لِی حِرفَتَانِ الفَقرُ وَالجِھَادُ

میرے دو ہنر (ہتھیار) ہیں فقر اور جہاد۔ (فرمان رسول ﷺ)

خُلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم

کی

جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

(مکمل چار حصے)



از قلم: حضور پاک ﷺ کا سپاہی میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان مدظلہ



مصنف جناب میجر امیر افضل خان صاحب

خُلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم

کی جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

حصہ اول

(فتوحات عراق و ایران)

از قلم: حضور پاک ﷺ کا سپاہی
میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان مدظلہ

ناشر: علم دین پبلشرز اُردو بازار لاہور پاکستان

نام کتاب : خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا تجزیہ
نام مصنف : جناب میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان مدظلہ
صفحات : ۱۰۷۵
اشاعت سوم : ۱۴۳۵ھ/2014ء
تعداد : 1100
قیمت :

ملنے کے پتے

۱۔ علم دین پبلشرز ماتھر سٹریٹ لوئر مال اُردو بازار لاہور
۲۔ مسلم کتابوی دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور
۳۔ میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان ۱۹ ذیشان کالونی قاب لائنز راولپنڈی

خلفاءِ راشدینؓ کی جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

فہرست مضامین حصہ اول

فہرست مضامین حصہ دوم

فہرست مضامین حصہ سوم

فہرست مضامین حصہ چہارم

خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کی جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

فہرست نقشہ جات حصہ اول

فہرست نقشہ جات حصہ دوم

فہرست نقشہ جات حصہ سوم

فہرست نقشہ جات حصہ چہارم

عرض ناشر

95 سالہ مجاہد اور غازی حضور پاک کے سپاہی جنات میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان صاحب مدظلہ کو جب انسان دیکھتا ہے تو ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اس عمر میں بھی جناب کی آواز میں اتنی گھن گرج اور رعب و دبدبہ ہے تو جوانی کا عالم کیا ہوگا۔

میجر صاحب مدظلہ کی ساری زندگی اپنوں اور بیگانوں سے معرکہ حق و باطل میں مصروفیت کی حالت میں گزری ہے۔ چونکہ میجر صاحب قبلہ ایک اصلی اور حقیقی سپاہی ہیں اس لئے بغیر کسی لگی لپٹی اور مُلمع سازی کے سیدھی اور صاف بات کرنے کے عادی ہیں جو اُن کے کئی مہربانوں کی طبع نازپر بھی گراں گزرتی ہے لیکن میجر صاحب کے پاس اپنے موقف پر اتنے مضبوط دلائل ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی جاتی ہے۔

میجر صاحب قبلہ کی کتب میں دلائل کی مضبوطی اور پختگی کی واضح مثال میجر صاحب کی کتاب حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال میں جنگ احد پر میجر صاحب کا موقف ہے اور اس بات کو ملک کے نامور محققین نے تسلیم کیا ہے کہ میجر صاحب کا موقف درست ہے ہم آج تک غلط تاثر کا شکار رہے جبکہ میجر صاحب نے سابقہ تصورات کو درہم برہم کر دیا ہے۔

ایسے ہی میجر صاحب قبلہ نے زبردست کتاب خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی پر مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ بات ثابت کی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بزرگوں کے طے شدہ اصولوں پر اپنی عسکری قوت کو منظم کرنا چاہئے نہ کہ غیروں کے فلسفہ میں گم ہو کر خالص اسلامی جہاد کو دنیاوی جنگ و جدل میں تبدیل کر دیا جائے۔

اگرچہ میجر صاحب قبلہ کی تمام کتب ہی مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں مگر حضور پاک کا جلال و جمال اور خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی تو گویا ایک نمونے کی مانند ہیں جن کو پڑھنے سے انسان کو عجیب و انوکھی روحانی تسکین محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میجر صاحب کی تفسیر قرآن بھی معلومات کا ایک سمندر ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بوسیلہ نبی کریم ﷺ اس مردِ مجاہد کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ آمین بجاہ طٰہٰ ویٰسین علیہ صلوٰۃ وتسلیم

عرضداشت

اے ربِ نبی محمد ﷺ! تو مُقلّب القُلوب ہے۔ ہماری حالت پر رحم فرما اور ہمیں عزت و غیرت کی زندگی واپس دے کہ حضور پاک ﷺ کے جمال سے ہم اس خطہ کو مُنوّر اور مُعطر کر دیں اور حضور پاک ﷺ کے جلال سے غیرت حاصل کر کے جہاد کو طرزِ زندگی کے طور پر اپنا کر عشقِ بلاخیز کا قافلہ سخت جان بن جائیں کہ میرِ عرب ﷺ کو یہاں سے ٹھنڈی ہوائیں جائیں۔

از حضور پاک ﷺ کا سپاہی
میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خاں

انتساب

رسول پاک ﷺ کے عشق سے
لبریز قافلہ سخت جان اسلام کے
غازیوں اور شہیدوں کے نام جن
کے ظاہر ہونے کا وقت
قریب آگیا ہے۔

کونسی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جان

بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلام ما بہ رسانید ہر کجا ہستند

حرف آغاز

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

گیارہ ستمبر کو امریکہ کے تجارتی (ورلڈ ٹریڈ سنٹر) اور دفاعی (پینٹاگون) مراکز کی تباہی مکافاتِ عمل کا نتیجہ تھی لیکن امریکہ نے اس واقعہ کو بہانہ بنا کر دہشت گردی کے خاتمہ کی آڑ لے کر ایک طویل المیعاد نظریاتی و عسکری جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ وہ اسے صلیبی جنگ۔ تہذیبوں کا تصادم، آزادی کی جستجو یا دہشت گردی کے خلاف جنگ کوئی بھی نام دے، درحقیقت یہ کفر اور اسلام کی جنگ ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے پانچ ہفتہ کی شدید ترین بمباری اور خون ریزی کے بعد افغانستان کو تباہ اور طالبان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ امریکہ پہلے ہی یہ واضح کر چکا ہے کہ یہ سلسلہ افغانستان پر نہیں رکے گا بلکہ ساٹھ ممالک پر محیط ہوگا۔ اسلامی ممالک کی تعداد ستاون ہے اس میں فلسطین، چیچنیا اور کشمیر شامل کر لیں تو یہ تعداد ساٹھ ہو جاتی ہے۔ گویا اس جنگ کے اہداف نامزد کئے جا چکے ہیں۔ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف اس جنگ کے عرصہ کا تعین نہیں کیا ہے لیکن امریکہ کے پالیسی ساز یہود نواز حلقے جنگ کو پچاس سال پر محیط دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے پچاس سال افغانستان جیسے ملک کو فتح کرنے یا دہشت گردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے درکار نہیں ہیں بلکہ یہ عرصہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عمل کو روکنے اور عالمِ اسلام میں روز افزوں جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لئے مطلوب ہے۔ ایٹمی پاکستان اسلام کا قلعہ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا عنوان ہے اس لئے براہ راست اس یلغار کی زد میں ہے۔ عالمِ اسلام اتحاد اور جہاد سے لیس ہو کر ہی اس یلغار کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن جہاد صرف جذباتی عمل نہیں ہے بلکہ ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہ ماحول اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک امت کا ہر فرد یا اکثریت اسلام کے عطا کردہ نظامِ حیات کے مطابق پوری زندگی بسر نہ کرے۔ گیارہ ستمبر کے بعد دنیا بدل گئی ہے مسلم امہ کو بھی بدلنا ہوگا، اسلام اور عالمِ اسلام کی بقا کے لئے اب جہاد ناگزیر ہو گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان "**لِیْ حِرْفَتَانِ اَلْفَقْرُ وَالْجِهَاد**" کی تعمیل میں تصوف فاؤنڈیشن نے فقر و تصوف کے ساتھ ساتھ اب جہاد و فنِ حرب پر بھی کتابیں شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔ پہلے مرحلے میں "شاہکار کتب جہاد" سلسلہ کی

حسب ذیل تین کتابوں کا سیٹ جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے شائع کیا جا رہا ہے ان کتابوں کے مصنف اس موضوع پر اتھارٹی اور یہ کتابیں بلاشبہ شاہکار کتب ہیں۔

(۱) جہاد جہاد اور فن حرب کے متعلق قرآن مجید کے رہنما و عالمگیر اصول از بریگیڈیر گلزار احمد

(۲) رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا عسکری تجزیہ از میجر امیر افضل خاں

(۳) خلفائے راشدین ؓ کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا عسکری تجزیہ (چار جلدیں) از میجر امیر افضل خاں

جہاد اور فن حرب پر یہ شاہکار کتب ملٹری اور جہادی ٹریننگ کے لئے بہترین نصاب ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ جہاد اور فن حرب کو تعلیمی اداروں اور دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے اور موجودہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے مسلم امہ کو جہاد کے لئے تیار کیا جائے۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ پہلی کتاب "جہاد" تیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ "رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین ؓ کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا عسکری تجزیہ" پر مشتمل باقی پانچ کتابیں بھی بیس سال قبل آرمی ایجوکیشن پریس نے آرمی کے لئے شائع کی تھیں۔ اب تصوف فاؤنڈیشن ان نایاب اور لازوال کتابوں کو منظر عام پر لا رہا ہے۔ انتہائی محدود وسائل کی وجہ سے یہ کتابیں محدود تعداد میں شائع کی جا رہی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کتابوں کی وسیع اشاعت ہو اور جہاد اور فن حرب پر مزید کتابیں شائع کی جائیں۔ اس سلسلے میں درد مند مخیر حضرات کو تعاون کی دعوت ہے۔ آخر میں ان دوستوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ان کتابوں کی اشاعت میں مدد کی ہے اللہ تعالیٰ اس کار خیر کو ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین۔ **وما علینا الا البلاغ**

ارشد قریشی

بانی تصوف فاؤنڈیشن لاہور

یکم رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ / ۱۷ نومبر ۲۰۰۱ء

تعارف

قبل ازیں آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ کے زیراہتمام حضورؐ پاک کی جنگی حکمت عملی وتدبیرات کا تجزیہ میجر امیر افضل خان (ریٹائرڈ) کی کتاب "جلال مصطفےٰؐ" میں پیش کیا جاچکا ہے۔ جلال مصطفےٰؐ کی اشاعت کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ انہیں خطوط پر خلفائے راشدینؓ کی جنگی حکمت عملی وتدبیرات کا تجزیہ بھی پیش کیا جائے تا کہ اسلامی تاریخ کے اس روشن باب کی ایک صحیح اور مکمل تصویر سامنے آسکے۔ میرے پیشرو نے یہ ذمہ داری بھی میجر امیر افضل خان (ریٹائرڈ) کو ہی سونپنا مناسب سمجھا مصنف نے جس لگن اور جذبہ سے یہ ذمہ داری نبھائی ہے وہ قابل تحسین ہے۔

اب تک فلسفۂ جنگ اور جنگی حکمت عملی پر جو کتب ہمارے افسران اور جوانوں کے زیر مطالعہ رہی ہیں وہ زیادہ تر مغربی مصنفین کی ہی تحریر شدہ ہیں اور ان میں جن جنگوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے ان کا پس منظر بھی مغربی ممالک کی تاریخ کا ہی حصہ ہے۔ پاکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے افواج اسلام کی پیشہ ورانہ تربیت کی بنیاد اسلام کی عسکری تاریخ کی روشنی میں اخذ شدہ جنگی اصولوں اور حکمت عملی پر رکھی جائے۔ یہی مقصد زیر نظر سلسلہ کتب کی اشاعت کا محرک ہے۔

آنحضرتؐ کے وصال کے بعد خلفائے راشدینؓ کا دور اسلامی تاریخ کا سنہری دور ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں اسلامی فتوحات کا دائرہ عراق وایران سے لے کر مصر وافریقہ تک پھیلا ہوا ملتا ہے۔ وہ قوم جو چند دہائیاں پہلے تک عرب کے ریگستانوں میں جہالت اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ حضورؐ پاک کی تعلیم اور خلفائے راشدینؓ کی ولولہ انگیز قیادت کے زیر اثر جس طرف بھی بڑھی کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ وہ کیا عوامل تھے جن کی بدولت اسلامی لشکروں کو تعداد ووسائل کی کمی کے باوجود کامیابی پر کامیابی نصیب ہوئی؟ زیر نظر سلسلۂ کتب کا مقصد انہی عوامل کی نشاندہی اور تجزیہ کی روشنی میں مملکت اسلامیۂ پاکستان کی افواج اپنی حکمت عملی کا تعین کر کے وطن عزیز کو اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ بنا سکیں۔

مصنف نے خلفائے راشدینؓ کے دور کو چار کتابوں میں قلمبند کیا ہے جو یکے بعد دیگرے قارئین کے سامنے پیش کی جائیں گی ان میں سے پہلی کتاب جو آپ کے زیر نظر ہے اس میں فتوحات ایران وعراق اور مرتدین کے قلع قمع کرنے کے بارے میں تفصیلات اور تجزیات بیان کئے گئے ہیں۔ دوسری کتاب فتوحات شام وفلسطین پر مبنی ہے اور ت

تیسری کتاب میں مصر وافریقہ کی فتوحات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ چوتھی کتاب اندرونی خلفشار کے علاوہ آخری میں یہ بتاتی ہے کہ جب وحدت آ گئی تو حضورؐ پاک اور خلفائے راشدینؓ کی ساری حکمت عملی "عطیات وثمرات" جس طرح مسلمانوں کی جھولی میں گر گئے۔ تمام کتابوں میں جن خیالات اور نظریات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنف کے اپنے ذاتی ہیں اور انہیں من وعن شائع کر دیا گیا ہے۔ ان نظریات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ بہر حال جی ایچ کیو کی کسی پالیسی کی غمازی نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ اسلامی فلسفہ جنگ اور حکمت عملی پر جتنا مواد حاصل ہو سکے اسے شائع کر کے قارئین کی علمی پیاس بجھائی جا سکے۔

میں ذاتی طور پر ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کا بھی ممنون ہوں جن کی کاوشوں کی بدولت اسلامی تاریخ پر مبنی یہ کتب پایہ تکمیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ میرے لئے یہ امر باعث عزت ہے کہ ان کتابوں کا تعارف لکھنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیب کی۔

مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ کتب افواج پاکستان کے افسران اور جوانوں کی عسکری صلاحیتوں کا اسلامی فلسفہ جنگ کے اصولوں سے ہم آہنگ کرنے میں ممد ومددگار ثابت ہوگا۔

میجر جنرل نصیر احمد ستارۂ جرأت

انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلیویشن

جی ایچ کیو

پیش لفظ

تشکّر

سب تعریفیں ربّ العالمین کے لیے ہیں اور اس ربّ العزت کی بارگاہ میں اپنے سر کو جھکاتا ہوں اور عرض یہ ہے کہ اے ربّ العالمین! تیری رحمتوں کا شکر کرتے وقت رقت طاری ہو جاتی ہے۔ تو بڑا رحیم و کریم ہے کہ اس گنہگار کو اس عمر میں قلم پکڑا کر اپنے حبیب ﷺ کے جلال کی جھلک پیش کرنے کی سعادت بخشی۔ حضور پاک ﷺ اور ہمارے آقا ﷺ پر لاکھوں سلام۔ اب ان کے قافلہ کے سرداروں کی زندگیوں کی جھلک پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ حضورِ پاک ﷺ کے ان عظیم ساتھیوں کا مقام اتنا بلند ہے، جس کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتی۔ وہ دیدارِ عام سے لطف اندوز ہوئے، اور یہ سب کچھ برداشت کر گئے۔ یا اُس لطف کو اپنے تک محدود رکھا:

خوشا وہ وقت کہ مدینہ مقام تھا اُس ﷺ کا
خوشا وہ دَور کہ دیدارِ عام تھا اُس ﷺ کا

(اقبالؔ)

حضورِ پاک ﷺ کے جلال و جمال کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور یہ کتاب بھی آپ ﷺ ہی کے جلال کا مظہر ہے۔ نام میں تبدیلی صرف واقعاتی ہے اور سوچا کہ جلال کی شان کو حضورِ پاک ﷺ تک ہی محدود رہنے دیا جائے اور کتاب ''جلالِ مصطفےٰ ﷺ'' کا حصوں میں تذکرہ نہ کروں اور ''جلالِ مصطفےٰ ﷺ'' کے الفاظ اکیلے حضورِ پاک ﷺ ہی کی شان کا نشان بن جائیں۔

گو حضورِ پاک ﷺ کا جمال اپنی جگہ از خود ایک مضمون ہے، لیکن جمال کا بیان کوئی عاشقِ رسول ﷺ ہی کر سکتا ہے۔ ہاں البتہ ہم سپاہیوں کو حضورِ پاک ﷺ کے جمال سے بھی جلال کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ کے رفقاء کے مقامات کی بلندی کو سمجھنے کے لیے جمال و جلال کے بارے میں تھوڑا بہت بھی سمجھ لیا جائے تو انسان بے ادبی سے ضرور بچ جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم نے حضورِ پاک ﷺ اور اُن کے رفقاء کی زندگی کے عملی پہلوؤں کو اپنے تنگ نظر

دُنیاوی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی تو پھر ہم اس خوشبو سے ضرور محروم ہو جائیں گے، جس سے یہ دنیا ہر وقت معطّر رہتی ہے۔ لہٰذا عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں عرض ہے کہ اے ربّ العالمین! میرے قلم کی پاکیزگی کو قائم رکھنا۔ قلم کی پاکیزگی کی تو نے قرآنِ پاک میں قسم اُٹھائی ہے اور قسم ہمیشہ پیاری چیز کی اُٹھائی جاتی ہے۔ اے میرے ربّ! میرے قلم کو طاقت دے کہ یہ صحیح واقعات لکھے اور صحیح تجزیئے پیش کرے۔

مقصد

کتاب لکھنے کا مقصد کتاب کے نام سے ہی عیاں ہے۔ دراصل یہ بھی جلالِ مصطفیٰ ﷺ کا ایک سلسلہ ہے جو جاری وساری ہے۔ بے شک خلفاءِ راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے زمانے کی جنگوں کے حالات متعدد تاریخوں میں درج ہیں۔ لیکن حکمت عملی اور تدبیرات کے جائزے کہیں نہیں ملتے، بلکہ جنگوں کے مقاصد بھی کچھ صحیح طرح سے بیان نہیں کیے گئے۔ یہی حال نتائج کا ہے کہ ان کے بارے میں بیانات بہت سرسری ہیں۔ لیکن نتائج کے اثرات کے جائزے تو بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ بعد کے زمانے میں جب پہلی المغازی کی تاریخیں ناپید ہونے لگیں تو کئی ادیب صاحبان نے الف لیلیٰ کی قسم کے رنگ کو تاریخ کا حصہ بنا دیا جس سے مسلمانوں کی جنگوں کے عسکری پہلو اوجھل ہو کر رہ گئے، بلکہ کچھ افسوسناک پہلو بھی سامنے آئے۔ لفاظی، غلط بیانی اور نااہل لوگوں کے تبصروں نے حالات اور معاملات کی حقیقت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

ان حالات میں جس مقصد کو میں نے ذہن میں رکھا ہے، اس کو پورا کرنا واقعی کٹھن کام ہے لیکن یہ کچھ ایک اصول کے تحت کرنے کا ارادہ ہے اور اس کی بنیاد اس پر ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے احکام موجود ہیں۔ ہمارے آقا حضورِ پاک حضرت محمد ﷺ نے عملی طور پر ان احکام کو اس دنیا میں اپنی سنت کے طور پر جاری وساری کیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے حضورِ پاک ﷺ کی سنت ان ہی سے سیکھ کر عملی طور پر اپنائی۔ اس لئے تاریخ میں اگر کسی جگہ ایسے الفاظ نظر آئیں جو قرآنِ پاک کے احکام یا حضورِ پاک ﷺ کی سنت کی نفی کرتے ہوں تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کا حصہ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ہماری تاریخ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ دوسرا اُصول جو مدِّ نظر رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر واقعہ کے نتائج کو ذہن میں رکھ کر پھر نتائج واثرات کی چھان بین کی گئی ہے۔ اگر یہ نتائج و اثرات اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پورے اُترتے ہیں جس مقصد کے لئے دینِ فطرت یا دینِ حنیف کو دُنیا میں جاری وساری کیا گیا ہے تو ہم مان لیں گے کہ یہ عمل ہمارے آقا ﷺ کے عظیم رفقاء کا تھا۔ اگر معاملات اس کے برعکس ہیں تو نہ وہ اعمال ہمارے آقا ﷺ کے رفقاء کے ہو سکتے ہیں اور نہ ایسے واقعات ہماری تاریخ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ پرانے زمانے کی ہر کتاب میں لوگوں نے اضافے کیے اور اپنے ان اضافوں کو مصنفِ کتاب کی طرف منسوب کر دیا۔

صرف قرآنِ پاک میں ایسے اضافے نہ کئے جا سکے، باقی کتب میں یہ اضافے اب بھی موجود ہیں۔

دینِ فطرت کا مقصدِ حیات

نبی علیہ صلی اللہ کے مبعوث ہونے کا کیا مقصد ہے؟ ہمارے آقا علیہ صلی اللہ نے مدینہ شریف پہنچ کر پہلے ہی خطبہ میں اس پہلو کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا۔ مختصر طور پر آپ علیہ صلی اللہ نے یہ فرمادیا: ''زمانے کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اسی لئے نبی علیہ صلی اللہ مبعوث ہوا کہ زمانے کو تسلسل دے۔'' اب یہ نکتہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ دنیا تسلسل کے ساتھ شروع ہوئی۔ حضرت آدم علیہ السلام اکیلے تھے اور انہوں نے ایک فلسفۂ حیات پیش کیا۔ پھر آدمیوں کی تعداد بڑھ گئی اور علاقوں یا ملکوں میں پھیل گئی۔ اور لوگ گروہوں میں بٹ گئے۔ گو اللہ تعالیٰ نے ہر خطے میں پیغمبر مبعوث فرمائے لیکن ہر زمین کی آب و ہوا کی وجہ سے مزاجوں میں فرق رہا۔ اس لیے اختلافات بڑھتے گئے اور زمانے کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ یعنی لوگ یا زمانہ ایک رُخ یا ایک صراطِ مستقیم کی بجائے مختلف راستوں پر چل پڑے۔ حضور پاک علیہ صلی اللہ نے ساری دنیا کے لیے اُمّت واحدہ کا تصور دے کر دینِ فطرت کا مقصدِ حیات بھی واضح کر دیا اور کاروانِ حق کو صراطِ مستقیم پر رواں دواں کر دیا۔ اور اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ زمانے کا تسلسل قائم ہو گیا۔

تفرقہ

اگر ہم اُوپر بیان کیے گئے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کرتے، تو ہمارے اندر کوئی تفرقہ پیدا نہ ہوتا۔ مگر یہاں یہ بھی اختلاف شروع ہو گیا کہ بعض نے کہا حضور علیہ صلی اللہ کو مبعوث ہونے کے بعد تمام دنیا آپ علیہ صلی اللہ کی اُمت ہے یا ایک اُمت ہے اور بعض نے کہا کہ نہیں، جو حضورِ پاک علیہ صلی اللہ کے احکام پر عمل کریں گے وہ آپ علیہ صلی اللہ کی اُمت ہیں۔ یہ تفرقہ کسی وضاحت کا مرہونِ منت نہ تھا اور نہ ہے۔ کہ تصور تو ایک اُمت کا ہے۔ لیکن عملی طور پر اُمت میں وہ شامل ہیں جو صراطِ مستقیم پر چل رہے ہوں۔ آگے چل کر غیروں کی اصطلاحوں پر ہم نے اسلامی پیوند لگا دیئے اور صراطِ مستقیم کی بجائے پیچھے مڑنے یعنی انقلاب جیسی غلط اصطلاحوں کو بھی اسلامی اصطلاح بنا کر قوم کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ان غلط اصطلاحوں نے اسلام کے رنگ و روپ کو ہی تبدیل کر دیا۔ چنانچہ اس کتاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فوجی حکمتِ عملی، تدبیرات اور جنگوں کا بامقصد مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ہم یہ سمجھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دینِ فطرت پر کیسے اور کس طرح عمل کیا۔ مختصر طور پر اسلامی فلسفۂ حیات کا بیان جلالِ مصطفےٰ علیہ صلی اللہ کے پیش لفظ میں کر دیا گیا تھا۔ کتابوں کا یہ سلسلہ اُس فلسفۂ حیات کے عملی پہلو کا بیان ہے اور آخری جلد کے آخری باب میں مسلمانوں کے فلسفہ حیات کا نچوڑ بھی بیان کیا جائے گا۔

تاریخ اور راوی

جلالِ مصطفیٰ ﷺ میں اس چیز کی وضاحت کردی گئی ہے اور اسلامی تاریخ کے بنیادی پہلو بیان کردیئے گئے ہیں۔ عام طور پر پرانے زمانے کے تاریخ دان زیادہ دیانتداری سے کام لیتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے المغازی کی تقریباً چالیس تاریخیں جو ابن اسحٰق سے پہلے لکھی گئیں وہ ناپید ہیں۔ دراصل اُمیّہ اور عباسی خلفاء کے زمانے میں ان تواریخ کی کتابوں کو ضائع کیا گیا، کیونکہ انہیں لکھنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کے فرزندان اور تبع تابعین نے اسلامی فلسفہ حیات کو صحیح طور پر پیش کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتے تھے اور خلفاء کو ایسے لوگوں کا خوف دامن گیر رہتا تھا جو ان کے غلط کاموں پر فوراً روک ٹوک شروع کردیتے تھے۔ پرانی تاریخوں میں ابنِ اسحٰق، ابنِ ہشام اور واقدی کا اُردو ترجمہ یا انگریزی ترجمہ کہیں سے نہیں مل سکا۔ طبقات[1] ابن سعد کا ترجمہ اُردو میں موجود ہے۔ لیکن آپ نے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے بارے میں لکھا ہے۔ واقعاتی طور پر تسلسل سے تاریخ کی کتاب نہ مل سکی، ابن سعد البتہ بڑے ادب سے سب واقعات کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی تاریخ سے بڑی مدد حاصل کی گئی ہے۔ جہاں ناموں میں اختلاف تھا یا واقعات کو کئی صاحبان سے منسوب کیا گیا وہاں ابن سعد سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن یہ ثانوی پہلو ہے۔

واقدی

واقدی جو ابن سعد کا اُستاد تھا۔ اس کے خلاف دو بڑے الزام ہیں۔ اوّل الزام، امام بخاری نے دروغ گوئی کا لگایا ہے۔ خاص کر واقدی کے حضور پاک ﷺ کی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کے واقعات کے بیانات پر امام بخاریؒ کو سخت اعتراض ہے کہ واقدی بے ادب ہے۔ لیکن جناب داتا گنج بخشؒ اسی واقعہ کے متعلق واقدی کے اسی بیان کو اس کا نام لئے بغیر نہ صرف صحیح تسلیم کرتے ہیں بلکہ اسی بیان سے حضور پاک ﷺ کے اعلیٰ وارفع مقامات کا ذکر ایسے پیارے الفاظ میں کرتے ہیں کہ واقدی کی بریت ہوجاتی ہے۔ واقدی پر دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں بہادری کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ جنگوں میں جو کچھ ہوا اور آگے آپ جو کچھ پڑھیں گے۔ وہ سب کچھ معجزہ سے کم نہیں۔ اگر واقدی نے اس سلسلہ میں حقیقت بیان کردی تو اس نے کوئی قصور نہیں کیا۔ بلکہ پرانے تاریخ دانوں میں یہ واحد صاحب ہیں جنہوں نے صرف روایات پر بھروسہ نہ کیا بلکہ تجزیئے پیش کرنے کے لئے چھان بین بھی کی۔ بلکہ یہ اس کی ایک بڑی خدمت ہے۔ گو واقدی کی اپنی تاریخ نہ مل سکی لیکن دوسروں نے واقدی کے حوالے سے جو کچھ لکھا اس کو جہاں تک صحیح پایا گیا، وہ آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ جہاں اختلاف ہے وہاں ساتھ ہی اپنا تجزیہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

(۱) ہماری پرانی تاریخوں میں طبقات ابن سعد کے مقابلہ کی تاریخ نہ مل سکے گی۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے حالات کو جس پیار و محبت سے اکٹھا کیا اور جس ادب کے ساتھ ان کے کردار کو پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جرمنی کے آخری بادشاہ قیصر ولیم نے بیسویں صدی کے شروع میں اس کا ترجمہ کرا کے جرمن افسروں کو دیا کہ اعلیٰ کردار والے سپاہیوں کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ اس زمانے میں مشہور بھی ہوگیا تھا

کہ قیصر مسلمان ہوگیا ہے کہ انور پاشا کے ساتھ اس کی بڑی دوستی تھی۔ ہم نے ابن سعد کا حوالہ صرف اس جگہ دیا ہے جہاں وہ واقعہ صرف ابن سعد میں تھا۔ لیکن ثانوی پہلو کے طور پر اس کی کتاب کے لفظ لفظ سے استفادہ کیا گیا۔

طبری

اس کے بعد سب سے پرانی تاریخ جو ہمارے ہاں موجود ہے وہ تاریخ طبری ہے۔ اور اس کتاب کے لئے طبری کی تاریخ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہے کہ طبری نے ایک ہی واقعہ کو کئی راویوں کے حوالے سے مختلف شکل و صورت میں پیش کیا ہے۔ کئی جگہوں پر تسلسل بھی نہیں۔ ان حالات میں اپنے دیگر تاریخ کے مطالعے سے مدد لینا پڑی۔ اس سلسلہ میں اگر تمام کتابوں کا ذکر کیا جائے تو شاید یہ خودنمائی کے تحت آئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ساتویں جماعت سے طالب علم کی حیثیت سے میں اکثر اُردو میں لکھی ہوئی مسلمانوں کی تاریخیں پڑھ چکا ہوں۔ اگر پنجابی میں لکھی ہوئی گلزار چہار یار یا حضور پاک ﷺ کی شان میں کوئی نعت یا نظم لکھی ہوئی مل گئی تو وہ بھی پڑھ ڈالی۔ اور پاکستان کے بننے تک اُردو میں لکھی ہوئی اسلام کی تاریخ کی کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی جو نہ پڑھی ہو۔

انگریزی تاریخیں

فوج میں افسر بننے کے بعد ۱۹۵۱ء سے غیروں کی عسکری تاریخوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، تو ساتھ ہی انگریزی میں لکھی ہوئی اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ اپنوں کی کتابیں تو اس سلسلہ میں کم تھیں، لیکن غیروں کی سینکڑوں کتابیں پڑھیں، جن میں ہتی، گب، ٹوان بی جیسے مشہور مورّخین کے علاوہ اگر متعصب گلب کا کچھ لکھا ہوا مل گیا تو وہ بھی پڑھ لیا۔ اور اگر پروفیسر روم لنڈو جیسے کسی اعتدال پسند شخص کی کوئی کتاب مل گئی تو وہ بھی پڑھ لی اور اپنوں کی جو بھی کتاب مارکیٹ میں آئی اور مل سکی تو پڑھ لی۔ اس مطالعے سے مجھے تاثر ملا کہ غیروں نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن ان کی عینک بھی متعصب تھی اور پیمانے بھی۔ اس لئے وہ اسلام کی روح تک نہ پہنچ پائے۔ اور جو لوگ اورینٹلسٹ[1] کہلائے، ان میں اور ابو جہل میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔

مسلمان مورّخ و مبصّر

اس زمانے میں مسلمان مورّخین نے کئی اچھی کوششیں کیں لیکن اکثر کے سلسلہ میں معاملات بین بین رہے۔ وجہ یہ تھی کہ اکثر لکھنے والے مغرب کی ''بڑائی'' سے مرعوب تھے۔ نقل زیادہ کی اور وہ بھی مغربی دانشوروں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں بھی اکثر نے اسلام کو غیروں کے پیمانے سے ناپا۔

(۱) مستشرقین

غیروں کے فلسفے اور نظریئے

تاریخِ عالم اور دُنیا کی عسکری تاریخ کا مطالعہ تو پہلے سے شروع تھا۔ واقعاتِ عالم کے طالب علم کی حیثیت سے دیگر قوموں کے سیاسی فلسفوں اور معاشرتی نظریوں کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ہندوؤں کو دوبارہ البیرونی کی زبان سے خوب پڑھا۔ یونانی فلسفہ اور یورپ کی موجودہ زمانے کی تہذیب وتمدن پر نظر دوڑائی۔ غرض غیروں کے بارے میں جو کچھ میسر آسکا پڑھا، لیکن سب کچھ کو اسلام کے مقابلہ میں بودا اور بھونڈا پایا۔ حضور پاک ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء رضی اللہ عنہم کے ساتھ غیروں کے موازنے والی بات کی گستاخی سے تو اللہ تعالیٰ نے بچایا، لیکن اگر کسی کی کوئی اچھی چیز نظر بھی آئی تو اس کی تعریف ضرور کی۔ لیکن حضور پاک ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کی بلندیوں کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب (اقبالؔ)

ان نتائج پر پہنچنے کے بعد اپنی تاریخ اور فلسفہ ونظریہ کا با مقصد مطالعہ دوبارہ شروع کر دیا اور پہلے اپنے تاثرات ۱۹۶۷ء کے بعد ہلال میں شائع کئے اور دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دی کہ اسلام کی روح کو تلاش کر کے قوم کے سامنے پیش کریں۔ اس مطالعہ کی صورت میں جو مواد اکٹھا کر سکا ہوں، اس کو کتابی شکل دے رہا ہوں۔ لیکن اگر اس بحث میں پڑ گیا کہ یہ واقعہ فلاں مورّخ نے بیان کیا اور فلاں مبصر نے یہ تجزیہ پیش کیا تو کتاب الجھاؤ پیدا کرے گی۔ اس لئے واقعات مؤرخین اور مبصرین کے نام لکھے بغیر ہی پیش کیے جا رہے ہیں۔ کسی ضروری جگہ حوالے موجود ہیں اور واقعات مورخین کی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی سنّت سے جو مدد لی گئی ہے۔ اس کا بیان ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ پر نام لکھنے سے تمام کتاب روزنامچہ بن جاتی ہے۔

وحدت

کوشش یہ کی گئی ہے کہ حضور پاک ﷺ کے رفقاء رضی اللہ عنہم نے جس وحدتِ عمل اور وحدتِ فکر کا مظاہرہ کیا اس کو قوم کے سامنے پیش کیا جائے اور کتاب کا پہلا باب بھی وحدت کے مضمون پر ہے۔ عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسلامی فلسفہ حیات کے بنیادی پہلو، وحدت پر عمل کرتے ہوئے فوجی حکمت عملی تعین کی۔ اسی طرح لشکر کے سالاروں نے تدبیرات کو بھی انہی اصولوں کے مطابق ڈھالا۔ اور نتیجۃً یہ اہلِ حق ساری دنیا پر چھا گئے۔ حضور پاک ﷺ نے بھی اپنی وفات سے پہلے دو باتوں کے لئے فکر مندی کا اظہار فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے مسلمانو! کسی بیرونی دشمن کا خطرہ اتنا زیادہ نہیں لیکن دو چیزیں آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ...

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان جب تک ایک مرکز کے تحت متحد رہے کوئی اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔لیکن اپنے اندرونی خلفشار نے انہیں ہمیشہ سخت نقصان پہنچایا۔ ہمارے سامنے ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی مثالیں موجود ہیں۔ کہ پہلی صورت میں ہمارے اتحاد کی وجہ سے دشمن ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ دوسری صورت میں ہم دولخت ہو گئے۔

حُبّ الدنیا وکراہت الموت

دوسرا خطرہ جس کی حضور پاک ﷺ نے نشاندہی کی اور اس سلسلہ میں یہ وضاحت بھی کی کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ مسلمان گو تعداد میں بہت زیادہ ہوں گے لیکن دُنیا میں، نہ اُن کی کوئی عزت ہوگی، نہ اُن کو کوئی خاطر میں لائے گا۔ وجہ یہ ہوگی کہ مسلمان دنیا کی محبت میں اندھے ہو جائیں گے۔ اور موت سے ان کو اس قدر کراہت یا ڈر ہوگا کہ وہ اسلامی فلسفۂ حیات سے دور ہوتے جائیں گے۔ میں اپنی تاریخ سے حضور پاک ﷺ کے رُفقاء کے ان دونوں پہلوؤں کی طرف اُن کے رویّہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا اور تاریخ کا با مقصد مطالعہ بھی اسی کو کہتے ہیں کہ تاریخ سے سبق حاصل کئے جائیں اور ان پر عمل کیا جائے۔ تاریخ کو صرف تفریح کی حیثیت سے پڑھنا اور اس سے سبق نہ حاصل کرنا ایک بے مقصد مشقت ہوتی ہے۔ یا با مقصد تاریخ لکھنے کو اس طرح پیش کیا جائے کہ خواہ مخواہ کیچڑ اُچھالا جائے۔ الزام تراشی ہو یا ذہنی عیاشی ہو، اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تاریخ کو صرف اس طرح پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے تاریخ کو قرآن پاک میں پیش کیا ہے۔

کتابوں کی ترتیب

خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کی تاریخ کو اور ہر خلیفہ راشد کے زمانے کو الگ الگ حصوں یا کتابوں میں تقسیم کرنے کی بجائے واقعات اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ حکمت عملی میں تسلسل قائم رہے۔ چنانچہ پہلا حصہ جو آپ کے سامنے ہے، وہ فتوحاتِ عراق وایران پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصہ میں فتوحات فلسطین وشام کو شامل کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں فتح مصر اور افریقہ وایشیاء کی فتوحات ہیں۔ چوتھا حصہ اندرونی خلفشار کے عملی پہلو کو بیان کرتے ہوئے سانحۂ کربلا کے واقعات تک ہے۔ ہر حصہ کے ہر باب کے اختتام پر جہاں تک ممکن ہوا ہے، تبصرہ اور تجزیہ موجود ہے۔ لیکن جہاں کسی باب میں کوئی بڑا واقعہ ہے وہاں اس کے نتائج، نتائج کے اثرات اور اسباق بھی موجود ہیں۔

(امیر افضل خان)

پہلا باب

وحدت اور مرکزیّت

ابتدائیہ

ہمارے آقا حضور پاک محمد مصطفےٰ ﷺ نے مسلمانوں کو اخوت کا درس دے کر ایک وحدت کی لڑی میں پرو دیا۔ اور ایک مرکز قائم کر دیا۔ اسلامی فلسفہ کو اجتماعی طور پر اپنانے کے لئے وحدت اور مرکز کو اولیت حاصل ہے۔ حضورِ پاک ﷺ نے مسلمانوں کو متحد کر کے ایک سیسہ پلائی دیوار بنا دیا تھا۔ جو سرزمین عرب میں ایک سپرنگ بورڈ پر کھڑے پَر تول رہے تھے کہ دنیا میں اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کا پرچم جگہ جگہ گاڑ دیں۔ اہل حق سرزمینِ عرب میں باطل کو پاش پاش کر چکے، تو ان کی نظر عرب سے باہر کے باطل پرستوں پر مرکوز ہوگئی۔ دین حق کا یہ عالمگیر پیغام، اب ان کو دُنیا کے کونے کونے میں پہنچانا تھا۔ حضور پاک ﷺ نے اس سلسلہ میں بسم اللہ کر دی تھی اور دنیا کے جانے پہچانے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی جا چکی تھی۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کے راز ہیں۔ جو کام حضورِ پاک ﷺ کی وفات کے چند سال بعد ہوا، وہ آپ ﷺ کی زندگی میں بھی ہو سکتا تھا۔ ایک نکتہ یہ ہے حضورِ پاک ﷺ پر جس دین کی تکمیل کی گئی، اسے رہتی دنیا تک جاری و ساری رہنا ہے۔ اس کی حضورِ پاک ﷺ نے اپنے غلاموں کو تربیت دی اور آپ ﷺ نے ہر میدان میں عملی نمونہ بھی پیش کیا تا کہ کاروانِ حق حضورِ پاک ﷺ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر رواں دواں رہے۔ اسی لئے یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گا۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امتحان جاری ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اہلِ حق ہر زمانے میں اس امتحان میں کامیاب و کامران رہے۔

حضورِ پاک ﷺ کی جانشینی

حضور پاک ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے غلاموں میں سے کسی ایک نے مسلمانوں کا امیر بن کر قافلۂ حق کی رہنمائی کرنا تھی۔ ہاں حضور پاک ﷺ کے بعد اُن کا نائب یا مسلمانوں کا امیر کون ہوتا، یہ سوال اتنا اہم نہ تھا، کیونکہ کوئی تفرقہ نہ تھا۔ اسلامی فلسفۂ حیات کے لحاظ سے اور حضور پاک ﷺ کے ارشاد کے مطابق جو امارت کا طلبگار ہوتا تھا اس کو امارت نہ ملتی تھی۔ اور امارت کی ذمہ داریاں پوری کرنے سے سب ڈرتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ کاش! وہ گھاس کا ایک تنکا ہوتے تا کہ روزِ قیامت اللہ کے سامنے حساب کتاب سے بچ جاتے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ خلافت کے واقعاتی پہلو کا حقیقت پسندانہ جائزہ تاریخی عوامل سے پیش کیا جائے تا کہ اس پہلو کے بامقصد اصول آشکارا ہوں اور ہم اُن سے کوئی سبق سیکھ سکیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

پرانے زمانے کے مؤرخین نے کسی اور اختلاف یا تفرقہ کا ذکر نہیں کیا سوائے اِس کے کہ انصار کے قبیلہ خزرج کے چند لوگ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ کو امیر یا خلیفہ بنانا چاہتے تھے اس لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک اجتماع ہوا۔ سعد رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔ اس اجتماع میں کتنے اصحاب تھے، ان کی تعداد کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ معاملات ابھی بحث وغیرہ تک ہی پہنچے تھے اور انصار میں جناب حباب رضی اللہ عنہ بن المنذر[1] اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی مستعد معلوم ہوتے تھے اور قبیلہ اوس کے جناب بشیر رضی اللہ عنہ بن سعد انصار کی خلافت کے حق میں نہ تھے۔ مگر حالات نے بعد میں ظاہر کر دیا کہ انصار کی ایک بڑی جماعت یہ بات پسند نہ کرتی تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جائے لیکن انصار کے جذبات کو بھڑکایا جا رہا تھا۔ اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، اور امین الامت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وہاں بروقت نہ پہنچ جاتے، تو شائد یہ فیصلہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حق میں ہو جاتا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ ہو جانے کے بعد تمام اختلافات ادھر ہی ختم ہو گئے اور اس کے ثبوت میں دورِ صدیقی رضی اللہ عنہ کی وہ تمام فتوحات ہیں جو اس کتاب کا موضوع ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قوم کا مرکز مضبوط نہ ہوتا۔ اور قوم اختلاف کا شکار ہوتی تو اس قوم کی افواج دنیا کے شہنشاہوں کی افواج کے اس طرح پرخچے نہ اُڑا سکتیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اختلافات کو بعد کے زمانے میں کچھ زیادہ ہوا دی گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہُ الکریم چونکہ اس مشاورت میں شامل نہ تھے تو شائد انہوں نے فرمایا ہو یا پوچھا ہو کہ اتنی جلدی کیا تھی؟ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جب اُن کو حالات سے آگاہ کیا گیا تو آپ خاموش ہو گئے۔

(۱) جلال مصطفےٰ ﷺ، صفحہ ۵۲، ۵۳، ۱۸۱، اور ۳۵۵ سے استفادہ کریں۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ وہاں موجود نہ تھے، پہلے فوت ہو گئے تھے۔

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کیا چاہتے تھے؟

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق ہوتا تھا اور وہی کچھ ہوا جو اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے، وغیرہ، تو اُن کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو سمجھنے کی مزید کوشش کریں۔ قرآن پاک اور سیرۃِ طیبہ کا مطالعہ کر کے اپنے دل و دماغ کو اور روشن کریں۔ مشہور مسلمان فلاسفر ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ ٥ نے اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو چاہتے تھے، اس کے ہونے میں کچھ دیر نہ لگتی تھی۔ داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ ٥ ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ہی سے سب کچھ ہو جاتا تھا۔ پھر قرآنِ پاک میں جنگ بدر کے سلسلے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ ریت یا مٹی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے، تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کو الگ نہیں کرنا چاہیے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیج کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بلند سے بلند کرتے رہتے ہیں۔

قلم دوات منگوانے کی روایات

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی، یا خلافت کے سلسلہ میں اگر تمام واقعات اور روایات کو ہم اس وجہ سے نظر انداز کر جائیں کہ ان کا جائزہ پیش کرنے سے کچھ لوگ ناراض ہو نگے، تو ہمارے اوپر بھی یہ الزام عائد ہو سکتا ہے کہ ہمارا وحدت اور مرکزیت کا فلسفہ زبانی کلامی ہے، اس لیے چند مشہور روایات کا جائزہ ضروری ہے۔ ان میں سے ابنِ سعد میں ایک روایت ہے، کہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوئے تو جناب عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بلاؤ کہ میں جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے ایک فرمان لکھ دوں تا کہ میرے بعد کوئی ان پر اختلاف نہ کرے۔

طبری میں ایک روایت ہے کہ بیماری میں حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قلم دوات منگوالو تا کہ میں آپ کے لئے ہدایات لکھوا دوں کہ آپ میرے بعد اختلاف نہ کریں۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کا خیال تھا کہ ہمارے لئے قرآن پاک اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کافی ہے، اور اب قلم و دوات کے چند لفظوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ بہر حال آگے اس روایت پر بڑے بڑے تبصرے کئے گئے کہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جانشینی کا پورا سلسلہ لکھ دینا چاہتے تھے لیکن فلاں نے روڑا اٹکا دیا۔

تبصرہ: ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ہم ان دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک روایت کو ثقہ یا غیر ثقہ قرار دیں۔

دیئے۔تو دونوں روایتوں میں یہ بات واضح ہے کہ قلم دوات نہ پہنچی اور کچھ بھی نہ لکھا گیا۔تو ہم صرف اتنا تبصرہ کریں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ اور حضور پاک ﷺ چاہتے کہ قلم دوات کی لکھائی سے جانشینی کا فیصلہ اسی وقت ہو جائے تو ایسا ضرور ہو گیا ہوتا۔شائد حضور پاک ﷺ کچھ لکھوانا چاہتے ہوں اور پھر ارادہ تبدیل کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔

قلم دوات منگوانے کے سلسلہ میں ایک اور شک بھی سامنے آتا ہے۔اپنے زمانے میں حضور پاک ﷺ نے کسی حدیث مبارکہ کو لکھنے کی اجازت نہ دی، کہ قرآنِ پاک اور احادیث الگ الگ رہیں۔اور احادیث یا علمِ مغازی کے لکھنے کا کام آپ ﷺ کی وفات کے بعد شروع ہوا۔اس لئے حضور پاک ﷺ اس پر قائم رہے اور آخری وقت کوئی وصیت بھی نہ لکھائی۔اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ہو سکتی ہے کہ اگر حضور پاک ﷺ جانشینی کے بارے میں کوئی واضح ہدایات دینا چاہتے تو زبانی بھی دے سکتے تھے۔اگر آخری وقت بھی جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے بارے بار بار یاد دہانی کرائی تو جانشینی کے سلسلہ میں بھی واضح اعلان کر دیتے اور انصار کے سقیفہ بنو ساعدہ میں اجتماع ایک عملی ثبوت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے واضح الفاظ میں اپنی جگہ کسی جانشین کا اعلان نہ فرمایا۔

حضور پاک ﷺ کی وفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

ہمارا تو یہ تجزیہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شاید یہ بات کبھی سوچی تک بھی نہ ہو کہ حضور پاک ﷺ وفات پا جائیں گے یا کم از کم اُن کی زندگی میں وفات پا جائیں گے۔اس لئے اکثر صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کی جانشینی کے معاملات کی طرف کبھی دھیان بھی نہ دیا ہوگا۔اس کے ثبوت میں ہم یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کی وفات کے وقت جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تلوار اُٹھالی اور فرمایا کہ ''خبردار!اگر کوئی یہ لفظ کہے گا کہ حضور پاک ﷺ وفات پا گئے تو میں اُس کا سر قلم کر دوں گا۔'' تو ظاہر ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کو یہ یقین نہ آ رہا تھا کہ حضور پاک ﷺ وفات پا گئے تھے۔جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد اُن کو یقین آیا کہ واقعی حضور پاک ﷺ وفات پا چکے تھے اور ایسا بھی ہونا تھا۔

صحابہ کرامؓ اور خاص کر حضور پاک ﷺ کے خاص رفقاء رضی اللہ عنہم یعنی چار یار اور عشرہ مبشرہ میں شامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عقیدہ یا کردار کا جائزہ لینا، سورج کو چراغ دکھانا ہے۔اُن میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر امارت کا خواہاں نہ تھا اور نہ ان میں سے کسی نے ایسی کوشش کی۔بعد کی روایات میں کچھ لوگوں نے اپنے پیمانوں کے لحاظ سے بعض اضافی باتیں کہہ دیں۔اس سلسلہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے رویہ کو جلالِ مصطفےٰ ﷺ میں بیان کر دیا گیا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کا

[illegible]

مدینہ شریف میں حاضر ہوا اور آپ ؓ سے پوچھا کہ آپ ؓ نے بارِ خلافت کیوں اُٹھا لیا ہے۔تو آپ ؓ نے فرمایا:''اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ڈر لگ رہا تھا کہ اُمت تفرقہ کا شکار نہ ہو جائے۔''

اس پہلو کی وضاحت، واقعات کے ذریعہ سے خود بخود ہوتی جائے گی اور قارئین سے گزارش ہے کہ چاروں کتابوں کو پڑھنے کے بعد کوئی رائے قائم کرنا۔حضورِ پاک ﷺ کے اِن عظیم رفقاءؓ کا ظاہر و باطن ایک تھا اور ظاہری طور پر وہ ایک دوسرے کے ساتھ سیدھی بات کرتے تھے،جن باتوں کو سننے والوں نے اختلاف کے طور پر بیان کر دیا۔لیکن عملی اختلاف حضرت عثمان ؓ کی خلافت کے آٹھویں یا دسویں سال تک کہیں بھی نظر نہیں آیا۔اور اس سے آگے جو کچھ ہوا،اس پر تیسری اور چوتھی کتاب میں ساتھ ہی ساتھ جائزہ پیش کر دیا گیا ہے،کہ حضورِ پاک ﷺ کے کسی عظیم رفیق پر اس زمانے میں بھی کوئی حرف نہیں آتا۔

حضرت علی ؓ اور خلافت

پہلے گزارش کی جا چکی ہے کہ ہم خلافت کے فلسفہ میں نہ جائیں گے کہ خلافت کا حقدار کون تھا اور کون نہ تھا، کیونکہ اگر ہم کوئی فیصلہ دے بھی دیں تو اُمت کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔کیونکہ حضرت علی ؓ کے خلیفہ بن جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔بلکہ امامت کے سلسلہ میں بھی اختلافات ختم نہ ہوئے۔اس لئے ہم ان عقائد یا نظریات کے جائزہ سے گریز کریں گے۔ہم صرف عملی پہلو کی وضاحت کریں گے کہ جناب حضرت علی ؓ کے رویہ سے کسی اختلاف کا اظہار نہیں ہوتا۔اور اس سلسلہ میں چند واقعاتی ثبوت پیش کئے جاتے ہیں۔

اوّل:آپ ؓ نے دوستوں کی کمان کی جنہوں نے حضورِ پاک ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ شریف پر حملہ آور دشمن کو مار بھگایا اور یہ کام آپ ؓ جناب ابوبکر صدیق ؓ کے احکام پر کر رہے تھے۔دوم:تینوں خلفاءِ راشدین کے زمانے میں آپ مشیرِ اعلیٰ تھے اور ہر کارروائی آپ ؓ کے مشورہ سے کی گئی۔اور آپ کی مشاورت یا خلیفہ کے نائب ہونے کے واقعات آئندہ صفحات میں آئیں گے۔سوم:آپ کو اصحابِ ثلاثہ سے اتنی محبت تھی کہ بیٹوں کے نام اُن کے نام پر رکھے۔امام حسن ؓ اور امام حسین ؓ کے نام حضورِ پاک ﷺ نے رکھے۔حضورِ پاک ﷺ کی وفات کے بعد پہلا بیٹا پیدا ہوا تو نام محمد ؓ رکھا۔جو محمد ؓ بن حنیفہ کے نام سے مشہور ہوئے۔اُن کا ذکر اس کتاب کے تیسرے باب اور چوتھی کتاب کے دوسرے اور تیسرے باب میں آئے گا۔اس کے بعد جو بیٹا پیدا ہوا تو اُس کا نام اپنے چچا عباس ؓ کے نام پر رکھا،وغیرہ۔لیکن ایک بیٹے کا نام ابوبکر ؓ رکھا جن کی والدہ لیلیٰ بنت مسعود تھیں۔آپ کربلا میں شہید ہوئے

حبیب ربیعہ تھیں اور عین التمر کے نواح میں سے مالِ غنیمت میں جناب خالد رضی اللہ عنہ کو ملیں۔ اس کا ذکر اس کتاب کے پندرھویں باب میں ہے۔ ایک اور بیٹے کا نام عثمان رضی اللہ عنہ رکھا، جن کی والدہ اُمِ البنین تھیں، جو اپنے تین اور سگے بھائیوں کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے اور آپ کا ذکر چوتھی کتاب کے ساتویں باب میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

جنابِ علی رضی اللہ عنہ اور جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان

حضور پاک ﷺ نے انتشار کے علاوہ جس دوسرے خطرہ کا ذکر فرمایا، وہ حب الدنیا ہے اور دنیا کے بارے جس عملی رویہ کا جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھرانے نے مظاہرہ کیا، اُس شان کو بھی کوئی قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی کچھ جھلکیاں چوتھی کتاب کے پہلے باب میں ملیں گی، اور اس گھر میں امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ نے جو روایات قائم کیں، ان کی دُنیا میں مثال ملنا تو ویسے بھی مشکل ہے۔ لیکن یہ واقعات فرش تا عرش اس قدر پھیلاؤ اختیار کر چکے ہیں کہ ان کی وسعت کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے کچھ ذکر ضروری ہے۔ حضور پاک ﷺ نے مجلس کے دوران سرگوشی سے منع فرمایا۔ کہ مجلس میں کسی اکیلے دکیلے سے الگ بات نہ کی جائے۔ لیکن فرمایا کہ دو ہستیوں کے سلسلہ میں حضور پاک ﷺ اپنے اہل مجلس سے معذرت کے بعد الگ بات کرنے کی اجازت چاہیں گے۔ وہ دو ہستیاں جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور جناب فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے رویہ کے بارے میں کچھ جھلکیاں دوسری کتاب میں بھی ہیں۔ لیکن مکمل پہلو تیسری کتاب کے نویں باب میں موجود ہے۔ جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ میں روایت ہے کہ وفات سے چند روز پہلے حضور پاک ﷺ نے جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر کان میں کچھ بات کی تو آپ رو پڑیں۔ پھر حضور پاک ﷺ نے دوبارہ بلایا اور کان میں پھر کچھ بات کی تو آپ مسکرا دیں۔ اُس وقت یہ بات راز ہی رہا۔ البتہ اپنی وفات سے چند دن پہلے آپ رضی اللہ عنہا نے اس راز سے پردہ اُٹھا دیا۔ کہ پہلی دفعہ جب حضور پاک ﷺ نے ان کے کان میں بات کی تھی تو وہ حضور پاک ﷺ کی اپنی وفات کی خبر تھی اس لئے وہ رو پڑیں۔ دوسری دفعہ بلا کر فرمایا کہ آپ مجھے جنت میں سب سے پہلے اور بہت جلد ملیں گی تو وہ خوش ہو گئیں اور مسکرا دیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ان عظیم ہستیوں کے سامنے دنیا کی کوئی اہمیت نہ تھی بلکہ وہ آخرت کو ہی سب کچھ جانتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلافت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر صحابی اس قابل تھا کہ حضور پاک ﷺ کے بعد امارت کو سنبھال لیتا اور عشرہ مبشرہ میں سے اپنی فوقیت کی وجہ سے کوئی صحابی بھی خلیفۃ الرسول ﷺ کے منصب پر فائز ہونے کا مستحق تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے تو شاید اس سلسلہ میں کبھی کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے پاس گئے، اور ان کو کہا کہ وہ امین الامت ہیں، اس لئے وہ مسلمانوں کی خلافت کو سنبھال لیں۔ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے ابن خطاب رضی اللہ عنہ! کیا صدیق کے ہوتے ہوئے کوئی اور اس منصب کے قابل ہے؟ میں تو خود آپ کے پاس آ رہا تھا کہ انصارِ مدینہ سقیفہ بن ساعدہ میں اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہاں پر خلافت کے مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔'' چنانچہ دونوں عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن دفن کی تیاری میں مصروف تھے، اس لئے صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر یہ تینوں صحابہ رضی اللہ عنہم سقیفہ بن ساعدہ میں پہنچے۔ وہاں انصار کا اجتماع تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ خود بیمار تھے۔ وہ ایک جگہ لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے الفاظ ان کے بیٹے یا بھتیجوں میں سے کوئی سن کر یاد کر لیتا تھا اور سارے اجتماع کو سنا دیتا تھا۔ روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے جذبات کو بھڑکانے کی بھی کوشش کی، کہ قریش کی نسبت انصار خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس سلسلے میں لمبی چوڑی بحث چھڑ گئی۔ سوال اُٹھا کہ مہاجرین میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی کافی موجود ہیں۔ جنہوں نے اوّل روز ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پر لبیک کہا۔ اگر وہ انصار کی امارت کی مخالفت کریں تو پھر کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ ایک تجویز ایسی بھی پیش ہوئی، کہ پھر دو امیر مقرر کئے جائیں ایک مہاجرین سے اور ایک انصار سے۔ اسی دوران جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ کچھ اور مہاجرین بھی تھے لیکن مورخین نے نام نہیں لکھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ وہاں پر پہنچ کر اُن کا ارادہ ہوا کہ وہ ایک تقریر کریں۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے پہل کاری چھین لی، اور آگے بڑھ کر خود خطاب فرمایا۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ حیران تب ہوئے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ تمام دلیلیں اپنے خطاب میں فرما دیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سوچے ہوئے تھے بلکہ ان سے بہتر دلائل بھی دیئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وحدت فکر اور عمل اور اپنے اختلافات کو بات چیت سے طے کرنے کی یہ پہلی مثال ہے۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تقریر

آپ رضی اللہ عنہ نے پہلے مختصر الفاظ میں اسلام کا فلسفۂ حیات بیان فرمایا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے اور مومن کی زندگی کے مقاصد کی تشریح کی اور فرمایا کہ:

''دُنیا کی زندگی آخرت کی کھیتی ہے اور صرف نیک اعمال ہی کام آئیں گے، لیکن بنیادی چیز جس کی ضرورت ہے وہ مسلمانوں کی وحدت اور مرکزیت ہے۔ عرب قبائل نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ اسلام کے اجتماعی پہلو کو وہ اچھی طرح سے نہیں سمجھتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انصار نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور اس خدمت کا اظہار حضور

پاک ﷺ جنگ حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت فرما چکے ہیں اور حضور پاک ﷺ انصار کے ساتھ یہاں تک ایک جان ہو گئے ہیں کہ اپنی آخری آرام گاہ کے لئے بھی انصار کے شہر مدینہ کو پسند فرمایا۔لیکن ابھی کئی قبائل ان گہرے فلسفوں کو نہیں سمجھتے وہ فی الحال یہ پسند نہ کریں گے کہ ان پر حضور پاک ﷺ کے قبیلے سے باہر کا کوئی امیر مقرر ہو۔ یہ وقت تو وحدت اور اتحاد کا ہے۔اس لئے بہتر ہے کہ حضور پاک ﷺ کے خاندانِ قریش میں سے کسی ایک کو خلیفۃ الرسول تسلیم کر کے ہم اپنی وحدت اور اتحاد کا مظاہرہ کریں تاکہ مکہ کے قریش پر بھی اس کا اچھا اثر ہو۔اور کم از کم دو جگہوں یعنی خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں وحدت کا اظہار ہو جائے۔ یہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔یہ امین الامت ہیں۔ان میں سے کسی کو خلیفہ تسلیم کر لیا جائے۔"

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ "یارِ غار رضی اللہ عنہ اور صدیق رضی اللہ عنہ سے بہتر اس منصب کا کون حق دار ہو سکتا ہے؟ جن کی امامت میں حضور پاک ﷺ خود نماز ادا کر چکے ہیں۔"

اس پر دونوں عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم آگے بڑھے اور انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔اس کے بعد انصار میں سے حضرت بشیر رضی اللہ عنہ بن سعد اور حضرت اُسیر رضی اللہ عنہ بن حضیر نے بھی آگے بڑھ کر آپ کی بیعت کر لی اور بعد میں تمام انصار یا اجتماع میں شریک مسلمانوں نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ کچھ عرصہ تذبذب اور کشمکش کا شکار رہے لیکن عملی طور پر چونکہ کسی مخالفت کا ثبوت نہیں ملتا۔اس لئے ہم اس معاملہ کو یہاں ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

بات قوم کی وحدت اور مرکزیت کی تھی۔مہاجرین کو اوّل اسلام لانے کا اعزاز حاصل تھا اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فاقت، عمر، تجربہ وغیرہ کے لحاظ سے افضل تھے۔

خلیفہ اوّل کا پہلا خطبہ

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ بھی قوم کی وحدت کی عکاسی کرتا ہے۔آپ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی ثناء اور حضور پاک ﷺ پر درود و سلام کے بعد مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دی اور اندرونی خلفشار کو دور کرنے پر زور دیا۔آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کرتے رہیں تو مسلمانوں پر اُن کی اطاعت واجب[1] ہے۔آگے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حاکم وقت کے سامنے سچ بولنا بہت بڑی وفاداری ہے اور سچ کو چھپانا

(۱) اسلامی فلسفہ اطاعت امیر کی بنیاد اس اصول پر ہوتی ہے، نہ کہ ایسے فلسفوں پر کہ ایسے لوگ ہمارے امیر بن جائیں جو غیروں کے فلسفوں کا پرچار کریں، اسلام کا مذاق اُڑائیں۔اسلام کے اندر قومیتوں کا پرچار کریں۔صوبائی عصبیت کو ہوا دیں، ملک کو دولخت کر دیں اور ایک دوسرے کو "محبِ وطن" قرار دیتے رہیں، گو اسلام میں وطن کو اللہ کا شریک نہیں بنایا جاتا لیکن یہاں فلسفہ "حبِ اسلام" ہے اور وطن کی قدر

تب ہے کہ اس میں اسلامی احکام نافذ ہوں۔

غداری ہے۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آگے فرمایا: ''آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں جو بڑا کمزور ہے، میرے نزدیک وہی بڑا زبردست ہے۔ جب تک میں اسکا حق اس کو نہ دلا دوں اور تم میں جو زبردست ہے وہی میرے نزدیک بڑا کمزور ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس اگر مستحق لوگوں کا حق موجود ہے تو ان کو واپس نہ دلا دوں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے اس طرح امیر اور اس کی بیعت کرنے والوں کے تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ جناب موسیٰ رضی اللہ عنہ بن عقبہ کے ناپید کاغذات سے ابن اسحٰق کی تاریخ میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''میں نے نہ کبھی امارت کی خواہش کی اور نہ کبھی اللہ تعالیٰ سے اس سلسلہ میں دعا مانگی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہوں کہ اس مشکل کام میں وہ میری مدد کرے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان بیان کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کردار سے تو غیر مسلم بھی متاثر ہوئے۔ مشہور یورپین مورّخ ''کارلائل'' کہتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر کتنے عظیم ہوں گے جن کا جانشین اتنے بلند پایہ کردار کا مالک ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے ایسے الفاظ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ پڑھ کر رقت طاری ہو جاتی ہے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس زمانے میں غیروں کی نقالی میں ہم ''بامقصد تجزیوں'' کے تحت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کی بےادبی کر جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک مبصر کی کتاب کے چند الفاظ یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

''حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی حالت اس طرح ہو گئی تھی، جس طرح سردیوں کے موسم میں ایک بھیڑ بارش سے ٹھٹھر جاتی ہے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو مسلمانوں کے غم گہرے ہو گئے۔ کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی امارت کی صفات کے لئے کچھ زیادہ مشہور نہ تھے۔ اور مسلمانوں کے جہاز کو طوفان سے نکالنا تو بڑا کٹھن کام تھا۔ اس موقع پر کسی مضبوط دل اور سخت لیڈر کی ضرورت تھی۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ ایک دُبلے پتلے انسان تھے۔ اُن کی بھنویں نازک تھیں، جن کے نیچے آنکھیں دبی ہوئی تھیں۔ وہ وسمہ اور مہندی لگاتے تھے، لیکن بڑھاپا اُن کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے نظر آتا تھا۔ بڑے رحمدل تھے اور بات بات پر رو دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمات بہت زیادہ تھیں۔ اُنہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو وفاداری دکھائی اور حضور پاک

ﷺ نے آپ کو صدّیق کا خطاب دیا۔ ذاتی حوصلے میں بڑے بلند تھے۔ اوران کے اسلام پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تیسرے فرد تھے جو اسلام لے آئے اور عشرہ مبشرہ میں ان کو بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ لیکن کیا یہ خوبیاں مشکل اوقات میں لیڈری کے لیے کافی ہیں؟ جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کا معاملہ بھی تشویش پیدا کئے ہوئے تھا۔"

تبصرہ: قارئین! آپ اِس کی لفاظی، اور تضاد بیانی میں جائیں کہ مخالفت میں صرف لفاظی ہی لفاظی ہے۔ اور اسی بناء پر یہ مبصر آپ رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے موزوں نہیں سمجھتا (نعوذ باللہ) اور یہی مبصر آگے جا کر اپنی کتاب میں تسلیم کرتا ہے کہ "چند مہینوں کے بعد باغی اور مرتدین، ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام سن کر کانپ کانپ جاتے تھے۔" چنانچہ ہمارا با مقصد تجزیہ اس قسم کی لفاظی اور بے ادبی سے مبرا ہے۔ ہم با مقصد تجزیہ سے سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور غلط باتوں کو صحیح باتوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے لحاظ سے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے ہی روز سے امارت اور خلافت کے لئے موزوں ترین تھے۔ اپنی پہلی تقریروں اور کارروائیوں ہی میں انہوں نے اپنی عظمت کو ثابت کیا اور آگے جو کچھ کیا اُس کی آج تک دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک حضور پاک ﷺ کے وصال کے غم نے مسلمانوں کو چند لمحوں کے لئے نڈھال ضرور کیا۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلے الفاظ نے اُن میں جان ڈال دی اوران کو یاد آ گیا کہ اسلام کا فلسفۂ حیات کیا ہے۔ ٹھٹھری ہوئی بھیڑ والی بات کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو اپنے اصلی مقام پر واپس لے آئے۔ حضور پاک ﷺ خود فرما چکے تھے۔ "کہ اے مسلمانو! میں نے سب لوگوں کو اُن کے احسانات کا بدلہ دے دیا۔ لیکن ایک شخص کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں اُن کو پورا نہ کر سکا اور وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔" حضور پاک ﷺ کے اس بیان کے اندر کئی راز پنہاں ہیں، جن کو سمجھنا ہم گنہ گاروں کے لئے ناممکن ہے۔ ہاں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کچھ نشاندہی فرما گئے ہیں:۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ

جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ وہ مشکل کام تھا جس کے ساتھ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا سب سے پہلے واسطہ پڑا۔ آپ رضی اللہ عنہ خود اس لشکر میں شامل تھے۔ لیکن حضور پاک ﷺ کی بیماری اور وفات کی وجہ سے اس لشکر کی روانگی میں دیر ہو گئی تھی۔ حضور پاک ﷺ وفات سے ایک آدھ دن پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس سلسلہ میں یاد دہانی فرما چکے تھے اور تاکید فرمائی تھی کہ تاخیر نہ کرنا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے اسی معاملہ پر توجہ دی اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو موتہ[1] کی طرف

کوچ کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ موتہ وادی بلقا اور موجودہ اُردن میں ہے۔ اس زمانے میں ان سب علاقوں کو بلادِ شام اور فلسطین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جلالِ مصطفےٰ ﷺ کے پانچویں باب میں جنگِ موتہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے۔ ادھر ہی جناب اُسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ بن حارث شہید ہوئے تھے۔ حضور پاک ﷺ بعد میں، خود ایک لشکر کو لے کر اس علاقہ میں تشریف لے گئے جس کو مہم تبوک کہتے ہیں اور اسکا بھی مکمل ذکر جلالِ مصطفےٰ ﷺ کے آٹھویں باب میں موجود ہے۔ حضور پاک ﷺ کا دشمن کے ساتھ ٹکراؤ نہ ہوا لیکن آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ اُس علاقہ میں ایک اور سخت حربی مظاہرہ ہوتا کہ دشمن کو اس طرف سے مسلمانوں پر یورش کرنے کی ہمت نہ پڑے۔ حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم اس خیال کے حامی ہو گئے کہ اوّل تو اس طرف کوئی مہم بھیجی ہی نہ جائے، لیکن اگر مہم بھیجی جائے تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی بجائے کسی اور تجربہ کار صحابی کو سالارِ لشکر مقرر کیا جائے۔ اہل لشکر مدینہ سے باہر پڑاؤ کئے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بیچ میں شامل تھے۔ اُن کو کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قائل کر لیا کہ ان کی اس قسم کی تجویز کو وہ خلیفۃ الرسول ﷺ کو پیش کریں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دونوں گزارشات پیش کر دیں تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے ابن خطاب رضی اللہ عنہ! سنو، یہ احکام اللہ کے حبیب ﷺ کے ہیں اور ابو قحافہ[۲] رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو ان میں تبدیلی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کیا تم مجھے ایسے سالارِ لشکر کو ہٹانے کے لئے کہہ رہے ہو جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر فرمایا۔''

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی ندامت کا اظہار کیا۔

تبصرہ: حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارکہ میں جن اختلافات کو باعث رحمت قرار دیا گیا ہے کہ بات چیت سے معاملات کو طے کیا جائے، اُس طریق کار کی یہ عملی مثال ہے۔

اِس سیدھے سادے واقعہ کو اِس زمانے کے ایک مبصر کی کتاب میں پڑھیں تو آپ کو فرق نظر آ جائے گا۔ وہ رقمطراز ہیں:

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس اِس طرح آئے جس طرح وہ پہلے زمانے میں ایک مضبوط اور سخت آدمی کی طرح ایک کم گو اور فرمانبردار دوست کے پاس آیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو بُرا بھلا کہا۔ گو پرانے زمانے کے مورخین نے جناب اُسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم کو بڑی دانائی والی بات

(۱) جلالِ مصطفےٰ ﷺ کے صفحہ ۲۹۳ پر اس کا ذکر آ چکا ہے۔ (۲) جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد کا نام۔

قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بڑی غلطی تھی۔ حکمت عملی کے لحاظ سے بھی اور سیاسی لحاظ سے بھی۔ اور چونکہ بڑے بڑے تجربہ کار صحابہ نے اس مہم کی مخالفت کی تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی دانائی والی بات نہ ہوگی (نعوذ باللہ) جگہ جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے، اور باغی خوش تھے کہ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی فوج مدینہ سے چلی گئی ہے اور اب ان کا مسلمانوں کے کمزور خلیفہ یا امیر کے ساتھ واسطہ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کسی حکمت عملی کے تحت نہ کیا تھا، بلکہ حضور پاک ﷺ کے ساتھ اپنی عقیدت کی وجہ سے کیا۔"

یہ مبصر کوئی غیر مسلم نہیں بلکہ بڑی اچھی کتابیں لکھی ہیں، جن کی بعض باتیں دودھ کی طرح شفاف ہیں۔ لیکن ادب ملحوظ نہیں رکھا اور تفرقہ کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ مورخین نے اگر نتائج کے طور پر بھی حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مہم کو دانائی والی کارروائی قرار دیا تو پھر کون سی حکمت عملی کے تحت یہ مبصر اس کارروائی کو سیاسی غلطی قرار دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اسلام کے فلسفۂ حیات کا پتہ نہیں ہوتا۔ اور اسلام کو انہوں نے مغرب کی عینک سے پڑھا ہوتا ہے۔ اور مغربی پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ کے نامِ مبارک پر سب حکمت عملیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ اور جلالِ مصطفےٰ ﷺ میں اس پہلو کی کھل کر وضاحت کر دی گئی ہے بلکہ بیسویں صدی تک غیرت مند مسلمان اور خاص کر غازی انور پاشا رحمتہ اللہ علیہ جیسے لوگ حضور پاک ﷺ کے نام مبارک پر لاکھوں سلطنت عثمانیہ قربان[1] کرنے کو تیار تھے۔

پھر ہر واقعہ کو بقول کلاسوٹز، نتائج کے اثرات سے پرکھا جائے۔ جب حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم کے نتائج اچھے نکلے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ ہوا تو حکمت عملی بھی صحیح سمجھی جائے۔ ویسے مدینہ شریف کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ جلالِ مصطفےٰ میں یہ پہلو واضح کر دیا گیا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوا کر مدینہ شریف کو ایک ایسے مستقر میں تبدیل کر دیا تھا کہ چند سو آدمی، عورتیں اور بچے بھی کسی بڑے سے بڑے لشکر کا ایک ماہ تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ مکہ مکرمہ کی قریش اور طائف کے قبیلے وفادار تھے۔ مدینہ شریف کا محاصرہ کرنے والی کسی فوج کے خلاف وہ تیسرے یا چوتھے دن پہنچ سکتے تھے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو واپس بلایا جا سکتا تھا۔ مدینہ شریف کے گرد و نواح سے کوئی قبیلہ چار یا پانچ ہزار سے زیادہ نفری کا لشکر مدینہ شریف کے خلاف نہ لا سکتا تھا۔ اور اگر لاتا تو یا تو اسے بھاگنا پڑتا یا اس کو تہس نہس کر دیا جاتا۔ اگلے باب میں مدینہ شریف پر حملہ آور لشکروں کی یلغار کی کہانی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدینہ شریف میں اتنی طاقت تھی کہ کسی کو اس کا محاصرہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ دو باتیں تفصیل سے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ با مقصد تجزیہ سے تفرقہ کی بجائے وحدت پیدا کی جائے اور بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھ کر تجزیئے پیش کیے

(۱) جلالِ مصطفےٰ ﷺ، صفحہ ۳۴۹

جائیں۔یاد رکھیئے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں میں جو یک رنگی پیدا کی اسے قلم بیان کرنے سے قاصر ہے:

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ (اقبالؔ)

جیش اُسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی پہلی کارروائی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل اور قوم میں وحدت اور جذبۂ جہاد پیدا کرنے سے شروع ہوتی ہے۔غیرت مند قومیں موت سے نہیں ڈرتیں اور مدینہ شریف کے مسلمان، عورتیں اور بچے ہر سختی کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے،اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مقررہ وقت پر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے پڑاؤ میں حاضر ہوتے ہیں۔سب سے پہلے سالارِ لشکر سے اجازت مانگتے ہیں کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کی مشاورت کے لئے مدینہ منورہ شریف چھوڑ جائیں۔پھر لشکر کے لیے الوادعی دعا مانگتے ہیں اور لشکر ترتیب کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے کوچ کرتا ہے۔حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہیں۔خلیفۂ وقت زمین پر کھڑے ہیں۔جب حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے چلنے کی باری آتی ہے تو خلیفۂ وقت بھی ساتھ پیدل چل پڑتے ہیں۔حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ گھوڑے سے اُترنے لگتے ہیں تو خلیفۂ وقت منع فرماتے ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے جاتے ہیں اور پھر اسی طرح کافی دور تک چلنے کے بعد ایک جگہ رُک جاتے ہیں اور سارے لشکر کو اپنے پاس سے گزرنے تک انتظار کرتے ہیں۔جب آخری آدمی آپ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزر جاتا ہے تو پھر آپ رضی اللہ عنہ رب العزت کے دربار میں ہاتھ اُٹھا کر عاجزی سے دُعا مانگتے ہیں اور جب لشکر کافی دور نکل جاتا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی معیت میں مدینہ شریف پیدل واپس آتے ہیں۔یہ ہے اسلام کا فلسفۂ حیات،اور یہ ہیں اسلام میں امیر اور مسلمانوں کے تعلقات۔ایسی حکمت عملیوں کے نتائج آپ اگلے باب میں پڑھیں گے،لیکن یہ نتائج اُس آنکھ کو نظر آتے ہیں جس میں مدینہ کی آنکھ کا سُرمہ ہو۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف (اقبالؔ)

نتائج واسباق کا خلاصہ

کتاب کے اس پہلے باب میں ہمارے لیے متعدد اسباق ہیں۔واقعات کا تجزیہ پیش کرتے وقت،واقعات کے نتائج،نتائج کے اثرات،اسلامی فلسفۂ حیات اور زندگی کے مقاصد پر کھل کر تبصرہ کر دیا گیا ہے۔مختصر طور پر اسباق و نتائج حسب ذیل ہیں:

۱۔ دین اسلام کو جاری وساری رکھنے کے لئے وحدت اور مرکزیت کی سخت ضرورت ہے۔

۲۔ خلافت اور امارت کے سلسلے میں اختلافات وقتی تھے، جو جلدی ختم ہو گئے۔

۳۔ حضور پاک ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی شان کو سمجھنا ضروری ہے۔ جو مسلمان یہ نہیں سمجھتا اور اس سلسلے میں اپنی انکساری کا اظہار نہیں کرتا، اس کے تجزیئے اس کے عقلی پیمانوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ایسا شخص یا تو غیروں کے فلسفوں سے متاثر ہوتا ہے یا اسلام کے فلسفۂ حیات اور زندگی کے مقاصد کو نہیں سمجھتا۔

۴۔ اگر اسلامی فلسفۂ حیات اور حضور پاک ﷺ کے نبی مبعوث ہونے اور اسلام کے قافلے کو صراطِ مستقیم پر رواں دواں رکھنے کے نظریہ کو سمجھ لیا جائے تو پھر سارے اختلافات مٹ جاتے ہیں۔

۵۔ تاریخ میں غیر ضروری لفاظی اور اضافی باتیں لکھنے والے لوگوں کے تجزیوں کو نظر انداز کیا جائے۔

۶۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی فوجی حکمت عملی اور حضور پاک ﷺ سے ان کی رفاقت کی وجہ سے اُن کی شان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آپ ؓ نے اپنی تمام تر کارروائیوں کی بنیاد حضور پاک ﷺ کی غلامی پر رکھی اور مسلمانوں کا عمل اسی بنیادی فلسفہ سے شروع ہوتا ہے۔

۷۔ سیدنا علی ؓ اور حضرت فاطمہ الزہرا ؓ کو جو بلندیاں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں، ان کو اپنے دنیاوی پیمانوں سے نہ ناپا جائے اور عقیدت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ کیا جائے جو کچھ ان ہستیوں نے کیا۔

۸۔ آگے واقعات ثابت کریں گے کہ حضرت علی ؓ اور اُن کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر ؓ ہی اُن لشکروں کی کمان کر رہے تھے جو مدینہ شریف کے دفاع کے لئے باہر نکلے اور لشکر میں زیادہ تعداد بنو ہاشم اور حضور پاک ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کی تھی کہ حضور پاک ﷺ کی وفات کی وجہ سے اُن میں سے اکثر حضرت اُسامہ ؓ کے لشکر میں شریک نہ ہو سکے۔

۹۔ اسلام ایک اللہ اور ایک دین کے ماننے کا نام ہے۔ اس میں علاقائی نسلی یا لسانی تعصب کی اجازت نہیں۔ اس لئے اسلام کا وہ مزاج نہیں جو مغربی جمہوریت کا ہے۔ یہاں شرط، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ یہاں تعصب یا نسلی معاملات کو ہوا دینے والے یا مرکز کو کمزور کرنے والے غیر اسلامی فلسفوں کو لانے والے یا مادر پدر آزادی کے پرچار کرنے والے کی کوئی گنجائش نہیں۔

۱۰۔ اسلام کی فوجی حکمت عملی ایک اللہ، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک اُمت کے فلسفہ پر مبنی ہوتی ہے۔ یہاں اولی الامر کا حکم چلتا ہے۔ اس کو ہمیں مغربی عینکوں سے نہیں پرکھنا چاہیے۔

۱۱۔ صحابہ کرام ؓ کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اُن کا طرز کلام سیدھا تھا اور وہ پشتو اور پنجابی زبان کی طرح بے تکلف

ہو کر ایک دوسرے کو "تو" کر کے پکارتے تھے، وہ اپنے اختلافات منہ پر بیان کر دیتے تھے اور جب اُن کے سامنے صحیح صورتِ حال بیان کی جاتی تو اختلافات کو بھول جاتے تھے۔ یہ ہمارے لئے عملی سبق ہے۔

دوسرا باب

منکرین و مرتدین کا ارتداد

حضور پاک ﷺ کی زندگی ہی میں یمن میں اسود عنسی بغاوت کر چکا تھا۔ لیکن حضور پاک ﷺ کی بیماری کی خبر سن کر چند دوسرے قبائل میں بھی بغاوت کے آثار نمودار ہو گئے۔ ان میں طلیحہ، سجاح اور مسیلمہ کذاب نے تو نبوت کا بھی اعلان کر دیا تھا اور مدینہ شریف کو فوری خطرہ بھی طلیحہ سے تھا، کیونکہ بنی اسد، بنی سلیم اور غطفان قبائل میں سے کئی لوگ اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بلکہ ہوازن قبیلہ کے لوگ بھی کچھ بین بین ہی تھے۔ مسیلمہ کذاب گو نبوت کا اعلان کر چکا تھا لیکن وہ یمامہ میں بیٹھ کر اپنے قبیلہ بنو حنیفہ میں اپنی پوزیشن مضبوط کر رہا تھا۔ نقشہ اوّل میں چیدہ چیدہ باغی قبائل اور ان کے سرداروں کو الگ ظاہر کیا گیا ہے۔

اسود عنسی اور یمن کے واقعات

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یمن میں اسود عنسی کی بغاوت حضور پاک ﷺ کے زمانہ ہی میں شروع ہو چکی تھی، لیکن وہاں پر کافی لوگ مسلمانوں کے وفادار رہے۔ حتیٰ کہ اسود کی بیوی آزاد بھی مسلمانوں کے ساتھ تھی۔ شروع میں یمن کے معاملات بڑے بھیانک نظر آتے تھے۔ لیکن حضور پاک ﷺ اپنی زندگی ہی میں اسود کے قتل کی خوشخبری مسلمانوں کو سنا چکے تھے۔ گو قاصد کے ذریعے سے یہ خبر آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت اُسامہ کے لشکر کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد ملی۔ یہ فتنہ تقریباً تین یا چار ماہ تک رہا اور اب اس طرف سے تسلی تھی۔

طلیحہ کی بغاوت

طلیحہ مختلف قبائل کو اکٹھا کر رہا تھا۔ بنی غطفان کے علاوہ، ہوازن اور طے قبیلے کے کچھ لوگ بھی اُس کے ساتھ مل گئے۔ بنو اسد اور بنی سلیم بھی اُس کے ساتھ تھے۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے ہی میں مخبروں کو اُدھر بھیجا جا چکا تھا۔ اور حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد چند مخبروں نے خود بخود آ کر حالات کا جائزہ پیش کیا اور زکوٰۃ دینے سے تو تقریباً سب قبائل انکار کر چکے تھے۔ قریش مکہ کو چھوڑ کر یا طائف کے بنو ثقیف قبائل کے علاوہ ہر جگہ بغاوت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شمال کی طرف جہاں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کا لشکر بھیجا گیا، اس راستے پر قضاعہ قبیلہ کے لوگ بھی باغی ہو چکے تھے اور جو چھوٹے چھوٹے قبائل اگر باغی نہ ہوئے تھے تو وفادار بھی نہ تھے لیکن جیسے ہی اُن قبائل نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو دیکھا، وہ تتر بتر ہو گئے۔ ایسے قبائل میں سے اکثر نے دومۃ الجندل میں جا کر پناہ لی یا شر پسند جگہ جگہ اکٹھے ہو جاتے تھے لیکن حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ اپنے مشن پر رواں دواں رہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مدینہ شریف کے گردونواح کے باغی قبائل کے ساتھ ازخود کسی بڑی جھڑپ کے لئے اس وقت تک تیار نہ ہوئے جب تک حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ واپس نہ آ گئے۔

قبائل کا زکوٰۃ دینے سے انکار

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے البتہ حفظِ ماتقدم کے طور پر مدینہ شریف کے دفاع کو اور مضبوط بنایا اور جگہ جگہ قاصد بھیجے کہ باغی قبائل کے درمیان سے وفادار لوگ اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ آ جائیں۔ قبیلہ طے سے جناب عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم اور کئی چھوٹے قبائل سے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ اور حضرت البرقان رضی اللہ عنہ وغیرہ کچھ دستوں کو لے کر مدینہ پہنچ گئے۔ نقشہ اوّل کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد آپ پر ظاہر ہوگا کہ باغی قبائل کا زیادہ تعلق اس علاقہ سے تھا جو مدینہ شریف سے شمال اور شمال مشرق و مغرب کی طرف ہے اور سرزمین عرب کا یہ وسطی علاقہ بھی ہے۔ لیکن باغیوں کی بڑی بڑی جمعیتیں زیادہ تر نقرہ، ابرق اور بزوخا میں تھیں۔ یہ جگہیں نقشہ اوّل میں بھی ہیں لیکن ان کے محلِ وقوع کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے نقشہ دوم سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان باغیوں کے علاوہ مدینہ شریف کے نزدیک کے چھوٹے قبائل خاص کر ثعلبہ بن سعد، بنو اسد، مرہ اور حیسی[1] کے کچھ لوگ ذوقصہ میں اکٹھے ہو گئے۔ طلیحہ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے بھائی حبال کو بھی اپنے قبائل کے ایک دستہ کے ساتھ ان شر پسند قبائل کی طرف بھیج دیا، جس نے آ کر

(۱) ان سب قبائل کی مسلمانوں کے ساتھ جھڑپوں کا ذکر جلال مصطفےٰ ﷺ کے ضمیمہ میں تفصیل سے موجود ہے کہ حضور پاک ﷺ نے کیسے ان کے خلاف حربی کارروائیاں کی تھیں۔

ان قبائل کی عارضی سپہ سالاری بھی سنبھال لی۔

چنانچہ ان قبائل نے اپنے کچھ لوگوں کو وفد کی صورت میں مدینہ شریف بھیجا۔ مقصد حالات کو قریب سے دیکھنے کا بھی تھا۔ مسلمانوں نے اس وفد کی حسب دستور مہمانداری کی، لیکن ان لوگوں کے خیالات اور ارادوں میں تبدیلی آچکی تھی۔ کہنے لگے کہ وہ نماز ضرور پڑھیں گے۔ لیکن زکوٰۃ دینے کے لئے تیار نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی سننا پسند نہ کریں گے اور زکوٰۃ کی رقم کا پیسہ پیسہ وصول کریں گے۔

تبصرہ: اب اسلام اگر جدید طرز کا جمہوری نظام ہوتا تو فیصلہ ہو جاتا کہ زکوٰۃ کا معاملہ ختم ہے، کیونکہ اکثریت نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن اسلام میں اللہ کی اطاعت ضروری ہے۔ اور اولوالامر کو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔

قبائل کا ردِّ عمل

بہر حال اہل وفد حیران تھے کہ مدینہ شریف میں اُن کو جنگجو لوگ کم ہی نظر آرہے تھے اور یہ چیز ان کی سمجھ سے باہر تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کس بل بوتے پر یہ فیصلہ کر رہے ہیں۔ اس چیز کی سمجھ ان کو بعد میں آئی جب وہ اسلام میں دوبارہ داخل ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ ہاں اسلام دین فطرت ہے اور یہاں پر عقیدہ کی حفاظت کے لئے غیرت کی موت یا شہادت کو زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے اور مسلمان گیدڑ کی زندگی کی بجائے شیر کی موت مرنا پسند کرتے ہیں۔

باغی قبائل کی مدینہ شریف کی طرف پیش قدمی

بہر حال اس وقت مختلف وفدوں کے لوگوں نے واپس جا کر اپنے قبائل کو بتایا کہ مدینہ شریف کی حالت کمزور ہے اور حملہ کے لئے بہترین وقت آگیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ذوقصہ سے ذوتسی کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ دونوں شہر اب وہاں موجود نہیں۔ ان کا مدینہ شریف سے فاصلہ کوئی بیس پچیس میل تھا لیکن صحیح طور پر یہ کہنا کہ یہ لوگ مدینہ شریف کے کتنے نزدیک پہنچ گئے، کافی مشکل ہے۔ بہر حال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باخبر تھے۔ اور مدینہ شریف بھی اس طرح خالی نہ تھا جس طرح وفد کے لوگوں نے سمجھ لیا۔ یا جن مبصروں کو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر والی حکمت عملی صحیح نظر نہیں آئی تھی۔ واقعات ظاہر کریں گے کہ ان کا تبصرہ جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف کا انفعالی دفاع بھی نہ کیا بلکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے طریقہ کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ نے متحرک دفاع اختیار کیا۔ مجاہدین کو تین چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کیا اور ان کی کمان عشرہ مبشرہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور

حضرت طلحہ ؓ کے سپرد کی۔ بلکہ طبری کے مطابق ایک چوتھا لشکر بھی تیار کیا گیا جس کی کمان حضرت عبداللہ ؓ بن مسعود کو سونپی گئی۔ اور ان تمام لشکروں کو باغیوں سے دو دو ہاتھ کر کے بھگا دینے کی ذمہ داری سونپی۔ باغیوں نے اپنے لشکر کے کچھ لوگوں کو ذوحسی میں چھوڑا اور باقی لشکر کے ساتھ مدینہ شریف کی طرف پیش قدمی کی۔ مسلمان لشکر اپنی منتخب کی ہوئی زمین پر متحرک دفاع اختیار کئے ہوئے تھے اور دشمن کے حملہ کے منتظر تھے۔ دفاع میں تدبیرات کے صحیح استعمال کے لئے ''اُصولِ انتظار'' کے تحت کارروائی کرنے میں بڑے سلیقے اور ہنر کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمان یہ سب جانتے تھے۔ کافی انتظار کے بعد بھی جب دشمن کی طرف سے کوئی حملہ نہ ہوسکا تو مسلمان سمجھ گئے کہ بھان متی کے کنبہ کے پاس، حملہ کی کوئی خاطر خواہ تجویز نہیں ہے۔ اور حضرت صدیق اکبر ؓ سے اجازت لینے کے بعد مسلمان دستے مرتدین پر ٹوٹ پڑے۔ مرتدین کا کافی نقصان ہوا اور اُن میں بھگدڑ مچ گئی اور انہوں نے بے ترتیبی سے پسپائی اختیار کی۔

دشمن کا تعاقب

مسلمانوں کے پاس سواری کے جانور نہ تھے۔ اس لئے حضور پاک ﷺ سے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق وہ دشمن کا تعاقب نہ کر سکے اور دشمن کی پسپائی بھی کسی تجویز کے تحت نہ تھی۔ بہر حال مسلمانوں نے کچھ بار برداری والے اونٹ اکٹھے کئے اور کچھ دستوں کو ان پر سوار کر کے دوسرے دن دشمن کی خبر حاصل کرنے یا تعاقب کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے گھوڑے اور شتر، حضرت اسامہ ؓ کے لشکر کے ساتھ چلے گئے تھے۔ مسلمانوں کے یہ دستے جب ذوحسی کے قریب پہنچے، تو مرتدین نے اونٹوں کے پاؤں میں پانی کے کپے ڈال دیئے۔ یہ کپے رسیوں سے باندھے ہوئے تھے اور اچانک ان کو کھینچ کر اونٹ کے پاؤں پر پھینک دیا جاتا تھا۔ اونٹ لڑائی والے نہ تھے۔ وہ ڈر گئے اور ''شتر بے مہار'' ہو گئے اور اپنے سواروں کو لے کر مدینہ شریف پہنچ گئے اور وہاں بڑی مشکل کے ساتھ اُن کو روکا گیا۔ اس چال اور داؤ سے دشمن بہت خوش ہوا اور اس نے سمجھا کہ مسلمان دستوں کو شکست ہوگئی ہے، حالانکہ یہ دیکھ بھال یا تعاقب والے دستے تھے۔ مسلمانوں کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کو پتہ چل گیا کہ ان کی حرکت محدود ہوگئی تھی اور ان کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ وہ مدینہ شریف کا دفاع محدود، متحرک طریقے سے کریں، یعنی نزدیک سے کریں۔

مرتدین کی مدینہ شریف پر دوسری یلغار

مسلمانوں نے مدینہ شریف کا دفاع اب بہتر طریقہ سے اپنایا۔ وفادار قبائل سے کچھ اور کمک بھی پہنچ گئی تھی، جن میں حضرت عدی ؓ، ان کے ساتھی اور بنوتمیم کے حضرت قعقاع ؓ اور بنو اسد کے حضرت ضرار ؓ وغیرہ اسلام پر قائم تھے۔ اور آگے چل کر یہ لوگ اسلام کے عظیم مجاہدین کے طور پر ہماری تاریخ کے درخشندہ ستارے بن کر

چمکے۔ بہرحال اس امداد کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر ؓ نے مدینہ کا ایک بیرونی دفاع تیار کیا اور کچھ صحابہؓ عورتوں اور بچوں کو اندرونی دفاع یعنی خندق کے ذریعہ دیکھ بھال کرنے اور چوکنا رہنے پر مامور کیا۔ مدینہ کے بیرونی دفاع کے لئے خلیفہ اوّل خود درمیان میں تھے۔ مرتدین نے ذوحسی سے آگے بڑھ کر پھر مدینہ کی طرف پیش قدمی کی۔ اونٹوں کو بھگا دینے کے بعد وہ خوشی میں ذوحسی سے چل تو پڑے، لیکن مدینہ کے باہر آ کر رک گئے۔ مسلمانوں کا لشکر مدینہ کے باہر موجود تھا۔ رات کے اندھیرے میں خلیفہ اوّل نے صف آرائی کی۔ نعمان ؓ بن مقرن ؓ میمنہ پر، خلیفہ اوّل درمیان میں، عبداللہ بن مقرن ؓ میسرہ پر اور سوید ؓ بن مقرن ؓ عقب میں ریزرو تھے۔ یہ صف آرائی کچھ اس قسم کی تھی جس طرح آج کل بھی ہم رات کے حملہ کے لئے کرتے ہیں اور اس صف آرائی کے ساتھ مسلمانوں نے سحری کے وقت مرتدین پر شبخون مارا۔ دشمن جو یلغار کے لیے آیا تھا، خود یلغار کا شکار ہو گیا۔ اور مسلمانوں نے سوئے ہوئے دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا جب کچھ روشنی ہوئی تو دشمن کی لاشیں تھیں یا بے ترتیبی میں دشمن بھاگ رہا تھا۔

تبصرہ: یہاں پر دو نکتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ حضرت مقرن ؓ انصار تھے اور ان کا نام عبید ؓ تھا۔ جنگ بدر میں چار قیدیوں کو جوڑی جوڑی باندھنے کی وجہ سے مقرن ؓ کا نام پڑ گیا۔ آپ ؓ کے دس بیٹے تھے اور سب نے اسلام کی بڑی خدمت کی اور بڑے بڑے بلند مقامات پر پہنچے۔ ہماری اس کتاب میں اکثر اس عظیم باپ کے عظیم فرزندوں کے نام جگہ جگہ آئیں گے۔ اس لئے پہلے سے تعارف ضروری ہے۔ دوسرا پہلو رات کے حملہ کا ہے۔ دنیا کی عسکری تاریخ میں رات کے حملے کا ذکر کہیں مشکل سے ملتا ہے۔ مشہور جنگی ماہر کلاسوٹز رات کے حملہ کے بارے میں خاموش ہے۔ انگریز تو رات کے وقت دشمن کے علاقہ میں حرکت بھی نہ کرتے تھے۔ ہمارے موجودہ صوبہ سرحد کے علاقہ میں رات کو کسی دوسری پکٹ کو کمک تک نہ بھیجتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں پہلی دفعہ مچنی کے قلعہ سے آگے کسی پکٹ پر ایسی کارروائی پہلی دفعہ کی گئی اور انگریزوں کی اس خطہ کی عسکری تاریخ میں یہ یادگار دن ہے لیکن مسلمان ایسی کارروائی آج سے چودہ سو سال پہلے کر رہے تھے۔

دشمن کا تعاقب

اس دفعہ مسلمان تعاقب کرنے کے لئے بہتر حالت میں تھے۔ دشمن کا کافی نقصان ہوا تھا۔ وقت موزوں تھا۔ سارا دن اس کام پر صرف ہو سکتا تھا۔ صدیق اکبر ؓ نے تعاقب کرنے کے لئے خود دستوں کی کمان سنبھالی اور سارے راستے دشمن کو سنبھلنے نہ دیا۔ چنانچہ دوسرے دن مرتدین کو ذوقصہ میں جا لیا۔ وہاں پر وہ کوئی منظم مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کی صفوں میں ابتری آ چکی تھی اور مسلمانوں کی یلغار کی تاب نہ لا کر ذوقصہ سے بھی بھاگ گئے۔ حضرت طلحہ ؓ بن

عبیداللہ نے ان کا کئی میل تک تعاقب کیا۔ ذوقصہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو ایک دستہ کے ساتھ وہاں متعین کر دیا اور خود باقی لشکر کے ساتھ مدینہ شریف واپس آ گئے۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کی واپسی

اس واقعہ سے صرف دو دن بعد حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ تقریباً دو ماہ کے سفر اور حربی مظاہرے کے بعد اپنے لشکر کے ساتھ واپس آ گئے۔ یعنی جمادی الاوّل کے درمیان میں واپس آئے۔ قبیلہ قضاعہ کی سرکوبی اور ان کو تتر بتر کیا جا چکا تھا۔ اس کے بعد حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ تبوک، دومۃ الجندل موتہ اور وادیٔ بلقا میں دور دور تک گئے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے کوئی بڑی جنگ نہ لڑی۔ البتہ بنوکلب اور بنوغستان کے ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں۔ یہ قبائل جنگِ موتہ کے وقت مسلمانوں کو نقصان پہنچا چکے تھے۔ اس مہم میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے اُن کا کافی نقصان کیا۔ مالِ غنیمت بھی حاصل ہوا۔ اور مسلمانوں کا رُعب دور دور تک بیٹھ گیا۔ اور اس طرح شمال کی طرف سے مسلمانوں کے لئے خطرات کم ہو گئے اور جن جن قبائل کے علاقوں سے مسلمان لشکر گزرا وہ بھی اس حربی مظاہرے سے دب گئے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول بھی جائیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننا ہی بہت بڑی حکمت عملی ہوتی ہے اور صرف عقلی اور دنیاوی پیمانوں سے اس مہم کا تجزیہ کیا جائے تو اس مہم کو حکمت عملی کا ایک شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند نکتے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مدینہ شریف کسی بڑے خطرے سے دوچار نہ تھا۔ قبائل کے گروہ بھان متی کے کنبہ کی طرح تھے۔ وہ کوئی خاص فوجی کارروائی کرنے کے قابل نہ تھے۔ واقعات اس تجزیہ کے ثبوت میں جاتے ہیں۔

۲۔ اس قسم کے حربی مظاہرے سے غسانی اور دوسرے عیسائی قبائل پر مسلمانوں کا رُعب بیٹھ گیا۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سال، ڈیڑھ سال کے بعد جو شام و فلسطین کو فتح کرنے کی حکمت عملی بنائی اس کی بنیاد حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے رکھ دی تھی اور دوسرے مرحلہ میں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کی کارروائیاں اس سلسلہ کی کڑیاں تھیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ بہر حال حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ شمال کی طرف سے بے فکر ہو کر دیگر حکمت عملیوں کا تعین کرتے رہے۔

۳۔ نقشہ اول کا مطالعہ ظاہر کرے گا کہ مرتدین کا زیادہ زور مدینہ کے شمال یا وسطی عرب میں تھا۔ ویسے تو بغاوت، بحرین، اومان اور یمن کے متعدد علاقوں اور حضرموت وغیرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں جب حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے حربی مظاہرہ سے جو کامیابی ہوئی، تو اس سے نہ صرف وسطی عرب کی بغاوت ختم کرنے میں جلد کارروائی ہو سکی۔ بلکہ مشرق میں پیش قدمی کر کے یمامہ کو بھی شر سے پاک کر دیا گیا۔ اور

بے فکر ہو کر یمامہ کے محاذ سے آگے بڑھ کر مسلمانوں نے اسلام کے پرچم کو عرب کی سرحدوں سے باہر، پہلے عراق اور پھر ایران کی طرف پیش قدمی کر کے لہرا دیا۔

۴۔ خلفاءِ راشدین کی کتاب کے اس پہلے حصہ میں ہمارا موضوع بھی فتوحاتِ ایران و عراق ہے اور اسکے لئے جو حکمت عملی بنائی گئی اس کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ اور شام و فلسطین کی فتوحات کو حصہ دوم میں۔ اوّل حضرت اُسامہ ﷜ اور دوم خلیفۂ اوّل کی باقی حکمت عملی کے واقعات ملا کر پیش کریں گے۔ آگے ضروری مقامات پر اس بارے میں اشارے موجود ہوں گے۔ حضرت صدیق اکبر ﷜ کی ساری حکمتِ عملی کو سمجھنے کے لئے اُس زمانے کے بین الاقوامی حالات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ جناب صدیق اکبر ﷜ نے سب سے پہلے عراق کے محاذ کو کیوں چنا؟ اور اس میں کیا راز تھا؟ ان سب باتوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ا: اوّل عراق کے لوگ ایرانیوں کے محکوم تھے اس لئے وہاں پر مسلمانوں کی کامیابی کی جلدی اُمید تھی اور ایسے ہی ہوا۔

ب: دوم ایران کی بادشاہت میں کچھ کمزوریاں آ رہی تھیں، اُن سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ بلکہ وہاں پر حضور پاک ﷺ کے زمانے میں ایک عورت حکمران بن گئی اور ایک سے زیادہ عورتیں تخت پر براجمان ہو چکی تھیں۔ حضور پاک ﷺ فرما گئے تھے کہ جن ملکوں میں مردوں کی جگہ، حکومت عورتوں کے ہاتھوں میں چلی جائے، تو وہاں معاملات خراب صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

ج: سوم ایران کی بادشاہت کو ایشیاء میں وسعت تو کافی تھی لیکن روم کے مقابلہ میں جغرافیائی سیاسی یعنی جیو پولٹیکل حیثیت سے کچھ کم تر تھی۔

د: ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے حضرت صدیق اکبر ﷜ جو حضور پاک ﷺ کے ہمراز تھے، اُن کو ضرور معلوم ہوگا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے، چنانچہ اُن کی حکمت عملی میں عراق و ایران کی فتح کو ترجیح حاصل تھی۔ اس لئے حضرت اُسامہ ﷜ کی مہم، اصل کارروائی سے پہلے ایک ''انحرافی'' کارروائی کا مظاہرہ بھی تھی۔

ر: صحابہ کرامؓ کی شان کو ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کیا جانتے تھے یا کیا کچھ کر سکتے تھے، اس بارے میں یہ نکتہ یاد رکھیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی رفاقت اور نگاہ نے اُن کو وہاں پہنچا دیا تھا، جس کا تصور کرنا ہم گنہ گاروں کے بس کی بات نہیں۔

ذاتی مثال

حضرت اُسامہ ﷜ کے لشکر کے واپس مدینہ شریف پہنچ جانے پر حضرت صدیق اکبر ﷜ کو کافی اطمینان

حاصل ہو گیا تھا اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا اور ان کے لشکر کو آرام کی تاکید کی اور باقی جو لوگ مدینہ میں موجود تھے، ان میں سے ایک لشکر تیار کیا، سواری والے جانور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے لئے اور مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ مرتدین کے قلع قمع اور ان پر بھرپور وار کرنے کے لئے وہ خود اُس لشکر کی کمان کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس لشکر میں عظیم صحابہ کرام حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سب شامل ہوں گے۔ اور گو تاریخ دان اس سلسلہ میں لشکر کی تعداد اور فوج کے ناموروں کے ناموں کا ذکر نہیں کرتے۔ شاید ان میں سے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ گئے ہوں۔ لیکن حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو نائب بنانا اور پھر صرف ان کے ساتھیوں کو آرام کی تاکید کرنا، ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ مدینہ میں رہ گئے تھے، وہ اس لشکر میں ضرور شامل ہوں گے۔ بہرحال روایت ہے کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، کہ خلیفہ کی بجائے کسی اور صاحب کی سپہ سالاری میں یہ کام انجام پائے۔ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بسم اللہ اُن کو خود کرنا ہوگی۔ اس حکمت عملی میں یہ راز پنہاں تھا کہ آگے چل کر خلیفہ وقت پر کام کا زیادہ بوجھ پڑنے والا تھا اور مدینہ شریف کو ایک مستقر کے علاوہ اب ایک مرکز یعنی ایک BASE بھی بن جانا تھا۔ اور شائد اس کے بعد خلیفہ بنفس نفیس لشکر کی کمان نہ کر سکیں۔ باقی مسلمانوں کو بھی دن رات ایک کر کے جہاد میں مصروف ہو جانا تھا۔ اس لئے یہ ذاتی مثال ضروری تھی کیونکہ اسلام کی رُو سے ایک لیڈر کو نہ صرف وہی کرنا پڑتا ہے جو اُس کے ماتحت کو کرنا ہوتا ہے بلکہ اس کو چند قدم آگے بھی رہنا پڑتا ہے۔

اس سے پہلے جب لشکر اسلام نے مرتدین کو مدینہ شریف کے نزدیک شکست دی تھی تو اُس کے اثرات کے طور پر مدینہ شریف کے گردونواح میں تو کافی مرتدین واپس اسلام میں داخل ہو گئے تھے لیکن شمال میں ابرق تک کے علاقہ کو مرتدین سے جلد خالی کرانا ضروری تھا۔ تاکہ وفادار مسلمان یا تو آسانی سے مدینہ شریف میں آسکیں، یا جہاں کہیں وہ مرتدین کے اندر گھرے ہوئے تھے، ان کو وہاں سے نکالا جائے۔ گو پہلے ان تمام علاقوں پر صرف بنو ثعلبہ کا غلبہ تھا، لیکن بعد میں بنی ذبیان اور بنی عبس وغیرہ نے بھی ان علاقوں پر اپنا تسلط جمالیا۔

لشکر اسلام کی فتح

چنانچہ جمادی الثانی میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ پہلے ذوقصہ پہنچے، جہاں نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن پہلے سے موجود تھے۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ فاتح نہاوند بھی ہیں اور کتاب کے آخری حصہ میں تو ان کے ذکر سے ہمارا خون ضرور گرم ہو جائے گا، لیکن باقی جنگوں میں بھی آپ اکثر ہمارے ساتھ رہیں گے۔ جنگ اُحد میں آپ اُن تین

لڑکوں میں شامل تھے جن کو جنگ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ بہر حال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ذوقصہ پہنچ کر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ کے بھائیوں کو لشکر کی کمان کا وہی شرف عطا کیا، جو تینوں عظیم بھائیوں نے مرتدین پر سحری کے وقت حملہ میں حاصل کیا تھا۔ اور اس ترتیب سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ابرق پہنچ گئے، آگے مرتدین صف بندی کر کے جنگ کے لئے تیار تھے۔ مورخین نے لشکروں کی تعداد کی مکمل وضاحت نہیں کی، سوائے اس کے کہ مرتدین کو برتری حاصل تھی اور بہتر تدبیرات اور جذبۂ جہاد کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مرتدین کے سردار حارث اور عوف بھاگ گئے اور سمیرہ میں جا کر طلیحہ کے ساتھ مل گئے۔ حطیہ زندہ گرفتار ہوا۔ اور نزدیک کے قبائل نے توبہ کر لی۔ یہ لوگ نہ صرف واپس اسلام میں داخل ہو گئے اور زکوٰۃ ادا کر دی بلکہ اسلامی لشکر کی مہمانداری کی اور تحائف بھی پیش کئے۔ یہ ایک بہت بڑی فتح تھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وفادار مسلمانوں کو اس علاقہ میں اکٹھا کیا اور علاقہ کا بندوبست اُن کے سپرد کر دیا اور خود جلدی واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں پر صرف چند دن قیام کر کے حکومت کے دیگر معاملات سلجھائے (حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس پیش قدمی اور حربی مظاہرہ کو نقشہ دوم پر دکھایا گیا ہے۔)

اسلامی فوج کھلی فضاؤں میں

مدینہ شریف میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تمام مجاہدین کو اکٹھا کیا جن میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے مجاہد، اردگرد سے آئے ہوئے مجاہد اور دوسرے لشکر جن کا ذکر ہو چکا ہے ان کے مجاہد، سب کو شامل کیا اور جمادی الثانی ہی کے مہینہ میں ذوقصہ کا رُخ کیا۔ وہاں مجاہدین کی کھلی فضاؤں میں تنظیم کی، ان کو ترتیب دی اور آنے والے زمانے کے لیے اپنی حکمت عملی کی چیدہ چیدہ باتوں سے مجاہدین کو آگاہ کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا، اُن پر امیر مقرر فرمائے اور انہیں نشان اور عَلَم عطا فرمائے اور اُن کے امیروں کو آئندہ کے لئے ذمہ داری سونپی۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ گیارہ کے گیارہ لشکر اسی ایک دن تیار ہو گئے، لیکن بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ لشکر کسی حد تک مکمل تھے، کچھ آدھے تھے اور کچھ کے ڈھانچے تھے، کہ بعد میں نفری پوری کر دی جائے گی۔ احکام زبانی تھے لیکن اس طرح تھے جس طرح آج کل ہم جنرل ہیڈ کوارٹر سے کوئی احکام یا آپریشنل آرڈر جاری کرتے ہیں۔ ایسے احکام کو مدینہ شریف سے جاری کرنے کی بجائے آپ رضی اللہ عنہ نے ذوقصہ کی فضاؤں کو منتخب کیا کہ ''نیلے تمبو'' کے نیچے رہ کر معاملات کی جو سوجھ بوجھ حاصل ہوتی ہے وہ ائرکنڈیشنڈ کمروں میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس فوج کو سرگرم عمل رہنے کا سبق دے رہے تھے، جس کی بنیاد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم رکھ گئے تھے۔ اور اب ان لوگوں نے دنیا فتح کرنی تھی اور اس کے لیے بیابان اور کھلی فضاؤں کی تربیت زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و سلمانیؓ (اقبالؔ)

لشکر اور ذمّہ داریاں

لشکروں کو جو ذمّہ داریاں سونپی گئیں ان کو نقشہ اوّل اور دوم سے بھی سمجھا جا سکتا ہے لیکن تمام تر لشکروں کی ذمّہ داریوں کو کسی ایک نقشے پر واضح کرنا مشکل تھا۔ پھر یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ ذمہ داری اور کارروائی کے لئے الگ الگ نقشے بنائے جائیں۔ ذمہ داریوں میں تبدیلیاں بھی ہوئیں چنانچہ نقشہ سوم میں پہلے پانچ لشکروں کی کارروائی دکھائی گئی ہے اور نقشہ چہارم سے اگلے پانچ کی۔ گیارہواں لشکر ریزرو ہی رہا۔ لشکروں کو ہدایات مکمل طور پر دی گئیں جن کی تفصیل بعد میں ہر لشکر کے ذکر کے ساتھ آئے گی۔ بلکہ خلیفہ وقت نے اپنی تجاویز اور نتائج کو جسے ہم FORCAST OF OPS کہتے ہیں وہ بھی بتا دیئے اور پھر اپنی پوری کارروائی کو واضح کیا۔ اوقات مقرر فرمائے اور جنگی حکمت عملی کو واضح طور پر بیان کیا۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ لشکروں کی ذمہ داریوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ باقی پہلو آگے خود عیاں ہو جائیں گے۔ مختصر ذمہ داریاں حسب ذیل تھیں:۔

۱۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید:۔ اوّل بزوخا میں طلیحہ کا قلع قمع پھر بطحا میں مالک بن نویرہ کا خاتمہ اس کے بعد اگلے احکام کے لیے تیار رہنا۔ جو دراصل مسیلمہ کذاب کی سرکوبی تھی۔

۲۔ حضرت عکرمہ بن ابوجہل:۔ یمامہ کے نواح میں پہنچ کر مسیلمہ کذاب پر نظر رکھنا لیکن جب تک زیادہ فوج اکٹھی نہ ہو جائے اور مدینہ شریف سے احکام نہ ملیں تو کسی بڑی لڑائی سے گریز کرنا۔ ظاہر ہے خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ، خالد رضی اللہ عنہ کی فتوحات کے منتظر تھے اور یہ کٹھن کام خالد رضی اللہ عنہ اور بڑی قوت سے کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا کام مسیلمہ کذاب کو ''محدود'' کرنا تھا تاکہ وہ کسی اور کی مدد نہ کر سکے اور نہ کسی سے مدد لے سکے۔

۳۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے ریزرو کا کام کریں اور خلیفہ کے احکام کا انتظار کریں۔ دراصل یہ لشکر بھی، بعد میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کا حصہ ہو گیا، تینوں لشکروں نے مل کر مسیلمہ کذاب کے خلاف کاروائی کرنا تھی کہ وہ بڑا خطرناک دشمن تھا۔

۴۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص:۔ پہلے بنوقضاعہ کے علاقے میں جا کر حربی مظاہرے کریں کہ وہ لوگ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر تتر بتر ہو گئے تھے اور ان کی واپسی کے بعد پھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس کے بعد قضاعہ کے [illegible]

۵۔ حضرت خالد ؓ بن سعید:۔ شام و فلسطین کی سرحدوں کے ساتھ کے علاقہ کے قبائل کی سرکوبی اور وہاں مظاہرے (چوتھے اور پانچویں لشکر نے دراصل اہل روم پر نظر رکھنا تھی) اس حکمت عملی کا پہلا مرحلہ حضرت اُسامہ ؓ کا لشکر تھا۔ یہ کارروائی کا دوسرا مرحلہ تھا، اور تیسرا مرحلہ دوسری کتاب میں بیان کیا جائے گا۔

۶۔ حضرت طریفہ ؓ بن حاجز:۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ شریف کے درمیان کے علاقوں میں بنوسلیم اور بنوہوازن کے مرتدین کا مزاج درست کرنا۔

۷۔ حضرت حذیفہ ؓ بن محصن:۔ علاقہ اومان یا عمان کے باغی قبائل کی سرکوبی کرنا۔

۸۔ حضرت عرفجہ ؓ بن ہرثمہ:۔ علاقہ مہرہ میں باغیوں کی سرکوبی (نمبر شمار ۷ اور ۸ کے علاقے ساتھ ساتھ تھے۔ حکم دیا گیا کہ اکٹھا ہو جانے کی صورت میں جس کا علاقہ ہوگا، وہی سپہ سالار اعظم بن جائے گا۔)

۹۔ حضرت مہاجر ؓ بن اُمیہ:۔ آپ ؓ کو یمن اور خاص کر کندہ اور حضرموت کے علاقے میں مامور کیا گیا۔ دراصل آپ بھی نمبر شمار ۷ اور ۸ کے نزدیک تھے اور یہ لشکر بعد میں اکٹھے بھی ہو گئے۔

۱۰۔ حضرت علاء ؓ بن الحضرمی:۔ آپ ؓ کو آپ کے پرانے علاقے بحرین میں ہی مامور فرمایا۔

۱۱۔ حضرت سوید ؓ بن مقرن ؓ:۔ آپ ؓ یمن اور مکہ مکرمہ کے راستوں والے علاقہ کے ذمہ دار تھے، لیکن آپ کو زیادہ تر ریزرو ہی رہنا پڑا۔

خلیفۂ اوّل کی حکمت عملی کا جائزہ

خلیفۂ اوّل نے لشکروں کو جو ذمہ داریاں سونپیں، ان میں سے صرف نمبر شمار ۴ اور ۵ میں حضرت عمرو ؓ بن عاص اور حضرت خالد بن سعید کا رُخ، شام و فلسطین کی طرف تھا۔ باقی تمام لشکروں کا رُخ یا کام ایسا تھا کہ اپنی کارروائی کو ختم کرنے کے بعد، وہ آسانی کے ساتھ کاظمہ کی طرف سے نچلے عراق پر یلغار کر سکتے تھے۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ جناب صدیق اکبر ؓ دومۃ الجندل کے راستے عراق پر اوپر یعنی شمال سے بھی حملہ کرنا چاہتے تھے اور اس کا آگے بھی ذکر آئے گا۔ لیکن ایسی مہم کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے مرحلہ میں مسلمان دریائے فرات کو پار نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان کا مقصود حیرہ تھا۔ آگے چل کر اس پہلو کی کھل کر وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن اس کے لئے بہترین طریقہ وہی تھا جو خلیفہ اوّل نے اختیار کیا۔ اسی دوران حضرت صدیق اکبر ؓ مدینہ شریف میں کئی اور مجاہدین کو تربیت دے رہے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ بن جراح اور یزید ؓ بن ابی سفیان ؓ کے ماتحت فتوحاتِ شام کی بھی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جن کا ذکر دوسری کتاب میں ہوگا۔ اس حکمت عملی کا انحصار اس پر تھا۔ کہ عرق میں حیرہ تک کے

علاقوں پر قبضہ کرنے میں کتنی کامیابی اور کب تک یہ کامیابی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد شام وفلسطین کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔ آگے چل کر حیرہ کی فتوحات کے بعد دونوں محاذوں کی حکمت عملیوں کے تانے بانے ملا کر تمام حالات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے کہ مسلمانوں نے اس طرح آسانی کے ساتھ دنیا کو فتح نہ کر لیا تھا۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے موڑخین میں سے اکثر نے اور خاص کر بعد کے زمانے کے مورخین نے تمام تر جنگی کارروائیوں کو الف لیلیٰ کی کہانیوں کے طور پر پیش کیا، زیادہ تر میمنہ، میسرہ، جیش المقدم اور عقب کا ذکر اس طرح کیا کہ تدبیرات ساری کی ساری پوری ہو گئیں، اور اہل قلم بھی ''سرخرو'' ہو گئے۔ حقیقت بڑی گہری ہوتی ہے اس کو کھودنا پڑتا ہے۔ اور شائد ہم اس کو کرید بھی نہ سکیں۔ یاد رکھیں کہ مسلمان بامقصد جنگ لڑتے تھے۔ لوگوں کو غاصبوں کی غلامی سے چھٹکارا دلا کر اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرتے ہیں، ملک نہیں فتح کرتے، لوگوں کے دلوں کو فتح کرتے ہیں، غیروں نے ہماری جنگوں کو اپنے تعصب کی وجہ سے قہر وجبر کی جنگوں کا نام دے دیا۔ یہ بہت بڑی سازش ہے، حقیقت کچھ اور ہے:

یہ جبر وقہر نہیں، یہ عشق و مستی ہے　　　　کہ جبر وقہر سے ممکن نہیں جہانبانی

(اقبالؔ)

مرتد قبائل کے نام خط

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکروں کو ان میں سے ہر ایک مقصود کی طرف روانہ کرنے سے پہلے تمام مرتد قبائل کو ایک ہی مضمون کے خط لکھے۔ ان خطوط میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی حمد اور حضور نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنے کے بعد، اسلام کے عقائد اور فلسفۂ حیات بیان فرمایا اور تفصیل کے ساتھ وضاحت کی کہ دین اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور یاد دلایا کہ اب ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا ہوگا۔ کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ اور اولوالامر کے طور پر ان پر فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام نہ صرف جاری وساری کریں، بلکہ ان پر عمل بھی کرائیں، وغیرہ۔ آگے لکھا کہ ''ان کو معلوم ہوا ہے کہ کافی لوگ اسلام لائے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد اس سے مرتد ہو گئے ہیں۔ اُن کو یہ جسارت اس لئے ہوئی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے متعلق غلط اندازہ قائم کیا اور اس کے طریق کار سے وہ واقف نہیں۔ ظاہر ہے کہ شیطان نے ان کو ورغلایا۔'' اس کے بعد خلیفۃ الرسول نے متعدد قرآنی آیات کے حوالے سے مرتدین کو توبہ کرا کے اسلام میں واپس آنے کی ہدایات فرمائیں۔ اور لکھا کہ ''اگر ایسا نہ ہوا تو جنگ کے ذریعہ ان کو راہِ راست پر لایا جائے گا۔''

تبصرہ:

یہاں پر یہ واضح کرنا از حد ضروری ہے کہ اسلام کی رُو سے حاکم وقت پر فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام پر عمل پیرا کرانے کے لئے ہر قسم کی طاقت اور تدبیر کا استعمال کرے۔ غیروں کے فلسفے سے متاثر ہو کر ہم نے جو انفرادی آزادی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اور مذہب ذاتی معاملہ بنتا جا رہا ہے یہ ایک بہت بڑی سازش ہے۔

لشکر کے امیروں کے نام خطوط

اسلام میں جنگ لڑنے کا ایک واضح مقصد ہے اور مرتدین کو جو خط لکھے گئے وہ بھی اس بامقصد جنگ کی وضاحت کے طور پر تھے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ کرنے کے لئے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر اپنے گھروں سے باہر نکلے تھے۔ یہی اسلام کا فلسفہ ہے اور نظریۂ حیات ہے۔ جنگ کسی مادی غرض یا سیاسی ضرورت یا دشمنانہ حرکت کے لئے نہیں لڑی جاتی۔ تمام مغربی مورخین، مبصرین اور ماہرین کی کتابوں کو کھنگال ڈالیں، ان جائزوں اور تبصروں کو پڑھیں، عسکری تاریخوں کا مطالعہ کریں۔ وہ لوگ جنگ کے مقاصد کو واضح نہیں کر سکے اور نہ ہی جنگ کے نتائج کو۔ یہ صرف دین فطرت کا خاصہ ہے کہ جنگ کے مقاصد واضح ہیں۔ چنانچہ ہر سالارِ لشکر کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہدایات لکھ کر بھیجیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ''وہ اللہ سے ڈرتے رہیں جہاں جائیں قبائل کو اسلام میں واپس آنے کی دعوت دیں۔ اگر وہ اسلام میں واپس آجائیں تو اُن کو کچھ نہ کہا جائے۔ اگر اسلام میں واپس نہ آئیں تو ان سے جنگ کریں اور تب تک سرکوبی کرتے رہیں، جب تک وہ اسلام میں واپس نہیں آجاتے۔ اور جب وہ اسلام میں واپس آجائیں تو انہیں، ان فرائض سے آگاہ کیا جائے جو ایک مسلمان کو پورا کرنا ہوتے ہیں۔ اور ان پر عمل کرایا جائے۔'' اس سلسلہ میں خلیفہ وقت نے متعدد تفصیلی ہدایات بھی جاری کیں، جن میں ہر پہلو پر عمل کرنے کے طریق کار کی وضاحت کی تھی۔ ہم اس تفصیل میں اس لئے نہیں جانا چاہتے کہ آگے چل کر ان ہدایات پر عمل ہی ہماری کتاب کا مضمون ہے۔ اور انہی عملی کارروائیوں کے نتائج و اسباق کو ہر باب میں خلاصہ کے طور پر بھی شامل کیا گیا ہے۔

خالد رضی اللہ عنہ بن ولید (اللہ کی تلوار نیام سے باہر آگئی)

خلیفہ اوّل نے دشمنوں پر فتوحات حاصل کرنے کے بعد لشکر اسلام کو اللہ کی زمین پر ہر طرف پھیلا دیا۔ انہوں نے از خود بسم اللہ کی اور دشمن پر سخت چوٹ کرنے کے بعد اب اللہ کی تلوار کو بھی نیام سے باہر نکال لیا۔ خالد رضی اللہ عنہ کو جو کام سونپا گیا اس کی وضاحت نقشہ سوم پر ہے۔ لیکن پہلے دو مرحلوں کی کارروائی کو نقشہ دوم پر زیادہ وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے طلیحہ کا قلع قمع کرنا تھا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن خلیفہ وقت نے ہدایات دیں کہ طلیحہ کے خلاف کارروائی سے پہلے قبیلہ طے کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا۔ قبیلہ طے کے حضرت عدی رضی اللہ عنہ

بن حاتم جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے وہ اپنے چند وفادار ساتھیوں سمیت لشکرِ اسلام میں شامل ہو گئے تھے۔

طلیحہ کی بغاوت

طلیحہ کا تعلق بنو اسد کے ساتھ تھا۔ حضرت ابو سلمہ مخزومی رضی اللہ عنہ، حضرت ام المومنین امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے ماتحت، حضور پاک ﷺ نے اپنے زمانے میں جن قبائل کی سرکوبی کے لئے ایک مہم بھیجی ان میں بنو اسد بھی شامل تھے۔ جنگ خندق کے وقت جن گروہوں نے مدینہ شریف پر حملہ کیا ان میں بھی بنو اسد[1] شامل تھے اور یہی طلیحہ اُن کا سالار تھا۔ دو سال بعد یہ سارا قبیلہ[2] اسلام میں داخل ہو گیا۔ گو یہ لوگ اس غلط فہمی میں تھے کہ وہ اسلام پر کوئی احسان کر رہے ہیں اور قرآن پاک میں جو ذکر ہے کہ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ) آپ فرما دیجئے کہ اپنے اسلام کا احسان مت جتاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ اس نے تمہیں ایمان عطا فرمایا۔'' تو اس سلسلہ میں مفسرین کے لحاظ سے یہ آیت اِسی قبیلہ کی اس غلط فہمی کے متعلق ہے۔ حضور پاک ﷺ نے البتہ اس قبیلہ کے ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور[3] کو ان پر عامل مقرر فرما دیا۔ یہ بات شاید طلیحہ کو پسند نہ تھی۔ اور حضور پاک ﷺ کی بیماری کے زمانے ہی میں اس نے بغاوت کر دی تھی اور ضرار کو اپنے علاقہ سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد باغی قبائل کی مدد کے لئے طلیحہ نے کس طرح اپنے بھائی حبال کو بھیجا، اس کا ذکر ہو چکا ہے اور قبائل کو جب مدینہ شریف کے گرد و نواح میں شکست ہوئی تو طلیحہ بھی سمیرہ کے مقام پر چلا گیا۔

اسی دوران طلیحہ کو کچھ اور قبائل کی امداد ملنے کی اُمید لگ گئی۔ خاص کر بنو غطفان کے چھوٹے قبیلہ بنو فزارہ کی، جن کا سردار عینیہ[4] بن حصن سات سو جوانوں کے ساتھ طلیحہ کی امداد کو پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ طے اور قبیلہ جدیلہ کی امداد بھی مل چکی تھی۔ اس لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ذوقصہ سے روانہ ہونے سے پہلے، طلیحہ بزوخا کے مقام کی طرف کوچ کر چکا تھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بزوخا کے لئے ابرق کے راستے پیش قدمی شروع کر دی۔ لیکن ابھی وہ بزوخا سے چند منزلیں دور تھے تو انہوں نے بائیں طرف رُخ کر دیا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خیبر کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن دراصل خلیفۂ وقت کی ہدایات کے مطابق وہ ''اُجا'' یا ''اُوجا'' پہاڑ کے علاقے میں پہلے قبیلہ طے کے ساتھ معاملات کرنا

(۱) ان واقعات کی تفصیل کے لیے جلالِ مصطفےٰ کے صفحہ ۱۱۷، ۱۳۲، ۱۳۳ اور ۳۱۴ سے استفادہ کریں۔

(۲) جلالِ مصطفےٰ، صفحہ ۲۶۲

(۳) حضرت ضرار رضی اللہ عنہ اسلام پر قائم رہے۔ آگے اس کتاب میں بھی اور دوسری کتاب میں بھی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ اکثر ہمارے ساتھ رہیں گے اور ان کے کارنامے پڑھ کر خون گرم ہو جاتا ہے۔

(۴) جلالِ مصطفےٰ صفحہ

چاہتے تھے۔نقشہِ دوم کے مطالعہ سے یہ معاملات اور کھل کر سامنے آجائیں گے۔حضرت عدی ؓ بھی حضرت خالد ؓ کے ساتھ تھے اورانہوں نے حضرت خالد ؓ کی اجازت سے اپنے قبیلہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔حضرت خالد ؓ بہت زیادہ مہلت دینے پر تیار نہ تھے اور حضرت عدی ؓ کو بھی پہلے رابطہ کے طور پر کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی،وجہ یہ تھی، اور جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے،قبیلہ طے کے کچھ لوگ طلیحہ کے لشکر میں شامل ہو چکے تھے،اور قبیلہ والے ان لوگوں کو وہاں سے نکالنا چاہتے تھے۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں رحمت کی،گو قبیلہ طے والے اپنے سارے قبیلہ والے لوگوں کو طلیحہ کے لشکر سے ایک ساتھ تو الگ نہ کر سکے،لیکن ان کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا۔اوران لوگوں نے بزوخا کی جنگ میں طلیحہ کی کوئی مدد نہ کی۔اور جن لوگوں کے ساتھ حضرت عدی ؓ کا براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا،وہ اسلام میں واپس آ گئے اور پانچ سو سوار لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔یہی نہیں،بلکہ حضرت عدی ؓ کی کوشش سے ان کا حلیف قبیلہ جدیلہ بھی اسلام کی آغوش میں واپس آ گیا،اورایک ہزار مجاہد اس قبیلہ سے بھی لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔حضرت خالد ؓ کے لشکر کی تعداد کوئی چار ہزار کے قریب تھی۔اب یہ تعداد بڑھ گئی۔یہ سب کچھ خلیفہِ وقت کی ہدایات اور حکمت عملی کے تحت ہوا۔

تبصرہ:

مسلمان بے مقصد جنگ نہیں لڑتے۔وہ تو باطل کو مٹا کر حق لاتے ہیں۔اور جو کوئی اس کارِ خیر میں ان کا ساتھ دے،وہ اسلامی معاشرے میں شامل ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام میں فتح کا اختتامی مقام یہ ہوتا ہے کہ فاتح اور مفتوح کے دلوں کو جوڑ دیا جائے۔اور ایک خاندان بنایا جائے۔اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری وساری کر دیا جائے۔اگر مفتوح اسلام کی برادری میں شرکت نہیں کرتا تو پھر بھی اسلام کی رُو سے مسلمان اپنے باجگزاروں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔دین کے معاملات میں کوئی جبر نہیں اور زبردستی کلمہ پڑھانے کا کوئی حکم نہیں۔اب دوسری طرف تمام مغربی مبصرین کی کتابیں پڑھ لیں۔وہ فتح کے اختتامی مقام پر آکر رُک جاتے ہیں اور کلاسوٹز جیسا ماہر اور کافی حد تک غیر جانبدار مبصر بھی اپنی ساتویں کتاب کے آخری باب میں اس مضمون کو کسی نکتہ پر نہ پہنچا سکا۔کہتا ہے کہ جنگ سے جنگ نکلتی ہے اور شکست سے فتح۔اور فتح کا کوئی اختتامی مقام نہیں ہے۔لیکن دینِ فطرت میں جنگ بامقصد ہوتی ہے۔اس لئے اس میں اختتامی مقام بھی ہوتا ہے کہ مسلمان غارتگری نہیں کرتے بلکہ دلوں کو فتح کرتے ہیں۔

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است　　　جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است　　　(اقبالؔ)

بزوخا کی جنگ

چنانچہ جمادی الآخر ۱۱ ہجری کے آخری ایام میں اللہ کی تلوار،اب ایک دشمن اسلام کی طرف روانہ ہوگئی۔خلیفہِ

وقت کی ہدایات پر عمل ہو چکا تھا اور اب کارروائی دوسرے مرحلہ میں داخل ہونے والی تھی۔ بزوخا سے ایک منزل کے فاصلے پر پہنچنے کے بعد حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ بن محصن اور ثابت رضی اللہ عنہ بن اقرم کو مخبری کے لئے آگے اسکاؤٹ کے طور پر بھیجا گیا۔ دونوں عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے تھے۔ طلیحہ کو بھی مسلمانوں کی پیش قدمی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اس نے اپنے بھائی حبال کو ایک ساتھی کے ساتھ مخبری کے لئے آگے بھیجا۔ آپس میں ٹکراؤ ہوا۔ حبال تو واصل جہنم ہوا لیکن اس کا ساتھی بھاگ گیا اور طلیحہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ طلیحہ اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لئے آگے بڑھا۔ ساتھ ہی اس کا دوسرا بھائی سلمہ بھی تھا۔ دستہ پیچھے رہا اور یہ دونوں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ اور دونوں عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم پر اچانک وار کر کے اُن کو شہید کر دیا۔ دراصل حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ تلوار زنی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ لیکن داؤ اور گھات میں آ گئے اور پھر دشمن کا سارا دستہ اُن پر حملہ آور ہو گیا۔ جناب عکاشہ رضی اللہ عنہ پہلے یمن میں تھے اور اصحاب بدر میں سے تھے۔

طلیحہ اس کارروائی کے بعد جلد اپنے لشکر میں پہنچ گیا اور مسلمانوں کی پیش قدمی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے لشکر کو صف بند اور منظم کیا۔ لشکر کی کمان عیینہ بن حصن کے سپرد کی اور ایک خیمہ میں بیٹھ گیا، کہنے لگا کہ وہاں پر وہ جبرائیل فرشتہ سے ہدایات حاصل کرے گا اور ادھر ہی سے احکام جاری کرے گا۔ مسلمانوں نے پیش قدمی کے دوران اپنے دو عظیم ساتھیوں کے جسد خاکی دیکھے تو اُن کے جذبات سخت مجروح ہوئے، وہ مرنے مارنے پر تو پہلے سے تیار تھے، اب اُن کے جذبات میں زیادہ شدت آ گئی۔

میدانِ جنگ

بزوخا ویسے تو چٹیل میدان ہے لیکن نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُجا پہاڑ کا جنوب مشرقی حصہ بزوخا تک پھیلا ہوا ہے۔ اور وہاں کچھ ٹیلے اور ٹیکریاں بھی ہیں۔ لیکن مورخین نے جنگ کے واقعات کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑائی کھلے میدان میں ہوئی اور ٹیلوں کا استعمال نہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد تقریباً چھ ہزار تھی۔ دشمن کی تعداد کے بارے میں مورخین خاموش ہیں کہ کتنی تھی، لیکن دشمن میں یک جہتی نہ تھی۔ بنو طے اور جدیلہ کے جو لوگ وہاں تھے وہ دل سے طلیحہ کے ساتھ نہ تھے۔ بنو عامر کا قبیلہ بھی جنگ سے کترا رہا تھا۔ بنو اسد کے کئی لوگ مثلاً ضرار رضی اللہ عنہ، قضاعی رضی اللہ عنہ اور سنان رضی اللہ عنہ وغیرہ مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے۔ سارا دارومدار طلیحہ کے اپنے قرابت داروں اور عیینہ بن حصن کے قبیلہ فزارہ پر تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ لشکر کی کمان خود فرما رہے تھے۔ اور دراصل خود مختار کمانڈر کی حیثیت سے ان کی یہ پہلی بڑی جنگ تھی۔ جنگ موتہ میں آپ کے چوتھے مرحلہ میں کمان ملی۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چھوٹے دستوں کی کمان ضرور کی۔ لیکن کسی بڑے لشکر کی علیحدہ کمان نہ کی اور اب تک جو جھڑپیں یا لڑائیاں خلیفہ اوّل کے زمانے میں ہوئیں وہاں بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کسی چھوٹی موٹی کمان کے سلسلہ میں بھی مورخین خاموش

ہیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ خود صفوں سے آگے تھے۔ مسلمانوں کی پہلی یورش سے مرتدین کے دانت کھٹے ہو گئے۔ عینیہ اور اس کا قبیلہ بڑی بہادری سے لڑے، لیکن مسلمانوں کی ایک دو یورشوں اور یلغاروں کے بعد اُن کی صفوں میں شگاف پڑنا شروع ہو گئے۔ عینیہ بہادر آدمی تھا اور ایک دفعہ اسلام بھی لے آیا تھا۔ لیکن بڑا متعصب انسان تھا۔ بنواسد اس کے قبیلہ کے حلیف تھے۔ اس لئے اس کا خیال تھا کہ حلیف قبیلہ کا "پیغمبر" قریش کے پیغمبر کی نسبت اس کو زیادہ قابل قبول تھا (نعوذ باللہ) اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ قریش کا پیغمبر ﷺ اللہ کا حبیب ﷺ ہے، سرکار دو عالم ﷺ ہے، رحمۃ اللعالمین ﷺ ہے۔ اور ایسی صفات کا مالک جس کی تعریف قلم سے بیان ہی نہیں کی جا سکتی۔ طلیحہ ایک کاہن تھا۔ نفسیات کا ماہر تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، بڑا اچھا ایکٹر تھا، اس لئے وقتی طور پر عینیہ کو متاثر کیا تھا۔ اب جو عینیہ کو جنگ میں مایوسی ہوئی تھی تو وہ بھاگ بھاگ کر طلیحہ کے پاس پہنچتا تھا اور یہ پوچھتا کہ جبرائیل کیا خبر لائے۔ طلیحہ اوٹ پٹانگ اور انگل پچو جواب دیتا رہا۔ اور آخر عینیہ تنگ آ کر اعلان کرنے ہی والا تھا کہ طلیحہ جھوٹا ہے اور میدان جنگ سے بھاگ جاؤ کہ طلیحہ نے "پہل کاری" چھین لی اور اپنی بیوی کے ساتھ تیز اونٹنی پر بیٹھ کر خود ہی فرار ہو گیا۔

مرتدین کی شکست

طلیحہ اور عینیہ دونوں بہادر آدمی تھے اور جنگ کے نبض شناس بھی تھے۔ طلیحہ نے بعد میں اسلام کی خدمت بھی کی اور عینیہ بھی اسلام لے آیا۔ اس میدانِ جنگ سے اُن کے بھاگنے کو بزدلی پر محمول نہ کیا جائے۔ حالات ان کے قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ ان کا باطل فلسفہ اور طریق کار جواب دے گیا تھا۔ چنانچہ بزوخا کی جنگ ایک دن کا کچھ حصہ ہی جاری رہ سکی کہ مرتدین نے تتر بتر ہونا شروع کر دیا۔ اور کچھ میدانِ جنگ میں کھیت رہے۔ اسی طرح سب قبائل افراتفری میں بھاگے۔ ان کے نزدیک نہ کوئی جنگ کا مقصد تھا اور نہ شکست کے بعد کوئی تجویز تھی کہ اگلا مرحلہ کیا ہوگا۔ بھان متی کے کنبہ کا اتحاد کسی بنیاد پر نہ تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ حسد اور منفی بنیادوں پر یہ اتحاد قائم تھا۔ چنانچہ حق کی ایک ہی وار نے باطل کو پاش پاش کر دیا۔

جنگ کے نتائج

یہ جنگ تو بزوخا کے میدان میں ختم ہو گئی لیکن حضور پاک ﷺ سے سیکھے ہوئے طریقہ اور خلیفہ اول کی حکمت عملی کے تحت فتح کو آگے بڑھانا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے ہر سمت میں مرتدین کا تعاقب کیا۔ طلیحہ تو بھاگ کر نقع میں بنوکلب کے پاس جا کر ٹھہر گیا اور جب سنا کہ اس کا سارا قبیلہ اسلام لے آیا ہے تو وہ بھی دوبارہ اسلام میں داخل ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد مدینہ شریف سے گزر کر مکہ مکرمہ میں جا کر عمرہ بھی ادا کیا۔ خلیفہ اوّل نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے پر اُن کی بیعت کے لئے حاضر ہوا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں جو کچھ تھا وہ کہہ دیا کہ "اے طلیحہ تمہارے ہاتھ سے دو عظیم صحابہ حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس لئے میں تمہیں دل سے پسند نہیں کرتا۔" طلیحہ نے عرض کی: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا کہ ان کو شہادت کا رُتبہ مجھ جیسے گنہ گاروں کے ہاتھوں سے ملنا تھا۔ اِس گفتگو کو اس زمانے کے ایک مبصر نے مورّخین کے حوالے سے لفاظی کو جو رنگ دیا ہے اور درمیان میں خود اپنی رائے بھی دی ہے، وہ سب اضافے معلوم ہوتے ہیں۔ طلیحہ رضی اللہ عنہ بہادر آدمی تھا۔ نہاوند کی جنگ میں شہید ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُس کے سب گناہ معاف فرما دیئے ہوں گے جس دن وہ اسلام کی آغوش میں دوبارہ داخل ہوا ہوگا اور متعدد جنگوں میں ایک مانے ہوئے مجاہد کی طرح کام کرتا رہا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے البتہ عینیہ کا تعاقب کیا جسے بمیرہ کے نزدیک غمرہ کے مقام پر جالیا۔ عینیہ نے مقابلہ کیا لیکن آخر گرفتار ہوا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عینیہ کو ایک اور مرتد قرۃ بن ہمیرہ کے ساتھ خلیفہ وقت کی خدمت میں مدینہ شریف بھیج دیا۔ خلیفہ نے اُن کو اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ دونوں اسلام میں واپس آنے پر تیار ہو جائیں۔ دونوں نے اسلام میں واپس آنے کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد اپنے قبیلہ میں خاموشی اور گوشہ نشینی سے دن گزارے۔ عینیہ کا اسلام البتہ اپنی مرضی کا تھا۔ اور ماہِ رمضان میں دن کی بجائے رات کو روزہ رکھتا تھا۔ آدمی بہادر تھا لیکن بہت آزاد منش طبیعت کا تھا۔ اس لئے کسی ایک بات پر قائم نہ رہتا تھا۔ اور ایسے لوگ کسی بھی زمانے میں اسلام کے لئے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کر سکتے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مکمل اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عینیہ کی ایک بیٹی البتہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آگئی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ظفر کی طرف پیش قدمی

یہاں پر مورخین میں اختلاف ہے کہ غمرہ کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ واپس نقرہ گئے یا بزوخا یا ظفر کے مقام کی طرف جا کر اُم سلمٰی کی سرکوبی کی۔ نقشے اور فاصلہ کے لحاظ سے تو یہ بہتر نظر آتا ہے کہ غمرہ سے بڑھ کر پہلے ام سلمٰی کے خلاف کارروائی ختم کر کے پھر نقرہ میں جا کر ابوشجرہ کا مزاج درست کرتے اس لئے نقرہ میں ابوشجرہ کے خلاف کارروائی کا ذکر بعد میں ہوگا۔ اُم سلمٰی جس کو ام زمل بھی کہتے ہیں، عینیہ بن حصن کی قریبی رشتہ دار تھی اور اُم قرفہ(1) کی بیٹی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھی اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لڑکی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خدمت کے لئے دے دی تھی۔ بدقسمت لڑکی وہاں خوش نہ تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو آزاد کر دیا تھا۔ اپنے قبیلہ میں جا کر اس نے بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ اور خاص کر عینیہ کی گرفتاری کے بعد اپنے قبیلہ اور

(1) تفصیل کے لئے جلالِ مصطفٰے کا صفحہ ۳۲۱ اور ۳۲۲ دیکھئے۔

نزدیک کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا اور ظفر کے مقام پر ایک لشکر اکٹھا کرلیا۔ اللہ کی تلوار نے پیش قدمی کر کے ایک ہی جھپٹ میں دشمن کا صفایا کر دیا۔ یہ قبائل بڑی بہادری سے لڑے۔ خاص کر جس اونٹ پر اُم سلمٰی سوار تھی، اس کے گرد لوگ اپنی جان پر کھیل گئے۔ لیکن مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کیونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے چند زور آور مجاہدین کے ساتھ آگے بڑھ کر اُم سلمٰی کے اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں اور اس کا ہودہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ تدبیرات کے اصولوں میں مرکز کو تباہ کرنے سے لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اُم سلمٰی بھی اپنی ماں کی طرح اس جنگ میں ماری گئی اور فتنہ ختم ہو گیا۔

نقشہ دوم کو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ ذوقصہ سے خیبر تک، پھر اُجا پہاڑ، بزوخا، ظفر، سلمہ، غمرہ اور سمیرہ وغیرہ کے علاقوں میں بغاوت کو تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ متعدد چھوٹے بڑے قبائل غطفان، فزارہ، اسد، طے، جدیلہ، عدم، قیس، غوث اور بنوسلیم کے کافی لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے اور کچھ ایسے لوگوں کو سخت سزائیں بھی دی گئیں، جنہوں نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے تھے۔ عبرت کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بہر حال بنوسلیم کے کچھ مرتد نقرہ کے گردونواح میں موجود تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے خود یہاں تک تشریف لائے تھے لیکن قبائل خانہ بدوش تھے تتر بتر ہو گئے تھے۔ یہ اہم مقام تھا اور بطحا میں مالک بن نویرہ کی سرکوبی سے پہلے اس علاقہ سے باغیوں کا صفایا ضروری تھا۔

قبیلہ بنوسلیم کے سردار ابوشجرہ کی سرکوبی

خلیفہ اوّل نے جو مختلف لشکر تعین کیے اُن میں حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ بن حاجز بھی بنوسلیم کے علاقوں میں بغاوت کو رفع کرنے میں لگے ہوئے تھے لیکن وہ زیادہ تر مدینہ شریف اور مکہ کے درمیان والے علاقہ میں مصروف تھے۔ اس لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کو یہ احکام دوبارہ ملے یا خود خلا تے کا مکمل صفایا کرنے کے لئے انہوں نے ادھر کا دوبارہ رُخ کیا۔ اس پہلو کو مورخین نے واضح نہیں کیا۔ بہر حال حضرت خالد رضی اللہ عنہ نقرہ کی چل پڑے۔ وہاں بنوسلیم کا سردار عمر بن عبدالعزیٰ تھا، جو شاعر بھی تھا اور ابوشجرہ تخلص کرتا تھا۔ وہ اس غلط فہمی میں تھا کہ خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر جلد کمزور ہو جائے گا اور وہ اس پر جھپٹ کر مدینہ شریف تک مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کر دے گا۔ اس نے ایک نظم لکھی جس کے ایک شعر کا مفہوم یہ تھا:

"مجھے معلوم ہے کہ میں اپنے نیزے سے خالد کے دستہ کو سیراب کروں گا اور میں توقع رکھتا ہوں کہ مدینہ جا کر عمر رضی اللہ عنہ کی خبر لوں گا۔"

لیکن اللہ کی تلوار خود اس کی خبر لینے کے لئے روانہ ہوگئی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اچانک بنوسلیم کے بچے کھچے مرتدین پر یورش کر دی۔ بنوسلیم، فتح مکہ اور جنگ حنین کے وقت حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ جس کی تفصیل جلال مصطفےٰ میں موجود ہے۔ ان میں کتنے لوگ ایسے تھے، جو خالد رضی اللہ عنہ کے ماتحت کام کر چکے تھے اور کئی نئے تھے۔ اس سلسلہ میں مورخین خاموش ہیں۔ بہر حال یہ لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یورش کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ ابوشجرہ گرفتار ہوا اور اسے مدینہ شریف بھیج دیا گیا۔ جہاں پر اس نے معافی مانگی جو اس کو مل گئی اور وہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوگیا۔

مورخین کے اضافے

طبری سمیت متعدد مورخین اور خاص کر بلاذاری نے لکھا ہے کہ بعد میں ابوشجرہ پر بُرے دن آئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں وہ صدقہ یا خیرات لینے کے لئے مدینہ شریف حاضر ہوا۔ جہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چابکوں سے اس کی تواضع کی (نعوذ باللہ)۔ طبری تو صرف دُرہ اٹھانے تک بات کرتا ہے، لیکن بلاذاری ایک کے بعد دوسرا اور دُروں کی بھر مار کی بات کرتا ہے۔ جس کو ہمارے موجودہ زمانے کے ایک مبصر نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اوّل تو ابوشجرہ کو جب معافی ملی اُس وقت بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے اور وہ ابو شجرہ کو پہچانتے ہوں گے۔ اب اوّل بات یہ ہے کہ جو خیرات بانٹ رہا ہو تو کیا وہ چابک اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک خستہ حال پر چابک اُٹھاتے اور خاص کر جب وہ مسلمان ہوگیا تھا۔ یہ لفاظی اور یہ اضافے اور الف لیلیٰ کی کہانیاں اپنے تجزیہ کو دلچسپ بنانے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ لیکن لکھنے والوں کو یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ کتنی بے ادبی کر رہے ہیں۔ بات ابوشجرہ کی خستہ حالی کی تھی کہ اونچے بول نے اس کو خستہ حال کر دیا تھا۔ لیکن بیچ میں چابکوں کو لا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان کو گھٹانے کی دانستہ یا غیر دانستہ سازش ہے جس سے قوم میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔

حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ بن حاجز

اسی زمانہ میں حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ بن حاجز بھی اس علاقہ میں اپنی ذمہ داریاں نباہ چکے تھے۔ اس علاقے میں ایک بہت بڑا مرتد بھی تھا، جو فجاہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا اصلی نام عبد یالیل تھا۔ یہ مردود حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کافی ہتھیار حاصل کئے۔ کہنے لگا اپنے علاقہ سے مرتدین کا قلع قمع کروں گا لیکن واپس آ کر اپنے نائب نجبہ بن المشیا کے ساتھ مل کر جگہ جگہ مسلمانوں پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ اس نے قبیلہ ہوازن، بنوسلیم اور بنو عامر کے مسلمانوں پر بھی حملے کر کے، ان پر ظلم ڈھائے اور غارت گری کی۔ وہ حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ کے دستوں کے

درمیان سے نکل جاتا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کوختم کرنے کے لیے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن قیس کوبھی حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیجا۔ مسلمانوں نے تمام علاقہ کوگھیرے میں لے کران کی تلاش شروع کی، اورایک جھڑپ میں بخبہ تو ہلاک ہوگیا۔ لیکن فجاہ بھاگ گیا۔ اسی دوران شمال سے خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کالشکر پہنچ گیا تھا اور فجاہ، محدود علاقہ میں گھر گیا۔ اورآخرمسلمانوں نے اس کوگرفتار کرلیا اور مدینہ بھیج دیا۔ وہاں پر خلیفۂ اوّل نے اُس مردود کوزندہ جلا دینے کاحکم دیا کیونکہ اس نے دھوکہ دیا تھا۔ مسلمانوں پرظلم ڈھائے تھے۔ مسلمانوں سے ہتھیار مانگ کر، مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسے مردود کو دیکھا ہوگا تو آنکھوں میں خون آگیا ہوگا اور اس کوزندہ جلادیا۔ روایت ہے کہ خلیفۂ اوّل نے بستر مرگ پر اس کارروائی پر افسوس کیا کہ فجاہ کوزندہ جلانے کی بجائے صرف قتل کر دیا ہوتا۔

تبصرہ

یہ روایت سرآنکھوں پر، خلیفہ نے شائد ایسا ضرور فرمایا ہوگا اور وہ اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ آگ میں اللہ تعالیٰ دوزخ میں گنہ گاروں کوجلائے گا۔ دنیا میں قتل اور طریقوں سے بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فجاہ جیسے مردود کو آگ میں جلنا چاہیے تھا کہ لوگوں کوعبرت ہوتی۔ اس سے عبرت بھی حاصل ہوئی کہ اس کے بعد مدینہ سے لے کر مکہ تک اور شمال میں خیبر سے غمرہ تک اور نیچے ذوقصہ تک کسی کوسرکشی کی نہ سوجھی۔ اوران تمام علاقوں میں امن ہوگیا۔

خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کا خلیفہ اوّل کو خط

ویسے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر مرحلہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ، خلیفہ وقت کوحالات سے آگاہ کرتے رہے ہوں گے، لیکن تمام فتنوں کے ختم ہوجانے کے بعد مورخین کے مطابق حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک مفصل خط لکھا۔ اس میں تمام تر کارروائی کا ذکر کیا گیا تھا، جن لوگوں کوسزائیں دیں یا کچھ کارروائی کی اُن سب کا ذکر تھا۔ خلیفۂ اوّل نے خالد رضی اللہ عنہ کی تمام کارروائیوں کوصحیح تسلیم فرمایا اور خالد رضی اللہ عنہ نے جو کامیابیاں حاصل کیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کے لئے اللہ کے دربار میں ان کی جزا کے لئے گزارش کی اور باقی لشکریوں کودعائیں دیں اور فرمایا کہ "میری ہدایات کے بعد رواں دواں رہو۔"

دین اسلام ایک متحرک فلسفہ ہے، اورآگلے باب میں ہم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کارروائیوں کوبطحا یا بطاح کے معاملات سے شروع کریں گے۔ یہاں پر اس باب کے واقعات کے نتائج کا خلاصہ پیش کرنا ضروری ہے جو حسب ذیل:

نتائج و اسباق

۱۔ اسلام میں جنگ کا ایک واضح مقصد ہوتا ہے کہ جنگ اللہ کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے لڑی جاتی ہے۔ دیکھ لیں کہ سب کارروائی اسی مقصد کے تحت ہوئی اور ہر وقت اس مقصد کو سامنے رکھا گیا۔

۲۔ اسلام کسی جبر وقہر کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن دشمن کو سر پر بھی نہیں چڑھاتا۔

۳۔ جو کام صلح صفائی سے ہو سکے، وہاں پر لڑائی سے گریز کیا جائے۔

۴۔ حملہ اتنا زوردار ہو کہ دشمن کے چھکے چھوٹ جائیں۔

۵۔ ہر وقت چوکنا رہا جائے۔

۶۔ حکمت عملی کا تعین او پر والے کمانڈر یا مرکز کو کرنا چاہیے۔ تدبیرات کا کام محاذِ جنگ کے کمانڈر کے ہاتھ میں ہو اور اس میں دخل اندازی نہ کی جائے۔

۷۔ مسلمان علاقہ یا زمین کی بجائے لوگوں کے دلوں کو فتح کرتے ہیں اور وہ جہاں جاتے ہیں اچھے اور وفادار لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک فلسفۂ حیات ہے۔ اس پر وہ خود عمل کرتے ہیں۔ یہی فلسفہ وہ دوسروں کو پیش کرتے ہیں۔ اور فاتح کہلانا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے غلام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری وساری کر رہے ہوتے ہیں۔

۸۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کرتے وقت ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن سے ان کی بے ادبی نہ ہو۔ اور ایسی لفاظی سے بھی گریز کیا جائے جس سے قوم میں تفرقہ پھیلے یا کسی کے عقیدہ کو ٹھیس پہنچے۔

۹۔ تاریخ کے بامقصد مطالعہ کا مقصد نہ کیچڑ اُچھالنا ہے نہ ذہنی عیاشی، نہ غیروں کے پیمانوں کا استعمال، نہ اُتار چڑھاؤ کہ قارئین سے داد لی جائے بلکہ بامقصد مطالعہ کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ اس سے سبق سیکھیں۔

۱۰۔ اسلام کی تاریخ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں ایک معطر باغ کی طرح پاک ہیں۔ اس خوشبو سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

تیسرا باب

مرتدین کا قلع قمع

حضرت خالد ؓ بن ولید سیف اللہ اب اپنی کارروائی کے دوسرے مرحلہ کے لئے رواں دواں تھے، اکثر مورخین کے لحاظ سے انہوں نے یہ کوچ ظفریا سلمٰی پہاڑی کے نزدیک سے کیا۔ جہاں وہ اُم سلمٰی کی سرکوبی کر چکے تھے اور نقرہ میں ابوشجرہ کے خلاف کارروائی اُم سلمٰی کی سرکوبی سے پہلے کر چکے تھے۔ نقشہ دوم میں تمام مقامات دیئے گئے ہیں اور قارئین تجزیہ خود کرلیں۔ ہم اس بحث میں اس لئے نہیں پڑتے کہ بات چند میل کے فاصلہ اور صحیح راستے کی ہے۔ لیکن جنگ میں بعض دفعہ لمبے اور دوہرے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اس لئے ہمارا مقصد اس سے حل ہو جاتا ہے کہ خالد ؓ مالک بن نویرہ کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہاں البتہ مورخین نے اس سلسلہ میں انصار مدینہ کے بارے میں جو کہانی لکھی ہے کہ انہوں نے حضرت خالد ؓ کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا کہ خلیفہ وقت نے ان کو صرف پہلے مرحلہ یعنی بزوخا کے علاقوں کے مرتدین سے پاک کرنے کے احکام دیئے تھے۔ پھر حضرت خالد ؓ ان کو چھوڑ کر اپنے مشن پر چل پڑے۔ انصار کو بعد میں خیال آیا کہ اگر حضرت خالد ؓ کامیاب ہو گئے تو ان کو جو شہرت حاصل ہو گی اس کی وجہ سے انصار کو ندامت اُٹھانا پڑے گی۔ اور اگر خالد ؓ کے لشکر پر کوئی مصیبت آگئی تو یہ ذلت ساری مسلمان قوم کے لئے ہو گی۔ اس لئے حضرت خالد ؓ کے لشکر کی روانگی کے بعد وہ بھی چل پڑے اور جلد ہی اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔

غلط کہانیاں

یہ سب غلط کہانی ہے اور کسی ''زرخیز'' دماغ کی اختراع ہے، کچھ مخالفین ہر موقع پر ایسے تفرقے ڈالنے میں لگے رہتے ہیں۔ ممکن یہ ہوسکتا ہے کہ بطحا کے لئے کوچ کرتے وقت آپس میں کچھ بحث ہو گئی ہو، مسلمانوں کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ کوئی لڑائی کا تھکا ماندہ مجاہد یا بچوں کی جدائی کی وجہ سے کوئی صاحب اگلے مرحلہ کے بارے میں کوئی سوال کر بیٹھا ہو اور کچھ بحث ہو گئی ہو۔ لیکن ایک گھنٹے کا اختلاف اور پھر انصار کو ندامت یا خالد ؓ کا اُن کو چھوڑ کر

چل پڑنا سب غلط کہانیاں ہیں۔ جس فوج کے ضبط کا یہ حال ہو، جیسا اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے، وہ اس طرح فتوحات حاصل نہیں کر سکتی جس طرح خالد رضی اللہ عنہ کی فوج فتوحات حاصل کر رہی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ، خلیفۂ وقت سے خط و کتابت میں مصروف تھے۔ اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے خلیفۂ وقت کو کئی خطوط لکھے۔ گو مورخین نے ایک بڑے خط کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے خالد رضی اللہ عنہ کی کارروائی کو تسلیم کیا اور اگلے مرحلہ پر روانہ ہونے کا حکم دیا۔ خلیفۂ وقت جس نے ساری حکمت عملی بنائی اور یہاں تک گئے کہ طلیحہ کے خلاف کارروائی سے پہلے بنو طے اور جدیلہ قبائل کو ساتھ ملانے کی کوشش بھی کرنا تو کیا خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر خالد رضی اللہ عنہ چل پڑے؟ (نعوذ باللہ) تو پھر کیا خلیفہ وقت لشکر کے ہر سپاہی کو الگ الگ ہدایات دیتے؟ یہاں تو فاصلہ اتنا نزدیک تھا کہ خالد رضی اللہ عنہ کو گھڑی گھڑی کی ہدایات مل رہی تھیں اور وہ سب کچھ خلیفۂ وقت کے احکام کے تحت کر رہے تھے۔

اس لئے انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی کہانیاں ہماری تاریخ سے خارج ہو جانی چاہئیں۔ صحابہ کرامؓ تو آگاہ تھے اور دین فطرت کو وسعتوں کو سمجھتے تھے لیکن بیچ میں کئی سادہ لوگ تھے، جو سادگی سے کوئی بات کر جاتے تھے جو بڑی وقتی ہوتی تھی، ایسے سادہ لوگوں میں حضرت شویل رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کا ذکر آگے چل کر فتح حیرہ کے موقع پر آئے گا۔ اس لئے ہم پر واجب ہے کہ ایمان افروز تجزیوں کے بعد ایسی باتوں کو تاریخ سے خارج کرنے کی مہم چلائیں۔ اس سلسلہ میں ایک نکتہ بیان کرنا ضروری ہے۔ پرانے تاریخ دانوں نے جو کچھ سنا لکھ دیا۔ واقعات کو بیان کرنے والے لوگوں میں بعد میں کئی ایسے بھی ہوئے ہیں جو مکمل طور پر اسلام کی وسعتوں کو نہ سمجھتے تھے۔ وہ اسلام کو بھی صرف ایک عام طرزِ زندگی یا فلسفہ یا معاشرت یا طرزِ تمدن سمجھتے تھے اور اس حد تک بات صحیح ہے کہ اسلام سب کچھ ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور مکمل فلسفۂ حیات۔ اس کا نہ تو غیروں کے فلسفہ کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ غیروں کی عینک سے پڑھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو غیروں کے پیمانوں سے ناپ سکتے ہیں۔ اس لئے جہاں کہیں ہم اس چکر میں پڑ گئے کہ غیروں کے ہاں ایسا ہوتا تھا یا ہوتا ہے، اور اسلام میں بھی ایسا ہوا ہوگا یا ہو سکتا ہے تو یہ درست نہ ہوگا۔

خالد رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ دوسرے مرحلہ کے لئے پیش قدمی شروع کر چکے تھے۔ مقابلہ مالک بن نویرہ کے ساتھ تھا۔ جو قبیلہ بنو تمیم سے تعلق رکھتا تھا۔ جلال مصطفےؐ[1] میں اس قبیلہ کی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا ذکر ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو علم الکلام اور لفاظی کے ماہر سمجھتے تھے لیکن اللہ کے کلام کے سامنے ان کے سر جھک گئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن نویرہ ہی کو ان پر عامل مقرر فرمایا۔ اور مالک پہلے وفاداری سے کام کرتا رہا لیکن

جیسے ہی اس نے حضور پاک ﷺ کی وفات کی خبر سنی تو زکوٰۃ کی جتنی رقم اکٹھی کی تھی وہ واپس اپنے خزانہ میں ڈال دی اور کہنے لگا بہتر ہے، یہ رقم اپنے قبیلہ کے کام میں لائی جائے اور اسلام سے پھر گیا۔لیکن اس کے قبیلہ کے کئی آدمی اسلام پر قائم رہے۔ خاص کر حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو اور آپ کے بھائی حضرت عاصم رضی اللہ عنہ جیسے لوگ جن کے بارے میں آگے چل کر قارئین ایمان افروز واقعات پڑھیں گے۔

مالک بن نویرہ اور اُس کی بیوی

بنیادی طور پر مالک اچھا آدمی تھا اور خوبصورت نوجوان تھا۔اس کی بیوی لیلیٰ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اچھی شکل و صورت بخشی تھی لیکن مورخین اور ہمارے اِس زمانے کے ایک مبصر نے لیلیٰ کی خوبصورتی کے لئے لفاظی کے جوتانے بانے باندھے ہیں اور سب معاملات کو رومانی کیفیت دے دی ہے تو اس کا ایک خاص غلط روی والا مدعا ہے۔ کہ آگے چل کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اختلافات کو ہوا دینے کے لئے اس خوبصورتی کو ایک بنیاد بنایا جائے۔ پہلے مورخین ،صرف خوبصورتی کا ذکر کرتے ہیں، کئی سو سال بعد اصفہانی صاحب آنکھوں کی تعریف کرتے کرتے لیلیٰ کی ٹانگوں کی خوبصورتی کو بھی بیچ میں لے آتے ہیں اور اس حاشیہ آرائی کو اس قدر بڑھایا کہ ایسی ٹانگیں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔عرب میں ٹانگیں ڈھکی ہوتی ہیں اور صرف اہلِ یورپ میں ٹانگوں کی خوبصورت کی بات ہوتی ہے۔اس لئے اصفہانی کے اس اضافے کو تاریخ سے خارج کردیا جانا چاہیے تھا۔ ہاں شاید پرانی ایرانی تہذیب وتمدن میں ٹانگوں کی خوبصورت کا ذکر ہو، اسلام کے بعد تو وہاں بھی ٹانگوں کو ڈھانپنا ''سترِ عورت'' ہوتا ہے۔

مالک بن نویرہ اور سجاح

مالک بن نویرہ کے مرتد ہونے کے بعد وہاں پر کچھ اور حالات ظہور پذیر ہوئے اور یہ حضور پاک ﷺ کی وفات سے لے کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بطحا کی طرف پیش قدمی تک کے زمانے میں ہوئے۔ان کا بیان اس لئے ضروری ہے کہ معاملات پوری طرح سمجھ میں آجائیں۔ بنوتمیم از خود کئی چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔مالک کا تعلق بنی حنظلہ سے تھا۔اور بنی حنظلہ خود آگے بنی یربوع کی ایک شاخ تھے۔ بنی یربوع کے حارث بن سوید کی ایک لڑکی سجاح بھی اسی زمانے میں اُبھری، جو ماں کی طرف سے بنی تغلب[1] کے ساتھ منسلک تھی۔تمام قبیلوں کے خاندانی تعلقات کے بیانات سے قارئین بھول بھلیوں میں پڑ جائیں گے۔اور یہ لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ سجاح کا خاندانی تعلق بڑے بڑے قبائل کے ساتھ تھا اور وہ خود عراق کی سرحد کے نزدیک بنی تغلب میں رہتی تھی۔ یہ لوگ بنیادی طور پر عیسائی

(۱) بنوتغلب کا آگے بھی ذکر آئے گا۔

تھے، لیکن عقائد کے کچھ زیادہ پکے بھی نہ تھے۔

سجاح کا نبوت کا دعویٰ

اُس زمانے میں جگہ جگہ جھوٹے نبی پیدا ہو رہے تھے۔ طلیحہ اور مسیلمہ کذاب تو کافی مشہور بھی ہو چکے تھے۔ سجاح نے سوچا کہ مردوں نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے، کیوں نہ کوئی عورت بھی اس سلسلہ میں آگے بڑھے۔ وہ شاعرہ تھی، علم الکلام کی ماہر تھی اور پیشگوئیاں بھی کر لیتی تھی۔ اس زمانے میں حضور پاک ﷺ کی کامیابی نے نقالوں کے لئے دروازے کھول دیئے تھے۔ ہر قبیلہ نے کچھ اس طرح سوچنا شروع کر دیا کہ ان کا کوئی آدمی نبی ہوگا، تو ان کو بھی وہی وسعت نصیب ہو جائے گی جو قریش مکہ کو نصیب ہو گئی تھی۔ چنانچہ سجاح نے جیسے ہی نبوت کا اعلان کیا، لوگ دھڑا دھڑ اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس نے ایک لشکر کے ساتھ بنو تمیم کے علاقے کی طرف پیش قدمی کی۔

سب سے پہلے تو اس نے مالک بن نویرہ کے ساتھ خاندانی تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے، ایک معاہدہ کیا اور پھر دونوں نے مل کر بنو تمیم کے کئی چھوٹے قبیلوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ یعنی وہاں جا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ کوئی مذہبی جنگ نہ تھی، بلکہ صرف کسی ضرورت کے تحت یا طاقت کے بل بوتے پر سب کارروائی ہوتی رہی۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، سوائے اس کے کہ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ اس سے مالک بن نویرہ کو اور طاقت نصیب ہوئی۔

سجاح کی یمامہ کی طرف پیش قدمی

لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور کسی ایک جنگ میں سجاح کو شکست ہو گئی۔ تو اس کے لشکر والوں کو فکر ہوئی اور پوچھنے لگے کہ ''اب کیا ہوگا؟'' تو سجاح کے زرخیز دماغ نے ایک نیا نعرہ دیا کہ ''یمامہ چلو، یمامہ چلو۔'' اس نعرہ میں بڑی کشش تھی اور لوگ جوق در جوق سجاح کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ مسیلمہ کذاب جس نے یمامہ میں نبوت کا اعلان کیا ہوا تھا، اس کے مکمل حالات تو تفصیل کے ساتھ ذرا آگے آئیں گے، یہاں پر صرف اتنی وضاحت ضروری ہے کہ مسیلمہ کو مسلمانوں سے خطرہ تھا اور شائد اُس وقت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابو جہل اس طرف پیش قدمی کر چکے تھے یا کرنے والے تھے۔ اس لئے مسیلمہ اس وقت سجاح کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں مول لینا چاہتا تھا۔ مورخین نے سجاح کی یمامہ کی طرف پیش قدمی کی تاریخ نہیں لکھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسیلمہ اس وقت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جھڑپ میں کامیاب ہو چکا ہو اور شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کی پیش قدمی کا منتظر ہو، یہ سب ذکر آگے آئیں گے۔ طبری نے اس سلسلہ میں کچھ اشارہ بھی کیا ہے۔ بہرحال روایت ہے کہ مسیلمہ چالیس آدمی لے کر سجاح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور تحفے پیش کئے، اور ''آدھی زمین'' سجاح کے لوگوں کو دے کر سمجھوتہ کر لیا۔ مسیلمہ اس سے پہلے ایسی ''آدھی زمین'' کا تحفہ مسلمانوں کو بھی پیش کر چکا تھا، جس

کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مسیلمہ اور سجاح کی شادی

مسیلمہ بڑا مکار تھا، وہ کسی نہ کسی طرح سجاح پر ڈورے ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔طبری نے اس سلسلہ میں جو دوری روایت بغیر کسی راوی کے نام کے لکھی ہے، اس کہانی کو بڑا رومانی رنگ دے دیا گیا ہے۔ کہ کس طرح سجاح یمامہ پہنچی اور کس طرح مسیلمہ نے ایک الگ خیمہ لگا کر اس کے اندر عود اور لوبان کی دھونی دی وغیرہ۔ اس روایت یا کہانی کی تفصیل بیان کرنا، یہاں مقصود نہیں۔ بہر حال مسیلمہ اور سجاح کی شادی ہوگئی۔لیکن وہ اس کے پاس نہ ٹھہری اس لئے شادی بھی شاید ''وقتی'' تھی۔ قارئین! ہم پر بھی الزام لگا سکتے ہیں کہ اس واقعہ کی طرف اشارہ بھی کیوں کیا۔لیکن ہم یہ سب کچھ تاریخ کے بامقصد مطالعہ کے تحت کر رہے ہیں، کہ جھوٹے نبیوں کا یہ کردار ہوتا ہے اور یہ خاتمہ۔ کہ سجاح نے شہرت حاصل کی تھی، وہ ختم ہوگئی اور وہ بنی تغلب کے پاس واپس چلی گئی۔ روایت ہے کہ سجاح نے بعد میں اسلام قبول کر لیا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ میں آ کر آباد ہوگئی، جہاں پر باقی زندگی ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح گزاری۔

دوم اس سے یہ نتیجہ بھی نکالنا مقصود ہے کہ سجاح کی اس آخری کارروائی سے مالک بن نویرہ کو جو قوت حاصل ہوئی تھی، وہ کافی حد تک کم ہوگئی، اور مسیلمہ کی قوت نہ صرف برقرار رہی بلکہ بڑھ گئی۔ چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے آگے چل کر ان دونوں کا قلع قمع کرنا تھا۔اس لئے دونوں کی طاقت اور حالات کا تجزیہ آپ کے سامنے آ گیا۔

مالک بن نویرہ کا خاتمہ

مالک اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔اور وہ اس قابل نہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کر سکے۔مورخین نے مالک کے خاتمے کو مختلف روایتوں سے پیش کر کے حالات کو عجیب وغریب شکل دے دی ہے، ان تمام روایات کا موازنہ کر کے حقیقت تلاش کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال چند واضح پہلو اس طرح ہیں۔ مالک ایک خاندانی قسم کا شہزادہ تھا اور کافی حد تک بااصول اور باعزت آدمی تھا اور اپنے قبیلہ کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ دینے سے انکار کر بیٹھا اور سوچا کہ حالات کے مطابق وہ ٹھیک کر رہا تھا۔اس نے سجاح کے ساتھ اتحاد بھی مجبور ہو کر اور ضرورت کے تحت کیا تھا کہ شائد اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے۔ جلد ہی حالات نے پلٹا کھایا اور جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کی تو مالک کو اپنی شکست نظر آئی۔

مالک کا قتل

مالک معاملات کی تہ تک نہ پہنچ سکا یا زندگی میں اتنے پلٹے کھا چکا تھا کہ اب مکمل پلٹا کھا کر غیر مشروط طور پر اسلام میں داخل ہونے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ ہاں لڑائی سے ضرور گریز کیا۔ اپنے قبیلہ کو حکم دیا کہ اپنے گھروں میں اپنے کام پر لگے رہیں اور زکوٰۃ کی رقم پیش کرنے کے لئے اپنے قاصد، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کی طرف بھیج دیئے۔ یہ رقم بھی تھوڑی تھی، اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نہ صرف پوری رقم واپس لینے پر اصرار کیا بلکہ جب تک مالک توبہ کر کے اسلام میں واپس نہیں آ جاتا اس کو معافی نہیں مل سکتی۔

چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جن لوگوں کو مالک کی تلاش کے لئے بھیجا وہ اسے گرفتار کر کے لے آئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ مسلمان جگہ جگہ پھیل گئے۔ اور حکم کے مطابق اذان دیتے تھے۔ جہاں پر سے جواباً اذان کی آواز آتی ان لوگوں کو چھوڑ دیتے۔ جہاں سے آواز نہ آتی ان کو گرفتار کر لیتے اور مالک کے گھر سے اذان کی آواز نہ آئی اس لئے اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ جو کچھ بھی ہوا، مالک کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا اور جب وہ اُن سے بات کرتا تو حضور نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''تمہارے صاحب'' کے الفاظ استعمال کرتا تھا، خالد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''اپنے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہیں کہتے، کیا وہ تمہارے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں؟'' مالک خاموش ہو گیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا۔ ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور کو اس کے قتل کا حکم دیا گیا جو حکم پورا کر دیا گیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مالک کو قید کر دیا اور ارادہ مالک کو مدینہ بھیجنے کا تھا یا ابھی اور پرسش کرنا تھی۔ امین وغیرہ اور قیدی بھی تھے اور مالک سمیت یہ سب حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور کی نگرانی میں تھے۔ رات کو کچھ بارش ہوئی اور سردی زیادہ ہو گئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے خیمے سے آواز دی اور پوچھا کہ کیا قیدیوں کو گرم نہیں کیا؟ بہر حال عربی کے جو الفاظ استعمال ہوئے، بنی کنانہ، کی تلمیح کے مطابق اس کے چھپے ہوئے معنی یہ تھے کہ قیدیوں کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور نے مالک، امین اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ انصاری کا اختلاف

مشہور صحابی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بھی لشکر میں تھے، وہ سخت اصول پسند تھے۔ فتح مکہ کے وقت بھی انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی کارروائی پر کچھ اعتراض کر کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی تھی، لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد رضی اللہ عنہ کو قصوروار نہ ٹھہرایا اور بات ختم ہو گئی تھی۔ اور مسلمانوں کا یہی طریق تھا کہ بات چیت جب ختم ہو جاتی تھی تو سب کچھ بھول جاتے تھے۔ اب وہی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ، خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں وفاداری کے ساتھ کام کر رہے تھے، لیکن اس قتل پر جب اختلاف ہوا، تو آپ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بڑے سخت سوال کئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ پلا دی تو ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر لشکر چھوڑ کر مدینہ شریف چلے گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کے سامنے حضرت خالد ﷺ کی سخت شکایت کی۔ خلیفہ اول نے حضرت ابوقتادہ ﷺ کو حکم دیا کہ ابوقتادہ ﷺ واپس جائیں اور اپنے سالارِ لشکر سے بغیر اجازت اپنی جگہ چھوڑنے کی معافی مانگیں۔ ابوقتادہ ﷺ واپس آگئے اور خالد ﷺ نے ابوقتادہ ﷺ کو معاف کر دیا۔

تبصرہ

صحابہ کرام ﷺ کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان کی رنجشیں بھی وقتی ہوتی تھیں۔ اور ابوقتادہ ﷺ والی بات تو ادھر ہی ختم ہو گئی لیکن اب ذرا اس روایت کی طرف آئیں جو اس باب کے شروع میں زیر بحث آ چکی ہے کہ انصارِ مدینہ نے حضرت خالد ﷺ کے ساتھ چلنے سے ہی انکار کر دیا تھا اور ایک گھنٹہ تک تذبذب میں رہنے کے بعد پیش قدمی کی، اور حضرت خالد ﷺ اُن کو وہیں چھوڑ کر چل پڑے۔ اسلام میں سخت ضبط کا حکم ہے اور حضور پاک ﷺ کا حکم ہے کہ جب دو ہوں تو ایک کو امیر بنا لو۔ اس لئے جہاں کہیں کوئی روایت آئے کہ وہاں اطاعت امیر میں کوتاہی ہوئی، تو اگر اس کی سزا یا معافی نہیں ملی تو روایت غلط سمجھو۔ اور حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کا ابوقتادہ ﷺ کے سلسلہ میں فیصلہ کو یاد رکھو۔ ظاہر ہے کہ انصار کے تذبذب والی کہانی غلط ہے۔

دوم مالک بن نویرہ کے قتل کی دونوں روایات کو پرکھیں۔ حضرت خالد ﷺ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پہلی صورت میں جو آدمی حضور پاک ﷺ کو اپنا نہیں سمجھتا وہ مرتد ہے۔ اس کی گردن اُڑانا عین اسلامی فعل ہے۔ اور دوسری روایت میں مالک غلط فہمی کی وجہ سے قتل ہوا۔

مالک بن نویرہ کا خون بہا

حضرت خالد ﷺ اور ابوقتادہ ﷺ میں اختلاف کی بات البتہ ضرور پھیل گئی۔ اور مالک کے بھائی مہتمم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور وہ مدینہ شریف پہنچ گیا اور وہاں جا کر ثبوت پیش کیا کہ مالک دل سے مسلمان ہو گیا تھا یا مسلمان تھا۔ شرمیلا آدمی تھا بار بار پلٹے کھانے کی وجہ سے اپنے اسلام کا کوئی کھلم کھلا اعلان نہ کیا یا نہ کر سکا، لیکن اسلامی لشکر کی مخالفت نہ کی۔ مہتمم نے اپنے اسلام کا ثبوت پیش کیا اور بھائی کے قتل کا خون بہا مانگا۔ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے باز پُرس کے لئے حضرت خالد ﷺ کو بلا بھیجا۔ حضرت خالد ﷺ نے صفائی پیش کی جس کو خلیفہ وقت نے منظور فرمایا۔ مالک کے بارے میں معاملات کچھ مشکوک تھے اس لئے خلیفۂ وقت نے مالک کے نومسلم خاندان کو خون بہا ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ کہ ان کی دلجوئی بھی مقصود تھی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر جگہ مشہور ہو گیا کہ مالک، حضرت خالد ﷺ کی اجتہادی غلطی کی وجہ سے قتل ہوا۔

مورخین کی رنگ آمیزی

یہاں تک بات صحیح تھی، پرانے زمانے میں تو اس بات کو زیادہ نہ اُچھالا گیا، صرف طبری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے درمیان تلخ کلامی کا ذکر کیا، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لئے ''اللہ کے دشمن'' کے الفاظ استعمال کئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے ''اُم شملہ کے بیٹے'' یعنی بائیں ہاتھ والی ماں کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے۔ ہم دوسری کتاب میں واضح کریں گے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنی جائیداد کی تقسیم کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وارث منتخب کیا، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی والدہ اُن کے سگے چچا کی بیٹی تھیں۔ تو وہ اس کے لئے ایسے لفظ کیسے استعمال کرتے؟ ہم کہہ آئے ہیں کہ عرب کے پرانے رواج کے مطابق بھی چچی کو ماں کہتے تھے، کہ جنگ حنین میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حارث نے جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب پکڑلی اور حضور نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کون ہے؟ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس چچا کے بیٹے کے الفاظ تھے ''میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں کا بیٹا۔'' علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ''اللہ کی تلوار'' کے لئے اللہ کے دشمن کے الفاظ کبھی نہ استعمال نہ کرتے۔ یہ مورخین کی رنگ آمیزیاں ہیں۔

ویسے جنگوں میں کیا ہوتا ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ پاک میں سورۂ نمل میں بلکہ سیاسی زبان میں یہ لکھا ہے کہ لشکر ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے جنگیں دیکھی ہیں۔ اُن کو معلوم ہے کہ جنگوں میں عورتوں کی عزت بچانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے دین فطرت نے شادی یا ازدواجی رشتہ میں منسلک ہونے کی راہ کھولی۔ ہم اس لئے یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی لیلیٰ کے ساتھ شادی پر کوئی اعتراض ہو۔

خلیفہ اوّل کی حکمت عملی کی ایک اور جھلک

اب مسیلمہ کذاب کی باری تھی، قارئین ذرا ذوقصہ واپس جائیں اور نقشہ سوم اور چہارم پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ خلیفہ اوّل نے جو گیارہ لشکر منظم کئے تھے، ان سب کی ذمہ داریاں نقشوں کی مدد سے سمجھیں، بہر حال فی الحال ہمارا واسطہ یمامہ سے ہے اور دوسرا لشکر جو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل کا تھا اس کو حکم ملا کہ یمامہ کے علاقہ میں جا کر مسیلمہ پر نظر رکھیں۔ لیکن اپنے آپ کو کسی جنگ یا لڑائی میں نہ الجھا دینا۔ تیسرا لشکر شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کا تھا جو عکرمہ رضی اللہ عنہ کے ریزرو تھے۔ اب ذرا حکمت عملی پر نظر دوڑائیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو گیارہ لشکر مقرر فرمائے، ان میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کو چھوڑ کر باقی کا کام یا دشمن پر نظر رکھنا تھا یا معمولی قسم کے دشمن کے ساتھ واسطہ تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے نکل کر ذوقصہ ہوتے ہوئے، ابرق سے ایک طرف ہو کر طے اور جدیلہ کے علاقوں سے ہوتے ہوئے بزوخا، ئمیرہ، غمرہ، ظفر، سلمیٰ اور ابرق وغیرہ سے دشمنوں کو ادھیڑتے اور اُکھیڑتے ہوئے بطحا تک آ کر دشمنوں کو تہس نہس کرنا تھا،

تو ظاہر ہوا کہ خلیفہ اوّل کی حکمت عملی کی کشش کا مرکز حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر ہی تھا۔ ادھر ادھر جو لشکر بھیجے، ان میں سے کچھ کسی اور بڑی حکمت عملی کا حصہ تھے اور کچھ نے مرتدین کو ان کے علاقوں میں الجھائے رکھنا تھا کہ کہیں سب مرتدین اکٹھے ہو کر یا ملاپ کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک محاذ نہ بنا سکیں۔ آپ خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کو سمجھیں کہ ہر لشکر کی نفری اس کی ذمہ داری کے مطابق تھی، اور اندازہ لگائیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوجی بصیرت کا، کہ ہر کام انہوں نے کس طرح ناپ وتول کے ساتھ کیا۔ ہم جو تدبیرات میں دوسروں کی نقالی میں صرف فائر بندی کے انتظار تک سوچتے ہیں اور یہی کچھ بڑے بڑے اداروں میں پڑھاتے ہیں وہ ان عظیم رہنماؤں کی حربی مہارت اور بصیرت میں کیسے غوطہ لگا سکتے ہیں کہ ہم نے اپنوں کے نقش قدم پر چلنا جو چھوڑ دیا ہے۔

چنانچہ قافلۂ حق میں سے سب سے پہلے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل نے مسیلمہ کے ساتھ ٹکر لی، گو خلیفۂ اوّل نے اس کی اجازت نہ دی تھی، کہ وہ حالات کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ شاید حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا اثر اُس کے ہم عمر بھتیجے عکرمہ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن ہشام بن مغیرہ پر بھی ہوا۔ خالد رضی اللہ عنہ کے ولید اور ہشام بھائی تھے۔ اور عکرمہ رضی اللہ عنہ کا باپ عمرو بن ہشام جو زمانۂ جاہلیت کا ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ تھا اور آج کل اس کو ہم جہالت کا باپ یعنی ابوجہل کہتے ہیں۔ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا چچیرا بھائی تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کی والدہ ماجدہ عکرمہ رضی اللہ عنہ کی پھوپھی اور ابوجہل کی بہن تھی۔ بہرحال خلیفۃ الرسول ﷺ، عکرمہ رضی اللہ عنہ سے سخت ناراض ہوئے اور ان کو ڈانٹ دیا کہ اس حالت میں مدینہ شریف نہ آنا۔ شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کو اُن کی جگہ بھیجا، اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور عرفجہ رضی اللہ عنہ کے پاس اومان اور مہرہ کے علاقوں میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے بعد حضرموت میں حضرت مہاجر رضی اللہ عنہ بن اُمیہ کے ساتھ مل جائیں۔ ان لشکروں کی ذمہ داری نقشہ چہارم پر موجود ہے اور عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ادھر بڑی بہادری دکھائی جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔ فی الحال ہمارا مقصود یمامہ ہے اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کو لمبی چوڑی ہدایات دے کر خلیفہ نے یمامہ بھیجا کہ وہ وہاں پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا انتظار کریں اور یمامہ کی فتح کے بعد شام کی سرحدوں کی طرف بنوقضاعہ کے علاقوں میں جا کر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے مل جائیں وغیرہ۔ اس حکمت عملی کا ذکر دوسری کتاب میں ہے۔ لیکن شرجیل رضی اللہ عنہ نے بھی وہی غلطی کی جو عکرمہ رضی اللہ عنہ کر چکے تھے۔ وہ بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے پہلے ہی مسیلمہ سے اُلجھ پڑے اور شکست کھائی۔ چنانچہ جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو ان سے ناراض ہوئے۔

مسیلمہ کی جھوٹی نبوت

مسیلمہ بن حبیب کا تعلق بنوحنیفہ سے تھا۔ دس ہجری میں بنوحنیفہ کا ایک وفد مدینہ آیا جس کا مختصر ذکر جلال

مصطفےٰ میں کیا گیا ہے۔ مسیلمہ اس وفد میں شامل تھا۔ وفد میں دو اور آدمی بھی شامل تھے جو تاریخ میں باقی رہ گئے۔ ان میں سے ایک نہار الرجال تھا۔ جس نے مسیلمہ کے عروج میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ دوسرا مجاعہ بن مرارہ تھا جس کے ہاتھ اور مشیت ایزدی کی وجہ سے بنوحنیفہ ایک بہت بڑی بربادی سے بچ گئے، کہ اس کا داؤ کام آیا۔ بہر حال بنوحنیفہ کا یہ وفد جب مدینہ شریف حاضر ہوا تو حضور پاک ﷺ نے ان کو تحائف بھی دیئے۔ یہ لوگ کہنے لگے کہ اُن کا ایک ساتھی باہر اونٹوں کی رکھوالی کر رہا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے اس کے لئے بھی ایک تحفہ دیا اور فرمایا: ''وہ تو ایسا نہیں کہ تم سے پیچھے رہ جائے اور تمہارے سامان کی حفاظت پر لگا رہے۔'' یہ مسیلمہ تھا اور حضور پاک ﷺ کو نظر آ رہا تھا کہ گو غلط صورت ہوگی لیکن ایک دن وہ اپنی قوم کے اُوپر آ جائے گا یعنی وہ پیچھے رہنے والا نہیں، آگے آئے گا۔ مسیلمہ نے ان الفاظ کو اپنے حق میں خوب استعمال کیا۔

نہار الرجال نے اس سلسلہ میں مسیلمہ کی بہت مدد کی۔ طبری کے مطابق وہ مہاجرین میں سے تھا، یعنی یہ معلوم نہیں کہ وہ قبیلہ قریش میں سے تھا یا بنوحنیفہ یا کسی اور قبیلہ سے۔ لیکن ہجرت کر کے مدینہ ٹھہرا رہا اور اسلام سے اچھی طرح واقف تھا اور بنوحنیفہ کو اسلام کی طرف راغب کیا اور پھر اُن کے ساتھ وفد میں شامل ہو کر حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور پاک ﷺ نے اس کو بنوحنیفہ کے لئے مبلغ اور معلم بنا کر بھیج دیا۔ اس شخص کا بنوحنیفہ پر بڑا اثر تھا اور اسی نے شرارت کی بنیاد رکھی۔ اور یہ جھوٹ باندھا کہ (نعوذ باللہ) اس نے خود حضور پاک ﷺ سے سنا کہ مسیلمہ کو نبوت میں اُن کے ساتھ شریک کر دیا گیا ہے۔

کذاب کی جھوٹی نبوت کے اثرات

مسیلمہ کی جھوٹی نبوت کا بنوحنیفہ پر عجیب وغریب اثر ہوا۔ بنوحنیفہ دنیاوی چکر میں تھے۔ ان کو جب حضور پاک ﷺ کی نبوت کی وجہ سے قریش اور انصار مدینہ کی شان نظر آئی تو انہوں نے صرف دنیاوی پہلو کو دیکھا۔ وہ دین فطرت کے فلسفہ حیات نہ سمجھ پائے تھے۔ انہوں نے جب مسیلمہ سے سنا کہ وہ ''آدھی دنیا'' کے مالک ہو گئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور مسیلمہ نے اس قسم کا ایک خط بھی حضور پاک ﷺ کو لکھا۔ حضور پاک ﷺ نے جواب میں مسیلمہ کو کذاب کے نام سے پکارا اور یہی اس کا تاریخی نام ہے۔ ویسے مسیلمہ اپنے اوپر جن آیات کے اُترنے کی بات کرتا تھا وہ بالکل بیہودہ اور لغو ہوتی تھیں۔ مثلاً کبھی بکری کی قسم اور کبھی مینڈک کی قسم۔ شاید مینڈکی کوز کام والی بات بھی وہیں سے شروع ہوئی ہو۔ کئی باتیں بڑی غلیظ قسم کی ہوتی تھیں۔ اور کئی معمولی باتوں کو عجوبہ بنا کر پیش کیا جاتا تھا کہ بکری سیاہ اور دودھ سفید، اللہ کی قدرت ہے۔ اور دودھ میں پانی مت ملاؤ۔ وغیرہ۔ پھر حضور پاک ﷺ کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا،

(۱) جلال مصطفےٰ، صفحہ نمبر ۲۹۱

جس کے چند اُلٹ اثرات تو اسی زمانے میں ظاہر ہو گئے اور کچھ بعد میں۔ کسی کنوئیں میں پانی کم تھا، زیادتی کی دعا کی تو مزید کم ہو گیا۔ فصلوں اور کھیتوں کی زرخیزی کی دعا کی تو وہ زمینیں بنجر ہو گئیں۔ جن بچوں کی پیدائش پر اُن کے لئے دعا کی اور جہاں ہاتھ لگایا وہ عمر بھر کو روگ بن گیا۔

اس سلسلہ میں پوری کہانیاں بیان کرنے سے مضمون بہت وسیع ہو جائے گا۔ حضور پاک ﷺ آخری نبی ہیں۔ نبوت کا سلسلہ اُن پر ختم ہے۔ جھوٹے نبیوں کو ایسی ذلت نصیب ہونا ضروری ہے تا کہ انہیں اور باقی لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ پہلے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے خدائی کا دعویٰ کرنے والوں کو بھی کچھ عرصہ برداشت کیا۔ پھر نمرود کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا کیئے اور فرعون کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ جھوٹا نبی بھی خدا پر بہتان باندھتا ہے۔ اور اس جھوٹے نبی کو ختم کرنے کے لئے کوئی نبی تو نہیں آ سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کرتا ہے اور غلامانِ محمد ﷺ کو شرف دیتا ہے کہ اس مردود کو ختم کریں۔ اسود، طلیحہ یا باقی جھوٹے نبی کچھ زیادہ اثرات پیدا نہ کر سکے لیکن جن لوگوں نے ان کو ختم کیا ان کی بڑی شان ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھیں کہ جھوٹے نبی کو ختم کرنا اور اس پر لعنت بھیجنا اور اس کو کذاب کے نام سے پکارنا یہ سب دین اسلام کی بڑی خدمتیں ہیں۔ کسی جھوٹے نبی کو ماننے والا مسلمان نہیں ہو سکتا اور ایسے جھوٹے جنہوں نے جہاد کو بھی معطل کر دیا تو ایسوں کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش

جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ویسے تو مسیلمہ کذاب کے قبیلہ کے کئی لوگ جانتے تھے کہ وہ جھوٹا ہے، لیکن قبائل حسد کی وجہ سے دنیاوی چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک طلیحہ نے تو اس کے منہ پر کہہ دیا تھا کہ تم جھوٹے ہو اور محمد ﷺ برحق نبی ہیں۔ لیکن اپنے قبیلہ کا جھوٹا نبی، قریش کے سچے نبی سے بہتر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بدقسمت انسان اپنے اس حسد کی وجہ سے جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ ہی واصل جہنم ہوا۔ مسیلمہ میانہ قد کا تھا اور بدنی طور پر مضبوط آدمی تھا۔ اُس کی ناک چپٹی تھی اور یہی اس کی پہچان تھی۔ ویسے حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک شیطان ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور جب شیطان اس کے پاس آتا تھا تو مسیلمہ کی عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ منہ سے جھاگ بہنے لگتی تھی۔

جنگ یمامہ۔ طرفین کی تیاریاں

پرانے نقشوں میں بھی یمامہ کو ایک شہر کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ جہاں مسیلمہ کذاب کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ سارا علاقہ موجودہ ریاض کے نزدیک ہے۔ اور مسیلمہ کذاب کا قبیلہ بنوحنیفہ اسی علاقے میں آباد تھا۔ بطاح یا بطحا سے یمامہ کو

جوراستہ آتا ہے، وہ وادی حنیفہ میں عقربہ کے نزدیک سے داخل ہوتا ہے اور وہ جگہ وہاں سے تقریباً پچیس میل دور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنوحنیفہ جنگ وجدل کے معاملات کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلامی لشکر وادی کے اندر داخل ہو کر ان کے آباد علاقے اور زرخیز زمینوں سے فائدہ اُٹھائے۔ چنانچہ مسیلمہ ایک لشکر جرار کے ساتھ، جس کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے، اپنے ہیڈکوارٹر کو چھوڑ کر عقربہ پہنچ چکا تھا۔ وہاں پوزیشن میں ہونے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ اگر حضرت خالد ؓ راستے سے ہٹ کر آگے بڑھتے تو مسیلمہ اُن کے بائیں بازو پر وار کر کے اُن کو اپنی مرضی کی جگہ اور وقت پر لڑائی لڑنے کے لئے مجبور[1] کر سکتا تھا۔ حضرت خالد ؓ کو اس چیز کی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے وادی والے راستہ سے ہٹ کر جبلیہ شہر کی مخالف سمت میں ایک اونچی زمین پر پوزیشن اختیار کر لی۔ یہاں سے عقربہ کا میدان مکمل طور پر نظر آتا تھا۔

اسلامی لشکر

حضرت خالد ؓ کے لشکر کی تعداد تقریباً تیرہ ہزار بتائی جاتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہے کہ حضرت خالد ؓ نے چار ہزار کے لشکر کے ساتھ کاروائی شروع کی اور طلیحہ کے ساتھ مقابلے کے وقت تعداد چھ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ یہ تعداد آگے بڑھتی گئی اور مدینہ شریف سے کمک کے ساتھ بطحا کی کاروائی تک یہ تعداد کوئی دس ہزار کے قریب تھی۔ حضرت شرجیل ؓ کا لشکر شامل کر کے کل تعداد تیرہ یا چودہ ہزار کے لگ بھگ ہو جاتی ہے۔ یہی دین فطرت کی اہم بات ہے کہ با مقصد جنگ میں فتح کا اختتامی مقام اس طرح ترقی کرتا جاتا ہے اور اہل حق کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ حضرت خالد ؓ کے لشکر میں صحابہ ؓ بدر سے حضرت سلیط ؓ بھی تھے جو آگے جا کر جسر کی جنگ میں شہید ہوئے۔ خلیفہ اوّل صحابہ بدر اور عمر رسیدہ صحابہ کرام ؓ کو مدینہ شریف میں رکھا کرتے تھے کہ اوّل اُن کو آرام ملے کہ انہوں نے مشکل وقت گزارا تھا۔ اور دوم نوجوانوں کو مواقع مہیا کیے جائیں کہ انہوں نے دنیا فتح کرنا تھی۔ حضرت عمر ؓ نے تبدیلی کر دی کہ ان بزرگوں کو محاذ پر مشیر کے طور پر مامور کر دیا کہ نوجوانوں کو نزدیک سے صلاح میسر ہو سکے۔

حضرت خالد ؓ کے لشکر میں خلیفہ اوّل کے بیٹے عبدالرحمٰن ؓ اور حضرت عمر ؓ کے بیٹے عبداللہ ؓ شامل تھے۔ اور اُن کے چچا زید ؓ بن خطاب بھی تھے۔ صاحب اُحد اور حضور پاک ﷺ سے تلوار حاصل کرنے والے حضرت ابودُجانہ[2] بھی تھے۔ جنگ اُحد میں حصہ لینے والی مشہور صحابیہ اُمِ عمارہ ؓ بھی تھیں اور جنگ اُحد کے عظیم شہید

(۱) جنگ کے اس طریقہ کار کو عملی طور پر سمجھنے کے لئے جلال مصطفیٰ ﷺ کے دوسرے باب میں حضور پاک ﷺ کی تجویز اور کارروائی کو غور سے پڑھیں۔ خاص کر صفحہ ۷۸ اور جنگ کے اسباق پر نظر ڈالیں۔

(۲) تفصیل کے لیے جلال مصطفیٰ ﷺ، صفحہ ۸۹ سے استفادہ کریں۔

اسد اللہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر نیزہ پھینکنے والا وحشی رضی اللہ عنہ بھی آج لشکر اسلام میں شامل تھے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ جنگ احد میں کفار کے سالار حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور اُم المومنین اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اسلامی لشکر میں شامل تھے۔ ویسے متعدد حفاظ اور صحابہؓ لشکر اسلام میں اللہ اور رسول کے نام پر اپنی جانِ عزیز جانِ آفریں کو پیش کرنے پر تیار تھے۔ اصحاب بدر سے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور سالم رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

تبصرہ:

ذرا ان حالات کا اپنے زمانہ سے موازنہ کریں۔ کچھ صاحبان ہیں جن کے لحاظ سے فوج ایک پیشہ ہے اور صرف کچھ ''تنخواہ دار سپاہی'' ہی قربانی کے لئے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ بے چارے تو بے گناہ ہیں اور دشمن بڑا ظالم ہے جو اُن کو بھی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ مرزا غالبؔ والی بات بھی اُن کو پسند نہیں کہ اُن کے آباء شائد فن سپاہ گری کی شد بد رکھتے تھے۔ کچھ لوگ قلمی جہاد کرتے ہیں اور کچھ زبانی کلامی جہاد میں مصروف ہیں۔ کچھ لوگ صرف داد دینے اور تالیں بجانے تک جانے کو تیار ہیں اور جو پیشہ غیروں کے زمانے میں بھی معزز سمجھا جاتا تھا، اس پیشہ کو اختیار کرنے کو لوگ تیار نہیں۔ یہاں تک کہ جہاد کو کچھ ''علماء'' نے جدوجہد کے معنی پہنا دیئے ہیں۔ اور چودہ سو سال سے ہمارے پاس جو جہاد کا ایک کاری ہتھیار موجود تھا، اسے کسی نے فقہ کے تابع کر دیا اور کسی نے ''کوشش'' کے معنی پہنا کر جہاد کو ''نہتا'' کر دیا۔

مسیلمہ کی فوج

جیسے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے مسیلمہ کی فوج کوئی چالیس ہزار ہوگی۔ البتہ جنگ سے پہلے مسیلمہ کا ایک جرنیل مجاعہ بن مرارہ اپنے چالیس جوانوں کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ کسی قبیلہ پر چھاپہ مارنے گئے تھے اور بے خبری اور سوتے میں گرفتار ہوئے، جب وہ خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے مسیلمہ کی پیغمبری میں حصہ داری کو اپنا ایمان سمجھا، تو خالد رضی اللہ عنہ نے مجاعہ کو چھوڑ کر سب کے سر قلم کرا دیئے۔ مجاعہ شائد حالات کی نبض شناسی میں کچھ مدد دے سکے۔ مسیلمہ کو نفری میں برتری حاصل تھی، لیکن مسلمانوں نے جنگ میں جو مہارت حاصل کر لی تھی اس وجہ سے مسیلمہ مسلمانوں کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ مسیلمہ نے اپنی فوج کی دفاعی صف بندی کی۔ میمنہ پر محکم بن طفیل اور میسرہ پر رجال اور درمیان میں کذاب خود تھا۔ عقربہ کا میدان اُن کی پچھلی طرف تھا، جس میں ایاز کا باغ تھا۔ فوج کی صف بندی جبیلہ شہر کے مشرق اور مغرب کی طرف تھی اور وہ مسلمانوں کے حملہ کے منتظر تھے۔ پہلے دو موقعوں کی طرح اُن کو اُمید تھی کہ کامیاب دفاع کے بعد وہ جوابی

حملہ کر کے اپنی کارروائی کو جارحانہ شکل میں تبدیل کر سکیں گے۔

اسلامی لشکر اور اللہ تعالیٰ کا ذکر

اتنا بڑا اسلامی لشکر اس سے پہلے کبھی کسی لڑائی میں شرکت نہ کر سکا تھا۔ مسلمانوں نے ساری رات عبادت اور دُعاؤں میں گزاری۔ حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد یہ پہلی بہت بڑی لڑائی تھی۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ذکر میں بھی مصروف رہے اور انہوں نے اپنے لئے لڑائی کا نعرہ "یا محمد ﷺ" تجویز کیا۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ جھوٹے نبی کے پیروکاروں کے مقابلے میں اپنے نبی کے برحق ہونے کی صدا سے طاقت حاصل کی جائے۔ ایسے نعروں سے طاقت حاصل کرنے کو وہ انسان بہتر سمجھ سکتا ہے۔ جس نے جنگ میں شرکت کر کے یہ تجربہ اپنایا ہو۔ حملہ کرتے وقت ایسے نعروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن دفاع میں بھی یہ نعرے ایک اور جھپٹ کے لئے تیار کر دیتے ہیں۔

اسلامی لشکر کی صف بندی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ خود لشکر کے درمیان میں اسلام کے علم کے سایہ میں کھڑے تھے۔ میمنہ پر زید رضی اللہ عنہ بن خطاب تھے اور میسرہ پر ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اس دفعہ قبائل کو آپس میں شیر وشکر کرنے کے لئے یک جا کر دیا گیا تھا۔ اور ہر چھوٹے دستے کے امیر تلواریں اپنے ہاتھوں لئے دستوں کے آگے چکر لگا رہے تھے۔ قرآن پاک کی آیات بلند آواز سے پڑھ رہے تھے کہ حق آ گیا اور بطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹنے کی چیز ہے۔

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالد رضی اللہ عنہ جانباز ہے یا حیدر رضی اللہ عنہ کرار (اقبالؔ)

اسلامی لشکر کا حملہ

شوال کا مہینہ تھا اور موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ موسم کے لحاظ سے اس زمانے میں سردی شوال ذی قعد[1] میں شروع ہوتی تھی۔ ایک صبح مسلمان اللہ اکبر کے نعروں سے مرتدین پر حملہ آور ہو گئے اور نعرہ تکبیر سے وادیٔ حنیفہ کی فضا میں گونج اٹھیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ از خود لشکر کے درمیانی حصہ کی قیادت فرما رہے تھے اور بازوؤں پر جناب زید رضی اللہ عنہ اور ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ تھے۔ مسلمانوں کا حملہ بھرپور اور بڑے زور شور کا تھا۔ لیکن مرتدین نے مضبوط چٹان کی طرح مقابلہ کیا۔ مسلمان اُن کی صفوں میں گھس گئے اور کئی مرتدین کو واصلِ جہنم کیا لیکن تین گنا زیادہ تعداد والے دشمن پر اس

(۱) جنگ خندق بھی ایسے ہی موسم میں ہوئی۔ جلالِ مصطفٰے تیسرا باب سے استفادہ کریں۔

حملے کے اثرات کچھ زیادہ نہ ہو سکے۔ مسیلمہ اور اُس کا قبیلہ بھی جنگ کے ماہر تھے اور مسلمانوں کو ہوازن اور ثقیف کے بعد پہلی دفعہ عرب کے ایک بہت بڑے جنگجو قبیلہ کے ساتھ واسطہ پڑا تھا، مسلمانوں کے حملہ کا زور ٹوٹ گیا۔ مسیلمہ حالا حالات کو بھانپ گیا۔ اور اُس نے جوابی حملہ کر دیا اور طاقت و نفری کی برتری کی وجہ سے بنوحنیفہ مسلمانوں کو بہت پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بے شک مسلمان جذبہ اور تدبیرات میں اپنا مقام نہ رکھتے تھے۔ لیکن بنوحنیفہ تعداد اور مسیلمہ کے وعدوں کی اُمید پر سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کا دوسرا حملہ

مسلمان دستے کافی پیچھے ہٹ گئے اور بنوحنیفہ کو ڈر تھا کہ یہ کوئی چال نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں پر زیادہ دباؤ نہ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا اچھا موقع فراہم دیا اور اس دوران مسلمانوں نے قبائل کو پھر الگ الگ کر دیا۔ اس تبدیلی نے مسلمانوں کو تازہ دَم کر دیا۔ اسلام نے دلوں کو جوڑ دیا تھا لیکن خون کے رشتہ اور قرابت داری کا بھی مقام ہے۔ جب عقیدہ ایک ہو، وحدت اللہ کے نام پر ہو تو پھر قرابت داری سونے پر سہاگہ ہوتی ہے، ویسے بھی ایک دوسرے کو جاننے کا فائدہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک سیکشن یا پلٹون کے جوان ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ تو مسلمانوں نے اس حملہ کے ساتھ اللہ اکبر اور یا محمد ﷺ کے پُر جوش نعرے لگائے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے گرد کچھ جنگجو اکٹھے کئے اور اُن کا ''ریلا'' بنا کر وہ درمیان میں دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ دائیں بازو سے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر رجال کا خاتمہ کر دیا۔ اور مسلمانوں کے حالات تبدیل ہوئے ہوئے نظر آئے۔ کفار پیچھے ہٹ رہے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مبازرت طلبی شروع کر دی۔ بنوحنیفہ کے کئی جوان آگے بڑھے، لیکن پلک جھپکنے میں باری باری واصلِ جہنم ہوئے۔ مسیلمہ خود جنگ میں کوئی حصہ نہ لے رہا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسیلمہ کے نزدیک پہنچ کر مبازرت طلبی سے یا حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیں کہ اس طرح سے دشمن کی طاقت کا مرکز ختم ہو جاتا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ آگے بڑھتے بڑھتے مسیلمہ کے کافی قریب پہنچ گئے۔ لیکن مسیلمہ مبازرت کے لئے آگے نہ آ رہا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بات چیت کے بہانے سے مسیلمہ کو آگے بلایا۔ لیکن مسیلمہ کا شیطان اُس کے کام آیا اور مسیلمہ منہ پھیر کر بھاگ گیا۔ مسیلمہ بچ تو گیا لیکن بنوحنیفہ نے جب دیکھا کہ اُن کا جھوٹا پیغمبر اللہ کی تلوار کے سامنے نہ ٹھہر سکا تو اُن کے حوصلے پست ہو گئے جہاں وہ لڑ رہے تھے وہاں خون کی ندیاں بہہ چکی تھیں اور جنگ کے بعد وہاں دشمن کی سات ہزار لاشیں گنی گئی تھیں۔ ان حالات میں مسیلمہ کے میمنہ والے کمانڈر محکم بن طفیل نے تمام لشکر کو حکم دیا کہ وہ ایاز کے باغ میں پناہ لیں اور وہ خود اُن کے لئے ریئر گارڈ کا کام کرنے لگا۔ محکم اس لڑائی میں خود کھیت رہا اور دشمن کے کافی

لوگ واصل جہنم ہوئے یا تتر بتر ہو گئے۔ لیکن تیسرا حصہ باغ میں پہنچ گیا۔ وہ باغ قلعہ نما تھا، اس کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ محکم کا سر، خلیفہ اوّل کے بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو قلم کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

ایاز کا باغ

دوپہر کا وقت تھا اور مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑائی اس دن ختم نہ ہو کہ کفار رات کے اندھیرے میں باغ کی دیواروں کو توڑ کر نکل سکتے تھے۔ اور پھر کسی جگہ کمک کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے اور مسیلمہ والا قصہ ختم نہ ہوتا۔ مسلمانوں کے پاس محاصرہ یا قلعہ بند علاقے کو توڑنے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ مشہور محدث اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت گار حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کے بڑے بھائی براء رضی اللہ عنہ بن مالک کو عجیب سوجھی۔ کہنے لگے کہ اُن کو اُٹھا کر باغ کے اندر پھینک دو۔ پہلے تو لوگ نہ مانے لیکن آخر جب اُن کی بات مانی گئی تو وہ دشمن کے سروں پر ایک ''آفت ناگہانی'' کی طرح اس طرح گرے کہ دشمن ڈر گئے اور حضرت براء رضی اللہ عنہ نے دوڑ کر قلعہ کے دروازے کھول دیئے۔ اسلامی لشکر کے مجاہد باہر منتظر تھے۔ وہ پانی کے ریلے کی طرح اندر داخل ہو گئے۔

مسلمان باغ میں تو داخل ہو گئے، لیکن ظاہر ہے وہ تنگ محاذ یا جگہ پر لڑ رہے تھے اور پھیلاؤ اختیار کرنے کے لئے اُن کو عظیم قربانیاں دینا پڑیں۔ حرکت کی زیادہ گنجائش نہ تھی، مسلمانوں کی تمام تر تدبیرات اور ہنر حرکت کے اردگرد گھومتا تھا اور یہ حرکت وہ تلواروں اور نیزوں کی مدد سے کر رہے تھے اور دشمن کو تہ تیغ کر کے آگے بڑھتے جاتے تھے۔

مسیلمہ کا خاتمہ

مرتدین کو مسیلمہ کی ذات پر بڑی اُمیدیں تھیں۔ اس نے اُن کو بڑے سبز باغوں کی اُمیدیں دلا رکھی تھیں، اس لئے وہ دوڑ دوڑ کر اس کے اردگرد آتے اور پوچھتے۔ مسیلمہ اور زیادہ سختی سے لڑنے کا حکم دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شکست میں اُس کی موت ہے، تو اس لئے لڑنے میں ہی کچھ امید تھی کہ شائد شکست سے بچ جائیں۔ مسلمان طاقت کی کشش کے اس مرکز کو ختم کرنا چاہتے تھے اور ہر مسلمان کی خواہش تھی کہ وہ اس مردود کو واصلِ جہنم کر دے۔ لیکن وحشی رضی اللہ عنہ، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور جناب اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا تینوں مسیلمہ کے کافی نزدیک پہنچ گئے۔ اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا مسیلمہ پر وار کرنے ہی والی تھیں کہ ایک مرتد نے وار کر کے آپ کا بازو کاٹ دیا اور آپ کے لڑکے ادھر متوجہ ہو گئے۔ پہلے اس مردود کا خاتمہ کیا، پھر کسی طرح وحشی رضی اللہ عنہ کو موقع مل گیا اور انہوں نے تاک کر مسیلمہ پر نیزہ پھینک دیا جو اُس کے پیٹ میں گھس گیا۔ مسیلمہ ادھر متوجہ ہوا تو جناب ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ دیا۔ اور جیسے ہی یہ اعلان فرما رہے تھے تو ایک مرتد نے بے خبری میں جناب ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا۔ مسیلمہ کے سر کٹ جانے سے مرتدین دل چھوڑ گئے، لیکن باغ سے باہر راستہ نہ تھا، پس کشتوں کے پشتے لگ گئے اور جنگ بڑی مشکل سے شام کو جا کر تھمی۔

مرتدین کی شکست

اللہ کی شان ہے، وہی وحشی ؓ جس نے کفر کی حالت میں اسلام کے عظیم مجاہد جنگوں کے دولہا، اللہ کے شیر، حضور نبی کریم رؤف ورحیم ﷺ کے چچا اور رضاعی بھائی، امامہ ؓ کے والد خاندانِ ہاشم کے درخشندہ ستارے، اسلام کے اوّل علمبردار اور علم حاصل کرنے والے کو شہید کیا تھا۔ اب اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد کذابوں کے باپ اور پہلے بڑے کذاب کو اسی نیزے سے واصل جہنم کیا۔ وحشی ؓ نے بعد میں شام و فلسطین کی جنگوں میں شرکت کی تھی اور لوگوں کو دونوں واقعے سنایا کرتے تھے۔ ایک طرح حضرت حمزہ ؓ کی نرالی شان اور دوسری طرف مسیلمہ کی شیطنت عجب تضاد تھا۔ ام عمارہ ؓ نے مسلمان صحابیات کے ناموں کو چار چاند لگا دیئے اور ان کی کارروائی میں ہماری عورتوں کے لیے سبق ہے کہ عورت کو اسلام نے جو مقام دیا ہے وہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ میدانِ جنگ میں مجاہدہ بن کر بھی وہ چار دیواری و چادر میں موجود رہ سکتی ہے۔ وہ لوری دے کر عظیم مجاہد پیدا کرتی ہے۔ اس کا اسلام میں اعلیٰ وارفع مقام ہے۔

مرتدین کو شکست فاش ہوئی۔ ویسے جنگ میں طرفین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ اور بنوحنیفہ کے تقریباً سب مشہور سردار مارے گئے۔ مجاعہ کو ساتھ لے کر حضرت خالد ؓ نے میدانِ جنگ کا چکر لگایا جو لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ مجاعہ لوگوں کو پہچان کر حضرت خالد ؓ کو بتاتا رہا۔ خیال ہے کہ جنگ کے پہلے مرحلہ میں کوئی سات ہزار کے قریب مرتدین اور اتنے ہی یا اس سے کچھ زیادہ مرتدین، دوسرے مرحلہ میں یعنی باغ کے اندر مارے گئے۔ جنگ میں شاید ہی کوئی مسلمان مجاہد ہوگا جو زخمی نہ ہوا ہو لیکن شہداء کی تعداد کوئی بارہ سو کے قریب تھی۔ ان میں متعدد صحابہ کرام ؓ اور تین سو حفاظِ قرآن شامل تھے۔ روایت ہے کہ اتنے حفاظ کی شہادت کی خبر سن کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے قرآنِ پاک کو جمع کرا کر تحریری شکل دی۔ ایسے اس زمانے میں بے حساب صحابہ ؓ قرآن پاک کو سینہ میں محفوظ کئے ہوئے تھے اور حصوں میں تو تقریباً سب کو ازبر تھا۔

مسلمان شہداء اور لشکر کی حالت

حضرت ابودوجانہ ؓ کے علاوہ بازوؤں کے دونوں مسلمان امیر حضرت زید ؓ اور حضرت ابوحذیفہ ؓ بھی شہید ہوئے اور عظیم صحابی حضرت ثابت ؓ بھی۔ ویسے مسلمان مجاہد تھک کر چور ہو چکے تھے۔ شام کے بعد جس نے جدھر سر رکھا ادھر ہی سو گیا۔ حضرت خالد ؓ لشکر کی حالت کو بھانپ چکے تھے۔ اور بنوحنیفہ کا مجاعہ بھی بھانپ چکا تھا۔ اس لئے مجاعہ نے داؤ کھیلا۔ کہنے لگا یہ فتح آپ لوگوں کو مہنگی پڑی ہے کہ یمامہ کا بڑا لشکر ابھی قلعہ میں موجود ہے۔ حضرت

خالد ؓ حیران ہوئے اور اپنے لشکر کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ نرم شرط پر صلح کے لیے تیار ہو گئے کہ تمام ہتھیار مسلمانوں کے حوالے کر دیئے جائیں اور جنگ کا تاوان بھی لیکن صرف آدھی آبادی کو آزادی ہو گی۔ مجاعہ نے وعدہ کیا کہ وہ یہ شرطیں لے کر قلعہ میں جائے گا اور بچے کھچے سرداروں سے مل کر کوئی فیصلہ کرے گا۔ مجاعہ نے قلعہ کے اندر جا کر تمام عورتوں کو مردانہ لباس پہنا کر قلعہ کی دیواروں پر بٹھا دیا اور واپس آ کر شرطیں اور نرم کرنے کے لیے کہا۔ حضرت خالد ؓ نے اتنے آدمی قلعہ کی دیواروں پر دیکھے تو انہوں نے شرائط نرم کر دیں۔ اور قلعہ کے سب لوگوں کو آزاد کر دیا اور سمجھوتہ ہو گیا۔

حضرت خالد ؓ کو مجاعہ کے داؤ کا پتہ چلا تو غصہ ضرور آیا لیکن مسلمان وعدہ کا پابند ہوتا ہے۔ انہی دنوں خلیفہ اول کا خط آیا جنہوں نے لکھا تھا کہ بنوحنیفہ میں جو لوگ اسلام میں داخل نہ ہوں ان کو معاف نہ کرنا لیکن حضرت خالد ؓ قلعہ کے اندر والے لوگوں کو امان دے چکے تھے۔ خلیفہ اول کو پورے واقعہ سے آگاہ کیا تو انہوں نے بھی فرمایا کہ وعدہ ضرور پورا کیا جائے۔ بہر حال یہ امان قلعہ کے اندر کے لوگوں کے لئے تھی نہ کہ ساری وادی یا علاقہ کے لئے۔ تھکاوٹ ختم ہونے کے بعد مجاہدوں نے دور دور تک بنوحنیفہ کے لوگوں پر چھاپے مار کر پورے علاقہ کو سر کر لیا۔

حضرت خالد ؓ کی شادی

جنگ یمامہ سے چند دن بعد حضرت خالد ؓ نے مجاعہ کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس بات پر بھی مورخین نے کچھ رنگ آمیزی کی ہے کہ حضرت صدیق اکبر ؓ نے حضرت خالد ؓ سے باز پُرس کی اور اُن کو لکھا کہ تمہارے شہدا کا خون ابھی خشک نہیں ہوا۔ اور تمہیں شادی کی سوجھی۔ ہمارا ایک مبصر اس پر مزید تبصرہ کرتا ہے کہ حضرت خالد ؓ کو جب یہ خط ملا تو اس نے کہا کہ یہ سب اعیمر (یعنی حضرت عمر ؓ) کی شرارت ہے۔ تاریخ ابن اسحٰق میں حضرت خالد ؓ کے ایسے الفاظ بالکل موجود نہیں۔ البتہ خط کا ذکر ہے، لیکن اس کے بھی راوی کا ذکر نہیں۔ اوّل تو یمامہ میں چودہ ہزار آدمی مارے گئے اور کئی جوان عورتوں کے لیے خاوند بھی نہ ملتے تھے۔ چنانچہ حضرت خالد ؓ نے اچھے نسب کی لڑکیاں مدینہ شریف بھیجیں جن میں ایک خولہ ؓ بھی تھیں جو ایک سردار جعفر بن قیس کی بیٹی تھیں۔ انہی دنوں حضرت فاطمہ ؓ کی وفات ہوئی تھی اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں سردار حضور پاک ﷺ کا خاندان یعنی بنو ہاشم ہیں۔ تو یہ لڑکی خولہ ؓ حضرت علی ؓ کی زوجیت میں جائے گی۔ حضرت علی ؓ نے منظور فرمایا لیکن حضرت خولہ ؓ نے کہا کہ شرط یہ ہے کہ بیٹا میرے خاندان کے نام پر ہوگا۔ جو حضرت علی ؓ نے منظور کیا۔ تب ہی آپ ؓ کے بیٹے کا نام محمد ؓ بن حنیفہ ہے۔ جن کی اولاد محمود غزنوی ○ کے لشکر کے بھادیہ پر حملہ آور ہوئی اور محمود

غزنوی ○ نے انہیں کوہستانِ نمک میں آباد کردیا۔ اور موجودہ علوی یا اعوان قبائل اُنہی کی اولاد سے ہیں۔ اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی شادی پر کیسے اعتراض کرتے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اُن کو بھلا کیوں بہکاتے خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر کے بعد شادی کی تھی۔

جنگ یمامہ کے نتائج و اسباق

۱۔ خلیفہ اول نے جنگ کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس علاقے کے انتظام کو بہتر کریں۔ مجاہدین کو چھٹیاں دیں اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کے لشکر کو اپنے اگلے مشن پر روانہ کردیں۔ جو بنو قضاعہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے علاقہ میں ہے۔ اس طرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ملکِ شام و فلسطین میں اسلام کا پرچم بلند کرنے کی حکمت عملی بنا رہے تھے۔

۲۔ سرزمین عرب میں مرتدین کے قلع قمع کے لئے خلیفہ اول نے جس حکمت عملی کا اعلان کیا۔ اس کے تحت مسیلمہ کا خاتمہ ہی سب سے بڑا اور اہم کام تھا جو خوش اسلوبی اور ایک باقاعدہ تدبیر کے ساتھ نبھا لیا گیا۔ اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ اگلے حکم کے منتظر تھے۔

۳۔ کلاسوتز اور باقی مغربی مفکرین اور ماہرین کی جنگ کی کتابیں پڑھ لیں ان میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ کارروائی جیسے آگے بڑھتی ہے اس کی شدت میں کمی آجاتی ہے اور فتح کا افتتاحی مقام آجاتا ہے، جہاں کوئی امن کا معاہدہ ہو جاتا ہے یا شکست سے ایک اور جنگ پیدا ہوتی ہے، جو رُخ تبدیل کر دیتی ہے وغیرہ۔ لیکن دین فطرت میں جارحانہ کارروائی یا حملہ جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے اس میں طاقت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور جب تک مسلمانوں نے بامقصد جنگ کو مدنظر رکھا دنیا کی کوئی طاقت ان کو نہ روک سکی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خود دین فطرت کے فلسفۂ حیات پر عمل کرتے تھے اور یہی فلسفہ آگے پیش کرتے تھے، مدینہ سے یمامہ تک کے حالات اس کے ثبوت میں جاتے ہیں۔

۴۔ مسلمانوں نے برتر نفری والے دشمن کے خلاف یہ کامیابیاں اس لئے بھی حاصل کرلیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق حکمت عملی وضع کی اور اپنی تدبیرات کو اس حکمت عملی کے تابع کیا جو متحرک طرز جنگ تھی۔ تمام تر تجاویز کو اس کے مطابق ڈھالا اور کامیابیاں حاصل کیں۔[۱]

۵۔ سارا عرب، مسلمانوں کا دشمن ہو چکا تھا۔ شمال میں رومی اور غسانی قبائل دشمن تھے۔ لیکن ایسی حکمت عملی کا تعین کیا گیا کہ دشمنوں کو اکٹھا ہی نہ ہونے دیا۔ ہر سمت میں ضرورت کے مطابق لشکر بھیج کر دشمنوں کو الجھائے رکھا یا ان پر

(۱) جلال مصطفےٰ کی ۔ جنگ میں اس پہلو کو نتائج کے اثرات سے واضح کیا گیا ہے اور شروع سے پیش لفظ میں صفحہ ۲۵ اور جنگِ بدر میں صفحہ ۶۳ [illegible] سابق کتب میں جدا جدا اسباق ملتے ہیں۔

نظر رکھی اور اس طرح مرتدین کی بڑی طاقتوں کے قلع قمع میں آسانی ہوئی۔

۶۔ جھوٹی نبوت کا جو فیشن ہو گیا تھا۔ وہ مسیلمہ کے عبرت ناک انجام اور بنوحنیفہ کی رزیل قسم کی قربانی کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہاں پر کسی جھوٹے نبی کے بارے میں کم ہی سننے میں آیا۔

۷۔ اسلامی فلسفۂ حیات اپنانے سے قبیلہ قریش اور انصار مدینہ کو ایسی شان حاصل ہو گئی جس سے پورے عرب میں ان کے نام کا طوطی بولنے لگا۔ طبری میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بغاوت کے شروع کے زمانوں میں کسی سفر سے واپس آئے، وہ بڑے سنجیدہ تھے اور حالات کو بھانپنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ ان سے مل کر باہر کے حالات کا پتہ کریں۔ جب آپ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پاس پہنچے تو عظیم صحابہ کا ایک حلقہ آپ کے گرد موجود تھا۔ جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ تقریباً سب عشرہ مبشرہ والے اصحاب بیٹھے تھے اور واقعات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر کچھ خاموش ہو گئے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ فکر مندی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: اسلام کی وجہ سے قریش اور انصار کو جو اعلیٰ مقام حاصل ہوا ہے وہ انشاء اللہ ابد تک قائم رہے گا۔ چنانچہ جنگِ یمامہ اس پیش گوئی کی بنیاد ثابت ہوئی ہے اور یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

۸۔ اسلام وحدت کا علمبردار ہے اور قبائل صرف پہچان کے لئے ہیں۔ جنگ یمامہ میں قبائلی لشکر توڑ دینے سے کچھ نقصان ضرور اُٹھانا پڑا۔ اول یہ شروع اسلام کی بات تھی اور اس وقت مکمل طور پر لوگ ایک دوسرے کو جانتے نہ تھے۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ لڑائی میں اپنے دائیں اور بائیں والوں کو جاننا چاہیے۔ اہل یورپ نے ہمارے لفظ ربط سے لفظ رجمنٹ بنالیا اور جنگ میں رجمنٹوں کا وجود اہم ہو گیا۔ پیشہ ور فوج میں ایک پلٹن کو سوائے کسی خاص مجبوری کے، اکٹھا لڑنا چاہیے اور رسالہ میں سُواڈرن سے نیچے حصے بخرے نہ کئے جائیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں لاہور کے محاذ پر بی آر بی پر یونٹوں کو جس طرح توڑ کر بھان متی کا کنبہ بنا دیا گیا اور خاص کر راقم کی پلٹن کے جس طرح پرخچے اُڑا دیئے گئے تو میدان جنگ میں عظیم قربانی دینا پڑی۔

۹۔ اسلام کا کارواں ازل سے ابد تک رواں دواں ہے۔ اسلام نے کائنات (Universe) کا تصور چودہ سو سال پہلے دیا۔ اور انسان کو از خود ایک چھوٹی کائنات کے طور پیش کیا۔ کہ انسان کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگر انسان اس دنیا اور ظاہر کو ہی سب کچھ سمجھے تو پھر انسان اس دنیا کا ایک عام "حیوان" ہے۔ ایسا فلسفہ غیر اسلامی نظریہ ہے۔

۱۰۔ ہمارے اس مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ پوری قوم کو اللہ کی فوج بنائیں اور عزت و غیرت کی زندگی اختیار کریں

پوری قوم کوفنِ سپاہ گری سے روشناس کرائیں۔اسلامی فلسفۂ حیات کواپنائیں اور صراطِ مستقیم کو ایسے تلاش کریں کہ قوم میں وحدت پیدا ہو۔تاریخ میں جو چیز ہمارے اِن مقاصد کے حاصل کرنے میں روڑے اٹکاتی ہے وہ خراب مثالیں ہیں وہ ہمارے بزرگوں کی تاریخ نہیں ہوسکتی۔ان کوتاریخ سے نکال دینا چاہیے۔

۱۱۔ اسلام کے لحاظ سے ادب قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کے اقوال میں سے ہے۔جولفاظی یا قصہ گوئی صرف ذہنی عیاشی مہیا کرے یا تفرقہ پیدا کرے وہ ہماری روایات نہیں ہیں۔

۱۲۔ اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا کی مثال میں ہماری عورتوں کے لئے اسباق ہیں۔

چوتھا باب

مرتدین کے خلاف حکمت عملی کے نتائج واثرات

قارئین کو پھر ذرا ذوقصہ واپس جانا ہوگا۔ جہاں خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گیارہ لشکروں کو شکل و صورت دی تھی۔ لشکرِ اسلام کے مکمل واقعات ہم پڑھ چکے ہیں۔ لشکرِ دوم حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل کا تھا جس کا سرسری ذکر ہم پچھلے ابواب میں کر چکے ہیں کہ انہوں نے مسیلمہ سے شکست کھائی اور خلیفۂ اول نے ان کو اومان کی طرف روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ کچھ کامیابی کے بعد مدینہ شریف لوٹنا اور پہلے کی طرح غلطی نہ کرنا۔ اومان وغیرہ کے علاقہ جات میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ پہلے ہی کام کر رہے تھے۔ گیارہ لشکروں میں ان کے ساتویں اور آٹھویں لشکر کے طور پر ذکر ہو چکا ہے۔ اومان کے علاقہ[1] کارروائی تک تو امارت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس ہی تھی، لیکن ساتھ ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے لکھ دیا تھا کہ اومان سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ امیر ہوں گے۔ چنانچہ شروع میں یہ تینوں سالارِ لشکر اومان کے نزدیک رجام کے مقام پر اکٹھے ہوئے۔ اس علاقے کے مسلمان عامل حضرت جیفر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباد رضی اللہ عنہ بھی اپنی قیام گاہوں سے نکل کر اسلامی لشکروں میں شامل ہو گئے۔

دبا کی جنگ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کافی عرصہ سے اس علاقہ میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن ان کے پاس جو لشکر تھا اس کی نفری کم تھی اس لئے انہوں نے دشمن کے ساتھ الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ یہاں زیادہ تر قبیلہ ازد[1] آباد تھا۔ اسلام میں آنے کے بعد ان کے قبیلہ کے حضرت حرد رضی اللہ عنہ نے اور قبائل کو بھی اسلام کی طرف راغب کیا۔ اومان کے وسیع علاقہ میں کئی قبائل آباد ہیں اور اس وجہ سے ہر آنے والے مورخ نے بھی مختلف راویوں کے بیانات کے حوالوں سے واقعات کو آپس میں گڈمڈ کر دیا۔ بہرحال نقشہ چہارم کے مطالعہ سے اس علاقہ کے واقعات بہتر طور پر سمجھ آ جاتے ہیں۔ اومان، یمامہ سے بھی نزدیک

(۱) جلال مطفیٰ کے صفحہ ۸۹۔۲۸۸ پر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ لوگ کیسے اسلام لے آئے۔

ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی یمامہ میں ناکامی کے بعد، نزدیک ترین علاقہ اومان ہی تھا۔ جہاں پر ان کو بہتر طور سے استعمال کیا جاتا۔ اس وجہ سے اُن کو اومان جانے کا حکم ملا۔ از دقبائل کو مرتد کرنے والا لقیط بن مالک تھا۔ اس نے نبوت کا دعوٰی کیا یا نہیں اس کا پکا ثبوت نہیں ملتا لیکن وہ امان کا بادشاہ ضرور بن بیٹھا اور دِبا کو اپنا صدر مقام بنایا۔

مسلمان لشکریوں نے علاقہ کے مسلمان لوگوں کو ساتھ ملا کر دِبا کی طرف پیش قدمی کی۔ لقیط نے صف بندی اس طرح کی کہ تمام قبیلوں اور خاندانوں کے بال بچوں کو لشکر کے پیچھے صف بند کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ میدانِ جنگ سے نہ بھاگیں اور اپنے خاندانوں کی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے آخری دم تک لڑیں[1]۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں لشکروں کی تعداد کے بارے مورخین میں اختلاف ہے لیکن حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جو مسیلمہ کے ساتھ کچھ ٹکر لے سکے ان کے لشکر کی تعداد چار ہزار سے کم نہ ہوگی اور اپنے دو لشکروں اور وفادار قبائل کی مدد سے کل نفری چودہ پندرہ ہزار ضرور ہو گی۔ راوی اس بات پر متفق ہیں کہ دس ہزار مرتدین کھیت رہے تو دشمن کی تعداد بھی بیس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ گو مورخین نے جنگ کے حالات تفصیل سے نہیں بتائے اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفائی یعنی (MOPPING-UP) ہو رہی تھی۔ لیکن اسلام آسانی سے نہیں پھیلا۔ دبا کی جنگ کے بارے مورخین اتنا ضرور کہتے ہیں کہ جنگ اتنی شدید اور خونریز تھی کہ ایک دفعہ مسلمانوں کے قدم بھی اُکھڑ گئے، اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے، دو وفادار قبیلے بنی عبدالقیس اور بنی ناجیہ بروقت مدد کے لئے پہنچ گئے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ لقیط مارا گیا اور مسلمانوں کو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی کمانڈ

اس فتح کے بعد اگلے اقدام کا فیصلہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو کرنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اومان کے عامل کے عہدہ پر رہنے دیا کہ خلیفہ اول نے ان کو وہ علاقہ سونپا تھا۔ اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ شریف بھیج دیا۔ مالِ غنیمت اتنا زیادہ تھا کہ ساتھ ایک مضبوط فوجی دستہ بھی بھیجنا پڑا۔ اور فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ اس دستہ کا کمانڈر کوئی چیدہ شخصیت ہوتی۔ نقشہ چہارم پر دیکھیں کہ یہ بھی ایک مہم نظر آئے گی اور جہاں سے مسلمان دستہ ان لونڈی غلاموں اور مالِ غنیمت کے ساتھ گزرا وہاں پر مسلمانوں کا رعب بیٹھتا گیا۔ ایک طرح سے یہ بھی ایک حربی مظاہرہ ثابت ہوا۔

خلیفہ اوّل کی حکمت عملی کی ایک اور جھلک

(۱) جنگ حنین میں مالک بن عوف نے بھی عورتوں اور بچوں کو ساتھ رکھا۔ بوڑھے درید کا اس سلسلہ میں تبصرہ۔ جلال مصطفےٰ کے صفحہ ۲۳۷ پر پڑھیں کہ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ شکست میں عورتوں کے ساتھ ہونے سے ذلت ہوتی ہے۔ لیکن مسلمان عورتوں نے جنگ میں شرکت کر کے درید کی بات کو غلط ثابت کر دیا۔

عسکری معاملات کی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ساری فوجی حکمت عملی پر نظر دوڑاتے ہیں تو دنیا میں ایسی حکمت عملی کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ علاوہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر متعدد وسائل حاصل کر کے آگے بڑھ کر عراق وایران کا رُخ کرنے والا تھا۔ دوسرا حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کے لشکر ایک مرکزی حیثیت حاصل کر رہے تھے۔ اور شام وفلسطین کی مہم کے لئے تیاری کی جارہی تھی۔ اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ جو مال غنیمت لے کر مدینہ شریف گئے۔ وہاں دونوں محاذوں کے لئے ہتھیار، کمک اور جنگی سامان تیار ہو رہا تھا۔ تیسرا دبا کی کامیابی کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا رُخ مغرب میں مہرہ کی طرف تھا کہ باقی علاقوں میں مرتدین کا قلع قمع کیا جائے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی مہرہ کی طرف پیش قدمی

دبا کی جنگ رمضان گیارہ ہجری میں ہوئی اور اب مہری کی باری تھی۔ مہرہ کا علاقہ حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی اور گیارہ میں سے ان کا آٹھواں لشکر تھا۔ حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ بھی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی طرح اس علاقے میں اپنی کم نفری کی وجہ سے کچھ زیادہ کام نہ کر سکے اور پھر تینوں لشکر اکٹھے ہو گئے۔ اب حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ مدینہ چلے گئے تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ ذمہ داری خود سنبھال لی۔ آپ نے متعدد وفادار قبائل کو اپنے ساتھ ملایا اور کچھ دستے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس چھوڑ کر آپ ایک لشکر جرار لے کر مہرہ کی طرف چل پڑے اور ماہ شوال گیارہ ہجری میں وہاں پہنچے۔ اس علاقہ میں دو گروہ تھے اور ان دو گروہوں میں سے کم تعداد والے گروہ شخریت کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اسلام کی دعوت دی دوسرے گروہ سے قبائلی حسد اور اپنی کمی کی وجہ سے شخریت کا گروہ مسلمانوں کے ساتھ مل گیا اور توبہ کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک حکمت عملی تھی کہ اس کے بعد دوسرا گروہ مصبح بھی شاید اپنی کمزوری اور حالات سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ مسلمان خونریزی نہیں چاہتے۔ وہ ایک مقصد کے لئے جنگ کرتے ہیں اور اگر جنگ کے بغیر مقصد حل ہو جائے تو خوشی کی بات ہوتی ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں حکمت عملی آدھی کامیاب رہی۔ مصبح نے اپنی طاقت کے گھمنڈ کی وجہ سے نجد کے مقام پر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی، مورخین صرف اتنا بتاتے ہیں کہ یہ جنگ دبا کی جنگ سے بھی زیادہ خونریز تھی۔ مال غنیمت اتنا حاصل ہوا کہ جس کا حساب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تیز رفتار اونٹنیاں جن کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے، حاصل ہوئیں۔ اور اس جنگ میں مرتدین کا سردار اور متعدد لوگ مارے گئے۔

نجد کی لڑائی کے نتائج

یہ جنگ اتنی فیصلہ کن تھی کہ اس جنگ کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ریاضتہ، الدوضہ، ساحل جزائر، مر،

لیبان، جیروت، ظہور الشجر، صبرات، میغب اور ذرۃ الحمیم کے شہروں اور علاقوں تک پھیل گیا۔ لوگوں سے توبہ کرائی اور وہ اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد کامیابی کی خوشخبری اور مالِ غنیمت کے ساتھ قاصدوں کو مدینہ بھیجا اور خود ابین کے مقام پر مجاہدین کو آرام دینے کے لئے ٹھہر گئے۔ خلیفہ اوّل بڑے خوش ہوئے۔ حضرت عکرمہ ؓ نے جو غلطی کی تھی اس کا ازالہ کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر ؓ نے حکم دیا کہ حضرت عکرمہ ؓ اپنے لشکر کو لے کر حضرت مہاجر ؓ[1] بن اُمیہ اور حضرت زیاد ؓ بن لبید کے ساتھ حضر موت کے علاقوں میں جائیں اور وہاں پر باغیوں اور مرتدین کی سرکوبی کریں۔

حضر موت اور یمن کے مرتدین

عرب سر زمین کے مختلف نقشوں کا مطالعہ اور خاص کر نقشہ چہارم کا مطالعہ ظاہر کرے گا کہ یہ ایک بڑا وسیع علاقہ ہے اور جن شہروں کا ہم ذکر کر چکے ہیں یا آگے کریں گے ان کے بارے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اب وہاں موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے کا یمن آج کل کا یمن نہ تھا۔ ویسے آج بھی دو یمن ہیں اور کچھ علاقے سعودی عرب کی حکومت کے پاس ہیں۔ اس زمانے میں یمن کے علاقے کی حدوں کا کوئی صحیح تعین نہ تھا۔ اصل بات قبائل کی ہوتی تھی کہ کس قبیلہ کی حکومت کہاں تک تھی اور اس کا فیصلہ بھی مشکل تھا۔ معاملات جس کی لاٹھی اس کی بھینس والے تھے۔ بہر حال حضور پاک ﷺ کے زمانے میں یمن کے مختلف علاقوں اور قبائل سے کئی وفد حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور پاک ﷺ نے بھی ادھر کئی مہمات بھیجیں۔ اس سلسلہ میں جلالِ مصطفےٰ ﷺ کے آٹھویں باب میں ہمدان کا وفد، ملوک کنندہ کا وفد، کندہ کا وفد، ملوک حمیر کا وفد، اور وائل بن حجر وغیرہ کے وفدوں کا جو ذکر ہے ان تمام وفود کا تعلق کسی نہ کسی طرح یمن، حضرت موت اور نواحی علاقوں سے تھا۔ اسی جلالِ مصطفےٰ کے ضمیمہ[2] میں جن مہمات کا ذکر ہے وہ بھی یمن کے علاقہ میں بھیجی گئی تھیں۔

اس کتاب کے دوسرے باب کے شروع میں اسود عنسی کی جھوٹی نبوت اور یمن کے مختصر حالات کا ذکر بھی ہو چکا ہے اور چند ماہ جب مسلمان باقی مہمات میں مشغول رہے، یمن کے مختلف علاقوں میں بھی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ یہ جھگڑے کچھ قبائلی بھی تھے کہ آپس میں رقابت اور حسد کی وجہ سے جنگ و جدل کا معاملہ چلتا رہا لیکن ہم ان چھوٹی جھڑپوں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم صرف ان فوری واقعات کو لیں گے، جہاں پر اسلامی لشکر نے صفائی یا (MOPPING UP) والی کارروائی کی اور حالات کو ٹھیک کیا، ورنہ کچھ حالات اس طرح کے بھی رہے کہ جب دو قبیلوں کا آپس میں جھگڑا ہوا تو ایک مسلمانوں کا ساتھی بن جاتا اور دوسرا اس لئے مرتد ہو جاتا کہ اس کا حریف

(۱) حضرت مہاجر ؓ ... ام سلمہ ؓ کے بھائی تھے (۲) صفحہ ۳۵۰ (۳) ...

قبیلہ مسلمانوں کا ساتھی تھا۔ اس طرح سے کئی لوگوں اور قبائل نے کئی پینترے بدلے اور زاہد کا مشہور پہلوان عمروؓ بن معدیکرب بھی ایک دفعہ ایسے ہی چکر میں مرتد ہو گیا لیکن بعد میں توبہ کی اور آگے جنگوں میں ہم اب اس کو اسلامی لشکر میں کارہائے نمایاں دکھاتے دیکھیں گے۔ ہماری اپنی کہانی کو تسلسل دینے کے لئے ہم حضرت عکرمہؓ، مہاجرؓ بن امیہ اور زیادؓ بن لبید کے باہمی ربط و تعاون کی طرف واپس مڑتے ہیں۔

زیاد رضی اللہ عنہ بن لبید

حضور پاک ﷺ کے زمانے مبارکہ سے حضرت زیادؓ بن لبید حضر موت کے عامل تھے، ان کے نزدیک سکاسک اور سکون کے علاقوں کے عامل حضرت عکاشہؓ بن محصن[1] تھے۔ حضور پاک ﷺ نے اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے مہاجرؓ بن اُمیہ کو اسی علاقہ میں کندہ قبائل کے علاقوں کے لئے عامل مقرر فرمایا۔ لیکن مہاجرؓ بیمار ہو گئے اور وہاں نہ جا سکے اور ان کا کام بھی حضرت زیادؓ بن لبید ہی کرتے رہے۔ اس کے بعد جب حضور پاک ﷺ کا وصال ہو گیا تو جگہ جگہ بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یمن اور حضر موت کے بھی کافی لوگ مرتد ہو گئے، لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اومان میں حضرت جیفرؓ اور حضرت عبادؓ کچھ مقامات پر قابض تھے۔ اسی طرح اس علاقہ میں حضرت زیادؓ بن لبید اور حضرت عکاشہؓ بن محصن قابض تھے۔ زکوٰۃ کے جھگڑے وہاں پر بھی تھے اور ایک شندرہ اونٹنی کے سلسلہ میں اختلاف نے کئی جھڑپوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن حالات پھر بھی قابو میں تھے اور حضرت عکاشہؓ تو واپس مدینہ چلے گئے اور وہاں پر حضرت خالدؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے اور بعد میں شہید بھی ہو گئے جو آپ بزوخا کی جنگ میں پڑھ چکے ہیں۔

مہاجر رضی اللہ عنہ بن اُمیہ اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ

مہاجرؓ مدینہ ہی میں تھے اور چونکہ حضور پاک ﷺ آپ کو عامل مقرر فرما گئے تھے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اُن کی وہ امارت قائم رکھی اور ساتھ حکم دیا کہ تبدیل شدہ حالات میں وہ اپنی امارت پر ایک لشکر کے ساتھ جائیں گے اور گیارہ میں سے دسواں لشکر حضرت مہاجرؓ کا تھا۔ حضرت مہاجر کو مجاہد ملنے میں دیر ہو گئی اور انہوں نے کافی دیر کے بعد کوچ کیا اور پہلے جا کر صنعا میں قیام کیا۔ وہاں حالات کا مطالعہ کیا اور پھر خلیفۂ وقت کو آگاہ کیا کہ بغاوت بہت زیادہ پھیل چکی تھی۔ حضرت زیادؓ بن لبید ایک محدود علاقہ پر قبضہ رکھے ہوئے تھے۔ انہی دنوں حضرت عکرمہؓ اومان اور مہرہ میں کام سے فراغت پا چکے تھے تو اُن کو خلیفۂ اول نے حکم دیا کہ وہ یمن اور حضر موت کی طرف پیش قدمی

(1) حضرت [illegible]

کریں اور تینوں لشکر مل کر ان علاقوں سے مرتدین کا خاتمہ کریں۔ بلکہ ان علاقوں کے رابطہ کو طائف کے ساتھ بھی بحال کریں کہ ذرائع آمدورفت پر بھی کچھ باغی قبائل چھاپے مار رہے تھے۔

اس علاقہ میں مسلمانوں کی طاقت اب کافی بڑھ چکی تھی اس لئے حربی مظاہروں اور لشکروں کے کوچ بھی کافی اثر پیدا کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ حضرت زیادؓ کی ایک جھڑپ اہل ریاض کے ساتھ ہوئی اور حضرت زیادؓ کامیاب ہوئے اور انہوں نے مرتدین پر ایک شب خون بھی مارا اس کے بعد حضرت عکرمہؓ اور حضرت مہاجرؓ کا باہمی ملاپ ہوا اور دونوں نے مل کر کنندہ کے قبائل پر فوج کشی کی اور ان کو مطیع کیا۔ البتہ بڑی جنگ حجیر کے مقام پر ہوئی جس میں تینوں اسلامی لشکر شامل تھے۔ مرتدین اشعث بن قیس کی کمانڈ میں تھے، جو عجیب وغریب انسان تھا۔ بڑا چالاک اور ہوشیار تھا اور اُس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اشعث کو شکست ہوئی اور وہ دوبارہ اسلام لے آیا۔ اشعث بن قیس حضرت علیؓ کے زمانہ تک زندہ رہا اور جنگوں میں حصہ لیتا رہا۔

بحرین کی مہم

قارئین کو یاد ہوگا کہ گیارہ لشکروں میں نواں لشکر حضرت علاءؓ بن الحضرمی کا تھا۔ اور خلیفہ اوّل نے آپ کو بحرین کے لئے مامور فرمایا تھا۔ آپ دراصل حضور پاک ﷺ کے زمانے سے بحرین کے عامل چلے آتے تھے۔ اور حضور پاک ﷺ کی وفات کے وقت آپ مدینہ میں تھے۔ آپ بحرین تب تک نہ جا سکتے تھے جب تک یمامہ میں مسیلمہ کذاب کا خاتمہ نہ ہوتا تو آپ نے وہی راستہ اختیار کرنا تھا۔ چنانچہ جنگ یمامہ کے بعد گیارہ ہجری ذی قعد کے مہینے میں آپ وہاں پہنچے اپنے لشکر کے علاوہ بحرین کے وفادار مسلمانوں کو بھی آپ اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے اور آپ نے مرتدین کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ مرتدین نے دفاعی جنگ کو اپنایا اور اپنے سامنے خندق کھود لیں۔ مسلمانوں نے کافی حملے کئے لیکن مرتدین کا کمانڈر حطم کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے حملوں کو پسپ کرتا رہا۔ بلکہ مرتدین کئی دفعہ اپنے مورچوں سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور بھی ہوئے۔ مورخین نے اس لڑائی کو ہجر کی مورچہ بند لڑائی کا نام دیا ہے۔ جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ آخر ایک رات کو دشمن کے لشکر میں کچھ بوکھلاہٹ اور شوروغوغا سننے میں آیا۔ مسلمانوں نے مخبری کی تو پتہ چلا کہ تمام لشکر شراب میں دھت ہے، کچھ کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے کہ انہوں نے زیادہ شراب پی لی تھی۔ یہ موقع مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے دیا۔ انہوں نے رات کے وقت ہی حملہ کر دیا۔ آگے دیکھا تو سنتری بھی سوئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مرتدین گاجر مولی کی طرح کٹ گئے اور انہوں نے شکست فاش کھائی۔

دشمن کا تعاقب

دوسرے روز صبح حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے دشمن کا تعاقب کیا اور دشمن نے ایک ساحلی علاقہ پر مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر جگہ پر مرتدین کا خاتمہ ہو چکا تھا اور یہ چند مرتدین بھی یا تو واصلِ جہنم ہوئے یا تتر بتر ہو گئے اور اس طرح سے تمام سرزمین عرب کفر اور شر سے پاک ہو گئی۔ ان تمام کارروائیوں پر کوئی نو ماہ کا عرصہ صرف ہوا۔ حضرت علاء رضی اللہ عنہ بن الحضرمی کے ساتھ اس کتاب کے آخری ابواب میں ہماری پھر ملاقات ہو گئی جہاں پر آپ نے ایران کے صوبہ فارس کو سمندر کے راستے فتح کرنے کی کوشش کی، وہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کوشش کی وجہ سے اسلام کا رُخ ادھر ہو گیا۔

حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ

اب صرف گیارہواں لشکر باقی رہ گیا ہے۔ اس لشکر کو کسی کام پر لگانے کی ضرورت نہ پڑی۔ ویسے حضرت سوید رضی اللہ عنہ اور ان کے عظیم بھائیوں سے اکثر ہماری ملاقات ہوتی رہے گی۔

مرتدین کے خلاف کارروائی کے نتائج کا خلاصہ

نقشہ اول سے نقشہ چہارم تک کا مطالعہ دوبارہ کریں۔ نقشہ اوّل میں مرتدین کے مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سارا عرب باغی نظر آتا ہے۔ نقشہ دوم میں مدینہ کے نزدیک کی کاروائی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور نقشہ سوم اور چہارم پوری حکمت عملی کے تحت کارروائیوں کا خاکہ ہیں۔ ان نقشوں کی مدد سے فوجی حکمت عملی اور لشکروں کے کمانڈروں کی تدبیرات آسانی سے سمجھ آسکتی ہیں اور بہتر ہے کہ ہم ان مثالوں سے فوجی سبق سیکھیں۔ دیول اور منٹگمری کی کہانیاں پڑھنے سے یا فلر اور لیڈل ہارٹ کے فلسفوں سے وہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جو دین فطرت کے جنگی ماہرین کی جنگوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ کلاسوٹز جیسا ماہر اور غیر جانبدار مبصر بھی فتح کے اختتامی مقام اور عوام کی جنگ میں شرکت والے مضامین پر آ کر رُک جاتا ہے اور اس کو آگے ساحل نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود ہم اس کے فلسفہ جنگ سے مرعوب اور متاثر ہیں۔ غیروں کی اندھا دھند تقلید سے بچ کر رہنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ ہم اپنے سپہ سالاروں کی جنگوں سے اسباق سیکھیں اور غیروں کی نقالی اپنے مقاصد کو سامنے رکھ کر کریں۔

ان چار ابواب میں اس حکمت عملی کی جھلکیاں ہیں جو خلیفہ اول نے مضبوط مرکز اور قومی وحدت کے تحت اختیار کیں اور اندرونی خلفشار کو دور کر کے مسلمانوں کو ایک دفعہ پھر ایک بند میں باندھ کر اس طرح اکٹھا کر دیا کہ سب ایک دوسرے کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اور تفرقے مٹ گئے۔ اس میں تلوار ضرور استعمال کرنی پڑی کہ اس جہان کو دوام نہیں اور بقول علامہ اقبال: اہل فرنگ اگر جنگ کے ذریعہ سے اس عیش جہاں کو دوام دے رہے ہیں تو ان کی یہ

تمنا خام ہے۔ اسلام میں جنگ کا مقصد یک رنگی پیدا کرنا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری وساری کیا جاتا ہے۔

ہاں البتہ ایسا کرنے کے لئے ہمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ

(اقبالؔ)

گیارہ لشکروں کی کاروائی کا اجمالی خاکہ

دوسرے باب میں جن گیارہ لشکروں کی تنظیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی کارروائیوں کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت خالد ؓ بن ولید کا لشکر:۔ اوّل بنو طے اور جدیلہ کو اسلام میں واپس لے آئے۔ پھر طلیحہ کا قلع قمع کیا۔ بعد میں ابوشجرہ، اُم سلمٰی اور مالک ابن نویرہ کو زیر کر کے مسیلمہ کے فتنہ کو ختم کیا۔ اگلے دس بارہ ابواب میں ان کے ساتھ اکثر ملاقات رہے گی۔

۲۔ حضرت عکرمہ ؓ بن ابوجہل نے، یمامہ کے علاقہ میں مسیلمہ پر نظر رکھنے کی بجائے ٹکر لی اور نقصان اُٹھایا۔ وہاں سے خلیفۂ اوّل کے حکم پر اومان میں حضرت حذیفہ ؓ اور حضرت عرفجہ ؓ کی مدد کو گئے اور وہاں سے یمن اور حضر موت میں زیاد ؓ بن لبید اور حضرت مہاجر ؓ بن اُمیہ کے ساتھ مل کر ان علاقوں سے مرتدین کا خاتمہ کیا۔

۳۔ حضرت شرجیل ؓ بن حسنہ:۔ حضرت عکرمہ ؓ کے ریز رو اور پھر ان کی جگہ لینا اور وہی غلطی دہرانا۔ حضرت خالد ؓ کی سرزنش اور بعد میں جنگ یمامہ میں شرکت۔ اس کے بعد حضرت عمرو ؓ بن عاص سے مل کر بنو قضاعہ کی سرکوبی اور دومۃ الجندل اور تبوک تک حربی مظاہرے، آئندہ فتوحات شام کی بنیاد بننے میں کام کرنا۔

۴۔ حضرت عمرو ؓ بن عاص:۔ اپنی لی ہوئی ذمہ داری پوری کی اور شرجیل کی آمد کے بعد حربی مظاہروں میں تیزی کی۔

۵۔ حضرت خالد ؓ بن سعید:۔ شام و فلسطین کی سرحدوں پر کامیاب حربی مظاہرے کئے۔

آپ کی کارروائیوں کی تفصیل جلد دوم میں آئے گی۔ آپ سپہ سالاری پر زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے۔ آپ کا ذکر جلالِ مصطفےٰ میں بھی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے آپ کو مہمانداری کے فرائض سونپے۔

۶۔ حضرت طریفہ ؓ بن حاجز:۔ مکہ و مدینہ کے درمیانی علاقوں میں مرتدین کا قلع قمع کیا۔ فجاہ اور ابوشجرہ کے فتنوں کو ختم کرنے میں حصہ ادا کیا۔ حضرت خالد ؓ کے ساتھ رابطہ اور اس کے بعد ان کے لشکر کے مجاہدین کو دوسرے

لشکروں میں بانٹ دیا گیا۔

۷۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بن محصن :۔اومان کی کارروائی میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر کام کیا اور پھر اومان کی امارت سنبھال لی۔ بعد میں آپ ایران کی فتوحات کے وقت بھی اسلامی لشکروں میں شریک ہوئے۔

۸۔ حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ بن ہرثمہ :۔اومان کی کارروائی میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دبا کی جنگ تک کام کیا، پھر مدینہ چلے گئے اور آپ کی ذمہ داری حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے سنبھال لی۔ جنگ جسر کے بعد آپ پھر عراق کے محاذ پر چلے گئے۔

۹۔ حضرت علا رضی اللہ عنہ بن الحضرمی :۔بحرین کو مرتدین سے پاک کیا، اس کتاب کے آخری ابواب میں ان کے ساتھ پھر ملاقات ہوگی۔

۱۰۔ حضرت مہاجر رضی اللہ عنہ بن اُمیہ :۔ پہلے صنعا میں قیام اور پھر حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرموت اور یمن میں مرتدین کا قلع قمع کیا اور پھر وہاں کی امارت سنبھال لی۔

۱۱۔ حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن :۔ریزرو میں رہے۔

اختتامی تبصرہ

ہم ان چار ابواب کا ایک الگ حصہ اور ''مرتدین کا قلع قمع'' کا نام دینا چاہتے تھے۔لیکن سارے مضمون کو چار حصوں یا جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے تو آگے حصے بنانے سے اور حوالہ دینے میں معاملات کچھ گڈمڈ ہو جائیں گے۔ ان ابواب کا مختصر اختتامی تبصرہ یہ ہے کہ خلیفہ نے اندرونی خلفشار کو ختم کیا اور اسلام کی مرکزیت کو قائم رکھا۔ ان کارروائیوں کے بعد اہل اسلام عرب کی سرزمین سے نکل کر عجم یعنی ''بین الاقوامی'' دنیا میں داخل ہونے کے لئے پر تول رہے تھے۔یاد رہے کہ اسلام ملکوں کے نام پر کسی قومیت کو کچھ وقعت نہیں دیتا اور یہ الفاظ ہم غیروں سے ''مستعار'' لے کر بیان کر رہے تھے۔ ورنہ اسلام میں قومیت نظریاتی اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔اور ہر ملک، ملکِ ما است۔

جیسا کہ پیش لفظ میں ذکر کیا گیا ہے اس حصہ میں یہ حکمت عملی ہے کہ مسلمان ایران اور عراق کے علاقوں کی طرف بڑھیں۔اور دوسرے حصہ میں شام و فلسطین کی طرف۔ اگلے باب جو فتوحاتِ عراق میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان کی بسم اللہ اسلام کے ایک عظیم فرزند سے کی جا رہی ہے۔مورخین نے ان کا ذکر بڑے پیارے انداز میں کیا ہے، لیکن ان کی شخصیت کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کم کی گئی ہے۔انہوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دیں وہ ضرور بیان کی گئی ہیں۔لیکن نہ تو ان کو دنیاوی عہدوں میں ان کی شخصیت کے مطابق اعزاز ملے اور نہ مورخین نے ان کو وہ اعزاز بخشا جس کے وہ حق دار تھے۔

یہی حالات اسلام کے اس عظیم فرزند کے قبیلہ بنو بکر کے ہیں جنہوں نے مسلمانانِ عرب کے انصارین کو اسلام کو عجم یا ''بین الاقوامی'' دنیا میں پھیلانے وہی کردار ادا کیا جو انصارِ مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ مل کر اسلام کو سرزمین عرب میں پھیلانے میں کیا۔ حالانکہ بنو بکر اوسطاً تعداد میں کم تھے اوران کی خدمات کا انصارِ مدینہ کی خدمات کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کہا تو جا سکتا ہے کہ بنو بکر نے انصارِ مدینہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ اسلام کے یہ عظیم فرزند حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث تھے۔ جن کے لئے ہم اپنی کتاب کا پانچواں باب وقف کر رہے ہیں۔

خونِ دل و جگر سے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

(اقبالؔ)

پانچواں باب

حضرت مثنیٰ بن حارث رضی اللہ عنہ

حضرت مثنیٰ بن حارث رضی اللہ عنہ جن کو حارثہ شیبانی بھی کہتے ہیں کا تعلق قبیلہ بنو بکر سے تھا۔ یہ قبیلہ سرزمین عرب کے شمال مشرق اور عراق کے جنوب میں آباد تھا۔ جلال مصطفےٰ میں بنو سعد بن بکر کے جس وفد کی مدینہ میں آمد کا ذکر ہے۔ وہ آپ ہی کے قبیلہ کے بارے میں ہے ظاہر ہے کہ آپ کا قبیلہ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں مسلمان ہو چکا تھا۔ مثنیٰ اس وفد میں شامل تھے یا نہیں اور کیا اُن کو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں مورخین کوئی روشنی نہیں ڈال سکے اور یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ کو حضور پاک ﷺ کا ''دیدار عام'' نصیب ہوا یا نہیں لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کو جس طرح اللہ اور رسول کے نام پر استعمال کیا ایسا شرف دنیا میں چند خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے اور ایسے انسان دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ابن سعد نے اپنی تاریخ میں البتہ ایک اور وفد شیبان کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت حرملہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک وفد آیا، جو لوگ عراق، عرب کی سرحد پر ایک طرف بنو تغلب اور دوسری طرف بنو تمیم کے درمیان آباد تھے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا قبیلہ ہو لیکن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے نام کا کہیں ذکر نہیں۔

عظیم فرزند اسلام جلال الدین خوارزم نے جب کالاباغ کے نزدیک دریائے اٹک کو پار کیا اور دریا کے مشرقی کنارے پر بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے ستانے لگے۔ تو مغربی کنارے پر کھڑا چنگیز خان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سرداروں نے اجازت چاہی کہ جلال الدین کے تعاقب میں دستے بھیج کر اسے گرفتار کریں۔ چنگیز خان نے کہا ''نہیں''! تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسے فرزند کوئی ماں جنتی ہے۔ چلو واپس چلو۔ آگے بڑھ کر اور کچھ نہ حاصل کر سکو گے۔'' دین فطرت نے اس قسم کے عظیم فرزند ہر زمانے میں پیدا کئے۔ ہاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت کو البتہ بھانپ لینا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے اور وہاں تو صرف عاجزی والی بات ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں جسارت

سے بھی ڈر لگتا ہے کہ حق ادا نہ ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور اس کی مکمل سوجھ بوجھ ناممکن ہے۔

ہاں البتہ جس نکتہ کی طرف ہم آ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انصار[1] مدینہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی طرح ایسے اسلام کے فرزندوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو بڑے عظیم تھے لیکن نہ ان کو دنیا میں کوئی رتبہ ملا اور نہ ہی مورخین اور قوم نے ان کو یاد رکھا۔

تبصرہ

دور مت جایئے اسی زمانے میں پاکستان کی تحریک کے ہراول دستے میں چند سکاؤٹ تھے۔ جن کی ایک ہی ادا نے انہیں غازی اور شہید بنا دیا۔ وہ ناموسِ رسول ﷺ پر قربان ہو گئے۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ ٥ اور قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ ٥ ان سب سے واقف تھے۔ یہ عظیم مجاہد اس خطہ میں دونوں جنگوں کے درمیان والے عرصہ میں اسلام کے نام کو چار چاند لگا گئے، اور اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ہم نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا، جس کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا لیکن ہم ان سکاؤٹوں کو بھول چکے ہیں اور کئی اور بھی ہوں گے جن کے بارے کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ وہ اسلام کی کیا خدمت کر گئے اور وہ گمنام مجاہد ہوں گے۔ غیر قوموں کے ہاں تو گمنام سپاہیوں کی ایک یادگار بھی بنائی جاتی ہے لیکن اسلام میں اس کا تصور نہیں کہ مومن سب اللہ کے سپاہی ہیں اور ان کی جزا اللہ کے پاس ہے اور ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ اور رسول کے لئے کرتے ہیں اور نہ شہرت کے لئے۔ اگر کسی کی یادگار ہے تو بھی صحیح ہے اگر نہیں تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ قبر بھی ایک استعارہ ہے ورنہ مومن زندہ ہوتا ہے اور اس دنیا کے دروازے کو کھول کر وہ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔

غازی اور شہید

جن مجاہدین یا بزرگوں کے مزاروں یا یادگاروں پر ہم حاضری دیتے ہیں وہ بھی اللہ اور رسول ﷺ کے لئے دیتے ہیں اور فاتحہ پڑھنے کے بعد دعا یہ مانگتے ہیں کہ اے رب العالمین ہم جن صاحب کے نشان پر حاضر ہوئے ہیں وہ تیری راہ میں بڑے نیک کام کر گئے۔ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ ایسے بزرگوں کی تلاش ضروری ہے اور پاکستان کے جن سکاؤٹوں کو ہم بھول چکے ہیں۔ وہ غازی عبدالرشید شہید، غازی علم الدین شہید، غازی ملک میاں رحمتہ اللہ علیہ محمد شہید غازی عبدالقیوم شہید، غازی مرید حسین شہید اور غازی دوست محمد شہید ہیں۔ یہ ناموسِ رسول ﷺ پر قربان ہو گئے۔

(۱) انصار مدینہ کے سلسلے میں جلال مصطفےٰ کے صفحہ ۲۴۹ سے ۲۵۲ تک استفادہ کریں۔ یہ اللہ کا راز ہے کیونکہ ان کے لئے اکیلے حضور پاک ﷺ کافی ہیں جنہوں نے ان کے شہر یثرب کو مدینۃ النبی ﷺ بنا دیا، انصار کی خدمات کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتی۔ لیکن اپنی تاریخ دیکھیں نہ ان کو

جنگ کے نبض شناس

اسی طرح حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث کو بھی بھولتے جاتے ہیں۔ وہ شیر جتنا دل گردہ رکھتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو فولادی جسم عطا کیا تھا۔ میدانِ جنگ اور شکارگاہ میں کوئی فرق نہ سمجھتے تھے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ نے جنگ کے حالات سمجھنے کی ایسی توفیق عطا فرمائی تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ لڑائیوں کے نتائج کا پہلے ہی اندازہ لگا لیتے تھے۔ ایک بار آپ رضی اللہ عنہ مدینہ شریف میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگی حالات کا جو تجزیہ آپ نے پیش کیا وہ خلیفۂ وقت کے اپنے تجزیہ کے عین مطابق تھا۔ خلیفہ وقت نے ان کے خیالات کو اپنی حکمت عملی کا حصہ بنایا اور لشکر کے امیروں کو لکھا کہ اُن کی تدبیرات کو اپنائیں۔ اس کے باوجود نہ کبھی آپ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری ملی اور نہ ہی آپ نے کبھی اس کے لئے خواہش ظاہر کی یا شکایت کی۔ ہمیشہ کسی سپہ سالار کے ماتحت کام کیا اور نہایت دیانتداری سے خدمات انجام دیں۔ ہاں صرف ''وقتوں'' نے سپہ سالاری کا تاج ان کے سر پر رکھا اور ایسے وقتوں میں اسلام کی وہ خدمت کی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت نے ان کو ناپ وتول کر کے تیار رکھا تھا کہ آپ ان حالات کو سنبھالا دیں۔

اسلام کے عظیم فرزند

اگلے چند ابواب میں آپ رضی اللہ عنہ اکثر ہمارے ساتھ رہیں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ بھرپور جوانی میں تھے اور جوانی میں ہی شہادت نصیب ہوئی۔ تلوار زنی، داؤ، سلیقہ، جھڑپ، چھاپہ، حفظ ماتقدم کی کارروائی، کمانڈ، حربی فن کا جو مظاہرہ آپ نے کیا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہایت طاقتور تھے اور آپ کا ذہن کسی منجھے ہوئے مدبر کی طرح چوکنا تھا۔ جنگ جسر میں زخموں سے چور ہو گئے اور انہی زخموں کی وجہ سے بعد میں شہادت نصیب ہوئی۔ اُس جنگ میں انہوں نے مسلمان مجاہدین کو جس طرح دشمن کے چنگل سے چھڑایا وہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ پھر ان زخموں کے ہوتے ہوئے دشمن کے ساتھ جنگوں سے گریز نہ کیا۔ آئندہ کے مسلم سپہ سالار حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کے لئے جو ہدایات اپنے بستر شہادت پر اپنے بھائی معنیٰ کو دیں وہ آگے آئیں گی۔ جن کو پڑھ کر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم اسلام کے اس عظیم فرزند کو سلام کرتے ہیں جس کی لحد سے یہ صدا آ رہی ہے۔

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو بنایا راز الوندی

(اقبال)

چھٹا باب

ایران وعراق کے جغرافیائی اور تاریخی عوامل

تمہید

جن ملکوں کی طرف اب فرزندانِ اسلام یلغار کرنے والے تھے وہ ہمارے ہمسائے ملک بھی ہیں اور جانے پہچانے ہیں کہ ہمارے خطے میں اسلام اسی راستے سے آیا اور ہماری تاریخ ان ملکوں اور خطوں کے ساتھ نہ صرف روحانی طور پر وابستہ ہے بلکہ عملی طور پر بھی ہم اکثر شیر وشکر ہوتے رہے۔ ہماری ثقافت، ادب اور ہماری زبان پر بھی ان ملکوں کے عظیم راہنماؤں کے اثرات ہیں۔ عربی زبان اور عراق کے راہنماؤں سے تو ہم نے ہمیشہ روحانی غذا حاصل کی لیکن فارسی زبان کو بھی ہم نے سر آنکھوں پر لگایا کہ اکثر اس زبان نے بھی ہمیں اسلام کی صحیح لوری دی۔ عراق سے جناب پیر دستگیر رحمۃ اللہ علیہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ○، امام رحمۃ اللہ علیہ ماتریدیہ ○، فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ ○، فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ ○، جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ○ ، بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ○ شبلی رحمۃ اللہ علیہ ○، منصور رحمۃ اللہ علیہ ○ اور متعدد علماء وفقراء، جن میں فقہ کے علماء امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ○، امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ ○، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ○ شامل ہیں۔ سب ہمارے لیے ایسے ہیں کہ جیسے وہ ہمارے سروں کے تاج ہوں۔ ایران سے شیخ سعدی ○، جامی رحمۃ اللہ علیہ ○، حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ○، اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ○ کے کلام کے اثرات بیسویں صدی کے شروع تک مسلمانوں کے گھر گھر میں موجود تھے۔ جو لوگ ایران میں اسلام کے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتے رہے۔ ان کو ہم نے اپنا رہنما ہی مانا۔ ہاں عمر خیام کی رباعیوں یا فردوسی کے شاہناموں نے جب دوسری تہذیبوں اور تمدن یا ذہنی عیاشی کی باتیں کہیں تو کچھ غلط روایت بھی اس راستے سے ہمارے بیچ داخل ہو گئیں۔ اسلام کے اصول سیدھے ہیں۔ زبان ایک ہو تو بڑا اچھا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو مفہوم ایک ہو تو وحدت آ ہی جاتی ہے اور ہمارا رشتہ اللہ اور رسول ﷺ کے واسطہ سے ہے۔ لیکن یہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بج سکی۔ ہر خطہ کے مسلمان ایسا سوچیں تو تب اُمت واحدہ کا تصور ابھر سکتا ہے۔ اگر ملکوں اور خطوں کی بنیاد کسی اور نظریہ یا باطل نظریہ پر ہو تو پھر بقول علامہ اقبالؒ ''کیا خاک

مسلمان ہوں گے؟''

جغرافیہ

جہاں تک ایران وعراق کے جغرافیہ کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں۔ زمینی طور پر یہ علاقے وہی ہیں جو پہلے تھے۔ ہاں دریائے دجلہ اور فرات اپنی راہگزر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اور ایران وعراق میں جنگلات کی کمی کی وجہ سے موسموں میں تبدیلی آ گئی ہے۔ سیاسی تبدیلیاں چودہ سو سال تک ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔ لیکن جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں عراق بھی ایرانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ بلکہ ایرانی سلطنت یمن تک پھیلی رہی عراق میں عرب قبائل تھے اور ایسا بخت نصر کے زمانے سے ہے۔ بخت نصر وہی تھا جس نے چھ سو سال قبل مسیح یہودیوں کو پہلی دفعہ نیست و نابود کیا تھا۔ بہر حال عرب قبائل کو عراق میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ ویسے یمن یا ریگستانی علاقوں سے کئی عرب قبائل عراق کی زرخیز وادیوں اور دریاؤں کے طاس میں جس کو سواد کہتے تھے وہاں جا کر آباد ہو جاتے تھے۔ بنو طے، بنو لخم، بنو تغلب وغیرہ کئی قبائل یمن سے ہجرت کر کے ان خطوں میں گئے۔

تاریخی پہلو

دجلہ اور فرات دنیا کے مشہور ترین دریا ہیں اور بابل کی حکومت کے زمانے میں بھی یہاں کی تہذیب دنیا کی جانی پہچانی اور مانی ہوئی تہذیب تھی لیکن سلطان محمود غزنوی ٥ کی طرح ہمارا تاریخی مطالعہ بھی بامقصد ہے۔ محمود ٥ اسلام کی تاریخ کو شعروں میں سننا چاہتے تھے۔ فردوسی نے ایک شاہنامہ لکھ ڈالا جس میں ایرانی تہذیب، ثقافت، خاندان، بادشاہت، کسریٰ، پرویز، جمشید، شہنشاہان، کجلاہوں اور خسروان ثریا جاہ، کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ محمود ٥ کو جب فردوسی نے یہ سب پڑھ کر سنایا تو محمود ٥ کی روح کو ذرا بھر بھی تسکین حاصل نہ ہوئی۔ محمود ٥ نے کہا وہ تو یہ چاہتا تھا کہ اے فردوسی تو سرکار دو عالم حضور پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام سے تاریخ شروع کر کے آگے بڑھاتا اور دنیا کے ملکوں سے قافلہ اسلام کو شاہین کی طرح گزارتا اور ایسے لوگوں کی تاریخ لکھتا جن کے ساتھ میرا اور میرے بزرگ ابوالحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ ٥ کا تعلق ہے۔ یہ تم نے کیا کیا کہ ''جمشیدوں'' اور ''کسراؤں'' کی تاریخ لکھ دی۔

اب ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے دانشوروں نے ساری کہانی کو رنگ ہی اور دے دیا اور وہ الفاظ کی قیمت کے چکر میں پڑ گئے کہ محمود ٥ نے فردوسی کو سونے کا ایک سکہ فی شعر کی بجائے چاندی کا ایک سکہ دینا کیا۔ اگرچہ بات بھی صحیح ہے کہ فردوسی اپنے لفظوں کی کم قیمت سن کر دل برداشتہ ہو کر چلا گیا اور اس غم میں مر گیا کہ اس کے الفاظ سستے بک

رہے تھے تو اس کی بڑائی کا پول ادھر ہی کھل جاتا ہے۔ ویسے محمود ○ نے تو فردوسی کو کہا بھی نہ تھا کہ وہ تاریخ لکھے۔ محمود ○ نے نے ویسے کسی ایسی جگہ خواہش ظاہر کی تھی۔ محمود ○ حضور پاک ﷺ کا غلام تھا۔ اس نے اسلامی فلسفہ حیات ایک جملے میں بیان کر دیا کہ وہ محمود بت فروش کی جگہ محمود بت شکن کے نام سے پکارا جانا پسند کرے گا۔ جس کا مقصد حیات ہی یہ ہو کہ روز قیامت اللہ کے سامنے کیا جواب دے گا۔ اس کے سامنے سونے اور چاندی کی کوئی قیمت نہیں اور اس عظیم مجاہد کے خلاف یہ اور کوئی ایسے بہتان ہماری تاریخوں میں موجود ہیں۔ جن کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ان غلیظ بہتانوں کو سمندر میں کیوں نہیں ڈبو دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ساری عسکری تاریخ لکھنے کی سعادت بخشی تو محمود ○ کی عظمت کو کھل کر بیان کیا جائے گا کہ وہ اسلام کا عظیم فرزند تھا۔

غلط نقالی

بات معاملات کی روح تک پہنچنے کی ہوتی ہے۔ تاریخ کے غلط مطالعے سے اور غیروں کی دنیاوی اور جھوٹی عظمت سے متاثر ہو کر، ہم خود غلط ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ جس طرح رضا شاہ پہلوی آریہ مہر اور پتہ نہیں کیا کیا بن گیا اور شاہ رخ یا "سیرس" کی بادشاہت کے اڑھائی ہزار سال منانے کے چکر میں پڑ گیا اور یہ بھول گیا کہ ایران اب مسلم ایران ہے اور اللہ کے حبیب ﷺ کے غلام ہیں۔ "کسراؤں" والی بات ختم ہے۔ یہ نکتہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ ہم بھی ٹیکسلا، ہڑپہ اور مہاجندارو کی تہذیبوں کے گن گانے لگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم مصطفوی ﷺ ہیں۔ اول "بندے ماترم" کا ترجمہ کر کے "پاک سرزمین شاد باد" کے چکر میں پڑ کر کافی نقصانات کر چکے ہیں، ابھی تو "سایہ ذوالجلال" کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں، ورنہ سارا پاکستان "شاد باد" ہو جاتا کہ سوہنی دھرتی کی پوجا جو شروع کر دیا اور زمین عوام کہ اللہ کا شریک بنانے لگ پڑتے ہیں۔

ماحصل

اس سب بیان سے ہم اس مقصد پر آتے ہیں کہ ایران کی پرانی تاریخ میں ہمارے لئے کچھ بھی نہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص نے جب ایک لائبریری کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ بڑی شاندار ہے تو آپ نے لکھا فن اور ہنر کی کوئی کتاب ہو تو رکھ لینا۔ باقی سب کو جلا دو اور ساتھ ہی لکھا کہ "اے سعد رضی اللہ عنہ سنو! اگر ان کتابوں میں فلسفہ، نظریہ یا معاشرت وغیرہ کی کوئی اچھی باتیں ہیں تو ہمارے کام کی نہیں کہ ہر پہلو پر ہمارے پاس اللہ کے احکام اور حضور پاک ﷺ کی سنت موجود ہے یعنی ان سے بہتر احکام آ چکے ہیں۔ اس لئے ان کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اگر ان

کتابوں میں ذہنی عیاشی والا ادب ہے یا غلط قسم کا فلسفہ ہو تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔''

بعد کے کئی مورخین اور ادیب آگے بڑھے اور انہوں نے یہ تھیوری پیش کی کہ نہیں حضرت عمر ﷛ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ بڑے علم دوست تھے۔ ان بے چارے ادیبوں کے سامنے عرض ہے کہ حضرت عمر ﷛ واقعی بڑے علم دوست تھے لیکن وہ صرف اللہ اور رسول والے علم کے دوست تھے۔

باقی ساری گلویاں اکا اللہ والی گل
کجھ رولا پایا عالماں تو کجھ کتاباں وچ جہل

(بُلھے شاہ)

اور حضرت عمر فاروق ﷛ کے حساب سے اللہ جل جلالہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے علاوہ باقی سب خرافات ہیں۔

علموں بس کریں او یار
تینوں اکا الف ﷲ ہی درکار

(بُلھے شاہ)

پچھلے دنوں ماؤزے تنگ نے جب چین میں ایسی پرانی کتابوں کو جلا دیا تو پھر کچھ ''دانشور'' خاموش ہو گئے۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ سوجھ بوجھ سے ایسا کیا کہ کسی سرخ انقلاب کے چکر میں تھے۔

ایران کی پرانی تاریخ

اس وضاحت کے بعد ہم دارا اور سکندر کے جنگوں کے چکروں میں نہ پڑیں گے آیا پارتھی ایرانی تھے یا تورانی اور خراسانی یا ساسانی کون تھے؟ اور کہاں سے آئے وغیرہ کے چکروں میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ ہم صرف وہاں تک جائیں گے جب حضور پاک ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو نوشیرواں ایران کا بادشاہ تھا اور بڑا عادل بادشاہ تھا۔ حضور پاک ﷺ کی عمر مبارک نو سال تھی تو وہ مر گیا۔ بنیادی طور پر باطل فلسفہ کا پابند تھا۔ اس کے بعد تخت کے وارث نا اہل ثابت ہوئے۔ حضور پاک ﷺ مکہ ہی میں تھے اور آپ ﷺ کی نبوت کو چند سال ہی گزرے تھے کہ اہل ایران اور اہل روم میں ایک جنگ ہوئی جس میں اہل روم کو شکست ہوئی۔ کفارِ مکہ خوش تھے کہ وہ اپنے آپ کو ایرانیوں کا حلیف سمجھتے تھے اور مسلمانوں کو اہل روم کے حلیف سمجھتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ اس کا ذکر قرآن پاک کی سورۂ روم میں موجود ہے۔ جہاں یہ ذکر بھی ہے کہ اہل روم جلد غالب آ جائیں گے۔ مسلمانوں کو مدینہ میں ہجرت کئے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ یہ پیش گوئی بھی پوری ہو گئی۔ سورۂ روم مکی ہے اور جب یہ سورۃ اُتری تو ابوجہل وغیرہ نے بڑا مذاق اُڑایا کہ عرب سے نکل کر

باہر کے معاملات کا فیصلہ بھی مکہ میں ہونا شروع ہوگیا ہے۔اس اللہ کے دشمن کو کیا پتہ تھا کہ دین اسلام ساری دنیا کے لئے ہے اور جلد ہی ساری دنیا پر چھا جائے گا۔اہل ایران کی شکست کو صرف چار سال ہوئے تھے تو ہمارے آقا ﷺ نے جنگ احزاب میں خندق کی کھدائی کے وقت ہی مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی ملکیت کی خوشخبری[1] سنا دی تھی۔

بہر حال ایران کی حکومت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی اور چند سالوں میں کئی بادشاہ تبدیل ہوئے۔ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے زمانے میں ایک عورت بھی تخت پر بیٹھی تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جس قوم کو حکومت کے لئے کوئی مرد نظر نہ آئے اور وہ عورتوں کو حکومت سونپ دیں تو وہ قوم زوال پذیر ہوتی ہے۔ یہ بات جلد پوری ہوئی۔ تخت کے وارثوں میں قتل پہ قتل ہوتے گئے اور کئی وارث مارے گئے۔آخری بادشاہ یزدجرد تھا۔اس کی ماں کی شادی اس کے باپ کے ساتھ پوشیدگی میں ہوئی۔اس کی پیدائش اور پرورش اس کے دادا سے چھپا کر کی گئی کہ اس کا دادا اپنے کسی بیٹے کو شادی کی اجازت نہ دیتا تھا گو خود تین ہزار عورتوں کا حرم رکھے ہوئے تھا۔بہر حال ہمارا زیادہ واسطہ آخری یزدجرد کے ساتھ ہی ہوگا۔

عراق کے سیاسی حالات

مغربی عراق کا دارالحکومت حیرہ تھا جو نقشہ پنجم اور ششم میں موجود ہے۔ یہ جگہ نجف اشرف اور کوفہ کے نزدیک تھی گو آج کل کھنڈرات کی شکل میں ہے۔عراق کے لوگ کچھ نیم خود مختار تھے اور نیم بادشاہت تھی۔ ایران والوں نے کچھ عرصہ بنی طے کو عراق کی بادشاہت یا ''نوابی'' سونپ رکھی تھی۔اور جب چاہتے کوئی اور باجگزار بادشاہ بنا لیتے۔جس طرح انگریز ریاستوں کے راجے اور نواب بناتے رہتے تھے۔موجودہ شہروں میں سے کئی شہر موجود نہ تھے۔ بصرہ اور کوفہ تو سننے میں بھی آئے تھے۔ان شہروں کو تو مسلمانوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چھاؤنیوں کے طور پر آباد کیا کہ فوجی لحاظ سے یہ مقامات اہم تھے۔ بغداد بھی ایک قصبہ تھا۔اس کو خاندان عباسیہ نے جدید ''بغداد'' بنا دیا۔صفین یا سٹیفن کا مقام بڑا اہم تھا اور اس کو مسلمان مدائن کہتے تھے۔ یہاں پر کئی شہر تھے، یہ ایرانی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔

عرب قبائل اور خاص کر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنو بکر کے کچھ لوگ عراق میں بھی آباد تھے۔ جب اسلام نے ان قبائل کو تازہ روح اور نئی زندگی بخشی تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جیسی عظیم شخصیت آئندہ کے حالات کو بھانپ گئی کہ ایران کے معاملات اب دگرگوں ہونے والے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو متحد کیا اور آگے بڑھ کر ایرانیوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ یہ چھاپے زیادہ تر ابلہ کی چھاؤنی کی طرف تھے جو نقشہ پنجم اور ششم میں ہے اور موجودہ بصرہ کے نزدیک ہے۔ کسی زمانے میں خلیج فارس سے جہاز ابلہ تک آتے تھے۔ خاص کر ہندوسندھ یعنی موجودہ پاکستان اور

(۱) تفصیل کے لئے جلال مصطفیٰ کے صفحہ ۱۲۹۔۱۳۰ سے استفادہ کریں۔

بھارت کے جہاز جو ایرانیوں کے ساتھ تجارت کے لئے آتے تھے، وہ ابلہ کی بندرگاہ میں آکر رکتے تھے اور اس زمانے میں اس جگہ کو ہندوسندھ کی بندرگاہ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ مقام آگے بھی ہماری کتاب میں اکثر زیر بحث آئے گا اور اس علاقہ و ہم جنوبی محاذ کا نام دیں گے۔ یہاں ہی سے آگے بڑھ کر حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلام کی فتوحات صوبہ فارس سے ہوتی ہوئی زاہدان اور مکران تک پہنچیں۔

مثنیٰؓ بن حارث بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ ایرانیوں کے ساتھ چند ایک جھڑپوں کے بعد اُن کی دوررس نگاہ تاڑ گئی کہ حکومت زوال پذیر بھی ہو تو فوج میں زوال دیر سے آتا ہے، ہاں اگر کسی ملک کی حکومت فوج کی نالائقی سے زوال پذیر ہو تو پھر اور بات ہوتی ہے، یعنی یک نہ شد دو شد۔ دونوں گئے گزرے ہوتے ہیں لیکن اگر حکومت صرف بندر بانٹ اور سیاسی اکھاڑہ بن جائے تو کسی عظیم ملک کی فوج جلد ختم نہیں ہوتی۔ مغل فوج میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک بھی کچھ جان موجود تھی۔ یہ نکتہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ فوج کسی ملک پر کیوں قابض ہو جاتی ہے کسی ملک میں جب سیاسی بندر بانٹ شروع ہو جاتی ہے تو وہاں اگر اہل فوج مضبوط ہوں تو وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال لیتے ہیں۔

اللہ کی فوج

دین فطرت پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج کے مترادف قرار دیتا ہے۔ حکومت میں سیاست بازی اور بندر بانٹ ضرور آجاتی ہے اور اس پہلو کو کتاب سوم اور چہارم میں اور واضح کیا گیا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ پوری قوم اللہ کی فوج ہو۔ فن سپاہ گری سے واقف ہو۔ اور ربط وضبط پر عمل پیرا ہو تو پھر سیاسی افراتفری کم ہوگی اور حکومت قائم رہے گی۔ دوسری صورت میں کوئی ایک پہلو کمزور ہو جائے گا تو وہ دوسرے کو بھی لے ڈوبے گا۔ اس لئے جو لوگ سویلین اور فوجوں کو الگ الگ کرتے ہیں وہ قوم میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔

ایرانی فوج

بہرحال ہمارے عظیم مجاہد حضرت مثنیٰؓ کو جلد ہی ایران کی فوج کی حربی کارروائیوں کا اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی مکمل طور پر زوال کی طرف رخ نہ کئے ہوئے تھیں ہمارے اس زمانے کے ایک مبصر جو پرانی ایرانی فوجوں کی کارروائیاں بیان کرتے ہوئے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ ایرانی فوج دنیا میں اپنا مقام نہ رکھتی تھی۔ ہاں البتہ زیادہ متحرک نہ تھی۔ مسلمانوں سے ایرانیوں کی شکست کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ ایرانی متحرک نہ تھے۔ اور ہمارے لحاظ سے جو متحرک نہ ہو۔ اس کا کوئی مقام نہیں یعنی متحرک طرز جنگ سے گریز کرنے والی فوج جلد ختم ہو جاتی ہے۔

ساتواں باب

فتوحاتِ عراق کی بسم اللہ

(جنگِ سلاسل)

اس باب میں وہ واقعات بیان کئے جائیں گے جب اہل اسلام مشرق اور شمال مشرق سے ملک عرب کے علاقوں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں داخل ہوتے ہیں گو عراق کی آبادی زیادہ تر عرب قبائل پر مشتمل تھی لیکن وہ ایرانیوں کے باجگزار تھے اور عرب شہزادے ہر قبیلہ میں کچھ برائے نام پوزیشن کے مالک تھے۔ اصلی طاقت ایران کے مقرر کردہ گورنروں کے ہاتھ میں تھی اور اُن میں سے اکثر فوجی جرنیل بھی تھے۔ اُس زمانے میں عرب سرحدوں کے ساتھ کاظمہ وغیرہ اور ابلہ کے علاقوں کا فوجی گورنر ہرمز تھا۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کی ٹکر ہوئی یہ جرنیل بھی تھا۔

ایرانیوں کے حالات

ایرانی، عربوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ ان کو ایک جنگلی قوم یا وحشی لوگ سمجھتے تھے۔ یمن تک ان کی حکومت قائم رہی تھی۔ جو انہوں نے ایبے سینیا کی فوج کو شکست دے کر حاصل کی تھی۔ لیکن صحرائے عرب یا حجاز اور نواحی علاقوں میں ان کو کوئی زرخیزی یا دولت نظر نہ آئی، تو انہوں نے اس طرف کی پرواہ نہ کی۔ حضور پاک ﷺ نے ایران کے بادشاہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ[1] بن حذافہ کو قاصد کے طور پر خط دے کر بھیجا۔ کسریٰ ایران نے وہ خط پھاڑ دیا اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اس کی سلطنت بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔

کسریٰ کے تکبر اور غرور کی کوئی حد نہ تھی اس نے یمن کے گورنر بدھان کو حکم دیا کہ اس عرب (یعنی حضور پاک ﷺ) کو گرفتار کر کے اس کے پاس بھیجا جائے۔ بدھان نے دو آدمی بھیجے کہ حالات کا مطالعہ کریں۔ اس سلسلہ میں ابن

(۱) آپ رضی اللہ عنہ اُم المومنین جناب حفصہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے بھائی تھے۔

اسحٰقؒ کے انگریزی ترجمے والی کتاب میں حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جب یہ دو آدمی حضور نبی کریم رؤف ورحیم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور پاک ﷺ کی باتوں سے بڑے متاثر ہوئے اور حضور پاک ﷺ نے اُن کو بتادیا کہ ان کے بادشاہ کا بیٹا اپنے باپ کو قتل کر کے خود تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ یہ آدمی جب گورنر کے پاس واپس پہنچے اور اپنے تاثرات بتائے تو گورنر نے کہا کہ ایسی بات تو پیغمبر ہی کرتے ہیں اور اسی دوران بادشاہ کے قتل کی خبر بھی مل گئی اور یمن کا گورنر بھی مسلمان ہوگیا اور وہ فیروز جس نے اسود عنسی کو قتل کیا ایرانی تھا۔ دوسرے اور چوتھے باب میں ذکر ہے کہ اسلام کس طرح یمن کے چپہ چپہ میں پھیل گیا تو اس کے بعد ایران کا معاملہ یمن میں خود بخود ختم ہوگیا بلکہ متعدد ایرانی بھی اسلام کی آغوش میں داخل ہوگئے۔

عراقی قبائل

حضرت مثنیٰ ؓ بن حارث خلیفہ اوّل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کو حالات سے آگاہ کیا اور اُن سے اجازت چاہی کہ وہ آگے بڑھ کر عراق کے قبائل میں اسلام کا پیغام پہنچائیں جس کے لئے اُن کو کچھ فوج مہیا کی جائے۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے حضرت مثنیٰ ؓ کو اُس علاقے کا عامل مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی قبیلہ عجل کے مدغور بن عدی کو اپنے علاقے کے لئے ایسی ہی تقرری کا حکم دیا۔ دو اور قبائل سلمٰی اور حرملہ کے سرداروں کو اسی قسم کے کام کی اجازت بھی مل گئی۔

کمانڈ میں وحدت اور حکمت عملی

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان تمام تر کارروائیوں میں وحدت اور مرکزیت پیدا کی جائے اور مختلف کمانڈروں کو کسی ایک کمانڈر کے ماتحت کر کے بھرپور اور متحدہ کارروائی کی جائے اور خلیفہ اوّل ذہنی طور پر اس کام کے لئے تیار تھے۔ اور حضرت خالد ؓ یمامہ میں اپنی کارروائی پوری کرنے کے بعد اگلے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ ادھر شمال کی جانب حضرت عمرو ؓ بن عاص، حضرت شرجیل ؓ بن حسنہ اور حضرت خالد ؓ بن سعید، شام و فلسطین کی سرحدوں کی "دیکھ بھال" میں مصروف تھے اور خلیفہ وقت حالات کا مطالعہ فرما رہے تھے۔

تاریخ کے بامقصد مطالعہ کے لئے یہ چیز سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ایسے ہی تو دنیا فتح نہ ہوگئی۔ اس کے لئے حکمت عملی اور طریق کار مقرر کئے گئے کہ پہلے اہلِ اسلام کس طرف کا رُخ کریں اور کب؟ اور دوسرا مرحلہ کب اور کیسے شروع ہو؟ ظاہر ہے کہ اپنے وقت کے عظیم ترین حکمران اور حضور پاک ﷺ کے بعد دنیا کے دوسرے نمبر کے سپہ سالار

(۱) یہ کتاب پاکستان فوج کے جنرل ہیڈ کوارٹر نے دوبارہ شائع کر کے ہر لائبریری کو دی ہے۔

اعظم ؓ اور یارِ غار ؓ کی حکمت عملی کا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔ حضرت عمر ؓ کے زمانے میں فتوحات زیادہ ہوئیں کہ اُن کو وقت بھی زیادہ مل گیا تھا جب ہم دونوں عظیم رہنماؤں کی کامیابیوں کا موازنہ کرتے ہیں تو حضرت عمر ؓ کے زمانے کو بہتر حیثیت دے دیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ان تمام فتوحات کی بنیاد حضرت صدیق اکبر ؓ کے زمانے میں رکھی گئی بلکہ اگر عرصہ کا حساب لگایا جائے تو اوسط کے لحاظ سے جتنی فتوحات حضرت ابوبکر ؓ کی اڑھائی سال کی خلافت میں ہوئیں اتنی نہ حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانے میں ہوئیں اور نہ کسی اور مسلمان حاکم کے زمانے میں۔ پھر قوم میں جو وحدت فکر پیدا کیا اور اندرونی خلفشار ختم کر کے جس طرح مسلمان آپ ؓ کے زمانے میں وحدتِ عمل کی منزل پر رواں دواں ہوئے تو اس سلسلہ میں حضرت فاروق اعظم ؓ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''بخدا! اللہ رحمت کرے حضرت ابوبکر ؓ پر۔ اُن کے نقش قدم پر چلنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تاریخ اور راوی

اب حالات کو آگے چلانے سے پہلے ایک وضاحت بہت ضروری ہے۔ اب تک لڑائیاں سرزمین عرب پر ہوتی رہیں اکثر جنگوں کے بعد دشمن بھی مسلمان ہوگئے اور واقعات لکھنے والوں نے دوطرفہ چھان بین کے بعد تاریخ کو بہتر طور پر لکھا۔ اس میں ایک آسانی بھی تھی کہ ادھر حکم دیا اور پھر جلدی سے اس حکم پر عمل یا کارروائی مکمل ہوگئی۔ اور نتائج بھی سامنے آ گئے لیکن اب معاملات وسعت اختیار کر گئے تھے۔ ایک راوی نے مدینہ کا ذکر کیا کہ وہاں سے اس قسم کے احکام جاری ہوئے۔ دوسرے نے اس جگہ کا ذکر کیا جہاں احکام پہنچے اور کارروائی و نتائج کا راوی، ایک تیسرا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ بہرحال ان وسعتوں کے باوجود مسلمانوں کی تاریخ جتنی صحیح طور پر موجود ہے اتنی کسی اور قوم کی نہیں۔ وہ سچے لوگ تھے، جس طرح چیزیں اُن کو نظر آئیں انہوں نے بیان کر دیں اور مورخین نے سب کے بیانات لکھ ڈالے طرزِ بیان اور فاصلوں کی وجہ سے جو تھوڑا بہت فرق تھا اس کو البتہ ٹھیک نہ کیا گیا اور مختلف روایتیں لکھ دی گئیں پھر بعد کی صدیوں میں کچھ شرپسندوں نے اپنی طرف سے اضافے کر دیئے۔ اور اُن کو کتاب کا حصہ بنا کر پیش کر دیا لیکن اگر گہرا مطالعہ کیا جائے تو حقیقت اور سچائی سامنے آجاتی ہے کہ بیان ''عینی شاہد''، کا ہے یا صرف ''شاہد'' کا ہے۔

اِس طرح ''مبصر''، ''ناقد''، ''پرچہ نویس''، ''ادیب''، ''افسانہ نگار''، ''قصہ گو''، غرض یہ کہ ہر لکھنے والے کے بیان سے اُس کی اصلیت ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔

راویوں کے طرز بیان

مثال کے طور پر طبری میں ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے جب یمامہ کی طرف سے حضرت

خالد رضی اللہ عنہ کوعراق میں داخل ہونے کا حکم دیا تو اسی زمانے میں حضرت عیاض[1] رضی اللہ عنہ بن غنم کو بالائی علاقے سے دومۃ الجندل والے راستے عراق میں داخل ہونے کا حکم دیا دونوں کی منزلِ مقصود حیرہ تھی اور خلیفہ نے فرمایا جو حیرہ پہلے پہنچ جائے گا وہ عراق کا سپہ سالار ہوگا اِس کتاب کے تیرہویں باب میں ہم حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی متحدہ کارروائی کے تانے بانے جا کر دومۃ الجندل میں ملائیں گے اور یہ سارا عرصہ جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے لاکھوں کی تعداد میں دشمن کو واصلِ جہنم کیا اور درجنوں جنگیں لڑیں۔ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم دومۃ الجندل کو بھی فتح نہ کر سکے۔

تبصرہ

اب سارے حالات کو مدنظر رکھ کر اگر اس روایت کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے۔ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کا لشکر ہی چند ہزار آدمیوں کا تھا اور راستہ اتنا غیر آباد تھا کہ اس راستے سے اگر حیرہ کو فتح بھی کر لیا جاتا تو مدینہ کے ساتھ نہ کوئی رابطہ قائم رکھا جا سکتا اور نہ ہی اہلِ لشکر کے لئے راستہ پر کسی بحالی یا کفالت کا سامان ہوتا وغیرہ اور حیرہ کی فتح کے بعد اُس کے نچے آباد علاقوں میں وہ تمام جنگیں لڑے بغیر چارہ نہ تھا جن کا ذکر ہم اگلے پانچ ابواب میں کریں گے۔ یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے راوی بھی گزرے ہیں جن کو عراق کو فتح کر لینا اتنا آسان نظر آیا کہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم عراق کو چند ہزار مجاہدوں کے ساتھ دومۃ الجندل والے راستے سے فتح کر لیتے۔ اس روایت کو نقشہ پنجم کی مدد سے پڑھیں اور جو لوگ صرف نقشوں کی مدد سے حکمت عملی بناتے ہیں اُن کو تو شاید یہ روایت صحیح نظر آئے گی لیکن جو لوگ نقشوں کا مطالعہ کر کے تجویز بنانے سے پہلے نقشوں کی زمینوں پر ذہنی طور پر سفر بھی کرتے ہیں اور ذہنی طور پر جنگیں بھی لڑتے ہیں وہ اس روایت کو سن کر ہنس دیں گے۔ خیر یہ الگ بات ہے کہ اللہ کی تلوار اور حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کی فوجی بصیرت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور ذہن یہ بات مان ہی نہیں سکتا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسے احکامات دیئے ہوں لیکن ایسے راوی موجود تھے جن کو عراق کی ساری جنگ اتنی معمولی نظر آئی۔ اس کی مزید وضاحت تیرہویں باب میں خود بخود ہو جائے گی لیکن دومۃ الجندل والا راستہ کھولنے کی ضرورت تھی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لئے احکام

خلیفۂ وقت نے جب فیصلہ کر لیا کہ بسم اللہ عراق سے کریں گے تو انہوں نے حضرت خالد کو رضی اللہ عنہ حکم دیا کہ وہ یمامہ سے ابلہ کی طرف بڑھیں۔ اور اُن کی منزلِ مقصود صرف حیرہ تک ہوگی۔ مدائن وغیرہ کے سلسلہ میں احکام بعد میں

(۱) آپ عظیم صحابی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے چچازاد اور خالہ زاد بھائی بھی تھے۔

دیئے جائیں گے۔ ساتھ ہی آپ نے حکم دیا کہ صرف رضا کار آدمیوں کو اپنے لشکر میں رہنے دیں۔ باقیوں کو جو جنگ میں شرکت کرنا نہیں چاہتے اُن کو اپنے گھروں میں جانے دو تو نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس صرف دو ہزار مجاہد رہ گئے اور آٹھ ہزار مجاہد اپنے گھروں کو چلے گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خلیفہ وقت کو اس کی اطلاع دی تو خلیفہ نے مسجد نبوی میں تمام مسلمانوں کو اِن حالات سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جو قبیلہ بنو تمیم سے تھے اور اسلام پر قائم رہے کو بلایا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس کمک کے طور پر بھیج دیا۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اور اُن کے دوسرے بھائی حضرت عاصم رضی اللہ عنہ آئندہ کے ابواب اور اگلی کتابوں میں بھی ہمارے ساتھ رہیں گے، ایسے خوش نصیب والدین دنیا میں کم ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قعقاع رضی اللہ عنہ اور عاصم رضی اللہ عنہ جیسے فرزند عطا فرمائے۔

خلیفہ اوّل کی حکمت عملی

خلیفہ اوّل یہ سب کچھ کسی حکمت عملی کے تحت کر رہے تھے۔ قعقاع رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے اور تیار تھے تو خلیفہ وقت نے انہیں محاذ جنگ پر بھیج دیا جب صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ خالد رضی اللہ عنہ کی اتنی بڑی مہم کے لئے واحد مجاہد کو کمک پر بھیجا جا رہا ہے تو خلیفہ اوّل نے فرمایا ''قعقاع رضی اللہ عنہ تیار تھے، بھیجے جا رہے ہیں آپ لوگ تیار ہو جائیں اور باقی لوگوں کو تیار کریں تو اُن کو بھی محاذ پر بھیج دیا جائے گا اِس کے علاوہ خلیفہ اول نے یمامہ کے لشکر سے لوگوں کو گھر جانے کی جو اجازت دی اُس میں بھی بڑی دانائی اور حکمت کی بات تھی لوگ تھک چکے تھے اور بال بچوں سے ملنا ضروری سمجھتے تھے۔ چھٹی ملی مالِ غنیمت بھی ساتھ لے آئے ہوں گے، بڑی خوش آمدید اور آؤ بھگت ہوئی ہوگی۔ چند دن گھر میں گزارے ہوں گے تو کچھ بوریت محسوس ہوئی ہوگی۔ دل میں پھر خیال پیدا ہوا ہوگا کہ کیوں نہ محاذ پر جائیں اور مالِ غنیمت حاصل کر کے ایک دفعہ پھر لوٹیں اور دوبارہ وہی عزت اور آؤ بھگت ہو۔ یہ نفسیاتی اور فطرتی پہلو ہے اور دین فطرت ایسے طریقوں کی اجازت دیتا ہے۔

علاوہ خلیفہ اوّل شروع شروع ایران کے خلاف کسی لاؤ لشکر کو نہیں بھیجنا چاہتے تھے اگر اُس لشکر کو کامیابی نہ ہو تو پیچھے علاقوں میں لوگ موجود ہوں اور اگر ایران جوابی کارروائی کریں تو ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔ بڑے لشکر سے بہت بڑی جارحانہ کارروائی معلوم ہوتی اور اُس سے ایرانی لاؤ لشکر بھی مقابلے میں آ سکتے تھے اور مسلمانوں کے بہت بڑے لشکر کو اُس علاقے کے لوگ بھی شاید پسند نہ کرتے۔ خلیفہ اوّل کی حکمت عملی یہ تھی کہ اُس علاقے کے مسلمان قبائل کو اُس کام میں شریک کیا جائے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر تمام مجاہدین میں وحدت کا ذریعہ بنے۔ وہ حربی بصارت اور کامیابیاں جو خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کے مجاہدین حاصل کر چکے تھے اُن سے باقی مسلمان بھی فائدہ اُٹھائیں۔ اس لئے خلیفۂ اوّل نے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ، مذعور بن عدی اور سلمیٰ اور حرملہ قبائل کے سرداروں کو خط لکھے کہ وہ اپنے مجاہدین کے ساتھ خالد رضی اللہ عنہ

کے آئندہ احکام کا انتظار کریں کہ وہ اُن کے علاقہ کے سپہ سالارِ اعظم ہیں۔

جنگ سلاسل کی تیاری

واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے آپ یاد کریں کہ حضرت مثنیٰ ؓ گیارہ ہجری ذیقعد کے مہینہ میں مدینے حاضر ہوئے تھے اور اُس کے صرف دو ماہ بعد محرم بارہ ہجری میں حضرت خالد ؓ کو ایران وعراق کی طرف پیش قدمی کے احکام مل جاتے ہیں۔ حضرت خالد ؓ کے پاس صرف دو ہزار مجاہدین رہ گئے تھے لیکن گردونواح سے مسلمان قبائل کو بھرتی کر کے حضرت خالد ؓ اپنی فوج کی تعداد کوئی دس ہزار کے قریب کر چکے تھے اب آگے چار عرب سرداروں سے جن کو خلیفہ اوّل نے خط لکھے دو ہزار فی قبیلہ مجاہد ملنے کی اُمید تھی جس سے لشکر کی تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچنے کی اُمید تھی۔ یمامہ سے کوچ کرنے سے پہلے حضرت خالد ؓ نے چاروں عرب سرداروں کو خط لکھے اور اپنی پیش قدمی کے راستہ سے اُن کو آگاہ کیا کہ وہ نباج[1] والے راستہ سے ابلہ کی طرف آگے بڑھیں گے اور ابلہ سے پہلے وہ اپنے لشکروں کے ساتھ آکر اُن سے مل جائیں اور پھر ایران کے اُس علاقہ کے گورنر ہرمز کو خط لکھا جس کے مختصر طور پر الفاظ یہ تھے ”ہم اللہ کے احکام کو جاری وساری کرنے کے لئے پیش قدمی کر رہے ہیں تم اسلام میں داخل ہو جاؤ اگر یہ نہیں منظور تو جزیہ ادا کرو اور ہم تمہارے علاقے میں ایسے لوگوں کو لا رہے ہیں جو موت کے ساتھ اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی تم لوگ زندگی کے ساتھ کرتے ہو۔“

خالد ؓ کی تجویز پر عمل

حضرت مثنیٰ ؓ نے فوری طور پر احکام کی تعمیل کی۔ خالد ؓ کو خوش آمدید کہنے کے لئے وہ نباج پہنچ گئے۔ بے شک اگر اس عظیم انسان کے پَر ہوتے تو وہ اُڑ کر حضرت خالد ؓ کے پاس یمامہ پہنچ گئے ہوتے۔ بہر حال باقی تینوں سرداروں نے بھی بسر وچشم اِن احکام کو مانا سب قبائل مسلمانوں کی طاقت اور کردار سے بہت متاثر ہو چکے تھے۔ دین فطرت نے اُن کی اپنی شان کو بڑھا دیا تھا وہ خود ایرانیوں سے تنگ تھے اور ان کے ہمسایہ قبائل بھی ایرانیوں کی غلامی کا جوا اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ اور اللہ کی غلامی سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

ہرمز کا ردِّ عمل

ہرمز البتہ حضرت خالد ؓ کا خط پڑھ کر حیران ہو گیا کہ وہ معمولی آدمی نہ تھا وہ بہادر فوجی جرنیل تھا جس کو ایران کے سرحدی صوبوں کی حکومت سونپی گئی تھی۔

(۱) نقشہ پنجم دیکھیں

ایران میں جرنیلوں کے رتبہ کا اندازہ ان کی ٹوپی سے لگایا جاتا تھا اور بہت بڑے جرنیل زیادہ قیمت والے ہیرے اور جواہرات کی ٹوپی پہنتے تھے چنانچہ ہرمز ایک لاکھ درہم کی ٹوپی پہنتا تھا۔ ابلہ اُس کا صدر مقام تھا۔ اُس مقام کو خاص اہمیت حاصل تھی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ موجودہ بصرہ کے نزدیک واقع تھا۔ نقشہ پنجم سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگائیں کہ تمام عرب و یمن کو یہاں سے راستے جاتے تھے۔ اور اوپر عراق کے علاقے سواد یا دریاؤں کے طاس کو بھی سمندری لحاظ سے اس کی اہمیت پچھلے باب میں واضح کردی گئی ہے اور یہ علاقہ بھی زرخیز تھا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شدت کی وجہ سے ہرمز کو اِس علاقہ میں تعینات کیا گیا تھا۔

ہرمز ایک مغرور شخص تھا اور شہنشاہ کے رواج اور طور طریقوں کے مطابق وہ عام آدمیوں کی پرواہ نہ کرتا تھا اور عرب اُس کے خیال کے مطابق بونے تھے یعنی وہ اُن کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ عرب قبائل بھی اُس کے ساتھ بے پناہ نفرت کرتے تھے اور اگر کسی کی بدگوئی کرنا ہوتی تو کہتے کہ فلاں ہرمز سے بھی بدتر ہے چنانچہ جب ہرمز کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا خط ملا تو اُس نے کسریٰ کو مدائن میں اطلاع دی کہ اُس کو ایسا خط ملا ہے لیکن ساتھ ہی بڑے تفاخر کے ساتھ لکھا کہ ''ان جاہلوں'' کو وہ ایسا سبق سکھائے گا کہ وہ یاد رکھیں گے۔ اُس ''بے چارے'' نے مسلمانوں کو بھی کسی عام قسم کے ''نو وارد'' کی طرح سمجھا۔ اُس کو کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دین فطرت کے پروانے ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اُٹھے ہیں اور ساری دنیا کو حق اور صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لئے آتے ہیں اور باطل کو اپنے پاؤں کے روند ڈالنا اُن کے مقدر میں لکھا جاچکا ہے۔

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش جس نے ڈھونڈی سلطان کی درگاہ (اقبالؔ)

ہرمز کی تجویز

ہرمز نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا خط ملنے کے بعد سوچا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کاظمہ سے یمامہ کے راستے ابلہ پر دھاوا بولیں گے ابلہ اہم مقام تھا اور اُس پر قبضہ کرنا کسی بھی دشمن کا مقصد ہوسکتا تھا اور ابلہ کی فوجی، سیاسی، مالیاتی اور تجارتی اہمیت ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں، ہرمز کی یہ سوچ بالکل صحیح تھی۔

متحارب گروہوں سے ہر گروہ خاص کر جارحانہ کارروائی والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی اہم علاقے پر قبضہ کر لیا جائے گو ایسے مقاصد حاصل کرنے کے لئے فوری کارروائی دشمن کی افواج یا فوجی قوت کو نیست و نابود کرنا ہوتا ہے اور اگر ایک ہی وار نے دونوں چیزیں حاصل ہوجائیں تو سونے پر سہاگہ۔ ہرمز مدافعانہ کارروائی کا انتظار کرے گا اور اپنے چنے ہوئے مقام یا زمین پر لڑائی یا مقابلہ کرنے کے بارے میں تجویز بنائے گا۔

ہرمز کے خیال کے مطابق کاظمہ اس کام کے لئے بہترین جگہ تھی، اس لئے اُس نے ابلہ سے کاظمہ کی طرف

وغ کر دیا۔ ایرانیوں کی طرز جنگ، کم حرکت والی بھاری بھرکم فوج کے ساتھ اس طرح وضع کی گئی تھی کہ وہ دفاع اختیار کرتے، دشمن کو اپنے ساتھ گتھم گتھا ہونے کی اجازت دیتے تھے اور اپنے بھاری بھرکم کلہاڑوں نیزوں برچھیوں اور تلواروں کا خوب استعمال کرتے تھے اکثر پیدل دستوں نے خود پہنے ہوئے تھے اور ٹانگوں تک کی حفاظت کے لئے بچاؤ کی ڈھالیں ٹانگوں کے ساتھ باندھی ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے کو اپنے ساتھ باندھ رکھتے تھے یعنی پیدل دستے زنجیروں سے ایک دوسرے کے ساتھ کس کر سات سات یا دس دس کے گروہ میں ہوتے تھے۔ یعنی ایک دیوار بننے کی کوشش کرتے تھے لیکن بیچاروں کو پتہ نہیں تھا کہ اُن کا مقابلہ ایسی قوم سے ہے جو سیسہ پلائی دیوار بن کر لڑتے ہیں جو متحرک تھے اور جدھر چڑھتے تھے تو طوفان کا رُخ موڑ دیتے تھے۔

سبک اُس کے ہاتھوں میں سنگ گراں پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں (اقبالؔ)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تجویز

ہرمز کی تجویز میں ظاہراً کوئی کمی نظر نہ آتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی تلوار پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑ چکی تھی اور خالد رضی اللہ عنہ نے تدبر کے سارے سٹاف کالج پاس کر لئے تھے وہ غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں نرالی صورت اختیار کر چکے تھے اور اللہ کی تلوار بن گئے تھے۔'' دل بینا تو ہر مومن کو میسر ہو سکتا ہے لیکن خالد رضی اللہ عنہ کو اب ایک اور مدبر کے دل بینا کی خدمات بھی حاصل ہونی والی تھیں جن کو ہم مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حاث کے نام سے جانتے ہیں تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی پہلی ضرورت حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات کی تھی بجائے اِس کے کہ خالد رضی اللہ عنہ اُن کو اور باقی مجاہدوں کو یمامہ میں بلاتے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے چاروں قبائل کے سرداروں کو لکھا کہ وہ اُن کے ساتھ نباج کے علاقے میں ملیں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی ملاقات

حضرت خالد رضی اللہ عنہ ابھی نباج میں داخل نہ ہوئے تھے کہ عظیم صحابی مثنیٰ رضی اللہ عنہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ اس ملاقات کے تصور سے کسی بھی مومن کے دل میں سرور اور رقت طاری ہو جاتی ہے کہ اسلام کے ان دو عظیم فرزندوں کی ملاقات کا نظارہ دیکھنے والے مجاہد کتنے خوش قسمت تھے اور ہمارے تاریخ دان اگر تجسس کے ساتھ ایسی عظیم ملاقاتوں کے تاثرات کہیں سے ڈھونڈ نکالتے اور اُن کو قوم کے سامنے پیش کرتے تو یہ تاثرات اُن فضول باتوں سے بدرجہا بہتر ہوئے جو وقتی ذہنی عیاشی مہیا کرتی ہیں۔ ہمارا تصور ہے کہ دونوں عظیم مجاہدوں پر پہلی ملاقات میں سکتہ طاری ہو گیا ہوگا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر دل سرور سے بھر گئے ہوں گے۔ نیچے سے اوپر جو ایک دوسرے کو نیچی نظروں

ہوں گے اور دونوں شخصیتوں سے اسلام کی روشنی جو اس لمحہ باہر نکلی ہوگی اُس کی خوشبو سے سارا ماحول معطر ہو گیا ہوگا اور جب ایک دوسرے کے ساتھ بغلگیر ہوئے ہوں گے تو اردگرد اہلِ حق کے قافلہ میں اہلِ بصیرت کے دل باغ باغ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ ہر مومن کو ایسی جاوداں زندگی عطا کرے:

کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا　　پھر ذوق شوق دیکھ دلِ بے قرار کا　　(اقبالؔ)

وحدت عمل اور تدبیرات

باقی تینوں قبائل سردار جناب مذغور، سلمٰی اور مرحلہ کے امیر بھی دو دو ہزار مجاہدین کے ساتھ نباج کے علاقے میں اسلامی لشکر کے ساتھ آ کر مل گئے۔ اب نقشہ ششم کو غور سے دیکھیں تو حضرت خالد ﷜ کے اِس طریق کار کو سمجھنے میں مدد ملے گی کہ وہ کس طرح اپنی مرضی کی زمین میں اٹھارہ ہزار کے لشکر کو متحد رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ مرضی کی زمین ریگستان تھا۔ اس ساحلی علاقے میں کسی تنگ راستے سے پیش قدمی کر کے حضرت خالد ﷜ کی کارروائیاں محدود ہو جاتیں یا لشکر حصوں میں اس طرح بٹ کر رہ جاتا کہ ایک مٹھی میں کرنا مشکل ہو جاتا اور کئی کارروائیاں دشمن کے ردِ عمل کے طور پر کرنا پڑ جاتیں۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جو سپہ سالار زیادہ تر کارروائیاں دشمن کے ردِ عمل کے طور پر کر رہا ہو وہ دشمن کی انگلیوں پر ناچ رہا ہوتا ہے لیکن یہاں پر حضرت خالد ﷜ نے ہرمز کو ناچ نچایا۔ انہوں نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں بانٹ کر نباج سے آگے پیش قدمی شروع کر دی۔ طبری یا بعد کے مورخین نے یمامہ سے ہی لشکر کی بانٹ تین حصوں میں بتائی ہے اور وہ ضرور صحیح ہوگی لیکن انہوں نے ساتھ ہی یمامہ سے ہراول کی کمانڈ حضرت مثنٰی ﷜ کو دے دی جو صحیح نہیں۔ حضرت مثنٰی ﷜ ملے ہی نباج میں۔ اس لئے آگے والی بات صحیح ہو سکتی ہے نقشہ پنجم اور ششم دونوں اس سلسلہ میں بہتر رہنمائی کرتے ہیں۔

بہرحال ہراول یا اگلے دستوں پر حضرت مثنٰی ﷜ تھے جو دو دن پہلے چلے۔ درمیان میں حضرت قعقاع ﷜ کے بھائی حضرت عاصم ﷜ بن عمرو تھے۔

تیسرے اور آخری دستے میں حضرت خالد ﷜ خود تھے جس کے ہراول دستوں کی کمانڈ حضرت عدی[1] ﷜ بن حاتم کر رہے تھے۔ سب لشکروں کے ساتھ علاقہ کا ایک رہنما بھی تھے، جو راستے کی نشاندہی کرتا تھا۔ حضرت خالد ﷜ نے اپنی منزلِ مقصود حفیر[2] کو قرار دیا جو ابلہ سے چند میل دور مغرب کی طرف ہے۔ اور حضرت خالد ﷜ نے یہ فیصلہ نہیں

(۱) حضرت عدی ﷜ مشہور سخی حاتم کے بیٹے تھے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جلالِ مصطفےٰ کے صفحہ ۲۸۷ پر بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کے شروع میں بھی ذکر ہے۔ بڑے دراز قد اور راسخ العقیدہ تھے۔ بہت لمبی عمر پائی۔　　(۲) نقشہ ششم دیکھیں۔

کیا تھا کہ وہ دشمن کی فوج کو کسی مقام پر تباہ و برباد کر کے اپنا مقصد حاصل کریں گے وہ صرف دشمن کا ردِعمل دیکھنا چاہتے تھے بہر حال اس پیش قدمی نے ہرمز کے لئے یہ خطرہ پیدا کر دیا کہ حضرت خالد ؓ بغیر کسی لڑائی کے ابلہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہرمز سر پر پاؤں رکھ کر اپنے لشکر سمیت کاظمہ سے ابلہ کی طرف بھاگا۔ اس سے حضرت خالد کا ایک مقصد پورا ہوگا کہ دشمن نے ردِعمل کے طور پر اُن کے ساز پر ناچنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کاظمہ (جو موجودہ کویت میں ہے) جب اُس مقام کو ہرمز نے چھوڑا ہوگا تو لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا ہوگا اور ہرمز کے لشکر میں تھکاوٹ۔ اس لئے حضرت خالد ؓ نے آگے بڑھ کر ابلہ کے مقام پر ہرمز سے دو دو ہاتھ کرنے کی بجائے کچھ اور ہی سوچ لیا۔ ڈیلٹا کے علاقہ میں جنگ سے گریز کرتے ہوئے اور اپنے دوست ریگستان کو استعمال کرتے ہوئے حضرت خالد ؓ نے کاظمہ کا رُخ کیا کہ کیوں نہ کاظمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور اُس کے بعد دشمن کا ردِعمل دیکھیں گے کہ ہرمز کا قلع قمع کہاں پر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہرمز ابلہ کے دفاع میں لگا ہوا تھا کہ اُس کو خبر ملی کہ حضرت خالد ؓ حفیر کی طرف جا رہے ہیں۔

ہرمز کا ناچ

اب ہرمز کو خیال آیا کہ اس طرح کاظمہ بغیر لڑائی کے اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تو اُس نے جلدی سے ابلہ کو چھوڑ کر کاظمہ کا رُخ کیا۔ حضرت خالد ؓ کاظمہ میں دشمن سے پہلے ضرور پہنچ سکتے تھے اور وہاں پر بغیر لڑائی کے قبضہ بھی کر سکتے تھے لیکن اب دشمن پھندے میں آ چکا تھا۔ حضرت خالد ؓ یہ چاہتے تھے کہ دشمن اُن سے پہلے کاظمہ پہنچ جائے اور جیسے ہی دشمن کاظمہ پہنچے حضرت خالد ؓ ایک ہی وار سے دو مقصد حل کر لیں یعنی کاظمہ پر قبضہ بھی کر لیں اور دشمن کو نیست و نابود بھی کر دیں۔ حضرت خالد ؓ نے اپنی رفتار کو تھوڑا سا سست کیا اور ہرمز نے اپنے بھاری بھر کم لشکر پر زور ڈال کر کاظمہ ایسی حالت میں پہنچایا کہ اہل لشکر تھک کر چور ہو گئے اور جلدی میں کاظمہ کے دفاع کے لئے لشکر کو صف بند کر دیا۔ اب تک ہرمز ردِعمل کے طور پر تین صف بندیاں کر چکا تھا اور حضرت خالد ؓ صرف دیکھ بھال میں مصروف تھے اگر خالد ؓ ایرانی فوج سے پہلے پہنچ کر کاظمہ پر قبضہ کر لیتے تو پھر حضرت خالد ؓ کو ایرانی فوج کے حملے کا انتظار ہوتا اور دفاعی جنگ لڑنا پڑتی۔ دفاعی جنگ کو متحرک رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور حضور پاک ﷺ نے مسلمانوں کو متحرک اور جارحانہ جنگ کی تربیت دی تھی کہ پہل کاری اپنے پاس رکھیں اس لئے حضرت خالد ؓ نے ہرمز کو صف بندی کرنے دی۔

متبادل یا متوازی فوج

موجودہ فوج کی ڈرل میں ایک حرکت کو متبادل مارچ یا Counter March کہتے ہیں۔ ڈرل پرانے

جنگ کی نقالی کو اپنا کر اٹھارویں صدی میں موجودہ ڈرل کو اپنایا۔ متبادل کوچ کو اُس نے جنگ کے دوران بھی تدبیرات کے طور پر اپنایا۔ اُس سے پہلے یورپ کی عسکری تاریخ میں ایسا کوئی ذکر موجود نہیں ہے لیکن ہم یہاں یہ نہیں کہیں گے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس طرز جنگ کے موجد ہیں بلکہ صرف یہ کہیں گے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کوشش یہ تھی کہ دشمن تھک کر چور ہو جائے اور اُس پر حملہ وہ ایسی جگہ سے کریں جہاں ریگستان مسلمانوں کی پچھلی طرف ہو۔ یہ دونوں چیزیں کاظمہ کے میدان جنگ نے مہیا کر دیں۔ اہل یورپ تو سترھویں اور اٹھارویں صدی تک جنگ کی حرکات کو جیومیٹری کے فارمولوں کے طور پر اپناتے تھے اور اب بھی اپناتے ہیں۔ لڑائی ایک داؤ ہوتی ہے اس میں دھوکا بھی ہوتا ہے اور چالیں بھی۔ اسلام ہمیں چالوں کے اپنانے کے لئے تو کہتا ہے لیکن چالوں اور فارمولوں کی غلامی کی اجازت نہیں دیتا اس لئے ہم اس طریق کار کو ایک وقتی چال کا نام ہی دیں گے۔

جنگ کی کارروائی

اب جنگ کی کارروائی کے سلسلے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ مسلمانوں کی تعداد کوئی اٹھارہ ہزار کے قریب تھی۔ ایرانیوں کی تعداد کے بارے میں کچھ خاموشی ضرور ہے لیکن وہ مسلمانوں سے کسی صورت میں کم نہ تھے۔ ہتھیاروں میں بھی ایرانی برتر تھے لیکن مسلمان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے لڑ رہے تھے اِس کے علاوہ مسلمانوں کی تدبیرات اور حکمت عملی بہتر تھی اور حربی خوبیوں میں بھی وہ ایرانیوں سے بہتر تھے وہ ہلکے پھلکے اور متحرک تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے متحرک طرز جنگ کی تربیت دی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ ایسی کارروائی کاظمہ میں ہو یا ابلہ میں۔ مقصد دشمن کا ابلہ کے علاقے میں قلع قمع تھا اور خلیفہ وقت کی یہی ہدایات تھیں کہ پہلا مرحلہ ابلہ سے شروع ہو۔ اب اگر نقشہ پنجم یا ششم کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کاظمہ کے پچھلے علاقہ میں ریگستان تھا۔ صحرائی علاقہ میں جنگ کا یہ اصول ہوتا ہے کہ صحرا کو اپنی پشت پر رکھ کر جنگ کرو۔ مسلمانوں کی ایرانیوں کے ساتھ یہ پہلی لڑائی تھی اور اِس میں فتح کی ضرورت تھی اور کاظمہ کی زمین حفیر یا ابلہ کے علاقوں کی نسبت مسلمانوں کے لئے بہتر تھی۔ صحرا کو پیچھے رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر جنگ میں کوئی خراب مرحلہ آجائے تو ریگستانی علاقے میں تتر بتر ہو کر اپنی مرضی کے مقام پر اکٹھے ہو کر پھر اپنی مرضی کی جگہ دشمن پر وار کیا جا سکتا ہے لیکن ریگستان کا استعمال صرف وہی لوگ صحیح طور پر کر سکتے ہیں جو ریگستان کے باسی ہوں۔ مسلمانوں کو یہی فائدہ تھا لیکن ایرانی لشکر کی طرز جنگ میں زمین کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔

مبصرین کے تجزیے

کلاسوِز کے مطابق مبصرین یا ناقد بعض دفعہ تجزیے صرف لفاظی کے زور پر کرتے ہیں اور اُن کے بیچ کچھ نہیں

ہوتا۔ ہمارے ایک مبصر لکھتے ہیں کہ ''ہرمز خود ابلہ کی بجائے کاظمہ میں جنگ کا خواہاں تھا کہ ابلہ کے زرخیز زمین کے علاقے میں وہ پہلے ہی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے چھاپوں سے تنگ آچکا تھا اور وہ ابلہ سے دور ہی جنگ کا خواہاں تھا۔ اس لئے وہ بھی خوش ہوا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کاظمہ جارہے تھے اور ادھر ہرمز کے لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو تباہ کرنا آسان ہوگا۔''

چھاپوں، جھڑپوں اور لڑائی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چھاپہ ہمیشہ زرخیز علاقہ یا مدد طلب والی جگہ پر مارا جاتا ہے جھڑپ حادثہ یا معمولی مخالفت کو دور کرنا ہوتا ہے لیکن لڑائی اور جنگ میں سب کچھ داؤ پر ہوتا ہے۔ ہرمز نے شروع میں اپنے لئے صحیح تجزیہ کیا اور مسلمانوں کو کاظمہ میں روکنا بہتر تھا لیکن اب خوشی والی بات کوئی نہ تھی۔ ہرمز حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ ہاں البتہ لڑائی کے نتائج کے بارے میں وہ پُر اُمید تھا اور ''خواہاں'' والی بات نہ تھی۔

ہمارے یہی مبصر آگے لکھتے ہیں:

متحارب ملکوں کے لشکر ایک دوسرے کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچ لیتے ہیں اور یہی چیز ہرمز اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو کاظمہ کے مقام پر لے گئی۔'' لیکن اس بناء پر اس چیز کی کلاسوٹز کی زبان میں وضاحت ضروری ہے بات یہ ہوتی ہے کہ جارحانہ کارروائی والے کو دشمن کی تلاش ہوتی ہے اور مدافعانہ کارروائی والا خود اپنی چنی ہوئی زمین پر دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہے اور یہی مقناطیس بن جاتی ہے لیکن یہاں حالات مختلف تھے ہرمز کو کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ کبھی کاظمہ کو بچانے کے لئے بھاگتا تھا اور کبھی ابلہ کو بچانے کے لئے۔ کسریٰ حالات کو بہتر طور پر سمجھتا تھا اُس نے جنرل قارن کو ہرمز کی امداد کے لئے بھیج دیا۔ ہرمز کے لئے بہتر یہ تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتا اور قارن کا انتظار کرتا تب تک مسلمانوں کو الجھائے رکھتا اور کمک آجانے کے بعد اپنی مرضی سے مسلمانوں کے خلاف کوئی فیصلہ کن کارروائی کرتا لیکن یہاں پر اُس نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اشاروں پر ناچتے ہوئے اپنے آپ کو باندھ دیا اور اس کا لشکر مشقت اور تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا۔

چنانچہ ان حالات میں ہم اپنے مبصر سے اختلاف کرتے ہیں کہ ہرمز بڑی حربی خوبیوں کا مالک تھا۔ ہمارے لحاظ سے اور نتائج کے لحاظ سے بھی ہرمز کا عسکری تدبیرات کے سلسلہ میں کوئی مقام نہیں۔

طرفین کی صف بندی

ہرمز نے کاظمہ سے مغرب کی طرف اپنی فوج کی صف بندی کی اور لشکر کے سامنے ریتلا علاقہ تھا اور پچھلی طرف چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ پیدل فوج ٹکڑیوں میں زنجیروں کے ساتھ بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس جنگ کو [illegible] تو پسند نہ کرتے تھے کہ جوان متحرک نہ رہ سکتے تھے مگر

ایرانی اِن زنجیروں کو کیوں استعمال کرتے تھے اِس کی دو وجوہات ممکن تھیں اوّل مل کر مرنا جینا اور دوم کمزور دِلوں کو بھی ساتھ بندھنوں میں باندھ دینا۔ اسلام اس سلسلہ یا ضرورت کے لئے فلسفۂ حیات کی ''زنجیر'' استعمال کرتا ہے۔ بہرحال حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کو صف بند اور سلاسل ہونے دیا اور پھر اچانک ان کے سامنے اپنے اونٹوں سے سامان اُتار دینے کا حکم دیا۔ اہلِ لشکر نے پیاس کی شکایت کی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اعلان کروادیا ''بخدا پانی پر ایسی جماعت کا قبضہ ہو جائے گا جو لڑائی میں صابر رہے گی۔'' اور روایت ہے کہ جنگ کے شروع ہونے سے ایک لمحہ پہلے اللہ تعالیٰ نے بارانِ رحمت سے مسلمانوں کے ایمان ویقین کو تقویت دی۔

ہرمز نے لشکر کے بازوؤں پر قباذ اور انوشجان کو مقرر کیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ اور عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم کو۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنے سواروں کے ساتھ دشمن پر جھپٹنے والی فوج کے ساتھ لشکر کے عقب میں تھے۔ جیش المقدم میں چند سوار بھی تھے جن کی کمانڈ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو کر رہے تھے۔ ایرانی پہلوانوں نے آگے نکل کر مسلمانوں کو مبارزت کی دعوت دی اور ہرمز بھی گھوڑے پر سوار ''خالد''، ''خالد'' پکارتا آگے نکلا۔ اُس زمانے کی جنگ میں سپہ سالاروں کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ ذاتی پہلوانی یا تیغ زنی میں اپنا مقام رکھتے ہوں۔ اس لئے مسلمان بھی لشکر کے سرداروں کے سلسلہ میں یہ پہلو مدِ نظر رکھتے تھے کہ کسی وقت کوئی پشیمانی نہ ہو چنانچہ حضرتِ خالد رضی اللہ عنہ بھی آگے بڑھے۔ دونوں گھوڑوں سے اُتر کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو لیے یا تلوار زنی کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ہرمز کو پچھاڑ دیا۔ ہرمز کے حامی جھپٹے اور اصولِ جنگ کے خلاف حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے لگے۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو ہرمز کے حامیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے مل کر تمام ایرانیوں کا قلع قمع کر دیا۔

اس زمانے کے مبصر نے اِس مقابلہ کو کچھ زیادہ ہی رنگ آمیز بنا دیا ہے اور ہمیں تو پرانی تاریخوں میں سے اِس قسم کا رنگ نظر نہیں آتا۔ بہرحال اِس کامیابی کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھرپور حملہ کا حکم دیا۔ دشمنوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو دھوکا کرنا چاہا اس سے مسلمانوں کو بڑا غصہ اور طیش آیا، پھر مسلمان ایرانیوں کی صفوں میں گھستے چلے گئے۔ تھکے ہوئے ایرانی اپنے سپہ سالار کے خاتمہ کی وجہ سے دِل چھوڑ چکے تھے۔

بھرپور جنگ

متحرک مسلمانوں نے بندھے ہوئے ایرانی سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا اور ایرانیوں کی یہ طرزِ جنگ اُن کو مسلمانوں کے مقابلے میں بہت مہنگی پڑی اور جنگ کا فیصلہ بہت جلد ہو گیا۔ کہ اُن کے دونوں بازوؤں والے سردار اقباذ اور انشوجان نے خیریت اِسی میں سمجھی کہ جو لوگ آزاد تھے اُن کو بھگا کر اور بچا کر لے جائیں چنانچہ لشکر کا ایک

حصہ میدانِ جنگ سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ حضرت خالد ؓ نے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق فوری تعاقب کے لئے حضرت مثنیٰ ؓ کو روانہ کیا لیکن بھگدڑ تتر بتر طریقے سے ہورہی تھی اور سر پر پاؤں رکھ کر۔ تعاقب کا فائدہ وہاں ہوتا ہے جہاں یہ اُمید ہو کہ دشمن کوئی اور پوزیشن اختیار کرے گا اور اُس کو وہاں قدم نہ جمانے دیا جائے مگر یہاں بات ہی اور تھی۔ اس لئے تعاقب جلد ہی خود بخود ختم ہوگیا۔

مالِ غنیمت

مسلمانوں کو کافی مالِ غنیمت حاصل ہوا جس میں ایک ہاتھی بھی تھا اور وہ زنجیریں جن کی مدد سے ایرانی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اُن کا وزن کئی من تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ متعدد زنجیروں میں بندھے ہوئے ایرانی کھیت رہے۔ حضرت خالد ؓ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ شریف بھیجا اور ہرمز کی لاکھ درہم کی ٹوپی بھی جو خلیفہ اوّل نے حضرت خالد ؓ کو عطا کر دی، ہاتھی کو بھی مدینہ بھیج دیا اور مسلمان اتنے بڑے جانور کو دیکھ کر حیران ہو گئے لیکن اُس کی خوراک کا مسئلہ تھا اس لئے خلیفہ نے وہ بھی حضرت خالد ؓ کے پاس واپس بھیج دیا۔

مسلمانوں کی پیش قدمی

فوری تعاقب سے کچھ زیادہ مقصد حاصل نہ ہوا صرف اتنا پتہ چلا کہ دشمن بے ترتیبی سے بھاگ رہا ہے، اس لئے حضرت خالد ؓ نے کاظمہ میں صرف دو دن قیام کیا اور پھر دشمن کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ ہراول کے طور پر حضرت مثنیٰ ؓ کا دو ہزار کا لشکر تھا۔ حضرت مثنیٰ ؓ جب دریا کے نزدیک پہنچے جہاں اب زبیر کا مقام ہے تو وہاں کی حکمران عورت قلع بند ہوگئی۔ حضرت مثنیٰ ؓ وقت کا ضیاع نہ چاہتے تھے اس لئے اپنے بھائی معنیٰ ؓ کو قلعہ کے محاصرہ اور سرکوبی کے لئے چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ اُس عورت کو حالات کی خبر ملتی رہتی تھی وہ مسلمانوں کو نزدیک سے دیکھنا چاہتی تھی۔ محاصرہ کے دوران اُس نے حضرت معنیٰ ؓ کو دیکھ لیا اور نہ صرف جلد ہتھیار ڈال دیئے بلکہ مسلمان ہوگئی اور حضرت معنیٰ ؓ سے شادی کی درخواست بھی کی جو انہوں نے منظور کر لی۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اِس شادی پر کسی مبصر نے کوئی حاشیہ آرائی نہیں کی۔ عورت کی فطرت میں ہوتا ہے کہ وہ بہادر اور باکردار آدمی کو پسند کرتی ہے۔

قصورِ زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اِس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بےچارہ زن شناس نہیں (اقبالؔ)

جنگ کے نتائج واسباق

۱۔ عراق میں اسلام کی بسم اللہ ایک عظیم فتح سے ہوئی جنگ سلاسل کو عجم یا ''بین الاقوامی'' دنیا میں جنگ بدر جیسی حیثیت حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کی سنت کو صحیح طور پر آگے بڑھایا

۲۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پچھلے چار ابواب میں مرتدین کے قلع قمع کے لئے تمام چھوٹی موٹی لڑائیوں اور جھڑپوں کی تعداد میں چالیس کے قریب بنتی ہے اور خلیفہ اوّل نے مسلمانوں کو متحد کر کے دنیا میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ اور اُس کے رسول ﷺ کا نام بلند کر کے بسم اللہ کی۔ اس میں ہمارے لئے سبق یہ ہے کہ ہم بھی اسلام کا فلسفہ حیات اپنائیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

۳۔ قدرتی بات ہے کہ مرتدین کے قلع قمع کے وقت متحرک حربی طریقہ اختیار کیا گیا لیکن وہ بغاوت تھی اور بغاوت کے لئے ضروری ہے کہ متحرک ہونا پڑتا ہے، اس لئے پچھلے ابواب میں ہم نے متحرک حکمت عملی پر تبصرہ نہ کیا تھا۔ اب واضح ہو رہا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے جو متحرک جنگ کا طریقہ رائج کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضور پاک ﷺ کے سب غلاموں نے وہی حکمت عملی اور تدابیر اپنائیں اور ہمیں بھی یہی طرز جنگ اپنانا چاہیے۔

۴۔ اسلام میں پوری قوم اللہ کی فوج ہے اور جہاد فرض ہے۔ ان مہمات اور جنگوں کے سلسلہ میں آپ نے دیکھ لیا کہ پوری قوم کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی جا رہی تھی۔

۵۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عراق کی فتوحات کے سلسلہ میں حکمت عملی پر نظر ڈالیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے عراق کے اندر تک جانے اور دریاؤں کو پار کرنے کی اجازت نہ دی۔ جنوب میں ابلہ کے اہم مقام سے شمال میں حیرہ کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ مرحلے مقرر فرمائے۔ ہدایات جاری کیں۔ قبائل کو وحدت میں پرونے کے لئے ایک کمانڈر مقرر کیا پھر سب کچھ اُس کمانڈر پر چھوڑ دیا۔

جو قوم چھوٹے کمانڈروں پر بھروسہ نہیں کرتی اور اُن کی ہر بات میں دخل اندازی کرتی ہے وہ زیادہ دن تک نہیں چل سکتی۔ آپ دیکھ چکے ہیں اور آگے بھی دیکھیں گے کہ جونیئر افسروں یا علاقہ اور محاذ کے سالاروں پر مکمل بھروسہ کیا گیا تو مسلمانوں نے اتنا جلدی تمام دنیا کو فتح کر لیا یاد رکھیں کہ انگریزوں کی سلطنت کو بھی بنانے والے کپتان اور لیفٹیننٹ تھے، ہماری پرانی یونٹوں کے بانی یہی تھے۔

۶۔ تاریخ کے بامقصد مطالعہ کا یہ مطلب نہیں کہ کیچڑ اُچھالا جائے یا فضول باتیں اکٹھی کی جائیں یا غیروں اور باطل فلسفہ والوں کی عظمت کے گن گائے جائیں۔ بامقصد مطالعہ کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ واقعات اور حالات کا صحیح جائزہ

لیاجائے اور معاملات کو اپنی عقل اور پیمانوں سے نہ پرکھا جائے بلکہ تجزیہ کر کے قارئین کے تجسس کے لیے چھوڑ دیا جائے کردار کشی نہ کی جائے اور اپنوں کے بارے تو ایک ایک لفظ میں ادب ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو آدمی تاریخ سے تفرقے والی باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہے اور اُن کو ہوا دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ مسلمان کو اگر کوئی تفرقہ والی بات نظر آئے تو اُس کو نظر انداز کر دیں یا اُس کے صحیح رُخ کو قوم کے سامنے پیش کریں۔

۷۔ مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں اُن کے لئے فن سپاہ گری کی تربیت ضروری ہے، وہ اپنے آپ کو اسلامی رابطوں میں باندھیں ورنہ ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۸۔ حضرت خالد ؓ کی تدبیرات کا جائزہ لیں۔ مسلمانوں کے حالات کا اپنے آج کے حالات کے ساتھ موازنہ کریں مسلمانوں کی اُس زمانے میں دنیا کی عظیم سلطنتوں کے مقابلے میں وہی حالت تھی جو آج ہماری ہے بلکہ تعداد کے لحاظ سے ہم قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں سے بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے سامنے کچھ ذلت کے زمانے بھی ہیں۔ بارہویں تیرھویں صدی میں صلیبیوں اور منگولوں کی یلغار اور سقوطِ بغداد، مسلمانوں کا سپین سے انخلا، انیسویں بیسویں صدی میں مسلمانوں کی غلامی، اب روسیوں کی افغانستان پر یلغار، یہودیوں کا فلسطین پر قبضہ، ایپے سینا میں مسلمانوں کا خون، کشمیر پر غاصبوں کا قبضہ، سقوطِ ڈھاکہ، فلپائن اور برما مسلمانوں پر ظلم، روسی ترکستان میں اسلام کو ختم کرنے کی سازش، اپنے اندر غیروں کے فلسفوں کا پرچار وغیرہ بڑی ذلت کی باتیں ہیں۔ ان تمام باتوں کی گہرائی میں جایا جائے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری امت میں وحدتِ فکر و وحدتِ عمل پیدا کیا جائے اور اس کی بنیاد ہمیں پاکستان میں رکھنا ہوگی اور پوری پاکستانی قوم کو اللہ کی فوج بنانا ہوگا اور متحرک طرزِ زندگی اور طرزِ جنگ اپنانا ہوگی یعنی جہاد کو جاری و ساری کرنا ہوگا اور اس کو اسلامی فلسفۂ حیات کا اپنانا کہتے ہیں۔

۹۔ جنگ سلاسل کے نتائج کچھ بیان کر دیئے گئے ہیں کہ مسلمانوں نے پیش قدمی شروع کر دی اور جنگ کے نتائج آگے بڑھتے ہیں۔ اسلام میں فتح کو آگے بڑھا کر لوگوں کے دلوں کو فتح کیا جاتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ سلاسل کی جنگ کے بعد وہاں کے عرب قبائل اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے۔

۱۰۔ ایران کی حکومت ڈانواں ڈول ہو رہی تھی فوج کی شکست اُن کے کان نہ کھول سکی اور وہ نہ سنبھلے اس کے بعد شکست پہ شکست کھاتے گئے اور مٹ گئے۔ ہم نے بھی ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کوئی سبق نہ سیکھا تو دسمبر ۱۹۷۱ء میں ملک دولخت ہو گیا۔ اب بھی مکمل طور پر سبق نہیں سیکھ رہے، خدا خیر کرے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

آٹھواں باب

ثنی یا مذار کی جنگ صفر ۱۲ ہجری

اسلام کا قافلہ

اسلام کا قافلہ رواں دواں تھا۔ اسلام کی بامقصد جنگ میں فتح کا کوئی اختتامی مقام نہیں ہوتا۔ مغربی مبصرین خواہ وہ پرانے زمانے کے ہوں یا آج کل کے وہ فتح کے اختتامی مقام پر پہنچ کر بھول بھلیوں میں پھنس جاتے ہیں، ان کے تمام فلسفے، معاشرت اور زندگی کے مقاصد یہاں آ کر جواب دے جاتے ہیں لیکن دین فطرت والوں کی شان نرالی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تلوار نیام سے باہر آ چکی تھی، منزل مقصود کی طرف ہر قسم کی پیش رفت جاری تھی۔ پچھلے باب میں فوری تعاقب اور لمبے تعاقب کا ذکر ہو چکا ہے اور بقول کلاسوز مسلمان اپنی فتح کے ''عطیات وثمرات'' وصول کر چکے تھے، اب فتح کو جاری کرنا تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے مسلمان ملک نہیں دل فتح کرتے ہیں اس لئے ابلہ میں اُن کے لئے کوئی کشش نہ تھی کوئی اور فوج ہوتی تو کاظمہ کے بعد ابلہ کا رُخ کرتی۔ وہاں فتح کی شادمانیاں مناتی۔ شراب کے خم لنڈھاتی لیکن اللہ کے نام پر تلوار اُٹھانے والوں نے صرف ایک گشتی دستہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کے ماتحت ابلہ کی طرف روانہ کیا کہ اعلان کر دو کہ ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا'' اور باقی قافلہ شمال کی طرف رواں دواں تھا۔ ہراول کا کام ہمارے عظیم مجاہد حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث کر رہے تھے۔

ایرانیوں کا ردِعمل

پچھلے باب میں قارن کا ذکر ہو چکا ہے جس کو کسریٰ ایران یعنی ازدشیر نے ہرمز کی مدد کے لئے بھیجا تھا۔ یہ بھی ایک لاکھ درہم والا جرنیل تھا اس نے دریائے دجلہ کو فدار کے مقام پر پار کیا۔ یہاں پر چھوٹا معاون دریا دریائے معقیل جس دریائے دجلہ کے ساتھ ملتا ہے اور تھوڑا نیچے دریائے دجلہ اور فرات کا سنگھم ہے، بہر حال قارن آگے بڑھا اور فرات کو ثنیٰ کے مقام سے پار کیا اس کے بعد وہ جنوب کی طرف مڑ کر ابلہ یا کاظمہ پہنچنے کے بارے

پرائس ہو ہرمز کے خاتمہ اور ایرانیوں کی شکست کی خبر ملی۔ جنگ کے ایرانی بھگوڑے بھی وہاں اُسے ملے جن میں ہرمز کے دو جرنیل قباذ اور انوشجان بھی شامل تھے۔ بھگوڑے اور قارن کی فوج ثنی اور مذار کے علاقہ میں اکٹھے ہو کر اب آگے کے معاملات کو سوچنے لگ گئے۔ کئی باتیں اُن کی سمجھ سے باہر تھیں۔ کیا ہو چکا تھا؟ اور کیا ہو گا؟ وہ عجیب کشمکش اور تذبذب میں گرفتار تھے اور ظاہر ہے کہ اُس کے بعد قارن وہاں رُک گیا کہ وہ بھی کسی مدافعانہ تجویز کے تحت جگہ یا علاقہ کے دفاع کی تجویز بنانے میں مصروف تھا۔ نقشہ ششم میں مذار اور ثنی کے مقامات دکھائے گئے ہیں۔ یہ نقشہ کاظمہ کی جنگ سے حیرہ کی فتح تک تمام جنگوں کے علاقوں اور مقامات کی نشاندہی کرتا ہے اور حضرت خالد ﷺ کی تمام تر پیش قدمی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس نقشہ کی مدد سے حضرت خالد ﷺ کی تدبیرات جو آپ نے خلیفہ اوّل کی حکمت عملی کے تحت حیرہ کی فتح تک بنائیں اُن کی اچھی طرح سے سمجھ آ جاتی ہے، ساتھ ہی ایرانیوں کے ردِ عمل اور کارروائی کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ایرانی ساکن دفاع یعنی ''کھڑی'' یا ''بیٹھی'' جنگ کو پسند کرتے تھے اس وجہ سے قارن نے دریا کے علاقہ کو پسند کیا کہ یہاں پر لوگوں کو زنجیروں سے باندھنے کی ضرورت نہ پڑے گی زنجیروں سے باندھنے والے پہلو پر مبصرین نے ہر طرح کی چہ مگوئیاں کی ہیں کہ کوئی کہتا تھا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کہ خود کو پا بجولاں کر کے دشمن کے حوالے کر دیا جاتا ہے دوسرا کہتا تھا کہ بھاگنے والے لوگوں کو قابو میں رکھنے کا طریقہ تھا یہ طریقہ شاید کرایہ کے سپاہیوں کو قابو رکھنے کے لئے تھا۔ بہر حال قارن نے دریا کو پسند کیا کہ اُس کے عقب کی حفاظت ہو جائے گی اور مسلمان کسی بازو سے آگے بڑھ کر اُس کے لشکر کو گھیرنے یا اُدھیڑنے کی کارروائی نہ کر سکیں گے۔

ایرانیوں کی حکمت عملی کا تجزیہ

اب اہل ایران کی اس حکمت عملی کا تجزیہ کریں کہ وہ خالص دفاعی جنگ لڑ رہے تھے اور یہ بے مقصد دفاعی جنگ تھی یعنی وہ اُس کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے جو کچھ اُن کے پاس تھا۔ اُن کا ملک بڑا وسیع تھا۔ اُن کی تدبیرات کسی حکیمانہ جنگ کا حصہ نہ تھیں اور بقول کلاسوٹزا اگر وہ دشمن کو اپنے اندر کسی حکمت عملی کے تحت گھسنے کی اجازت دیتے اور پھر اپنی چھینی ہوئی زمین یا علاقہ میں مسلمانوں کے ساتھ اپنی کسی تدبیر اور تجویز کے مطابق کرتے تو وہ کارروائی صحیح ہوتی یا کسی جگہ بہت بڑا لشکر اکٹھا کر کے مسلمانوں پر اتنا سخت حملہ کرتے کہ مسلمان تتر بتر ہو جاتے تو پھر اس کو بامقصد جنگ کا نام دے سکتے تھے لیکن ایرانی اپنی سلطنت اور زمین کو بچانے کے لئے جگہ جگہ مسلمانوں کے ساتھ لڑ رہے تھے یا مسلمانوں کی پیش قدمی کے تحت ردِ عمل کے طور پر آگے آ رہے تھے جو نہتے لوگوں کے مقابلہ کے لئے کبھی ''پا بہ زنجیر'' ہو کر کام چلاتے تھے اور کبھی دریا کا سہارا لیتے تھے کہ کہیں اُس کے اپنے جوان پیچھے نہ بھاگ جائیں۔

حضرت خالد ﷺ کی پیش قدمی

حضرت خالد ؓ بھی حضرت مثنیٰ ؓ کے پیچھے دریاؤں کے سنگھم کی طرف روانہ تھے اور پھر حضرت مثنیٰ ؓ نے خبر دی کہ انہوں نے شنئی کے مقام کے نزدیک دشمن کے ایک لشکر کو تلاش کرلیا ہے۔ یہ خبر سن کر حضرت خالد ؓ آگے بڑھے اور علاقہ کی دیکھ بھال کی زمین کا جائزہ لیا۔ یہ کام ذرا اُوپر والی سطح پر تھا اور تعداد کے لحاظ سے حضرت خالد ؓ کا لشکر ہمارے موجودہ ایک ڈویژن کی تعداد کے برابر تھا۔ لیکن اُس زمانے میں جنگ اتنے محدود علاقوں میں ہوتی تھی کہ یہ ساری کارروائی اس طرح تھی جس طرح آج کل ''ایڈونس ٹو کنٹکٹ'' میں کوئی کمپنی کمانڈر رُک جائے کہ آگے دشمن زیادہ ہے تو پھر بٹالین کمانڈر آگے بڑھ کر دشمن اور زمینی حالات کا جائزہ لیتا ہے۔

حضرت خالد ؓ کی دوررس نگاہ جلد ہی حالات کو بھانپ گئی دشمن کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اُس کو وہاں چھوڑ کر آگے حیرہ کی طرف پیش قدمی نہ ہوسکتی تھی یعنی کنائی نہیں کی جاسکتی تھی نہ ہی حضرت خالد ؓ اس دشمن کو کسی چال سے نچا سکتے تھے جس طرح ہرمز کے ساتھ کیا اور حضرت خالد ؓ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ دریا کسی اور جگہ سے پار کر کے کسی اور مقام پر دشمن سے لڑائی لڑی جائے کہ دریا کے پار لڑائی لڑنا مسلمانوں کی طرزِ جنگ کے لحاظ سے ٹھیک نہ تھا۔ مسلمان اُس وقت تک اپنے دوست صحرا کو عقب میں رکھے ہوئے تھے اور شروع شروع کی جنگوں میں یہ ضروری تھا۔ حضرت خالد ؓ نے اندازہ لگالیا کہ وہ ایک بڑا مقصد اُسی مقام پر حاصل کر سکتے تھے کہ دشمن کی فوج کو اُسی مقام پر ایسا تہس نہس کیا جائے کہ وہ وہاں سے بھاگ جائیں۔ ہر لڑائی اور جنگ کا فوری مقصد یہی ہوتا ہے کہ دشمن کی فوج کو ایسی شکست دی جائے کہ اُس میں لڑنے کی سکت ختم ہوجائے اور اس حصول کے لئے بعض دفعہ ایک سے زیادہ لڑائیاں لڑنی پڑتی ہیں۔

طرفین کی صف بندی

دشمن پہلے ہی صف بند ہو چکا تھا، قارن خود درمیان میں تھا اور بازوؤں پر اُس نے کاظمہ یا سلاسل کی جنگ کے شکست خوردہ جرنیل قباذ اور انوشجان کو ہی لگایا۔ کاظمہ کے فاتح جرنیل اور اللہ کی تلوار نے بھی دشمن کے مقابلے میں اپنی فوج کے بازوؤں پر کاظمہ کی فاتح فوج کے بازوں والے سالار حضرت عاصم ؓ بن عمرو اور حضرت عدی ؓ بن حاتم کو مقرر کیا۔

قارن بڑا سمجھدار آدمی تھا وہ ایران کی فوج کی شکست اور بے دلی کو بھانپ چکا تھا اور وہ شکست خوردہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا وہ اُن کو بدلہ لینے پر اُبھار رہا تھا اس وجہ سے اُس نے کاظمہ کے شکست خوردہ جرنیلوں کی عزت بحال رکھی اُس کو اپنی فتح کا بڑا یقین تھا کیونکہ مبارزت میں وہ اپنا مقام نہ رکھتا تھا۔ وہ اِس خیال میں تھا کہ وہ پہلے ہی وار میں مسلمانوں کے سپہ سالار کو ختم کر کے اپنی فوج کا جذبہ بحال کرلے گا۔ بے شک! ہر کمانڈر کو ایسے کرنے کے لئے ہر

طرح کی کوشش کرنی چاہیے اور اس سلسلہ میں قارن کی کارروائی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بات صرف یہ تھی کہ اُس کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کا مقابلہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جو زندگی کی نسبت موت سے زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ یہ وہ مسلمان تھے جن میں کم دل فلاسفر اور مصلحت آمیز مدافعانہ قسم کے مبلغ اُس وقت تک مسلمانوں کی صفوں میں داخل نہ ہوئے تھے۔

جنگ کی کارروائی

ثنی کے میدان میں ایک طرف ہلکے پھلکے ہتھیاروں والے مسلمان اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ صف آرا ہورہے تھے دوسری طرف ایرانی بھی بھاری بھرکم ہتھیاروں کے ساتھ زمین میں قدم گاڑنے کی کوشش کررہے تھے۔ اتنے میں قارن آگے نکلا اور مبارزت طلب کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ آگے نکلنے ہی والے تھے کہ اسلام کے ایک عظیم فرزند حضرت معقل رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار پر سبقت لے گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسکرائے اور یہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی شان ہے کہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسی گمنام ہستیاں بھی پیدا کرتا ہے جن کی شہرت اور جزا سب اللہ کے ہاں ہے۔ یہ معقل رضی اللہ عنہ بن الاعشیٰ تھے۔ نوارد حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں اور مسلمانوں دونوں کو حیران کردیا۔ ایک ہی وار میں انہوں نے قارن کا سر اُس کے بدن سے جدا کردیا۔

ایرانیوں کی تجویز کے مطابق قارن کے بازوؤں والے دونوں ایرانی کمانڈروں نے آگے بڑھ کر مبارزت طلب کرنا تھی کہ شاید وہ کامیابی حاصل کرکے ایرانیوں کا جذبہ بحال کردیں اس لئے قباذ اور انوشجان یعنی کاظمہ کے بھگوڑے آگے بڑھے۔ ادھر کاظمہ کی فتح یاب فوج کے بازوؤں کے کمانڈر آگے بڑھے۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے قباذ کو واصل جہنم کیا اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے انوشجان کو۔ اس موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھرپور حملہ کا حکم دے دیا۔ گو ایرانی پابہ زنجیر نہ تھے لیکن انہوں نے مقابلہ ضرور کیا اور طبری کے مطابق تیس ہزار ایرانی مارے گئے اگر اس تعداد سے آدھی نفری کھیت رہی ہو تو لشکر کی کل تعداد تیس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ کمانڈر بھی لاکھ درہم کی ٹوپی والا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد اٹھارہ ہزار کے قریب ہوگی۔ لڑائی بھی ایرانیوں کے مرضی کے میدانِ جنگ میں تھی۔ گو دریا کے مغربی کنارے کی طرف ہوئی اور مسلمانوں نے دریا کو پار کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ مورخین بھی یہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو بے شمار مال غنیمت ملا جو کاظمہ اور سلاسل کی جنگ سے کہیں زیادہ تھا۔ مسلمان زخمیوں یا شہداء کی تعداد کا کوئی ذکر نہیں۔ کسی چوٹی کے مجاہد کی شہادت کا ذکر بھی نہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا نقصان برائے نام تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان منظم تھے اور تدبیر کے مطابق جنگ لڑی تھی۔ ایرانی اپنی فوج کو جنگ کے ایندھن کے طور پر استعمال کررہے تھے۔

جنگی تجزیے

عسکری تاریخ کے طالب علموں کے لئے ایسی جنگوں میں بڑے اسباق ہوتے ہیں کہ ان کے تجزیے کر کے حالات سے اور زیادہ واقفیت ہوتی ہے۔ ذہن میں فوجی حکمت عملی اور تدبیرات سما جاتی ہیں۔ اس جنگ میں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے تابڑتوڑ حملوں کے بعد ایرانیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ لڑائی کے شروع ہی میں ایرانیوں کے تین بڑے سردار مارے گئے اور مسلمانوں کی طرح ایرانیوں کے پاس نچلی سطح پر کمانڈر مقرر کرنے کا کوئی رواج نہ تھا اور نہ نچلی سطح والے اس قابل ہوتے تھے کہ جنگ میں ٹولیوں کے امیر ہوں۔ حضور پاک ﷺ نے ہر دس آدمیوں پر ایک امیر مقرر کرنے کا حکم فرمایا تھا اور پھر ان دس امیروں یا سو کے دستہ پر ایک اور امیر۔ اور یہ سطح اوپر جاتی رہتی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس سلسلہ میں یاد دہانی بھی کراتے ہیں جس کا آگے ذکر آئے گا۔

جنگ کے نتائج و اسباق

۱۔ فلسفہ جنگ کے بڑے اصول یعنی جنگ کو رواں دواں رکھا گیا اور نتیجہ ایک اور فتح کی صورت میں ظاہر ہوا اور آگے ایک اور جنگ بھی ہوئی جس کا ذکر اگلے باب میں ہے۔

۲۔ مسلمانوں کو کافی مالِ غنیمت ملا، زرخیز علاقوں میں فوج کی کفالت اور بحالی میں آسانی ہوگئی اور جنگی ہتھیار بھی ملے جن سے لڑنے کی وقت میں اضافہ ہوا۔

۳۔ اس پہلو کو کچھ مؤرخین نے غلط طور پر بھی پیش کیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ علاقہ کی زرخیزی کو مدِنظر رکھتے ہوئے جنگ کو جاری رکھا جائے، دراصل حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ دشمن سے زرخیز علاقہ چھین لینے سے، جنگ مسلمانوں کے لئے آسان ہوگئی ہے اور دشمن کے لئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

۴۔ مسلمان جنگ صرف اللہ کے احکام کے لئے لڑتا ہے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے علاقوں کی زرخیزی کی بجائے دشمن کو بتایا تھا کہ وہ اُن کے مقابلے میں ایسے لوگ لے آیا ہے جو موت سے بھی اتنی محبت کرتے ہیں جتنی وہ لوگ زندگی سے۔

۵۔ اس جنگ میں حضرت حسن بصری[1] رضی اللہ عنہ کے والد قید ہو کر آئے اور بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ بصرہ اس وقت ابلہ کے پاس گاؤں تھا حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا ذکر تیسری کتاب کے ساتویں باب میں ہے۔

(۱) جلالِ مصطفیٰ، صفحہ ۴، اور ۳۵۵ سے استفادہ کریں۔

۶۔ اس جنگ نے ثابت کیا کہ ایران جیسا طاقتور ملک بھی ''انفعالی'' یا ساکن دفاع سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا کہ وہ لوگ ہلکے پھلکے دستوں کے خلاف دفاع برائے دفاع کر رہے تھے۔ یہی غلطی مغلوں نے مرہٹوں کے سامنے کی۔ نتیجہ دونوں جگہ مشابہہ ہے۔

۷۔ جنگ میں زیادہ نقصان لیڈروں اور افسروں کا ہوتا ہے مسلمانوں میں ہر سطح پر ایسے لیڈر موجود تھے۔ ایرانیوں کے لئے لیڈر پیدا کرنے کا مسئلہ بن گیا۔ اس سلسلہ میں جرمن جنرل فان سیکٹ کے دونوں جنگ عظیموں کے درمیانی عرصہ کی تجویز کا مطالعہ ہر افسر کے لئے ضروری ہے۔

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

(اقبالؔ)

نواں باب

جنگِ ولجہ، صفر ۱۲ ہجری

مؤرخین ومبصرین کے تجزیوں پر تبصرہ

مؤرخین کے حساب سے ثنیٰ کی جنگ اور جنگ ولجہ دونوں صفر کے مہینے میں ہوئیں اور ساتھ ہی لکھتے ہیں کہ ثنیٰ کی شکست کے بعد (ایاز دستیر) شہنشاہِ ایران نے دو لشکر ایک دوسرے کے پیچھے روانہ کئے۔ ایک لشکر اندازغر یا اندازگر کا تھا اور دوسرا بہمن کا۔ ولجہ پہنچ کر بہمن نے دونوں لشکروں کی کمانڈ سنبھالنا تھی لیکن بہمن کے وہاں پہنچنے سے پہلے اندازگر میدان ہار بیٹھا۔ زمان ومکاں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات کچھ ناممکن نظر آتی ہے کہ صفر کے مہینہ کے اندر ہی اندر ثنیٰ کی شکست کی خبر مدائن پہنچ گئی اور کئی سو میل کا فاصلہ طے کر کے ایک لشکر بھی ولجہ پہنچ گیا۔ لیکن ''مکان'' کا مسئلہ کیسے حل ہو کہ اندازگر کا لشکر چار پانچ سو میل کا فاصلہ دو ہفتوں میں طے کر کے ولجہ پہنچ گیا؟

مبصر کا تجزیہ

اس زمانے کے ایک مبصر نے طبری کی ایک اور روایت سے ''زماں'' کے مسئلہ کا حل تو نکال لیا کہ ایرانی کچھ فاصلہ پر آدمی کھڑے کر دیتے تھے جو بآواز خبروں کو ایک دوسرے تک پہنچاتے تھے اور میدانِ جنگ سے خبر چند گھنٹوں میں اس ''انسانی وائرلیس'' سے دارالخلافہ تک پہنچ جاتی تھی۔ اب صحیح خبر ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچانے کے لئے فاصلہ پچاس سو گز تک ہونا چاہیے تو ایک میل میں کم از کم تیس چالیس آدمی رکھنا پڑتے ہوں گے اور فاصلہ جب چھ سے سات سو میل دور ہو تو بیس سے لے کر تیس ہزار آدمی اس کام پر لگے ہوتے ہوں گے لیکن ایک سے دوسرے آدمی تک خبر کی جو گت بنتی ہوگی اُس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ راقم نے دس سے پندرہ آدمیوں کے ذریعہ سے خبروں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے پہنچانے کی مشق اپنی کمپنی کے جوانوں سے ۱۹۵۱ء میں کرائی تھی بات بگڑ کر کچھ کا کچھ بن جاتی ہے۔ بہرحال گھنٹوں والی بات تو ناممکن ہے ہاں کوئی ایسا تیز تر طریقہ ہوگا کہ خبر مہینہ کی بجائے دنوں میں مدائن پہنچ جاتی ہوگی اور ایسے طریقہ کار ابن بطوطہ نے محمد تغلق کے زمانے میں اس خطہ میں بھی ذکر کیا تھا اور بعد میں بھی ایسا طریقہ جاری

وساری رہا۔ اور وہ ایک چوکی سے دوسری چوکی تک تیز ہرکاروں کا استعمال ہوتا ہے۔

کئی لوگ پرانی اور باطل ایرانی تہذیب کی عظمت کے بڑے قائل ہیں اُن کو ایران کی اُس عظمت میں اچھا ہی اچھا نظر آتا ہے اور کوئی جدت یا اچھی بات سنی تو وہ اُس کو ایران کی پرانی عظمت بڑھانے میں مدد سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں خبروں کو آگے صحیح طور پر پہنچانا اور قاصد کا کام بہت مشکل ہے ہر آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ کام تربیت یافتہ لوگ کر سکتے ہیں اور آگے اس پر اگلے بابوں میں اور تبصرہ بھی ہوگا اس لئے ایرانی اگر دنوں میں ایسا کر سکتے تھے تو بڑی بات تھی۔

ایک دوسری صورت

ظاہر ہے کہ ''زمان و مکاں'' کا تجزیہ صحیح نہیں۔ بات کچھ ایسے ہو سکتی ہے کہ قارن کا لشکر تو کاظمہ کی شکست سے پہلے چل چکا تھا اور کاظمہ کی شکست کی خبر سن کر انداز غر کے لشکر کو بھیجا گیا اور وہ قارن کے لشکر کی مدد کے لئے ثنی کے مقام پر بروقت نہ پہنچ سکا راستہ میں اُس نے ثنی کی شکست کی خبر سنی اس طرح کہ جس طرح قارن نے کاظمہ کی سنی تھی اور اُس نے رُخ تبدیل کر کے ولجہ کے مقام کا رُخ کیا۔ جہاں ابھی مسلمان نہ پہنچ سکے تھے بہمن کے لشکر کو ثنی کی شکست کے بعد بھیجا گیا کہ دو شکستیں ہو چکی تھیں اس لئے ایک بڑے کمانڈر کی ضرورت تھی کہ دو لشکروں کو ملا کر مسلمانوں کو شکست دی جائے۔ آگے جو واقعات ہوئے وہ اس تجزیہ کے حق میں جاتے ہیں اور ان تجزیوں پر تبصرہ کا مطلب یہ ہے کہ صحیح صورت حال واضح ہوتی رہے تو جنگوں کے نتائج اور اسباق صحیح طور پر نکالے جائیں اور اس کو ہم تاریخ کا بامقصد مطالعہ کہتے ہیں تــ ـــ بت قارئین پر چھوڑ دیں گے اور ان کو جو رائے زیادہ وزنی معلوم ہو وہ اس پر یقین کر لیں اور اہلِ فوج کے لئے یہ ایک ذہنی مشق بھی بن جاتی ہے۔

ولجہ کی جنگ کا ایرانی کمانڈر

اندازگر فارسی النسل نہ تھا لیکن اہلِ فارس میں اُس کو اونچا مقام حاصل تھا وہ خراساں کا فوجی گورنر رہ چکا تھا اور عرب قبائل میں بھی ہرمز کی طرح وہ کوئی ناپسندیدہ آدمی نہ تھا وہ مدائن سے چل کر کسکر آیا جو موجودہ واسط ہے اور وہاں سے دجلہ کو پار کیا پھر آگے بڑھ کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور یہاں کسی جگہ ثنی کی شکست کی خبر سنی اور رُخ دجلہ کی طرف پھیر دیا۔ مؤرخین نے تو یہ نہیں لکھا کہ راستے میں ایسی خبر سنی تو رُخ دجلہ کی طرف پھیر دیا لیکن یہ ہمارا اپنا تجزیہ ہے اور اس وجہ سے بھی یہ تجزیہ صحیح ہے کہ اگر ثنی کی شکست کی خبر سن کر وہ مدائن سے چلتا تو پھر کسکر یا واسط جا کر دجلہ دریا کو یوں پار کرتا۔ مدائن سے دجلہ پار کر کے سیدھا راستہ زیادہ نزدیک تھا۔ نقشہ ششم کی مدد سے قارئین خود اس رائے کا تجزیہ کریں ویسے ولجہ کا مقام نقشہ پر ہم نے بھی اندازاً ظاہر کیا ہے کہ ایک آدھ میل کا فرق ہو سکتا ہے اور مؤرخین کے

بیانات اور اُلیس سے فاصلہ کو مدنظر رکھا ہے۔

بہمن کو ایرانی فوج میں بڑا اونچا مقام حاصل تھا وہ بھی لاکھ درہم والے کمانڈروں میں شامل تھا اور بادشاہ کے ساتھ اُس کے گہرے مراسم تھے اُس کو حکم دیا گیا کہ وہ اندازگر کی مدد کرے اور کمانڈ سنبھال لے۔ وہ ایسا نہ کر سکا تو ظاہر ہے کہ ''زمان ومکاں'' کے حساب کتاب میں ایرانی بُری طرح ناکام ہو رہے تھے اور نہ صرف ایرانی محاذ جنگ کے کمانڈر بلکہ پوری ایرانی حکومت مسلمانوں کے اشاروں پر ناچ رہی تھی یعنی ان کی تمام تر کارروائیاں ردِعمل کے طور پر تھیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ فلاں نے پہل کاری حاصل کر لی تو دراصل وہ زمان ومکاں پر حاوی ہونا ہوتا ہے۔ چھوٹی سطح پر یہ معاملہ کچھ آسان ہوتا ہے وسیع علاقوں کے سلسلہ میں یہ بڑا اہم معاملہ ہوتا ہے لیکن حضور پاک ﷺ نے مسلمانوں کو زمان ومکاں پر حاوی ہونے کی تربیت دی تھی۔ آپ اب جنگوں میں مسلمانوں کی تمام تر کارروائیوں کو اس پیمانہ کے ساتھ ناپئے۔ آخری ابواب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کے تحت اِس مسئلہ کی اور وضاحت ہوگی۔

احوال ومقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

(اقبال)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا تجزیہ

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حالات کا جائزہ لیا۔ وہ دو لڑائیاں جیت چکے تھے دشمن سے علاقے چھین چکے تھے لیکن ایرانی فوج کا کوئی بڑا حصہ پوری طرح تباہ و برباد نہ ہوا تھا۔ دونوں مقامات پر ایرانی فوجی بھاگ کر پیچھے چلے گئے اور کمک کے طور پر آنے والے لشکروں میں شامل ہو گئے دونوں مقامات پر میدانِ جنگ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اجازت نہ دی کہ وہ گھیرا ڈالنے کی کوئی کارروائی کر سکے یا تعاقب کے ذریعہ دشمن کو مکمل تباہ کر دے۔ اوّل خیال جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دل میں تھا وہ یہ تھا کہ اب وقت ضائع نہ کیا جائے اور جو ایرانی فوج یا دشمن مل سکے اُس کو شکنجے میں کس لیا جائے، ساتھ ہی جو علاقے حاصل کئے تھے اُن کو قابو میں رکھنا ضروری تھا اس لئے حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو اُن علاقوں کا فوجی گورنر بنایا اور اُن کو حفیر میں متعین کیا۔ قارئین نقشہ پنجم یا ششم پر نگاہ ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کے لحاظ سے حفیر کو ابلہ پر فوجی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی اور ہرمز اگر ابلہ یا کاظمہ کی بجائے حفیر کے مقام پر مسلمانوں کے ساتھ جنگ لڑنے کی ٹھان لیتا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کو زیادہ پسند کرتے۔ ایرانیوں کے نقطہ نگاہ سے ابلہ زیادہ اہم تھا اور اُس کا بیان ہو چکا ہے لیکن مسلمانوں کی حکمت عملی کے لحاظ سے حفیر کو زیادہ اہمیت تھی۔ یہ ایک قسم کا خشکی کے راستوں کا جنکشن یا مرکز تھا اور اس کی ایک طرف ریگستان تھا جو مسلمانوں کا ''دوست'' تھا۔ حضرت سوید رضی اللہ عنہ صحابی اور صحابی

رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور جگہوں پر نومسلم قبائل کو کمانڈ دے رہے تھے لیکن اتنی اہم جگہ کی کمانڈ ایک ایسے صحابی کو دی جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی گیارہ لشکروں میں سے ایک کی کمانڈ دے چکے تھے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی مخبری

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنوبکر کے ذریعہ سے اور باقی نومسلم عرب قبائل کی مدد سے مخبری کا نہایت اعلیٰ پایہ کا انتظام کر لیا تھا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یہ خبر بھی مل چکی تھی کہ ایران کا دوسرا لشکر بھی مدائن چھوڑ کر محاذ جنگ کی طرف رواں دواں تھا لیکن اُس کی رفتار سست تھی معلوم ہوتا تھا کہ بہمن جنگ سے کچھ کترا رہا تھا۔ دراصل ازدشیر بیمار تھا اور حکومت کی متوقع تبدیلی نے اوپر والوں کو عجیب الجھن میں ڈالا ہوا تھا اور یہی کمزوریاں ایرانیوں کے زوال کا باعث بن رہی تھیں اور ایسی بے یقینی کسی بھی قوم کے لئے زوال کا باعث بن سکتی ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تجویز

چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تیزی کے ساتھ ولجہ کے مقام کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جس کا محل وقوع نقشہ ششم پر دیکھیں اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دشمن کے سامنے ہی کچھ فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رسالہ والوں کو کہیں پیچھے ہی چھپا کر رکھا ہوا تھا اور دشمن پر ظاہر کیا کہ وہ صرف پیدل دستوں کے ساتھ وہاں آ موجود ہوئے تھے۔ ایرانی لشکر کی تعداد کے بارے میں مورخین خاموش ہیں اور مسلمانوں کی تعداد کوئی پندرہ ہزار کے قریب بتائی گئی ہے اور شاید کچھ زیادہ نہ ہو کہ ایرانی کمانڈر مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہوا اور اپنی پچھلی طرف دریا کو بھی استعمال کرنے کی کوشش نہ کی کہ دریا پیچھے سے اُس کے لشکر کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ دن اور اگلا دن طرفین نے دیکھ بھال میں گزار دیا۔ پرانے مورخین نے میدانِ جنگ کے زمینی حالات کو زیادہ واضح نہیں کیا۔ مورخین اور مبصرین نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایرانی فوج کی صف بندی دریا سے کافی آگے میدان میں بتائی ہے۔ یہ مطالعے اور تجزیے صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ تمام تر مطالعے اس حقیقت کی تلاش میں ہو سکتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ رات کو اپنے رسالہ کو دشمن کے پیچھے کس راستے سے اور کیسے لے گئے کہ دشمن کو خبر نہ ہوئی۔ ظاہر ہے دشمن دریا کی طرف سے بالکل بے خبر تھا۔ یعنی ایرانی چوکنے نہ تھے وہ اپنے بازوؤں یا پچھلے علاقہ کی حفاظت نہ کر رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے زمین کا مطالعہ کس خوبصورتی سے کیا اور تجویز پر کس طرح بھید اور خوشنودگی سے عمل کیا ایسی تجاویز وہ لوگ بنا سکتے ہیں جن کی روح جنگوں میں ہوتی ہے اور دشمن کی نفری اور زمین کا ایسا تجزیہ کرتے ہیں کہ چپہ چپہ زمین اُن کے سامنے بول

اندازگر کا ردِ عمل اور جنگ کی کارروائی

اندازگر خوش تھا۔ اُس کا اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی نفری کوئی دس ہزار ہے۔ اُس کو کوئی گھوڑا ابھی میدانِ جنگ میں نظر نہ آیا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ کم نفری کی وجہ سے مسلمان گھڑ سوار بھی پیدل لڑ رہے ہیں۔ نقشہ ہفتم کے طور پر جنگ ولجہ کے تین مرحلوں کے تین خاکے پیش کئے جا رہے ہیں جو بغیر سکیل کے ہیں لیکن ان نقشوں کی مدد سے جنگ کی صورتوں کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا۔

پہلا مرحلہ

اندازگر پچاس ہزار درہم کی ٹوپی والا جرنیل تھا اور مؤرخین نے یہ نہیں بتایا کہ اُس کے لشکر کے بازوؤں پر کون کون تھے؟ حضرت خالد رضی اللہ عنہ خود درمیان میں تھے اور حضرت عدی رضی اللہ عنہ اور عاصم رضی اللہ عنہ بازوؤں پر تھے، لیکن آج کے دن حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حکم پر لشکر کے ہر دستہ کے امیر اگلی صفوں میں تلوار کے جوہر دکھا رہے تھے۔ محاذ زیادہ پھیلا ہوا نہ تھا۔ ایرانیوں کی صف بندی اِس طرح تھی کہ ایک لائن اور اُس کے بعد دوسری لائن اور یہ گہرائی بہت زیادہ تھی۔ اگلی صف جب تھک جاتی تھی تو وہ ہٹ جاتی تھی اور مسلمانوں کے سامنے ایک نئی صف آ جاتی تھی۔

علاوہ ایرانی سرداروں نے مبارزت طلبی سے گریز شروع کر دیا تھا۔ ہرمز، قارن، قباذ اور انوشجان کی قسمت کے بارے میں سن کر وہ کچھ سہمے ہوئے تھے لیکن اس دفعہ لشکر میں کچھ "ہزار مرد" لائے گئے جو ایرانی فوج کے خاص پہلوان کہلاتے تھے اور اکیلے کئی مردوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور ان کو بہادری کے جوہر دکھانے کے بعد بادشاہ کی طرف سے ہزار مرد کا خطاب ملتا تھا۔ ایک ایسا ہی ہزار مرد آگے نکلا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اُس کا کام تمام کر دیا اور اس نے اونچی آواز سے اعلان فرمایا کہ اے ایرانیو! یہ تمہارا ہزار مرد ہے۔ طبری کی روایت ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اُس کے اوپر کھڑے ہو کر کھانا کھایا، فوجی اور اخلاقی لحاظ سے صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

دوسرا مرحلہ

جیسے ہی مسلمانوں کے حملے کا زور ٹوٹا یا جان بوجھ کر توڑا گیا تو ایرانی خوش ہوئے اور انہوں نے جوابی حملہ کر دیا اور کئی جگہوں پر مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا مسلمان بے جگری سے لڑے لیکن ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کئی مسلمان حیران تھے کہ معاملات کچھ غلط صورت اختیار کر رہے تھے۔ ایرانی خوش تھے بلکہ اندازگر کو ایک لاکھ درہم کی ٹوپی ملنے کی بھی اُمید لگ گئی لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ کسی وقت کے انتظار میں تھے کہ ایرانی صفیں اپنی اصلی پوزیشنوں سے آگے کچھ پیش قدمی کر رہی ہوں تو تب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فیصلہ کن تجویز اور لڑائی کا تیسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔

تیسرا مرحلہ

لڑائی کا تیسرا مرحلہ مسلمانوں کے رسالہ کی دو یونٹوں کا ایرانیوں پر پچھلی طرف سے حضرت بسر رضی اللہ عنہ بن ابی رحم اور سعید رضی اللہ عنہ بن مرہ کی قیادت میں حملہ تھا جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رسالہ کی اِن دو یونٹوں کو لڑائی والے دن سے پہلی رات کو دشمن کی پچھلی طرف بھیج دیا یہ کام بڑی رازداری سے کیا گیا تھا۔ بڑے لمبے چکر کے بعد یہ گھڑ سوار دشمن کے پیچھے ٹیلوں کی اوٹ میں جا کر چھپ گئے اور حکم تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشارہ ملنے پر دشمن پر پچھلی طرف سے حملہ کر دیں۔ یہ راز ایرانیوں سے بھی پوشیدہ تھا اور مقرر شدہ اشارہ کیا تھا اس سلسلے میں مورخین بھی خاموش ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اشارہ کوئی آگ یا دھواں یا دشمن کے جوابی حملہ کی اُمید وغیرہ تھی یعنی جیسے ہی دشمن جوابی حملہ کرے اور زمین سے اُس کے پاؤں آگے کی طرف ہوں تو پیچھے سے آ کر پل پڑو۔ خدانخواستہ اگر دشمن جوابی حملہ کر کے مسلمانوں کی صفوں میں دور تک گھس جاتا یا مسلمانوں کا بڑا لشکر پسپائی اختیار کر لیتا اور رسالے والے بعد میں حملہ آور ہوتے تو بڑی افراتفری پیدا ہوتی۔ ایسی کارروائی کا بنیادی پہلو یہ ہوتا ہے کہ یہ حیران کن ہو اور رسالہ والوں کا حملہ کرنے والی جگہ پر پہنچ جانا ہی بڑی کامیابی ہوتی ہے جہاں سے حملہ کیا جائے اس کے بعد صرف کمانڈر کے اشارہ اور راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دن کا وقت تھا اُمید واثق ہے کہ حضرت بسر رضی اللہ عنہ اور سعید رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑوں پر سرپٹ دوڑ رہے ہوں گے اور دشمن بوکھلا گیا ہوگا۔

لڑائی کا نتیجہ

نقشہ ہفتم کے تین خاکے ساری لڑائی کا نچوڑ ہیں۔ ایرانی فوج میں ایسی تباہی مچی کہ اُن کا بچ نکلنا ناممکن ہو گیا اور زیادہ فوج کھیت رہی جو چند بچ کر نکل سکے اُن کو یہ پتہ نہ تھا کہ کس طرف بھاگ رہے ہیں اندازگر بھی اُن میں تھا۔ وہ سرپٹ دوڑ رہے تھے، کس طرف؟ یہ انہیں خود کو بھی پتہ نہ تھا پس آگے آگے وہ خود تھے اور پیچھے پیچھے موت اور کوئی ایک اندازگر سمیت دریا کی طرف بڑھنے کی بجائے ریگستان میں داخل ہو گئے اور بھاگتے گئے پھر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کوئی پانی نہ تھا اور وہاں پیاس کی شدت سے تڑپ کر جان دے دی۔ اندازگر مبارزت سے بچ گیا لیکن ریگستان جو مسلمانوں کا دوست تھا۔ اُس سے نہ بچ سکا۔ ریگستان ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرتا ہے جو اُس کو "جانتے" ہوں اور وہ اُن کو "جانتا" ہو۔ ایرانیوں میں صرف وہ چند بچ سکے جنہوں نے دریا کو پار کر لیا وہ کچھ دریا کی نذر بھی ہوئے اور مسلمانوں کو بے پناہ مالِ غنیمت حاصل ہوا۔

عسکری

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جنگ کا یہ طریقہ کار یا جدت کونسی عسکری تاریخ پڑھ کر سیکھا اور اس سے پہلے دنیا کی عسکری تاریخ میں ایسا طریقہ کب اپنایا گیا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو موجودہ زمانے کے عقلی مبصرین کے ذہنوں میں پیدا ہوں گے ہمارے لئے اِس سوال کا جواب آسان ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُن خوش نصیبوں میں سے تھے کہ جن کو حضور پاک ﷺ کے ''دیدارِ عام'' کے علاوہ ''دیدارِ خاص'' بھی ہو چکا تھا اصل میں اُن پر جنگ اُحد[1] میں بہت کچھ واضح ہو گیا تھا کہ اُن کی جگہ لشکرِ اسلام میں ہے۔ ویسے سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے حضور پاک ﷺ نے اپنی نگاہ سے اور عملی نمونوں سے عسکری فلسفے اور کئی اور مضامین کے کالج کھول دیئے تھے کسی کو ماہر مالیات بنا دیا، کسی کو عالم دین، کسی کو جرنیل اور کسی کو ماہر تجارت۔ بعض فقیہ تھے اپنی اپنی قسمت تھی جو کچھ کسی کی شخصیت میں سما سکتا تھا وہ عطا ہو گیا۔ پھر حضور پاک ﷺ نے ایمان کے درجوں کی بھی وضاحت کی کہ ایک ایسا درجہ آتا ہے کہ مومن کے سامنے تمام دنیا جہاں کے علوم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بقول علامہ اقبال ٥ کبھی کبھی ہماری نگاہِ دل وجود کو بھی چیر کر پار نکل جاتی ہے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور حضور پاک ﷺ کی غلامی سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور ''دیدارِ خاص'' کا دروازہ بند نہیں ہوا لیکن بدقسمتی سے ہماری نگاہیں ہمارے توہمات میں الجھ کر رہ گئی ہیں اس وجہ سے ہم غیروں سے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ہمارے قلب و نظر کی ناپاکی کی وجہ سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں اِس کائنات کا وارث مقرر کیا تھا۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں آفاق

(اقبال ٥)

نتائج و اسباق

۱۔ یہ لڑائی بڑی فیصلہ کن تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایرانی فوج کو تباہ و برباد کر دیا گو دشمن کے نقصان کے صحیح اندازہ کے بارے مورخین خاموش ہیں بہرحال دشمن کی فوج کی تعداد بیس تیس ہزار کے درمیان تھی جس میں سے چند سو زندہ بچ کر نکل سکے۔

۲۔ گو ہر لڑائی کی فتح بنیادی طور پر تدبیرات کی فتح ہوتی ہیں اور ایسی دو تین فتوحات مل کر حکمت عملی کی فتح قرار دی جا سکتی ہے لیکن ولجہ کی لڑائی بنیادی طور پر حکمت عملی کی بھی فتح تھی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بہمن کے پہنچنے سے پہلے اندازگر کا قلع قمع کر دیا۔ حکمت عملی (اسٹریجی) اور تدبیرات (ٹیکٹکس) کو الگ الگ سمجھنے کے لئے یہ مثال بڑی موزوں

(۱) جلال مصطفےٰ صفحہ ۷۶ سے استفادہ کریں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر کیا گزری۔

ہے۔زیادہ وضاحت کلاسوزز کی کتابوں میں ہے۔جن کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ایرانی ویسے بھی اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے جنگ میں مصروف تھے اور جو عرب قبائل اِن علاقوں میں تھے وہ نیم خودمختار تھے۔اُن کو نظر آ گیا کہ ان کے مالک تبدیل ہو رہے ہیں اور ان کے نئے مالک برابری کا اصول جاری و ساری کر دیں گے اس لئے قبائلی سردار فکر مند ہو کر اکٹھے ہوئے کہ مسلمانوں کا سخت مقابلہ کریں۔

۴۔ جن علاقوں کو مسلمان اپنے ماتحت لا چکے تھے وہاں کے لوگ البتہ خوش ہو گئے کہ اسلام میں برابری اور مساوات کے اصولوں کی وجہ سے ان کو اسلام میں کشش نظر آئی اور وہاں کے قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

۵۔ حضرت خالد ؓ کی اس کارروائی کا ہنی بال کی کنائی والی کارروائی کے ساتھ موازنہ ٹھیک نہ ہوگا کہ وہ ایک سیدھی سادھی جنگ تھی کہ ہنی بال کے رسالہ نے بازوؤں سے بڑھ کر پہلے دشمن کے رسالہ پر حملہ کر کے اُس کو شکست دی اور پھر ہنی بال کے اشارہ پر رومن پیدل فوج پر حملہ آور ہوئے۔ویسے کچھ مبصر عسکری تاریخ میں مشابہت اور موازنہ تلاش کرتے ہیں اور یہ ایک اچھے تجسس والا مطالعہ ہوتا ہے لیکن بقول کلاسوزز کسی ایک جگہ کے حالات دوسری جگہ کے عین مطابق نہیں ہوتے۔اس لئے مشابہت کی بجائے اور اصول تلاش کرنا چاہیے اور ان اصولوں کو اپنا غلام بنانا چاہیے ہمارا ایمان ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی اور ہم مسئلہ آواگون کے قائل نہیں اور وہ لوگ بھی کوروپانڈو کی جنگ یا دوسری جنگوں کو نہ دہرا سکے۔چنانچہ حضرت خالد ؓ کے اس طریق کار سے ہمارے لئے بہت سبق اور اصول نکلتے ہیں اور اوّل سبق یہ ہے کہ وہ کس طرح رازداری کے ساتھ دشمن کے پیچھے پہنچ گئے اور خالی پیچھے پہنچ جانے سے اسی فیصد کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، ہماری فوج میں ستمبر ۱۹۶۵ء سے پہلے اس طریق کار کا بڑا مطالعہ کیا گیا کہ دشمن کے پچھلے علاقہ میں پہنچ کر اُس کی توپوں پر حملہ کیا جائے لیکن افسوس اس میں پیش رفت نہ ہو سکی اور نہ ہم ستمبر ۱۹۶۵ء میں کبھی ایسا عملی طور پر کر سکے،ضرورت بڑی اہم ہے لیکن طریق کار بہت مشکل ہے اس کے لئے ''کفن پوشوں'' کی ضرورت ہوتی ہے اور کم تعداد کے لوگ بنیادی طور پر ایسی کارروائی کرتے ہیں اور اُن کی کامیابی کو آگے بڑھانے کے لئے تدبیرات کو ''طول'' دیا جاتا ہے یہ بڑا دلچسپ عملی مضمون ہے جس کی مکمل وضاحت یہاں مشکل ہے۔

۶۔ اس جنگ نے اہل ایران کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دی۔بہمن نے آگے بڑھ کر کوئی لڑائی لڑنے کی کوشش نہ کی۔بادشاہ جو بستر مرگ پر تھا شکست کی خبر سن کر اس دنیا سے جلد رخصت ہو گیا۔

۷۔ بڑا سبق یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان غیرتمند تھے۔اُن کے ایمان جذبہ جہاد سے معمور تھے،وہ مرنا اور مارنا

دسواں باب

امغیشیا اور اُلیس کی جنگ

مسلمانوں کی تدبیرات اور کارروائی کا جائزہ

نقشہ ششم کو غور سے دیکھنے سے یہ ظاہر ہوگا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے والے تھے صرف امغیشیا کا علاقہ باقی تھا۔ یہاں تک بھی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث کے قبیلہ کے لوگ پھیلے ہوئے تھے اور وہ نصرانی تھے اُس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے یہ لوگ بھی کسریٰ ایران کے باجگزار تھے اور ولجہ کی لڑائی میں حصہ لے چکے تھے اور وہاں سے کچھ لوگ جان بچا کر اپنے علاقہ میں پہنچ گئے تھے، یہ زرخیز علاقہ تھا اور باشندے بڑے امیر تھے۔ انہوں نے ایک فوجی چھاؤنی بنا رکھی تھی جس کو چوکی کہتے تھے۔ چوکی کا لفظ فوجی زبان میں ہمارے ہاں بھی عام ہے اس لئے ہم اِس مقام کو اس کے اپنے نام اُلیس سے ہی موسوم رکھیں گے اور لشکر اسلام نے عراق کی فتوحات کے سلسلے کی چوتھی جنگ اِس چھاؤنی میں لڑی۔

قارئین نے نوٹ کیا ہوگا کہ ولجہ کی لڑائی سے بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو تدبیرات اپنائی گئیں اُن کے تحت گھیرے میں آنے والے دشمن کے قلع قمع میں کافی دیر لگ گئی تھی ویسے تعاقب بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فوری تعاقب جس کے ذریعہ سے فتح کے ''عطیات'' وصول کئے جاتے ہیں اور دوسرا حکمت عملی کا تعاقب کہ دشمن کو کسی اور اہم جگہ قدم جمانے کا موقع نہ دیا جائے لیکن ولجہ کی لڑائی میں مسلمان لشکر کافی تھک چکا تھا اور کاظمہ سے لے کر جنگی حالات کے تحت اتنا لمبا سفر طے کر لیا تھا کہ اب منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے پوری طاقت اور بھرپور وار کرنے کی ضرورت تھی۔

ابلہ اور بصرہ کے علاقوں کی اہمیت

پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو ابلہ کے علاقہ کا فوجی گورنر بنا دیا تھا اور وہ کچھ فوجی دستوں کے ساتھ حفیر میں تعین تھے۔ دوسری جگہ پر بھی فوجی چوکیاں قائم تھیں

طرح لشکر اسلام کا پھیلاؤ کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا اور اپنی طاقت منتشر ہونے کا خطرہ تھا اس لیے حضرت خالد ﷛ نے تمام فوجوں کو ولجہ میں اکٹھا کیا اور جو علاقے فتح کئے ہوئے تھے اُن کا بندوبست وہاں کے وفادار قبائل کو سونپ دیا گیا۔
نقشہ ششم کو اگر غور سے دیکھیں تو نباج سے حفیر والا راستہ مدینہ سے آمدورفت کے لئے بھی کافی لمبا تھا اور ولجہ پہنچنے کے بعد نباج سے زرود اور شراف والا راستہ نزدیک تھا۔ اس لئے ابلہ کے علاقہ کی اہمیت مسلمانوں کے لئے اور کم ہو گئی تھی۔
اس میں شک نہیں کہ خلیفہ اوّل نے حضرت خالد ﷛ کو نچلے علاقہ سے بڑھ کر حیرہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا کہ اس راستے فوجوں کی کفالت آسان تھی لیکن اب مسلمان زرخیز علاقوں میں پہنچ چکے تھے۔ ویسے مسلمانوں کے لئے حیرہ کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ خلیفہ وقت شام و فلسطین کی طرف بھی پیش قدمی کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ عراق کے محاذ والی فوجیں شام و فلسطین کے محاذ والی فوجوں کے نزدیک ہوں تا کہ بوقت ضرورت دونوں محاذ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں ویسے حیرہ سے سیدھا راستہ مدائن بھی جاتا تھا۔

ابلہ اور حیرہ کے علاقوں کا موازنہ

طبری کی ایک روایت کے مطابق ابلہ کا علاقہ حضرت عمر فاروق ﷛ کے زمانے میں فتح ہوا۔ دراصل حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کے زمانے میں ابلہ تک علاقہ فتح تو ہو گئے تھے لیکن حکمت عملی کے تحت فارس یا خرستان کی طرف مزید پیش قدمی نہ کی گئی کہ پہلے حیرہ تک جانا ضروری تھا کہ عراق اور شام کی فتوحات کے تانے بانے ملائے جائیں اس چیز کی مزید وضاحت اور خرستان کی فتوحات کا ذکر چھبیویں باب میں موجود ہے اس لئے موجودہ ضرورت کے تحت اسلامی لشکروں نے حفیر کے مقام پر چوکی بنائی۔ حفیر کی مسلمانوں کے لئے کچھ وقتی اہمیت تھی۔ مسلمانوں کی حکمت عملی کے لحاظ سے حیرہ اور امغیشیا کو زیادہ اہمیت تھی۔ اس لئے فوجوں کا اجتماع وہاں پر کیا گیا ابلہ اور حفیر کو کم اہمیت دی گئی اور وہاں پر کارروائی دیکھ بھال تک محدود تھی۔ دریاؤں کے سنگم سے حضرت خالد ﷛ نے فوج اوپر بلا لی تو ابلہ کے علاقوں پر مسلمانوں کا کنٹرول باقی نہ رہا۔ حضرت عمر فاروق ﷛ کے زمانے میں یہاں جو کارروائیاں مرحلہ درمرحلہ ہوئیں اُن کا ذکر آگے فتوحات ایران کے تحت آئے گا۔

حیرہ اور امغیشیا کو کئی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ عراقی علاقوں کے نیم خودمختار قبائل کے اہم مرکز تھے، کسی زمانے میں یہ علاقے تمدن اور تجارت کے بھی مرکز رہے اور سب سے بڑھ کر ہمارے عظیم مجاہد حضرت مثنیٰ ﷛ کے قبیلے کا علاقہ تھا اس لئے ان قبائل کو اپنے ساتھ شامل کرنا ضروری تھا۔ شام و فلسطین کے محاذ کے ساتھ نزدیک ہونے کے علاوہ اگلے تمام واقعات سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگوں میں حیرہ کے علاقہ نے بڑا اہم کردار

لئے کوچ کیا اور اسی جگہ کے نزدیک قادسیہ کے مقام پر مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اُس نے ایرانی سلطنت کے پرخچے اُڑا دیئے۔ کوفہ کی چھاؤنی بعد میں اسی جگہ کے نزدیک بنائی گئی۔

مسلمانوں کی پیش قدمی

ہمارے عظیم مجاہد حضرت مثنیٰ بن حارث ہراول دستوں کی کمانڈ کر رہے تھے اور گو ولجہ کے بعد فوری تعاقب نہ کیا گیا لیکن حکمت عملی کا تعاقب کیا گیا تھا۔ حضرت خالد ؓ کو خبر مل رہی تھی کہ عرب قبائل آپس میں مل رہے تھے اور حضرت مثنیٰ ؓ کے گشتی دستوں نے جلد اس خبر کی توثیق کر دی۔ حضرت خالد ؓ کو البتہ فکر یہ تھی کہ بہمن جو اپنے کوچ کے دوران ولجہ کی شکست کی خبر سن چکا تھا کہ وہ اُلیس نہ پہنچ جائے۔ بہمن نے یہ خبر سنی ضرور، لیکن اُس نے خود وہاں پہنچنے کی بجائے اپنے ماتحت جرنیل جابان کو اُلیس بھیج دیا اور خود مدائن واپس چلا گیا۔

ایرانیوں کے حالات

بہمن مدائن کیوں گیا؟ اس کی مؤرخین نے کئی وجوہات بتائی ہیں کوئی کہتا ہے کہ صلاح مشورے کے لئے گیا کوئی کہتا ہے کہ وہ شہنشاہ کا ایڈی کانگ تھا اور ہر ایڈی کانگ (ADC) کو بادشاہ کے دربار میں مقررہ دنوں میں حاضری دینا پڑتی تھی وہ اُس دن وہاں گیا تو بادشاہ زیادہ بیمار تھا وہ اُس کی تیمارداری میں لگ گیا، یہ سب باتیں صحیح ہو سکتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی عیاں ہے کہ وہ موت سے ڈر گیا اور پہلے ایرانی جرنیلوں کے حالات سن کر وہ ذہنی شکست کھا چکا تھا اور جابان کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ جابان خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا تھا کہ وہ ڈرا ہوا تھا کیونکہ طبری کے مطابق اُس نے اُلیس پہنچ کر اپنے لشکر کو بتا دیا کہ اُس کو کسی سپہ سالار سے اتنی وحشت یا دہشت کبھی نہیں ہوئی جتنی اُس دن حضرت خالد ؓ سے ہو رہی تھی۔ طبری تو ہر قسم کی باتیں لکھتا رہتا ہے لیکن بلاذری اور اصفہانی وغیرہ عام طور پر ایران کے پرانے زمانے کی عظمتوں کے بڑے گن گاتے ہیں۔ ہمارے اس زمانے کے مبصر بھی اِن پرانے مؤرخین کی مدد سے غیر مسلم ایرانی عظمت کے بڑے قائل ہیں وہ جان بوجھ کر جابان کے ان الفاظ کو گول کر گئے کیونکہ ایسے الفاظ لکھنے کے بعد اُن کا سارا پلاٹ جس پر ان کی تحریر کی بنیاد ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی ابن اسحٰق کے انگریز مترجم گلیم کا کہنا ہے کہ بلاذری جو طبری کی وفات سے تیس سال پہلے مر گیا تھا اُس نے اپنی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں لکھی اور اصفہانی کو تو خیر جانتے ہی کم لوگ ہیں۔

اللہ کی تلوار ؓ

بہر حال مثنیٰ ؓ کی زبانی عرب قبائل کے جمگھٹے کی خبر سن کر اللہ کی تلوار حضرت خالد ؓ نے منزل کی طرف

روانہ ہو گئے۔ حکمت عملی کے طور پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ جابان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ عرب قبائل کا قلع قمع کر دیں اور پھر جابان سے نپٹ لیں لیکن جابان وہاں پر اسلامی لشکر سے چند گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ لشکر کی تعداد کے بارے میں مؤرخین خاموش ہیں۔ وہاں پہنچنے پر البتہ ایرانی لشکر کے لئے کھانا تیار کیا گیا جو ضرور عرب میزبانوں نے تیار کیا ہوگا۔ وہ کھانا دستر خوان پر چن دیا گیا یا رکھنے کی تیاری ہو رہی تھی، اور سپاہ کھانا کھانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر صف بند ہو کر دشمنوں پر جھپٹنے کے لئے پہنچ گیا۔ بازوؤں پر حضرت عدی رضی اللہ عنہ و عاصم رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ جابان نے اپنے لشکر والوں کو کہا کہ مسلمان اُن کو کھانا کھانے کی مہلت نہ دیں گے، بہتر ہے کہ کھانے میں زہر ملایا جائے لیکن اہل لشکر نہ مانے اور جلدی میں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کسی نے ایک نوالہ چکھا اور کسی نے دو کہ مسلمانوں کے نعرۂ تکبیر سے فضا گونج اُٹھی۔

مسلمانوں کا حملہ

اللہ کی تلوار حضرت خالد رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے سر پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں پر ایک وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اے خالد! تم اللہ کی تلواروں میں سے ایک ہو۔ اس پہلو کو ہم دوسری کتاب میں یرموک کی جنگ کے بیان میں اور واضح کریں گے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک دستہ مقرر فرمایا کہ اُن کی پشت کی حفاظت کی جائے اور آپ آگے بڑھے اور انہوں نے عرب قبائل میں سے دشمنوں کے نام پکار کر اُن کو اپنے مقابلہ میں آنے کی دعوت دی۔ ان میں سے صرف مالک کو آگے بڑھنے کی ہمت ہوئی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک ہی وار میں اُس کا کام تمام کر دیا۔ بازوؤں پر اسی قسم کی دعوت حضرت عدی رضی اللہ عنہ اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ دے رہے تھے۔ لیکن اُن کے بالمقابل عبدالاسود اور الجبر آگے نہ آئے۔ عرب قبائل یہ سمجھتے تھے کہ جابان پہنچ گیا ہے اور بہمن پہنچنے والا ہوگا اور گو وہ مبارزت کے لئے آگے نہ بڑھے تھے لیکن ویسے ایرانی بہادری سے لڑ رہے تھے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ حملہ بڑی تیزی سے کر دیا تھا۔ صف بندی پہلے ہی سے کر کے کوچ کر رہے تھے دشمن کے سامنے آئے تو سامان اُتارنے کا حکم دیا اور فوراً حملہ کر دیا۔ مسلمان آگے بڑھ کر حملہ کر رہے تھے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عرب قبائل کو راہِ راست پر لانے کے لئے بڑے پیغام بھیجے تھے لیکن وہ کسی غلط فہمی کا شکار تھے، میدانِ جنگ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے منہ سے یہ کلمات نکلے "اے رب العالمین! یہ لوگ راہِ راست پر نہیں آ رہے تھے ہم تیرے نام پر خون کی ندیاں بہا دیں گے۔"

نہیں ہوتا اور قتل و غارت سے واقعی خون ان مہینوں میں ایک طرف بہہ نکلتا ہے اس زمانے کی جنگوں میں پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور پرانے زمانے کی حالت نہیں ہوتی تو کیا واقعی اس جنگ میں مسلمانوں کے تابڑتوڑ حملوں سے ''خون کی ندیاں'' بہہ گئیں؟

مؤرخین و مبصرین کی موشگافیاں

طبری کے مطابق ستر ہزار کفار اس جنگ میں مارے گئے لیکن یہ زیادتی ہے مسلمانوں کا لشکر اٹھارہ ہزار سے زیادہ نہ تھا اور دشمن کا لشکر کم از کم ایک لاکھ کے قریب ہوتا تو تب ستر ہزار کفار مارے جاتے اور دشمن کے لشکر کی اتنی تعداد کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ''اضافہ'' خون کی ندیوں والی بات کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا کہ شاید ستر ہزار آدمیوں کے خون سے ایک ندی بہہ سکی ہوگی۔ اندازہ ہے کہ دشمن کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور مرنے والوں کی تعداد شاید اٹھارہ ہزار ہو۔ ویسے اٹھارہ سے بیس ہزار آدمی بھی ایک محدود جگہ مریں اور ہر آدمی کا تقریباً سیر دو سیر خون بہہ جائے تو یہ بھی پانچ سو سے چھ سو من خون ہوسکتا ہے جو نو دس ہزار گیلن کے برابر ہوسکتا ہے اور اس سے خون کی ندی ضرور بہہ گئی ہوگی۔

مؤرخین نے بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے کسی نے لکھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قسم اُٹھائی کہ فتح کے بعد وہ لوگوں کے سر کاٹ کر خون کی ندیاں بہادیں گے اور لڑائی ختم جانے کے بعد لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لاتے تھے اور اُن کے سر کاٹتے جاتے تھے لیکن خون چلتا نہ تھا اس لئے پانی چھوڑا گیا کہ خون کو بہا کر لے جائے اور ندی کے پانی کا رنگ سرخ کردے تاکہ قسم پوری ہو۔ کسی نے لکھا کہ اُس ندی پر آٹا پیسنے والی جو چکیاں تھیں وہ تین دن اسی خون کے ساتھ چلتی رہیں۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لئے اتنے من آٹا پیسا وغیرہ وغیرہ یہ اضافے تو نابلد لوگوں کے ہیں لیکن کئی سنجیدہ لوگوں نے بھی اس جنگ کو خونی دریا والی جنگ کا نام دیا اور یہ بھی لکھا کہ لڑائی کے بعد کسی قیدی کو زندہ نہ چھوڑا اور تعاقب میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا گیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قسم پوری ہو۔

قارئین اندازہ لگائیں کہ غلطی والوں کو ایک تلمیح مل گئی اور اُس کے گرد اتنی کہانیاں بُن دیں کہ جنگ اُلیس کے تمام واقعات پر پانی پھیر دیا اور حقیقی واقعات پر کچھ بھی نہ لکھا اِس جنگ کے مقابلے میں یمامہ کی جنگ کو لیں جہاں چودہ ہزار سے سات ہزار آدمی ایاز کے باغ میں مارے گئے تو اس کا نام خونی باغ رکھ دیا گیا لیکن مسلمانوں کے بارہ سو شہداء کا ذکر بھی کیا مگر یہاں پر مسلمانوں کے ایک شہید کا بھی ذکر نہیں اور دشمن کے ستر ہزار آدمی کے ختم کرنے کا ذکر کیا اس طرح پوری جنگ کو الف لیلیٰ کا کہانی بنا دیا یہی نہیں بلکہ اِس اُلیس کی جنگ کو ایک ایسی جنگ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے ایسے الفاظ منسوب کیے گئے جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی شان گھٹانے کے مترادف ہے۔

افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جنرل اکرم اور جنرل گلب جیسے مبصروں نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا۔ دوسری جنگ عظیم میں راقم نے کئی جگہیں دیکھیں جہاں پر چند سو جاپانی لاشیں پڑی تھیں تو انسان وہاں کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ڈوگرئی کے میدان جنگ سے بھارتیوں نے تقریباً سات سو لاشیں ہمارے سامنے سے فائر بندی والے دن اُٹھائیں جس کے دو سال بعد بھارت کے لوک سبھا میں بڑا بڑا واویلا بھی مچا۔ بے شک میدانِ جنگ بڑا بھیانک نظر آتا تھا تو ستر ہزار لاشوں کا تصور کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

جنگ کے نتائج

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنگ بڑی سخت تھی کہ ہم ہر جنگ کے نتائج کا تجزیہ اُس کے اثرات سے کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی شکست تھی جس نے ایرانی سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جابان کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا اس لڑائی کے بعد ایران کی کسی بڑی فوج کو حضرت خالد ﷜ کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی اور نہ ہی عرب قبائل اس کے بعد حضرت خالد ﷜ کے مقابلہ میں کوئی سخت کارروائی کر سکے یہ ایک بہت بڑی شکست تھی جس سے ایرانی اور دشمن عرب قبائل سہم گئے۔

امغیشیا کی فتح

اُلیس کی جنگ کے نتائج کے طور پر امغیشیا خود بخود فتح ہوگیا اور مسلمانوں کو اُلیس اور امغیشیا میں بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا اور حضرت خالد ﷜ نے جندل عجلی ﷜ کو مدینہ بھیجا جنہوں نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ خلیفہ اوّل کی خدمت میں پیش کیا اور تمام لڑائی کے واقعات صحیح تفصیل اور پختہ کاری سے سنائے۔ جنہیں سن کر حضرت ابوبکر ﷜ بہت خوش ہوئے اور ان سے نام پوچھا جب انہوں نے اپنا نام جندل بیان کیا تو حضرت ابوبکر ﷜ نے فرمایا کہ تم تو ''بلندل'' ہو یعنی پتھر کی طرح مضبوط اور پختہ۔ یہ واقعہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ قاصد یا خبر پہنچانے کا کام ہر آدمی صحیح طور پر نہیں کرسکتا۔ یہ ایک فن ہے اور خداداد چیز ہے، ہم اس سے پہلے جو ''ایرانی وائرلیس'' کا ذکر کر چکے ہیں وہ کچھ افسانہ معلوم ہوتا ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو پرانے زمانے میں وائرلیس یا ٹیلیفون نہ تھے لیکن پیغام رساں چنیدہ آدمی ہوتے تھے اور یہ پہلو آج بھی اتنا ہی اہم ہے۔ بہر حال حضرت صدیق اکبر ﷜ حضرت جندل ﷜ سے بہت خوش ہوئے، اور آپ نے مالِ غنیمت سے ایک لونڈی ان کو عطا فرمائی۔ میدانِ جنگ کے سپاہی کے لئے یہ ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے کہ وہ جانوروں کی طرح جنسی تعلقات کو ختم کر کے ازدواجی رشتے والے راستہ کی راہ نکالتا ہے انہی لونڈیوں اور کنیزوں کے بطن سے بعد میں عظیم مجاہد اور فقیہہ پیدا ہوئے۔ پھر حضرت ابوبکر ﷜ نے مسلمانوں کی اس

فتح کی خوشخبری مسجد نبوی میں سنائی اور فرمایا کہ ''مسلمانو! فتح مبارک ہو۔ ہمیں اسلام کے عظیم فرزند حضرت خالد ﷜ پر فخر کرنا چاہیے۔ ایسے فرزند بہت کم عورتیں پیدا کرتی ہیں اور بے شک ہمارے سر اللہ تعالیٰ کے دربار میں جھک جائیں کہ اُس نے اپنا حبیب ﷺ ہمارے پاس بھیج کر ہمیں یہ عزت بخشی۔''

جنگ کے نتائج واسباق

۱۔ خون کی ندیوں والی بات کو مؤرخین اور مبصرین نے ایک افسانے کا رنگ دے دیا۔ یہ افسوسناک اور شرمناک پہلو ہے لیکن زیادہ افسوس ہمارے اس زمانے کے ایک سنجیدہ مبصر پر ہے جس نے اس جنگ کا نام ہی پرانی تاریخوں سے ہٹ کر خونی دریا کی جنگ رکھ دیا۔

۲۔ ایران کی فوج ذہنی شکست کھا چکی تھی ایرانی لشکر خواہ اس کی تعداد کتنی تھی لیکن وہ مسلمانوں کے اٹھارہ ہزار کے لشکر کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔

۳۔ جنگ میں ایرانی افواج کی زیادہ بہادری والی بات کوئی نہیں۔ اُن کی موت بھیڑ بکریوں والی موت تھی مگر اس کو غلط رنگ دے کر غیر مسلم ایران کی عظمت کو اسلام کے مقابلے یا موازنے کے لیے آگے لانا کسی سازش کے تحت ہی ہوسکتا ہے اور ان کے کارناموں پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم راجہ داہر یا انگ پال کے کارناموں پر فخر کریں ایسے لوگوں کو مسلمان کہنا بھی باعث ننگ ہے۔ کیونکہ یہ دل سے مسلمان نہیں ہوتے۔

۴۔ پیش لفظ میں عرض کی گئی تھی کہ اضافوں سے کس طرح تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اس پہلو کو متعدد مثالوں سے جگہ جگہ واضح کیا جارہا ہے، لیکن ایک اصول کو یاد رکھیں، مومن کا دل آئینہ ہے۔ اگر آپ مسلمان بنیں تو اسلام کے باغ سے خوشبو ہی خوشبو آئے گی اور غیروں کے فلسفوں میں کوئی بڑائی نظر نہ آئے گی لیکن اگر آپ کے اسلام کو زنگ لگ گیا ہے تو اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

(اقبالؒ)

۵۔ ہمارے سامنے مثال موجود ہے، اٹھارہ ہزار نہتے مسلمان اپنے گھروں سے دور اس وقت کی ایک عظیم سلطنت کی باقاعدہ فوج کو کس طرح تہس نہس کرتے جاتے ہیں۔ اور خود ''بُنیانٌ مرصوص'' ہیں۔ ایک ایک نکتہ پر دھیان دیں۔ تیزی، جلد حملہ، دشمن کو تہس نہس کرنا، قاصد کی پختہ بیانی، دینِ فطرت کے ضابطے، انسانی زندگی کا مطالعہ، حق کو حق کہنا اور

ضرورت کو ضرورت سمجھنا، بے شمار اسباق ان جنگوں میں موجود ہیں۔

گیارہواں باب

فتح حیرہ

حیرہ کے حالات

اب وہ منزل نظر آنا شروع ہوگئی تھی جو خلیفہ اوّل نے مقصود کے طور پر اللہ کی تلوار کے لئے مقرر کی تھی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کی طرف رواں دواں تھے۔ اسلام متحرک فلسفہ ہے۔ یہ ساکن اور انفعالی کارروائیوں کو پسند نہیں کرتا اور حیرہ والے بھی کس شک میں نہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اب اُن کی باری آچکی ہے اس لئے وہ تیاریوں میں مصروف تھے۔

حیرہ کا عرب بادشاہ برائے نام تھا اور اصلی طاقت ایرانی گورنر کے پاس تھی، جس کا نام آزازیہ تھا یہ پچاس ہزار درہم کی ٹوپی کا مالک تھا اور ایرانی فوج کے حشر سے باخبر تھا لیکن وہ کسی کمک کے سہارے پُر اُمید ضرور تھا اس لئے عام ایرانی طرز کی ''بیٹھی'' یا ساکن جنگ کی بجائے اُس نے عرب قبائل سے سیکھے ہوئے طریقوں پر جنگ کرنے کی کوشش کی سب سے پہلے اُس نے تمام لشکر کو شہر سے باہر نکالا اور وہاں پر پوزیشن سنبھالی۔ اس کے بعد اپنے بیٹے کو حیرہ سے دس بارہ میل دور نیچے بھیجا کہ دشمن پر کڑی نگاہ رکھے اور اگر دشمن کی پیش قدمی کی خبر دریا والے راستے سے ملے تو دریائے فرات کے پانی کو مقر کے مقام کے پاس مکمل طور پر نہروں میں ڈال دیا جائے تا کہ دریائے فرات میں کوئی پانی باقی نہ رہ جائے یہ کام آزازیہ کے بیٹے نے وہاں پہنچتے ہی کر دیا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جس وقت حیرہ کی طرف پیش قدمی شروع کی تو آپ حالات سے مکمل طور پر باخبر تھے اور عام فوجی لحاظ سے پیدل فوج والی پیش قدمی کی بجائے انہوں نے کشتیوں کے ذریعے دریا کے بہاؤ کے خلاف اوپر کا

سفر شروع کیا وہ ابھی منزلِ مقصود سے دور ہی تھے کہ ملاحوں نے خبر دی کہ دریا میں پانی کی سطح بہت کم ہوگئی ہے اور کشتیاں اوپر نہ جا سکیں گی۔ معاملات کی چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ شاید دشمن نے دریا کا پانی نہروں میں ڈال دیا ہے ورنہ موسم کے لحاظ سے یا کسی اور وجہ سے دریا کا پانی اس طرح کم نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کارروائی

بہر حال حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں دشمن کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُن کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے رسالہ کے چند دستوں کو اپنی کمانڈ میں سرپٹ طور پر مقر کے مقام کی طرف دوڑا دیا۔ انہوں نے اچانک چھاپہ مار کر پانی کو نہروں سے کاٹ کر پھر دریا میں ڈال دیا اور ایرانی فوجی دستہ کا خاتمہ کر دیا اور پھر جلد ہی ایک جھپٹا اور مارا اور بادقلمی کے مقام پر آزازبہ کے لڑکے اور اُس کے متعدد ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ شاید وہ چوکنے نہ تھے البتہ چند ایران جان بچا کر واپس پہنچے اور آزازبہ کو اُس کے بیٹے کے مرنے اور حالات کی خبر دی۔ اُسی وقت ایرانی کسریٰ ازدشیر کے مرنے کی خبر بھی پہنچی اور آزازبہ بغیر لڑائی کے وہ جگہ چھوڑ کر فرات کو عبور کر کے بھاگ گیا۔

تبصرہ

پرانی ایرانی تہذیب کے مداح ایک مبصر نے واقعہ کو اس طرح بیان کیا کہ" آزازبہ ایران کا سچا اور عظیم سپوت تھا اور حیرہ کے دفاع کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھا" لیکن دوسرے صفحے پر جب یہ واقعات سامنے آتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ " بے چارے آزازبہ کا دل ٹوٹ گیا تھا اس لئے وہ فرات کو عبور کر کے مدائن میں بہمن کے پاس چلا گیا۔" ہمارے لئے عظمت صرف اسلام میں ہے اور لفاظی کے چکر میں ہم کسی غیر اسلامی تہذیب و تمدن کے مردہ جسم میں جان ڈال کر اُس کو اسلام کے مقابلے میں لے آنے کو پسند نہیں کرتے۔ کچھ لوگ رلجہ داہر یا باطل فلسفیوں کو اُجاگر کر کے پتہ نہیں کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر یہ سب کچھ لاعلمی کے طور پر کیا جا رہا ہے تو ہم اُن کے لئے دعا کر سکتے ہیں اور اگر جان بوجھ کر کر رہے ہیں تو انہیں سبق سکھانا ضروری ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کارروائی

ظاہر ہے کہ آزازبہ کے فرار کے بعد حیرہ میں اب عرب قبائل ہی باقی رہ گئے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا ارادہ تھا کہ خوانق اور نجف کے درمیان کہیں پڑاؤ کریں لیکن صورتِ حال کی تبدیلی کی وجہ سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اپنے لشکر کے تمام امیروں کو خوانق میں اکٹھا کیا۔ حالات کا جائزہ لیا اور خود آگے بڑھ کر اُس جگہ پڑاؤ کیا جہاں پر حیرہ سے نکل کر آزازبہ نے پڑاؤ کیا ہوا تھا اور وہاں سے بھاگ چکا تھا۔ عرب قبائل کے الگ الگ قلعے تھے جن میں وہ

قلعہ بند ہو گئے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو حصوں میں بانٹ کر امراء کو اِن قلعوں کا محاصرہ کرنے اور انہیں سر کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ دراصل حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ چکے تھے۔ حیرہ کسی زمانے میں بڑا شہر تھا اور ہر لحاظ سے آباد تھا یہ جگہ نجف اشرف سے نزدیک ہے اور اب سنتے ہیں وہاں کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ حضور نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اکثر مسافروں اور تجارت پیشہ لوگوں نے حیرہ کی خوبصورتی اور لوگوں کے رہن و سہن کے بارے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بھی ذکر کیا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شہر پر چند سال بعد اسلام کے جھنڈے لہرائیں گے۔

کرامۃ بنت عبدالمسیح

اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دفعہ حیرہ کے ذکر میں کرامۃ بنت عبدالمسیح کا ذکر بھی آ گیا۔ جن کی خوبصورتی اور گھڑسواری کا ذکر زبان زدِ عام تھا اور وہ ''حیرہ کی پری'' یا ''حیرہ کی بیگم'' وغیرہ کے ناموں سے موسوم تھی۔ مجلس میں ایک دفعہ حضرت شویل رضی اللہ عنہ نے بڑی سادگی سے پوچھا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حیرہ فتح ہو جائے گا تو کرامۃ کا کیا بنے گا۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور رحمۃ اللعالمین کو یہ سادگی اتنی پسند آئی کہ مسکرا کر فرمایا: ''اُس کو تم لے لینا۔'' آج حضرت شویل رضی اللہ عنہ کی انتظار کی گھڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اُن کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے پورے ہونے کا وقت آ گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا اُس نے ہونا تھا۔ حیرہ پہنچ کر گو سب اہلِ لشکر خوش ہوں گے لیکن حضرت شویل رضی اللہ عنہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوئی۔

لڑائی والا معاملہ تو ختم تھا۔ ''صفائی'' والی بات باقی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ، ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور، ضرار رضی اللہ عنہ بن المقرن رضی اللہ عنہ مزنی اور ضرار رضی اللہ عنہ بن خطاب کو عرب قبائل کے چار قلعوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ حضرت مقرن رضی اللہ عنہ کے دس بیٹوں میں سے حضرت سوید رضی اللہ عنہ، معقل رضی اللہ عنہ، نعمان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں۔ آج پانچویں کا ذکر پڑھ رہے ہیں اور آگے چھٹے حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کا ذکر پڑھیں گے۔ باقی یا تو چھوٹے تھے یا عام درجے کے مجاہد کہ اُن کا ذکر کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ضرار رضی اللہ عنہ بن خطاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھائی نہ تھے، یہ ایک اور خطاب کے بیٹے تھے۔

عرب قبائل کے چار سرداروں میں زیادہ مشہور دو تھے۔ اوّل ایاس بن قبیصہ طائی، جو برائے نام یا باجگزار بادشاہ تھا اور دوسرا کرامۃ کا باپ عبدالمسیح بن عمر بن بقیلہ جو اکثر ابن بقیلہ کے نام سے مشہور ہے۔ مؤرخین نے ہر قلعہ کے

عملی کا ہے وہ کامیاب ہو چکی تھی۔ خوانق پہنچ کر حضرت خالد ؓ ایک طرح سے حیرہ کو گھیرا ڈال چکے تھے اور کلاسوئز نے ایسی کارروائیوں کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے مطابق حضرت خالد ؓ اپنی مہم اور فتوحات کے ''عطیات و ثمرات'' وصول کر رہے تھے اور ہمارا جائزہ یہ ہے کہ تمام قبائل کی طرف سے عبدالمسیح ہی نمائندہ بن کر مسلمانوں کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے آیا۔

عبدالمسیح کی ''زیرکی''

یہ آدمی دو سو سال بوڑھا تھا۔ نوشیروان عادل کا زمانہ دیکھ چکا تھا، کچھ کاہن قسم کا آدمی تھا یا تجربہ کے ذریعہ سے آنے والے واقعات کا ذکر بھی اشارتاً کر دیتا تھا۔ علم الکلام کا ماہر مانا جاتا تھا۔ بڑا حاضر جواب تھا اور فلسفیانہ قسم کی باتیں کرتا تھا۔ تمام مؤرخین نے حضرت خالد ؓ اور اس کی گفتگو کو لفظ بلفظ لکھا ہے اور اس کی زیرکی اور دانائی کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ حضرت خالد ؓ نے البتہ تین شرطیں پیش کیں۔ اوّل: اسلام لے آؤ اور ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر یہ بھی منظور نہیں تو جزیہ یا ٹیکس دو کہ تمہاری حفاظت کا بندوبست کیا جائے اگر یہ بھی منظور نہیں تو فیصلہ تلوار کرے گی۔ اوّل تو ی شرطیں سن کر عبدالمسیح کی ساری ذہانت جواب دے گئی کہ بقول علامہ اقبال ○ فلسفہ جو خونِ جگر سے نہ لکھا جائے اس کی بنیاد کوئی نہیں ہوتی اور عبدالمسیح کا زبانی کلامی فلسفہ تھا۔ لیکن حضرت خالد ؓ نے اس کو اور زیادہ حیران کر دیا جب آپ ؓ نے اس کے خادم کی پیٹی کے ساتھ لٹکتی ہوئی تھیلی کھولنے کا حکم دیا جس میں ایسا سخت زہر تھا جس کو سونگھنے سے بھی انسان زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اور عبدالمسیح اس تاڑ میں تھا کہ یہ زہر کسی وقت حضرت خالد ؓ کو بے خبری میں سونگھا دے، لیکن حضرت خالد ؓ کے پوچھنے پر جواب دیا کہ وہ یہ زہر اپنے لئے لایا تھا کہ معاہدہ میں ناکامی کے بعد اس زہر کے ساتھ خودکشی کرے گا۔ یہ بات قابل تسلیم نہ تھی کیونکہ خودکشی کے لئے بڑے وقت موجود تھے لیکن حضرت خالد ؓ نے اس کو اور ساری مجلس کو حیران کر دیا۔ جب یہ زہر عبدالمسیح کے خادم سے لے کر آپ نے بسم اللہ پڑھ کر منہ میں ڈال دی۔ اپنوں کے پاس بھی حضرت خالد ؓ کو روکنے کا وقت نہ تھا لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اللہ کی تلوار پر دشمن یا باطل کا کوئی حربہ اثر نہ کر سکتا تھا۔ اور حضرت خالد ؓ نے اس کا ثبوت پیش کر دیا۔ مکمل وضاحت دوسری کتاب کے گیارہویں باب میں ہے۔

عبدالمسیح کی زیرکی کو کافی دھچکا لگ چکا تھا۔ وہ تو نوشیرواں عادل جیسے بادشاہ کے دربار میں اپنی زیرکی کی داد لے چکا تھا اور عام ایرانی ارباب اقتدار تو اس کی دانائی سے مرعوب تھے لیکن یہاں اہل حق کے سامنے اس کی تمام تر دانائی خس و خاشاک ہو رہی تھی اور جو تھوڑی سی کسر باقی تھی، وہ حضرت شویل ؓ نے پوری کر دی۔ وہ آگے بڑھے اور

انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حضور پاک ﷺ کا فرمان یاد دلایا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حیران تو ہوئے لیکن اپنے آقا ﷺ کا فرمان سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر رقت طاری ہوگئی اور عبدالمسیح کی زیرکی نے بھی ضرور جواب دے دیا ہوگا اور اس کی رہی سہی زیرکی مٹی میں مل گئی ہوگی۔ معاہدہ سے تو کچھ حاصل ہوگیا ہوگا لیکن عبدالمسیح سب کچھ کھو بیٹھا، کہ اپنی لڑکی کرامۃ کو حضرت شویل رضی اللہ عنہ کے حوالے کرنے والی بات کو معاہدہ میں شامل کرنا پڑا، باقی معاہدہ جزیہ تک محدود تھا۔

حضرت شویل رضی اللہ عنہ والا معاملہ بھی ہمارے آقا ﷺ کی شان کی یاددہانی تھی ورنہ کرامۃ کی عمر اُس وقت اسّی برس ہو چکی تھی اور حضرت شویل رضی اللہ عنہ کو ہمارے آقا ﷺ کی فرمائش کے مطابق وہ مل ضرور گئی لیکن پہلے باب میں ہم نے صحابہؓ کی شان بیان کرتے وقت صحابہ کی سادگی کا بھی ذکر کیا اور حضرت شویل رضی اللہ عنہ کا بھی۔ چنانچہ آج کے دن انہوں نے اس سادگی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ کرامۃ حضرت شویل رضی اللہ عنہ سے کہنے لگی کہ وہ بہت بوڑھی ہو چکی ہے۔ حضرت شویل رضی اللہ عنہ اُس کا ہدیہ لے لیں۔ حضرت شویل رضی اللہ عنہ کو بات پسند آئی فرمایا "ایک ہزار درہم سے کم نہ لوں گا۔" کرامۃ بڑی مکار تھی اور حضرت شویل رضی اللہ عنہ کی سادگی سے واقف ہو چکی تھی۔ بڑے حیلوں کے بعد ایک ہزار درہم دے دیئے تو حضرت شویل رضی اللہ عنہ نے اُس کو آزاد کر دیا۔ جب لشکر والوں نے پوچھا تو حضرت شویل رضی اللہ عنہ نے ساری کہانی بڑی سادگی سے بیان فرمائی۔ اہلِ لشکر ہنس دیئے۔ کہ حضرت شویل رضی اللہ عنہ کے خیال میں ہزار درہم زیادہ رقم ہو بھی نہ سکتی تھی۔

تبصرہ

اس تمام واقعہ کے بہت سے پہلو ہیں۔ حق کے سامنے باطل سرنگوں ہے۔ حق کا فلسفہ خونِ جگر سے لکھا جاتا ہے اس کے سامنے باطل کی ذہانت، شہرت یا عزت کوئی بھی چیز کچھ معنی نہیں رکھی۔ لیکن یاد رکھیں کہ اسلام کا فلسفہ یا نظریہ اس وقت مکمل سمجھا جاتا ہے کہ تلوار اپنے پاس ہو اور عسکریت اس فلسفہ کا اوڑھنا بچھونا ہے ورنہ اسلام بھی بے جان فلسفہ رہ جائے گا۔ جلالِ مصطفٰے کے ہر باب میں اس پہلو کی وضاحت کی گئی ہے اس لئے ہمارے دانشوروں اور ادیبوں کو چاہیے کہ اسلام کے جاندار فلسفہ کو اُجاگر کریں اور محض امن پسندی کے نعروں سے قوم کو مردہ نہ کر دیں۔ بے شک مسلمان فتنہ پسند نہیں کرتے اور امن پسند ہیں لیکن امن کو جاری و ساری کرنے کے لئے اپنے پاس تلوار ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی ہمیشہ مدد کرے گا پھر ہماری مدد کیوں نہیں کرتا ہمارا اسلام منافقانہ اور زنگ آلود ہے۔ آؤ مل کر اصلی اسلام کو تلاش کریں ہم فریب خوردہ ہیں اور ہم شاہبازی سے بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جذبہ جہاد اور ایمان و یقین عطا فرمائے۔ آمین!

وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کرگسوں میں

(اقبالؔ)

نماز فتح

طبری نے اس فتح کے بعد آٹھ رکعت نماز فتح کا ذکر کیا ہے کہ تمام رکعت ایک ہی سلام سے ادا کی گئیں یہ نماز شکرانہ تھی۔ آٹھ رکعت والی بات عجیب لگی ہوگی ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے نماز کے فلسفہ[1] کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ حضور پاک ﷺ نے فتح مکہ کے وقت خانہ کعبہ میں نماز پڑھی اور بعض روایات کے مطابق تکبیریں کہیں۔

مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد ؓ بن ابی وقاص نے بھی نماز فتح ادا کی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ نماز باجماعت ادا کی گئی کیونکہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان نماز باجماعت کے سوا باقی تمام نمازوں کو صرف عبادت کا نام دیتے تھے اور مجبوری کی حالت میں ایسا کرتے تھے ورنہ نماز قائم تو تب ہوتی ہے جب باجماعت پڑھی جائے۔

فتح حیرہ

مسلمان سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے اور حضرت خالد ؓ کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ حیرہ پر قبضہ کے بعد ختم ہو جاتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس باب کو فتح حیرہ کا نام دیا گیا ہے جیسے جلال مصطفےٰ میں صرف ایک باب کو اہل حق کی فتح کا نام دیا گیا تھا اور وہ فتح مکہ ہے۔ ہر لڑائی کو اسلام نے فتح کا نام نہیں دیا اور حکمت عملی کے مبصروں نے یہ پہلو اب آ کر سمجھا ہے کہ کئی لڑائیاں مل کر کوئی فتح ہو سکتی ہے فتح مقصد حاصل کرنے کے بعد ہوتی ہے اور جو کام کسی کو سونپا جائے اُس کو مکمل کرنے کے بعد ہی فتح کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ فتح کے بعد اللہ تعالیٰ کے دربار میں عاجزی کی جاتی ہے اور اسلام جشن منانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور پاک ﷺ بھی فتح مکہ کے وقت جشن مناتے یا مسلمان بھی کسی فتح کے بعد تو جشن مناتے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کچھ حاصل کر کے عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں جھک جاتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے اگر ہم بھی شکرانے کے سجدے پر قائم رہتے اور اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو ہماری آج یہ حالت نہ ہوتی۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؔ)

مسلمانوں کے ذمیوں کے ساتھ معاہدے

(۱) جلالِ مصطفےٰ، صفحہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۶ سے استفادہ کریں۔

ہم اللہ کی تلوار اور مسلمان مجاہدوں کی خدمت میں پھر حاضر ہوتے ہیں۔ وہ حیرہ کے لوگوں کے ساتھ معاہدے کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے سب معاہدوں کے الفاظ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اُن کی بنیاد اُن تین شرطوں پر ہوتی ہے۔ اسلام، جزیہ یا تلوار۔ اوّل یہ کہ آیئے آپس میں بھائی بھائی بن جائیں اور بین الاقوامی دُنیا جس وحدت کی آج تلاش میں ہے۔ ہمارے آقا ﷺ اس طرزِ تمدن اور فلسفہ کی نشاندہی آج سے چودہ سو سال پہلے فرما چکے ہیں۔ دوم اگر یہ منظور نہیں تو ٹیکس ادا کرو کہ تمہارے اوپر حکومت کا بندوبست کیا جائے اور آج دنیا کی سب حکومتیں اپنی رعایا سے ٹیکس لے رہی ہیں۔ مسلمان اللہ کے احکام جاری کرنے کے لئے ذمیوں سے جزیہ (ٹیکس) لیتے تھے اور اس بدلے میں اُن کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے تھے اس بنیادی وضاحت کے بعد آئندہ بھی جہاں معاہدہ کا ذکر آئے وہاں پر ان بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھیں اور تلوار آخری شرط ہے۔

اردگرد کی صفائی

ہاں البتہ ان حالات میں صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفائی دور دور تک کرنی پڑتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے اردگرد صاف ستھرا ماحول ہو اور اس صفائی کی تفصیل یہ ہے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ، قعقاع رضی اللہ عنہ، بسر رضی اللہ عنہ بن ابی رحم، عصمہ رضی اللہ عنہ بن النہاس اور تینوں ضرار رضی اللہ عنہ جن کا ذکر ابھی ابھی ہو چکا ہے کے ماتحت سات لشکر مقرر کئے گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ربیع الاوّل ۱۲ ہجری میں حیرہ فتح کیا تھا اور دو ماہ سے بھی کم عرصہ یعنی ربیع الثانی کے آخر تک اِن مجاہدین نے دریائے فرات اور دجلہ کے درمیان والا سارا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اِن امراء کا اپنا قیام آگے والی چوکیوں میں ہوتا تھا لیکن ان کے لشکر کئی متحرک دستوں میں بٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ اللہ اور اللہ کے رسول کا نام بلند کرتے تھے اور عراق کی سرزمین کلمہ شہادت کی صدا سے گونج رہی تھی۔

سول انتظامیہ

. حیرہ کے گردونواح اور فوجی چوکیوں کے نچلے اور درمیانے علاقہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جگہ جگہ عامل مقرر فرمائے۔ حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو عقر بھیجا، جو اَب بھی اُن کی نسبت سے سوید عقر کے نام سے مشہور ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن دہیمہ کا فلالیج کا عامل مقرر فرمایا اور عظیم صحابی جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ لجیلہ کو بالقیا اور باسما پر مقرر فرمایا۔ اُط بن ابی اُط کو روزمستان کے علاقہ میں بھیجا گیا انہوں نے ایک نہر کو اپنا مستقر بنایا جو آج تک نہر اُط کہلاتی ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا اہل فارس کے نام پیغام

مفتوحہ علاقہ اور اردگرد کی صفائی کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہل فارس [illegible]

(اقبالؒ)

نمازِ فتح

طبری نے اس فتح کے بعد آٹھ رکعت نمازِ فتح کا ذکر کیا ہے کہ تمام رکعت ایک ہی سلام سے ادا کی گئیں یہ نماز شکرانہ تھی۔ آٹھ رکعت والی بات عجیب لگی ہوگی ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے نماز کے فلسفہ[1] کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ حضور پاک ﷺ نے فتح مکہ کے وقت خانہ کعبہ میں نماز پڑھی اور بعض روایات کے مطابق تکبیریں کہیں۔

مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے بھی نمازِ فتح ادا کی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ نماز باجماعت ادا کی گئی کیونکہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان نماز باجماعت کے سوا باقی تمام نمازوں کو صرف عبادت کا نام دیتے تھے اور مجبوری کی حالت میں ایسا کرتے تھے ورنہ نماز قائم تو تب ہوتی ہے جب باجماعت پڑھی جائے۔

فتح حیرہ

مسلمان سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے اور حضرت خالدؓ کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ حیرہ پر قبضہ کے بعد ختم ہو جاتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس باب کو فتح حیرہ کا نام دیا گیا ہے جیسے جلالِ مصطفٰے میں صرف ایک باب کو اہل حق کی فتح کا نام دیا گیا تھا اور وہ فتح مکہ ہے۔ ہر لڑائی کو اسلام نے فتح کا نام نہیں دیا اور حکمت عملی کے مبصروں نے یہ پہلو اب آ کر سمجھا ہے کہ کئی لڑائیاں مل کر کوئی فتح ہو سکتی ہے فتح مقصد حاصل کرنے کے بعد ہوتی ہے اور جو کام کسی کو سونپا جائے اُس کو مکمل کرنے کے بعد ہی فتح کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ فتح کے بعد اللہ تعالیٰ کے دربار میں عاجزی کی جاتی ہے اور اسلام جشن منانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور پاک ﷺ بھی فتح مکہ کے وقت جشن مناتے یا مسلمان بھی کسی فتح کے بعد تو جشن مناتے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کچھ حاصل کر کے عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں جھک جاتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے اگر ہم بھی شکرانے کے سجدے پر قائم رہتے اور اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو ہماری آج یہ حالت نہ ہوتی۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

مسلمانوں کے ذمیوں کے ساتھ معاہدے

(۱) جلالِ مصطفٰے، صفحہ ۱۵، اور ۱۶ سے استفادہ کریں۔

ہم اللہ کی تلوار اور مسلمان مجاہدوں کی خدمت میں پھر حاضر ہوتے ہیں۔وہ حیرہ کے لوگوں کے ساتھ معاہدے کر رہے ہیں۔مسلمانوں کے سب معاہدوں کے الفاظ ایک جیسے ہوتے ہیں۔اُن کی بنیاد اُن تین شرطوں پر ہوتی ہے۔ اسلام، جزیہ یا تلوار۔اوّل یہ کہ آ یئے آپس میں بھائی بھائی بن جائیں اور بین الاقوامی دُنیا جس وحدت کی آج تلاش میں ہے۔ہمارے آقاﷺ اس طرز تمدن اور فلسفہ کی نشاندہی آج سے چودہ سو سال پہلے فرما چکے ہیں۔دوم اگر یہ منظور نہیں تو ٹیکس ادا کرو کہ تمہارے اوپر حکومت کا بندوبست کیا جائے اور آج دنیا کی سب حکومتیں اپنی رعایا سے ٹیکس لے رہی ہیں۔مسلمان اللہ کے احکام جاری کرنے کے لئے ذمیوں سے جزیہ (ٹیکس) لیتے تھے اور اس بدلے میں اُن کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے تھے اس بنیادی وضاحت کے بعد آئندہ بھی جہاں معاہدہ کا ذکر آئے وہاں پر ان بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھیں اور تلوار آخری شرط ہے۔

اردگرد کی صفائی

ہاں البتہ ان حالات میں صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔صفائی دور دور تک کرنی پڑتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے اردگرد صاف ستھرا ماحول ہو اور اس صفائی کی تفصیل یہ ہے۔حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ، قعقاع رضی اللہ عنہ، بسر رضی اللہ عنہ بن ابی رحم، عتبہ رضی اللہ عنہ بن النہاس اور تینوں ضرار رضی اللہ عنہ جن کا ذکر ابھی ابھی ہو چکا ہے کے ماتحت سات لشکر مقرر کئے گئے۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ربیع الاوّل ۱۲ ہجری میں حیرہ فتح کیا تھا اور دو ماہ سے بھی کم عرصہ یعنی ربیع الثانی کے آخر تک اِن مجاہدین نے دریائے فرات اور دجلہ کے درمیان والا سارا علاقہ فتح کر لیا تھا۔اِن امراء کا اپنا قیام آگے والی چوکیوں میں ہوتا تھا لیکن ان کے لشکر کئی متحرک دستوں میں بٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ اللہ اور اللہ کے رسول کا نام بلند کرتے تھے اور عراق کی سرزمین تک شہادت کی صدائے گونج رہی تھی۔

سول انتظامیہ

حیرہ کے گردونواح اور فوجی چوکیوں کے نچلے اور درمیانے علاقہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جگہ جگہ عامل مقرر فرمائے۔حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو عقر بھیجا، جو اَب بھی اُن کی نسبت سے سوید عقر کے نام سے مشہور ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن دثیمہ کا فلالیج کا عامل مقرر فرمایا اور عظیم صحابی جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ لجیلہ کو بالقیا اور باسما پر مقرر فرمایا۔اُط بن ابی اُط کو روزمستان کے علاقہ میں بھیجا گیا انہوں نے ایک نہر کو اپنا مستقر بنایا جو آج تک نہر اُط کہلاتی ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا اہل فارس کے نام پیغام

مفتوحہ علاقہ اور اردگرد کی صفائی کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہل فارس کے امرائے حکومت اور متعدد قبائل

کے سرداروں کو خط لکھے۔ ان تمام خطوط کا بنیادی مضمون وہی تھا جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ دین فطرت میں اصول وہی رہتے ہیں۔ حضرت خالد ؓ نے سب کو اسلام کی دعوت دی اور بھائی بننے کے فلسفہ کی وضاحت کی اگر یہ بھی منظور نہیں تو ہماری عملداری میں آ جاؤ۔ ہم ان علاقوں میں اپنے خالق کے احکام کو جاری و ساری کریں گے اور یہ بھی منظور نہیں تو تیار ہو جاؤ۔ ہم آپ کے سامنے ایسی قوم لے آئے ہیں جو موت کے ساتھ اتنی محبت کرتی ہے جتنی تم لوگ زندگی سے محبت کرتے ہو۔'' خطوں میں ایک دو الفاظ کا فرق ہو سکتا ہے۔ خط لکھتے وقت انسان کے اُس وقت کے مزاج کے مطابق لفظ نکلتے ہیں جن میں گاہے بگاہے تبدیلی آتی رہتی ہے لیکن مسلمان کے اصولوں اور عقائد میں تبدیلی نہیں آتی اس لئے ہر خط کے مضمون کو دہرا کر ہمارا مقصد کتاب میں چند صفحوں کا اضافہ کرنا نہیں۔ ہماری دلچسپی تو با مقصد تحریر ہے۔

نتائج و اسباق

پہلے یمامہ کے صحرا سے نکل کر نباج ہوتے ہوئے حفیر پہنچ کر پھر حفیر اور کاظمہ کے درمیان ''متبادل'' یا ''متوازی'' کوچ کیا پھر ایک اچانک جھپٹا کاظمہ کے مقام پر اس طرح مارا کہ پہلے ہی وار میں باطل تہس نہس ہو گیا پھر صحرا سے آگے بڑھتے ہوئے دریا پر ایسے ٹھوکر ماری کہ ثنی اور مذار کے مقامات پر ذوقِ خدائی والوں کا بول بالا ہو گیا۔ پھر صحرا کو دوست بنا کر دریا کے ساتھ متحرک رہے اور ولجہ کے مقام پر حرکت کا گھیرا بنا کر دنیا کے سامنے جنگ کی تدبیرات کا ایک نیا طریقہ کار پیش کیا۔ جو آج تک رائج ہے اور رائج رہے گا۔ رہی سہی کسر اُلیس کے مقام پر نکال دی جہاں ''خون کی ندیاں'' بہہ گئیں لیکن غلطی دشمن کی تھی اپنی برتر تعداد کی وجہ سے کھانے میں مشغول یا لنگر پر ''کڑکوں'' تھے۔ فتح تو اس دن حاصل ہو گئی تھی لیکن دریاؤں کے دل چیر کر حیرہ تک پہنچنا اور دنیا کے دوسرے عظیم تر سپہ سالارِ اعظم اور جنگ کے ماہر جناب صدیق اکبر ؓ کی حکمت عملی کے کئی مرحلوں میں سے ''ایک مرحلہ'' کو مثبت کارروائیوں سے پورا کر کے نمازِ شکرانہ یا نمازِ فتح بھی ادا کر چکے تھے۔

۲۔ اہل حق کا قافلہ رواں دواں تھا اور ''صفائی کی مہمات'' بھی شروع کر دی تھیں لیکن حضرت خالد ؓ نے اپنا ہیڈ کوارٹر حیرہ ہی میں رکھا۔ دریاؤں کے درمیان والے زرخیز علاقہ میں کیوں پیش قدمی نہ کی، مدائن پر کیوں حملہ آور نہ ہوئے۔ دریائی علاقہ میں اپنی کارروائیوں کو صرف متحرک رکھا لیکن علاقوں پر قبضہ نہ کیا۔ یہ خلیفہ اوّل ؓ کی حکمت عملی کے راز تھے۔ اُس وقت تک مسلمان سب کارروائیاں اپنے ''دوست صحرا'' کی مدد کی آڑ میں کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا مقصد اسلام پھیلانا تھا۔ وہ علاقے فتح کر کے دولت نہیں سمیٹنا چاہتے تھے۔ وہ مال غنیمت سے مکہ یا مدینہ میں محل تعمیر نہ کروانا چاہتے تھے وہ وہاں پر ایسے Castles نہیں بنانا چاہتے تھے جیسے اہل یورپ نے دنیا کو لوٹ کر وہاں بنوائے ہیں۔ خلیفہ چہارم ؓ کے زمانے تک مسجد نبوی بھی کچی تھی اور وہی کھجور کی چھت تھی ہاں کچھ وسعت ہو گئی تھی۔

۳۔ یہ نکتے سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔اہل اسلام میں جنگ کا مقصد زرخیز زمین اور علاقوں پر قبضہ نہیں ہوتا۔ایسا کیا بھی جائے تو وہ وقتی حکمت عملی کے تحت ہوتا ہے۔ابلہ کی مثال دی جا چکی ہے۔سارا مقصد اسلام کو پھیلانے کی حکمت عملی میں پنہاں تھا۔اُسی زمانے میں اسلام کی فوجیں شام وفلسطین کی سرحدوں پر بھی جمع ہو رہی تھیں اور خلیفہ وقت کی حکمت عملی یہ تھی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حیرہ سے آگے بڑھ کر انبار،عین التمر ،دومۃ الجندل وغیر کی طرف اُن علاقوں میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کریں تا کہ دونوں افواج ایک دوسرے کی مدد کر سکیں اور اگلے بابوں میں انہی کارروائیوں کے مختصر ذکر ہوں گے اور نقشہ ہشتم کا ساتھ مطالعہ کرتے رہنا۔

۴۔ باطل کے فلسفہ والوں کے پاس فتح کا کوئی اختتامی مقام نہیں ہوتا اور آج تک اہل مغرب کے جنگی ماہر اور مبصر اس بھنور سے نہیں نکل سکے لیکن دین فطرت کی با مقصد جنگ کے ذریعہ اہل حق کا قافلہ رواں دواں ہے اور نتائج کے اثرات اور اثرات کے نتائج پر کارروائی کی جاتی ہے یا کارروائی کو آگے بڑھایا جاتا ہے اس لئے نتائج کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور اہل بصیرت پیدا ہوتے رہیں گے۔اور نتائج میں اضافے کرتے رہیں گے اور یہی حالت اسباق کی ہے۔

ل۔ حیرہ کی فتح اور تمام مہم کی کامیابی سے ہمیں متعدد سبق ملتے ہیں جن کی نشاندہی ساتھ ہی ساتھ کی جاتی ہے لیکن آپ لوگ فوجوں کی تعداد اور مسلمانوں کے ہتھیاروں پر نظر ڈالیں آگے اس کا دشمن کی تعداد اور ہتھیاروں سے موازنہ کریں اور پھر جائزہ لیں مانا کہ ایران کی حکومت زوال پذیر تھی لیکن فوج میں اُس وقت تک کچھ نہ کچھ حربی خوبیاں موجود تھیں۔انہوں نے لڑائی بھر پور طریقہ سے کی اور اگر مرنے والوں کی تعداد کو ذہن میں رکھا جائے تو یاد رکھیں کہ لڑائی میں مرتا وہ ہے جو لڑتا ہے اور اس میں ہمارے لئے سبق ہیں۔

ب۔ اس سبق کی تفصیل میں جائیں کہ بھاری بھرکم ایرانی فوج جو خوب لڑی اور تعداد میں بھی برتر تھی وہ کم طاقت اور نہتے مسلمانوں سے شکست کیوں کھا گئی جواب اپنے دل میں تلاش کریں۔موٹی موٹی وجوہات یہ ہیں مسلمانوں کا اپنے فلسفہ حیات پر عمل،بہتر حکمت عملی،بہتر تدبیرات،بہتر سلیقہ،بہتر ہنر اور با مقصد جنگ ہے۔

ج۔ ہم اس سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں یہ وسیع مضمون ہے۔بنیاد البتہ موجود ہے کہ پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج بنانا ہوگا۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے
(اقبالؔ)

بارھواں باب

انبار، کلوازی اور عین التمر کے واقعات

پچھلے باب میں حیرہ کی فتح کے نتیجے کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ ایرانی فوج شکست کھا چکی تھی۔ مسلمانوں نے مدائن کا رُخ نہ کیا کہ اُن کی حکمت عملی کے لحاظ سے اُس کا وقت نہ آیا تھا اور خلیفہ اوّل کے احکام سے اِس حکمت عملی کی نشاندہی ہوتی ہے تو قدرتی بات ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اب شمال کا رُخ کیا۔ دریائے فرات کے عرب والی طرف دشمن کی چوکیوں کو ختم کرنا تھا اور فرات کے دوسری طرف اگر کوئی اہم مقام ہوتو اُس پر بھی قبضہ کرنا تھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تجویز

نقشہ ہشتم کو غور سے دیکھیں تو متعدد شہر دریائے فرات کے مغرب کی طرف نظر آرہے ہیں ان میں نزدیک ترین عین التمر ہے۔ باقی چھوٹی چھوٹی چوکیاں ہیں۔ حصید، خنافس اور ذومیل وغیرہ۔ ذرا دور انبار ہے اور دریا کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جنگ کی تدبیرات میں اُن کا اپنا طریقہ ہوتا تھا۔ نزدیک سے عین التمر کے مقام سے دشمن کو ''اُدھیڑنے'' کی بجائے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دور انبار جا کر دشمن کو اکھیڑنے کا فیصلہ کیا۔ ایسی کارروائی کے لئے انگریزی میں بھی اصطلاحیں ہیں کہ Roll Forward یا ایک طرف سو دشمن کو ''رول'' کرنا یا ٹرننگ وغیرہ لیکن ہم نے جو اردو اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ نقشہ کو دیکھ کر آپ ان فوجی اصطلاحوں کے وسیع تر معانی میں بھی جا سکتے ہیں۔

طریق کار کی افادیت

انبار کو پہلا ہدف بنانے میں بڑے فائدے تھے اور حالات ایسے تھے کہ ''اکھیڑنے'' کی کارروائی کی جا سکتی تھی ورنہ عام حالات میں ''ادھیڑنا'' ہی بہتر رہتا ہے۔ جس طرح حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ثنیٔ سے آگے حیرہ تک کارروائی کی

اُسے ادھیڑ نا کہیں گے۔ انبار اُس زمانے میں تجارتی مرکز تھا۔ شام اور ایران کے دور دور علاقوں سے تجارتی قافلے وہاں آتے تھے۔ اور اُس جگہ پر قبضہ کرنے کے بعد دریائے فرات کے مغرب میں ایرانیوں کے لئے فوجی چوکیاں قائم کرنا مشکل ہو جاتا تھا اور ایسے ہی ہوا علاوہ ازیں انبار دریا سے دور بھی نہ تھا اور حضرت خالد اپنے آپ کو دریائی جنگ میں نہ الجھا رہے تھے۔ وسیع علاقہ تھا۔ کسی جگہ سے دریا کو پار کر کے انبار کی کسی طرف سے حملہ آور ہو سکتے تھے۔

انبار کی طرف پیش قدمی

حضرت خالد ؓ نے کچھ فوج کو حیرہ میں رکھا اور حضرت قعقاع ؓ کو وہاں پر اپنا جانشین چھوڑا مشرق میں گشتی دستے پھیلے ہوئے تھے اور مدائن تک ایرانیوں کی تمام کارروائیوں پر حضرت مثنیٰ ؓ نظر رکھے ہوئے تھے۔ حضرت خالد ؓ نے دریا کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھی۔ جون کا مہینہ تھا اور اسلامی کیلنڈر کے حساب سے ربیع الثانی ۱۲ ہجری تک کے درمیان کی کوئی تاریخ تھی۔ ایسے موسم میں ریگستان میں سفر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دریا سہارا دے رہا تھا اور اپنا ''دوست'' ریگستان بھی ساتھ بائیں بازو پر موجود تھا۔ انہوں نے انبار سے تھوڑے فاصلہ پر نیچے دریا کو عبور کیا۔ فوج کی تعداد کوئی نو ہزار کے قریب ہوگی اور اتنی ہی فوج حیرہ اور باقی چوکیوں پر چھوڑ دی گئی تھی۔ دریا کو عبور کرنے کے بعد جب وہ انبار سے ایک دن کی منزل پر تھے تو کئی اونٹنیوں نے بچے دے دیئے۔ اقرع ؓ بن حابس جو ہراول دستوں کے کمانڈر تھے، وہ وقت ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ اونٹنیوں کے بچوں کو اونٹوں پر لاد دیا جائے اور اپنا سفر جاری رکھا جائے۔ اہل انبار نے جب دور سے یہ نظارہ دیکھا تو وہ سکتے میں آ گئے۔

انبار کے حالات

انبار میں ایران کی طرف سے فوجی گورنر ساباط کا رئیس شیرزاد تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ بڑا عقلمند معزز اور ہردلعزیز آدمی تھا اور دانائی میں مشہور تھا۔ اُس نے جب یہ نظارہ دیکھا تو پہلے ہی کہہ دیا کہ اس طرح کی کارروائی وہ لوگ کرتے ہیں جو جان کی بازی لگا کر آتے ہیں۔ لہٰذا وہ پہلے ہی صلح پر تیار ہو گیا۔ حضرت خالد ؓ جب انبار کے نزدیک پہنچے اور دیکھ بھال کی تو وہاں پر اُن کو صرف ایک رکاوٹ نظر آئی اور وہ ایک ایسی خندق تھی جو قلعہ کے چاروں طرف کھودی گئی تھی اور اُس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ہم اُس کو کھائی کہیں گے۔ پرانے زمانے میں دریا کے نزدیک کے مقامات کا دفاع اسی طرح ہوتا تھا۔

جنگ سے نابلد لوگ

حضرت خالد ؓ نے انبار کے چاروں طرف چکر لگایا اور اپنے لشکریوں کو آگاہ کیا کہ انبار کے لوگ جنگ

سے بالکل نابلد نظر آرہے تھے۔ ظاہر ہے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جیسے جنگی ماہر ایک نظر میں سب کچھ بھانپ گئے۔ اس شہر کا حدود اربعہ اور محل وقوع ایسا تھا کہ عرصہ سے متحارب گروپوں یا فوجوں کے لئے اس میں کوئی کشش موجود نہ تھی کہ مقناطیس کی طرح فوجوں کو اپنی طرف کھینچتا رہتا اور وہاں لوگ گتھم گتھا ہوتے رہتے یعنی عراق اور شام کی سرحدوں کا یہ علاقہ سوئزرلینڈ کی طرح تھا یا پاک و ہند برصغیر کا کشمیر۔ اس شہر کے لوگ قلعہ کی دیواروں پر چڑھ کر اسلامی لشکر کو اس طرح دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی بارات کو دیکھتا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار تیراندازوں کو ترتیب دیا اور ہر آدمی کے لئے ایک ہدف مقرر کیا اور حکم ملا کہ "فائر بائی آرڈر" ہوگا اور شست دشمن کی آنکھ پر ہوگی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اشارے مقرر کئے اور ایک ہی اشارے کے ساتھ ایک ہزار تیر اکٹھے نکلے جن میں سے زیادہ تر نشانے پر بیٹھے اور انبار کے سینکڑوں آدمی ایک آنکھ سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہ جنگ اِسی وجہ سے "ذات العیون" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ لوگ جلدی سے قلعہ کی اوپر والی دیوار سے نیچے اُترے۔ شیرزاد نے یہ حالات دیکھ کر صلح کی درخواست کی لیکن شرائط چونکہ مسلمانوں کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی تھیں اس لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نامنظور کردیں۔

مذبوحہ جانوروں کا پُل

بہرحال قلعہ کو سر کرنے سے پہلے کھائی یا خندق کو پار کرنا ضروری تھا۔ مسلمانوں میں تیراک بھی کم تھے اور کشتیاں بھی موجود نہ تھیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کمزور اور بوڑھے اونٹوں کو ذبح کر کے خندق کی ایک تنگ جگہ میں پھینک دیا اور مسلمانوں نے خندق کو پار کر لیا جو دشمن سامنے آتا تھا وہ مولی گاجر کی طرح کٹ جاتا تھا کیونکہ لوگ لڑائی کے فن سے پورے طور پر واقف نہ تھے۔ شیرزاد نے پھر درخواست کی کہ چند سواروں کے ساتھ بغیر کسی سامان کے اُس کو قلعہ سے نکل کر مدائن جانے کی اجازت دی جائے۔ شیرزاد برائے نام "شیر کا بچہ" تھا۔ اُس کے پاس دانائی تو تھی "توانائی" نہ تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اُس کو قلعہ سے نکل کر مدائن جانے کی اجازت دے دی۔ اس میں حکمت عملی کی بات یہ تھی کہ مدائن میں خوف وہراس پیدا ہوگا اور بغیر لڑائی کے انبار خالی ہو جائے گا۔ شیرزاد جب بہمن کے پاس پہنچا تو اُس نے اُس کی سخت بے عزتی کی لیکن بہمن خود مسلمانوں کے ساتھ جنگ سے کترا رہا تھا۔ اس لئے شیرزاد کو بھی جواب دینے کی ہمت ہوگئی، پھر اُس کے پاس بہانہ بھی تھا کہ انبار کے لوگ لڑا کے نہ تھے۔

صلح کا عہد نامہ

انبار کے تمام قبائل نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اہل کلوازی، اہل بوازیخ اور بانقیا کے نزدیک والے علاقوں کے لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی بلکہ اہل بانقیا اور اہل بوازیخ تو مسلمانوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ بعد میں جب

مسلمانوں کو یہ علاقے خالی کرنا پڑے تو پھر بھی یہ لوگ وفادار رہے۔ اہل سواد کے جو علاقے ادھر نزدیک تھے وہاں کے لوگوں نے بھی مسلمانوں کو خراج دینا منظور کیا۔

عین التمر

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انبار کے علاقے پر حضرت زبرقان رضی اللہ عنہ بن بدر کو ناظم مقرر کیا اور پھر واپس کوچ کیا اور دریائے فرات کو عبور کر کے کچھ عرصہ کے لئے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جب عین التمر کے سامنے آئے تو پھر اپنا رُخ ادھر پھیر دیا وہاں کا ایرانی فوجی گورنر مہران بن بہرام تھا۔ اور فرات کے مغرب کی طرف یہ آخری بڑی چوکی تھی جہاں ایران فوج تھی اور خالد رضی اللہ عنہ اس کو "اکھیڑنے" کے لئے رواں دواں تھے وہاں کئی عرب قبائل تغلب، نمبر اور ایاد وغیرہ آباد تھے جن کا سردار عقہ بن ابی عقہ تھا جو کافی بہادر آدمی تھا۔ وہ مہران سے کہنے لگا کہ مسلمانوں کا تعلق عرب قبائل سے ہے اور عقہ کے عرب قبیلے مسلمانوں کے ساتھ طریقہ جنگ کو جانتے ہیں اور ایرانی نہیں جانتے اس لئے عربوں کو اجازت دی جائے کہ وہ مسلمانوں سے نپٹ لیں۔

مہران بڑا خوش ہوا اور عقہ کی دلجوئی کی گو اُس کے باقی ساتھی حیران تھے۔ مہران نے البتہ اپنے لوگوں کو بتایا کہ اگر عقہ کامیاب ہو گیا تو وہ ایران کی کامیابی ہے اور اگر ہار بھی گیا تو مسلمانوں کا کچھ نہ کچھ تو نقصان کرلے گا اور بعد میں ایرانی فوج آسانی سے مسلمانوں کا مقابلہ کرلے گی۔ یہ تجزیہ اصولی طور پر غلط ہے۔ بقول کلاسوٹز ایسا کرنا چیتھڑوں سے تلوار کا کام لینا ہے۔ ظاہر ہے کہ مہران ذہنی طور پر شکست کھا چکا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ عین التمر سے ایک دن کی منزل پر اُن کے مقابلہ کے لئے عرب قبائل صف آرا ہیں اور کوئی ایرانی نظر نہیں آ رہا تھا۔

عقہ کی گرفتاری

حضرت خالد نے اندازہ لگالیا کہ ایرانی جنگ سے کترا رہے ہیں یا بھاگ چکے تھے اور عرب قبائل کو قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔ اس لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے صف بندی کا حکم دے دیا اور احکام یہ دیئے کہ دشمن پر حملہ کرنے کی بجائے اُس کے حملہ کو صرف روکے رکھیں لیکن درمیان جہاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ خود تھے وہاں کچھ پیچھے بھی ہٹے یا خاموشی سے وار سہتے رہے۔ عقہ حیران تھا کہ کیسی جنگ ہے لیکن اس کی حیرانی جلدی ختم ہو گئی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے چند محافظوں کے ساتھ ایک جھپٹا مارا اور عقہ کو گرفتار کر لیا اور پھر بازوؤں والی فوج نے زبردست حملہ کر دیا۔ عرب قبائل اپنے

بازوؤں والے سرداروں سمیت جو بجیر اور ھذیل تھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔ مہران نے جب یہ خبر سنی تو وہ عین التمر سے فرار ہو گیا اور کسی طرح بچ بچا کر مدائن پہنچ گیا۔

عین التمر پر قبضہ

عین التمر کے لفظی معنی کھجوروں کی آنکھ یا چشمہ ہے۔ عین التمر ریگستانی علاقہ میں واقع ہے اور نخلستان کی وجہ سے یہاں پر آبادی ہے خانہ بدوش اس جگہ آ کر اپنے جانوروں کو پانی پلاتے تھے اس علاقے کے عرب قبائل جنگجو ضرور تھے لیکن دنیا جہاں سے زیادہ واقف نہ تھے اور نہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کتنا عروج دے دیا تھا۔

وہ لوگ بڑی جنگوں سے ناواقف تھے۔ اُن کے خیال میں جنگ بھی ایک قبائل کی دوسرے کے خلاف چڑھائی اور لوٹ مار تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی لوٹ مار کر کے چلے جائیں گے اس لئے وہ قلعہ بند ہو گئے لیکن جنگ نے طول پکڑا اور جب انہوں نے اپنے مغرور سردار عقہ اور باقی لوگوں کو مسلمانوں کے قبضہ میں پا بہ زنجیر دیکھا تو وہ گھبرا گئے اور صلح پر تیار ہو گئے اور مسلمانوں کی شرائط پر صلح کر لی ہاں البتہ عقہ اور اُس کے ساتھی صلح سے پہلے تہ تیغ ہو چکے تھے۔

عین التمر کے پادری

عین التمر کے اندر پادریوں کی ایک بند قسم کی خانقاہ یا درسگاہ تھی جس میں چھوٹے چھوٹے تقریباً چالیس بچے ایک طرح کی قید کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کو خرید کر لایا جاتا تھا اور زبردستی پادری بنایا جاتا تھا ان لڑکوں کا تعلق مختلف عرب قبائل سے تھا اور یہ سب ذہین لڑکے تھے جن کو چن چن کر خریدا گیا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان بچوں کو آزاد کر دیا اور مختلف مسلمان امراء نے ان بچوں کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ یہ تمام بچے از خود یا بعد میں ان کی اولاد سے کئی عظیم الشان مسلمان ہو گزرے ہیں انہی میں ایک بچہ نصیر تھا جن کے بیٹے موسیٰ نے جناب طارق بن زیاد کے ساتھ مل کر اُن کے اعلیٰ مشیر کی حیثیت سے سپین کو فتح کیا۔ جن عظیم صحابہ یا اہل لشکر نے اِن بچوں کی پرورش کی اُن میں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ اور حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث شامل تھے۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کا ذکر جنگ یمامہ میں ہو چکا ہے اور حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے۔

نتائج واسباق

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں جنگیں لڑائیاں کم ہیں اور حربی مظاہرے زیادہ ہیں یہ کارروائیاں از خود حیرہ اور اُلیس کی جنگ کے نتائج کے اثرات کے تحت تھیں ہاں البتہ ایک نتیجہ جو نکلا وہ یہ تھا کہ ایرانی فوج کا کوئی بڑا دستہ اب

دریائے فرات کے مغربی یا جنوب مغربی کنارے کے کسی شہر میں باقی نہ رہا اور دوسرا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حکمت عملی جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تعین فرمائی تھی پوری ہونے والی تھی اسلام کا فاتح لشکر عراق کو فتح کرنے کے بعد شام و فلسطین کو فتح کرنے والے لشکر کی مدد کے لئے اُن علاقوں کے اور نزدیک پہنچ گیا تھا۔

۲۔ جہاں تک اسباق کا تعلق ہے وہاں قدم قدم پر سبق ہیں اسلام غیرت کی زندگی گزارنے کا دوسرا نام ہے۔ ذرا اپنے بارے سوچیں کہ منہ سے تو ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام کہتے ہیں اور دراصل غلامی باطل فلسفوں اور باطل حکمرانوں کی کر رہے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ہتھیاروں کا بہانہ بنا کر غیروں کی آغوش میں جاتے ہیں اور کبھی سائنسی اور ٹیکنالوجی کا بہانہ بنا کر غیروں کی غلامی میں چلے جاتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس کون سے ہتھیار تھے اور قلعوں کو سر کرنے کے لئے کون سے Selge Equipment تھے لیکن وہ ہمیشہ کامیاب رہے اللہ اپنے بندوں کی اسی طرح مدد کرتا ہے۔

۳۔ گرمیوں کا موسم تھا تو دریا کے ساتھ والا راستہ اختیار کر کے پہلے دور والے مقصود کو حاصل کیا پھر جب راستے سے واقفیت ہوگئی تو لق و دق صحرا کے نخلستان عین التمر پہنچے اور اُس کو بھی سر کیا۔ پانی والی خندق یا کھائی پار کرنا پڑی تو کشتیوں کی بجائے مذبوحہ اونٹوں کو استعمال کیا۔ جنگ سے نابلد آدمیوں کے ساتھ واسطہ پڑا تو ایک ہی وار سے کئی آدمی ناکارہ کر دیئے" فائر بائی آرڈر" یعنی فائر میرے حکم پر ہوگا یا اشارہ پر ہوگا۔ فوجی تدبیرات اور ہنر کا ایک اعلیٰ اصول ہے جس کے صحیح استعمال سے حیران کن کارروائی کی گئی۔

۴۔ ہمارا مدعا تاریخ کا بامقصد مطالعہ ہے بدقسمتی سے ہم نے غیروں کی نقالی میں تاریخ برائے تاریخ پڑھنا شروع کر دی۔ غیروں کے باطل تمدن اور آثار قدیمہ کی پوجا شروع کر دی ہے۔ اپنی تاریخ کو غیروں کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اہل اسلام نہ تو کسی مقامیت کے قائل ہیں اور نہ ملکوں یا جغرافیہ کے چکر میں پڑتے ہیں وہ تو اہلِ حق کا کارواں ہے جو صراط مستقیم پر گامزن رہتا ہے۔

تو ابھی رہگزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر
(اقبال)

تیرھواں باب

دومۃ الجندل

اسلام کا اجتماعی سورج، یثیرب کے مستقر پر اپنی کرنوں کی روشنی ڈال کر اس روشن سے دُنیا کے اندھیرے کو ختم کرنے کی بسم اللہ کرنے کے بعد پہلے ہی چند سالوں میں دومۃ الجندل پر جا کر کئی دفعہ چمکا۔ باطل نے کئی دفعہ اکٹھا ہو کر اہل حق کا مقابلہ کرنا چاہا۔ جلال مصطفےٰ میں دومۃ الجمدل کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے خود پانچ ہجری میں اس طرف ایک مہم کی مانند فرمائی۔ چھ ہجری میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف ایک مہم لے کر دومۃ الجندل تک گئے۔ یہ سب حربی مظاہرے تھے۔ بڑی مہم البتہ تبوک کی مہم تھی۔ حضور پاک ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل کے سردار اکیدر کی سرکوبی کے لئے بھیجا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُس کو گرفتار کر کے لے آئے جو مسلمانوں کا باجگزار بن گیا۔

خلیفہ اوّل کی کارروائی

حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد دومۃ الجندل کے اردگرد کوئی لوگ باغی یا مرتد ہو گئے تھے اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے حربی مظاہرے سے بھی کئی لوگ بھاگ کر دومۃ الجندل چلے گئے تھے علاقہ بڑا وسیع ہے اور ریگستان ہے دومۃ الجندل کے اردگرد نخلستان ہیں اور لوگ وہاں پڑاؤ کرتے ہیں بارش ہو جائے تو علاقہ میں بڑی گھاس اُگ آتی ہے اور خانہ بدوش قبائل کے لئے دومۃ الجندل میں ہمیشہ بڑی کشش رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے گیارہ لشکروں میں چوتھا لشکر جو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا تھا اُس کو دومۃ الجندل کی دیکھ بھال کے لئے بھیجا اور جنگ یمامہ کے بعد حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کو بھی ادھر بھیج دیا لیکن اُن کا رُخ زیادہ تر تبوک کی طرف رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اہل روم مسلمانوں کی عراق کی فتوحات سے باخبر ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر شام و فلسطین کے علاقوں میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں ادھر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید، رومیوں کی تاک اور دیکھ بھال میں زیادہ مصروف ہو گئے اس دوران تمام وسطِ عرب کے باغی قبائل نے دومۃ الجندل کو

اپنا گڑھ بنالیا اور اکیدر نے تمام قبائل کی سرداری کو قبول کرلیا، اور باغی ہوگیا۔

حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم

دومۃ الجندل ریگستانی علاقوں کا ایک اہم مقام ہے اور مسلمان جو کچھ کرنا چاہتے تھے اُس ساری کارروائی اور حکمت عملی کے تحت دومۃ الجندل پر مسلمانوں کے مکمل قبضہ کی بہت ضرورت تھی چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کو دومۃ الجندل پر فوج کشی کا حکم دیا اور لشکر کا ایک دستہ دیا جس کی تعداد چار یا پانچ ہزار تھی یہ اُس وقت کی بات ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ابھی حیرہ سے بہت دور تھے۔ خلیفہ اوّل نے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کو یہ حکم بھی دیا کہ دومۃ الجندل پر قبضہ کرنے کے بعد وہ آگے بڑھیں اور حیرہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے رابطہ قائم کریں اور اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے پہلے حیرہ پہنچ جائیں تو اور بہتر ہے۔ یہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی جس کو ہم Task کہتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے جو کچھ ہوا اُس پر بحث سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ ایک مشکل مہم تھی اور گو حیرہ کے لئے سیدھا راستہ ضرور تھا لیکن کسی بڑے لشکر کا اس راستے کو استعمال کرنا مشکل تھا کہ کفالت اور بحالی کے زیادہ ذرائع راستے میں موجود نہ تھے۔ ویسے دومۃ الجندل کی اہمیت کئی لحاظ سے اہم تھی کیونکہ متعدد خانہ بدوش قبائل کا یہ مرکز تھا اور حیرہ سے آگے عین التمر یا عراق و شام کی سرحد پر فراض کے علاقوں اور مدینہ شریف کے سیدھے راستہ پر دومۃ الجندل وغیرہ کے گردونواح کے علاقوں پر مسلمانوں کا مکمل کنٹرول ہو۔ نقشہ پنجم کو دوبارہ دیکھیں جہاں خلیفہ اوّل کی حکمت عملی کی وضاحت کی گئی ہے تو یہ پہلو اور اچھی طرح سے سمجھ میں آسکے گا۔ حکمت عملی کے تحت تو مکمل واقعات کے تجزیہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جو راوی صرف واقعاتی حالات بیان کر دیتے ہیں وہ معاملات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے، اُن میں کسی نے یہ سن لیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو نچلے عراق سے حیرہ پہنچنے کا حکم ملا انہوں نے اپنے پاس سے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ جو حیرہ پہلے پہنچ جائے گا وہی سپہ سالارِ اعظم ہوگا۔ دومۃ الجندل والا راستہ فتوحات کے لئے استعمال کے قابل نہ تھا اور آگے جب ایران کی فتوحات کی تیاری ہوئی تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کمک کے ساتھ نباج، رزود اور شراف والا راستہ اختیار کیا۔ جو نقشہ ششم پر اور زیادہ واضح ہے اس لئے جن راویوں نے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل والے راستے حیرہ یا عراق فتح کی غرض سے بھیج دیا یہ اُن کے ذہن کی پختگی کو ظاہر نہیں کرتا ساتویں باب میں اس سلسلہ میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔

حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کا دومۃ الجندل کا محاصرہ

چنانچہ ہم اپنی پرانی رائے پر قائم ہیں کہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کے پاس نہ اتنا بڑا لشکر تھا اور نہ اللہ کی تلوار والا جنگی تدبر۔ اس لئے راویوں کے اس اضافے کے سلسلے میں مزید بحث بے معنی اور فضول ہوگی اور واقعات ایسے ہوئے کہ

عیاض رضی اللہ عنہ جب وہاں پہنچے تو انہوں نے دومۃ الجندل کا محاصرہ کر لیا لیکن محاصرہ کچھ غیر مکمل تھا یعنی کچھ علاقہ میں مضبوط چوکیاں قائم کی ہوئی تھیں اور کچھ علاقہ کی صرف دیکھ بھال کر سکتے تھے دشمن باہر بھی موجود تھا اور باہر کے علاقہ پر بھی مسلمانوں کا مکمل کنٹرول نہ تھا۔ دومۃ الجندل کا کوئی ایک قلعہ نہ تھا یہاں قلعہ جات تھے اور باہر بھی دور دور تک قلعے تھے بلکہ کئی ایسی چوکیاں تھیں جن پر جب حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کا قبضہ ہو جاتا تو بیچ میں باغی قبائل گھس بھی جاتے تھے اور حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کا اپنی چوکیوں کے ساتھ رابطہ ٹوٹ جاتا تھا رابطہ قائم رکھنے کے لئے کچھ فوجی کارروائی کرنا پڑتی تھی۔

مؤرخین نے اس جنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ مسلمانون نے دشمن کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور دشمن نے مسلمانوں کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ عام مبصر اس اصطلاح کو سمجھ بھی نہ سکے۔ جنگ میں ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن دوسری جنگ عظیم میں ہر محاذ پر ایسے واقعات ہوئے اور وہاں اوسان قائم رکھنے پڑتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہماری دو کمپنیوں کا دشمن کے ایک بریگیڈ نے محاصرہ کر لیا لیکن کچھ وقت کے لئے دشمن کی ایک پلٹن کی ایک طرف ہم تھے اور دوسری طرف ہماری کچھ امدادی فوجیں تو اس طرح دشمن کا بھی محاصرہ ہو گیا اگر ہمارے اوپر والے بروقت کارروائی کر لیتے تو دشمن کی ایک پوری پلٹن قید ہو جاتی۔ ایسا تو نہ ہوا لیکن دشمنوں کی لاشوں سے میدانِ جنگ بھر گیا۔

حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی کارروائی

چنانچہ حالات ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی کارروائی بھی بروقت نہ تھی اور انہوں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو الجھا دیا لیکن وہ بہادر انسان تھے اور ہر جگہ سے مسلمانوں کی فتوحات کی خبریں سن رہے تھے اس لئے وہ بھی محاصرہ اُٹھا کر کسی ایک طرف چل پڑنے کو تیار نہ تھے کہ مسلمانوں کے نام پر دھبہ لگ جائے گا اس لئے مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے اور جنگ طول کھینچتی گئی۔ اس کے آگے راویوں نے مختلف بیانات دیئے ہیں۔ جن روایات کو ہم زیادہ صحیح سمجھتے ہیں اُن کے مطابق واقعات کچھ اس طرح ہیں کہ حیرہ اور انبار کی فتح کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کو مالِ غنیمت کے ساتھ اور قاصد کے طور پر مدینہ بھیجا۔ آپ نے درمیانی راستہ اختیار کیا اور گو دومۃ الجندل کے مقام سے گزرنے کا کوئی ثبوت نہیں لیکن وہاں کہیں نزدیک سے گزرے۔ خلیفہ اوّل کے پاس دومۃ الجندل کے حالات کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور حضرت ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ راستوں سے خوب واقف تھے چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ولید رضی اللہ عنہ کو ایک دستہ مہیا کیا کہ وہ دومۃ الجندل میں حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی مدد کریں اور دونوں لشکروں کے درمیان رابطہ پیدا کریں کہ حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حالات کی بھی واقفیت تھی۔ حضرت ولید رضی اللہ عنہ جب حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ عین التمر والے راستے حضرت خالد

رضی اللہ عنہ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور خلیفہ اوّل نے اُن احکام سے آگاہ کیا کہ اگر ہو سکے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی مدد کریں۔ قارئین نقشہ پنجم اور ہشتم کی مدد سے جغرافیائی حالات کا مطالعہ کریں تو یہ حالات اور بہتر طور پر سمجھ آ جائیں گے۔

خوش قسمتی سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس وقت عین التمر کو فتح کر کے وہاں قیام کر رہے تھے تو انہوں نے پھر ایک دفعہ صحرا میں اپنے گھوڑے ڈال دیئے، حیرہ میں حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ کچھ دن اور غیر حاضر رہیں گے اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اہل ایران اور دشمنوں پر نظر رکھیں اور اللہ کی تلوار نے لشکر کا تیسرا حصہ عین التمر میں چھوڑا اور باقی چھ ہزار کے ساتھ وہ روانہ ہو گئے۔

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز　　کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج
مشکل نہیں یارانِ چمن معرکہ باز　　یہ سوز اگر ہو نفس سینہ دراج
(اقبالؒ)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا خط

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی طرف پہلے ہی قاصد روانہ کر دیا جس کو خط دیا جس میں عربی زبان میں کچھ شعر لکھے ہوئے تھے جو خالد رضی اللہ عنہ کے اپنے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ادیب اور شاعر بھی تھے اُن کے شعروں کا اُردو ترجمہ کچھ اس طرح کا ہو سکتا ہے۔

''اے میرے رفیق! تھوڑا انتظار کر لو۔ ہمارے گھوڑے آپ کی طرف سرپٹ دوڑ رہے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ان گھوڑوں کی پیٹھ پر کون سوار ہے، یہ وہ مجاہدین ہیں جن کے ہاتھوں میں چمکتی تلواریں ہیں وہ گروہ در گروہ رواں دواں ہیں۔''

دشمن کا ردِ عمل

البتہ دشمن کو بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس طرف کوکوچ کی خبر مل گئی تو انہوں نے بھی مدد کے لئے قاصد دوڑا دیئے، اس کے بعد بنوغسان و بنوکلب کے کئی لوگ اُن کی مدد کو پہنچ گئے۔ جس سے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ پر دباؤ بڑھ گیا اور مسلمان دن رات حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کے بروقت پہنچنے کے لئے دعائیں کر رہے تھے البتہ دشمن بھی دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اوّل اکیدر کی سرداری کے تحت جس کا ذکر ہو چکا ہے اور دوم جودی بن ربیع کے تحت۔ اکیدر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا اور اُس کو ہمت نہ تھی کہ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کے بارے کچھ سوچ بھی سکے۔ اُس نے

دوسروں کو بھی سمجھایا کہ ہتھیار ڈال دیئے جائیں لیکن جب دوسروں نے طاقت کی گھمنڈ پر اُس کے مشورہ کو ٹھکرا دیا تو اُس نے راہ فرار اختیار کی اگر امان طلب کرتا تو شاید بچ جاتا لیکن اُس کے دن پورے ہو چکے تھے اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو کے ایک دستہ نے اس کو گرفتار کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا۔ اُس کی بغاوت اور غداری ایک سے زیادہ دفعہ تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اُس کا سر اُڑا دینے کے احکام صادر فرمائے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دومۃ الجندل پہنچ کر دیکھ بھال کر کے حالات کا جائزہ لیا اور لڑائی کی تجویز بنائی۔ انہوں نے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی فوجوں کو بھی اپنی ماتحتی میں لے لیا کہ کمانڈ کی وحدت جنگ کا ایک ضروری اصول ہے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پورے لشکر کے ساتھ محاصرہ اس طرح کیا کہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کو جنوب کی طرف کی ذمہ داری سونپی اور باقی تین اطراف میں اپنے ساتھ لائے ہوئے لشکر کو قلعوں سے کافی پیچھے رکھا۔ دشمن کا خیال تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ قلعہ جات کی دیواروں پر حملہ کر کے پہلے دیواروں میں شگاف کریں گے اور وہ اس قسم کے دفاع کے لئے تیار ہو رہے تھے لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایک تماشائی کی طرح آرام کر رہے تھے اتنے لمبے سفر کے بعد فوج کا آرام بھی مقصود تھا۔ جودی نے تنگ آ کر یک لخت قلعہ سے باہر نکل کر دو اطراف میں حملہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ جس طرف کامیابی زیادہ ہوگی، اُس راستے سے فرار اختیار کر لیا جائے گا۔ جنوب میں حضرت عیاض رضی اللہ عنہ نے تو حملہ کو جلد پسپا کر دیا لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حملہ آوروں کو بڑھنے دیا اور جودی بھی اُس طرف آ گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جھپٹا مارا اور جودی کو گرفتار کر لیا اور مجاہدین اسلام قلعہ کے دروازہ تک پہنچ گئے۔ قلعہ کے اندر والوں نے دروازے بند کر دیئے اور کافی لوگ باہر رہ گئے اور یہ زیادہ تر جودی کے قبیلہ کے لوگ تھے اور جودی سمیت یہ مسلمانوں کے ہاتھوں مولی گاجر کی طرح کٹ گئے۔

اس کے کچھ دن بعد تک محاصرہ جاری رہا لیکن قلعہ کے اندر حالات بہت خراب ہو گئے تھے اور کچھ دنوں کے بعد قلعہ سر ہو گیا۔ مؤرخین نے تفصیل نہیں لکھی۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ بنو کلب کو کچھ رعایت مل گئی کہ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اور عاصم رضی اللہ عنہ کے قبیلہ تمیم کے یہ لوگ پرانے حلیف تھے اور قبیلہ تمیم کے حضرت اقرع رضی اللہ عنہ بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے۔ قلعہ کے اندر حالات اتنے خراب ہو گئے کہ محاصرہ ختم ہوا تو لوگوں نے اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو بیچنا شروع کر دیا جن لڑکیوں کا نیلام کیا جا رہا تھا ان میں جودی کی لڑکی بھی تھی اور خوش شکل تھی، قیمت کچھ زیادہ تھی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پوری رقم ادا کر کے یہ لڑکی خرید لی۔ اگر خالد رضی اللہ عنہ نہ خریدتے تو کوئی اور خرید لیتا۔ لڑکی کی قسمت اچھی تھی کہ اللہ کی تلوار کی زوجیت میں آئی۔ اسلام دین فطرت ہے اور ایسی باتوں کو بیان کرنے میں شرم کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مسلمان جانوروں کی طرح لوگوں کی عورتوں پر ناجائز قبضہ یا غلط جنسی تعلقات کو گناہ کبیرہ قرار دیتے ہیں۔

ذاتی مشاہدہ

جنگ میں کیا ہوتا ہے۔ راقم نے بہت کچھ دوسری جنگ عظیم میں دیکھا کہ کس طرح غیرت مند لوگوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے اگر تمام مشاہدات کا ذکر کروں تو ایک الگ کتاب بن جائے گی۔ دور کیوں جایئے کیا قوم کو معلوم نہیں کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت کیا ہوا اگر ہم عورتوں اور بچوں کی عزت بچانا چاہتے ہیں تو غیرت مند قوم بننا پڑے گا اور غیرت کے لیے طاقت اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں اپنے اندر جذبۂ جہاد کو پیدا کرنا ہوگا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا   بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی   کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(اقبالؔ)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے چند دن اور دومۃ الجندل میں قیام کیا اور مختلف جگہ پر عامل مقرر کئے اور پھر حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے کر حیرہ روانہ ہو گئے۔

سارے واقعات کی چھان بین کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ خلیفہ اوّل نے دومۃ الجندل کے علاقے بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری میں دے دیا اور جو کارروائی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کی وہ خلیفہ کی طرف سے احکام کے تحت کی اور پوری ذمہ داری سے نبھانے کے بعد حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے یا مکمل طور پر اپنی کمانڈ میں لے لیا۔ تو ظاہر ہے کہ ساتویں باب میں ہم نے جن مؤرخین کے حوالے سے ذکر کیا تھا کہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بھی خالد رضی اللہ عنہ کے برابر کے سپہ سالار تھے اور حیرہ کے فتح کرنے میں دونوں میں مقابلہ تھا تو وہ روایت صحیح نہیں اور نہ یہ کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی دعوت پر دومۃ الجندل آئے، سب حکمت عملی خلیفہ اول کی تھی۔

نتائج و اسباق

اس جنگ کے نتائج ایک طرف نقشہ ہشتم کا مطالعہ کر کے نکالیں اور بنیادی طور پر نقشہ پنجم پر غور کریں کہ کس طرح مسلمانوں کی شمالی سرحدیں مشرق میں خلیج فارس سے لے کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ اور دومۃ الجندل سے تبوک اور موتہ تک اور آگے بحیرہ قلزم تک محفوظ ہو گئیں اب مسلمان اگلی کارروائی کے لیے پر تول رہے تھے۔

۲۔ یاد رہے کہ کسی کو محاصرہ میں لینا یا خود محاصرہ میں آ جانا یہ دونوں بڑی مشکل جنگی کارروائیاں ہیں اور گو آج کل قلعہ جات نہیں ہیں لیکن پھر بھی کئی پوزیشنیں (دفاعی) ایسی ہوتی ہیں جن کو گھیرا پڑ جاتا ہے جب ہمیں گھیرا پڑ جائے تو پھر تدبیرات کے علاوہ حکمت عملی کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے کہ دشمن کی فوج کو ہم کتنے دن اُلجھائے رکھیں گے اور اس کے لئے کتنی قربانی دینا پڑے گی اور کیا اتنی قربانی کی ضرورت ہے اور دی جا سکتی ہے وغیرہ۔ یہ بھی یاد رہے کہ گھیرا ڈالنے

کے لیے بہت زیادہ فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہم دشمن کی کسی فوج کو گھیر اڈالنے کی سعی کرتے ہیں تو اُس دشمن کو جلد ختم کرنا چاہیے ورنہ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کی طرح ہم خود اُلجھ کر رہ جائیں گے یا اپنا فضول نقصان کرانا پڑیگا ویسے آج کل کے زمانے میں گھیرے میں زیادہ دیر ٹھہرنا ناممکن بھی ہوتا ہے۔ علاقہ محدود ہوتا ہے اور دشمن توپخانہ یا سیدھے فائر کرنے والے ہتھیاروں کی مدد سے اُس علاقہ کو جہنم بنا دیتا ہے۔

۳۔ دومۃ الجندل پر قبضہ کے بعد خلیفہ اوّل نے شام و فلسطین کی مہم کی اجازت دے دی اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح، یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ، عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کے لشکر مقرر فرمائے جن کو ذمہ داری کے علاقے سونپے کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کو تبدیل کیا اور اُس علاقے میں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو بھیجا گیا۔ بہر حال اِس سب کارروائی کو دوسری کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ کہ کس طرح مجاہدین نے اپنا رُخ ایک اور طرف کر دیا۔

چودھواں باب

حصید، خنافس اور مضیخ وغیرہ کی تسخیر

پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل میں کچھ زیادہ عرصہ ٹھہرنا پڑ گیا چنانچہ طرح طرح کی باتیں مشہور ہوگئیں کہ آپ مدینہ واپس چلے گئے۔ یہ ہوا اور وہ ہوا وغیرہ، باطل نے شر پسندوں کو اُبھارا اور ایران کے ارباب حکومت جو خالد رضی اللہ عنہ کے نام سے کانپ جاتے تھے اُن میں کچھ جان آئی۔ ویسے جیسا کہ نقشہ ہشتم سے ظاہر ہے کہ شمال میں دریائے فرات کے مغرب کی طرف چند ایک علاقے یا چھاؤنیاں ایسی تھیں جہاں تک مسلمان نہ پہنچ سکے تھے علاوہ عین التمر سے عقہ بن ابوعقہ کے قبیلہ کے لوگ بھی وہاں سے بھاگ کر اُن شمالی علاقوں میں پہنچ گئے تھے ایرانیوں نے عرب قبائل کو بھڑکایا اور بہمن نے کچھ فوج بھی تیار کی کہ جہاں تک مسلمان نہ پہنچ سکے تھے وہاں وہ فوج بھیج دی تاکہ ایسے فوجی عرب قبائل کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔

ایرانی فوج کا فرات کو عبور کرنا

حضرت خالد رضی اللہ عنہ ابھی دومۃ الجندل ہی میں تھے کہ دو ایرانی لشکر مدائن سے نکل کر اپنی منزلوں کی طرف چل پڑے ایک روزبہ کے تحت حصید کی طرف گیا اور دوسرا زرمہر کے ماتحت خنافس گیا۔ نقشہ ہشتم دیکھیں کہ یہ مقامات انبار کے مغرب اور عین التمر کے شمال میں ہیں۔

انبار کے عامل حضرت زبرقان رضی اللہ عنہ نے اس کی اطلاع حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو حیرہ میں دے دی اور انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اُن افواج اور دستوں میں سے کچھ کو حیرہ میں اکٹھا کر لیا جو دونوں دریاؤں کے درمیان دجلہ تک گشت کرتے رہتے تھے اور دو دستے ایک حضرت اعبد رضی اللہ عنہ کے تحت اور دوسرا حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے تحت حصید اور خنافس کے علاقوں میں بھیج دیئے کہ دشمن پر نظر رکھیں۔

چنانچہ ماہ رجب ۱۲ ہجری میں جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ حیرہ پہنچے تو یہ حالات دیکھے، بہمن نے البتہ ایرانی فوجوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی کارروائیاں دفاعی حدود کے اندر رکھیں اور عرب قبائل کو تیار ہونے دیں کہ وہ لوگ بھی کافی بڑے لشکر تیار کر رہے تھے ان میں ایک تو ہذیل تھا جو مضیح میں لشکر تیار کر رہا تھا اور دوسرا ربیعہ تھا جو ثنی اور بشر میں لشکر تیار کر رہا تھا۔ ربیعہ بجیر کا بیٹا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ عین التمر کی جنگ میں عقہ کے بازوؤں پر ہذیل اور بجیر تھے اور وہاں سے بھاگ چکے تھے۔ بہمن کا خیال تھا کہ یہ تمام لشکر الگ الگ مقامات پر رہیں اور جب طاقت پکڑ جائیں تو پھر مسلمانوں کے ساتھ بھرپور جنگ لڑی جائے۔

مؤرخین کے تبصرے

مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جو دومۃ الجندل سے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے آئے تھے وہ ایرانی پایۂ تخت مدائن یا دجلہ کے پار بغداد وغیرہ کے علاقے میں کوئی بھرپور کارروائی کرنے کا ارادہ کر کے آئے تھے لیکن خلیفہ کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے ایسا نہ کیا گیا ممکن ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایسی بات ذہن میں رکھے ہوئے ہوں لیکن ہمارا جائزہ یہ ہے کہ خلیفہ اوّل کے لحاظ سے ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ یاد رکھیں کہ دونوں خلفاءِ راشدین حکمت عملی کے تعین میں اپنا مقام نہ رکھتے تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء خاص تھے، وہ ایرانی طاقت کو فرات کے مغرب میں ملیامیٹ کرنا چاہتے تھے اور اُن کے لحاظ سے حیرہ اُس کے گردونواح، نجف، اور قادسیہ وغیرہ اہم مقامات تھے جہاں ایک فیصلہ کن جنگ کی ضرورت تھی اور دو سال بعد ایسا ہی ہوا بلکہ اُس علاقہ کی اہمیت اتنی تھی کہ بعد میں کوفہ کی چھاؤنی بھی ادھر ہی بنائی گئی بہر حال جو کچھ بھی تھا ابھی ایران کی سلطنت کافی جاندار تھی کہ اُن کو فرات کے اس پار بھی فوج بھیجنے کی ہمت پڑ گئی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا طریقہ کار

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لئے فرات کے مغرب کی طرف کے علاقے ایک شکارگاہ کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے انہوں نے حالات کے مطالعہ کے بعد فیصلہ کیا کہ اِن فوجوں کو ایک جگہ اکٹھے نہ ہونے دیا جائے اور الگ الگ مقامات پر اِن کا قلع قمع کیا جائے یہ افواج اگر اکٹھی ہو جاتیں تو مل کر کوئی بھرپور جنگ نہ لڑ سکتیں کیونکہ قبائل کی جنگ کا وقت گزر چکا تھا اسلامی لشکر اب ایک مانی ہوئی قوت تھی۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ کو حیرہ میں نائب مقرر کیا اور کچھ دستے اُن کے پاس چھوڑ دیئے۔ باقی فوج کو لے کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ عین التمر پہنچ گئے وہاں پر آپ نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کی کمانڈ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو دی کہ وہ حضرت اعبد رضی اللہ عنہ کے

دستوں کے ساتھ مل کر حصید فتح کریں۔ دوسرے حصہ کی کمانڈ حضرت ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ کو دی کہ وہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر خنافس فتح کریں تیسرا حصہ اپنے پاس رکھا اور عین التمر ہی میں ٹھہرے کہ عرب قبائل اگر ثنئی یا بشر سے آگے بڑھ کر کوئی کارروائی کریں تو اُس کا علاج کیا جائے۔

چھوٹے لشکروں کی کارروائیاں

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس طرح ایک طرف تو ضرورت کے مطابق فوج کو استعمال کر رہے تھے اور ساتھ ہی چھوٹے کمانڈروں کو خود مختار طور پر کام کرنے یا جنگ لڑنے کی تربیت بھی دے رہے تھے چنانچہ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کا لشکر عین التمر سے پہلے چلا اور ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ کا بعد میں۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کا رُخ حصید کی طرف تھا اور وہاں کا کمانڈر روز بہ اِن حالات کی اطلاع پا کر گھبرا گیا اور زرمہر سے مدد کی درخواست کی۔ زرمہر کو خنافس چھوڑنے کا حکم نہ تھا بہمن اُس جگہ مزید کمک بھیج کر کسی بڑی جنگ کی تیاری کی سوچ میں تھا اس لئے زرمہر نے مہبوازن کو خنافس میں اپنا نائب بنایا اور خود روز بہ کے پاس حصید چلا گیا کہ حالات کا گہرا مطالعہ کرے۔

حصید کی فتح

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ماتحت لشکر کے سب سرداروں کے بہت مقامات ہیں اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو جو مقام حاصل ہے وہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے اللہ کی تلوار سے ایک ہنر یہ سیکھا تھا کہ بجلی کی طرح کوند کر اپنی مرضی کے وقت دشمن کے سروں پر پہنچ جاؤ اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ تیزی سے دشمن کے سر پر حصید پہنچ گئے، زرمہر نے خالد رضی اللہ عنہ کو لشکر میں نہ دیکھتے ہوئے مبارزت طلب کی اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اُس کا کام تمام کر دیا۔ روز بہ نے بھی زرمہر کی نقل کی اور وہ حضرت عصمہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضرت عصمہ رضی اللہ عنہ مہاجر تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کے تمام قبیلہ نے ہجرت کی تھی اس لئے بررہ کہلاتے تھے بہر حال دونوں ایرانی سرداوں کی لاشیں اب مسلمانوں کے قدموں کے نیچے تڑپ رہی تھیں اور انہوں نے بھرپور حملہ کر دیا۔ ایرانیوں کے قدم اُکھڑ گئے اُن کی لاشوں کے ڈھیر سے میدان جنگ مذبح خانے کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور کچھ ایرانی جان بچا کر خنافس کی طرف بھاگ گئے۔

خنافس کی فتح

لیکن خنافس میں "آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا" والی بات ہو گئی۔ ادھر حصید کے بھگوڑے پہنچے کہ ادھر حضرت ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ کا تازہ دم لشکر خنافس پر حملہ کرنے کے لئے سرپٹ آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ ایک مبصر رقمطراز ہیں کہ

مہوازن سمجھدار آدمی تھا اُس نے وہاں سے بھاگ کر کسی بہتر جگہ پوزیشن لینے کے بارے سوچا ویسے تو اُس کے نزدیک ثنّئی اور بشر میں بھی عرب قبائل ربیعہ کے ماتحت مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو رہے تھے لیکن اُس نے مضیخ میں جا کر پناہ لی جہاں پر ہذیل لشکر اکٹھے کر رہا تھا خنافس تو جلدی فتح ہو گیا اور مسلمانوں کو حصید اور خنافس دونوں جگہوں سے بے شمار مالِ غنیمت حاصل ہوا لیکن دشمن کی مکمل سرکوبی ابھی باقی تھی۔ نقشہ ہشتم کی مدد سے ہر مقام کا جائزہ لیں تو ابھی ثنّئی، بشر اور مضیخ میں دشمن باقی تھا اور "سمجھدار" مہوازن اتنی دور موت کے ڈر سے بھاگا یا حکمت عملی کے تحت ہم اس پر تبصرہ نہیں کریں گے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی چھلانگ

مہوازن، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بارے کافی سن چکا تھا اور دور جانے میں اُس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب ثنّئی اور بشر کی سرکوبی کر لیں گے تو اُن کو مضیخ سے بھاگنے کا موقع مل جائے گا لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہمیشہ جنگ کے طریق کار میں ہر دفعہ ایک نئی طرح ڈالتے تھے اس دفعہ انہوں نے شیر کی طرح ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لئے اب دو ممکن طرز کار تھے۔ اوّل یا تو بشر اور ثنّئی پر جھپٹا مارتے اور ربیعہ کا قلع قمع کرتے یا شیر کی طرح ایک لمبی چھلانگ لگا کر مضیخ پہنچ جاتے جہاں شکار بھی زیادہ تھا، وہاں مہوازن بھی پہنچ چکا تھا خالد رضی اللہ عنہ نے دوسرے طریقہ کو اپنایا۔

مبصر کی رائے

ہمارے ایک مبصر کی رائے کے مطابق اِن دو ممکنات کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مدائن پر حملہ کرتے کہ ایران فوج کا کافی حصہ مضیخ یا فرات کی اس طرف تھا۔ قارئین پچھلے سارے نقشے دیکھیں۔ حالات کا جائزہ لیں اور آگے ایران کے فتوحات کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ایرانیوں کی جو جنگیں ہوئیں اُن کو بھی سرسری طور پر دیکھ لیں کہ ابھی تک ایرانیوں کو مکمل شکست دینے کے لئے کتنی بڑی طاقت کی ضرورت تھی تو امید واثق ہے کہ مدائن کی طرف حملہ کی بات اُس وقت تک بعید از قیاس ہو گی ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دومۃ الجندل کی فتح کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اِس سلسلہ میں شاید کچھ سوچا ہو لیکن ابھی اس کا وقت نہ آیا تھا۔ خلیفہ اول کی حکمت عملی کسی اور سمت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہمارے لئے بڑے عظیم ہیں لیکن یارِ غار کی عظمت کے سامنے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو لے آنا اور سب کامیابیوں کے سہرے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سر باندھ دینے والی بات صحیح نہیں۔ ہم اس موضوع کو آگے چل کر اس سلسلہ کی دوسری کتاب میں زیادہ بہتر طور پر بیان کریں گے کہ خلیفہ اوّل دریائے فرات سے آگے جانے سے پہلے کچھ اور کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُن کی ہدایات پر کام کر رہے تھے۔ آنے والے تمام واقعات، اُن کے

نتائج اور اُن نتائج کے اثرات اِسی سوچ اور حکمت عملی کے ثبوت میں جائیں گے۔ ہمارے مصر لفاظی اور بے وقت کی ''اونچی'' سوچوں سے اپنی کتابوں کو بھر کر اپنی حربی اہلیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

صرف ''دو ممکنات''

ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ حضرت خالد ؓ کے سامنے صرف دو''راستے'' یا ''ممکنات'' تھے کہ مضیح جائیں یا بشر اور ثمیٰ۔ انہوں نے لمبی چھلانگ لگا کر مضیح جانے کا فیصلہ کیا کہ وہ ایرانیوں کے اس طرف ختم کرنے کو ترجیح دیتے تھے، انہوں نے حضرت قعقاع ؓ اور ابو لیلیٰ ؓ کے لشکروں کو اپنی کمانڈ میں لیا اور وہ مضیح کی طرف روانہ ہو گئے۔

مضیح کی طرف پیش قدمی

مضیح کافی دور ہے اور وہاں پہنچنے کے لئے بشر اور ثمیٰ دونوں کو اپنے بائیں ہاتھ پر چھوڑنا تھا لیکن حضرت خالد ؓ جلدی میں تھے۔ یہ شعبان ۱۲ ہجری کا واقعہ ہے۔ اکتوبر، نومبر کا مہینہ تھا تو حضرت خالد ؓ نے حکم دیا کہ سواری صرف اونٹوں پر کی جائے۔ گھوڑے خالی پیٹھ ساتھ چلیں کہ تھک نہ جائیں۔ جناب خالد ؓ نے یہ بھی حکم دیا کہ تمام لشکر فلاں تاریخ تک مضیح سے تقریباً ایک منزل دور فلاں جگہ پہنچ جائیں اور جنگ کے باقی احکام وہیں جاری ہوں گے مؤرخین اس سلسلہ میں اتنی تفصیل میں نہیں گئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقررہ دن پر حضرت خالد ؓ کے تینوں لشکر سورج کے غروب ہونے کے وقت مضیح سے چند گھنٹے کے فاصلہ پر تھے۔ اہل مضیح کو یہ سب معلوم تھا اور دوسری صبح وہ لڑائی کے ہر قسم کی صف بندی کرنے کو تیار ہو رہے تھے اُن کا اندازہ تھا کہ مسلمان دوسرے دن صبح اُس پڑاؤ سے آگے بڑھیں گے اِس لئے وہ رات انہوں نے شراب و کباب میں گزاری۔ ہونے والی شادیاں رچائیں، شعر و شاعری کی۔ وہ سب کچھ کیا جو زندگی سے محبت کرنے والے موت اور زندگی کی کش مکش میں کسی فیصلہ کن گھڑی کا انتظار کر رہے ہوں۔ مسلمان کا رویہ البتہ مختلف ہوتا ہے اُس کے لئے موت ایک دروازہ ہے۔

شبخون

حضرت خالد ؓ کو اس سب کا اندازہ تھا اس لئے انہوں نے رات کو شبخون مارنے کا فیصلہ کیا لشکر تین حصوں میں تقسیم کیا ہر لشکر کو اُس کا مقصود اور رُخ بتایا اور یہ مشکل کارروائی تھی۔ چاند رات کو آدھی رات کے قریب نکلتا تھا اور نومبر کا چاند عرب اور عراق کے اُن علاقوں میں اُس موسم میں بڑی ٹھنڈی اور پیاری چاندنی دیتا ہے۔ چنانچہ چاند نکلنے سے پہلے حضرت خالد ؓ کے تینوں لشکر اپنے مقام اتصال (RV) پر اندھیرے ہی میں پہنچ چکے تھے جیسے ہی چاند طلوع ہوا اور چاندنی کی کچھ مدد ملی تو لشکروں نے آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ آگے کیا ہوا مؤرخین خاموش ہیں سوائے اس کے کہ دشمن

گاجر مولی کی طرح کٹ گیا ہمارے مبصر کا کہنا ہے کہ اُن کا ''سمجھ دار'' ایران جنرل مہوازن لا پتہ ہوگیا، کہاں گیا؟ کیسے لڑا؟ اور ایرانی فوج نے کہاں جا کر دم لیا۔ اس سلسلہ میں کوئی صاحب زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ کچھ مر گئے اور کچھ بھاگ گئے۔ ہاں ہذیل البتہ جان بچا کر عتاب کے پاس بشر پہنچ گیا۔

کفار کے مسلمان مہمان

اس جنگ میں دو ایسے مسلمان بھی عظیم صحابی حضرت جریرؓ کے ہاتھوں شہید ہوئے کہ وہ وہاں پر کفار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن کے رشتہ داروں نے اُن کا خون بہا مانگا۔ خلیفہ اوّل نے فرمایا کہ یہ حادثاتی موت ہے اور مسلمان کفار کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ جنگ سے پہلے کہیں فرار کیوں نہ اختیار کیا؟ یا کیسے فوت ہوئے۔ اُس کا کسی مسلمان مجاہد کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حکومت البتہ خون بہا ادا کر دے گی کہ اُن کے بال بچوں کی کفالت حکومت کا فرض ہے۔ بات ادھر ہی ختم ہوگئی اور طبری سمیت کوئی مؤرخ اس پر حاشیہ آرائی نہیں کرتے لیکن ہمارے مبصر جن کو ہر پہلو میں حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کا اختلاف کہیں سے مل جاتا ہے لکھتے ہیں کہ ''حضرت عمر فاروقؓ غصے سے خلیفہ اول کے پاس گئے اور کہا کہ خالدؓ بڑا ظالم ہے، مسلمانوں کی جان کی حفاظت نہیں کرتا۔''

تبصرہ

بات بے معنی ہے اور ایسا ناممکن ہے یہ اس مبصر کا اپنا ذہنی اختراع ہے۔ یہ الفاظ ان مبصر کو کہاں سے ملے جن لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا ہو وہ تو ایسے تبصروں اور الفاظ کو کوئی وقعت نہ دیں گے ہاں جنہوں نے صرف جنگ کو پڑھا ہو یا ''دیکھا'' ہو وہ شاید ایسی بات لکھ سکتے ہیں جنگ کا ''دیکھنا'' بھی دو قسم کا ہوتا ہے نقشے پر ''دیکھنا'' اور میدانِ جنگ میں ''دیکھنا'' کچھ جنگ کو صرف نقشے پر دیکھتے ہیں اور کچھ زمین پر بہر حال ''دیکھنے'' اور ''لڑنے'' میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کمانڈرز جنگ لڑتے ہیں سٹاف افسر صرف جنگ دیکھتے ہیں۔

کلاسوٹز اپنی پہلی کتاب کے آٹھویں باب[1] میں لکھتا ہے کہ ''لڑائی کے معاملات کو سمجھنے کے لئے ان لوگوں سے تربیت حاصل کرو جو لڑائی لڑ چکے ہیں اگر اپنے ملک میں ایسے لوگ نہ ملیں تو غیر ملکوں میں جا کر ایسے لوگوں سے لڑائی کی باتیں سیکھو۔'' خود کلاسوٹز کا تعلق جرمن جنرل سٹاف سے تھا لیکن وہ اُن سٹاف افسروں کے ساتھ سخت نفرت کرتا تھا جو عملی نہ ہوتے یا رجمنٹل کام سے جی چراتے تھے۔ ایک پلٹن میں بھی ایک پلٹون یا کمپنی کمانڈر جنگ کے معاملات کو ایجوٹنٹ یا کوارٹر ماسٹر صاحب سے بہتر طور پر سمجھے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی ایجوٹنٹ یا کوارٹر ماسٹر جنگ میں گشتی دستوں کی کمانڈ

(۱) تفصیل کے لئے کلاسوٹز کے فلسفہ جنگ حصہ اول، اردو کے صفحہ ۲۰۰ سے استفادہ کریں۔

بھی کرتا رہے، اور ایسا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو ایسی بٹالیں خوش قسمت ہوگی جس کے ایجوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر اسلام کے مایۂ ناز سپوت ہوں۔

نتائج و اسباق

۱۔ ان تینوں جنگوں کا بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی بُری طرح شکست کھا گئے اور فرات کے عرب والے رُخ پر بالکل نہ ٹھہر سکے۔

۲۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق کی فاتح مسلمان فوج، شام و فلسطین کی سرحدوں کے نزدیک پہنچ گئی چنانچہ خلیفہ اوّل کی حکمت عملی اُن راستوں پر بالکل اسی طرح چل رہی تھی جس طرح انہوں نے اس کا تعین کیا تھا۔

۳۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اپنے آپ پر مکمل بھروسہ تھا اور اب اہل ایران اُن کو اپنے برابر کی ایک طاقت سمجھ رہے تھے اور اس سوچ میں تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ کیسے نپٹا جائے۔

سبق

دشمن پر بروقت وار، تیزی، ضرورت کے مطابق لشکروں کی بانٹ، استعمال، حالات کا صحیح جائزہ، حکمت عملی، تدبیرات، رات کی کارروائی اور حیران کن اثرات، مقصد کا پہلے سے مقرر کرنا وغیرہ۔ تمام معاملات صاف طور پر طے کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی بڑی سوچی سمجھی ہوئی حکمت عملی اور تدبیرات تھیں جن سے ہم آج بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط ایک مسئلہ علم کلام
(اقبالؔ)

پندرھواں باب

عرب قبائل کی سرکوبی، جنگ فراض اور متفرقات

مضیح کی تسخیر کے بعد ثنی اور بشر (ذومیل) کے قبائل کی سرکوبی ضروری تھی اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ترجیحی طور پر ان مقامات کی بجائے پہلے مضیح کا رُخ کیا۔ مؤرخین جس طرح تاریخی بیانات کا تسلسل قائم نہیں رکھتے اسی طرح مقامات کے بارے جو کچھ سنا وہ لکھ دیا وہ مقامات جو آج کل موجود ہیں یا اس زمانے میں موجود تھے جب تاریخ لکھی گئی تو ان کے سارے حالات کے تانے بانے کچھ آسان سے جوڑے جاسکتے ہیں لیکن وہ مقامات جو اَب کھنڈرات کی شکل میں ہیں یا بالکل موجود نہیں ہیں اُن کے بارے میں غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں ہمارے اس خطّہ کے مؤرخین نے جناب محمود غزنوی ؒ کے بھادیہ پر حملہ کو بھیرہ پر حملہ بنا دیا۔ حالانکہ عتبی جو لشکر میں موجود تھا اُس کے بیان کے مطابق بھادیہ کا یہ قلعہ موجودہ کوہستان نمک میں تھا اس طرح عرب مؤرخین نے مقامات کے بارے اگر کوئی غلطی کی ہو تو یہ اتنی بڑی بات نہیں۔ علاقہ وہی تھا اور ہماری حکمت عملی کے جائزہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

مقامات کا محل وقوع

نقشہ ہشتم کا پھر مطالعہ کریں تو حیرہ، عین التمر اور ذومیل (بشر) کے محل وقوع میں کسی پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ اِن تینوں جگہوں کے کھنڈرات موجود ہیں اور انگریزوں کے سروے کے چھوٹے نقشے پر بھی یہ مقامات موجود ہیں۔ حصید اور خنافس کے بارے چند میلوں کا فرق ہوسکتا ہے لیکن ہمارے نقشہ پر نشانات عین التمر سے پیش قدمی اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اور ابو لیلیٰ رضی اللہ عنہ کے الگ الگ رُخ سے ہیں کہ یہ مقامات وہیں کہیں ہیں۔ آگے مضیح کی تسخیر کے لیے لشکروں کی روانگی ان مقامات کے قریب سے ہوئی تو جن مؤرخوں نے اِن مقامات کی کارروائی کے مطابق نشاندہی کی اُس کو صحیح تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح حصید اور خنافس کے لئے جو ایرانی فوجیں آئیں اور اُن کی خبر انبار کے مسلمان عامل نے

دی اس سلسلہ میں ان مقامات کا انبار علاقہ کے نزدیک ہونے کا تاریخی ثبوت ہمارے پاس موجود ہے۔ ثنّی کا محل وقوع پر کچھ شک ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ مضیح اور بشر کے کہیں درمیان میں ہوگا کہ مضیح سے واپسی پر پہلے ثنّی پر حملہ ہوا اور بعد میں بشریا ذومیل پر۔ بہرحال ثنّی کا محلِ وقوع چند میل اِدھر اُدھر ہوسکتا ہے۔

وضاحت کی ضرورت

اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پڑی ہے کہ کچھ مؤرخین نے اِن مقامات کو دریائے فرات کے انبار والی اطراف میں ہی بتادیا اگر ایسا ہوتا تو اسلامی لشکر کو دریائے فرات پار کرنا پڑتا اور کارروائی کا یہ تسلسل نہ رہ سکتا جو ہم نے بیان کیا ہے، اور نہ اتنے عرصہ میں یہ مہمات سر ہوسکتیں۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ یہ نقشے ہم کسی سکیل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور یہ سکیل جانے پہچانے اور موجودہ مقامات کی حد تک تو ٹھیک لاگو ہے، لیکن کسی جگہ کچھ میلوں کا فرق ہوسکتا ہے اور تجسس والے کئی صاحبان اپنی تحقیق (Research) کے وقت ہم پر غلط نشاندہی کا بہتان لگا سکتے ہیں یہ اعتراف ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہم نے اپنے نقشوں کو خاکہ یا بغیر سکیل والے نقشوں کا نام دینا پسند نہ کیا۔ پرانے زمانے کے مؤرخ نقشہ نہیں بناتے تھے بلکہ آج کل بھی غیر فوجی نقشہ نہیں بناتے۔ حدود اربعہ بیان کر دیتے تھے بلکہ پرانے زمانے میں جغرافیہ بھی آج کل کا سروے شدہ جغرافیہ نہ تھا۔ چوتھی صدی میں مشہور مسلمان مؤرخ اور جغرافیہ دان البیرونی نے جغرافیہ کو کچھ موجودہ ناپتول کی شکل دی ورنہ پرانے زمانے کے جغرافیہ کے نقشے کسی سکیل کے ساتھ نہ ہوتے تھے کچھ بھی شکل بنادی جاتی تھیں۔ فاصلے اور زمینی حالات قلم سے لکھے جاتے تھے تاریخ کے بامقصد مطالعہ کے لئے فاصلوں کا صحیح ہونا ضروری ہے لیکن اُمید واثق ہے کہ ہماری چھوٹی موٹی غلطی کو درگزر کیا جائے گا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

رمضان ۱۲ ہجری کے پہلے ہفتہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ ثنّی کی طرف روانہ ہوئے یہاں بھی وہی کچھ ہوا یا کیا گیا جو مضیح میں کیا۔ صرف چاند کا فرق تھا کہ وہ پہلی رات کا تھا لیکن ایک دفعہ عملی تجربہ کے طور پر یہ کام کیا ہوا تھا، اس کے علاوہ ثنّی میں دشمن بھی کم تھا۔ بہرحال طریق کار کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے وہاں دشمن کا سردار ربیعہ بن بجیرہ مارا گیا۔ ربیعہ کی لڑکی کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے باقی لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ مدینہ شریف بھیج دیا۔ سردار کی لڑکی تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گزارش کی کہ اس کو زوجیت میں قبول کریں اور انہوں نے منظور کر لیا۔ طبری نے اس شادی کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس سلسلہ میں اولاد کا بھی ذکر کیا ہے کہ بیٹی کا نام رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اور زوجہ عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا اور لڑکے کا نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا۔ آپ کا صرف یہ بیٹا اور محمد بن حنفیہ جنگ کربلا

میں نہ شریک ہو سکے اور ان سے آگے اولاد چلی۔ ورنہ آپ کے متعدد بیٹے جن میں ایک کا نام ابوبکر رحمتہ اللہ علیہ تھا اور ایک کا عثمان رحمتہ اللہ علیہ وہ بھی کربلا میں شہید ہوئے۔

اب لطف کی بات یہ ہے کہ ایسی باتیں آج کل ہماری کتابوں سے خارج ہوتی جاتی ہیں کہ صحابہ کی ایک دوسرے سے محبت کے تمام ذکروں کو ختم کر دیا جائے، حتیٰ کہ جنرل اکرم اپنی کتاب اللہ کی تلوار میں اس شادی کا ذکر تو کرتا ہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور بیٹے کے نام کا ذکر نہیں کرتا۔

بشر پر حملہ

ربیعہ کا قلع قمع کرنے کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ الزمیل یا بشر کی طرف اس تیزی سے پیش قدمی کر رہے تھے کہ وہاں کے قبائل کو ثنئی کے حالات کا پتہ نہ چل جائے۔ ہذیل نے بھی بھاگ کر وہاں پناہ لی ہوئی تھی اور بشر میں عتاب ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ فروکش تھا۔ اس مقام پر بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تین اطراف سے آگے بڑھ کر شبخون مارا اور اس معرکہ میں اتنے دشمن کھیت رہے کہ اس سے پہلے کسی ایک میں نہ ہوئے تھے اور بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھوں لگا یہاں پر بنوتغلب آباد تھے جو کئی اور مقامات پر بھی مسلمانوں کے ساتھ لڑ چکے تھے لیکن یہ اُن کا مرکز تھا۔ یہ لوگ بُری طرح شکست کھا کر تتر بتر ہو گئے۔

الرضاب پر چڑھائی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بشر سے الرضاب کی طرف بڑھے خبر ملی تھی کہ عین التمر کے عقہ کے خاتمہ کے بعد، اُس کا بیٹا ہلال کچھ عرب قبائل کو اکٹھا کر کے مسلمانوں سے اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن جب اسلامی لشکر وہاں پہنچا تو تمام قبائل منتشر ہو گئے۔ حصید، خنافس، مضیح ثنئی اور بشر کے حالات سن کر ان کے مزاج خود بخود درست ہو گئے ہوں گے اور اُن کو پتہ چل گیا ہوگا کہ یہ قبائل کی عام قسم کی جنگ نہ تھی۔ مسلمان ایک عظیم طاقت کے طور پر اُبھر رہے تھے جن کے خوف سے ایرانی بھی کانپ رہے تھے۔

مسلمانوں کے جنگی مقاصد

حضرت خالد وہ سب کچھ کر چکے تھے جو اُن کے سپرد کیا گیا تھا کوئی اور سپہ سالار ہوتا تو زندگی کے باقی دِن حیرہ یا کسی صحت افزا، مقام پر بڑے مزے سے بادشاہ کی طرح گزارتا۔ اہلِ ایران دوبارہ مدائن میں دبک کر بیٹھ گئے تھے عرب قبائل تتر بتر ہو چکے تھے اور کوئی دنیاوی حکومت ہوتی تو وہ یہ کہتی کہ جو کچھ حاصل کر لیا تھا اُس کو ہضم کرو لیکن دین

فطرت کے بوریا نشینوں کے کسی جنگ کے وہ مقاصد نہیں ہوتے جو باطل طاقتوں کے ہوتے ہیں۔ اللہ کی فوج رواں دواں اور مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔ اُن کا تعلق ایک متحرک قافلہ سے ہے جو صراط مستقیم پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس نکتہ کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تلوار کو ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے ہاں کسی مرد کو تلوار دکھا کر اُس کو زبردستی کلمہ پڑھوانا فضول حرکت ہے۔ ہمارا کام اللہ تعالیٰ کے راستے کی دعوت دینا ہے اور اللہ کی زمین جس کے ہم وارث ہیں، اُس پر اللہ کے دین کو جاری وساری کرنا ہے اگر کسی جگہ کوئی ہمارے کردار سے متاثر ہو کر یا ہمارے بزرگوں کی نگاہ کے اثر سے اسلام لے آتا ہے تو فبہا۔ اس میں یاد رکھنے والی بات پیش لفظ میں عرض کر دی گئی ہے کہ حضور پاک ﷺ کے جمال و جلال کا چشمہ جاری ہے۔ اللہ کی دین ہے اور اللہ کی عطا ہے۔ کسی اولیاء اللہ میں حضور پاک ﷺ کے جمال کی جھلک پیدا ہوئی اور اُس کی نگاہ میں حضور پاک ﷺ کے جمال کا اظہار ہوا تو لوگوں کو رحمۃ اللعالمین کی غلامی نصیب ہوگئی جیسے فقراء کی آمد سے اس خطہ میں ہوا۔ جلال کا چشمہ ابھی جاری ہے اور مسلمانوں کے کردار کی جھلک سے لوگ دین اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں لیکن اس کام کے لئے متحرک امیر کارواں کی ضرورت ہے۔

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اقبالؔ

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فراض کی طرف پیش قدمی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو لے کر ایک اور لمبے سفر پر رواں دواں ہو گئے۔ مہینہ رمضان کا تھا اور آخری ہفتہ تھا۔ مسلمانوں کے نعرۂ تکبیر کی صدائیں دونوں دریاؤں کے درمیان گونج رہی تھیں۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اور دوسرے شاہسوار دجلہ کے کنارے اس طرح چکر لگا رہے تھے کہ ایرانی دجلہ کے بھی دوسرے کنارے پر محدود ہو کر رہ گئے تھے صرف سباط کی طرح کی چند مضبوط چھاؤنیاں یا چوکیاں اُس طرف قائم تھیں لیکن ایک جگہ دریائے فرات کے کنارے پر بھی ایرانی فوج کا کوئی دستہ موجود تھا یہاں پر اہل روم اور اہل ایران کی سرحد ملتی تھی اور اس جگہ کا نام فراض یا الفراض ہے۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے الرضاب کی کامیابی کے بعد جلد وہاں کا رُخ کیا۔ واپس حیرہ آئے یا راستے سے اُدھر مڑ گئے۔ یہ معاملہ کچھ صاف نہیں بہر حال اس سرحد پر اہلِ ایران اور اہلِ روم دونوں کے فوجی دستے تعینات تھے اور دونوں ممالک جو کچھ عرصہ پہلے ایک دوسرے کے ساتھ حالات جنگ میں رہ چکے تھے۔ اس زمانے میں ایک دوسرے کے ساتھ امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اہلِ ایران مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی مزہ چکھ چکے تھے اور ان میں اب وہ پہلے والی سکت باقی نہ رہ گئی تھی لیکن اہلِ روم کی اُس وقت تک باری نہ آئی تھی وہ ویسے خوش تھے کہ مسلمان اور ایرانی آپس میں لڑ کر

کمزور ہو جائیں گے تو اُن کو کسی ایک سے بھی خطرہ باقی نہ رہ جائے گا لیکن روم کے دستے کے اعلیٰ افسر نے جب دیکھا کہ ایرانی مسلمانوں سے سہم گئے ہیں تو اُس نے ایرانیوں کو تیار کر لیا کہ دونوں مل کر اسلامی لشکر کے ساتھ جنگ کریں۔ مسلمان فرات کے اس طرف تھے اور وہ دونوں لشکر دوسری طرف اور کوئی چھ ہفتہ تک طرفین اسی حالت میں رہے۔ مؤرخین نے لشکروں کی نفری بہت زیادہ بتائی ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ جنگ میں اور بعد میں مسلمانوں نے دشمن کا تعاقب کر کے لاکھوں آدمیوں کو قتل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں کا لفظ بیشمار کیلئے استعمال ہوا ہے یہ حقیقت نہیں۔

خیال ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا آدھا لشکر یعنی دس ہزار کی نفری ضرور ہوگی اور دونوں دشمنوں کی تعداد ملا کر اُن سے دُگنی ہو سکتی ہے یہ اندازہ حالات اور واقعات کے تجزیہ کی مدد سے لگایا جا رہا ہے۔

فراض کی جنگ

رومی لشکر مسلمانوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا اور وہ بار بار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جنگ کی دعوت دے رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُن دونوں کو دریا پار کرنے کی دعوت دے رہے تھے، اُس زمانے کے لحاظ سے ایسا ہوتا رہتا تھا کہ جنگ بھی ایک قسم کی ایک اجتماعی مبارزت ہی ہوتی تھی۔

بہر حال رومیوں نے کسی طرح دریا عبور کر ہی لیا اور ایرانیوں کو بھی دریا عبور کرنے پر مجبور کیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ تاک میں تھے، وہ شیر کی طرح دونوں دشمنوں پر اُس وقت جھپٹ پڑے جب وہ تجویز ہی بنا رہے تھے کہ مسلمانوں کا مقابلہ مل کر کریں یا الگ الگ اور اتنے دشمن کھیت رہے کہ مؤرخین نے بے شمار کی جگہ لاکھوں کا لفظ استعمال کیا۔ مسلمانوں نے دشمن کا دور دور تک تعاقب بھی کیا اور جگہ جگہ دشمنوں کو چن چن کر مارتے رہے، بہت کم نفری اپنے ملکوں میں واپس پہنچی۔ یہ ذی قعد کا مہینہ تھا اور اس حربی مظاہرے اور لڑائی کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو حیرہ واپس جانے کے احکام دے دیئے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فریضۂ حج کی ادائیگی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے لشکر کی کمانڈ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو کے حوالے کی اور لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جیسے ہم آج کل بھی کرتے ہیں۔ ہراول[1] یعنی ایڈوانس گارڈ۔ قلب یا دِل یعنی مین باڈی عقب یا ساقہ۔ یعنی رئیر گارڈ، ہر دستہ کا ایک کمانڈر مقرر کیا گیا اور ساقہ پر ایک ہم راز دان شجرہ بن لانبر کو مقرر کیا اور یہ تاثر دیا کہ خالد رضی اللہ عنہ ساقہ کے ساتھ آرام آرام سے سفر کریں گے اور باقی لوگ اور کمانڈر اپنی ذمہ داری سے خوب چوکنے رہیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا ارادہ

(۱) ہراول دستوں کو جیش المقدم بھی کہتے ہیں۔

حج کرنے کا تھا اور وہ یہ کام چپکے سے کرنا چاہتے تھے کہ پہلے کی طرح اہلِ عرق وایران کو پتہ نہ چل جائے اور وہ کوئی گڑبڑ نہ کریں۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ لشکر کے کوچ کے بعد راستے میں حضرت خالد ؓ رازداری سے لشکر سے نکل گئے اور مکہ کی راہ لی لیکن ممکن ہے کہ حضرت خالد ؓ بھی کوچ ہی والے دن یا پہلے رازداری سے نکل کر جا چکے ہوں۔ قارئین نقشہ پنجم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد ؓ نے دومۃ الجندل، بزدخایا نقرہ یا خیبر والا راستہ استعمال کیا ہوگا اور مدینہ کے قریب سے ذوقصہ کے پاس سے گزرے ہوں گے۔ مؤرخین اس سلسلہ میں خاموش ہیں لیکن اگر فاصلے سیدھے طور پر ناپے جائیں تو حضرت خالد ؓ کا سفر فراض سے مکہ اور پھر حیرہ تک اگر ناپا جائے تو وہ فراض سے حیرہ کے سفر کے مقابلہ میں چھ گنا ہے۔

خلیفہ وقت سے اجازت لی یا مدینہ کے پاس سے گزرتے ہوئے پیغام بھیج دیا۔ حضرت خالد ؓ حج پر چھپ کر کیسے رہ سکتے تھے اور وہ کیسا حج ہوگا جو حاکم وقت کی اجازت کے بغیر کیا جائے یا چھپ کر کیا جائے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت خالد ؓ نے پہلے اجازت نہ لی ہوگی اور بعد میں جب ارادہ حج کا کیا ہوگا تو مدینہ سے گزرتے وقت اطلاع دی ہوگی یا اجازت مانگی ہوگی اور خلیفہ وقت نے حکم دیا ہوگا کہ حج رازداری سے کیا جائے۔ طبری کے حوالے سے مؤرخین کہتے ہیں کہ خلیفہ وقت نے یہ بات ناپسند کی۔ طبری کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ ابوبکر ؓ نے حضرت خالد ؓ پر عتاب کیا اور عتاب یہ کیا کہ اُن لوگوں کو شام بھیج دیا۔'' اگلے باب میں خلیفہ اول کے اُس خط کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، جس میں آپ ؓ نے حضرت خالد ؓ کو شام جانے کا حکم دیا اور اُس خط کو پڑھ کر قارئین خود اندازہ لگائیں کہ خط میں عتاب ہے یا عزت افزائی۔ واقعات آگے ثابت کریں گے کہ حضرت خالد ؓ کی شہرت ملک شام میں پہنچ کر دوبالا ہوگئی اور فی الحال ہم اسی پر اکتفا کریں گے کہ شام میں جا کر جن لشکروں کے آپ سپہ سالار اعظم بن گئے اُن میں ایک لشکر کی کمانڈ امین الامت حضرت ابوعبیدہ ؓ بن جراح کر رہے تھے۔ حضرت خالد ؓ کی اپنی شان ہے لیکن جو لوگ امین الامت کی شان کو سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ حضرت خالد ؓ کی اس سے زیادہ کیا عزت افزائی ہوسکتی ہے کہ حضور نبی پاک ﷺ کے بدن مبارک سے اپنے منہ سے خود کے ٹکڑے نکالنے والے پر کمانڈ کرنے کا م ... ت ابوعبیدہ ؓ عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ کتابوں کے سلسلہ کے حصہ دوم میں آپ ؓ کے اکثر ... میں آپ کی شان کی جھلکیاں اکثر ابواب میں موجود ہیں۔

حضرت خالد ؓ نے یہ سفر اکیلے نہ کیا چند اہم رازداروں اور شہ سواروں کے ساتھ مل کر فریضہ ن... افسوس کہ مؤرخین نے نہ تو ساتھیوں کے نام لکھے نہ سفر کے حالات پر کوئی تبصرہ یا تجزیہ کیا۔ صرف یہ لکھا کہ جب اہلِ لشکر واپس حیرہ پہنچے تو حضرت خالد ؓ بھی اُسی دوران پہنچ گئے اور انہوں نے چھ گنا سفر اُسی عرصہ میں طے کر لیا۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

(اقبالؔ)

نتائج واسباق

اس باب میں متفرق کارروائیاں ہیں۔ ایک طرف ایرانی اور دشمن عرب قبائل کا فرات کے عرب والی طرف سے مکمل صفایا ہو گیا تو دوسری طرف مسلمان لشکر مشرق کی طرف سے بھی شام کی سرحدوں پر پہنچ گئے جنوب سے تین لشکر تو پہلے سے اہلِ روم کی ''دیکھ بھال'' پر لگے ہوئے تھے اب وہاں پر نئی تنظیم کے تحت چار لشکر تیار ہوئے اور انہوں نے بے فکری سے کام شروع کر دیا کہ اُن کو مشرق کی طرف سے کسی دشمنانہ حرکت کا کوئی ڈر باقی نہ رہا۔

۲۔ ایرانی سہم گئے وہ دبک کر مدائن اور بڑے شہر میں بیٹھ گئے۔

۳۔ شبخوں کی اس کارروائی کا اس باب اور پچھلے باب میں ذکر ہے۔ شبخوں مار کر بہتر نتائج حاصل کئے اس سے دشمن پر زیادہ رعب بیٹھ گیا کہ ایسی قوم کے ساتھ مقابلہ ہے جس کا دن رات ایک ہے رات کی کارروائی بڑی مشکل ہوتی ہے اور بڑی تربیت اور ضبط وربط کی ضرورت ہوتی ہے۔ شبخون مارنے کے لئے تمامتر باقاعدہ فوج اور مجاہدین جب تک کفن پوش نہ بنیں کامیابی مشکل ہوتی ہے۔ بڑا وسیع تجربہ چاہیے کیونکہ ہر مختلف زمینی حالات کیلئے طریق کار مختلف اختیار کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک دوسرے کے ساتھ اُلفت کو خاص کر واضح کیا گیا ساتھ ہی یہ ثبوت بھی پیش کر دیا گیا کہ اس زمانے میں بھی اچھے بھلے سمجھدار لوگوں میں کئی ایسے ہیں کہ الفت والی باتوں پر پردہ ڈال دیں گے اور تفرقہ والی باتیں بغیر وجہ آگے لے آئیں گے اور بے معنی تفرقات کو بھی خواہ مخواہ بیان کریں گے ہمارے لئے سبق یہ ہے کہ ہر ایسی تحریر سے بچیں جو اختلافی ہو اور ہم وحدت کے راستہ پر چلیں۔ پیش لفظ میں بیان کر دیا گیا تھا کہ واقعات کو اُن کے نتائج اور اثرات سے پرکھیں اور پھر اپنے دل سے پوچھیں کہ کیا یہ عمل اُن لوگوں کے ہیں جو ہمارے آقا ﷺ کے رفقاء تھے؟ اگر آپ کا دل صاف ہے تو ہر چیز آپ کو صاف نظر آئے گی۔

سولہواں باب

فاتحین عراق کا عراق کو الوداع

مرتدین کی کارروائیوں کے سلسلہ میں پہلے چار ابواب کی کارروائیوں کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا تھا کہ مختلف وقتوں میں مختلف لشکر مختلف مقامات اور جگہوں پر برسر پیکار ہے اِن اگلے بارہ ابواب میں عراق کی فتح کے واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور باب بھی چھوٹے ہیں چونکہ سپہ سالار اعظم بھی ایک تھے تو واقعات میں از خود تسلسل ہے اور مدد کے لئے جو نقشے شامل کئے گئے ہیں وہ حالات کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ حضرت خالد ﷛ کے لشکر کی تعداد کوئی اٹھارہ ہزار کے قریب بنتی ہے اور اگر تمام آنے جانے والے مسلمان مجاہدین کو شامل کیا جائے جو کسی نہ کسی طرح عراق کی جنگ میں شریک ہوئے تو پھر بھی کل مسلمان جنہوں نے اس جہاد میں شرکت کی ان کی تعداد بیس پچیس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی حضرت خالد ﷛ نے اس لشکر کے ساتھ کم از کم ایک درجن کے قریب بڑی لڑائیاں لڑیں اور پھر جھڑپوں کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

دشمن کی تعداد اور نقصانات

مسلمانوں کے مقابلہ میں اہل ایران لاکھوں جوانوں کو میدانِ جنگ میں لے آئے تمام ایرانی اور عرب قبائل جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ لڑی اُن کی کل تعداد پانچ لاکھ سے کم نہیں بنتی۔ دشمن کے جتنے لوگ کھیت رہے اُن کی تعداد بھی لاکھوں میں جاتی ہے اِن جنگوں کے واقعات کو تسلسل سے بیان کئے بغیر اگر خالی یہ لکھ دیا جائے کہ اٹھارہ سے بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ حضرت خالد ﷛ نے بارہ بڑی جنگوں میں ایرانیوں کو شکست دی اور ہر جنگ میں ایرانیوں کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہ تھی اور اتنا بڑا وسیع علاقہ فتح کیا تو عسکری تاریخ کا کوئی بھی طالب علم اس بات کو تسلیم نہ کرے گا اور نہ یہ حقیقت ہے، بات یہ ہے کہ عسکری تاریخ کا طالب علم ہر چیز کو سو فیصدی دنیاوی پیمانوں سے ناپے گا لیکن دین فطرت کے ساتھ یہ پیمانے نہیں چل سکتے یہاں ان ہونی کو بہت بڑا دخل ہے یہاں اس چیز کو ہم اپنی زبان میں

کرامت کہتے ہیں۔

ایک سوال

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کرامت سقوطِ بغداد کے وقت کیوں رونما نہ ہوئی۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں کیوں نہ رونما ہوئی اور آج کل کیوں رونما نہیں ہو رہی۔ صرف اُسی زمانے میں کیوں رونما ہوئی اتو اُس کا جواب یہ ہے ایسی کرامات صرف اُسی وقت رونما ہوتی ہیں جب ہمارے مقاصد زندگی ہمارے سامنے ہوں اور ہم اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کر رہے ہوں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا طریق کار

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے وہی طرز جنگ اپنایا جو ہمارے آقا ﷺ سکھا گئے تھے۔ طرز جنگ، تدبیرات، سلیقہ، ہنر، فن سب نرالے ہیں کہ اِن کی بنیاد اسلام کے فلسفۂ حیات پر باندھی جاتی ہے۔ ایرانیوں نے قدامت پسند قسم کی لڑائی لڑ کر جگہ جگہ مار کھائی۔ تعداد میں برتری کے باوجود کسی ایک جگہ بھی جارحانہ کارروائی نہ کر سکے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اِن تمام فتوحات کو حاصل کرنے کے بعد بھی خاموشی سے نہ بیٹھتے تھے۔ متحرک دین کے شیر، عراق کے شہروں پر چھاپے پہ چھاپہ مار رہے تھے، یہ چھاپے زیادہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے ماتحت ہوتے رہے لیکن ایک چھاپے میں خود حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوئے اور یہ چھاپہ بغداد کی منڈی اور بازار پر تھا لیکن اللہ کی تلوار نے اب دنیا کی ایک اور سلطنت کو تہس نہس کرنا تھا چنانچہ نئی ہجری یعنی تیرھویں ہجری کے چوتھے مہینہ میں وہ ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فاتحین عراق، عراق کو الوداع کہہ رہے تھے، حضرت خالد رضی اللہ عنہما کیلے نہ تھے فاتحین کی آدھی تعداد اُن کے ساتھ تھی اِسی وجہ سے اِس باب کو اُن سب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

خلیفہ اوّل کا خط

چند دن پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اوّل کا خط ملا جس کے بارے میں پچھلے باب میں لکھا تھا کہ طبری نے اس خط کے لئے عتاب کا لفظ استعمال کیا لیکن خط میں ہمیں تو کوئی عتاب والی بات نظر نہیں آتی۔ طبری نے اس خط پر اور کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن ہمارے اس زمانے کے مبصر طبری کے ''عتاب'' کے لفظ کو اپنی زبان میں بیان کر کے اضافی لفظوں کی ذمہ داری خواہ مخواہ طبری کے سر ڈال دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں ''حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تھوڑا سا خط پڑھا تو بُوبُرا ئے لیکن جب خط آگے پڑھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔

تبصرہ

ہم عام طور پر کوئی بیان لکھنے کے بعد اُس پر تبصرہ کرتے ہیں لیکن یہاں تبصرہ پہلے ہی پیش کر رہے ہیں کہ وہ کونسا ایسا راوی بیٹھا تھا جس نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بڑبڑاتے سنا/ دیکھا جس کے بارے واقعہ کے تین سو سال بعد طبری کو پتہ نہ چلا لیکن چودہ سو سال بعد ہمارے مبصر کو پتہ چل گیا۔ دوم اس میں عتاب نہ تھا بلکہ عزت افزائی تھی اب مکمل خط قارئین کے مطالعہ یا جائزہ کے لئے پیش کرتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از جانب اللہ کا بندہ عتیق بن ابوقحافہ بنام خالد رضی اللہ عنہ بن ولید

السلام علیکم! سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور ہم اللہ کے رسول جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے ہیں آپ کوچ کریں یہاں تک کہ آپ مسلمان مجاہدین کے شام کے علاقہ میں اجتماع والے مقامات تک پہنچ جائیں میں آپ کو مسلمان مجاہدوں کی افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ اہلِ روم کے ساتھ جنگ کریں آپ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور اُس کے ساتھ والوں کے بھی اعلیٰ افسر یا کمانڈر رہوں گے۔

تیزی کے ساتھ بڑھو اور مقصد کو سامنے رکھو۔ اے ابوسلیمان رضی اللہ عنہ! اللہ کی مدد سے اپنی ذمہ داری کو پورا کرو کیونکہ اللہ کی شان بہت بلند ہے ہمیشہ اُن میں سے رہو جو اللہ والے ہیں اور یہ حرکت جو تم نے اب کی ہے آئندہ کبھی تم سے سرزد نہ ہو۔ اپنی فوج کو برابر دو حصوں میں تقسیم کرو اور آدھی فوج مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو دے دو کہ وہ عراق کے سپہ سالار رہوں گے نہ تمہارے پاس زیادہ فوجی جائیں نہ اُن کے پاس زیادہ۔ فتح کے بعد آپ عراق واپس آئیں گے اور پھر کمانڈ سنبھال لیں گے۔

یہ خدا کا فضل ہے کہ تمہارے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور تم مسلمانوں کو دشمن کے نرغے سے صاف بچا لاتے ہو۔ اے ابوسلیمان! میں تمہارے خلوص اور خوش قسمتی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اب اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ تمہارے دل میں فخر پیدا نہ ہونا چاہیے کیونکہ فخر کا انجام خسارہ اور رسوائی ہے اور نہ اپنے کسی فعل پر نازاں ہونا کیونکہ فضل وکرم کرنے والا صرف خدا ہے اور وہی اعمال کا صلہ دیتا ہے۔

قارئین کا فیصلہ

اب یہ فیصلہ قارئین کریں کہ اس میں عتاب والی بات کون سی ہے اس لئے طبری کے تبصرہ والی بات تو ادھر ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن ہمارے مبصر سے پوچھیں کہ خط کے شروع میں ایسی کون سی بات تھی جس کو پڑھ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر غصہ آیا اور آخر میں کون سی بات تھی جس کو پڑھ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا دل باغ باغ ہو گیا اگر کوئی خوشی کی بات تھی تو خط کے شروع میں ہے کہ شام کی امارت ملی اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پر کمانڈ کیونکہ حضرت

خالد رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان کو سمجھتے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا نام لکھا کہ وہ بھی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان کو سمجھتے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عزت افزائی کی ساتھ ہی مبارک دے رہے تھے کہ اُن کو کتنی بلندی مل رہی ہے خط کے آخر میں جو نصیحتیں ہیں اُن میں بھی ہمیں تو کوئی عتاب والی بات نظر نہیں آتی۔ ہاں البتہ ایک فقرہ ہے اور وہ خط کے عین درمیان میں کہ "یہ جو تم نے حرکت کی ہے آئندہ کبھی تم سے سرزد نہ ہو۔" مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حج پر بغیر اجازت جانے کے سلسلہ میں تنبیہ تھی ہمارا یہاں پر مؤرخین کے ساتھ اختلاف ہے کہ اگر حج بغیر اجازت کرتے تو تنبیہ محرم یا صفر کے مہینہ میں ہوتی یہ خط ربیع الاوّل کے آخری ہفتہ یا ربیع الثانی میں ملا یہ حج اجازت کے بغیر نہیں کیا یہ تنبیہ بھی صرف حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ایک مشورہ تھا کہ وہ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں اور دور جا کر بغداد میں چند محافظوں کے ساتھ چھاپہ مارنے کا جو کام سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے کیا تھا وہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور اس سلسلہ میں کوئی مفصل خط شاید پہلے بھی لکھا ہو وہاں تو ہر ہفتہ خط آتے ہوں گے حج کے سلسلہ میں چار ماہ بعد تنبیہ والی بات بھی اتنا ہی افسانہ ہے جتنا حج پر بلا اجازت جانے کی بات۔

لشکر کی تقسیم

لشکر کی تقسیم اور مجاہدین کے الوداع کے واقعات وہ ہی بیان کر سکتا ہے جس نے ایسا نظارہ کبھی خود دیکھا ہو۔ آپ لوگوں نے خود کئی دفعہ اپنی یونٹوں سے لوگوں کو دوسری یونٹ میں جاتے وقت الوداع کیا ہوگا۔ کئی افسران کو اس چیز سے واسطہ پڑتا ہے، زندگی میں ایسے کئی واقعات سے واسطہ پڑا بلکہ محاذِ جنگ پر سے کئی لوگوں کو الوداع کہنا پڑتا ہے بلکہ خود راقم نے بھی دو دفعہ محاذِ جنگ پر اپنے اُن ساتھیوں کو الوداع کہا جن کے ساتھ دشمن کے فائر کے نیچے رہا۔ خاص کر فروری ۱۹۶۶ء میں جب میں اپنے عظیم ساتھیوں کو بی آر بی پر الوداع کر رہا تھا اور مجاہدین کی ایک اور بٹالین کو کھڑا کر کے محاذ پر لانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو وہ گھڑیاں اور الوداع مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی لشکر کی تقسیم

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے لشکر بالکل آدھا آدھا بانٹ دیا لیکن جن کو زیادہ جانتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو زیادہ تر اپنے لشکر کا ہی حصہ بتایا اور پھر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو لشکر کی تقسیم کے بارے میں بتایا۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی عرضداشت

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ پہلے مسکرائے، پھر عرض کی: "اے سالارِ لشکر! آپ نے خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے خط سے مجھے صحیح

طور پر آگاہ کیا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں اے سالار لشکر کی بانٹ ویسے ہی ہونا چاہیے جیسے خلیفہ اوّل نے لکھی ہے اور آپ نے مجھے پڑھ کر سنائی۔" پھر آبدیدہ ہو کر عرض کیا: "اے سالار لشکر! بخدا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے بغیر مجھے دشمن پر کامیاب ہونے کی اُمید نہیں ہے۔ آپ مجھے ان حضرات سے کیوں محروم کرتے ہیں؟"

تبصرہ

خدا کا شکر ہے کہ کسی مبصر نے دو عظیم سالاروں کی اس گفتگو یا واقعہ کو تفرقہ بنا کر پیش نہیں کیا لیکن ہمارے لئے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں بڑا سبق ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی شان کو سمجھتے تھے اس لئے ہمیں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی وہی عزت کرنا چاہیے جو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جیسے عظیم مجاہد کو اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا جواب

حضرت خالد یوں گویا ہوئے: "اے ابن حارث! بے شک آپ صحیح فرماتے ہیں میں غلط تھا اب بانٹ اسی طرح ہوگی کہ اگر قعقاع رضی اللہ عنہ میرے ساتھ جائیں گے تو ان کے بھائی عاصم رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ رہیں گے حضرت مقرن رضی اللہ عنہ کے جتنے بیٹوں میں سے جن کو چاہو اپنے پاس رکھ لو اور اتنے ہی مجھے دے دو اگر ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور میرے ساتھ جائیں گے تو بنو اسد یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے جن کو چاہو اپنے پاس رکھ لو وغیرہ۔

لشکر کی دوبارہ بانٹ

بہر حال لشکر اس طرح بانٹا گیا کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو پوری تسلی ہوگئی کہ اسلام کے لحاظ سے بندوں کو تولا کرتے ہیں گنا نہیں کرتے جس کا کردار بلند ہو وہی اللہ کے ہاں برتر ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی شان کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں مذکورہ صحابہ کے علاوہ حضرت فرات رضی اللہ عنہ بن حیان، حضرت بشیر رضی اللہ عنہ بن الخفاصیہ، حضرت حارث رضی اللہ عنہ بن حسان، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی اوفیٰ، حضرت حارث رضی اللہ عنہ بن بلال اور حضرت معبد رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی موجود تھے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کوچ

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے عراق سے کوچ کے نظارہ کو اور سفر کے حالات کو دوسری کتاب میں بیان کیا جائے گا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے کئی سو میل اپنے عظیم سپہ سالار کے ساتھ سفر کیا اور قراقر تک گئے لیکن اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا یہ سفر جو ایک فتح عظیم کے بعد کئی فتوحات کو اپنے اندر رکھے ہوئے ایک مکمل باب کے طور پر حصہ دوم کی زینت بنے گا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی الوداعی بغلگیری اور اس سفر میں دونوں کی رفاقت کو ہمارے مؤرخین نے بڑے

مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔قارئین کو یاد ہوگا کہ یہ عظیم مجاہد سب سے پہلے نباج میں ملے جہاں پر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی تلوار کو خوش آمدید کہا۔وہاں عراق کی سرحد شروع ہوتی تھی۔آج شام کی سرحد پر قراقر کے مقام پر ایک دوسرے کو الوداع کرر ہے تھے،شہادت میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو سبقت حاصل ہوگئی لیکن اللہ کی تلوار کو دشمن کی تلوار گزند نہ پہنچا سکی یہ بیان دوسری جلد میں کچھ مکمل ہوگا لیکن اب ذرا ہم اپنے دل میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہم اُسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جیسے عظیم فرزند پیدا کئے۔افسوس کہ ہم اسلام کی جگہ دنیاوی چکروں میں ہیں۔

کھو نہ جا اِس سحروشام میں اے صاحب ہوش
اِک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

(اقبالؔ)

سترہواں باب

بابل کی جنگ

مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا عراق سے کوچ اور شام کی طرف روانگی کو دشمن سے چھپایا نہ جا سکا۔ ایرانی خوش تھے کہ اب مسلمان اہلِ روم کے ساتھ اُلجھ کر رہ جائیں گے۔ اس لئے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ مسلمانوں کو عراق سے باہر نکال دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ کی تلوار کو حاصل ہے اور یہ اللہ کی دین اور عطا ہے لیکن فوجی بصیرت، غیر تمندی اور نبض شناسی کے لحاظ سے جو مقام حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے، دنیا کی عسکری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسلام کے یہ عظیم فرزند دنیا کے عظیم ترین فوجی ماہرین میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ان صفات کے علاوہ عالی حوصلگی، شجاعت، دلیری، ثابت قدمی اور میدانِ جنگ میں چوکنے رہنے میں بھی اُن کے مقابلے کے بہت کم نظر آتے ہیں۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث کی وفاداری، اطاعت امیر، اسلامی فلسفہ کی غلامی، اسلام کے پرچم کو بلند رکھنے کی کوشش اور اسلام کی خدمت میں اس طرح رواں دواں رہنا کہ اسلام اور عسکریت ان کا اوڑھنا بچھونا بن جائے۔ ایسی خصوصیات ہیں جو انسان کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد جب دوسروں کی عسکری تاریخ کچھ عرصہ تک میرے مطالعے میں رہی تو اسلام کے جن عظیم مجاہدین کے سامنے مجھے غیروں کے بڑے بڑے جرنیل بونے نظر آئے، ان مجاہدین میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ خاص کر آنے والے واقعات اور حالات کو بروقت بھانپ لینے کا ملکہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا اس کی مثال نہیں ملتی۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی نظر ہر آنے والے واقعہ کو سمجھنے کی جو بصیرت رکھتی تھی اور پھر وہ آنے والے واقعات کے ساتھ دوچار ہونے کے لئے جو تجویز بناتے تھے اور جو پیش بینی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ودیعت ہوئی تھی وہ سنہری الفاظ میں لکھنے کے قابل ہے۔

تبصرہ

آنے والے واقعات کا صحیح اور بروقت تجزیہ کر کے حالات کے ساتھ دوچار ہونے کی ضرورت ہر سطح پر ہوتی ہے اور جس قوم کے فرد ہر سطح پر ایسی سوچ رکھتے ہوں یا ان میں ایسی سوچ پیدا کی جائے تو وہ قوم کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں کبھی کوئی کوشش نہیں کی کہ آنے والے واقعات کا جائزہ لیں اور اپنے ذمہ دار آدمیوں کو اس کی تربیت دیں کہ وہ بروقت کارروائی اور حالات کیساتھ کامیابی سے دوچار ہونے کے لئے تیار ہوں۔ جس قسم کے رہنما ماضی کے حالات کا تجزیہ کر کے اپنے حالات درست نہیں کرتے کہ مستقبل کے حالات ان کی مرضی کے مطابق چلیں۔ وہ قوم زیادہ دن عزت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ وہ غیروں کے اشاروں پر ناچتے رہتے ہیں اور اُن کی سب کارروائیاں ردعمل کے طور پر ہوتی ہیں۔ ان تمام اگلے ابواب میں یا تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے اپنے عمل ہیں یا ان کی سوچ کے مطابق خلفاءِ راشدین نے جو حکمت عملی مقرر کی وہ کامیاب رہی اور جو کچھ اس وقت تک ہوا اس حکمت عملی کے تعین میں بھی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی سوچ اوپر سے لے کر میدانِ جنگ کی کارروائی کی سطح تک شامل تھی کیونکہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ واقعات سے آگے آگے چلتے تھے۔

فوجی چوکیوں کا اہتمام

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے شام کی طرف کوچ کے بعد حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ''خالی جگہوں'' کو پُر کیا اور تجربہ کار امراء کو آگے والی چوکیوں پر متعین کیا اپنی چوکی پر اپنے بھائی حضرت معنّیٰ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ یہ اہم مقام تھا اور دریائے دجلہ کے کنارے سیب کے علاقہ میں واقع تھا۔ ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور کی جگہ اپنے چھوٹے بھائی حضرت مسعود کو متعین کیا۔ ایک اور خاص مقام پر حضرت مذعور رضی اللہ عنہ بن عدی کو مقرر کیا۔ آپ کا تعلق بنو عجل سے تھا۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن خطاب کے جگہ آپ نے عظیم صحابی حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بن النہاس کو مقرر کیا۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا جائزہ

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی دوررس نگاہ بھانپ چکی تھی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے چلے جانے کے بعد ایرانی ضرور کوئی بھرپور کارروائی کریں گے۔ اس لئے اگر مسلمان فوجی دستے اپنی چوکیوں میں دبک کر بیٹھ گئے تو یہ ایک انفعالی دفاع ہوگا اور پھر عراق میں مسلمان زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے حکم دیا کہ متحرک ہو جاؤ اور جگہ جگہ دشمن پر چھاپے مارتے رہو۔ یہ چھاپے اوپر انبار کے علاقے میں تو محدود علاقوں میں تھے لیکن واسط اور مدائن کے علاقوں میں ان کو تیز تر

کر دیا گیا۔ایرانی اس طرز جنگ میں تو مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور ہلکے پھلکے مسلمان دستوں نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ایرانیوں کے لئے ان حالات میں بہتر تھا کہ وہ کسی لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مرکز پر حملہ آور ہوں۔جنگ کے اصولوں کے لحاظ سے یہ صحیح طریقہ کار ہے کہ ''منبع'' کو ختم کر دو۔لیکن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ ان سے ایک قدم آگے تھے۔ انہوں نے سوچا ہوا تھا کہ ایرانیوں کے پاس اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار باقی نہیں اور وہ اس کے لیے تیار تھے۔

کسریٰ کا حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو خط

ایران کے بادشاہ کے پاس کچھ نہ کچھ فوج تو موجود رہتی تھی کہ مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کرے، لیکن ایران کے بادشاہ شہر بزار نے بے وقوفی یہ کی کہ اپنی طرف سے ایک ''ذلت آمیز'' قسم کا خط بھی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھ دیا، جس کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے:

''یہ خط شہر بزار کی طرف سے مثنیٰ (رضی اللہ عنہ) کو لکھا جاتا ہے۔'' تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے مقابلے کے لئے اہل فارس کی رذیل اور کمینی فوج بھیج رہا ہوں یہ لوگ مرغیاں اور خنزیر پالنے والے ہیں۔میں تمہیں انہی لوگوں کے ہاتھ سے قتل کراؤں گا۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا جواب

اب اسلام کے عظیم فرزند کا جواب سنیں!

''یہ خط مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے شہر بزار کے نام لکھا جاتا ہے۔جو تم نے لکھا ہے تم خود بھی وہی ہو۔اس لئے میں اس میں تمہارے لئے برائی اور ہمارے لئے بھلائی ہے، یا تم جھوٹ بول رہے ہو مگر یاد رکھو کہ اگر بادشاہ جھوٹا ہوتا ہے تو وہ زیادہ سزا کا حق دار ہوتا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے۔تمہارے خط سے ہم یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ تم ان رذیلوں اور کمینوں سے کام لینے پر مجبور ہو گئے ہو۔لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے تمہارے کبر و مکر کو بکریاں، مرغیاں اور خنزیر پالنے والوں تک پہنچا دیا۔''

طبری کے مطابق اس خط و کتابت نے مدائن کے لوگوں پر بڑا اثر کیا۔خاص کر بادشاہ کے خط نے لوگوں کو بڑا شرمسار کیا۔

تبصرہ

یہ دونوں خط تاریخ کا حصہ ہیں۔بادشاہ کا خط گیدڑ بھبکی ہے اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا جواب ادب کا ایک شہ پارہ ہے۔خط میں پختگی، ثابت قدمی، مومن کی فراست اور اسلامی فلسفہ حیات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں یعنی اسلام نے

ایک عام قبیلہ کے سردار کو بادشاہ کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہت بلند کر دیا لیکن افسوس کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہم نے بھی ایرانی بادشاہ کی طرح گیدڑ بھبھکیوں پر گذارا گیا اور پھر نتیجہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں دیکھ لیا۔

ہرمز کی پیش قدمی

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث چوکنے تھے ایرانی بادشاہ کے خط کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ایرانی فوج پیش قدمی کرے گی۔ ان کو اپنی چوکیوں سے لمحے لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ وہ دشمن کی تاک میں تھے، جیسے ہی ایرانی جنرل ہرمز نے دریائے دجلہ کو ایک لشکر کے ساتھ پار کیا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو خبر مل گئی۔ یہ ایک نیا ہرمز تھا جو کہ پچاس ہزار درہم کی ٹوپی پہنتا تھا اور ہرمز جاذبیہ کہلاتا تھا۔ ایرانی لشکر کی تعداد کے بارے میں مؤرخین کچھ خاموش ہیں اور کچھ بعد کے مؤرخین کا خیال ہے کہ ایرانی لشکر دس ہزار کے قریب تھا۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ ان کے خیال کے مطابق حضرت خالد رضی اللہ عنہ چلے گئے تھے اور اب مسلمان ایک ''تر نوالہ'' تھے لیکن باقی تمام جنگوں کی نفری کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمارا اندازہ ہے کہ ہرمز کے لشکر کی نفری پندرہ ہزار سے زیادہ ہی ہوگی۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو جیسے یہ خبر ملی آپ نے حیرہ میں انتظار نہ کیا اور اپنے ساتھ آٹھ ہزار مجاہدین لے کر باطل کو ختم کرنے کے لئے روانہ ہو گئے اور دریائے فرات کو پار کیا۔ نقشہ نمبر کی مدد سے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اور ہرمز دونوں کی پیش قدمی کا مطالعہ کریں کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے حیرہ سے آگے بڑھ کر بابل کے مقام کے نزدیک ایک ایسی جگہ پر صف بندی اختیار کی جہاں دریائے فرات کا چھوٹا سا معاون دریا گزرتا تھا۔ آپ نے اس چھوٹے دریا کو دفاعی پوزیشن میں استعمال کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو گئے ہوئے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے ہوں گے۔ یہ واقعہ بھی ۱۳ ہجری کے ربیع الثانی کے آخری ایام کا ہے۔

جنگ کی کاروائی

مؤرخین جنگ کی کاروائی کی تفصیل میں نہیں جاتے اور صرف یہ کہتے ہیں کہ بابل کے نزدیکی کنڈ کے پاس شدید لڑائی ہوئی۔ ایرانی فوج میں ایک ہاتھی بھی تھا جس پر حملہ کر کے مسلمانوں نے اس کو مار دیا۔ اہل فارس نے شکست کھائی۔ مسلمانوں نے دشمن کا مدائن تک تعاقب کیا۔ اس شکست کی خبر سن کر شہر بزار کا بھی انتقال ہو گیا۔

ایران میں تخت نشینی کا جھگڑا اور اندرونی خلفشار

اسی زمانے میں مؤرخین ایران کے اندرونی خلفشار اور حکومت کے جھگڑوں کی تفصیل لکھتے ہیں۔ ان کے

مطابق ایک سال کے اندر اندر ایک مرد بادشاہ سابور یا صبور اور دو عورتیں تخت پر بیٹھیں اور آخر میں ملک کا بادشاہ یزدجرد بن گیا اور رستم وزیر جنگ کی حیثیت سے کرتا دھرتا ہوگیا۔ عورتوں میں سے آزرمیدخت بڑی خوبصورت تھی اور ہر شہزادہ یا جرنیل اس کے ساتھ شادی کا خواہاں تھا۔ اس شادی کی خواہشات اس وقت ظاہر کی گئیں جب وہ تخت پر بیٹھی۔ شہنشاہ صبور نے اس کی شادی جنرل فرخ زاد سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مؤرخین میں اس سلسلہ میں اختلاف ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ آزرمیدخت نے فرخ زاد کو مدائن بلا کر دھوکے سے مروا دیا۔ کیونکہ فرخ زاد بوڑھا آدمی تھا اور شہزادی کو بات پسند نہ آئی تھی۔ فرخ زاد کا بیٹا رستم جو خراسان میں باپ کا نائب تھا، اس نے دارالحکومت پر حملہ کر کے آزرمیدخت کو مروا دیا اور یزدجرد کو کہیں سے ڈھونڈ نکالا اور اس کو تخت پر بٹھا دیا اور خود وزیر جنگ بن گیا۔ یہ سب جھگڑے جنگ بابل کے بعد ہی تھوڑے عرصہ میں ظہور پذیر ہو گئے۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی مدینہ کو روانگی

اب اندازہ لگائیں کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا کہ ایرانیوں میں خلفشار ہے اور آرام سے بیٹھ جائے کہ جو کچھ حاصل ہو گیا اسی پر مزے سے حکومت کرتا یا ایرانیوں کی کمزوری اور خلفشار کو دیکھ کر اپنے آپ کو ایرانیوں کے ساتھ جنگوں میں اُلجھا بیٹھتا لیکن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو بقول علامہ اقبال، اللہ تعالیٰ نے ''دل بینا'' عطا کیا ہوا تھا اور مومن کی فراست آپ کے حصہ میں کافی زیادہ آئی ہوئی تھی۔ جس بارے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے کہ ''مومن کی فراست سے ڈرتے رہو کہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔'' تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھی اللہ کے نور سے دیکھتے تھے اور وہ واقعات کو بھانپ گئے کہ ایران کا بجھتا ہوا چراغ اب آخری روشنی دے رہا تھا لیکن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی تو دس ہزار فوج ایران کے ان علاقوں میں کسی ایک مقام کی حفاظت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے لشکر کی کمانڈ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ بن الخصاصہ کو سونپ دی۔ آپ عظیم صحابی تھے اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ خود مدینہ روانہ ہو گئے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ انتھک مجاہد تھے وہ بڑے سے بڑا لشکر تیار کرنا چاہتے تھے اور ان نومسلم کو بھی لشکر اسلام میں داخل کرنے کے حق میں تھے جو توبہ کر چکے تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو مجاہدین میں شمولیت پر پابندی لگا رکھی تھی۔ گو معافی سب کو مل گئی تھی یعنی ان کا امتحان اس وقت تک پورا نہ ہوا تھا۔ یہ نکتہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ اسلام لاؤ لشکر تیار کرنے اور ان کی مدد سے دنیا کو تہس نہس کرنے کے حق میں نہیں اور نہ ''کرایہ کے سپاہی'' کی اسلام میں گنجائش ہے۔ اسلام میں اوّل ضرورت یہ ہے کہ انسان خود اسلامی فلسفۂ حیات پر عمل کر رہا ہو تو وہ تب ہی جہاد میں شرکت کر سکتا ہے اور جب تک آدمی اس معیار پر پورا نہیں اُترتا، اس کو مجاہدین میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ فیلڈ مارشل دیول کے لحاظ سے سپاہی چور ہے، ڈاکو ہے اور رہزن

ہے لیکن اسلام اس تصور کو غیر اسلامی کہتا ہے، یہاں ہر مجاہد کا کردار بلند ترین ہونا چاہیے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیماری

جب حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو خلیفہ اوّل بیمار تھے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو دوسری بار یارِ غار رضی اللہ عنہ کی زیارت ضرور نصیب ہوئی لیکن یارِ غار اب اللہ کے حبیب کے پہلو میں جلد آرام فرمانے والے تھے۔ خلیفہ اوّل کی دوررس نگاہیں سب کچھ دیکھ چکی تھیں۔ وہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد فرما چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرائی اور یہ احکام صادر فرمائے:

''اے ابن خطاب رضی اللہ عنہ! میں جو کچھ کہتا ہوں، اس کو غور سے سنو۔ پھر اس پر عمل بھی کرنا۔ آج دوشنبہ کا دن ہے میں توقع کرتا ہوں کہ میں آج ہی انتقال کر جاؤں گا۔ اگر میں انتقال کر جاؤں تو شام ہونے سے پہلے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے کر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دینا۔ میری موت کی مصیبت خواہ کتنی ہی عظیم ہو۔ تم دین کے احکام اور اوامر خداوندی کی تعمیل میں ہرگز تاخیر نہ کرنا۔ تم نے دیکھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت میں نے کیا کیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک عظیم ترین حادثہ تھا۔ اگر میں اس وقت خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل میں ذرہ بھر بھی تاخیر کرتا تو خدا ہم کو ذلیل کرتا ہم کو سزا دیتا وغیرہ۔

تبصرہ

قارئین! خلیفہ اوّل کے الفاظ کو دوبار تین بار پڑھیں، گہرائیوں میں غوطہ لگائیں۔ پھر بھی ان الفاظ کو کسی معنی میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے معانی رہتے زمانے تک نکلتے رہیں گے اور وہ لوگ جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بھیجنے پر معترض ہیں کہ حکمت عملی یہ تھی اور وہ تھی۔ ان کا جواب حضرت خلیفہ اوّل خود دے رہے ہیں اور ہم نے جان بوجھ کر اس چیز کو اپنے تجزیہ میں شامل نہ کیا اور سبق یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی ہمیں ذلیل کرتی ہے۔ جہاد کو اوّلین حیثیت حاصل ہے، اور جہاد سے گریز غلامی کا طوق گلے میں ڈالتا ہے۔

آج حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہی حالات سے دوچار تھے جن حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تھے۔ آج اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کی جگہ مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث تھے اور عراق کی زمین اللہ والوں کو دعوت دے رہی تھی کہ آؤ ادھر اللہ اور رسول کا نام بلند کرو۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی سعادت

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بھی دینا تھی کہ یارِ غار کے جنازے اور تدفین میں شرکت کریں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں شرکت کرنے والوں پر جو رحمت کی بارش برسی ہوگی اس کو مؤرخین نے بیان نہیں کیا اور یہی بات باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے ہے۔ یہ شاید اللہ کا راز ہے، ہم اس سلسلہ میں صرف تصور کر سکتے ہیں کہ چند ایسے لوگوں کے ساتھ ملاقات ہوئی جنہوں نے قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ ٥، علامہ اقبال ٥، غازی علم الدین شہید ٥ اور غازی مرید حسین شہید ٥ کے جنازوں میں شرکت کی اور کچھ کے اس سلسلہ میں تاثرات بھی پڑھے۔ اگر بیسویں صدی میں اللہ کی رحمت اتنی ہوتی ہے تو حضور پاک ﷺ کے رفقاء کے زمانے میں جو رحمت برستی تھی اس کو برداشت کرنے والے بھی اسی زمانے کے ہی لوگ تھے۔

اسلام کے اس عظیم فرزند حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہ آخری ملاقات تھی، اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ از خود اپنے بستر مرگ پر آئندہ کے طریق کار کے لئے وصیتیں فرما رہے تھے کہ ایران کی فتح کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے اور یہ ہے مسلمان کا فلسفہ حیات کہ وہ سب کچھ اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے کرتا ہے اس کا مرنا اور جینا اللہ ہی کے لئے ہے، وہ مرتے وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی بات کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانشینی ایک الگ باب کا مضمون ہے۔ لیکن چونکہ دوسری کتاب میں فتوحات شام کے سلسلہ میں خلیفہ اول کی حکمت عملی کا بیان باقی ہے اور ادھر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتوحات ہوئیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ اس اہم مضمون کو دوسری کتاب کے پانچویں باب میں بیان کیا جائے کہ حالات کا مکمل تجزیہ پیش ہو سکے، فی الحال طبقات ابن سعد کے حوالے سے حضور پاک ﷺ کے دونوں رفقاء کے بارے میں صرف اتنا لکھا جاتا ہے کہ جو سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے آپ دونوں کے بارے میں فرمایا:

"وہ دونوں ہدایت کے امام، راستہ پانے والے، راستہ بتانے والے اصلاح کرنے والے اور کامیابی حاصل کرنے والے تھے، جو دنیا سے اس طرح گئے کہ شکم سیر نہ تھے۔"

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے احکام کی تعمیل

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے ہی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے لئے فوج کی بھرتی شروع کر دی۔ مؤرخین نے کافی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ان خطبات کا بھی ذکر کیا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے دیئے۔ مؤرخین نے البتہ یہ تاثر بھی دیا ہے کہ صرف چند لوگ جہاد کے لئے تیار ہوئے وغیرہ۔ یہ سب ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ آخر مدینہ میں کتنے لوگ موجود ہوں گے عراق کی مہم میں بھی لوگ گئے ہوئے تھے۔ چار

لشکر شام میں جہاد میں مصروف تھے۔ پانچواں لشکر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا بھی ادھر پہنچ چکا تھا اور پہلے جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اوّل سے کمک کی درخواست کی تھی تو خلیفہ اوّل نے اکیلے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، خطبات کا مطلب یہ تھا کہ ان کو مسافر، کارواں والے اور آنے جانے والے لوگ اور دوسرے قبائل تک جان لیں کہ فلاں جگہ جہاد میں شرکت کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں کو احکام دیئے جاتے تھے کہ اطراف میں پھیل جائیں اور افواج بھرتی کریں۔ اس زمانے میں مرتدین پر پابندی بھی تھی۔ خلیفہ اوّل نے وفات سے پہلے یہ پابندی ختم نہ کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پابندی جلدی ختم نہ کر سکتے تھے۔ بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اس قسم کے احکام دے دیئے گئے کہ ہر آدمی کا معاملہ چھان بین کر کے صحیح لوگوں کو جہاد میں شرکت کی اجازت دے دی جائے۔ گو مؤرخین اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ لیکن اگلے ابواب میں مشہور مرتدین سے توبہ کرنے والے چونکہ محاذوں پر پہنچ گئے۔ اس لئے اس قسم کی رائے پیش کی جا رہی ہے۔

حضرت ابو عبید ثقفی رضی اللہ عنہ

عراق کی سپہ سالاری کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ بن مسعود کو نامزد فرمایا جن کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا۔ اکثر اہل قلم آپ کو اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح امین الامت کی ایک شخصیت سمجھ کر کئی دفعہ واقعات کو غلط رنگ دے دیتے ہیں۔ حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی طرح کوئی زیادہ مشہور نہ تھے بلکہ آپ نوعمر تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے آخری سالوں میں ایمان لائے تھے۔ آپ کے قبیلہ سے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو آپ کے رشتہ دار تھے۔ آپ سے بہت پہلے ایمان لے آئے۔ آپ کے بڑے بھائی عروہ بن مسعود[1] صلح حدیبیہ کے وقت تک قریش مکہ کے ترجمان تھے اور ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ آپ بھی فتح مکہ کے بعد ایمان لے آئے اور شاید ابو عبید رضی اللہ عنہ نے بھی باقی خاندان کے ساتھ اس زمانے میں اسلام قبول کیا ہوگا تو تاریخی طور پر صحیح دن کہیں سے نہیں مل سکا۔ آپ کے جوش جہاد اور خاندانی عظمت کی وجہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ عزت بخشی۔ آپ کے ساتھ مشیر کے طور پر دو عظیم صحابہ مقرر کئے گئے یہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن عبید اور سلیط رضی اللہ عنہ بن قیس تھے جو اوّلین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نصیحت فرمائی کہ ان صحابہ کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جلدی میں تھے اور ضروری ہدایات اور کارروائی کے بعد محاذ جنگ پر روانہ ہو گئے۔ پرانے زمانے کی کسی تاریخ میں اس چیز کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری کی کوئی خواہش تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنانے سے اُن کو مایوسی ہوئی وغیرہ۔ اس زمانے میں کچھ مبصرین نے ایسے تجزیئے کیے ہیں لیکن ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ

(۱) جلال مصطفیٰ کے صفحہ ۱۶۹ اور ۲۸۱ سے استفادہ کریں۔

حضرت مثنیٰ ؓ ان باتوں سے بلند تھے۔

حضرت ابوعبید ثقفی ؓ اور اُن کے ساتھیوں نے قبائل کو جہاد کی ترغیب دینا تھی اور اس وجہ سے وہ مختلف مقامات پر ٹھہرتے گئے اور مجاہدین کو بھرتی کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ عراق کے محاذ پر آگے بڑھتے گئے۔

نتائج واسباق اور خلاصہ

۱۔ ایران کی فتوحات کے سلسلہ کا یہ ابتدائی باب ہے لیکن واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ حضرت خالد ؓ کی شام کی طرف روانگی، حضرت مثنیٰ ؓ کی سپہ سالاری، جنگ بابل، ایران میں حکومت میں تبدیلیاں اور نئی سوچ بچار، حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی وفات، حضرت عمر ؓ کی خلافت اور حضرت ابوعبید ؓ کی عراق کی سپہ سالاری تمام بڑے بڑے واقعات ہیں جو بہت تھوڑے عرصے میں ظہور پذیر ہوئے۔ لیکن جس قوم کا مقصودِ زندگی واضح ہو اس قوم پر یہ واقعات خراب اثر نہیں کرتے۔

۲۔ واقعات کے نتائج ساتھ بیان کر دیئے گئے کہ حضرت مثنیٰ ؓ نے بابل کی جنگ میں ضرور فتح حاصل کر لی، لیکن ایران کی بڑھتی ہوئی طاقت کا بروقت سدِّ باب ضروری تھا۔ حضرت ابوبکر ؓ کے بَروقت احکام، حضرت عمر ؓ کا فوری عمل اور حضرت مثنیٰ ؓ کی وقت کی اور جنگ کی نبض شناسی میں ہمارے لیے بڑے سبق ہیں۔

۳۔ اسی زمانے میں شام کے محاذ پر مسلمانوں کو اجنادین کے مقام پر ایک بڑی فتح نصیب ہوئی اور وہ وادیٔ یرموک میں دوبارہ پہنچ گئے۔ اب حضرت عمر فاروق ؓ نے دو محاذوں کی حکمت عملی کے تانے بانے کیسے ملائے، اس سلسلہ میں ایران والے محاذ کا خلاصہ بیان ہو چکا ہے۔ باقی باتیں بھی آگے اس کتاب اور دوسری کتاب میں آئیں گی۔

اٹھارھواں باب

حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ کی ایرانیوں کے ساتھ جنگیں

حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ کی محاذ جنگ کی طرف روانگی

حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ مدینہ کے گردونواح سے کوئی ایک ہزار کے قریب مجاہدین اکٹھے کر سکے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ان کے مشیروں سمیت مدینہ سے روانہ کیا اور فرمایا: ''اے ابوعبید رضی اللہ عنہ! صحابہ رسول کا احترام برقرار رکھنا اور ان سے ہر حکم کے سلسلہ میں مشورہ کرنا جب تک حالات کو خوب بھانپ نہیں لیتے جلد بازی میں کوئی کاروائی نہ کرنا۔ جنگ، جنگ ہے اور اس سے فائدہ وہ لوگ اُٹھاتے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور مواقع سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی یہ سمجھتے ہیں کہ کب تک حالات کا انتظار کیا جائے اور کب کاروائی کی جائے، جنگ میں جلد بازی سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔''

اس کے بعد حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ مدینہ سے چل پڑے اور راستہ میں قبائل کو جہاد کی ترغیب دی اس طرح چار ہزار مجاہدین اور شامل ہو گئے۔ آپ شعبان تیرہ ہجری میں خفان[1] پہنچ گئے۔ یہ مقام اُلیس اور حیرہ کے نزدیک ہی ہے۔ حضرت مثنی رضی اللہ عنہ اپنی کم نفری کی وجہ سے اس مقام پر دفاع کئے ہوئے تھے اور حضرت ابوعبید نے ادھر ہی آپ سے کمانڈ سنبھال لی۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے کہ چار پانچ ہزار کی کمک آ گئی تھی۔

محاذِ جنگ کے حالات

پچھلے باب میں ایران کی حکومت کے بارے جو ذکر ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت تک یزدجرد تخت نشین ہو چکا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ تخت نشین ہونے والا تھا، رستم پردہ پر نمودار ہو چکا تھا اور دراصل وزیر جنگ کی حیثیت سے وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا اور تخت کے کٹھ پتلی وارثوں کا خاتمہ ہونے والا تھا اور رستم قومی وحدت

(۱) نقشہ نمبر دیکھیں۔

کے لئے ایرانی بادشاہت کو سنبھالا دینا چاہتا تھا۔ وہ جلد یزدجرد کو بھی لے آیا لیکن اس دوران اس نے ملکی حالات کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کی نفری اور طاقت بہت کم تھی۔ ایرانی صرف ردعمل کے طور پر مسلمانوں کے ساز پر ناچتے رہے اور اسلامی لشکر نے الگ الگ مقامات پر ایرانی فوج کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ مسلمان سپہ سالاروں کی تبدیلی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے رستم نے ایسی حکمت عملی کا تعین کیا کہ وہ مسلمانوں سے پہل کاری چھین لے اور اپنے لشکروں سے اس طرح پیش قدمی یا حملے کرائے کہ مسلمان ردعمل کے طور پر لڑائی لڑیں۔ جس سے یا تو مسلمان شکست کھا جائیں گے یا ان کا نقصان اتنا زیادہ ہوگا کہ وہ بری طرح تھک جائیں گے اور جنگ کو جاری نہ رکھ سکیں گے۔ جنگ کے اصولوں کے لحاظ سے یہ طریق کار ہی بہترین ہے کہ ایسے طریقے اختیار کیے جائیں کہ دشمن کی سب کاروائیاں ردعمل کے طور پر ہوں۔

تبصرہ

یہاں ایک تبصرہ ضروری ہے۔ یہ اصول خالی جنگ تک محدود نہیں بلکہ ہر ملک اور قوم کی حکمت عملی کے لیے بھی سنہری اصول ہے۔ خلیفہ اوّل اور بعد میں خلیفہ دوم نے اسی اصول کے تحت حکمت عملی کا تعین کیا۔ انہوں نے دشمنوں سے پہل کاری چھین کر دشمن سے تمام کام ردعمل کے طور پر کروائے اور تدبیرات کی سطح پر بھی اہل لشکر کو احکام دیئے کہ اس اصول کو اپنایا جائے۔

رستم کی حکمت عملی

رستم نے تین لشکر مقرر کئے اور ان تینوں کو الگ الگ مقاصد سونپے۔ رستم ان مقاصد کے تحت پہلے مرحلہ میں مسلمانوں کو سواد کے علاقہ سے نکالنا چاہتا تھا۔ گو مسلمانوں کا اس علاقے پر مکمل قبضہ نہ تھا اور جگہ جگہ ان کی فوجی چوکیاں تھیں اور کچھ علاقہ عملداری میں تھا۔ نقشہ نمبر اس علاقے کا نقشہ ہے اور سواد کا علاقہ موجودہ بصرہ سے لے کر اوپر مدائن تک دونوں دریاؤں کے درمیان اور اسکے ساتھ کا زرخیز علاقہ ہے۔ مدائن سے اوپر کے کچھ علاقے بھی اس میں شامل ہیں اور بہتر ہے کہ ہم یہ کہہ لیں کہ دجلہ اور فرات کے طاس سے رستم مسلمانوں کو نکالنا چاہتا تھا۔ رستم نے اس کاروائی کو مکمل کرنے کے لیے جو تین لشکر تیار کئے ان کی تعداد کے بارے مؤرخین خاموش ہیں بلکہ رستم نے ایک چوتھے لشکر کو تیار رکھنے کے احکام بھی دیئے۔ خیال ہے کہ یہ لشکر پندرہ سے بیس ہزار کے درمیان ہوگا کہ اس سے کم نفری کے ساتھ کوئی ایرانی مدائن سے باہر نکل کر مسلمانوں کے خلاف کسی جارحانہ کاروائی کے بارے کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی کاروائی

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جیسے واپس پہنچے اُن کو تمام حالات سے آگاہی ہوگئی۔ انہوں نے آگے والی چوکیوں کی تعداد کو پہلے سے بہت کم کر دیا اور واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے زیادہ فوج کو فرات کے مغرب میں رکھا۔ اگلے علاقہ میں مخبر تھے یا صرف ایسی جگہ چوکی رکھی جہاں پر لوگ وفادار تھے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے حالات کو بروقت بھانپ لینے کا بڑا ملکہ عطا کیا تھا۔ ذاتی چھاپے مارنے میں وہ اپنا مقام نہ رکھتے تھے کہ دشمن کو ہمیشہ بے خبری میں جا لیتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ کی تلوار سے بھی بہ ، کچھ سیکھ چکے تھے۔ اس لئے لڑائی یا جنگی حالات کی نبض شناسی میں وہ بہت ماہر ہو چکے تھے۔ حیرہ کے مقام پر عقب میں کھلا ریگستان موجود نہ تھا بلکہ وہاں پر دریا کا ایک فالتو بہاؤ تھا۔ کچھ نہریں تھیں جو ان کو متحرک ہونے سے روکتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے خفان کے مقام کو چنا اور حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے ان سے ادھر ہی آ کر کمانڈ سنبھالی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

جنگِ نمارق

ایرانیوں کا پہلا لشکر مدائن سے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے نکلا اور دریائے فرات کو پار کر کے نمارق کے مقام پر ٹھہر گیا۔ یہ مقام بھی کوفہ کے نزدیک ہی ہے۔ اس لشکر کا ایرانی کمانڈر جابان تھا جو الیس کی جنگ سے بھاگ گیا تھا اور ایرانیوں کو کھانے میں زہر ملا دینے کی صلاح دی تھی۔ جابان مسلمانوں کے ہاتھ دیکھ چکا تھا اور ذہنی شکست کھائے ہوئے تھا۔ اگر کسی مبصر کی کتاب میں اس شخص کی بہادری کا کوئی قصہ پڑھیں تو اس پر یقین نہیں کرنا چاہے، جابان کو نمارق سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ جوشِ جہاد میں آرام نہ کر رہے تھے اور وہ خفان میں نہ ٹھہر سکے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر صف بندی کی اور دشمن کو نمارق میں جا لیا۔ مسلمانوں کے میمنے پر حضرت واثق رضی اللہ عنہ بن جیدرہ تھے اور میسرہ پر عمرو رضی اللہ عنہ بن الہیثم۔ مجبوراً جابان کو بھی صف بندی کرنا پڑی جس کے بازوؤں پر جشنس ماہ اور مروانشاہ تھے۔ مسلمانوں نے زوردار حملہ کیا اور ایرانیوں کے قدم اُکھڑ گئے، وہ ذہنی شکست کھائے ہوئے تھے۔ جابان اور مروانشاہ گرفتار ہوئے۔ مروانشاہ کا تو سر قلم کر دیا گیا۔ جابان کی عمر کو دیکھ کر اس کو گرفتار کرنے والے مجاہد مطہر بن فضہ کو ترس آ گیا اور انہوں نے اس کو امان دے دی۔

بعد میں جب جابان کی پہچان ہوگئی تو باقی مجاہدین اُس کا سر قلم کرنا چاہتے تھے لیکن معاملہ حضرت سالارِ لشکر ابوعبید رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے وعدے کا پاس ضروری ہے اس لئے جابان کو چھوڑ دیا گیا اور وہ فرار ہو گیا۔

دوسرا ایرانی لشکر اور کسکر کی لڑائی

جابان کا لشکر بھاگنے میں بڑا تیز نکلا اور کافی لوگ بچ کر کسکر(۱) (موجودہ واسط) کی طرف بھاگ گئے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے رسالہ نے اُن کا دور دور تک تعاقب کیا۔ لیکن جابان کے لشکر کے کافی لوگ بھاگ کر واسط پہنچ گئے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ واسط میں کسریٰ کا خالہ زاد بھائی نرسی رہتا تھا اور یہ ان کی خاندانی جاگیر تھی۔ اس علاقہ میں عمدہ قسم کے پھل پیدا ہوتے تھے۔ جس کا پھل صرف نرسی اور اس کے خاندان کے لوگوں کے لئے تھا جس میں سے کچھ وہ کسریٰ اور باقی امراء کو تحفہ کے طور پر دیتے تھے۔

رستم نے نرسی کو حالات سے آگاہ کیا کہ سلطنت کو بچانے کے لئے وہ ایک لشکر تیار کریں اور یہ دوسرا لشکر تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ نرسی امیر آدمی تھا اور زیادہ دولت کے لالچ کے ساتھ وہ لشکر تیار کرنے میں مصروف تھا کہ جابان کے لشکر کے بھگوڑے بھی وہاں پہنچنے شروع ہو گئے۔ اس لئے حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ وہ واپس نہ آئیں اور اُن کا انتظار کریں۔ اس کے بعد حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے فرات کو عبور کر کے پہلے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور پھر سارا اسلامی لشکر واسط کی طرف روانہ ہو گیا۔

نرسی نے اسلامی لشکر کی یلغار کی خبر سنی تو اپنے لشکر کی صف بندی کی اور بازوؤں پر اپنے ماموں زاد بھائیوں بندویہ اور تیرویہ کو مقرر کیا۔ یہ دونوں بادشاہ کے بھی ماموں زاد بھائی تھے اور پہلی دفعہ مسلمانوں کا واسطہ ایسے لشکر کے ساتھ تھا۔ جس کی کمانڈ شاہی خاندان کے افسروں کے ہاتھ میں تھی اور واسط سے ذرا ہٹ کر مقاطیہ کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کے بازوؤں پر جابان کے ساتھ جنگ کے وقت کی طرح حضرت واثق رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ مسلمانوں کے بھرپور حملہ کی ایرانی تاب نہ لا سکے اور تتر بتر ہو گئے۔ مسلمانوں کو کافی مال و دولت و مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہوا جس میں خشک پھل بھی تھا جو مدینہ بھیجا گیا۔ ویسے نرسی کے باغوں کے پھل پہلی دفعہ عام آدمیوں کو کھانے کے لیے ملے۔

حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کا واسط میں قیام کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور انہوں نے صرف دشمن کو تتر بتر کرنا تھا اور یہ ایک حربی مظاہرہ بھی تھا۔ حضرت وافق رضی اللہ عنہ کو الزوابی کی طرف بھیجا اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو نہر جوبر کی طرف۔ انہوں نے ان علاقہ کے لوگوں کو مطیع کیا۔ حیرہ کے نزدیک سے باروسما کے علاقے سے بھی کافی لوگ نرسی کی مدد کے لئے گئے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایرانی فوج مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی تو انہوں نے مسلمانوں سے پہلے ہی حیرہ اور باروسما کی طرف واپسی شروع کر دی اس لئے حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے پیچھے بھیجا کہ ان پر نظر رکھیں۔

جالینوس کی شکست

(۱) نقشہ نمبر سے استفادہ کریں۔

لیکن اس تعاقب سے ایک اور راز ظاہر ہوا۔ مدائن میں تیسرا لشکر جالینوس کا تیار ہو رہا تھا۔ رستم نے اس لشکر کو نرسی کی امداد کے لئے بھیجا تھا کہ مسلمانوں کو راستے میں روکے لیکن جالینوس دیر سے پہنچا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ مسلمان لشکر کا پیچھا کرتا، اس نے حیرہ کا رُخ کیا اور باروسما کے ضلع میں باقسیا کے مقام پر ایک چھاؤ لگا کر بیٹھ گیا حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر مل گئی اور انہوں نے حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی۔ سالار لشکر نے تمام افواج کو اکٹھا کیا اور واپس حیرہ کا رُخ کیا۔ راستے میں جالینوس پر حملہ کیا۔ جالینوس جس تیزی سے آیا تھا اس تیزی کے ساتھ واپس بھاگ گیا۔ مؤرخین نے اس جنگ کو بہت سرسری طور پر بیان کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ جالینوس اپنی فوج کے کافی حصہ کو بچا کر واپس لے گیا۔ بہرحال حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ اور اسلامی لشکر کی دھاک بیٹھ گئی۔ اتنے سے قلیل عرصہ میں حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ تین فتوحات حاصل کر چکے تھے۔

مسلمانوں کی دعوت

مسلمانوں کے اس دبدبہ کے بعد وہ جہاں جاتے تھے تو عرب قبائل ان کی دعوت کرتے تھے اور طرح طرح کے کھانے پیش کرتے تھے۔ مؤرخین نے اس سلسلہ میں کافی تفصیل باتیں لکھی ہیں جس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ پورے لشکر کو ایک جیسا کھانا پیش کیا جاتا تھا جیسے آج کل ہمارے ہاں فوجی مل کر ''بڑا کھانا'' پکاتے ہیں۔ بے شک اسلام سخت امارت کا قائل ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ دو میں بھی ایک کو امیر مقرر کرلو لیکن معاشرتی طور پر برابری کے احکام ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط

حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کو کامیابیاں تو بہت نصیب ہوئیں لیکن وہ لشکر والوں سے کچھ زیادہ ہی مشقت لے رہے تھے۔ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ جوش جہاد سے سرشار تھے بلکہ شوق شہادت کا خمار بھی بہت پہلے آ گیا تھا اور بعض کے حصہ میں یہ عطا زیادہ عرصہ کے لیے ہوتی ہے۔ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا اور وہ سب مسلمانوں سے یہی امید رکھتے تھے۔ بات تو ٹھیک تھی لیکن اسلام اس کے ساتھ ساتھ حفاظت کے پہلو پر بھی زور دیتا ہے اور جلد بازی سے بھی منع کرتا ہے۔ خلیفہ دوم مدینہ میں بیٹھے ہوئے حالات کو بھانپ چکے تھے اور ان کا مشاہدہ سو فی صد درست تھا۔ اس لئے انہوں نے حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون اس طرح کا تھا:

''آپ مکر و فریب، خیانت اور ظلم کی سرزمین میں ہیں۔ تمہارا واسطہ ایسی قوم کے ساتھ ہے جس میں بدی کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے اور بدی اُن کی گھٹی میں داخل ہو گئی ہے۔ اور یہ قوم بھلائی کو بھول بیٹھی ہے۔ اس لئے تم بہت چوکنے رہنا اور اپنی زبان کو محفوظ رکھنا۔ اپنا راز ہرگز آشکارا نہ کرنا کیونکہ راز داری برتنے والا شخص جب تک راز کو

محفوظ رکھتا ہے گویا وہ قلعے میں محفوظ ہے۔ اسے کوئی ناگوار صورت پیش نہیں آسکتی اور جب اس کو وہ ضائع کر دیتا ہے تو وہ خطرے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔"

تبصرہ

اوّل تو ہم قارئین کو یہ باور کرائیں گے کہ باطل فلسفوں اور تمدنوں کے بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ان میں ہمیں کوئی چیز اچھی نظر نہیں آتی اور ہم تاریخ کے بامقصد مطالعہ میں جگہ جگہ قارئین کی توجہ اس نکتہ کی طرف دلاتے رہے ہیں اور ثبوت پیش کرتے رہے ہیں کہ باطل، باطل ہے وہاں کوئی برائی والی بات نہیں۔ شیطان بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہے لیکن یہ سبق ہم اس کی زبان یا طریق کار سے کبھی نہیں سیکھتے اور نہ اس سلسلہ میں شیطان کی کبھی بڑائی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدہ میں بڑا مقام رکھتا ہے۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ ہمارے دشمن خواہ یہود ہوں یا ہنود یا اُن کے حواری ہوں یا اسلام دشمن طاقتیں۔ ان پر کبھی بھروسہ نہ کیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط کے مطابق اپنی رازداری کو قائم رکھیں۔

جسر کی جنگ۔ رمضان تیرہ ہجری

جسر کی جنگ جس کو دریا کی جنگ یا جنگ فیل بھی کہتے ہیں۔ اس میں ہاتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کو سخت واسطہ پڑا، یہ اسلام کی عسکری تاریخ کی ایک عظیم جنگ ہے۔ اس سے پہلے اس کے جائزے بڑے نامکمل ہیں[1] اور صحیح واقعات کی چھان بین کے لئے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ فوری نتائج اور اثرات کچھ مایوس کن یا خطرناک تھے لیکن حتمی نتائج اور اثرات ایسے تھے کہ انہوں نے میدان جنگ کا پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیا کیونکہ مسلمانوں نے شکست نہ کھائی تھی اور انہوں نے حالات کا مقابلہ کر کے بہتر حکمت عملی اور بہتر تدبیرات سے ایران کو فتح کر لیا۔ مانا کہ فوری طور پر حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے عسکری لحاظ سے کچھ اچھی حکمت عملی اور تدبیرات یا حربی دانائی کا ثبوت پیش نہ کیا اور نہ ہی اُن کا کوئی ایسا دعویٰ تھا لیکن اسلامی جذبے اور فلسفۂ حیات کا یہ ایک پُرعزم مظاہرہ تھا، جس کے تجزیہ سے خاص سبق حاصل ہوئے ہیں مؤرخین نے اس سلسلہ میں جنگ یا تاریخ کا بامقصد مطالعہ نہیں کیا اور اس ساری کاروائی کو ناکامی اور شکست والی جنگ کے نام سے موسوم کر کے اختتامی تبصرہ کو طول نہ دیا۔ کسی صاحبان نے ایرانی سپہ سالاری کی ہوشیاری کے گن گائے اور کچھ نے حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کی جلد بازی کو مسلمانوں کی شکست کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ کسی نے زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ دیا کہ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ جوش جہاد میں حالات کی صحیح نبض شناسی نہ کر سکے۔

(۱) نقشہ نمبر سے استفادہ کریں۔

اہل حق کا امتحان

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ اہل حق کا امتحان تھا اور اس محاذ پر بھی جنگ[1] موتہ کی طرح ایک واقعہ ہونا تھا اور اس امتحان میں اہل حق کامیاب ہوئے۔ جنگ موتہ میں جو کچھ تین عظیم شہدا نے کیا۔ یہاں پر وہ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ اُن کے خاندان کے چند مجاہدین اور بدری صحابہ حضرت سلیط رضی اللہ عنہ نے کیا اور جنگ موتہ میں جو کچھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کیا۔ جنگ جسر میں وہی کچھ حضرت مثنیٰ نے کیا۔ یہ مشیت ایزدی تھی کہ عظیم قربانی کی ضرورت تھی اور ان قربانیوں کے بڑے اچھے نتائج نکلتے ہیں۔

دین فطرت کی شان نرالی ہے۔ یہاں ملک اور علاقے فتح نہیں کئے جاتے۔ یہاں پر اپنے فلسفۂ حیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اگر اہل حق کو ہر جنگ میں فتح حاصل ہو جاتی یا قربانی نہ دینی پڑتی تو پھر تو سب کچھ آسان ہو جاتا لیکن رب العزت کی حکمت نرالی اور اس تک کوئی نہیں پہنچ پاتا۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں جنگ اُحد، جنگ موتہ اور جنگ حنین میں ایسے واقعات ہوئے کہ بڑی قربانی دینی پڑی۔ پچھلے دو سالوں سے اہل اسلام تمام جنگوں میں فتح ہی فتح حاصل کر رہے تھے۔ صرف حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور شرجیل رضی اللہ عنہ کو کچھ معمولی قسم کی ناکامیاں ہوئی تھیں۔ اسی طرح جنگ یمامہ میں بھی قربانی زیادہ دینی پڑی۔ اس لئے جنگ جسر کا مطالعہ اس پہلو سے بھی اہم ہے کہ کچھ انہونی باتیں بھی جنگ میں ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ فتح ہی فتح کی اُمید پر کاروائی نہ کی جائے بلکہ سب کام اللہ اور رسول کے لئے کیا جائے اور نتائج کے فیصلے کی پرواہ نہ کی جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ ہر کام میں اس کی مصلحت ہی ہوتی ہے۔

ایرانیوں کے حالات

اہل ایران حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ سے تو کئی شکستیں کھا چکے تھے لیکن اب ابوعبید رضی اللہ عنہ بھی اُن کے تین لشکروں کو شکست دے چکے تھے۔ ہم باطل کی کسی عظمت کے قائل نہیں اور جو لوگ پرانی ایرانی عظمت کے گڑے مردے اُکھیڑ کر ایرانیوں کو اس سطح تک لے آئے ہیں کہ مسلمانوں کا مقابلہ ایرانیوں نے زیادہ بہتر کیا اور وہ رومیوں سے زیادہ اچھے لڑے اور ایسے جائزوں کے ساتھ اپنی کتابوں کے صفحات بھر دیئے ہیں۔ ہم اُن سے کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہمارے لحاظ سے اہل ایران خوش قسمت تھے کہ اُن کے ملک پر جلدی اسلام کا پرچم بلند ہو گیا۔ اور پھر آگے چل کر اہل ایران نے اسلام کے پرچم تلے اسلام کی خدمت کی۔ رومیوں کے ساتھ جنگ بڑا عرصہ جاری رہی اور کہیں جا کر پندرہویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ فتح ہوا لیکن یہ جنگ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ رومیوں کی اولاد یا جانشین کسی نہ کسی لبادہ میں ہمارے ساتھ برسرِ پیکار رہے۔ اہل ایران نے مسلمانوں کا سخت مقابلہ کیا جو کچھ ہوا وہ اس کتاب میں موجود ہے لیکن بہتر ہوگا کہ مسلمانوں اور ایرانیوں کی حربی خوبیوں کا موازنہ اپنے عظیم مجاہد حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث

(۱) تفصیل کے لئے جلالِ مصطفےٰ کے پانچویں باب سے استفادہ کریں۔

کے الفاظ میں سن لیں۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا تجزیہ

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے اسلام سے بھی پہلے ایرانی فوج کے ساتھ کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ اس زمانے میں دس ایرانی ایک سو عرب جوانوں پر غالب آجاتے تھے اور جب مسلمان ہو گئے تو یہی سو عرب جوان ایک ہزار ایرانی جوانوں پر غالب آنے لگے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمان ہونے کے بعد ہماری طاقتوں میں سو گنا اضافہ کر دیا۔ اس حساب کے آسان سوال کو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے عملی تجربہ سے حل کر دیا ہے۔ ورنہ اگر سیدھے لفظوں میں کہا جائے کہ مسلمان ہونے کے بعد آدمی کی طاقت سو گنا بڑھ جاتی ہے تو کوئی مبصر نہ مانے گا۔ لیکن یہاں پر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا تجزیہ سامنے ہے۔

اسلام سے پہلے ایک ایرانی دس عربوں پر غالب تھا۔ اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورۃ انفال میں واضح کر دیا کہ اگر ہوں تم میں سے بیس تو غالب آؤ گے دو سو پر۔ ''میرا یہ ایمان ہے کہ یہ ہر زمانے کے لئے ہے اور ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

بہمن جاذویہ

جسر کی جنگ کا ایرانی سپہ سالار بہمن جاذویہ تھا جس کا ذکر اُلیس کی جنگ کے سلسلہ میں ہو چکا ہے کہ جابان کو آگے بھیج دیا اور خود کترا کر دارالخلافہ کی طرف چلا گیا۔ بہانہ صحیح تھا یا غلط۔ بہر حال بہمن ایران کا ایک مانا ہوا جرنیل تھا اور ایک لاکھ درہم کی ٹوپی پہنتا تھا۔ تین لشکروں کی بجائے اب رستم نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور اس کی کمانڈ بہمن جاذویہ کو دی۔ لشکر کی نفری پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی اور کسی ایرانی لشکر کو پہلی دفعہ کسریٰ کا علم دیا گیا جس کو ''درفشِ کاویاں'' کہتے تھے اور اس کو فتح کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ جالینوس کو بھی بہمن کے ساتھ بھیجا گیا اور رستم نے حکم دیا کہ اگر جنگ سے بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ لشکر میں متعدد ہاتھی بھی تھے اور ان کے ہودوں پر کھجور کے درخت باندھ دیئے گئے تھے اس لاؤ لشکر سے مسلمانوں کے لئے ہیبت پیدا کی جا رہی تھی۔

جنگ کے واقعات

بہمن دریائے فرات کے کنارے حیرہ سے تھوڑا اوپر اور جسر کے نزدیک قُس انّ طف کے مقام پر پڑاؤ کئے ہوئے تھا۔ یہ مقام کوفہ کے سامنے دریا کی نچلی طرف ہے، مسلمان لشکر دریائے فرات کے مغربی کنارے مروحہ کے مقام پر پڑاؤ کئے ہوئے تھا۔ مسلمان لشکر کی کل نفری نو ہزار بتائی جاتی ہے لیکن خیال ہے کہ اس سے کچھ زیادہ ہوگی کیونکہ نو ہزار

لشکر حضرت خالد رضی اللہ عنہ، حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس چھوڑ دیئے گئے تھے اور چار ہزار کے قریب حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ آئے۔ مخبری اور چوکیوں کی ذمہ داری پر ہزار دو ہزار کے قریب مجاہد ہوں گے تو پھر بھی باقی لشکر دس ہزار سے اوپر تھا اور بہمن جس کے ماتحت جالینوس جیسے پچاس ہزار ادنیٰ افسر تھے تو ایرانی لشکر کی نفری بھی چالیس ہزار کے قریب ضرور ہو گی ،لیکن حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ جوش جہاد اور شہادت کے نشہ میں ایسے مخمور تھے کہ وہ ایرانیوں کو خاطر میں نہ لا رہے تھے۔

شہادت

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ شہید کی صرف ایک ہی خواہش باقی رہ جاتی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ پھر دنیاوی زندگی عطا فرمائے اور وہ ایک دفعہ پھر اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں جنگ کرے اور اسکو شہادت نصیب ہو اور یہ سلسلہ جاری رہے۔ ہوتا کچھ اس طرح ہے کہ ہر شہید کو شہادت سے کچھ عرصہ پہلے شہادت کی خوشبو آتی ہے۔ کسی کو کچھ دن پہلے اور کسی کو چند گھنٹے یا چند لمحے پہلے۔ اس سے شہید کے اندر ایک ایسا سرور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کا ہر عمل عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے بلکہ ان کی شخصیت میں ایسی تبدیلی آجاتی ہے جس کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتی۔ میدانِ جنگ میں یہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ ابوعبید رضی اللہ عنہ کو نہ صرف اپنے بارے میں شہادت کی خبر مل چکی تھی بلکہ چند اور رشتہ داروں کے بارے میں بھی وہ آگاہ ہو گئے تھے کہ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت دومہ کو اس قسم کا ایک خواب آیا کہ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ اور ان کے فلاں فلاں رشتہ دار کو کوئی جام پلایا جا رہا ہے۔ دراصل یہ جام شہادت تھا۔

حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ داروں کو لشکر کی کمانڈ کے لئے نامزد کیا اور خواب کی تعبیر بھی یہی سمجھی گئی۔ جنگ موتہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کے جن سرداروں کو نامزد کیا وہ شہادت پا گئے تھے یہاں فرق یہ تھا کہ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے اپنے جن رشتہ داروں کو نامزد کیا وہ شہادت پا گئے۔

مسلمانوں کا دریا کو عبور کرنا

ایرانی، مسلمانوں کو دعوت یہ دعوت دے رہے تھے کہ وہ دریا کو پار کریں۔ ایرانی جسر کے نزدیک قُس ان طف کے مقام پر ایک تنگ علاقہ میں صف بندی کیے ہوئے تھے۔ ابوعبید رضی اللہ عنہ کو ایرانیوں کا جب یہ پیغام ملا تو پاس کھڑے تمام امیروں نے عرض کی ''کہ اے سالار دریا کو پار کرنا بڑی خطرناک کاروائی ہے، حکمت عملی، تدبیرات اور حربی خوبیوں کے تمام پہلو زیر بحث آئے اور خاص کر ابوعبید رضی اللہ عنہ کے مشیر حضرت سلیط رضی اللہ عنہ بن قیس جو صحابہ بدر میں سے تھے انہوں نے سخت مخالفت کی۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی زور دیا اور عرض کی کہ وہ جگہ لڑائی کے لئے موزوں نہیں۔ ہمارے اس زمانے کے ایک مبصر لکھتے ہیں کہ'' حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ بہادری میں اپنا مقام نہ رکھتے تھے لیکن حکمت عملی اور تدبیرات

میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔" واللہ اعلم ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ تین جنگوں میں ایرانیوں کو شکست دے چکے تھے اور ایک آدھ دن اور صبر کر جاتے تو ایرانی خود بخود وہ جگہ چھوڑ کر مدائن چلے جاتے اور ابوعبید رضی اللہ عنہ کو حکمت عملی اور تدابیر کا ماہر مانا جاتا۔ یہ مشیت ایزدی ہے اور اللہ تعالیٰ کے راز ہیں۔ ہم کسی اور چیز کی تلاش میں ہیں اور وہ یہ ہے کہ کتنے عظیم تھے وہ مسلمان جوان کے لشکر میں تھے، سب کو نظر آ رہا تھا کہ فوجی لحاظ سے کاروائی صحیح نہیں تھی اور دریا پر ایک غیر جانبدار عرب ابن صلوبا پل بھی بنا رہا ہے اور یہ پل بن گیا تو اسلامی لشکر نے اس پل کو عبور کیا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ ان کے بھائی حضرت سلیط رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابہ، حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو جیسے ماہر فوجی۔ جناب مذعور بن عدی جیسے ماہرین جنگ خاموش تھے اور بسر و چشم اپنے امیر کا حکم مان رہے تھے۔ یہ تھا وہ اسلامی فلسفہ اور اطاعت امیر کہ اپنی رائے ضروری لیکن جب امیر نے فیصلہ کر دیا تو پھر حکم بجالانے کے سوا دوسری بات تک نہ کی۔

میدانِ جنگ

میدانِ جنگ اتنا تنگ تھا اور حکمت عملی اور تدبیرات کا یہی ایک پہلو صحیح نہیں تھا۔ مسلمان خواہ دریا کے اِس پار ہوتے یا اُس پار ہوتے۔ انہوں نے اسی بہادری سے لڑنا تھا۔ ان کی نفری وہی رہنا تھی لیکن تنگ میدانِ جنگ مسلمانوں کے لئے موزوں نہ تھا۔ مسلمانوں کی تمام تر حکمت عملی، تدبیرات اور حربی خوبیوں کا دارومدار اس پر تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ متحرک رہیں اور تنگ میدانِ جنگ میں وہ اپنی مرضی کے مطابق متحرک نہ رہ سکتے تھے۔ ایرانی لشکر کی تعداد مسلمانوں سے اتنی زیادہ تھی کہ ایرانی مسلمانوں کے سامنے ایک جمگھٹ بنے ہوئے تھے۔ ہر مسلمان کا مقابلہ کم از کم چار یا پانچ ایرانیوں کے ساتھ تھا۔ مسلمان تابڑ توڑ حملے کرتے اور ایرانیوں کو واصل جہنم کرتے۔ ان کی صفوں میں شگاف ڈالتے لیکن ایرانی اپنی صفوں کو بحال کر لیتے اور شکست سے بچ جاتے۔ مسلمانوں کا رسالہ بالکل نکما ثابت ہو گیا۔ گھوڑے ہاتھیوں سے بدک جاتے، میدانِ جنگ تنگ تھا۔ گھوڑوں کو کہیں نہ کہیں ہاتھی نظر آ جاتا اگر میدان کھلا ہوتا تو گھوڑوں کو متحرک کر کے ایرانی فوج کے کسی ایسے حصہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا، جہاں ہاتھی نہ ہوتے۔

جب حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ یہ گھوڑے رکاوٹ بن رہے ہیں تو آپ اپنے گھوڑے سے اُتر گئے اور جوشِ جہاد میں آگے بڑھ کر ایک ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی۔ ہاتھی اور اونٹ بڑے کینہ پرور جانور ہوتے ہیں۔ ہاتھی نے آگے بڑھ کر حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ اسلام کے علم اُن کے بھائی الحکم رضی اللہ عنہ نے تھام لیا اور بہادری سے لڑے وہ بھی شہید ہو گئے۔ پھر ان کا بیٹا جبیر رضی اللہ عنہ آگے بڑھا۔ اور اسلام کے علم کو اوپر اُٹھایا لیکن وہ بھی جلدی شہید ہو گئے اور آخر ان کے چچیرے بھائی ابومحجن رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اسی طرح قبیلہ ثقیف کے سات مجاہد شہید ہو گئے تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے لشکر کی امارت اور علم کو سنبھالا۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی بروقت کاروائی

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کو دریا نہ عبور کرنے کی صلاح دی تھی تو حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''کیا بات ہے میرے بنوبکر کے بھائی کہ آج آپ بھی کچھ ڈرے ہوئے ہیں۔'' تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ مسکرا دیئے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فراست عطا کی تھی وہ بھانپ چکے تھے کہ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کس مقام پر کھڑے تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مومن کے یہ مقامات عروج ہی کرتے رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ بھی ہوتی ہے اور تیزی کے ساتھ بھی اور حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کے مقامات ذرا تیزی سے تبدیلی حاصل کرتے گئے۔ بہرحال یہ مقامات والا فلسفہ کچھ مشکل بھی ہے۔ اور دعا یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ نیک کرے کہ کسی اونچے مقام سے کوئی گراوٹ نہ ہو جائے۔

چنانچہ جسر کی جنگ میں بنوثقیف ایک عظیم قربانی دے کر اس مقام سے بھی بلند ہو گئے جو انہوں نے تیزی سے حاصل کیا تھا۔ مسلمانوں نے بڑی بہادری سے حملے کئے تھے۔ ایرانیوں کے کئی دفعہ قدم اُکھڑ گئے تھے اور ان کو شکست ہوتی ہوتی رہ گئی تھی۔ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ اور بنوثقیف کی اس طرح شہادت نے ایرانیوں کو کچھ حوصلہ دے دیا لیکن مسلمان بھی لڑنے مرنے پر تیار تھے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالتے ہی ایک نعرہ لگایا اور وہ شیر کی طرح گرجے اور مسلمان لشکر کی صفوں میں پھر ربط وضبط آ گیا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ میدانِ جنگ تنگ تھا۔ مجاہدین متحرک ہو کر اور پیچھے ہٹ کر ستا بھی نہ سکتے تھے اور جب پیچھے ہٹنے کی جگہ نہ ملتی تھی تو دریا میں کودنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے مسلمان صحرا کو عقب میں رکھ کر لڑتے تھے، صحرا متحرک جنگ میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھانپ گئے کہ اس میدانِ جنگ میں دشمن پر فتح تو ناممکن ہے بلکہ شکست سے بچنا بھی مشکل ہے۔ حالانکہ ایرانیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ چکے تھے اور ان میں بھی لڑنے کی زیادہ سکت نہ تھی۔

پسپائی یا چال؟

چنانچہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں بھائیوں اور بنوبکر کے قبیلہ کو اکٹھا کیا کہ وہ اس کے اردگرد ''آہنی دیوار'' بنائیں اور یہ حکم حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو دیا۔ قبیلہ تمیم ان کے گرد ایک ایسی دیوار بنائے بلکہ حضرت سلیط رضی اللہ عنہ اور مذعور رضی اللہ عنہ کو بھی ادھر ہی بلایا اور تمام بہادر لوگوں کو ملا کر ایک ''بنیان المرصوص'' بنائی جس نے ایرانیوں کو ذرا دور روکا اور آپ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ تمام اہل لشکر پل سے دریا کو پار کر کے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف صف بند ہو جائیں، لشکر کے کچھ لوگ دریا پار پہنچ گئے اور ادھر صف بندی شروع کر دی لیکن اسی دوران قبیلہ ثقیف کا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن

مرشد آگے بڑھا اور جوشِ جہاد میں پل کی کشتیوں کے رسے کاٹ دیئے اور پکار اُٹھا:

''خبردار مسلمانو! آج شہادت کا دن ہے، اسلام کسی پسپائی کی اجازت نہیں دیتا۔''

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ مسکرانے لگے اور فرمایا وہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔ اُن کو پکڑ کر لے آؤ تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اُن کو سمجھایا کہ یہ پسپائی نہیں چال ہے، دریا کے اس طرف صف بندی کریں گے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرو اور اس طرف جو مسلمان پہنچ گئے ہیں اُن کو آواز دو اور ان کی مدد سے پل کو بحال کرو۔

تبصرہ:

اگر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مرشد پل کو نہ توڑتے تو اس جنگ میں اتنا نقصان نہ ہوتا لیکن یہ سب مشیت ایزدی تھی کہ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے۔ اب پل کو دوسرے کنارے سے مرمت کرنا تھا اور اس میں دیر لگ گئی۔ بلکہ اس کنارے سے بھی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ پل کی مرمتی والی جگہ کی حفاظت خود کر رہے تھے۔ اور ہر طرف گھمسان کا رَن پڑا ہوا تھا۔

حضرت سلیط رضی اللہ عنہ کی شہادت

اب ایرانیوں کو روکنے کا سارا کام حضرت سلیط رضی اللہ عنہ، حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور حضرت مذعور رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھا، جو بڑی بہادری سے لڑتے رہے اور اسی دوران حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے پل کو دوبارہ بحال کرالیا۔ جب حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ دوبارہ ان مجاہدوں کے پاس پہنچے تو یہ زخموں سے چور تھے اور حضرت سلیط رضی اللہ عنہ نے زخموں سے چور ہو کر شہادت بھی حاصل کر لی تھی اب حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اور اُن کے قبیلہ والے لوہے کی دیوار بن کر ایرانی حملوں کو روک دیتے تھے اور مسلمان پل سے دریا کو عبور کر کے دوسری طرف صف بند ہو رہے تھے۔ تمام کام نہایت ربط و ضبط سے ہو رہا تھا۔ بنو بکر آخری قبیلہ تھا جو پل کے پار رہ گیا، اور جب تمام قبائل دریا کی دوسری طرف صف بند ہو گئے تو بنو بکر میں سے بھی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے عظیم بھائی وہ مجاہد تھے جنہوں نے پل کو سب سے آخر میں پار کیا۔

ایرانی میدانِ جنگ چھوڑ گئے

مؤرخین کے لحاظ سے عین اسی وقت جب مسلمان دریا کی دوسری طرف پہنچے تو ایرانی فوجوں کو خبر ملی کہ مدائن میں گڑبڑ ہے اور دو گروہ ہو چکے ہیں، ایک رستم کا اور ایک فریزاں کا۔ اس وجہ سے ایرانیوں نے مسلمانوں کا تعاقب نہ کیا اور میدانِ جنگ چھوڑ کر چلے گئے اور مسلمان مروحہ کی طرف صف آرا ہو کر ایرانی فوج کی مدائن کی طرف مراجعت کو دیکھتے رہے۔

تبصرہ

اس جنگ کے بیان سے پہلے ہی ہم نے آنے والے واقعات پر تبصرہ پیش کر دیا تھا اور کچھ جائزے ساتھ ہی ساتھ بیان کر دیئے اور اب آگے اس پورے باب کے نتائج اور اسباق پر سیر حاصل تبصرہ کیا جا رہا ہے، لیکن کچھ حقیقتیں فوری توجہ چاہتی ہیں۔ آپ نے پچھلی کئی جنگوں میں ایرانی فوج کی شکست کے حالات پڑھے وہ جب تتر بتر ہو گئیں تو مسلمانوں نے اُن کا دور تک تعاقب کیا لیکن یہاں مسلمان دریا کے دوسرے کنارے پر صف آراء ہیں اور ایرانی میدانِ جنگ چھوڑ گئے۔ باقی جنگوں میں جب ایرانی دریا کی طرف بھاگے تو وہ دریا میں ڈوب کر مر گئے اور اپنے پل کی وہ اسی طرح حفاظت نہ کر سکے بلکہ آگے بڑھ کر مسلمانوں نے پل پر قبضہ کر کے ایرانیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ یہاں پر عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مرثد کے پل کو کاٹ دینے کے بعد بھی مسلمانوں کا عزم اور ثابت قدمی میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا، یہ موازنہ ہمیں دو قوموں کے فلسفہ حیات کے فرق کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ ہاں البتہ کچھ مسلمان ضرور بھاگ گئے اور مدینہ تک بھی پہنچ گئے بعد میں پشیمان ہوئے اور زیادہ بہادری سے لڑے اور جو لوگ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ گئے، انہوں نے چند ماہ بعد ایرانیوں کو جنگ بویب میں شکست دی اور اب مسلمان ایران کی فتح کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

جسر کی جنگ میں ابوعبید رضی اللہ عنہ نے دریا عبور کیا اور ایرانیوں کو شکست نہ دے سکے اور بے شک قربانی بھی دی، لیکن ایرانیوں کو بھی کچھ حاصل نہ ہوا وہ اس طرح میدانِ جنگ چھوڑ کر چلے گئے جس طرح ابوسفیان[1] اُحد کے میدان کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

نتائج واسباق

۱۔ یہ نتائج واسباق صرف جنگ جسر تک محدود نہیں بلکہ پورے باب کے حالات و واقعات کے نتائج پر تبصرہ کیا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے شام چلے جانے کے بعد معاملات بین بین ہی رہے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے پہلے بابل کے مقام پر ایرانیوں کو شکست دی او مدینہ شریف سے کمک مانگی۔ مدینہ شریف سے کمک ضرور آئی لیکن اوّل خلافت میں تبدیلی آگئی تھی۔ دوم شام وفلسطین کی جنگ زوروں پر تھی۔ اس لئے ایران وعراق کے محاذ کو بہت زیادہ اہمیت نہ حاصل ہو سکی۔

۲۔ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ ثقفی تشریف لائے اور تین مقامات یعنی نمارق، واسط اور باقیس پر ایرانیوں کو شکست دی اور جو حکمت عملی ایرانیوں نے بنائی تھی اس کے پرخچے اُڑا دیئے۔

۳۔ جنگ جسر یا جنگ فیل ایک حادثہ تھا یا ان ہونی کارروائی، اس میں شاید یہ مشیت ایزدی تھی کہ مسلمان پوری

(۱) جلال مصطفےٰ کے دوسرے باب سے استفادہ کریں۔

تیاری کر کے ایران پر حملہ آور ہوں ورنہ اگر حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ ایک دن اور دریا کو پار نہ کرتے تو ایرانی خود بخود چلے جاتے کہ مدائن میں گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اگر ایرانی ویسے چلے گئے اور اُن میں مسلمانوں کے تعاقب کی ہمت نہ تھی تو پھر بھی ظاہر ہے کہ وہ جنگ لڑنے نہ آئے تھے بلکہ بہمن کا لشکر ایک سیاسی چال تھی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے لیکن ابو عبید رضی اللہ عنہ کے دریا کو پار کرنے سے ان کو کچھ حاصل ہوگیا اور وہ واپس چلے گئے۔

۴۔ رستم علم نجوم سے بھی واقف تھا اور یہ علم بھی ایک سائنس ہے۔ ایران کی تباہی اسے نظر آ رہی تھی لیکن اپنے بارے میں یہ علم ہمیشہ اپنے ''عاملوں'' کو کچھ غلط فہمیوں میں بھی ڈالے رکھتا ہے۔

آگے کے حالات اس کے ثبوت میں جائیں گے کہ رستم مسلمانوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا اور بھرپور لڑائی میں اس کو اپنی تباہی بھی نظر آ رہی تھی لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ ایران کی حکومت کے بھی پرخچے اُڑنے تھے اور رستم کا بھی خاتمہ ہونا تھا۔ لیکن جنگ جسر نے رستم کو کچھ اور دن دے دیئے۔

۵۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو بچا کر دریا کے اس طرف لے آئے، لیکن جنگ جسر نے ایک چیز ظاہر کر دی کہ سواد کے علاقہ میں آج چوکیاں رکھنا کل واپس لے آنا اور یہ ٹھک ٹھک کب تک جاری رہے گی جب تک ایران کی فوجی طاقت کو مکمل طور پر تباہ نہیں کیا جاتا، معاملات یوں ہی رہیں گے۔ ایرانیوں کو مکمل شکست دینے کے صرف دو طریقے تھے:

(ا۔ اوّل: لاؤ لشکر تیار کیا جائے اور مدائن پر یلغار کر کے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔

یا

ب۔ دوم: دجلہ و فرات کے طاس کے تمام علاقے خالی کر دیئے جائیں اور فرات کے مغرب میں تیار رہا جائے۔ چھاپے مار کر دریا کے علاقوں میں ایرانیوں کا ناک میں دم کر دیا جائے اور ان کو مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کریں یا فیصلہ کن جنگ لڑیں لیکن میدانِ جنگ مسلمانوں کی مرضی کا ہو۔ جہاں ایرانی فوج کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

۶۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنی کم فوج سے ان دونوں میں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے تھے اور ایسی کارروائی کا مرکز مدینہ شریف کو ہونا چاہیے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اس دوسرے طریقہ کے حامی تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے حیرہ کو دوبارہ چھوڑ دیا اور اب خفان کی جگہ بھی شراف کو چنا جو صحرا کے اور نزدیک تھا۔

۷۔ مدینہ شریف کے مستقر سے ایران و عراق کے محاذ کو وہ اہمیت نہ حاصل ہو سکی تھی جو اب شام کے محاذ کو مل چکی تھی یا مل رہی تھی۔ وہاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ، ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور، ضرار رضی اللہ عنہ بن خطاب، قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو، جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پہلے بھی نبیؐ کے صحابہ موجود تھے جن میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح، شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ، یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ، عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب،

ابوذر غفاری ﷛، عبداللہ ﷛بن جعفر طیار اور عبداللہ بن زبیر ﷛کے نام قابل ذکر ہیں۔

۸۔ ایران ایک وسیع علاقہ تھا، ذرائع آمدورفت کے لئے دومۃ الجندل والا راستہ بالکل بیابان تھا۔نباج والا راستہ اختیار کیا لیکن راستے میں پھر بھی صحرا تھے۔شام و فلسطین کا محاذ تنگ تھا۔وادیاں تھیں، جھیلیں تھیں اور ذرائع آمدورفت بہتر تھے۔ پہلے چار لشکر بھیجے پھر کمانڈر میں وحدت بھی پیدا کر دی گئی۔لیکن ضرورت کے مطابق علاقائی طور پر محاذ کو حصوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔لیکن عراق و ایران میں عجیب حالات تھے۔جگہ جگہ دریا اور ندیاں عبور کرنا پڑتی تھیں۔ادھر بیابان ریگستان تھا۔جس میں عین التمر خنافس اور مضیح کے قبائل کو قابو رکھنا تھا۔ادھر بصرہ کی طرف ڈیلٹا کا علاقہ تھا، دلدل تھی، کہیں عراق و ایران کی سرحد پر پہاڑ تھے۔پندرھویں نقشے سے علاقہ کی وسعت کا اندازہ لگائیں۔ادھر پانچویں یا آٹھویں نقشہ سے اس سب علاقہ کا شام و فلسطین کے علاقہ کے ساتھ موازنہ کریں تو پھر فرق پتہ چلے گا۔اس علاقے کے لئے کسی بھرپور فوجی حکمت عملی کے تعین کی ضرورت تھی۔

۹۔ حضرت ابوعبید ﷛اور اُن کے قبیلہ نے عظیم قربانی دے کر مسلمانوں کو فلسفۂ اسلام کا ایک عملی نمونہ دکھایا اور خلیفہ دوم کی ایران و عراق کے محاذ کی اہمیت کے بارے میں عملی طور پر آگاہ کیا۔آگے چل کر اس سلسلہ میں حضرت فاروق اعظم ﷛نے جو عملی کارروائیاں کیں اُن کا ذکر آئے گا۔اس سلسلہ میں حضرت ابوعبید ﷛کی قربانی نے اہم کردار ادا کیا۔

۱۰۔ ایرانی لشکر جسر کی جنگ سے جس طرح واپس چلا گیا۔اس عقدہ کو مؤرخین نے پوری طرح نہیں کھولا۔ملکی حالات خراب ہوتے رہتے ہیں۔بادشاہ مرتے رہتے ہیں۔میدانِ جنگ میں قاصد آکر صرف سالار جنگ کو ملتا ہے۔سالارِ لشکر کم از کم اتنا تو کرسکتا تھا کہ پل پر قبضہ کر کے مسلمانوں کی پسپائی میں رکاوٹ ڈالتا، کچھ لوگوں کو تعاقب کے لئے بھیجتا لیکن کچھ بھی نہ کیا اور مدائن واپس چلا گیا۔کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ مدائن میں جو بغاوت یا تفرقہ تھا۔وہ رستم اور فیرزان کے درمیان طاقت کی رسہ کشی تھی۔کچھ کا خیال ہے کہ بغاوت میں مردان شاہ اور جابان ملوث تھے جن کا حشر اگلے باب میں ظاہر ہو جائے گا۔

بہر حال جنگ جسر میں جو کچھ ہوا۔رستم وزیر جنگ پکا ہو گیا اور یزدجرد نے بادشاہ کے طور پر مکمل باگ دوڑ سنبھال لی۔

اس جنگ میں چھ ہزار ایرانی مارے گئے اور چار ہزار مسلمان شہید ہوئے اور کوئی دو ہزار کے قریب تتر بتر ہو گئے۔حضرت مثنیٰ ﷛کے پاس کوئی چار پانچ ہزار مجاہد رہ گئے۔اگر حضرت عبداللہ ﷛بن مرثد پل کی رسیاں نہ کاٹتے تو اتنا نقصان نہ ہوتا۔لیکن مشیت ایزدی ایسی ہی تھی۔حضرت مثنیٰ ﷛نے عبداللہ ﷛کو بھی معاف کر دیا۔

اس جنگ میں مسلمانوں نے بڑی بہادری دکھائی، تنگ محاذ پر اکیلے مسلمان مجاہد کا چار یا پانچ کفار کے ساتھ مقابلہ ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں نے پل کو مرمت کر کے دوبارہ جو صفوں کو بحال کیا اور طریقے اور ضبط کے ساتھ دوسرے کنارے پر صف بندی کی۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ جذبہ سے طاقت میں کتنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جسر کی جنگ کے نتائج کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا اور فرمایا: ''ہر مسلمان کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ابوعبید رضی اللہ عنہ پر رحمت ہو۔ اگر دریا عبور کرنے کے بعد وہ پہاڑی کی اوٹ میں صف بندی کر لیتے تو پھر بھی بہتر رہتا۔ ویسے میری خواہش تو یہ تھی کہ وہ دریا کو عبور ہی نہ کرتے اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلتے۔ اگر حالات زیادہ خراب بھی ہو جاتے تو کیا حرج تھا کہ وہ وہاں سے واپس آ جاتے۔''

تبصرہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ اپنے اندر کتنی عمدگی لئے ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان حاکم کے لشکر کے سپہ سالار کے لیے یہ کتنے پیارے الفاظ ہیں اور غلطی کا بیان بھی کتنے پیارے الفاظ میں کیا ہے۔ ہم جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کریں تو ہمیں چاہیے کہ ان الفاظ سے سبق لیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے لیے کتنے پیارے الفاظ استعمال کرتے تھے اور ایسے الفاظ ہرگز نہ استعمال کرتے تھے جس سے کسی کی دل شکنی ہو۔

آپ اندازہ لگائیں کہ مدینہ میں بیٹھ کر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے میدانِ جنگ کا نقشہ موجود تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حاکم وقت ہونے کی صورت میں ٹھیک فرماتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت کرنا چاہیے۔ اصلی بات مومن کا مقصد حیات ہے کہ وہ غیرت کی زندگی اور عقیدہ کی حفاظت میں اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔

اس جنگ کے قاصد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زید جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ ان کے بیان کا طریقہ اتنا اچھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب مسلمانوں کو لڑائی کے صحیح واقعات سناؤ۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے صحیح حالات کو عمدہ طریقے سے بیان کر دیا اور کوئی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی بلکہ لوگوں میں جذبۂ جہاد اور بڑھ گیا اور اس کے نتائج کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زید کا بیان ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آدمی جنگ کے سارے واقعات کا آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہو۔ یہ ہیں قاصد کی خصوصیات۔ یہ کام اتنا آسان نہیں اور صحیح پیغام رسانی ایک بہت بڑا ہنر ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قاصد کسی شکست کے بعد پوری قوم میں افراتفری مچا دیتے ہیں۔

اسباق حسب ذیل ہیں:

۱۔ متحرک طرز جنگ بہترین طرز جنگ ہے اور متحرک رہ کر حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے آتے ہی تین جنگوں میں فتح

حاصل کر لی۔

۲۔ محدود علاقہ میں رہ کر جنگ لڑنا بھی بڑا کٹھن کام ہے، کم نفری کی حالت میں تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ زیادہ علاقہ سے متحرک ہو کر دشمن پر کبھی ادھر سے وار کیا اور کبھی ادھر سے یعنی اپنی طاقت کو حرکت سے زیادہ کیا جائے۔

۳۔ ہلکے پھلکے مسلمان تعداد میں کمی کے باوجود، بھاری بھر کم ہتھیاروں والے ایرانیوں کو جگہ جگہ شکست دیتے رہے اس لئے ''بندو بستی دُم'' جتنی چھوٹی ہو بہتر ہوتا ہے۔

۴۔ فلسفۂ حیات اور کردار فنِ سپاہ گری کی بنیادی چیزیں ہیں، جب ایرانی ایک باطل فلسفہ پر متحد تھے تو وہ عربوں سے برتر تھے کیونکہ اس وقت عربوں کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا لیکن عرب جب مسلمان ہو گئے اور انہوں نے دین فطرت کے فلسفہ کو اپنا لیا، تو وہ انہی ایرانیوں سے برتر ہو گئے۔

۵۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کے کردار کا جو جائزہ پیش کیا وہ ایک زوال پذیر قوم کے کردار کا تجزیہ ہے۔ ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے جلدی مٹ جاتی ہیں۔ ہمیں ہر وقت اپنا قومی محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ اس قسم کی کمینگی سے دور رہیں۔

۶۔ جنگ کی چالوں، تدبیرات، فن، ہنر، ربط و ضبط، احکام کی پابندی، ثابت قدمی اور اطاعت امیر وغیرہ کے سلسلہ میں اسباق پہلے ہی بیان کئے جا چکے ہیں۔ یہ سب کچھ مسلمانوں نے قرآن پاک کی برکت سے حاصل کیا۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی
(اقبالؔ)

انیسواں باب

جنگ بویب

جنگ جسر کے نتیجہ کے طور پر اسلامی لشکر میں بے چینی پھیل گئی لیکن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے تمام مجاہدین کو اُلیس کے نزدیک اکٹھا کرلیا۔ ایک طرف مدینہ میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو دوسری طرف عرب قبائل سے مزید مجاہدین کو فوج میں بھرتی کرلیا اور اپنی تعداد میں اضافہ کرلیا۔ مدینہ شریف سے بھی کمک آنا شروع ہوگئی جس کو مرحلہ در مرحلہ اگلے ابواب میں بیان کیا جائے گا، بہرحال اہل مدینہ پر جنگ جسر کے نتائج کا یہ اثر ہوا کہ ایران کے سلسلہ میں انہیں دوٹوک فیصلہ کرنا پڑا۔

جابان اور مردان شاہ کا خاتمہ

ایران کے اندرونی جھگڑوں کے سلسلہ میں مؤرخین کوئی صحیح روشنی نہیں ڈال سکتے۔ جنگ جسر کے چند دن کے بعد حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اُلیس کے عرب قبائل کی مدد سے ایک چھاپہ مار کر جابان اور مردان شاہ کو گرفتار کرلیا۔ یہ لوگ وہاں کب، کیسے اور کیوں آئے اس کے تانے بانے ملتے نظر نہیں آتے۔ لیکن طبری میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کہ آپ نے جابان کو کہا ''کہ تم نے ہمارے امیر کو دھوکا دیا تھا۔ ان کے سامنے جھوٹ بولا تھا اور ان کو بھڑکایا تھا۔'' ایسے ہیں جن کے اندر کوئی راز پنہاں ہے۔ ایک بات تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ لوگ جنگ جسر سے پہلے اس علاقہ میں تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی ساز و باز کرکے بہمن کے لشکر کو شکست دلانا چاہتے تھے۔ یا مسلمانوں کو کوئی غلط اطلاع دی یا غلط اُمید دلائی وغیرہ۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جنگ جسر کے وقت وہ مدائن میں تھے اور وہاں کچھ گڑبڑ کی جس میں کامیاب نہ ہوئے اور وہاں سے بھاگ کر ادھر آگئے۔ جسر کی جنگ کے بعد جو ایرانی لشکر مسلمانوں کے تعاقب کئے بغیر چلا گیا تھا۔ وہاں بھی جابان کی گڑبڑ کا ذکر موجود ہے۔ بہرحال ان ناکامیوں کے بعد جابان اور مردان شاہ اب اُلیس کے نزدیک پہنچ کر مسلمانوں کے ساتھ کوئی ساز و باز کرنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے اعتبار نہ کیا اور وہ گرفتار ہوئے۔

تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جابان مدائن میں کسی ناکامی کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُلیس کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ اس کو خیال ہوگا کہ مسلمان افراتفری کی حالت میں ہوں گے۔ بچے کھچے لشکر کو وہ ملیامیٹ کر کے ایران میں نام پیدا کرے گا لیکن وہاں اُلٹا اپنے ساتھیوں سمیت پکڑا گیا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے دونوں کے سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ جابان جو دو جنگوں سے بھاگ چکا تھا۔ آخر حق کی تلوار سے اپنا سر قلم کرا بیٹھا۔ یعنی اُس کے مقدر میں مسلمان کی تلوار کی تیز دھار تھی جس سے کئی دفعہ بھاگنے کے بعد وہ بچ نہ سکا۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

(اقبالؔ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو ہدایت

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسلام کے عظیم فرزند حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ ''دشمن کے چنگل سے اپنے آپ کو باہر کرو۔ اپنی حدود سلطنت میں جہاں دشمن کے ساتھ سرحدیں ملتی ہیں۔ وہاں چشموں پر پھیل جاؤ۔ بنو ربیعہ، بنو مضر اور ان کے حلیف قبائل سے جس قدر صاحب شجاعت اور شہسوار مل سکیں ان کو اپنے ساتھ ملا لو اور اپنے علاقہ میں سب مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو۔ ہم مدینہ سے کچھ مجاہدین فوری طور پر آپ کی مدد کے لئے بھیج رہے ہیں اور ہماری اگلی ہدایات کا انتظار کریں۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ پہلے ہی ذی قار پہنچ چکے تھے۔ یہ حکم ملتے ہی انہوں نے سوار کے علاقہ میں فوجی چوکیوں کو تقریباً ختم ہی کر دیا اور صرف چند مخبر ادھر چھوڑ دیئے۔ چنانچہ پرانے طریقہ کے مطابق اپنے دوست ریگستان کی اوٹ لی اور وہاں مجاہدین بھرتی کرنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی کمک کا انتظار کیا۔ یاد رہے کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک پر برچھی کا جو زخم آیا تھا وہ بہت گہرا تھا لیکن چونکہ چل پھر سکتے تھے، اس لئے زخمی چہرے کے ساتھ ہی اپنے کام میں مشغول رہے۔

مدینہ سے کمک

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حضرت جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بجیلہ کو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لئے بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے قبیلہ یا جہاں سے جتنے مجاہدین مل سکیں ان کو ساتھ لے کر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ جائیں۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ عراق کے علاقہ سے واقف تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ شام چلے گئے تھے۔ ان دنوں

شام چھٹی آئے ہوئے تھے۔ حضرت جریرؓ جلد ہی محاذ جنگ پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عدیؓ بن حاتم کو حکم دیا کہ وہ بھی کمک کے ساتھ جلدی عراق کے محاذ پر پہنچیں۔ حضرت عدیؓ بھی علاقہ سے واقف تھے اور حضرت خالدؓ کے ساتھ اس علاقہ میں جنگوں میں شریک رہے تھے۔ حضرت عرفجہؓ بن ہرثمہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ گیارہ لشکروں میں اُن کا آٹھواں لشکر تھا وہ قبیلہ ازد کے عامل تھے۔ وہاں پر ان کو حکم ملا کہ قبیلہ ازد کے مجاہدین کے ساتھ عراق کے محاذ پر رپورٹ کریں۔ باقی کمک میں قبیلہ رباب سے ہلال بن علفہ، بنوخشم سے ابن الحشیؓ، قبیلہ خشعم سے عبداللہؓ بن ذی السمین قبیلہ حنظلہ سے ربعیؓ اور اُن کا بیٹا وغیرہ دستے لے کر چل پڑے۔ باقی قبائل سے ربعیؓ بن عامر، ابن الہوبرؓ، المنذرؓ بن حسان اور قرطؓ بن جماع بھی اپنے دستوں کے ساتھ حضرت مثنیٰؓ کی امداد کے لئے عراق پہنچ گئے۔

مہران کی پیش قدمی

ایران کے اندرونی حالات کے سلسلہ میں مؤرخین میں یہاں بھی اختلاف ہے کہ آیا بوران جو عورت تھی۔ وہ حکمران تھی یا یزدگرد جس کو مسلمان یزدجرد کہتے ہیں۔ بہرحال رستم اور فیرزاں کی رسہ کشی ختم معلوم ہوتی ہے۔ جنگوں کے صحیح جائزوں کے لئے دونوں طرفین کے صحیح حالات کے بارے میں پوری واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمیں اتنا معلوم ہورہا ہے کہ ایران سنبھلنے کی کوشش کررہے تھے اور وہ باخبر تھے۔ ان کو جب پتہ چلا کہ مدینہ سے حضرت مثنیٰؓ کو کمک پہنچنا شروع ہوگئی ہے تو انہوں نے جلدی سے مہران ہمدانی کے ماتحت ایک بارہ سے پندرہ ہزار کا لشکر تیار کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ جا کر حضرت مثنیٰؓ کا قلع قمع کردے اور مہران نے تیزی سے پیش قدمی شروع کردی اور دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر کوفہ کے سامنے والے علاقہ میں آکر صف بند ہوگیا۔

جنگ بویب (صفر ۱۴ ہجری)

طبری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جنگ بویب رمضان کے مہینہ میں ہوئی لیکن جنگ جسر بھی رمضان ۱۳ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس لئے جنگ بویب اتنی جلدی نہیں ہوسکتی اور نہ پورے سال کا فرق ہوسکتا ہے۔ اس لئے صفر ۱۴ ہجری والی بات کچھ صحیح معلوم ہوتی ہے مہران نے جس جگہ پڑاؤ کیا اس کا نام بسوتھا۔ ''بسو'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سوکھی ہوئی ہو اور دودھ نہ دے۔ حضرت مثنیٰؓ کو جب یہ پتہ چلا تو آپ نے کہا کہ مہران کے لئے یہ برا شگون ہے۔ مہران البتہ حضرت مثنیٰؓ کو دعوت دے رہا تھا کہ وہ دریا کو پار کریں اور دودو ہاتھ ہو جائیں۔ حضرت مثنیٰؓ دریا کی دوسری طرف بویب(1) ندی یا دریا کے پاس فوجی طرز کا پڑاؤ کئے ہوئے تھے۔ مہران کو حکم تھا کہ جلد حضرت مثنیٰؓ کا قلع قمع

(1) نقشہ نہم دیکھیں۔

کریں اور وہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ سے دریا پار کروا کر جسر کی جنگ کی طرح کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ دریا کے نزدیک بھی دشمن پر نظر رکھنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ اب مزید کمک کے آنے تک زیادہ بھروسہ اپنے دوست ریگستان پر کر رہے تھے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے دریا کو پار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب مہران پر ایک طرف حکومت کا دباؤ تھا کہ وہ جلدی کرے۔ دوسری طرف اس کو ڈر تھا کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کوئی حیران کن کاروائی نہ کردیں کہ وہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرح اس سلسلہ میں بہت خائف تھا۔ اس لئے مہران نے مجبور ہو کر دریا پار کر ہی لیا۔

طرفین کی صف بندی

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے بازوؤں پر دونوں صحابہ رسول حضرت عدی رضی اللہ عنہ اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ اور ریز رویا جھپٹنے والے دستے اپنے بھائی معنیٰ رضی اللہ عنہ کے ماتحت لشکر کے پیچھے رکھے۔ درمیان میں وہ خود تھے اور ان کا چھوٹا بھائی مسعود ان کے ساتھ تھا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑے شمس پر سوار تھے جس پر آپ صرف جنگوں میں سوار ہوتے تھے۔ بدن پر زخم کی وجہ سے خاص کر چہرہ پر بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر آپ ہر دستہ کے سامنے رُک جاتے تھے اور خطاب فرماتے تھے۔ ایک مجاہد البتہ بے تاب تھا۔ جو سب اہل لشکر سے آگے نکل گیا۔ اس مجاہد کے جنگ جسر میں قدم اُکھڑ گئے تھے اور آج کے دن وہ کسر پوری کرنا چاہتا تھا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اس کو دیکھ کر مسکرا دیئے اور اس کو صفوں کے بیچ کر دیا۔

طبری کے لحاظ سے میمنہ اور میسرہ پر مذعور رضی اللہ عنہ اور النسیر رضی اللہ عنہ تھے، اور سواروں کی کمانڈ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ تھی۔ بلکہ کچھ جیش المقدم بھی تھا جس پر حضرت عصمہ رضی اللہ عنہ تھے، بہر حال اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ دائیں بائیں کے دستوں میں ہر سطح پر کمانڈر ہوتے تھے اور کئی امیر ہو سکتے تھے۔ مہران نے مجبوراً دریا پار کیا اور شومیا کے مقام پر صف بندی کی جس کے بارے میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بھی مہران کے لئے بُرا شگون ہے۔ مہران اپنے لشکر کے درمیان میں تھا اور اس کی فوج کے بازوؤں پر مردان شاہ اور حیرہ کا رئیس آزاذ بہ تھے، یہ مردان شاہ، نیا مردان شاہ تھا کہ ایک مروانشاہ چند دن پہلے جابان کے ساتھ مارا گیا تھا اور وہ آزاذ بہ وہی ہے جو فتح حیرہ کے وقت اپنے لڑکے کے مارا جانے کی وجہ سے بھاگ گیا تھا۔

جنگ

ایرانیوں کے تینوں دستوں میں ایک ایک ہاتھی تھا اور فوج میں بہت شور مچا ہوا تھا۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے

مجاہدین کو آگاہ کیا کہ یہ بزدلی کی نشانی ہے اور مجاہدین خاموش رہیں۔ تین دفعہ نعرۂ تکبیر کی صدا دی جائے گی اور چوتھے نعرہ پر تمام مجاہدین دشمن پر پل پڑیں۔ مسلمان دفاعی جنگ کے صرف اس حد تک قائل تھے کہ حکمت عملی کے طور پر زمین اور علاقہ مرضی کا ہو، لیکن وہ کسی انفعالی دفاع میں یقین نہ کرتے تھے۔ وہ دفاع کو بھی متحرک رکھتے تھے اور ساکن تب تک رہتے تھے جب تک دشمن مار سے دور ہو۔ لیکن جب دشمن مار کے دائرے میں آجاتا تو پھر مسلمان متحرک ہو کر حملہ ہی کرتے اور تمام تر کاروائی جارحانہ ہوتی۔

اب ایرانیوں کی افراتفری کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے پہلے ہی نعرۂ تکبیر کی آواز پر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان بھی کچھ بے ترتیب سے آگے بڑھے لیکن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے "ضبط، ضبط" پکارا اور مسلمان سنبھل گئے اور ترتیب سے لڑائی شروع ہوگئی۔ لوگ بار بار حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے تھے اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اگر دیکھنے کا جواب مسکراہٹ یا شاباش کے اشارے سے دیتے تھے تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ ان کے محاذ یا علاقہ میں کاروائی سالار کی مرضی کے مطابق ہو رہی تھی۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کا جنگ کی نبض شناسی میں بہت اونچا مقام تھا اور بہت چوکنے اور جلد فیصلے کرنے والے تھے۔

مہران کا خاتمہ

مسلمانوں کے لشکر کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن اندازہ ہے کل تعداد آٹھ یا نو ہزار کے قریب تھی۔ جس میں آدھے سے زیادہ جنگ کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے۔ ایرانی جنگ جسر کے بعد کچھ بہتر ہمت میں تھے۔ اس لئے جب مسلمانوں کے حملوں میں کچھ کمی آئی تو ایرانیوں نے کچھ آگے بڑھنے کی کوشش کی اور مسلمانوں نے ان کو روکا جس کی وجہ سے جنگ طول پکڑتی جاتی تھی۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی زندگی کی یہ پہلی جنگ تھی کہ آپ زخموں کی وجہ سے دشمن کی صفوں میں نہ گھس سکے لیکن اگلی صف میں موجود ضرور رہے۔ جب جنگ کی یہ حالت ان کو نظر آئی تو انہوں نے سوچا کہ دشمن کی طاقت کی کشش کے مرکز کو ختم کیا جائے اور مسلمانوں کو بھڑکایا کہ "مہران کا سر قلم کرو" ان الفاظ میں پتہ نہیں کیا جادو تھا کہ تمام اطراف سے لوگ جوش جہاد میں آگے بڑھے اور چند لمحوں میں مہران کا سر زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے قتل میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ اور بنو تغلب کا ایک مجاہد برابر کے شریک تھے اور جنگ کے بعد مہران کے ہتھیار دونوں میں برابر بانٹ دیئے گئے۔

حضرت مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت

ایرانی بھی اس جنگ میں بڑی شدت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اور خاص کر دونوں فوجوں کے قلب میں اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ گرد و غبار اوپر اٹھا تو نظر آیا کہ ایرانیوں کا قلب جنگ ہار کر پیچھے ہٹ چکا تھا اور میدانِ جنگ لاشوں

سے پٹا پڑا تھا۔ انہی میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے جو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی آخری سانسوں پر تھے۔ اپنے عظیم بھائی مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی جگہ آج انہوں نے سنبھالی ہوئی تھی اور دشمن کی صفوں میں گھس کر اُن کو تہس نہس کرنے کا کام انہوں نے کیا تھا۔ آپ کے قبیلہ والوں نے آپ کو زمین سے اُٹھایا تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ پکار اُٹھے۔ ''اے مسلمانو! یاد رکھو ہمارے بیچ بہتر لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس طرح شہادت حاصل کریں۔ اپنے جھنڈوں کو اوپر اُٹھاؤ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عروج دے۔''

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، حرب ہے کاری
(اقبالؔ)

اور حضرت مسعود رضی اللہ عنہ شہید نے زندگی کا مقصد حاصل کرلیا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مسلمانوں کا بھرپور حملہ

اسلامی لشکر نے حضرت مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے ولولہ اور جذبۂ جہاد کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے دشمن پر بھرپور حملہ کر دیا۔ حضرت قرط رضی اللہ عنہ بن جماع نے آگے بڑھ کر ایرانی رسالہ کے کمانڈر شہر بزار کو قتل کر دیا۔ کمک میں آنے والوں میں سے حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن السمیں اور حضرت ربعی رضی اللہ عنہ نے اپنے دستوں اور قبائل کے ساتھ زوردار حملے کئے اور ایرانی سرداروں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے دستہ کے ساتھ آگے بڑھ کر پل پر قبضہ کرلیا۔ اب ایرانیوں کے لئے بھاگنے کے راستے بھی مسدود تھے اور پورے لشکر کو تہس نہس کر دیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس جنگ میں مرنے والے ایرانیوں کی بوسیدہ ہڈیاں کئی سال تک وہاں پڑی رہیں۔ ظاہر ہے لشکر کا بڑا حصہ ادھر ہی ختم ہوگیا۔ پھر بھاری بھرکم ایران بھاگ بھی نہ سکتے تھے۔ ویسے تو کوئی اور جنگوں میں ایرانیوں کا نقصان زیادہ ہوا لیکن یہاں میدانِ جنگ محدود علاقہ میں تھا تو بوسیدہ ہڈیاں زیادہ دیر رہیں۔ اس کو کہتے ہیں شکست۔ ہمارے جن مؤرخین نے جسر کی جنگ کو اپنی شکست تصور کرلیا وہ یہاں موازنہ کریں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جسر کی جنگ میں مسلمان کامیاب نہ ہوسکے۔

تلواروں اور نیزوں پر جنازہ

اس جنگ میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے بھائی مسعود رضی اللہ عنہ شہید اور باقی شہداء کے جنازوں کو جنگ کے بعد تلواروں اور نیزوں پر اُٹھایا گیا اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، تاریخ میں اس قسم کی روایت پہلی دفعہ سامنے آتی ہے کہ شہداء کی عزت افزائی کی گئی۔ اسلام دین فطرت ہے اور بے شک وہ غیروں کی نقالی سے منع کرتا ہے لیکن عرب قبائل کے چند اچھے رواج اسلام میں موجود رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قبیلہ یا قبیلہ بنوبکر کے ہاں جنگ کے مرنے والوں کے لئے ایسی عزت کا رواج ہوگا۔ اور پہلی دفعہ میدانِ جنگ میں اسلام کے شہداء کو یہ عزت جنگ بویب میں دی گئی کیونکہ یہ رسم دین فطرت کے فلسفہ حیات کو کسی اصول کے خلاف نہیں جاتی، بلکہ مرنے والوں یا شہداء کی عزت افزائی ہے تو اس کے بعد شاید مسلمانوں میں اس کا رواج ہوگیا ہو۔ بہرحال یورپ کی عسکری تاریخ میں ایسی روایات سترہویں صدی سے پہلے نظر نہیں آتیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ترکوں سے یہ سیکھا اور اب یہ رسم عام ہوگئی ہے کہ ملک کے لیڈروں اور سپاہیوں کے جنازے توپ پر اُٹھائے جاتے ہیں۔ (واللہ اعلم) اس پہلو پر زیادہ تجسس کی ضرورت ہے۔

فوری عطیات

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو دشمن کے فوری تعاقب کا طریقہ کار سکھلا گئے تھے۔ جس کا جلالِ مصطفےٰ کے دوسرے تیسرے اور ساتویں باب میں تفصیل سے ذکر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس طریقے کو ہر جنگ میں استعمال کیا خاص کر حضرت جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ اور وہ لوگ جنہوں نے جسر کی جنگ میں شرکت نہ کی وہ بدلہ لینے کے لئے بہت پُرجوش تھے۔ انہوں نے تیزی سے دریا کو پار کیا اور مہران دریا کے پار جورسد ورسائی کا سامان اور ریوڑ چھوڑ آیا تھا اس پر قبضہ کیا اور حیرہ کے عبدالمسیح کے بیٹے اور کرامۃ کے بھائی کو حکم دیا کہ یہ ریوڑ ہانک کر مسلمانوں کے بندوبستی علاقے میں لے جائے۔ وہاں پر مسلمان عورتیں اور بچے تھے اور انہوں نے جب اجنبی لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہوں نے ابن عبدالمسیح اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ اس بے چارے نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو فتح کی خوشخبری سنائی اور خود عش عش کرنے لگا کہ جس قدم کی عورتیں اور بچے ایسے ہوں ان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت جریر رضی اللہ عنہ، عصمہ رضی اللہ عنہ اور عکرمہ رضی اللہ عنہ اپنے قبائل کے دستوں کے ساتھ بچے کچھے دشمن کا دور تک تعاقب کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مدائن کے نزدیک سباط چھاؤنی کے نزدیک کے علاقوں کو بھی تاخت وتاراج کیا گیا، جہاں سے مال غنیمت حاصل ہوا۔ یہ متحرک کاروائیاں مختلف امراء کے ماتحت سارے طاس یا سواد کے علاقے میں جاری رہیں اور واسط سے لے کر اوپر تک جگہ جگہ مسلمان دستے اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کرتے رہے۔ یعنی جس طرح حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایرانیوں کے لئے دجلہ کے اس پار رہنا ناممکن ہوگیا تھا تو اب پھر مسلمان دستوں نے وہی صورت پیدا کر دی۔

شمال میں انبار اور دریائے فرات کے مغرب کے ریگستانی علاقہ یعنی عین التمر اور خنافس کے علاقہ کے عرب قبیلے بھی جنگ جسر کے بعد خود مختاری کا سوچ رہے تھے اور مسلمانوں کی طرف لاپرواہی برتی۔ حضرت مثنیٰ ؓ نے متعدد امراء کو دستے بھیج کر ان علاقوں میں حربی مظاہرے کئے اور شر پسندوں کے مزاج کو درست کیا۔ علاقہ الکباث اور تکریت کے علاقوں میں لشکر بھیجے اور تکریت پر چڑھائی والے لشکر کی کمانڈ حضرت مثنیٰ ؓ نے خود کی۔

نتائج و اسباق

۱۔ اس باب اور جنگ بویب کے نتائج یعنی ''عطیات اور ثمرات'' اوپر بیان کر دیئے گئے ہیں جو فوری نتائج تھے، حتمی یا پیش رفت والے نتائج عملی طور پر اگلے باب میں خود بخود عیاں ہو جائیں گے کہ حضرت خالد ؓ ایران کی فتح کی جو بنیاد باندھ گئے تھے۔ اس کو جسر کے مقام پر تھوڑا دھچکا لگا لیکن حضرت مثنیٰ ؓ نے اس بنیاد کو پھر مضبوط کر دیا۔

۲۔ حضرت عمر ؓ مدینہ میں ایران کی فتح کے لئے تجاویز مرتب فرما رہے تھے اور یزدجرد جو تخت پر مکمل طور پر براجماں ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی شکست دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

۳۔ اسلام میں بامقصد جنگ کے تحت حق کا قافلہ رواں دواں رہتا ہے۔ حکمت عملی کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ آگے چل کر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے قانون کو نافذ کرنا ہوتا ہے اور پہلے یہ قانون اپنے اوپر لاگو کرنا ہوتا ہے۔

۴۔ اس زمانے میں محاذ شام پر مسلمان دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔

۵۔ اسلام میں فتح کا کوئی اختتامی مقام نہیں ہوتا۔ مسلمان رواں دواں رہتے ہیں۔

بیسواں باب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایران کو فتح کرنے کے سلسلے میں حکمت عملی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے کوچ

جنگ جسر رمضان ۱۳ ہجری میں واقع ہوئی۔ اس وقت خلیفہ دوم نے جو کاروائی کی اس کا ذکر بھی ہو چکا ہے اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو جو کمک مہیا کی اس کی مدد سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ بھی بیان کئے جا چکے ہیں اور جنگ بویب جو اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی وہ صفر ۱۴ ہجری میں واقع ہوئی۔ لیکن اس جنگ سے ایک ماہ پہلے یعنی محرم ۱۴ ہجری میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور چوٹی کے صحابہ کو ساتھ لے کر مدینہ شریف سے جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور حکم دیا کہ سب مسلمان اس جہاد میں شرکت کریں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ کے ردیف تھے جس کو آج کل سیکرٹری یا چیف آف سٹاف کہہ سکتے ہیں اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔

صرار کے چشمہ پر قیام

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صرار کے چشمہ پر قیام فرمایا اور جو مجاہدین مل گئے ان سے ایک لشکر تشکیل فرمایا اس لشکر کے جیش المقدم یا ہراول دستوں پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور اگلی منزل پر روانہ ہونے کا حکم دیا یعنی منزل بمنزل چلیں گے اور جب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اس منزل پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو مل جائیں گے تو پھر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو آگے کے احکام دیں گے۔ ہر منزل پر ایسا جیش المقدم اپنے لشکر کے قیام کا بندوبست کرتا۔ جیسے آج کل ہم لوگ ہار بر پارٹی یا کلر پارٹی آگے بھیجتے ہیں۔ باقی لشکر کے میمنہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کو مقرر کیا اور میسرہ

پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام کو۔اور مجاہدین کا انتظار فرما رہے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ساتھ تھے،انہوں نے عرض کی "اے امیرالمؤمنین! آپ ہر بات پر ہم سے مشورہ کرتے تھے،اس دفعہ بغیر مشورہ کے احکام جاری کر دیئے۔آخر اپنی حکمت عملی یا تجاویز کے بارے میں انہیں کچھ تو آگاہ کریں۔"

مجلس مشاورت

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایران کی جنگ بہت طول پکڑ گئی ہے،انہوں نے مشوروں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔اب ویسے بھی کھلے میدان آ چکے ہیں جہاں جنگ کے لئے بہترین مشورے ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قارئین کو یاد ہوگا کہ خلیفہ اوّل نے مرتدین کے قلع قمع کے لئے ذوقصہ کے مقام پر تمام لشکر مقرر فرمائے۔ اور ذوقصہ بھی صراصر کے چشمہ کی طرح کھلی جگہ تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ خود ایک لشکر جرار کے ساتھ ایران پر حملہ آور ہوں اور اس جھگڑے کو ختم کر دیں۔اس لئے بہتر ہے کہ ابن ابوطالب رضی اللہ عنہ کو بھی مدینہ سے بلا لیا جائے کہ ان کے بغیر مشورہ نامکمل ہو گا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبیداللہ کو بھی ہراول دستوں سے واپس بلا لیا جائے۔چنانچہ تمام چوٹی کے صحابہ اکٹھے ہو گئے اور عشرہ مبشرہ سے صرف حضرت سعد بن ابی وقاص نجد میں صدقات کی وصولی پر گئے ہوئے تھے۔باقی وہاں موجود تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو خلیفہ دوم سے متفق تھے اور ان کے خیال کے مطابق خلیفہ کو دور دراز علاقوں اور ملکوں میں جانا چاہیے تھا اور بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس تیار ہوئے اور جس کا ذکر دوسری کتاب میں آئے گا تو اس وقت بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی رائے دی کہ خلیفہ کو علاقوں میں جانا چاہیے اور اپنی آنکھ سے علاقوں اور معاملات کی خبر حاصل کر کے بروقت کارروائی کرنا چاہیے۔

لیکن حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف اور باقی صحابہ کرام نے اس کی سخت مخالفت کی اور سب کی یہ رائے تھی کہ اوّل تو دو محاذوں پر جنگ جاری ہے اور ایران کے محاذ کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔دوسرا خدانخواستہ اگر محاذ جنگ پر اس لشکر کو شکست ہو جائے جس کی کمانڈ خلیفہ کر رہے ہوں تو اس کو اسلام کی شکست سمجھا جائے گا۔پھر حالات اتنے بھی خراب نہ تھے کہ اتنے زیادہ مجاہدین کو اکٹھا کیا جائے اور ایران جنگ کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جائے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلائل اتنے وزنی تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو تسلیم کیا۔لیکن دونوں کا خیال تھا کہ اس کام کے لئے کسی چوٹی کے صحابی رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنانا چاہیے لیکن اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نامزدگی

اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اُسی وقت ایک قاصد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا ایک خط لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف پکار اُٹھے: ''کہ مل گیا مل گیا۔'' لوگوں نے پوچھا کہ کون؟ آپ نے فرمایا ''فاتح ایران'' اور یہ کام حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو سونپا جائے۔ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس نامزدگی سے اتفاق کیا اور اسی قاصد کے ذریعہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ عشرہ مبشرہ کے جن بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مشاورت میں شرکت کی وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن یہاں اُن کے لئے چند الفاظ ضروری ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام مالک تھا لیکن آپ سعد رضی اللہ عنہ بن مالک کی بجائے زیادہ تر سعد بن ابی وقاص کے نام سے مشہور ہیں۔ اول اسلام لانے والوں میں سے ہیں اور سترہ برس کی عمر میں یہ شرف حاصل ہوا۔ اسلام کے واسطے سب سے پہلا تیر آپ نے چلایا جب آپ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث کے لشکر کے ساتھ باہر نکلے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی سب جنگوں میں شرکت کی اور واحد صحابی ہیں جن کے طبقات ابن سعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے: ''میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔''

اکثر مؤرخین نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے رشتہ سے ماموں تھے۔ جنرل اکرم نے کوئی رشتہ تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ اور اصل بات یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے والد مالک، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے۔ تو اس طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی تھے۔ آمنہ رضی اللہ عنہا بنت وہب، بن عبد مناف بن زہرہ ہیں۔ اور مالک بن وہیب بن عبد مناف بن زہرہ ہیں۔ زہرہ، قصیٰ کا بھائی تھا اور وہاں سے بنی زہرہ، کا نسب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جاتا ہے۔ طبقات ابن سعد میں آپ کا ذکر بڑے پیارے الفاظ میں ہے، اور جلالِ مصطفےٰ میں کثرت[1] سے ذکر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جنگ ایران

ایران کی جنگ کو بیان کرتے وقت کچھ مورخین اور مبصرین نے عجیب قسم کے بیانات دیئے ہیں۔ یہ مبصر یا مورخ ان صدیوں کے ہیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کے قبائل کو لکھا کہ یہ ایرانیوں اور عربوں کی جنگ ہے، اور آپ ہمارا ساتھ دیں۔ پرانی تاریخوں میں میری نظر سے ایسی کوئی روایت نہیں گزری۔ ہاں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو ان عرب قبائل کو لشکر اسلام میں شامل کرنے کے لئے لکھا جو اسلام لے آئے تھے۔ الفاظ کے استعمال میں بڑا فرق ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہ میں ایسے الفاظ ڈال دیئے جائیں کہ یہ عربوں اور ایرانیوں کی جنگ ہے۔ نعوذ باللہ ایسے بیان لغو ہیں اور اس مورخ کو اللہ تعالیٰ معاف کرے۔

(۱) صفحہ ۳۳، ۴۰، ۵۲، ۹۴، ۳۱۱ اور ۳۱۲ وغیرہ

بات یہ ہوتی ہے کہ عرب قبائل کو اسلام لانے کے بعد ایسی دعوت دی جا سکتی ہے کہ آئیں ہمارے ساتھ مل کر ایران کی شہنشاہیت کو ختم کریں۔ اور ہم مل کر اللہ اور رسول کا نام بلند کریں گے، جیسے بعد میں ایران کے مسلمانوں کو دعوت دی گئی کہ ہم مل کر ترکستان میں اللہ اور رسول کا نام بلند کریں وغیرہ۔ ملکوں اور قبائل کے نام پہچان کے لیے ہیں اور قرآنِ پاک میں ان ناموں کو صرف پہچان تک استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد رشتہ اسلام ہے۔ قبائلی رشتے اور پیار و محبت والی بات الگ ہے۔ لیکن ان رشتوں کو غلط طور پر استعمال کر کے تعصب سے گریز کیا جائے۔

اسی طرح اس زمانے میں کچھ مبصرین نے طبری کے حوالے سے یہ لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایران کی جنگ کے حق میں نہ تھے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اے کاش ایران اور ہمارے درمیان آگ کا سمندر ہوتا یا دریا ہوتا۔" کسی اور تاریخ میں کسی معتبر راوی نے یہ بات نہیں کہی، ممکن ہے جب شام کے ساتھ جنگ میں زیادہ مصروفیت تھی تو وقتی طور پر آپ رضی اللہ عنہ نے کہہ دیا ہو کہ کچھ وقت کے لیے ایران اور ہمارے درمیان ایک آگ کا دریا ہوتا۔ لیکن واقعات اس طرف اشارہ بالکل نہیں کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ حالات اتنے بھیانک ہو گئے ہوں کہ ایرانیوں کو روکنے کے لئے کسی آگ کے دریا کی ضرورت پڑتی۔

یہ سب ذہنی اختراع ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو عربوں تک محدود کرنا چاہتے تھے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم زمانے کو تسلسل دینے کے لئے مبعوث ہوئے کہ زمانے کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت واحدہ کا تصور دے کر یہ تسلسل قائم کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے پیغمبر اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیسے عرب کی سرحدوں پر آگ کے دریاؤں کی دعائیں کرتے۔

اگر ایسی بات ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس طرح جہاد کے لئے نہ نکلتے۔ کہ تمام مسلمانوں کو لے کر ایران کی طرف روانہ ہونے لگے۔ جنگ سے کترانے والی بات بالکل غلط ہے۔ ہاں یہ پہلو البتہ آگے آئے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے علاقہ پر پھیلاؤ رکھنا چاہتے تھے، جس پر آسانی سے کنٹرول کیا جا سکے۔ اس لئے آگے چل کر دریائے سندھ سے آگے فوجوں کو جانے سے منع کر دیا اور دوسری طرف افواج کو دریائے جیحوں اور سیحوں پر روک دیا۔ اس میں ایک اور پہلو بھی تھا کہ کئی نومسلم دور دراز ملکوں میں جا کر دوسروں کی تہذیب میں رنگے جاتے تھے اور اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو تمام مسلمانوں کے لئے زبان بھی عربی کا فیصلہ کیا کہ وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسی قوم دیکھنا چاہتے تھے، جن میں مکمل وحدت ہو اور ان کا ثقافتی رنگ بھی اسلامی ہو۔ یہ پہلو بڑا وسیع ہے اور چوتھی کتاب میں اس کی مکمل وضاحت کی جائے گی کہ غلط طریقوں میں پڑ کر کس طرح ہم مکمل وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل پر قائم نہ رہ سکے۔ تیسری کتاب میں البتہ مصر اور افریقہ کی طرف عربی کے پھیلاؤ کا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔

سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کی محاذِ جنگ کی طرف روانگی

حضرت سعد رضی اللہ عنہ جب چشمہ صرار پر خلیفہ دوم کی خدمت میں پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایران کی حکومت کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کی تیاری اور حکمت عملی کا تعین کر چکے تھے جو کام وہ خود کرنا چاہتے تھے وہ کام انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا اور فرمایا کہ" آپ کو عراق وایران کے محاذ پر سپہ سالار مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کٹھن کام ہے، پورا محاذ ابلہ (موجودہ بصرہ) سے لے کر حیرہ تک آپ کی کمانڈ میں ہوگا۔ متعدد چھوٹے کمانڈر، جو ان علاقوں میں خود مختار طور پر کام کر رہے ہیں۔ سب آپ کے ماتحت ہوں گے۔ آپ مشکل حالات میں صبر کریں اور ثابت قدمی کو اپنا شعار بنائیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اسلامی فلسفہ حیات، طرح زندگی، اللہ کے احکامات اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے وہ تمام باتیں یاد دلائیں جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں عظیم رفقاء آپ کی مصاحبت سے سیکھ چکے تھے اور ان کی نگاہ سے ان مقامات تک پہنچ چکے تھے۔ اس وقت تک تقریباً چار ہزار کا لشکر یمن اور دوسرے نزدیکی علاقوں سے اکٹھا ہو چکا تھا۔ ان سب مجاہدین کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی کمانڈ میں دے دیا گیا۔ ان متعدد ایسے لوگ بھی تھے جو پہلے مرتد ہو چکے تھے لیکن دوبارہ اسلام کی آغوش میں آ گئے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ شروع میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے لوگوں کو جہاد میں شرکت سے الگ رکھا لیکن اب بہادر اور بااعتبار لوگوں کو لشکر اسلام میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ ان میں عمر رضی اللہ عنہ بن معدیکرب بھی تھے جو یمن کے مشہور پہلوان تھے۔ اسلام کے لشکر میں ان کی بہادری کے کارناموں کا ذکر آئے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام مجاہدین کو پہلے خطبہ دیا اور پھر ان مجاہدین کے ساتھ صرار کے چشمہ سے آعوض تک خود بھی چل کر گئے اور وہاں پر بھی مجاہدین سے خطاب کیا۔ اس کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو روانہ ہونے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ پہلے نباج کے نزدیک زرود میں قیام کرنا۔ نقشہ پنجم کے ذریعہ ظاہر ہوگا کہ عراق کی مہم کے لیے مسلمانوں نے یہی راستہ عام طور پر استعمال کیا اور دومۃ الجندل والا راستہ مشکل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھی یہ حکم دیا کہ نباج اور زرود کے علاقوں سے بہادر اور غیر تمند مسلمانوں کو اپنے لشکر میں شامل کر لینا اور باقی ہدایات حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو وقتاً فوقتاً ملتی رہا کریں گی۔ یہ بڑا صحیح طریقہ تھا کہ تمام ہدایات ایک ہی وقت میں نہ دیں بلکہ ہدایات ضرورت کے مطابق دیں اور جیسے ہی ہم ان جگہوں میں مجاہدین کے کارواں یا قافلہ کے ساتھ چلتے جائیں گے، یہ نکتے ہم پر خود بخود کھلتے جائیں گے۔

کچھ لوگوں کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نفرت

طبری کے مطابق محمد ﷺ بن سوقہ کی ایک روایت ہے کہ انہی دنوں کچھ اور لوگ جہاد میں شرکت کے لیے آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ بڑی بے رُخی اختیار کی۔ جب آپ رضی اللہ عنہ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کراہت آتی تھی، اور ان کے لیے ان کے دل میں اندرونی نفرت پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال وہ لوگ جہاد کے لئے چلے گئے کہ ظاہری طور پر ٹھیک تھے اور دلوں کے حالات اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں لیکن یہ شرپسند لوگ تھے اور کسی دنیاوی غرض کے لئے جنگوں میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو فتنے پیدا ہوئے اُن میں ان لوگوں نے نہ صرف شرکت کی بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے مردود بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے مزید کمک

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی روانگی کے بعد بھی خلیفۂ دوم نے لوگوں کو جہاد پر جانے کی ترغیب کے سلسلہ میں تبلیغ جاری رکھی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر بنو اسد اور بنو تمیم سے چار ہزار مجاہدین تیار ہو گئے۔ بنو اسد طلیحہ کا قبیلہ تھا اور بنو تمیم مالک بن نویرہ کا۔ ان قبائل کے سرداروں کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ وہ زرود اور شراف کے درمیان پڑاؤ کریں اور جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ زرود سے شراف کی طرف کوچ کریں تو وہ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ ذی قار سے ہٹ کر اب شراف میں مقیم تھے۔

ابلہ (بصرہ) کے علاقوں سے امداد

عراق کی فتوحات کے سلسلہ میں ابلہ، پہلی ہی مہم میں فتح ہو گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ بعد میں بیان کیا گیا تھا کہ حیرہ کی طرف کوچ کرتے وقت حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ابلہ کے علاقوں سے سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو واپس بلا لیا تھا۔ مسلمان لشکر والے مدینہ سے رابطہ کے لیے نباج کے ساتھ زرود اور شراف والا چھوٹا راستہ استعمال کرتے تھے جیسا کہ نقشہ پنجم میں دکھایا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں جب، حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ کو عراق بھیجا گیا تو ابلہ والے علاقوں پر بھی کچھ توجہ دی گئی اور حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ بن قتادہ کے ماتحت ایک دستہ اس علاقے میں بھیجا گیا، اور پھر جلدی سے ان کی مدد کے لیے حضرت شریح رضی اللہ عنہ بن عمرو کو بھیجا گیا، جن کی وہاں پر جاتے ہی ایک جھڑپ میں شہادت ہو گئی۔ ان حالات کی وجہ سے دو ہزار کا ایک لشکر حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بن غزوان کے ماتحت بھیجا گیا کہ علاقہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اور گو اس وقت تک اس علاقہ کی اہمیت زیادہ نہ تھی لیکن ایرانیوں کے لیے یہ علاقہ اہم تھا اور اس پہلو کی وضاحت ہو چکی ہے، چنانچہ وہاں زیادہ لشکر بھیجنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خوزستان اور فارس کے صوبوں کے

سلسلہ میں بھی ایرانی حکومت کو کچھ فکر پڑ جائے۔

نقشہ دوازدہم کا غور سے مطالعہ کریں تو اس علاقہ کے متعدد شہر یعنی ابلہ، مناظر، اہواز، رم ہرمز اور بندر شاہ پور وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں یہاں پر حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ اگر ذرا پیش قدمی کرتے تو خوب جھڑپیں ہوتی تھیں اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت عظیم صحابی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نے اس علاقہ میں بڑی بہادری دکھائی۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپ حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ کے قبیلہ ثقیف سے تھے اور آگے بھی جنگوں میں وہ اکثر ہمارے ساتھ رہیں گے، آپ کا ذکر جلالِ مصطفےٰ میں بھی موجود ہے۔ بہر حال اب ان حالات میں خلیفہ دوم نے حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا وہ اپنی کاروائیاں دیکھ بھال تک محدود رکھیں اور صرف گشتی کاروائیاں کریں۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کو کچھ کمک کے ساتھ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ سات سو سواروں کے دستہ کے ساتھ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شمولیت کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور جس دن حضرت سعد رضی اللہ عنہ، شراف پہنچے تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ از خود کئی سواروں یا مجاہدین کے برابر تھے۔ سیاست کے ماہر تھے اور سفارتی کاموں کے لیے بھی بڑے موزوں تھے، آپ کے ساتھ تیسری اور چوتھی کتاب میں بھی ملاقات رہے گی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تیاری

خلیفہ وقت کے احکام کے تحت حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑی جنگ کی تیاری میں مصروف تھے، ویسے بھی ایسی تیاری حکمت عملی کے تحت محاذِ جنگ سے ذرا پیچھے کسی پُر امن اور ایسی جگہ ہونا چاہیے تھی جو مسلمانوں کے دوست ریگستانی علاقہ میں ہو۔ ادھر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ دوم کے احکام کے تحت ذی قار سے ہٹ کر شراف پہنچ چکے تھے اور اب شراف اور زرود کے درمیانی علاقے اسلامی لشکر کی جمگاہ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ چار ہزار کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ چار ہزار مجاہدین کی کمک بعد میں آئی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود کوئی سات ہزار مجاہدین بھرتی کر چکے تھے۔ تقریباً پندرہ ہزار مجاہدین اسلام کے علم کے نیچے اکٹھے ہو چکے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے زرود سے شراف کی طرف کوچ کا ارادہ کیا۔ اس دوران حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھی اپنی فوج کی تعداد کو کوئی بارہ ہزار کے قریب پہنچا چکے تھے۔ اس طرح ایران کے محاذ پر تمام فوج کی نفری تقریباً تیس ہزار کے نزدیک پہنچنے والی تھی کہ روایت ہے کہ جنگ قادسیہ کے بعد تیس ہزار کے قریب مجاہدین میں مالِ غنیمت تقسیم ہوا۔ لشکر کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے کہ شام سے چھ ہزار کی کمک بھی جنگ قادسیہ کے آخری دنوں میں جنگ میں شامل ہو گئی۔ اور مالِ غنیمت کے ساتھ جو تقریباً تیس ہزار نفری کا لفظ ہے، تو اس سے یہ اظہار مقصود ہے کہ اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد میں اسلامی افواج اس محاذ پر کسی جنگ میں شریک نہ ہوئی تھیں

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت

اب ہم اسلام کے عظیم فرزند اور ہماری افواج کے ایک عظیم سپہ سالار کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو ان عظیم مجاہد کی رفاقت نہ حاصل ہو سکی، پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جسر کی جنگ میں شدید زخمی ہوئے اور ان زخموں کے باوجود بویب میں دشمن کو شکست دی لیکن چہرہ مبارک کا زخم بڑا شدید تھا۔ وہ جسم کو کھائے جا رہا تھا اور زندگی کے آخری ایام میں وہ زیادہ حرکت نہ کر سکتے تھے۔ اس عظیم مجاہد کو بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرح میدانِ جنگ کی شہادت نصیب نہ ہوئی۔ یہ اللہ کا راز ہے، ورنہ بدن پر کوئی خالی جگہ نہ تھی جہاں زخم کا نشان نہ ہو۔ منتظر تھے کہ شاید حضرت سعد رضی اللہ عنہ شراف پہنچ جائیں تو اُن کو خوش آمدید بھی کہیں اور حالات کا جائزہ بھی پیش کریں لیکن خلیفہ دوم کے احکام کے تحت حضرت سعد رضی اللہ عنہ ابھی زرود میں ہی تھے کہ اسلام کے یہ عظیم فرزند حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مورخین و مبصرین نے اس واقعہ کو عجیب رنگ دیئے ہیں کسی نے لکھا کہ مدینہ شریف کے مرکز نے تیسری دفعہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو مایوس کیا اور سپہ سالار نہ بنایا کسی نے بات کو آگے بڑھایا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ یہ توقع کرتے تھے کہ مثنیٰ رضی اللہ عنہ ان کے پاس آخر زرود میں رپورٹ پیش کریں اور ان کو حالات سے آگاہ کریں۔ اس لئے وہ شراف نہ گئے، کسی نے پھر طول دیا کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو امید تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جلدی سے آگے والے محاذ پر پہنچ جائیں گے لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کو مایوس کیا۔

فضول جائزے اور تبصرے

ہمارے لحاظ سے یہ سب جائزے اور تبصرے فضول ہیں بلکہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مبصرین کے الفاظ بھی وہ نہیں جو ہم نے لکھے ہیں۔ انہوں نے بعض جگہ دونوں عظیم رہنماؤں کی بے ادبی کی ہے۔ ہمارا جائزہ واقعات اور نتائج کے تحت ہے کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ زخموں سے نڈھال تھے اور اب وہ اپنے خالق حقیقی سے ملنے والے تھے۔ ایسے عظیم انسان کے دل میں سپہ سالاری کی خواہش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے سب کام اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے ہوتے ہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ خلیفہ کے احکام کو بجالاتے ہوئے زرود میں ٹھہرے ہوئے تھے اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ کے احکام کے تحت شراف میں ٹھہر کر ''چھاپہ مار'' کارروائیوں میں مشغول تھے۔ تیس ہزار کے لشکر کی جمگاہ، اس کی کفالت اور بحالی کوئی آسان کام نہ تھا۔ آگے کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نہ صرف آخری سانس تک جہاد میں مصروف رہے بلکہ آنے والے جہاد میں شرکت کے بانی مبانی رہے کہ آئندہ کے لیے تجاویز مرتب کر گئے تھے۔

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی آخری دو کاروائیاں

حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے بستر مرگ پر تجاویز مرتب کیں کہ دریائے فرات کو پار نہ کیا جائے۔ افواج کو قادسیہ کے علاقہ میں تعین کیا جائے اور وہاں سے آگے بڑھ کر دریاؤں کے طاس اور سواد کے علاقوں پر صرف چھاپے مارے جائیں اور ایرانیوں کا ایسا ناک میں دم کیا جائے کہ وہ ہمارے ساتھ ہماری مرضی کی زمین پر دریائے فرات کے اس طرف جنگ پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے بعد آپ نے عظیم صحابی حضرت بشیر رضی اللہ عنہ بن الخصاصہ کو بلایا اور لشکر کی کمانڈ اُن کے سپرد کی۔

اُن کا وقت قریب آ گیا تھا اور فرمایا کہ میری وفات کے دوسرے دن میرے بھائی معنیٰ رضی اللہ عنہ اور میری بیوی سلمٰی کو زرود میں حضرت سالارِ لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کی خدمت میں بھیج دینا۔ وہاں پہنچ کر میرا بھائی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو شراف کے سارے حالات سے آگاہ کرے گا اور میری آئندہ کی تجاویز اور حکمت عملی سالارِ لشکر کے گوش گزار کرے گا۔ ساتھ ہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عرض کرنا کہ عدت ختم ہونے کے بعد اگر وہ پسند کریں تو میری بیوی کے ساتھ نکاح کر کے اس کی عزت افزائی کریں۔ اور اگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایسا نہ کرنا چاہیں تو پھر میرا بھائی معنیٰ رضی اللہ عنہ میری بیوی کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ دوسرے دن حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ اپنی بھاوج سلمٰی کے ساتھ شراف کی طرف سے اسلام کے سپہ سالار کو حالات سے باخبر کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

تبصرہ

قارئین ذرا رُک جایئے۔ اپنے اندر جھانک کر دیکھئے، جب حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کی نوجوان بھاوج، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم رفیق حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سامنے سب حالات بیان کئے ہوں گے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر کیا گزری ہوگی؟ اور آپ پر کیا گزر رہی ہے، یہ سلمٰی کی عزت افزائی ضرور تھی لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی عزت افزائی بھی ضرور تھی کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے اُن کو اپنے بھائی پر بھی ترجیح دی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آبدیدہ ہو کر حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ کی ہر بات کو تسلیم کیا۔ حضرت سلمٰی رضی اللہ عنہا کو نکاح میں لینے میں اپنی عزت افزائی سمجھی اور ان کے بطن سے حضرت عبداللہ پیدا ہوئے۔ حضرت سلمٰی رضی اللہ عنہا کا تعلق بنوتغلب سے تھا۔ ویسے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے متعدد قبائل میں شادیاں کیں۔ عمر بن معدیکرب رضی اللہ عنہ جو بنوکندہ سے تھے، ان کی پوتی کے ساتھ بھی شادی کی اور بنوثعلبہ اور بنوبکر وغیرہ متعدد قبائل میں شادیاں کیں۔ بہر حال ہم حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو سلام عرض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں عرض کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جیسے غیرت مند اور بہادر لوگ پیدا کر کے ہم مایوسیت سے پھر سے نکلیں اور ہماری ذلت کی گھڑیاں ختم ہوں۔

شکایت ہے مجھے یا ربّ خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

(اقبالؔ)

دینِ فطرت

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے ہاں بیوہ کی شادی کا تصور ہی ختم ہوگیا ہے اور غیروں کی نقالی میں ہم ایک شادی اور بیوہ کو ساری عمر بیوہ رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کی یہ حالت تھی کہ مرنے سے پہلے اپنی عورتوں کو شادی کی اجازت دے جاتے تھے اور سردار یا شہید کی بیوہ کے ساتھ شادی کر کے، بیوہ اور اس کے خاوند دونوں کی عزت کی جاتی تھی۔ حضرت جعفر طیارؓ جنگ موتہ میں شہید ہوئے۔ آپؓ کی زوجہ اسماءؓ بنت عمیس تھیں جو حضرت امامہؓ بنت امیر حمزہؓ کی خالہ بھی تھیں اور جن کا ذکر جلالِ مصطفےٰ میں ہے کہ حضور پاک ﷺ نے امامہؓ کو ان کے سپرد کیا۔ حضرت اسماءؓ کے بطن سے حضرت عبداللہؓ اور محمد بن جعفرؓ پیدا ہوئے، حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت اسماءؓ سے نکاح کیا۔ جن کے بطن سے محمد بن ابوبکرؓ پیدا ہوئے۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد ان کو غسل بھی حضرت اسماءؓ نے دیا۔ اس وقت تک حضرت فاطمۃ الزہراؓ وفات پا چکی تھیں۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت علی المرتضیٰؓ نے ان کے ساتھ نکاح کیا اور ان کے بطن سے حضرت علیؓ کے دو بیٹے حضرت یحییٰؓ اور حضرت عونؓ پیدا ہوئے۔ اگر بنت رسول ﷺ حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ کے گھر نہ ہوتیں تو شاید حضرت علیؓ اپنی بھاوج کے ساتھ حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد ہی نکاح کر کے اپنے مرحوم بھائی اور بھاوج کی عزت افزائی کرتے۔ بہرحال حضرت عبداللہؓ و محمدؓ پسران جعفرؓ اور حضرت محمدؓ بن ابوبکرؓ کی پرورش بھی زیادہ تر حضرت علیؓ کے گھر ہوئی کہ اُن کی والدہ کو اللہ کے شیرؓ کی زوجیت کا فخر بھی حاصل ہوگیا۔ حضرت مثنیٰؓ کی بیوہ کے ساتھ حضرت سعدؓ کی شادی اور حضرت خالدؓ کی شادیوں پر غلط تبصروں کو ختم کرنے کے لیے یہ تمام حالات طبقات ابن سعدؓ کے مختلف ابواب سے اخذ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں کہ وہ دینِ فطرت کو سمجھیں اور تاریخ اسلام کے بامقصد مطالعہ کے مدعا کو بھی سمجھیں کہ اسلام نے جنسی تعلقات کو قانونی حیثیت دے کر معاشرہ سے زنا کی لعنت کو کم کیا۔ اور اگر محاذِ جنگ پر تو اگر ایسا نہ ہو تو اللہ ہی حافظ ہے۔

ماحصل

ان تمام بیانات اور جائزوں کے بعد ہم یہ کہنے کے قابل ہیں کہ حضرت سعدؓ اور حضرت مثنیٰؓ کے

درمیان نہ کوئی غلط فہمی تھی اور نہ کوئی رنجش۔ مسلمان کسی جھوٹے تفاخر سے نفرت کرتے تھے۔ سب کام کسی حکمت عملی کے تحت ہو رہا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ زرود میں جو دیر لگا رہے تھے وہ خلیفۂ دوم کے احکام کے مطابق تھا۔ اور محاذِ شام سے بھی فوجوں نے عراق کے محاذ پر آنا تھا۔ امید واثق ہے کہ اس کے بعد قارئین اختلافات کا وسعت نظری سے مطالعہ کریں گے اور دین اسلام کے باغ سے خوشبو کی تلاش کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے احکام

حضرت سعد رضی اللہ عنہ جب زرود میں تین ماہ قیام کر چکے اور پندرہ ہزار کے قریب لشکر بھی اکٹھا ہو گیا تو پھر آپ نے خلیفہ دوم سے شراف کی طرف کوچ کی اجازت مانگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ وہ ان کو تمام حالات سے باخبر رکھیں کہ اپنی فوج کی تعیناتی کیا ہے وہ کیسے چھاپے مار رہی ہے اور ایرانوں کے ردِ عمل وغیرہ کیا ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم کو تمام تر تفصیل لکھی اور ساتھ ہی حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے تجزیہ سے بھی آگاہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی اور اس کی دوررس نگاہوں کی تعریف کی۔ ساتھ ہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم والا طریقہ نہ بھول جانا، اپنے لشکر کو اس طرح دہائیوں میں تقسیم کرو کہ ہر دس آدمی پر ایک امیر اور پھر دس امیروں پر یا سو آدمیوں پر ایک ایک امیر اعلیٰ۔ اس کے بعد ایک ہزار کا دستہ ہو جس پر ایک امیر ہو وغیرہ۔ چنانچہ اس طرح لشکر مکمل طور پر رابطوں میں باندھ دیا جائے، امارت کے لیے زیادہ موزوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھا جاتا تھا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تین سو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم تھے جن میں ستر صحابہ کو جنگ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ سات سو نوجوان مجاہدین وہ تھے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرزندان تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزید خطوط

چند دن بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ایک اور خط ملا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک ساتھ دو خط لکھے، ایک شام میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ عراق سے جو فوج حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام گئی تھی، اسکو واپس کر دیا جائے۔ شام سے عراق کی افواج کی واپسی کی تاریخ اور سنہ ہجری کے سلسلہ میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جنگ قادسیہ اور جنگ یرموک کی تاریخوں میں اختلاف ہے اور شام کے معاملات میں تو بہت اختلاف ہے کہ آیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جنگ یرموک سے پہلے سبکدوش کیا گیا یا جنگ کے دوران قاصد آیا۔ ان باتوں پر تفصیل سے بحث دوسری کتاب میں ہوگی اور اختلاف ایک چھوٹے نکتہ کی وجہ سے ہے۔ جس کی وضاحت ان حالات ہی میں بہتر رہے گی۔ فی الحال ہم یہ جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آیا شام سے عراق کی فوج دو حصوں یعنی ایک حصہ پہلے اشعث بن قیس کے

ماتحت آیا۔ ہمارا تجزیہ ہے کہ عراق کی فوج صرف ایک ہی حصہ میں آئی اور وہ حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ کے ماتحت آئی جس کے ہراول کا کام حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، اور وہ عین اس وقت پہنچے جب جنگ قادسیہ شروع تھی اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اشعث بن قیس تو مدینہ شریف سے ایران کے محاذ پر آئے تھے۔

اشعث بن قیس والی بات ہمیں غلط نظر آتی ہے کہ وہاں لکھا گیا ہے کہ عمر بن معدیکرب بھی اشعث بن قیس کے ساتھ تھا اور وہ جنگ یرموک میں حصہ لینے کے بعد آئے۔ اشعث بن قیس شام کی جنگوں میں شریک تھے۔ مدینہ آئے ہوئے تھے۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی طرح خلیفۂ دوم نے اُن کو بھی عراق کے محاذ پر بھیج دیا۔ انہی دنوں عمر بن معدیکرب کو معافی ملی اور اُن کو بھی حضرت اشعث وغیرہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق بھیج دیا۔ ہم یہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔

دوسرا اختلاف اس چیز کا ہے، جنگ یرموک پہلے ہوئی یا جنگ قادسیہ۔ ہمارا جائزہ ہے کہ جنگ قادسیہ پہلے ہوئی۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ جنگ یرموک کے بعد عراق کی فوج کو واپس کیا گیا ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جنگ یرموک کی کہانی میں حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ یا کسی اور مجاہد کی کاروائی کا ذکر نہیں ہے جو بعد میں عراق آئے۔ پھر طبری کے لحاظ سے جنگ قادسیہ محرم چودہ یا پندرہ ہجری میں ہوئی یعنی خود طبری میں دو روایتیں ہیں اور صحیح یہ ہے کہ جنگ قادسیہ محرم پندرہ ہجری میں واقع ہوئی۔ اس پر البتہ سب متفق ہیں کہ جنگ یرموک بھی پندرہ ہجری کے رجب کے مہینہ میں ہوئی تو ظاہر ہے کہ ہر حالت میں جنگ قادسیہ، جنگ یرموک سے پہلے ہوئی۔

بعد کے چند مبصرین نے جنگ قادسیہ کو شوال یا ذی قعد پندرہ ہجری کا واقعہ قرار دے کر جنگ یرموک کو جنگ قادسیہ سے پہلے کا واقعہ قرار دے دیا۔ اس سارے تجزیہ کی بنیاد صرف ایک راوی کے ایک لفظ پر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں سب سے پہلے یرموک کی فتح کی خبر سنی۔ اصل میں یہ یرموک کی پہلی جنگ کی فتح تھی اور ایک حرف کی تبدیلی سے مؤرخین نے تمام حالات کو خواہ مخواہ گڈمڈ کر دیا۔ دراصل یرموک تین دفعہ فتح ہوا، اس لئے بھی بیانات گڈمڈ ہوگئے۔ فی الحال ہم اس نکتہ پر قائم ہیں کہ جنگ قادسیہ پہلے واقع ہوئی، اور جنگ یرموک بعد میں کہ جنگ یرموک کے بعد شام کو اہلِ روم نے الوداع کہہ دیا اور جنگ یرموک اگر پہلے واقع ہو جاتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام سے آدھی فوج کو عراق بھیج سکتے تھے۔ چند دن بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ شراف روانہ ہو جائیں اور لکھا:

''کہ آپ کا ایسی قوم کے ساتھ واسطہ ہے کہ جو بظاہر مضبوط ہے لیکن اندر سے کھوکھلی ہے۔ ان کے قریب سے بچ کر رہنا۔ جہاں مقابلہ ہو سختی کے ساتھ پیش آؤ۔ اور ان کی فوجوں کا تماشہ دیکھنے میں نہ محو ہو جانا۔ یہ لوگ بڑے فریبی اور مکار ہیں اور ان کی چال بازیوں کا توڑ ضرور کرنا۔ قادسیہ عرصہ سے فارس کا دروازہ ہے۔ ان لوگوں کی تمام مادی ضروریات اسی دروازہ سے پوری ہوتی ہیں۔ یہ نہایت شاداب، دلچسپ اور مستحکم مقام ہے جب وہاں پہنچو تو اپنی فوجی

چوکیاں اس کی گھاٹیوں میں قائم کرنا اور باقی لشکر کا قیام پہاڑوں اور نرم زمین کے درمیان پانی کے چشموں پر ہونا چاہیے، وہاں پہنچ جانے کے بعد کبھی پیچھے ہٹنے کے بارے میں بالکل نہ سوچنا۔ تمہارے وہاں پہنچنے کے بعد دشمن میں ہل چل مچ جائے گی اور وہ مجبور ہو کر پوری قوت کے ساتھ آپ پر حملہ کریں گے، آپ نے ثابت قدمی، استقلال اور پامردی سے مقابلہ کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے کہ فتح آپ کی ہوگی اور اس کے بعد وہ کبھی بھی تمہارے مقابلہ میں نہ آسکیں گے۔ اگر خدانخواستہ مقابلہ میں ناکامی ہوئی تو پہاڑ اور ریگستان آپ کے عقب میں ہوگا۔ آپ ان علاقوں میں پناہ لے کر دوبارہ تیار ہو سکتے ہیں۔ دشمن کو ان علاقوں کی واقفیت نہیں ہے۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا قادسیہ کی طرف کوچ

اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ جس دن شراف سے قادسیہ کی طرف کوچ کرنے والے تھے۔ اسی دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اور خط آیا جس میں لکھا تھا کہ "جب فلاں دن آجائے تو اپنی فوجوں کو لے کر روانہ ہو جائیں اور عذیب الجانات اور عذیب القوادس کے درمیان پہنچ کر، وہاں مشرق اور مغرب کی طرف چھاپہ مار کاروائیاں شروع کی جائیں۔"

اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ بمشکل منزل پر پہنچے ہوں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اور خط آیا جس میں لکھا تھا کہ "اپنے دل کو مضبوط رکھنا۔ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا۔ کوئی خوف دل میں نہ لانا۔ **لاحول ولا قوۃ** کا اکثر ورد کرتے رہا کریں۔ مجھے دشمن کے بارے مکمل اطلاع دینا کہ اس کا سپہ سالار کون ہے؟ ان کی فوجیں آپ سے کتنی دور ہیں مجھے محل وقوع سے اس طرح واقف کرو کہ جیسے میں سب حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور ان حالات کو بھانپ لینے کے بعد اور ان کا جائزہ لینے کے بعد ہی اور ہدایات جاری کر سکتا ہوں۔" اور آخر میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جواب

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جواب از خود آئندہ کے میدان جنگ کے زمینی حالات کا بڑا پُر معنی اور مختصر جائزہ ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے لکھا "قادسیہ، خندق اور دریائے عتیق کے درمیان ایک شہر ہے، اس کے بائیں جانب بحر احضر ہے، جس کا پھیلاؤ حیرہ تک دو راستوں کے درمیان سے نمودار ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک راستہ بلندی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ایک نہر کے کنارے کنارے جاتا ہے۔ جس کو الحصوص کہتے ہیں۔ اس راستے سے گزرنے والا آدمی خوانق اور حیرہ کے درمیان میں پہنچتا ہے اور قادسیہ کے دائیں جانب وہاں کے دریاؤں کی ایک ترائی ہے۔"

(نقشہ دہم قادسیہ کے محل وقوع کا کچھ خاکہ ظاہر کرتا ہے اور صف بندی بھی۔)

"سواد کے جن قبائل یا باشندوں نے پہلے مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کی تھی، گو ان علاقوں میں ہمارے انخلا کے بعد وہ اہل فارس کے طرفدار ہیں مگر ہماری امداد کے لیے بھی تیار ہیں۔ ایرانی ہمارے مقابلہ پر رُستم کو بھیج رہے ہیں۔

وہ ہمیں ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن انشاء اللہ ہم اُن کو ختم کر دیں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مزید ہدایات

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اوپر والے خط کا جواب یہ دیا کہ "اِس علاقہ میں قائم دائم رہیں اور دشمن کو حرکت کرنے دیں۔ انشاء اللہ اسی علاقہ میں دشمن آپ کے ہاتھوں ایسا برباد ہوگا کہ اُس کی شکست کے بعد آپ کو مدائن تک کوئی چیز نہ روک سکے گی۔"

بلکہ ایک خط میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد کو یہاں تک لکھا: "کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آنے والی جنگ میں اہل اسلام کو ایک بہت بڑی فتح حاصل ہوگی۔"

اس کے علاوہ خلیفہ نے ہدایات دیں کہ چند مجاہدین کا ایک وفد ایران کے بادشاہ یزدجزد کے ہاں بھیجا جائے کہ ایک دفعہ اس کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔

قادسیہ کا میدانِ جنگ

اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ، خلیفۂ دوم کو باخبر رکھتے ہوئے اپنی چنی ہوئی زمین پر صف بندی کر رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ کو جیش المقدم کے طور پر آگے بھیجا جنہوں نے پہلے عذیب الہجانات میں پڑاؤ کیا اور پھر آگے بڑھ کر عتیق اور خندق کے درمیان[1] پل کے سامنے صف بند ہو گئے۔ باقی لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی کمانڈ میں پیچھے تھا اس علاقے میں اس سے پہلے اہل اسلام کا کوئی اتنا بڑا لشکر اکٹھا نہیں ہوا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ ایرانیوں کو اس میدانِ جنگ میں کیسے لایا جائے۔ اس کے لئے جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مختلف چھاپہ مار دستے متعین کیے جنہوں نے سواد کے علاقہ میں اودھم مچا دی۔ ان دستوں کی کمانڈ بڑے نڈر اور دلیر نوجوان کر تے تھے جو واسط سے لے کر انبار تک جگہ جگہ ایرانی چوکیوں اور مال خانوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ خاص کر حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث، حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو تو سرپٹ گھوڑوں کی پیٹھوں ں پر سوار تھے اور ان کے دستے جگہ جگہ اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے پھرتے تھے۔

مسلمانوں کے چھاپوں کی وجہ سے حکومت کے کارندے یزدجرد کے دربار میں بار بار مسلمانوں سے بچاؤ کے لیے درخواست دے رہے تھے۔ ایرانی مجبور ہو رہے تھے کہ مسلمانوں کے کچھ کاروائی کریں۔

دوم اپنی سرحد پر اتنا بڑا لشکر کوئی ملک برداشت نہیں کر سکتا اور اگر رستم کا خیال تھا کہ چھوٹے چھوٹے لشکر بھیج کر

(۱) نقشہ دہم سے استفادہ کریں۔

مسلمانوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑی جائیں لیکن نوجوان یزدجرد فیصلہ کن جنگ کا خواہاں تھا۔ وہ ایسا اس لئے کرنا چاہتا تھا کہ سول انتظامیہ تباہ ہو رہی تھی چنانچہ حکومت کے جاگیردار اور مشیر سخت اور بھرپور فوجی کاروائی کے حق میں تھے۔

نتائج واسباق

ہمارا اگلا باب اس باب کی کاروائیوں کے نتائج کے اثرات تدبیرات کو عملی جامہ پہنانے کی کاروائی ہے، کہ حکمت عملی کے ماتحت بامقصد جنگ، تانے بانے ملا کر پیش رفت کر رہی ہے۔ مسلمانوں نے دنیا کو ایسے آسانی کے ساتھ فتح نہ کر لیا تھا۔ ہماری تاریخ کی کتابیں نامکمل اور بے مقصد ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ کتنی سخت تیاری کی ضرورت ہوتی ہے، حکمت عملی، تدبیرات اور تجاویز کو ڈھالنا آسان کام نہیں۔ بلکہ مسلمانوں نے جو حکمت عملی یا تجاویز مرتب کیں اُن کو پرکھا، ان کے نتائج کا اندازہ لگایا اور نتائج کے اثرات کا بھی جائزہ لیا تو پھر لائحہ عمل تیار کرتے تھے۔ ہمارے ہاں آج کل جب اہل اسلام پر کوئی مصیبت آئے تو جہاد جہاد پکار اُٹھتے ہیں۔ کبھی اسلامی اُمت کی وحدت کے نعرے لگاتے ہیں اور کبھی اسلامی دولت مشترکہ کے اور کبھی ملے جلے دفاع کی بات کرتے ہیں۔

یہ سب زبانی کلامی جمع تفریق ہے۔ جہاد ایک طرز زندگی ہے۔ اس کو امن کے زمانے میں جاری وساری کرنا پڑتا ہے۔ پوری قوم کو فن سپہ گری کی شدھ بدھ کی ضرورت ہوتی ہے اور ساری قوم کو اس طرح رابطوں میں باندھ دیا جاتا ہے۔ کہ وہ بنیان الرصوص بن جاتے ہیں۔ پیشہ ور فوج کو بنیاد ایسے ہی ڈھانچے پر ہوتی ہے، تو پھر جہاد بالسیف کی بات کر سکتے ہیں اور اسلامی ممالک تب اکٹھے ہو سکتے ہیں جب سب کا سیاسی فلسفہ اسلامی ہو۔ آج ہم بھان متی کا کنبہ ہیں، تو جہاد کیسے کریں۔؟ اب ذرا اس زمانے کے واقعات کا اپنے حالات سے موازنہ کریں:۔

۱۔ حضرت عمر ﷺ کی ذاتی خواہش اور دلچسپی تھی کہ اہل ایران کے ساتھ جنگ کی سپہ سالاری وہ خود فرمائیں اور بڑی مشکل سے اُن کو اس سے تب روکا جا سکا کہ عشرہ مبشرہ سے ایک صاحب اس کام کے لیے مل گئے ہمارے ہاں یہ کہتے ہیں کہ حاکم اعلیٰ اور اس کے سب مشیر غیر فوجی یا سویلین ہونا چاہئیں۔

۲۔ حضرت سعد ﷺ جیسے عظیم صحابی کو ایران کی فتح کے لیے سپہ سالار بنایا اور مجاہدین کے دستے فوراً محاذ پر روانہ کر دیئے گئے۔ اور وہاں پر حضرت مثنیٰ ﷺ مستعدی سے محاذ پر موجود تھے۔ ہم ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اپنے گھروں میں سوئے ہوئے تھے اور لاہور، دستوں کے کئی سپہ سالار دن کے نو بجے محاذ پر پہنچے۔

۳۔ پوری قوم مجاہدین کی تھی اور حضرت سعد ﷺ راستے میں مجاہد اکٹھے کرتے گئے، ہماری قوم فن جنگ سے نابلد ہے اور صرف نعرے لگا سکتی ہے۔

۴۔ علاقوں سے کمک اور جمگاہ کے بارے کتنے خوبصورت فیصلے کئے۔ خیر اس سلسلہ میں ہماری افواج بھی بڑی

ماہر ہیں۔

۵۔ محاذ پر جانے کے لیے حکمت عملی کے طریق کار، علاقے کا مطالعہ اور خلیفۂ وقت کی بروقت ہدایات۔ ہماری فوج کا یہ پہلو کافی اچھا ہے لیکن اس کو اور اسلامی بنانے کی ضرورت ہے۔

۶۔ حضرت مثنیٰ کی وصیت اور آئندہ کے حالات کے بارے سمجھ اور تجاویز۔ یہ معاملہ بڑا اہم ہے اور اس کاروائی میں ہم بڑے کمزور ہیں۔قوم اور فوج کو اس سلسلہ میں اور تربیت کی ضرورت ہے۔

۷۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خلیفۂ وقت کو ہر معاملہ سے آگاہ کرنا اور خلیفۂ وقت کی ہدایات۔ یہ پہلو اب ہر ملک میں ٹھیک چل رہا ہے۔صرف زیادہ سچائی کی ضرورت ہے۔ہم کچھ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔

۸۔ اپنی چنی ہوئی زمین پر صف بندی اور زمین کا مطالعہ، بڑا وسیع مضمون ہے۔اور ہماری افواج کو ان پر اور زیادہ زور دینا چاہیے۔اور بہت زیادہ زور۔

۹۔ دشمن کے بارے خبر اور دشمن کو اپنی مرضی کی زمین پر لڑنے کے لیے مجبور کرنا بڑا اہم سبق ہے اور ہر سطح ہماری تدبیرات، فن اور ہنر کی بنیاد اس نظریہ پر ہونی چاہیے۔

۱۰۔ اللہ اکبر کی صدا، لاحول ولاقوۃ کا ورد، اللہ کا ذکر، ہم ان باتوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔اپنی فوج کو ان چیزوں پر زور دینا چاہیے۔

۱۱۔ اسلامی تاریخ کے بامقصد مطالعہ میں ہمارے لیے لفظ لفظ میں سبق ہے۔لشکر کی تنظیم، امراء کو مقرر کرنا، صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان، بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیٹوں کی شرکت، سب پہلو بڑے اہم ہیں۔یاد رہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمارے کئی ارباب حکومت نے اپنے بیٹوں کو محاذ پر جانے نہ دیا۔

۱۲۔ مسلمانوں کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے کردار سے سبق سیکھ کر اس دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہیے۔ اور یہ ذلت کی زندگی ہمارا حصہ نہیں ہونا چاہیے۔

اکیسواں باب

جنگِ قادسیہ اور طرفین کی تیاری

اہل اسلام اور ایرانی بادشاہت کے درمیان ایک فیصلہ کن اور بھرپور جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ صرف جگہ اور وقت کا تعین باقی تھا۔ دونوں طرف تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ مسلمان ایک دفعہ حیرہ کو فتح کر چکے تھے۔ انبار تک ان کے قلمرو میں تھے۔ واسط تک وہ ایرانیوں کو شکست دے آئے تھے۔ بابل اور کئی اور مقامات میں دریائے فرات کے مشرق میں بھی مسلمان ایرانیوں کو شکست دے چکے تھے لیکن مرکز سے حکمت عملی کے تحت وہ مدائن کی طرف اس وقت پیش قدمی کرنے کو تیار نہ تھے جب تک ایرانی فوج کو اپنی مرضی کے مقام پر تہس نہس نہ کر دیتے۔

مسلمانوں کو کوئی جلدی نہ تھی اور وہ اپنے لشکر کی بحالی اور کفالت کے لیے عراق کے زرخیز علاقوں سے جو کچھ حاصل کر سکتے تھے کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو فتوحات حاصل کی تھیں۔ ان کی وجہ سے ایران کی حکومت میں ہل چل مچ چکی تھی۔ ان کے نظم و نسق کے بخیے اُدھیڑ دیئے گئے تھے اور اہل ایران کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔

ایرانیوں کا ردعمل

ایرانی دور دور کے علاقوں کے لوگوں یعنی کردستان، ترکستان، خراسان اور آرمینیا کے صوبہ جات کے باشندوں کو مدائن کے نزدیک ایک چھاؤنی ساباط(۱) میں اکٹھا کر رہے تھے تا کہ مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے لیکن رستم کسی فیصلہ کن جنگ سے کترا رہا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو رستم کو علم نجوم پر دسترس تھی اور اس کو آگے کے

(۱) نقشہ نہم سے استفادہ کریں۔

حالات کچھ دھندلے نظر آرہے تھے۔ دوم وہ ہمیشہ دوسروں کو قربانی کا بکرا بناتا رہا۔ سوم حکمت عملی کے لحاظ سے بھی رستم کا جائزہ درست تھا۔ کہ ایک بڑی اور فیصلہ کن لڑائی میں شکست کو برداشت کرنے کی سکت اب ایرانی سلطنت میں ختم ہو چکی تھی۔

چنانچہ رستم ہر قسم کے داؤ اور فریب سے کام لے رہا تھا۔ اس نے یزدجرد کو صاف کہا کہ لڑائی تو ہوتی ہی مکروفریب سے ہے بہتر ہے مسلمانوں کے ساتھ داؤ اور مکروفریب سے کام لیا جائے لیکن یزدجرد پر دور دراز کے علاقوں کے جاگیردار لگاتار دباؤ ڈال رہے تھے کہ انہیں مسلمانوں سے بچایا جائے۔

اہلِ اسلام کا وفد

اسی دوران خلیفۂ دوم کے احکام کے تحت حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے چودہ ارکان پر مشتمل چند مدبّر، جری اور وجیہہ مسلمانوں کا ایک وفد یزدجرد کے پاس بھیجا۔ ان میں کم از کم سات تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ البتہ نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ، مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ اور عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ چوتھے حضرت معنیٰ رضی اللہ عنہ تھے جو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ باقیوں میں حضرت اشعث رضی اللہ عنہ بن قیس، مغیرہ رضی اللہ عنہ بن زرارہ اور الحارث رضی اللہ عنہ بن حسان کے بارے بھی خیال ہے کہ شاید آپ یا تو صحابی تھے یا اپنے قبیلہ کے سردار۔ ان کے علاوہ عرب کے مشہور پہلوان عمر بن معدیکرب بھی تھے جن کا ذکر ہو چکا ہے اور باقی مشہور مجاہد بھی تھے۔ جن میں بسر رضی اللہ عنہ بن ابی رحم، جبلہ رضی اللہ عنہ بن جویۃ الکنانی، حنظلہ رضی اللہ عنہ بن الربیع، فرات رضی اللہ عنہ بن حیان، عدی رضی اللہ عنہ بن سہیل اور عطارد رضی اللہ عنہ بن حاجب تھے۔ تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ چودہ مجاہدین بہت اونچے پایہ کے سردار تھے۔ بہادری میں تو سب اپنا مقام نہ رکھتے تھے۔ لیکن تدبّر، بات چیت، مردانہ وجاہت، ثابت قدمی اور اسلامی فلسفہ حیات کی مکمل پیروی کے سلسلہ میں ایک ایک صاحب پر کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے، اور ایرانی ان کو جانتے تھے اور جو ایرانیوں کے لیے ''نو وارد'' تھے وہ بھی اپنی شخصیت کی وجہ سے توجہ کے مرکز تھے۔

وفد کی یزدجرد کے ساتھ ملاقات

مسلمانوں کے وفد کی جب اہل مدائن کو اطلاع ملی تو وہاں کے لوگ جوق در جوق ان کو دیکھنے کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی ظاہرا حالت یہ تھی کہ اُن کے جبے پرانے اور بوسیدہ تھے۔ کاندھوں پر چادریں تھیں ہاتھوں میں باریک قسم کے کوڑے یعنی چابکوں کی بجائے عام قسم کے درختوں کی پتلی شاخیں تھیں جن کو ''چھمک'' کہتے ہیں۔ پاؤں پر موزے چڑھائے ہوئے تھے اور ان کے گھوڑوں کی پیٹھیں ننگی تھیں۔ گھوڑے البتہ بڑے چست تھے۔ وہ ہنہنا

رہے تھے اور ٹاپیں مار رہے تھے۔ ایرانی اُن کو دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ عام قسم کے سادہ دیہاتی لوگ تھے لیکن ان کا رعب داب اتنا تھا کہ اُن کو دیکھ کر ایرانی کانپ جاتے تھے۔

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ انگریزوں کی نقل میں اور رعب داب قائم رکھنے کے لیے ہم سویلین لوگوں نے سوٹ اور نکٹائی پہنی۔ فوجیوں نے رنگ برنگی وردیاں پہنیں۔ یعنی بلیو پٹرول اور منکی جیکٹ وغیرہ۔ لیکن یاد رہے کہ انسان کا رعب اُس کے کردار، اصولوں، شخصیت اور قومی تفاخر سے ہوتا ہے۔

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائر کہ بلند بال دانہ و دام سے گزر

(اقبالؔ)

کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ وفد کا کوئی امیر نہ تھا۔ آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے کوئی صاحب کچھ تقریر کر دیتے تھے۔ یہ تبصرہ یا جائزہ غلط ہے۔ طبری کے لحاظ سے نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن امیر تھے۔ اور ہم اس کو صحیح سمجھتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر دو ہو تو بھی ایک کو اپنا امیر بنا لو بلکہ ہمارا جائزہ ہے کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو نائب امیر تھے۔ ہاں ایک قسم کی سادگی کی وجہ سے ایرانیوں کو سمجھ نہ آ رہی ہوگی کہ امیر کون ہے۔

روایت ہے کہ یزدجرد وفد کے ساتھ ملاقات کے لیے تیار نہ تھا اور وہ اپنی بلندی کا اتنا قائل تھا کہ چاہتا تھا کہ یہ وفد اس کے دربار کے کسی اور امیر کے ساتھ ملاقات کرے لیکن مسلمان اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لیے یزدجرد مجبور ہو گیا اور وفد کو اپنے دربار میں آنے دیا۔ لیکن وہاں بھی بڑی دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ وہ لوگ اُن کے ملک میں یوں گھس آئے تھے اور چھ گیدڑ بھبکیاں بھی تھیں۔

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی تقریر

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ جو وفد کے سربراہ تھے، نے یزدجرد کے دربار میں جو تقریر کی مختصر طور پر اس کے الفاظ یہ تھے: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمارے پاس اپنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا جنہوں نے ہمیں صراط مستقیم دکھایا اور نیکی کے راستے پر لگایا اور اسی راہ پر چلنے سے دونوں جہاں حاصل ہوتے ہیں اور ہم یہی دعوت آپ اور آپ کے لوگوں کو دینے آئے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے۔ تم اس کتاب کے مطابق احکام چلاؤ۔ جب تک ایسا کرتے رہو گے تم اپنی جگہ قائم رکھے جاؤ گے۔ اگر یہ منظور نہیں ہے تو جزیہ دو کہ اس رقم سے ہم اس علاقہ کے نظم و نسق کو چلائیں گے۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر فیصلہ تلوار کرے گی۔''

یزدجرد کا ردِ عمل اور وفد کی واپسی

یزدجرد یہ سن کر حیران رہ گیا لیکن اپنی حیرانی اور پریشانی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور پرانے زمانے کے ایران کی عظمت اور عربوں کی جہالت کو زیر بحث لے آیا۔ پھر دونوں قوموں کی دولت اور غربت کا موازنہ کیا اور ہر طرح سے عربوں کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حضرت مغیرہ ﷜ بن زرارہ یہ برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اپنے امیر کی اجازت سے بادشاہ کی فضول اور بے معنی تقریر کا بڑا سخت جواب دیا کہ بادشاہ آدابِ مہمانداری سے آگاہ نہیں ہے۔ آپ نے عرب قبائل کی اسلام سے پہلے کی سخاوت، شرافت اور اصول پرستی کے واقعات کا ذکر کر کے بادشاہ کو خاموش کر دیا اور آگے کہا کہ: ''اب تو حالات بالکل ہی تبدیل ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جَلَّ جَلَالُہٗ کے حبیب ﷺ نے ہمارے دلوں کو روشن کر دیا ہے اور ہم مسلمان ہیں دنیا کی کسی باطل تہذیب وتمدن یا فلسفہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور سب نظاموں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔''

بادشاہ یہ سن کر بھڑک اُٹھا اور ایک مٹی کا بھرا ہوا ٹوکرا منگوایا اور کہنے لگا کہ وہ تمام وفد کو قتل کر دیتا لیکن بین الاقوامی اصول کو مدِ نظر رکھتے ایسا نہیں کر رہا۔ لیکن کوئی تحفہ وفد کو نہ دے گا بلکہ ایک مٹی کا ٹوکرا ہے۔ یہ تمہارے سروں پر لاد دیا جائے گا اور تمہارا جو امیر ہے اس کو اُٹھانا پڑے گا۔ یہ سن کر حضرت عاصم ﷜ بن عمرو جو نائب امیر تھے وہ آگے بڑھے اور انہوں نے یہ ٹوکرا اپنے سر پر اُٹھالیا کہ امیر نے کمانڈ کرنا ہوتی ہے اور اہل وفد تیزی سے وہاں سے واپس چل پڑے۔ وہ بڑے خوش تھے کہ جس سرزمین پر وہ اللہ تعالیٰ جَلَّ جَلَالُہٗ اور اس کے حبیب ﷺ کا نام بلند کرنا چاہتے تھے۔ اس کی مٹی ان کو اسی ملک کے بادشاہ کے ہاتھوں سے پہلے ہی مل گئی۔ اور وہ واپس رواں دواں تھے۔ رستم جو نجومی تھا اور دربار میں موجود نہ تھا۔ اس کو جب پتہ چلا کہ ان کے ملک کی مٹی اسلامی وفد لے جا رہا ہے تو اس نے اس کو بڑا بُرا شگون سمجھا۔ بادشاہ کو بتایا کہ اس نے غلطی کی تھی اور اس نے اسلامی وفد کے پیچھے تیز سوار دستے دوڑائے کہ مٹی واپس لے آئیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ جَلَّ جَلَالُہٗ کے ان مجاہدوں کو نہ پا سکے۔

رستم کا کوچ

رستم ہر طرح کے حیلے بہانے کر رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کسی فیصلہ کن جنگ سے بچ جائے۔ کیونکہ آنے والے حالات ایران کے لیے اچھے نہ تھے لیکن یزدجرد مصر تھا کہ رستم جلد سے جلد مسلمانوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑے۔ رستم نے مستعفی ہونے کی بھی دھمکی دی تو بادشاہ خود لشکر کی کمانڈ کے لیے تیار ہو گیا۔ اس لئے رستم مجبور ہو گیا اور

آخراس نے مدائن سے حیرہ کی طرف کوچ شروع کردیا۔ ایک روایت کے مطابق ایرانی لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ ٥ کی المغازی میں ایرانیوں کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے اور اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار۔ رستم نے چالیس ہزار فوج جالینوس کے ماتحت جیش المقدم کے طور پر بھیجی۔ ساٹھ ہزار اس کے اپنے ساتھ تھی اور بیس ہزار عقب میں تھی تو کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بن گئی۔

طرفین کا آمنا سامنا

رستم کے کوچ کرنے کے بعد اور خاص کر حیرہ پہنچنے کے بعد دونوں لشکر ایک دوسرے کے نزدیک اور آمنے سامنے آچکے تھے، صرف درمیان میں دریائے فرات کا چھوٹا معاون دریا عتیق تھا جس کے پل پر مسلمان قابض تھے۔ یہ حالات تو بڑے لشکروں تک محدود تھے لیکن مسلمانوں کے چھوٹے دستے متحرک تھے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو، حضرت معنی رضی اللہ عنہ بن حارث اور حضرت قیس رضی اللہ عنہ بن ہبیرہ اپنے دستوں کے ساتھ دور دور تک دشمن پر وار پر وار کر رہے تھے اور اب جونڈی دل ایرانی لشکر قریب آ گیا تھا جو لمبے چوڑے علاقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس پر وار کرنے کا مسلمانوں نے نیا طریقہ نکالا کہ اُن کے مختلف پڑاؤ پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ اس کام میں حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بن معدیکرب نے بڑی مہارت دکھائی اور ایرانی لشکر کو بڑا تنگ کیا۔ خاص کر ایک دفعہ حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ نے ایران کے دو ہزار مردوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور ایک کو قیدی بنا کر لے آئے۔

ویسے اب ایران اور عراق کے لوگوں میں پرانے تعلقات ختم ہو چکے تھے۔ حیرہ کے علاقے میں ایرانی سپاہی لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے۔ وہاں کے باشندوں کے ساتھ دست درازی کرتے تھے۔ عورتوں کی عزت لوٹ لیتے تھے وغیرہ۔ بوڑھا عبدالمسیح اور ہمارے حضرت شویل رضی اللہ عنہ کی کرامۃ کا باپ اس وقت تک زندہ تھا اور وہ شکایت لے کر رستم کے پاس گیا لیکن اس سیدھی سادھی بات کو رستم کے سامنے "ادبی زبان" میں پیش کیا، جس کو رستم کچھ دیر کے بعد سمجھا اور دونوں نے اپنی علم او کلام کی مہارت سے ایک دوسرے کو لاجواب کرنا چاہا۔ مبصرین اور مؤرخین نے مزے لے لے کر اس گفتگو کو لکھا ہے لیکن ہم اس باطل ادب کو نظرانداز کر رہے ہیں کہ باطل فلسفے والے لوگوں کی عزت لوٹ رہے تھے اور جن کی عزت لوٹی جا رہی تھی وہ ادب اور فلسفہ کو اپنی ڈھال بنانا چاہتے تھے۔ غیرت مند قومیں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی ہیں۔

مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندہ حر کے لیے نشتر تقدیر ہے نوش!

(اقبالؔ)

رُستم کا جنگ سے گریز

رستم نجف پہنچ چکا تھا یہاں اس نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتے نے اہل ایران کے تمام ہتھیاروں کو تالا لگا کر چابی کسی عظیم بادشاہوں کے بادشاہ کو دی جس کے بارے میں رستم کو کسی نے بتایا کہ وہ مسلمانوں کے پیغمبر حضورﷺ ہیں اورانہوں نے یہ چابی حضرت عمرؓ کو دے دی۔ نجومیوں میں کچھ کا خیال تھا کہ ایران کا معاملہ ختم ہے اور کچھ امیدیں دلا رہے تھے کہ اگر جنگ نہ ہوئی تو پھر ایران بچ سکتا ہے۔ چنانچہ رستم نے جنگ سے بچنے کے بہانے تلاش کرنے شروع کر دیئے اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ قاصد یا وفد بھیج کر صلح کی بات چیت کریں۔ حضرت سعدؓ نے اس کام کے لیے سات مجاہدین کو نامزد کیا لیکن جناب الربیعؓ نے رائے دی کہ ایک وقت میں ایک قاصد بھی ان حالات میں کافی ہے ۔ یہ بات حضرت سعدؓ کو پسند آئی اور پہلے حضرت ربیعؓ کو بھیجا۔ حضرت الربیعؓ گھوڑے پر سوار ہو کر ہی رستم کے درباری خیمہ میں داخل ہو گئے اور آدھے فاصلہ تک قالینوں کے اوپر ہی گھوڑے کو جا کر کھڑا کیا۔ رستم اور حضرت الربیعؓ کی گفتگو یہ ہوئی:

رستم نے پوچھا: آپ کیا پیغام لائے ہیں؟

الربیعؓ نے فرمایا: وہی پیغام جو ہمارے آقاﷺ لے کر آئے۔ وہ منظور کر و یا جزیہ دو ورنہ تلوار فیصلہ کرے گی۔

رستم: اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے عوض کیا دیتا ہے؟

الربیعؓ: شہیدوں کے لیے جنت اور زندہ رہے تو غازی۔

رستم لا جواب ہو گیا اور کئی دنوں کی مہلت مانگی کہ وہ بادشا کے ساتھ مشورہ کر لے۔

تو حضرت الربیعؓ نے فرمایا: کہ ہمارے آقاﷺ کا حکم ہے کہ تین دن سے زیادہ مہلت نہ دو۔''

رستم بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا کہ کیا تم ان کے امیر ہو۔ الربیعؓ نے فرمایا: ''نہیں ہم سب ایک جسم کی طرح ہیں اور ایسی باتوں میں چھوٹے بڑے میں کوئی امتیاز نہیں۔''

رستم پر اس کا گہرا اثر ہوا اور وہ ششدر رہ گیا کہ اس سادگی اور سچائی ایران کے جھوٹے تمدن میں کتنا بڑا فرق ہے اس لئے اس نے حضرت سعدؓ کو کوئی دوسرا قاصد بھیجنے کی درخواست کی۔ اب حضرت حذیفہؓ بن محصن کی

(۱) ذوقصہ کے گیارہ لشکروں میں سے ایک اور حضرت عکاشہؓ کے بھائی تھے۔

باری تھی۔ انہوں نے گھوڑے سے اترنے ہی سے انکار کر دیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہی تین شرطیں پیش کیں اور واپس چل پڑے کہ جواب بھجوا دینا۔

رستم حیران تھا اس نے کسی بہتر قاصد کے لیے درخواست کی اور اس دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کو بھیجا۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نہ صرف میدانِ جنگ کے شیر تھے بلکہ سفارتی کاموں یا سیاست کے معاملات میں آپ رضی اللہ عنہ کا بہت اونچا مقام تھا۔ بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ایرانی افسر مہمانداری نے ان کو پل کے پار خوش آمدید کہا اور اُس کے ساتھ خاموشی سے چلتے گئے اور اسی طرح خاموشی سے رستم کے دربار میں پہنچ گئے اور جیسے رستم کے نزدیک پہنچے چھلانگ لگا کر رستم کے ساتھ اس کے تخت پر بیٹھ گئے۔ رستم اور ایرانیوں نے مجبوراً یہ سب برداشت کیا اور اس دفعہ رستم نے ایک لمبی چوڑی تقریر کر دی جس میں ایرانیوں کی عظمت کو خوب اُچھال کر بیان کیا۔

جواب میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ جل جلالہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور دین فطرت کے فلسفہ حیات پر جو تقریر کی اس سے سارا دربار سہم گیا اور پھر آپ نے وہی تین شرطیں پیش کر دیں۔

رستم بات کو ختم کرنا چاہتا تھا اور کہنے لگا اگر تم کو مار دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ سبحان اللہ! ہمیں اور کیا چاہیے جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اپنی فکر کرو کہ دوزخ منہ کھولے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

رستم کو سخت غصہ آیا اور کہنے لگا۔ تمہارے اور ہمارے درمیان کبھی امن نہیں ہو سکتا۔ تم سب کو ختم کر دوں گا۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ قرآن کی رو سے کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

رستم کو اب ہمت نہ رہی کہ کسی اور قاصد سے بات کرتا لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ باقی چار مجاہدین کو بھی دوسرے دن وفد کے طور پر رستم کے پاس بھیج دیا۔ وفد کے ان مسلمانوں نے اپنی تلواریں چیتھڑوں میں لپیٹی ہوئی تھیں لیکن اُن کی دھار بڑی تیز تھی۔ اور مسلمانوں نے پھر وہی تین شرائط دہرائیں۔ کہتے ہیں کہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ رستم اسلام کی طرف کچھ مائل بھی ہوا لیکن اپنی قوم سے ڈر گیا۔ ان مجاہدین میں کچھ مؤرخین کے مطابق مشہور صحابی حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ بن ہرثمہ، رسالے کے مشہور افسر بسر رضی اللہ عنہ بن ابی رحم اور اپنے قبیلے کے سردار حضرت مذعور رضی اللہ عنہ بن عدی اور قرافہ رضی اللہ عنہ بن زاہد ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ رستم کچھ خوش ہوا کہ شائد حالات اور معاملات میں کچھ تبدیلی آ جائے۔ لیکن اس دفعہ وہ ایک اور ڈگر پر چل پڑا۔ ایران کی دولت اور عربوں کی پرانے زمانے کی خستہ حالی کا

(۱) گیارہ لشکروں میں سے آٹھویں کے کمانڈر، دوسرا باب دیکھیں۔

سموازنہ کرتے ہوئے کئی کہانیاں سنا دیں۔کبھی لومڑی کی کہانی، کبھی مکھی اور چوہوں کی کہانی کہ یہ سب ہوس میں آکر تھوڑے پر اکتفا نہیں کرتیں اور آخر اتنے موٹے ہو جاتے ہیں کہ اپنے بل سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ساتھ ہی لالچ کے طور پر ہر امیر کو نقد انعام تحفہ کے طور پر دینے کی پیش کش کی۔ رستم ابھی تک کچھ اس خیال کا حامی تھا کہ غربت نے عربوں کو اکٹھا کر دیا ہے اور موجودہ زمانے کی مشہور کہاوت کہ جنگ HAVE NOT اور HAVES کے درمیان ہوتی ہے، کہ رستم نے بھی کچھ بچ جانا۔ بلکہ بدقسمتی سے یورپ کا دانشور تو آج بھی اسی کلیہ کو لئے پھرتا ہے۔ اور مسٹر آرنلڈ کے حساب سے مسلمانوں کا عروج اسی وجہ سے ہوا کہ غریب اکٹھے ہو گئے۔

مسلمان اہل وفد مسکرائے، اور انہوں نے رستم کو کہا کہ تم ہماری آمد کے مقصد کو نہیں سمجھے۔ پہلے صرف قاصد آتا رہا۔ ایک آدمی کے الفاظ میں کچھ کمی رہ سکتی ہے۔ ہم آج اجتماعی طور پر تمہیں وہی تین شرائط پیش کرنے آئے ہیں جو دائن میں پیش کر چکے ہیں، اور ہمارے قاصد بار بار دہرا چکے ہیں اور آج تین دن کا وعدہ بھی پورا ہو گیا ہے۔ ہم وفد کی شکل میں اس لئے آئے ہیں کہ ایک دوسرے پر گواہ ہوں اور یہ اسلامی طریقہ ہے اور آخری بات سن لو، ہمارا مقصد ایران میں اللہ اور اس کی حاکمیت کو جاری وساری کرنا ہے۔

رستم حیران تھا۔ اب اسے جنگ ناگزیر نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگا:۔

''آپ لوگ دریا پار کریں گے کہ ہم پار کریں۔''

مسلمانوں نے یک زبان جواب دیا:

''آپ لوگ پار کریں۔''

تبصرہ

قارئین کو نقشہ اور زمینی حالات کے ساتھ ضرور دلچسپی ہوگی، قادسیہ کے میدانِ جنگ کو نقشہ دہم میں دکھایا گیا ہے۔ جس میں مسلمانوں کی صف بندی بھی دکھائی گئی ہے۔ کہ وہ کسی سکیل کے ساتھ نہیں ہے۔ گو علاقہ کا نقشہ سکیل کے ساتھ ہے۔ صف بندی محدود علاقے میں پل کے نیچے دریائے عتیق کے پار تھی۔ ایرانیوں کے پیچھے دریا تھا اور مسلمانوں کے عقب میں پرانی خندق۔ ایرانیوں کی صف بندی ایک لکیر کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے۔ اور نقشہ پر اُن کے دستہ کے مانڈروں کے نام نہیں لکھے گئے۔ اس زمانے میں زمین کا استعمال فرد کے لیے اتنا اہم نہ تھا، سوائے اس کے کہ وہ جارح ومتحرک رہنے دے۔ زمین کا زیادہ استعمال حکمت عملی کے تحت ہوتا تھا۔ اس لئے ہم زمین کا بیان دوبارہ نہیں کر رہے اور اسی پر اکتفا کر رہے ہیں جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط میں لکھا، مسلمانوں کے لحاظ سے ریگستان ان کے پیچھے تھا اور خندق وقتی طور پر اُن کے عقب کی حفاظت کے لیے اہم تھی۔ اہم پل پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور اس کو وہ کبھی

ختم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اہل ایران نے پل حاصل کرنے کے لیے قاصد بھی بھیجا کہ انہیں دریا عبور کرنے کے لیے پل کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ مسلمانوں نے کہلا بھیجا کہ ایک اور وقتی یا عارضی پل بنالو۔ اور ایسا ہی ہوا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی صفوں کو اور دائیں طرف کرنا پڑا۔ یعنی موجود ڈرل کے مطابق دائیں اور باہر کو قدم بڑھاتے گئے۔
نقشہ کی اہمیت اتنی ہی سرسری ضرورت کی ہے کہ اُس زمانے میں چھاتی کے زور اور جذبہ کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔

لشکر اسلام کی صف بندی

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا۔ بازوؤں پر عبداللہ رضی اللہ عنہ بن المعتم اور شرجیل رضی اللہ عنہ بن السمط تھے۔ درمیان میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ ازخود تھے۔ آپ کے بائیں پر حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمر تھے اور دائیں طرف حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ بن الحویہ تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود تو معذور تھے۔ نہ گھوڑے پر سوار ہو سکتے تھے اور نہ بیٹھ سکتے تھے کہ بدن پر سخت پھنسیاں اور پھوڑے نکل آئے تھے۔ لشکر کے درمیان میں اونچے مقام پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے تھے اور چھاتی کے نیچے تکیہ رکھے ہوئے تھے، نیچے قاصد کھڑے تھے جن کے ذریعہ سے آپ زبانی یا لکھ کر احکام پہنچاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اور وہ بھی احکام پہنچانے میں مددگار تھے اور گھوڑے پر سوار آپ کے سامنے موجود رہتے تھے۔ کم تعداد کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں کی گہرائی تین یا چار مجاہدین تک محدود تھی۔ لشکر میں کافی امیر تھے اور لشکر دس دس اور سو سو کی ٹولیوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ ایک عجیب نظارہ تھا کہ لشکر کے امیر اپنے دستوں کے آگے حرکت یا چہل قدمی کرتے ہوئے تلوار کو اُٹھائے ہوئے قرآنِ پاک کی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے جنگ کے دوران یا جنگ کے شروع میں یہ طریقہ ہمیشہ اپنایا۔ اور عثمانیہ ترک اس طریقہ کو یورپ میں لے گئے۔ اٹھارھویں صدی کے جرمن بادشاہ فریڈرک نے جب موجودہ ڈرل کی طرح ڈالی تو اُس نے اس طریقہ کی نقل پریڈ گراؤنڈ پر بھی عام کردی اور آج کل بھی "ٹرپنگ دی کلر" کی پریڈ سے پہلے جو کمانڈر اپنی گارڈوں کے سامنے چہل قدمی کرتے ہیں، یہ مسلمانوں کی جنگ کے اس طریقہ کی نقل ہے۔

ایرانیوں کی صف بندی

رستم نے بھی اپنے لشکر کو پانچ بڑے حصوں میں بانٹا۔ درمیان میں وہ خود تھا اور ایک بہت بڑے تخت پر بادشاہ کی طرح بیٹھ گیا جس کو زمین سے اونچا رکھا گیا۔ اس تخت پر ایرانی بادشاہ کا جھنڈا درفش کاویانی لہرا رہا تھا۔ یہ جھنڈا اس سے پہلے بہمن جنگ جسر کے وقت بھی لے آیا تھا۔ رستم خود دوہری زرہ پہنے تھا۔ لشکر میں تیس کے قریب ہاتھی تھے جن میں نصف کے قریب درمیان میں اور باقی لشکر میں برابر بانٹے ہوئے تھے۔ صف بندی میں ایرانیوں کی گہرائی دس یا بارہ کے

قریب تھی۔ جس سے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ ٥ کا دونوں لشکروں کے بارے تعداد کا جائزہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ایرانی لشکر کے درمیان پندرہ ہزار جوانوں نے سات سات یا دس دس ٹولیوں میں اپنے آپ کو زنجیروں کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ یہ ایک جدت تھی کہ جنگ سلاسل کے مقابلہ میں تھوڑے لوگوں کو زنجیروں میں باندھا گیا۔ بہرحال یہ ''مادی دیواریں'' خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی اسلام کی ''بنیان المرصوص'' کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔

ایرانی لشکر کے امراء

ایرانی لشکر کے دائیں حصوں پر جالینوس اور ہرمزان تھے اور بائیں حصوں پر مہران اور بیرزان، عقب میں بہمن تھا۔ جالینوس اور بہمن کے ساتھ مسلمانوں کو واسطہ پڑ چکا تھا۔ اور یہ مہران کوئی نیا مہران تھا۔ ہرمزان اور بیرزان نئے تھے ایرانیوں کی پیغام رسانی کے طریقہ کو اس جنگ کے لیے ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس طریقہ پر یقین آ جاتا ہے کہ سارے راستہ پر پیغام رساں موجود تھے جو خبر کو جلدی آگے پیچھے پہنچا سکتے تھے۔ اور ایک چوکی یا مقام سے دوسری چوکی یا مقام تک لکھی ہوئی یا زبانی خبر پہنچانے کا بندوبست تھا۔ یہ بات قابل تسلیم ہے اور ''انسانی وائرلیس'' والا چکر اب خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ وہ ذہنی اختراع یا لفاظی تھی۔

نتائج یا اسباق

یہ باب صرف جنگ کی تیاری کی باتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ہمارے آقا ﷺ نے امن کے زمانے میں جنگ کی تیاری کو جہادِ اکبر کا نام دیا ہے اور جنگ کو جہادِ اصغر۔ قادسیہ کی جنگ ایک فیصلہ کن جنگ ہے اور اس کی تیاری میں ہمارے لئے متعدد اسباق ہیں جن کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ یہ سب اسباق کاروائی کے طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں کہ میدانِ جنگ کی تیاری سے پہلے امن کے زمانے میں پوری قوم کی تیاری کو زیادہ وقعت حاصل ہے۔ میدانِ جنگ کی تیاری بھی جنگ کی کاروائی کا حصہ ہے کہ مسلمان اپنے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک تجویز کے تحت صف آرا تھے۔

بائیسواں باب

قادسیہ کی جنگ

بعض مؤرخین نے اس جنگ کو محرم ۱۴ ہجری کا واقعہ بتایا ہے اور بعض مؤرخین نے محرم ۱۵ ہجری کا۔ جنگ جسر رمضان المبارک ۱۳ ہجری میں ہوئی اور جنگ بویب ۱۴ ہجری میں۔ خود خلیفہ دوم ۱۴ ہجری کو مدینہ سے نکلے۔ اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھیجنے میں ایک دو ماہ لگے ہوں گے۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا زرود میں قیام، شراف میں قیام، وفود کو مدائن بھیجنا۔ رستم کی پیش قدمی وغیرہ تو ظاہر ہے کہ جنگ قادسیہ محرم پندرہ ہجری کا واقعہ ہے لیکن یہ کہنا کہ جنگ قادسیہ، جنگ یرموک کے بعد شوال ۱۵ ہجری میں ہوئی، ٹھیک نہیں۔ کچھ مورخین غلطی کر گئے۔ جنگ یرموک کے بعد شام میں مکمل فتح ہو جانے کے بعد تو وہاں سے بے شمار کمک آسکتی تھی اور چونکہ تھوڑی امداد آئی تو ظاہر ہے کہ ابھی شام میں مکمل فتح نہ ہوئی تھی۔ دوسری کتاب میں زمان و مکان کا پورا جائزہ موجود ہے۔

اسلام کی فیصلہ کن جنگ

ویسے تو جنگ قادسیہ دنیا کی تاریخ کی ایک مشہور ترین جنگ ہے لیکن ہم صرف اسی بات پر اکتفا کریں گے کہ ہماری عسکری تاریخ میں جنگ قادسیہ کو اہم مقام حاصل ہے اور یہ اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ ہے۔ اس جنگ کے نتائج اثرات اتنے دوررس تھے کہ ان سے دنیا کا سیاسی نقشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو گیا۔ پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی صف بندی کسی وقتی دفاع یا مکمل انفعالی دفاع کے اصول کے تحت نہ ہوتی تھی اور اس جنگ میں مسلمانوں نے جو دریا پار نہ کیا، اس کا بھی یہ مطلب تھا کہ مسلمان متحرک دفاع میں یقین رکھتے تھے اور صف بندی صرف دشمن پر نظر رکھنے اور اپنی ترتیب کے لیے ہوتی تھی۔ اس لئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی یہی حکم دیا کہ صف بندی کے ساتھ دشمن پر نگاہ رکھنا اور دشمن کو تھوڑا آگے بڑھنے دینا کہ اس کی صفوں میں کچھ بے ترتیبی آجائے۔ آپ نے فرمایا: ”وہ چار تکبیریں کہیں گے، پہلی دو تکبیریں تنبیہ اور تیاری کے لیے ہوں گی۔ تیسری تکبیر پر مبارزت طلب کر سکتے ہیں اور چوتھی تکبیر پر اپنے اپنے سامنے

بھرپور حملہ کیا جائے گا۔"

مبارزتیں

ظہر کی نماز کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کچھ وقفہ دے کر دو تکبیر کہیں اور مجاہدین اپنی اپنی جگہ دیوار کی طرح جم گئے۔ بعد میں تیسری تکبیر کہی کہ مجاہدین مبارزت طلب کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کی صفوں سے دو صحابہ کرام حضرت غالب رضی اللہ عنہ بن عبداللہ اور بائیں درمیانی دستہ کے کمانڈر اور اسلام کے عظیم فرزند حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو نکلے۔ حضرت غالب رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے ہرمز آیا جو بابل کی جنگ میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا۔ حضرت غالب رضی اللہ عنہ نے اس کو شکنجے میں لے کر قیدی بنالیا۔ یہ جنگ کا پہلا قیدی تھا۔ لیکن حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے سامنے آنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اور ظاہر ہو گیا کہ اہل ایران میں اب مسلمانوں کے ساتھ ذاتی مقابلہ کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ آگے بڑھتے گئے اور اس افراتفری میں کہ کون آگے بڑھ کر مقابلہ کرے۔ "اور تم آؤ اور وہ آئے" کے چکر میں ایرانیوں نے وہاں سے اپنی پوری صف ہی خالی کر دی۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس افراتفری میں وہ ایک خوبصورت خچر جو سامان سے لدا ہوا تھا اس کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے خچر کو پکڑ کر پیچھے اپنے دستے کی طرف موڑ دیا کہ اس کو سالار اعظم کے پاس لے جائیں اور خود میدانِ جنگ میں تلوار لہراتے رہے لیکن کوئی سامنے نہ آیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خچر کے سامان کا ملاحظہ کرایا تو دیکھا کہ خوشبودار اور اتنے قیمتی قسم کے کھانے لدے ہوئے تھے جو بادشاہ لوگ کھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "یہ کھانے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر میں بانٹ دیئے جائیں۔"

اس کے بعد سامنے سے تو کسی ایرانی کو مبارزت کی ہمت نہ ہوئی لیکن مسلمانوں کے بائیں بازو کے سامنے سے ایک "ہزاری" آگے نکلا اور بڑے گھمنڈ کے ساتھ مبارزت طلب کی۔ ادھر عمرو رضی اللہ عنہ بن معدیکرب کو بھی موقع مل گیا اور انہوں نے جا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ ایک ایرانی تیرانداز بدلہ لینے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا لیکن عمرو رضی اللہ عنہ بن معدیکرب کے شکنجے سے وہ بھی بچ کر نہ جا سکا۔

اب دونوں طرف افواج میں بے صبری پیدا ہو رہی تھی اور دونوں لشکروں میں سے خاص کر اسلامی لشکروں میں سے اکثر حملہ کے لیے بے چین تھے اور بڑی مشکل کے ساتھ لشکر کے نائب حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن عرفطہ نے اُن کو روکا کہ اس وقت تک حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے چوتھی تکبیر نہ کہی تھی۔

ایرانیوں کا حملہ

رستم کے لیے اب حملہ کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ اصل میں ابتدا میں وہ حملہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ مانا

کہ اس نے صف بندی کر لی تھی اور صف بندی کی تجویز دریا کو پار کرنے سے پہلے بنائی ہوگی۔ لیکن اتنی بڑی فوج کو دریا پار کرنے میں کافی وقت لگا تھا اور باقاعدہ صف بندی میں ضرور دیر ہوگئی ہوگی لیکن اب وہ تیار تھا۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کے دونوں بازوؤں پر بھرپور حملہ کر دے اور ان کی صفوں کو تباہ و برباد کر کے وہ پورے لشکر کو گھیرے میں لے لے۔ رستم کے لشکر کی تعداد اس کو ایسا کرنے کی اجازت دیتی تھی اور یہ بڑی اچھی تجویز تھی۔ ہاں برابر یا تعداد میں تھوڑی برتری کے ساتھ ایسی تجویز کامیاب نہیں ہو سکتی۔

رستم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمام اسلامی لشکر اور خاص کر دونوں بازوؤں والے حصوں کو تیروں سے چھلنی کر دیا جائے۔ اس زمانے میں تیر ہی دور مار ہتھیار تھے اور ایرانیوں نے تیر کا خوب استعمال کیا۔ مسلمانوں نے بھی تیروں سے جواب دیا لیکن مسلمانوں کے ہتھیار ہلکے تھے اور ایرانیوں کی نسبت تیروں کی اثرات کم تھے۔ رستم بھانپ گیا کہ تیر اسلامی لشکر کا کافی نقصان کر رہے ہیں۔ چنانچہ درمیان والے حصوں کو ٹھہراؤ دیتے ہوئے رستم نے مسلمانوں کو دونوں بازوؤں پر حملہ کر دیا۔

دائیں بازو پر حملہ کے اثرات

مسلمانوں کے دائیں بازو کے کمانڈر حضرت عبداللہ ؓ تھے لیکن ان کے لشکر کے حصہ کے جس دستہ پر حملہ کا بہت زور پڑا۔ وہ دستہ حضرت جریر ؓ بن عبداللہ کے بجیلہ قبیلہ کا تھا۔ آپ عظیم صحابی ہیں اور آپ نے اپنے قبیلہ کو خوب جوش دلا کر بڑا سخت مقابلہ کیا لیکن آپ کے سات یا آٹھ سو کے دستہ پر سات آٹھ ہزار ایرانی حملہ کر رہے تھے۔ اس لئے حضرت سعد ؓ نے جلدی کمک روانہ کر دی۔ یہ کمک عقب یا ریزرو سے نہ تھی بلکہ لشکر کے درمیان سے چھوٹے چھوٹے دستے بھیجے جن کی کمانڈ حضرت اشعث بن قیس، حمال اور طلیحہ ؓ کر رہے تھے۔ طلیحہ ؓ نے آگے بڑھ کر اس ایرانی پہلوان کا کام تمام کر دیا جو پیش قدمی کی خوشی میں مبارزت طلب کرتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ اس طرح ایرانیوں کے قدم اُکھڑنے شروع ہو گئے اور جریر ؓ بن عبداللہ نے پھر اپنی صفوں کو بحال کر لیا۔

بائیں بازو پر اثرات

ایرانیوں کا مسلمانوں کے بائیں بازو پر حملہ بھی بڑا شدید تھا۔ اس بازو کے کمانڈر حضرت شرجیل ؓ تھے لیکن ایرانیوں کے حملہ کا زور اس دستہ پر پڑا جس کی کمانڈ عمرو ؓ بن معدیکرب کے ہاتھ تھی۔ یہ تر نوالہ نہ تھے جیسے ایرانی دستہ آگے بڑھے حضرت عمرو ؓ نے مولی گاجر کی طرح اُن کو کاٹ کر رکھ دیا اور اُس کے دستہ نے بھی ایرانیوں کو بُری طرح مار دی۔ حضرت سعد ؓ نے حضرت عاصم ؓ کو حکم دیا کہ بائیں بازو کی مدد کریں۔ حضرت عاصم ؓ نے آگے بڑھ

کر ہاتھیوں کے ہودوں کے رسے کاٹ دیئے اور یہ ہودے دھڑام سے نیچے گر گئے۔اب ایرانی لشکر کے لئے تماشہ بن گیااور وہ اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے۔

چوتھی تکبیر

عصر کی نماز کے وقت تک ایرانی حملوں کی شدت کم ہو چکی تھی اور حضرت سعد ﷺ نے چوتھی تکبیر کہ دی۔ مسلمانوں نے تمام محاذ پر بھر پور حملہ کر دیااوران کی صفوں میں گھس گئے اور ایک مقام پر ایرانی صفوں میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ رستم کو تخت سے اُتر کر اپنی حفاظت کے لئے جنگ میں شریک ہونا پڑا۔مسلمان متحرک دفاع کی طرز کو اپنائے ہوئے یہ حملہ کر رہے تھے لیکن یہ ضروری نہ تھااور نہ مسلمانوں کو یہ اُمید تھی کہ اس ایک ہی حملہ سے کچھ فیصلہ کن نتائج نکل آئیں گے۔ یہ ان کی بنیادی جارحانہ کاروائی تھی کہ آگے بڑھ کر دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچائی جائے اور دشمن کو سخت جانی نقصان پہنچایا جائے۔اس کے لئے مسلمانوں نے ایک عجیب وغریب طریق کار اپنایا ہوا تھااور تلوارزنی اور نیزوں کے زور سے یہ محدود پیش قدمی چھوٹی سطح پر اپنے قسم کی ایک بڑی تیز متحرک کاروائی تھی۔

پہلے دن کی جنگ کا زیادہ زور بجیلہ قبیلہ پر پڑا لیکن شہادت زیادہ ترطلیحہ ﷺ کے قبیلہ بنواسد کو نصیب ہوئی جو بجیلہ قبیلہ کی مدد کے لئے گئے تھے اور انہوں نے متحرک ہو کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے کر بجیلہ قبیلہ کی بروقت مدد کی۔اس لئے جنگ قادسیہ کا پہلا دن عام طور پر بنواسد کا دن مانا جاتا ہے۔گو حضرت عاصم ﷺ کا قبیلہ تمیم یا قبیلہ بجیلہ ازخود اور عمرو ﷺ معدیکرب کا قبیلہ کنندہ اور ازدوغیرہ کسی سے کم نہ تھے۔لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے کہ کوئی دن کسی کو نصیب کر دیتا ہے۔بہرحال پہلے دن کی جنگ میں شام ہونے تک حالات تقریباً وہی تھے جو جنگ کے شروع ہوتے وقت تھے اور کافی اندھیرا ہو جانے تک بھی لڑائی جاری رہی۔

دوسرا دن

پہلے دن کی جنگ میں اور کامیابیوں کے علاوہ مسلمانوں کے لیے بڑی کامیابی یہ تھی کہ کافی ہاتھیوں کو بھی میدانِ جنگ سے زخمی کر کے فرار کرادیا۔رات کو اطمینان کے ساتھ مسلمانوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور شہدا کو دفن کیا جن کی قبریں اب بھی وہاں موجود ہیں اور ایرانیوں کی بے پناہ تعداد کے بارے میں مسلمان زیادہ فکر مند نہ تھے اوران کو اپنی فتح کا یقین ہونے لگا۔ادھر رستم کی رات بڑی خراب گزری اس کو کچھ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت عمر فاروق اعظم ﷺ نے اس کا کلیجہ کو پھاڑ دیا ہے۔

دوسرے دن سورج جب چڑھ اوپر آ گیا تو پھر مبارزت کا سلسلہ شروع ہوا۔ دونوں طرف سے بہادر لوگ آگے بڑھ رہے تھے اور یہ مقابلے زوروں پر تھے کہ ایرانی فوج کے ایک حصہ کا کمانڈر جالینوس بھی آگے بڑھا

اور مبارزت طلب کی اس کے سامنے طلیحہ ؓ تھے اور وہ تلوار لے کر آگے بڑھے۔ جالینوس ایرانی فوج میں مانا ہوا بہادر تھا۔ لیکن طلیحہ ؓ کی شمشیر زنی کے سامنے اس کے قدم اُکھڑ گئے اور اس نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ باقی مبارزتوں میں بھی مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن ایک مبارزت میں ابن قطیبہ ؓ شہید ہو گئے۔ لیکن شہادت سے پہلے اپنے مدِ مقابل ایرانی کمانڈر شہریار کا سر قلم کر دیا۔

دو کرامتیں

جنگ کے دوسرے دن دو کرامتیں بھی رونما ہوئیں جس نے مسلمان لشکریوں کو حیران کر دیا۔ پہلی کرامت حضرت قعقاع ؓ بن عمرو کی شام سے آمد تھی اور دوسری کرامت ابو محجن ؓ ثقفی نے دکھائی۔ شام سے تقریباً چھ ہزار کے لشکر نے واپس آنا تھا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت عمر ؓ نے شام میں حضرت ابو عبیدہ ؓ کو خط لکھ دیا تھا۔ یہ لشکر دو حصوں میں کوچ کر رہا تھا اور جیش المقدم جس کی کمانڈ حضرت قعقاع ؓ کر رہے تھے وہ اپنے باقی لشکر سے ایک دن کی مسافت پر آگے تھا۔ ان کو جنگ کے بارے میں کچھ علم تھا اور ویسے وہ علاقہ کے چپہ چپہ سے واقف تھے اور حضرت خالد ؓ کے ساتھ کاظمہ سے لے کر مضیح تک جنگوں میں حصہ بھی لیا تھا اور حیرہ میں ان کے نائب کا کام بھی کیا تھا۔ آپ رومیوں کو جنگ اجنادین میں اور دمشق کی پہلی فتح تک اپنے ہاتھ بھی دکھا چکے تھے ان کو قادسیہ میں داخل ہونے سے پہلے جنگ کی بو آ گئی اور ان کی دوررس نگاہ بھانپ گئی کہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس لئے میدانِ جنگ سے تھوڑا پیچھے انہوں نے اپنے لشکر کو ٹکڑیوں میں بانٹا اور ہر حصہ میں پندرہ بیس مجاہد شامل کیے اور حکم دیا کہ پہلے حصہ کے ساتھ جس طرح نعرۂ تکبیر کے ساتھ وہ خود داخل ہوں گے۔ اسی طرح باقی مجاہدین باری باری نعرہ تکبیر کے ساتھ وقفے وقفے کے بعد میدانِ جنگ میں داخل ہوتے رہیں گے۔

اس کاروائی کے اثرات کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتی۔ جن لوگوں نے میدانِ جنگ میں وقت گزارا ہے اُن کو معلوم ہے کہ ایک مجاہد کی کمک تمام دستے کو ہشاش بشاش کر دیتی ہے اور یہ طریق کار مردہ دلوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی جنگ میں بھی سمجھدار کمانڈر کمک یا عارضی طور پر میدانِ جنگ میں داخل ہونے والوں کو ہدایت دیتے ہیں کہ نعرۂ تکبیر سے میدانِ جنگ میں داخل ہوں اور اگر واپس جانا ہو تو ایسے آہستہ سے اور چھپ کر نکلو کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ بہر حال قعقاع ؓ کی آمد نے میدانِ جنگ کا نقشہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ لیکن حضرت قعقاع ؓ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ قعقاع ؓ کی آمد کے بعد مورخین نے اپنی قلم کا رُخ ہی اُن کی طرف موڑ دیا۔ اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں۔ قعقاع ؓ بن عمرو اور عاصم ؓ بن عمرو کی وجہ سے ان کے قبیلے کا نام بھی تارخ اسلام میں سنہری الفاظ سے لکھا ہوا ہے اور دنیا میں ایسے ماں باپ بہت ہی کم ہوئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت قعقاع ؓ

اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ جیسے فرزند عطا کیے۔

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ میں

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ میں اپنی پہلی ٹولی کے ساتھ داخل ہوئے اور صفوں سے آگے نکلتے ہوئے مبارزت طلب کی۔ قعقاع رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ ایرانیوں نے اُن کو کوئی ''نو وارد'' اور جنگ کا نابلد جوشیلا سمجھ لیا۔ اور آگے سے بہمن جاوذیہ نکلا جو جسر کی جنگ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچا چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ بہمن بہت زیادہ عمر کا تھا اور نوشیروان عادل کے زمانے سے فوج میں تھا۔ اس نے سمجھا کہ ''ناتجربہ کار'' نو وارد جوان کے ساتھ وہ کوئی داؤ کھیل سکے گا۔ لیکن حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ ملک شام میں بہمن اور جسر کی جنگ کے واقعات سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ پکار اُٹھے: خبردار! آج میں حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ اور عظیم بدری صحابی سلیط رضی اللہ عنہ کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہ سکتا اور چند لمحوں کے بعد بہمن زمین پر تڑپ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بریزان ایک محافظ کے ساتھ آگے نکلا کہ شاید بہمن کی عمر کی زیادتی نے اس نو وارد کو یہ موقع دیا ہے اور اس کو جانے نہ دیا جائے۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ایک مجاہد شامل ہو گیا اور دونوں نے مل کر دونوں ایرانیوں کا صفایا کر دیا۔ ایرانی ششدر رہ گئے۔ لحظہ بھر میں ان کے دو جرنیل زمین پر تڑپ رہے تھے اور مسلمانوں نے اس خوشی میں ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ لیکن ایرانیوں کی تعداد اُن کے آڑے آئی اور وہ بہادری کے ساتھ لڑے بھی۔ مسلمانوں کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور مسلمان حملہ روک کر کچھ ستانے لگے۔

لیکن حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو آرام نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے سپہ سالار کو جا کر سلام کیا، اپنے ساتھیوں کو اپنے بھائی حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے لشکر کا ایک حصہ بنانے کی اجازت چاہی اور خود سپہ سالار کی اجازت سے ایک داؤ تیار کیا۔ ایک اونٹ پر ایک بہت بڑی جھول ڈالی اور ساتھ کچھ ایسی لکڑیاں باندھیں کہ اونٹ، ہاتھی سے بھی زیادہ خطرناک جانور نظر آنے لگا۔ ایرانی فوجیوں پر تو اس جھلاوے کا اثر نہ ہوا لیکن یہ جھلاوا اور داؤ اس لحاظ سے بڑا کامیاب رہا کہ ایرانی لشکر کے گھوڑے اسکو دیکھ کر بدک گئے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے مسلمانوں نے ایرانیوں پر ایک اور زوردار حملہ کیا جس سے ایرانیوں کی صفوں میں شگاف پڑ گئے۔ بلکہ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ بنو تمیم کے چند مجاہدوں کو لے کر رستم کے قریب پہنچ گئے اور رستم کو ایک بار پھر تخت سے اُترنا پڑا۔ لیکن سورج غروب ہونے والا تھا اور رستم دوسری دفعہ بچ نکلا۔

ابو محجن

دوسرے دن کی جنگ ختم ہونے سے پہلے البتہ مسلمان مجاہدین دوسری کرامت سے خوب لطف اندوز ہوئے، اسلامی لشکر میں ایک شاعر تھے، جنہوں نے شراب کی تعریف میں کوئی شعر کہہ دیا۔ اُن کا نام ابو محجن تھا۔ وہ اس مکان میں

بیڑیاں پہنے قید تھے جہاں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زوجہ سلمیٰ بھی تھیں۔ جنگ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے بار بار آہیں بھرتے تھے۔ حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا سے نہ رہا گیا اور پوچھا کہ افسوس کس بات کا کر رہے ہو؟ تو ابو محجن نے عرض کی کہ آپ اگر میری بیڑیاں کھول دیں تو یہ آہیں ختم ہو جائیں گی۔ مجھے بھی تلوار چلا کر جو سرور آئے گا تو ندامت میں کچھ کمی آ جائے گی حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا کو ترس آ گیا اور انہوں نے ابو محجن کو وعدہ پر آزاد کر دیا۔ آپ نے سپہ سالار کا گھوڑا لیا اور اس پر سوار ہو کر دشمن کی سفوں پر اتنے حملے کیے کہ جن کی تعداد ہی بے شمار تھی۔ ادھر سے اُدھر دشمن کی صفوں کو تہس نہس کر رہے تھے۔ اور جو آگے آتا تھا اس کو ڈھیر کر جاتے تھے۔ مسلمان حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گھوڑا سپہ سالار کا تھا۔ اُن کو خیال ہوا کہ سپہ سالار اُن کے حملوں سے ناخوش ہیں اور بیماری کے باوجود جنگ میں شریک ہو گئے ہیں اور دشمن کو ہاتھ دکھا رہے ہیں۔ اس ندامت سے مسلمان مجاہدین نے دشمن پر بھرپور حملے کر کے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ شام سے ہاشم رضی اللہ عنہ پہنچ گئے ہیں۔ جب ابو محجن جب تھک گئے اور ان کی تلوار کی دھار کچھ کند ہوئی تو واپس آ گئے اور پاؤں میں بیڑیاں پہن کر پھر اپنے آپ کو قید کر لیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو جب حالات کا پتہ چلا تو اُن کو بلا کر کہا کہ "تمہاری اس بہادری کے بعد تمہاری سزا کو قائم رکھنے سے اُن کو بڑی ندامت آ رہی ہے۔" تو ابو محجن نے عرض کی: "اے سالار مجھے بھی وہ شعر کہنے سے بڑی ندامت آ رہی ہے۔ اللہ کی قسم آج سے شراب کی تعریف سے توبہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ پچھلے گناہ معاف فرمائے۔" آمین

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف سے انعامات

دوسرے دن کی جنگ تھمنے ہی والی تھی کہ خلیفۂ دوم کا قاصد پہنچ گیا۔ اس کے پاس چار تلواریں اور چار گھوڑے تھے اور حکم تھا کہ جو لوگ بہتر طور پر ان چیزوں کا حق ادا کر رہے تھے اُن کو یہ انعامات دیئے جائیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے فیصلہ مشکل تھا اور اس کا اعلان بھی ضرور کیا ہو گا۔ بہر حال تلواریں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمر، طلیحہ رضی اللہ عنہ، جمال رضی اللہ عنہ اور اشعث رضی اللہ عنہ بن قیس کو عطا ہوئیں اور گھوڑے حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اور بنو تمیم کے تین سواروں کو جو اُن کے ساتھ شام سے آئے تھے۔ پہلا دن اگر بنو اسد کا تھا تو اُن کے کمانڈر طلیحہ رضی اللہ عنہ کو تلوار پیش کی گئی۔ دوسرا دن واقعی بنو تمیم کا تھا۔ دو بھائی اور تین سوار انعامات حاصل کر گئے۔

جنگ کا تیسرا دن

تیسرے دن مسلمان مجاہدین فتح کے لیے بڑے پُر امید تھے کہ ہاتھی جو پہلے دن میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے وہ دوسرے دن بھی میدانِ جنگ میں نظر نہ آئے لیکن تیسرے دن ہاتھی پھر میدانِ جنگ میں آ کر موجود ہو

گئے ۔اُن کی مرہم پٹی کر دی گئی اور نیا طریقہ یہ نکالا کہ ایک محافظ دستہ مقرر کیا جو ہاتھیوں کے گرد رہتا تھا۔ ہاتھی جب آگے حرکت کرتے تو بھی یہ دستہ ساتھ ہالہ بنا کر آگے پیچھے ہوتا۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی نزدیک سے ہاتھیوں کو زخمی نہ کر دے یا ہودوں کے رسے نہ کاٹ دے۔ یہ دیکھ کر مسلمان کچھ فکر مند ضرور ہوتے لیکن حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اُن کی دلجوئی کے لیے سامان پیدا کر دیا۔ انہوں نے بنو تمیم کے کچھ لوگوں کو رات کے وقت لشکر کے پیچھے بھیج دیا اور حکم دیا کہ صبح کے وقت سے وہ میدانِ جنگ میں بالکل اسی طرح داخل ہوتے رہیں جس طرح نئی کمک کے طور پر کل کے دن وہ خود داخل ہوئے تھے۔

ساتھ ہی ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ کو پیغام بھیجا کہ جنگ شروع ہے اور وہ بھی میدانِ جنگ میں اسی ترتیب سے داخل ہو جس طرح قعقاع رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تھے۔ ہاشم رضی اللہ عنہ بھی باخبر ہو چکے تھے اور یہ طریقہ اپنانے سے سارا دن مسلمانوں کو کمک کے طور پر ٹولیاں پہنچتی رہیں۔

مؤرخین کا اختلاف

شام سے کمک کی نفری کے سلسلہ میں اختلاف ہے اور کچھ مورخین یہ تعداد صرف بارہ سو بتاتے ہیں۔ طبری نے بھی یہ تعداد کم ہی بتائی۔ لیکن پہلے مورخین یعنی ابن اسحٰق وغیرہ کے لحاظ سے کمک پانچ یا چھ ہزار تھی۔ اور اس تعداد کو اکثر بعد کے مورخین نے صحیح مانا۔ اور ہم بھی اس کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ اتنی دور سے کمک جب آئے تو تعداد کافی ہونا چاہیے تھی۔

رستم کی ڈھارس

جنگ کے تیسرے دن رستم کو کچھ ڈھارس بندھ رہی تھی۔ ہاتھی میدانِ جنگ میں ٹھہر گئے تھے اور رستم پہلا ایرانی سپہ سالار تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اتنے دن ٹھہر گیا تھا۔ ایرانی فوج میں بھی کچھ بھروسہ پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کے اتنے سخت حملوں کو وہ برداشت کر گئے تھے۔ ان کا رسالہ جو اونٹوں سے کچھ ڈر گیا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے کوئی طریقہ ضرور کیا کہ اونٹوں پر جھول ڈال کر اپنے گھوڑوں کا ڈر اس ''جھلاوے'' کے لیے ختم کر دیا کہ جنگ کے تیسرے دن ان بناوٹی ''جھلاووں'' کا گھوڑوں پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا اور ایران رسالہ نے پیش قدمی کر کے درمیان سے مسلمانوں کی صفوں کو اسطرح تتر بتر کر دیا کہ ان کے چند شاہسوار حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی پہنچ گئے لیکن مسلمان مجاہدوں نے ان کو مار بھگایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے چند مسلم ایرانی افسروں کے ساتھ مشورہ کیا کہ ہاتھی کی کمزور جگہ کون ہے تو معلوم ہوا کہ آنکھ اور سونڈ۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے چند بہادر مسلمانوں کو بلا کر یا پیغام کے ذریعے کہلا بھیجا کہ

وہ ہاتھیوں کے سونڈ کاٹ کر یا ان کو اندھا کر کے میدانِ جنگ سے بھگا دینے کا بندوبست کریں۔ مسلمان مجاہدین تیار ہو گئے اور اس کی بسم اللہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ دونوں بھائیوں نے مل کر کی۔ ان کے سامنے بڑا سفید ہاتھی تھا۔ انہوں نے یک لخت حملہ کر کے ہاتھی کو اندھا بھی کر دیا اور اس کی سونڈ بھی کاٹ دی۔ اب ہاتھی "بے ہتھیار" ہو گیا۔ صرف پاؤں تلے روندنے کا کام کر سکتا تھا لیکن اندھا تھا۔ اپنے پرائے کی تمیز نہ تھی۔ اپنے اوپر سے ہودوں اور سواریوں کو گرا دیا اور بے مہار میدانِ جنگ میں بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر حمال اور اس کے دستہ نے اپنے سامنے والے اور عمرو رضی اللہ عنہ بن معدیکرب اور اس کے دستہ نے اپنے سامنے والے ہاتھیوں کا یہی حال کیا۔ اب میدانِ جنگ میں ایک تماشا بن چکا تھا۔ ہاتھی "شترِ بے مہار" ہو گئے اور اپنے ہودوں کو اپنی فوج کے اوپر گرایا اور اپنی ہی فوج کو روند ڈالا۔ ہاتھیوں کے میدانِ جنگ خالی کر دینے کے بعد مسلمانوں نے ایرانیوں پر ایک بھرپور حملہ کیا لیکن کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

جنگ کی آخری رات لیلۃ الہریر

قادسیہ کی جنگ کے ہر دن اور رات کے الگ الگ نام ہیں۔ پہلے دن کو یوم ارمات کہتے ہیں کہ کچھ بدنظمی رہی، دوسرے دن کو یوم اغواث کہتے ہیں کہ کچھ راحت ملی کہ شام سے کمک پہنچ گئی تھی۔ تیسرے دن کو یوم عماس کہتے ہیں کہ بڑی خونریز جنگ ہوئی اور بہت سخت کام کرنا پڑا بلکہ رات کو بھی جنگ جاری رہی اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت زور سے بات نہ کرتے تھے بلکہ آہستہ گفتگو کرتے تھے۔ اس لئے اس کا نام لیلۃ الہریر پڑ گیا۔ سورج کے غروب ہونے کے بعد جنگ کی شدت میں ضرور کمی آ گئی لیکن چاندنی رات تھی اور جنگ ختم نہ ہوئی۔ میدانِ جنگ یا اپنے لشکروں پر سپہ سالاروں کا زیادہ کنٹرول نہ تھا اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو چھوٹے دستوں کے جوشِ جہاد کی وجہ سے تھا کہ وہ اپنے امیروں کے تحت رات کو بھی حملہ پر حملہ کر رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو صرف یہ خبر ملتی تھی کہ اب فلاں قبیلہ یا فلاں امیر یا فلاں دستہ آگے جا کر حملہ کر رہا ہے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اوپر ہاتھ اُٹھا کر ان مجاہدین کے لئے اللہ کی رحمت اور فتح مندی کی دعا مانگتے تھے۔ مورخین نے اس سلسلہ میں تقریباً سب قبائل کا ذکر کیا ہے لیکن امراء میں زیادہ شہرت حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ، عمرو رضی اللہ عنہ بن معدیکرب، طلیحہ رضی اللہ عنہ، اشعث رضی اللہ عنہ بن قیس، قیس رضی اللہ عنہ بن ابی یغوث اور قیس رضی اللہ عنہ بن ہبیرہ کو حاصل ہوئی۔ قیس رضی اللہ عنہ بن ابی یغوث جنگ میں نو وارد تھے وہ شام کے محاذ پر جنگ لڑنے گئے اور جنگ لڑے بغیر عراق کی فوج کی کمک کے لیے حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ کے ساتھ جنگ کے تیسرے دن پہنچے اور اسی رات کو شہرت حاصل کر لی۔

چوتھا دن

چوتھے دن جب قادسیہ کی اُفق پر سورج نمودار ہونے سے پہلے روشنی ہوئی تو طرفین ایک لمحہ کے لیے رُک گئے

کہ رات کی کاروائی کے بعد وہ کہاں تھے۔ یہ قدرتی امر ہے۔ میدانِ جنگ کے دن اور رات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ رات کیسے گزری وہ لڑتے لڑتے یا جیسے بھی ہو گزر جاتی ہے۔ لیکن رات کے کئی نتیجے صبح روشنی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں پہلے سے سمجھ ہوتی ہے اور کچھ آدمی کو حیران کر دیتے ہیں اور ایرانیوں کے ساتھ یہی ہوا۔ مسلمان چوکنے تھے اور وہ رات کے حملوں سے بہت کچھ حاصل کر چکے تھے۔ ایرانی تھک کر چور ہو چکے تھے اور مسلمانوں کا سپہ سالار جانتا تھا کہ مسلمان اور سختی برداشت کر لیں گے۔ اس لئے اس نے رات کے عطیات اور ثمرات کا فائدہ اُٹھانے کے لئے یلغار کا حکم دے دیا کہ اشارہ پر یہ کام ہوگا۔

رستم حیران تھا کہ اس کا لشکر رات کیسے خیریت میں گزار گیا۔ اس لئے اس نے کچھ شگاف پُر تو کیے لیکن اس نے سمجھا کہ مسلمان بھی تھک چکے ہوں گے اور جلدی کسی حملہ کی اُس کو امید نہ تھی۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی بلکہ سب ایرانی امرا سستی کر رہے تھے کہ مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر کے تحت پورے محاذ پر یلغار کر دی۔ قعقاع رضی اللہ عنہ اپنے دستے کے ساتھ رستم کے نزدیک پہنچ گئے۔ رستم نے ہاتھیوں کی طرح بھاگ کر دریا میں پناہ لینا چاہی لیکن ہلال[1] نامی ایک شخص نے رستم کو پہچان لیا اور اس کی ٹانگ پکڑ کر اس کو باہر کھینچا اور پھر اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے بعد رستم کے تخت پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اعلان کر دیا کہ اس نے رستم کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور ایرانیوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

ایرانی جنرل جالینوس نے وہ کرنا چاہا، جو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے ایسے حالات میں جسر کی جنگ میں کیا تھا لیکن وہاں مسلمان ربط وضبط کے ساتھ دریا کی دوسری طرف ایک دفاعی لائن بنا رہے تھے اور یہاں ایرانی شتر بے مہار کی طرح تتر بتر ہو رہے تھے۔ اس لئے جالینوس کی کوشش زیادہ کامیاب نہ ہو رہی تھی۔ گو جالینوس اور اس کے ساتھ بہادری سے لڑے اور رئیر گارڈ کا اچھا کام کیا لیکن جلدی سے حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ نے اس کا کام بھی تمام کر دیا۔ اب ایرانی بے ترتیبی سے بھاگ رہے تھے۔ اپنی فوج سے ان کی مدد صرف وہ لوگ مجبوراً کر رہے تھے جو پابہ زنجیر تھے۔ پندرہ ہزار ایرانی زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی زنجیریں کاٹنا شروع کر دیں کیونکہ مسلمان ان کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ اس سارے خونی ڈرامے میں جو دیر لگ رہی تھی۔ اس لئے ایرانی امراء اور رسالہ والوں کو جو اونچے درجہ کے سپاہی تھے، اُن کو بھاگنے کا کچھ موقع مل گیا۔

ایرانی بھاگنے والوں کا پیچھا حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ، شرجیل رضی اللہ عنہ اور زہرہ رضی اللہ عنہ نے کیا اور بڑی دور دور تک اُن کو

(۱) قارئین کو شاید عجب معلوم ہوگا کہ ہلال کو باقی مجاہدین کی طرح کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ بدقسمت انسان خلیفہ سوم اور چہارم کے عہدوں میں شر پسندوں میں شامل ہو گیا تھا۔ شاید رستم کو قتل کرنے میں تکبر کیا اور ذاتی تفاخر پیدا ہوا۔ عبرت کا مقام ہے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت اپنے نیک خاتمہ کی دعا کرنا چاہیے۔

پکڑتے مارتے گئے۔ یہ تعاقب اتنا لمبا تھا کہ کئی تعاقب کرنے والے دوسرے دن واپس قادسیہ پہنچے جب کہ مسلمانوں کے بچے اور عورتیں بھی میدانِ جنگ میں پہنچ چکے تھے اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا مجاہد ہو جو زخمی نہ ہوا ہو۔ مسلمان شہداء کی تعداد بھی تقریباً پانچ اور چھ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ آج تک کسی جگہ میں اتنے مسلمانوں نے شہادت نہ پائی تھی۔ البتہ دشمن کا نقصان پانچ گنا زیادہ تھا۔ شاید زیادہ مرے ہوں کیونکہ پندرہ ہزار تو وہ تھے جو''پابہ زنجیر'' تھے۔ (لفظ''پابہ زنجیر'' یہ غلط فہمی دور کرسکتا ہے کہ ان کے پاؤں زنجیر سے بندھے ہوئے تھے، نہیں بات یہ نہ تھی۔ وہ کمر سے ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ لفظ''پابہ زنجیر'' ہماری اپنی جدت ہے کہ ان مبصروں سے اتفاق نہیں ہے جو اس طریق کار کو بہادری سمجھتے ہیں کیونکہ وہ زیادہ متحرک نہ تھے اور اس سے ان کی حربی خوبی محدود ہو کر رہ گئی تو لفظ''پابہ زنجیر'' استعمال کر دیا گیا)

فتح کی خوشخبری

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت کو اسلامی طریقہ کے مطابق فوج میں تقسیم کر دیا اور پانچواں حصہ مدینہ شریف بھیجا لیکن اس سے پہلے ایک تیز رفتار قاصد کو فتح کی خوشخبری کے لیے مدینہ بھیجا۔ یہ قاصد بنوفزارہ کے سعد رضی اللہ عنہ بن عمیلہ تھے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ جانتے تھے۔ ابھی یہ قاصد مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھے تو امیر المؤمنین سے ملاقات ہوگئی کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر روز فتح کی خوشخبری سننے کے لیے مدینہ سے چند میل باہر آجاتے تھے۔ شتر سوار کو امیر المؤمنین نے پہچان تو لیا کہ قاصد ہے اور اس سے ایران کے حالات پوچھے جس نے قادسیہ کی خوشخبری سنائی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ آپ اس اونٹنی سوار کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف دوڑتے رہے اور اس سے فتح کی باتیں سنتے رہے۔ قاصد بھی تیزی میں تھا وہ باتیں سناتا رہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دیتے اور کہتے''اے اللہ کے بندے اور سناؤ، اور سناؤ'' اور خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور اسی حالت میں مدینہ پہنچے۔

اسباق

جنگ قادسیہ سے مندرجہ ذیل سبق حاصل ہوتے ہیں:۔

ا۔ ترجیحات پہلے مقرر کر دی جائیں اور ان پر قائم رہا جائے۔

ب۔ اپنی چنی ہوئی زمین پر دشمن کو جنگ کے لیے مجبور کیا جائے۔

ج۔ اسلامی فلسفہ حیات کی جنگ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ ہر وقت اس پر عمل کیا جائے۔

د۔ لڑائی کی نبض شناسی اور بروقت کاروائی اہم ضروریات ہیں۔

ر۔ ولولہ اور جذبہ کی بے حد ضرورت ہے۔

س۔ بہادروں کو بروقت انعامات اور عطیات ضرور دیئے جائیں۔

ص۔ دشمن کا تعاقب ضرور کیا جائے۔

ض۔ نتائج کے اثرات یا ثمرات سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

جنگ قادسیہ، دنیا کی ایک فیصلہ کن جنگ مانی جاتی ہے۔ جس نے ایران کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیئے۔ لیکن مسلمانوں نے فوراً تعاقب نہ کیا، صرف محدود تعاقب کیا۔ کہ مدائن پر قبضہ کرنے کا وقت نہ آیا تھا۔ کہ اب دوسرے محاذ یعنی شام میں بھر پور جنگ ہونا تھی۔ جس کو جنگ یرموک کہتے ہیں اور اس کا ذکر دوسری کتاب میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے نو ماہ بعد یعنی شعبان پندرہ ہزار ہجری میں مدائن کی طرف پیش قدمی کی گئی۔

تیئسواں باب

مدائن پر قبضہ

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو پانچ حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح آپ نے شعبان کے مہینہ میں مدائن کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔نقشہ یازدہم حالات کو اور واضح کرے گا۔ ساری کاروائی حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ بن الحویہ کے جیش المقدم نے کی۔ باقی لشکر کے چار حصوں میں سے دو کمانڈر تو قادسیہ والے پرانے کمانڈر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور شرجیل رضی اللہ عنہ تھے اور دو نئے کمانڈروں میں قادسیہ کے نائب سالار حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن غرفطہ اور شام سے کمک والی فوج کے کمانڈر اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا سارا لشکر کوئی بیس یا پچیس ہزار رہ گیا تھا۔ کچھ دستے حیرہ کے گردونواح میں بھی چھوڑ دیئے گئے تھے۔

ایرانیوں کا طریق کار

رستم کے شکست سے پہلے ہی یزدجرد، جنرل نخیر جان کو کمک کے طور پر بھیج چکا تھا۔ یہ یزدجرد کے دادا خسرو پرویز کے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ آگے جنگ نہاوند کے بعد اس کے خزانہ کے سلسلہ میں کچھ دلچسپ قصے بھی سامنے آئیں گے۔ راستے میں اسے قادسیہ کی جنگ کے بھگوڑے مل گئے اور اسے حالات سے باخبر کیا۔ اس نے تمام بھگوڑوں کو روک کر "بابل"[1] کے مقام پر ایک دفاعی پوزیشن تیار کی اور کچھ دستوں کو بابل سے آگے برس کے مقام پر بھی متعین کیا۔ اسی دوران یزدجرد کو رستم کی تباہی و بربادی کی خبر مل گئی تو اس نے رستم کے رقیب اور حریف فیرزان کو بلا کر سپہ سالار اعظم مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمانوں کی کسی متوقع پیش قدمی کو روکا جائے۔

فریزان نے آگے بڑھ کر جگہ جگہ لشکر مقرر کیے۔ یہ سب کچھ ایک جنگ کی بجائے ایک جنگی مشق نظر آتی تھی۔ جیسے ہم ایڈوانس ٹو کنٹیکٹ کی کوئی جنگی مشق بریگیڈ یا ڈویژن کی سطح پر تیار کریں۔ جو خواہ پوری فوج کے ساتھ ہو یا سنگل

(۱) نقشہ یازدہم سے استفادہ کریں۔

ایکسر سائز ہو۔ ہاں اگر کسی جگہ ایمپائر اور کنٹرول سٹاف سخت ہو تو وہ الگ بات ہے کہ وہ ''پیش قدمی'' کو کچھ کنٹرول کریں جنگ میں ایسا تماشہ دوسری جنگ عظیم میں پہلے ۱۹۴۰ء میں ہوا جب فرانس کی میجٹ لائن ٹوٹی تو جرمن فوجوں نے پیرس کی طرف اس طرح پیش قدمی کی یا ۱۹۴۴ء میں اتحادیوں نے جب یورپ میں حزیزیا نما شیر برگ میں دوسرا محاذ کھولا اور وہاں پر دو تین ماہ کی سخت لڑائی کے بعد جب جرمنوں کے دفاع میں شگاف پڑا تو اتحادی فوجیں پیرس کی طرف اسی طرح روانہ ہوئیں۔

جھڑپیں

مسلمانوں اور ایرانیوں میں پہلی جھڑپ برس کے مقام پر ہوئی۔ ایرانی کمانڈر مبارزت طلب کر کے حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آیا اور زخمی ہونے کے بعد اس نے بھاگ کر بابل میں پناہ لی۔ اس کے بعد برس کے سویلین حاکموں نے مسلمانوں کی باجگزاری اختیار کی اور چند دن بعد مسلمانوں کے باقی چار لشکر بھی وہاں پہنچ گئے۔ اسکے بعد فیرزان نے بابل کے مقام پر مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی اور کچھ مؤرخین نے اسکو بابل کی دوسری جنگ کا نام بھی دیدیا ہے لیکن ہمارا جائزہ یہ ہے کہ تعاقب ہو رہا تھا اور ایک جھڑپ تھی کہ صرف حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ دو دو ہاتھ ہو رہے تھے اور جلد ہی ایرانی کمانڈر مدائن کی طرف بھاگنے کی بجائے اہواز اور خزستان کی طرف بھاگ گیا۔ یہ قادسیہ کا بھگوڑا جنرل ہرمزان تھا اور اس کے ساتھ اب ہمیں اکثر واسطہ پڑتا رہے گا۔ البتہ ایرانی لشکر کا کچھ حصہ کوثی کی طرف بھاگ گیا۔

کوثی سے آگے سورا اور ذیرکعب کے مقام پر بھی فیرزان نے کچھ دستے تعین کئے ہوئے تھے، سورا کے مقام پر بالکل معمولی جھڑپ ہوئی اور ایرانی بھاگ گئے۔ البتہ ذیرکعب کے مقام پر نخیر جان جو ایک مضبوط پوزیشن اختیار کئے ہوئے تھا وہ خود تو پہلی مبارزت میں ہلاک ہو گیا۔ گو نخیر جان اور اس کے خزانہ اور خوبصورت بیوی کی کہانی ابھی باقی ہے لیکن اس کے لشکر نے سخت مقابلہ کیا۔ حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر عظیم صحابی حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے ایک دستہ کے ساتھ بائیں بازو سے آگے بڑھ کر ایرانی پوزیشن کو اکھیڑ دیا اور اس کے بعد تمام ایرانی کوثی کی طرف بھاگ گئے۔

فیرزاں کا تجزیہ

فیرزاں فرار ہونے کی کاروائی میں حق بجانب تھا وہ اپنی شکست خوردہ فوج سے کافی کام لے رہا تھا کہ اس کو مدائن کا دفاع مضبوط کرنے کا وقت مل رہا تھا۔ وہ پُر امید تھا کہ دریا کی وجہ سے مدائن کا قلعہ بند دفاع بڑا مضبوط تھا اور چند سال پہلے اہل روم کی افواج مدائن تک پہنچ گئی تھیں۔ لیکن مدائن کے دفاع میں شگاف نہ کر سکی تھیں اور پھر مسلمانوں کے

پاس تو محاصرہ توڑنے والا سامان بھی نہ تھا۔ علاوہ ازیں مسلمان تیراک بھی نہ تھے اور دریائی جنگ یا کشتیوں کے استعمال سے بھی نابلد تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو اتنی دیر روک لینے سے وہ مدائن کے دفاع کو کافی مضبوط کر چکا تھا اور پھر کچھ سر پھرے فوجیوں کو باقی مقامات پر چھوڑ کر خود مدائن پہنچ گیا۔ جہاں پر اپنی تمام تر توجہ مدائن کے دفاع پر دینی شروع کر دی۔

ایک ایسا ہی سر پھرا شہریار تھا جس کو خیال تھا کہ مبارزت میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور وہ کوثی کے دفاع کا ذمہ دار تھا اور جیسے ہی اسلامی لشکر وہاں پہنچا تو بڑے ہتک آمیز لہجہ میں مبارزت طلب کی۔ کہنے لگا کہ وہ عام آدمی کے ساتھ مبارزت نہیں کرتا اگر لشکر میں کوئی سردار موجود ہے تو آگے آئے۔ عام طور پر مبارزت کے لیے حضرت زہرہ رضی اللہ عنہ خود جاتے تھے۔ لیکن یہ بات اُن کو پسند نہ آئی اور فرمایا کہ ہمارے ہاں سب سردار ہیں اور حضرت نائل بن جوشم کو آگے بھیجا کہ یہ ہمارے سردار ہیں۔ یہ مقابلہ بڑا دلچسپ رہا اور ایک وقت آیا کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون بہتر وار کر رہا ہے اور آخر میں دونوں گتھم گتھا بھی ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت نائل نے شہریار کو چاروں شانے چت گرایا اور اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد ایرانی فوج وہاں سے بھاگ گئی اور کوثی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ کوثی وہ جگہ ہے جہاں کسی زمانے میں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قید رکھا تھا۔ مسلمان لشکریوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ ان مقامات کی زیارت کی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سمیت اہل لشکر نے وہاں نوافل ادا کیے۔ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سمیت تمام اہل لشکر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا اور خدا کے فضل سے ہم ہر نماز میں ایسا التحیات میں کرتے ہیں۔

مدائن اور کوثی کے درمیان صرف ایک پڑاؤ کا فاصلہ تھا جس کو سباط کہتے ہیں۔ یہ جگہ دراصل مدائن کی فوجی چھاؤنی تھی، فیرزان تو مدائن چلا گیا، یہاں پر شیرزاد کو چھوڑ گیا تھا۔ یہ شیرزاد وہی تھا جس نے انبار کے مقام پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمانوں کو بڑے قریب دیکھا تھا اور جان کی امان طلب کر کے بھاگ گیا تھا اس لیے یہاں پر بھی جلد صلح اور جلد ہی لڑائی سے بے تیار ہو گیا اور اس کے بعد اسلامی لشکر مدائن کی طرف بڑھ گیا۔

مدائن

مدائن کو صفین بھی کہتے ہیں اور اہل یونان سٹیفن کہتے ہیں۔ یہ مقام اہل ایران کا مینجو ڈاڑو، ٹیکسلا یا ہڑپہ ہے۔ موجودہ ادیبوں اور دانشوروں نے پرانی تہذیب و تمدن کی تمام کہانیوں کو اس شہر کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور گو بابل کی تہذیب اس سے پرانی ہے لیکن اس شہر کے ساتھ اہل ایران کا کچھ زیادہ ہی تعلق رہا ہے۔ اور اس کے بارے میں بہت تحقیق ہوئی ہے کہ اس کی بنیاد کب رکھی گئی؟ دروازے کتنے تھے؟ اور سکندر یونانی نے بھی اس کی ایک دیوار بنائی۔ سلوکس نے شہر کا مغربی حصہ بنایا تھا اور پارتھیوں نے یہ کیا اور نوشیروان نے وہ کیا وغیرہ۔ لیکن اہل اسلام کو ایسی تاریخوں

کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ سب باطل تہذیبوں کی نشانیاں ہیں۔ ہمیں تو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ وہ سب تہذیب وتمدن مٹ گئے جو غیر اسلامی تھے۔

یہ مدائن دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ مغرب کی طرف سے اسلامی لشکر جب مدائن کے قریب پہنچا تو اس طرف جو شہر آباد تھا اس کے دفاع کے لیے ایرانیوں نے شہر کے آگے ایک خندق کھودی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے حکم دیا کہ منجنیقیں تیار کی جائیں اور خود شہر کا محاصرہ کر لیا۔ گو مدائن کے لوگوں کو کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ تھی کہ کشتیوں کے ساتھ ان کا دجلہ کے پار دوسرے مدائن کے ساتھ رابطہ تھا لیکن مسلمانوں نے جگہ جگہ منجنیقیں نصب کر دیں اور دن رات شہر پر پتھر یا آگ وغیرہ برسائی جانی شروع کر دی اور مکمل دو ماہ کے محاصرہ کے بعد ایرانی تنگ آ گئے اور کافی لوگ اس طرف والے مدائن کو چھوڑ کر دریائے دجلہ کے پار والے مدائن میں چلے گئے لیکن دریا کے اس طرف کوئی کشتی نہ چھوڑ گئے۔

مدائن پر قبضہ

بادشاہ یزدجرد دارالحکومت میں موجود تھا۔ یزدجرد مدائن کے دفاع پر کافی زور دے رہا تھا لیکن وہ سمجھ چکا تھا کہ اسلام کا سیلاب آسانی سے نہیں تھم سکتا اور جلد اس کو مدائن سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور اس کی سلطنت پارہ پارہ ہونے والی تھی کہ اس کے دادا نے حضور پاک ﷺ کے خط کو پھاڑ دیا تھا اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایرانی سلطنت اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے گی اور وہ وقت آ چکا تھا۔ یزدجرد اپنے خزانہ کو خچروں پر لاد کر حلوان اور باقی پہاڑی علاقوں میں منتقل کر رہا تھا۔

اب مسلمانوں کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ دریا پر کوئی پل نہ تھا اور تمام کشتیاں دوسری طرف تھیں، لیکن دریا کی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے دریا کو پیدل چل کر گھوڑوں پر سوار ہو کر پار کیا جا سکتا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ دریائے دجلہ کو پار کر رہے ہیں۔ عظیم صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی انہی دنوں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس مشیر کے طور پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے غلاموں کے لیے خشکی کو مسخر کر دیا ہے۔ اسی طرح دریا بھی مسخر ہیں۔ لہٰذا حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لشکر نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے جیش المقدم کا کام حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو کر رہے تھے اور ایرانیوں نے جب دریا کی دوسری طرف یہ دیکھا تو ان کی فوج بھی دریا میں کود گئی اور دریا کے بیچ و بیچ لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ عجیب وغریب قسم کی لڑائی شاید دنیا میں پہلی بار ہوئی ہو گی۔ بہر حال حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی اور ایرانیوں نے بُری طرح مار کھائی۔

اسی دوران بادشاہ یزدجرد نے مدائن چھوڑ دیا۔ دراصل وہ تیار بیٹھا تھا جب اسکو مسلمانوں کے دریا میں کود

جانے کی خبر ملی تو اس نے بھاگنے ہی میں خیریت سمجھی۔ایرانی فوجوں کو جب یہ پتہ چلا تو وہ بھی دل چھوڑ گئے کہ خواہ مخواہ لڑائی کیوں لڑیں۔اتنے میں مسلمان دستے کچھ دریا کے پار پہنچ گئے تو اس کنارے سے کشتیاں پکڑ کر مسلمانوں کے لیے دوسری طرف بھجوا دیں اور اسلامی لشکر نے جلدی سے دریا پار کر لیا اور اسلامی لشکر ایرانی دارالحکومت میں داخل ہو گیا۔

تعاقب کرنے والی اسلامی فوج بادشاہ کو تو نہ گرفتار کر سکی لیکن اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا اور قیمتی سامان سے لدے ہوئے خچر اور سونے کی اشرفیوں سے لدے ہوئے ٹٹو سب مسلمانوں کے ہتھے چڑھ گئے۔مالِ غنیمت اہل لشکر میں بانٹا گیا اور ہر مجاہد کے حصہ میں بے پناہ دولت آئی۔خمس یعنی پانچواں حصہ اور خاص قسم کی اشیاء کو مدینہ شریف بھیجا گیا جس میں ایک تیس گز لمبا چوڑا قالین بھی تھا۔حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ پر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو عظیم صحابہ میں بانٹ دیا۔اس کے ایک ٹکڑے کی قیمت بھی بے بہا تھی۔

مبصرین کے تبصرے

کچھ مبصروں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر وہ قالین باقی بچتا تو آج وہ کسی میوزیم کی شان ہوتا۔یہ افسوسناک پہلو ہے۔اسلام میں میوزیم اور مادی چیزوں کی نمائش کو پسند نہیں کیا گیا۔لیکن غیروں کی نقالی میں یہی مال و دولت والی چیزیں آگے چل کر ہمارے زوال کا باعث بنیں اور ایسے ہی مال و دولت نے مسلمانوں کو دنیا میں آگے بڑھنے سے روک دیا۔جہاں دولت ہو وہاں شرارت ہوتی ہے اور اسلام قناعت کا دعوے دار ہے اور زندگی میں میانہ روی چاہتا ہے، کہیں ہوتا یہ رہا کہ دولت، علم، عقل سب چیزوں کی ریل پیل ہوئی تو ہم زوالِ بغداد سے نہ بچ سکے۔دولت نے ہمیں کئی دفعہ آسان زندگی کی طرف مائل کیا اور ہمارے اوپر ذلت کی گھڑیاں مسلط کیں۔پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ کسی جگہ مجاہد کھڑے ہوتے تھے اور اللہ کے نام پر تلوار اُٹھا کر عزت بحال کر دیتے ہیں۔اسلام کے لحاظ سے وہ علم جس میں حضور پاک ﷺ کا عشق اور عسکریت نہ ہو وہ ایک خالی نیام کی طرح ہے اور دولت کے ساتھ محبت اور موت سے کراہت پیدا کرتا ہے۔اس فتح کے بعد مسلمانوں نے مدائن میں نمازِ شکرانہ ادا کی۔

چوبیسواں باب

فتوحات کے اثرات اور جلولہ و تکریت کی لڑائیاں وغیرہ

کسی ملک کے دارالخلافہ پر قبضہ کرنا بڑے دوررس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ دین فطرت کی یہ خاصیت ہے کہ اہل اسلام جہاں گئے، وہاں چونکہ ملک فتح کرنے کی بجائے وہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرتے تھے، تو اسلام ہر اس جگہ قائم ودائم ہے جہاں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے جا کر اسلام کے جھنڈے گاڑے۔ چنانچہ مدائن پر قبضہ کرنے کے بعد اہل ایران نے اسلام کی آغوش میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تبلیغ کچھ زیادہ ہی پُر اثر تھی۔ اس لئے کئی ایرانی نومسلم مجاہدوں کی صفوں میں بھی شامل ہو گئے اور مجاہدین اسلام باری باری گھروں میں چھٹی جاتے تو تب ہی ہر جگہ لشکر اسلام کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

مسلمان کسی ملک میں جا کر کوئی شاہانہ زندگی بسر کرنے کی طرح نہ ڈالتے تھے بلکہ وہاں کا نظام وہاں ہی کے لوگوں کی مدد سے چلاتے تھے اور فوج کو ضرورت کے مطابق الگ جگہوں پر چھاؤنیوں میں رکھتے جس کا ذکر آگے آئے گا مدائن پر قبضہ کے بعد پہلی ضرورت یہ تھی کہ دارالخلافہ کے گردونواح کے علاقہ میں کافی دور دور تک ایرانی مخالفت کا صفایا کیا جائے۔ مدائن پر قبضہ کے بعد میں جلولہ، تکریت اور موصل[1] تھے۔ جہاں پر ایرانی فوج ابھی کافی تھی۔ دوسری طرف وسطی ایران میں ہمدان، قم، نہاوند اور رے[2] وغیرہ کے علاقے تھے۔ جنوب میں ڈیلٹا یا اہواز اور خرستان[3] کا علاقہ تھا۔

ایران پر مکمل قبضہ کے لیے ان علاقوں میں دشمن کی مکمل سرکوبی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے شمالی علاقوں کے دشمن کی سرکوبی کی گئی۔ اس کی ضرورت اس لئے تھی کہ ایران اور روم کے حکام مل کر مسلمانوں کے خلاف کوئی

(۱) ان مقامات کے محل وقوع کے لیے پندرھویں نقشے (نقشہ پانزدہم) سے استفادہ کریں۔

(۲) نقشہ سیزدہم اور پانزدہم (۳) نقشہ دوازدہم

قدم نہ اُٹھائیں جیسا کہ الفراض کے مقام پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خلاف ایرانی اور رومی لشکر متحد ہو گئے تھے۔اس لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ کے ماتحت بارہ ہزار کا لشکر تیار کیا اوران کو جلولہ کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔

جلولہ کی جنگ

جلولہ دریائے دجلہ کے کنارے مدائن کے شمال میں واقع ہے۔ایرانیوں نے جلولہ کے مقام کا بہتر دفاع کیا ہوا تھا۔شہر سے ایک میل آگے ایک خندق کھودی ہوئی تھی۔خندق کے ایک طرف دریا تھا اوراسے پانی سے بھرلیا تھا۔اس کی دوسری طرف دلدل تھی۔جگہ جگہ پھندے،کنڈیا اورداؤ لگے ہوئے تھے۔اس لئے حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ اس شہر کو جلد فتح نہ کر سکے۔ایرانی فوج کی کمانڈ مہران کے ہاتھ میں تھی۔یہ وہی مہراں تھا جس نے مسلمانوں کی مدائن میں پیش قدمی روکنے میں بھی کام کیا اور مدائن کے دفاع میں بھی رستم کے بھائی کا ساتھ دیا۔یزدجرد حلوان سے مہراں کو ہر طرح کی کمک بھیج رہا تھا تا کہ مسلمان لشکر جلولہ کا محاصرہ جاری نہ رکھ سکیں۔یہ جنگ طوالت کے لحاظ سے تمام جنگوں پر سبقت لے گئی اور پورے چھ ماہ مسلمان جلولہ کے ایک طرف صف بندر ہے بلکہ ان چھ ماہ میں ایرانیوں نے کئی دفعہ خندق کو پار کر کے مسلمانوں پر حملے بھی کیے جن کی تعداد کئی مبصرین نے سو کے قریب بھی بتائی ہے۔لیکن یہ زیادتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایرانی ہر دوسرے روز حملہ کرتے تھے۔اصل بات یہ تھی کہ اسلامی لشکر میں تجربہ کار امرا کی کمی تھی۔حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے بغیر کوئی نامور کمانڈر موجود نہ تھا۔قیس رضی اللہ عنہ بن ہبیرہ،طلیحہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن معدیکرب چھٹی گئے ہوئے تھے اور کافی دیر کے بعد جلولہ پہنچے۔

اور ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ ایرانی اتنے باہمت ہو گئے تھے کہ اس طرح حملے کرتے۔دراصل مسلمان تاڑ چکے تھے کہ ایرانی شہر کو سر کرنا مشکل کام ہے اور جلولہ کی قدرتی اور بناوٹی دفاع کو کچھ اس طرح شیر وشکر کر دیا گیا تھا کہ اس کو سر کرنے کے لیے بے پناہ وقت کی ضرورت تھی،کہ جلولہ دریا کے کنارے ایک اہم مقام تھا۔

ویسے حکمت عملی کے لحاظ سے یہ کوئی اہم مقام نہ تھا لیکن وہاں پر اتنی زیادہ ایرانی فوج کو چھوڑ کر آگے تکریت یا موصل کی طرف پیش قدمی نہیں ہو سکتی تھی۔ان حالات میں مسلمان لشکر والے ایرانیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے کہ وہ باہر نکلیں۔مسلمانوں نے کئی دفعہ کمزوری کا اظہار بھی کیا۔مسلمان ایک بڑی ''کنڈی'' اور داؤ لگا کر ایرانیوں کو پھانسنا چاہتے تھے۔مسلمان اس دن کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے جس دن زیادہ سے زیادہ ایرانی باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔آخر ایرانی اس حوصلہ افزائی کے چکر میں آگئے اور باہر نکل کر پورے لشکر کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ تیار تھے اورانہوں نے ایرانیوں کے ساتھ وہی کیا جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایرانیوں کے ساتھ ولجہ کے

مقام پر کر چکے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وجلہ کے مقام پر حرکت کی گنجائش تھی اور پیچھے جانے کی کاروائی چھپ کر کی گئی۔ رسالہ کا استعمال کیا اور کاروائی دونوں بازوؤں پر کی گئی۔ یہاں پر چھاتی کے زور سے آگے بڑھ کر صرف ایک بازو پر پیدل دستوں کی مدد سے کاروائی کر کے دشمن کو گھیرے میں لے لیا گیا اور اس کا سہرا حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔ سامنے سے حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ نے بھرپور حملہ کیا۔ جنگ قادسیہ کے چوتھے دن کی لڑائی کی طرح یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے آندھی سے مسلمانوں کی مدد کی کہ ایرانیوں کے سامنے سے آندھی چلنے لگی۔ ایرانی فوج ضرور بہادری سے لڑی اور گھمسان کا رن پڑا لیکن ایرانیوں کے پاس پسپائی کے بغیر چارہ نہ تھا اور ایسی پسپائی اب قلعہ کیا ندر کر کے بھی کوئی افادیت حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے میدانِ جنگ سے تتر بتر ہو جانے کو ترجیح دی اور جو بچ گئے، انہوں نے حلوان وغیرہ کی راہ لی۔ مہران بھی فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ طبری نے اس جنگ میں دشمن کا نقصان ایک لاکھ بتایا ہے۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ دشمن کی تعداد زیادہ سے زیادہ پچیس یا تیس ہزار ہو سکتی ہے۔

اس لیے لاکھ والی بات تو بے شمار کے لیے ہے۔ ممکن ہے آدھا دشمن کھیت رہا ہو۔ فوجی اور عسکری نقطۂ نظر سے یہ جنگ ہنی بال[1] کی کنائی (Cannave) کی جنگ سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔ اس جنگ سے مسلمانوں کو بے شمار مالِ غنیمت حاصل ہوا اور دولت کی ریل پیل ہو گئی اور یہی دولت کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں کی حرکت میں ٹھہراؤ پیدا کر دے گی لیکن یہ چیز تیسری اور چوتھی کتاب میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ دولت حب الدنیا اور کراہت الموت کی بنیاد بنتی ہے اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی فکر تھی۔

تکریت اور موصل پر چڑھائی

جلولہ سے شمال کی طرف تکریت اور موصل کے علاقوں میں بھی ایران افواج موجود تھیں بلکہ موصل کا ایرانی کمانڈر اب تک کسی اور دنیا میں رہ رہا تھا اور اپنی طاقت پر اُسے کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا کہ اس نے موصل سے نکل کر تکریت پہنچ کر وہاں سے مسلمانوں پر یلغار کرنے کی تجویز بنائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن معتم کو پانچ ہزار کے لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس ایرانی کمانڈر کا نام عتیق تھا اور تکریت سے کچھ عرب قبائل خاص کر بنو تغلب وغیرہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن حالات تبدیل ہو رہے تھے اور جب عرب قبائل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے خفیہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ پیام رسانی شروع کر کے مسلمانوں کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ اور

(۱) ہنی بال واحد غیر یورپین جنرل ہے جس کی فوجی بصیرت کو یورپ کے عسکری تاریخ کے مبصروں نے کچھ مقام دیا ہے۔ آپ کا تعلق موجودہ تیونس سے تھا اور قبل از مسیح اہل روم کے ساتھ کافی جنگیں لڑیں۔ یورپ والوں کی اس ''فراخدلی'' کے پیچھے اہل روم کے ساتھ ان کی اپنی کدورتیں ہیں۔

اس طرح سے یہ ایرانی کوشش بہت جلد خش وخاشاک ہوگئی اور پوری ایرانی فوج کو گھیرے میں لے کر تہس نہس کر دیا گیا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پہلے تو حضرت ربیع رضی اللہ عنہ کے ماتحت ایک دستہ کو موصل بھیج دیا لیکن پھر پورے لشکر کو لے کر آپ نے از خود موصل تک حربی مظاہرہ کیا اور موصل تک کے علاقوں کو مسلمانوں نے اپنی باجگزاری میں لے لیا۔

متعدد کاروائیاں

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مسلمان فوجیوں کے کئی دستے بنا کر دیگر اطراف میں بھی بھیجے، شمالی علاقوں کے علاوہ نزدیک کے وسطی علاقوں اور ساتھ کے پہاڑی علاقوں میں بھی کچھ دستے حربی مظاہروں کے لیے بھیجے گئے۔ یہ دستے خانقین، قصر شیریں اور حلوان کے علاقوں تک گئے۔ وہاں پر لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی اور کئی جھڑپیں بھی ہوئیں اور ایسی ہی ایک جھڑپ میں قادسیہ، مدائن اور جلولہ کا بھگوڑا جنرل مہران بھی ہلاک ہوگیا۔ یہ کاروائیاں اس سلسلہ کی کڑیاں تھیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ یزدجرد کا پیچھا کر کے ایرانی شہنشاہیت کو پاش پاش کر دینا چاہتے تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کاروائیوں کو محدود کرنے کے احکام دیئے، ان کے خیال کے مطابق اسکا ابھی وقت نہ آیا تھا۔ عراق کے جتنے علاقہ پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے سویلین نظم ونسق کو بحال کرنے کی ضرورت تھی اور اسے فوجی طور پر مضبوط کرنا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تجزیہ کو پیش کرنے سے پہلے ایک اور دلچسپ بیان ضروری ہے۔

قصر شیریں

مسلمان اب قصر شیریں تک پہنچ گئے تھے۔ شیریں اور فرہاد کا قصہ ہمارے علاقہ کی لوک کہانیوں میں مشہور ہے اور شیریں کے وجود کا تو تاریخی ثبوت موجود ہے کہ وہ یزدجرد کی دادی تھی اور خسرو پرویز کی تین ہزار بیگمات میں سے بڑی چہیتی تھی۔ اس نے یزدجرد کے باپ کی اپنے خاوند سے چوری اور خفیہ طور پر شادی کرادی تھی کہ یزدجرد گمنامی میں پیدا ہوا۔ اس ملکہ کا محل ہی قصر شیریں کے نام سے مشہور ہوا اور بادشاہ نے اس کو سردیوں کے لیے بنوا کر دیا تھا۔ اس محل کی تعمیر کے وقت نوجوان انجینئر فرہاد کی نظر شیریں پر پڑ گئی اور لٹو ہوگیا۔ شیریں نے بھی آگے سے کچھ محبت کا اظہار کیا اور بادشاہ کی اجازت سے فرہاد کو ایک بڑی چٹان پھاڑ کر محل میں پانی پہنچانے کا کام سونپا گیا کہ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو شیریں اس کو مل جائے گی۔ فرہاد چٹان کو پھاڑنے میں تو کامیاب رہا لیکن شیریں کو حاصل نہ کر سکا کہ اس کا وہی حشر ہوا جو ہر "عاشق" یا پتنگ کا ہوتا ہے لیکن تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیریں نے بھی عاشق کے ساتھ ہمدردی میں جان دے دی۔ اس لئے کئی لوگ فرہاد کے وجود کے بارے میں بھی شک کرتے ہیں اور پورے واقعہ کو بناوٹی کہانی کا نام

دیتے ہیں۔ پرانے ادب میں ایسی قصہ گوئیوں کے لیے جگہ اور زمانے یا کسی ایک آدھی تاریخی شخصیت کو قصہ میں ضرور شامل کیا جاتا تھا کہ کہانی سچی نظر آئے۔ اسلام اسی وجہ سے قصہ گوئی کے خلاف ہے کہ اس میں جھوٹ ہوتا ہے اور ہم ہیں کہ عورت اور مرد کے عشق کی ہر کہانی پر لٹو ہو رہے ہیں۔ خواہ یہ کہانی عرب سے لیلیٰ مجنوں کی ہو یا ایران سے شیریں فرہاد کی۔ بلکہ کسی عاشق کو بلخ و بخارا سے چناب کے کنارے لے آئے ہیں اور کسی کو ستیان سے سندھ کے ریگستانوں میں اور اپنے ہیر رانجھا میں غیر تمند کیدو کی جس طرح مٹی پلید کی ہے اور اسلامی معاشرے کا مذاق اُڑایا ہے تو توبہ بھلی ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
(اقبالؔ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تجزیہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان وسیع علاقوں کی فتوحات کی وجہ سے بہت مصروف تھے۔ فتوحاتِ شام اور ایران دونوں ملکوں میں ہو رہی تھیں۔ اول زبان کا مسئلہ تھا اور اُن کے خیال کے مطابق عالم اسلام کی زبان عربی ہونا چاہیے تھی کہ وحدت فکر میں آسانی ہے۔ مغرب میں یہ معاملہ کافی کامیاب رہا جس کا ذکر تیسری کتاب میں ہے۔ مشرق میں کامیاب ہونے کے بعد عباسیوں، مسلم خراسانی اور برمکیوں نے اس چیز کو ختم کیا اور رہی سہی کسر منگولوں کے زمانے میں نکل گئی۔ اس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ ورنہ لسانی وحدت بھی بڑی کام کی چیز ہوتی ہے۔

دوسرا مسئلہ زر اور زمین کا تھا، بلکہ زن کا بھی تھا۔ زن کے معاملہ میں اسلام میں سختی نہ تھی اور مجاہدین نے غیر ملکوں میں شادیاں کیں اور گو خلیفہ دوم نے اس سلسلہ میں کوئی بندش کے احکام نہ دیئے لیکن اس کی کثرت کو پسند نہ فرمایا، آپ اس کام کو آہستہ آہستہ کرنے کے حق میں تھے۔ آپ کو ڈر یہ تھا کہ غیروں کے ساتھ زیادہ شادیوں سے غیروں کے باطل فلسفہ کے معاشرتی رسم و رواج مسلمانوں کے تمدن میں داخل ہو جائیں گے اور آگے یہی ہوا کہ مسلمانوں نے غیروں کے تمدن کو اپنا لیا بلکہ اکبر بادشاہ جیسے لوگ آدھے ہندو ہو گئے اور پھر کافر ہو کر مرے۔

زر و زمین والا مسئلہ بھی اہم تھا کہ مجاہدین نے جائیدادیں حاصل کر کے زرخیز علاقوں میں آباد ہونا شروع کر دیا اور دولت کی ریل پیل نے جہاد کے ولولہ اور جذبہ میں کمی پیدا کرنا شروع کر دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ سب کچھ جانتے تھے لیکن یہ بڑے مشکل مسائل تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی کئی ایسے تھے جو ان معاملات کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ وغیرہ جیسے عظیم صحابہ ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن باقی عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کئی ایک رزق حلال کی زیادتی کو کوئی غلط بات نہ

سمجھتے تھے اور اصولی طور پر تو بات صحیح ہے، لیکن اس کے اثرات میں شاید بہت لوگ نہ گئے، پھر دولت کی ریل پیل کی یہ حالت ہوگئی کہ صدقہ یا خیرات لینے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔

ان تمام معاملات کے بارے خلیفہ دوم نے ہدایات جاری کیں کہ یہ چیزیں ہمارے مقصد زندگی کو خراب نہ کریں اور فوری طور پر فوجی چھاؤنیاں بنانے کے احکامات جاری کئے کہ مجاہدین ذرا الگ تھلگ رہیں۔ گو اسلام کے لحاظ سے پوری قوم اللہ کی فوج ہے لیکن ساری باجگزار رعایا اس وقت تک ابھی اللہ کی فوج نہ تھی اس لئے مجاہدین کو ایک رکھنا ضروری تھا اور پھر اتنی بڑی حکومت کے لیے پیشہ ور فوج کی بھی ضرورت تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پہلے انبار کو چھاؤنی بنایا لیکن وہاں مکھیوں کی زیادتی کی وجہ سے مجاہدین تنگ آگئے اور آخر بوڑھے عبدالمسیح بن بقیلہ جو حضرت شویل رضی اللہ عنہ والی کرامۃ کے والد تھے اس کے مشورہ سے کوفہ کو چھاؤنی بنایا جنوبی علاقوں میں ابلہ سے آگے بصرہ کو چھاؤنی بنایا گیا، کیونکہ وسطی ایران میں کسی کاروائی سے پہلے خلیفہ دوم جنوبی علاقوں پر مسلمانوں کے تسلط کو مضبوط کرنا چاہتے تھے کہ اب ان علاقوں کی اہمیت مسلمانوں کو بھی محسوس ہو رہی تھی کہ ایرانی بادشاہت کا باہر کے ملکوں سے مکمل طور پر رابطہ توڑ دیا جائے اور ہمارا اگلا باب انہی علاقوں کی مہمات کے بارے ہے۔

نتائج و اسباق

۱۔ نتائج حکمت عملی کی تجاویز کے مطابق عیاں ہوئے۔ شمالی علاقوں پر قبضہ کر کے ایران اور ملک شام کے درمیانی علاقوں پر مسلمان چھا گئے۔

۲۔ سویلین نظم و نسق اور فوجی نظام کو بہتر بنایا گیا اور چھاؤنیوں کی بنیاد ڈالی گئی۔

۳۔ جنوبی علاقوں کو اسلام کی آغوش میں لانے کے لیے حکمت عملی تعین کی گئی۔

۴۔ وسطی علاقوں میں محدود حربی مظاہرے جاری رکھے گئے اور ابھی ایرانی شہنشاہیت کے مکمل خاتمہ کے وقت کا تعین باقی تھا۔

۵۔ اسباق عیاں ہیں کہ دل کو بیدار رکھنا پڑتا ہے۔

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری — مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

اقبالؔ

پچیسواں باب

خزستان اور فارس کے صوبوں کی مہمات

ایران اور عراق کی سرحد پر اہواز کا نام اکثر سننے میں آتا ہے اس کے ارد گرد کے علاقہ کو صوبہ خزستان یا صوبہ اہواز کہا جاتا ہے اور یہاں سے جنوب کی طرف خلیج فارس کے ساتھ ساتھ صوبہ فارس ہے۔ نقشہ دوازدہم دیکھیں کہ اس علاقہ کا یہ ایکتا کہ ہے، ہمارے پرانے مورخین اور مبصرین نے اس علاقہ کی اسلامی لشکروں کی مہمات کو ایک دوسرے کے بیچ ملا دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے لشکروں کے کئی امیر ہوئے جنھوں نے محدود علاقوں میں پیش قدمی کی یا حربی مظاہرے کئے۔ یہ کاروائیاں مدینہ شریف سے سیدھے احکام کے طور پر خودمختار طور پر کی گئیں اور عراق و ایران کے سپہ سالار کے احکام کے تحت بھی کاروائیاں محدود ہوتی تھیں کہ حکمت عملی کے تحت اس علاقہ کی باری دیر میں آئی۔ گو واسط جنگ کاظمہ کے بعد ہی پڑ گیا تھا اس لئے معاملات لمبے ہو گئے۔ زمین مسلمانوں کو فوجی لحاظ سے پسند نہ تھی۔ ڈیلٹا، جگہ جگہ ندیاں، سمندر، پانی، کیچڑ اور دلدل وغیرہ۔ اس لئے معاملات ہر طرح سے محدود رہے اور طول پکڑتے رہے۔ پچھلے تمام بیانات میں سرسری طور پر اس علاقہ کے بارے ہم اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اب مختصر طور پر تمام واقعات کو مہمات کے نام دے کر آپ کے سامنے کسی ترتیب اور سلسلہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

پہلی مہم

کاظمہ کی جنگ سے پہلے اور بعد بھی ابلہ اور بصرہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ آٹھویں باب میں ذکر ہے کہ ایک گشتی دستہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کے تحت ابلہ کی طرف بھیجا گیا۔ پھر نویں باب میں ذکر ہے کہ حضرت سوید رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو ان علاقوں کا فوجی گورنر بنا کر حفیر کے مقام پر تعینات کیا گیا۔ لیکن ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا کہ حیرہ کی طرف پیش قدمی کی تو اس علاقہ سے اپنے عاملوں کو واپس بلا لیا گیا تھا کہ اتنے بڑے علاقے کا انتظام ان حالات میں سنبھالنا مشکل تھا۔ دراصل یہ پہلو پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ علاقے گو ایرانیوں کے لیے اہم تھے لیکن مسلمانوں

کے لیے اس وقت تک اتنے اہم نہ تھے اور نباج سے حفیر والے راستے کے بجائے مسلمان نباج سے زرود اور شراف کے راستے سیدھے حیرہ پہنچ جاتے تھے۔

بے شک یہ علاقے مسلمانوں کی سرحد کے نزدیک تھے لیکن مسلمان بین الاقوامی طور پر سمندروں میں داخل نہ ہوئے تھے اور اس وقت تک ان کے لیے سمندروں کے کنٹرول میں اُلجھ جانا ٹھیک بھی نہ تھا۔ دوم ان علاقوں کی زمین کے بارے اوپر تجزیہ کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے فوجی لحاظ سے ناپسندیدہ تھی۔ سوم ان علاقوں میں ایرانی رؤسا کی جاگیریں تھیں اور ہر جگہ ذاتی مفاد کے تحت مسلمانوں کے ساتھ سخت مقابلہ ہوتا اور بادشاہت اس وقت تک قائم تھی وہ ان جاگیرداروں کی خوب امداد بھی مہیا ہو رہی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی یہ حکمت عملی تھی کہ پہلے ایرانی حکومت اور اس کی فوج کے بڑے حصے کو برباد کیا جائے اور صرف ان علاقوں پر قبضہ رکھا جائے جو اس سلسلہ میں مددگار رہوں۔ ان علاقوں پر قبضہ سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے پہلی مہم کے بعد ان علاقوں میں معاملات کو ''دیکھ بھال'' تک محدود رکھا گیا۔

دوسری مہم

لیکن مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اس علاقے سے مکمل طور پر بے فکر ہو جانے کے بڑے نقصانات تھے۔ ایرانی اس طرف سے کوئی بڑی پیش قدمی کر کے مسلمانوں کے ذرائع آمد و رفت میں خلل ڈالتے۔ گو مسلمانوں کی ''بندوبستی دُم'' نہیں ہوتی تھی لیکن عارضی طور پر ایرانی کچھ خلل انداز ہو سکتے تھے۔ اس لئے جن دنوں خلیفہ دوم نے حضرت ابوعبید ؓ کو حضرت مثنیٰ ؓ کی جگہ عراق سپہ سالار مقرر کیا۔ انہی دنوں حضرت عتبہ ؓ بن غزوان کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ ابلہ کے علاقہ میں بھیجا گیا کہ وہاں یہ گشتی کاروائیاں اور حربی مظاہرے جاری رکھے جائیں لیکن حضرت ابوعبید ؓ کی شہادت کے بعد جب عراق کی سپہ سالاری حضرت سعد ؓ کو سونپی گئی تو حضرت عمر ؓ نے حضرت عتبہ ؓ کو حکم دیا کہ سات یا آٹھ سو سواروں کا دستہ حضرت مغیرہ ؓ بن شعبہ کے کے ماتحت حضرت سعد ؓ کی مدد کو بھیجیں اور خود اپنے علاقہ کی مہمات کو محدود رکھیں یعنی حربی مظاہرے یا دیکھ بھال سے آگے نہ بڑھائیں۔ اس چیز کا ذکر پچھلے ابواب میں حضرت سعد ؓ کو کمک کے عنوان کے تحت ہو چکا ہے اور اس وجہ سے دوسری مہم بھی محدود ہو گئی۔

تیسری مہم

مدائن کی فتح کے بعد حضرت عمر ؓ نے حضرت سعد ؓ کو حکم دیا کہ حضرت مغیرہ ؓ بن شعبہ کو آٹھ سو سواروں سمیت ابلہ کے علاقہ میں حضرت عتبہ ؓ بن غزوان کے پاس واپس بھیج دیں۔ ہمارے کئی مبصر یہاں پر حضرت مغیرہ ؓ کی بجائے حضرت عتبہ ؓ کو آٹھ سو سواروں کا کمانڈر لکھ گئے جس نے معاملات کو اور گڈمڈ کر دیا، لیکن

ہمارا تجزیہ یہ ہے اور مختلف مؤرخین کے بیان کی چھان بین کر کے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کو نومسلم قبائل سے اور مجاہدین کی بھرتی کا حکم بھی ملا اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے سواروں کو ملا کر ان کے پاس چھ ہزار کا لشکر ہو گیا اور انہوں نے خلیفہ کے حکم پر آگے پیش قدمی کی۔ آگے سے مقابلہ ہرمزان سے ہوا۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ جب مسلمان مدائن کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ کہ بابل کے مقام پر جو جھڑپ ہوئی تو قادسیہ کی جنگ کا بھگوڑا ہرمزان بابل کے مقام سے بھاگ کر خرستان چلا گیا۔ اس علاقے میں اس کی جائیداد تھی۔ اس نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکا لیکن ہر مقام پر شکست کھائی اور مسلمانوں نے دونوں دریاؤں دجلہ اور فرات کے سنگھم تک کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں یزدجرد دارالخلافہ چھوڑ چکا تھا اور ایرانی جنرل کچھ خود مختار تھے۔ اس لئے ہرمزان نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی۔ مسلمان خود ابھی اس پوزیشن میں نہ تھے کہ زیادہ آگے پیش قدمی کرتے۔

چوتھی مہم

اس علاقے کی چوتھی مہم کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ یہ کسی حکمت عملی کا نتیجہ تھی یا حضرت علا رضی اللہ عنہ بن الحضرمی کی ذاتی تجویز یا خواہش کے تحت ہوئی۔ بہر حال اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت علا رضی اللہ عنہ بھی کسی کامیابی کے خواہشمند تھے اور یہ ان کی اپنی تجویز تھی۔ حضرت علا رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بحرین کے عامل تھے اور اس کا ذکر جلالِ مصطفےٰ میں موجود ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت علا رضی اللہ عنہ بھی مدینہ میں تھے۔ دوسرے اور چوتھے باب میں حضرت علا رضی اللہ عنہ کی بحرین کی مہم کے لیے نامزدگی اور کاروائی کو مکمل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی کامیابیوں کو سن کر حضرت علا رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ بھی کچھ علاقے فتح کریں اور انہوں نے سمندری راستہ سے صوبہ فارس پر حملہ کی تجویز بنائی جس کی نشاندہی نقشہ دوازدہم پر کر دی گئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک کسی سمندری جنگ کے حق میں نہ تھے، جس کو مؤرخین نے غلط رنگ دیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سمندری جنگ سے نفرت کرتے تھے اور ان کو کراہت تھی وغیرہ۔ یہ سب اضافی باتیں ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ پہلے سمندر کو سمجھا جائے، اس کو استعمال کرنے کا طریقہ سیکھا جائے، تو پھر سمندری جنگ کے بارے سوچا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو خشکی تک کیسے محدود کر سکتے تھے لیکن ان کے لحاظ سے وہ وقت اس کام کے لیے یعنی سمندری جنگ کے لیے موزوں نہ تھا، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علا رضی اللہ عنہ کی یہ کاروائی خلیفہ دوم کی اجازت کے بغیر تھی۔

بہر حال حضرت علا رضی اللہ عنہ نے بحرین کے ساحل سے پار علاقوں کے نومسلم عرب قبائل کو شامل کر کے ایک لشکر

تیار کیا اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ بحرین اور کچھ ساحلی علاقوں کے لوگ سمندر میں کشتیوں کو چلانے کے کام سے واقف تھے اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ بحرین اور کچھ ساحلی علاقوں کے لوگ سمندر میں کشتیوں کو چلانے کے کام سے واقف تھے اور خلیج فارس میں تو ہر طرح کی کشتیاں آسانی سے چلتی تھیں۔ پانی میں کافی ٹھہراؤ تھا اس موسم میں ٹھہراؤ تھا چنانچہ تینوں لشکر صوبہ فارس میں کشتیوں کے ذریعے سے طاؤس کے علاقے میں اُتر گئے لیکن ایرانی چوکنے تھے اور سمندری جنگ کو سمجھتے تھے۔ ساحلی علاقوں کی جنگ کو بھی وہ زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس لیے اسلامی لشکر کے تینوں دستوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی بلکہ دو لشکروں کے سردار اور ان کے لڑکے بھی جنگوں اور جھڑپوں میں شہید ہو گئے۔ اب مسلمان مجاہدین ان علاقوں میں پھنس کر رہ گئے۔ انہوں نے ہتھیار تو نہ ڈالے لیکن جنگلوں اور بیابانوں میں گزارا کرنا شروع کر دیا کیونکہ ساحل پر ایرانیوں کا کنٹرول تھا۔ یہ مجاہدین واپس بحرین بھی نہیں جا سکتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ردعمل اور پانچویں مہم

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے حضرت علا رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا لیکن ساتھ ہی حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بن غزوان کو حکم دیا کہ خشکی کے راستے سے آگے بڑھ کر ان مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم کریں اور ان سب علاقوں کو اسلام کی علمبرداری میں شامل کریں۔ خلیفہ دوم کے حکم پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کی امداد کیلئے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن کے ماتحت ایک دستہ فوج کا بھیجا اور مدینہ سے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت بھی ایک دستہ آ چکا تھا، حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ نے آگے پیش قدمی کی اور ہرمزان کے لشکروں کو کئی مقامات پر شکست دی اور ہرمزان ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ صلح کر چکا تھا اور اپنے آپ کو اس علاقہ کا خودمختار حاکم کہتا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ یزدجرد سے ملا ہوا تھا اور وہاں سے کمک حاصل کرتا رہتا تھا۔ ان حالات میں حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ اگر اور زیادہ آگے بڑھتے تو خطرہ یہ تھا کہ ہرمزان ان کے پچھلی طرف کے راستوں کو مسدود کر دیتا اور یہ لشکر بھی گھیرے میں آ جاتے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اور مدد مانگی انہوں نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو کے ماتحت ایک لشکر حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیجا۔ اب اسلامی لشکر کی تعداد دس بارہ ہزار کے قریب ہو گئی۔ حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ نے خود چند دستوں کے ساتھ بائیں جانب کے علاقوں کی حفاظت کی ذمہ داری نبھائی اور حضرت ابورحم رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کے ساتھ سمندر کے ساتھ ساتھ آگے روانہ کیا اور ان مجاہدین کو ایرانیوں کے گھیرے سے نکالا گیا۔ بہرحال اس طرح ساحل علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا لیکن شمال کی طرف ابھی خزستان اور فارس کے کافی علاقوں پر ایرانیوں کا ہی قبضہ تھا۔

چھٹی مہم

کچھ عرصہ بعد حضرت عتبہ ؓ حج سے واپس آتے وقت اونٹ سے گر کر زخمی ہو گئے اور بعد میں وفات پا گئے اور حضرت فاروق اعظم ؓ نے حضرت مغیرہ ؓ بن شعبہ کو بصرہ کا عامل مقرر کیا اور آپ نے اس محاذ کے حربی مظاہروں میں اور جان ڈال دی لیکن جناب مغیرہ ؓ کے خلاف ایک زنا کا مقدمہ دائر ہو گیا جس کا فیصلہ خلیفہ دوم نے کرنا تھا۔ حضرت مغیرہ ؓ کے بارے میں روایت ہے کہ جاری حد رکھتے ہوئے آپ نے اَسّی (۸۰) کے قریب شادیاں کیں۔ آپ زیادہ وجیہہ تو نہ تھے لیکن ان کی شخصیت میں عورتوں کے لیے بیحد جاذبیت تھی۔ اس لیے ایک دفعہ کچھ مخالفین کو غلط فہمی ہوئی یا کچھ بات تھی کہ انہوں نے مقدمہ کر دیا کہ فلاں عورت بھی حضرت مغیرہ ؓ کے بالا خانے میں اس حالت میں دیکھی گئی۔ چار گواہوں میں زیاد ابن سمیہ بھی تھا جس کا آگے چوتھی کتاب میں ذکر آئے گا۔ اس نے عورت کی پہچان کے بارے شکوک ظاہر کیے تو حضرت مغیرہ ؓ کافی عرصہ کے بعد اس مقدمہ سے بری ہوئے۔

آپ کی جگہ حضرت ابو موسیٰ(۱) اشعری کو بصرہ کا عامل مقرر کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ہرمزان نے ایک صلح نامے کو توڑ کر مسلمانوں کو ذک پہنچائی تو حضرت ابو موسیٰ ؓ نے آگے بڑھ کر اہواز پر قبضہ کر لیا۔ اور ایرانیوں کو شکست دی اور وہ بھاگ گئے۔ ہرمزان بھی بھگوڑا ہو گیا اور حضرت ابو موسیٰ ؓ نے دور دور تک تعاقب کیا۔ مسلمانوں نے ان سب علاقوں کو بصرہ کے صوبہ کا حصہ بنا لیا اور اور موجودہ صوبہ خزستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں نے علاقہ میں جگہ جگہ چوکیاں قائم کر دیں اور تمام امن وامان ہو گیا اس کے بعد اضافی یا فالتو لشکر کو لے کر حضرت نعمان ؓ بن مقرن کوفہ چلے گئے۔

کوفہ میں تبدیلیاں اور ساتویں مہم

حضرت عمر ؓ نے اہل کوفہ سے تنگ آ کر ایک دفعہ فرمایا تھا کہ عجیب لوگ ہیں، جب کہ ان پر کوئی مضبوط آدمی مقرر کرتا ہوں تو اس کے خلاف دروغ گوئی شروع کر دیتے ہیں اور جب کسی معتدل اور بھلے آدمی کو ان پر مقرر کرتا ہوں تو اس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس لئے ان چند سالوں میں حضرت عمر ؓ نے کوفہ میں کئی تبدیلیاں کیں لیکن یہ معاملات مکمل طور پر قابو میں نہ آسکے اور واقعہ کربلا تک بلکہ اس سے کئی سال بعد بھی کوفہ میں کوئی نہ کوئی سازش جنم لیتی رہی۔ یہاں پر ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے صرف اشارہ کافی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو حضرت سعد ؓ بن ابی وقاص کی بددعا ہے کہ انہوں نے حضرت سعد ؓ جیسے بزرگ صحابی کو بھی معاف نہ کیا اور ان کے خلاف الزام

(۱) حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ عظیم صحابی ہیں۔ جلال مصطفیٰ میں کثرت کے ساتھ آپ کا ذکر ہے، اس کتاب میں آگے اور تیسری و چوتھی جلد میں بھی آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔

لگائے۔خلیفہ وقت نے ان کی جگہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو بڑے معتدل اور چوٹی کے صحابی تھے لیکن اہل کوفہ ان کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور فتنہ وفساد کرتے رہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ کے لیے خزستان کی مہم پر چلے گئے۔تو اُن کے نائب حضرت عبداللہ [1] رضی اللہ عنہ بن مسعود کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا ان ہی دنوں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کے خلاف الزامات ثابت نہ ہوئے تو پھر ان کو کوفہ کا عامل مقرر کر دیا گیا۔بعض مؤرخین اور مبصرین نے ان تبدیلیوں کی آڑ میں ان سب عظیم صحابہ کرام کے واقعات کے جائزے لے کر جو الفاظ استعمال کئے ہیں ایسی ہمت اللہ تعالیٰ ہماری قلم کو کبھی بھی نہ دے۔ ہمارے لیے یہ سب صحابہ کرام بہت عظیم ہیں۔

بہر حال جن دنوں میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کوفہ کے فوجی گورنر اور سپہ سالار تھے۔اس زمانے میں یزدجرد کی شہ پر ہرمزان نے اربق کے گردونواح میں ایک بڑی فوج اکٹھی کی اور مسلمانوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے موقع کی تلاش شروع کر دی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے،انہوں نے یہ خبر مدینہ بھیجی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ایک لشکر بصرہ بھیجیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو دوبارہ ایک لشکر کے ساتھ ادھر بھیج دیا جنہوں نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اُن سے امداد لے کر آگے پیش قدمی کی اور ہرمزان کو اربق کے مقام پر شکست دی۔لیکن یہ ہرمزان کی کچھ شرارت بھی تھی وہ مسلمانوں کو کم نفری کے ساتھ آگے بڑھنے کی شہہ دینا چاہتا تھا کہ ششتر کے مقام پر اس نے لاؤ لشکر اکٹھا کر دیا۔ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف اطلاع بھیجی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو ایک ہزار کا لشکر دے کر ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیجا۔لیکن اسی دوران خلیفہ دوم کے احکام آگئے کہ تمام تر کوشش کے ساتھ جنوبی علاقوں سے ایرانی بادشاہت کے فتنہ کو ختم کر دو۔ چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے نصف لشکر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ماتحت کوفہ چھوڑا اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ خود باقی لشکر کے ساتھ خزستان کی طرف چل پڑے۔مسلمانوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے ششتر کے علاقہ میں ہرمزان کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں اور آخر ہرمزان قید ہوا اور اس کو مدینہ بھیج دیا گیا، جہاں پر حیلہ و بہانہ سے اس نے اپنی جان بچا لی ورنہ کئی دفعہ کی وعدہ شکنی کے بعد اس کا سر قلم ہونا چاہیے تھا۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے ایران فیروز کو بھڑکانے والا بھی یہی ہرمزان تھا کہ اس نے اس کے بعد مدینہ شریف ہی میں رہائش رکھی

(1) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ اُن خوش نصیبوں میں ہیں جو مکہ کے اولین مسلمانوں میں شامل ہیں اور اسلام لانے کی وجہ سے بڑی مصیبتیں سہیں۔عمار رضی اللہ عنہ، اُن کے والد رضی اللہ عنہ اور اُن کی والدہ رضی اللہ عنہا سب نے اسلام کے لیے تکلیفات برداشت کیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسلام کے عظیم عالم اور حنفی فقہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔آپ کا ذکر جلال مصطفیٰ میں کئی جگہ پر ہے۔

ہوئی تھی اور دل سے مسلمان نہ ہوا تھا۔ یہ ذکر تیسری کتاب کے تیسرے باب میں ہے۔

بہر حال حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ خزستان اور فارس کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر کے ان علاقوں کو ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور خود واپس کوفہ آکر اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ جس پر کچھ عرصہ اور قائم رہے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے اب صرف ''صفائی'' کا کام باقی رہ گیا تھا اور انہوں نے شوش کے علاقوں تک پیش قدمی کر کے ان سب جگہوں کو اسلام کی آغوش میں دے دیا۔ شورش میں حضرت دانیال پیغمبر کی قبر ہے جو کچھ دریا برد ہونے والی تھی۔ مسلمانوں نے قبر کو صحیح حالت میں اور اس کو دریا بُرد ہونے سے بچایا اور اس مقام کے تقدس کو بحال کر دیا جو آج تک قائم ہے۔

نتائج واسباق

یہاں حکمت عملی ایک واضح شکل اختیار کر جاتی ہے۔ شمال میں قبضہ کے بعد اب جنوب میں اہل ایران کا سمندروں سے جو باقی دنیا کے ساتھ رابطہ تھا اس کو بھی کاٹ دیا گیا۔ اب درمیانی علاقے باقی تھے اور ظاہر ہے مسلمان اب آخری کلہاڑا چلانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ جس کا ذکر اگلے باب میں ہے اور یہی اس باب کی کاروائی کا بڑا نتیجہ تھا۔ مسلمان کتنے چوکنے تھے۔ کس طرح پہل کاری کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ کس طرح بروقت سوجھ بوجھ کے ساتھ کاروائی کی۔ سب پہلو مختصر طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تمام ابواب فوجی حکمت عملی کے بحث ومباحثہ اور عسکری تاریخ کے مبصروں کے لئے نکتوں کی وضاحت کے لیے بڑی اچھی فوجی مشقیں بنائی جاسکتی ہیں۔

ان میں کئی اسباق ہیں جس میں خاص کر زمین کا مطالعہ، ڈیلٹا کی جنگ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور ریگستانی علاقہ کے لوگوں کا ڈیلٹا میں اس وقت مکمل کاروائی کرنا جب وہ اس علاقہ کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ ہر پہلو کا مطالعہ کافی دلچسپ ہے۔ لیکن وہ لوگ زندہ تھے۔ ہماری طرح ان کے دل مردہ نہ ہو چکے تھے وہ غیرت مند تھے اور سب کچھ اللہ تعالیٰ جل جلالہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کام کرتے تھے۔ ایرانیوں کا علم نجوم ان کو نہ سمجھ سکا۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جائے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

(اقبالؔ)

چھبیسواں باب

معرکۂ نہاوند کیلئے طرفین کی تیاری

یہ ایرانی سلطنت کے آخری دن تھے۔ لیکن اتنی بڑی سلطنت جس کا صدیوں سے دنیا میں طوطی بولتا رہا ہو۔ اس پر ایک آخری بھرپور وار کی ضرورت تھی جس کا موقع خود ایرانیوں نے فراہم کر دیا تھا جن صوبوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا ان کے متعدد جوان لشکروں کی بھگدڑ کے ساتھ ایران کے دور دراز علاقوں میں چلے گئے تھے اور وہ اپنے علاقوں میں واپسی کے خواہاں تھے اس لئے اہل ایران ان علاقوں میں جب بھی کوئی لشکر تیار کرتے جہاں پر اُن کی حکومت تھی تو ایسے لشکر میں شمولیت کے لیے یہ بھگوڑے بے تاب ہوتے تھے کہ شاید فتح کی صورت میں ان کو واپس اپنے علاقوں میں جانے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ جس زمانے میں مسلمان لشکر خزستان اور فارس کے صوبوں میں پیش قدمی کر رہے تھے اس زمانے میں نہاوند کے مقام پر اہل ایران مسلمانوں کے ساتھ ای اور جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ کچھ صوبوں میں مثلاً آذر بائیجان، قیمس، اصفہان، مرو، رے اور طبرستان وغیرہ کے علاقوں میں ایرانی حکومت قائم دائم تھی۔ ان سب جگہوں سے افواج نہاوند میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئیں اور طبری کے مطابق اس جگہ تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار کے قریب ایرانی جوان اکٹھے ہو گئے۔ ممکن ہے تعداد زیادہ نہ ہو لیکن اتنی تعداد ضرور تھی جس نے مسلمانوں کو فکر مند کیا۔

فتح و قریب

مسلمان چوکیوں نے اس اجتماع کی خبر حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں دی جو اس وقت کوفہ میں سپہ سالار اور فوجی گورنر تھے۔ آپ نے وہاں سے جس قاصد کو یہ خبر دے کر مدینہ بھیجا اس کا نام قریب تھا اور اس کے والد کا نام ظفر تھا۔ اس سے اہل مدینہ نے یہ شگون لیا کہ ظفر یا فتح قریب یا نزدیک ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اب ذہنی طور پر تیار تھے۔ اس لئے انہوں نے مشاورت طلب کی اور خود کوفہ جانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا کہ وہاں سے وہ ساری مہم کو آگے اپنی نگرانی میں چلائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر دشمن کی تعداد کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ کئی عظیم صحابہ نے مشورہ دیا کہ ملک شام، حجاز

اور یمن سے تمام اسلامی افواج کو ایران بھیج دیا جائے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حالات اتنے بھیانک نہیں ہیں۔ ویسے بھی فتوحات اللہ تعالیٰ کی مدد سے نصیب ہو رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ کیا جائے۔ ایران کے علاقے میں اتنے مجاہدین موجود ہیں کہ وہ اکٹھے ہو کر تمام حالات پر قابو پا سکتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اس سے پہلے دو دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے باہر جانے کے حق میں تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس ہو بھی آئے تھے۔ اس دفعہ بالکل مختلف رائے دے رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے بڑے متاثر ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا۔

نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کا تقرر

گو عراق و ایران میں متعدد چوٹی کے صحابہ موجود تھے لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے طریقہ پر اس دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو اس نئی مہم کے لیے سپہ سالار مقرر کیا۔ آپ حضرت مقرن رضی اللہ عنہ کے عظیم فرزند نعمان رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کوفہ ہی میں رہ کر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی ہر طرح مدد کریں گے اور اُن کے لشکر کی تیاری میں مدد دیں گے۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کسی تعارف کے محتاج نہیں اور روایت ہے کہ آپ ان تین نوعمر لڑکوں میں شامل تھے جن کو جنگِ اُحد میں شرکت کی اجازت ملی۔ آپکے والد مقرن رضی اللہ عنہ صحابہ بدر میں سے ہیں اور ان کا اور اُن کے دس بیٹوں کا ذکر پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے۔ بہر حال حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی مہم کے لیے خلیفہ دوم نے مندرجہ ذیل احکامات بھی جاری کئے:۔

۱۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بصرہ میں اپنے نائب کو چھوڑیں گے اور خود بصرہ سے لشکر کا تیسرا حصہ ساتھ لے کر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو رپورٹ کریں گے۔

۲۔ مدائن سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بن الیمان کا ایک لشکر بھی حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہوگا۔

۳۔ مدینہ سے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ جو اس وقت مقدمے سے بری ہو چکے تھے وہ ایک لشکر تیار کر کے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے پاس جلد سے جلد پہنچ جائیں گے اور اس لشکر میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہ کو شرکت کی دعوت دی گئی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سمیت کئی صحابہ کبار رضی اللہ عنہ لشکر میں شامل تھے۔

۴۔ خلیفہ دوم نے یہ حکم بھی دیا کہ بصرہ سے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے جانشین تسلی کریں گے کہ خزستان کے علاقوں سے کوئی ایرانی نہاوند کی طرف تو نہیں جاتا کہ ممکن ہے کچھ لوگ کسی بہانے سے خزستان سے نکل کر نہاوند میں جا کر ایرانی لشکر میں شامل ہو جائیں۔

۵۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اگر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں تو اس کے بعد سپہ سالاری کے لیے جانشینی کی یہ ترجیحات ہوں گی۔ اول حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ پھر حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور آخری میں حضرت

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے بصرہ، مدینہ اور کوفہ کے لشکروں کو کوفہ ہی کے مقام پر اکٹھا کیا اور پھر مدائن پہنچ گئے۔ مدائن سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو ساتھ شامل کر کے قصر شیریں کے راستے کرنان شاہ کی طرف پیش قدمی کی۔ نقشہ سیاز دہم سے اس سلسلہ میں راہنمائی حاصل کریں۔ قصر شیریں تک بلکہ اس سے آگے تک مسلمانوں کی چوکیاں موجود تھیں۔ آپ نے اپنے لشکروں کے اجتماع کے لیے تزار کے مقام کو چنا۔ آپ بصرہ سے صوبہ خزستان میں اہواز کے راستے بھی پیش قدمی کر سکتے تھے لیکن فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے اوپر والا راستہ اختیار کیا گو علاقہ پہاڑی تھا لیکن دیکھ بھال اور پھیلاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں نے اس راستے کو پسند کیا۔ سردی کا موسم آنے والا تھا اور مسلمان کچھ جلدی میں تھے۔ اہل ایران تو سردی برداشت کر سکتے تھے لیکن گرم علاقے کے مسلمان زیادہ سردی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے تزار پہنچنے کے بعد حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی نعیم رضی اللہ عنہ کو جیش المقدم پر مقرر کر کے حکم دیا وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور نہاوند سے گیارہ میل پیچھے جس جگہ کو آج کل سعد وقاص کہتے ہیں وہاں رُکنے کا حکم دیا۔ آپ بھی پیچھے رواں دواں تھے۔

اسلامی لشکر کی تعداد کوئی تیس یا چالیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے اور آگے ایرانی فوج ایرانی جنرل مردان شاہ کے ماتحت کوئی ایک لاکھ کے قریب تھی۔ مسلمانوں نے حسب دستور صلح کی ایک کوشش کی۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کو سفیر بنا کر بھیجا لیکن معاملہ بالکل اسی طرح رہا جو کچھ رستم اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے درمیان قادسیہ کے مقام پر ہوا تھا۔ بلکہ ایرانی اس بار کچھ زیادہ ہی پُر امید تھے۔ اب لڑائی بالکل ناگزیر ہوگئی تھی اور مسلمان تیار تھے۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا اُنہیں کے جگر میں

(اقبالؔ)

ستائیسواں باب

جنگ نہاوند۔ محرم ۲۱ ہجری

نہاوند کی جنگ دنیا کی ایک مشہور ترین جنگ ہے، اس جنگ کے بعد ایران کی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا اور ایران و فارس کے لوگ اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے اور مسلمان کی حیثیت سے ان خطوں کے مسلمانوں نے علمی اور عسکری میدانوں میں عظیم کام کئے۔ قادسیہ کی جنگ کی طرح یہ بھی ایک فیصلہ کن جنگ تھی اور اسلام کی عسکری تاریخ میں ان دونوں جنگوں کو بہت بلند مقامات حاصل ہیں۔

نہاوند کا علاقہ سطح مرتفع ہے اور سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ بلند ہے۔ ویسے چھوٹی چھوٹی ندیاں اور وادیاں کثرت سے موجود ہیں۔ نہاوند کا میدانِ جنگ ایرانیوں کا چنیدہ تھا۔ انہوں نے پوزیشن ندی کے کنارے کچھ اونچی زمین پر لی ہوئی تھی اور ایرانی پوزیشن پر حملہ کرنے کے لیے اس ندی کو پار کرنا پڑتا تھا۔ نقشہ چہاردہم کا خاکہ میدانِ جنگ اور فوجوں کی صف بندی کو سمجھنے کے سلسلہ میں کچھ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ایرانی فوج کے دایاں اور بایاں بازو دونوں ٹیلوں پر تھے، اس لیے مسلمان کوئی متحرک طرزِ جنگ اختیار کر کے دشمن کو بازو سے اکھیڑنے کی کاروائی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ مسلمان صرف ندی کو پار کر کے سامنے ہی سے حملہ کر سکتے تھے۔ لشکروں کی صف بندی ہو چکی تھی۔

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے بازوؤں پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور اپنے بھائی نعیم رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور خود درمیان میں تھے۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ رسالہ کے افسر تھے لیکن آگے ہر لشکر تقریباً دس حصوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ہزار مجاہدین پر صحابہ کرام یا اور نامور مجاہدین امیر تھے۔ ایرانیوں کے لشکر کے بھی تین بڑے حصے تھے۔ مردان شاہ درمیان میں تھا اور بازوؤں پر بہمن اور زادق تھے۔ یہ کوئی نیا بہمن تھا۔ ایرانی فوج کے عقب میں انوشق تھا۔

یہ ایرانیوں کا اپنا علاقہ تھا اور ان کے پاس رسد و رسائی کی کوئی کمی نہ تھی۔ مسلمانوں کا رسد کا بڑا ذریعہ مدائن تھا جس پر چند سال پہلے قبضہ کیا تھا اور وہ کافی دور تھا۔ باقی علاقہ جو مسلمانوں کے عقب میں تھا وہ اتنا آباد نہ تھا۔ سردیوں کا موسم آ رہا تھا اور مسلمان جلدی میں تھے۔ ایرانیوں کو کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ اپنی چنی ہوئی زمین پر ایک لاؤ لشکر کے ساتھ

آرام سے بیٹھے تھے۔ مدافع کے انتظار والے تمام فوائد ان کے حق میں تھے۔ زیادہ سردی اور خوراک میں کمی کی وجہ سے بعد میں اگر اسلامی لشکر پسپائی اختیار کرتا تو ایرانی مسلمانوں پر جگہ بجگہ حملے کرتے یا پسپائی کے راستوں کو مسدود کرتے پھر یہ ایرانی فوج پہلی بھاری بھرکم ایرانی فوجوں سے مختلف تھی۔ یہ لوگ نسبتاً ہلکے پھلکے اور متحرک تھے۔

لڑائی کا پہلا دن

چنانچہ مسلمانوں کے پاس ندی پار کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اور ساری ایران کی مہمات میں جسر کی جنگ کو چھوڑ کر یہ پہلی جنگ تھی جہاں پر مسلمان مجبور ہو کر دشمن کی چنی ہوئی زمین پر اس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ صف آرائی وہی رہی اور ندی بھی دوپہر تک پار کر لی گئی لیکن لڑائی کا تیسرا نعرہ "اللہ اکبر" ظہر کی نماز کے بعد دیا گیا جس کو سننے کے بعد اسلامی لشکر نے بھرپور حملہ کر دیا۔ اول اوپر چڑھ کر آگے بڑھنا تھا اور پھر ایرانیوں سے سخت مقابلہ کیا۔ اس لیے مسلمانوں کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے لیکن کافی مجاہد بھی شہید ہو گئے۔

لڑائی کا پہلا دن

دوسرے دن بھی معاملات ویسے ہی رہے۔ بازو کی طرف سے کوئی چھوٹی موٹی کاروائی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے سورج کے چڑھنے کے بعد مسلمانوں نے سامنے سے ایک اور بھرپور اور سخت مقابلہ کیا اور نتائج بالکل پہلے ہی دن کی طرح تھے۔ دشمن بے جگری سے لڑا، اس کی لاشوں سے میدانِ جنگ پٹ گیا لیکن مجاہدین اس کی صفوں میں کوئی برائے نام شگاف بھی نہ بنا سکے۔

جنگ میں التوا

اگلے دو دن جنگ خود بخود ہی تھم گئی، مسلمانوں نے کوئی زوردار حملہ نہ کیا اور ایرانی بھی دیکھ بھال میں مصروف رہے لیکن ایرانی بہتر حالات میں تھے۔ میدانِ جنگ ان کی مرضی کا تھا اور وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے، یعنی ایرانیوں کی جنگ کچھ بامقصد تھی، پہلے وہ بادشاہ کی سلطنت کی حفاظت کیلئے لڑ رہے تھے اور اب اپنی بقا کیلئے لڑ رہے تھے۔

حضرت نعمان کا صلاح ومشورہ

ان حالات میں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے میدانِ جنگ کے چیدہ اور تجربہ کار سرداروں کو اکٹھا کیا اور آئندہ کے طریق کار کے بارے میں مشاورت طلب کی۔ سرداروں کی آرا کو مؤرخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ آخر حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن معدیکرب کی رائے سے ایک ملی جلی تجویز بنائی گئی کہ دشمن کے چھوٹے چھوٹے حملوں کے سامنے

کچھ پسپائی اختیار کی جائے اور جب دشمن ہمت کر کے خوب آگے بڑھے تو دونوں بازوؤں سے اس کو گھیر لیا جائے۔اس وقت تک دشمن ایسی زمین پر آ گیا ہوگا جو مسلمانوں کی مرضی کی ہوگی۔اس کے لیے پسپائی کافی زیادہ اور بائیں بازو کی طرف اختیار کرنا پڑتی تھی کہ مدائن کو راستہ ایسی ہی سمت سے جاتا تھا۔

مسلمانوں کا نئی تجویز پر عمل

ویسے مسلمانوں نے اپنے لشکر میں کچھ یہ بھی مشہور کر دیا کہ خلیفۂ وقت وفات پا گئے۔ندی کے پار سے آگے والی چوکیوں کو رات کے اندھیرے میں واپس لایا گیا، جمعہ کی صبح اور لڑائی کے پانچویں دن ایرانی کمانڈروں کو مسلمانوں کی ''کمزوری'' پر کوئی شک نہ رہا اور انہوں نے ندی کو پار کرنا شروع کر دیا۔مردان شاہ ندی کو پار کر کے پہلے صف بندی کرنا چاہتا تھا اور پھر بھرپور حملہ کرنا چاہتا تھا۔مسلمانوں نے بھی ایرانیوں کے سامنے اپنی صف بندی کو کچھ قائم رکھا کہ ایرانیوں کو کسی دھوکے کا شک نہ پڑ جائے اور مسلمان بالکل لڑائی قدرتی طریقہ پر لڑ کر پسپائی اختیار کر رہے تھے۔ایرانیوں کو مسلمانوں کی کمزوری کا پکا یقین ہو گیا اور اُن کو فتح نظر آنے لگی۔مسلمانوں نے کچھ تبدیلی یہ کر دی کہ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے رسالہ کو بھی کافی پچھلی اور بائیں طرف ہٹا لیا گیا اور حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کو بازوؤں سے ہٹا کر لشکر کے درمیان میں رکھا گیا اور ان کی جگہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اور اشعث کو بھیجا گیا، حضرت سوید رضی اللہ عنہ کو بھی درمیان میں لایا گیا۔

ایرانی فوج نے یہ سب دیکھ کر ندی کو کچھ بے ترتیبی سے پار کرنا شروع کر دیا کہ فتح کی خوشی میں ان کی صف بندی میں ہر جگہ کچھ بے ترتیبی آ گئی۔حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ جو حربی کارروائی میں ماہر مانے جاتے تھے وہ یہ سب دیکھ کر اس خیال کے حامی ہو گئے کہ ایرانیوں پر اسی وقت جواب حملہ کر دیا جائے وہ گھوڑے پر سوار تھے۔انہوں نے سرپٹ گھوڑا دوڑایا اور حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ جوابی حملہ کا بہترین وقت تھا۔حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بھی گھوڑے پر سوار تھے اور کفن کی طرح کا سفید لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور نہایت صبر کے ساتھ اس گھڑی کے منتظر تھے۔جس گھڑی بعد دوپہر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جواب حملہ کیا کرتے تھے۔حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کئی اور سرداروں نے بھی حملہ کرنے کے بارے میں مشورہ دیا بلکہ کچھ نے ذرا سخت الفاظ استعمال کیے لیکن حضرت نعمان رضی اللہ عنہ مسکرا دیتے تھے وہ بڑی دھیمی آواز میں جواب دیتے تھے اور فرماتے تھے: ''اللہ تعالیٰ ہماری عزت رکھ لے گا اور جو کچھ آپ جلدی میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔وہی انشاء اللہ انتظار اور صبر سے حاصل ہو جائے گا۔'' اس کے بعد آپ نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور یہ عرض کی: ''اے میرے رب میری آنکھوں کو فتح سے ٹھنڈک پہنچا، ایسی فتح جس سے اہل اسلام کی عزت دوبالا ہو جائے اور پھر مجھے شہادت نصیب کر دینا۔''

تبصرہ

کچھ مبصروں کا خیال ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کا مشورہ صحیح تھا بلکہ کئی لوگ یہاں تک بھی چلے گئے کہ اگر حضور پاک ﷺ اس وقت وہاں پر موجود ہوتے تو وہ وہی کچھ کرتے جو مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ سوچ رہے تھے۔ حضور پاک ﷺ کیا کرتے ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہاں ہمیں معلوم ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانو! جوابی حملہ بعد دوپہر کے کیا کرو کہ یہ وقت اس کام کے لیے اچھا ہوتا ہے اور آپ نے اکثر حالات میں جوابی کاروائی بعد دوپہر کو ہی کی۔ اس میں حکمت بھی پنہاں ہے کہ جب دشمن سویرے کے وقت کوئی کاروائی شروع کرتا ہے تو دوپہر تک اپنا پورا زور لگا چکا ہوتا ہے اور اس وقت تک کافی تھک چکا ہوتا ہے اگر بہت سویرے ہی جوابی کاروائی کی جائے تو دشمن اپنی تجویز کو تبدیل بھی کر سکتا ہے یا اپنی کامیابی کو روک کر ادھر بھی سخت مقابلہ شروع کر سکتا ہے۔ بعد دوپہر جوابی کاروائی سے دشمن کے پاس ردعمل کا وقت تھوڑا رہ جاتا ہے۔

بہرحال حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے سامنے صرف یہ بات تھی کہ حضور پاک ﷺ نے کیا کیا اور اس کا جواب یہ تھا کہ حضور پاک ﷺ نے بعد دوپہر جواب کاروائی کی۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ اپنی ساری کاروائی کو حضور پاک ﷺ کے فرمان اور عمل پر قربان کرنے کو تیار تھے اور اسلامی فلسفہ حیات کے مطابق تمام حکمت عملیاں، تدبیرات، سلیقے فن، ہنر اور حربی خوبیاں یا دنیا کا کوئی کام اس چیز سے تابع کر دینا چاہتے تھے جو حضور پاک ﷺ نے کیا اور اسی میں اسلام کی بڑائی کا راز پنہاں ہے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰس وہی طٰہٰ

(اقبالؔ)

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ عشق کے انتہائی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ معاملات کو جس طرح وہ سمجھتے تھے اس کو دنیاوی بودے پیمانے کیسے ناپ سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔

عقلی اور فوجی لحاظ سے بھی حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کا تجزیہ صحیح تھا۔ شروع میں دشمن کی بے ترتیب صفوں پر حملہ کیا جاتا تو دشمن ندی کو پار کر کے واپس چلا جاتا اور ادھر ہی بیٹھ جاتا اور معاملہ ادھر کا ادھر ہی رہتا۔ دشمن پر جوابی حملہ اس وقت کیا گیا کہ وہ مکمل طور پر الجھ چکا تھا اور واپس جانے کے قابل نہ تھا اور ایسی شکست سے دشمن کو دوچار ہونا پڑا کہ ایرانی سلطنت ہی ختم ہوگئی۔ اگر جلدی جوابی حملہ کر دیا جاتا تو دشمن شاید آدھی نفری کو بچا کر پسپائی اختیار کر لیتا اور پھر کہیں اور لڑائی لڑتا۔ یعنی اس کو نہاوند میں شکست ہوتی، شکست فاش نہ ہوتی۔

مسلمانوں کا جوابی حملہ

ایرانی آگے بڑھ رہے تھے اوران کی تمام تر فوج مسلمانوں کے ساتھ گتھم گتھا ہو چکی تھی کہ بعد دو پہر اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ مسلمانوں نے جوابی حملہ کر دیا تو ایرانی حیران ہو گئے۔ دو پہر سے پہلے وہ بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے اور مسلمان صبر سے ان کے حملے برداشت کر رہے تھے بلکہ ایک بازو سے حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کا رسالہ ایرانیوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرے بازو سے مسلمان پیدل فوج قعقاع رضی اللہ عنہ کے ساتھ ربط پیدا کرنے کیلئے آگے بڑھ رہی تھی۔ سامنے والی ایرانی فوج پھر بھی معاملات کو نہ سمجھ سکی۔ ان کو خیال تھا کہ مسلمان کسی بڑی پسپائی کی تجویز کو چھپانے یا زیادہ سے زیادہ لشکر کو دشمن کے چنگل سے چھڑانے کے لیے رئیر گارڈ کی سخت کاروائی کر رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں کی چال کو سمجھ جاتے اور جلدی پسپائی اختیار کر لیتے تو شاید فوج کا کچھ حصہ بچ کا نکل سکتا۔ لیکن ان کی غلط فہمی قائم رہی اور وہ جال میں پھنس چکے تھے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو اپنا اختلاف بھول چکا تھا اور حضرت اشعث رضی اللہ عنہ، طلیحہ رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بن معدیکرب وغیرہ کے ساتھ مل کر دشمن کی فوجوں کو وہ مولی گاجر کی طرح کاٹ رہے تھے۔

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی یلغار

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ یلغار کا حکم دے چکے تھے اور فرما چکے تھے کہ اب جذبۂ جہاد اور چھاتی کے زور سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کی جائے اور کسی اور حکم کی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی تو آپ خود آگے بڑھ کر دشمن کو تہس نہس کر رہے تھے۔ آپ کے دونوں بھائی سوید رضی اللہ عنہ اور نعیم رضی اللہ عنہ جان چکے تھے کہ ان کا عظیم بھائی آج اپنے خاندان، انصار مدینہ اور اہل اسلام کے نام کو چار چاند لگانے پر تلا ہوا ہے اور شہادت کی خوشبو ان کی رگ رگ میں بس چکی تھی۔ دشمن پر وار کے بعد مخمور آنکھوں سے وہ اپنے دونوں بھائیوں کو دیکھتے تھے اور شاید اسی لئے حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کو بازو سے ہٹا کر درمیان میں لے آئے تھے کہ ضرورت کے وقت وہ ان کو سنبھالا دیں اور پھر وہ وقت آ گیا کہ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو اتنے زخم آ چکے تھے کہ وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے۔ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ ان کے ہم شکل بھی تھے اور انہوں نے لشکر پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ سپہ سالار آخری دم پر ہے وہ خود ''نعمان'' بن گئے اور حضرت سوید رضی اللہ عنہ نے اپنے عظیم بھائی کو زمین پر لٹا دیا اور منہ کو چادر سے ڈھانپ دیا اور خود جہاد میں مصروف ہو گئے۔

ایرانیوں نے غلطی یہ کی تھی کہ ندی پار کرنے کے بعد کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو زنجیروں میں باندھ لیا تھا یا اوپر والوں کے حکم سے ''پابہ زنجیر'' کر دیئے گئے اور حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کا دل بے تاب اس وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ جب ایرانی بندھ جائیں تو پھر جوابی حملہ ہو، آدھے یا اس سے کچھ کم باندھ دیئے گئے اور باقی آدھے جب مسلمانوں کے جوابی حملہ کی تاب نہ لا سکے اور پیچھے مڑے تو اوندھے منہ ان بندھے ہوئے لوگوں پر گرنے لگے اور پیچھے سے مسلمانوں کی تلوار سب کا کام تمام کر رہی تھی۔ لاشوں کے ڈھیر اس قدر لگ گئے کہ مسلمانوں کو ان لاشوں کے اوپر سے کود کر آگے

بڑھنا پڑا۔ سورج کے غروب ہونے سے پہلے ایرانیوں کو مکمل شکست ہو چکی تھی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بھائی معقل رضی اللہ عنہ حضرت سپہ سالار نہاوند، نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زمین پر جھک کر عرض کی:

''اے سالار اللہ تعالیٰ نے فتح سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔''

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے آخری الفاظ

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے یہ خوشخبری سننے کے بعد آنکھیں کھول دیں اور فرمایا ''الحمدللہ! خلیفہ دوم کو اس کی جلد اطلاع دے دینا۔'' اور پھر ان کے چہرہ مبارک پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی کہ شہادت کا تحفہ اُن کو پیش ہو رہا تھا۔ اور ''برلب تبسم آید'' کا وقت آ گیا تھا۔ قارئین یہ ہے مسلمان کا فلسفہ حیات، اگر آپ نے تصور میں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک کا بوسہ نہیں لیا تو اپنے قلب کا علاج کرائیں۔

شہادت کا تحفہ

یہ شہادت کا تحفہ کئی ہزار مسلمانوں کو نصیب ہوا۔ مؤرخین نے شہدا کی تعداد نہیں لکھی۔ طبری کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ ایرانی مارے گئے، لیکن اس کے لحاظ سے ایرانی لشکر کی تعداد بھی ڈیڑھ لاکھ تھی۔ ہمارا اندازہ باقی مؤرخین اور اسلامی لشکر کے تناسب سے یہ ہے کہ دشمن کے لشکر کی تعداد کوئی لاکھ کے قریب ہوگی۔ لہٰذا ساٹھ ہزار کے قریب مارے گئے ہوں گے۔ اس لئے مسلمان شہدا کی تعداد بھی چھ سات ہزار سے کم نہیں کیونکہ شہادت کا تحفہ وصول کرنے والوں میں حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بن محمد یکرب بھی تھے جو ہر جنگ میں اپنی بہادری کا لوہا منوا چکے تھے۔ اسلام سے پہلے ایک جھوٹی نبوت کا دعوے دار دوسرا مرتد تھا، پھر دونوں نے توبہ کی اور اسلام کی آغوش میں داخل ہوئے۔ اللہ کی عطا ہے کہ ان کا خاتمہ نیک ہوا اور ان کی آخری آرامگاہ بھی حضرت نعمان رضی اللہ عنہ جیسے اسلام کے عظیم فرزند کے نزدیک ہے اور آج ہم حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن محمد یکرب کے نام مبارک کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ کا لفظ لگا کر اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں کہ ایسے لوگ ہمارے قافلہ میں ہو گزرے ہیں۔

دشمن کا تعاقب

فتح کے بعد حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم کے احکام کے تحت اسلام کا علم حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ رات پڑ چکی تھی اس لئے فوری تعاقب نہ ہو سکا۔ صبح سویرے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے خود آگے بڑھ کر دور دور تک دشمن کا تعاقب کیا کچھ لوگوں نے نہاوند شہر کے اندر قلعہ بند ہونے کی کوشش کی۔ لیکن ڈر گئے اور اور آخر بھاگنے کو ترجیح دی۔ ویسے

کافی ایرانی جنگی قیدی بھی بنائے گئے اور متعدد مال و دولت مسلمانوں کو مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہوا۔

نخیر جان کا خزانہ

جنرل نخیر جان کا ذکر مدائن کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی کے وقت ہو چکا ہے کہ وہ رستم کی مدد کو آ رہا تھا اور زیر کعب میں ہلاک ہوا۔ یہ نخیر جان اسی نہاوند کے علاقہ کا جاگیر دار تھا اور یزدجرد کے دادا کے زمانے میں بھرپور جوانی میں تھا۔ اور اس کی ایک بڑی خوبصورت بیوی تھی وہ عورت کسی طرح یزدجرد کے دادا خسرو پرویز کے حرم میں داخل ہونا چاہتی تھی اور نخیر جان کو پتہ چل گیا اور اس عورت سے نہ صرف لاتعلق ہو گیا بلکہ باتوں باتوں میں ایک طریقہ کے ساتھ نخیر جان نے وہ عورت شہنشاہ کو پیش کر دی۔ شہنشاہ نے نہ صرف اس پیشکش کو منظور کیا بلکہ اس عورت کو دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ اپنے حرم سے ہر عورت سے قیمتی تحفے بھی اس عورت کو دلوائے اور خود بھی نخیر جان کو مالا مال کر دیا۔ چند ماہ بعد خسرو پرویز مر گیا اور وہ عورت مال و دولت کے ساتھ نخیر جان کے پاس واپس آ گئی اور جلدی مر گئی یا مار دی گئی۔ بہر حال ایران میں نخیر جان شہنشاہ کے بعد دوسرے نمبر کا امیر آدمی تھا۔ اور اس کا سارا خزانہ نہاوند کے قریب ایک قلعہ میں چھپا ہوا تھا اور جو مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

تبصرہ

قارئین کو شاید یہ کہانی پسند نہ آئے کہ ہم نے جو قلم کی پاکیزگی کا وعدہ کیا ہوا تھا اس لحاظ سے یہ کہانی اس کتاب کے موزوں نہ ہو لیکن مولانا روم کی مثنوی پڑھ لیں اس میں باطل فلسفہ والوں کی ایسی کہانیاں موجود ہیں اور ہم اس کہانی سے زر اور زن کے فتنہ کی بے غیرتی والے اثرات اور ایران کے زوال پذیر حکمرانوں کی زندگی کے حالات سے قارئین کو آگاہ رکھنا چاہتے ہیں کہ ان سے ہم سبق سیکھیں۔

جو ہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود!
(اقبالؔ)

مالِ غنیمت اور دولت

مسلمانوں نے مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ اور نخیر جان کا سارا خزانہ مدینہ بھیج دیا۔ خلیفہ نے نخیر جان کا خزانہ عراق و ایران واپس کر دیا کہ افواج کی کفالت پر خرچ کیا جائے۔ مالِ غنیمت اور جزیہ سے اب دولت کی ریل پیل ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے بہت زیادہ آگے پیش قدمی کی اجازت نہ دے رہے تھے کہ دولت کی ریل پیل کو

سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اور مجاہدین غیروں کے تمدن کو اپنانے لگ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان غلط راستوں پر بڑے بند باندھے اور بعد میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے بھی بہت کوشش کی کہ مسلمان دولت کے چکر میں نہ پڑیں ورنہ اپنے فلسفہ حیات سے دور ہو جائیں گے۔ دولت کو صرف قناعت اور ضرورت تک محدود رکھا جائے اور اپنے فقر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

جنگ کے نتائج و اسباق

۱۔ جنگ نہاوند کو اسلام کی تاریخ میں فتوحات کی فتح کا نام دیا گیا ہے اور اس کے بعد ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس محاذ پر باطل کی تلوار والا فتنہ تو ختم ہو گیا لیکن باطل کے تین ''زالوں'' یعنی زر، زمین اور زن کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ زن کا مسئلہ تو دین فطرت نے کچھ حل کیا ہوا تھا کہ چار شادیوں کی اجازت تھی۔ لیکن زر اور زمین کا فتنہ ایک طرف حسد اور دوسری طرف سہل زندگی کو لے آتا تھا۔ سہل زندگی کے بعد ہم ''امن پسند'' ہو جاتے ہیں اور امن پسندی کے چکر میں تلوار کو سرد خانے میں رکھ چھوڑتے ہیں۔ اور دیکھ لیں کہ آج اسی تلوار کے لیے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں اور ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی معتمد کی طرح قید خانے میں فریاد کر رہے ہیں۔

مرد حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر
میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی

(اقبالؔ)

۲۔ ایک ضروری سبق یہ ہے کہ جب حضور پاک ﷺ کی سنت موجود ہو تو اس کو اپناؤ وہی حکمت عملی ہے۔ اس چکر میں نہ پڑیں کہ حضور پاک ﷺ اگر آج ہوتے تو یہ کرتے۔ حضور ﷺ کی سنت اپنانا ہی بہت بڑی حکمت عملی ہے۔

۳۔ اس جنگ کے باقی اسباق ساتھ ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں اور تبصرے و جائزے بھی ساتھ پیش کر دیئے گئے ہیں۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ پسپائی اختیار کر کے دشمن کو شکنجہ میں لینے کی کاروائی بہت مشکل تجویز ہوتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سیالکوٹ کے محاذ پر ہم نے بھی دشمن کو شکنجہ میں لینے کیلئے پسپائی اختیار کی۔ اور نہاوند کے معرکہ میں اس قسم کے معرکوں کی نقل کی اور اپنے علاقوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایسی کاروائی کے لیے بڑے دل گردے اور اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پاکستان کی فوج اعلیٰ تربیت یافتہ نہیں لیکن جو فوج یا قوم فائر بندی کو مدنظر رکھ کر تجاویز بنائے وہ ایسی کاروائی نہ ہی کرے تو بہتر ہے۔ البتہ پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج بنایا جائے اور تمام تر حکمت عملی اور تدبیرات اسلامی فلسفہ حیات کے تحت ہوں تو پھر ہر تدبیر انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہوگی۔

اٹھائیسواں باب

ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ

نقشہ پانز دہم یعنی پندرہویں نقشہ کا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ نہاوند کی فتح کے بعد بھی آدھے سے زیادہ ایران ابھی باقی تھا۔ جہاں پر ابھی اسلامی لشکر کے کسی مجاہد نے قدم نہ رکھا تھا۔ مسلمانوں کا مقصد تو یہ نہ تھا کہ ایران کو تباہ و برباد کیا جائے اور چپہ چپہ پر لڑائی ہو۔ نہ وہ لوٹ مار کرنے آئے تھے کہ دولت سمیٹ کر مکہ مدینہ لے جاتے۔ وہ تو وہاں سے دولت واپس کر رہے تھے وہ تو اللہ تعالیٰ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام نافذ کرنے آئے تھے اور جو اللہ تعالیٰ ﷻ اور رسول ﷺ کے احکام قبول کر لیتا تھا وہ ان کی قوم یعنی اُمت واحدہ میں شامل ہو جاتا تھا اور حضور پاک ﷺ کے مبعوث ہونے کا یہی مدعا تھا۔

خلفاءراشدین کی حکمت عملی

پہلے دونوں خلفاء مشرق کی طرف اسلام کو پھیلانے کی حکمت عملی نے نہاوند کے مقام پر تاج پہن لیا تھا۔ اس کے بعد کی مہمات کی تفصیل میں مؤرخین بھی نہیں گئے۔ کیونکہ یہ سب ''صفائی'' کا کام تھا۔ تیزی سے پیش قدمی کر کے اسلامی لشکر کسی بھی جگہ پر جا کر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس سلسلہ کی کاروائیوں کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے:۔

ا۔ کوفہ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کو تبدیل کر کے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا تعین کیا گیا۔ پارسائی، قربانی اور حضور پاک ﷺ کی رفاقت کے سلسلہ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا مقام بہت اونچا ہے لیکن حالات پر مکمل حاوی ہونے کے لیے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جیسے زمانہ ساز، سیاست داں اور فوجی ماہر کی ضرورت تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں اتنی زیادہ وسعت ہو چکی تھی کہ اس کام کے لیے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ جیسے اَن تھک صاحب کی ضرورت تھی۔ ویسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں نائب کا کام انجام دے رہے تھے اور وہاں پر انہوں نے ایک مکتب کی بنیاد ڈالی جس سے علم حاصل کر کے مسلمان علماء دور دراز علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے جاتے تھے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ اور امام اعظم رضی اللہ عنہ

وغیرہ نے اسی مکتب سے فقہ اور علم حدیث کا علم حاصل کی۔

۲۔ ۲۱ہجری کے آخر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو عراق سے ایک لشکر کے ساتھ نہاوند والے راستے اصفہان پر چڑھائی کا حکم ملا۔ بعد میں آپ کی امداد کے لیے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا۔ حضرت احناف رضی اللہ عنہ بن قیس جن کو خراسان کے علاقہ پر چڑھائی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ بھی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے کہ انہوں نے بھی ادھر ہی سے گزر کر جانا تھا اور تینوں نے مل کر اصفہان فتح کرلیا۔

۳۔ خلیفہ دوم کے حکم کے مطابق اصفہان کو فتح کرنے کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے دونوں لشکروں کی کمانڈ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو ملنا تھی جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ کاشان اور قم پر لشکر کریں۔ یہ کام انہوں نے کامیابی کے ساتھ پورا کرلیا۔

۴۔ ان کارروائیوں کے مکمل ہونے کے بعد حضرت نعیم بن مقرن رضی اللہ عنہ کو حکم ملا کہ بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ رَے پر چڑھائی کریں۔ رَے بڑی فوج اہمیت والا مقام تھا اور انہوں نے ہمدان سے گزر کر وہاں جانا تھا۔ اہل ہمدان پہلے ایک دفعہ باجگزاری اختیار کرنے کے بعد پھر بغاوت پر آمادہ ہوگئے تھے۔ بہر حال انہی دنوں جیسا کہ نمبر شمار تین میں اوپر بیان کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کے دائیں بازو پر آگے بڑھ رہے تھے اور اس لیے حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے زیادہ تسلی کے ساتھ پیش قدمی کی۔ پہلے ہمدان کے باغیوں کا مزاج درست کیا پھر کئی جھڑپوں کے بعد رَے پہنچے اور وہاں پر اسلام کے جھنڈے لہرا دیئے۔

۵۔ رَے سے آگے حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت سوید رضی اللہ عنہ کے ایک لشکر نے طبرستان کے وسیع علاقہ پر قبضہ کرلیا۔

۶۔ ۲۲ہجری تک یہ تمام مہمات ختم ہوچکی تھیں تو مسلمانوں نے آذربائیجان کا رُخ کیا اور کوفہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حکم ملا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بن الیمان کو ایک بڑا لشکر مہیا کریں جو آذربائیجان پر چڑھائی کرے۔ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کو حکم ملا کہ اس لشکر کے لیے وہ بھی کمک مہا کریں۔ جس کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ بہر حال حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر دربند تک تمام علاقے فتح کرڈالے۔ پھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بن فرقاد کو مقرر کیا گیا جنہوں نے آرمینیا اور جھیل کیسپین کے علاقوں تک اسلام کے علم لہرا دیئے۔

۷۔ آذربائیجان کی مہم ابھی جاری ہی تھی تو خلیفہ دوم نے مختلف لشکر بھجوا کر خزستان اور فارس سے شیراز تک کے علاقوں کو اسلامی قلم رَو میں شامل کرلیا۔

۸۔ اس کے بعد حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے ستیان پر چڑھائی کی اور وہ خود پاکستان وایران کی موجودہ سرحد پر

زاہدان کے مقام تک آئے اور آگے سہل رضی اللہ عنہ بن عدی کو بھیجا جس نے دریائے سندھ تک مکران کے علاقے فتح کیے اور دریائے سندھ پر رُک گیا۔

۹۔ اس کے بعد حضرت احناف بن قیس نے نیشاپور، ہرات، طرطوس اور بلخ کے علاقوں تک اسلام کے لیے علم گاڑ دیئے۔ یہاں پر یزدجرد نے بھی آخری مقابلہ کیا اور اس کے بعد دریائے جیحوں کو پار کر کے چینی ترکستان کی طرف بھاگ گیا اور مسلمان دریائے جیحوں پر رُک گئے۔

۲۳ ہجری تک ایران کا چپہ چپہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا بلکہ موجودہ افغانستان روسی ترکستان اور جنوبی پاکستان کے کئی حصوں پر بھی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا نام بلند ہو رہا تھا، تیسری کتاب کے چھٹے اور ساتویں ابواب میں ان فتوحات اور وسعتوں کو باقاعدہ طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تبصرہ

یہاں قارئین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ سوال کریں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریائے سندھ اور دریائے جیحوں سے آگے پیش قدمی کیوں روک دی اور مسلمانوں نے بعد میں اور ملکوں کو اور تیزی سے فتح نہ کیا جس طرح پہلے دو خلفاء کے زمانے میں کیا۔ سوال بڑا اہم ہے اور اول تو اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ دوم ملک فتح کرنے تو آسان ہوتے ہیں۔ فتح کو قائم رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ باطل تلوار کو پھینک دینے کے بعد کسی اور شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے وسیع علاقے فتح کیے۔ وہاں اللہ کے نظام کو جاری کیا اور کسی نہ کسی شکل میں اسلامی نظام جاری ہے اور یہ سب ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ لیکن نظامِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو نظام جہاد کا دوسرا نام ہے۔ وہ صرف خلفائے راشدین کے زمانے میں جاری رہ سکا اور پھر اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اللہ کا کوئی نیک بندہ اور مجاہد پیدا ہو گیا اس نے نظامِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحال کر دیا۔ باطل اور حق کی یہ کشمکش ہمارے اندر بھی جاری ہے، اور باطل باہر سے بھی ہم پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس زمانے اگر اور زیادہ پیش قدمی کی اجازت دیتے تو اتنے علاقوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا اور مشیت ایزدی معاملات کو شاید اس طرح چلانا چاہتی ہے کہ ہمارا امتحان جاری و ساری ہے۔ ورنہ ''کھیل'' کب کا ختم ہو گیا تھا۔

شاہِ یزدجرد

ایران کے آخری بادشاہ کی بدقسمتی کہ اس کے دل سے بادشاہت کی حُب ختم نہ ہو سکی اور آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھ سے مرد کے علاقے میں ذلت آمیز حالت میں ہلاک ہوا۔ اس کا دادا اپنے بیٹوں کو شادی کی اجازت نہ دیتا تھا گو اپنی تین ہزار عورتیں تھیں کہ کسی نجومی نے اس کو بتایا تھا کہ اسکا کوئی پوتا ایران کا

آخری بادشاہ ہوگا۔ اس کی چہیتی بیوی شیریں (فرہاد کی معشوقہ) نے یزدجرد کے باپ کی پوشیدگی سے ایک بال سنوارنے والی لڑکی سے شادی کرادی۔ یزدجرد پوشیدگی میں پیدا ہوا اور پوشیدگی ہی میں اس کی پرورش ہوئی۔ اس کا تخت پر آنا بھی ایک ڈرامہ تھا اور آگے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ بیان کر دیا گیا ہے۔

اگر یزدجرد اسلام قبول کر لیتا تو اس کے دونوں جہان سنور جاتے۔ بہرحال اس کی ایک بیٹی کے بارے میں عجیب وغریب روایات ہیں کہ نوعمری میں مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئی اور مدینہ بھیج دی گئی۔ مدینہ پہنچ جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ تھا کہ گو یہ لڑکی ایک دنیاوی شاہ کی بیٹی ہے، پھر بھی اس کی عزت کی جائے اور ہمارے دو جہانوں کے سرکار کے نواسے امام حسین رضی اللہ عنہ کو یہ لڑکی پیش کی گئی اور اُن کے عقد میں آئی۔ انہی کے بطن سے حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں اس محاذ کی کہانی یہاں تک پہنچتی ہے۔ دوسری کتاب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دونوں کی خلافت کے زمانے کے شام کے محاذ کے حالات ہیں اور گو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں تیسرا محاذ مصر اور افریقہ کا بھی کھل گیا تھا۔ لیکن اس کا ذکر تیسری کتاب میں ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہم اس سلسلہ کی پہلی کتاب کو ختم کرتے وقت اپنے ان تمام بزرگوں پر سلام بھیجتے ہیں۔ جن کا ذکر خیر اس کتاب میں ہے اور اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی التجا کرتے ہیں۔

قَالَ اللهُ تَعَالٰی فِی الْقُرْاٰنِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ

اے نبی (ﷺ) مومنوں کو جنگ (جہاد) کی ترغیب دو۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ کُرْهٌ لَّکُمْ

تم (لوگوں) پر جنگ (جہاد) کو فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

لِیْ حِرْفَتَانِ اَلْفَقْرُ وَالْجِهَادُ

میرے دو ہنر (ہتھیار) ہیں فقر اور جہاد۔ (فرمان رسول ﷺ)

خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم

کی جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

حصہ دوم

(فتوحات شام و فلسطین)

از قلم: حضور پاک ﷺ کا سپاہی
میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان مدظلہ

ناشر: علم دین پبلشرز اُردو بازار لاہور پاکستان

تعارف

زیرِ نظر کتاب خلفائے راشدینؓ کی جنگی عملی وتدبیرات کے تجزیہ پر مبنی سلسلہ کتب کی دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے جس بالغ نظری سے فتوحات شام وفلسطین کے واقعات اور مضمرات پر بحث کی ہے۔ وہ اسلامی تاریخ پر مصنف کے مکمل عبور کا ثبوت ہے۔ اسلامی تاریخ میں جنگ اجنادین اور جنگ یرموک کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مصنف نے دونوں جنگوں کو نہ صرف واقعاتی طور پر تفصیل سے بیان کیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نتائج کے لحاظ سے ان دونوں جنگوں کو اسلامی تاریخ میں ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ ان جنگوں میں مسلمانوں نے "حکمت عملی کی پسپائی" اختیار کر کے "تدبیراتی طور پر" جو جارحانہ عمل اختیار کیا، مصنف نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

ہرقل اپنے زمانے کا ایک تسلیم شدہ جنگی حکمت عملی کا ماہر مانا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں اسے اس طرح شکست ہوئی کہ وہ ایشیا کو آخری سلام کر کے قسطنطنیہ (استنبول) پہنچ گیا۔ مصنف اس بات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے کہ مسلمانوں نے موسم اور اپنے "دوست" ریگستان کو اپنے حق میں استعمال کر کے اور دشمن کو اس کے "دوست" سمندر سے دور لا کر کس طرح اپنے سے تین گنا لشکر کو شکست دے کر اپنی بہتر حکمت عملی وتدبیرات کا ثبوت دیا۔

مصنف نے اسلام کے پہلے پچیس سالوں کی تمام فتوحات اور مشہور واقعات کا خلاصہ اس کتاب کے بارھویں باب میں پیش کر دیا ہے جو آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

بریگیڈئیر عبدالمجیب
ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن

پیش لفظ

حرفِ تشکّر

سب تعریفیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہیں اور اُس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضور پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے عظیم رُفقاءؓ کی زندگی کے عملی پہلوؤں کی جھلک کے حصہ دوم کو پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ کے حصہ اوّل میں گزارش کر دی گئی تھی کہ دراصل یہ سب کچھ جلالِ مصطفیٰ ﷺ کا ہی سلسلہ ہے جو جاری وساری ہے۔

اُس پیش لفظ میں یہ بھی بیان کر دیا گیا تھا کہ کاروانِ حق رواں دواں ہے اِس لیے اس حصے کے لیے کسی مفصل پیش لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ ''جلالِ مصطفیٰ ﷺ'' میں حضور پاک ﷺ کی ذاتی کمانڈ اور آپ ﷺ کے مقرر کردہ لشکروں کے سالاروں کی کاروائیوں اور دیگر غلامانِ محمد ﷺ کی عملی زندگیوں کی ایک جھلک ہے کہ آپ ﷺ کے زمانے میں مجاہدینِ اسلام نے کس طرح آپ ﷺ کے احکام کی پیروی کی۔ اور دین فطرت کے لحاظ سے زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ یعنی حضور پاک ﷺ کے غلاموں نے حضور پاک ﷺ کی نگرانی میں اسلام کے فلسفۂ حیات پر عمل پیرا ہو کر ہمارے لیے ایک نمونہ پیش کیا۔ حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے رفقاءؓ نے اندرونی خلفشار کو دور کر کے کاروانِ حق کو صراطِ مستقیم پر رواں دواں رکھا۔ اور دن رات ایک کر کے ایران وعراق میں اللہ تعالیٰ کے احکام کا نفاذ کیا۔ اِس کا ذکر اس سلسلے کے حصۂ اوّل میں ہو چکا ہے اور موٹے لفظوں میں نتیجہ یا ماحصل یہ ہے کہ تلوار کو اپنے پاس رکھو:۔

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

(اقبالؔ)

حصہ دوم کی وضاحت

حصہ دوم میں فتوحاتِ شام وفلسطین کے بارے میں حکمت عملی اور تدبیرات کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح روم کا شہنشاہ ہرقل ایشیا سے بستر باندھ کر ملک شام کو الوداع کہتا ہوا قسطنطنیہ (استنبول) چلا گیا۔ آگے کیا ہوا۔ وہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر بھی اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ گو بلقان اور مشرقی یورپ

میں مسلمان دوسو سال پہلے داخل ہو چکے تھے اور مغرب سے سپین میں داخلہ، اسلام کی پہلی صدی میں ہی ہو گیا تھا۔ اور وسط یعنی سسلی اور بحیرہ روم سے داخلہ بھی اسلام کی دوسری صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ البتہ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں اہل یورپ نے صلیبیوں کے روپ میں شام اور فلسطین پر کئی یلغاریں کیں اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق و باطل کی ٹکر جاری ہے۔ اور ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ دُنیا اللہ تعالیٰ نے اہل حق کے لیے پیدا کی ہے تو باطل اُٹھ کر ہمارے ساتھ ٹکر لے لیتا ہے۔ یہ حصہ ہمیں ہماری اِس ذمہ داری کی یاددہانی کراتا ہے:۔

جہاں تمام ہے میراثِ بندۂ مومن   میرے کلام پہ حُجت ہے نکتہ لولاک

(اقبالؔ)

حصہ سوم اور چہارم

اس سلسلہ کی تیسری کتاب فتوحاتِ مصر افریقہ اور خلفائے راشدین ؓ کے زمانے کی باقی فتوحات کا جائزہ ہے۔ اور چوتھی کتاب اندرونی خلفشار اور اُن بنیادی کمزوریوں کی نشاندہی کرے گی جو اہلِ اسلام میں وقتاً فوقتاً داخل ہوتی رہیں۔ اور خاص کر خلیفۂ سوم اور خلیفۂ چہارم کے زمانے میں اس اندرونی خلفشار نے کاروانِ حق کے مقاصد کے پھیلاؤ کو کتنا نقصان پہنچایا۔ ساتھ ہی اسلامی فلسفۂ حیات کے مطابق موجودہ زمانے میں اُمتِ واحدہ کے تصور کو عملی شکل وصورت دینے کے سلسلے میں کچھ تجاویز بھی ہیں۔

فتوحاتِ شام وفلسطین

فتوحاتِ شام وفلسطین کی بنیادی حکمت عملی کے تانے بانے حضور پاک ﷺ کے زمانے ہی میں باندھے گئے تھے۔ حصہ اوّل میں فتوحات کی حکمت عملی کے بیان کے وقت اُن تمام کارروائیوں کا بھی اکثر ذکر ہے جو عراق کے محاذ پر صرف اس لیے کی گئیں کہ اُن کارروائیوں سے شام کی فتوحات میں آسانی ہوگی۔ اِس کتاب میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ تمام واقعات کے جائزوں کی بنیاد کو ''جلالِ مصطفےٰ ﷺ'' کے واقعات اور پہلی کتاب کے بیانات سے منسلک کیا جائے۔ تا کہ پوری حکمت عملی کی بنیاد اور دو محاذوں کے واقعات کے باہمی روابط آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ اور دین فطرت کے جنگ کے مقاصد کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کو قائم رکھا جا سکے کیونکہ وحدت کی وجہ سے ہم اُس زمانے میں زندہ قوت تھے۔

پُرانے موٴرخین فتوحات شام وفلسطین

پُرانے مؤرخین نے شام وفلسطین کی جنگی کاروائیوں کو کسی صحیح تسلسل سے بیان نہیں کیا اوّل خودمختار لشکروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اُن لشکروں کے لیے جو امدادی دستے بھیجے گئے اُن کو بھی بعض مورخین نے ایک الگ لشکر تصور کرلیا۔ اس کے علاوہ ذمہ داریوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ خودمختار طور پر لشکروں نے جو کاروائیاں کیں اُن کے تسلسل کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا گیا کہ بڑی کاروائیاں تمام لشکروں نے مل کر کیں۔ یرموک کے علاقہ سے دو دفعہ پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ شمالی شام اور دمشق کو بھی ایک دفعہ خالی کرنا پڑا۔ اور حمص سے اوپر والے شام کے علاقوں کو بھی ایک دفعہ چھوڑنا پڑا۔ یرموک کے میدان میں دو دفعہ لڑائیاں لڑی گئیں۔ دمشق اور فحل بھی دو دفعہ فتح ہوئے وغیرہ۔ سن ہجری کا اُس وقت تک تعین نہیں ہوا تھا کہ یہ کام سولہ ہجری میں ہوا۔ زیادہ واقعات اُس سے پہلے کے ہیں تو اس لیے صحیح سال پر بھی کچھ اختلاف ہوگیا لیکن یہ اختلافات نہ اتنے زیادہ ہیں کہ ہماری تاریخ پر کوئی شک کیا جائے اور نہ اتنے مشکل ہیں کہ صحیح صورت پر نہ پہنچا جا سکے۔ ہم نے اپنے جائزوں کے ذریعے سے حالات کو تسلسل دے دیا ہے۔

ایک اور چیز جس سلسلہ میں کافی مورخین جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہیں۔ وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا سپہ سالارِ اعظم کے رُتبہ پر تعین ہے بلکہ کئی مبصرین تو اِس حد تک چلے گئے کہ عملی طور پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی سپہ سالارِ اعظم رہے۔ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ برائے نام سپہ سالار تھے، یہ بڑی زیادتی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں اور اُن کا مقام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت بلند ہے، چنانچہ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اسلام کے دونوں عظیم فرزندوں کو اپنے مقام پر دکھایا جائے اور اس سلسلہ میں واضح ثبوت اور جائزے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شام کی مہمات کو شروع کرتے وقت مورخین حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کے معاملات کی گہرائی میں نہیں گئے تو اِس کا صحیح جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

تاریخ طبری

حصہ اول میں بھی یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ ہمارے پاس پرانی سے پرانی تاریخ جس سے استفادہ کیا جارہا ہے، طبری کی ہے واقدی یا اُس سے پہلے کی تاریخوں کے اُردو اور انگریزی ترجمے نہ مل سکے لیکن اور کتابیں ہیں جو پرانے مورخوں کے حوالے سے لکھی گئی ہیں وہاں پر کافی مواد مل جاتا ہے اور حالات کی چھان پھٹک ہوسکتی ہے۔ طبری نے جو واقعہ جہاں سے جیسا ملا لکھ دیا، ایک ایک واقعہ کو کئی دفعہ لکھا گیا ہے اور اکثر جگہوں پر ان بیانات میں اختلافات ہیں ایسی جگہوں پر طبقات ابن سعد سے بھی مدد لی گئی ہے تاکہ صحیح صورت حال کا پتہ چل سکے۔

اختلافات

اوپر والے بیان سے یہ تأثر بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ ہماری ساری تاریخ اور خاص کر شام وفلسطین کی تاریخ

اختلافات سے بھری پڑی ہے۔ نہیں یہ بات بالکل ہی نہیں۔ بنیادی اور ٹھوس واقعات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس پہلو کو ''جلالِ مصطفےٰ ﷺ'' میں تاریخ اور راوی[1] کے عنوان کے تحت پہلے ہی کھل کر بیان کر دیا گیا ہے کہ دراصل کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اختلافات، تفصیل اور وقت کے بارے میں ہیں۔ اور تاریخ کے بامقصد مطالعہ کا مدعا بھی یہی ہوتا ہے۔ کہ صحیح حالات کا کھوج لگایا جائے اور جائزے و تبصرے بغیر کسی لگی لپٹی کے کسی مقصد کے تحت پیش کیے جائیں۔ ہم نے حصہ اوّل میں یہ واضح کر دیا تھا کہ ہمارے سامنے قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی سنت ہے ہمارا یہ یقین ہے کہ حضور پاک ﷺ کے رفقاء کا ہر عمل قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی سنت کے مطابق تھا اور اسی پیمانے کو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا، جہاں معاملہ بالکل دنیاوی قسم کا تھا وہاں پیمانہ بھی دنیاوی مقرر کیا گیا اور اپنے تجزیہ اور تبصرہ کو حرف آخر نہیں سمجھا گیا بلکہ اُس کو ایک ''رائے'' کا نام دیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی دوسرے لوگوں کی ''رائے'' بھی لکھ دی اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا کہ جو چیز اُن کو صحیح معلوم ہو اُس پر یقین کر لیں۔

زماں و مکاں میں اختلاف

پہلے گزارش کر دی گئی ہے اور آگے بھی یہ وضاحت کھل کر کی گئی ہے کہ ''مکاں'' میں معمولی اختلاف یا مکاں کے معاملات میں جو صحیح تجزیئے نہیں ملتے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جغرافیہ صحیح نہیں تھا۔ یعنی اُس زمانے میں جغرافیہ میں اتنی ترقی نہ ہوئی تھی، اور نقشوں کا رواج بالکل نہ تھا، چنانچہ ہم نے اِس کتاب میں پندرہ نقشے دیئے ہیں۔ کہ مکاں کے معاملات سمجھ میں آسکیں، اور اختلافات کو بھی نقشوں کی مدد سے دور کیا جائے۔ ''زماں'' یا وقت میں اختلاف اِس وجہ سے ہے کہ سولہ ہجری، تک مسلمانوں کا کوئی اپنا سَن نہیں تھا۔ واقعات یا سالوں کو کبھی ابرہہ کے مکہ مکرمہ پر حملے کے سال کی مدد سے گنتے — کبھی حضور پاک ﷺ کی نبوت کے اعلان سے۔

کبھی مسلمانوں کی مدینہ میں ہجرت کی تاریخ سے اور کبھی حضور پاک ﷺ کی وفات کی تاریخ سے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سولہ ہجری ربیع الاوّل کے مہینے سے مسلمانوں کے لیے اپنا ایک سن اور زماں کا حساب کتاب نافذ کر دیا۔ اس میں ایک خاص پہلو بھی تھا کہ اہل حق کی تاریخ مدینہ کی ہجرت سے شروع ہو کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ لَیس الاسلام اِلّا بالجماعة اور مدینہ میں ہجرت کے بعد اہلِ حق کا کارواں مل کر صراطِ مستقیم پر رواں دواں ہوا اور جگہ جگہ پر اللہ اور رسول کا نام بلند ہونا شروع ہوا۔ تو ''زماں'' اور ''مکاں'' میں رابطہ کی بنیاد اُس دن سے پڑی۔ لیکن جو واقعات اُس سے پہلے ہو چکے تھے اُن کے مہینے تو لوگوں کو موسم کی وجہ سے کچھ یاد تھے اور چاند کی تاریخیں بھی اکثر جگہوں پر یاد رہیں۔ لیکن سن ہجری کا تعین کرنے میں بعض دفعہ ایک ہی جیسے

(۱) صفحہ گیارہ۔

واقعات کی وجہ سے کچھ راویوں نے الگ الگ بیان دے دیئے ہیں اور خاص کر اُن مقامات کی فتوحات کے بارے میں کچھ شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں، جہاں کاروائی دو دفعہ کرنا پڑی۔ ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ''زماں ومکاں'' کو ملا کر حساب کر کے اپنا تجزیہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اور انشاءاللہ یہ اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

دومحاذوں میں رابطہ

اِس حصہ میں خاص کوشش یہ کی گئی ہے کہ جب کسی بڑے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے تو ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ عراق وایران کے محاذ پر اُس زمانے میں کیا ہوا یا کیا ہو رہا تھا اور حصہ اول کے باب کا بھی ساتھ ہی حوالہ دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں بارہویں باب میں تمام مشہور واقعات کا خلاصہ بھی ہے، اور ہر واقعہ کی تاریخ بھی وہاں تسلسل سے دی گئی ہے کہ دونوں محاذوں کی حکمت عملی سمجھ میں آسکے، اور جو لوگ آئندہ اِن مضامین کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیں اُن کے لیے یہ ایک ''اشاریہ'' یا ''حوالہ'' بھی ہے۔ کتاب کے شروع میں تاریخوں کو دینے کی بجائے آخر میں دینے کا یہ مقصد تھا کہ قارئین پہلے واقعات اور اُن کے جائزوں کو سمجھ لیں اور پھر اِس ''اشاریہ'' یا حوالہ سے استفادہ کریں۔

کوشش آپ لوگوں کے سامنے ہے، آیئے مل کر حضور پاک ﷺ کے دربار میں حاضر ہوں اور نشانِ راہ کے تلاش کی عرض کریں:۔

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفاں کدھر جائے
اِس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

(اقبالؔ)

مصنف کتاب

پہلا باب

ابتدائیہ

ہماری کتابوں کے سلسلہ کے اِس حصہ کا تعلق فتوحاتِ شام وفلسطین سے ہے، اور اِن فتوحات کے لیے جس حکمت عملی کا تعین کیا گیا یا جن تدبیرات کو اپنایا گیا، اُن کا جائزہ بھی پیش کیا جائے گا اور کچھ تبصرے بھی ہوں گے۔ شام و فلسطین کے علاقہ قسطنطنیہ کے بادشاہ کے باجگزار تھے۔ قرآن پاک میں اس سلطنت کے لیے اہلِ روم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ''جلالِ مصطفےٰ ﷺ'' کے پانچویں باب میں یہ وضاحت کردی گئی تھی کہ، اہل عرب سارے یورپین لوگوں کو یا تو اہل روم کہتے تھے یا یونانی۔ اسلام کی دوسری اور تیسری صدی کے بعد مسلمانوں نے بحیرۂ روم کے کناروں سے دور بسنے والے یورپ کے لوگوں کو فرنیک وغیرہ کے نام سے موسوم کرنا شروع کردیا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قبل از مسیح یا اس کے بعد بھی اہل یورپ کا باہر کی دنیا کے ساتھ تعلق، سلطنت روم کے ذریعے ہوا، جس کا دارالخلافہ موجودہ روم تھا۔ یا سکندر یونانی کی وجہ سے باہر کی دنیا[1] کے ساتھ واسطہ پڑا، کہ وہ ایشیا اور افریقہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ چنانچہ جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو رجزیہ شعر پڑھے، اُن میں اہلِ روم کو یونانی کہہ کر پکارا گیا تھا۔ اُس زمانے میں باقی یورپ تو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور اُن کی اُس زمانے کی تاریخ جنگلی اقوام کے تمدن کی کہانی ہے۔ صرف وہ ملک جو بحیرۂ روم کے کنارے پر آباد تھے، اُن کا دنیا کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا۔ فرانس کا کچھ حصہ چونکہ بحیرۂ روم کے ساحل پر تھا تو یہاں سے شارلیمان کے عہد سے اہلِ یورپ میں کچھ جان آئی اور یہ اسلام کی دوسری صدی یعنی ہارون الرشید کا زمانہ تھا۔ موجودہ ترکی یا اناطولیہ البتہ کافی عرصہ سلطنت قسطنطنیہ کا حصہ رہا، اس لیے اس علاقے کو مسلمان چھوٹا روم کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا جلال الدین کو بھی رومی کہا گیا۔ حالانکہ آپ کی مثنوی پہلوی زبان یعنی فارسی زبان میں ہے۔ لیکن چونکہ آپ کا قیام قونیا میں رہا اور وہیں دفن ہیں اور یہ مقام اناطولیہ میں ہے اس لیے مولانا جلال الدین[2] رومی بن گئے۔

(۱) جلالِ مصطفےٰ، صفحہ ۲۰۸ سے استفادہ کریں۔ (۲) جلالِ مصطفےٰ، صفحہ ۶۱۳ دیکھیں۔

صہیب رومی رضی اللہ عنہ

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم صحابی صہیب رومی رضی اللہ عنہ تھے۔ حالانکہ آپ موصل میں پیدا ہوئے، لیکن وہاں سے کسی وجہ سے اُن کو موجودہ اناطولیہ میں کسی جگہ بیچ دیا گیا اور آپ وہاں کی زبان بولتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئی اور رومی کے نام سے پہلے شخص ہیں جو اسلام کی آغوش میں داخل ہوئے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں اہل عجم میں سے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے مقامات ایک الگ مضمون ہیں۔ اور ایک صاحب ابو واثلہ رضی اللہ عنہ ہندی بھی تھے، لیکن ہماری کتابیں اُن کی سوانح عمری کے بارے میں خاموش ہیں۔ بہر حال ہم یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اُس زمانے میں ہمارے لیے تمام اہل یورپ اور اناطولیہ کے لوگ اہل روم ہی تھے۔

اہلِ یورپ کا احساس کمتری

ظاہر ہے کہ قسطنطنیہ کا بادشاہ اپنے آپ کو شہنشاہِ روم ہی کہتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو روم کی پرانی سلطنت کا جانشین ہی سمجھتا تھا۔ اور ہم تو قرآن پاک کی رُو سے ان لوگوں کو اہل روم ہی کہیں گے، لیکن یورپ کے تاریخ دانوں نے اس بادشاہ یا حکومت کا نام بعد میں بازنطینی یعنی چھوٹا روم رکھ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ سلطنت بعد میں ہمارے ہاتھوں مٹ گئی۔ اور اہل یورپ نہیں چاہتے کہ اُن کی کسی سلطنت کو، جس سے اُن کے آباواجداد کا تعلق رہا ہو۔ سلطنت روم کہا جائے کہ یورپ کے تمام ممالک اپنے آپ کو اٹلی کی سلطنت روم کا ہی جانشین سمجھتے ہیں اور تمام یورپین ملکوں کے بادشاہوں نے اپنا نام روم کے بادشاہ سیزر (CEASER) کے نام پر رکھا۔ زار روس یا قیصر[1] جرمنی کے الفاظ سیزر کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، اور انگریزی لفظ "C" کو کسی نے "س" بنالیا اور کسی نے "ز" یا "ق" یہ لفظ اہل یورپ کو اتنا پسند ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی ملکہ نے بھی "قیصرۂ ہند" کا لقب اختیار کیا۔ اور یہ لقب انگریزوں کے بادشاہوں نے ۱۹۴۷ء تک اپنائے رکھا۔ دراصل اہلِ یورپ "خاندانی" طور پر رومن ہیں، اور وہی اُن کا طرزِ حکومت اور تمدن ہے۔ مذہب عیسائیت، اُن کا نجی معاملہ بھی ہے اور حکومت پر صلیب کا کچھ اثر رکھا جاتا ہے۔ لیکن اہلِ اسلام دونوں لحاظ سے اُن کے دشمن ہیں۔ یعنی تہذیب وتمدن دونوں کی طرف سے تہذیب یعنی مذہب کے لحاظ سے اُن کے تمدن کو ہم نے باطل فلسفہ قرار دے دیا۔ اس لیے انہوں نے قسطنطنیہ کی سلطنت کا نام اپنی تاریخوں میں بازنطینی یا چھوٹا روم رکھ دیا کہ اُن کا تہذیب وتمدن ہمارے سامنے سرنگوں ہوگیا تھا۔ افسوس کہ ہم اس دشمنی اور تعصب کو نہیں سمجھتے اور آج اہل یورپ

(۱) جلالِ مصطفیٰ کے صفحہ ۱۹۸ سے بھی استفادہ کریں۔

کے آگے ہر معاملہ میں ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ حالانکہ علامہ مرحوم فرما گئے :۔

سوال مے نہ کروں ساقیِ فرنگ سے میں

کہ یہ طریقہ رندانِ پاکباز نہیں

ٹکراؤ کی بنیاد

بہرحال ہم اپنی کتاب میں وہی لفظ استعمال کریں گے جو قرآن پاک میں ہیں یعنی قسطنطنیہ کی حکومت والوں کو اہلِ روم ہی کہیں گے اور ان کے ساتھ ٹکراؤ کی بنیاد اُسی دن پڑ گئی، جب حضور پاک ﷺ نے مسلمان قاصدوں اور سفیروں کے ذریعے روم کے بادشاہ اور اُس کے باجگزار اُمرا کو اسلام میں آنے کی دعوت دی۔ ملک شام کے جنوبی علاقوں کے عیسائی قوم کے علاقے میں بھی ایک نیم خودمختار بادشاہ تھا جس کا نام شرجیل بن عمرو تھا۔ یہ وادی بلقا یعنی موجودہ اردن میں عمان کے قریب قیام پذیر تھا۔ اُس کو بھی حضور پاک ﷺ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی لیکن اُس مردود نے مسلمان سفیر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کرا دیا تھا۔

تبصرہ

قارئین! ہم حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو سلام کہتے ہیں۔ آپ ہمارے پہلے بین الاقوامی شہید ہیں اور اِن کی شہادت رنگ لائی چنانچہ چند سال بعد اُس سارے علاقے میں اللہ تعالیٰ اور رسول کا نام بلند ہونا شروع ہو گیا تو اُن کی شہادت گاہ پر شوق کی نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کتاب کی ابتدا کر رہے ہیں۔

شاہِ روم کی طرف سفیر

شاہِ روم یا قیصر روم کا نام ہرقل تھا اور اُس کی طرف حضور پاک ﷺ نے حضرت ضیار رضی اللہ عنہ بن خلیفہ کو سفیر کے طور پر بھیجا۔ روایت ہے کہ ہرقل اُن دنوں اپنے ایشیائی دارالخلافہ انطاکیہ[1] (ANTIOCH) میں مقیم تھا جو موجودہ ترکی میں ہے کچھ مورخین کے لحاظ سے ہرقل بیت المقدس میں آیا ہوا تھا کہ ایرانیوں کے خلاف اُس کو جو فتوحات نصیب ہوئی تھیں تو اس سلسلہ میں وہ متبرک مقامات کی زیارت اور شکریہ ادا کرنے آیا ہوا تھا۔ اور یہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہی دنوں میں اُس کو خواب میں کچھ اشارہ ہوا تھا کہ سرزمین عرب سے اُٹھنے والے لوگوں کے ہاتھوں سے اُس کی رسوائی ہو گی۔ اور جیسے ہی ہرقل کو حضرت ضیار رضی اللہ عنہ بن خلیفہ کے ذریعے حضور پاک ﷺ کا خط ملا تو وہ عجیب و غریب تذبذب میں گرفتار ہو گیا اور اپنی پولیس کے بڑے افسر کو حکم دیا کہ مکہ یا مدینہ کا کوئی عرب ملے جو پیغمبر اسلام کو جانتا

(۱) نقشہ دوازدہم اور ازدہم سے استفادہ کریں۔

ہو، اور کسی اور غرض سے ادھر آیا ہو اُس کو پکڑ کر میرے دربار میں لے آؤ۔ حضرت ابوسفیان جو اُس وقت تک اسلام نہ لائے تھے بیت المقدس میں جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ تجارت کی غرض سے اکثر ادھر جاتے رہتے تھے۔ اُن دنوں صلحِ حدیبیہ کی وجہ سے قریش کے قافلے پھر تجارت کی غرض سے بلادِ شام میں جانا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ پولیس والے ابوسفیان کو چند ساتھیوں سمیت پکڑ کر لے گئے اور ہرقل کے دربار میں پیش کر دیا۔

ابوسفیان اور ہرقل کی گفتگو

جو کہانی ہم بیان کر رہے ہیں۔ خود ابوسفیان اس کہانی کے راوی ہیں۔ لیکن ان سے یہ کہانی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے سنی اور ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی۔ جیسے ہی ابوسفیان کو ہرقل کے دربار میں پیش کیا گیا ہرقل نے تنبیہ کی کہ وہ ہر بات کا جواب صحیح دے ورنہ اُس کی خیر نہیں۔ بادشاہ کے دربار میں سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے والے موجود ہوتے ہیں اور ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

ابوسفیان کہتا تھا کہ جھوٹ بولنے کا تو اُس کا ارادہ بھی نہ تھا اور شاید اُس کو ہمت بھی نہ ہوئی لیکن ہرقل کو کچھ فکرمند دیکھتے ہوئے ابوسفیان خود بخود بول اُٹھا کہ یہ نیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اتنا بڑا آدمی تو نہیں کہ اُس سے کوئی ڈر یا فکر ہو لیکن ہرقل نے ابوسفیان کو کہا کہ خاموش رہو اور اپنے آپ بات مت کرو۔ صرف سوالوں کا جواب دو۔

ہرقل: اُن کا شجرہ و نسب کیسا ہے؟

ابوسفیان: وہ اعلیٰ حسب و نسب کے ہیں اور اُن کا تعلق ہمارے خاندان کے ساتھ ہے۔

ہرقل: کیا اُن کے خاندان میں سے کبھی کسی اور نے نبوت کا دعویٰ کیا؟

ابوسفیان: نہیں۔''

ہرقل: کیا اُن کے خاندان میں سے کسی کے پاس کوئی حکومت تھی جو اُن سے لے لی گئی ہو؟''

ابوسفیان: نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔''

ہرقل: اُن کو ماننے والوں کا کردار کیسا ہے؟''

ابوسفیان: زیادہ تر کمزور اور غریب لوگ ہیں۔ اُن میں نوجوان لونڈیاں اور غلام بھی ہیں۔''

ہرقل: تم مجھے یہ بتاؤ کہ آیا وہ لوگ اُن کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور چمٹے رہتے ہیں، یا کسی نے اُن کو چھوڑ دیا ہے؟''

ابوسفیان: اُن کے کسی پیروکار نے اُن کو اب تک نہیں چھوڑا۔''

ہرقل: اُن کی اور آپ کی جنگوں کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟

ابوسفیان: مختلف اوقات میں مختلف ۔[1]

ہرقل: کیاوہ دھوکا بازی کرتے ہیں؟ یا اپنے قول کے پکے ہیں؟

ابوسفیان: وہ دھوکا بازی بھی نہیں کرتے اور قول سے بھی نہیں پھرتے۔''

ان سوالات کے جوابات سننے کے بعد ہرقل نے تمام گفتگو کا جائزہ لیا اور کہنے لگا کہ ''جہاں پر وہ بیٹھا ہے، اس جگہ پر جلد اُن ﷺ کے پیروکار قبضہ کرلیں گے اور کاش کہ ہرقل کو ایسے عظیم انسان کے پاؤں دھونے کی سعادت نصیب ہوتی۔''

ضیاء رضی اللہ عنہ بن خلیفہ کا تجزیہ

حضرت ضیاء رضی اللہ عنہ بن خلیفہ کا تعلق قبیلہ کلب سے تھا اور اُن کا قبیلہ دومۃ الجندل تک پھیلا ہوا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف پہلے قریش ہیں جنہوں نے بنوکلب کے ایک سردار اصبغ[2] کی بیٹی تماضر سے شادی کی اور حضرت ضیاء رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلہ کے ایک سردار تھے۔ یہ قبیلہ شام کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا اور گو حضرت ضیاء رضی اللہ عنہ اُس وقت نومسلم تھے، لیکن آپ رضی اللہ عنہ کی خاندانی شرافت اور قبیلہ کے اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے حضور پاک ﷺ نے آپ کو قیصر روم کو اسلام کی آغوش میں آنے کی دعوت کے لیے سفیر بنا کر بھیجا۔

ابن اسحٰق نے آپ کے تاثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ماحصل یہ ہے کہ ہرقل اسلام کی طرف مائل ہو گیا تھا اور ایک تقریر کے ذریعے اپنے امراء ارفوجی جرنیلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو پینترا تبدیل کر دیا گیا کہ وہ تو ان لوگوں کا امتحان لے رہا تھا۔ تو ہمارے لحاظ سے حُبِّ دُنیا اور تخت، اُس بے چارے کے لیے صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے میں رکاوٹ بن گئے۔ بہرحال حضرت ضیاء رضی اللہ عنہ کے مطابق ہرقل نے انہیں ایک بڑے پادری دغاتیر کے پاس بھیجا جس نے حضرت ضیاء رضی اللہ عنہ کی باتیں سننے کے بعد اعلان کر دیا کہ بخدا یہ وہی احمد ﷺ ہیں جس کا ہماری کتابوں میں ذکر ہے اور اعلان کر کے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ لیا۔ یہ دیکھ کر سب چھوٹے پادریوں نے اُن پر حملہ کر کے اُن کو شہید کر دیا۔ اور دغاتیر رضی اللہ عنہ نے لذت شوق سے بہت جلد دیدار پاک ﷺ حاصل کر لیا۔

(۱) مؤرخین کے لحاظ سے ابوسفیان کے مختصر جواب کا مطلب یہ تھا کہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اُحد میں قریش کو اور خندق میں معاملات بین بین ہی رہے۔ بہرحال یہ مؤرخین کا تجزیہ ہے اور شاید ابوسفیان کا یہ مطلب ہو۔ لیکن ہمارے لحاظ سے ہر جنگ میں قریش نے ناکامی دیکھی اور حدیبیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کا نام دیا ہے۔

(۲) جلالِ مصطفیٰ ﷺ، صفحہ ۳۲۰ سے استفادہ کریں۔

جغرافیائی اور زمینی پہلو

بلادِشام و فلسطین جغرافیائی لحاظ سے یا سیاسی طور پر دو الگ الگ ملک بھی رہے ہیں، اور اکثر اِن میں سیاسی وحدت بھی رہی۔ موجودہ اردن کو بھی ہمیشہ سے، ان علاقوں یا ملکوں کا حصہ ہی سمجھا جاتا رہا۔ انتظامی طور پر البتہ اردن ایک الگ صوبہ یا انتظامی علاقہ رہا۔ موجودہ لبنان کا تاریخی طور پر کبھی بھی کوئی الگ وجود نہیں رہا۔ بیسویں صدی کے شروع میں پہلی جنگ عظیم کے بعد اہل یورپ کی بندر بانٹ کے طور پر اور مسلمانوں کے حصے بخرے کرنے کے لیے اس کو ایک الگ ملک بنا دیا گیا اسی زمانے میں اعلانِ بلفور کے مطابق فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کا بھی فیصلہ ہوا۔ آج اسرائیل کا ملک اس علاقہ میں اہل اسلام کے لیے ایک ناسور بنا ہوا ہے، اور لبنان بھی اُسی ڈگر پر چلنے والا ہے۔

بہر حال یہ سب آباد علاقے ہیں اور کہیں کہیں ریگستان بھی ہے ایک طرف بحیرۂ روم کی معتدل آب و ہوا کا اثر ہے، سردیوں میں تو شمال کی سرد ہواؤں سے بھی کچھ پہاڑوں کی وجہ سے بچاؤ حاصل ہو جاتا لیکن گرمیوں میں صحرا کی گرمی سے کوئی بچاؤ حاصل نہیں کہ جنوب میں یہ سب عرب کے صحرائی علاقوں سے ملے ہوئے ہیں۔ شمالی پہاڑوں کی وجہ سے جو دریا بنتے ہیں وہ تو دجلہ اور فرات ہیں جو عراق میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن اپنے اندرونی پہاڑوں کی وجہ سے جگہ جگہ چھوٹے دریا موجود ہیں جن میں سے کچھ بحیرۂ مردار اور بحیرہ طبریہ میں گرتے ہیں یہ دونوں جھیلیں ہیں اور بحیرہ مردار کا پانی سطح سمندر سے بھی کافی نیچے ہے۔

زمین زرخیز ہے، ہر قسم کی کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور کی جاتی تھی۔ پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی زندگی کی تمام سہولتیں جس طرح آج موجود ہیں اُس زمانے میں بھی میسر تھیں۔ ذرائع آمد و رفت بھی اچھے تھے اور لوگ خوشحال اور آسودہ حال تھے۔ دمشق شاید دنیا کا پرانا شہر ہے جو صدیوں سے اِسی طرح آباد تھا، بیت المقدس کو بھی اتنی ہی وقعت حاصل تھی بلکہ مذہبی لحاظ سے زیادہ وقعت کا حامل تھا۔ فحل جابیہ، حمص، حلب، قنا سرین، غزہ، جافہ، بیروت، انطاکیہ، قساریہ، طرابلس، بیر شیبہ، عمان عقبہ، طبریہ، رملہ اور بیسان وغیرہ کے شہر جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، اُس زمانے میں بھی آباد تھے اور ساحلی علاقے کے شہر مثلاً غزہ، جافہ، قساریہ، انطاکیہ، طرابلس اور بیروت وغیرہ اُس زمانے میں بھی سمندری تجارت کے لیے بندرگاہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

تاریخی پہلو

ہم ملکِ شام کی بہت پرانی تاریخ میں نہیں جائیں گے۔ حضرت ابراہیم d کے بیٹے حضرت الحق d کی اولاد اسی علاقے میں آباد تھی۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اس خاندان کا بڑا حصہ مصر چلا گیا۔ لیکن کچھ

لوگ اس علاقے میں ضرور باقی رہے ہوں گے کہ حضرت لوط علیہ السلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رشتہ دار تھے وہ بھی اسی علاقے میں ہو گزرے ہیں۔ فرعونِ مصر کے زمانے میں البتہ مصر میں گئے ہوئے بنی اسرائیل، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا ہی دوسرا نام ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی قیادت میں واپس فلسطین کے علاقے میں آ گئے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام سب اسی علاقے میں آباد رہے اور دین حنیف کا پیغام دیا۔

ہماری دلچسپی البتہ حضور پاک ﷺ کے زمانے سے چند سال پہلے کے حالات سے ہے اور وہ یہ ہے کہ بلادِ شام و فلسطین، سلطنت روم کا حصہ تھیں۔ اور جو لوگ تاریخ کا مطالعہ برائے تاریخ میں دلچسپی رکھتے تھے، اُن کے مطالعہ کے لیے البتہ وہاں بہت بڑا اور وسیع ''میدان'' موجود ہے بے شمار آثارِ قدیمہ موجود ہیں اور پرانی تہذیب و تمدن کے اُجڑنے یا سلطنتوں کے ختم ہونے پر کافی تاریخی ''مواد'' موجود ہے لیکن ہم اپنے آپ کو صرف وہاں تک محدود رکھیں گے جس تاریخ کے تانے بانے ہمارے حق اور باطل کی لڑائی، کے سلسلے میں ہمارے لیے کچھ مددگار ثابت ہوں۔ چنانچہ حضور پاک ﷺ جب مکہ ہی میں تھے تو اہل روم، ایرانیوں سے شکست کھا گئے تھے لیکن حضور پاک ﷺ کو مدینہ میں ہجرت کئے ابھی دو سال ہی ہوئے تھے کہ اہلِ روم نے ایرانیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لے لیا۔ اس کا ذکر قرآنِ پاک کی سورۂ روم میں ہے۔

اوّل واقعہ کا ذکر ہے اور پھر پیشگوئی ہے جو اُسی زمانے میں جلد ہی پوری ہوگئی، اور اس واقعہ کا ذکر جلالِ مصطفےٰ کے پانچویں باب میں بھی کر دیا گیا ہے۔ اب نقشہ اول اور نقشہ دوم وغیرہ سے اور زیادہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے کی دنیا کی دو عظیم ترین سلطنتوں کی آپس میں حدود فراض کے مقام پر ملتی تھیں، یہ وہی مقام ہے جس کا ذکر حصہ اوّل[1] میں ہو چکا ہے اور وہاں پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دونوں سلطنتوں کی سرحدی چوکیوں کی ملی جلی فوج کو ذی قعد ۱۲ ہجری میں شکست دی۔

عرب جو اَب مسلمان تھے اُن کے ساتھ روم کی سلطنت کی واضح حدود نہ تھیں سلطنت روم کی جنوبی حد پر غسانی قبائل کی حکومت تھی اور یہ لوگ اہل روم کے باجگزار تھے۔ یہ لوگ عرب تھے اور یمن سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے تھے، وہاں نصرانی مذہب اختیار کر لیا۔ ان کے حاکم شرجیل کا ذکر بھی ہو چکا ہے جس نے مسلمان سفیر حضرت حارث رضی اللہ عنہ بن عمیر کو شہید کیا تھا۔ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کا ایک حاکم تھا جبلہ جو مسلمانوں کی یلغار کے بعد علاقوں کو چھوڑ جاتا تھا اور جب رومی جوابی حملہ کرتے تھے تو اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ جنگ یرموک میں اس کی کاروائیوں کا

(۱) پندرھواں باب۔

مفصل ذکر آئے گا۔

شام و فلسطین کے جنوبی علاقوں میں زیادہ تر عرب قبائل آباد تھے۔ شمال میں کرد، دروز، ترکمان اور آرمینیا کی نسل کے لوگ آباد تھے۔ جنوبی فلسطین میں مصر کے لوگ بھی آباد تھے، اور ساحلی علاقوں میں قبرص اور یونان سے آ کر بھی کئی لوگ آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے شام و فلسطین کی آبادی بھی ملک عراق کی طرح کئی قومیتوں سے تعلق رکھتی تھی۔

رومی افواج

عیسائی بادشاہ کی اپنی بھی فوج تھی اور سلطنت روم نے اہم مقامات پر اپنی باقاعدہ فوج بھی متعین کی ہوئی تھی۔ اس فوج میں روم کی سلطنت کے ہر حصہ کے لوگ شامل تھے۔ شام کی اُن ''قومیتوں'' کو چھوڑ کر، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے روم کی فوج میں شمالی آرمینیا کے کافی لوگ تھے۔ موجودہ اناطولیہ، یونان اور بلقان کی سلاد قوم کے لوگ بھی اہل روم کی افواج میں کثرت سے شامل تھے اور اہل روم کی فوج بھی ایرانی فوج کی طرح ایک باقاعدہ اور پیشہ ور فوج تھی، ویسے ہرقل یا روم کی سلطنت کو حضور پاک ﷺ کے زمانے سے پہلے ملک عرب سے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا تھا۔ اور ہرقل فوجی حکمت عملی اور تدبیرات کا ماہر تھا۔ وہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر چکا تھا کہ جب اہل ایران قسطنطنیہ کے محاصرہ کی تیاریاں کر رہے تھے تو ہرقل ایک طرف سے نکل کر مدائن پہنچ گیا اور ایرانیوں کو شکست دے کر اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے۔

جنگ موتہ

حضور پاک ﷺ نے البتہ اپنے زمانے میں حکمت عملی کے طور پر ایران و عراق کی نسبت شام و فلسطین کے علاقوں کو زیادہ اہمیت دی۔ جلالِ مصطفےٰ ﷺ کے پانچویں باب میں جنگ موتہ کے وجوہات اور نتائج کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ حضور پاک ﷺ اس طرف سے زیادہ فکر مند تھے۔ اول تو یہ علاقے مدینہ کے نزدیک تھے۔ دوم ان علاقوں کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا اہل کتاب ہونے کی وجہ سے رشتہ تھا کہ ہمارے حضور پاک ﷺ بھی دینِ ابراہیمی یا حنیف کا پیغام ساری دنیا کو دینے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ اہل کتاب میں سے یا تو لوگ دغاتیر رضی اللہ عنہ پادری کی طرح جلد اسلام لے آئے تھے، لیکن اگر مخالفت پر اُتر آتے تو جھگڑا اُس حد تک پہنچ سکتا تھا جس حد تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پر ہوا اور بعد میں یہودیوں نے مدینہ شریف میں ہمارے آقا ﷺ کی ہر بات کی مخالفت کی۔ ایسی صورت میں اہل حق پہلے روز سے باطل کا مقابلہ طاقت کے ساتھ کر رہے تھے اور یہودیوں کے علاوہ اب نصرانیوں کے ساتھ بھی مخالفت شروع ہو چکی تھی۔ نصرانیوں نے مسلمان سفیر کو شہید کر دیا تھا۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر حضور پاک ﷺ نے آٹھ

ہجری میں اہل حق کو موتہ بھیجا کہ وہاں پر لا تعداد رومی لشکر اور غسانی قبائل اکٹھے ہو کر مدینہ شریف پر یلغار کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ جنگ موتہ میں غلامانِ محمد ﷺ نے عظیم قربانی دے کر اہل روم اور غسانی قبائل پر واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ لڑائی مول لینا آسان کام نہیں ہے۔

تبوک کی مہم (جلالِ مصطفےٰ ﷺ آٹھواں باب)

حضور پاک ﷺ نے البتہ مسلمانوں کو ہمیشہ چوکنا رکھا کہ اہل روم کسی طرح سے شمال کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی پہل کاری نہ کر سکیں۔ چنانچہ نو ہجری میں آپ ﷺ نے تیس ہزار کے ایک لشکر جرار کے ساتھ تبوک کی طرف کوچ کیا کہ خبر ملی تھی کہ رومی کسی جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس مہم کے بہت اچھے نتائج واثرات ظاہر ہوئے۔ اور اہل روم کو مسلمانوں کے علاقوں کو تاخت وتاراج کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم[1]

حضور پاک ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے ماتحت ایک عظیم لشکر تیار کیا اور حکم دیا کہ وہ لشکر موتہ تک جائے۔ یہ لشکر بعد میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھیجا اور پہلی کتاب کے پہلے باب میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی کاروائی، مہم کی حکمت عملی، اور نتائج پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ وہاں یہ ثابت بھی کیا گیا ہے کہ اس مہم کی کتنی ضرورت اور اہمیت تھی۔ اور اس کاروائی سے کتنے دُور رَس نتائج نکلے۔

تبصرہ واسباق

یہ مختصر باب کئی لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے۔ علاقے کے ضروری تاریخی اور جغرافیائی پہلو کے علاوہ، قیصر روم اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا مکالمہ بڑا دلچسپ ہے۔ اسلامی فلسفۂ حیات کی جھلکیاں سچ اور جھوٹ میں تمیز ہرقل کی شخصیت آنے والے واقعات کا جائزہ وغیرہ سب پہلو مختصر طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں، جن میں کافی عملی اسباق موجود ہیں۔

(۱) جلالِ مصطفےٰ صفحہ ۲۹۳ سے استفادہ کریں۔

دوسرا باب

خلیفہِ اوّل کی شام وفلسطین کی فتوحات کی حکمت عملی

خلیفہِ اوّل نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بے شک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری کے طور پر بلادِ شام کی طرف بھیجا تھا، لیکن آپ رضی اللہ عنہ تمام حکمت عملیوں سے بھی آگاہ تھے، اور گو آپ رضی اللہ عنہ نے شام کی بجائے پہلے عراق کے محاذ کو ترجیح دی لیکن عراق کی فتوحات سے پہلے ذوقصہ کے مقام پر جمادی الثانی گیارہ ہجری میں جن گیارہ لشکروں کی تشکیل کی گئی اور پہلی کتاب کے دوسرے باب میں اس کی تفصیل ہے اُن میں سے دو لشکر انہی دنوں بلادِ شام کی سرحدوں کی طرف بھیجے گئے اور یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو ماہ بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مرتدین کے قلع قمع میں مصروف تھے۔ یہ دو لشکر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے تھے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کا لشکر دومۃ الجندل کے گردونواح میں تھا اور شام کی جنوب مشرقی سرحدوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کا لشکر شام کی جنوب مغربی سرحدوں پر تھا اور ان کی نگہداشت موتہ کے نیچے سے ایلہ (عقابہ) کے علاقہ تک تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک ساتھ دو محاذ نہیں کھولنا چاہتے تھے لیکن جب باقی آٹھ لشکر مرتدین کے قلع قمع پر لگے ہوئے تھے اور گیارہواں لشکر تشکیل نہ ہوا تھا تو اُس زمانے میں بھی حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ شام کی سرحدوں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے جہاں حصہِ اوّل میں مرتدین کے قلع قمع کو دوسرے تیسرے اور چوتھے ابواب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہاں پر اِن دو لشکروں کی کاروائی کا بھی ذکر ہے کہ یہ دونوں لشکر دیکھ بھال میں مصروف تھے، حربی مظاہرے کر رہے تھے اور آج کل کی فوجی اصطلاح کے مطابق دشمن کو اُس کے علاقے میں (Contain) کئے ہوئے تھے، یعنی زوردار دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم تھا کہ دشمن کے علاقے میں زیادہ دور اندر تک نہ جانا۔ بلکہ اُس طرف اپنے محاذ کے دکھلاوے کا اظہار کرنا اور دشمن کی خبر رکھنا، مخبری کا جال بچھانا وغیرہ اور کسی ملک پر حملہ کرنے سے پہلے اس ملک کے حالات کا جاننا اور وہاں پر مخبری کا جال بچھانا ضروری ہوتا ہے۔

یمامہ کی جنگ کے بعد شوال گیارہ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کو بھی اُسی علاقہ میں بھیج دیا۔ (حصہ اوّل چوتھے باب میں اس کا سرسری ذکر موجود ہے۔) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری بڑے وسیع علاقے میں تھی اور دومۃ الجندل کے لیے حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کے ماتحت ایک اور مہم تیار کی جا رہی تھی، جس کا ذکر حصہ اوّل[1] میں کر دیا گیا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے باقی علاقے کو حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ میں بانٹ دیا گیا تھا اس کے دو ماہ بعد جب ذوالحجہ گیارہ ہجری میں یمن اور حضرموت کے علاقوں میں مرتدین کا قلع قمع ہو گیا تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل اور ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کو[2] دستے مہیا کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کی مدد کے لیے بھیج دیا گیا۔ بعض مؤرخین نے ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خودمختار طور پر لشکر کے کمانڈر تھے اور بنو قضاعہ کے علاقہ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے آدھا علاقہ لے کر اُن کی ذمہ داری میں دے دیا گیا لیکن آگے کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے ماتحت تھے اور اُن کی ماتحتی ہی میں شروع کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ بہرحال علاقے نزدیک نزدیک تھے اور تھوڑی غلط فہمی ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ دومۃ الجندل سے لے کر چھ اسلامی لشکر یا دستے اِس طرح جگہ جگہ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کہ مغرب میں ایلہ یا عقابہ کا علاقہ بھی اُن کی نگاہ کے سامنے تھا — یہ تھی خلیفہ اوّل کی حکمت عملی جو بارھویں ہجری میں شام کی سرحدوں کے ساتھ جنم لے رہی تھی۔ حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، حضرت ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید جیسے عظیم صحابہ خود ہی کیا کچھ کم تھے کہ اس دوران جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید عراق کی فتوحات کے لیے رواں دواں تھے۔ تو شام کے محاذ کی آج کل کی فوجی زبان کے مطابق ''(RECEE-IN-FORCE)'' ہو رہی تھی یعنی بہت زوردار دیکھ و بھال کی جا رہی تھی۔ اور اتنے مجاہدین کی اذانوں کے اثرات الگ ہوں گے:۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود

ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

(اقبالؔ)

خلیفہ اول کے احکام

خلیفہ اوّل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے وہ عراق کا محاذ کھولیں گے اور اس سلسلہ میں اُن کی اس ''ترجیح'' کا جائزہ پہلی کتاب کے دوسرے اور ساتویں باب میں پیش کر دیا گیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ جب تک عراق میں حیرہ

(۱) تیرھواں باب۔ (۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اخیافی بھائی جن کا ذکر پہلی کتاب میں بھی ہو چکا ہے۔

تک کے علاقے فتح نہ ہو جائیں اور مشرقی محاذ پر حیرہ کے ساتھ دومۃ الجندل والے راستے سے رابطہ قائم نہ ہو جائے اس وقت تک شام کے محاذ پر کوئی ایسی کاروائی نہ کی جائے کہ دو محاذوں پر جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھیں۔ نقشۂ دوم کے مطالعہ سے یہ پالیسی اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کی جلد بازی

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بڑے منجھے ہوئے سیاست دان تھے اور فوجی معاملات کے بھی ماہر تھے اُن کے مشاہدات اور جائزے بڑی بلندی کے حامل ہوتے تھے۔ اس لیے انہوں نے خلیفۂ اوّل کے احکام پر سختی کے ساتھ عمل کیا وہ حالات کے نتائج سے پوری طرح باخبر ہوتے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کو گو اسلام لانے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پر فوقیت حاصل تھی اور آپ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ وفود کی مہمانداری کے فرائض بھی سونپے تھے لیکن آپ فوجی کاروائی میں کچھ جلد بازی کر گئے شاید جوشِ جہاد میں معاملات کی تہہ میں نہ جا سکے۔ اول تو آپ کمک کے مل جانے سے بہت خوش تھے۔ اور پھر اُن کو کچھ اور کمک ملنے کی اُمید تھی۔ خلیفہ اول نے واضح کر دیا تھا کہ عراق کی مہم کے دریائے فرات کے مغربی کنارے پر کامیابی کے ساتھ مکمل ہونے کے بعد اہل اسلام، شام و فلسطین میں آگے بڑھیں گے چنانچہ اُن کو کچھ خیال ہو گیا کہ جس طرح عراق کے محاذ پر حضرت خالد بن ولید کامیاب ہو رہے ہیں۔ اسی طرح شام کے محاذ پر اللہ تعالیٰ نے اُن (حضرت خالد) کے لیے کامیابیاں لکھ دی ہیں۔ اس لیے انہوں نے شام کے محاذ پر آگے بڑھنے کے لیے خلیفہ اول سے اجازت مانگی یعنی اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی ہر محاذ پر کامیابی کے لیے کسی "خالد رضی اللہ عنہ" کی ضرورت ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دوررس نگاہ کے ذریعے معاملات کو بھانپ چکے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ بلادِ شام پر اللہ تعالیٰ اور رسول کا نام بلند کرنے کا وقت آ گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ بھرپور تیاری میں مصروف تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا اضطراب دیکھ کر آپ نے اُن کو محدود پیش قدمی کی اجازت ضرور دی۔ لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اپنی حفاظت کا خیال رکھنا اور دشمن کے اندر اتنا دور تک بھی نہ گھس جانا کہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں۔ فوجی لحاظ سے گشتی دستوں کی جگہ لڑاکا دستوں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ دشمن کے بارے میں مزید خبر حاصل ہو سکے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی اوپر والی سطح تک یہی مدعا تھا لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ کچھ زیادہ دور تک غیروں کے علاقے میں چلے گئے۔

رومیوں کا ردِّ عمل

اہل روم کے طریق کار ایرانیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اہم مقامات یا چھاؤنیوں میں وہ لوگ اور فوجی محدود

(۱) جلال مصطفیٰ کے صفحہ ۲۸۲ اور ۲۹۰ سے استفادہ کر کے

تعداد رکھتے تھے۔ بڑے لشکر اندرونی علاقوں میں ایک جمگھٹ کے طور پر ہر وقت ایک مٹھی میں اکٹھے کئے جا سکتے تھے۔ وہ کسی بڑے لشکر کو اس طرح نہ بھیج دیتے تھے جس طرح ایرانیوں نے سلاسل، ثنی یا ولجہ وغیرہ کی جنگوں میں کیا۔ وہ دشمن کے بارے میں پہلے مکمل خبر حاصل کرتے تھے۔ دشمن کے ارادوں سے آگاہ ہوتے تھے اور مکمل چھان بین کے بعد کسی بڑے لشکر کو اپنی مرضی کے وقت اور مرضی کی زمین پر دشمن کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس پہلو کا مطالعہ ضروری ہے، اور قارئین ایرانیوں کے ردِ عمل کا رومیوں کے ردِ عمل کے ساتھ موازنہ ضرور کریں تو کتاب کے اگلے حصہ کی لڑائیوں کا مطالعہ آسان ہو جائے گا۔ بہر حال اہل روم چھاؤنیوں یا اہم مقامات پر ضرورت کے مطابق جود ستے رکھتے تھے۔ ان میں مقامی لوگ زیادہ ہوتے تھے اور بلادِ شام میں یہ کام زیادہ تر غسانی قبیلہ کے لوگ کرتے تھے۔ رومن فوج کا سپہ سالار اعظم باہان تھا اور وہ دمشق کے علاقے میں مقیم رہتا تھا اور اُس کے ساتھ جنگ یرموک میں ہمارا براہِ راست واسطہ بھی پڑے گا لیکن شروع زمانے میں اُس کا کام تمام علاقوں پر کڑی نگاہ رکھنا تھا۔ اور وہ اپنی تمام چھاؤنیوں اور فوجی چوکیوں کے ساتھ رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کا لشکر چند ہزار مجاہدین کا تھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کی پیش قدمی

۱۲ ہجری کے آخر میں جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو محدود پیش قدمی کی اجازت ملی تو آپ تیما کے مقام پر مقیم تھے، آپ رضی اللہ عنہ وہاں سے آگے بڑھے اور وادیٔ بلقا سے اِس طرح آگے گزرے کہ بحیرۂ مردار آپ رضی اللہ عنہ کے مغرب کی طرف رہ گیا روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے دریائے یرموک کو بھی پار کر لیا اور دمشق کے نزدیک مرج الصفر تک پہنچ گئے۔ نقشہ چہارم پر ان مقامات کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ آپ تقریباً ڈیڑھ سو میل پیش قدمی کر گئے۔ ممکن ہے آپ اتنے زیادہ اندر نہ گئے ہوں اور کوئی سو میل کا سفر کر کے وادیٔ یرموک تک ہی پہنچے ہوں۔ بہر حال باہان حالات سے باخبر تھا اور اُس نے مسلمانوں کو محصور کرنے کی کوشش کی اور اس کام کے لیے اُس نے ایک لشکر بھیج دیا۔ پہلی ہی کوشش میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا بیٹا اور چند مجاہدین رومیوں کے نرغے میں آ گئے جو کسی جگہ پانی کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ رومیوں نے اُن پر قابو پا لیا اور اُن کو شہید کر دیا۔ ایک مجاہد زندہ بچ گیا اور اُس نے جا کر خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کو حالات سے باخبر کیا۔

اب بہتر تو یہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حالات کا جائزہ لے کر کسی مقصد کے تحت کوئی کارروائی کرتے لیکن جوشِ انتقام میں انہوں نے چند سواروں کو ساتھ لیا اور حادثہ کے مقام کی طرف چل پڑے کہ رومیوں کے ساتھ دو دو ہاتھ ہو جائیں لیکن جب وہ حادثہ والی جگہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں رومیوں کا ایک لاؤ لشکر موجود تھا اور انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھی گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس نفری زیادہ نہ تھی اور انہوں نے رومی

لشکر کے گھیرے سے نکل کر ایک طرف کنارہ کشی کر لی۔ لیکن دشمن نے اُن پر حملہ پہ حملہ شروع کر دیا۔ اور سخت دباؤ ڈالا بلکہ اُن کا تعاقب شروع کر دیا جو ذی المرۃ کے مقام تک جاری رہا۔ دشمن شاید کچھ اور بھی کر لیتا لیکن حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابو جہل جو خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے، حالات کو بھانپ گئے اور انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ باقی لشکر کی کمانڈ سنبھال لی اور وہ رومی لشکر جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا تعاقب کر رہا تھا حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اُن پر عقب سے حملہ کر دیا، اِس لیے دشمن چوکنا ہو گیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا تعاقب بند کر دیا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو بھی اب پسپائی کر کے اپنے علاقے یا اپنے دوست ریگستان کے علاقے میں داخل ہونا تھا، لیکن انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے یرموک کے علاقے کے عقب سے نکل کر ریگستان کو استعمال کرتے ہوئے اپنے باقی ماندہ لشکر کو بچا لیا اور واپس تیما آ گئے پھر باقی اسلامی لشکروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ بات تو صرف اتنی تھی اور لڑائی میں ایسے حادثات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور کئی ان ہونی باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن کئی مورخین نے اس سب کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کا فرار قرار دیا، کسی نے اس واقعہ کو اُن کی کم دلی پر محمول کیا وغیرہ۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے سوچیں تو یہ صرف جلد بازی تھی، اور حالات کا جائزہ صحیح طور پر نہ کیا گیا تھا اور بے سوچے سمجھے انتقام لینے کی کوشش کی، اس لئے حالات نہ سنبھل سکے۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تجزیہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پہلے ہی سے اِس خیال کے حامی تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید از خود بڑے بہادر اور با اخلاق ہیں۔ اونچے پایہ کے مسلمان ہیں۔ لیکن سپہ سالاری کے مشکل کام سے عہدہ برانہ ہو سکیں گے اور انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اس رائے کا اظہار کر دیا تھا لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اُن کو ایک موقع دینا چاہتے تھے، اب حالات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ حضرت خالد بن سعید کا لشکر کچھ بٹ گیا اور اس طرح ان کے نام اور عزت کو بھی دھچکا لگ گیا تھا۔ لہٰذا خلیفہ اول نے شام کو فتح کرنے کے لیے ایک تبدیل شدہ حکمت عملی کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کو سپہ سالاری سے سبکدوش کرنا پڑا۔ لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید شام کی باقی تمام جنگوں میں ایک مجاہد کی حیثیت سے ضرور حصہ لیتے رہے اور بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔ جنگ یرموک میں سخت زخمی ہوئے اور اُس کے چار ماہ بعد شمالی شام کی ایک جھڑپ میں شہید ہو گئے۔ تفصیل آگے ساتویں باب میں موجود ہے۔

خلیفہ اول کی تنظیم نو اور نئی حکمت عملی

پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ حیرہ کی فتح کے بعد اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی دریائے فرات کے مغربی کنارے کے علاقوں میں کامیاب فوجی کاروائیوں کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اندازہ لگالیا تھا کہ شام و فلسطین میں اللہ جل جلالہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ خلیفہ اول نے بارہ ہجری میں حج ادا کیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھی پوشیدگی میں یہ حج ادا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں یار غار اور اللہ کی تلوار کی ملاقات ہوئی ہوگی کیونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی پوشیدگی عام لوگوں سے تھی کہ دشمن کو خبر نہ مل جائے کہ وہ محاذ پر موجود نہیں ہیں۔ ہم نے حصہ اول میں یہ جائزہ اور تبصرہ کھل کر پیش کر دیا تھا کہ ہمارے لحاظ سے مورخین اور مبصرین کی یہ حاشیہ آرائی غلط ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اول کی اجازت کے بغیر حج ادا کیا اور خلیفہ اول نے بعد میں اُن کو اس سلسلہ میں کوئی تنبیہہ کی۔ حصہ اول کے پندرھویں اور سولہویں ابواب میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ تنبیہہ تین ماہ بعد کی گئی اور وہ بھی ایسے وقت جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ایک اور بہت بڑی ذمہ داری سونپی جا رہی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کہ ''خالد رضی اللہ عنہ آئندہ ایسا مت کرنا'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنی حفاظت کی ہدایت تھی نہ کہ حج پر آنے سے روکنے کی۔

تو یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ اول اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے درمیان آئندہ کی حکمت عملی اور فتوحات شام کے سلسلے میں کوئی گفتگو بھی ہوئی ہو۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فتوحات عراق کے بعد مسلمانوں کے لشکروں کی تعیناتی اور عراق کے مفتوحہ علاقوں کے بارے میں حالات سے واقف کیا ہو کیونکہ حج سے واپسی کے فوراً بعد محرم تیرہ ہجری میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تمام مسلمانوں کو بھرپور جہاد میں شرکت کی دعوت دی اور مدینہ شریف میں متعدد لشکروں اور مجاہدین کو تیاری کے احکامات صادر فرمائے۔

اسلامی سپہ سالار

دراصل دو سالار لشکر، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ تو پہلے ہی سے شام کی سرحدوں کے ساتھ دیکھ بھال کے کاموں میں مصروف تھے۔ ان کے علاوہ اور دو عظیم صحابہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح اور حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ مدینہ شریف میں مجاہدین کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ مورخین اور مبصرین نے چاروں لشکروں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لشکر مدینہ سے روانہ ہوئے تھے لیکن یہ لوگ جب تفصیل میں جاتے ہیں تو صرف یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے لشکر کی مدینہؐ سے روانگی کے منظر اور خلیفہ اول کی ہدایات کا ذکر کرتے ہیں یا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے چوتھائی لشکر کی روانگی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کے جو لشکر شام کی سرحدوں پر متعین تھے وہ کہاں گئے یا کچھ مہمل بیانات ہیں جن کا آگے ذکر آئے گا۔ یہ مورخین حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن

حسنہ کی مدینہ سے روانگی کا بھی کچھ ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں لکھتے کہ مدینہ سے کوئی لشکر بھی ساتھ گیا یا نہ گیا۔ اور جیسے حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اپنی ذمہ داری کے علاقہ میں پہنچاتے ہیں۔ ساتھ ہی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے لشکر سمیت اپنی نئی ذمہ داری کے علاقے میں پہنچا دیتے ہیں۔

جائزہ اور تبصرہ

تمام حالات کے تانے بانے کچھ اس طرح ملتے ہیں کہ خلیفہ اول نے جب شام کو فتح کرنے کیلئے حکمت عملی وضع کر لی تو صرف ایک ہی لشکر مدینہ شریف میں تیار ہوا اور وہ حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تھا چونکہ دومۃ الجندل کے علاقے میں کوئی خطرہ باقی نہ رہ گیا تھا، اس لیے اس علاقے کے نزدیک دونوں لشکروں یعنی عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور شرجیل بن حسنہ کے لشکروں کو نئی ذمہ داری دے دی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر پسند تھا۔ اور اس کی تفصیل آگے تیسری کتاب میں آئے گی۔ اس لئے انہیں فلسطین کے ایسے علاقوں میں تعین کیا گیا جو مصر کے نزدیک تھے۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ، جن کی ذمہ داری کی تفصیل آگے آتی ہے، کہ اُن کو بھی شام کے علاقے میں ایک مقصود دے دیا گیا، البتہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ دونوں سالار مدینہ شریف آئے اور وہاں پر نئے حالات کے مطابق اُن کو اُن کی نئی ذمہ داری سے آگاہ کیا گیا اور کچھ کمک کے ساتھ آپ اپنے لشکروں میں واپس پہنچ گئے اور وہاں سے اپنے لشکروں کو ساتھ لے کر نئے مقصودوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، جنہوں نے سپہ سالار اعظم کا کام بھی کرنا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے ایک دستہ کے ساتھ سب سے آخر میں چلے۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کے لشکر کی کمانڈر بھی سنبھالنی تھی اور ایسا ہوا کہ واقعات اس کے ثبوت میں جاتے ہیں۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل اور حضرت ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے جبکہ میں جنگ یرموک تک ہمیشہ سے اُس لشکر کے حصہ میں رہے۔ جس کی کمانڈ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ذاتی طور پر کرتے رہے۔ ویسے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر کچھ تتر بتر بھی ہو گیا تھا اور ممکن ہے کہ کوئی ایک آدھا مجاہد کسی دوسرے لشکر میں شامل ہو گیا ہو کہ کچھ مورخین نے لکھ دیا کہ لشکر کا ایک حصہ حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا تھا۔ بہر حال حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید از خود ایک مجاہد کی طرح اپنی شہادت تک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل رہے، اور واقعات کا تسلسل کچھ اس طرح آگے چلتا ہے۔

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص

پہلے دومۃ الجندل سے لے کر تبوک کے علاقے میں بنو قضاعہ اور بنو کلب کے قبائل کے علاقوں میں متعین تھے جمادی الثانی بارہ ہجری میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم نے دومۃ الجندل میں تمام قبائل کی

سرکوبی کر کے وہاں کے حالات بہتر کر دیئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد خلیفہ اول نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اپنے علاقوں کے نظام کو سویلین حکام کے حوالے کر دیں اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے کر اپنے لشکر میں شامل کریں چنانچہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ بن العذری کو اس علاقے کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا اور خود لشکر اکٹھا کرنے میں لگ گئے اور آپ کو اگلے احکام کا انتظار بھی تھا اور ذمہ داری میں تبدیلی بھی تھی کہ مشرقی علاقوں کی بجائے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مغرب کی طرف کوچ کرنا تھا اور خلیج عقابہ کے نزدیک ایلہ کے مقام کو اپنا مرکز بنانا تھا یہ وہی مقام ہے جہاں پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مہم تبوک کے وقت اپنے لشکر کے ایک حصہ کو بھیج کر ایلہ کے سردار کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لیے احکام یہ تھے کہ وہ ساحلی علاقوں میں غزہ اور درمیانی علاقوں میں اجنادین سے آگے نہ بڑھیں اور انہی علاقوں میں اسلام کی قوت کو مضبوط کریں۔

تبصرہ:

خلیفۂ اول کے اس طریقہ کار میں خاص مقصد پنہاں تھا۔ آپ سمندر کے کنارے کسی ساحلی جنگ یا سمندری جنگ سے اُس وقت تک دور ہی رہنا چاہتے تھے۔ جیسے عراق کی مہم میں اُبلہ کی فتح کے بعد وہاں سے آگے خلیج فارس کے کنارے کی طرف پیش قدمی نہ کی گئی، یہی اصول یہاں بھی لاگو تھا۔ اس کے علاوہ درمیان میں اجنادین سے آگے بیت المقدس کا مقام تھا۔ اور وہاں پر فوری حملہ کرنے سے تمام عیسائی طاقتوں کے ساتھ ایک کھلم کھلا بہت بڑے تصادم کو دعوت دینا تھی اور ایسی کارروائی کے لیے بڑی طاقت کی ضرورت تھی۔ لیکن ایک راز کی بات بھی تھی۔ بیت المقدس بھی کعبہ شریف کی طرح اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، بے شک اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اہل حق قوت کے ساتھ اُس کے گھر میں داخل ہوں اور اس پہلو کی جلالِ مصطفٰے(1) کے چھٹے باب میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پوری کرنا چاہتے تھے کہ مکہ کی طرح بیت المقدس میں بھی کوئی زیادہ جنگ وجدل نہ ہو۔ اور کسی حکمت عملی کے تحت وہ جگہ بھی اپنے آپ ''جھولی'' میں گر جائے۔ اگلے احکام اور دوسرے سپہ سالاروں کو جو ذمہ داریاں سونپی گئیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بیت المقدس سے پہلے دمشق اور باقی شمالی علاقوں کو فتح کرنا چاہتے تھے، تاکہ بعد میں دو، یا زیادہ اطراف سے بڑھ کر آسانی سے بیت المقدس میں داخل ہو سکیں۔ اس سلسلے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں داخل ہونے کے طریق کار سے رہنمائی حاصل کی جا رہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں چار اطراف سے داخل ہوئے اور یاد رکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر وقت اور ہر جگہ یہ سوچتے تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یا طریق کار کیا ہے؟ کیونکہ اُن

(۱) تفصیل کے لیے جلالِ مصطفٰے کے صفحہ ۲۶۵ پر نقشہ اور صفحہ ۲۷۲ سے استفادہ کریں۔ (۲) صفحہ ۲۱۹، اور ۲۲۰۔

کو معلوم تھا کہ یہ سب کچھ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہے:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا (اقبالؔ)

اس کے علاوہ یہاں پر یہ بیان بھی ضروری ہے کہ حضرت عمرو[1] بن عاص رضی اللہ عنہ بہت سنجیدہ تھے اور ٹھنڈے مزاج کے فوجی ماہر تھے۔ آپ تدبر اور سیاست میں اسلام سے پہلے بھی عرب کے چوٹی کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے اسلام میں داخل ہونے کے بعد حضور پاک ﷺ کے سامنے عاجزی کی حالت یہ تھی کہ آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فرماتے تھے کہ ''بخدا مجھ میں ہمت نہ تھی کہ حضور پاک ﷺ کے چہرۂ مبارک کے جمال و جلال کی جھلک کو برداشت کر سکوں۔'' اس وفاداری اور عاجزی نے اُن کے مقامات کو بہت بلند کر دیا تھا اور آپ فلسطین کے علاقے میں ذمہ داری کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔ آپ کے ساتھ جو پہلے دستے موجود تھے اُن کی تعداد کوئی چار ہزار کے قریب تھی۔ مدینہ سے کمک کے بعد آپ کے لشکر کی تعداد سات ہزار کے قریب ہو گئی تھی۔

ب۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ

ذی قعد گیارہ ہجری میں جیسے ہی جنگ یمامہ ختم ہوئی حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ شام کی سرحدوں پر متعین تھے کہ اُن کو مدینہ بلا کر اور کمک دی گئی اور جس علاقے کی دیکھ بھال میں آپ مصروف تھے۔ اُسی علاقے سے آپ کو آگے بڑھنا تھا آپ کو اُردن کا علاقہ دیا گیا اور آپ نے معان موتہ والے راستے کی بجائے مشرق میں ریگستانی علاقے سے ایک راستہ اختیار کر کے پہلے عمان جانا تھا اور پھر وادیٔ یرموک تک کا علاقہ آپ کی ذمہ داری تھی۔ نقشہ اول کا مطالعہ اس سلسلہ میں مددگار ثابت ہوگا۔

ج۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ

یزید رضی اللہ عنہ کے لشکر کو البتہ مکمل طور پر مدینہ میں تیار کیا گیا۔ آپ کے چھوٹے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ یہ صفر تیرہ ہجری کا واقعہ ہے اور واقدی نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی مدینہ شریف سے روانگی کے منظر کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو ہدایات دیں، جو انہی ہدایات کے مشابہ تھیں جو حضور پاک ﷺ لشکر کے سالاروں کو دیا کرتے تھے۔ کہ ''بے شک اللہ کے نام پر جہاد کرو، لیکن حد سے تجاوز مت کرنا اور نہ ہی عورتوں بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ اُٹھاؤ۔ بلکہ دشمن کی لاشوں کو بھی تہس نہس نہ کرنا، اور لوگوں کو مذہبی درسگاہوں اور عبادت گاہوں کے متولیوں کو بھی قتل نہ کرنا اور نہ ہی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنا، اس کے ساتھ ہی خلیفہ اوّل نے حکم دیا کہ جہاں پر جاؤ وہاں تین شرطیں دہرانا۔'' اوّل: ہماری باجگزاری اختیار کرو تا کہ علاقے میں اللہ کے احکام نافذ کریں۔ دوم: اگر یہ منظور نہیں تو جزیہ یا ٹیکس دو تا کہ ہم اُس رقم سے تمہارے علاقوں کا نظم و نسق ٹھیک

(۱) جلال مصطفےٰ صفحہ ۱۳۲، ۱۷۵، ۲۰۴، ۲۶۱، ۳۲۷ اور ۳۷۹ سے استفادہ کریں۔

کریں اور تمہاری حفاظت کر سکیں، اور یہ بھی منظور نہیں تو پھر تلوار فیصلہ کرے گی۔''

تمام مورخین کو اس سے اتفاق ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہر سپہ سالار کو ایسی ہدایات ضروری جاری کیں، تب ذمہ داری سونپی۔ البتہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے لشکر کے سلسلے میں ابو یوسف کے مطابق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دو میل تک اہل لشکر کے ساتھ پیدل چلتے گئے۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ بار بار گزارش کرتے تھے کہ وہ مراجعت کریں تو یارِ غار نے فرمایا: ''اے سالارِ لشکر! میں نے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے جب چلا جائے اور پاؤں خاک آلودہ ہوں تو ایسے پاؤں کبھی دوزخ میں نہ ڈالے جائیں گے۔''

سبحان اللہ یہ مجاہدین کی شان ہے۔ لہٰذا ہمیں ہمیشہ جہاد کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں کہ اللہ کے راستے پر نکلے ہیں۔ ''مادر وطن'' وغیرہ۔ قسم کی غیر اسلامی اصطلاحوں کو استعمال نہ کیا جائے۔ حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے علاقے یعنی معان، موتہ، عمان اور یرموک سے گزر کر دمشق جانا تھا لیکن وہ راستے ہی میں اُلجھ گئے۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

د۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح

پہلے بیان شدہ تین لشکروں اور اس لشکر کو شامل کر کے چاروں لشکروں کی طاقت کی کشش کا مرکز حضرت امین الامت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جلالِ مصطفےٰ میں آپ کا ذکر مبارک[1] کثرت سے کیا گیا ہے اور اس سلسلہ کی کتابوں کے حصہ اول کے پہلے باب میں وہ ذکر ہے جہاں آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی معیت میں سقیفہ بنی ساعدہ گئے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کے انتشار کو ختم کرا کر وحدت کی بنیاد رکھنے میں اپنے دونوں عظیم، ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا۔ آپ کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ ذاتی بہادری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور فوجی تدبیرات میں دنیا کے بڑے بڑے سپہ سالار آپ کے سامنے بچے نظر آتے ہیں۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالاروں میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے مقامات اتنے بلند ہیں کہ ہر ایک کی فوجی فراست پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ملک شام کے چاروں لشکروں کے سپہ سالارِ اعظم بھی تھے انہیں بھی وہی راستہ اختیار کرنا تھا جو شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ اور حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو کرنا تھا اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے دمشق پر قبضہ کے بعد آپ کو حمص کی طرف پیش قدمی کرنا تھی اور وہاں پر اگلے احکام کا انتظار کرنا تھا۔ ہر لشکر کی نفری تقریباً سات ہزار بتائی جاتی

(۱) جلالِ مصطفےٰ صفحہ ۳۳، ۵۹، ۷۳، ۹۴، ۲۳۰، ۳۲۹، ۳۳۰ اور ۳۳۱ سے استفادہ کریں۔

ہے۔اور چاروں لشکروں کے اپنے اپنے مقصود نقشہ اول پر دیئے گئے ہیں اور یہی مقصود تمام تر مہمات میں اُتم طور پر ذہن میں موجود رہیں گے کہ جنگ کے مقاصد کو ذہن میں رکھ کر ہی سب کچھ کیا جاتا ہے۔لیکن اُس کے لیے کچھ مقصود دیئے جاتے ہیں۔اسلام میں جنگ کا مقصد تو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے قانون کا نفاذ ہوتا ہے۔البتہ کاروائی کے لیے مقصود ضرور دیئے جاتے ہیں۔

بلادِ شام میں سپہ سالاروں کی کاروائیاں

نئے مقصودوں کے تحت اور اپنے لیے ایک اور جہاں پیدا کرنے کے لیے چاروں لشکر رواں دواں تھے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔پہلے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کا لشکر مدینہ شریف سے نکلا۔اُس سے چند دن یا ایک ہفتہ بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا دستہ نکلا۔باقی لشکروں کی کمک پہلے یا بعد میں رواں دواں ہوتی رہی۔اُردن کے علاقے میں اہل روم کوئی بڑا لشکر نہ رکھتے تھے اور اُن کے بڑے لشکر یرموک سے سے اوپر ہی تھے تا کہ ضرورت کے وقت فلسطین یا اُردن بھیجے جا سکیں لیکن اب اہل روم دو محاذوں پر مسلمانوں کی پیش قدمی دیکھ رہے تھے ایک طرف حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف حضرت یزید رضی اللہ عنہ تقریباً ایک ہی وقت پیش قدمی کر رہے تھے۔حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو گو اُردن میں ہی رہ جانا تھا لیکن چونکہ انہوں نے موتہ والا راستہ استعمال نہ کیا اس لیے وہ ریگستان سے ہوتے ہوئے یرموک کی وادی میں پہنچ گئے۔لیکن حضرت یزید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ دونوں اُلجھ گئے۔بلکہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو اپنا رُخ بھی تبدیل کرنا پڑا اور آپ بحیرۂ مردار کے ساتھ پہلے درہ مواب کے علاقے میں دشمن کے ساتھ اُلجھ گئے اُس دشمن کو تو آپ رضی اللہ عنہ نے غزہ یا فلسطین کے علاقوں کی طرف بھگا دیا لیکن آگے بھی دریائے اُردن کے ساتھ ساتھ آپ کا دشمن کے ساتھ تصادم ہوتا رہا۔لیکن جب حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ آگے نکل گئے تو حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے سامنے سے بھی دشمن خود بخود بھاگ گیا۔

اِسی دوران حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پہنچے تو انہوں نے بھی حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ والا راستہ اختیار کیا اور وہ بھی وادیٔ یرموک میں پہنچ گئے۔لیکن چونکہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ ابھی تک اُلجھے ہوئے تھے اور اُن کے دمشق کو فتح کرنے کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو آگے حمص کی طرف بڑھنا تھا۔اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے ساتھ وادیٔ یرموک میں رُک گئے۔البتہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ زیادہ پیش قدمی نہ کر سکے۔اُن کو جو خبریں موصول ہو رہی تھیں اُن کے حساب سے اُن کا آگے بڑھنا بڑا خطرناک تھا کہ اُس طرف لاتعداد دشمن کے اکٹھا ہونے کی خبریں مل رہی تھیں۔نقشہ اول سے ان حالات کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کا ایک قدم وادیٔ یرموک میں تھا اور دوسرا قدم پچھلی طرف عقابہ کی وادی میں تھا،جس کو عرباۃ کی وادی بھی کہتے ہیں۔

اہلِ روم کا ردِ عمل

ظاہر ہے کہ اہلِ روم، مسلمانوں کی اہلِ ایران کے ساتھ تمام تر جنگوں کے نتائج کا غور سے مطالعہ کر رہے ہوں گے۔ اور اب انہیں مسلمان، ایران کی جنگوں سے کچھ فارغ بھی نظر آئے ہوں گے۔ پھر مسلمان لشکروں کی بلادِ شام کی طرف پیش قدمی کوئی چھپی ہوئی بات بھی نہ تھی پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کا لشکر بھی ملک شام میں کافی اندر تک چلا گیا تھا اور اہلِ روم نے سخت ردِ عمل والی، کاروائی کی تھی۔ حکمت عملی کے تحت اہلِ روم کے لیے فلسطین کا ملک یا صوبہ، ملک شام سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس علاقے کے ساتھ اُن کا سمندر کے ذریعے بھی رابطہ تھا۔ روحانی یا مذہبی طور پر بھی فلسطین کا علاقہ زیادہ اہم تھا۔ اس لئے انہوں نے زیادہ فوج اسی علاقے میں مختلف مقامات پر رکھی ہوئی تھی جن میں بیسان، طبریہ، قساریہ، بیت المقدس، رملہ اور بیر شیبہ وغیرہ کے مقامات شامل تھے یہی وجہ تھی کہ ایسی فوج کے کسی دیکھ بھال والے دستے کے ساتھ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کا ٹکراؤ بحیرہ مردار سے نچلے علاقوں میں ہو گیا اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ اپنی منزل کی طرف تیزی کے ساتھ نہ جا سکے۔ ان جھڑپوں کے بعد اہلِ روم کی افواج نے فرار بھی مغرب یعنی فلسطین کی طرف کیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تو زیادہ آگے بڑھ بھی نہ سکے۔ ظاہر ہے کہ رومیوں کی طاقت کی کشش کا مرکز فلسطین اور بیت المقدس کا علاقہ تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس علاقے میں اکیلے تھے، وہ فکر مند ہوئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے امداد کی درخواست کی۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا تجزیہ

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یرموک سے تھوڑا آگے اور بصریٰ کے قلعہ سے نیچے جابیہ کے مقام تک پہنچ چکے تھے وہ ادھر ہی رُک گئے اور تینوں لشکروں یعنی اپنے لشکر کے علاوہ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکروں کی کمانڈ بھی سنبھال لی اور پیش قدمی روک دی، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خیال تھا کہ اہلِ روم اول تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر پر بھرپور وار کریں گے اور اُس کے بعد تینوں لشکروں کی عقب سے ناکہ بندی کر کے اُن پر بھی سامنے سے سخت حملہ کریں گے لیکن ایسا کرنے کے لیے کافی لشکروں اور کسی خاص تجویز کی ضرورت تھی۔ اور اس کے لی وقت چاہیے تھا۔ رومیوں کو کمک کی بھی امید تھی اور وہ اپنی طاقت کو بڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ فکر مند بالکل نہ تھے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی اپنے دوست ریگستان کو اپنے عقب میں رکھے ہوئے تھے اور باقی تینوں لشکر بھی اپنے دوست ریگستان کو اپنے دائیں اور عقب دونوں سمتوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ کسی جال میں تو نہ پھنس سکتے تھے لیکن وہ پہل کاری اہلِ روم کو نہیں دینا چاہتے تھے۔

ممکن طریقے

اب مسلمانوں کے لیے کئی ممکن طریقے تھے جو وہ اپنا سکتے تھے ایک یہ تھا کہ وہ یرموک سے طبریہ یا فحل کے راستے اپنا رُخ فلسطین کی طرف موڑ دیتے اور شمال کی طرف سے فلسطین کی ناکہ بندی کرتے اور جو فوج جنوبی فلسطین میں موجود تھی اُس کا قلع قمع کر دیتے۔ یہ مشکل تجویز تھی کیونکہ اوپر سے فسلطین میں داخل ہونے والی فوج پہاڑوں اور وادیوں میں محدود ہو کر رہ جاتی اور مکمل ناکہ بندی بھی مشکل تھی کیونکہ سمندری راستے تو رومیوں کے لیے کھلے تھے لیکن زیادہ خطرہ یہ تھا کہ اپنی فوج منتشر ہو جاتی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ تمام فوجیں اپنے ریگستانی علاقے میں چلی جاتیں اور رومی لشکروں کو اپنی طرف کھینچ کر ریگستان میں تباہ و برباد کیا جاتا اِس چال میں خطرہ یہ تھا کہ رومی شاید چال میں آتے، اور اپنے لئے لمبے عرصے تک غیر آباد علاقوں میں گزارا مشکل ہو جاتا اور یہ ایک پسپائی ہوتی کہ خلیفۂ اول اس کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ شام پر لشکر کشی ہو چکی تھی، اب پہل کاری ہاتھ میں رکھنا ضروری تھی، تاکہ دشمن کے لشکر کو ضرور برباد کیا جائے کہ معاملات آگے بڑھ سکیں۔

خلیفہ اوّل سے مشورہ

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اول کو حالات سے آگاہ کیا اور اپنی سوچ سے بھی کہ کیا مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ خلیفہ اول حالات کو بھانپ گئے۔ وہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان، تدبر حربی قابلیت وغیرہ سب چیزوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اُن کو معلوم تھا کہ امین الامت تمام معاملات اور حالات پر مکمل طور پر حاوی ہو سکیں گے، لیکن مجاہدین کو حوصلہ افزائی اور دشمن کی دل شکنی کے لیے اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایسے کام پر لگایا جا سکے تو وہ اور بہتر ہوگا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بڑی بڑی جنگوں میں فتوحات حاصل کر چکے تھے اُن کی حربی خوبیاں سب لوگوں پر ظاہر تھیں اور اس میں شک نہیں تھا کہ یارِ غار رضی اللہ عنہ تو حضرت امین الامت رضی اللہ عنہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اہل لشکر یا باقی اُمراء یہ بات نہ سمجھتے تھے کیونکہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُس وقت تک کسی بڑی جنگ میں کمانڈ نہ کی تھی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی نئی ذمہ داری

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان دنوں عراق میں بالکل فارغ بیٹھے تھے اور شام کی سرحدوں تک حربی مظاہرے کر چکے تھے۔ خلیفہ اوّل کی عراق کی فتوحات کی حکمت عملی کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا تھا بلکہ اس حکمت عملی کو اتنا آگے بڑھا دیا گیا تھا کہ عراق و شام دونوں محاذوں کے لشکر اور اکاذکا مجاہدین بھی ایک دوسرے کی "باہمی امداد" کے قابل ہو چکے تھے،

(۱) تاہم وہی بات اس زمانے میں بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں افریقہ میں رومیل کا نام کئی ڈویژنوں کے برابر ہو گیا تھا اور جنوب مشرقی ایشیا میں ایک جاپانی سپاہی ایک دستہ کے برابر ہو گیا تھا۔ دین فطرت کے مجاہد اگر اپنے فلسفہ پر عمل کریں تو وہ ہمیشہ سے قرآن پاک کے مطابق دس سپاہیوں کے برابر ہیں۔

اس لیے بہتر یہی تھا کہ اللہ کی تلوار، جو میان سے باہر آ چکی تھی اُس کو بھی استعمال کیا جائے۔ کیونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا نام از خود لاکھوں کے لشکر کے برابر ہو چکا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ جلدی سے شام کے محاذ پر پہنچ کر کمانڈ سنبھال لیں اور آدھا لشکر اپنے ساتھ شام لے جائیں اور آدھا لشکر حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث شیبانی کے پاس چھوڑ کر عراق کے محاذ کی سپہ سالاری اُن کو سونپ دیں۔ لشکر کی بانٹ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی الوداعی کو حصہ اول کے سولہویں باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بھی اطلاع دی کہ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا انتظار کریں وہ سپہ سالار اعظم ہوں گے اور اُن کے آنے تک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حفظ ماتقدم کے طور پر کوئی کارروائی کر سکتے ہیں۔ لیکن رومیوں کے ساتھ کسی فیصلہ کن لڑائی میں اپنے آپ کو نہ اُلجھائیں۔

تبصرہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عراق و ایران کے محاذ پر جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ کر چکے تھے، اُن کے لحاظ سے اب وقت آ گیا تھا کہ شام و فلسطین میں اہل روم کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کر لیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو تجاویز مرتب کیں وہ یہ تھیں کہ اُردن سے گزر کر پہلے شام کو فتح کیا جائے اور فلسطین کو بعد میں فتح کیا جائے۔ اِن ترجیحات کی وجوہات بیان کر دی گئی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ تین لشکر یرموک سے آگے گزر کر بصریٰ کے مقام کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ صرف حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا لشکر فلسطین کے جنوبی علاقے میں موجود تھا اور دشمن پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ موجودہ فوجی لحاظ سے اس کو (HOLDING) کی کارروائی کہیں گے۔ HOLDING اور CONTAINIC میں جو فرق ہے واضح ہے کہ CONTAIN میں بھی نگاہ تو کڑی رکھی جاتی ہے لیکن آگے سے زیادہ رکاوٹ پیدا کرنے کی شاید سکت نہ ہو۔ HOLDING میں کڑی نگاہ کے علاوہ آگے سے سخت رکاوٹ کی کارروائی بھی کی جاتی ہے اور یہ ایک متحرک دفاع بھی ہو سکتا ہے۔

یہاں موازنہ کے طور پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اہل روم مسلمانوں کی حکمت عملی اور تجاویز یا ساز پر اس طرح نہ ناچ رہے تھے جس طرح عراق کی مہم کے وقت ایرانیوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساز پر ناچنا شروع کر دیا تھا اور جس کی تفصیل کتاب اول میں دی جا چکی ہے۔ اہل روم ردعمل کے طور پر جو کارروائی کرنے کا ارادہ کر رہے تھے وہ بڑی مدبرانہ چال تھی اور مسلمانوں کے لیے بہت ہی پُر خطر تھی، چنانچہ مسلمانوں کو نہ صرف اپنی پیش قدمی کی تجاویز کو تبدیل کرنا پڑا، بلکہ شام کے محاذ کے لیے عراق سے کمک منگوانے کے علاوہ کمانڈ میں بھی تبدیلی کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی کارروائی جو اُنہوں نے رومیوں کے ردعمل کے خلاف کی، اگلے باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

اب سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اہل روم کی کاروائی مسلمانوں کی پیش قدمی کے خلاف ایک صحیح ردعمل تھا، اور مسلمانوں کی مزید کاروائی اور تجاویز میں تبدیلی رومیوں کے ردعمل کے خلاف ایک مزید صحیح ردعمل تھا۔ اور یہ مزید ردعمل اس وجہ سے ہوسکا کہ مسلمانوں کی تجاویز ''لچکدار'' تھیں اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو آنے والے وقت کے لیے لچکدار پالیسی کے تحت تیار کر رکھا ہوا تھا۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے تبدیلی کر لینے سے پالیسی کی ''لچکداری'' کی خصوصیت پہنا دینے کی زبانی جمع تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی، بامقصد تبدیلی اور بامقصد لچکداری (FLEXABILITY) کے لیے بڑی فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر مومن کی فراست کے تحت ہوا تو پھر سونے پر سہاگہ ہوتا ہے۔ فوجی حکمت عملی اور تدبیرات کا یہی بڑا اور صحیح فارمولا ہے کہ اول دشمنوں کو اپنے ساز پر نچانا اور ساتھ ہی دشمن کے تمام ردعملوں کے خلاف مزید منصوبہ بندی کے لیے تیار رہنا۔ علاوہ اُس تیاری کے لیے اپنے پاس ذرائع بھی موجود رکھنا اور اگر ہم اپنے آپ کو ایسے حالات کے لیے تیار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر یہ یاد رکھنا ہوگا:

آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے ''آئین جنگ'' شہر کا دستور ہو گیا
ہر شے ہوئی ذخیرہ لشکر میں منتقل شاہین گدائے دانہ عصفور ہو گیا
(اقبالؔ)

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آخر کار مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں شام اور فلسطین کو اسی طریقہ و تجویز کے تحت فتح کیا جس کا حضرت ابوبکر صدیقؓ تعین کر گئے تھے۔ یعنی حکمت عملی وہی رہی۔ صرف وقت زیادہ لگ گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دشمن کے ردعمل کو مزید ردعمل کے ذریعہ رد کرنا پڑا۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی دفعہ مفتوحہ علاقوں کو چھوڑنا پڑا۔ مثال کے طور پر یرموک کے مقام کو پہلے ہی مرحلہ میں چھوڑنا پڑا۔ اس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا لیکن یرموک کو بھی بعد میں دو دفعہ فتح کرنا پڑا اور یرموک پر قبضہ تو شاید تین دفعہ کرنا پڑا لیکن یرموک کے مقام پر جنگیں دو دفعہ ہوئیں۔ اگر پہلے مرحلہ پر یرموک کی وادی کے نزدیک بصریٰ کے مقام والی جنگ کو بھی شمار کر لیا جائے تو پھر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یرموک کے مقام پر جنگیں بھی تین ہوئیں۔ دو جنگیں البتہ رجب کے مہینہ میں ہوئیں۔ ایک رجب تیرہ ہجری میں اور دوسری رجب پندرہ ہجری میں۔ اس لئے اُن دو جنگوں کو اکثر لوگوں نے ایک جنگ بنا کر پیش کیا۔

ہم جس نکتہ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ دشمن کے ردعمل کو رد کرنے کے لیے تجاویز میں جو تبدیلیاں آئیں اور حکمت عملی کے تحت جن مفتوحہ علاقوں کو چھوڑنا پڑا، اُن سب کاروائیوں کو نقشہ اول، دوم اور سوم کی مدد سے سمجھنے کی ضرورت ہے اور ہر مقام کے محل وقوع کو یاد رکھنا ہوگا تو تب ہی واقعات کھل کر سامنے آئیں گے۔ ورنہ ہم یا تو پرانے زمانے کے مورخوں کی طرح بھول بھلیوں میں اُلجھ جائیں گے، یا کئی نئے مبصرین کی طرح جنگ کو ایک جنگی مشق بنا کر

سارے مقامات کو ویسے ہی فتح کر لیں گے اور زماں و مکاں والے پہلو کو بھول جائیں گے۔

اسباق

۱۔ جو لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کو مومن کی فراست سے مطالعہ کریں گے۔ اُن کے سامنے ایسے راز کھل کر آشکارا ہوں گے کہ وہ خود بھی حیران ہو جائیں گے اور یارِ غار رضی اللہ عنہ کی شان کے بارے میں اُن کو کچھ سوجھ بوجھ حاصل ہونا شروع ہو جائے گی۔ ہمارے آقا ﷺ فرما چکے ہیں کہ "وہ ﷺ اپنے رفقا میں سے سب کے احسانات کا بدلہ چکا چکے ہیں لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے احسانات کا بدلہ نہ دے سکے۔" یہ نکتہ اتنا دقیق اور عمیق ہے کہ ہم گنہگاروں کے لیے اس کو سمجھانا ناممکن ہے کہ حضور پاک ﷺ جو سب کچھ اپنی نگاہ سے کر سکتے تھے اور اُن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ تھا، اس معاملہ میں آ کر کیوں رُک گئے۔ احسانات کا بدلہ دینا نہ چاہتے تھے یا کیا راز تھا۔ تو راز تو راز دان ہی سمجھ سکتا ہے اور حضور پاک ﷺ کی شان کو جس طرح یارِ غار رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے وہ بھی ایک راز تھا اور یہ راز جس سینہ میں راز کے طور پر رہ سکا اس کا احسان بھی راز ہے۔ یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے کہ علم کے شہر کا دروازہ ہوتے ہوئے بھی بعض دفعہ مشیت ایزدی کے تحت خاموش ہو جاتے تھے۔ یا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تھے جن کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ حضور پاک ﷺ کبھی وفات پا کر اُن کی آنکھوں سے اوجھل بھی ہو سکتے ہیں۔ یا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے جن کی شان میں خود ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا کہ بخدا آج اگر میرے گھر کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں دیتا۔ اب حضور پاک ﷺ کے ان عظیم رُفقا رضی اللہ عنہم کے بارے میں علامہ اقبال ؒ کے شعر کا یہ مصرع ہمیشہ یاد رہے کہ:

"تو اُسے پیمانہِ امروز و فردا سے نہ ناپ"

۲۔ تو سبق یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ کے رفقاء کی سیرتوں میں اپنے لیے نشانِ راہ کو تلاش کرنا چاہیے۔ فوجی حکمت عملی۔ مقاصد کا تعین۔ مقصودوں کی نشان دہی، لچکدار پالیسی۔ مکمل ذرائع کو اکٹھا اور پاس رکھنا۔ تیز پیش قدمی۔ چوکنا رہنا۔ بروقت کاروائی کرنا۔ تن من کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات کے تابع رکھنا اور ہر وقت یہ خیال یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام کو بلند کرنے میں لگے رہیں۔ اور پھر اپنی ذات کو ان اصولوں پر قربان کر دینا۔ ہمارے لیے سینکڑوں عملی سبق ہیں۔ جو لوگ صرف علم کے چکر میں رہتے ہیں یا عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ اُن کے سامنے بڑی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے "دلِ بینا" طلب کرنا چاہیے اور یہ حضور پاک ﷺ کی غلامی سے حاصل ہوتا ہے۔ بقول علامہ محمد اقبال ؒ:

عقل گو آستاں سے دور نہیں ۔۔۔ اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب ۔۔۔ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!
علم میں بھی سرور ہے لیکن ۔۔۔ یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

۳۔اکثر راوی اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جو دو حج ہوئے اُن میں گیارہ ہجری میں حج کے موقع پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا گیا اور بارہ ہجری میں حج کے موقع پر آپ خود خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ بلکہ وہاں پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی یاد میں خوب روئے بھی۔ ظاہر ہے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جنہوں نے پوشیدگی میں حج کیا، اُن کی خلیفہ اول کے ساتھ پوشیدگی میں کوئی ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔ کہ اُس کے تین ماہ بعد صفر تیرہ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شام میں بھیج دیا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے نام کو استعمال کیا۔ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ صحیح کارروائی ہے۔ بلکہ اس کے لیے امن کے زمانے میں تیاری کی ضرورت ہے۔ اول نام اللہ جل جلالہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے لیکن کچھ اللہ جل جلالہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائیوں کو تیار کرنا ضروری ہوتا ہے اور امن کے زمانے میں اُن کے نام سے دشمن کے دلوں میں ہیبت ڈالی جاتی ہے۔ مضمون بڑا وسیع ہے یہاں اشارہ کافی رہے گا۔

سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ ملت ما سازگار آمد
(اقبالؔ)

تیسرا باب

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا شام کی طرف کوچ (نقشہ دوم)

پہلی کتاب کے سولھویں باب میں فاتحین عراق کا ملک عراق کوالوداع کہنے کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے، یورپ کے مبصرین اور فوجی ماہرین فتح کے اختتامی مقام کو نہ تلاش کر سکے۔ کلاسوٹز، لیڈل ہاوٹ فلر وغیرہ تمام نئے اور پرانے ماہرین کی تمام تر کوششیں یہاں آ کر ختم وہ جاتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے، فتح سے شکست نکلتی ہے۔ کوئی فتح کے اثرات و ثمرات کے غلط استعمال کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن دین فطرت میں فتح کا اختتامی مقام موجود رہے گا کہ قافلہ حق رواں دواں ہے:

دمادم دم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے پیدا رم زندگی (اقبالؔ)

اسلام میں ایک فتح سے دوسری فتح پیدا ہوتی ہے، اس میں ملک اور علاقے فتح نہیں کئے جاتے بلکہ لوگوں کے دل فتح کئے جاتے ہیں۔ ملکوں کے نام تو صرف پہچان کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ اسلام کسی جغرافیائی حدود کا قائل نہیں اور نہ ہی اسلام میں جغرافیائی وطن کا کوئی تصور ہے۔ وطن کا تصور صرف اس حد تک ہے کہ وہ ایک مستقر ہے جہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کرنے والے رہتے ہیں۔ لیکن ایسا مستقر جہاں اللہ کی فوج رہتی ہو اور دنیا و جہان والے اُن کا نام سن کر کانپ جائیں۔ اسلام میں ایسے جغرافیائی حدود والے وطن کا کوئی تصور نہیں جس کی دھرتی کی پوجا کی جائے اور وطن کو اللہ کا شریک بنا دیں۔ اور "حب الوطنی" کے چکر میں ایسی بدعتوں کا شکار ہو جائیں کہ اسلام کی بنیادی اصولوں سے ہی ہٹ جائیں اور علامہ فرما گئے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور پھر یوں ہمارے لیے صراطِ مستقیم کی بھی نشاندہی کرتے ہیں:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

بہر حال ہم حصہ اول میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت خالد ﷜ اپنا لشکر آدھا آدھا بانٹ چکے تھے اور حضرت مثنیٰ ﷜ کو عراق کی سپہ سالاری بھی سونپ چکے تھے۔ لیکن بنو بکر کا یہ بیٹا اور اسلام کا ایک عظیم فرزند ار جمند اللہ کی تلوار سے الگ نہ ہونا چاہتا تھا۔ اُس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے محسن اور سپہ سالار سے اِس دنیا کی زندگی میں آخری دفعہ کہاں پر بغلگیر ہو۔ قارئین! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ابھی چند اور لمحے اسلام کے اِن دو عظیم فرزندوں کے ذکر جمیل سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کریں۔

حضرت خالد ﷜ نے ابھی تک یہ فیصلہ نہ کیا تھا کہ وہ شام کے لیے کونسا راستہ اختیار کریں گے حیرہ سے دریا کے ساتھ ساتھ چل کر فراض کے مقام تک سے حضرت خالد ﷜ خود اور اُن کے لشکر کے کئی مجاہد واقف تھے اور فراض کی فتح کا ذکر پہلی کتاب کے پندرھویں باب میں ہو چکا ہے۔ فراض کے مقام سے آگے کسی رہنما کی ضرورت پڑتی۔ حیرہ سے دومۃ الجندل والا علاقہ اور راستہ بھی حضرت خالد ﷜ اور اُن کے مجاہدین نے دیکھا ہوا تھا کہ حصہ اول کے تیرھویں باب میں دومۃ الجندل کی مہم کا ذکر ہے۔ دومۃ الجندل سے تبوک تک کا علاقہ بھی حضرت خالد ﷜، حضور پاک ﷺ کی تبوک کی مہم[1] کے دوران دیکھ چکے تھے۔ ان تمام راستوں کو سمجھنے کے لیے نقشۂ دوم سے استفادہ کریں، تو ظاہر ہوگا کہ دومۃ الجندل والا راستہ بہت لمبا تھا اور اُس راستے سے حضرت خالد ﷜ کی پیش قدمی کسی فوجی اہمیت کی حامل نہ ہوتی بلکہ ایسا نظر آتا کہ حضرت خالد ﷜ بھی مدینہ شریف سے ایک اور کمک والا لشکر لے آئے ہیں۔

جنرل گلب کا تجزیہ

جنرل گلب نے اپنی کتاب ''عربوں کی فتوحات'' میں حضرت خالد ﷜ کے لیے جو دومۃ الجندل والے راستے کا تعین کیا ہے، وہ دومۃ الجندل اور موتہ کے درمیان ایک قراقر کے نام کے گاؤں کی وجہ سے غلطی کر گیا ہے۔ وہ قراقر جو حضرت خالد ﷜ کے راستہ میں آتا تھا اور نقشہ دوم میں دکھایا گیا ہے وہ حیرہ سے صرف سو یا ڈیڑھ سو میل ہے اور جو قراقر جنرل گلب نے سمجھ لیا وہ حیرہ سے چار سو میل سے بھی زیادہ دور ہے۔ پھر تمام مورخین متفق ہیں کہ حضرت مثنیٰ ﷜ حضرت خالد ﷜ کے ساتھ قراقر تک آئے، تو دومۃ الجندل سے بھی دو سو میل دور اتنا سفر حضرت مثنیٰ ﷜ کیسے کر سکتے تھے، جب عراق میں اُن کی ذمہ داری تھی۔ اوپر والا قراقر تو مضیخ اور فراض کے درمیان تھا اور حضرت مثنیٰ ﷜ کی عملداری میں آتا تھا۔ اور اگر حضرت خالد ﷜ دومۃ الجندل والا راستہ استعمال کرتے تو وہاں سے تبوک اور موتہ کی طرف کوچ کرتے اور جنرل گلب نے جو قراقر سے شمال کی طرف حضرت خالد ﷜ کو سوئی اور پامریا کی طرف کوچ کرا دیا وہ جبل ہولرن کے مشرقی صحرا میں تھا اور وہ اُس نے اس لیے کیا کہ حضرت خالد ﷜ دمشق کے پاس سے شمال سے آ کر جنوب کی

(۱) تفصیل کے لیے جلالِ مصطفیٰ کے صفحہ ۲۶۵ اور ۲۷۲ سے استفادہ کریں۔

طرف کوچ کر رہے تھے۔ جنرل گلب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۳ پر جو نقشہ بنایا ہے اُس کا فاصلہ نو سو میل بنتا ہے اور اتنا لمبا سفر کرنے کے لیے کم از کم ڈیڑھ ماہ کی مدت درکار تھی گو جنرل گلب اُس علاقہ میں رہ چکا ہے اور زماں و مکاں کے بارے میں اس کے دوسرے تجزیئے کافی صحیح ہیں لیکن یہاں وہ بھول گیا اور چونکہ وہ تجزیہ کی تفصیل میں نہیں جاتا تھا اس لیے یہاں غلطی ہوگئی۔

ممکن راستوں کے جائزے

فراض والا راستہ مقابلتاً چھوٹا تھا لیکن اس راستے سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ ملک شام کی ایسی حدود میں داخل ہو جاتے کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا کہ کس جگہ کتنے دشمن کے ساتھ واسطہ پڑے گا اور دشمن کی فوجی چوکیاں کہاں کہاں ہوں گی۔ یہ سب معلوم کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ بہر حال حضرت خالد رضی اللہ عنہ ملک شام میں شمال ہی کی کسی سمت سے داخل ہونا چاہتے تھے کہ اُن کے داخلے سے بھی فوجی اہمیت کی کوئی افادیت حاصل ہو جائے یعنی کوچ یا حرکت کے بھی کچھ ''عطیات'' یا ''ثمرات'' مل جائیں لیکن ایسے ثمرات حاصل کرتے وقت اپنے بڑے مقصد کو اُتم طور پر اپنے ذہن میں رکھنا پڑتا ہے مگر اصل مقصد یہ تھا کہ تیزی سے پیش قدمی کر کے مسلمان لشکروں کی شام میں کمانڈ سنبھالنا اور اس لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کسی ''درمیانے'' راستہ کی تلاش میں تھے اور کچھ اچنبھے کی کاروائی بھی کرنا چاہتے تھے کہ ملک شام میں دشمنوں کو بھی حیران کر دیں اور اپنوں کے پاس بھی ایسے وقت پہنچیں اور ایسی جگہ پر جا کر جمگھٹ کریں کہ مسلمان مجاہدین خوش ہو کر نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کر دیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں کمک پہنچائی جس کے دیدار سے ان کی لذت شوق کے سامنے تمام علم بودے نظر آئیں۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے
لذتِ شوق بھی ہے نعمت دیدار بھی ہے

(اقبالؔ)

درمیان والا راستہ

چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حیرہ سے دریا کے ساتھ ساتھ سندوبیہ جانے کی بجائے، ریگستان کے بیچ میں عین التمر کا رُخ کیا، ایرانیوں سے اپنی کاروائی یا مقصد کو چھپانا بھی مقصود تھا گو ایسا کچھ عرصہ کے لیے ہو سکتا تھا۔ بہر حال حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ آپ جب عین التمر پہنچے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دومۃ الجندل والے راستہ کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ قارئین کے لیے بہتر رہے گا کہ وہ ساتھ ہی نقشہ دوم سے استفادہ کریں جس میں تینوں راستے الگ

الگ دکھائے گئے ہیں۔ درمیان والے راستے کونمبرایک راستہ کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ دومۃ الجندل والے کونمبر دو کے طور پر اور فراض والے کونمبر تین کے طور پر۔ اس سے آگے ہم زیادہ بیان درمیان والے راستہ کا ہی کریں گے کہ اللہ کی تلوار کے مصنف جنرل اکرم کے مطابق بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے درمیان والا راستہ ہی اختیار کیا۔

عین التمر سے قراقر تک ایک ریگستانی راستہ جاتا تھا اور قراقر سے سوی تک آگے پانچ دن کا سفر تھا۔ سوی کے قریب ایک چشمہ تھا اور اُس کے بعد سفر آسان تھا۔ گو قراقر تک اپنا مفتوحہ علاقہ تھا لیکن مئی کا مہینہ تھا اور شاید اُس سال بارشیں بھی کم ہوئی تھیں۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کسی رہنما کی تلاش میں تھے آخر قبیلہ طے کے رافع بن عمیرہ[1] رضی اللہ عنہ نے درمیانی راستوں کی کچھ نشاندہی کی۔ حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ عین التمر سے سیدھا قراقر جانے کی بجائے مضیخ اور عمیج القصر والا راستہ اختیار کیا جائے کہ اُس راستے میں پانی کی کوئی تکلیف نہ ہوگی اور یہ بھی چار پانچ دن کا سفر تھا اور اس طرح قراقر پہنچ کر مکمل تیاری کے ساتھ سوی کا سفر کیا جائے کہ وہ اجاڑ اور بیابان علاقے کا سفر ہے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ ان کا دل نہ چاہتا تھا کہ اپنے عظیم رہنما سے الگ ہوں۔ پہلے مضیخ یا قصر سے الگ ہونے کا ارادہ تھا لیکن آخر قراقر تک وہ بھی ساتھ ہی رہے کہ اللہ کی تلوار رضی اللہ عنہ اور مجاہدین کے ریگستان میں داخل ہونے کے نظارہ سے لطف اندوز ہوں اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی نظر اُس قافلے کے سالار پر جمی ہوئی تھی کہ آپ اب اُن کو آخری بار دیکھ رہے تھے:

منزلِ راہرواں دور بھی ہے دشوار بھی ہے
کوئی اِس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے
(اقبالؔ)

اسلام کے عظیم فرزندوں کی الوداعی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ یا عراق کے سارے مجاہدین نے ایک دوسرے کو کیسے الوداع کہا۔ اس کی جھلک پہلی کتاب کے سولہویں باب میں دی جا چکی ہے۔

مجاہدین کا ایک دوسرے سے محاذِ جنگ پر سے الگ ہونا، ایک ایسا بیان ہے، جس کو کسی قلم سے لکھنا کسی کے بس کی بات نہیں ہمارے مورخین جنہوں نے سنی سنائی باتوں کے بعد تاریخیں لکھ دیں اور خود یہ نظارہ نہ دیکھا اور نہ عملی طور پر ایسے واقعات میں شرکت کی، وہ تو اس نظارہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جناب حافظ شیرازی نے اپنے دیوان میں اور میاں محمد بخش ⭘ نے ''سیف الملوک'' میں بلبل اور پھول کی ایک کہانی لکھی ہے۔ اُس میں اِس محبت اور جدائی کی شرطِ قدیم کا کچھ تصور باندھا ہے، اور راقم کو ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کی فائر بندی کے دوران اپنے ساتھیوں سے الگ ہونے کا

(۱) رافع رضی اللہ عنہ بن عمیرہ اس مہم کے بعد ہماری تاریخ کا ایک درخشاں ستارہ بن گئے، اور اُن کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی دامادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

ایک واقعہ یاد ہے۔تو اس مضمون کا یہاں ختم کرنا ہی بہتر ہوگا۔ کہ اس وقت زبان گنگ ہوتی ہے اور آنکھیں رواں ہوتی ہیں۔اب آنکھوں کے رواں ہونے کی کہانی کون سمجھے۔

چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قراقر کے مقام پر اگلے پانچ دنوں کے سفر کی تیاری کی۔روایت ہے کہ اونٹوں کو کچھ دن پیاسا رکھ کر ان کو خوب پانی پلا دیا۔اور اس کے بعد ان کے ہونٹ کاٹ کر باندھ دیئے گئے کہ وہ جگالی نہ کر سکیں، اور ان کی دُمیں کھول دی گئیں۔کہتے ہیں کہ اونٹ کے پیٹ میں پانی کے لیے الگ جگہ ہوتی ہے اور اگر وہ جگالی نہ کرے اور اس کو ذبح کریں تو اُس کے پیٹ میں سے پانی الگ جگہ سے نکال سکتے ہیں۔اور ہر پڑاؤ پر اہل لشکر کچھ اونٹوں کو ذبح کرتے تھے۔اور اُن کے پیٹ کا پانی گھوڑوں کو پلا دیتے تھے۔

جنرل گلب کے لحاظ سے یہ طریقہ ریگستان میں اب بھی کیا جاتا ہے اور ایسا ممکن ہے لیکن اللہ کی تلوار کے مصنف جنرل اکرم کے لحاظ سے یہ ناممکن ہے کہ اونٹ کے پیٹ میں پانی کے لیے کوئی الگ جگہ ہے ہم اِس بحث کو آگے نہ بڑھائیں گے اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ کچھ اونٹوں پر پانی لاد دیا ہوگا جو شام کو اُتار کر کے گھوڑوں اور آدمیوں کو پلا دیتے ہوں گے۔اور اُن اونٹوں کو بھی ذبح کر کے کھا جاتے ہوں گے اور اونٹوں کو پانی نہ پلاتے ہوں گے کہ ان کے ہونٹ کٹے ہوئے تھے اور وہ جگالی نہ کر سکتے ہوں گے اور وہ بغیر پانی پیئے پانچ دن گزارہ کر گئے ہوں گے۔ جنرل گلب نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ریگستان میں بدوؤں کے ساتھ گزارا تھا۔اُس کے مشاہدہ کو رد کرنا بھی مشکل ہے۔

سوئیٰ کا مقام

چار دن کی اُن تھک کوشش کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر سوئ سے ایک منزل پر پہنچا۔ایک اور مجاہد حضرت محرز بن حریش رضی اللہ عنہ کو بھی علاقے کی کچھ واقفیت تھی انہوں نے مشورہ دیا کہ صبح کے تارے کو اپنی دائیں طرف والے اَبرو کے اوپر رکھ کر سفر شروع کیا جائے اور پھر دن کے وقت اسی سمت کے آگے نشانات مقرر کر کے سفر کر رواں دواں رکھا جائے تو ضرور سوئ پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ یہی طریقہ اپنایا گیا سوئ سے ایک منزل پر پہنچے تو رافع رضی اللہ عنہ کو پانی تلاش کرنے کے لیے کہا گیا اُن کی آنکھیں چندھیا چکی تھیں۔انہوں نے کہا کہ دو پستان نما ٹیلوں کو تلاش کیا جائے۔وہ ٹیلے مل گئے تو رافع رضی اللہ عنہ جنہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ ہوئی تھی، کہنے لگے کہ مجھے ادھر لے چلو اور وہاں پہنچ کر کہا کہ اب ادھر ایک جھاڑی نما درخت تلاش کرو۔سب نے کہا کہ ادھر کوئی درخت نہیں ہے۔رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تلاش کرو کہ ادھر سے کبھی کوئی درخت کاٹا گیا ہو اور اس کے تنے کا کوئی حصہ موجود ہو۔

آخر بڑی تلاش کے بعد ایک درخت کا تنا مل گیا۔رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے ادھر لے چلو اور جب رافع رضی اللہ عنہ اُدھر پہنچے تو کہنے لگے یہاں سے ریت ہٹاؤ۔ پہلے ریت ہٹائی تو نیچے سے گیلی مٹی آئی لیکن زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہاں

سے پانی فوارے کی طرح بہہ نکلا جس کو دیکھ کر تمام مجاہدین نے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کی۔ دراصل ریت کے کسی طوفان کی وجہ سے چشمہ کے اوپر ریت کی تہہ جم چکی تھی اب ریت ہٹائی گئی تو تمام اہل لشکر نے خوب پانی پیا اور جانوروں کو بھی پلایا۔ رافع رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے عرض کی ''اے سالار! آج سے تیس سال پہلے میں چند سال کا بچہ تھا کہ اپنے والد کے ساتھ یہاں سے گزرا تھا۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کے مشاہدہ اور یادداشت کی داد دی اور اس کے لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سمیت تمام مجاہدین نے دعا کی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا اسلامی لشکروں کے ساتھ رابطہ

اب ایک دن کے سفر کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ سرزمین شام میں داخل ہو گئے۔ اُدھر باقی اسلامی لشکر بھی یرموک کے علاقے میں بصریٰ کے نزدیک دیرہ اور جابیہ کے علاقوں میں پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک تیز رفتار شتر سوار کو اسلامی لشکروں کی تلاش کے لیے بھیجا تا کہ وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کے کوچ کی سمت اور باقی حالات سے آگاہ کرے اور اُس قاصد کو یہ پیغام بھی دیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مرج الراحت والا راستہ استعمال کریں گے اور مسلمان اُنکے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ نقشہ دوم سے ظاہر ہوگا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پہلے شمال کی سمت کوش کر رہے تھے۔ تدمیر یا قریاطین سے اُن کا رُخ جنوب کی طرف تبدیل ہونا تھا لیکن اُن کی حرکت کی شکل وصورت کو پھر بھی ایسا رہنا تھا کہ ریگستان ان کے بازو پر رہے۔ وہ ملک شام کے اندر دور دور تک گھس جانے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ پس جہاں کہیں راستہ میں دشمن ملا تو اُس کا قلع قمع ضرور کیا۔

اُن کی فتوحات کی خبریں دور دور تک پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے راستہ میں قبیلہ برا کی بستی مضیخ کو سر کیا اور الثمر کے مقام پر چھاپہ مارا آگے رجانتیں، علمین اور الکلب کے مقامات کو سر کیا۔ دمشق کی وادی پر خالی نگاہ ڈالی کہ آگے مرج الراحت کے مقام سے انہوں نے ریگستان کی بجائے جبل ہورن یا جبل دروز کے علاقے میں داخل ہونا تھا۔ یہ خطرناک علاقہ تھا کہ وہاں سے لاوا نکلتا تھا۔ بہر حال مرج الراحت سے گزرتے وقت حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک اونچے مقام پر اپنے علم کو گاڑ دیا۔ بعد میں مسلمان مجاہدین جب دوسری اور تیسری بار وہاں سے گزرے تو انکو یاد تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پہلی دفعہ فلاں مقام پر علم گاڑا تھا چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس علم کا نام العقاب تھا تو اس جگہ کا نام آج بھی سنیۃ العقاب ہے۔ روایت ہے کہ یہ وہی علم تھا جو بدر کی جنگ کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اُٹھایا ہوا تھا۔ اس کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا علم بھی کہتے تھے اور اس کا رنگ سیاہ تھا۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے جھنڈوں کے رنگ اکثر سیاہ ہی ہوتے تھے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ٹوپی

مورخین ،العقاب کے علاوہ ایک سرخ رنگ کی ٹوپی کا بھی ذکر کرتے ہیں جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سرزمین شام میں داخل ہوتے وقت پہنی ہوئی تھی۔اس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے تراشے ہوئے بال مبارک سلا رکھے تھے۔روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بال کٹوا رہے تھے اور جو بال گرتے جاتے تھے۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُن کو اٹھا لیتے تھے۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے ابا سلیمان!ان بالوں کا کیا کرو گے؟''تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کی:''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سی کر اپنی سر کی ٹوپی میں رکھوں گا۔''حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسکرادیئے اور فرمایا:''اے ابا سلیمان!جب تک یہ ٹوپی آپ کے سر پر رہے گی،آپ کو کبھی بھی کوئی شکست نہ دے سکے گا۔''

اس علم اور ٹوپی کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ قارئین اس پہلو کو سمجھیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سرزمین شام میں کیا کیا ہتھیار ساتھ لے کر داخل ہو رہے تھے اِس ٹوپی کا مفصل ذکر تو آگے جنگ یرموک کے دوران آئے گا،لیکن ہم جس نکتہ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی ہی سب کچھ ہے اور ابلیس کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے عقیدوں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی والی بات کو ختم کر دے۔علامہ اقبال ہ کی مشہور نظم جس کا عنوان ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام ہے''وہاں شیطان اپنے پیروکاروں کو یہ حکم دیتا ہے:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا | روحِ محمد اُس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کر فرنگی تخیلات | اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

مرج الراحت کا تصادم

حضرت خالد رضی اللہ عنہ رواں دواں تھے،حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا مرج الراحت کے مقام پر دشمن کے ساتھ تصادم ہو گیا۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دشمن کو بھگا دیا لیکن اُس کا تعاقب نہ کیا۔واقدی نے اس تصادم کو لڑائی کی شکل دے کر ایک لمبی چوڑی کہانی بنا دیا۔اللہ کی تلوار کے مصنف جنرل اکرم نے واقدی کے اس بیان کو دمشق کی فتح اور محاصرے سے پہلے مرج الراحت کی بجائے مرج الصفر کی جنگ کا نام دے دیا ہے کہ ان کا خیال ہے کہ یہ جنگ اجنادین کی فتح کے بعد اور یرموک کی پہلی جنگ کے بعد ہوئی۔مرج کے دو مقامات ہیں۔ایک دمشق کے جنوب میں ہے جو زرد رنگ والی زمین ہے۔مورخین نے مرج کے واقعات کے سلسلے میں اس لیے کچھ معاملات کو آپس میں ملا ضرور دیا ہے۔اس لیے جنرل اکرم کے تجزیہ پر تبصرہ تو ہم پچھلے باب میں اجنادین کی فتح کے بعد اس جگہ کریں گے جہاں پر جنرل موصوف نے اس کا ذکر کیا ہے لیکن جنرل جان گلب کے تجزیہ پر تبصرہ یہاں پر ضروری ہے۔

تبصرہ

جنرل جان گلب رقم طراز ہے کہ ''حضرت خالد ﷛ نے مرج الراحت کے مقام پر ایسٹر کے روز ۶۳۴ عیسوی میں حملہ کیا۔'' یہاں تک تو بات صحیح ہے کہ حضرت خالد ﷛ صفر یا ربیع الاول بارہ ہجری میں یہ کوچ کر رہے تھے اور اپریل کا مہینہ تھا۔ جس میں ایسٹر کا دن آتا ہے۔ لیکن آگے جنرل گلب لکھتا ہے کہ ''مسلمان مورخین نے خواہ مخواہ اس لڑائی کو مسلمانوں کی فتح بنا دیا۔ اگر حضرت خالد ﷛ کو فتح ہوتی تو وہ عیسائیوں کا تعاقب کرتے اور مغرب کی طرف مڑ کر دمشق کی وادی سے تمام رومی فوج کا قلع قمع کر دیتے۔'' جنرل گلب تعصب سے ایسا اندھا ہوا کہ اس تجزیہ میں اپنی فوجی ذہانت بھی کھو بیٹھا۔ حضرت خالد ﷛ کے سامنے ایک مقصد تھا کہ وہ جلد سے جلد مسلمان مجاہدین کی کمانڈ سنبھال لیں اور راستے میں جو ثمرات ملتے جائیں وہ بھی حاصل کرتے جائیں۔ وہ مغرب کی طرف پیش قدمی کر کے اپنا وقت کیوں ضائع کرتے اس لیے ہم اپنے پہلے بیان پر قائم ہیں کہ معمولی تصادم ہوا اور حضرت خالد ﷛ نے مرج الراحت کے مقام پر دشمن پر دباؤ ڈالا اور اُس کے بعد اپنے اصلی مقصد کے لیے رواں دواں ہو گئے۔

حضرت ابوعبیدہ ﷛ کا ردعمل یا کاروائی

جب حضرت ابوعبیدہ کو خبر ملی کہ حضرت خالد ﷛ کس طرف سے پیش قدمی کر رہے ہیں تو انہوں نے بھی شمال کی طرف چار ہزار کا ایک لشکر روانہ کیا کہ وہ حضرت خالد ﷛ کے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ گو مسلمانوں کا اس طرف آگے بڑھ کر مقامات فتح کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن حضرت خالد ﷛ کی اُس سمت سے پیش قدمی کو طاقت بہم پہنچانا ضروری تھا۔ یہ ایک فوجی عمل ہوتا ہے جو ہر سطح پر رابطے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ راقم نے اس عمل کو دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں ہر سطح پر دیکھا کہ ایسا کرنے سے بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔

جن مورخین یا مبصرین نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جب حضرت خالد ﷛ بصریٰ اور وہاں پر حضرت شرجیل ﷛ کا لشکر، بصریٰ کے لشکر کے ساتھ اُلجھا ہوا تھا اور حضرت خالد ﷛ نے یہ بات پسند نہ کیا اور کہا کہ ''وہ کیسے کمانڈر ہیں کہ دشمن کے حالات کو جانے بغیر خواہ مخواہ اپنی نفری کو الجھا دیتے ہیں۔'' تو یہ سب تجزیئے اور بیانات ان مبصرین کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔ حضرت شرجیل ﷛ کو چار ہزار کی نفری کے ساتھ حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے بھیجا تھا جب حضرت شرجیل ﷛ بصریٰ پہنچے تو وہاں پر کافی دشمن موجود تھا اس لیے انہوں نے دشمن پر نظر رکھی۔ اور چند دیکھ بھال والے دستے مزید آگے بھیج دیئے کہ حضرت خالد ﷛ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کریں۔ دشمن کی تعداد تو کافی زیادہ تھی لیکن وہ کچھ دبک گئے اور انہوں نے قلعہ بند ہونا پسند کیا۔ لیکن ایک آدھ دن کے بعد جب اُن کو پتہ چلا کہ

مسلمانوں کی نفری کم ہے تو انہوں نے قلعہ سے باہر نکل کر حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ حضرت خالد کو یہ خبر مل چکی تھی، وہ بھی آ کر جنگ میں شریک ہو گئے۔

مسلمان سپہ سالاروں کی فراست کی غیر متعصب انسان داد دئے بغیر نہ رہ سکے گا اور ہم گنہگاروں پر تو یہ سب کچھ پڑھ کر رقت طاری ہو جاتی ہے کہ اتنے دور دراز اور اتنے لمبے سفر کے باوجود مسلمان مجاہدین کے لشکر کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کر لیتے تھے۔ جن لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا ہوا اُن کو معلوم ہے کہ محاذ جنگ یا میدانِ جنگ میں باہمی رابطہ قائم رکھنا ایک بڑا مشکل عمل ہوتا ہے۔ اور یہاں تو یہ حالت تھی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بصریٰ پہنچنے کے دوسرے دن حضرت امین الامت حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ایک گھوڑے پر سوار، وہ علم اُٹھائے ہوئے میدانِ جنگ میں داخل ہوئے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خیبر کے مقام پر عطا کیا تھا، اس کا رنگ زرد تھا۔

ان مختصر بیانات کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم صرف قارئین کی توجہ اس طرف دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے یہ دو عظیم سپہ سالار جب ایک دوسرے سے محاذ جنگ اور میدانِ جنگ میں ملتے ہیں تو دونوں کے پاس وہ علم تھے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو عطا کئے تھے۔ اس سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان والی بات کو یاد رکھنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہ رابطہ کا نظام کتنا بلند ترین تھا۔ لہٰذا ہم سب واقعات کو تسلسل سے بیان کرتے ہیں۔

بصریٰ کی لڑائی

تینوں اسلامی لشکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی عملداری میں جابیہ اور دریائے یرموک کے درمیان فروکش تھے۔ مسلمانوں کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا انتظار تھا۔ جب سوی سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا تیز رفتار قاصد مسلمان لشکروں کو تلاش کر کے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے راستے کی نشاندہی کی اور جیسا کہ نقشہ دوم سے ظاہر ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اوپر سے چکر لگا کر آ رہے تھے اور قاصد چھوٹے راستے سے جلدی یرموک کی وادی میں پہنچ گیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ذرا فکرمند ہوئے کہ دوسرے مقامات کے علاوہ مرج الراحت سے آگے بصریٰ کی مضبوط سرحدی چھاؤنی تھی اور رومیوں کی کئی فوجی چوکیاں تھیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یہی راستہ اختیار کرنا تھا کہ جبل ہورن یا جبل الدروز کے مشرق میں ریگستان تھا جس میں سفر بہت مشکل تھا۔ سخت گرمی کا موسم تھا پہاڑ سے لاوا بھی بہہ نکلتا تھا۔

چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو چار ہزار کے لشکر کے ساتھ بصریٰ کی طرف روانہ کر دیا اس قلعہ میں رومیوں کی فوج کی تعداد بارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔ انہوں نے اسلامی لشکر کو دیکھ کر قلعہ بند ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اُن کا خیال تھا کہ دستہ کسی بڑی فوج کا ہراول یا جیش المقدم ہے۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ نے کچھ سوار آگے دوڑائے اور اپنے عمل کو قلعہ کے علاقہ کی دیکھ بھال کی کاروائی تک محدود رکھا کہ وہ محاصرہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ رومی لشکر

نے جب اسلامی لشکر کی یہ ''خاموشی'' دیکھی اور مسلمانوں کی نفری بھی کم تھی تو رومی قلعہ سے باہر آ گئے اور مسلمانوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ حضرت شرجیلؓ نے مسلمانوں کی وہی مشہور تین شرطیں دہرا دیں۔ رومی حیران ضرور ہوئے لیکن مسلمانوں کی کم نفری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

حضرت شرجیلؓ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اپنے سے تین یا چار گنا دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا اُن کے لیے عام بات تھی۔ ایک طرف حضرت خالدؓ کی آمد متوقع تھی۔ دوسری طرف اپنے لشکر بھی نزدیک تھے۔ اس لئے انہوں نے رومیوں کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا اور اسی دوران حضرت خالدؓ کا لشکر بھی پہنچ گیا حضرت خالدؓ خود اور خلیفہ اول کے فرزند حضرت عبدالرحمٰنؓ تلواریں لہراتے ہوئے نعرۂ تکبیر بلند کر رہے تھے اور لشکر کے آگے تھے۔ حضرت شرجیلؓ کے لشکر کے لیے ایک کرامت والی بات ضرور تھی اور انہوں نے جواب میں جو نعرۂ تکبیر کی صدا سنی تو رومی فوراً قلعہ بند ہو گئے۔ میدانِ جنگ میں ایک آدمی کی امداد کا بھی بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حصہ اول کے بائیسویں باب میں جنگ قادسیہ میں امداد سے جو فرق پڑا وہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

حضرت خالدؓ کے لشکر کی تعداد تقریباً نو ہزار تھی۔ حضرت شرجیلؓ کے چار ہزار مجاہدین شامل کر کے مسلمانوں کی نفری کوئی تیرہ ہزار بنی اور دوسرے دن رومیوں نے جو نگاہ دوڑائی تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ لشکروں کی نفری میں توازن ہے اس لئے وہ باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے۔ حضرت خالدؓ اب دونوں لشکروں کی کمانڈ سنبھال چکے تھے۔ انہوں نے میمنہ پر رافعؓ بن عمیرہ اور میسرہ پر ضرارؓ بن ازور کو مقرر کیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ جیش المقدم پر تھے۔ گرمی کی وجہ سے حضرت ضرارؓ نے اپنا خود اُتار دیا اور ننگے بدن دشمن پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ دشمن کے کشتوں کے پشتے لگ گئے اس کے بعد آئندہ شام کی جنگوں میں اُن کے نام سے ہی رومیوں کو ہیبت آ جاتی تھی۔ اور کوئی اُن کو ننگا دیو کہتا تھا اور کوئی ننگا جن یا پہلوان۔ آپ وزن میں کوئی بھاری بھر کم نہ تھے بلکہ آپ کا بدن چھریرا اور پھرتیلا تھا اس لیے اہل روم اپنی زبان میں جو لفظ استعمال کرتے تھے اُس کا صحیح ترجمہ مشکل ہے لیکن اُن کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ آفت ناگہانی یا ناگہانی بلا آ گئی بہرحال رومی گھبرا گئے کہ اتنے میں جنوب سے ایک دستہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار حضرت ابوعبیدہؓ بھی پہنچ گئے ان کی آمد کے نظارے مسلمانوں کی خوشی کی لہر اور حضرت امین الامت اور اللہ کی تلوار کی ملاقات نے اسلامی لشکر میں جو تاثر پیدا کیا اسکو بیان کرنے کی کسی قلم میں طاقت نہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی سکتے میں آ گئے اور بھاگ کر قلعہ بند ہو گئے بلکہ دوسرے دن جزیہ دینے پر بھی تیار ہو گئے اور مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بصریٰ فتح کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور اگر رومی صلح نہ کرتے تو بھی مسلمان محاصرہ اُٹھا کر چل پڑتے کہ اُن کے سامنے اس وقت ایک اور بڑا مقصد تھا لیکن جو ثمرات مل گئے وہ انہوں نے حاصل کر لئے۔ یہ

جمادی الاول تیرہ ہجری کا واقعہ ہے اور حضرت خالد ؓ کے عراق چھوڑنے کے بعد حضرت مثنیٰ ؓ بن حارث ان دنوں ایران کے ساتھ بابل کے مقام پر برسرِ پیکار تھے جس کا ذکر حصہ اول کے سترھویں باب میں ہو چکا ہے۔

واقدی کی لفاظی

طبری نے بصریٰ کی جنگ کو بہت مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے کہ یہ ایک تصادم تھا۔ واقدی نے البتہ اس لڑائی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور کچھ لفاظی کے چکر میں بھی آ گیا۔ واقدی پر اعتراضات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ واقعات کو "لطف انگیز" طریقے سے بیان کرے اور اُس میں الفاظ کے اتراؤ اور چڑھاؤ کا سہارا لیتا ہے۔ بے شک حسن بیان کے لیے ایسا کر لینا ٹھیک ہے لیکن اس "اتراؤ چڑھاؤ" سے واقعات کا رنگ نہ تبدیل ہو۔ یہاں پر واقدی لکھتا ہے کہ حضرت خالد ؓ کے آنے کی خبر سن کر حضرت ابوعبیدہ ؓ نے حضرت شرجیل ؓ کو بصریٰ بھیج دیا کہ فتوحات حاصل کرنا چاہتے تھے اور حضرت شرجیل ؓ بصریٰ کی لڑائی میں لگ گئے۔ حضرت خالد ؓ جو اوپر سے آ رہے تھے انہیں بصریٰ سے ایک میل دور لڑائی کی بھنک پڑ گئی اور وہ لڑائی میں شرکت کے لیے ادھر ہی تیار ہو گئے اور جب میدانِ جنگ میں پہنچے تو حضرت شرجیل ؓ سے پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ بصریٰ ایک اہم چھاؤنی ہے اور اس کا رومی کمانڈر ایک بڑا بہادر آدمی ہے اور تم تھوڑی نفری کے ساتھ اس کے مقابلے پر کیوں لگ گئے؟"

حضرت شرجیل ؓ نے کہا: "حضرت ابوعبیدہ ؓ کے حکم سے۔"

حضرت خالد ؓ نے کہا: "حضرت ابوعبیدہ ؓ بڑے اونچے کردار کے مالک ہیں لیکن وہ لڑائی کی حکمت عملیوں کو نہیں سمجھتے۔"

تبصرہ

ہم نے اس جنگ کی سیدھی سادی کہانی پہلے لکھ دی اور واقدی کی لفاظی کا سہارا نہ لیا کہ قارئین دونوں بیانوں کی طرز کا موازنہ کر سکیں۔ خالی یہی نہیں بلکہ واقدی اپنے بیان میں جب آگے چلتا ہے اور حضرت خالد ؓ اور حضرت ابوعبیدہ ؓ کی ملاقات کراتا ہے تو جو لفظ حضرت خالد ؓ، حضرت ابوعبیدہ ؓ کے سامنے عرض کرتے ہیں وہی لفظ اس اوپر والے بیان کی تردید کے لئے کافی تھے۔ لیکن تاریخ کے بامقصد مطالعہ اور غلط اضافوں کو رد کر کے صاف ستھری تاریخ پیش کرنے کے مقصد کو مدنظر رکھ کر ہم یہ تبصرہ کر رہے ہیں۔ اور افسوس ان مبصرین اور مورخین پر آتا ہے جنہوں نے واقدی کے الفاظ کے ساتھ چند اور اسم صفت کا اضافہ کر کے عظیم صحابہ ؓ کی بے ادبی کی۔ اول تو حضرت ابوعبیدہ ؓ اور حضرت شرجیل ؓ بصریٰ کے حالات کو حضرت خالد ؓ سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے کہ وہ ایک ماہ سے بصریٰ سے

ایک منزل پر بیٹھے تھے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں اُن سے کوئی سوال کیا ہو اور جو کچھ دراصل ہوا اسکو ہم آسان فوجی لفظوں میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے کوچ اور آمد کو" طاقت " دے رہے تھے اور یہ لفاظی ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اچانک جنگ کی بو آ گئی۔ دونوں طرف سے اعلیٰ پیمانے کا رابطہ تھا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کر دیا گیا تھا پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے ساتھ طرز گفتگو اس قسم کا نہیں ہو سکتا۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ عمر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے۔ پھر وہ اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے ابی سینیا میں بھی ہجرت کی تھی اور کاتب وحی بھی تھے۔ اُن کے لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایسے الفاظ استعمال نہ کرتے اور نہ ایسے لفظوں کے استعمال کی ضرورت تھی۔ جہاں تک امین الامت رضی اللہ عنہ کی شان کا تعلق ہے وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں واقدی ہی کے حوالے سے قارئین خود پڑھ لینا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ملاقات

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بڑے وجیہ تھے اور آپ کا پُر نور چہرہ ہر دیکھنے والے کو متاثر کرتا تھا۔ خاص کر ہلکی سی مسکراہٹ ہر وقت آپ کے چہرہ مبارک پر چھائی رہتی تھی اور وہ آپ کے جمال کو دوبالا کر دیتی تھی۔ جنگ اُحد میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بدنِ مبارک میں خود کے ٹکڑے چلے گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک سے لوہے کے ٹکڑے اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالے۔ جس سے آپ کے سامنے والے دانت کچھ ٹوٹ گئے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک آپ رضی اللہ عنہ کے بدن میں چلا گیا۔ اُس گھڑی کے بعد اور خاص کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کی یہ خواہش رہتی تھی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ مسکرائیں تا کہ لوگ اُن کے دانتوں کی زیارت کر سکیں جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کو چھو چکے تھے۔ ویسے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سراسر جمال ہی جمال تھے۔ نہ کبھی چہرہ مبارک پر غصہ کے آثار ہوتے اور نہ کوئی سخت کلمہ کبھی آپ رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا نام امیر تھا اور والد کا نام عبداللہ تھا۔ عربوں میں اکیلا لفظ امیر کسی حاکم یا امام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور اگر کسی کا نام امیر ہوتا تو اُس کے نام کے ساتھ اُس کے والد کا نام یا کوئی اور نام لگا دیتے۔ اس لیے جوانی میں لوگ آپ کو امیر عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے اور یہ نام عربوں میں عام ہو گیا، زیادہ سینہ بہ سینہ چلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قریش اور علوی قبائل جب کوہستان نمک اور ضلع میانوالی میں آ کر آباد ہوئے تو اُن علاقوں میں اکثر لوگوں کا نام امیر عبداللہ رکھا جاتا ہے اہل قلم نے البتہ آپ کو ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہی کے نام سے لکھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی بڑی قدر آور شخصیت کے مالک تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے خود پہنا ہوا تھا تلوار پیٹی کے ساتھ لٹک رہی تھی اور سرخ پگڑی کے نیچے وہ ٹوپی بھی پہن رکھی جس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک سلے ہوئے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر چیچک کے چھوٹے چھوٹے داغ تھے۔ اور چہرے پر پسینے کے قطرے اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے موتی جڑ دیئے گئے ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ علم العقاب تھا اور میدانِ جنگ میں کھڑے جائزہ لے رہے تھے کہ اتنے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیئے ان کے ہاتھ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ زرد علم تھا، جو خیبر کی فتح کا نشان تھا۔ آپ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔ پھر گھوڑے سے نیچے اُترے تو اسلام کے یہ دونوں عظیم فرزند آپس میں بغلگیر ہو گئے اور پھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یوں گویا ہوئے: ''اے ابا سلیمان! مجھے خلیفہ اول کا خط مل چکا ہے، جس میں انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو مجھ پر امیر مقرر کیا ہے۔ میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور میں آپ کی حربی خوبیوں سے بھی آگاہ ہوں۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے امین الامت میں بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ضرور ہوں لیکن آپ کی شان ساری امت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نرالی ہے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ جیسا اور کوئی نہیں۔ امین کا لفظ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف آپ رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال کیا۔ خدا کی قسم! مجھے آپ پر امیر ہوتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے لیکن یہ خلیفہ اول کا حکم ہے کہ میں انکار نہ کر سکا۔'' اب قارئین خود ہی فیصلہ کریں کہ واقدی اور ہمارا مبصر کہاں تک صحیح ہیں یعنی یہ دونوں سچے ہیں یا وہ صحیح ہو سکتے ہیں۔''

تبصرہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق و ایران کی فتوحات کی حکمت عملی کے تانے بانے شام و فلسطین کی فتوحات کی حکمت عملی کے ساتھ آ کر وادی یرموک میں مل گئے۔ تمام تر تجاویز ایک دوسرے میں شیر و شکر ہو گئیں اس لیے اگر اس کاروائی کو یرموک کی پہلی فتح کا نام بھی دے دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ یہاں پر البتہ مسلمان سالاروں کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آئندہ کا طریق کار کیا ہو گا یعنی دیرہ سے مغرب کی طرف پیش قدمی کر کے فلسطین کو تاخت و تاراج کریں اور وقتی طور پر وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اس سے اہل روم کے اس لشکر کی کچھ ناکہ بندی بھی ہو جاتی تھی جو اجنادین کے قریب اکٹھا ہو رہا تھا لیکن ایسی کاروائی میں سمندر کے تمام راستوں کو مسدود کرنے کے لیے بہت زیادہ نفری کی ضرورت تھی کہ ہر بندرگاہ پر چھاؤنی بنائی جاتی، جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کرنا پڑتیں اور یہ کاروائی مسلمانوں کو ساکن کر دیتی یا انفعالی دفاع کی کاروائی پر مجبور کر دیتی۔ مسلمانوں کا طرزِ جنگ یہ تھا کہ وہ متحرک رہنا چاہتے تھے اور اپنے دوست ریگستان کے نزدیک رہ کر کاروائیاں کرتے تھے لیکن فلسطین میں ریگستان ایسی خدمت کرنے کے لیے قابل نہ تھا۔ چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ کسی اپنی مرضی کی جگہ پر زیادہ سے زیادہ دشمن کو تہس نہس کر سکیں۔ اجنادین کے مقام پر کافی زیادہ رومی فوج اکٹھی ہو رہی تھی۔ اس کے محل وقوع کا اگر نقشہ سوم سے مطالعہ کیا جائے تو مسلمانوں کے ردعمل اور رومی تجویز بہتر طور پر سمجھ میں آ سکتی

ہے۔ حکمت عملی اور تدبیرات کے لحاظ سے اہل روم نے اہل ایران کی نسبت زیادہ فراست دکھائی تھی ایران والوں کے لیے سردھڑ کی بازی والی بات ضرور تھی لیکن حکمت عملی اور تدبیرات میں انہوں نے کسی دانائی کا مظاہرہ نہ کیا تھا اور اسی وجہ سے اپنے ایک مبصر سے ہم اپنا اختلاف پہلی کتاب میں بیان کر آئے ہیں۔

اہل روم کی تجویز

ہرقل کافی عمر کا آدمی تھا اور ایران کے بادشاہ یزدجرد کے دادا خسرو پرویز کے ساتھ بھی لڑائیاں لڑ چکا تھا۔ ایرانی فوج جب قسطنطنیہ کے محاصرہ کے لیے پر تول رہی تھی اور اناطولیہ میں رومیوں کو کئی مقامات پر شکست دے چکی تھی تو ہرقل نے ایک طرف سے نکل کر لمبا چکر لگایا اور ایران کے دارالحکومت کا محاصرہ کرلیا۔ ایران والے ساری فوج اناطولیہ لے گئے تھے اور اس طرح ہرقل نے جنگ کا پانسہ تبدیل کر دیا تھا اور اہل ایران پر اپنی مرضی کی صلح ٹھونس دی تھی۔ اُس کی باقاعدہ فوج میں ایشیاء کی تمام قوموں کے علاوہ یورپ کی متعدد قوموں کے لوگ موجود تھے۔ اس کی فوج بڑی تربیت یافتہ اور منظم فوج تھی اور اسے جم کر لڑنے کی بہت مہارت حاصل تھی۔ پیدل فوج کی ہر سیکشن کے ساتھ انتظامی ضروریات کے لیے ایک بیل گاڑی ہوتی تھی جس کو ہم آج کل ایف ''ایچلان'' ٹرک کہتے ہیں۔ اس گاڑی میں کینتی بیلچہ فاضل ہتھیار، بستر اور خوراک کا سامان ہوتا تھا۔ سپاہیوں کے لیے اعلیٰ خوراک کا بندوبست تھا اور شام و فلسطین کے زرخیز علاقوں میں سب کچھ میسر تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، مسلمانوں کی پیش قدمی کے خلاف ہرقل کا ردِعمل بڑا، جچا تلا تھا فلسطین کو مرکز بنا کر وہ اجنادین کے مقام پر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کو ختم کر کے ایلہ سے مشرق کی طرف اپنے لشکروں کو پھیلا دینا چاہتا تھا، تاکہ یرموک کی وادی میں پہنچے ہوئے اسلامی لشکروں کی ناکہ بندی ہو جائے، طبری کے مطابق وہ خود حمص میں موجود تھا اور پہلے مرحلے میں اوپر بیان شدہ کاروائی کے بعد وہ شمال سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو شام میں بھی شکست فاش دینے کی تجویز بنا رہا تھا۔ اس نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے اپنے بھائی تذارق کے ماتحت نوے ہزار فوج بھیجی۔ بالائی فلسطین میں فیقار بن مسطور کے پاس ساٹھ ہزار فوج موجود تھی اس کے علاوہ، جریہ، اردن اور قیقار کے ساتھ بھی کئی ہزار فوجیں موجود تھے۔ چھاؤنیوں اور فوجی چوکیوں میں فوجیں الگ تھیں اور ہرقل خود باہان کے ساتھ شمالی شام میں بیٹھ کر ایک اور بہت بڑا لشکر تیار کر رہا تھا۔

مسلمانوں کی تجویز

ان حالات میں مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ اہم مقامات پر قبضہ رکھنے کی بجائے

اہل روم کی فوجی طاقت کو تہس نہس کر دیں اور ایسا کرنے کے لئے ان کو خود ایک مٹھی میں ہونا تھا تا کہ جہاں کہیں اہل روم کی زیادہ سے زیادہ فوج کسی اپنی مرضی کے مقام پر مل سکے اُس کو اپنے سیکھے ہوئے طریقے کے ساتھ ملیامیٹ کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے پاس سب سے بڑی قوت اُن کا فلسفۂ حیات تھا اور اُس قوت کو متحرک کر کے وہ اپنی مرضی کے وقت اپنی مرضی کی زمین پر دشمن پر پل پڑتے تھے۔ اُن کی کوئی ''بندوبستی دُم'' نہ ہوتی تھی۔ وہ تین چار دن صرف کھجوروں اور پانی پر گزارہ کر سکتے تھے۔ وہ تیروں کا بھی کم سے کم صرف ضرورت کے تحت نہایت کفایت شعاری سے استعمال کرتے تھے۔ زیادہ کام وہ تلواروں اور نیزوں اور جھپٹنے پلٹنے سے لیتے تھے۔

''جھپٹنا پلٹنا، جھپٹ کر پلٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ''

ان حالات میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اہل روم کے ساتھ اجنادین کے علاقے میں دو دو ہاتھ ہو جائیں اور اس کاروائی کے لیے وہ آگے بڑھے۔

نتائج واسباق

جو تیاری بیان کی گئی ہے، اس کا نتیجہ اجنادین کی جنگ کی شکل وصورت میں نکلا، خلیفہ اول کی حکمت عملی کا بھرپور بیان ہو چکا ہے اور حضرت خالد ﷛ نے بلادِ عراق سے آ کر بلادِ شام میں کمانڈ سنبھال کر مسلمان مجاہدین کے دل میں اور زیادہ ولولہ پیدا کر دیا۔

۱۔ اس باب میں ہمارے لیے متعدد اسباق بھی ہیں۔ حضرت خالد ﷛ کی حضرت مثنیٰ ﷛ سے الوداعی اور حضرت ابوعبیدہ ﷛ سے ملاقات کے حالات ہمارے ایمان کو تازہ کرتے ہیں۔

۲۔ حضرت خالد ﷛ کا کوچ اور راستے کا چناؤ، اور پھر سفر کا طریقہ، یہ دنیا کی عسکری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ غیر ملکی فوج مبصر اور ماہرین اس کاروائی کو نظرانداز نہیں کر سکے اور عسکری تاریخ کے طالبانِ علم ان تمام کاروائیوں میں گہرے غوطے لگاتے ہیں۔ مسلمان امراء کا پہلے ہی سے یہ طریقہ تھا کہ اپنے سپہ سالار کو اپنی عملداری کے آخری مقام یا فوجی چوکی پر الوداع کہتے تھے۔ جس کو دنیا نے بعد میں نقل کر کے اپنایا۔ حضرت مثنیٰ ﷛ کا قراقر کے مقام تک جا کر اپنے محسن کو الوداع کہنا ایک روایتی مثال ہے۔ جس کو بعد میں مسلمانوں نے اپنایا اور ہماری فوجی زندگی کا یہ طریق کار ایک حصہ بن گیا۔

۳۔ حضرت خالد ﷛ کی حکمت عملی اور تدبیرات کی ملاوٹ اور اس کوچ سے بھی ''ثمرات'' اور ''عطیات'' حاصل کئے گئے جن کے بارے میں یورپ کے مبصر بے خبر تھے اور ایسے ''عطیات'' کا ذکر یورپ میں، کلاسوٹز نے

انیسویں صدی میں جا کر کیا ہے، کہ ہر پیش قدمی یا فتح کے ''عطیات'' وصول کرنے سے فوجی عمل کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

۴۔ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کی حکمت عملی، زماں و مکاں کا صحیح حساب، ریگستان میں سفر تاروں کی مدد سے چلنا، رہنمائی کے طریق کار، پیاس اور مشقت، آپس میں رابطہ، ایک دوسرے کی بروقت خبر، ان تمام باتوں پر اگر دھیان دیا جائے تو پھر یہ ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں نے دنیا کو آسانی کے ساتھ فتح نہ کیا تھا۔

۵۔ دراصل فلسفہ اور نظریہ تو ہمارے پاس موجود ہیں۔ خطابت کا بھی زور ہے۔ علم الکلام کے ماہر بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ لیکن ہم فلسفہ لکھتے ہیں۔ اصول لکھتے ہیں اور انہی چیزوں پر باتیں کرتے ہیں۔ عمل نہیں لکھتے اور نہ ہمیں پتہ ہے کہ اجتماعی طور پر عمل کیسے کیا جائے۔ کلاسوٹز اور باقی فوجی مبصرین میں بھی یہی فرق ہے کہ دوسرے لوگ فلسفہ یا اصول لکھتے رہے اور کلاسوٹز نے عمل لکھا تو جرمن قوم کو ایک فوجی قوم بنا دیا۔ ہم گنہگاروں کو بھی عمل لکھنے والوں کی ضرورت ہے۔

چوتھا باب

جنگِ اجنادین (نقشہ سوم)

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ وادی عربات میں موجود تھے۔ وہ دشمن پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے، لیکن آگے پیش قدمی نہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ریگستان کو اپنے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ اگر وہ زرخیز اور آباد علاقوں میں آگے بڑھ جاتے تو اُن کا سات یا آٹھ ہزار کا لشکر رومیوں کے اسی یا نوے ہزار ٹڈی دل لشکر کا تر نوالہ بن جاتا۔ وادیٔ یرموک میں چار مسلمان سپہ سالاروں کے ماتحت کوئی تیس ہزار کے قریب مجاہدین ہوں گے۔ نو ہزار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، اور باقی تین سپہ سالاروں میں سے ہر ایک کے ساتھ سات یا آٹھ ہزار کا لشکر تھا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کو شامل کر کے مسلمانوں کی کل نفری سینتیس (۳۷) ہزار سے چالیس (۴۰) ہزار کے لگ بھگ تھی، ہمارے اکثر مورخین نے تمام مسلمانوں کی تعداد کوئی پینتیس ہزار کے قریب بتائی ہے، لیکن جس طرح ریگستانی علاقے سے آگے بڑھ کر زرخیز علاقوں میں پیش قدمی کر کے مسلمانوں نے دشمن پر سیدھے طور پر دھاوا کر دیا تو اُس سے ہم یہ جائزہ پیش کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد کافی تھی، اور وہ دشمن سے آدھے ضرور ہوں گے۔

کوچ کا راستہ

پرانے زمانے کے مورخ اس سلسلے میں خاموش ہیں کہ اسلامی لشکر نے وادیٔ یرموک سے اجنادین جانے کے لیے کونسا راستہ استعمال کیا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی آمد کے بعد ہم سب لشکروں کو اب ایک لشکر ہی کہیں گے اور سب کام اب ایک سپہ سالار اعظم کے حکم پر ہو رہے تھے۔ اس زمانے کے دو مبصروں نے زمین کے مطالعہ کے بعد لشکر کے کوچ کے دو الگ الگ راستوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایک جنرل گلب ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا کافی حصہ اُس علاقے میں گزارا۔ اور دوسرے جنرل اکرم ہیں جو ان جنگوں کا مطالعہ کرنے کے لیے ان علاقوں میں گئے۔ چنانچہ ''اللہ کی تلوار'' کے مصنف جنرل اکرم کا خیال ہے کہ اسلامی لشکر نے شاید، یرموک سے جرش ہو کر جریشو والا راستہ استعمال کیا اور دریائے اُردن کو بحیرہ مردار سے اوپر کسی جگہ سے پار کیا۔ آگے بیت المقدس سے کنائی کرتے ہوئے جودہ کی پہاڑیوں سے گزر کر جنوب

کی طرف رُخ کیا اور کافی نیچے جا کر مغرب کی طرف بیر شیبہ کے اوپر یعنی شمال ہی کو مڑ گئے۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر اسلامی لشکر بحیرۂ مردار کے جنوب سے گزرتا تو بیر شیبہ، راستے میں آتا تھا اور وہاں سے وہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے لیتے۔ چونکہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اجنادین کے میدان میں باقی اسلامی لشکر سے ایک دن بعد پہنچے تو ظاہر ہے کہ ان کو خبر دے کر منگوایا گیا اگر جنرل اکرم کے تجزیہ کی بنیاد صرف حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ایک دن بعد پہنچنے کو ہی بتائیں تو پھر بھی بات نہیں بنتی۔ اجنادین سے بیر شیبہ پچیس میل دور ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اجنادین پہنچنے کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو منگوایا گیا تو پھر اُن کو تیسرے دن پہنچنا چاہیے تھا کہ ایک دن قاصد کے جانے میں خرچ ہوا اور ایک دن لشکر کے کوچ میں۔ جنرل اکرم کے تجزیہ کے مطابق بھی نقشہ سوم پر نشان لگا دیئے گئے ہیں۔

جنرل گلب کا تجزیہ

جنرل گلب کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے بحیرۂ مردار کے جنوب سے گزر کر اجنادین کی طرف پیش قدمی کی لیکن جنرل گلب نے اپنی کتاب کے ایک نقشے میں یہ ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں نے ساری پیش قدمی ریگستان میں کی کہ مسلمان پہاڑوں اور دروں میں سے پیش قدمی کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی ہدایات ذو قرد کی مہم کے دوران اور جنگ حنین[1] میں دیں۔ لیکن بحیرۂ مردار کے جنوب میں کچھ نچلی سطح والی چھوٹی پہاڑیاں بھی تھیں اور دشمن بھی اس علاقے سے بھاگ چکا تھا۔ پرانے مورخین کسی عرب رہنما کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ بحیرۂ مردار کے ساتھ ساتھ اُس علاقے کے کسی باشندہ نے مسلمانوں کی رہنمائی کی اور وہ بالکل درہ مواب سے گزرے۔ چنانچہ نقشہ سوم میں ہم نے کوچ کا راستہ اسی تجزیہ کے تحت بنایا ہے۔ جو جنرل گلب کے تجزیہ کے ساتھ ملتا ہے۔ اُس نے اس زمین کا چپہ چپہ دیکھا ہوا تھا اور اپنے تجزیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ بحیرۂ مردار کے نزدیک سے گزرنا مشکل تھا کہ ایسی ڈھلوانیں بھی ہیں کہ وہاں سے اونٹ یا گھوڑے کا اکیلے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جنرل اکرم کے تجزیہ پر تبصرہ

جنرل اکرم نے تیزی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک راستہ کی نشاندہی کی ہے یہ ایسا راستہ ہے جو صرف ''ہوائی'' ہے، پرانے زمانے میں بھی قافلے کوئی ایسا راستہ استعمال نہ کرتے تھے اور نہ ہی دریائے اُردن پر کسی ایسے پل کا کسی ایسی جگہ کا ذکر ہے جہاں سے دریا کو پار کیا جاتا تھا۔ دریا کو صرف ''فحل'' کے مقام سے پار کیا جاتا تھا جس پر دشمن کا قبضہ تھا اور اُس کا ذکر آگے آئے گا۔ نقشہ سوم کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا کہ جو راستہ جنرل اکرم نے متعین کیا ہے وہ بیت المقدس

(۱) جلال مصطفیٰ کے صفحہ ۱۵۱، ۱۵۵، اور ۲۴۶ سے استفادہ کریں۔

کے پاس سے گزرکرآتا ہے اور یہ تنگ دروں والا پہاڑی علاقہ ہے۔ اگر دشمن اسی ہزار کے قریب فوج اجنادین میں اکٹھی کرنے کے قابل تھا تو کیا یہ علاقے خالی تھے؟ اور یہاں سے مسلمان کسی لڑائی کے بغیر لڑ رجاتے، ان کے لیے دریا، پہاڑ اور دشمن تین رکاوٹیں تھیں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دوست ریگستان کو استعمال کیا ہوگا اور جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے ہوں گے تو حکم دے گئے ہوں گے کہ کل تک پہنچ جانا اور وہ دوسرے دن پہنچ گئے۔

چالیس ہزار کے لشکر کے لیے ویسے بھی کسی ایک دن میں کسی جگہ جمگھٹ کرنا آسان نہیں ہوتا، اس لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ اسلامی لشکر بحیرۂ مردار کے جنوب سے گزرا اور ہم جنرل گلب کے تجزیہ سے اتفاق کرتے ہیں لیکن آگے جنرل گلب کی یہ لفاظی کہ اسلامی لشکر ایک قافلے کی طرح کوچ کرتا تھا۔ اور لشکر کے طور پر منظم نہ تھا بالکل غلط ہے۔ اسلامی لشکر دس، سو اور ہزار کے گروہوں میں منظم کئے جاتے تھے۔ ہر سطح پر امیر تھے اور اطاعت امیر کا جو تصور دین فطرت میں موجود تھے، وہ کسی باطل فلسفہ میں نہیں ملتا۔ اور جو ربط وضبط اللہ تعالیٰ نے مسلمان مجاہدین کو نصیب کیا تھا اُس جیسی مثال ہی دُنیا میں نہیں مل سکتی۔ وہ سارا دن رابطہ سے رہتے تھے، پانچ وقت باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ اور رات کا کافی حصہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزار دیتے تھے اور اس ذکر کی آواز سے دشمن پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ مردِ خدا تھے:

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز
(اقبالؔ)

مؤرخین کے بیانات

جنگ اجنادین کو طبری نے بڑے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دراصل طبری نے شام کی سب جنگوں کو اُس تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا جیسے اُس نے عراق اور ایران کے واقعات کو پیش کیا ہے۔ شاید وہ ان علاقوں سے واقف نہ تھا اور عراق وایران اس کے اپنے ملک تھے۔ بہر حال اب اس کتاب میں جو بیانات پیش کیے جارہے ہیں، وہ زیادہ تر واقدی کی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں حصہ اول کے پیش لفظ میں وضاحت کر دی تھی۔ علاوہ شام کی جنگوں کے سلسلے میں اہل مغرب کے مورخین اور مبصرین نے بہت کچھ لکھا ہے بلکہ ویسے ایران وعراق کی نسبت شام کی جنگوں کا زیادہ مواد موجود ہے۔ مغربی مبصرین نے ابن اسحٰق، واقدی اور ابن سعد کے علاوہ رومی حکومت کے مورخین کے حوالوں سے بھی مواد اکٹھا کیا ہے۔ اس لیے یہاں آکر راقم بھی سب مورخین کے مواد سے فائدہ اُٹھائے گا۔ ویسے اجنادین کی جنگ کوئی معمولی لڑائی نہ تھی۔ میجر جنرل فُلر جیسا متعصب مورخ اور مبصر جس کی ہمیشہ سے کوشش رہی کہ اسلام کے ہر پہلو

کو کم تر بیان کرے اور عام طور پر اسلام کی کامیابیوں پر نہ صرف پردہ ڈالتا ہے، بلکہ سرے سے ذکر ہی نہیں کرتا، وہ بھی دنیا کی فیصلہ کن جنگوں میں اجنادین کی جنگ کا نام ضرور لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حقیقت کو کم تر کرنے کی بھی بھونڈی کوشش کرتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس لئے ہم اس جنگ کی اور زیادہ تفصیل میں جار ہے ہیں۔

طرفین کی تیاری

اہل روم اجنادین یا وادی عرباۃ میں ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ جو کچھ وہ مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہتے تھے، آج متحرک مسلمان خود اُسی مقام پر پہنچ کر وہی کچھ اہل روم کے ساتھ کرنے کے کے لیے شیروں کی طرح کوچ کر کے بیت جبرین کے مقام پر پہنچ گئے تھے۔ رومیوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ہوگی کیونکہ پورا شکار اُن کو ایک مقام پر مل رہا تھا۔ بلکہ یرموک کی وادی سے مسلمانوں کے کوچ کے بعد انہوں نے یرموک اور فحل کے علاقوں میں کمک پہنچادی۔ اُن کی تجویز کے مطابق اجنادین سے اگر کوئی مسلمان بچ گیا تو وہ موتہ اور تبوک کے راستے آگے بڑھ کر تمام مسلمانوں کو شام کی سرزمین سے باہر پھینک دیں گے۔

اجنادین کے مقام پر رومی لشکر کی نفری نوے ہزار بتائی جاتی ہے۔ بعض مورخین نے فوج کے کمانڈر کے نام تذراق یا تذرا لکھا ہے جس کو تھیوڈرس بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن واقدی کہتا ہے کہ وہ وردن تھا اور اُس کے نائب کا نام قبوقلار تھا۔ رومی فوج جب تک اجنادین کے مقام پر ساکن پڑی رہتی مسلمانوں کو اُن سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔ لیکن شام و فلسطین کے محاذ پر رومیوں کے اتنے بڑے لشکر کے ہوتے ہوئے مسلمان کوئی اور کاروائی نہ کر سکتے تھے کہ اتنے بڑے لشکر نے خالی اپنی موجودگی کے اثرات سے محاذ کی طرفین کی طاقتوں کی کشش کے مرکز کے توازن کو بگاڑ دیا تھا۔ اور جیسا کہ پچھلے باب میں واضح کیا گیا ہے۔ اس فوج کا خاتمہ ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت خالد ؓ مسلمانوں کے ہر دستہ کے پاس جا کر اس طرح خطاب فرماتے تھے۔

حضرت خالد ؓ کا خطاب

''اے غلامانِ محمد ﷺ! آپ نے شاید اہل روم کا اتنا بڑا لشکر پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا اگر اللہ کی مدد سے ہم نے ان کو شکست دے دی تو یہ لوگ پھر کبھی ہمارا سامنا نہ کر سکیں گے۔ اس لیے آپ ثابت قدم رہیں اور اپنے عقیدہ و فلسفۂ حیات کی حفاظت کریں اور یاد رہے کہ دشمن کے سامنے کبھی پیٹھ نہ پھیریں کہ اُس کی سزا دوزخ کی آگ ہے۔ چوکنے رہیں، اپنی صفوں کو بحال رکھیں اور اُس وقت حملہ کرنا جب میں حکم دوں۔''

حضرت خالد ؓ کی یہ تقریر اور اُن نو ہزار مجاہدین کے پورے لشکر کے لیے بہت بڑی حوصلہ افزائی کا باعث

بن رہی تھی ۔ وہ نو ہزار مجاہدین رومیوں کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے کہ اُن سے زیادہ تعداد میں ایک اور دشمن کو وہ کئی مقامات پر تہس نہس کر چکے تھے۔

رومی کمانڈر کی تقریر

روم کی فوج کے کمانڈر نے تمام جرنیلوں کو بلایا اور یہ تقریر کی۔ ''اے اہل روم! قیصر روم نے آپ پر بھروسہ کیا ہے اگر تمہیں شکست ہوگئی تو تم آئندہ کبھی مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکو گے اور وہ تمہارے ممالک فتح کر لیں گے اور تمہاری عورتیں ان کے قبضہ میں چلی جائیں گی۔ اس لیے ثابت قدم رہو۔ جب حملہ کرو تو ایک جان ہو کر لڑو۔ اور صلیب سے مدد لو اور یاد رکھو کہ تمہاری تعداد اُن سے تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔''

تبصرہ

اب دونوں کمانڈروں کی تقریر کے الفاظ کا موازنہ کریں۔ مسلمان اللہ سے مدد مانگتے ہیں۔ رومی صلیب یا سولی سے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی دشمن کی شکست کی بات کرتے ہیں کہ پھر رومی کبھی مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکیں گے اور رومیوں کا جرنیل بھی اپنی شکست کا ذکر کرتا ہے کہ اگر شکست کھا گئے تو پھر کبھی مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکیں گے۔ تو اللہ کی قدرت دیکھیں کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کمانڈروں کی زبان کو رومیوں کی شکست کے الفاظ کہنے کا پہلے سے ہی حکم دے دیا۔ یہ نکتہ یاد رکھیں کہ جنگ سے پہلے کبھی اپنی شکست کو کسی تصور میں بھی نہ لائیں۔ مسلمان ویسے بھی کسی شکست کو تسلیم نہیں کرتا وہ سب کچھ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے لیے کرتا ہے اور اپنی جان کو اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ اُس کی فتح کا مقصد بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کا نفاذ ہوتا ہے۔ وہ عورتوں اور بچوں کا ذکر نہیں کرتا کہ وہ بھی اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی زندگی غیرت سے گزاری۔ لیکن عورت کی حفاظت والی بات کو بھولنا نہیں چاہیے۔ رومی لشکر کا جرنیل اس کا ذکر ضرور کرتا ہے کہ شکست خوردہ قوموں کی عورتوں پر دوسرے لوگوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور ہم نے جلالِ مصطفےٰ[1] کے شروع ہی میں حجاج بن یوسف کی اس سلسلے میں غیرت کا ذکر کیا ہے۔

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور

اسلامی لشکر اپنی آگے والی آماجگاہ میں تھا جس کو فارورڈ کنسٹریشن کر سکتے ہیں اور مسلمانوں اور دشمن کے درمیان تقریباً آدھے میل سے ایک میل تک کا فاصلہ ہوگا کہ مسلمان بیت جبرین سے آگے نکل چکے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کسی بہادر مجاہد کو دشمن کی دیکھ بھال اور خبر لینے کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ اُن کی نظر حضرت ضرار رضی اللہ عنہ

۱) جلالِ مصطفےٰ صفحہ ۱۴ سے استفادہ کریں۔

پر پڑی۔ حضرت ضرار ﷛ گھوڑے پر سوار ہو گئے اور بے فکر ہو کر دشمن کی طرف چل پڑے۔ آگے ایک ٹیکری یا اونچی (زمین نظر آئی۔ اُس پر چلے گئے اور نزدیک سے دشمن کی دیکھ بھال میں محو ہو گئے۔ جب رومیوں کو یقین ہو گیا کہ مسلمان شاہسوار اُن کی خبر حاصل کرنے میں مصروف ہے تو انہوں نے تیس سواروں کا ایک دستہ بھیجا کہ اس مجاہد کا کام تمام کر دیں۔ رومیوں نے سرپٹ گھوڑے دوڑا دیئے۔ اور حضرت ضرار ﷛ بھی تھوڑی دیر کے لیے ان کے آگے بھاگے اور ایک رومی شاہسوار کو انہوں نے اپنے نزدیک پہنچنے دیا جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا آپ نے آہستہ سے اپنے گھوڑے کو موڑ کر اُس کا سر قلم کر دیا۔ رومی کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہوا کہ آپ نے باری باری دو اور رومیوں کے سر بھی قلم کر دیئے۔ رومی حیران تھے، لیکن دراصل رومی شاہسوار بھاری بھرکم تھے۔ جس کو رسالہ والے انگریزی میں ہیوی رائیڈنگ کہتے تھے مسلمان عرب کے ریگستانوں میں ہلکے پھلکے شاہسوار تھے اور بنو اسد کے حضرت ضرار ﷛ بزوخا، نقرہ اور سلمہ کے علاقوں میں شاہسواری کے گر سیکھ چکے تھے اور دشمن پر حملہ کرنے کے وہ داؤ جانتے تھے کہ انہوں نے رومیوں کے ساتھ کبڈی یا پولو کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے رومیوں کو ایسے چکر دیئے کہ تقریباً اُنیس بیس رومی کھیت رہے تھے تو پھر حضرت ضرار ﷛ واپس اپنے لشکر میں آ گئے۔ حضرت خالد ﷛ کچھ ناراض ضرور ہوئے کہ جس کام کے لیے بھیجا تھا اُس کی بجائے یہ کیا تماشا شروع کر دیا۔ لیکن حضرت ضرار ﷛ خاموش رہے۔ اسلامی لشکر کے باقی مجاہدین کے دل باغ باغ ہو گئے اور جہاں بھی حضرت ضرار ﷛ گئے تو مجاہدین نے مرحبا کہہ کر اُن کو خوش آمدید کہا۔ تو حضرت ضرار ﷛ نے اُن کو بتایا کہ باقی دس گیارہ رومیوں کو ختم کرنا بھی آسان تھا۔ لیکن انہیں سالارِ لشکر کا ڈر تھا اس لیے جلدی واپس آ گئے۔

اسلامی لشکر کی جاسوسی

حضرت ضرار ﷛ کی کاروائی دیکھ کر رومی فوج کا نائب کمانڈر قبوقلار سکتے میں آ گیا کہ ان کا کس قوم اور فوج کے ساتھ واسطہ ہے جن کا ایک مجاہد ایسے کمال دکھا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اجنادین کے علاقوں کے ایک عیسائی عرب کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر میں گھس جائے اور اندر جا کر لشکر کی تعداد، طاقت اور خوبیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ یہ عرب کسی بہانے اسلامی لشکر میں داخل ہو کر مسلمان مجاہدین کے ساتھ گھل مل گیا اور باہر نکلنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ واپس پہنچ کر اُس نے یہ جائزہ پیش کیا:

''یہ عجیب و غریب لوگ ہیں۔ رات کو راہب یا فقیر کی طرح اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے ہیں اور دن کو بالکل ایسے جنگجو نظر آتے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے حاکم کا بیٹا بھی چوری کرے تو اُس کا

ہاتھ کاٹ دیں گے اور اگر ان کا حاکم بھی زنا کا مرتکب ہوگا تو اُس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔"

قبوقلاز نے یہ سن کر کہا "اگر جو کچھ تم کہتے ہو، وہ صحیح ہے۔ تو پھر ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے بہتر ہوگا کہ زمین راستے دے اور ہم اُس کے اندر چلے جائیں، میری کیسی ہی اچھی قسمت ہوتی کہ خدائے یسوع مسیح مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچ لیتا۔"

تبصرہ

ظاہر ہے قبوقلاز دل چھوڑ چکا تھا لیکن ہمارے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کا وزیراعظم مسٹر چرچل لیفٹیننٹ تھا اور اپنی یونٹ کے ساتھ ہمارے صوبہ سرحد میں آکر متعین ہوا۔ اپنی یادوں میں لکھتا ہے کہ پٹھان ایک پادری بھی ہے اور جنگجو سپاہی بھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ سیاسی معاملات کی سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہے۔" مسٹر چرچل کا یہ مشاہدہ پٹھانوں کے لیے تھا کہ وہ اُس زمانے میں بھی اپنی مسلمانی کو کچھ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ورنہ سب مسلمان سیاست دان ہیں کہ وہ اہل یورپ کی طرح صرف کرایہ کے سپاہی نہیں۔ اُن کے سامنے زندگی کے کچھ مقاصد ہیں اور اُسی کو اُن کا سیاسی فلسفہ کہا جاتا ہے۔ وہ جنگجو ہیں کہ وہ اللہ کے سپاہی ہیں وہ "پادری" یا راہب ہیں کہ وہ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں۔ اور ان خصوصیات کی وجہ سے افغان آج بھی روسیوں کی طبیعت صاف کر رہے ہیں۔

تیری بے علمی نے رکھ لی ہے بے علموں کی لاج

عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان ، او غافل افغان

(محراب گل، افغان کے افکار)

مسلمانوں کی صف بندی

۲۷ رجمادی الاول تیرہ ہجری بعد از نماز ظہر مسلمانوں کو دوسرے دن کے لیے احکام موصول ہو چکے تھے اور وہ یہ تھے کہ ۲۸ رجمادی الاول صبح سویرے فجر کی نماز کے وقت وہ ہدایات کے مطابق دشمن کے سامنے صف بند ہو جائیں گے۔ مسلمانوں نے دشمن کی نفری کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ میل لمبے علاقے میں صف بندی کی۔ گو ایسی طویل صف بندی مسلمان اپنی صفوں میں زیادہ گہرائی نہ رکھ سکتے تھے، لیکن حالات کے مطابق یہ ضروری تھا۔ اور اتنی لمبی صف بندی نے اہل روم کو متحیر کر دیا۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ ایک دو میل میں صف بند ہوتے تھے اور صفوں کی گہرائی تمیں یا چالیس

جوانوں تک ہوتی تھی لیکن اب ان کو بھی اپنی صفوں میں طول پیدا کرنا پڑا اس سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہل روم کا ایک لشکر جس کو انہوں نے ریزرو رکھا ہوا تھا کہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کے بازوؤں پر بڑھ کر وار کرے گا وہ بھی صف بند ہو گیا۔ اس کا اور ذکر آگے آئے گا کہ مسلمانوں نے بھی اپنے بازوؤں پر فالتو مجاہدین کا بھی تعین کیا کہ اگر رومی بازوؤں سے کوئی کاروائی کریں تو مسلمان مجاہدین آگے نکل کر صف بندی کو طول دیتے جائیں۔

اسلامی لشکر کے چیدہ چیدہ اُمراء

اسلامی افواج کے درمیان میں عظیم صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل[1] تھے۔ میسرہ پر حضرت سعید[2] رضی اللہ عنہ بن عامر تھے، میمنہ پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ میسرہ کے ساتھ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ چار ہزار مجاہدین کے ساتھ متعین تھے کہ بائیں بازو کی حفاظت اُن کی ذمہ داری تھی۔ اور اسی طرح میمنہ پر جو فالتو دستے تھے اُن کے کمانڈر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ عقب میں ریزرو کے طور پر حضرت یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے۔ لشکر کے درمیان میں خود حضرت خالد رضی اللہ عنہ تھے۔ اور حضرت امین الامت رضی اللہ عنہ نائب سالار تھے۔ ویسے وہاں پر اسلام کے اور چیدہ چیدہ امراء بھی موجود تھے کہ کسی مبارزت کی ضرورت پڑے یا کسی دستہ کو کوئی نئی کاروائی کرنی ہو تو امراء اپنے پاس موجود ہوں۔
ان عظیم امراء میں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر رضی اللہ عنہ شامل تھے۔

اہل روم کی صف بندی

۲۸ / جمادی الاول صبح کے وقت جب رومیوں نے مسلمانوں کو صف بند ہوتے دیکھا تو وہ بھی جلدی سے صف بند ہو گئے۔ اُن کی صفوں کی گہرائی مسلمانوں کی صفوں سے تین گنا تھی۔ البتہ اُن کے دستوں یا لشکر کے حصوں کے کمانڈروں کے سلسلے میں مورخین خاموش ہیں۔ اُن کے پاس بے شمار جھنڈے تھے جن پر صلیب کے نشان بنے ہوئے تھے اور اُن کی صفوں میں بڑی باقاعدگی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ اُن میں عیسائی تھے، دروز تھے۔ عرب نصرانی تھے، آرمینیا کے لوگ تھے۔ اناطولین تھے۔ یونانی اور یورپ کے سلاد قوم کے لوگ بھی تھے اور مسلمان ایک اللہ اور ایک رسول کو ماننے والے تھے۔

(۱) حضرت معاذ بن جبل کا ذکر جاِل مصطفےٰ کے صفحہ ۲۳۲ اور ۲۸۶ پر موجود ہے۔ آپ کا شمار اسلام کے عظیم علماء حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمر وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آگے بھی آپ کا ذکر اکثر آئے گا۔ آپ انصار تھے۔
(۲) یہاں پر کچھ شبہ کی گنجائش ہے کہ آیا آپ سعید رضی اللہ عنہ بن عامر بن قذیم تھے یا سعید رضی اللہ عنہ بن عمر التمیمی تھے۔ یہ دونوں اصحاب تھے اور ہجرت بھی کی۔ زیادہ خیال یہ ہے کہ آپ سعید رضی اللہ عنہ بن عامر تھے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ہدایات

صف بندی کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایک بار پھر باہر نکلے، اور لشکر کے ہر حصے کے سامنے ٹھہر کر خطاب فرمایا تیراندازی کے بارے میں حکم دیا کہ ہمیشہ ایک دولی'' فائر کرو کہ جس طرح فائر بائی آرڈر کے تحت تمام فائر ایک وقت ایک یا کئی ہدفوں پر گرایا جاتا ہے۔ یہی حکم حضرت خالد رضی اللہ عنہ تیراندازی کے لیے دے رہے تھے تاکہ جس جگہ ایک وقت اکٹھے تیر پڑیں اُس صف کو تہس نہس کر دیں۔ ایک ایک تیر چلانے یا مرضی سے تیراندازی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں بھی گئے، جہاں عورتیں اور بچے تھے۔ اور فرمایا کہ وہ خود اپنی حفاظت آپ کریں۔ سب عورتوں نے یک زبان ہو کر عرض کی کہ یہ تو کم از کم ضرورت ہے۔ اُن کی خواہش تو یہ تھی کہ آج کے دن وہ مردوں کے دوش بدوش لڑیں۔

بوڑھا پادری

طرفین کو صف بندی کرنے میں چند گھنٹے لگ گئے۔ اسی دوران ایک بوڑھا پادری جس نے سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی، رومیوں کے لشکر سے آگے نکلا اور عربی زبان میں پکار اُٹھا کہ آپ میں کوئی مذہبی قسم کا آدمی ہے جو آگے آ کر مجھ سے بات کرے۔

تبصرہ

مسلمانوں میں تو پادریوں یا برہمنوں والی بات کا رواج بالکل نہ تھا۔ اور ''مولویوں'' والا سلسلہ بھی بڑی دیر کے بعد شروع ہوا۔ اُس زمانے میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ امامت کا کام ہر سطح پر سالارِ لشکر خود کرتا تھا یعنی کسی چھوٹے سے چھوٹے دستے سے لے کر پورے لشکر تک ہر سالار کو نماز کی امامت کرنے اور خطبہ دینے کے قابل ہونا ضروری ہوتا تھا۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

(اقبالؔ)

یعنی امام کا خطبہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمان سب کام اللہ اور رسول کے لیے کرتے ہیں۔ اور اس فانی دنیا کے ساتھ محبت والی بات کوئی نہیں۔ یہاں تو امتحان کے لیے آتے ہیں۔ جتنا جلدی اس امتحان سے پاس ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ قرآنِ پاک میں ہے کہ اگر سچے ہو تو موت کی آرزو کرو۔ یہ نکتہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نہ خودکشی کی اجازت دیتا ہے اور نہ موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کی۔

اسلام بچاؤ کی بھی عزت وغیرت سے تلقین کرتا ہے۔آرزو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کے دربار میں عرض کرتا ہے کہ اے رب العالمین! میں نے اپنی بساط کے مطابق اور تیری رحمت سے جو کچھ کرنا تھا وہ کرلیا۔اب زیادہ امتحان کی ہمت نہیں۔بہتر ہے کہ جلد اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور پادری کی بات چیت

اب پیچھے تبصرہ کردیا گیا ہے کہ مسلمان سب مذہبی قسم کے آدمی بھی ہیں، سیاستدان اور جنگجو سپاہی بھی ہیں۔اور اُس زمانے میں ابھی علماء دین یا یافقیہہ "یا مذہبی قسم کے لوگ کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا تھا۔یعنی ابھی تفریق" نہ شروع ہوئی تھی۔اس لیے کسی اکیلے دُکیلے آدمی پر مذہب کا لیبل چسپاں کرنے کی بجائے حضرت خالد رضی اللہ عنہ خود آگے نکلے۔

تو پادری نے پوچھا: کیا آپ اس لشکر کے سالار ہیں؟

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ہاں! اس وقت تک جب میں اللہ کے احکام اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پورا کرتا رہوں گا۔لیکن اگر میں ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہوں تو میرا ان پر امیر ہونے کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا۔اور نہ میں ان کو اپنی تابعداری کے لیے مجبور کرسکتا ہوں۔

پادری یہ سن کر سکتے میں آ گیا۔اور اُس کی زبان سے خود بخود یہ الفاظ نکلے۔اچھا اب پتہ چلا کہ آپ کو ہمارے اوپر فتوحات کیوں اور کیسے حاصل ہورہی ہیں۔لیکن پادری نے اپنے آپ پر کچھ کنٹرول کرتے ہوئے، اپنے سالار کے حکم کے مطابق اپنا راگ اس طرح الاپنا شروع کیا "اے عرب! تمہیں معلوم ہونا چاہیے، کہ آپ نے ایک ایسے ملک پر چڑھائی کرکے اس میں داخل ہونے کی کوشش کی ہے جس میں داخل ہونے کی کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی ہمت نہیں ہوتی۔اہل فارس نے یہاں داخل ہونے کی کوشش کی اور اُن کی ہم نے جو گت بنائی وہ دنیا کو معلوم ہے۔اور بھی کئی آئے اور خواہ مخواہ اپنی جانوں کا ضیاع کروایا لیکن وہ کچھ بھی حاصل نہ کرسکے۔آپ نے ہم پر کچھ معمولی فتوحات حاصل کرلی ہیں، لیکن یاد رکھیں کہ ایسی فتوحات کوئی پکی چیز نہیں ہوتیں۔"

"میرا حاکم دردن آپ لوگوں پر کچھ مہربان نظر آتے ہیں، اور اُس نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ اگر آپ اپنے لشکر واپس لے جائیں تو آپ کے ہر جوان کو ایک دینار اور ایک خلعت بمع پگڑی تحفہ کے طور پر پیش کی جائے گی اور آپ کو سو دینار اور سو خلعتیں پیش کی جائیں گی۔"

"ہمارے پاس ٹڈی دل لشکر ہے اور ایسے لشکر کے ساتھ آج تک آپ لوگوں کا واسطہ نہیں پڑا۔اس لشکر کے ساتھ قیصر روم نے بڑے مدبر اور طاقتور جرنیل اور عظیم دانشور قسم کے پادری بھی بھیجے ہیں۔"

حضرت خالد ﷺ نے فرمایا'' ہم تو صرف تین باتیں جانتے ہیں۔ اول یہ کہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاؤ۔ دوم: اگر یہ نہیں کرتے تو جزیہ دو۔ سوم: اگر وہ بھی منظور نہیں تو فیصلہ تلوار کرے گی اور جو آپ نے دیناروں اور خلعتوں کی بات کی ہے، اس سلسلے میں ہم زیادہ پسند یہ کرتے ہیں کہ ایسی چیزیں تلوار کے ذریعے حاصل کی جائیں اور یہ چیزیں ہمیں خود بخود ہی حاصل ہو جائیں گی۔''

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں ہے ننگ وہ پادشاہی
(اقبالؔ)

جب پادری نے یہ سنا تو اُس کے پاؤں تل سے زمین نکل گئی اور واپس جا کر دردن کو حالات سے آگاہ کیا۔ دردن میں کچھ ہمت باقی تھی، کہنے لگا:'' میں ابھی عربوں کو تہس نہس کرتا ہوں۔''

تبصرہ

دردن کو معلوم نہ تھا کہ'' عرب'' مسلمان ہو چکے تھے۔ اگر وہ صرف عرب ہوتے تو وہی ہوتا جو آج کل'' اہل عرب'' کے ساتھ فلسطین میں ہو رہا ہے یا باقی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے جو کسی وقت'' قومیتوں'' کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ بہر حال دردن اور رومی اس وقت تک پرانی باتوں کے چکر میں تھے۔ وہ تو مسلمانوں کو کوئی طاقت بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔''

پادری نے حضرت خالد ﷺ کو'' اے عرب'' کہہ کر پکارا۔ کہ عرب اُس کے لحاظ سے اُس وقت ایک معمولی قبیلہ تھے اور اُن کو بادشاہوں کے برابر بھی، وہ نہ مانتے تھے۔ جیسا کہ پادری نے کہا کہ کسی بادشاہ کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ اُن کے ملک پر چڑھائی کر سکے۔ اہل روم کو یہ غلط فہمی تھی کہ عرب غربت کی وجہ سے اور ضرورت کے تحت اپنے ملک سے باہر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اور اہل روم کے جانشین اہل یورپ اب بھی اسی چکر میں ہیں کہ عرب'' غریب و امیر کی باہمی جنگ'' کے فلسفہ کے تحت باہر نکلے تھے۔ اہل یورپ اپنے تعصب کے تحت اتنے اندھے ہیں کہ انہوں نے دین فطرت کی حقیقت کو تلاش کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلی
(اقبالؔ)

دردن کا حکم

بہر حال وردان نے طیش میں آ کر تیراندازوں اور پتھر برسانے والوں کو حکم دیا کہ وہ لشکر سے آگے نکل کر مسلمان مجاہدین پر تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دیں۔ اسلامی صفوں کے درمیان سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل آگے بڑھ کر حملے کے احکام دینے ہی والے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اُن کو روک دیا۔ کہ "نہیں ایسا مت کریں حملہ میرے حکم پر ہوگا اور وہ بھی سورج ڈھلنے کے بعد کہ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ کے لیے اُس وقت کو بہترین وقت قرار دیا ہے۔ بقول اقبال:

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پہل کاری

اب عام اندازے کے مطابق لڑائی میں پہل کاری اہل روم کے ہاتھوں میں نظر آتی ہے لیکن یہ بات نہیں ہے۔ رومی یہ کارروائی ردعمل کے تحت اور مجبوری کے تحت کر رہے تھے اور متحرک مسلمان ایسی "ساکن" بمباری کو اتنا زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ تیروں اور پتھروں سے مسلمانوں کا اتنا نقصان ہو رہا تھا۔ جتنا آج کل توپخانہ کے فائر سے ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج کل توپخانے کے فائر کے وقت چوکنا ہو کر مورچے میں بیٹھنا پڑتا ہے اور اُس زمانے میں صف بندی قائم رکھی جاتی تھی۔ تیروں اور پتھروں کو ڈھالوں پر روکا جاتا تھا لیکن مسلمانوں کے اس طرح "ساکن" رہنے والی بات حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو پسند نہ آ رہی تھی۔ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"اے سالار! جب اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو انتظار کیسا؟ بخدا رومی خیال کریں گے کہ ہم اُن سے ڈر رہے ہیں۔ کم از کم مبارزت کی اجازت تو دے دیں۔" حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسکرائے اور انہوں نے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو مبارزت کی اجازت دے دی۔ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے وقت میں مبارزت کی اجازت دے دیتے تھے۔ حملہ کے لیے البتہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد از ظہر کے وقت کو پسند فرمایا اور گو نہاوند کی جنگ بہت بعد ہوئی لیکن چونکہ پہلی کتاب میں اُس کا ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں کیسے وضاحت کی۔ تو اس لیے ہم اس فلسفے کی تفصیل میں نہیں جا رہے۔ مختصراً وہ یہ ہے کہ دشمن کے پاس ردعمل کے لیے روشنی کا وقت کم ہوتا ہے۔

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی مبارزتیں

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ خود پہنے ہوئے تھے۔ انہیں اجازت ملنے کی دیر تھی کہ دشمن نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی وہ گھوڑے پر سوار آگے بڑھ گئے اور انہوں نے جو رجزیہ نظم پڑھی اُس کو اپنی زبان میں ہم کچھ اس طرح بیان کریں گے:۔

"میں وہ قوت ہوں جس کے ڈر سے تمہارے چہرے زرد ہو جاتے ہیں، میں رومیوں کو جہنم واصل کرنے کے لیے آگے آیا ہوں۔ میں ہی آپ لوگوں کے لیے قہرالٰہی بن کر آیا ہوں۔ معلوم ہے میں کون ہوں؟ میں ضرار رضی اللہ عنہ بن الازور ہوں۔"

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے جیسے ہی رومی پہلوان نکلے۔ انہوں نے اپنا خود اتار دیا تو رومی بڑے حیران ہوئے لیکن جو آگے آتا جاتا تھا وہ اُس واصل جہنم کرتے جاتے تھے۔ انہی لوگوں میں عمان اور طبریہ کے فوجی گورنر بھی تھے جو زمین پر تڑپ رہے تھے۔ اس لیے رومیوں نے غصہ میں آکر دس شہسواروں کو آگے بھیج دیا، کہ اس آفت ناگہانی کو ختم کریں لیکن جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے پاس چیدہ چیدہ اور نامور مجاہدین رکھے ہوئے تھے۔ اور اُن کو لے کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اِن دس رومیوں پر ایسا جھپٹا مارا کہ وہ سب میدانِ جنگ میں تڑپنے لگے۔ رومی حیران تھے اس لیے انہوں نے یہ سوچا کہ چند مسلمان مجاہدین شاید مبارزت کے فن میں اپنا مقام نہیں رکھتے اس لیے بہتر ہوگا کہ تمام محاذ پر اپنے پہلوانوں کو آگے نکالا جائے تا کہ انہیں کہیں تو کوئی کامیابی حاصل ہو۔ تیروں کی بوچھاڑ تو ویسے بھی مبارزت کے دوران بند تھی رومی پہلوان پورے پانچ میل کے محاذ پر آگے نکل آئے، لیکن ادھر مقابلہ اللہ والوں کے ساتھ تھا۔ رومی آتے جاتے تھے اور ڈھیر ہوتے جاتے تھے۔ میدانِ جنگ رومی پہلوانوں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ یہ سودا رومیوں کو بہت ہی مہنگا پڑا۔ ان کے لشکر کے تمام بہادر پہوان اُن کی آنکھوں کے سامنے تڑپ رہے تھے۔

میدانِ جنگ میں ویسے بھی لڑنے والے چند ہی ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں نے حساب لگایا اور بڑے تجزیئے کئے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ میدانِ جنگ میں صرف پانچ سے دس فی صد آدمی ہدف کو دیکھ کر گولی مارتے ہیں، باقی ڈر سے اپنا سر مورچے کے اندر ہی رکھتے ہیں اور ایک رائفل کمپنی میں دس یا پندرہ آدمی لڑنے والے ہوتے ہیں۔ باقی صرف ٹوٹل پورا کرتے ہیں۔ رومیوں کے لشکر میں بہادری سے لڑنے والے آدمیوں کا یہ حال ہوا تو باقی لڑنے والوں کی اخلاقی قوتیں جواب دینے لگیں اور مسلمان سو فی صدی لڑتے ہیں تب ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم ایک سو ہو تو غالب آؤ گے ایک ہزار پر[1] یعنی جنگ اجنادین کے چالیس ہزار مجاہدین چار لاکھ رومیوں پر غالب آسکتے تھے اور رومیوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ یا نوے ہزار تھی تو وہ لوگ مسلمانوں کے لیے تر نوالہ تھے کہ اُن میں بہادری سے لڑنے والے صرف پندرہ یا بیس ہزار تھے جن میں سے دو تین ہزار مبارزت ہی میں ختم ہو گئے تھے۔

مسلمانوں کا حملہ

(۱) سورۃ انفال، آیت نمبر ۶۵

اور اسی دوران وہ گھڑی بھی آ گئی جس کے بارے میں ہمارے آقا حضور پاک حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نشاندہی فرما گئے ہیں ،سورج اپنی مدارج سے نیچے کو جھکا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پُر زور آواز میں چار تکبیریں کہیں جن کو جگہ بجگہ لشکر کے اُمراء نے دُھرایا اور مسلمان ایک پانی کے ریلے کی طرح آگے بڑھنے لگے۔حملہ سامنے سے تھا۔اس میں کوئی جنگی چال منووَر یا داؤ نہ تھا۔دشمن کو کسی بازو سے اکھیڑنے یا ادھیڑنے کی کوئی اجتماعی کوشش نہ تھی اس حملہ کی ساری بنیاد ذاتی ہنرمندی اور سلیقہ پر تھی۔رومیوں کے ساتھ پہلا بڑا مقابلہ تھا کسی چال کی صورت میں شاید امرا اپنے دستوں کو مکمل طور پر رابطوں میں نہ جوڑ سکتے اس لئے حکم یہ تھا کہ اپنے اپنے سامنے ہلکے پھلکے مسلمان نیزوں اور تلوار کا استعمال کرتے ہوئے جھپٹ پلٹ کر متحرک طریقوں سے حملہ کریں گے بھاری بھرکم رومی لشکر، بھاری بھرکم ایرانی صفوں کے ساتھ لڑنے کے عادی تھے کہ صف اپنے اجتماعی زور سے بالمقابل صف کو دھکیل کر شگاف بناتی تھی لیکن مسلمانوں کا طریقہ مختلف تھا۔ وہ متحرک ہو کر تلوار کے دو دو ہاتھ کر کے دشمن کو موت کے منہ میں دھکیلتے جاتے تھے اور اس طرح دشمن کی صفوں میں شگاف بناتے تھے۔

پہلے دن کے لیے ہدایات یہ تھیں کہ کشتوں کے پشتے لگا دو لیکن دشمن کی صفوں میں بہت بڑا شگاف نہ پیدا کرو، کیونکہ لڑائی کا فیصلہ کن وقت ابھی نہیں آیا تھا رومی سکتے میں آ جاتے تھے انہوں نے یہ طرز جنگ کبھی دیکھی نہ تھی۔مسلمان وار کر کے اُن کا کام تمام کر دیتے تھے اور وہ سوچ ہی رہے ہوتے تھے کہ کہاں وار کریں کہ اپنا سر کٹوا بیٹھتے تھے۔مسلمانوں کی تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں لیکن ان کی دھار بڑی تیز تھی۔جب سورج غروب ہونے لگا تو مسلمانوں کے حملوں کی شدت میں آہستہ آہستہ کمی پیدا ہونا شروع ہوئی اور مسلمان مجاہدین آہستہ آہستہ اپنی صفوں میں یا پرانی جگہ پر واپس آ گئے۔وردن نے جب میدانِ جنگ پر نظر دوڑائی تو وہ ہکا بکا رہ گیا میدانِ جنگ رومیوں کی لاشوں سے اٹا پڑا تھا اور مرنے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

دوسرا دن۔اور وردن کی دغابازی کی کوشش

لڑائی دھوکا ہے یا داؤ ہے یا جو کچھ مرضی ہے کہہ لیں لیکن یہ دغابازی نہیں ہے۔لڑائی میں دشمن پر دھوکے سے وار کرنا یا داؤ لگانا ایک ہی چیز ہے۔لیکن دغابازی الگ چیز ہے اور اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا اور سیواجی کی قسم کے لوگ یا کمینے لوگ لڑائی میں دغابازی کرتے ہیں، دغابازی اور جنگی چال میں فرق سمجھ لیں۔دھوکہ ایک ''چال'' ہے یا چال ہے لیکن دغابازی کا مطلب یہ ہے کہ وعدہ کر کے یا پناہ دے کر اپنے لفظوں سے پھر جانا یا کہنا کچھ اور کرنا کچھ۔ہمارے کئی مسلمان اتنے سادہ ہیں کہ وہ دغابازی سے کنارہ کشی کرتے وقت دشمن کے خلاف کوئی ''چال'' بھی نہ بچھانا چاہیں

گے۔ نہیں اس کی اجازت ہے کہ ایسا کرنا چاہے اور چال کی اجازت ہے، چال حیران کن کاروائی کے تحت آتی ہے۔

چنانچہ وردن نے اندازہ لگالیا کہ مسلمانوں کے ساتھ سیدھی لڑائی میں کوئی کامیابی ناممکن ہے اہل روم صف بندی کی دیوار بنا کر لڑنے کے عادی تھے اور مسلمان جھپٹ پلٹ کر حملہ کرتے تھے۔ تو یہ دیوار متحرک کاروائی کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتی تھی، چنانچہ ہم راز لوگوں کے ساتھ مل کر اُس نے تجویز بنائی کہ کسی طرح دھوکے سے مسلمان سپہ سالار کو آگے بلایا جائے پھر صلح صفائی کی بات کی جائے اور یہ بات ایسی جگہ پر ہو جہاں دس رومی چھپے ہوئے ہوں اور وردن کے اشارے پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کام تمام کردیں۔ وردن نے اس کام کے لیے ایک نصرانی عرب داؤد کو چُنا کہ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس سفیر بن کر جائے اور بات کرے کہ کافی خون بہہ چکا ہے اور جنگ کے معاملات کو ختم کریں۔

نصرانی عرب داؤد

داؤد حیران تھا کہ ہرقل کا حکم تھا کہ جنگ تب تک جاری رکھی جائے، جب تک مسلمانوں کو سارے علاقۂ شام و فلسطین سے نکال نہیں دیا جاتا۔ اس لیے داؤد نے کہا کہ یہ کوئی چکر ہے اور دال میں کچھ کالا ہے۔ صحیح حالات کے علم کے بغیر وہ سفارت کے کام کو انجام نہ دے سکے گا تو پھر مجبور اور دن کو اپنی تجویز یا دغابازی والی بات داؤد کو بتانا پڑی۔ سورج ابھی مکمل طور پر غروب نہ ہوا تھا اور جنگ بھی مکمل طور پر نہ تھمی تھی کہ داؤد نے آگے بڑھ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب آگے نکلے تو داؤد پر ہیبت طاری ہوگئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ دراز قد بھی تھے اور ویسے بھی میدانِ جنگ میں ستون نظر آتے تھے۔ لیکن اللہ کی تلوار کے خطاب نے غیر مرئی طور پر اُن کی شخصیت کے گرد وہ بلندیاں اکٹھی کردی تھیں جن کو کوئی قلم بیان نہیں کرسکتا۔ اس لیے داؤد نے بڑی مشکل کے ساتھ اپنی کپکپاہٹ پر قابو پایا، اور عرض کی کہ وہ جنگجو آدمی نہیں کسی مبارزت کی غرض سے نہیں آیا بلکہ وہ ایک قاصد ہے، سفیر ہے اور ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور فرمایا:

''سنو اے قاصد! اگر سچ بولو گے تو بچ جاؤ گے اور اگر جھوٹ کہو گے تو تہس نہس ہو جاؤ گے۔''

داؤد نے کہا کہ ''وردن اب جنگ کا خواہاں نہیں رہا، وہ آپ کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ لڑائی بند کردی جائے تاکہ کوئی مثبت قسم کی صلح کی جائے۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اگر تمہارے حاکم کا ارادہ کسی مکروفریب یا دغابازی کا ہے تو خدا کی قسم! ہم مکاروں کی جڑوں سے واقف ہیں، ہماری جنگی فراست کی وجہ سے ہمارے ردِعمل پہلے ہی سے ہمارے پاس موجود ہوتے ہیں اور وردن کے دل میں اگر کوئی خفیہ شرارت ہے تو یہی شرارت اس کو تہس نہس کردے گی۔ ہاں ہم صلح صرف اُس حالت میں کرسکتے ہیں کہ تم لوگ جزیہ دینے پر تیار ہو جاؤ۔''

داؤد حیران تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تو سب کچھ کہہ دیا ہے۔ وہ فراست کے ردِّعمل کے لفظ سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ واپس مڑا لیکن اُس کے قدم اُس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ اُس کو مسلمانوں کی فتح اور رومیوں کی شکست کے بارے میں کوئی شک باقی نہ رہ گیا تھا۔ جلدی سے پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوا اور عرض کی:

''اے سالار! اگر میری جان بخشی ہو سکے تو عرض کردوں کہ وردن کی نیت خراب ہے اور وہ دس رومی جوانوں کو ملاقات کی جگہ پر چوری سے چھپا رکھے گا لیکن اے سالار! میری عزت رکھی جائے اور جنگ کے بعد مجھے اور میرے خاندان کو پناہ دی جائے۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے منظور فرمایا اور داؤد واپس چل پڑا۔ وہاں جا کر وردن کو بتایا کہ وہ بڑا کامیاب رہا، بلکہ وہاں سے چلتے وقت ایک دفعہ پھر مڑ کر مسلمانوں کے سپہ سالار کو دوبارہ تسلی دی اور مسلمان سپہ سالار مکمل طور پر میری باتوں میں آ گیا وغیرہ وردن خوش ہو گیا۔

امین الاُمت رضی اللہ عنہ سے مشورہ

حضرت خالد رضی اللہ عنہ حیران تھے پہلے تو انہوں نے خیال کیا کہ راز کو راز رہنا چاہیے کہ وہ خود جا کر رات کو چھپے ہوئے دس رومیوں کا کام تمام کر دیں لیکن جب اپنے نائب امین الامت رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا: نہیں، ابا سلیمان! یہ معاملہ اہم ہے۔ ضرار رضی اللہ عنہ یا کسی اور بہادر مجاہد کو بھیج کر اُن چھپے ہوئے رومیوں کو ختم کر دیا جائے اور جب مکمل تسلی ہو جائے اور تمام رومی چپکے سے ختم ہو جائیں تو تب آپ وہاں جائیں اور اگر مسلمان مجاہد رومیوں کو ختم نہ کر سکے اور اُن میں سے ایک بھی واپس لشکر میں پہنچ گیا تو وردن آگے نہیں آئے گا یا وہ دغابازی کو کوئی اور شکل دے دیں گے۔

اس لیے یہ سارا معاملہ بڑی سوچ سمجھ سے کرنا ہے۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی رائے کی بڑی تعریف کی اور حضرت ضرار رضی اللہ عنہ سمیت دس مجاہدین کو اس کام پر مقرر کیا جنہوں نے رات کو ہی خبر دے دی کہ انہوں نے رومیوں کا کام تمام کر دیا ہے۔

وردن کا حشر

صبح سویرے وردن نے شاہی لباس پہنا۔ سر پر ہیروں سے جڑی ہوئی کئی درہم کی ٹوپی رکھی اور رنگین کوٹ پہنا کندھوں پر سے جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ایک خوبصورت پیٹی کے علاوہ کوٹ پر جھالر والا توش دان پہنے ہوئے تھا، تلوار پیٹی کے ساتھ لٹک رہی تھی اُس کے میان پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے اور تلوار کی ہتھی پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا تھا اور وہ پیدل اور اکیلا تھا اور بڑے تفاخر والی چال کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے چل رہا تھا کہ وہ بہت بڑا معرکہ سر کرنے والا ہے جیسے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُس کے نزدیک پہنچے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تراشے ہوئے بالوں سے سلی ہوئی ٹوپی

پہنے ہوئے تھے تو وردن نے نہایت کمینہ پن اور جھوٹے تفاخر کا مظاہرہ کیا اور ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑ ڈالی جس میں عربوں کی خستہ حالی کا ذکر تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''خاموش رہو رذیل میں آخری دفعہ تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ اسلام قبول کرو یا جزیہ دو۔''

وردن نے یہ سن کر مقرر شدہ اشارہ دیا کہ چھپے ہوئے رومی مسلمانوں کے سپہ سالار پر حملہ کر دیں اور چھپی ہوئی جگہ سے ''دس رومی'' نکلے ضرور لیکن کپڑے یا وردی رومیوں کی تھی لیکن جسم اور روح مسلمانوں کی تھی۔ اس میں یہ راز تھا کہ رومی اہل لشکر کو کوئی شک نہ پڑے۔ لیکن مسلمان اہل لشکر کی تسلی کے لیے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ نے رومی کوٹ اُتار دیئے اور اپنی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلوار سونت کر وردن کے نزدیک پہنچ گئے۔ ایسا کرنے میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو تسلی دینا بھی مقصود تھا۔ اب وردن پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عرض کی کہ وہ اُس کو اپنی تلوار سے قتل کریں کہ وہ سالارِ لشکر ہے، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''تمہاری حرکتیں سالارِ لشکر والی نہیں، اور مجبوری ہے ورنہ اسلام کے عظیم فرزند ضرار رضی اللہ عنہ کی تلوار سے بھی تم جیسے رذیل کا سر کاٹنا ہمیں پسند نہیں۔ افسوس کہ میدانِ جنگ میں جلاد نہیں ہوتے ورنہ یہ کام اُن سے لیا جاتا۔'' اور پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا۔ اُن کی تلوار کی چمک کے ساتھ وردن کا سر زمین پر تھا۔

مسلمانوں کا بھرپور حملہ

اب حملہ کے لیے بھی وقت موزوں تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھرپور حملے کے احکام پہلے ہی دے چکے تھے۔ اب صرف اشارے کی ضرورت تھی اور مسلمان خوشی اور جوشِ جہاد میں رومیوں پر پل پڑے۔ انہوں نے دشمن کو مولی گاجر کی طرح کتر کر رکھ دیا۔ بے شک رومی بہادری سے لڑے لیکن بہت جلد میدانِ جنگ رومیوں کی لاشوں سے بھر گیا اسی دوران حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ریزرو دستوں کو ایک بڑے حملے کا حکم دے دیا۔ پھر کیا تھا اہل روم کی رہی سہی سکت بھی ختم ہوگئی۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے دستے دشمن کی صفوں کے اندر گھس گئے اور رومی نائب کمانڈر قبوقلار کو بھی ہلاک کر دیا۔ اب جس فوج کے کمانڈر اور نائب کمانڈر ہلاک ہو جائیں اور بڑے بڑے اُمراء یعنی طبریہ اور عمان کے فوجی گورنروں سمیت کافی جرنیل ہلاک ہو چکے ہوں اس فوج کے لیے کسی تربیت کے ساتھ لڑنا مشکل ہوگیا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے بغیر کسی تربیت کے میدان جنگ کو چھوڑنا شروع کر دیا۔

رومیوں کی شکست اور مسلمانوں کا تعاقب

بے ترتیب پسپائی ہمیشہ مہنگی پڑتی ہے اور رومیوں کو زیادہ مہنگی پڑی۔ مسلمانوں نے دوسری حربی خوبیوں کے علاوہ تعاقب کی کاروائی میں بھی بہت زیادہ مہارت حاصل کر لی تھی۔ اجنادین کا میدان جنگ تھا۔ کھلے میدان میں

مسلمان تعاقب کے ماہر تھے۔اس لیے انہوں نے باقاعدہ ترتیب کے ساتھ رومیوں کا تعاقب کیا۔رومی ایک طرف بیت المقدس کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور دوسری طرف سمندر کی سمت میں۔اس لیے جب تک رومی جودہ کی پہاڑیوں میں نہ داخل ہو گئے اور سمندر کے ساحل پر نہ پہنچ گئے،مسلمان تعاقب کرتے رہے۔روایت ہے کہ اس جنگ میں پچاس ہزار رومی مارے گئے۔مسلمان شہداء کی تعداد صرف ساڑھے چار سو کے قریب تھی،لیکن مسلمان مجاہدین میں لاتعداد لوگ زخمی ہوئے۔رومیوں کے اس طرح قتل ہونے کی وجہ اُن کی طرزِ جنگ تھی،جس کا ذکر ہو چکا ہے۔وہاں اکیلے انسان کی حربی فوجی یا پھرتی کسی کام نہ آتی تھی۔وہ صف باندھ کر بھاری بھرکم ہو کر لڑتے تھے۔مسلمانوں کی طرز جنگ نے اُن کو ہوش بھی نہ آنے دیا۔مسلمانوں کی یہ ایک عظیم فتح تھی۔رومی پچھلے تین ماہ سے اس علاقے میں جمگھٹ کر رہے تھے اور بڑی حکمت عملی اور تدبیرات کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔لیکن یہ تمام فوج دو دن کی کاروائی میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔گو اہل مغرب یا اہل یورپ جنگ کے واقعات سے آگاہ ہیں۔لیکن اُن کا تعصب آج بھی حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جنگ اجنادین پر میجر جنرل فُلر کا تبصرہ

اس صدی کے ایک مشہور مورخ اور مبصر میجر جنرل فُلر نے دنیا کی عسکری تاریخ پر جتنی کتابیں لکھی ہیں اتنی کسی اور مبصر نے نہیں لکھیں۔سب کتابوں کی تفصیل پر بات لمبی ہو جائے گی۔لیکن اُس کی تین کتابوں کا ذکر ضروری ہے۔جس میں اُس نے دنیا کی ڈیڑھ سو سے زیادہ اُن جنگوں کے واقعات تجزیئے پیش کیے ہیں جو اُس کے لحاظ سے فیصلہ کن تھیں۔

اب فیصلہ کن جنگ وہ ہوتی ہے جس کے نتائج تاریخ پر اثر کریں یا تاریخ کا دھارا تبدیل کر دیں۔یا لڑائی کے فن یا تدبیرات یا حکمت عملی میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا ہو۔تاریخ کے دھارے میں تبدیلی کی صورت میں سیاسی تجزیئے اور فوجی خوبیوں میں پیش رفت کے سلسلے میں حربی داؤ کے تبصرے پیش کرنے پڑتے ہیں۔ہماری اِن کتابوں میں اسی پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اسلام کی ہر جنگ سیاسی تبدیلی لانے کے لیے کچھ کاروائی تھی یا فیصلہ کن تبدیلی لائی اور جنگی حکمت عملی،تدبیرات اور فن حرب کے میدان میں مسلمانوں نے دنیا کو حیران کر دیا اور بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی اِس لیے اہل اسلام کی ساری جنگیں فیصلہ کن ہیں لیکن چند جنگوں کو تو بڑی فوقیت حاصل ہے جن میں جنگِ بدر،جنگِ اُحد،جنگِ خندق،جنگِ موتہ،جنگِ یمامہ،جنگِ سلاسل،جنگِ قادسیہ،جنگِ نہاوند،جنگِ اجنادین اور جنگِ یرموک سیاسی اور فوجی لحاظ سے دنیا کی بہت بڑی فیصلہ کن جنگیں ہیں۔

اہل مغرب کا تعصب

لیکن تعصب سے اندھے جنرل فلر نے جو مغرب دنیا کی ڈیڑھ سو سے زیادہ لڑائیوں یا جنگوں کا ذکر کیا ہے ان میں پچھلے چودہ سو سال میں واقعہ ہونے والی مسلمانوں کی صرف تین یا چار جنگوں کا ذکر کیا ہے۔ایک الپ ارسلان کی جنگ ایک صلاح الدین ؒ کی جنگ ایک ہسپانیہ میں مسلمانوں کی شکست اور ایک سلطنت عثمانیہ کی جنگ مغربی دنیا کے زمانہ قبل از مسیح کی بھی پندرہ بیس جنگوں کا ذکر کر دیتا ہے جن کے اثرات چند سالوں کے بعد مٹ گئے۔اصل بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا نام نہیں لینا چاہتے اور لیں بھی،تو بڑے تعصب کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن ہر ایک کی ڈفلی الگ الگ ہے۔گلب کا تعصب یہ ہے کہ مسلمان جنگجو کیوں ہیں؟فلر کا تعصب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جنگجویانہ کاروائیوں پر پردے ڈالے جائیں۔اب سب جنگوں کے اثرات کو دہرانے کی بجائے اگر صرف اجنادین کی جنگ کو لیں کہ اس فتح نے شام کی فتوحات کے دروازے کھول دیئے اور صدیوں پرانی اہل روم کی سلطنت کو ایسا دھچکا لگا کہ اُس کے پرخچے اُڑنے شروع ہو گئے۔اور یہ جنگ دراصل اب بھی جاری وساری ہے،ایک طرف اہل حق ہیں یعنی مسلمان۔اور ادھر اہل باطل، کبھی اہل روم کے روپ میں کبھی صلیبیوں کے روپ میں اور کبھی یہودیوں کے روپ میں۔پھر باطل نے سوداگروں کا روپ دھارا۔اور سوداگر بن کر پہلے ہماری تجارت پر قبضہ کیا،باطل فلسفہ پھیلایا۔ہمارے اندر داخلی خلفشار پیدا کیا۔ہمیں عرب اور ترک بنایا،ہماری وحدت کو پارہ پارہ کیا اور یہ کام اب بھی جاری وساری ہے۔تو سیاسی لحاظ سے جنگ اجنادین اتنی فیصلہ کن تھی اور فوجی لحاظ سے متحرک طرز جنگ والوں نے بھاری بھرکم فوجوں کو تہس نہس کر دیا۔بندوبستی دم نہ رکھنے سے ہلکے پھلکے ہو کر فوجوں میں جو حرکت پیدا ہوئی تو دنیا ''چھوٹی'' ہو گئی اور دور دراز کے علاقے نزدیک ہو گئے۔لیکن جنرل فُلر کو اُن میں سے کوئی بات بھی نظر نہ آئی۔

جنرل فُلر کی کتاب

چنانچہ جنرل فلر کی یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ہمارے ملک کی کوئی ہی فوجی لائبریری یا فوجی یونٹ ہوگی جس میں یہ کتاب نہ ہو۔بلکہ پاکستان میں اس کتاب کی دوہری اشاعت کا بندوبست ہوا۔یہ فلر اپنی چیونٹیوں کو ہاتھی بنا کر پیش کرتا ہے اور ہمارے شیر بھی اُس کو نظر نہیں آتے اور حضور پاک ﷺ کے زمانے سے لے کر اجنادین کی جنگ تک تمام واقعات کو جس طرح بیان کرتا ہے۔بہتر ہے کہ اُس کو نقل کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا جائے اور پھر قارئین خود ہی فیصلہ کریں کہ یہ لوگ تعصب کی وجہ سے کس طرح اندھے ہو جاتے ہیں۔جنرل موصوف لکھتے ہیں:۔

''جب مارچ ۶۳۰ءعیسوی میں اصلی صلیب عیسائیوں کو مل گئی تو ایک نیا جھگڑا شروع ہو گیا جو ایک ہزار سال جاری رہا۔اسی سال کے موسم خزاں میں (حضرت) محمد[۱] (ﷺ) نے بہر (بدر) کی جنگ جیت کر عرب کی حکومت

(۱) [illegible] کے اندر کے الفاظ فلر کے نہیں۔وہ مضمون کو واضح کرنے یا ادب کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

سنبھال لی۔ ہاں ایک مہم جو مسلمانوں نے موتہ کے مقام پر بھیجی اس کو رومیوں کی ایک سرحدی چوکی نے شکست دے دی، اس کے تین سال بعد مسلمانوں کے پیغمبر وفات پا گئے تو چونکہ اُن کا کوئی بیٹا نہ تھا تو (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اُن کے جانشین بنے۔ عرب قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور جگہ جگہ بغاوت ہوگئی لیکن آخر عقربہ کے میدان (جنگ یمامہ) میں (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) بن ولید نے اہل مکہ (بنوحنیفہ) کو شکست دے دی اُس کے بعد فتح مند ہو کے پانچ سو جوانوں کے ساتھ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) کو عراق بھیج دیا اور تین چھوٹے چھوٹے دستے شام میں عیسائی عربوں کی مدد کے لیے بھیج دیئے کہ ان لوگوں نے مسلمانوں سے مدد طلب کی تھی کہ وہ بازنطینی (روم) حکومت کو ٹیکس نہیں دینا چاہتے تھے۔

جب یہ چھاپہ مار دستے شام کی طرف آئے تو ہرقل اس زمانے میں شام میں تھا اور اُس کو عیسائی عربوں پر بھروسہ تھا اس لیے اُس نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے کوئی تیاری نہ کی۔ لیکن اب ان حالات کے تحت اُس نے اپنے بھائی کو فلسطین بھیج دیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کیا جائے۔ جب (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) کو اس کا پتہ چلا تو وہ بجلی کی تیزی سے حیرہ سے پا مریا ہوتے ہوئے دمشق کے نزدیک پہنچ گئے اور وہاں بڑی مشکل کے ساتھ باقی تین دستوں کے ساتھ مل سکے اور آگے یروشلم (بیت المقدس) اور غزہ کے درمیان اجنادین کے مقام پر ایک شاندار فتح حاصل کی۔"

تبصرہ

قارئین! دروغ گوئی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اوّل تو ساری اسلامی تاریخ کو چند لفظوں میں بیان کر کے حالات کو کمتر کرنے کی یہ ایک فضول کوشش ہے۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے کی اُس کو صرف دو لڑائیاں نظر آئیں اور مرتدین کی مہمات میں صرف یمامہ کی جنگ، پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پانچ سو جوانوں نے سارا عراق فتح کر ڈالا۔ یہی نہیں بلکہ حیرہ سے ان پانچ سو جوانوں نے ایک ہزار میل سے لمبا سفر اس لیے طے کیا کہ تین مسلمان دستوں کو مدد دینا تھی، تو ان دستوں کی تعداد پانچ سو سے ضرور کم ہوگی کہ اتنے دور سے پانچ سو آدمی ان کی مدد کو آئے۔ اور شاید فی دستہ اگر پانچ سو کی تعداد بھی مان لیں تو کل دو ہزار آدمیوں سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اجنادین کے مقام پر بقول جنرل فلر "شاندار" فتح حاصل کی۔ شاندار کا لفظ لکھ کر جنرل فُلر نے اپنے پچھلے تعصب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اب اگر ہم اہل مغرب کے تعصب اور سازش کے مضمون میں چلے گئے تو اپنے مقصد سے دور چلے جائیں گے۔ البتہ پانچویں باب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کے تحت اسلام کے سپہ سالاروں کے کوچوں اور جنگی حرکت کی کچھ تفصیل دے کر ہم اپنا پہلو ضرور اُجاگر کریں گے۔ اور یہاں پر صرف یہ اضافہ کریں گے کہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم جنرل فُلر اور جنرل دیول جیسے لوگوں کی کتابوں سے "علم" سیکھنا چاہتے ہیں:

خدا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، فرد کی معموری

(اقبالؔ)

نتائج واسباق

۱۔ جنگ اجنادین اہل روم کے خلاف پہلی بڑی فتح تھی اور اس کی وجہ سے شام وفلسطین میں اہلِ اسلام کے لیے دروازے کھل گئے اور چند سال بعد ان ملکوں میں اللہ ﷻ اور رسول ﷺ کا نام بلند ہونا شروع ہو گیا اور گو یہ علاقے اکثر میدانِ جنگ بنتے رہے اور باطل یہاں آ کر ہمیشہ ہمارے ساتھ ٹکر لیتا رہا، لیکن اہل حق نے بھی ان علاقوں میں بڑی بڑی قربانیاں دے کر اللہ ﷻ اور رسول ﷺ کا نام بلند رکھا۔ اسی خطے میں عمادالدین زنگیؒ، نورالدین زنگیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، سلطان بیبرسؒ وغیرہ نے صلیبیوں کی یلغار کو روکا اور اس خطے کے مجاہدین نے منگولوں کے سامنے دیوار بن کر قربانی دی اور یہاں آج کل بھی ایک فتنہ برپا ہے اور اللہ کے بندے قربانی دے رہے ہیں۔

۲۔ اسی جنگ میں مسلمانوں نے اپنی متحرک کارروائیوں کا لوہا منوایا اور پہلی دفعہ ریگستان سے تھوڑا آگے نکل کر زرخیز، علاقوں میں جنگ کر کے اپنی اعلیٰ تر حکمت عملی اور تدبیرات کو چار چاند لگا دیئے۔

۳۔ مسلمان کا کوچ، بروقت اجتماع، بغیر بندوبستی دم کے گزارہ، جذبۂ جہاد، حیران کن کارروائیاں، فلسفۂ حیات، حربی خوبیاں، جھپٹنے پلٹنے کا طریقہ ایک ایک پہلو میں ہمارے لیے اسباق موجود ہیں۔

۴۔ جنگ کے لیے صحیح صف بندی، جس کو آج کل صحیح دفاعی پوزیشن کہتے ہیں۔ فوجی تدبیرات کا بنیادی پہلو ہے اور مسلمان ہمیشہ ایسی صف بندی کرتے تھے جس کو جلد متحرک کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے دفاعی پوزیشن بھی ایسے ہونے چاہئیں جن کو متحرک کیا جا سکے۔ دشمن پر حملہ یا جوابی حملہ، مسلمانوں نے حضور پاک ﷺ کی سنت کے طور پر اکثر بعد دوپہر کیا۔ بے شک ایسا کرنے سے دشمن کے پاس ردِعمل کے لیے روشنی کے اوقات تھوڑے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں بھی اس پہلو کا اور مطالعہ کرنا چاہیے۔

۵۔ حیران کن کارروائی، حضرت ضرارؓ کی دشمن کے ساتھ ''کبڈی'' مبارزت میں دشمنوں کو نیچا دکھانا۔ حملہ کر کے شیر کی طرح جھپٹنا اور پھر پلٹ کر جھپٹنا، دشمن کے مکروفریب اور دغابازی کا بروقت قلع قمع، سب ایسی کارروائیاں ہیں جن سے مومن کی فراست ٹپکتی ہے۔ اگر ہم ایسی فراست کے خواستگار ہیں تو یہ ہمیں انگریزی سکولوں یا غیروں کے مکتبوں میں نہ مل سکے گی:

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے! مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

پرورش دل کی اگر مدِنظر ہے تجھ کو
مردِ مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

(اقبالؔ)

''مجراب گل افغان کے افکار''

۶۔حضور پاک ﷺ سے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق تعاقب کرنا اور تعاقب میں دشمن کا اور زیادہ نقصان کرنا یعنی فتح کے فوری ''عطیات'' اور ثمرات وصول کرنا یہ بھی اہم فوجی سبق ہیں لیکن بڑا فوجی سبق یہ ہے کہ فتح کو جاری و ساری رکھا جائے جس کا ذکر اگلے باب میں ہے کہ مومن کی منزل کی کوئی انتہا نہیں:۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن
قدم اُٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

''مجراب گل افغان کے افکار'' (اقبالؔ)

۷۔مسلمانوں کے وادی یرموک کو چھوڑ دینے سے اہل روم کا ایک فوری ردِ عمل بھی تھا۔شمالی شام میں جو افواج موجود تھیں وہ جلدی سے وادی یرموک،طبریہ،بیسان اور فحل کے علاقوں میں آ گئیں۔ بلکہ کچھ دستے عمان تک بھی پہنچ گئے۔پہلے بیان کیا گیا ہے کہ اہل روم نے اُردن میں بہت کم فوج رکھی ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ دوسری دفعہ مسلمان یرموک کی وادی تک آسانی سے پہنچ گئے۔ پہلی دفعہ گو حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی فوجوں کو ناکامی ہوئی۔لیکن دوسری دفعہ مسلمان اپنی مرضی سے وادیِ یرموک سے کوچ کر کے اجنادین چلے گئے۔اہلِ روم کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے خالی کیے ہوئے علاقوں پر قبضہ کے لیے مضبوط فوج بھیجیں اور اُنہوں نے ایسا کیا کہ اجنادین میں فتح یا شکست یا معاملات کے بین بین ہوتے ہوئے بھی ضروری تھا کہ اہلِ روم اب تمام بلادِ شام میں جگہ جگہ مضبوط فوجی چوکیاں بنائیں بہر حال اجنادین کی شکست کے بعد رومیوں کی جو فوج بھاگی وہ بھی یرموک اور فحل وغیرہ کے مقامات پر جا کر رُک گئی۔تو اب اجنادین کی جنگ کے بعد مسلمانوں کو کچھ ایسے علاقے بھی دوبارہ فتح کرنے پڑے جہاں پہلے وہ آسانی کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔اس حکمت عملی کی وضاحت پانچویں اور چھٹے باب میں کی جائے گی۔

۸۔آخر میں ہم مسلمانوں کی کامیابی کا سبب بھی بیان کریں گے۔ان کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ حق کے لیے لڑتے تھے حق کے لیے لڑنے والے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ اُن کو غیرت عطا کر دیتا ہے۔علامہ اقبال ؒ نے اسی غیرت کو خودی کا نام دیا ہے۔لیکن بعض لوگوں نے علامہ کے لفظ خودی کو پسند نہیں کیا کہ اس سے تکبر کی بو آتی ہے اور ایسے لوگوں میں کئی فقراء اور سید قطب شہید ؒ بھی شامل ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ مسلمان عاجز ہے اور خودی کے لفظ سے اگر تکبر نہ بھی آئے تو غلط قسم کا تفاخر ضرور آ جاتا ہے اور جو غیر اسلامی ہے۔ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے

اور نہ اس بحث کی یہ جگہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ علامہ کا خودی سے مطلب غیرت تھا۔ اور غیرت بالکل اسلامی چیز ہے اپنی اس رائے کے سلسلے میں علامہ اقبال کا یہ شعر ثبوت مہیا کرتا ہے:

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُوسیاہی

پانچواں باب

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت

یرموک کی پہلی جنگ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جمادی الثانی تیرہ ہجری کے پہلے دس بارہ دنوں میں اجنادین کی فتح کی خوشخبری سن لی تھی اور عراق و شام کی فتوحات کے لیے جس حکمت عملی کے بڑے "زماں و مکاں" کے حساب کتاب کا انہوں نے تعین کیا تھا، وہ پھل لے آئی۔ اس کے بعد آپ بیمار ہو گئے۔ اور اسی بیماری کے دوران عراق سے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، جنہوں نے بابل کی فتح کی خوشخبری سنائی لیکن ساتھ ہی آئندہ کے حالات کے پیش نظر ایران و عراق میں اور زیادہ کمک کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ سب کچھ ہم پہلی کتاب کے سترھویں باب میں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی سوا دو سال یا اس سے بھی کم مدت میں جو فوجی کاروائیاں سرانجام دیں یا جن فوجی مہمات سے کام لیا۔ اُن کو اگر دنیاوی پیمانوں سے بھی ناپا جائے تو اُن کے عشر عشیر کی مثال بھی مشکل سے ملتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کچھ کر گئے، ہمارے لیے بڑی مشکل پیدا کر

گئے کہ ہم اُس سے آدھا کام کرنے کے بھی قابل نہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کتاب کے سترھویں باب میں جہاں حضرت صدیق اکبر ؓ کا ذکر آیا تو واضح کیا گیا تھا کہ آپ کی وفات اور آپ کی کاروائیوں کا خلاصہ سلسلہ دوم میں پیش کیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم آپ ؓ کے زمانے میں شام کے حالات اور حکمت عملی کے بیان کے بعد اپنا تجزیہ پیش کرنا چاہتے تھے۔

حضرت صدیق اکبر ؓ کی متحرک کاروائیاں

سلسلہ اول کے پہلے دس نقشوں اور اس حصہ کے چار نقشوں کے مطالعہ سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر ؓ کے زمانے میں کتنی متحرک کاروائیاں ہوئیں، پہلے آٹھ ماہ میں جو گیارہ لشکر تیار کیے گئے ان میں سے اکیلے حضرت خالد ؓ کے سفر کو اگر ناپا جائے تو وہ ایک ہزار میل کے قریب بنتا ہے اور اسی طرح نو اور لشکروں نے اتنے ہی لمبے یا اُس سے کچھ زیادہ سفر کیے پھر یمامہ سے کاظمہ ہوتے ہوئے حیرہ تک حضرت خالد ؓ نے کم از کم ایک ہزار میل کا سفر طے کیا اور اتنا ہی اجنادین تک۔ لیکن حیرہ سے عین التمر۔ دومۃ الجندل اور فراض وغیرہ کی مہمات الگ تھیں۔

تو اکیلے حضرت خالد ؓ نے حضرت صدیق اکبر ؓ کے زمانے میں کم از کم پانچ ہزار میل کا تو صرف سفر ہی طے کیا۔ اب پہلے نو لشکروں کے علاوہ چار اُن لشکروں کے سفر کو بھی گنا جائے جو اب فتوحات شام کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تو تمام لشکروں کے سفر جو حضرت صدیق اکبر ؓ کے زمانے میں ہوئے وہ کوئی بیس ہزار میل کے قریب بنتے ہیں جو علاقے فتح کیے وہ کئی ہزار مربع میل تھے۔

سرسری طور پر فتوحات کا اندازہ نقشہ دوم سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ خود مختار طور پر سترہ سپہ سالاروں نے آپ کی ہدایات پر ایک یا ایک سے زیادہ مہمات یا فتوحات کی کمانڈ کی جن میں حضرت خالد ؓ، عمرو بن عاص ؓ، شرجیل ؓ، طریفہ ؓ، خدیفہ ؓ، عرفجہ ؓ، علا ؓ، مہاجر ؓ، سوید ؓ، خالد بن سعید ؓ، عکرمہ ؓ، ولید بن عقبہ ؓ، ابوعبیدہ ؓ، یزید ؓ، عیاض ؓ بن غنم ؓ، مثنیٰ ؓ اور عتبہ ؓ بن غزوان شامل ہیں۔ اتنے لشکر تیار کرنا اُن کو ہدایات دینا، اُن کو کمک پہنچانا اور زماں و مکاں کا حساب کر کے اُن سے کام لینا تو دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے اول مرتدین کا قلع قمع کیا پھر فتوحات کو بین الاقوامی حیثیت دی۔

سیاسی نتائج

جنگ یا جنگ کی حکمت عملی کا اندازہ جنگوں کے سیاسی نتائج سے لگایا جاتا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانے کی جنگوں کے سیاسی نتائج اتنے عظیم ہیں کہ دنیا کا کوئی پیمانہ اُن کو نہیں ناپ سکتا۔ قوم میں وحدت اور مرکزیت پیدا

کرنے کے علاوہ آپ کی وفات کے وقت مسلمانوں کے لشکر ایک طرف ایرانی دارالخلافہ مدائن میں داخل ہونے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں مصروف تھے تو دوسری طرف رومی سلطنت کے ایشیائی دارالخلافہ حمص میں داخل ہونے کے لیے رواں دواں تھے بلکہ ان دونوں مقامات کے دروازے بھی کھٹکھٹا آئے تھے بے شک حضور پاک ﷺ کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دنیا کے دوسرے نمبر کے عظیم ترین سپہ سالار اعظم ہیں۔

زماں ومکاں

آپ کی حکمت عملی، تجاویز اور تدبیرات کے ''زماں ومکاں'' کے پہلو کی خاص قسم کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور یہ الگ باب کا موضوع ہے۔ ہم گنہگار اس سلسلہ میں جو سمجھ سکے وہ بیان کر دیا لیکن یہ مطالعہ چونکہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے اور صرف وہ لوگ اس میں غوطے لگا سکتے ہیں جو فوجی حکمت عملی کی خاص شدھ بدھ رکھتے ہوں۔ اس لیے اس پہلو کی خواص کو مطالعہ کی دعوت دی جاتی ہے۔ ہم صرف سرسری طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی تمام تر تجاویز اور حکمت عملی کی بنیاد اُس فلسفۂ حیات اور زندگی کے اُن مقاصد پر تھی جو قرآنِ پاک میں موجود ہیں اور حضور پاک ﷺ نے اُن کا عملی نمونہ پیش کیا جس کو ہم سنت رسول ﷺ کہتے ہیں۔ قارئین نے نوٹ کیا ہوگا کہ اس گنہگار اور فقیر کے قلم سے حضرت عبداللہ عتیق کے لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہی نکلے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کسی کسی جگہ ہے کہ اشاریہ بناتے وقت حوالوں میں آسانی ہو۔ لیکن جب کسی عقدہ یا راز والی بات کا ذکر تھا تو الفاظ ''یارِ غار'' لکھے گئے۔

کوئی لکھنے والا جو اپنے دل کی آواز لکھے وہ اپنے قلم کے لیے کسی ایسے اصول کا تعین نہیں کرتا۔ قلم خود بخود ایسے الفاظ لکھ جاتا ہے۔ ''یارِ غار رضی اللہ عنہ یا چار یار رضی اللہ عنہم'' وہ الفاظ ہیں جو ہم نے زیادہ تر اپنے بزرگوں سے سنے ہیں۔ لکھنے والے لوگوں نے یہ الفاظ کم استعمال کیے ہیں۔ دراصل بچپن میں اس سلسلے میں جو کچھ ہمیں سمجھایا گیا وہ یہ تھا کہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بلندیوں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ پھر وہاں بھی اہل بیت، اہل صفہ اور عشرہ مبشرہ کی الگ بانٹ ہے۔ لیکن چار یار والی بات کی بلندیوں کو کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی کہ وہ کچھ باتوں میں ہم راز تھے۔ یہاں لفظ ''کچھ'' استعمال کیا گیا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی شخصیت کو سمجھنے سے یارِ غار رضی اللہ عنہ نے بھی عاجزی کا اظہار کیا ہے۔

یارِ غار رضی اللہ عنہ

بہرحال ''یارِ غار رضی اللہ عنہ'' اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطاب صرف اور صرف حضرت عبداللہ بن ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کے لیے ہیں اور ان میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یعنی ایسا صدق اور ایسا امنا وصدقنا جو سب سے بڑا ہے، وہ صرف آپ رضی اللہ عنہ تک محدود ہے، اور سپہ سالاری کے کاموں میں حضور پاک ﷺ کے بعد آپ کو دوسرے نمبر پر رکھنے میں ایک طرف اگر اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا ہے تو دوسری طرف ان فتوحات کی حکمت عملی میں یارِ غار رضی اللہ عنہ کے طور پر آپ حضور

پاس ﷺ کے ہمراز تھے کہ حضرت اسامہ بن زید ؓ کے لشکر کو امنّا و صدقنا کے تحت بھیجا گیا لیکن ہمراز ہونے کی وجہ سے نتائج سے بھی آگاہ تھے۔ چنانچہ فوجی حکمت عملی جس ''زماں ومکاں'' کے تحت تعین کی گئی کہ ایک کاروائی۔ اُس سے فتح، اور فتح سے آگے کاروائی پھر رواں دواں یہ سب پہلو اتنے دقیق اور عمیق ہیں کہ اس کی گہرائی میں جتنے غوطے لگائے جائیں یا وسعتوں کو ناپنے کی کوشش کی جائے یا بلندیوں کی طرف نظر کی جائے یا باریک بینی سے دیکھا جائے تو معاملات اور زیادہ گہرائی اور پھیلاؤ وغیرہ اختیار کرتے جاتے ہیں اور ہم اس سلسلہ میں ان تمام کمالات کی وجہ علامہ اقبال کی زبان میں بیان کرتے ہیں:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق ؓ کے لیے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

(اقبالؔ)

آخری لمحے

اور پھر یارِ غار ؓ نے پوچھا آج کون سا دن ہے؟ عرض کی گئی کہ سوموار۔ فرمایا! ''بخدا میرے لیے یہ عزیز ترین دن ہے کہ میرے آقا ﷺ نے اسی دن اِس جہانِ دنیا سے رحلت فرمائی۔ اور میں بھی اسی دن اس جہاں سے رخصت ہو کر آپ ﷺ کی صحبت میں شامل ہونا پسند کروں گا۔'' پھر حضرت عائشہ ؓ کو بلایا اور فرمایا: ''بیٹی! حضور پاک ﷺ کا کفن کتنی چادروں کا تھا۔'' حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: ''تین چادروں کا۔'' تو جناب صدیق اکبر ؓ نے فرمایا کہ بخدا یہ پرانی چادر جو میں نے پہنی ہوئی ہے۔ اس کو شامل کر کے دو اور چادریں لے لینا اور میرے جسد خاکی کو میرے آقا ﷺ کے پہلو میں لٹا دینا اور میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ آج رات ہی مجھے دفن کر دینا۔''

قارئین! ہم حضرت صدیق اکبر ؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں۔ ہم جائزہ تو فوج حکمت عملی کا پیش کر رہے ہیں جو سراسر جلال ہی جلال ہے۔ لیکن جمال پیدا کرنے کے لیے عشق ومحبت کی باتوں کا بیان ضروری ہوتا ہے، اور پھر یہ بھی ہمارے فلسفۂ حیات کا حصہ ہیں اور فوجی حکمت عملی کی بنیاد بھی فلسفۂ حیات کے ڈھانچے پر ہوتی ہے اور ہاں آپ ؓ اُسی رات وفات پا گئے اور آپ ؓ کا جنازہ آپ کے نامزد جانشین حضرت عمر ؓ نے پڑھایا۔

حضرت فاروق اعظم ؓ کی خلافت

کتابوں کے اس سلسلے کے سلسلہ اول میں حضرت فاروق اعظم ؓ کی خلافت کے لیے نامزدگی کا سترھویں باب میں ذکر ہے کہ کس طرح حضرت صدیق اکبر ؓ نے آپ کو ایران وعراق کی فتوحات کے لیے حکمت عملی کے تحت

حضرت مثنیٰ بن حارث ؓ کو ملک بھیجنے کی ہدایات فرمائیں۔ ہم یہاں سب باتوں کی تفصیل میں نہ جائیں گے، اور صرف چند پہلوؤں کی وضاحت کریں گے۔

حضرت عمر فاروق ؓ کو حضرت صدیق اکبر ؓ نے نامزد فرمایا۔ آپ کا حضرت عمر فاروق ؓ کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہ تھا اور نہ اسلام سے پہلے حضرت فاروق ؓ، حضرت ابوبکر ؓ کے رفقاء میں شامل تھے جنہوں نے صدیق اکبر ؓ کی تبلیغ یا رفاقت کی وجہ سے اسلام قبول کیا اُن رفقا میں حضرت عثمان ؓ، حضرت طلحہ ؓ حضرت زبیر ؓ حضرت ابوعبیدہ ؓ اور حضرت سعد ؓ وغیرہ کا ذکر تو آتا ہے۔ لیکن حضرت عمر ؓ کا حضرت صدیق اکبر ؓ کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں بتایا جاتا۔

حضرت صدیق اکبر ؓ کا حضرت فاروق ؓ کے ساتھ بڑا رشتہ تو اللہ اور رسول کے واسطہ سے تھا، لیکن ایک پہلو واضح تھا کہ دونوں نے مل کر جتنی حضور پاک ﷺ کی رفاقت کی وہ کسی اور صحابی کو نصیب نہ ہوئی۔ خود حضرت علی المرتضیٰ ؓ نے روایت کی ہے کہ حضور پاک ﷺ جب کبھی اپنے مشاہدات بیان فرماتے تھے تو اکثر اس طرح بات کی بنیاد باندھتے تھے کہ "میں ﷺ، ابوبکر ؓ، عمر ؓ جب فلاں جگہ گئے یا فلاں کام کے لیے گئے اور حضور پاک ﷺ نے یہ الفاظ اس کثرت سے فرمائے اور دہرائے کہ حضرت عمر ؓ کی وفات کے وقت حضرت علی المرتضیٰ ؓ نے فرمایا کہ بے شک حضرت عمر ؓ کو بھی انشاء اللہ حضرت ابوبکر ؓ کی طرح حضور پاک ﷺ کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت نصیب ہوگی۔

کچھ اعتراضات

اسلام دین فطرت ہے اور حصہ اوّل میں اس پہلو کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام میں اپنے اختلافات کھل کر بیان کئے جاتے ہیں اور یہ کام مسجد کے اندر یا باقاعدہ مجلس میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ جن میں حضرت طلحہ ؓ سمیت کئی عظیم صحابہ شامل تھے، انہوں نے حضرت ابوبکر ؓ کی خدمت میں صاف لفظوں میں عرض کر دی کہ اتنے سخت انسان کو مسلمانوں پر کیوں امیر مقرر کر دیا گیا ہے۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے فرمایا بخدا جب میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گا تو یہ عرض کروں گا کہ اے میرے مالک تیرے حبیب ﷺ کی امت میں سے بہترین شخص کو اُمت اسلامیہ کی امامت کے لیے منتخب کر آیا ہوں۔

اب لطف کی بات ہے کہ ہمارے اس زمانے کے دانشور اس اختلاف کو مغرب جمہوریت کا چولا پہنا دیں گے کہ اسلام میں اختلاف باعث رحمت ہے وغیرہ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں کہ حضور پاک ﷺ کا مطلب تو یہ تھا کہ اختلاف کو بحث کے ذریعے حقیقت حال واضح کر کے طے کر لیا جائے۔ اپنی رائے کا اظہار ضرور کیا جائے لیکن امیر یا اولی الامر کا

فیصلہ سن لینے کے بعد اختلافات ادھر ہی ختم ہو جانے چاہئیں اسلام اختلافات کو بازاروں یا سڑکوں یا کھلے میدانوں میں لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کھلے میدانوں میں یا عید کی نماز پڑھ کر عاجزی کرنے کی اجازت ہے یا نمازِ شکرانہ یا نمازِ استسقا کہ جہاں اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے کھلے میدانوں میں جلسہ جلوس اور فضول نعروں کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

حضرت فاروق کا لقب

تیسرا پہلو جس کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کے لقب سے سرفراز کیا یعنی آپ امتیازی طور پر حق و باطل میں فرق کرنے والے تھے اور اس خصوصیت میں آپ غلامانِ محمد ﷺ میں ایک نمونہ ہیں۔ یارِ غار رضی اللہ عنہ نے صدق کے ساتھ اپنے آقا ﷺ کے احکام کو جاری و ساری کیا۔ اس لیے اُن کا خیال تھا کہ ایک ایسے عظیم انسان کی ضرورت ہے کہ جو حق و باطل میں فرق سمجھ سکے اور حضور پاک ﷺ کے احکام کو صحیح طور پر سمجھ کر جاری و ساری رکھ سکے۔

نتائج و اثرات

چوتھا ضروری پہلو یہ ہے کہ سلسلہ اول کے پیش لفظ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہم تاریخ کا تجزیہ نتائج اور نتائج کے اثرات سے بھی کریں گے، اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے کی کاروائیوں کے نتائج اور نتائج کے اثرات کو بیان کر کے اس امت کا سر اس دنیا میں بہت بلند ہو جاتا ہے اور ان واقعات پر کتابوں کی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ اور روزِ قیامت کو بھی حضور پاک ﷺ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ہماری اُمت کی ایک مثالی شخصیت کے طور پر پیش کریں گے۔

وحدت اور مرکزیت

پانچواں اور آخری پہلو یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جس وحدت اور مرکزیت کو قائم رکھا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس مرکزیت کو اس طرح مضبوط رکھا۔

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی اُخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

(اقبالؔ)

وادیٔ یرموک

گو جنگ اجنادین سے پہلے مسلمان وادیٔ یرموک تک پہنچ گئے تھے اور وہاں سے آگے بڑھ کر بصریٰ کے قلعہ

کو بھی فتح کر لیا تھا۔ بلکہ حضرت خالدؓ دمشق کے نواحی قلعہ جات کے دروازوں کو بھی کھٹکھٹا آئے تھے، لیکن یرموک کی وادی میں کوئی بڑی جنگ نہ ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ہرقل کی اُردن کے علاقے میں کوئی بڑی فوج موجود نہ تھی اور کتابوں کے اس سلسلہ کے حصہ اول میں ہم یہ بات بھی کہہ چکے ہیں کہ یرموک کی وادی کئی دفعہ فتح ہوئی اور وہاں پر دو جنگیں بھی ہوئیں اس لیے کچھ واقعات کو آپس میں ملا دیا گیا۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق یرموک کی پہلی جنگ، اجنادین کی جنگ کے فوراً بعد جمادی الثانی رجب تیرہ ہجری میں ہوئی اور بعض مورخین نے اس کو واقوصہ کی جنگ قرار دے دیا کچھ نے اس کو یاقوصہ کی گھاٹی کی جنگ لکھا لیکن اگر معاملہ کی گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں۔ اب چونکہ یرموک کی دوسری جنگ اور اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ بھی رجب کے مہینہ میں ہوئی جس کا مفصل ذکر آٹھویں اور نویں باب میں ہے اور گو وہ واقعہ پندرہ ہجری کا ہے لیکن دونوں حالتوں میں مہینہ رجب ہونے کی وجہ سے ان دونوں جنگوں کو بھی ایک کر دیا گیا۔ پھر چونکہ پرانے زمانے میں نقشوں کا استعمال نہ ہوتا تھا۔ زمینی فاصلے اور وقت یعنی زماں و مکاں کی گہرائیوں کا خیال نہ رکھا جاتا تھا اس لیے ایسے اختلافات بڑھتے ہی گئے۔ ساتھ ہی تاریخ کا بامقصد مطالعہ اور خاص کر عسکری تاریخ کا بامقصد مطالعہ سب سے پہلے انیسویں صدی عیسوی میں کلاسوٹز نے شروع کیا، کہ اُس نے فلسفۂ جنگ کی وضاحت تاریخی مطالعہ سے کی، لیکن اسلامی عسکری تاریخ کا بامقصد مطالعہ تو کیا ہی نہیں گیا۔ کسی نے بھی گہرائی یا ریسرچ کی کوشش نہیں کی۔

مبصرین اور نقادوں کے تجزیے

بہرحال یہ عمل بڑا خوش کن ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جنرل جان گلب اور جنرل اکرم نے اسلامی عسکری تاریخ کی گہرائی میں جانے کی کوشش کی۔ مبصرین اور نقادوں کا کام بڑا مشکل ہے۔ یہ ایک پیچیدہ ہنر ہے لیکن بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ ہر مبصر اور نقاد ہمیشہ سے کچھ فیصلے اپنے طور پر کر لیتا ہے یا کسی تعصب کی وجہ سے اُس نے ایک راستہ اختیار کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مبصر اور نقاد بھی بعض معاملات کو بین، بین ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ جنرل گلب کے بیانات تو بڑے مختصر ہیں اور اس نے اپنے جائزوں کو صحیح ثابت کرنے کی زیادہ کوشش بھی نہیں کی۔ جنرل اکرم نے البتہ بہت محنت کی ہے گو ان کے طرز بیان کے ساتھ ہمیں اختلاف ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اُن کے تجزیئے سو فی صدی صحیح ہوں اور نہ ہی راقم کا کوئی ایسا دعویٰ ہے کہ یہ تجزیئے صحیح ہیں۔ بہرحال کوشش آپ کے سامنے ہوگی اور آپ کو جو رائے صحیح معلوم ہو اُسی کو اپنا لیں۔

نقادوں کے اختلاف

چنانچہ اجنادین کی جنگ سے لے کر یرموک کی وادی کے واقعات فحل کی مہم یا فتح اور دمشق کی فتوحات کے سلسلے

میں جنرل اکرم اور جنرل گلب میں زماں ومکاں کے سلسلے میں کافی اختلافات ہیں اور میرا مطالعہ جنرل گلب کے تجزیہ کے زیادہ قریب ہے اور میں اس کی وضاحت بھی کروں گا۔ مجھے جنرل اکرم کے اس تجزیہ کے ساتھ اتفاق نہیں ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دمشق کے محاصرہ کے قریب سپہ سالار اعظم کے رُتبہ سے ہٹا کر یہ رُتبہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دیا گیا۔ میرے لحاظ سے یہ واقعہ یرموک کی وادی کا ہے، اور مجھے جنرل اکرم کے اس تجزیہ کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کہ اجنادین کی فتح کے بعد اسلامی لشکر چار جنگیں لڑ کر یا جھڑپیں کر کے پندرہ سے بیس دنوں میں اڑھائی سو میل یا اُس سے زیادہ فاصلہ بھی طے کرے۔ جنرل اکرم نے دمشق کی فتح کے سلسلے میں واقدی کے ایک بیان کا سہارا لیا ہے۔ واقدی کہتا ہے کہ اُس نے وہ عہد نامہ دیکھا تھا جو مسلمانوں نے دمشق کی فتح کے وقت وہاں کے باشندوں یا فرار ہونے والے رومی لشکر کے ساتھ کیا تھا۔ اس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دستخط تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی سپہ سالار تھے اور چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بنتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار اعظم بنا دیا اور چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ۲۲ جمادی الثانی تیرہ ہجری میں خلیفہ بنے۔ اس لیے دمشق رجب تیرہ ہجری میں فتح ہوا ہوگا نہ کہ رجب چودہ ہجری میں گو سب مورخین نے ایسا کہا ہے اور مزید لطف کی بات یہ ہے کہ واقدی خود بھی کہتا ہے کہ دمشق رجب چودہ ہجری میں فتح ہوا۔ اس لیے خود واقدی کے بیان میں تضاد ہے۔

اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ واقدی عہد نامہ پڑھنے میں غلطی کر گیا ہو یا حضرتِ خالد رضی اللہ عنہ نے اس عہد نامہ پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے دستخط کیے ہوں اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن کے دستخطوں کے ثبوت میں دستخط کیے ہوں، پھر یہ قرطاس، عہد نامہ کی نسبت مسلمانوں کے احکام یا حکومت کرنے کا ایک مسودہ تھا۔

زماں ومکاں کا تجزیہ

۱۔ جنگ اجنادین یکم جمادی الثانی تیرہ ہجری کو ختم ہوئی۔ اُس جنگ کے بعد وہاں سے وادی یرموک کی طرف روانگی کی تاریخ کے سلسلے میں مورخین خاموش ہیں۔ لیکن ہمارے لحاظ سے تعاقب، تعاقب والوں کی واپسی، مال غنیمت کی بانٹ، زخمیوں کی دکھ بھال، اجنادین تک کے علاقے کا سویلین انتظام مدینہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نتائج کی اطلاع اور آگے کی کاروائی کے سلسلے میں اطلاع دینے کے کام میں دس یا بارہ دن ضرور لگ گئے ہوں گے بلکہ زیادہ مجاہدین کے بال بچوں کو بھی آگے منگوایا گیا۔ اس لیے تمام اسلامی لشکر بیس جمادی الثانی سے پہلے اجنادین کے مقام کو نہ چھوڑ سکے ہوں گے۔

۲۔ پرانے زمانے کے مورخین اجنادین سے یرموک تک کے دوبارہ کوچ کے سلسلہ میں بھی خاموش ہیں کہ کون سا راستہ استعمال کیا گیا۔ جنرل اکرم نے واپسی کے لیے بھی جریشو اور جرش والے راستے کا تعین کیا ہے۔ ہمارے

خیال کے مطابق بحیرہ مردار سے جنوب میں درہ مواب والا راستہ ہی اختیار کیا ہوگا کہ فلسطین میں پیش قدمی کی اجازت نہ تھی اور اس راستے کے نقصانات کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ پہاڑوں کی تنگ وادیوں سے گزرنا تھا اور آگے دریائے اُردن کو بھی پار کرنا پڑتا تھا۔ اونٹ گھوڑوں وغیرہ کو کشتیوں کے ذریعے سے دریا سے پار کرنا آسان نہیں ہوتا۔

۳۔ یرموک اور دمشق جانے کے لیے بیت المقدس والے راستے کو اختیار کرنے سے تو زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ پہلے صوبہ فلسطین کو ہی فتح کر لیا جاتا۔ لیکن خلیفہ اول کی حکمت عملی کے تحت اور بہتر حل کے طور پر پہلے اُردن اور شام کو فتح کرنا تھا اور بعد میں فلسطین کو، کہ اُردن اور شام میں کاروائیوں کے وقت اپنے دوست ریگستان اور اپنے فتح کیے ہوئے عرب وعراق کے سرحدی علاقوں کے ساتھ رابطہ قائم رہتا تھا۔ فلسطین میں جا کر زرخیز علاقوں اور پہاڑوں میں اُلجھ جانا پڑتا اور سمندر پر کنٹرول نہ کیا جا سکتا۔

۴۔ بہر حال اگر جنرل اکرم کے مطابق فلسطین والا اندرونی راستہ اختیار بھی کیا گیا تو اجنادین سے وادئ یرموک تک فاصلہ کوئی ایک سوتیس میل بنتا ہے اور دریا کو بھی عبور کرنا تھا اور پہاڑوں اور وادیوں میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔ دوسرا راستہ زیادہ محفوظ تھا گو فاصلہ کوئی ایک سوستر میل بن جاتا تھا اور دونوں راستوں پر سفر میں کم از کم آٹھ دنوں اور زیادہ سے زیادہ بارہ دنوں کی ضرورت تھی۔ پہلے بھی یہ سفر بارہ دن میں طے ہوا تھا اس لئے اسلامی لشکر یرموک کی وادی یا واقوصہ کی گھاٹی میں جمادی الثانی کے آخری دن یا رَجب کے پہلے ہفتے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتقال ۲۲ رجمادی الثانی تیرہ ہجری کو ہوا۔ جب لشکر کسی کوچ میں ہوں گے یا کسی جگہ دشمن کے ساتھ اُلجھے ہوئے ہوں گے۔

۵۔ ہرقل حمص میں تھا۔ اجنادین کے اجتماع سے وہ بڑا پراُمید تھا اور مسلمانوں کی یرموک سے اجنادین کی طرف چلے جانے کے بعد وہ بہت خوش تھا اس نے جلدی سے اُردن میں یرموک، عمان اور فحل کے مقامات پر فوجیں بھیج دیں کہ اگلے احکام کا انتظار کریں لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب ان مقامات پر اجنادین سے فرار ہونے والے لوگ بھی پہنچ گئے تو ہرقل نے حکم دیا کہ ملک کے چپہ چپہ کا دفاع کیا جائے۔ اس لئے جب اسلامی لشکر اجنادین کی فتح کے بعد واپس اُردن آئے تو یرموک کی وادی میں انہوں نے وہاں پر رومیوں کے ایک بڑے لشکر کو صف بند دیکھا۔

یرموک کی پہلی جنگ

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ واقوصہ کی گھاٹی اور یرموک کی وادی میں مسلمان اہل روم کے ساتھ برسر پیکار تھے۔ تو رجب تیرہ ہجری میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم کا قاصد شداد رضی اللہ عنہ بن اوس وہاں پہنچا۔ قاصد ہوشیار آدمی تھا۔ پوشیدگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور اس خط کا ذکر کسی آدمی کے

ساتھ نہ کیا۔ زبانی طور پر سب کو سلام دیا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ خلیفہ اول نے اجنادین کی فتح کی خبر سن لی ہے وہ بڑے خوش ہیں۔ اور آپ سب کے لیے دعا فرماتے ہیں، جنگ جاری تھی اور کئی دن جاری رہی۔ وجہ یہ تھی دفاعی لحاظ سے یرموک اہم مقام تھا اور رومیوں نے مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد کئی دفاعی چوکیاں یہاں پر قائم کر لی تھیں اس لیے مسلمانوں کو ان چوکیوں کا صفایا کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ لیکن جنگ کی تفصیلات کسی مورخ نے نہیں لکھیں، سب مورخ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد خط کے مضمون کو ظاہر کیا گیا۔ اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے اور سب مورخ متفق ہیں کہ یرموک کی جنگ میں قاصد نے آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط دیا لیکن یرموک کی بڑی جنگ چونکہ پندرہ ہجری میں ہوئی اور پہلی یرموک کی جنگ کو کسی نے واقوصہ کی گھاٹی کی جنگ کہہ دیا اور کسی نے یرموک کی وادی میں ایک جنگ۔ اس لیے سب مورخین جس جگہ آ کر رک جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایسی کون سی جنگ تھی جو کئی دن جاری رہی۔

جنرل اکرم کا تجزیہ

اِن حالات کے تحت جنرل اکرم اپنی کتاب ''اللہ کی تلوار'' میں اس نتیجے پر پہنچے کہ واقوصہ کی گھاٹی میں جنگ صرف ایک دن رہی اور اسلامی لشکر نے مرج الصفر کی جنگ لڑی اور آگے بڑھ کر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کی مدت مورخین نے چھ ماہ سے ایک سال تک بتائی ہے۔ جنرل اکرم نے تجزیہ کر کے اس کو ایک ماہ کر دیا۔ اُن کا خیال ہے کہ مسلمان جب دمشق کا محاصرہ کر رہے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط پہنچا ہمارے لحاظ سے جنرل اکرم کا، زماں و مکاں، کا مسئلہ یہاں پر ٹھیک نہیں رہتا کہ اول محاصرہ کی مدت کو اتنا کم کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور دوم پندرہ بیس دن کے عرصے میں تین سو میل کا سفر بھی کیا جائے اور دو جنگیں بھی لڑی جائیں اور محاصرہ بھی کر لیا جائے۔ تو ہم اپنے پہلے تجزیہ کو دہراتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط قاصد نے یرموک کی وادی ہی میں پہنچایا اور وہاں پر کوئی جنگ جاری تھی جس کو ہم نے یرموک کی پہلی جنگ کا نام دے دیا ہے اور یہی جنرل گلب بھی کہتا ہے۔

یرموک کی پہلی جنگ کے زیادہ واقعات اگر ہماری تاریخوں میں موجود نہیں ہیں تو اُس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ اُس زمانے میں حکومت میں تبدیلی ہو گئی اور مورخین نے جنگ کو ثانوی حیثیت دے دی اور حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے ان کے قلم کا رُخ دوسرے اثرات کی طرف ہو گیا۔

فحل کی وادی (نقشہ چہارم)

اگر نقشہ دیکھیں تو فحل کا مقام جو دریائے اُردن کے مشرقی کنارے پر ہے۔ وہ یرموک کی وادی سے جنوب

کی طرف ہے۔ اگر جنرل اکرم کا اسلامی لشکر کی اجنادین سے واپسی کے راستے کا صحیح تصور کرلیا جائے کہ لشکر فلسطین والے راستے سے یرموک آیا۔ تو پھر یہ سمجھ نہیں آتی کہ مسلمانوں نے دریائے اُردن کو پار کرنے کے بعد جرش کا رُخ کیوں کیا۔ کم از کم فحل کے علاقے سے تو دشمن کی سرکوبی کر کے جرش سے چند میل شمال کی طرف جا کر وادیِ یرموک میں داخل ہوتے۔ لیکن جنرل اکرم کے لحاظ سے تو فحل پر دمشق کی فتح کے بعد قبضہ ہوا۔ مان لیتے ہیں کہ فلسطین کے علاقے میں مسلمان بیسان تک اوپر نہ گئے ہوں گے اور دریا کو کسی نیچے والی جگہ سے پار کیا ہوگا۔ لیکن اُردن کے علاقے میں کسی دشمن کی دریا کے مشرق میں ایسے ہی چھوڑ دینا فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

ہمارا تجزیہ یہاں بھی جنرل گلب سے ملتا ہے کہ درمیان والا راستہ مشکل اور ناممکن تھا اور اُس راستے سے نہ پیش قدمی ہوسکتی تھی اور نہ فحل کے مقام پر قبضہ اس لیے مسلمانوں نے درہ مواب، موتہ عمان، اور جرش والا راستہ استعمال کیا اور پہلے دیرہ اور واقوصہ کی گھاٹی میں دشمن کا قلع قمع کیا اور پھر دشمن کی طرف پیش قدمی سے پہلے مغرب کی طرف مڑ کر تھوڑا جنوب مغربی فحل کے علاقے میں کچھ کاروائی کی اور کچھ فوج کو وہاں پر متعین رکھا کہ اس راستے کو استعمال کر کے دشمن یرموک کی وادی کی پچھلی طرف سے کوئی ناکہ بندی نہ کر دے۔ دمشق پر قبضہ کرنے یا ملک شام کے کسی علاقے پر دھاوا بولنے کے لیے اجنادین اور فحل کے مقامات پر قبضہ ضروری تھا اور نقشہ چہارم کے مطالعہ کے بعد یہ پہلو اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

مورخین اور راوی

فحل کی فتح کے سلسلے میں کچھ مورخین نے اس کو ذی قعد تیرہ ہجری کا واقعہ قرار دیا ہے اور کچھ نے ذی قعد چودہ ہجری کا۔ ہم دونوں کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔ اور یہاں بھی ہم جنرل گلب کی فحل کی پہلی فتح کے لیے وقت کے تعین کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ فحل کی پہلی فتح ذی قعد تیرہ ہجری میں ہوئی لیکن اُس وقت مسلمانوں نے اپنے آپ کو دریائے اُردن کے مشرقی کنارے تک ہی محدود رکھا۔ اور دریا کو پار کر کے بیسان یا طبریہ کی طرف نہ گئے۔ پھر ذی قعد چودہ ہجری میں دوبارہ فحل کے علاقے میں آئے اور دریا کے مشرق میں بھی لڑائی ہوئی کہ رومیوں نے دریا پار کر لیا تھا اور مسلمانوں نے پہلے اُن کو وہاں شکست دی اور پھر دریا پار کر کے بیسان اور طبریہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ جنرل اکرم کے لحاظ سے بھی فحل ذی قعد تیرہ ہجری میں فتح ہوا۔

اُن کے لحاظ سے چونکہ دمشق بھی رجب تیرہ ہجری میں فتح ہوا۔ اس لیے وہاں سے واپس آ کر ذی قعد تیرہ ہجری میں فحل کو فتح کیا گیا لیکن ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ دمشق جانے سے پہلے فحل کے کچھ علاقے کو ذی قعد تیرہ ہجری میں فتح

کیا گیا اُس کے بعد مرج الصفر کی جنگ ہوئی پھر دمشق کا چھ ماہ سے ایک سال کے قریب تک محاصرہ رہا اور جب چودہ ہجری میں دمشق فتح ہوا اور ذی قعد چودہ ہجری میں فحل سے آگے بڑھ کر بیسان اور طبریہ وغیرہ فتح ہوئے بلکہ قساریہ کا محاصرہ بھی کرلیا گیا یعنی فحل کے علاقے میں دو جنگیں ہوئیں۔

جنرل اکرم کے لحاظ سے چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ فحل کی جنگ کے لیے جیش المقدم کا کام کر رہے تھے اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے یا شرجیل سپہ سالار تھے کہ علاقہ اُن کا تھا۔ اس لیے ضروری ہے کہ فحل دمشق کی فتح کے بعد فتح ہوا ہوگا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُس وقت سپہ سالاری سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ ہم یہ بات بھی صحیح مانتے ہیں کہ اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ فحل کی دونوں جنگوں میں جیش المقدم کا کام کر رہے تھے تو ہمارے تجزیہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے لحاظ سے یرموک کی پہلی جنگ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنایا گیا اور یہ رجب تیرہ ہجری کا واقعہ ہے تو ہم معاملات کو وہیں سے تسلسل کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خط

خط کے الفاظ یہ ہیں:

''میں تم کو خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، جو باقی رہنے والا ہے اور جس کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے وہی اللہ ہے جس نے ہمیں گمراہی سے نکال کر راہِ راست پر لگایا اور اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کیا۔ میں تم کو خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ تمام لشکر کا امیر مقرر کرتا ہوں۔ تم مسلمانوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ تم مالِ غنیمت کی حرص میں آکر مسلمانوں کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرنا، اور نہ کسی اجنبی مقام میں وہاں کے حالات اور نتائج سے بے خبر ہو کر اپنی فوجوں کا خواہ مخواہ تعین کر دینا۔ جب تم کسی جماعت یا دستے کو کسی جنگی کاروائی کے لیے بھیجو تو معقول تعداد کے بغیر نہ بھیجنا اور مسلمان مجاہدین کو خواہ مخواہ ہلاکت میں ہرگز مبتلا نہ کرنا۔ خدا نے تمہارا معاملہ میرے ہاتھ میں اور میرا معاملہ تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ دُنیا کی محبت سے آنکھیں بند کرلو اور اپنے دل کو اس سے بے نیاز کرلو۔ وغیرہ۔''

تبصرہ

یہ خط کا کچھ حصہ ہے اور اس پر تبصرہ کرنا ہم گنہگاروں کے بس کی بات نہیں۔ کہ اس پر کئی مضمون لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ اس میں اسلامی فلسفۂ حیات کی جھلک موجود ہے۔ اسلامی عقیدہ اور ہمارے لیے صراطِ مستقیم کی نشاندہی بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احسان کا بھی ذکر ہے۔ لیکن کچھ لفظوں پر دھیان دینا ضروری ہے کہ ''مسلمانوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ حقوق کیا تھے مختصر لفظوں میں مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ سے وہ وعدہ ہے جو

اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے کہ اُن سے مال و جان سب اللہ نے خرید لیے ہیں بدلے اس کے کہ جنت ہے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان حقوق کی یاددہانی کرائی گئی کہ مل کر اللہ کے حقوق پورے کرو اور اُس کے قانون کا نفاذ کرو۔

آگے مالِ غنیمت یا دنیاوی لالچ کا ذکر ہے کہ لڑائی صرف اللہ اور رسول کے لیے لڑی جائے اور خواہ مخواہ بغیر سوچے سمجھے مسلمانوں کو "دھکیل" نہ دیا جائے، لیکن ایک پہلو کی وضاحت ضروری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خط ایسے آدمی کو لکھ رہے ہیں جس کے ماتحت وہ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں کام کر چکے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال کے مطابق حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا بھی صرف حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا حق تھا کہ وہ امین الامت تھے۔ سلسلہ اوّل کے پہلے باب میں یہ ذکر بھی ہو چکا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اے ابن خطاب رضی اللہ عنہ! صدیق رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے کوئی خلافت کا حقدار نہیں ہوسکتا۔" اور اب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اور کیا لکھتے۔ صرف یہ لکھ دیا کہ "خدا نے تمہارا معاملہ میرے ہاتھ میں دے دیا اور میرا معاملہ تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔" اس ایک فقرہ کی وضاحت کے لیے بھی کئی مضامین کی ضرورت ہے۔ وہ ہم نفس تھے اُن میں وحدتِ فکر تھی۔ اُن کی روشن ضمیری کی یہ حالت تھی کہ اُن کے دل کے آئینے اپنے دل میں ایک دوسرے کا عکس دیکھتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جو کچھ کریں گے اُس کی ذمہ داری خلیفہ دوم نے پہلے سے ہی اپنے سر پر اُٹھالی اور جو کچھ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی کمانڈ میں ہو رہا تھا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی کے مطابق ہو رہا تھا۔

خلیفہ دوم کی حکمت عملی

قارئین نے نوٹ کیا ہوگا کہ اجنادین کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کو فلسطین کے علاقے میں نہ چھوڑا گیا۔ بلکہ چند دیکھ بھال والے دستے وہاں پر چھوڑ گئے۔ حالانکہ پہلے حکم کے مطابق فلسطین کے علاقے کی ذمہ داری حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی تھی۔ اور اُردن جس میں یرموک وغیرہ شامل ہیں، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یرموک یا واقوصہ کی گھاٹی میں اتنا زیادہ دشمن اکٹھا ہو چکا تھا کہ سب لشکروں کو وہاں جانا پڑا اور آگے بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ یرموک کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم سے آگے کے احکام کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے خط لکھا جس کا جواب آنے میں ضرور دیر لگی ہوگی، اور آگے کی کاروائی میں جو مزید دیر ہوئی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مزید ہدایات

حضرت عمرؓ نے مزید ہدایات دیں کہ ''دمشق فحل اور حمص کے مقامات فوجی لحاظ سے بڑے اہم ہیں ان مقامات پر قبضہ ہو جانے کے بعد سارے ملک کو فتح کرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن کاروائی حالات کے مطابق کرنا۔ ہاں جب یہ سب مقامات فتح ہو جائیں تو علاقوں میں تعیناتی وہی رہے گی جو صدیق اکبرؓ کر گئے ہیں کہ عمروؓ بن عاص کو فلسطین واپس کر دینا۔ شرجیلؓ کو اردن بھیج دینا۔ یزیدؓ دمشق میں رہیں گے اور آپؓ اور خالدؓ حمص اور اُس کے اگلے علاقوں میں بخدا میں اُسی حکمت عملی کو بڑھانا چاہتا ہوں جس کا خلیفہ اول تعین کر گئے ہیں۔''

تبصرہ

اس خط سے ظاہر ہے کہ حضرت خالدؓ کی امارت قائم تھی اور حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ اہم مقامات کون کون سے ہیں، فحل پر قبضہ کی ضرورت اُنہوں نے دہرادی۔ فحل پر مکمل طور پر قبضہ تب ہی کیا جاسکتا تھا جب دریائے اُردن کو پار کر کے فحل کے سامنے دریا کے مغربی کنارے پر بھی قبضہ ہو لیکن یہ مشکل کاروائی تھی جس کے لیے ابھی وقت نہ آیا تھا کہ اگر ایسا کیا جاتا تو اسلامی لشکر فلسطین کے علاقوں میں اُلجھ جاتے۔

فحل کی پہلی جنگ

چنانچہ دمشق کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ نے یرموک سے جنوب مغرب کی طرف رُخ کیا اور فحل کی وادی کی طرف چل پڑے۔ حضرت خالدؓ جیش المقدم پر تھے۔ رجب تیرہ ہجری میں یرموک کی پہلی جنگ ہوئی۔ ماہِ شعبان کے آخر میں کہیں مدینہ سے خلیفہ دوم کی نئی حکمت عملی کا پتہ چلا۔ خلیفہ دوم اُس زمانے میں ایران کے معاملات میں سخت مصروف تھے۔ حضرت ابوعبیدؓ ثقفی کے لیے لشکر تیار کر رہے تھے اور جبکہ آخر میں حضرت ابوعبیدؓ بھی ایران کی طرف روانہ ہو گئے اور شعبان میں کسکر وغیرہ کے مقامات اور جالینوس کے ساتھ جنگوں میں مصروف تھے، تو ظاہر ہے کہ خلیفہؑ دوم نے حضرت ابوعبیدؓ بن جراح کو رمضان کے بعد ہی کاروائی کرنے کی اجازت دی ہوگی کہ شوال، ذی قعد تیرہ ہجری میں آپؓ فحل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔

مورخین نے چونکہ فحل کی دونوں جنگوں کو آپس میں کچھ ملا دیا ہے۔ اس لیے پہلی جنگ کے سلسلے میں ہم صرف اسی پر اکتفا کریں گے کہ مسلمان دریا کے اس طرف رہے اور طبری کے مطابق حضرت ابوعبیدؓ نے فحل کے نزدیک پہنچ کر فحل کے محاصرہ کے لیے دس قائدین روانہ کئے جن کے نام بھی تاریخ میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں حضرت ابوالدعور سلمیؓ سرفہرست ہیں۔ لشکر کی تعداد کے بارے میں طبری لکھتا ہے کہ ہر قائد کے ماتحت پانچ چھوٹے قائد تھے یعنی پچاس امراء میں سے ہر ایک کے پاس سو یا دس مجاہد تھے۔ اس سے یہ حساب نکلتا ہے کہ حضرت ابوالدعورؓ

کے ساتھ یا تو پانچ سو مجاہدین تھے یا پانچ ہزار۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع کی کاروائی کے لیے ضرور پانچ ہزار کا لشکر ہوگا آگے طبری لکھتا ہے کہ رومیوں نے سارے علاقے میں پانی چھوڑ دیا اور تمام علاقہ دلدل بن گیا اور مسلمانوں کو تکلیف ہوئی اور وہ دریا کو پار نہ کر سکے۔ طبری کے لحاظ سے مسلمانوں نے شام کے شہروں میں سے سب سے پہلے فحل کا محاصرہ کیا اور اُس کے بعد دمشق کا تو یہ روایت بھی ہمارے تجزیہ کے مطابق چلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ کے بعد حضرت ابی الدعور رضی اللہ عنہ کو پانچ سو کے دستہ کے ساتھ رومیوں کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ دیا گیا اور باقی لشکر نے ذی قعد میں مرج الصفر کے راستے دمشق کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ لیکن اسی زمانے میں یعنی شعبان یا رمضان کے مہینہ میں عراق کے محاذ پر جسر کی جنگ میں حضرت ابو عبید ثقفی رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے اور اس سلسلے میں مسلمان کچھ زیادہ فکر مند تھے۔ گو جسر کی جنگ کے چند ماہ بعد یعنی صفر چودہ ہجری میں اسلام کے عظیم فرزند حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے بویب کے مقام پر ایرانیوں کو شکست دے دی۔ لیکن وہ خود سخت زخمی حالت میں تھے اور جیسا کہ سلسلہ اول کے بیسویں باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اب دو محاذوں پر جنگ زور شور سے جاری تھی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محرم چودہ ہجری میں مدینہ شریف سے نکل کر صرار کے چشمہ پر قیام کیا ہوا تھا۔ تو دوسری طرف حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ انہی دنوں دمشق کی طرف گامزن تھے۔

رمضان یا شوال تیرہ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو یہ بھی لکھا کہ جو لوگ خوشی سے عراق کے محاذ پر جنگ میں شریک ہونا چاہیں ان کو اُدھر بھیج دیا جائے اور شاید قیس بن ہبیرہ سمیت صرف چند مجاہد عراق کے محاذ پر گئے۔ لیکن اس میں بھی اختلاف ہے۔ کئی مورخین نے حضرت قیس کو چودہ ہجری میں بھی شام کے علاقے کی جنگوں میں لڑائی لڑتے دکھایا۔ لیکن عراق کی وہ تمام فوج جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس محاذ پر آئی تھی اُس کی عراق کے محاذ پر واپسی کے احکام دمشق کی فتح کے بعد ملے اور ان احکام کو اس طرح پورا کیا گیا کہ وہ مجاہدین قادسیہ کی جنگ میں شریک ہو گئے اس کا ذکر حصہ اول کے بائیسویں باب میں ہو چکا ہے۔ اس محاذ سے روانگی کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اب ہمارے مورخین اور مبصرین میں عراق کی فوج کی عراق کے محاذ پر واپسی کی تاریخ کے سلسلہ میں کچھ اختلافات ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ احکام دو دفعہ ملے اور کاروائی بھی دو دفعہ ہوئی۔ ایک دفعہ رضا کارانہ طور پر اور دوسری دفعہ حکم کے مطابق اس لیے بیانات میں دوغلہ پن ہو گیا۔ البتہ ایک بات ہے کہ مجاہدین شام کے محاذ کو زیادہ پسند کرتے تھے اور خوشی سے مجاہدین عراق و ایران کے محاذ پر کم ہی جاتے تھے۔

ترجیح کی وجوہات

اس ''ترجیح'' کی کیا وجوہات تھیں، اس سلسلہ میں ایک مبصر نے لکھ دیا ہے کہ ایرانی زیادہ بہادر یا لڑائی میں سخت تھے۔ ایرانی بہادر ہو سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کا فلسفہ حیات اس کو یہ نہیں بتاتا کہ وہ آسان لڑائی کو ترجیح دے۔ البتہ

ہر علاقے میں کچھ کشش ہوتی ہے۔دوسری جنگ عظیم میں ہم لوگ ''کرایہ کے سپاہی'' تھے اور مشرق وسطی میں جنگ میں شرکت کو مشرق بعید میں جنگ کی نسبت زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ بعد میں اطالیہ اور یونان کے محاذوں کو پسند کرتے تھے۔ انگریز سپاہی بھی ، برہما، ملایا وغیرہ کے علاقوں میں جنگ میں شرکت سے تنگ آجاتے تھے۔میری اپنی یونٹ دوسری جنگ عظیم میں ۱۹۴۱ء کے شروع میں بمبئی سے بحری جہاز پر سوار ہوئی۔ اندازہ یہ تھا کہ ہم مشرق وسطی جارہے ہیں لیکن دو دن کے بعد جہازوں کا رُخ جنوب کو پھیر دیا گیا اور پتہ چلا کہ ہم ملایا جارہے ہیں ملایا میں اس زمانے میں امن وامان تھا اور مشرق وسطی میں جنگ ہو رہی تھی لیکن پھر بھی سپاہی لوگ شام وفلسطین ،مصر اور لیبیا جانے کو زیادہ پسند کرتے تھے انسان کی ان دنیاوی ''ترجیحات'' یا کمزوریوں پر ہم زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کہ اس کو اپنے نفع ونقصان کا پتہ نہیں ہوتا اور یہ چیز صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترجیحات کا تجزیہ

دنیاوی پہلو پر تو سرسری تبصرہ کردیا گیا ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں دین ودنیا دونوں ایک جیسی تھیں اور ہم نے حصہ اول میں یہ پہلو تسلیم کیا کہ چوٹی کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شام کے محاذ پر موجود تھے۔اس کتاب کے آٹھویں اور نویں باب میں ان عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسماءِ گرامی بھی دیئے جارہے ہیں اور یہاں پر صرف چند، ترجیحاتی پہلوؤں کی وضاحت ضروری ہے۔

ل۔سورۂ روم میں مسلمانوں کو اہل کتاب اور اہل روم کا حلیف تسلیم کیا گیا۔مسلمان دل سے مغرب کے لوگوں کو اور اولادِ ابراہیم علیہ السلام کو اسلام کے دائرہ میں دیکھنے کے بڑے خواہاں تھے۔

ب۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اس محاذ پر پہلے ایک مہم بھیجی پھر خود تشریف لے آئے اور وفات کے وقت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بھیجنے کی تیاری کے احکام بھی دے دیئے تھے،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دلچسپیوں سے بھی متاثر تھے اور تبوک تک جانے میں اُن کو بڑا لطف محسوس ہوتا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم خود اس مہم پر گئے تھے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تبع وتابعین اُن قدموں پر چلنے کے بڑے خواہشمند ہوتے تھے۔جہاں پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم چلے ان مبارک قدموں کے نشانات پر چل کر وہ اپنے عشق کی پیاس بجھاتے تھے:

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

(اقبالؔ)

ج۔ بیت المقدس اور باقی مقامات اسی علاقے میں تھے جہاں پر پہلے پیغمبر اور نیک لوگ رہ چکے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن مقامات کی زیارت کرنا چاہتے تھے۔

د۔ آنے والے زمانے میں اسلام مغرب کی طرف زیادہ پھیلا کہ ایک طرف بحیرہ اوقیانوس اور سپین تک گیا۔ دوسری طرف شمال میں استنبول میں پہنچ کر یورپ کے وسط تک گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اشارے سن رکھے تھے اور اُن کی خواہش ہوتی تھی کہ جلد سے جلد مغرب کی طرف اللہ اور رسول کا نام بلند کرنے میں حصہ لیں۔

ر۔ اہل مغرب نے اسلامی تمدن اور ثقافت کو جلد اپنا لیا۔ ترکی میں جو کچھ ہوا یا ہونے والا تھا۔ اُس کو مغربی سازش نے اس صدی کے شروع میں ختم کرا دیا اور وہاں اب رکاوٹ پڑی ہوئی ہے۔ لیکن مغرب میں مراکو تک سب لوگوں نے اپنی زبان بھی عربی اپنالی اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اِن چیزوں کا کچھ پتہ تھا اس لیے وہ اس طرف زیادہ مائل تھے۔

س۔ اہل ایران نے اسلام قبول ضرور کیا اور ایران سے نکل کر اسلام روسی ترکستان، چینی ترکستان افغانستان اور برصغیر ہندو پاکستان میں پھیلا ضرور لیکن ہم عرب نہ بن سکے۔ اگر ہم بھی عربی زبان اپنا لیتے تو آج سب مسلمان عرب ہوتے اور ''قومیتوں'' کے چکر سے چھٹکارا مل گیا ہوتا۔ بہر حال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اس خطہ سے ہوگی اور شاید اب ہماری باری ہے:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد ‎ ‎ ‎ مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

(اقبالؔ)

اسباق ونتائج وتبصرہ

اس کتاب کا یہ پانچواں باب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت سے تعلق رکھتا ہے۔ اکثر پہلوؤں پر تبصرہ ساتھ ہی ساتھ کر دیا گیا ہے۔ باقی باب یرموک کی پہلی جنگ اور فحل کے محاصرہ یا پہلی جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس باب میں تجزیئے اور بحث کو ذرا وسعت دینا پڑی۔ ہمارا خیال ہے کہ دونوں محاذوں کی جنگ کی حکمت عملی اور واقعات کو کچھ نہ کچھ تسلسل مل گیا ہے اور چند لفظوں کے اضافے کے ساتھ مورخین کے تمام بیانات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض جگہ ادھوری بات کی وجہ سے واقعات کا تسلسل ٹوٹ گیا اور کچھ اختلافات پیدا ہو گئے جو شکوک وشبہات دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ا۔ ''مورخین کے لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے بعد سب سے پہلے جس فتح کی خوشخبری ملی وہ یرموک

کی فتح تھی۔ بے شک بات بالکل صحیح ہے لیکن یہ یرموک کی پہلی جنگ تھی جو رجب تیرہ ہجری میں ہوئی نہ کہ یرموک کی دوسری اور بڑی جنگ جو رجب پندرہ ہجری میں ہوئی۔

۲۔فحل کا محاصرہ دمشق سے پہلے ہوا (طبری) بے شک ہم اس کو صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ یرموک کی پہلی جنگ کے بعد، دمشق کی طرف پیش قدمی سے پہلے فحل کے علاقے میں کچھ کاروائی ضروری تھی۔اور وہ کی گئی۔

۳۔سب مورخین کے لحاظ سے فحل ذی قعد تیرہ ہجری میں فتح ہوا۔ بے شک ہم اس کو صحیح مانتے ہیں کہ یرموک کی پہلی جنگ کے بعد مسلمان کچھ عرصہ وہاں پر رُک گئے۔خلیفہ دوم سے ہدایات لیں اور پھر فحل کا محاصرہ کیا۔ ہم اس کو فحل کی پہلی جنگ کہیں گے۔فحل کے علاقے میں بعد کی کاروائی کو ہم فحل کی دوسری جنگ کہیں گے اور اُس کا ذکر بعد میں کریں گے۔

۴۔عراق سے آئی ہوئی فوج کو جنگ یرموک کے بعد عراق واپس کیا گیا۔ یہ رائے چند مورخین نے دی ہے۔ ہم اس کو بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ یہ یرموک کی پہلی جنگ کے بعد ہوا کہ اس جنگ کے ڈیڑھ ماہ بعد جسر کی جنگ میں حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ ثقفی شہید ہوئے۔لیکن یہ رضا کارانہ کاروائی تھی اور دمشق کی فتح کے بعد پوری عراقی فوج کو واپس عراق بھیج دیا گیا۔تو جن مورخین نے یہ کہا تھا کہ عراق کی فوج دو مرحلوں میں عراق واپس گئی وہ بھی صحیح ثابت ہوئے۔ ہاں یرموک کی دوسری جنگ جو قادسیہ کے بعد ہوئی اس کو اگر کسی نے بیچ میں شامل کر دیا ہے تو یہ غلط ہے۔

۵۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار اعظم کے رتبہ سے ہٹانے کی کاروائی یرموک کے مقام پر ہوئی۔مورخین کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے فوراً بعد یہ کاروائی کی تو پھر یہاں سب حساب کتاب ٹھیک ہو جاتا ہے کہ یرموک کی پہلی جنگ رجب کے وسط میں ہوئی اگر قاصد مدینہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے تیسرے چوتھے دن بھی چلا ہو تو وہ وسط رجب میں یرموک کے مقام پر پہنچ گیا ہوگا تو زماں و مکاں کا معاملہ درست ہو گیا۔

۶۔واقوصہ کی گھاٹی کی جنگ اور یرموک کی پہلی جنگ دراصل دونوں ایک ہی چیز ہیں اور مورخین نے الگ الگ نام لکھ دیے تو لوگوں نے جگہ نہ دیکھی تھی اس لیے شبہات میں پڑ گئے اس سلسلے میں جنرل گلب کا مطالعہ اور تجزیہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

زماں و مکاں کے تجزیہ پر تبصرہ

جن مبصرین نے زماں و مکاں کا حساب لگانے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دمشق کے

محاصرے کے دوران سپہ سالار اعظم کے عہدہ سے ہٹایا گیا۔ اُن کا حساب کچھ غلط نکلتا ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ہم نے دیکھ لیا کہ دشمن کے علاقے میں پیش قدمی کرنا بڑا کٹھن کام ہوتا ہے۔ اس لیے جو لوگ ''زماں ومکاں'' کا مطالعہ نقشوں اور سینڈ ماڈلوں یا تاریخ کے اوراق سے کرتے ہیں، وہ حالات کو صحیح طور پر صرف تب ہی سمجھ سکیں گے کہ نقشے یا تاریخ کے اوراق اُن کے تصور میں میدانِ جنگ بن جائیں۔ کلاسوٹز اور باقی فوج مبصروں میں یہی بڑا افراق ہے کہ کلاسوٹز عمل لکھتا ہے اور جب بھی کوئی اصول بیان کرتا ہے تو میدانِ جنگ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ ایک دلِ بینار کھنے والے کمانڈر یا مبصر کے سامنے میدانِ جنگ یا کاروائی والا علاقہ ایک نقشہ کی شکل میں آجاتا ہے۔ پھر اُس پر کاروائی شروع ہو جاتی ہے۔ افواج پیش قدمی کرتی نظر آتی ہیں۔ رُکتی ہیں۔ رکاوٹیں نظر آتی ہیں۔ دشمن کے ردِعمل نظر آتے ہیں، غرض یہ کہ چپہ چپہ زمین اور فوج کا ہر دستہ بول اُٹھتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے اور ''زماں'' کی گھڑی بھی ساتھ ساتھ ٹک ٹک کر رہی ہوتی ہے۔

جنرل گلب بڑا متعصب آدمی ہے۔ لیکن اس کے زماں ومکاں کے تجزیئے کافی صحیح ہیں کہ اُس نے مضمون کے اس پہلو میں اپنا تن من ڈال دیا ہے۔ وہ غیر مسلم ہے اور مسلمانوں نے اُس کو اپنا مشیر بنائے رکھا۔ لیکن اُس کا اسلام کے خلاف تعصب نہ گیا۔ اسلام کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی، لیکن اُس کے ناپ تول کے پیمانے متعصب ہی رہے۔ زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کی ان کہانیوں پر تجزیئے اور کتابیں یورپ میں تو موجود ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسی کوشش نہیں ہو رہی۔

چنانچہ اس کتاب کے بارہویں باب میں خلفائے راشدین کے زمانے کی فتوحات عراق وایران اور شام و فلسطین کو زماں ومکاں کے لحاظ سے اختصار کے ساتھ الگ بیان کر کے ایک جائزہ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ہمیں اپنے آباء کی اندرونی قوت یا مرکزیت کا اندازہ ہو سکے کہ وہ چند سالوں میں کیا کچھ کر گئے۔

چھٹا باب

دمشق کا محاصرہ اور فتح

اجنادین سے دمشق تک کا ہوائی راستے سے فاصلہ تقریباً ایک سو ساٹھ میل کے قریب بنتا ہے زمین پر اگر فلسطین کے اندر والا راستہ اختیار کیا جائے کہ جودی کی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے بحیرہ مردار کے شمال سے گزر کر پہلے واقوصہ کی گھاٹی اور یرموک کی وادی میں داخل ہوں اور پھر نزدیک ترین راستہ مرج الصفر والا اختیار کیا جائے تو دمشق تک فاصلہ کوئی دو سو میل بنتا ہے اور ہم نے جائزہ پیش کر دیا ہے کہ حالات یہ راستہ استعمال نہ کرنے دیتے تھے۔ ہمارے خیال کے مطابق وہی راستہ استعمال کیا گیا، جس راستے سے اسلامی لشکر وادیِ یرموک سے اجنادین گئے تھے۔ یہ راستہ دمشق تک کوئی اڑھائی سو میل بنتا ہے۔ یہ راستہ لمبا ضرور تھا لیکن پُر خطر بھی نہ تھا اور راستے میں کوئی تنگ گھاٹی بھی نہ تھی۔ نہ دریا کو عبور کرنا پڑتا تھا اور نہ کوئی زیادہ پہاڑیاں تھیں۔

بہر حال دونوں راستوں سے دمشق پہنچنے کے لیے کم از کم ایک ماہ کا وقت ضرور خرچ ہوتا کہ اگر صرف سفر ہی کرنا پڑتا تو اس کے لیے دس یا بارہ دن لگتے۔ لیکن یہاں تو اندرونی راستہ اختیار کرنے کے لیے اندرونِ فلسطین میں بھی جھڑپیں ہوتیں اور پھر آگے دونوں راستے جہاں سے مل جاتے تو ایک جنگ واقوصہ کی گھاٹی میں دوسری فحل کے علاقہ میں اور تیسری مرج الصفر میں تو کم از کم اِن جنگوں میں پندرہ بیس دن لگتے۔ اس لیے مشکل سے رجب یا شعبان تیرہ ہجری میں دمشق پہنچ سکتے کہ اجنادین سے لشکر جمادی الثانی کے دوسرے ہفتہ سے پہلے نہ چل سکتا تھا۔ دمشق کا محاصرہ چونکہ کم از کم چھ ماہ رہا۔ اس لیے دمشق رجب تیرہ ہجری میں فتح نہیں ہو سکتا تھا اور خود واقدی اور طبری[1] محمد بن اسحٰق کے حوالے سے تسلیم کرتے ہیں کہ دمشق رجب چودہ ہجری میں فتح ہوا۔

جنرل اکرم نے بڑی محنت کر کے زماں و مکاں کے حساب سے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے تقرر کو مدنظر رکھتے ہوئے دمشق کی فتح کا وقت رجب تیرہ ہجری مقرر کیا ہے اور آگے وضاحت آتی ہے کہ ہم اُن کے اس جائزہ کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے چنانچہ یہاں پر ہم جنرل گلب کے جائزہ کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔

(۱) تاریخ طبری، حصہ دوم، صفحہ ۲۸۹

فرق البتہ وہاں جا کر پڑتا ہے جہاں واقدی کے لحاظ سے دمشق کا محاصرہ دو دفعہ کیا گیا، اوّل اس وقت جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ عراق کے محاذ سے شام کی سرحد میں داخل ہوئے اور ہمارے لحاظ سے اُس وقت انہوں نے سنیات العقاب پر جھنڈا گاڑا، دوسرے محاصرے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ واقدی البتہ دمشق کے ''پہلے محاصرے'' کے وقت مرج الراحت کے مقام پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی رومیوں کے ساتھ ایک جنگ کے واقعات کو بھی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ گبن، ایک مشہور انگریز مورخ، واقدی کے اِن بیانات کو صحیح تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ہمارے لحاظ سے دمشق کے شمال مشرق میں کوئی جھڑپ یا تصادم ہو سکتا تھا اور ہم تیسرے باب میں اس کی وضاحت اور جنرل گلب کے تجزیہ پر تبصرہ بھی کر چکے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے اُس زمانے میں بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ جلدی سے اسلامی لشکروں کی کمانڈ سنبھال لیں۔ بہر حال جنرل اکرم بھی واقدی کے دمشق کے پہلے محاصرہ کو رد کر دیتے ہیں۔ البتہ مرج الراحت کی جنگ کو وہ مرج الصفر کی جنگ کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

دمشق کا محاصرہ

تمام مورخین نے دمشق کے محاصرہ کی مدت ایک سال سے چھ ماہ تک بتائی ہے البتہ بعض نے یہ اضافہ کیا کہ زور دار محاصرہ صرف چار ماہ یا ستر دن رہا۔ یہ بڑی اصولی بات اور صحیح تجزیہ ہے۔ محاصرے کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور کلاسوٹز نے اپنی چھٹی اور ساتویں کتاب میں اس پہلو کی خوب تر وضاحت کی ہے کہ محاصروں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں کہ دیکھ بھال والا محاصرہ کمک کے راستے مسدود کرنے والا محاصرہ اور فتح کے لیے محاصرہ وغیرہ۔

اِس وضاحت کے بعد ہم یہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ مورخین نے محاصرہ کے لیے جو مدت بتائی ہے اُس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ مدت چھ ماہ سے ایک سال تک تھی یعنی تیرہ ہجری میں محاصرہ ہوا اور چودہ ہجری میں دمشق فتح ہوا یا ذوالحجہ تیرہ ہجری سے رجب چودہ ہجری تک محاصرہ رہا جو تقریباً کم از کم چھ ماہ تھا اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ۔ جنرل اکرم نے البتہ دمشق کے محاصرہ کی مدت ایک ماہ کر دی ہے۔ اِس سلسلہ میں اُن کا خیال ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے چونکہ دمشق کے معاہدہ پر سپہ سالار اعظم کے طور پر دستخط کیے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنتے ہی سپہ سالار اعظم کے رُتبہ سے ہٹا دیا تو دمشق ضرور رجب تیرہ ہجری میں فتح ہوا ہو گا۔

ہمارا اس سلسلے میں تجزیہ یہ ہے کہ زماں و مکاں کے لحاظ سے دمشق میں لشکر اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتے اور محاصرہ کی مدت کو بھی اتنا کم نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے شاید حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نمائندہ کے طور پر دستخط کئے ہوں اور پھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن دستخطوں کے ثبوت میں دستخط کئے ہوں یا واقدی نے معاہدہ پڑھنے میں غلطی کی ہو اور پھر یہ معاہدہ تو تھا ہی نہیں یہ مسلمانوں کے ذمیوں کے لیے احکام تھے، اور سن ہجری کا تعین بھی اُس وقت تک نہیں

ہوا تھا اور معاہدہ پر سال نہیں لکھا گیا تھا۔

جنرل اکرم کا یہ خیال بھی ہے کہ دمشق رجب تیرہ ہجری میں ضرور فتح ہوا ہوگا کہ دمشق سے واپس ہو کر فحل کو ذیقعدہ تیرہ ہجری میں فتح کیا گیا۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ فحل، دمشق کے جنوب میں ہے اور دمشق سے پہلے بھی اس کی فتح ممکن ہوسکتی تھی اور خود جنرل اکرم کے مطابق دمشق کی فتح سے پہلے وہاں پر حضرت ابی الدعور رضی اللہ عنہ کو دیکھ بھال کے لیے چھوڑا گیا۔اس لیے فحل کی بھی دو جنگیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی ذی قعد تیرہ ہجری اور دوسرہ ذی قعد چودہ ہجری میں لیکن فحل کے واقعات سے دمشق کی فتح کو ایک سال پہلے تصور کر لینے کی کوئی فوجی وجوہات موجود نہیں ہیں۔

اہلِ قلم کی کشش کے مرکز

یہ تجزیہ یا ابتدائیہ واقعاتی تھا کہ تجزیہ کی کوئی بنیاد بھی ہو۔ دوسرا اور ایک اہم پہلو بھی ہے کہ واقعات سے الگ قلم بھی معاملات کو کچھ دائیں بائیں کر دیتا ہے کہ ہر اہل قلم کی کشش کے کچھ مرکز ہوتے ہیں اور ہر اہل قلم کسی ہیرو یا بڑے آدمی کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اُس کو اپنی تحریر کی کشش کا مرکز بنائے۔ اہل قلم حضرات میرے سمیت خود بہادر یا با اصول ہوں یا نہ ہوں یہ الگ مسئلہ ہے۔ کیونکہ اہل قلم کی بھی کئی قسمیں ہیں کچھ دل کی آواز لکھتے ہیں اور اس دل کی آواز کی بھی کئی قسمیں ہیں، کچھ ادب برائے ادب لکھتے ہیں۔ کچھ حسن بیان یا لفاظی سے لطف اُٹھاتے ہیں اور اہل قلم کو حصوں میں بانٹنا از خود ایک بہت بڑا مضمون ہے۔ لیکن اہل قلم اگر متعصب نہ بھی ہوں تو ''ترجیحات'' کا معاملہ ضرور ہوگا اور اِن ''ترجیحات'' کے سلسلے سے شاید ہی کوئی انسان خالی ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترجیحات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود ان ترجیحات کو مانتے تھے اور کئی عظیم صحابہ نے اپنے بیٹوں کے نام رکھنے سے اپنی ترجیحات کو تسلیم کیا۔ مثال کے طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے بیٹوں کے نام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرازوں اور یارانِ نبی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ناموں پر رکھے جس کا ذکر حصہ اول میں ہو چکا ہے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے نام مبارک تو خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو پہلا بیٹا ہوا اُس کا نام آپ نے ''محمد'' رکھا جو محمد بن حنیفہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ایک بیٹے کا نام حضرت یحیٰ پیغمبر کے نام پر رکھا۔ ایک کا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے والد سیدنا عبداللہ کے نام پر، ایک کا اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر اور ایک کا اپنے شہید بھائی جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے نام پر وغیرہ۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ اپنے بیٹوں کا نام پیغمبروں کے نام پر رکھتے۔ آپ کے ایک بیٹے ''محمد'' تھے جو جنگ جمل میں شہید ہوئے اور سیاہ ٹوپی والے کے نام سے مشہور تھے

باقی بیٹوں کے نام عمران، موسیٰ یعقوب، عیسیٰ، ابراہیم اور صالح رضی اللہ عنہ وغیرہ تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام نے بیٹوں کے نام شہداء کے نام پر رکھے۔ مدینہ میں ہجرت کے بعد مہاجرین کے ہاں سب سے پہلے جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا، آپ نے اُس کا نام شہدائے اُحد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جحش اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جبیر کے نام پر عبداللہ رکھا۔ اور آپ تاریخ اسلام کی ایک مشہور ہستی ہیں۔ دوسرے بیٹے کا نام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر شہید کے نام پر رکھا اور حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مختار ثقفی کا قلع قمع اور باقی کام بھی تاریخ اسلام کا حصہ ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے تیسرے بیٹے کا نام حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ثقفی کے نام پر رکھا اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ ایک عظیم مورخ اور محدث تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے باقی بیٹوں کے نام بھی حضرت حمزہ، حضرت زید، حضرت عبیدہ بن حارث اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے ناموں پر تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کے نام محمد، عروہ، ابوبکر، عبداللہ مصعب اور عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کے نام عمر، عامر، اصغر، اسماعیل، اسحٰق، ابراہیم، موسیٰ، صالح، عبداللہ، عثمان اور مصعب رضی اللہ عنہ تھے۔ اِن ترجیحات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان کئی شخصیتوں سے متاثر ہوتا ہے اور راقم نے خود بیٹوں اور بھتیجوں کے نام خالد، فاروق، شبیر، مرتضیٰ اور یوسف طاہر رکھے اور بیٹی کا نام فاطمہ رکھا حالانکہ بیوی کا نام بھی فاطمہ ہے۔ لیکن بیٹی کے نام کے لیے فاطمہ کے بغیر کوئی اور نام سامنے آتا ہی نہ تھا۔

اِس لیے ہماری بھی کچھ ترجیحات ہو سکتی ہیں اور ڈر یہ ہے ہمارا قلم کہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہر معاملہ میں حضرت امین الامت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پر ترجیح نہ دیتا رہے۔ کیونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سپہ سالار اعظم کے رُتبہ سے ہٹ جانے کے بعد ہر مورخ نے عملی طور پر سپہ سالار اعظم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی بتایا۔ اہل قلم کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ قارئین نے دیکھا ہوگا کہ سلسلہ اول میں جنگ قادسیہ کے دوران جیسے ہی حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ لڑائی کے دوسرے دن میدانِ جنگ میں داخل ہوئے تو تمام اہل قلم کا رُخ آپ کی طرف ہو گیا یہاں بھی یہی بات ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جو کارنامے انجام دے چکے تھے اُن کی وجہ سے کوئی اہل قلم اپنے قلم کا رُخ اُن سے ہٹانے کو تیار نہیں، میرے لحاظ سے، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو اپنا مقام ملنا چاہیے۔

ہمارے لیے حصہ اوّل میں حضرت مثنیٰ بن حارث رضی اللہ عنہ کا مسئلہ تھا اور اُن کو اُن کا مقام دینے کی کوشش کی گئی تھی یہاں دعا ہے کہ ہمارا قلم حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے قدموں پر قربان ہو جائے۔

دمشق کا شہر

دمشق کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ دنیا کا ایک بہت پرانا شہر ہے اور دنیا کے موجودہ آباد شہروں میں شاید سب سے پرانا ہے اور اس کے چاروں طرف پرانے زمانے کے شہروں کی طرح چار دیواری تھی۔ شمال کی طرف

ایک چھوٹا سا دریا بھی ہے لیکن وہ کوئی بڑی رکاوٹ نہ پیدا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں شہر تقریباً ایک میل لمبے اور آدھے میل چوڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے چھ دروازے تھے، جو مشرقی دروازہ، جابیہ دروازہ، کیسان کا دروازہ، تھامس کا دروازہ۔ فرادیس کا دروازہ اور چھوٹا دروازہ کے ناموں سے موسوم تھے۔ اس علاقے کا فوجی گورنر جنرل تھامس تھا جو قیصر روم کا داماد بھی تھا۔ اس کے ماتحت دو اور جرنیل حربیس اور عزازیر بھی تھے۔ ہرقل خود اجنادین کی جنگ تک تو حمص میں تھا اور اکثر مورخین نے حمص ہی کو اس کا ایشیائی دارالخلافہ بتایا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجنادین کی شکست کے بعد ہرقل نے اپنا دارالخلافہ انطاکیہ (ANTIOCH) بنالیا جو موجودہ ترکی میں ہے۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ قیصر روم کا دارالخلافہ ہمیشہ ہی سے انطاکیہ ہی رہا، اور حمص صوبے کا نام بھی تھا اور شہر کا نام بھی، اور اس زمانے میں انطاکیہ، صوبہ حمص کا ایک شہر تھا۔

دمشق کا دفاع

اہل روم نے دمشق کے دفاع کے لیے بہت بڑے پیمانے پر دفاعی بندوبست نہیں کئے ہوئے تھے جو شہر کی سیاسی جغرافیائی حالت کے مطابق ضروری ہوتے ہیں۔ اصل میں دمشق کا محل وقوع ایسا تھا کہ سلطنت روم کسی وقت بھی اس شہر کو سمندر یا خشکی کے راستے سے امداد پہنچا سکتی تھی۔ دمشق کی فوجی اہمیت اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس پر قبضہ کر کے دشمن کو کسی علاقے کی ''کنجی'' ہاتھ آجاتی۔ اور بقول کلاسوٹز فوجی لحاظ سے ایسے مقامات بہت کم ہوتے ہیں کہ ان کو علاقہ کی ''کنجی'' کہا جائے۔ دراصل اکثر مقامات کی افادیت محدود ہی ہوتی ہے۔ اہم مقامات چند ہی ہوتے ہیں۔ اور اصلی اہمیت فوج کی ہوتی ہے کہ وہ کتنی خصوصیات کی حامل ہیں۔ ایرانیوں کے ساتھ جنگ کی صورت میں بھی دمشق کو فوجی لحاظ سے اتنی زیادہ اہمیت نہ دی گئی تھی، ایرانی اگر دمشق پر قبضہ کر بھی لیتے تو وہ کسی بڑی افادیت کا حامل نہ ہوتا۔

اس لیے دمشق کے دفاع کا بندوبست صرف اس طرح کیا گیا تھا کہ اگر کوئی عرب قبیلہ اٹھ کھڑا ہو یا نزدیک کے قبائل کوئی لشکر یا گروہ تیار کر لیں تو وہ اچانک آ کر دمشق میں اودھم نہ مچا دیں اور لوٹ مار نہ شروع کر دیں۔ شہر کے اردگرد ایک دفاعی چاردیواری تھی اور شہر اس قلعہ نما چاردیواری کے اندر تھا۔ قلعہ کے دروازے لوہے کے تھے جو بند کئے جا سکتے تھے۔ قلعہ کی فصیل کے اوپر تیرانداز مقرر کئے جاتے تھے جو حملہ آوروں کو قلعہ کے نزدیک نہ آنے دیتے تھے اور قلعہ کی دیواروں کو توڑنے والوں کے اوپر آگ پھینکی جاتی تھی۔ دمشق میں رومی فوج کی تعداد بارہ سے بیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ کافی تعداد میں رومی اجنادین، واقوصہ اور فحل سے فرار ہو کر یہاں آ گئے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

حضرت ابوعبیدہ ؓ نے دمشق کی طرف کب پیش قدمی شروع کی، مورخین نے اس کی صحیح تاریخ نہیں بتائی، ہمارا تجزیہ ہے کہ فحل کی کاروائی کے بعد ذی قعد کے آخر یا ذوالحجہ کے شروع میں دمشق کی طرف پیش قدمی شروع کی گئی۔ دمشق کی طرف پیش قدمی سے پہلے عراق سے آئے ہوئے مجاہدین کے بال بچے بھی مجاہدین کے ساتھ آکر شامل ہو گئے تھے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اجنادین کی جنگ کے بعد ہی آکر مجاہدین سے ملے ہوں گے کیونکہ باقی مجاہدین کے بال بچے تو پہلے ہی سے اجنادین کی جنگ میں شریک تھے اور اس کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے۔ اجنادین کی فتح کے بعد ان لوگوں کو محاذ شام پر منگوایا گیا کیونکہ جب حضرت خالد ؓ عراق سے چلے تو سب مجاہدین کے خاندانوں کو مدینہ بھیج دیا گیا تھا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہ لوگ مجاہدین کے ساتھ واقوصہ کی گھاٹی یعنی وادی یرموک میں رمضان یا شوال کے مہینہ میں آکر شامل ہو گئے ہوں گے۔

دوسرا پہلو جس کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان بے خطرا اپنے خاندانوں کو محاذِ جنگ پر رکھتے تھے، عورتوں نے جہاد میں حصہ لیا اور میدانِ جنگ یا جنگ کے محاذوں کے نزدیک ہی عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو جہاد کی لوری دے کر پرورش کرتی تھیں اس وقت بچوں کو" خاکبازی" اور مادیت کے سبق نہیں دیئے جاتے تھے، بلکہ ان کو مجاہد بننے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن پاک ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار۔

دمشق کی طرف روانگی

حضرت ابوعبیدہ ؓ کا لشکر دمشق کی طرف رواں تھا۔ حضرت خالد ؓ جیش المقدم میں تھے ان کے عراقی لشکر میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ انہوں نے ایک متحرک دستہ الگ کر کے کافی لوگوں کو مخبری کے کام پر مقرر کیا ہوا تھا۔ ان کے ذریعے علاقے اور لوگوں کے حالات، دشمن کے بارے میں خبریں، ان کے ارادے اور متعدد دوسری معلومات اکٹھا کرنا تھا۔ یہ سب لوگ حضرت خالد ؓ نے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ نے ان تنظیمی معاملات میں کوئی زیادہ دخل اندازی نہ کی تھی۔ وہ اب ایک بلند ترین مقام پر فائز تھے جس کو آج کل سپریم کمانڈر کہا جاتا ہے یعنی سپہ سالارِ اعظم۔ اور حضور پاک ﷺ کے قریب ترین رفقاء میں سے ہونے کی وجہ سے وہ اس رُتبہ کے حق دار بھی تھے اور اہل بھی۔ حضرت خالد ؓ اپنے دستے کے سالار بھی تھے اور حضرت ابوعبیدہ ؓ کے نائب بھی۔ ویسے بھی حضرت ابوعبیدہ ؓ اپنوں کے لیے سراسر جمال ہی جمال کی حیثیت رکھتے تھے اور سورۂ فتح کے مطابق" رحماء بینھم " کی ایک عظیم مثال تھے۔ وہ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّار بھی تھے۔

مرج الصفر کی جنگ

یرموک کی وادی سے دمشق کوئی ستر میل کے قریب ہے اور یرموک کی شکست کے بعد رومی فوج صرف دمشق کے دفاع پر لگی ہوئی تھی اور ان کی ایک فوجی چوکی مرج الصفر کے مقام پر تھی جو دمشق سے تقریباً بیس میل جنوب کی طرف تھی۔ پہلے گزارش کر دی گئی ہے کہ ایک مرج یعنی مرج الراحت نام کی جگہ بھی تھی جو دمشق سے تقریباً اتنے ہی فاصلہ پر شمال یا شمال مشرق کی طرف تھی۔

واقدی نے مرج الصفر کے مقام کی بجائے مرج الراحت کے مقام پر ایک بڑی جنگ کا ذکر کیا ہے اور آگے چل کر یہ بھی لکھا کہ مرج الراحت کے مقام پر فتح حاصل کر کے حضرت خالد ﷛ نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے برعکس ''اللہ کی تلوار'' کے مصنف جنرل اکرم کا خیال ہے کہ واقدی نے جو مرج الراحت کی جنگ لکھی ہے وہ غلط ہے۔ یہ مرج الصفر کی جنگ تھی اور مرج الصفر کی جنگ کے بعد حضرت خالد ﷛ یا سب مسلمانوں نے مل کر دمشق کا محاصرہ کیا تھا۔ ہم بھی جنرل اکرم کی اس تحقیق سے اتفاق کرتے ہیں۔ شاید واقدی دو مقامات کے ناموں کے ساتھ ''مرج'' کے لفظ کی وجہ سے غلطی کر گیا ہو۔ مسلمان مورخین میں یعقوبی اور بلاذاری بھی دمشق کی فتح سے پہلے مرج الصفر کی جنگ کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ ہم تاریخ کے سلسلے میں جنرل اکرم سے البتہ اختلاف کرتے ہیں۔ ہمارے لحاظ سے یہ جنگ ذوالحجہ تیرہ ہجری میں ہوئی اور جنرل اکرم کے لحاظ سے جمادی الثانی تیرہ ہجری میں۔ لیکن ہمارا اتفاق اس بات پر ضرور ہے کہ یہ جنگ دمشق کے محاصرہ سے پہلے ہوئی۔

جنگ کے واقعات

دمشق کا رومی کمانڈر تھامس تھا۔ اس نے مرج الصفر کے مقام پر ایک رومی جرنیل قلوس کے ماتحت کچھ فوج رکھی ہوئی تھی۔ جب اس کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اس نے ایک اور رومی جرنیل عزازیر کو اس کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ یہ دونوں جرنیل بڑے بہادر تھے اور ذاتی جنگ یا مبارزت میں بہت مشہور تھے، لیکن ایک دوسرے کے ساتھ ان کے حسد کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس لیے اس جنگ میں رومی کوئی خاطر خواہ کام نہ کر سکے۔ مسلمان لشکر منزل بہ منزل بڑھتے جا رہے تھے اور باقی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی ان رومی لشکروں کی حضرت خالد ﷛ کے لشکر کے ساتھ جھڑپ ہو گئی۔ پرانے طریقہ پر رومی مبارزت کے لیے آگے نکلے۔ حضرت ضرار بن ازور ﷛ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر ﷛ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ بلکہ جو رومی پہلوان آگے نکلتا تھا۔ مسلمان مجاہد اس کو واصلِ جہنم کر دیتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت خالد ﷛ خود آگے بڑھے اور انہوں نے رومیوں کو پکارا کہ جو تمہارا سپہ سالار ہے وہ آگے آئے اور میرا مقابلہ کرے۔ حضرت خالد ﷛ نے یہ رجز بھی پڑھی:

''میں اسلام کا ایک ستون ہوں۔ میں حضور پاک ﷺ کا صحابی ہوں۔ میں ایک باعزت جنگجو ہوں اور میرا

نام خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہے۔"

عزازیر نے طعنہ زنی کر کے قلوس کو آگے نکالا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کام تمام ہو۔ قلوس نے ان سے آ کر لڑائی لڑنے کی بجائے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بات چیت کرنا چاہی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات چیت تو ہو چکی سنبھل جاؤ اور میرے وار کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن قلوس بڑی ہوشیاری سے دونوں دفعہ اپنے آپ کو بچا گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے نزدیک پہنچ گئے اور دونوں ہاتھوں سے اسے گردن سے پکڑ کر اور گھوڑے سے اوپر اُٹھا کر زمین پر زور سے پٹخ دیا۔ پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اشارے پر دو مجاہد اس کو اٹھا کر لے گئے اور قیدی بنالیا گیا۔

اب عزازیر آگے بڑھا۔ وہ ایک لحاظ سے خوش تھا کہ اس کا رقیب قلوس مسلمانوں کا قیدی بن گیا اور وہ جلد اس کو قتل کر دیں گے اور اپنے بارے میں اس کو خیال تھا کہ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کسی وقت بھی کام تمام کر دے گا۔ وہ آگے آ کر کہنے لگا: "اے عرب دوست! ذرا نزدیک آؤ کہ میں کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے اللہ کے دشمن! تم نزدیک آؤ کہ تمہارا سر کاٹ دیا جائے۔" عزازیر نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور کہنے لگا: "اے عرب رفیق تم خود کیوں آ گئے ہو۔ اگر تم مارے گئے تو تمہارے لشکر کا امیر کون ہوگا۔"

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اے اللہ کے دشمن! تم نے تماشا نہیں دیکھا کہ ہمارے مجاہدوں نے تمہارے پہلوانوں کا کیا حشر کیا۔ اگر میں ان کو اجازت دوں تو چند لمحوں میں تمہارے لشکر کو تہس نہس کر دیں گے کیونکہ میرے ساتھ ایسے مجاہدین ہیں جو موت کو ایک تحفہ سمجھتے ہیں اور زندگی کے ساتھ انہیں کوئی پیار نہیں۔"

ہاں! یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون؟"

عزازیر: "اچھا آپ کو پتہ نہیں، میں پورے شام کا عظیم ترین پہلوان ہوں، میں نے ایرانیوں کو تہس نہس کیا اور ترکمان فوجوں کو پامال کیا۔"

حضرت رضی اللہ عنہ! آخر تمہارا نام کیا ہے؟"

عزازیر۔ "میرا نام ملک الموت کے نام پر ہے، میں عزازیر ہوں۔"

حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسکرا دیئے اور فرمایا کہ "عزرائیل فرشتہ کو آج تمہاری ہی تلاش ہے کہ وہ جلدی سے تمہیں دوزخ میں لے جانا چاہتا ہے۔"

عزازیر: "قلوس کا کیا بنا؟"

حضرت خالد رضی اللہ عنہ: "وہ قید ہے۔"

عزازیر: "اس کو قتل کیوں نہیں کرتے وہ بڑا مکار ہے۔"

حضرت خالد رضی اللہ عنہ: ''میرا ارادہ ہے کہ تم دونوں کو اکٹھا ہی قتل کروں۔''

عزازیر: ''اگر آپ اس کو قتل کر دیں تو میں آپ کو ایک ہزار سونے کے سکے، دس خلعتیں اور پانچ گھوڑے انعام میں دوں گا۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ: ''یہ تو اس کی قیمت ہوئی، تم اپنے بچاؤ کے لیے کیا دو گے؟''

عزازیر: ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ: ''جزیہ۔''

اب عزازیر کو غصہ آ گیا، کہنے لگا: ''خبردار میرے وار کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' لیکن اس کے وار سے پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے وار کر دیا۔ مگر عزازیر بچاؤ کر گیا۔ یہی نہیں بلکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے کئی وار خطا گئے۔ اور نہ صرف حضرت خالد رضی اللہ عنہ حیران رہ گئے بلکہ مسلمان مجاہدین بھی ایک رومی کے یوں داؤ سے بچنے اور اس کے طرز جنگ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے اور عزازیر نے کہا کہ ''یسوع مسیح کی قسم میں تو کسی وقت بھی آپ کو ختم کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ کو زندہ پکڑ کر اس شرط پر چھوڑنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ہمارے ملک سے چلے جائیں۔''

اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے غصہ میں نزدیک سے وار کیا لیکن عزازیر وار بچا کر بھاگ کھڑا ہوا اور جب اندازہ لگایا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا گھوڑا اس کا پیچھا کرتے ہوئے تھک گیا ہوگا تو وہ رک گیا کہ اچانک حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر وار کرے، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس پر کنارہ کشی کی اور گھوڑے سے اتر کر اس کی طرف چل دیئے اور جیسے ہی اس کے نزدیک پہنچے، عزازیر نے وار کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سر کو نیچے کر کے وار کو بھی بچایا اور اس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں۔ اور عزازیر دھڑام سے نیچے گر گیا۔ وہ اٹھ کر بھاگنے لگا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے زمین پر پٹخا کہ وہ ادھ مویا ہو گیا۔ پھر اس کو پکڑ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ واپس چل پڑے۔ اب قلوس اور عزازیر دونوں اکٹھے ہو گئے تھے۔

اسی دوران اسلامی لشکر کے باقی دو دستے بھی پہنچ گئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تجویز کے تحت مسلمانوں نے رومی فوج پر بھرپور حملہ کر دیا۔ رومی فوج نے کوئی ایک دو گھنٹے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن کمانڈروں کے بغیر وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ اور سخت نقصان اُٹھانے کے بعد بڑی افراتفری کی حالت میں بھاگے۔ رومی فوج کے کچھ جوان دمشق پہنچ گئے اور تھامس کو حالات سے آگاہ کیا۔ چنانچہ مسلمان افواج کے دمشق پہنچنے سے پہلے تھامس نے دمشق کے دروازے بند کر دیئے۔

دمشق کا محاصرہ

چنانچہ متعدد پرانے مورخوں اور گلب کے تجزیہ سے اتفاق کرتے ہوئے ہمارے لحاظ سے بھی دمشق کا محاصرہ

ذوالحجہ تیرہ ہجری یا چودہ ہجری کے شروع میں ہوگیا۔طبری کے مطابق سپہ سالار اعظم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ہیڈ کوارٹر شہر کے جنوب مغرب میں اس راستے پر بنایا جس سے مسلمان پیش قدمی کر کے آئے تھے۔ یعنی جابیہ، مرج الصفر والا راستہ کہ سپہ سالار اعظم مدینہ شریف سے آگے والے راستے پر پہلے سے ہی ہو۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو مشرقی دروازے کی طرف مامور کیا جہاں عیسائیوں کی ایک خانقاہ بھی تھی۔حضرت یزید رضی اللہ عنہ شہر کی اس طرف تھے جہاں سے وہ فلسطین سے آنے والے راستوں کی ناکہ بندی کر سکیں اور بیروت کی طرف سے بھی راستہ اسی طرف سے آتا تھا۔حضرت ذوالکلاح رضی اللہ عنہ کو حمص کی طرف سے آنے والے راستے پر مقرر فرمایا۔شہر کی چاردیواری کے باقی حصے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے دستوں میں بانٹ دیئے گئے۔متحرک دستے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی ریزرو میں رہے۔

طبری کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محاصرہ شروع میں زیادہ تر دیکھ و بھال اور ناکہ بندی کے معاملات تک محدود تھا۔دراصل محاصرہ کی کاروائی بڑی مشکل جنگ ہوتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ مسلمان محاصرہ کے ساتھ شروع میں پوری طرح نہ ''اُلجھے'' تھے اور آخری دنوں میں سخت کاروائی کی تو مورخین نے محاصرہ کی میعادوں میں اختلاف کیا۔کسی نے سخت قسم کے محاصرہ کو ہی محاصرہ کا نام دیا اور کسی نے سارے عرصہ کو۔دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلمان ساکن جنگ کے عادی نہ تھے اور دمشق کا محاصرہ وہ مجبوری کے تحت کر رہے تھے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ صراصر کے چشمہ پر مقیم تھے اور ایران میں فیصلہ کن جنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔اس لیے شام میں زیادہ کمک بھی نہ بھیجی جا سکتی تھی کہ مسلمان دمشق کے گرد کچھ دستے چھوڑ کر شمالی شام کی طرف روانہ ہو جائیں۔اور نہ ہی مسلمانوں کے پاس محاصرہ توڑنے والے ہتھیار تھے،یعنی ان کے پاس وہ ذرائع موجود نہ تھے کہ قلعہ کو تہس نہس کر دیتے، ویسے پرانے زمانے میں اکثر لڑائیاں محاصرہ کی شکل اختیار کرنے کے بعد ''ساکن'' ہو جاتی تھیں۔

محاصرہ کے شروع کے ایام

اسلامی فوج کی کل نفری پچیس سے تیس ہزار کے قریب تھی، ہمارے حساب سے اجنادین کی جنگ کے سینتیس ہزار سے ایک ہزار کے قریب شہید اور ناکارہ زخمی ہوئے ہوں گے اور کچھ مجاہدین کو اجنادین، یرموک اور فحل کے علاقوں میں چھوڑا گیا ہوگا۔اس لیے تعداد تیس ہزار کے قریب ہی باقی رہ گئی ہوگی۔محاصرہ کے ابتدائی ایام میں زیادہ فکر یہ تھی کہ رومی محاصرہ کو توڑنے یا محاصرین کو امداد پہنچانے کی کوشش کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔طبری کے مطابق رومیوں کا بارہ ہزار کا ایک لشکر حمص کی طرف سے دمشق کے محاصرین کی مدد کے لیے آیا۔ہرقل کا مدعا یہ تھا کہ اس طرح محاصرہ کرنے والے اندر اور باہر دونوں طرف سے اُلجھ جائیں۔رومیوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور کو پانچ

ہزار متحرک دستوں کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور دشمن کی قید میں

واقدی کے مطابق حضرت ضرار رضی اللہ عنہ نے دشمن پر سنیت العقاب کے مقام پر گھات لگانے کی کوشش کی اور دشمن پر بے خبری میں حملہ کر کے اس کو سخت نقصان پہنچایا، لیکن خود بھی دشمن کے گھیرے میں آ گئے اور دشمن نے ان کو گرفتار کر لیا۔ ان کے بعد مسلمانوں کی کمانڈ حضرت رافع رضی اللہ عنہ بن عمیرہ نے سنبھال لی اور دمشق میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو آگاہ کیا جنہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو فوراً امداد کے لیے بھیجا۔ بے شک حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کا دشمن کے ہاتھوں میں چلا جانا ایک بہت بڑا نقصان تھا کہ ان کا نام کئی ہزار شہسواروں کے برابر تھا اور ان کی شہرت کی وجہ سے ان کو دشمنوں کے ہاتھوں سے چھڑانا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ چار ہزار کی نفری کے ساتھ لڑائی کے میدان میں پہنچ گئے اور جاتے ہی ایسے زوردار حملے کیے کہ جلد رومیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مسلمان مجاہدین میں حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی بہن خولہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جنہوں نے مردوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اپنی پہچان پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ انہوں نے اس قدر زوردار حملے کیے کہ مسلمان مجاہدین حیران تھے کہ ان کے درمیان کوئی ایسا شاہسوار بھی موجود ہے جو اتنا بہادر ہے لیکن وہ اس کو جانتے ہی نہیں کہ وہ کون ہے۔ اور جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ سمیت مسلمان مجاہدین کو معلوم ہوا کہ یہ اسلام کے ایک عظیم فرزند کی عظیم بہن ہے تو اُن پر رقت طاری ہو گئی۔

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی بازیابی

رومیوں کی شکست کے باوجود حضرت خالد رضی اللہ عنہ فکر مند تھے۔ رومیوں کو شکست دے دینا تو معمولی بات تھی، اصلی بات یہ تھی کہ رومی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو شہید نہ کر دیں یا اپنے ساتھ حمص نہ لے جائیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا دل بینا بھانپ چکا تھا کہ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ رومیوں کے پاس میدانِ جنگ میں موجود نہیں۔ اور جلد مخبروں سے بھی اطلاع مل گئی کہ رومی پسپائی سے بھی بہت پہلے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو ایک گھوڑے پر باندھ کر حمص لے جا رہے تھے۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو چھڑانا ضروری تھا اور اس کام کے لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی نظر ریگستانی راستے کے رہنما حضرت رافع رضی اللہ عنہ بن عمیرہ ہی پر پڑی۔ البتہ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ ہونا ضروری سمجھا گیا۔

مخبروں سے ایک چھوٹے راستے کا پتہ چلایا گیا اور حضرت رافع رضی اللہ عنہ ایک سو شہسواروں کے دستہ کو لے کر تیزی سے روانہ ہو گئے۔ خطرہ یہ تھا کہ رومیوں کو اگر اپنے تعاقب کا پتہ چل گیا تو وہ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیں گے اس لیے حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک جگہ جا کر گھات لگائی۔ اور حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو دشمن کے پنجہ

سے چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ قارئین اسلام کے ان دو عظیم بھائی بہن کو دمشق سے حمص جانے والے راستے میں ایک دوسرے کو ملتے ہوئے دیکھ کر کس مجاہد کی آنکھیں نمناک نہ ہوئی ہوں گی۔

رومی کمک کا تعاقب

اہل روم کی یہ کمک بڑی تیز تیز حالت میں بھاگ رہی تھی لیکن مسلمانوں کے تمام لشکر نے ان کا تعاقب نہ کیا۔ صرف حضرت صامت رضی اللہ عنہ بن الاسود کو تعاقب کے لیے بھیجا اور واقدی کے مطابق انہوں نے حمص تک دشمنوں کا تعاقب کیا جہاں وہ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ حمص، دمشق سے تقریباً سو میل دور ہے ممکن ہے مسلمان کا تعاقب والا دستہ شاید حمص کے صوبہ کی حدود میں داخل ہوا ہو جو دمشق سے تقریباً چالیس میل کے بعد شروع ہو جاتی ہے ویسے یہ اصول ہمیشہ یاد رہے اور یہ اصول آج بھی اتنا ہی اہم ہے کہ محاصرہ میں گھرے ہوئے دشمن کے لیے باہر سے دشمن کی جو کمک آئے۔ اُس کو بہت دور روکا جائے، ورنہ اگر گھیرے والوں کو کسی کمک کی خبر مل گئی تو وہ ہر حالت میں گھیرا توڑنے کی کوشش کریں گے۔ محاصرین زندگی اور موت کے علاوہ، عزت کی جنگ بھی لڑ رہے ہوتے ہیں کہ وہ دشمن کا قیدی نہ بننا چاہیں گے۔ راقم اور اُس کے ساتھیوں کو ستمبر ۱۹۶۵ء میں اس چیز کا ذاتی تجربہ ہے کہ اپنی ایک بکتر بند گاڑی دیکھ کر ہم نے دشمن کے محاصرہ کو توڑ دیا۔

محاصرے کا دوسرا مرحلہ

محاصرے کا دوسرا مرحلہ کب شروع ہوا۔ صحیح طور پر دو حالتوں کو الگ الگ کرنا مشکل ہوتا ہے، بہر حال رومیوں کو کمک کے بھاگ جانے کے بعد مسلمان اب تسلی میں تھے کہ اُن کو دور دور تک دمشق کی طرف آنے والے راستوں کو مسدود کرنے کے لیے زیادہ نفری کی ضرورت باقی نہ رہی اور زیادہ نفری کو دمشق کی دیواروں کے نزدیک لایا گیا۔

اُدھر اُس زمانے میں یعنی صفر چودہ ہجری میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث اپنے زخموں کے باوجود ایرانیوں کو بویب کے مقام پر شکست دے چکے تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ایران کا سپہ سالار اعظم منتخب کر دیا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس جا چکے تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایران کی فتوحات کے لیے مجاہدین کا ایک لشکر جرار تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ بے شک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بڑے ٹھنڈے مزاج کے تھے اور جلد بازی میں وہ اپنے مجاہدین کو خواہ مخواہ مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ بہر حال اندازہ کیا جاتا ہے کہ ان تسلی بخش حالات کی وجہ سے دمشق کا محاصرہ کا دوسرا مرحلہ ربیع الاوّل یا ربیع الثانی چودہ ہجری میں شروع ہوا ہوگا۔

محاصرین کے حالات

دمشق شہر کی حالت یہ تھی کہ کچھ تو اسی علاقے کے باشندے تھے جن کو لڑائی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس کے علاوہ رومی فوج تھی جس کی نفری کوئی چودہ سے پندرہ ہزار بتائی جاتی ہے۔اجنادین کے مقام پر نوے ہزار رومی فوج مسلمانوں کے ہاتھوں سے شکست کھا چکی تھی۔ یہ چودہ یا پندرہ ہزار رومی مسلمانوں کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے، یہ صرف دمشق کی دیواریں تھیں جو ان کی حفاظت کر رہی تھیں جب مسلمانوں نے محاصرہ شروع کیا یعنی ذوالحجہ تیرہ ہجری میں تو یہ سردیوں کا موسم تھا اور فروری مارچ میں اس علاقے میں سرد ہوائیں چلتی ہیں۔اس لیے اہل روم کا خیال یہ تھا کہ مسلمان سردی کی وجہ سے زیادہ عرصہ محاصرہ جاری نہ رکھ سکیں گے۔مگر جب سردی کا موسم بھی گزر گیا اور موسم بہار آ گیا تو رومی فوج کا کمانڈر تھامس فکر مند ہو گیا کہ وہ کسی طرح محاصرہ توڑ کر اپنا ساز و سامان لے کر اپنے خاندان کے لوگوں سمیت حمص کی طرف فرار اختیار کرنا چاہتا تھا۔ ہمارے بعض مورخین نے دمشق کے محاصرہ کے دوران محاصرین اور مسلمانوں کے درمیان کئی بڑی بھرپور لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ بے شک محاصرہ توڑنے کے لیے بڑی بھرپور لڑائی لڑنا پڑتی ہیں مگر فتح تب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ باہر سے بھی کچھ امدادی دستے مہیا ہوں۔اس لیے یہ تمام لڑائیاں دراصل محاصرہ توڑ کر بھاگ نکلنے کی کوششیں ہی تھیں۔ایسی کوششیں کئی دفعہ دن کے وقت کی گئیں پھر رات کے وقت بھی ایک آدھ دفعہ محاصرہ توڑنے کی کوشش کی گئی۔لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔اس وجہ سے محاصرہ طول پکڑتا گیا کہ باہر سے کوئی بھرپور امداد نہ پہنچ سکی۔

پادری کی کہانی

مسلمانوں نے آخر میں جا کر رجب چودہ ہجری میں دمشق کو فتح کیا۔اس سلسلہ میں متعدد کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک پادری کی کہانی ہے کہ اُس کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُس وقت رابطہ قائم کر گئے تھے، جب عراق سے شام میں داخل ہونے کے بعد (ثنیات العقاب) پر جھنڈا لہرایا تھا۔ یہ ایک کہانی ہی معلوم ہوتی ہے، البتہ پادری کے ساتھ رابطہ بعد میں بھی قائم ہو سکتا تھا۔ یہ رابطہ اتنا پرانا اس لیے بنایا گیا کہ قلعہ بند ہو جانے کے بعد شاید کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔سخت قسم کے محاصرہ کے دوران تو شاید ایسا ہو۔لیکن پہلے مرحلہ کے دوران جو محاصرہ تھا اُس زمانے میں اِکا دُکا اور چوری چھپے لوگ قلعہ سے ضرور باہر آتے رہے ہوں گے اور یہ رابطہ اُس وقت قائم کیا گیا ہوگا۔ بہر حال اُس پادری کے بارے میں مشہور ہے کہ اُس کی مدد سے چند مجاہدین قلعہ کے اندر چلے گئے اور انہوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

یونس کی کہانی

ایک اور رومانوی قسم کی عشق و محبت کی کہانی بھی سننے میں آتی ہے اور اہل قلم حضرات ایسی کہانیوں میں رنگ

بھی بھر دیتے ہیں اور خاص کر ہمارا تو گزارہ انہی باتوں پر چلتا ہے۔

آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

(اقبالؔ)

تو کہتے ہیں کہ ایک یونس نامی عیسائی عرب اپنی محبوبہ کو جو اس کے نکاح میں بھی آچکی تھی، حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک رات باہر نکل کر مسلمان اہل لشکر سے رابطہ قائم کیا کہ اگر مسلمان دمشق کی فتح کے بعد اُس کی محبوبہ اُسے دلانے کا بندوبست کر دیں تو وہ مسلمانوں کے لیے اوپر سے کچھ رسّے پھینکے گا اور مسلمان ان رسّوں کی مدد سے اندر داخل ہو کر قلعہ کے دروازے کھول لیں۔ ایسی کہانی تسلیم کی جا سکتی ہے کہ عشق و محبت والے لوگ جنگ کے زمانے میں ایسے کاموں میں بڑے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ بلکہ فوج کی جنگی مشقوں میں بھی جہاں دو ملکوں کی لڑائی کے لئے جھگڑے کی کوئی صورت پیدا کی جاتی ہے تو اکثر ''جھگڑا'' پرتھوی راج اور سنجوگتا کے سوئمبر کی قسم کی کسی کہانی سے شروع کیا جاتا ہے، کہ سپاہی کو ایسی چیزوں کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اللہ کی فوج کے سپاہیوں کے لیے ایسی چیزیں کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ لیکن داؤ کے طور پر کوئی چیز حاصل ہو جائے تو اُس کو ضرور استعمال کیا جائے، اس لیے پادری اور یونس کی امداد کو منظور کر لینے میں کوئی دغابازی والی بات نہیں تھی بلکہ یہ ایک داؤ کا استعمال تھا جس کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

بہر حال دمشق کی فتح کے سلسلہ میں ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ ایک طرف رومی تنگ آچکے تھے کہ وہ دمشق چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف دمشق کے اصلی باشندے بھی چاہتے تھے کہ محاصرہ کہیں ختم ہو۔ اس لیے اگر دمشق کی کسی سمت سے پادری اور یونس کی مدد سے مسلمان مجاہدین داخل ہو گئے اور دوسری طرف تھامس بھی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کر چکا ہو اور دونوں واقعات ایک ہی دن ہوئے ہوں تو اس میں کسی اچنبھے کی بات نہیں۔ لڑائیوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مورخین کا یہ بیان کہ ایک طرف حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر لڑ کر صبح سحری کے وقت دمشق میں داخل ہو گیا اور دوسری طرف حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کر کے تھامس نے دروازے کھول دیئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ملاقات شہر کے وسط میں ہوئی یہ سب کچھ ممکنات میں شامل ہے۔

مبصرین اور مورخین کی لفاظی

لیکن کچھ مورخین نے سارے واقعہ کو رنگ ہی عجیب و غریب دے دیا ہے۔ ایک مبصر کے لحاظ سے تو سپہ سالارِ اعظم ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ تھے، اور گو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط مل چکا تھا لیکن انہوں نے اُس وقت

تک حضرت خالد ﷛ کوخط کے مضمون سے آگاہ نہ کیا تھا اس لیے بدمزگی ضرور پیدا ہوئی کہ حضرت خالد ﷛ کا لشکر اپنے زور بازو سے دمشق میں داخل ہوا تھا اور رومیوں کو مسلمانوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے تھے، لیکن حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے کچھ رعایتوں پر سمجھوتہ کرلیا جس کی وجہ سے رومی اپنا سارا ساز وسامان لے کر دمشق سے جاسکتے تھے اور یونس کی محبوبہ کو بھی لے جاسکتے۔ اس وجہ سے حضرت خالد ﷛ کو حضرت ابوعبیدہ ﷛ کے طریق کار پر افسوس ضرور ہوا، جو مورخین حضرت ابوعبیدہ ﷛ کو سپہ سالار اعظم مانتے ہیں، اُن کے خیال کے مطابق بھی حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے رعایتیں کچھ زیادہ دے دیں اور حضرت خالد ﷛ کو حالات سے باخبر نہ رکھا گیا تھا۔ بلکہ آگے یہاں تک بھی جاتے ہیں کہ حضرت خالد ﷛ نے تین دن کے بعد ایک لشکر کے ذریعے بھاگتے ہوئے رومیوں پر ایک چھوٹے سے راستہ سے جاکر حملہ کردیا اور تمام مال ودولت چھین لیا۔ لیکن یونس کی محبوبہ نے خودکشی کرلی۔ حضرت خالد ﷛ نے اس لڑکی کی بجائے یونس کو ایک اور خوبصورت رومی لڑکی پیش کردی۔ لیکن وہ لڑکی ہرقل کی بیٹی تھی۔ اور ہرقل کے قاصد نے حضرت خالد ﷛ سے رحم کی بھیک مانگی تو حضرت خالد ﷛ نے ہرقل کی بیٹی کو آزاد کردیا۔ یونس البتہ مسلمان ہوگیا اور بعد میں بہادری سے لڑتے ہوئے ایک اور جنگ میں شہید ہوگیا۔

تبصرہ

ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ ہم اس کہانی کو غلط کہیں اور نہ ہی کوئی ناپ تول کا ایسا پیمانہ ہے جس کی مدد سے ایسی کہانی کو غلط ثابت کریں۔ کہانی سبق آموز بھی ہے۔ یونس مسلمانوں میں شامل ہوجانے کے بعد مسلمانوں کے کردار سے متاثر ہوکر پکا مسلمان ہوگیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو شہادت نصیب کی۔ حضرت خالد ﷛ کی ہرقل کی لڑکی کو آزاد کردینے والی بات بھی اسلامی کردار کی بلندی کا مظاہرہ ہے اور ایسی کہانیوں کو تاریخ سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ نسیم حجازی نے تاریخی کہانیوں میں ایسے رنگ بھر کر لوگوں کے لیے تاریخ میں دلچسپی پیدا کی ہے۔ ایسی کہانی جہاں مسلمانوں کے اعلیٰ کردار کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ نقصان دہ نہیں ہوتی۔ البتہ حضرت ابوعبیدہ ﷛ کے حضرت خالد ﷛ کو باخبر رکھنے کے بارے میں بیانات بے معنی ہیں۔ لڑائی میں ہر بات نیچے تک پہنچانی مشکل ہوتی ہے اور حضرت خالد ﷛ جو کاروائی کررہے تھے، اس میں وہ بھی موقع سے فائدہ اُٹھا رہے تھے اور شاید دونوں عظیم صحابہ رضی اللہ عنہما نے ایک دوسرے کو خبر دی بھی ہو لیکن خبر پہنچنے سے پہلے دونوں اپنی اپنی کاروائیوں میں مصروف ہوکر قلعہ کے اندر چلے گئے ہوں، جہاں تک فرار ہونے والے رومیوں کے مال ودولت کی بات ہے کہ حملہ اس لیے کیا گیا کہ تمام مال ودولت چھین لیا جائے یہ کسی مورخ کی ذہنی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ ہم پانچویں باب میں حضرت عمر ﷛ کے حضرت ابوعبیدہ ﷛ کے خط کے اقتباسات پیش کرچکے ہیں جس میں خلیفہ دوم نے فرمایا کہ کسی مال غنیمت کے لالچ میں مسلمانوں کو کسی

مشکل میں نہ ڈال دینا۔ اس لیے مال و دولت والی تو بات ہی غلط ہے اور پھر یونس کو بھی اپنی محبوبہ نہ ملی۔ خیر ہم حصہ اول میں فرہاد کا ذکر کر آئے ہیں کہ اس کو شیریں نہ ملی اور ہماری ایسی پیار و محبت کی کہانیوں میں رانجھا ہیر نہ لے سکا اور مہینوال سوہنی کو لینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید مجازی عشق میں ہر جگہ ناکامی ہی ہوتی ہے۔ اور شاید پیامِ عشق ہی کے سلسلے میں علامہ اقبال یہ اشارہ کر گئے ہیں:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ، یعنی آتش زنِ طلسم حجاز ہو جا

دمشق کی فتح

دمشق رجب چودہ ہجری میں فتح ہوا۔ تمام مورخین اس تاریخ پر متفق ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ زماں و مکاں کے حساب اور واقعات کے تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد ہم بھی یہاں مورخین کے ساتھ متفق ہیں اور وقت کے بارے میں ہمیں اپنے تجزیہ میں کوئی بناوٹی سہارا نہ لینا پڑا۔ تمام مورخین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ فتح کے بعد صلح نامہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی طے شدہ شرائط پر ہوا۔ واقدی بھی یہی کہتا ہے، وہ صرف اضافہ یہ کرتا ہے کہ معاہدہ پر دستخط حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے تھے، کہ معاہدہ اُن کی طرف سے ہے۔ اب معاہدہ یا صلح نامہ ڈیڑھ سال تک سنبھال کر رکھا گیا یا یہ اُس کی نقل تھی یا کسی کی ذہنی اختراع۔ بات یہ ہے کہ اس معاہدہ کا فائدہ تو رومیوں کا تھا اور وہ دمشق کو چھوڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اہل دمشق تو مسلمانوں کے باجگزار بن گئے تھے اور اُن کے لیے تو شرائط وہی تھیں جو باقی لوگوں کے لیے ہوتی تھیں اور جہاں بھی مسلمان جاتے تھے اُن کے احکام ایک جیسے ہوتے تھے۔

بہر حال دمشق کی فتح ایسے زمانے میں ہوئی کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نباج والے راستے سے زرود پہنچ چکے تھے اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ شراف میں اُن کا انتظار کرتے ہوئے وفات پا چکے تھے۔ خلیفہ دوم نے ایران کے محاذ پر فیصلہ کن جنگ کی ابھی اجازت نہ دی تھی۔ دمشق کی فتح کی خبر سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو شراف جانے کی اجازت دے دی اور اُس محاذ پر قادسیہ کی جنگ کی تیاریوں پر زیادہ توجہ شروع کر دی گئی۔

روایت ہے کہ دمشق کی فتح کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جن بھاگتے ہوئے رومیوں کو راستے میں جا لیا اُن میں رومی فوج کا کمانڈر تھامس بھی تھا اور وہ لڑائی میں مارا گیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب وہاں سے واپس آ رہے تھے تو انطاکیہ سے ایک دستہ ایک رومی سفیر کو لے کر آیا جس نے ہرقل کی طرف سے درخواست کی کہ رحم کے نام پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُس کی لڑکی اور تھامس کی بیوہ کو آزاد کر دیں۔ دمشق سے انطاکیہ تقریباً ایک سو اسی سے لے کر دو سو میل بنتا ہے۔ یعنی کم از کم ہفتہ دس دن کا سفر ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رومیوں پر تین دن کے سفر کے بعد چھاپہ مارا تو وہ تقریباً آدھا

یا اُس سے کم سفر طے کر چکے ہوں گے اور انطاکیہ تک چار دن کا سفر باقی تھا کیا ہرقل کو خبر مل جانے کے بعد کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا۔ ہرقل کا سفیر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ایسے وقت مل گیا جب وہ دمشق نہ پہنچے تھے؟ زماں و مکاں سے یہ کہانی بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ہرقل کی بیٹی کو رومی لشکر کی منت پر آزاد کر دیا ہوگا۔ پھر یزدجرد کی بیٹی کو تو مدینہ بھیج دیا گیا۔ ہرقل کی بیٹی کو آزاد کر دیا گیا تو کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی۔ یزدجرد جگہ جگہ ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ بیٹی کو کیا سنبھالتا۔ قیصر روم کی بیٹی بیوہ ہوئی تھی اور قیصر اُس کو اپنے دارالحکومت میں عزت کے ساتھ رکھ سکتا تھا۔

دمشق پر قبضہ

واقدی کے مطابق دمشق پر قبضہ کے تقریباً ایک دو ہفتے بعد شعبان چودہ ہجری میں ایک عیسائی عرب نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ چند دنوں تک عبدالقدس کے مقام پر ایک بہت بڑا میلہ لگے گا اور اگر مسلمانوں کو اور مالِ غنیمت کی ضرورت ہے تو اُس کے لیے بڑا اچھا موقع ہے۔ یہ عیسائی مسلمانوں سے کچھ فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا اور حالات کچھ ایسے بیان کیے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وہاں پر چھاپہ مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کون ایسے چھاپے کے لیے تیار ہے تو نوجوان عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ شہید، نے رضا کارانہ طور پر اس چھاپہ پر جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور بزرگ صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسے لوگ بھی تیار ہو گئے۔ اُن کو لوٹ مار سے غرض نہ تھی البتہ وہ شہادت کے طالب رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے پانچ سو سواروں کے لشکروں کے ساتھ یہ لشکر عبدالقدس روانہ کر دیا۔ گبن نے اپنی تاریخ میں اس جگہ کو ابیلہ کہا ہے۔ اور ابلہ کے نام سے ایک ایسی جگہ دمشق سے بلبک کی طرف جاتے ہوئے تیس میل کے بعد آتی ہے۔ آگے واقدی لکھتا ہے کہ وہاں پر پانچ ہزار کا رومی لشکر تھا۔ جس نے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا اور ایک مسلمان بچ کر واپس آیا، جس نے سپہ سالار کو حالات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو مسلمان مجاہدین کو بچانے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ نہ صرف رومیوں کا قلع قمع کیا بلکہ کافی زیادہ مالِ غنیمت بھی ساتھ لے آئے اور خود حضرت خالد رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی اس کاروائی کی تعریف کی اور خلیفۂ دوم کو آگاہ کیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کس بہادری سے مسلمان مجاہدین کو بچانے کا کام کیا۔

تبصرہ

واقدی کے حوالے سے کچھ مبصرین اور گبن نے سارے واقعہ کو ایسا رنگ دیا ہے کہ کہانی پر یقین نہیں آتا۔ بلبک، دمشق سے تقریباً چالیس میل دور ہے اور مسلمان مجاہدین کو رومیوں کے علاقے میں کسی چھاپہ پر وہاں چلا جانا تو

فوجی حکمت عملی کے تحت صحیح تھا۔ لیکن خلیفہ دوم کی ہدایات کے باوجود اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ضمیر کو سمجھتے ہوئے ہمیں تو ساری کہانی میں کوئی بناوٹ ہی نظر آتی ہے۔ بلکہ ہمارے ایک مبصر نے جس رنگ میں اس ساری کہانی کو اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ الفاظ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان کے شایان نہیں۔

لیکن واقدی نے ایسی کہانی کیوں لکھی؟ اس میں حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی کاروائی پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ سوچے سمجھے بغیر رومیوں کے اندر پھنس گئے۔

بناوٹیں اور اضافے

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد متعدد جنگوں یا لڑائیوں کا ذکر ہو چکا ہے لیکن کسی جنگ میں کسی سطح پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہاشم کی اولاد سے کبھی کسی مجاہد کا نام اس طرح اوپر نہ آیا کہ انہوں نے فلاں دستے کی کمانڈ کی، یا فلاں کارنامہ انجام دیا۔ پہلی دفعہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کا ذکر آیا، تو کاروائی میں ناکامی کی کہانی ہے۔ یہ پہلو تجزیہ طلب ہے اور سوال یہ ہے کہ کیا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگوں نے جنگ میں شرکت نہ کی؟ یا خلافت کے دعویدار دوسرے لوگوں کی وجہ سے یا اُن کے ڈر کی وجہ سے مورخین نے بنوہاشم کی بہادری یا جنگ میں شمولیت والی بات تاریخ سے کاٹ دی، ہماری پرانی تاریخوں میں تو پھر بھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی افریقہ اور ایران کی جنگوں میں شرکت کا ذکر ملتا ہے اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی قسطنطنیہ کی جنگ میں شرکت کا ذکر بھی ہے۔ لیکن آج کل کے زمانے کی تاریخوں میں سے یہ بیانات بھی خارج ہوتے جاتے ہیں۔

اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور متعدد عظیم صحابہ کی اولاد میں سے بہت کم لوگوں کا تاریخ میں ذکر ہے۔ اب پہلے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو لیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے چار بیٹوں میں سے حضرت فضل رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے متعدد جنگوں میں حصہ لیا لیکن اُن کی بہادری پر پردہ ڈالا گیا۔ آپ کے باقی دو بیٹوں معبد رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے چار بیٹوں عمارہ رضی اللہ عنہ، فضل رضی اللہ عنہ، عقیل رضی اللہ عنہ اور یعلی رضی اللہ عنہ میں سے کسی کا ذکر نہیں ملتا کہ انہوں نے کسی جنگ میں شرکت کی۔ علاوہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی طفیل رضی اللہ عنہ، حصین رضی اللہ عنہ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث شہید بدر کے سگے بھائی تھے۔ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فتح مکہ کے بعد اسلام لے آئے۔ بلکہ آپ کے چچا ابولہب اور زبیر کے بھی کئی بیٹے اسلام لے آئے۔ تو اُن میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں ملتا وغیرہ۔ ہمارے لحاظ سے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی کتابیں چونکہ زیادہ تر بنوامیہ کے زمانے میں لکھی گئیں تو یا تو بنوامیہ کے حکمرانوں نے جان بوجھ کر ایسا کرایا، یا مورخین نے بنوامیہ کے ڈر سے یا بنوامیہ کے لوگوں کو خوش رکھنے کے لیے حضور

پاک ﷺ اور عظیم صحابہ کے خاندان کے لوگوں کے بہادری کے کارناموں کو تاریخ کا حصہ نہ بنایا۔ جب بنو عباس کا زمانہ آیا تو اُن کے اپنے خاندان کے لوگوں کو تو تاریخ میں واپس لا کر ''بحال'' کر دیا گیا لیکن باقی ہاشمیوں یا علویوں یا صدیقی خاندان وغیرہ کے بارے میں ایسا نہ ہو سکا اسی دوران ایک اور گروہ پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضور پاک ﷺ کے خاندان کے لوگ حکمرانوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے جنگوں میں شرکت ہی نہیں کی۔ یہ سب بناوٹیں یا اضافے ہیں اور اس سلسلہ میں ہماری تاریخ کی ریسرچ بہت ضروری ہے، چنانچہ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم ایسے واقعات کی یا تو چھان بین زیادہ کریں گے یا جہاں پردے پڑے ہوئے ہیں، وہاں سے پردے ہٹائے جائیں گے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ کسی گشتی دستہ کی کاروائی تھی، جو کسی جگہ پھنس گئی اور سالارِ اعظم چونکہ چوکنا تھے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو امداد کے لیے بھیج دیا۔ باقی رنگ آمیزی اہل قلم کی اپنی ہے۔

دمشق پر قبضے کے نتائج، اسباق

۱۔ دمشق پر قبضہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اول تو خلیفہ اول کے تعین کیے ہوئے احکام کے تحت چاروں لشکروں نے کاروائی کرنا تھی۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ ہی نے دمشق رہنا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص جانا تھا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ نے اُردن اور فلسطین کی طرف واپس مڑنا تھا۔

۲۔ دمشق کا نام تو بڑا تھا اور آبادی کے لحاظ سے بھی بڑا پرانا شہر تھا، اور یہی اس کی اہمت تھی۔ لیکن حکمت عملی یا فوجی لحاظ سے یہ شہر اتنا اہم نہ تھا۔ اہل روم نے بھی اس جگہ کا کوئی دوہرا دفاع نہیں اپنایا ہوا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس شہر کا خاطر خواہ دفاع نہ کر سکے۔ مسلمانوں کے لیے بھی دمشق پر حملہ کر لینا یا قبضہ کر لینا تو کچھ آسان تھا، گو محاصرہ میں کافی دن لگے لیکن قبضہ کو قائم رکھنے کے لیے افواج کی ضرورت تھی اور متحرک مسلمان مجاہدین نے دمشق پہنچ کر کچھ عجیب حالات محسوس کیے۔ اس شہر کے دفاع کے لیے قلعہ بند ہونا اُن کے طریق جنگ میں نہ آتا تھا۔ اور تمام راستوں کی حفاظت یا ناکہ بندی کے لیے کافی لشکروں کی ضرورت تھی۔ پھر شہری زندگی کے معاشرتی معاملات نے افواج کو الجھا کر رکھ دیا سادہ اور کم ضروریات والے مجاہدین شہری زندگی کے مسائل دیکھ کر حیران رہ گئے، تو اُن کو تب کچھ سمجھ آئی کہ خلیفہ اول نے عراق وایران کے محاذ پر حیرہ کی فتح کے بعد مدائن کی طرف پیش قدمی کی اُس وقت اجازت کیوں نہ دی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین جانتے تھے کہ شہروں میں ''کشش'' ہے۔ لبھاؤ ہے لالچ ہے زندگی کی ہر چیز مہیا ہے، اور یہ شہر ہی قوموں کو بے شک علم اور اخلاق تو ضرور سکھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی آرام پسندی، حرص اور لالچ بھی بڑھا دیتے

ہیں اور تہذیب کے پردہ کے نیچے پتہ نہیں کیا ہوتا رہتا ہے:

پردہ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی — کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

(مسولینی کا خیال علامہ اقبال کے الفاظ میں)

۳۔ دمشق کی فتح کے بعد سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کا لشکر دمشق کے بندوبست کے لیے بندھ کر رہ گیا۔ اور اسلامی لشکر کی متحرک کاروائیوں میں پچیس فیصد کمی واقع ہوگئی۔

۴۔ اہل روم کے لیے دمشق خالی کرنے میں فوجی لحاظ سے ان کی طاقت پر کوئی زیادہ اثر نہ پڑا۔ حمص سے ہٹ کر انہوں نے انطاکیہ میں لشکر اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ دوسری طرف فلسطین میں اجنادین سے لے کر، بیت المقدس کے علاقے میں اپنی چھاؤنیوں کو خوب مضبوط کیا۔ لیکن رومی زیادہ توجہ فحل کے علاقے کو دے رہے تھے اور فحل کے مغرب میں دریائے اُردن کے پار بیسان اور طبریہ کے مقامات پر انہوں نے کافی زیادہ فوج اکٹھا کرنا شروع کر دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ فوج کے ساتھ دریائے اُردون کو کسی وقت پار کر کے اور فحل سے پیش قدمی کر کے واقوصہ کی گھاٹی پر مسلمانوں کے عقب میں قبضہ کر لیں گے۔

۵۔ ساتھ ہی اہل روم اپنی سمندری طاقت میں اضافہ کرنے لگ گئے اور فلسطین کے علاقوں میں تمام کمک سمندری راستوں سے آنا شروع ہوگئی۔

۶۔ دمشق دفاعی لحاظ سے اچھا مقام نہ تھا کہ وہاں آرام سے بیٹھ کر شمال یا شمال مغرب کے کسی حملے کے خلاف اچھا دفاع اختیار کر لیا جاتا۔ دمشق ہر وقت خطروں سے دوچار تھا اور اس کے دفاع کے لیے بہت زیادہ فوج کی ضرورت تھی لیکن سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ جو مجاہد دمشق پہنچ گئے وہ وہاں کی خوبصورتی سے بُری طرح متاثر ہو رہے تھے کہ وہ نہ صرف وہاں آباد ہونا پسند کرنے لگے بلکہ اُنہوں نے وہاں شادیاں کرنی بھی شروع کر دیں۔

۷۔ تاریخ کے بامقصد مطالعہ کے لیے، امام مسلم اور امام بخاری کے پایہ کے بزرگوں کی ضرورت ہے جو لوگ ہماری تاریخ کو صحیح رنگ میں پیش کریں اور تمام بناوٹوں، اضافوں، اور تعصبوں کو دور کریں۔

اسباق حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسلمانوں کی بجائے کوئی اور فوج ہوتی تو وہ لوگ دمشق جیسے شہر میں وہی کچھ کرتے جس کو علامہ اقبال نے مسولینی کی زبان میں بیان کیا، لیکن مسلمانوں نے وہاں پر تھوڑی فوج رکھی اور اپنے مقصد کی طرف روانہ ہوگئے کہ ہر جگہ اللہ اور اللہ کے رسول کا نام بلند کرنا تھا۔

۲۔ کسی بڑے شہر پر قبضہ رکھنے کے لیے دور دور تک کے علاقہ کی صفائی کرنا پڑتی ہے اور ہمارے مجاہدین شہر کو

چھوڑ کر بیابانوں کی طرف روانہ ہو گئے:

گماں آبادِ ہستی میں یقین مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

(اقبالؔ)

ساتواں باب

فحل، حمص اور باقی علاقوں میں فوجی کاروائیاں

پچھلے دو ابواب میں فحل کا ذکر ہو چکا ہے۔ نقشہ چہارم پر فحل کا محل وقوع دیکھنے سے فحل کی فوجی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہر مقام کی فوجی اہمیت حالات اور مہمات سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر مسلمان پورے فلسطین پر پہلے قبضہ کر لیتے تو فحل فلسطین اور اُردن کے درمیان ایک پل کا ایک سرا ہی تھا۔ اور اس کی وادی یا اُس کے گرد پہاڑ یا اُس کا نچلا میدانی علاقہ اتنی اہمیت کا حامل نہ ہوتا لیکن مسلمان ایک طرف دریائے اُردن کو اپنے بائیں بازو کی حفاظت کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف اپنے دوست ریگستان کو دائیں بازو پر رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اب وہ شمال میں اتنے دور جا چکے تھے کہ دریائے اُردن کے دونوں کناروں پر قبضے کی ضرورت تھی اور فحل سے دریا کو پار کر کے دریا کے مغربی کنارے پر قبضہ ضروری ہو گیا تھا۔

فحل کی اہمیت

قارئین کرام کو! یاد ہو گا کہ دمشق کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے مسلمان مجاہدین فحل گئے تھے اور وہاں پر حضرت ابی الاعور سلمی رضی اللہ عنہ کے ماتحت کچھ دیکھ بھال والے دستے بھی چھوڑ گئے تھے اور اس وقت صرف اتنا کچھ ہی کرنے کی ضرورت تھی اور اتنا ہی ہو سکتا تھا۔ فحل کے علاقے پر مکمل قبضے کے لیے دریا کے پار بیسان اور طبریہ پر بھی قبضہ

ضروری تھا اور اگر مسلمان اس وقت یعنی ذی قعدہ تیرہ ہجری میں کوئی ایسی کاروائی کرتے تو اس کامیابی کو قائم رکھنے کے لیے وہاں پر کافی فوج رکھنا پڑتی۔

البتہ دمشق پر قبضہ ہو جانے کے بعد، اب اہلِ روم کے لیے بھی آسان ہو گیا تھا کہ فسلطین کی فوج کو دمشق لے جانے کی بجائے وہ کسی وقت بھی فحل سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے عقب میں یرموک کے سارے علاقے پر قبضہ کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کے ذرائع آمد و رفت اب لمبے ہوتے جاتے تھے۔ اور جب ذرائع آمد و رفت زیادہ طول پکڑ جائیں تو فتح کا اختتامی مقام آجاتا ہے کہ جیسے آگے بڑھتے جائیں گے تو عقب کی حفاظت کے معاملات بھی بتدریج بڑھتے رہیں گے مسلمان اس سلسلہ میں بڑے چوکنے تھے اور بروقت کاروائیاں کرتے تھے۔ لیکن ہرقل کوئی معمولی آدمی نہ تھا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وہ بڑا مدبر اور سمجھ دار آدمی تھا۔ دمشق کے علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ سر پھوڑنے کی بجائے فحل کے مقام پر، وہ اجنادین کی طرح کا ایک جمگھٹ کر کے مسلمانوں کے عقب کے لیے خطرات پیدا کر سکتا تھا۔ اور اس کے ردِ عمل کے طور پر اگر اسلامی لشکر وہاں پر اجنادین کی طرز کا کوئی اجتماع کرتے تو یہ بھی رومیوں کی خواہش کے مطابق تھا کیونکہ اجنادین تو کھلا میدان تھا اور مسلمان اپنے متحرک طرز جنگ کی وجہ سے فتح حاصل کر سکے لیکن فحل کی وادی میں تنگ گھاٹی تھی۔ دریا تھا، دلدل بنائی جا سکتی تھی۔ سطح سمندر سے نچلے علاقے تھے اور رومی زمین کے چپہ چپہ، پانی کے بہاؤ یا پایاب کے علاقوں سے واقف تھے۔ اور ایسے کیچڑ والے تنگ علاقے میں مسلمانوں کی کاروائیاں محدود ہو کر رہ جاتیں۔ اس لیے دمشق کی شکست کے بعد رومیوں نے اپنی تمام تر توجہ طبریہ، بیسان اور فحل کے علاقوں کی طرف کر دی۔

رومی فوج

چنانچہ مخبروں سے مسلمانوں کو جو اطلاعات موصول ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اہلِ روم جزیرہ، آرمینیا، شمالی شام بلکہ یونان اور یورپ کے علاقوں سے لوگوں کو بھرتی کر کے ایک لاؤ لشکر تیار کر رہے تھے۔ اس لشکر کا کمانڈر سقلار بن مخراق تھا اور جب اس لشکر کی نفری کوئی اسی ہزار کے قریب ہو گئی تو اسے فحل، طبریہ اور بیسان کے علاقوں میں بھیج دیا گیا بلکہ کمک کے طور پر قساریہ میں بھی کچھ فوج رکھی گئی کہ ضرورت پڑنے پر بھی سقلار کی مدد کرے۔ دمشق رجب چودہ ہجری میں فتح ہوا تھا۔ شعبان اور رمضان کے مہینے بندوبست اور دور دور تک حربی مظاہرے کرنے میں گزر گئے اور آخر شوال کے مہینے میں حضرت ابوعبیدہ ﷜ نے دمشق کی عملداری حضرت یزید بن ابوسفیان ﷜ کو سونپ دی اور خود باقی لشکر سمیت فحل کی طرف روانہ ہو گئے۔

فحل کی دوسری جنگ

اس کاروائی کی جلد ضرورت تھی۔فرق صرف یہ ہے کہ کچھ مورخین نے اس جنگ کی تاریخ ذی قعد تیرہ ہجری لکھی اور کچھ نے ذی قعد چودہ ہجری اور کچھ نے معاملات بین بین چھوڑ دیئے۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ دونوں قسم کے مورخین صحیح ہیں۔ کیونکہ فحل کے مقام پر دو جنگیں ہوئیں، پہلی جنگ دمشق کی طرف پیش قدمی سے پہلے ہوئی، اور مسلمانوں نے دریا کو پار نہ کیا اور دریا کے مشرق کے علاقہ پر قبضہ کر کے حضرت ابی الدعور رضی اللہ عنہ کو وہاں پر چھوڑ گئے کہ دریا کے مغربی کنارے سے دشمن آگے بڑھ کر مسلمانوں کے ذرائع آمدورفت کو نہ کاٹ دے۔ یہ واقعہ ذی قعد تیرہ ہجری کا ہے اور دوسری لڑائی کا ہم اب ذکر کر رہے ہیں جو ذی قعد چودہ ہجری میں ہوئی تو زماں و مکان کا معاملہ بھی صحیح ہو گیا اور اختلاف بھی ختم ہو گیا۔ یہ علاقہ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری کا تھا اور کئی مبصرین نے اس کاروائی کے بارے میں یہ بھی لکھ دیا کہ تمام لشکروں کی کمانڈ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، یہ سب غلط ہے، کمانڈ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔

تبصرہ

اصل بات یہ ہے کہ اسلام اللہ کی آمریت ہے اور ہر وقت ہر جگہ ایک اولوالامر کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر تم دو ہو تو ایک کو اپنا امیر مقرر کر لو۔ اس لیے، اصول یہ ہے کہ ہر جگہ ہر وقت ایک امیر موجود ہو اور اُس کے احکام کی پابندی کی جائے، تا کہ ربط و ضبط رہے۔ اسلام کے لحاظ سے کام فوجی نوعیت کا ہو یا سویلین ایک امیر کا ہونا لازمی ہے۔ اس لیے حصہ اول میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ مرتدین کی مہم کے دوران جن امراء کے علاقے نزدیک نزدیک تھے، اُن کے اکٹھا ہونے کی صورت میں جس کا علاقہ ہو گا وہی امیر ہو گا۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں یہ پہلو واضح کیا گیا تھا۔ یہاں پر خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے احکام اسی قسم کے تھے لیکن وہ باقی امراء کے لیے تھے، جب سب اکٹھے ہوتے تھے تو پھر سپہ سالارِ اعظم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہی ہوتے تھے۔ اور پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ تھے، ویسے تو اجنادین حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا علاقہ تھا۔ اور دمشق حضرت یزید رضی اللہ عنہ کا لیکن کمانڈ سپہ سالارِ اعظم کے پاس ہی رہی۔

چنانچہ دمشق سے فحل کی طرف کوچ کے وقت حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی کے دستے جیش المقدم کا کام کر رہے تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار اعظم تھے اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے دستوں کو چھوڑ کر باقی سارے لشکر فحل پہنچ گئے، مسلمان دستے دریا کو پار کر کے بیسان پر دھاوا بولنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اہل روم نے دریا کے پانی کو بند کے ذریعے باندھ دیا اور فحل کے تمام علاقے کو زیر آب کر دیا اور مسلمان ادھر ہی رُک گئے۔ اہل روم یہ بھی جانتے تھے کہ دلدل میں سے کون سے راستے موجود تھے اور کہاں سے گزر کر وہ مسلمانوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ مسلمان کچھ فکرمند ضرور تھے کہ دلدل اور کیچڑ اُن کے لیے ناپسندیدہ چیز تھی۔ اور سقلار کچھ زیادہ ہی غلط فہمی میں تھا اور وہ یہ سمجھا کہ مسلمان حملہ

کرنے آئے تھے، اُس میں ناکام ہوئے اور اب وہ بے فکر ہو کر بیٹھ گئے ہوں گے۔ اُس نے خاموشی سے دریا اور دلدل کو پار کیا اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

دلدل اور کیچڑ میں لڑائی

مسلمانوں نے رومیوں پر ایسی جوابی کاروائی کی کہ دلدل اور کیچڑ کی لڑائی رومیوں کو بہت مہنگی پڑی اور سقلار سمیت کوئی دس ہزار رومی موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ مسلمان پہلے دلدل کے بارے میں فکرمند تھے جب انہوں نے دیکھا کہ رومیوں کے مقابلہ میں وہ کیچڑ اور دلدل میں بھی بہتر جنگجو ہیں، تو انہوں نے پیش قدمی شروع کر دی اور رومیوں کو دریا سے پار جانے سے روک دیا۔ بلکہ طبری کے مطابق اسی ہزار کے رومی لشکر سے صرف چند ہزار دریا کے پار جا سکے۔ خیر ممکن ہے کہ اتنا سخت نقصان نہ ہوا ہو لیکن بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ اس شکست کے بعد رومی کسی کھلے میدان میں مسلمانوں کا سامنا نہ کر سکے۔

دریائے اُردن کے مغربی کنارے

فحل کی اس کامیابی کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ تو دریا کے مشرق میں رہ گئے اور انہوں نے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکروں کو دریا پار کر کے مغربی علاقے کے مقامات کو سر کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کاروائی میں احکام کے مطابق حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے کہ اُن کا علاقہ تھا جن کو مورخین نے غلطی سے شروع ہی سے سپہ سالار بنا دیا۔ اب تجویز یہ تھی کہ اگر حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ دو لشکروں کے ساتھ اپنی عملداری میں دشمن کا قلع قمع کر سکتے ہیں تو پھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ حمص کی طرف چلے جائیں گے کہ وہاں پر حضرت ذوالکلاح رضی اللہ عنہ دمشق سے صرف تیس چالیس میل دور شمالی علاقوں کی دیکھ بھال کے کام پر مامور تھے۔ دریا کو پار کرنے کے بعد مسلمانوں کو خبر ملی کہ رومی بیسان اور طبریہ میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان شہروں کا محاصرہ کرنا پڑا اور ان کو فتح کرنے میں دیر ضرور لگی۔ آخر کار یہ شہر بھی دمشق کی صلح کی شرائط پر مسلمانوں کے باجگزار بن گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جب تسلی ہو گئی کہ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اب اُردن اور جنوبی فلسطین کے علاقے کے بچے کھچے رومی قلعوں کو بغیر کسی مدد کے سر کر لیں گے تو وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی کاروائیاں

اُردن اور فلسطین کے علاقوں میں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی کاروائیوں کو نہ تو مورخین نے

کسی تسلسل سے بیان کیا ہے اور نہ ہی فوجی نقطۂ نگاہ سے۔ سب مورخین کے مطابق ان دونوں سالاروں نے بیت المقدس کو چھوڑ کر فلسطین اور اردن کی تمام چھاؤنیوں اور فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ بلکہ مورخین اجنادین کی دوسری جنگ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کہ عمرو بن عاص ﷛ کی کمانڈ میں دونوں سالاروں نے اجنادین کے مقام پر ایک اور جنگ بھی لڑی کیونکہ سمندر کے راستے اہل روم، فلسطین کے علاقے کے کئی مقامات پر نئی فوج لے آئے تھے تو اس کا بھی قلع قمع کرنا پڑا۔ مورخین دونوں سالاروں کے رُخ اور راستہ کے بارے میں خاموش ہیں۔

کہ آیا سمندر کے ساحل والا راستہ اختیار کیا یا طبریہ سے واپس آ کر دریائے اُردن کے مغربی کنارے سے ہوتے ہوئے بحیرہ مردار سے گزر کر اجنادین تک گئے کہ آگے مورخین غازہ اور عقرہ کے علاقوں تک ہر قبضہ کا ذکر کرتے ہیں۔ دراصل پرانے زمانے میں بھی بڑے لشکروں کا قبضہ شہروں تک محدود ہوتا تھا۔ اور بارود کی ایجاد کے بعد بیسویں صدی کے نصف تک معاملات تبدیل ہو گئے کہ چند ہتھیار بند دستوں کی مدد سے بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اب پھر حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ سویلین لوگوں کے پاس بھی چھوٹے ہتھیار ہوتے ہیں اور غیر ملکوں پر قبضہ مشکل ہو جاتا ہے تو اُس زمانے میں بھی مسلمانوں کے دونوں لشکر قساریہ کو چھوڑ کر تقریباً تمام اُردن اور فلسطین کے شہروں پر قابض ہو چکے تھے۔ البتہ بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ جس میں خاص حکمت عملی تھی اور اُس کی وضاحت دسویں باب میں ہو گی کہ اپنے درمیان میں اس جگہ پر کیوں قبضہ نہ کیا گیا۔

قساریہ کی کاروائی

پرانے زمانے کے مورخین جب لشکروں کی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں تو فتوحات کو ذرا زیادہ ہی وسعت دے دیتے ہیں۔ ہمارے مورخ نے جہاں حضرت شرجیل ﷛ اور عمرو بن عاص ﷛ کی فلسطین و اُردن کی فتوحات اور حضرت ابوعبیدہ ﷛ اور حضرت خالد ﷛ کی حمص کی فتوحات کا ذکر کیا تو درمیان میں حضرت یزید بن ابوسفیان ﷛ کی فتوحات کو بھی یہ ''وسعت'' دے دی کہ انہوں نے بیروت تک تمام ساحلی علاقے فتح کر ڈالے۔ یہ علاقے فتح ضرور ہوئے لیکن یرموک کی دوسری اور بڑی جنگ کے بعد نہ کہ، اس وقت جیسا کہ بعض مورخین اور مبصرین لکھ گئے ہیں۔ اوّل تو جب تک حضرت ابوعبیدہ ﷛ اور حضرت خالد ﷛ اُردن میں تھے، اس زمانے میں حضرت یزید ﷛ بڑی مشکل کے ساتھ دمشق کے دفاع کا بندوبست کر رہے تھے اور ذی قعد، ذوالحجہ چودہ ہجری میں جب یہ دونوں عظیم سالار دمشق سے شمال کی طرف چلے گئے تب حضرت یزید ﷛ کسی طرف کوئی کاروائی کرنے کے قابل بنے اور ان کو حضرت ابوعبیدہ ﷛ کے احکام کے تحت قساریہ کی رومی فوج کی سرکوبی کے لیے کچھ کاروائی کرنا پڑی۔ حضرت یزید ﷛ کے پاس اتنا لشکر نہ تھا کہ وہ ایک طرف قساریہ میں بھی لڑائی کرتے اور دوسری طرف شمال میں بیروت بھی چلے جاتے۔ قساریہ دراصل

فلسطین میں تھااور جیسا کہ نقشہ سوم اور چہارم سے ظاہر ہے کہ یہ بندرہ گا عرض بلد کے حساب سے طبریہ سے بھی جنوب کی طرف ہے لیکن قساریہ میں رومیوں کی کافی فوج رہتی تھی۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے وہاں پر فوجی دستے بھیجے مگر قساریہ فتح نہ کر سکے۔ گو حضرت یزید رضی اللہ عنہ کا لشکر قساریہ کا خشکی کی طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے لیکن سمندر کی طرف کھلی تھی اور مسلمانوں کو قساریہ فتح کرنے میں بالکل کامیابی نہ ہوئی بلکہ چند ماہ بعد جب مسلمانوں کے دستوں نے حمص وغیرہ سے پسپا ہو کر یرموک میں پوزیشن اختیار کی تو قساریہ کا محاصرہ بھی اُٹھانا پڑا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کاروائی

فحل کی دوسری جنگ ذی قعد چودہ ہجری میں ختم ہوئی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کچھ دیر وہاں انتظار کیا کہ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اردن اور فلسطین کے معاملات پر حاوی ہو جائیں اور جب انہوں نے حالات کو سنبھال لیا تو ذوالحجہ چودہ ہجری میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دونوں لشکروں کے ساتھ شمالی علاقوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئے انہیں دمشق کے پاس سے گزرنا تھا اور اس لیے انہوں نے دمشق کو ایک طرف چھوڑ دیا لیکن جیسے ہی وہ مرج الروم کے مقام پر پہنچے تو آگے سے دو رومی لشکر ان کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔

رومیوں کی دمشق فتح کرنے کی کوشش

ہرقل فوجی تدبر کے لحاظ سے بڑا ماہر آدمی تھا اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسلامی لشکر فلسطین میں اُلجھے ہوئے تھے اور دمشق کے علاقے میں صرف یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کوئی آٹھ نو ہزار کے لشکر کے ساتھ موجود تھے۔ اس لیے اس نے جنرل تھیوڈس (توذرا) کے ماتحت ایک لشکر تیار کیا جس کو حکم دیا کہ بیروت والے راستے سے تیزی سے آگے بڑھ کر دمشق پر حملہ کرے۔ دراصل یہ لشکر انطاکیہ میں تیار کیا گیا تھا اور اس کا کام حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو بے خبری میں آلینا تھا لیکن اس لشکر کو روانہ کرنے کے بعد ہرقل کو پتہ چلا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی اُردن سے چل پڑے ہیں اور وہ شمال کی طرف حرکت کر رہے ہیں، اب وہ فکرمند ہوا۔ اور اس نے حمص کی افواج کو حکم دیا کہ وہ جلدی سے حرکت کر کے توذرا کی مدد کو پہنچیں۔ چنانچہ وہاں سے ایک لشکر جنرل شنس کی کمانڈ میں دمشق کی طرف چل پڑا۔

فوجی نقادوں اور مبصروں میں ایک اصطلاح مشہور ہے کہ متحارب لشکر ایک دوسرے کو مقناطیس کی طرح کھینچتے ہیں۔ اصطلاح از خود بڑی پر معنی ہے اور کلاسوٹز نے اس پہلو پر اپنی کتابوں میں ایک پورا باب لکھ ڈالا ہے۔ دراصل یہ سب ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ اور امید کی جھلک دونوں طرفین کی گتھم گتھا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بہرحال یہاں پر یہ اصطلاح بڑی موزوں رہے گی اور جو لوگ فلسفۂ جنگ اور نظریہ جنگ کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ

موجودہ بیان شدہ حالات میں اس اصطلاح کا ذہنی تجزیہ کر سکتے ہیں کہ ای طرف جنرل توذرا اور جنرل شنس، مرج الروم کے مقام پر پہنچے تو دوسری طرف حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ گو ظاہر ہے کہ اس کی خبر مسلمانوں نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو بھی دے دی ہوگی کہ وہ بھی سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق دمشق کا باہر سے متحرک دفاع بھی کررہے تھے اور پھر ایک بیرونی دفاعی لائن بھی بنائی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن کو آگے نہ طلب کیا اگر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان رومی لشکروں کا قلع قمع کرنے کے قابل نہ ہوتے تو ان کی شمالی شام کی فتوحات کے ارادے کسی جچی تلی حکمت عملی کا نتیجہ نہ تھے۔ یاد رہے کہ مسلمان بڑے باخبر تھے اور اُن کی تمام تر کارروائیاں ایسی تجویز کے تحت ہوتی تھیں جو ٹھوس بنیادوں پر بنائی جاتی تھیں۔

طرفین کی نفری اور تیاری

اسلامی لشکر کی نفری کوئی بیس ہزار کے قریب تھی جو دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جنرل توذرا کی نفری بیس پچیس ہزار سے کم نہ ہوگی کہ وہ دمشق فتح کرنے آرہا تھا اور مانا کہ اہلِ روم کو غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ مسلمان اُردن اور فلسطین میں اُلجھے ہوئے ہیں لیکن حضرت یزید رضی اللہ عنہ تو دمشق میں تھے۔ تو رومی جنرل شنس جو کمک کے طور پر آیا، اُس کی نفری بھی کم از کم دس ہزار ضرور تھی اور انہوں نے دیکھا کہ مسلمان لشکر اُن کے سامنے صف بند تھے تو جنرل شنس، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے اور جنرل توذرا حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے صف بند ہوگئے لیکن پہلے اس سے کہ کوئی لڑائی ہوتی سورج غروب ہوگیا۔

اہل روم کی حربی چال

رومی جنرل حربی تجویزوں کے ماہر تھے، اور توذرا نے سوچا کہ جب دو اسلامی لشکر دمشق سے آگے پیش قدمی کر چکے تھے تو ضروری ہے کہ دمشق کے دفاع کے بارے میں حضرت یزید رضی اللہ عنہ کچھ بے فکر ہو چکے ہوں گے اور وہ لوگ آرام کر رہے ہوں گے۔ اس لیے رات کی تاریکی میں ایک طرف ہو کر توذرا اپنے لشکر کو لے کر دمشق کی طرف چل پڑا۔ اور شنس اکیلا ہی دو لشکروں کے سامنے صف آرا ہوگیا۔ رومیوں کی اس میں ایک حربی چال تھی کہ دمشق پر قبضہ کر لینے کے بعد وہاں قلعہ بند ہو جائیں گے اور مسلمان محاصرے میں الجھ جائیں گے۔ دراصل ہرقل ایک بہت بڑی جنگ کی تیاری میں مصروف تھا اور اگلے واقعات میں یرموک کی جنگ انہی تیاریوں کا نتیجہ تھی۔ اس سے آگے اہل روم کی تجویز یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر شنس اکیلے طور پر دو لشکروں کا مقابلہ نہ کر سکا تو وہ کچھ پسپائی اختیار کرے گا اور مسلمان اُن کا تعاقب نہ کریں گے کہ اُن کو دمشق کے بارے میں خبر مل جائے گی اور بے شک ساری تجویز بہت اعلیٰ پائے کی تھی، اور ایسی تیاری

کے لیے ہرقل کی تجویز کچھ اس قسم کی تھی کہ مسلمانوں کو منتشر رکھ کر جگہ جگہ مختلف مقامات کے محاصروں میں اُلجھا دیا جائے، اس لیے جنرل توذرا کی دمشق کی طرف پیش قدمی اسی تجویز کی ایک کڑی تھی۔ اسلام کے دو عظیم سپہ سالاروں نے مشورہ کیا کہ صورت حال سے کیا نپٹا جائے اور فیصلہ کیا گیا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ادھر ہی رہیں اور شنس کے لشکر کو اُلجھائے رکھیں اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ دمشق کا چکر لگا ہی لیں کہ توذرا شاید ادھر گیا ہو۔

مسلمانوں کا ردِّ عمل

اسلام کے عظیم فرزندوں کا تجزیہ صحیح تھا۔ پو پھٹنے سے تھوڑا پہلے توذرا لشکر دمشق کے قریب پہنچ گیا لیکن حضرت یزید رضی اللہ عنہ چوکنے تھے اور وہ دمشق کے باہر ہی صف بند ہو گئے، اور توذرا کا مقابلہ شروع کر دیا۔ مسلمان کھلے میدان کی لڑائی کو پسند کرتے تھے اور وہ خود تو کبھی قلعہ بند ہونا پسند نہ کرتے تھے، بلکہ جب دوسرے لوگ قلعہ بند ہو جاتے تو بھی مسلمانوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کس حربی چال کی مدد سے ان لوگوں کو قلعہ سے باہر نکال لیں اور دو دو ہاتھ اگر کھلے میدان میں ہوں تو بہتر ہے۔ مسلمان مجاہدین کھلے میدانوں میں دشمنوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔ توذرا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے دمشق کا رُخ کیا اس کا خیال تھا کہ وہ دمشق پر آسانی سے قبضہ کر کے قلعہ بن ہو جائے گا لیکن وہاں حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے مجاہدوں نے ان کے لشکر کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ اور اس کے لشکر والے دمشق کی فتح کے خوابوں کو بھول کر وہاں سے پسپائی کی کسی تجویز کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ان کے عقب میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مجاہدین پہنچ گئے۔ رومی فوج بری طرح تہس نہس ہو گئی اور توذرا بھی ہلاک ہو گیا۔ یہاں پشتو کی کہاوت بڑی موزوں ہوگی "باران داتخدیدم، پرناہ پر شبہ شوہ"، یعنی بارش سے بھاگا اور رات پرنالہ کے نیچے گزارنا پڑی۔

داؤ یا حربی چال

جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو تسلی ہو گئی کہ اُن کے سامنے جنرل شنس کا لشکر ہے اور باقی رومی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے تو انہوں نے ایک بھرپور حملے کا حکم دے دیا اور خود آگے بڑھ کر شنس کو ہلاک کر دیا۔ مسلمانوں کی کم تعداد کو دیکھتے ہوئے پہلے تو رومی بڑی بہادری سے لڑے لیکن جلد ہی میدانِ جنگ ان کی لاشوں سے بھر گیا۔ اس لئے انہوں نے دل چھوڑ دیا اور بغیر کسی ترتیب کے پسپائی شروع کر دی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن کا برائے نام تعاقب کیا کہ ابھی دمشق سے حالات کی خبر نہ ملی تھی۔ لیکن شام تک دمشق سے حالات کی خبر مل گئی کہ رومیوں کی حربی چال ایک داؤ تھا جو کامیاب نہ ہو سکی۔ رومیوں کی اس بھرپور شکست کے بعد مسلمانوں نے شمالی شام پر آسانی سے قبضہ کر لیا لیکن مسلمان

چوکنے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اہلِ روم کے ساتھ فیصلہ کن جنگ ابھی باقی تھی۔

مسلمانوں کی حکمت عملی

مسلمانوں نے دمشق کی فتح کے کئی ماہ بعد حمص کی طرف پیش قدمی کی۔ گو دمشق کی فتح کے بعد وہ کسی وقت بھی حمص تک بڑی آسانی سے جا سکتے تھے لیکن وہ سب کچھ کسی ضرورت کے تحت کرتے تھے۔ پیش قدمی کرتے وقت اپنے دوست ریگستان کو وہ دائیں بازو پر رکھے ہوئے تھے۔ مسلمان ایک طرف شمال کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے تو دوسری طرف پہاڑی اور زرخیز علاقے میں اور ساحل کے ساتھ ساتھ دشمن کی چوکیوں کا آہستہ آہستہ صفایا کر رہے تھے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ ایسی کارروائی کے لیے فلسطین کے نچلے علاقوں میں مصروف تھے۔

جیسے ہی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے رومی لشکروں کا مرج الروم میں صفایا کیا اور حمص کے لیے پیش قدمی کی تو ساتھ ہی حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ نچلے ساحلی علاقوں میں وہ قساریہ کی بندرگاہ پر قبضہ کریں۔ چنانچہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کارروائی کے لیے ایک دستہ کے ساتھ وہاں بھیج دیا اور اہل قساریہ قلعہ بند ہو گئے۔ کسی مورخ نے اگر اُسی زمانے میں حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بیروت کی فتح کا ذکر کیا ہے تو وہ صحیح نہیں کہ رومی اس وقت تک بڑے طاقتور تھے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حمص کی فتح

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی ان حالات میں زیادہ سے زیادہ حمص تک جا سکتے تھے کیونکہ اس وقت ان کے پاس اتنی زیادہ طاقت نہ تھی اور ایسے کام کے لیے مسلمانوں کو متحد ہو کر اپنی چنی ہوئی زمین پر کارروائی کرنا تھی۔ مسلمان لشکر جو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے ان کی نفری کوئی چودہ ہزار کے قریب باقی رہ گئی تھی اور یہ نفری دور جا کر اپنی فتح کو قائم نہ رکھ سکتی تھی۔

عراق کی فوج کی واپسی

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج میں نفری کی یہ کمی اس لیے واقع ہو گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جو فوج عراق سے اپنے ساتھ لے آئے تھے اُس کو واپس کر دیا جائے اور زماں و مکاں کے تمام جائزوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مراج الروم کی جنگ کے فوراً بعد اور حمص کی فتح سے پہلے ملک شام سے چھ ہزار مجاہدین حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ کی کمانڈ میں ایران چلے گئے اور دو حصوں میں (عین) جنگ قادسیہ کے دوران

وہاں پہنچ گئے۔ جس کی تفصیل پہلی کتاب میں موجود ہے کہ یہ واقعہ محرم پندرہ ہجری کا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ ذوالحجہ چودہ ہجری میں شام سے چلے ہوں گے کہ سفر تقریباً ایک ماہ کا تھا۔ عسکری تاریخ کے طالب علموں اور فوجی حکمت عملی اور تدبیرات کے ماہرین کے لیے اس کاروائی میں بہت زیادہ اسباق ہیں کہ اتنے دور بیٹھ کر خلیفہ دوم کا زماں و مکاں کا حساب کتنا ٹھیک تھا اور کمک ایسے وقت بھیجی گئی کہ ملک شام میں کوئی بھرپور کاروائی نہ ہو رہی تھی۔ ہمارے مورخین نے جو زماں کے اختلافات بیان کیے، صحیح تجزیہ سے یہاں وہ سارے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور نفری کے بارے میں بھی احکام واضح تھے کہ ساری عراق والی فوج واپس کی جائے۔ یہ فوج اس وقت نو ہزار تھی اور اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ وغیرہ متحرک دستوں میں چلے گئے تھے تو باقی نفری کوئی چھ ہزار رہ گئی ہوگی۔ اور ہم اُن مورخین سے اتفاق کرتے ہیں جو تعداد چھ ہزار بتاتے ہیں اور یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اتنا دور سے صرف ہزار بارہ سو کی کمک گئی۔ علاوہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لشکروں کی تعداد جو گھٹ کر چودہ، پندرہ ہزار رہ گئی تو یہ کلیہ بھی چھ ہزار کی نفری کے حق میں جاتا ہے۔ اسی طرح جن مورخین نے اسلامی فوج کو حمص سے اوپر حلب وغیرہ کے علاقوں تک پیش قدمی کرادی وہ بھی صحیح نہیں کہ ابھی شام میں اہل روم کے ساتھ ایک بھرپور جنگ ہونا تھی اور مسلمان زیادہ سے زیادہ شیراز تک جا سکے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی حمص کی طرف پیش قدمی

اب اسلام کے دونوں عظیم فرزندوں کے پاس تقریباً چودہ پندرہ ہزار فوج تھی۔ جس کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سیدھے حمص کی طرف چلے گئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ راستے میں بائیں طرف بالبک کی طرف مڑ گئے جہاں پر لوگوں نے مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ بالبک میں لڑائی بھی ہوئی لیکن تفصیل کسی نے نہیں بتائی۔ حمص کی فتوحات کے واقعات کچھ عجیب وغریب رنگ میں پیش کیے گئے ہیں کہ مسلمانوں کے وہاں پہنچنے کے بعد اہل حمص جزیہ دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک سال تک شہر پر حملہ نہ کریں گے۔ لیکن اگر اہل روم کی طرف سے کوئی کمک یا لشکر آ گیا تو پھر مسلمان شہر کا محاصرہ یا بزور شمشیر جو کچھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اس لیے حمص کے دروازے کھول دیئے گئے اور حمص کو ایک ''پرامن'' شہر قرار دے دیا گیا اور لوگوں کو اسلام میں شمولیت کی دعوت دی۔ لوگ دھڑادھڑ اسلام کے دائرے میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ بعض جگہ لوگوں نے ازخود مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ آکر ان کے علاقوں کا انتظام سنبھال لیں۔ اور مسلمان دستوں کی دعوتیں بھی کیں۔ یہ کہانیاں کسی حد تک صحیح ہیں کہ ان علاقوں کے لوگ رومیوں سے بڑے تنگ تھے اور گلب جیسے متعصب مبصر نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ لوگوں کے لیے اسلام میں کشش تھی۔ مسلمانوں کا طرز زندگی اور فلسفۂ حیات لوگوں نے پسند کیا۔ لیکن وہ لوگ ابھی اس سوچ اور تذبذب میں تھے کہ کیا مسلمان اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ انہیں

رومیوں سے پکا چھٹکارامل جائے گا۔لیکن اس سلسلہ میں معاملات ابھی بین بین ہی تھے۔مسلمان خود ایسی کوئی تسلی دینے کو تیار نہ تھے۔کیونکہ اہل روم کے ساتھ ایشیا میں ان کی ایک فیصلہ کن جنگ ہونا باقی تھی۔

رومیوں کا حمص میں چوری چھپے داخلہ

مسلمان دستے حمص اور شیراز کے گردونواح میں پھیلے ہوئے تھے اور رومیوں نے چوری چھپے حمص کے اندر اپنی فوج داخل کرنا شروع کر دی۔جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ رومی حمص میں اس طرح داخل ہو رہے ہیں تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ حمص کی طرف مبذول کر دی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مطابق حمص ہی شمالی شام کا اہم شہر تھا۔ کوئی آٹھ ہزار کے قریب رومی فوج حمص میں داخل ہو گئی تھی اور ان کے کمانڈر ہربیس نے اس فوج کے ساتھ اچانک حمص کے دروازے بند کر دیئے۔مسلمان افواج کی تعداد کوئی پندرہ ہزار کے قریب تھی لیکن حمص کے قلعہ کو سر کرنا ان کے لیے مشکل تھا کہ شہر پناہ کی دیواریں دمشق کی دیواروں سے بہتر حالت میں تھیں۔

مسلمانوں کی حربی چال

مسلمانوں کو دمشق کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ محاصرہ بہت لمبے عرصہ کے لیے کرنا پڑا تھا گو سردیوں کا موسم ختم ہونے والا تھا اور مسلمانوں کو معلوم تھا کہ اگر محاصرہ نے طول پکڑا اور گرمیوں میں قلعہ سر نہ ہو سکا تو مسلمانوں کو اگلا سردی کا تمام موسم قلعہ کے باہر سرد ہواؤں میں گزارنا پڑے گا۔مسلمان ویسے بھی محاصرہ کی کاروائی کو پسند نہ کرتے تھے۔وہ متحرک مجاہد تھے اور جنگ کو متحرک رکھ کر ہی وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے،چنانچہ انہوں نے داؤ کھیلا کہ وہ محاصرہ اُٹھا کر واپس دمشق جا رہے ہیں۔ہربیس نے جب یہ دیکھا تو قلعہ کے اندر سے تقریباً پانچ ہزار جنگ جو سپاہی اکٹھے کر کے مسلمانوں کا تعاقب شروع کر دیا۔مسلمانوں نے کچھ دیر تو پسپائی کی شکل کو ظاہر کیا لیکن تھوڑے ہی وقت کے بعد عظیم صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، پہلے کی تجویز کے مطابق، پانچ سو سواروں کے ساتھ آگے سے اچانک پیچھے مڑے اور جلدی سے جا کر حمص کے قلعہ کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔پہرہ داروں نے دروازے بند کر دیئے،لیکن قلعہ کے باہر کے علاقے پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا اسی دوران آگے سے اسلامی لشکر نے پیچھے مڑ کر ہربیس کے لشکر پر دھاوا بول دیا۔ اب رومی چاروں طرف سے گھر چکے تھے اور مسلمانوں نے ان کی تکا بوٹی کرنا شروع کر دی۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہربیس کی تلاش میں تھے کہ ایک اور دیوقامت رومی جرنیل حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا۔

رومی جنرل کا حشر

اس دیوقامت رومی جرنیل نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ تلوار سے مقابلہ کیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے وار کو

اس طرح روکا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر اس رومی جنرل کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے اس دفعہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا طریقہ اپنایا کہ رومیوں کو بھی اور اپنے مجاہدوں کو بھی حیران کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس دیو قامت رومی کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا اور اس زور سے ہاتھوں اور بدن کے درمیان دبایا کہ اس کی چھاتی کے جوڑ، پسلیاں، پھیپھڑے اور پیٹ کے سب حصے بے جان کر دیئے۔ اور جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی ہے تو انہوں نے اس کو چھوڑ دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تو یہ رومی جرنیل اپنے پاؤں پر مردہ حالت میں کھڑا رہا۔ لیکن آخر زمین پر یکدم لڑھک گیا۔ لوگ حیران تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو کتنی قوت بخشی ہے۔ رومیوں میں اب لڑنے کی سکت باقی نہ تھی، مشکل ہی سے اُن کا کوئی آدمی زندہ بچا ہوگا۔

صلح کی درخواست

چنانچہ جو لوگ قلعہ کے اندر تھے انہوں نے رومی لشکر کے باقی چند ہزار آدمیوں کو مجبور کیا کہ قلعہ کے دروازے کھول دیئے جائیں پھر ان لوگوں نے صلح کی درخواست کی اور عذر پیش کیا کہ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان تمام لوگوں کو امان دے دی، اور رومی فوجیوں نے بھی نہتا ہو کر اسی علاقے میں رہنا پسند کیا۔ یہ واقعہ صفر پندرہ ہجری کا ہے۔ انہی دنوں محرم پندرہ ہجری میں ایران میں قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ مسلمانوں کی فتح کی صورت میں ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے مسلمان مجاہدین نے شام کے علاقوں میں تسلی کے ساتھ اپنے دستے پھر شمال میں شیراز کے مقام تک بھیج دیئے۔

ہرقل کی بھرپور تیاری

بہر حال ربیع الاوّل اور ربیع الثانی پندرہ ہجری میں معلوم ہوا کہ اہلِ روم مسلمانوں کو شام سے نکالنے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں اور یورپ، اناطولیہ، آرمینیا اور شام کے بچے کھچے وفادار لوگوں کے لاؤ لشکر تیار کیے جا رہے ہیں۔ اور مقصد نہ صرف مسلمانوں کو شام و فلسطین سے باہر پھینکنے کا ہے بلکہ مسلمانوں کو مکمل طور پر ختم کر کے مکہ و مدینہ کو تاخت و تاراج کرنا بھی ہے اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے ردِ عمل کو ہم اگلے باب میں زیرِ بحث لائیں گے، لیکن یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ مدینہ میں خلیفہ دوم شام میں اس قسم کے حالات کے ظہور پذیر ہونے سے بے خبر نہ تھے۔ ان کو اندازہ تھا کہ ایسے حالات ضرور پیدا ہوں گے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ محرم پندرہ ہجری میں قادسیہ کے مقام پر ایرانیوں کے خلاف ایک عظیم الشان فتح حاصل کر چکے تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے

انہیں مدائن کی طرف پیش قدمی سے روکا ہوا تھا اور حکم دیا ہوا تھا کہ ایران میں تب تک کوئی بھر پور کاروائی نہ ہوگی جب تک شام میں حالات مکمل طور پر تسلی بخش نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ یرموک کی دوسری جنگ رجب پندرہ ہجری میں ہوئی اور اس فتح کے بعد ذی قعد پندرہ ہجری میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ دریائے فرات کو پار کر کے بابل کے مقام تک پہنچنے اور مدائن صفر سولہ[1] ہجری میں جا کر فتح ہوا۔ آنے والے واقعات پر پہلے سے زمان و مکاں کا تبصرہ کرنے سے ہمارا محاذ پر کوئی مشکل یا بھر پور کاروائی ہو رہی ہوتی تو دوسرے محاذ پر معاملات دیکھ بھال تک محدود رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہویں باب میں فتوحات کو تسلسل کے ساتھ اور وقت کا حوالہ دے کر بیان کیا جائے گا، کہ مسلمانوں نے دنیا ایسے آسانی سے فتح نہیں کر لی تھی۔ جس طرح ہمارے مورخین فتوحات کا بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ فتوحات کو بڑھا چڑھا بھی دیتے ہیں اور جب کوئی مشکل گھڑی آجاتی ہے تو چند لوگوں پر الزام لگا دیتے ہیں۔ نہیں! بات یہ نہیں ہے۔ جنگ میں سب کچھ ہوتا ہے اور وہاں سب کچھ حکمت عملی کے تحت یا باقاعدہ جائزوں کی مدد سے ہو رہا تھا۔

نتائج واسباق وخلاصہ

۱۔ یہ باب نتائج کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور اسباق عسکری مدبروں کے لیے عظیم مثالیں ہیں۔ ویسے تو ہر فتح کے اثرات مختلف ہوتے ہیں اور گو ہر فتح کے ''عطیات وثمرات'' بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ عطیات و ثمرات پکے قسم کے ہوں۔ بعض دفعہ یہ ثمرات مہنگے بھی پڑتے ہیں۔ اس لیے اپنی فتوحات کو قائم رکھنا پڑتا ہے کہ ثمرات پکے ہوں۔ علامہ اقبال بھی اس طرف اشارہ کر گئے ہیں:

نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

۲۔ ویسے دمشق کی فتح پر بہت کچھ ''خرچ'' کرنا پڑ گیا۔ محاصرہ لمبا ہو گیا گو دمشق کا شہر ضرور بڑا تھا لیکن عسکری لحاظ سے اتنا اہم نہ تھا۔ یہاں پر دشمن کی فوج کو اس طرح تہس نہس نہ کیا جا سکا جس طرح اجنادین میں کیا گیا۔ یہی چیز حمص میں ہوئی البتہ فحل کی فتح کے ثمرات زیادہ تھے اپنا عقب بھی دشمن سے پاک ہوا اور نچلے علاقوں میں فتوحات کو بھی آگے بڑھایا جا سکا اور دشمن کی فوج کا بھی بے پناہ نقصان ہوا۔

۳۔ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے بہترین تجویز وہ ہوتی ہے کہ ایک ہی وار سے اہم زمین پر بھی قبضہ کر لیا جائے اور دشمن کی فوج کو بھی تہس اور نہس کر دیا جائے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دشمن بھی اہم زمین کے بچاؤ کے لیے اپنی تمام تر

(۱) اس کی سب تفصیل پہلی کتاب کے بیسویں باب میں موجود ہے۔

قوت کو جنگ میں جھونک دیتا ہے اور اسی کو فوجی مبصروں نے ''مقناطیس'' کا نام دیا ہے کہ افواج ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دراصل بات ضرورت ہی کی ہوتی ہے بہرحال اگر یہ دونوں مدعا ایک ہی وار میں حاصل ہو جائیں تو فبہا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جو کچھ مل جائے، اگر دشمن کی فوج کو تہس نہس کر سکیں تو بہتر ورنہ اہم زمین پر قبضہ ہی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔

۴۔ دمشق کی فتح میں یہ دونوں چیزیں حاصل نہ ہو سکیں کیونکہ دمشق نہ تو اہم مقام تھا اور نہ دشمن کو برباد کر سکے، تو پھر ثمرات حاصل کرنے کی بجائے فتوحات کو آگے بڑھانا پڑا۔ اور اس طرح جنوبی علاقوں یعنی اُردن اور فلسطین میں بھی فتوحات حاصل کرنا پڑیں اور شمالی شام تک اسلام کو بھی پھیلا دیا گیا۔ بلکہ ایران میں کمک بھی بھیج دی گئی۔ لیکن اب ان فتوحات کو قائم رکھنے کی ضرورت تھی۔

۵۔ یہ فتوحات شمال میں قائم نہ رکھی جا سکیں اور اگلے باب میں ان علاقوں سے پسپائی کا ذکر ہوگا بلکہ دمشق کو بھی چھوڑنا پڑا تو کیا ان فتوحات کو حاصل کرنے کی کارروائی غلط تھی کہ ان فتوحات کو قائم نہ رکھا جا سکا؟ نہیں بات یہ نہیں۔ ایران میں بھی مسلمان حیرہ کب کا فتح کر چکے تھے اور دریائے فرات کو پار کر کے دشمن کو کسکر اور بابل کے مقامات پر شکست دے چکے تھے لیکن آخری فتح انہوں نے قادسیہ کے مقام پر حاصل کی اور قادسیہ میں اکٹھا ہوتے وقت پہلے کے فتح شدہ علاقے چھوڑ آئے۔ مسلمانوں کا یہ ایک طرز جنگ تھا وہ فتوحات حاصل کرتے تھے اور اپنے آپ کو آگے صرف اتنا بڑھاتے تھے کہ جس حد تک وہ اپنے آپ کو ''کھینچ'' سکتے تھے۔ پھر جب دشمن کا آگے سے زور پڑتا تھا تو وہ اپنے آپ کو سپرنگ کی طرح ''سکیڑ'' لیتے تھے، اور جب دشمن اِس بُنیان المرصوص کے ساتھ ٹکریں مار مار کر تھک جاتا تو وہ متحرک ہو کر دشمن کو تہس نہس کر دیتے تھے۔

۶۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان میں ہم بھی کسی ایسی طرز جنگ کو اپنائیں؟ تو یہ ایک مشکل سوال ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سیالکوٹ کے محاذ پر ہم نے ایسا کیا اور نقصان اُٹھایا اور موجودہ حالات میں ہم ایسی کارروائی نہیں کر سکتے ایسی کارروائی دشمن کے علاقے میں کی جا سکتی ہے اور وہ بھی محدود حد تک اور ایسی کارروائی کے لیے ہمیں اُس فلسفۂ حیات پر مکمل طور پر عمل کرنا ہوگا جس پر وہ مسلمان عمل کرتے تھے کہ جب اذان کی صدا بلند کرتے تو پہاڑوں کے دل دہل جاتے تھے:

ناگاہ فضا بانگِ اذان سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار
(اقبالؔ)

۷۔ تو اب سوال یہ تھا کہ کیا مسلمان جو کچھ حاصل کر چکے تھے اُس کو کھو دینے کے بعد دشمن خاموش ہو جائیں

گے؟ اُن کا متبرک مقام بھی بیت المقدس تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش والی جگہ بھی فلسطین ہی تھی۔ مسلمانوں نے حکمت عملی کے طور پر بیت المقدس پر قبضہ تو نہ کرلیا تھا لیکن اُس کے چاروں طرف اور بہت اوپر تک سب شام و فلسطین پر اسلامی لشکر چھائے ہوئے تھے اور بیت المقدس کسی وقت بھی اُن کی جھولی میں گر سکتا تھا۔ اگر اہلِ روم ایشیا سے خاموشی کے ساتھ دُم دبا کر بھاگ جاتے اور قسطنطنیہ (استنبول) میں جا کر پناہ گزیں ہوتے، تو مسلمانوں کا سیلاب اُس طرف بڑھتا جاتا۔ چنانچہ ہرقل جیسے مدبر آدمی کے لیے ضروری تھا کہ کم از کم وہ ایک بھرپور کوشش ضرور کرے۔ اور مسلمان یہ جانتے تھے۔ تو تب ہی وہ ایران کے محاذ پر ''خاموش'' ہو چکے تھے۔

۸۔ اہلِ یورپ کے جنگی ماہرین اسی وجہ سے فتح کا اختتامی مقام نہیں تلاش کر سکے کہ اُن کے پاس فلسفے باطل ہیں۔ بامقصد جنگ کی تیاری کے لیے زماں و مکاں اور ذرائع کو اعلیٰ ترین حکمت عملی کے تحت شیر و شکر کیا جاتا ہے اور تب ہی مسلمانوں نے یہ فتوحات حاصل کیں۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ دیکھے

(اقبالؔ)

آٹھواں باب

یرموک کی جنگ کیلئے طرفین کی تیاری

تاریخی لحاظ سے یرموک کی جنگ، دُنیا کی ایک عظیم ترین جنگ ہے، حضور پاک ﷺ کے زمانے سے جب آپ ﷺ نے ہرقل کو اسلام کی دعوت دی، اور عیسائی سردار شرجیل نے مسلمان سفیر حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا یا بعد میں جنگ موتہ ہوئی، پھر تبوک کی مہم اور حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے حربی مظاہرے ہوئے، یا اب تک ان سات ابواب میں جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے، اِن سب کاروائیوں کے نتیجے کے طور پر یرموک کے میدان میں پندرہ ہجری کے وسط میں ایک بھرپور کاروائی ہوئی جو اس صدی کی تو بلاشبہ بہت بڑی فیصلہ کن جنگ تھی لیکن دراصل ایسی فیصلہ کن جنگیں تاریخ میں خال خال نظر آتی ہیں۔

مورخین کے تبصرے

اہل یورپ سمیت دُنیا کے تمام مورخین اور مبصرین نے اس جنگ کو دنیا کی ایک عظیم اور فیصلہ کن جنگ قرار دیا ہے جس نے تاریخ کے دھارے ہی تبدیل کر کے رکھ دیئے۔ میجر جنرل فلر جیسا متعصب مبصر بھی اپنی کتاب میں اس جنگ پر ایک پیراگراف لکھ ہی چھوڑتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اُس کے ذہن میں سازش وشرارت ہے جنگ کا ذکر کرنا تو اُس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اہل روم یا بقولِ اہل یورپ بازنطینی لوگوں نے اس جنگ کے بعد ایشیا کو الوداعی سلام کہا اور چند سال بعد اگر مسلمان ایک طرف آبنائے باسفورس کے قریب خیمہ زن تھے تو دوسری طرف افریقہ سے اہل روم کو نکال چکے تھے اور پھر اُس کے چند سال بعد سپین کے راستے یورپ میں داخل ہو گئے۔ جنگ یرموک ایک دروازہ تھا جس کے کواڑ زبردستی کھولنے کے بعد کئی سو سال تک مسلمان مجاہدین کو روکنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ تو جنرل فُلر کو مجبوراً اس جنگ کا ذکر کرنا پڑا، ہاں! شرارت کے طور پر مسلمانوں کی اس عظیم فتح کیلئے جنرل فُلر نے ساری جنگ کی سطح کو کم کرنے کی کوشش بھی کی۔

اِس جنگ میں وہ رومیوں کی تعداد پچاس ہزار بتاتا ہے اور مسلمانوں کی کم تعداد کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ وہ صرف

پچیس ہزار تھے۔ آگے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے منور اور حرکتی چال کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن رومیوں کی شکست کی وجہ تمام تر اُن کے خراب نظام حکومت کے سر تھوپ دیتا ہے کہ وہ ایشیائی علاقوں کے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش نہ آتے تھے۔ لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ لوگ تو لڑائی میں حصہ نہ لے رہے تھے اور علاقے کے جو لوگ جبلہ سمیت رومیوں کے ساتھ تھے وہ جنگ کے کئی سال بعد بھی رومیوں کے وفادار رہے اور کچھ لوگ یورپ میں جا کر آباد بھی ہو گئے۔ لیکن اصلی بات یہ ہے کہ لشکر میں (۹۰) نوے فیصد لوگ آرمینیا، یونان اور باقی بلقان کے علاقوں سے تھے، انہوں نے صلیبیں اُٹھائی ہوئی تھیں اور جنگ کو مذہبی رنگ دیا جا رہا تھا۔ تو پھر لوگوں پر خراب حکومت نے میدانِ جنگ پر کیا اثرات ڈالے؟ ہاں البتہ جنرل فلر کو اصلی بات معلوم نہ تھی:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی (اقبالؔ)

اہلِ یورپ کا تعصّب

کیمبرج یونیورسٹی کی تاریخی کتابوں کا متعصب مصنف پروفیسر بیکر بھی تسلیم کرتا ہے کہ اہلِ روم کی فوج کی تعداد یرموک کی جنگ میں، مسلمانوں کی تعداد سے زیادہ تھی، اور جنرل گلب بھی تسلیم کرتا ہے کہ سرزمین شام پر اس سے پہلے اہلِ روم کا اتنا بڑا لشکر دیکھنے میں نہ آیا تھا، لیکن یہ دونوں تعداد کے بارے میں خاموش ہیں۔ مشہور مورخ گبن بھی رومیوں کی برتر تعداد کو تسلیم کرتا ہے۔ اور پھر یہ سارے مورخ جنگ کے آخری دن آنے والی ایک آندھی کو شکست کی وجہ قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن آندھی کی وجہ سے رومی یرموک سے بھاگ کر دمشق یا حمص یا بیروت وغیرہ میں ٹھہر جاتے۔ آخر ایشیاء کو الوداعی سلام کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ ضرورت تو صرف اس لیے پیش آئی کہ اہلِ روم کو یرموک کے میدان میں ستر ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ مسلمانوں نے یہ لاشیں بعد میں گنیں کہ اُس دن فوری تعاقب پر نہ جا سکے کہ رات پڑ گئی تھی۔ دوسرے دن محدود تعاقب کے ذریعے صرف رومی سپہ سالارِ اعظم کا سر کاٹنے کی ضرورت تھی جو مجاہدین نے کاٹ لیا۔ بہر حال غیروں کا تعصب اپنی جگہ پر۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنگ بہت ہی زیادہ فیصلہ کن تھی اور یہ وزنی فیصلہ کئی سو سال ہمارے ترازو کے پلڑے میں رہا۔ لیکن حق اور باطل کی یہ جنگ جاری و ساری ہے اس لیے جنگ یرموک کو اگر پہلی صلیبی جنگ کا نام دے دیں تو کوئی ہرج نہیں، کہ بعد کی صلیبی جنگوں میں بھی وہی صلیبی جھنڈے اُٹھانے کا طریقہ اپنایا گیا، جو یرموک کی جنگ میں اپنایا گیا تھا۔ وہی صلیبیں، وہی پادری، وہی یورپ سے کمک اور علاقے کی نصرانی آبادی کے جذبات کو بھڑکانا جیسے اُس وقت شروع کیا ویسے ہی اُس کو صلیبی جنگوں میں بھی دہرایا گیا اور آج اسرائیل یا لبنانی عیسائیوں سے وہی کچھ کرایا جا رہا ہے، اور ''کمک'' اب بھی آرہی ہے اور کمک دینے والے دوسری

دنیا کے یورپین ہیں۔

جنگ یرموک کا عسکری پہلو

اس تاریخی پہلو کے علاوہ فوجی لحاظ سے یرموک کی جنگ نہ صرف اہم ہے اور اس سے اہم نتائج نکلے بلکہ اس کا مطالعہ میں عسکری تاریخ کے جو مطالعہ فوج میں بحث کے ذریعے کیے جاتے ہیں اُن کے لیے کافی مواد موجود ہے اور معاملات کو زیر بحث لانے کے لیے حربی پہلو، ذرائع، زمین، صف بندی، طرز جنگ وغیرہ کی اس طرح چھان پھٹک ٹھیک ہوسکتی ہے کہ دنیا کی دوسری جنگوں میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی، یہ مقابلہ اُس زمانے کی دو تین صدی سے تسلیم شدہ حکمت عملی کے دو مانے ہوئے ماہروں کے درمیان تھا، ایک طرف ہرقل تھا جو دنیاوی لحاظ سے اپنے زمانے کا ماہر مدبر تھا۔ وہ ایسی کامیابیاں حاصل کر چکا تھا جن کی مثال عام تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے کہ جب ایران کی فوج نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا تو وہ چپکے سے ایک طرف سے نکلا اور فوج اکٹھی کر کے ایرانی دارالحکومت مدائن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیئے اور جنگ کا رُخ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ دوسری طرف صحرائے عرب کے بوریا نشین اور حضور پاک ﷺ کے غلام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ وہی کچھ کرتے تھے جو اُنہوں نے اپنے آقا حضرت محمد مصطفی ﷺ سے سیکھا تھا اور اپنے عظیم رفیق، یارِ غار رضی اللہ عنہ کی بنائی ہوئی حکمت عملی کو پروان چڑھا رہے تھے۔ میدانِ جنگ میں ایک طرف اگر ہرقل کے بیٹے خاندان کے تمام عظیم جرنیل، یورپ کے جنگجو اور صلیبیوں کے جھنڈے تلے لڑنے والے نصرانی تھے۔ تو ان کے مقابلے میں امین الامت رضی اللہ عنہ، اللہ کی تلوار رضی اللہ عنہ، وحی کے کاتب رضی اللہ عنہ، اسلام کے عظیم عالم حضور پاک ﷺ کے عاشق و غلام، قرآن پاک کے حافظ اور اللہ کے ذکر سے روحانی غذا حاصل کرنے والے مجاہدین تھے جو صرف اللہ اور رسول کے لیے لڑتے تھے:

مسلم التی؟ سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ دار

(اقبالؔ)

طرفین کے تجزیئے

ہرقل کا ردِعمل بڑا مدبرانہ تھا اور مسلمان افواج اس زمانے میں جس طرح پوری سرزمین شام پر پھیلی ہوئی تھیں پچھلے ابواب میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اگر ہر لشکر رومیوں کے بھرپور وار کا الگ الگ مقابلہ کرتا تو حالات کو سنبھالا دینا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے ہرقل

کے ردِعمل کے خلاف مسلمانوں کا ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے اپنی فراست کا استعمال کیا۔ اور اپنی طاقت کو منتشر نہ ہونے دیا یہ سبق[1] اُن کو حضور پاک ﷺ پڑھا گئے تھے۔ اب مسلمانوں کے لیے سوال یہ تھا کہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کس جگہ کیا جائے، اہل روم کا ''دوست'' سمندر مغرب میں تھا۔ مسلمانوں کا دوست ''ریگستان'' مشرق میں تھا۔ جو حمص سے لے کر دومۃ الجندل تک پھیلا ہوا تھا۔ مسلمان اگر دمشق سے اوپر کسی بھی جگہ اہلِ روم کا مقابلہ کرتے تو ریگستان مسلمانوں کی مدد کر ہی رہا تھا۔ لیکن وہ ایسی جگہ پر مقابلہ کرنا چاہتے تھے کہ ریگستان تو مسلمانوں کی مدد کرے لیکن رومی سمندر سے مکمل فائدہ نہ اُٹھا سکیں پھر مسلمان حکمت عملی کے طور پر بھی دشمن کے خلاف حیران کن کارروائی کرنا چاہتے تھے کہ اُس کے ساز پر ناچنے کی بجائے اُس کو اپنے ساز پر نچائیں۔

جنرل گلب کا تعصب

جنگ یرموک فوجی لحاظ سے ایک دلچسپ مطالعہ مہیا کرتی ہے اور اس ساری تمہید کا مقصد یہ بھی ہے کہ عسکری تاریخ کے طالبان علم پوری جنگ کے ایک ایک واقعہ کا مطالعہ اِن نکتوں کے تحت کریں جو پہلے سے واضح کیے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اہل روم حکمت عملی میں کچھ کم تدبر کے مالک نہ تھے۔ بے شک ان کے پاس مسلمان مجاہدین والی فراست نہ تھی مگر حربی تدبر ضرور تھا۔ لیکن وہ حیران اس وجہ سے تھے کہ اُن کا کس قوم کے ساتھ واسطہ ہے کہ وہ ہر جنگ میں کسی نئی طرز یا تدبیرات کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ ہمارے لیے جنگ کی تیاری کے واقعات میں جانا بہت ضروری ہے تا کہ ہم تیاری کے ذریعے جنگ کے واقعات میں داخل ہوں اور پھر ان واقعات سے نتائج اور اسباق اس مطالعہ کی مدد سے نکال سکیں۔ جنرل گلب بھی ایسے مطالعوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اہل روم کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں کے ذکر کی طرف آتا ہے تو ایک عجیب وغریب تعصب سے کام لیتا ہے اور اب اس کے بیانات میں وہ صفائی نہیں رہتی، جو اُس نے مسلمانوں کی عراق کی فتوحات کے سلسلہ میں دکھائی۔ جنگ یرموک کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''عرب تاریخ دان، اس کی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکے کہ مسلمان اتنا جنوب کی طرف کیوں پسپا ہو گئے؟ وہ کسی بھی جگہ ریگستان کا استعمال کر سکتے تھے۔ اور ہرقل بھی مسلمانوں کی اس پسپائی سے خوش ہو گیا ہو گا، کہ اس کے بعد مسلمان شمالی یا اوپر والے شام پر حملہ آور نہ ہو سکیں گے اس لیے اُس کی فوج بھی صف بندی کر کے اور پوزیشن لے کر یرموک کے میدانِ جنگ میں ٹھہر گئی اور جب آندھی چلی تو اُس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا کہ رومیوں کے منہ پر ریت کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ اور مسلمانوں نے کچھ تجویز ضرور بنائی تھی کہ اُن کے دستے دائیں اور بائیں سے بڑھ کر رومیوں کے پیچھے پہنچ گئے پھر اسلامی لشکر نے آگے بڑھ کر رومیوں کو شکست فاش دے دی۔''

(۱) تفصیل کے لیے جلال مصطفےٰ کے دوسرے باب خصوصاً صفحہ ۸۴ سے استفادہ کریں۔

یہ پڑھ کرہنسی ضرور آتی ہے کہ مسلمانوں نے بھی ''کچھ تجویز'' بنائی تھی اور جنرل گلب کے اس سوال کا جواب بھی جنگ کے نتائج میں موجود ہے کہ مسلمان اتنا جنوب اس لیے آئے تھے کہ قیصر روم ایشیا کوالوداعی سلام کہہ دے۔ہم مسلمان کافی سادہ ہیں کہ جنرل گلب اردن والوں کا مشیر بن کر مسلمانوں کے اتحاد میں جوروڑے اٹکا تا رہا وہ تو الگ بات ہے لیکن ایک کتاب لکھ کر ہماری تاریخ کو بھی خراب کر گیا۔ظاہر ہے وہ بھی بالفور کے اعلان کو پروان چڑھانے کے لیے آیا تھا:۔

جلتا ہے مگر شام وفلسطین پر مرا دل　　　تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدہ دشوار
ترکان جفا پیشہ کے پنجہ سے نکال کر　　　بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار (اقبالؒ)

ہرقل کا تجزیہ

اب ہم جنگ یرموک کی کہانی کی طرف واپس آتے ہیں۔ ہرقل کے تدبر میں کوئی شک نہ تھا۔اجنادین کی شکست کے بعد اُس نے دمشق کے محاصرہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کو کافی عرصہ روکا۔علاوہ دمشق پر مسلمانوں کے قبضہ کے بعد ہرقل نے فحل کے مقام پر اجنادین کی قسم کی کاروائی کی لیکن مسلمان مجاہدین نے وہاں پر بھی اس کی فوجوں کو شکست دی۔مسلمان ابھی فحل سے نکل کر طبریہ وغیرہ کے علاقوں میں مصروف تھے،تو ہرقل نے ایک دھاوا کر کے دمشق پر اچانک قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بروقت وہاں پر موجود تھے۔ ہرقل کی یہ کوشش بھی پھل نہ لاسکی اور رومیوں کا اتنا سخت نقصان ہوا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نہ صرف حمص پر آسانی سے قبضہ کرلیا۔ بلکہ وہاں سے آگے تک پیش قدمی کر گئے۔لیکن ہرقل نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ پُر امید تھا،اور اس نے ایک بڑا الاؤ لشکر تیار کیا،جس کی تعداد بعض مورخین نے دو لاکھ بتائی ہے اور بعض نے ڈیڑھ لاکھ۔اس فوج کا سپہ سالارِ اعظم کچھ مورخین کے لحاظ سے باہان تھا۔اور کچھ کے لحاظ سے تو ذرا لیکن باہان والی بات زیادہ صحیح ہے کہ تو ذرا مرج الروم کی جنگ میں مارا گیا تھا۔

رومیوں کے لشکر اور تجویز

باہان آرمینیا کا باجگزار بادشاہ بھی تھا، وہ آرمینیا سے ایک لشکر تیار کر کے لے آیا تھا۔دوسرا لشکر قناطیر کا تھا،جو بلقان کے علاقے کی سلاد قوم کا شہزادہ تھا۔تیسرا لشکر گریگوری کا تھا جو یونانی تھا اور چوتھا لشکر دیرجان کا تھا جس میں ملی جلی قومیتوں کے لوگ تھے۔ایک پانچواں لشکر بھی تھا لیکن اس کے جوانوں کو اکثر دوسرے لشکروں میں بانٹ دیتے تھے۔ اس لشکر میں زیادہ تر ایشیا کے عرب النسل عیسائی تھے،جس میں زیادہ تعداد قبیلہ غسان کی تھی اور لشکر کا کمانڈر جبلہ تھا،جو

شرجیل کے بعد غسانی علاقے کا باجگزار بادشاہ تھا۔ یہ تمام لشکر انطا کیہ اور شمالی شام کے علاقوں میں اکٹھے کئے جا رہے تھے اور ہر لشکر کی نفری تقریباً تیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔

اس طرح رومی لشکر کی تعداد تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار بنتی ہے۔ لیکن اہل روم کا ایک لشکر جس کی تعداد چالیس ہزار تھی، قساریہ کا دفاع کر رہا تھا۔ وہاں پر اپنے بھائی یزید رضی اللہ عنہ کے حکم کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قساریہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، لیکن جب دونوں بھائیوں کو پسپا ہو کر یرموک جانے کے حکم ملے تو قساریہ کا لشکر یا اُس کا کچھ حصہ بھی ضروری باقی رومی لشکر میں شامل ہو گیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین میں لشکر کی تعداد میں تھوڑے سے اختلافات ہیں۔ بہر حال ہرقل کی تجویز یہ تھی کہ جیسے ہی جگہ جگہ پر مسلمان لشکر منتشر ہیں اُن کو قینچی کے ساتھ کتر کر رکھا دیا جائے، اور جب کوئی لشکر آگے یا پیچھے ملاپ کرنا چاہے تو درمیان یا عقب میں رومی اہم زمین پر قبضہ کر چکے ہوں۔ اس لیے اب اسلامی لشکروں کی تعیناتی اور ردِّ عملوں کا جائزہ ضروری ہے۔

اسلامی لشکروں کی پوزیشن اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ردِّ عمل

نقشہ سیاز دہم کا مطالعہ کریں۔ شیراز کے مقام پر مسلمانوں کے آگے والے دستوں کو خبر ملی کہ اہلِ روم بے پناہ انسانوں کا ہجوم اکٹھا کر چکے تھے اور ایک طوفان کے ریلے کی طرح تمام اسلامی لشکروں پر چھا جانا چاہتے تھے۔ اُس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ حمص کے گردونواح میں تھے۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ دمشق میں اور اُن کے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قساریہ میں۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اُردن میں اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ فلسطین میں۔ بیت المقدس پر بھی رومیوں کا قبضہ تھا اور ان کی فوج کا ایک مضبوط دستہ وہاں موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان ایسی منتشر صورت میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشورہ کیا اور پورے محاذ کے سپہ سالارِ اعظم کے طور پر حکمت عملی کے مطابق ایک تجویز بنائی کہ ان حالات میں تمام لشکروں کو دمشق کے عقب میں کسی جگہ اکٹھا کیا جائے اور پھر حالات کے مطابق صف بندی اپنے کسی چنے ہوئے میدان میں کی جائے، وہ علاقہ حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تھا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کسی مورخ یا مبصر کو یہاں کوئی اختلافی بات نہ سوجھی کہ یہاں پر سپہ سالاری حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیتے، جیسے فحل کے علاقے میں ایک آدھ موخ اور ہمارے ایک مبصر کے سپہ سالاری کے فرائض حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو دے دیئے اور اس پر پہلے تبصرہ بھی ہو چکا ہے۔ ہاں البتہ اکثر مورخین نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے بعد اپنے قلم کا رُخ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف کر دیا کہ عملی طور پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی مسلمانوں کے سپہ سالار اعظم بن گئے۔ یا تمام تجاویز حضرت خالد رضی اللہ عنہ بنا رہے تھے، اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تمام احکام حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے دلواتے تھے، وغیرہ۔ یہ زیادتی ہے، ہم واقعات سے ثابت کریں گے کہ

سب کام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُن کے نائب اور ایک دستہ کے کمانڈر تھے۔

ہرقل کی تجویز وتدبیرات

ہرقل کی تجویز کا نقشہ 'پنجم میں کچھ اظہار کیا گیا ہے۔ یہ تجویز متعدد مورخین کے جائزوں کا نچوڑ ہے کہ وہ نقشے نہ بناتے تھے، جو تجاویز کامیاب ہو جائیں اُن کا نقشہ بنانا آسان ہوتا ہے۔ ناکام تجویز کو ایک مفروضہ ہی سمجھیں۔ اہل یورپ نے تو رومیوں کی تجویز کو" پگڑ مگڑ" کر کے بیان کیا ہے۔ اُن کی عادت ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جہاں ناکامی ہو، وہاں پہلے سے ہی ارادوں کا آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا کر قارئین کو بھول بھلیوں میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اپنی جنگوں کے بڑے مفصل تجزیے کرتے ہیں۔ مسلمان مورخین نے اپنے آپ کو صرف واقعات تک محدود رکھا۔ حکمت عملی اور تجاویز کو زیادہ زیر بحث نہ لاتے تھے۔ واقعات میں دشمن کی ناکامی کی گہرائی میں بھی نہ جاتے تھے۔ اس لیے ہم ہرقل کی جو تجویز بیان کر رہے ہیں وہ واقعات کے نچوڑ سے بنائی گئی ہے اور ہم اس سلسلہ میں مفصل تبصرہ نہ کر سکیں گے کہ کچھ مفروضے بھی بیچ میں شامل ہیں۔

ہرقل کو زیادہ فکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تھی کہ وہ کافی شمال میں جا چکے تھے۔ اس لیے ہرقل ان کے خلاف کوئی حیران کن کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ اسلام کے ان دونوں عظیم فرزندوں کے لشکر کے اوپر ایک "جال" پھینکنے کی کوشش میں تھا۔ اس کا طریقہ کار کچھ ایسا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے جبلہ اپنے ایشیائی نصرانی لشکر کے ساتھ پیش قدمی کرے گا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دونوں کو اُلجھا کر رکھ دے گا اور اُلجھے ہوئے مسلمانوں کے بائیں بازو یعنی مغرب کی طرف سے دیرجان پیش قدمی کرے گا اور شمال مشرق کی طرف سے مسلمانوں کے دائیں بازو پر گریگوری حملہ کرے گا تو اس طرح تقریباً ستر اسی ہزار کے یہ تین لشکر پہلے مرحلے میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے چودہ، پندرہ ہزار کے لشکر کا ایسا صفایا کر دیں گے کہ ان میں سے کوئی آدمی بچ کر نہ جا سکے گا۔

دوسرے مرحلہ میں قناطیر بیروت سے آگے بڑھ کر حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو الجھا رکھے گا اور اوپر والے تین لشکر یعنی جبلہ، گیر گوری، اور دیرجان حمص کے علاقے میں مسلمانوں کا صفایا کرنے کے بعد قناطیر کی مدد کے لیے آ پہنچیں گے۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ اگر قساریہ کے محاصرہ کو ختم کر کے اپنی ساری فوج کو دمشق میں اکٹھا کر بھی لیں گے تو اہل روم کے چار لشکروں کے سامنے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے آٹھ دس ہزار آدمی زیادہ دن نہ ٹھہر سکیں گے۔

تیسرے مرحلے کے لیے باہان دمشق میں پہنچ کر احکام دے گا کہ باقی ماندہ مسلمانوں کے دو لشکروں یعنی حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بلکہ یہ دو لشکر رومیوں کے لیے تر نوالہ ہوں

گے۔ان حالات میں ہرقل نے جو تجویز بنائی تھی اس سے بہتر کوئی اور تجویز تصور میں لانی مشکل ہے۔اس نے بھرپور تیاری کی، تمام لشکر تیار کر کے ان کو باقاعدہ تجویز کے ساتھ محاذ جنگ پر کاروائی کا حکم دے دیا۔

جبلہ جوایشیائی نصرانی تھا۔اُس کو کچھ یہ شبہ بھی دی گئی کہ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔عربوں کے طریق جنگ سے جبلہ اور اُس کے لشکر والے زیادہ واقف ہیں۔اس لیے اُس کو سب سے پہلے پیش قدمی کا حکم تھا۔علاوہ اپنے یورپین لاؤ لشکر کو چھپانا بھی مقصود تھا، اور یہ پہلا مرحلہ تھا۔دوسرے مرحلے کو ہم نے ٹوٹی ہوئی لکیروں سے نقشہ پنجم پر ظاہر کیا ہے۔ تیسرا مرحلہ کسی حد تک صحیح مفروضہ ہے کہ گوایسا زمین پر تو نہ ہوا لیکن اہلِ روم کے پہلے دو مرحلوں میں فتح کے بعد یہ ''ثمرات'' اُن کو ضرور بر ضرور حاصل ہو جاتے۔

ایک جائزہ

جنرل گلب کہتا ہے کہ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ مسلمان اتنے مضبوط تھے، کہ یرموک کے میدان میں اُنہوں نے رومیوں کو شکست فاش دے دی تو پھر انہوں نے یرموک تک پسپائی کیوں اختیار کی؟اس سوال کا جواب زیادہ تر تو جنگ کی کاروائی سے ملے گا کہ مسلمانوں نے کتنی محنت اعلیٰ تدبیرات، جذبۂ جہاد، حربی خوبیوں کی مدد سے فتح حاصل کی لیکن یہاں پر حکمت عملی کے پہلو کی وضاحت ضروری ہے۔کہ یہ سب کچھ حکمت عملی کے تحت تھا۔کلاسوٹز نے اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے اور وہ اس کو اعلیٰ حکمت عملی کہتا ہے کہ اندرونِ ملک پسپائی اختیار کر کے دشمن کو اپنی چنی ہوئی زمین پر شکست دی جائے۔وہ ۱۸۱۲ء میں نپولین کے سامنے روسیوں کی پسپائی کا ذکر کرتا ہے۔حالانکہ مسلمانوں کی تجویز روسیوں سے بھی ہزار درجے بہتر تھی کہ روسیوں نے خوب مار کھائی، اور چونکہ نپولین اپنے آپ کو بہت زیادہ ''کھینچ'' چکا تھا اس لیے مار کھا گیا۔لیکن یہاں پر تو مسلمانوں نے کمال ہی کر دیا اور گلب جو عسکری تاریخوں کا طالب علم ہے۔اُس کو مسلمانوں کی کاروائی پر عش عش کرنا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کو زمین اور حالات ایسا کرنے کی اجازت دیتے تھے اور ہم یہ فالتو تبصرہ بھی کریں گے کہ یہ اصول ہر ملک کو لاگو نہیں اور ہم پاکستان میں ایسا نہیں کر سکتے۔کلاسوٹز کی کتابوں کے ترجمہ کے وقت ہم نے اس پہلو کو بہتر طور پر واضح کر دیا ہے۔[1]

جنرل گلب اور مغربی مبصر واقعات کو جان بوجھ کر بیان نہیں کرتے اور پوری جنگ کی حیثیت کو کم تر بنانے کے لیے تعصب سے بھرا ہوا ایک تبصرہ کر دیتے ہیں کہ مسلمان پتہ نہیں کیوں پسپا ہو گئے؟ اُس کا جواب یہ بھی ہے کہ اُس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فراست عطا کر دی تھی اور ہمارے آقا ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ ایمان کے نور سے دیکھتے تھے اور وہ ایمان کے اُس درجہ تک پہنچ چکے تھے کہ تمام علم اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے،

(۱) کلاسوٹز اور جنگ حصہ سوم، پچیسواں باب، خاص کر صفحہ ۳۱۸ اور ۳۳۶ سے استفادہ کریں۔

وہ نہ صرف میدانِ جنگ کے نبض شناس بن چکے تھے بلکہ حالات اور حکمت عملی کو بھانپنے کا اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایسا ملکہ عطا کر دیا تھا کہ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہوں نے اپنی روشن ضمیری پر جان بوجھ کر پردے ڈالے ہوئے تھے، لیکن افسوس کہ ہم اس فقیری کو کھو بیٹھے ہیں:

آہ کہ ہے کھو گیا تجھ سے فقیری کا راز — ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم و شام (اقبالؒ)

مسلمانوں کی تجویز

مسلمانوں کے طریق کار اپنی قسم کے تھے۔ اجنادین کی جنگ سے پہلے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو چھوڑ کر تمام اسلامی لشکر جابیہ کے مقام پر وادیٔ یرموک میں اکٹھے رہ چکے تھے۔ پھر اجنادین کی جنگ کے بعد اسی جگہ کے نزدیک بلکہ جابیہ سے تھوڑا جنوب کی طرف واقوصہ کی گھاٹی میں مسلمان مجاہد رومیوں کے ساتھ ایک جنگ لڑ چکے تھے۔ جس کو ہم یرموک کی پہلی جنگ کا نام دے چکے ہیں۔ میدانِ جنگ میں سے اگر کسی حکمت عملی کے تحت پسپائی کرنا پڑ جائے یا کسی ایسی جگہ پر قبضہ کرنا ہو جہاں پہلے قبضہ رہ چکا ہو۔ تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ جو سپاہی یا جو یونٹیں جس جگہ پر رہ چکی ہوں، ان کو اسی علاقے کی ذمہ داری دی جائے یا ان کا اسی علاقے میں تعین کیا جائے جس کو وہ جانتے ہوں۔ اس طرح احکام دینے سے اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی آسان ہوتا ہے۔ کہ آدھے سے زیادہ معاملات خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے وادیٔ یرموک کو پسند فرمایا اور چونکہ علاقہ دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اُس جگہ پر جارحانہ دفاع کے لیے صف بندی کی تجویز اپنے ذہن میں بنالی۔

حکمت عملی کی پسپائی اور مسلمانوں کا اخلاق

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت یزید رضی اللہ عنہ اور اُردن و فلسطین میں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو اطلاع دے چکے تھے کہ جابیہ کے علاقے میں اکٹھ ہوگا۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لیے احکام یہ تھے کہ وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتظار کریں اور نچلے علاقوں سے چونکہ مجاہدین کو آگے آنا تھا، اُن کو پیش قدمی کی ہدایات جلد ہی دے دی گئیں۔ پسپائی خواہ حکمت عملی کے تحت اختیار کی جائے خواہ مجبوری کے تحت، جنگ کا ایک مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ ہر پسپائی بھگدڑ کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اخلاقی قوتوں کو دھچکا لگتا ہے۔ چھوٹے دل والے لوگ افواہیں پھیلا دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان مجاہدین ان باتوں سے بالاتر ہو چکے تھے، اُن کی ہر حرکت میں کوئی راز ہوتا تھا۔ وہ انفرادی سطح پر بھی جھپٹ پلٹ کر لڑنے کے عادی تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کاروائی کو پسپائی کا نام ہی نہ دیا۔ پہلے وہ یرموک سے اجنادین یا دمشق سے فحل جا چکے تھے اب بھی جنوب کی طرف حرکت کر رہے تھے۔ اور حرکت میں اُن کے لیے برکت تھی کہ دین فطرت

متحرک نظریہ حیات ہے۔ مسلمان اُمراء نے حمص اور باقی اہم مقامات کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ جنگی حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر گئے ہیں کہ وہ چند ماہ تک ان علاقوں کی شاید حفاظت نہ کر سکیں اس لیے اس سال جو رقم انہوں نے جزیہ یا ٹیکس کے طور پر لی ہے اس کو واپس کرتے ہیں۔ انشاء اللہ جلدی واپس آجائیں گے اور ضرورت کے تحت پھر جزیہ لے سکتے ہیں لیکن لین دین اور ناپ تول کے پیمانوں میں اللہ تعالیٰ نے سخت احکام دیئے ہیں اس لیے فی الحال ساری رقم واپس کی جاتی ہے۔ لوگ ویسے بھی مسلمانوں کے کردار سے بہت متاثر ہو چکے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں سن کر زار و قطار رونا شروع کر دیا اور بار بار پوچھتے تھے کہ مسلمان کب واپس آئیں گے اور اکثر نے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے پیسہ پیسہ لوگوں کو واپس کر دیا۔

تبصرہ

یہاں پر ایک تبصرہ کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمان مجاہدین تو کئی سالوں سے لڑائیوں میں مصروف تھے، وہ قتل کرتے تھے اور قتل کیے جاتے تھے۔ اُن کو تو ''ظالم'' ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے یہ ''اخلاق'' کہاں سے سیکھا۔ اس کا جواب ہمارے اُن ''دانشوروں'' سے پوچھا جائے جو سپاہیوں کو اکھڑ اور جاہل کہتے ہیں اور پوری قوم کو ''امن پسندی'' کی لوری دے کر فنِ سپہ گری سے نفرت دلاتے ہیں۔ اسلام تلوار سے پھیلا یا نہ پھیلا۔ یہ بحث فضول ہے لیکن کیا ہم اس چیز سے انکار کر سکتے ہیں۔ کہ اکثر جگہوں میں اسلام ایسے پھیلا کہ تلوار والے جہاں بھی گئے اُن کے اخلاق سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسلام سپاہیوں اور غیرت مند لوگوں کا مذہب ہے۔ مسلمان اللہ کی فوج ہیں وہ ربط وضبط میں بندھے ہوئے ہیں اور سپاہیانہ اوصاف اُن میں اخلاق کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔

بُرا ہو دو سو سال کی غلامی کا کہ ہمیں سپاہیانہ اوصاف اور فنِ سپہ گری سے بھی نفرت ہوگئی ہمیں یہ یاد نہیں رہتا کہ ۱۹۴۷ء میں سپاہیوں نے کس طرح مہاجرین کے بچوں کو اپنی گود میں اُٹھائے ہوئے قافلوں کی حفاظت کی وہ سب ہماری تاریخ کا سنہری باب ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آج کل مسلمان سپاہی جب ملک میں کسی جگہ شرپسندوں کا قلع قمع کرتے ہیں یا حکومت وقت کے کسی حکم کے تحت قانون کے نفاذ کے لیے جب کوئی کاروائی کرتے ہیں تو مادر پدر آزاد لوگ سپاہیوں کے خلاف نفرت کا طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سپاہیوں کا کام صرف یہ ہے کہ طغیانی یا کوئی مشکل کام ملک کے اندر ہو تو وہ کریں یا بیرونی خطرے میں ملک کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔ یعنی صرف وہی قربانی کے لیے تیار رہیں۔ یہ سارے باطل فلسفے ہیں اور غیروں کی نقالی میں ہم نے فوج الگ اور سول الگ کے راگ الاپنے شروع کر دیئے۔ یاد رکھیں کہ سپاہیانہ اوصاف انسان میں اخلاق پیدا کرتے ہیں اور سپاہی کا دل جس طرح اپنوں کے لیے دھڑکتا ہے، ٹھیک اُسی طرح اُسی کی آنکھ قوم کے غم میں تر ہو جاتی ہے۔ لیکن غیروں کے فلسفہ کے پجاریوں پر کوئی

اثرات نہیں ہوتے:

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!
(اقبالؔ)

''ردِّ عمل'' کی جنگ

اب دراصل اہل روم اور مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کے ''ردِّ عمل'' کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ اہلِ روم چپ چاپ حملہ کرنا چاہتے تھے۔ مسلمان بھی چپ چاپ رہے اور پسپائی کی تیاری شروع کر دی لیکن اس کو پسپائی کا نام نہ دیا اور چنانچہ رومی لشکر جب اپنی جگاہوں سے اپنے اپنے مقصود کی طرف پیش قدمی کر چکے، تو مسلمان مجاہدین نے چپکے سے اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ دیا۔ جبلہ سب سے آگے تھے۔ وہ اور اس کے لشکر والے جب حمص پہنچے تو مسلمان جا چکے تھے۔ رومی حیران تھے کہ انہوں نے خاموشی سے اتنی تیز پیش قدمی کی۔ اور پھر بھی مسلمانوں پر اچانک وار نہ کر سکے۔ دائیں بائیں سے جب گریگوری اور دیرجان کے لشکر پہنچے اور خوش ہوئے کہ انہوں نے مسلمانوں پر ''جال'' پھینک دیا ہے، لیکن جب تینوں لشکر والوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ پیدا کیا تو ''جال'' خالی تھا۔ کہ اللہ کے شیر ایسے جالوں میں نہیں پھنس سکے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اعلان کر کے اس جگہ کو چھوڑا۔ لوگوں کو اکٹھا کیا لیکن دشمن تک خبر نہ پہنچ سکی۔ تو یہ بھی خبروں پر ردِّعمل کی حکمت عملی کی ایک چال ہوتی ہے۔ مخبر عام طور پر تمام خبریں بڑے ہیڈ کوارٹروں تک پہنچاتے ہیں۔ چونکہ مسلمانوں نے اپنی پوزیشن اس وقت چھوڑی جب رومی لشکر پیش قدمی کر چکے تھے، یا پیش قدمی شروع کر رہے تھے۔ اس لیے خبر پہلے انطاکیہ پہنچی اور وہاں سے خبر پہنچانے والے نے بھی لشکروں کی طرح ''پیش قدمی'' کر کے خبر پہنچائی تھی۔ اس لیے اہل لشکر اور ''خبر'' دونوں ایک ہی وقت حمص پہنچے۔

کاروائی کے ''زماں ومکاں'' کے سلسلے میں ایک حربی چال یا داؤ ہے جس کو ہر سطح پر اپنایا جا سکتا ہے کہ جب دشمن آپ کے خلاف حیران کن کاروائی کرنا چاہے اور آپ کو وہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور جانا ہے تو اپنی پوزیشن عین اس وقت چھوڑی جائے جب دشمن پیش قدمی شروع کر دے یا حملہ کے لیے پَر تول رہا ہو اور جب کسی جگہ پَر تول کر بھرپور حملہ کیا جائے اور یہ امید ہو کہ دشمن کو جا کر تہس نہس کر دیں گے اور پکڑ لیں گے لیکن اگر وہاں پہنچنے پر دشمن جا چکا ہو تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یاد رکھیں کہ صرف مقامات پر قبضہ کرنے سے دشمن کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا جتنا اس کی فوج کو تہس نہس

کر کے پہنچایا جاسکتا ہے۔

خلیفہ وقت کی تسلی

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے تمام لشکروں کو بڑی حکمت عملی کے ساتھ وادیِ یرموک میں پہنچا دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ شمالی شام کو ربیع الثانی پندرہ ہجری میں خالی کر چکے تھے۔ دمشق کو جمادی الاول میں خالی کیا اور انہی دنوں قساریہ کا محاصرہ بھی اُٹھالیا گیا۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی انہی دنوں وادیٔ یرموک میں پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے قاصدوں کے ذریعے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ انہی دنوں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی مدینہ بھیجا گیا اور انہوں نے خلیفہ دوم کو تمام حالات سے باخبر کیا طبری کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے بہترین دفاعی پوزیشن واقوصہ کی گھاٹی یعنی دریائے یرموک کا علاقہ تھا، اور انہوں نے ازخود مسلمانوں کو اس پوزیشن پر اجتماع کر کے اکٹھے ہو کر لڑنے کا مشورہ دیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا اُمرا اور عظیم صحابہ سے مشورہ

جابیہ کے گردونواح میں جب تمام لشکر اکٹھے ہو گئے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ایک مشاورت طلب کی جس میں امراء، عظیم صحابہ اور جنگ کے ماہرین نے شرکت کی۔ طبری نے کچھ صحابہ کرام اور امراء کے نام لکھے ہیں۔ کچھ کے نام دوسری تاریخوں کے واقعات سے لے لئے گئے ہیں کہ ان کا ذکر کسی واقعہ کے ساتھ وابستہ تھا۔ کچھ ناموں کا ان کی زندگی کے حالات میں ذکر ہے کہ انہوں نے جنگ یرموک میں حصہ لیا۔ اس طرح سے مختلف ذرائع سے جن لوگوں کے نام اکٹھے کر کے ہم یہاں لکھ رہے ہیں یہ ضروری نہیں کہ وہ مشاورت میں بھی شامل ہوں کہ خیال ہے کہ چند صحابہ کرام جنگ سے صرف ایک ہفتہ پہلے پہنچے۔ اسی طرح سے جن کے بارے ہمارے پاس واضح ثبوت موجود ہے کہ ان کو صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے ان کے نام ہم الگ لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے یہ مطلب نہیں کہ باقی امراء صحابی نہ تھے۔ شاید ان میں سے بھی کئی صاحبان کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی ہو۔

اسلامی لشکر میں تقریباً ایک ہزار صحابہ کرام شامل تھے۔ عمر رسیدہ صحابہ میں سے جن میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب بھی تھے کہ آپ کے دونوں بیٹے یزید رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دستوں کی کمانڈ کر رہے تھے۔ عورتوں میں ان کی بیوی ہندہ رضی اللہ عنہا بھی تھی جو آج کے دن اللہ اور رسول کی غلامی پر فخر کر رہی تھی۔ علاوہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی بیوی اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا اور حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی بہن خولہ رضی اللہ عنہا قابل ذکر ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور ان کی ایک بیوی اور نوجوان بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی تھا۔ علماء میں سے حضرت

معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود بھی تھے۔ عاشقوں میں سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے نوجوان بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے علاوہ کئی عظیم صحابہ کے بیٹے جنگ میں شرکت کررہے تھے۔ اولین اسلام لانے والوں میں سے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اور عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بچپن کے دوست اور بہنوئی صفوان رضی اللہ عنہ بن اُمیہ اور بھتیجے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل بھی تھے۔ جو فتح مکہ کے وقت اسلام لے آئے اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا عمر رضی اللہ عنہ بھی تھا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور فضل[1] رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے اور صحابیوں میں سے ابی الاعور رضی اللہ عنہ اور ذوالکلاح رضی اللہ عنہ بھی تھے اور حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور اور رافع رضی اللہ عنہ بن عمیرہ بھی تھے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

اُمراء

باقی امراء جن کے نام طبری میں موجود ہیں۔ وہ قبیلوں کے سردار تھے۔ ان میں بھی کئی صحابہ کرام ہیں، اور سب مشہور جنگجو تھے اور جنگوں میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ چنانچہ اوپر دیئے ہوئے صحابہ کرام کے علاوہ جو لوگ دستوں کی کمانڈ کررہے تھے ان میں قابل ذکر امراء یہ تھے۔ مدغور بن عدی، زیاد بن حنظلہ، وحید بن خلیفہ، امراء القیس، یزید بن نخیس ابن ذی الخمار، عمارہ بن مخشی، حبیب بن مسلمہ، سہیل، عبداللہ بن قیس، عمرو بن عتبہ، سمط الاسود، معاویہ بن خدیج، جندب بن عمرو، لقیط بن عبدالقیس، عمرو بن فلاں قیس بن عمرو، زید بن عوف، عصمہ بن عبداللہ، خوشب، ذوظلیم، مسروق بن حلال، عتبہ بن ربیعہ، جاریہ بن عبداللہ اور قیاث۔

مشاورت

روایت ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مشاورت کے لیے اکثر جنگ کے ماہرین کی رائے طلب کی کہ صف بندی کس مقام پر کی جائے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان ایک دفاعی جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ اب دفاعی جنگ میں پہل کاری اپنے پاس نہیں رہ جاتی۔ لیکن اگر دشمن کو پہل کاری کے لیے مجبور کیا جائے تو یہ پہل کاری ردعمل کے طور پر ہوتی ہے اور مسلمانوں کی یہی کوشش تھی کہ دشمن کو پہل کاری پر مجبور کیا جائے اور ان کا دفاع ایسا ہو کہ دشمن کا منہ پھیر کر رکھ دیں۔ اور جب دشمن میں حملہ کی سکت ختم ہو جائے تو پھر اپنی طاقت کے مطابق جارحانہ کاروائی کی جائے۔ چنانچہ جابیہ کا مقام ایسا تھا جو مسلمانوں کو ضرورت کے مطابق پھیلاؤ تو دے سکتا تھا لیکن اس جگہ پوزیشن لینے میں دو نقص تھے۔ ایک تو بائیں

(۱) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی جن کی وجہ سے آپ کی عظیم والدہ اُم فضل رضی اللہ عنہا کے نام سے مشہور ہیں۔ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا آپ کی سگی بہن تھیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمِ فضل رضی اللہ عنہا کو اپنی والدہ کی طرح پیار کرتے تھے۔ آپ اپنے خاوند حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بہت پہلے اسلام لے آئیں۔

بازو کی حفاظت مشکل تھی۔ اور دوم دشمن عقب میں بھی آسکتا تھا لیکن وہاں سے ہٹ کر یرموک کے میدان میں پوزیشن لینے سے مسلمان اپنے بازوؤں کی نگرانی اور چند دستوں سے اپنے عقب کی حفاظت بھی کر سکتے تھے۔

مسلمانوں کا دفاع جارحانہ قسم کا ہوتا تھا اور یہ چیز جگہ بجگہ واضح کر دی گئی ہے کہ مسلمان کسی ساکن یا انفعالی دفاع کے قائل نہ تھے۔ وہ متحرک دفاع میں یقین رکھتے تھے۔ یرموک کی گھاٹی ان کو ایسی زمین مہیا کرتی تھی۔ جہاں پر وہ متحرک دفاع اختیار کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں نقشہ ششم کا مطالعہ مددگار ثابت ہوگا کہ بازوؤں کی حفاظت بھی ہو رہی تھی کیونکہ ایک طرف دریا اور دوسری طرف لاوے کا پہاڑ تھا۔ اور دیرہ کے مقام پر چند دستے رکھ کر اپنے عقب کی حفاظت بھی ہو سکتی تھی۔

طبری کے مطابق حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ رائے تھی کہ دفاعی جنگ کے لیے یرموک کا میدان ہی بہترین جگہ ہے اور سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ سالار لشکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے تمام اہل لشکر کو یرموک کے مقام پر اجتماع اور صف بندی کا حکم دے دیا اور یہ صف بندی یا اجتماع اس طرح تھا جیسے نقشہ ششم میں دکھایا گیا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ البتہ ایک دستہ کے ساتھ جابیہ کے مقام پر ہی ٹھہر گئے اور وہاں انہوں نے آج کل کے زمانے کی اصطلاح کے مطابق سکرین یا ''پردے'' کا کام کیا۔ اس زمانے میں سب ایسے دستوں کو جیش المقدم کہتے تھے۔ اسلامی لشکر نے جابیہ سے ہٹ کر یرموک کی گھاٹی میں اپنی تقسیم شدہ زمین پر ایسا پڑاؤ اختیار کیا جس کو اشارہ کے ساتھ صف بندی میں تبدیل کیا جا سکے اور اس کاروائی کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قساریہ کا رومی لشکر اب فحل کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ کر سکتا تھا، کیونکہ مسلمانوں نے اس سمت کی بھی تقریباً ناکہ بندی کر دی تھی۔

رومیوں کی پیش قدمی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جھپٹ

رومی لشکر حمص کو خالی دیکھ کر تیزی کے ساتھ دمشق کی طرف بڑھے اور ان کا خیال تھا کہ دمشق میں بھرپور لڑائی ہوگی لیکن ان کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب وہ وہاں پہنچے تو مسلمان دمشق کو بھی خالی کر چکے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں بھی جزیہ کی رقم لوگوں کو واپس کی اور اہل دمشق مسلمانوں کے کردار سے بڑے متاثر ہوئے اور خاموشی سے مسلمانوں نے عارضی طور پر دمشق کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ رومی اپنی کامیابی سے حیران تھے۔ اس لیے انہوں نے جابیہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہاں پر حضرت خالد موجود تھے۔ رومی جو بغیر کسی مزاحمت کے دو تین سو میل کی پیش قدمی کر چکے تھے، انہوں نے اپنی بھاری بھرکم فوج کو اپنے طریقے اور ڈھیلے پن سے آگے بڑھایا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ایسا موقع خدا دے، انہوں نے پیش قدمی کرنے والوں کا سامنے سے مقابلہ کرنے کی بجائے ایک بازو سے ایسا جھپٹا مارا کہ رومیوں کے کشتے کے پشتے لگ گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا یہ چھاپہ اتنا سخت تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں رومی کھیت رہے اور وہ سر پر پاؤں

رکھ کر ایسے بھاگے کہ دمشق تک پہنچنے تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس چھاپے سے دو مقاصد حاصل کر لئے کہ آئندہ رومی دمشق سے آگے پھونک پھونک کر قدم رکھیں گے اور مسلمانوں کو اپنے چنے ہوئے مقام پر اپنی طرز کی صف بندی کرنے کا وقت مل جائے گا۔

یرموک کا میدانِ جنگ

مسلمانوں نے صف بندی کے لیے، جو جگہ چنی اسے نقشہ ششم پر دکھایا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ مسلمانوں کے دائیں بازو پر جبل حورن یعنی لاوے کے پہاڑ تھے۔ بصریٰ اور جبل الدروز وغیرہ کے مقامات بھی مسلمانوں کے دائیں بازو پر ہی تھے۔ بائیں بازو پر دریائے یرموک کا ایک حصہ یا ایک چھوٹا دریا تھا۔ نقشہ ششم میں شمال کی طرف سے دو راستے آئے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک تو وہ راستہ ہے جو دمشق سے جابیہ آ کر آگے وادیٔ یرموک میں داخل ہوتا ہے۔ دوسرا راستہ شمال مغرب کی طرف سے ساحلی علاقوں کی طرف سے دریائے اُردن کو بنت یعقوب کے گاؤں کے پاس سے پار کرتا ہے۔ اور آگے جہاں دریائے یرموک کے ایک حصہ کو پار کرتا ہے اس کا نام بھی پل بنت یعقوب ہے اور اس پل سے پار جو علاقہ ہے اس کو وادی رقاۃ کہتے ہیں۔ اس پل کا ذکر جنگ کے آخری دن ایک اہم جگہ کے طور پر آئے گا۔ بہر حال جیسا کہ نقشہ ششم سے ظاہر ہے، یہ دونوں راستے یرموک کی وادی میں آ کر مل جاتے ہیں۔

ان راستوں کے مرکز کو جسے آج کل کی فوجی زبان میں جنکشن پوائنٹ کہیں گے۔ جنگ یرموک میں خاص اہمیت حاصل تھی اور مسلمانوں نے اپنی صف بندی اس طرح کی کہ اس جگہ سے دشمن کو زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ مسلمانوں کے عقب میں بھی دریا تھا اور اس کے بعد دریا کے معاون تھے۔ جہاں پر معمولی دستے رکھ کر مسلمان اپنے عقب اور بائیں بازو کی حفاظت کر سکتے تھے۔ دائیں بازو کی مسلمانوں کو فکر نہ تھی کہ اس طرف سے حملہ نہ ہو سکتا تھا لیکن مسلمان اگر تتر بتر ہو کر کوئی اور چال اختیار کرنا چاہتے تو وہ دائیں والے علاقے کو استعمال کر سکتے تھے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ جب رجب تیرہ ہجری میں یعنی جنگ اجنادین کے فوراً بعد، اسی مقام پر یرموک کی پہلی جنگ ہوئی۔ تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ سپہ سالارِ اعظم تھے، اور انہوں نے صف بندی کر کے رومیوں کو شکست دی تو اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بھی وہی صف بندی قائم رکھی اور مسلمانوں نے پڑاؤ یا صف بندی تقریباً گیارہ میل میں کی۔

جو لوگ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان کو سمجھتے ہیں اور ان کی خاموشی اور کم گوئی سے واقف ہیں، ان کو معلوم ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی میدانِ جنگ میں موجودگی ہی لاکھوں سپہ سالاروں کی کاروائی کے برابر تھی۔ آپ کی ہلکی سی مسکراہٹ پر لوگ اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جاتے تھے، کہ آپ کے دندانِ مبارک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بدنِ مبارک کو جنگ اُحد میں چھو چکے تھے۔ کہ آپ نے اپنے دانتوں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بدنِ مبارک سے خود کے ٹکڑے

نکالے تھے۔اس کے علاوہ گیارہ میل لمبے علاقے میں صف بندی کرنا اوراس پر کمانڈ کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ کسی بڑی شخصیت کی موجودگی ہی ایسے وقتوں میں کام آتی ہے۔ اوّل لشکر کے چار بڑے حصے کئے اوران میں سے ہر حصہ دس حصوں میں بٹا ہوا تھا۔لیکن ویسے کل چھتیس یا چالیس یونٹیں یا بتالیس تھیں۔ اوران کی کمانڈ وہ امراء وصحابہ کرام کر رہے تھے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور کچھ تفصیل بعد میں آئے گی کہ سارے صحابہ کرام صرف کمانڈ نہ کر رہے تھے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بندوبستی افسر تھے۔اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جذبہ بڑھا رہے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کے تمام تر احکام پہلے ہی سے جاری کر دیئے اور مسلمانوں کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہر دس کی ٹولی پر ایک امیر ہوتا تھا۔اور آگے دس امیروں پر ایک امیر اعلیٰ۔اوراسی طرح یہ بات اوپر تک چلی جاتی تھی۔ بنیادی پہلو نظم وضبط اور ربط وضبط کا تھا۔اطاعت امیر اور موت سے بے خوبی کا عقیدہ اس کی بنیادیں تھیں۔ اس لیے میدانِ جنگ میں سپہ سالار کی شخصیت اور امراء کی شخصیت ہی کافی موثر ہوتی تھی کہ مجاہد لڑتے وقت صرف یہ سوچتے تھے کہ ان کا امیر اُن ہی میں سے ایک ہے اور ساتھ لڑائی لڑ رہا ہے، یا اُن کو لڑائی لڑتے دیکھ رہا ہے۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ اس تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

صف بندی اور لشکروں کی بانٹ

اتنی بڑی لڑائی میں بتالیس کمانڈروں اور مشہور شخصیتوں کے نام محفوظ ہیں۔اسی وجہ سے تمام جانے پہچانے نام لکھ دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ یرموک میں سوا یسے صحابہ موجود تھے جنہوں نے جنگ بدر میں بھی شرکت کی تھی اور جنگ بدر کے پورے تین سو تیرہ صحابہ کرام کے نام بمع آباؤ جداد ابن اسحاق کی تاریخ میں موجود ہیں بلکہ ابن سعد کی تاریخ میں بھی ان کی تلاش کی جاسکتی ہے۔ان ناموں میں اختلاف محدود ہے اور سارے تجزیہ کے بعد کوئی آٹھ یا دس صحابہ کرام کے ناموں پر شک پڑتا ہے،اور وہ بھی اس وجہ سے کہ کئی صحابہ کے نام ایک جیسے تھے۔ بہر حال جس جنگ میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ہزار سے زیادہ صحابہ کرام اور حق وباطل کے پہلے معرکہ کے سو مجاہدین شامل ہوں اس کی صفوں پر تصور ہی میں نظر ڈالنے سے بے ساختہ زبان سے ''سبحان اللہ'' نکل جاتا ہے۔

اہل روم کی پیش قدمی

باطل کی ٹڈی دَل فوج دمشق سے آگے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جواُن کی گت بنائی تھی تو انہوں نے غسانی قبائل اور جبلہ کے لوگوں کو آگے کیا اور وہ ہر جگہ معلومات حاصل کر کے آگے بڑھتے تھے انہوں نے آہستہ آہستہ یرموک کی وادی کے شمال میں پہنچنا شروع کر دیا۔ پھر مسلمانوں سے کچھ فاصلے پر ایک صف بندی

کی شکل والا پڑاؤ اختیار کیا جو طول میں اٹھارہ میل لمبا تھا کہ ان کی تعداد بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی۔ اب متحارب فوجیں ایک دوسرے کو دیکھ سکتی تھیں۔ طرفین دیکھ بھال، مخبری، احکام، ہدایات اور جنگی سامان کی مرمت پر لگے پڑے۔ لیکن ہرقل کے دل کو کوئی اندرونی فکر کھائے جا رہا تھا۔ اُس کو جنگ کی صورت میں صاف شکست نظر آتی تھی۔ اُس نے ایک اور کوشش کی کہ کسی طرح سے صلح ہو جائے اور عزت رہ جائے۔ اس لیے اُس نے باہان کو ہدایات دیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوئی کوشش ضرور کریں۔

اہل روم کی صلح کی کوشش

باہان نے اپنے لشکریوں کے ایک مشہور کمانڈر جنرل گریگوری کو مسلمانوں کے پاس سفیر کے طور پر بھیجا اور وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ اہل روم کچھ حوصلہ میں تھے۔ مسلمانوں کی حکمت عملی کے تحت پسپائی والی چال کو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکے تھے۔ اُن کو خیال ہوا کہ اگر مسلمانوں کو یہ کہہ دیا جائے کہ جو کچھ انہوں نے بلادِ شام سے حاصل کیا ہے، وہ لے کر چلے جائیں اور آئندہ کبھی ملک شام پر حملہ آور نہ ہوں تو شاید مسلمان صلح کر لیں چنانچہ گریگوری نے یہ شرائط پیش کر دیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پہلے تو مسکرا دیئے، پھر فرمایا: کہ ہم شرائط والا معاملہ ذرا کھلا رکھتے ہیں ہم مخالفین کو ایک شرط کی بجائے متبادل شرائط بھی پیش کرتے ہیں کہ انہیں کچھ سوچنے کی گنجائش دی جائے تا کہ جو شرط اُن کو بہتر معلوم ہو اس پر فیصلہ ہو جائے۔ گریگوری یورپین تھا اور اس علاقے میں نو وارد تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کو پہلی دفعہ واسطہ پڑا تھا۔ جب ترجمان نے اس کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا بیان سنایا تو وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی فصاحت اور طرز بیان اور کلام سے بڑا متاثر ہوا کہ خاندانی آدمی تھا۔ جھٹ بول اُٹھا: ''وہ کیا شرائط ہیں؟'' تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسلام کی آغوش میں آؤ۔ یہ منظور نہیں تو جزیہ دو اور یہ بھی منظور نہیں تو فیصلہ تلوار کرے گی۔'' یہ سن کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ خاص کر وہ آخری بات سن کر بڑا حیران ہوا کہ مسلمان کوئی لگی لپٹی بھی نہیں رکھتے اور تلوار پر ان کو اتنا بھروسہ ہے۔ گریگوری بہادر آدمی تھا اس نے بات کو آگے نہ بڑھایا اور تسلیم کیا کہ بے شک مسلمانوں کی شرائط میں کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ وہ امین الامت رضی اللہ عنہ کی باتوں کی تاب نہ لا سکا اور اُٹھ کر چل دیا:

پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے　　　　لا نہ سکے فرنگ میری نواؤں کی تاب

(اقبالؔ)

جبلہ کی سفارت

گریگوری نے جب باہان کو انہی الفاظ اور اپنے تاثرات کے ساتھ رپورٹ پیش کی تو باہان کے ہاتھوں کے

طوطے بھی اُڑ گئے لیکن اُس کو کچھ شک گزرا کہ شاید ترجمان نے معاملات کو اُلجھا دیا ہے۔ اس لیے اُس نے عربی نسل اور غسانی قبائل کے باجگزار بادشاہ جبلہ کو بھیجا کہ وہ سیدھی طور پر بات کر سکے گا۔ جبلہ جب مسلمانوں کے پڑاؤ میں داخل ہوا تو اُس کو اور زیادہ ندامت اُٹھانا پڑی گو مسلمان کسی جغرافیائی رشتے کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے لیکن جبلہ مسلمانوں کی زبان بولتا تھا۔ اُس کا قبیلہ یمن سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اُس کی طرزِ معاشرت بھی مسلمانوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی تھی۔ اس لیے اُس کے منہ سے تو لفظ بھی مشکل سے نہ نکل سکے کہ وہ غیروں کی وکالت کر رہا تھا اور وہ گریگوری سے بھی جلد واپس چلا گیا۔

جبلہ کا اسلام اور فرار

یہاں بہتر رہے گا کہ جبلہ کی آئندہ کی کہانی بھی بیان کر دی جائے۔ جنگ یرموک کی شکست کے بعد اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد جبلہ نے معافی مانگی اور اسلام لے آیا۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد اُس نے مدینہ میں حاضری دی اور اس امید پر وہاں گیا کہ اہل روم کی طرح مسلمانوں کو بھی کسی باجگزار بادشاہ کی ضرورت ہوگی اور جبلہ کو وہ حق مل جائے گا۔ مدینہ کے کسی ہجوم میں کسی بدو کا پاؤں جبلہ کے پاؤں پر آ گیا یا بدو کے بدن کا وزن جبلہ پر آ گیا تو اس نے اس آدمی کو تھپڑ مار دیا۔ اُس بدو نے خلیفہ دوم کے سامنے مقدمہ پیش کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ وہ بدو اسی طرح کا ایک تھپڑ جبلہ کے منہ پر رسید کرے۔ جبلہ نے اس کو اپنی بے عزتی سمجھا اور اپنے قبائل کے لوگوں کے ساتھ مدینہ سے فرار ہو گیا اور پھر کفر میں داخل ہو گیا بلکہ شاہ ہرقل کی سلطنت میں واپس پہنچ کر باقی عمر گمنامی کی زندگی گزار دی۔ دراصل اُس کو اسلام کے ساتھ محبت کی بجائے باجگزار بادشاہت کا چکر مدینہ لے گیا تو بے چارہ خاک مسلمان ہوتا۔ بدقسمت تھا۔

جنرل گلب اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ اس طرح مسلمان ایک طاقتور قبیلہ کی مدد خواہ مخواہ ضائع کر بیٹھے بلکہ ایک ضعیف روایت بھی لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے جبلہ کو رواضی کرنے کی کوشش کی۔ یا جبلہ نے خود بعد میں مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ اور جبلہ نے اپنی آخری عمر ہرقل کے دربار ہی میں گزار دی۔

یہاں پر یہ تبصرہ ضروری ہے کہ اسلام کو کسی طاقتور قبیلہ یا آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اسلام کی نعمت عطا کر دے۔ اس سلسلے میں جلال مصطفےٰ طعیں بنو اسد کے قبول اسلام سے استفادہ کریں کہ اُن لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہوئی کہ وہ اسلام پر بڑا احسان کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں واضح کر دیا۔ ''لوگ اپنے اسلام کا آپ ﷺ پر احسان جتاتے ہیں۔ آپ ﷺ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت جتائیں

(۱) صفحہ ۲۶۲

بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان عطا فرمایا۔'' یہ نکتہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ اسی قبیلہ کے حضرت ضرار بن الازور بھی تھے جو یہ بات جلدی سمجھ گئے تو اُن کا نام تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔ لیکن اسی قبیلہ کے طلیحہ نے جو قبیلہ کا سردار تھا۔ یہ بات نہ سمجھی تو پہلے نبوت کا دعویٰ کیا پھر ذلت کی زندگی دیکھی۔ پھر بات سمجھ میں آ گئی تو مسلمان ہو گیا اور آخر نہاوند[1] کی جنگ میں شہادت حاصل کر کے ہماری آنکھوں کا تارا بن گیا۔ لیکن جبلہ بدقسمت تھا اس کی نیت میں فتور تھا۔ دنیا کی حب تھی اس لیے مسلمان ہونے کی کوشش کی اور مسلمان نہ ہو سکا۔

انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

(اقبال)

جنگ ناگزیر تھی

ابھی تک جمادی الثانی پندرہ ہجری کا مہینہ ہی چل رہا تھا لیکن باہان کو کوئی شک باقی نہ رہ گیا تھا کہ کوئی چیز جنگ کو روک سکے گی۔ بہر حال حالات سے باخبر ہونے کے لیے اس نے جبلہ کے دستوں کو ذرا آگے بڑھایا کہ مسلمان دستوں پر چھاپے مارے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ مسلمان اس مقام پر صرف دفاعی جنگ لڑنا چاہتے ہیں یا اُن کے ارادے کچھ اور ہیں۔ پھر ذرا نزدیک سے دیکھ بھال بھی ہو جائے کہ اُن کی صف بندی کیسی ہے اور نفری کتنی ہے۔ لیکن جبلہ اور اُس کے دستے ذرا آگے نکلے تو مسلمان متحرک دستوں اور جیش المقدم کے دستوں نے اپنے طریقہ پر ان دستوں پر ایسا جھپٹا مارا کہ جبلہ نے بھاگنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی، اب باہان سمجھ چکا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ لیکن پورا ماہ اس کو کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دراصل اس کی کچھ خواہش یہ بھی تھی کہ مسلمان اس پر حملہ آور ہوں۔ اس لیے ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا اور معاملات ویسے ہی رہے۔ لیکن اس کا فائدہ مسلمانوں کو ہوا کہ ان کو اس عرصہ میں چھ ہزار کی اور کمک مل گئی۔ مسلمان مطمئن اور بے فکر تھے۔ گرمی کا موسم تھا اور علاقے کی آب و ہوا ان کے اپنے علاقوں سے ملتی جلتی تھی۔

ایران میں قادسیہ کے مقام پر فتح حاصل ہو چکی تھی اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مدائن کی طرف پیش قدمی کے لیے پَر تول رہے تھے اور اُس محاذ پر کوئی فکر کی بات نہ تھی۔ ہاں خلیفہ وقت نے ایران میں محدود کارروائیوں کی اجازت دی کہ پہلے شام کے معاملات صحیح ہو جائیں اور مدائن کی طرف بھرپور، پیش قدمی نہ کی جائے۔ اگر مسلمانوں کی ساری حکمت عملی کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا، کہ جب وہ ایک محاذ پر بھرپور کارروائی کرتے تھے، تو دوسرے محاذ پر معاملات کو محدود کر دیتے تھے۔ اس ساری حکمت عملی کی مکمل سمجھ بارھویں باب میں آئے گی، جہاں پر واقعات کو تسلسل

(۱) حصہ اول کے ستائیسویں باب میں یہ ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب خلیفہ دوم کی تمام تر توجہ شام کے محاذ پر تھی اور آج تک مسلمانوں نے شام کے محاذ پر اتنا بڑا لشکر کبھی اکٹھا نہ کیا تھا۔

لشکر میں شامل جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اُن میں کچھ بزرگ صحابی چھ ہزار کی کمک کے ساتھ آئے۔ خاص کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگ کے دوران ایک دستہ کی کمانڈ بھی کی۔ لیکن اُن کا زیادہ کام صلاح و مشورہ تھا۔ اور اُن کی موجودگی سے مجاہدین کی دلجوئی ہوئی تھی۔ وہ خطبہ بھی دیتے تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی جنگوں کا ذکر کر کے مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ بات حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں تھی کہ اُس زمانے میں اُن کی عمر ستر برس سے بھی زیادہ تھی۔ طبری میں لکھا ہے کہ آپ قصہ گوئی کا کام کرتے تھے۔ پُرانے زمانے میں عمر رسیدہ لوگ میدانِ جنگ میں بہادری کے قصے کہانیاں سنا کر لوگوں کے دل میں جذبہ پیدا کیا کرتے تھے اور ایسے عمل کی جنگ میں ضرورت بھی ہوتی ہے۔ آج کل زیادہ زور نفسیاتی جنگ پر دیا جاتا ہے اور ریڈیو۔ ٹی وی اور تمام ذرائع ابلاغ اس کام پر لگے ہوتے ہیں بلکہ سینئر افسر، وزراء اور قوم کے رہنما محاذِ جنگ پر جا کر سپاہیوں کی دلجوئی کرتے ہیں۔ اسی طرح اُس زمانے میں بزرگ اور عمر رسیدہ صحابہ خطابت کا کام کرتے تھے اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ خطابت اور علم الکلام کے ماہر تھے۔ یہ اُن کا جذبہ تھا کہ اس عمر میں بھی وہ اسلام کی خدمت کے لیے میدانِ جنگ پر آ گئے تھے۔ ایک اور عظیم صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مدینہ کا چکر بھی لگایا اور پھر واپس آ گئے۔ یرموک کی جنگ میں بندوبست کی تمام ذمہ داری آپ کی تھی اور چالیس ہزار فوج کے کھانے پینے اور کفالت کا بندوبست کافی مشکل کام تھا۔ لشکر میں عورتیں اور بچے بھی تھے اور کھانے پکانے کے کام میں عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس جنگ کے بعد ایران بھیج دیا گیا، جس کا ذکر حصہ اوّل میں ہو چکا ہے کہ وہاں پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کم تھی۔

باہان کا تذبذب

باہان عجیب و غریب تذبذب کے حالات میں تھا۔ وہ مسلمانوں کی شمالی شام سے حکمت عملی کے تحت پسپائی کو نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اگر مسلمانوں نے کوئی بھرپور جنگ لڑنا تھی تو یہ تمام نفری یا لشکر شمالی شام میں کیوں نہ اکٹھے کر دیئے۔ اُس زمانے میں تدبیرات کے تحت پسپائی کے واقعات تو عسکری ماہرین کے علم میں تھے کہ اُن کو داؤ یا چال کہا جاتا تھا لیکن حکمت عملی کے تحت ایسی پسپائی والی بات ذرا اتنی عام نہ تھی۔ پہلے وہ اس خیال کا حامی تھا کہ مسلمان کچھ فرار اختیار کر رہے ہیں، لیکن جب اُس کے قاصد اور سفیر مسلمانوں کے پاس آ کر وہ جواب لے گئے جو اسلامی جنگوں کی بنیاد تھے تو وہ بہت حیران ہوا۔ اس لیے اُس نے سوچا کہ مسلمانوں کے کسی قاصد کو بلا کر اس پر اپنی طاقت اور فوجوں کی کثرت کا

رُعب ڈالا جائے تو شاید مسلمان مرعوب ہو کر کوئی صلح کر لیں۔ چنانچہ اُس نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دعوت دی کہ وہ اپنے کسی سفیر کو اہل روم کے پاس صلح کی بات چیت کے لیے بھیجیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سفارت کے لیے اللہ کی تلوار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی سفارت

باہان نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر اپنی ٹڈی دَل فوج کی نفری کی زیادتی کے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اللہ کی تلوار پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ لڑائی فتح و شکست کے لیے تو نہیں لڑتے تھے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے لڑتے تھے اور فتح کے لیے صرف دعا مانگتے تھے کہ فتح میں عزت ہوتی ہے۔ شکست کا ان کے ہاں کوئی تصور نہ تھا۔ انہوں نے کبھی یہ لفظ استعمال نہ کئے تھے کہ اگر ہم شکست کھا گئے تو یہ ہو گا یا وہ گا۔ وہ دشمن کی شکست کا ذکر کرتے تھے کہ اگر ہم دشمن کو شکست نہ دے سکے تو شاید ہمارے اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور ہو یا دشمن کو شکست دے دی تو پھر دشمن ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکے گا وغیرہ۔ عملی و بدنی شکست تو ویسے بھی بے معنی ہوتی ہے۔ اگر انسان ذہنی شکست نہ کھائے تو وہ کبھی ہار نہیں مانتا۔ اور یہی اسلام کا فلسفۂ حیات ہے۔

باہان نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے لمبی چوڑی تقریر کر دی۔ تمام باتیں سننے کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سنو! ہم مسلمان صرف تین شرطیں جانتے ہیں۔ اسلام قبول کرو، یا جزیہ دو، نہیں تو فیصلہ تلوار پر چھوڑ دو۔ یہ باتیں سن کر باہان کی ساری دانائی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اب اسے کوئی شک نہ رہا تھا اور لڑائی ناگزیر تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر امین الامت رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ اور سپہ سالارِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے رُخ کو تھوڑا تبدیل کر کے شمال مغرب کی طرف کر دیا کہ رومیوں کے رُخ، سمت اور زمین کے لحاظ سے ایسی تبدیلی کی ضرورت تھی۔

زمین کا بیان

زمین ہر جنگ میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے طرفین زمین کے معاملات پر اتنی زیادہ توجہ نہ دیتے تھے، بلکہ یورپ میں تو پندرھویں صدی تک زمین کے معاملات کو جنگ کا حصہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ لڑائیاں زیادہ تر اکھاڑوں یا کشتی کے میدان میں ہوتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ جنگ بے مقصد ہوتی تھی گو کچھ داؤ اور چالیں جنگ میں استعمال ہوتی تھیں لیکن زمین کا استعمال، جو ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اپنایا، ایسا استعمال دنیا کی عسکری تاریخ میں آج سے صرف تین چار سو سال پہلے نظر آتا ہے۔ اب اسلامی لشکر میں سو سے زیادہ تو اصحاب بدر رضی اللہ عنہم شریک تھے جنہوں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر کے مقام پر زمین کا[1] چناؤ کرتے دیکھا۔ اسلام کی باقی جنگوں اُحد، خندق

(۱) جلال مصطفےٰ صفحہ ۵۳ سے استفادہ کریں۔

وغیرہ کے شرکاء بھی اس جنگ میں شامل تھے۔اس لیے یرموک کے میدانِ جنگ اور چنی ہوئی زمین کے چپہ چپہ کا استعمال مسلمان مجاہدین بہتر طور پر کر رہے تھے اور زمین کے بازوؤں اور عقب کی حفاظت کو ہم پہلے ہی بیان چکے ہیں۔

ہمارے کئی مبصرین نے یرموک کے میدانِ جنگ کا وہاں جا کر گہرا مطالعہ کیا ہے۔تمام ندی نالوں اور کناروں کی اونچائی وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیل میں گئے ہیں۔یہ بڑا اچھا مطالعہ ہے لیکن ہم وہ مطالعہ نقل نہیں کر رہے کہ اصول یہ ہے کہ صرف وہ زمینی نشان بیان کئے جائیں جن کی کاروائی میں ضرورت ہو۔اس لیے قارئین ہمارے مطالعہ کو ادھورا نہ سمجھیں ہمارے لحاظ سے سارے میدانِ جنگ میں اہم جگہ ثنین کی پہاڑی تھی اس پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔یہ ساتھ والے علاقے سے تقریباً دوسو یا تین سوفٹ اونچی تھی اور دیکھ بھال یا احکام دینے کے لیے بڑی موزوں تھی۔اکثر احکام سالارِ لشکر نے اسی مقام سے دیئے۔ویسے جس زمین پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔وہ بھی مقابلتاً رومی فوج کے علاقے سے اونچی تھی۔

مسلمانوں کی صف بندی

مسلمانوں کی صفوں کا طول یا پھیلاؤ گیارہ میل لمبا تھا تو چالیس ہزار کی نفری کو اتنے علاقے میں اگر ایک ایک گز کے فاصلہ پر ایک جوان کھڑا کیا جائے تو کل دو صفیں بنتی تھیں۔لیکن مسلمانوں کا طریقہ یہ تھا کہ دستوں کے درمیان میں جو یونٹیں یا رجمنٹیں تھیں ان کے درمیان بھی فاصلہ رکھا جاتا تھا کہ حرکت میں آسانی ہو اور اس طرح مسلمانوں نے درمیانی جوانوں کے فاصلے اور دستوں کے فاصلوں کو بڑھاتے ہوئے میدانِ جنگ میں تین صفیں بنائیں۔تین کا عدد حربی سائنس میں بڑا اہم رہا۔آج بھی ایک کمپنی کی تین پلاٹونیں اور ایک پلاٹون کی تین سیکشنیں ہوتی ہیں اور عام طریقہ دفاع بھی یہ ہے کہ دو آگے اور ایک پیچھے ریزرو میں ہو۔ویسے مسلمانوں کا طریقہ یہی تھا کہ تین یا پانچ صفیں بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم جب کھلے میدان میں عید کی نماز یا کوئی اور نفل نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو تین یا پانچ صفیں بنانے کو ترجیح دی جاتی ہے اور آدمی زیادہ ہوں تو صفوں کے لیے سات، نو یا کوئی بھی طاق عدد چنا جاتا ہے۔ دراصل ہماری عبادات بھی جنگ ہی کی ایک تیاری ہوتی ہیں۔اس لیے عبادات میں بھی جنگی اصول یاد رکھے جاتے ہیں اور ہماری نمازوں کی صف بندی، میدانِ جنگ کی صف بندی کی نقل ہوتی ہے۔آج کل دفاع میں صف بندی کی جگہ مورچہ بندی یا دفاعی لائن نے لے لی ہے اور حملہ میں صف بندی آج بھی قائم ہے۔

ویسے میدانِ جنگ کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ مسلمان بھی دشمن کے بازوؤں کے خلاف کوئی بڑی حرکت نہ کر سکتے تھے۔لیکن مسلمانوں نے جان بوجھ کر یہ طریقہ اختیار کیا جس کو رومی نہ سمجھ سکے۔مسلمان شروع میں دفاعی جنگ لڑنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے محدود علاقے کو پسند کیا کہ اہل روم محدود محاذ پر کاروائی کر سکیں گے۔

مسلمانوں نے اپنے دفاع کوتمام تر اپنی اندرونی قوت پر استوار کیا جس کو موجودہ زمانے میں اندرونی خطوط یا اندرونی ذرائع (Interior Lines) کہتے ہیں۔ ان کی ساری طاقت ایک مٹھی میں تھی اور ان کی تجویز یہ تھی کہ اندرونی طاقت کے زور سے وہ دشمن کے حملوں کا مقابلہ کریں گے اور جب دشمن تھک کر چور ہو جائے گا تو پھر مسلمان کسی بازو سے حملہ کریں گے۔ بازو سے حملہ کی گنجائش دائیں طرف موجود تھی، کہ لاوا والی پہاڑی کی ڈھلان کو محدود حد تک کسی حرکت یا پھیلاؤ کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا اور مسلمان بسم اللہ کسی محدود کارروائی سے کر کے اس کو وسعت دے دیتے تھے۔ یہ اُن کا طرز جنگ تھا تو ظاہر ہے کہ مسلمان میدانِ جنگ کی یہ تمام باتیں ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔

اسلام کے چیدہ چیدہ اُمراء

سپہ سالارِ اعظم حضرت ابوعبیدہ ؓ خود تھے اور حضرت خالد ؓ اُن کے نائب بھی تھے اور متحرک دستوں کے کمانڈر بھی۔ رسالہ والوں کو لشکروں میں بھی بانٹا ہوا تھا کہ کل لشکر کی نفری چالیس ہزار کے قریب تھی جس میں دس ہزار رسالے کے مجاہد تھے۔ متحرک دستوں میں حضرت خالد ؓ کے ماتحت ضرار ؓ بن ازور، میسرہ ؓ بن مسروق اور عامر ؓ بن طفیل تھے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ کے دائیں بازو پر حضرت شرجیل ؓ تھے اور اُن کے دائیں پر حضرت عمرو ؓ بن عاص۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ کے لشکر کا ستون حضرت عکرمہ ؓ بن ابوجہل تھے اور ان کے بائیں حضرت یزید ؓ بن ابوسفیان ؓ تھے، یہ لشکر آگے چھتیس یا چالیس حصوں میں بانٹے گئے تھے جن کے امراء کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

رومیوں کی صف بندی

اہلِ روم کو اپنی اٹھارہ میل کی لمبی صف بندی کو کم کر کے گیارہ میل کرنا پڑا۔ اس میں ان کو ایک لحاظ سے فائدہ تھا کہ ان کی صفوں کی گہرائی بڑھ گئی اور مسلمانوں کی تین صفوں میں اہل روم کی دس یا بارہ صفیں تھیں۔ کچھ مبصرین نے صفوں کی تعداد کو تیس کے قریب میں بھی بتایا ہے۔ رومی اپنے آپ کو' باندھ کر' یا اکٹھے ہو کر لڑتے تھے۔ اس لیے ایک جوان سے دوسرے جوان کا فاصلہ ایک گز سے بھی کم ہوتا تھا۔ پھر دو ستوں کے درمیان بھی فاصلہ نہ رکھتے تھے۔ اہلِ روم مسلمانوں سے چار گنا کے قریب تھے۔ اس لیے اگر وہ مسلمانوں کی طرح صف بندی کرتے تو ان کی بارہ صفیں بنتیں۔ اس میں فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک یا دو صفیں لڑائی لڑ سکتی ہیں۔ اور ان کی صف بندی بھی نقشہ ششم پر موجود ہے۔ باہان اپنے آرمینیا کے لشکر کے درمیان میں تھا۔ اس کے بائیں قناطیر کا لشکر تھا۔ اور باہان کے دائیں دیرجان تھا اور دیرجان کے دائیں گریگوری۔ گریگوری کے چالیس یا پچاس ہزار کے لشکر میں سے تیس ہزار نے اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا لیکن ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کا اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھنا زیادہ ''لچک دار'' ہوتا تھا۔ جبلہ کے عرب دستے جیش المقدم یا ''پردہ'' کا کام کرنے کے لیے چاروں لشکروں میں بانٹ دیئے

گئے تھے اور رسالہ کو بھی لشکروں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ رومیوں کا محاذ جابیہ گاؤں سے لے کر دریائے یرموک تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کے بازوؤں کی حفاظت بھی قدرتی رکاوٹ کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ ان کے عقب میں دریا تھا اور پیچھے وادی رقاۃ تھی اور اہم مقام پر پل بنت یعقوب تھا۔

صف بندی اور مسلمان اُمراء

صف بندی کے بعد تمام مسلمان امراء اپنی صفوں کے سامنے چکر بھی لگاتے تھے اور سورۃ انفال کی آیات کی تلاوت بھی کرتے تھے اور خطاب بھی فرماتے تھے۔ سورہ انفال کو اس زمانے میں اہل لشکر سورۃ جہاد کا نام دیئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سورۃ توبہ کی آیات پڑھی جاتی تھیں۔ اور خاص کر ان چیزوں کا ذکر ہوتا تھا جس میں مسلمان کی زندگی کا مقصد بھی اللہ کے راستے میں جہاد کرنا اور اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کا نفاذ ہے۔ حضور پاک ﷺ کی مثال اور آپ ﷺ کی جنگوں میں شرکت کے واقعات کو دہرایا جاتا تھا۔ حضور پاک ﷺ کے صحابہ کرام ذاتی مشاہدات بیان کرتے تھے اور حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارکہ کا بیان ہوتا تھا۔ جنگ کے سلسلے میں حضور پاک ﷺ کی زیادہ تر احادیث جنگ کے شرکاء نے ہی آگے پہنچائیں۔ میدانِ جنگ میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام کو اس طرح بلند کیا جاتا تھا کہ مجاہدین اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتے تھے اور ان کو یہ خیال ہی نہ رہتا تھا کہ دشمن کتنا اور کہاں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ایک دستے کے کمانڈر تھے۔ جب اہلِ روم مسلمانوں کے سامنے صف بند ہونے لگے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایڑیاں اُٹھا کر دشمن کی طرف غور سے دیکھا۔ پچھلی صفوں میں ایک مجاہد تھا جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نہ جانتا تھا۔ وہ پکار اُٹھا: ''مجاہدو! یہ تمہارے سامنے کون ہے جو دشمن کو اس طرح ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہا ہے۔ یہ کوئی نومسلم معلوم ہوتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ مسلمان یہ پرواہ نہیں کرتا کہ اس کے سامنے کتنا دشمن ہے وہ صف بندی کے بعد صرف اللہ اور شہادت کی سوچتا ہے۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے دستہ سے کسی نے اس مجاہد کو بتایا کہ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں ان کو دشمن کے بارے میں تو کوئی پرواہ نہیں۔ ویسے دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اسی طرح حضرت خالد رضی اللہ عنہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے کہ نوجوان مجاہد نے عرض کیا: ''اے سالار! دشمن کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عزیز من! فوج کی طاقت نفری میں نہیں ہوتی بلکہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی امداد پر بھروسہ کرتے ہیں۔

تبصرہ

یہ تھی دنیا کی ایک عظیم ترین اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری، جس کے عسکری پہلو کو پڑھ کر نہ صرف ایمان تازہ ہوتا ہے، بلکہ ذہن کو ایسی حربی مشق ملتی ہے کہ آدمی کے سامنے دنیا کی مانی ہوئی حکمت عملیوں اور تدبیرات کی کتابیں کھل جاتی ہیں۔ کچھ مبصرین نے اس ساری جنگ کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بجائے تمام تر کاروائی کا موجد حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بنا دیا یہ بہت افسوسناک پہلو ہے اور ایسے لوگ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان کو نہیں سمجھتے۔ اب ذرا ایران کے محاذ پر جنگ قادسیہ کا ذکر پڑھیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کتنے خطوط لکھے۔ حالانکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ سے ہیں اور حق کے راستہ پر سب سے پہلا تیر چلانے کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے لیکن پھر بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہر وقت باخبر رہنا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے صرف ایک خط لکھا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مدینہ شریف بھیجا جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوری تجویز کی منظوری دی اور باقی معاملات حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پر چھوڑ دیئے۔

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ خط جو آپ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا وہ بڑا پُر معنی ہے کہ آپ نے لکھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے میرا معاملہ تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔'' علاوہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک جنگ میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت بھی کام کر چکے تھے۔ اور کتاب اول میں یہ ذکر بھی ہو چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ موزوں ترین ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں عظیم رفقاء کافی حد تک ''ہم نفس'' تھے۔ ہم اس کی مزید وضاحت دسویں باب میں کریں گے جہاں فتح بیت المقدس کے وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت کی، کہ دنیا میں وہ اپنے قسم کی ایک عجوبہ دعوت تھی۔

اب جو لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی سب کامیابیوں کا بانی سمجھتے ہیں۔ شاید وہ ان باتوں سے ناواقف ہیں یا ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صف بندی کچھ اس قسم کی تھی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ متحرک دستوں کے کمانڈر تھے اور وہ نائب سالارِ اعظم ہونے کی وجہ سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک رہتے تھے اور سپہ سالارِ اعظم نے اُن کو خوب استعمال کیا کہ مسلمانوں کی تجویز یہ تھی کہ شروع میں تمام تر کاروائی دفاع تک محدود رکھیں۔ اس لیے ہر لشکر نے رسالے کو اپنی پچھلی طرف متعین کیا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متحرک دستے پورے لشکر کے پیچھے تھے۔ سپہ سالار اعظم نے حدود مقرر کر دی تھیں کہ دشمن کی پیش قدمی کو وہاں سے آگے نہ جانے دیا جائے گا۔ یعنی کاؤنٹر پینیٹریشن لائن مقرر کر دی گئی تھی اور دشمن کے وہاں پہنچنے پر ضرورت کے مطابق جوابی حملہ ہوتا تھا۔ جس کے لیے ہدایات حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے دی جاتی تھیں کہ خود حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ لشکر کے درمیان میں موجود تھے۔

جنگ یرموک کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر بھی دفاع سے حملہ کو اس طرح پیدا کیا گیا جیسے حضورِ پاک ﷺ نے بدر کے مقام پر کیا تھا۔ اور اگر ہم ہر جنگ حضور پاک ﷺ کی سنت کی پیروی کے طور پر لڑیں تو فتح ہمارے قدم چومے گی۔ لیکن افسوس کہ ہم حضور پاک ﷺ کی جنگ کی سنتوں کو بھولتے جاتے ہیں۔

نتائج و اسباق

ا۔ جنگ قادسیہ کی طرح، جنگ یرموک کی تیاری کو الگ باب میں بیان کرنے میں ایک خاص مقصد تھا کہ ہم پر یہ پہلو واضح ہو جائے کہ جنگ لڑنے سے پہلے جنگ کی تیاری کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جہاد کا اعلان کرنے سے پہلے جہاد کی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے کہ جہاد ایک طرزِ زندگی ہے جب تک وہ طرزِ زندگی اختیار نہ کیا جائے، تو جہاد کا اعلان یا جہاد بالسیف کا تصور ایک لا حاصل مشق ہے۔ ہمارے جو دانشور مسلمانوں کی کسی جگہ تکالیف کی بات سن کر جہاد کے اعلان اور جہاد کی ضرورت پر اخباروں کے صفحے بھر دیتے ہیں، وہ اسلام کے فلسفۂ حیات سے بے خبر ہیں۔ وہ جہاد کے بے جان فلسفہ کے قائل ہیں۔ جہاد کی تیاری کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور پوری قوم کو اللہ کی فوج بنایا جاتا ہے۔

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے   یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

(اقبالؒ)

۲۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کی عظمت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام کے یہ مایہ ناز فرزند اتنے ارفع و اعلیٰ مقامات پر فائز تھے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

۳۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جنگ کے نتائج کے بارے میں ذرا بھر بھی شک نہ تھا۔ اور نہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو کوئی شک تھا۔ آپ نے جنگ قادسیہ کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو متعدد ہدایات دیں، لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالارِ اعظم بناتے وقت جو ہدایات ایک بار دیں وہی سب کچھ تھیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ایک مقام تھا جس کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے اور انہوں نے آپ کو لکھ دیا تھا کہ "خدا نے تمہارا معاملہ میرے ہاتھ اور میرا معاملہ تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔"

ہم صرف یہ پہلو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں ایک وحدتِ فکر پیدا ہو چکی تھی۔ یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے شام کے محاذ پر ہوتے ہوئے وہ خود وہاں پر موجود ہیں۔ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خلیفہ وقت بھی وہاں ہوتے تو وہ اسی طرح کرتے۔ اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس روحانی رشتہ کو دنیاوی پیمانوں سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن سبق یہ ہے کہ مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ اور ہمیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے تعلقات پیدا

کرنے چاہئیں۔

۵۔ جنگ میں بڑا مقصد دشمن کی فوج کو اس طرح تہس نہس کرنا ہوتا ہے کہ دشمن میں لڑنے کی سکت باقی نہ رہے ایسا کس مقام پر کیا جائے اور کیسے کیا جائے، اس چیز کو فوجی حکمت عملی کہتے ہیں۔ اور اس حکمت عملی کو صحیح کاروائی میں تبدیل کرنے کو تدبیرات کہتے ہیں۔ پھر تدبیرات کا صحیح استعمال صرف فن یا ہنر سے کیا جا سکتا ہے، جس کو فوجی زبان میں فن سپہ گری کہتے ہیں۔ آج یرموک کے میدان میں اللہ اور رسول کے نام پر قربان ہونے والے، دشمن کو اپنی مرضی کے میدان میں لے آئے تھے اور یہ اُن کی حکمت عملی کی کامیابی تھی۔ اور اب تدبیرات کی باری تھی کہ دشمن کو فن سپہ گری کے صحیح استعمال سے تہس نہس کر دیا جائے۔ کیا رومی امراء یا رومی فوج یہ خیال کر سکتی تھی کہ اتنی کم نفری اس میدان جنگ میں اُن کو ایسا تہس نہس کر دے گی؟ اور اُن کے قیصر کو شام کی سرزمین کو الوداعی سلام کرنا پڑے گا۔ قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں نے یہ سب کچھ کر کے دکھایا کہ جنگ یرموک اسلامی جلال کی ایک جھلک بھی ہے:

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر　　　　نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

(اقبالؔ)

۶۔ اہل روم کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ اگر وہ دشمن کو جال میں نہ پھنسا سکے تو یرموک کے میدان میں اُن کو اس طرح تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

۷۔ اب جنرل فلر سے کون پوچھے کہ جنگ اجنادین سے دو سال بعد مسلمانوں کا پانچ سو کا لشکر پچیس ہزار کیسے بن گیا؟ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کہ اہل مغرب نہ صرف اسلام کو اپنے بودے پیمانوں سے ناپتے ہیں بلکہ اپنے لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔ بہر حال ہمارا فرض یہ ہے کہ اپنوں کے بارے میں جو کچھ غیروں کا لکھا ہوا پڑھیں تو اس سلسلہ میں اپنوں کا لکھا ہوا پڑھیں اور راقم نے اسی وجہ سے فلر اور گلب کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۸۔ بوڑھے ہرقل کی حکمت عملی یا تجویز میں کوئی کمی نہ تھی اور آگے واقعات سے ظاہر ہوگا کہ رومی فوج بڑی بہادری سے لڑی لیکن پھر بھی وہ شکست کھا گئی تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا تدبر، فن، ہنر، بہادری، حربی خوبیاں اور ہر چیز رومیوں سے بہتر تھی تو تب ایسا ہوا۔ اور اصلی بات تو فلسفۂ حیات کی ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے فلسفہ حیات پر یقین کر کے اس پر عمل بھی کریں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔

۹۔ مسلمان اللہ کی فوج ہیں، بوڑھے، عورتیں، بچے سب میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی عمر بھی کافی تھی۔ سب جنگ میں شریک تھے اور بزرگ صحابہ مجاہدین کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ لشکر کے دستوں کے امراء میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی حضرت عمر فاروق

ﷺ سے عمر میں بڑے تھے اور یہی حال حضرت شرجیل ﷺ بن حسنہ کا تھا، لیکن عالم، صحابہ کرام کے صاجزادے عاشق فقیر، جنگجو، مزدور، کاشتکار، تجار یعنی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا، جس سے تعلق رکھنے والے لوگ جنگ میں شریک نہ ہو رہے ہوں۔ لیکن آج ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں سے کچھ تو ''قلمی جہاد'' کرتے ہیں۔ کچھ ''زبانی جہاد'' اور کچھ تالیاں بجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی فوج ''پال'' رکھی ہے اور اسی کا کام ہے کہ وہی ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہے، اور کہیں دشمن کی بمباری سے سویلین لوگ مر جائیں تو اخباروں میں خبر آتی ہے کہ ''بے گناہ'' سویلین'' بھی مارے گئے'' ''یعنی گنہگار'' صرف فوجی ہیں۔ یہ قسم کی بدقسمتی ہے۔ وہاں تو میدانِ جنگ میں عورتیں اور بچے مجاہدین کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے کو تیار تھے۔ اور ہم صرف تالیاں بجاتے ہیں۔

۱۰۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کے زمانے کے مہلک ہتھیاروں کے ہوتے ہوئے کیا یہ ممکن ہے کہ اب بھی مجاہدینِ اسلام پرانے زمانے کی طرح کامیاب ہو سکیں گے؟ ہمارا ایمان ہے کہ بے شک ایسا ہو سکتا ہے انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ دُنیا اللہ تعالیٰ نے اُسی کے لیے پیدا کی ہے اور انسان ہی کائنات کا مرکز ہے۔ اگر مسلمان اپنا عقیدہ صحیح کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام علوم اُن کے سامنے آ کر ہاتھ باندھ کر نہ کھڑے ہو جائیں۔ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی بھی شامل ہیں اور اگر وہ غیرت پیدا کر لیں اور اس غیرت کے ساتھ اپنے عقیدہ کی حفاظت شروع کر دیں تو دنیا کی کوئی طاقت اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بلکہ ہمیں تو نظر آتا ہے کہ دنیا باطل فلسفوں سے تنگ آ چکی ہے اور اب پھر حق کی باری ہے:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے　　　مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

(اقبالؔ)

نواں باب

جنگِ یرموک

پندرہویں ہجری میں رجب کا مہینہ تھا اور ادھر ۶۳۶ عیسوی کا ماہِ اگست تھا۔ تاریخ کیا تھی اور دن کونسا تھا؟ اس سلسلے میں مورخین خاموش ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یرموک کی پہلی جنگ تیرہ ہجری میں رجب کے مہینہ میں ہوئی اور دوسری بھی رجب ہی کے مہینے میں دوسال بعد ہوئی اور اُس وقت تک ہجری سن کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کام ربیع الاوّل سولہ ہجری میں ہوا تو راویوں نے معاملات کو آپس میں کچھ ملا دیا ہے۔ جہاں سال نہ لکھے جائیں تو عرب میں ویسے بھی مشہور ہے کہ سالوں کو اونٹ اور بکری کی کہانی کی طرح یاد کیا جاتا تھا۔ کہ کونسا سال تھا کہ بارشیں اچھی ہوئیں اور بکری اور اونٹ کے لیے مفید سال تھا وغیرہ۔ حالانکہ یرموک کی پہلی جنگ کافی مختصر تھی۔ اُس میں رومیوں کے کچھ نئے دستے شمالی شام سے آئے تھے اور کچھ اجنادین کے بھگوڑوں میں سے تھے۔ لیکن مورخ حضرات حالات کو سنبھالا نہ دے سکے۔ اس لیے جب سن ہجری کا تعین ہو بھی گیا تو کچھ اُلجھن باقی رہ گئی کہ کونسا سال لکھیں۔

بہرحال ہم حالات کو تسلسل سے بیان کرتے آئے ہیں اور اکثر مورخین نے یرموک کی جنگ کی تاریخ رجب پندرہ ہجری ہی لکھی، تو واقعات بھی اس کے ثبوت میں جاتے ہیں اور رجب کی کسی درمیانی تاریخ کو اس میدان جنگ میں اہل حق صف بند ہوئے جس کو علامہ اقبال اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند   تھی منتظر حنا کی عروسِ زمین شام

رومیوں کی مجبوری

اہل روم اب تنگ آچکے تھے اور وہ حملہ کے لیے مجبور ہو گئے۔ انہوں نے اپنے انتظار کی گھڑیاں ختم کر کے پہل کاری کی کوشش کی وہ گرمی کے موسم سے تنگ تھے۔ اگست کا مہینہ تھا اور ابھی دو ماہ اور گرمی کا موسم تھا۔ پھر تقریباً دو لاکھ فوج کی کفالت و بحالی کا کام مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اسلامی لشکر صف بند تھا۔ رومیوں نے سمجھا کہ اجنادین کی طرح مسلمان یہاں پر بھی حملہ آور ہوں گے یا کوئی اور ترکیب کریں گے۔ جب مسلمانوں نے ظاہراً بالکل انفعالی صورت دکھائی تو رومیوں نے مجبوراً حملہ کر ہی دیا۔ یہ تو ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ مسلمان خاموش اور ساکن تھے اور یہ سب

تجویز کے تحت تھا۔ رومیوں کو حملہ سے کوئی پہل کاری حاصل نہ ہوئی۔ گو ظاہراً یہ پہل کاری ضرور ہے کہ میدانِ جنگ میں پہلا وار رومی کررہے تھے اور مسلمانؓ دفاع کررہے تھے۔ دفاع کرنا بھی آسان نہیں۔ اور اس زمانے میں کھڑے ہوکر وار سہنے پڑتے تھے۔ تیروں کو ڈھالوں سے روکا جاتا تھا۔ اور جب نزدیک ہوتے تھے تو پھر مسلمان اپنی پھرتی دکھا کر نیزے اور تلوار استعمال کرتے تھے۔ بہرحال لڑائی کا یہ اصول ضرور یاد رکھا جائے کہ مجبوری کی پہل کاری زیادہ ثمرات کی حامل نہیں ہوتی۔ اور رومیوں کو پہل کاری پر مجبور کردیا گیا۔

پہلا دن

رجب کی کسی تاریخ کو مسلمان جب صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ رومی لشکر اُن کے سامنے کافی نزدیک پہنچ گیا ہے اور درمیانی فاصلہ جو کئی میل تھا وہ ایک میل سے بھی کم رہ گیا ہے۔ آگے والی مسلمان چوکیاں پہلے سے رومیوں کی حرکت کے بارے میں خبر دے چکی تھیں۔ اور سورج چڑھنے کے بعد تو رومی فوج کے جھنڈے ہی جھنڈے نظر آرہے تھے۔ جن میں سے اکثر پر صلیب کے نشانات تھے۔ لیکن کچھ قبائل اور لشکر کے مختلف دستوں کے جھنڈے بھی تھے۔

جرجہ[1] کا قبول اسلام

تھوڑی دیر کے بعد رومی فوج سے ایک جرنیل آگے نکلا۔ مسلمان مجاہدین نے اندازہ لگایا کہ یہ رومی مبارزت طلب کرے گا۔ اب مجاہدین تیار ہورہے تھے کہ سب سے پہلے اسلامی فوجی سے آگے نکلنے کی سعادت کس کو نصیب ہوتی ہے۔ کئی پہلوان ایڑیاں اُٹھا رہے تھے اور کئی مجاہد اپنے سالاروں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ان کے سالار اُن کی طرف متوجہ ہوں اور اجازت دیں کہ وہ آگے نکلیں۔ رومی جرنیل جرجہ گھوڑے پر سوار تھا اور وہ میدانِ جنگ کے درمیان میں آکر رُک گیا۔ جرجہ کسی لشکر کے بڑے حصہ کا کمانڈر نہ تھا۔ البتہ وہ دستے کا کمانڈر تھا اور مشہور آدمی تھا۔ اپنی فوج والوں کو یا رومی سپہ سالار کو کیا کہہ کر آگے نکلا، اس سلسلہ میں مورخین خاموش ہیں۔ شاید ان کو بتایا ہو کہ مبارزت کے لیے جارہا ہے یا کوئی آخری بات کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ جرجہ عربی زبان سے بھی واقف تھا۔

میدانِ جنگ کے درمیان میں آکر اس نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو پکارا۔ مسلمان خوش ہوگئے کہ چلو بسم اللہ۔ اللہ کی تلوار سے ہوگئی، اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ جلدی ہی جرجہ کا کام تمام کردیں گے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ آگے بڑھے لیکن جیسے ہی جرجہ کے نزدیک پہنچے تو جرجہ نے عربی زبان میں بڑی فصاحت سے عرض کی کہ "اے سالار! میں لڑائی لڑنے نہیں آیا ہوں، میں تو چند سوالات کے جوابات دریافت کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

(۱) شاید نام جارج ہو۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ضرور پوچھو۔''

جرجہ کہنے لگا ''اے سالار! بلندی اور عظمت والے لوگ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ میرے سامنے غلط بیانی نہ کریں گے۔ میرا سوال یہ ہے کہ'' کیا یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے کوئی تلوار بھیجی جو آپ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عطا کردی اور جب آپ اس تلوار کو سونت لیتے ہیں تو کوئی طاقت آپ کو شکست نہیں دے سکتی؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

جرجہ: ''پھر آپ کو اللہ کی تلوار کے نام سے کیوں موسوم کیا جاتا ہے؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے سوال کرنے والے سنو! میں اکیلا اللہ کی تلوار نہیں ہوں۔ مسلمانوں میں میرے رُتبہ سے بڑھ کر کئی لوگ ہیں۔ کئی اللہ کے شیر ہیں۔ کوئی صدیق ہے کوئی فاروق ہے اور کوئی امین ہے اور یہ سب کچھ رہتی دنیا تک ہوتا رہے گا۔ اللہ کے مجاہد پیدا ہوتے رہیں گے اور اس وقت بھی بے حساب مجاہد اللہ کی تلواریں ہیں۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ جنگِ موتہ میں جب میں نے مسلمانوں کا علم سنبھالا تو ہمارے آقا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے فرمایا کہ اب اللہ کی تلوار نے مسلمانوں کا علم سنبھال لیا۔ اس کے بعد میرا لقب اللہ کی تلوار مشہور ہو گیا۔''

پھر اے سوال کرنے والے ایک اور بات بھی یاد رکھنا کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرما دیتے تھے وہ ہو جاتا تھا۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر　　　وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

(اقبالؒ)

جرجہ نے عرض کی: اے خالد (رضی اللہ عنہ)! آپ مجھے کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰه ۔'' دل و یقین سے پڑھو اور جو کچھ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر ایمان لے آؤ۔

جرجہ: ''اگر میں ایسا نہ کروں تو؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ: ''جزیہ دو۔''

جرجہ: ''اگر میں ایسا بھی نہ کروں تو؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو پھر تلوار فیصلہ کرے گی۔''

جرجہ نے کچھ سوچنا شروع کر دیا اور پھر کہا کہ اگر میں اب آپ کے دین میں شامل ہوتا ہوں، تو اس کا رُتبہ کیسے مقرر کیا جاتا ہے۔ یعنی ترجیحات کیا ہوں گی؟''

حضرت خالد ؓ نے فرمایا: ''ہمارے ہاں رُتبہ میں سب برابر ہیں۔''

اس پر جرجہ پکار اُٹھا: ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہ۔'' اور دونوں جرنیل اسلامی لشکر کی طرف چل پڑے۔ جرجہ اسلامی لشکر میں داخل ہوتے وقت بھی ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہ'' پڑھ رہا تھا۔ اور مسلمان مجاہدین مرحبا مرحبا کے پیارے الفاظ سے حضرت جرجہ ؓ کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ حضرت جرجہ ؓ اسلام لانے کے بعد اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ اور آج ہم حضرت جرجہ ؓ پر سلام بھیجتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں ان کا نام سنہری الفاظ میں لکھا ہوا ہے کتاب اول کا ہمارا وعدہ بھی پورا ہوگیا کہ خود حضرت خالد ؓ کی زبان کے ذریعے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ اکیلے اللہ کی تلوار نہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

مبارزتیں

حالات کو سہارا دینے کے لیے رومی جرنیل نے رومی پہلوانوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر مبارزتیں طلب کریں اور مسلمانوں کو مبارزتوں میں نیچا دکھا کر حالات کا پانسہ تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ مبارزت کا دور شروع ہوا۔ لیکن صرف درمیان والے حصے سے چیدہ چیدہ رومی پہلوان نکلے۔ مورخین طرفین کے ناموں کے سلسلے میں خاموش ہیں۔ صرف یہی لکھتے ہیں کہ جو رومی آیا مارا گیا اور صرف حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر ؓ نے تنہا پانچ رومیوں کو واصل جہنم کیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر باہان کی اخلاقی قوتوں اور حوصلے کو بڑا دھچکا لگا۔ وہ حیران تھا کہ ہر پہلو سے اس کو نیچا دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اس نے لشکر کے باقی حصوں یعنی بازوؤں سے بھی پہلوان نکالے لیکن ان کا حشر اور بھی بدتر رہا۔

رومیوں کا حملہ

دوپہر تک کا وقت تو مبارزتوں میں گزر گیا لیکن سورج کے ڈھلنے کے ساتھ باہان نے رومیوں کو آگے بڑھ کر حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس نے صرف آدھی صفوں کو حملہ کا حکم دیا جو پانچ یا چھ صفیں ہوسکتی ہیں۔ ہم پہلے تجزیہ کر آئے ہیں کہ رومیوں کی صفیں دس یا بارہ سے زیادہ نہ تھیں اور جن مبصرین نے رومیوں کی صفیں تیس کے قریب لکھی ہیں وہ صحیح نہیں۔ بہر حال باہان یہ نہیں چاہتا تھا کہ پورے لشکر کو حملے کا حکم دے، کہ وہ ایک قدم زمین پر قائم رکھنا چاہتا تھا کہ کیا معلوم آگے سے مسلمانوں کا کیا طریقہ ہو۔ اس کی پانچ یا چھ صفوں کی طاقت بھی مسلمانوں کی نفری یا تین صفوں سے دگنا تھی اور حملہ سارے محاذ پر تھا۔ باہان یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی قوت اور طاقت کتنی ہے اور وہ کیسے مقابلہ کریں گے۔ باہان کے اس حملہ کو آج کل کی زبان میں پروبنگ (Probing) کہتے ہیں یعنی طاقت کے استعمال سے دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانا کہ دشمن کتنے پانی میں ہے۔

حملہ بڑا زوردار تھا لیکن رومی فوج میں کافی نفری ایسے نوجوانوں کی تھی جنہوں نے پہلے جنگ میں حصہ نہ لیا تھا

اجنادین، فحل اور شمالی شام کے علاقوں میں اوپچھلے دو سال کی جنگوں میں اہل روم کافی زیادہ تجربہ کار جنگجولوگوں کو مروا بیٹھے تھے اور اب نئی پود آگے آئی تھی۔ مسلمان مجاہدین سب جنگجو تھے اور کئی جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ پہلے تو مسلمانوں نے رومی حملہ آوروں پر تیروں کی ایسی بوچھاڑ کی کہ ان کے منہ پھیر کر رکھ دیئے۔ اور مسلمانوں کا طریقہ یہ تھا کہ تیر دیکھ کر اپنے امیر کے حکم پر ایک وقت میں کسی مقررہ ہدف پر پھینکے جاتے تھے۔ یہ تیر جیسے ہی رومیوں کے کسی ایک دستہ کے کسی حصہ پر گرتے تو رومی فوج کا وہ حصہ ناکارہ ہو جاتا اور صفوں میں شگاف پڑ جاتا۔ اور رومیوں کی صفوں میں بے ترتیبی آجاتی۔

بہر حال رومی فوج کے کچھ حصے، مسلمانوں کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمان مجاہدین نے نیزے اور تلواریں اُٹھالیں اور دشمنوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اب مناسب تو یہ تھا کہ باہان ان صفوں کو آگے بڑھاتا، جو پیچھے ریزرو میں رہ گئی تھیں۔ لیکن باہان کو ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوئی یا دوسرے دن کے بھر پور حملہ کی سوچ کے تحت رومیوں نے اپنے حملہ آور دستوں کو کوئی کمک نہ بھیجی۔ اور جو مسلمانوں کے ہاتھ چڑھ گئے وہ بچ کر نہ جا سکے لڑائی شدید ضرور تھی اور کچھ مسلمان مجاہدین نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔ لیکن رومیوں کے مرنے والوں کی تعداد کو دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی اس کامیابی پر بڑی خوش ہوئی، اور ان کو اپنے آپ پر اللہ کے فضل سے اور بھروسہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے رومیوں کی طاقت کا اندازہ لگا لیا کہ ان کے زوردار حملے کہاں تک پہنچ سکیں گے۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ طرفین اپنی صفوں میں واپس جانے کے لیے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ آئے۔ مسلمانوں میں زخم تو کئی مجاہدین نے کھائے، لیکن ایسے زخمی بھی تھے جو پٹیاں باندھنے کے بعد دوسرے دن کی لڑائی میں دشمن پر ضرب کاری لگانے کو تیار تھے۔

دوسرا دن (نقشہ ہفتم)

رات آرام سے کٹی۔ گو باہان کی اُمیدیں بر نہ آئیں رومیوں کا اتنا زیادہ جانی نقصان دیکھ کر وہ سخت پریشان تھا اواس کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہر روز اگر حالات ایسے ہی رہے تو چند دنوں کے بعد معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس لیے پہلے دن شام کو جب لڑائی ختم ہوئی تو باہان نے تمام امراء کو صلاح و مشورہ کے لیے طلب کیا۔ اور دوسرے دن کی لڑائی کے لیے جو تجویز اُس نے بنائی اُس سے اُن کو آگاہ کیا تجویز یہ تھی کہ دونوں درمیان والے لشکر، مسلمانوں کے درمیان والے لشکروں پر حملہ ضرور کریں گے۔ اور یہ ظاہر کیا جائے گا کہ پورے محاذ پر شدت سے حملہ ہو رہا ہے لیکن درمیان والے لشکر مسلمانوں کے لشکروں کو اُلجھائے رکھیں گے اور انہیں زیادہ پیچھے کی طرف نہ دھکیلیں گے لیکن اتنا ضرور دباؤ ڈالا جائے گا کہ یہ لشکر بازوؤں والے لشکروں کی مدد نہ کر سکیں۔ دونوں بازوؤں پر شدید ترین حملے ہوں گے اور حملے اتنے شدید ہوں کہ بازوؤں سے رومی لشکر پوری طاقت کے ساتھ آگے بڑھ کر مسلمانوں کو گھیرا ڈال لیں گے اور ایسا تب ہو سکے گا کہ

بازوؤں کے مسلمان لشکروں کو تہس نہس کر دیا جائے۔ گھیرا پڑ جانے کے بعد درمیان والے لشکر شدید حملوں کے ساتھ مسلمانوں کو اس گھیرے کے اندر ہی اندر تباہ کر دیں تاکہ کوئی آدمی بچ کر نہ جا سکے۔

مسلمان چوکنے تھے۔ اور بھرپور حملہ کی توقع رکھتے تھے۔ ان کو آگے والی چوکیوں نے پہلے سے ہی خبر دے دی کہ رومیوں کے درمیان ہلچل ہے اور صفیں تیار ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں نے تیار ہونے میں دیر نہ لگائی، لیکن آخر اندھیرے میں صفیں باندھنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن مسلمانوں کے آگے کی چوکیوں والے دستے ہوشیار تھے۔ عام طور پر روشنی ہو جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے تھے۔ لیکن اُس دن وہ لڑ کر پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اور رومی حملہ کو اس طرح تھامے ہوئے تھے کہ رومی بھی حیران ہو گئے کہ شاید مسلمانوں نے پوری صفیں آگے کر دیں ہیں۔ ان دستوں نے رومیوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ رومیوں کو جو یہ خیال تھا کہ وہ حیران کن اور تیز کاروائی کر کے مسلمانوں کے بازوؤں کے دستوں کو اُکھیڑ دیں گے۔ اس تجویز کے تو وہ نزدیک تک نہ پہنچ سکے۔ البتہ سورج ابھی پوری طرح اُفق پر نہ آیا تھا۔ کہ دونوں فوجیں آپس میں مکمل طور پر ٹکراؤ اختیار کر چکی تھیں۔

رومیوں کا دائیں بازو پر حملہ

درمیان میں اہل روم کا حملہ عام قسم کا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے بازوؤں پر سخت حملے ہوئے۔ پہلے دائیں بازو کی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ دائیں بازو پر حملہ قناطیر کے لشکر نے کیا۔ وہاں پر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا لشکر تھا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی سنجیدگی، تدبر، ٹھنڈے مزاج اور دوررس سوچ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے رومی حملہ کے ریلے کو نہایت ثابت قدمی کے ساتھ روکا اور رومیوں کا حملہ ناکام ہو گیا۔ لیکن تجویز کے مطابق رومیوں نے جلدی سے دوسرے ریلے کے ساتھ حملہ کر دیا۔ مسلمان پھر بھی ثابت قدم رہے اور یہ حملہ بھی ناکام ہو گیا۔ لیکن رومی فیصلہ کن کاروائی کی تیاری کر چکے تھے۔ انہوں نے پچھلی صفوں سے تازہ دم فوج کے ساتھ تیسری دفعہ ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ مسلمان مجاہد اس حملے کی مکمل طور پر تاب نہ لا سکے اور کچھ مجاہدین کے قدم اُکھڑ گئے۔ بعض عقب کی طرف ہٹ کر جھپٹنا چاہتے تھے۔ لیکن ٹڈی دل رومی لشکروں کی صفوں کی گہرائی زیادہ تھی۔ اس لیے مسلمان واپس اپنی کھوئی ہوئی جگہ حاصل نہ کر سکے۔ بعض اہل لشکر نے اپنے بائیں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکر کا سہارا لیا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے کہ اب کچھ سخت جوابی کاروائی کی ضرورت تھی۔ ورنہ جیسا کہ نقشہ ہفتم کے پہلے مرحلہ سے ظاہر ہے، ان کی صفوں میں شگاف پڑنے والا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عقب سے رسالے کی مدد سے جوابی حملہ کر کے رومیوں کے حملے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ لیکن رومیوں کو پوری طرح پیچھے نہ دھکیلا جا سکا، اور انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کے زور کو بڑھا دیا، کہ ان کی صفوں کی گہرائی بہت زیادہ تھی۔ لیکن مسلمان مجاہدین کے لیے

پیچھے ہٹنے والی بات اب ختم ہو چکی تھی۔عقب سے رسالہ بھی جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔اس کے علاوہ مسلمان مجاہدین کی عورتیں اور بچے ہاتھ میں ڈنڈے یا خیموں کی چوبیں لے کر کھڑے تھے۔کچھ مجاہدین عورتوں اور بچوں کا حوصلہ دیکھ کر پھر ثابت قدم ہو گئے۔بہر حال مسلمانوں نے جلد اپنی صفیں درست کر لیں۔حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دوسرا جوابی حملہ رسالے اور پیدل فوج کے ملے جلے دستوں کے ساتھ کیا۔یہ جوابی حملہ اتنا سخت تھا کہ مسلمان مجاہدین نے اپنی کھوئی ہوئی زمین کافی حد تک واپس لے لی اور رومیوں کے قدم اُکھڑنے لگے۔

مسلمانوں کے بائیں بازو پر حملہ

عین اسی وقت جب رومیوں نے مسلمانوں کے دائیں بازو پر حملہ کیا۔تو گریگوری نے مسلمانوں کے بائیں بازو پر زبردست حملہ کر دیا۔یہاں پہ آگے حضرت یزید بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ کا لشکر تھا۔گریگوری کے لشکر میں سے تیس ہزار جوانوں نے اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھا ہوا تھا۔آگے آگے دس ہزار پیدل جوان تھے جو زنجیروں سے بندھے ہوئے نہ تھے اور ساتھ جبلہ کے غسانی بھی تھے۔پیچھے زنجیروں سے بندھے ہوئے رومی ایک دیوار کی طرح حرکت کر کے آگے والوں کو سہارا دیتے تھے۔ایرانیوں اور رمیوں کا زنجیروں سے باندھنے کے طریقے میں فرق تھا۔ایرانی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے تھے ور رومیوں کی زنجیریں لچک دار تھیں۔ایرانی زنجیریں باندھ کر دشمن کے سامنے دیوار بننے کی کوشش کرتے تھے اور ایسی فوج زیادہ تر دفاع میں لڑتی تھی۔اور جب حملہ آور دشمن تھک کر چور ہو جاتا تھا تو پھر کھلے سپاہی آگے نکل کر حملہ آور ہوتے تھے۔رومیوں کی زنجیریں "لچکدار" تھیں۔ایک تو باندھے ہوئے گروہ چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے کہ یہ لوگ متحرک بھی ہو سکتے تھے۔پھر زنجیر کو کھولنے کے بھی طریقے تھے کہ کوئی آدمی زخمی ہو گیا یا گر گیا تو اس کو بیچ سے نکال دیتے تھے۔یعنی زنجیروں والے سیدھے طور پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

گریگوری کے لشکر کا پہلا حملہ بھی بڑا سخت تھا۔لیکن حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکر نے ثابت قدمی کے ساتھ رومیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔گریگوری کے لشکر کا دوسرا ریلہ بھی بہت سخت تھا۔زنجیرں میں کسے ہوئے رومی ہاتھ کی طرح آگے بڑھ رہے تھے اور وہ لوگ اپنے جمگھٹ کے زور کی وجہ سے کئی مقامات پر حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے اندر گھس گئے۔حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے بھی حالات کو سنبھالا دینے کے لیے اپنے عقب سے رسالے سے جوابی حملہ کروایا اور کچھ کامیابی ضرور ہوئی لیکن رومیوں کے حملہ کا زور نہ ٹوٹ سکا۔کچھ مسلمانوں کے قدم یہاں پر اُکھڑ گئے۔پچھلی صفوں میں حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ تھے،وہ بھی کچھ پیچھے ہٹے۔اب رسالہ آگے جا چکا تھا اور پیچھے عورتیں اور بچے تھے۔اور حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند رضی اللہ عنہا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔وہ پکار اُٹھیں خبردار! ابو یزید رضی اللہ عنہ اور ابو معاویہ رضی اللہ عنہ یہ کیا بات ہے اگر ضرورت تھی تو ہمیں کیوں نہ پکارا گیا۔اور اس کے بعد ہندہ

رضی اللہ عنہا کئی عورتیں بچے جو کچھ ان کو ملا، لے کر اسلامی لشکر کی صفوں میں آ کر شامل ہو گئے۔ اور جو رومی نظر آیا اس کا منہ توڑ کر رکھ دیا۔ ایک مجاہدہ کے پاس تلوار بھی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ شامل ہو کر جنگ میں شریک ہو گئیں اور کئی رومیوں کو بھی واصل جہنم کیا۔

واقدی کے لحاظ سے حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے وہ گانا بھی گایا جو اُس نے اُحد کے میدان میں قریش کی دلجوئی کے لیے گایا تھا۔ کہ اہل قریش جنگ اُحد کے پہلے[1] مرحلہ میں بھاگ گئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ گانا یہاں موزوں نہ تھا اور وہ بارہ سال پرانی بات تھی۔ ہندہ اُس زمانے میں چالیس سال سے کم عمر کی تھیں اور کسی اور فلسفہ حیات کے تحت زندگی گزار رہی تھیں۔ اب وہ مسلمان مجاہدہ تھیں۔ اُن کے دو بیٹے اللہ اور رسول کے نام پر جنگ کر رہے تھے۔ اُن کے خاوند اللہ اور رسول کے نام پر اہل لشکر کی دلجوئی کر رہے تھے۔ ہندہ شاعرہ تھیں۔ علم الکلام کی ماہر تھیں۔ حاضر جوابی میں اپنا مقام نہ رکھتی تھیں۔ اُن کی غیرت اب اللہ اور رسول کے تابع ہو گئی تھی۔ اس لیے شاید کوئی رجز پڑھی ہو۔ اور ممکن ہے کہ قرآنِ پاک کی کوئی آیت تلاوت کی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسحور کرنے والی آواز بھی نصیب فرمائی تھی۔ لفاظی کے شوقین راویوں نے شاید اُس کو اور رنگ دے دیا اور واقدی پر یہ اعتراض اکثر کیا جاتا ہے کہ وہ ایسی باتوں کو لکھ کر تاریخ میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ اور مورخین کے ایسے معمولی خیالات پر درگزر کیا جا سکتا ہے۔

سالارِ لشکر کا جوابی حملہ

بہرحال بائیں بازو پر بھی حالات کچھ سنبھل گئے۔ لیکن رومیوں کے حملوں کا زور جاری تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے نائب حضرت خالد رضی اللہ عنہ درمیان میں کھڑے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نائب سالار ہونے کے علاوہ ریزرو اور متحرک دستوں کے کمانڈر بھی تھے۔ دوپہر تک جنگ کی یہ حالت رہی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اب سورج ڈھلنے لگا اور وہ وقت آ گیا تھا جس وقت حضور پاک ﷺ جوابی حملہ کرنے کا حکم دیتے تھے۔ حضرت امین الامت رضی اللہ عنہ شاید اسی وقت کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور فرمایا ''ابا سلیمان! کیا اب حضور پاک ﷺ سے سیکھے ہوئے طریقہ کے مطابق جوابی کاروائی کا وقت نہیں آ گیا؟'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس اشارہ کے منتظر تھے کہ ریزرو دستوں کے استعمال کے بارے میں وہ اپنے ذہن میں تجویز بنا چکے تھے اور حالات کے مکمل طور پر نبض شناسی بھی کر چکے تھے۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے ریزرو دستوں کو پہلے دائیں جانب کاروائی کا حکم دے کر معاملات کو ایسا سنبھالا دیا کہ صورتِ حال صحیح ہو گئی۔

البتہ بائیں جانب زیادہ بھرپور کاروائی کی ضرورت تھی۔ زنجیروں سے بندھے ہوئے گریگوری کے لشکر پہ

(۱) جلالِ مصطفےٰ کے صفحہ ۹۰۔۸۹ سے استفادہ کریں۔

بائیں بازو سے حملہ زیادہ کامیاب نہ رہتا۔ یہاں پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز بنائی کہ ایک تو بائیں جانب سے اسی طرح حملہ کیا گیا، جیسے دائیں بازو پہ کیا گیا تھا لیکن درمیان میں جہاں گریگوری اور دیرجان کے لشکروں کا جنکشن پوائنٹ تھا وہاں پر حضرت ضرار رضی اللہ عنہ نے متحرک دستوں سے ایک سخت حملہ کیا۔ ایسا کرنے کے لیے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل کے دستوں کا سہارا لیا اور نقشہ ہفتم کے دوسرے مرحلہ یہ طریق کار بھی آسانی سے سمجھا جا سکے گا۔ لیکن اسی دوران حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو کہیں دیرجان نظر آ گیا، جو اپنے لشکر میں بے فکر تماشہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا لشکر بھرپور حملے میں شریک نہ تھا۔ بلکہ وہ صرف حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے درمیان والے لشکر کو اُلجھائے ہوئے تھا۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ شیر کی طرح جھپٹے اور دیرجان کے لشکر کے اندر گھس کر دیرجان کا کام تمام کر دیا۔ اور پھر واپس اپنے دستوں میں شریک ہو گئے۔ اب رومیوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ گریگوری کا لشکر مسلمانوں کے رحم و کرم پر تھا، وہ الگ ایک طرف مسلمانوں کی تلواروں اور نیزوں کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔ گریگوری بہادر آدمی تھا اور سمجھ دار بھی۔ وہ حالات کو بھانپ گیا اور پسپائی کے احکام دے دیئے۔ گو یہ پسپائی بھی مہنگی رہی کہ زنجیروں سے بندھے ہوئے کئی جوان خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبے۔ لشکر میں زیادہ یورپین تھے۔ اگست کے مہینہ میں گرمی اور پسینہ کی وجہ سے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ متحرک مسلمان دستوں کی تلواریں گھڑسواروں کے وار پہ وار رومی بری طرح مار کھا کے پیچھے ہٹے۔

دوسرے دن کی جنگ کا ماحصل

دوسرے دن کی جنگ مسلمانوں کے لیے سخت گھڑیاں لے کر آئی تھی۔ جتنے حملے مسلمانوں کے بازوؤں والے لشکروں پر ہوئے اور جس طرح مسلمان مجاہدین نے ان حملوں کو پسپا کیا اس کی عسکری تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا صبر، اور اس گھڑی کا انتظار کہ جس گھڑی میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جوابی کاروائی کا حکم دیتے تھے، یہ ایسے سبق ہیں کہ آج بھی صحیح ہیں اور اس سے روحانی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کی تمام حکمت عملیاں اور تدبیرات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پر قربان کی جاسکتی ہیں۔ قرونِ اولیٰ کی ہر جنگ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ جہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پوری کی، وہاں کامیابی ہی کامیابی تھی۔ ویسے اس پہلو کو دنیاوی پیمانوں سے ناپا جائے تو بھی دوپہر کے بعد جوابی کاروائی کے بڑے فائدے ہوتے ہیں کہ دشمن کے پاس ردعمل کا وقت نہیں رہتا۔ اور اپنا عمل آدھے دن کے نتائج کے تجزیہ اور نبض شناس کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جوابی کاروائی ہمیشہ بعد دوپہر ہی کی جائے کہ اسلام دین الوسطیٰ اور میانہ روی سکھاتا ہے کہ کاروائی کو بھانپ کر کی جائے۔

بہرحال دوسرے دن کی جنگ نے مسلمانوں کے حوصلوں کو اور بلند کیا اور رومیوں کو یہ حملہ بہت مہنگا پڑا۔ جنرل دیرجان مارا گیا اور اس کے لشکر کی کمانڈ ایک اور جنرل قرین کو دی گئی۔ اور گریگوری کے زنجیروں سے باندھے

ہوئے جوان اتنے زیادہ مارے گئے کہ وہ ان سب کی لاشوں کو بھی نہ اُٹھا سکے۔ رومی لشکر کے لوگ رات کے اندھیرے میں چھپ کر آتے رہے اور اپنے مردوں اور زخمیوں کو اُٹھانے کی کوشش بھی کی۔ جو مردے مسلمانوں کے قدموں کے نیچے روندے گئے ان پر مسلمانوں نے مٹی ڈال دی۔ اور شام پڑنے پر مسلمانوں نے اپنے شہدا کو عزت کے ساتھ دفن کیا۔

عورتوں نے آگے بڑھ کر زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ البتہ کچھ مورخین اور مبصرین نے جنگ کے واقعات کو لطف آمیز بنانے کے لیے اور جنگ کو افسانوی رنگ دیتے ہوئے عورتوں کی کارکردگی کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی لفاظی سے کام لے لیا ہے کہ ہر روز مجاہدین کے قدم کسی نہ کسی جگہ اُکھڑ جاتے تھے اور عورتیں خیموں کی چوبیں لے کر اُن مسلمانوں کی خوب مرمت کرتی تھیں کہ وہ کہاں بھاگ رہے ہیں۔ بلکہ کچھ مورخین نے مجاہدین کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈال دیئے کہ رومیوں سے مقابلہ تو اتنا مشکل نہیں لیکن بخدا اپنی عورتوں کے ڈنڈے بڑے سخت ہیں وغیرہ وغیرہ۔

تبصرہ

مانا کہ ایک آدھا ایسا واقعہ کسی جگہ ضرور ہوا ہوگا کہ کوئی مجاہد کچھ زیادہ پیچھے چلا گیا ہوگا اور شاید کسی مجاہد نے دل لگی کے ساتھ بھی ایسا کہہ دیا ہو کہ عورتوں سے ڈر آتا ہے، اور ڈر کی بجائے اصلی لفظ تو ندامت ہے، لیکن کسی ایسے ایک آدھ واقعہ کو افسانہ نہیں بنا لینا چاہیے کہ مجاہد روزانہ کسی ایک جگہ سے بھاگتے تھے اور عورتوں کے ڈنڈے کھاتے تھے۔ یہ الگ پہلو ہے کہ کئی عورتوں نے جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ عظیم صحابی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی ایک زوجہ جنگ یرموک میں شریک تھیں اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت اُم حکیم ؓ جنہوں نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کی طرف مائل کیا تھا وہ بھی جنگ میں شامل تھیں۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ بن ازور کی بہن حضرت خولہ ؓ کا ذکر بھی آتا ہے۔ بلکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ایک بہن جو صفوان رضی اللہ عنہ بن اُمیہ کی زوجہ تھیں اُن کے بارے میں بھی کچھ روایات میں ذکر ہے کہ وہ بھی جنگ میں موجود تھیں اور مسلمان عورتیں لشکر کا حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ کھانے پکانے کا کام کرتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کرتی تھیں۔ جنگ میں پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں۔

تیسرے دن کی جنگ (نقشہ ہشتم)

اہل روم دو دن کی کاروائی میں بری طرح پٹ چکے تھے۔ لیکن جارحانہ کاروائی کے بغیر اُن کے پاس کوئی اور چارہ کار بھی نہ رہ گیا تھا۔ یہی مسلمانوں کی حکمت عملی کی عظیم کامیابی تھی کہ دشمن اس حالت میں تھا کہ یا وہ بھرپور حملہ کرتا رہے یا میدانِ جنگ چھوڑ دے۔ جنرل گلب کے سوال کا جواب یہاں بھی مل جاتا ہے کہ اگر مسلمان دمشق کے شمال میں

پوزیشن لیتے تو اہل روم اُن کے ساتھ بلی اور چوہے والا کھیل کھیلتے رہتے۔

رومیوں کی تجویز

تیسرے دن کی کاروائی کرنے سے پہلے رومیوں کو سوچنا تھا کہ وہ کیا کریں پہلے دن سارے محاذ پر کاروائی کر کے مار کھا چکے تھے۔ دوسرے دن بازوؤں پر کاروائی میں زیادہ کامیابی نہ ہوسکی۔ گو اصولی لحاظ سے یہ کاروائی صحیح تھی۔ اور تیسرے دن بھی اگر رومی یہ کاروائی کرتے تو ان کی کامیابی کی کچھ امید تھی۔ لیکن گریگوری کا لشکر اتنی مار کھا چکا تھا کہ وہ تیسرے دن کی لڑائی میں کوئی جارحانہ کاروائی کرنے کے قابل نہ تھا۔ دونوں درمیان والے لشکر بہت حالت میں تھے۔ لیکن ان میں سے ایک کا سپہ سالار مارا گیا تھا اور درمیان سے آگے بڑھنے میں خطرہ یہ تھا کہ دونوں لشکر بیچ میں پھنس جاتے۔ مسلمانوں کے عقب میں رسالہ تھا اور مسلمان رومیوں کو پھنسا کر تہس نہس کر دیتے۔ اس لیے باہان نے یہ تجویز بنائی کہ گو حملے کا مظاہرہ سارے محاذ پر کیا جائے گا لیکن اپنے دونوں بائیں بازو والے لشکروں کی مدد سے وہ لوگ مسلمانوں کے دائیں بازو پر حملہ کریں گے۔ باہان نے اپنے لشکر اور قناطیر کے دونوں لشکروں کو ملا کر اس ساری کاروائی کی کمانڈ قناطیر کو دے دی اور جبلہ کے عیسائی لوگ بھی تمام کے تمام ان کے ماتحت کر دیئے۔ جہاں رومیوں نے حملہ کرنا تھا۔ وہاں پر آگے مسلمانوں کے جو دو دائیں بازو والے لشکر تھے۔ ان کی کمانڈ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔

نقشہ ہشتم کے پہلے مرحلے کے خاکے میں رومی تجویز اور کاروائی کی ایک جھلک ہے، جس سے حالات کچھ اور واضح ہو جاتے ہیں۔ رومیوں کے دائیں بازو والے لشکر کچھ زیادہ کاروائی نہ کر سکتے تھے کہ گریگوری کے ''پابہ زنجیر'' بہت زیادہ نقصان اٹھا چکے تھے اور سامنے سے نئے جنرل قرین نے جو کاروائی کی، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ خود دیکھ رہے تھے، اور اپنی فراست سے وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ دکھاوے کی کاروائی تھی۔ اس لیے مسلمان اس محاذ پر چوکنے ضرور تھے لیکن ظاہر ہو رہا تھا کہ رومیوں کے ریلے کا زور دونوں دائیں بازوؤں والے لشکروں پر ہے اور رومیوں نے ایک پرزور حملہ کر دیا۔ حملے کا زیادہ زور وہاں تھا، جہاں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے لشکروں کی حدود ملتی تھیں اور یہ پرانے زمانے کا اصول آج بھی اتنا ہی اہم ہے کہ کسی بھی یونٹ، کمپنی یا پلاٹون کے ملاپ والی جگہ یا باہمی حد پر دشمن کا حملہ زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ اس لیے آج کل اصول یہ رکھا جاتا ہے کہ ایسے ملاپ یا باہمی حدیں وہاں ہونی چاہئیں جو زمین غیر اہم ہو کہ اگر دشمن کو اس علاقے میں کچھ کامیابی حاصل بھی ہو جائے تو وہاں سے دشمن کو جوابی حملہ کی مدد سے ہٹانا آسان ہوتا ہے۔ یا دشمن جو حاصل کر لیتا ہے وہ اس کو بہت مہنگا پڑتا ہے۔

افواج کی گتھم گتھا لڑائی

رومیوں کا پہلا حملہ بڑا زوردار تھا لیکن مسلمانوں نے اس کو آسانی کے ساتھ پسپا کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ رومی کچھ نقصان اٹھا چکے تھے لیکن ان کے پاس بے پناہ نفری تھی۔ دوسرا حملہ انہوں نے اور زیادہ تیاری اور پیچھے سے صفوں کو آگے بڑھا کر پہلے حملے سے بھی زیادہ زور سے کیا۔ جس سے مسلمانوں کی صفوں میں شگاف پڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تدبیر کے تحت محدود پسپائی اختیار کی۔ اس کی وجہ سے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کی فوج کا وہ حصہ جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نزدیک تھا اس کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے وہ دستے جو درمیان میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے نزدیک تھے۔ انہوں نے ان مجاہدین کا سہارا لے لیا اور ادھر ہی ڈٹ گئے۔ دوپہر تک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ رومیوں کو کچھ کامیابی کی امید بھی نظر آئی۔ لیکن حالات مسلمان مجاہدین کے کنٹرول میں تھے۔ تدبیراتی طور پر پیچھے ہٹنے کے بعد مسلمانوں نے رومیوں پر زوردار حملے شروع کر دیئے اور سورج ڈھلنے سے پہلے میدانِ جنگ رومیوں کی لاشوں سے بھر گیا۔ وہ بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ لیکن مسلمان جہاں تک پہنچ سکے، وہاں مضبوطی سے ڈٹ گئے تھے اور اب صرف یہ بات تھی کہ اسلامی لشکر کی صف کی سیدھائی ٹیڑھی ہو چکی تھی جس کو بحال کرنا ضروری تھا۔ یاد رکھیں کہ دفاعی لائن کی سیدھائی کی بحالی آج بھی دفاع کی ایک اہم ضرورت ہے۔

مسلمانوں کا جوابی حملہ

جیسے ہی سورج ڈھلنا شروع ہوا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جوابی حملے کی اجازت دے دی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لیے جوابی حملہ آسان تھا کہ انہوں نے صرف ایک یعنی دائیں طرف حملہ کرنا تھا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی پسپائی تدبیراتی تھی، انہوں نے اپنے رسالے کو استعمال نہ کیا تھا۔ ان کا رسالہ اپنے لشکر کے عقب میں تازہ دم تھا۔ اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بھرپور کارروائی کا انتظار تھا اور پھر رابطہ قائم کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو آگاہ کر دیا کہ وہ حملہ ایک ہی مقام سے کر کے باہان کے آرمینیا کے لشکر کی درمیانی صفوں کو تہس نہس کریں گے۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے متحرک دستوں کے ساتھ آرمینیا کے لشکر پر زوردار حملہ کیا تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دائیں بازو سے اپنے رسالہ کو آگے بڑھا کر قناطیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ نقشہ ہشتم کے خاکہ سے دوپہر کے بعد لڑائی کو جو دوسرا مرحلہ دکھایا گیا ہے اس سے حالات زیادہ واضح طور پر سمجھ آسکیں گے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حملے کی طرز رومیوں کے لیے نرالی تھی۔ پہلے وہ گھیرا ڈال کر دشمن کو تہس نہس کرتے تھے یا سامنے سے کشتوں کے پشتے لگاتے تھے۔ اس دن پہلے وہ دور تک دشمن کے اندر گھس

گئے اور پھر اپنی کامیابی کو پھیلاؤ دیا۔اس سے آرمینیا کے لشکر کی ترتیب بھی ختم ہوگئی کسی کو یہ سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کیا کرے اور میدانِ جنگ رومیوں کی لاشوں سے بھر گیا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا دائیں سے رسالے کا حملہ بڑا جچا تلا تھا۔آپ خود شہسواری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔اور خود اس رسالے میں شامل تھے جس نے دائیں سے آگے بڑھ کر قناطیر کے لشکر کو گھیرا ڈال لیا۔دونوں رومی لشکروں کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پسپائی اختیار کریں لیکن یہ پسپائی کسی ترتیب کے ساتھ نہ تھی۔اس لیے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے جو دستے پیچھے ہٹ گئے تھے یا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کا سہارا لے رہے تھے وہ بھی آگے بڑھے اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پیدل دستوں نے بھی پیش قدمی شروع کردی اور اپنی تدبیراتی پسپائی کو ختم کردیا۔اب معاملہ یہ تھا کہ رومیوں کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے پنجے سے کیسے رہائی حاصل کریں۔گو کافی مسلمان مجاہد بھی شہید ہوئے، لیکن میدانِ جنگ رومیوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔

تیسرے دن کی جنگ کا ماحصل

تیسرے دن کی جنگ کے شروع کے وقت میں مسلمانوں کے لیے بھی چند فکر کی گھڑیاں آئیں لیکن یہ دن رومیوں کو کافی مہنگا پڑا۔خاص کر جبلہ کے غسانی جو آرمینیا کے لشکر میں تھے ان کا بہت نقصان ہوا۔قناطیر کا لشکر پچھلے تین دن سے جنگ میں بھرپور کاروائی کر رہا تھا۔اس کا بھی کافی نقصان ہوا۔لیکن اتنا نہ ہوا جتنا آرمینا کے لشکر کا۔مسلمانوں میں پچھلے تین دن سے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے لشکر پر زور پڑ رہا تھا لیکن آج کے دن تدبیراتی پسپائی کی وجہ سے ان کا نقصان کم ہوا۔البتہ جہاں دونوں لشکروں کو باہمی حدود ملتی تھیں۔وہاں مسلمان زیادہ شہید یا زخمی ہوئے۔لیکن سورج غروب ہوتے وقت رومی جب اپنی صفوں میں واپس پہنچے تو ان کی بہت بڑی تعداد ختم ہو چکی تھی۔تین دن گزر چکے تھے ان کی فوج کا کافی حصہ تباہ ہو چکا تھا لیکن ان کو کسی طرح کی کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔چنانچہ باہان نے شام کے وقت اپنے تمام امراء کو اکٹھا کیا اور ان کو بتایا کہ اگر لڑائی کا چوتھا دن بھی اسی طرح گزرتا ہے تو پھر کسی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے۔البتہ اس کے جرنیلوں نے وعدہ کیا کہ اگلے دن وہ سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

چوتھا دن (نقشہ نہم)

چوتھے دن کی کاروائی کے بارے میں طرفین کو کوئی شبہ نہ تھا۔اہل روم جانتے تھے کہ ان کے تین دن کے لگاتار سخت حملے بھی کوئی اچھا نتیجہ نہ حاصل کر سکے تھے۔اگر چوتھے دن بھی وہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ کر سکے تو پھر معاملات ان کے حق میں نہیں جا سکتے۔اس لئے اس دن کے لئے رومیوں کے پاس صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ اتنا

بھرپور حملہ کریں جتنا اُن کو اُن کی طاق اجازت دے۔ بلکہ مکمل طاقت کو داؤ پر لگا دیں۔ مسلمانوں کے دل میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ رومی صرف ایک اور بھرپور حملہ کرسکیں گے۔ اگر اس حملہ کو انہوں نے ناکام بنادیا۔ تو پھر رومیوں کا معاملہ آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اس لیے لڑائی کے چوتھے دن مسلمان نہ صرف ایک بھرپور حملہ کی توقع کر رہے تھے، بلکہ ان کو اپنی کمزوریاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ گو مسلمان شہداء کی نسبت اہلِ روم کے دس گنا آدمی مارے جا چکے تھے۔ لیکن مسلمان مجاہدین میں تیرانداز زیادہ شہید ہوگئے تھے، اور خاص کر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کے تیرانداز کافی زیادہ شہید ہوگئے تھے۔ مسلمان مجاہدین نے شام کے محاذ پر اس سے پہلے اتنی سخت جنگ نہ دیکھی تھی۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا جائزہ اور کاروائی

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حالات سے باخبر تھے۔ اور ان کو معلوم تھا کہ لڑائی کا زیادہ بوجھ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے لشکر پر پڑا، یا حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکر کے اس حصہ پر جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نزدیک تھا۔ جنگ کے دوسرے دن حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکر پر بھی بہت بوجھ پڑ چکا تھا۔ صرف درمیان والے لشکر پر مقابلتاً کم بوجھ پڑا، اس لیے انہوں نے اس لشکر سے کچھ تیرانداز حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بھجوادیئے، اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو پہلے سے ہی بتادیا کہ آج کے دن دشمن کا حملہ درمیان میں ہو نہ ہو، درمیان سے کچھ کاروائی کر کے دشمن کے حملوں کے زور کو بالواسطہ طور پر ختم کرنے کی ضرورت ہوگی اور اس کے لیے وہ تیار رہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکروں کی باہمی حدود والی صفوں کے لیے کچھ ریزرو دستوں کو بھی متعین کیا کہ وہاں نفری کچھ کم ہوگئی تھی، زیادہ تبدیلی کرنے کا وقت گزر چکا تھا اور جو مجاہد جہاں تھا اس کی وہاں زیادہ ضرورت تھی۔

باہان کا تجزیہ

باہان بھی حالات سے باخبر تھا۔ جنگ کو تینوں دنوں میں وہ ایک الگ الگ تجویز پر عمل کر چکا تھا اور اس کو معلوم تھا کہ ایک بار پھر حملہ سے دشمن کو جب تک بازو سے نہ اکھیڑ دیا جائے۔ لڑائی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی۔ یہ حملہ وہ مسلمانوں کے بائیں بازو پر بھی کرسکتا تھا لیکن گریگوری کے پابہ زنجیر سپاہی ابھی دوسرے دن کی جنگ کے زخم چاٹ رہے تھے۔ پھر گریگوری کا لشکر رومیوں کے لیے ایک جہاز کے لنگر کی طرح تھا کہ اس لشکر کے ساتھ ان کے قدم زمین پر گڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے حملہ کرنا مشکل تھا کہ وہاں آگے مسلمان بھی تازہ دم تھے۔ کیونکہ انہوں نے تیسرے دن کی جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ اس لیے باہان اس نتیجہ پر پہنچا کہ تیسرے دن کی کاروائی کو چوتھے دن بھی دہرایا جائے۔ صرف حملہ کا رُخ تھوڑا ترچھا اور اندر کی طرف ہو۔ باہان کو معلوم تھا کہ مسلمان لشکر بھی اس محاذ پر پچھلے تین دنوں سے سخت لڑائی لڑ رہے تھے

اور وہ تھک چکے ہوں گے۔ ساتھ ہی اس کو امید تھی کہ مسلمان آج اس بازو پر حملہ کی توقع کر رہے ہوں گے کہ جنگ کے اصول کے مطابق ناکامی والی جگہ پر دوبارہ سر پھوڑنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

رومیوں کا حملہ

چنانچہ چوتھے دن صبح سویرے رومیوں کے بائیں محاذ کے دونوں لشکروں نے مسلمانوں کے دائیں محاذ کے دونوں لشکروں پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ مسلمان مجاہدین بڑی ثابت قدمی سے دفاع میں ڈٹ گئے۔ لیکن حملے کی طرز میں ریلے پہ ریلہ تھا۔ ایک دو ریلوں کو انہوں نے روک لیا۔ لیکن تیسرے ریلے کے ساتھ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو کچھ تدبیراتی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ لیکن بہت معمولی۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے دستوں نے بھی حملہ کے ایک دو ریلوں کو روکا لیکن وہ زوردار حملوں کو مکمل طور پر نہ روک سکے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر میں قناطیر کے لشکر والے کوئی شگاف نہ پیدا کر سکے لیکن آرمینیا کا لشکر جبلہ کے غسانی عربوں کے ساتھ مل کر حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کچھ شگاف پیدا کرنے لگا۔ ان حالات میں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو بھی تدبیراتی پسپائی کی ضرورت پڑ گئی، اور ان کی صفیں کافی پیچھے چلی گئیں۔ عورتوں کو بھی ان کی صفوں میں شامل ہونا پڑ گیا۔ اور ان عورتوں کے ہاتھ جو کچھ بھی لگا، وہ لے کر مجاہدین کی صفوں میں شام ہو کر مقابلے میں شریک ہو گئیں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا تجزیہ

سورج ابھی دوپہر تک نہ پہنچا تھا۔ اور یہ وقت مسلمانوں کے متحرک یا ریزرو دستوں کو جنگ میں شامل کرنے کا نہ تھا۔ ابھی تک یہ بھی مکمل طور پر ظاہر نہ ہو رہا تھا کہ رومیوں کے ارادے کیا ہیں، خدانخواستہ اگر رومی حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے دستوں کو شکست دے دیتے ہیں یا دینے کے قابل ہو جاتے ہیں تو آگے کیا کریں گے۔ اس کا تجزیہ ضروری تھا۔ ان حالات کا تجزیہ ذہنی طور پر امین الامت رضی اللہ عنہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ درمیان والا لشکر جہاں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تھے، آج تک کسی بھرپور کاروائی میں شرکت نہ کر سکا تھا کہ مسلمانوں کے لحاظ سے یہ لشکر اُن کا مضبوط پاؤں یا "لنگر" تھا۔ اس لیے کیا اب وقت نہیں آ گیا تھا کہ اس لشکر سے کچھ فائدہ ایسی صورت میں اُٹھایا جائے کہ اس کی "لنگر" والی خاصیت پر بھی اثر نہ پڑے۔

دشمن کے حملہ کو درہم برہم کرنا

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو پہلے ہی بتا چکے تھے کہ آج کے دن انہیں کچھ کاروائی کرنا ہوگی۔ لیکن اب ایک عجیب و غریب صورت تھی۔ رومیوں کے حملہ کا رُخ ترچھا تھا۔ اور اسی وجہ سے حضرت عمرو بن عاص کے لشکر پر زور نہ پڑا۔ نقشہ نمبر کے مطالعہ سے اس ترچھے حملہ والی بات سمجھ آ جائے گی۔ رومی اس ترچھے حملہ کی مدد سے

مسلمانوں کی صفوں میں شگاف پیدا کر کے اسلامی لشکروں کو دو حصوں میں بانٹنے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ اس طرح مسلمانوں کی قوت منتشر ہو جائے اس لیے اگر حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکر کو سنبھالا یا سہارا نہ دیا جاتا تو رومی اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے۔ اب اگر اس رومی لشکر پر حملہ کر کے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حالات کو سنبھالا دیتے جو رومی لشکر حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ پر حملہ آور تھے تو خطرہ یہ تھا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے قرین کا لشکر خالی جگہ پر قبضہ کر کے مسلمانوں کے لیے خطرناک صورتِ حال پیدا کر دیتا۔ بلکہ پورے میدانِ جنگ میں افراتفری مچ جاتی۔

اِن حالات میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لیے صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ اپنی صفوں کو قائم رکھتے ہوئے دشمن کے حملے کے زور کو درہم برہم کر دیں۔ آج کل فوجی اصطلاح میں ہم اس کو (Spoiling) کہہ سکیں گے۔ اور دین فطرت کے مجاہد جنگ کے سب اصول اپنے آقا ﷺ سے سیکھ چکے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سمیت اپنے تمام اُمراء کو حکم دیا کہ شمال مشرق کا ترچھا رُخ اختیار کر کے وہ گریگوری اور قرین کے لشکروں پر حملہ کر دیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نقشہ نمبر کے دوسرے مرحلے والے نقشے کی مدد لیں۔ یہ ایک عجیب وغریب صورت تھی۔ ترچھے حملے سے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو سیدھے طور پر تو کوئی فائدہ نہ ہوا لیکن کچھ رومی جو حملہ کر رہے تھے اُن کے عقب پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اُن میں سے چند بھاگنے لگے اور چند میں افراتفری مچ گئی اور آرمینیا کا لشکر رُک گیا۔

باہان کے لیے اب عجیب قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے اور اُس کو مسلمانوں کی اس کاروائی پر کسی ردِ عمل کی کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ اس لیے رومیوں کا حملہ رُک گیا اور دوپہر سے پہلے یہ حالات ہو چکے تھے کہ رومی ساکن ہو گئے اور اپنی پیش قدمی کو جاری نہ رکھ سکے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ زیادہ پیش قدمی کی اجازت تو نہ دے رہے تھے کہ اُن کا مقصد پورا ہو چکا تھا لیکن مسلمانوں کا بھی ایک نقصان ہو گیا کہ اُن کے دونوں بائیں والے لشکر بھی رومیوں کے ساتھ اُلجھ گئے۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو دونوں لشکر پورے محاذ پر ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف گتھم گتھا تھے بلکہ کسی حد تک ''بندھ'' بھی گئے تھے۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ، گریگوری کے مقابلے میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ قرین کے مقابلے میں، حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ، آرمینیا والوں کے مقابلے میں اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، قناطیر کے مقابلہ میں سخت اُلجھے ہوئے تھے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا جوابی حملہ

اب صرف اللہ کی تلوار حضرت خالد رضی اللہ عنہ سالارِ اعظم کے حکم کے منتظر تھے۔ سورج ڈھل چکا تھا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جب امین الامت رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے جوابی حملہ کا اشارہ دے دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ تیار تھے بلکہ اُن کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں اپنے دستوں کو متحرک کرنے کی کافی جگہ مل گئی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ درمیان سے آگے جا چکے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے متحرک دستوں کو دو حصوں میں تقسیم کر چکے تھے ایک حصہ کی کمانڈ کا خود فیصلہ کیا اور

ایک کی کمانڈ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو سونپ دی اس دفعہ تجویز پہلے دونوں کی تجویز سے مختلف تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تو اسی جگہ سے حملہ کیا جہاں سے اُنہوں نے ایک دن پہلے یعنی جنگ کے تیسرے دن کیا تھا اور رومی ایسی کاروائی کی اُمید بھی کر رہے تھے۔ لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا دوسرا حملہ جو انہوں نے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ سے کروایا وہ اس جگہ سے تھا جہاں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی حدود ملتی تھیں۔ اس تجویز کو سمجھنے کے لیے نقشہ نمبر کے دوسرے مرحلہ کے خاکہ کا مطالعہ کریں۔ رومیوں کا سب سے بڑا لشکر آرمینیا والوں کا تھا۔ جس میں جبلہ کے غسانی بھی شامل تھے وہ لشکر اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے "قلابوں" میں پھنس گیا، بلکہ سامنے سے حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکر نے آرمینیا والوں پر حملہ کر دیا۔ آرمینیا والے بڑی بہادری سے لڑے اور گھمسان کا رَن پڑا۔ دوپہر کے بعد سارا دن بڑی سخت لڑائی ہوتی رہی لیکن آخر آرمینیا والوں کے قدم اُکھڑ گئے اور سخت جانی نقصان اُٹھاتے ہوئے انہوں نے پسپائی شروع کر دی۔ ادھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ترچھے حملہ کی وجہ سے آرمینیا والوں کے لیے عقب میں پسپائی بھی مشکل ہو رہی تھی اور اُن کا جبلہ کے غسانی عربوں سمیت اُس دن اتنا نقصان ہوا جتنا پہلے تین دنوں میں ہوا تھا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی نبض شناسی

اب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی نبض شناسی کام آئی۔ انہوں نے پہلے بھی زیادہ پسپائی اختیار نہ کی تھی اُن کے بائیں جانب حضرت ضرار رضی اللہ عنہ متحرک دستوں سے پیش قدمی کر رہے تھے۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جانا اور اپنے دستے کو دائیں بازو سے آگے بڑھ کر دشمن پر ایک قسم کا گھیرا ڈالنے کی کوشش کی، اور سامنے سے پیدل دستوں کے ساتھ ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ قناطیر کے یورپین دستے اگست کی گرمی میں پہلے ہی پسینہ پسینہ ہو رہے تھے لیکن یہ پسینہ لہو بچانے کے کام نہیں آتا وہ اُلٹا لہولہان ہو گئے۔ اور بُری طرح مار کھائی۔ اسی طرح سے سورج غروب ہونے سے پہلے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ نہ صرف اپنی کھوئی ہوئی زمین حاصل کر چکے تھے۔ بلکہ قناطیر اور آرمینیا کے لشکر کافی حد تک گھیرے میں آچکے تھے اور مجاہدین چن چن کر اُن کو واصل جہنم کر رہے تھے۔ یہ عمل سورج کے غروب ہونے تک جاری رہا اور بڑی مشکل سے مسلمانوں کے دائیں بازو والے لشکروں کے سامنے سے نڈھال رومی اپنی پوزیشن پر واپس جا سکے۔

مسلمانوں کے حملے کے خلاف رومیوں کا ردِ عمل

اب حالات یہ تھے کہ اب تک اہل روم جارحانہ جنگ لڑ رہے تھے۔ جارحانہ جنگ میں تیراندازوں کا استعمال محدود ہوتا ہے کہ حملہ شروع کرنے سے پہلے یا پسپائی کے وقت تیروں کو دور مار ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس

لیے رومی فوج کے تیر انداز بھی تازہ دم تھے بلکہ قرین اور گریگوری کے لشکر کے تیر انداز کافی حد تک تازہ دم تھے۔ تیر اس زمانے میں جارحانہ کاروائی کے وقت حملہ آوروں کو مقصود تک یا گتھم گتھا ہونے تک مددگار ہوتے تھے جیسے آج کل توپخانے کا فائر یا بکتر بند گاڑیوں کا فائر یا خود کار ہتھیاروں کا فائر پیدل دستوں کو مقصود تک پہنچاتا ہے۔ لیکن دفاع میں تیر انداز اگر باقاعدہ طور پر استعمال کیے جاتے تو وہ جنگ کا رُخ ہی تبدیل کر دیتے تھے اور اہل روم کے پاس تیروں اور تیر اندازوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

مسلمانوں نے جارحانہ کاروائی سے گریز بھی اسی وجہ سے کیا تھا کہ اگر پہلے وہ ایسا کرتے تو وہ رومی تیر اندازوں کے سامنے تر نوالہ بن جاتے۔ چنانچہ جب یزید رضی اللہ عنہ اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سمیت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے تمام اُمراء نے پیش قدمی کی تو اہل روم کے تیر اندازوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے مسلمانوں کی بُری حالت کر دی، بلکہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اہل روم آنکھوں کا نشانہ باندھتے تھے اور اس دن سات سو مجاہدین کی آنکھوں پر تیر لگے، جن میں سے کئی مجاہدین کی آنکھ بھی ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گئی۔ روایت ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ایک تیر طائف[1] والی جنگ میں لگا تھا اور اُس سے ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی یا اُس میں نظر کم ہو گئی تھی۔ اب اس جنگ میں ایک تیر آ کر اُسی آنکھ میں لگا اور اُس میں اگر کوئی نظر باقی تھی تو وہ بھی ختم ہو گئی۔ بہر حال جو کچھ ہوا وہ اللہ کی راہ میں ہوا۔ جن مجاہدین کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی اُن کے مقامات اللہ تعالیٰ نے اور بلند کر دیئے۔ مسلمان ظاہری آنکھوں کی پروا نہیں کرتا، اس کے دل کا آئینہ صحیح ہونا چاہیے۔

سورج ڈھلنے کے بعد جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جوابی کاروائی شروع کر دی تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دونوں لشکروں کو پیچھے ہٹنے کے احکام دے دیئے کہ دشمن کے تیروں کی مار سے باہر نکلا جائے۔ لیکن پسپائی جس حالت میں بھی کی جائے یہ بڑی مشکل جنگی کاروائی ہوتی ہے۔ جیسے ہی اسلامی لشکروں نے قدم پیچھے ہٹائے قرین اور گریگوری کے لشکروں نے تعاقب شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اسلامی لشکروں میں کچھ بے ترتیبی بھی آئی۔ یہ دونوں رومی لشکر کافی حد تک تازہ دم تھے گریگوری کے لشکر نے دوسرے دن مار کھائی تھی لیکن قرین کے لشکر نے دوسرے اور تیسرے دن کسی خاص کاروائی میں حصہ نہ لیا تھا۔ اس لیے ان دونوں لشکروں نے اپنے تعاقب کو حملہ کی شکل دے دی۔ اب اگر اس حملہ کو بروقت اور اپنی پرانی پوزیشن سے دور ہی نہ روکا جاتا تو میدانِ جنگ کا کھیل ہی تبدیل ہو جاتا۔ یہ بڑی نازک گھڑی تھی اور ضرورت اس کی تھی کہ اس سیلاب کے آگے بند باندھا جائے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ثابت قدمی

(۱) جلالِ مصطفےٰ، صفحہ ۲۴۷ اور ۲۴۸ دیکھیں۔ (۲) جلالِ مصطفےٰ، صفحہ ۲۳۱ سے استفادہ کریں۔

یہاں پر حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل کی اسلامی غیرت کام آئی اور آپ رضی اللہ عنہ کا نام ہماری تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ کی بہادری پر تو کسی کو کوئی شبہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے خلاف بھی وہ جنگ بدر، جنگ اُحد اور جنگ خندق میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ بلکہ فتح مکہ کے وقت حضرت خالد کے دستہ کی مخالفت[1] صرف حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے بہنوئی صفوان رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ اس جنگ میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے جواں سال بیٹے عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اس سے پہلے مہرہ، حضرموت اور یمن میں بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ جس کا ذکر حصہ اوّل میں آچکا ہے۔ اور اس کتاب کے شروع میں شام کی کاروائیوں کے سلسلے میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی بہادری کا ذکر ہو چکا ہے کہ انہوں نے کس طرح اسلامی غیرت کے تحت حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید کے لشکر کو دشمن کے نرغے سے باہر نکالا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا دن

یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے کہ اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ کے دن یعنی چوتھے دن نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے دن سے مشہور ہونا تھا۔ اور اسلام کی اس بلندی اور ارفع خصوصیت کا مظاہرہ ہونا تھا کہ اسلام میں آجانے کے بعد ماضی کی دشمنیاں اور گناہ ختم ہوجاتے ہیں۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ کے باپ عمرو بن ہشام (جو ابوجہل کی کنیت سے مشہور ہے) نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں۔ اور باقی مسلمانوں کو جو تکلیفیں پہنچائیں وہ ایک پوری کتاب کا مضمون ہے۔ مسلمانوں کی مکہ سے ابے سینیا یا مدینہ شریف کو ہجرت بھی ابوجہل اور اُس کے رفقاء کی شرارتوں سے تنگ آجانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جنگ بدر کی ذمہ داری بھی ابوجہل کے سر آتی ہے۔ لیکن اُس کے بیٹے عکرمہ رضی اللہ عنہ آج ہمارے سر کے تاج ہیں کہ جنگ یرموک میں وہ ایک مثال قائم کر گئے۔

شہادت پر بیعت

شہادت پر بیعت کا لفظ پہلی دفعہ جنگ اُحد میں سننے میں آیا۔ جب متعدد صحابہ کرام نے جنگ کے دوسرے مرحلے پر شہادت پر بیعت کی اور عکرمہ رضی اللہ عنہ جو اُس زمانے میں مسلمانوں کے دشمن تھے۔ انہوں نے یہ نظارہ اسلام لانے سے پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آج وہی عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلامی غیرت کے تحت پکار اُٹھے آؤ مسلمانو شہادت پر بیعت کریں۔ وہ الفاظ کیا تھے؟

''خبردار! اے مسلمانو! اے اللہ اور رسول کے نام پر لڑنے والو! آؤ شہادت پر بیعت کریں کہ اس جگہ سے ہمارے قدم صرف شہادت ہی ہٹا سکتی ہے۔''

(۱) جلالِ مصطفیٰ، صفحہ ۲۳۱ سے استفادہ کریں۔

جہاں تک حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی آواز پہنچی، سب مجاہدین لبیک لبیک پکار اُٹھے اور روایت ہے کہ چار سو مجاہدین نے شہادت پر بیعت کی اور رومیوں پر ایسا بھرپور وار کیا کہ اُن کے چھکے چھڑا دیئے۔ بلکہ رومیوں نے پسپائی بھی اختیار کرنا شروع کر دی۔ اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے والے لشکر کے باقی اُمراء بھی ڈٹ گئے اور مسلمان ''بنیان المرصوص'' بن گئے۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکر والے بھی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر وہ بھی تھم گئے اور اپنی صفیں بحال کر لیں بلکہ اب تک عورتیں بھی جنگ میں شریک ہو چکی تھیں۔ اور اُس محاذ پر حضرت خولہ رضی اللہ عنہا بنت ازور نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ مردوں کو بھی حیران کر دیا اور اُن کے بھائی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ دوسرے محاذ پر رومیوں کو تہس نہس کر رہے تھے۔ حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ اُم حکیم سب اُس دن جنگ میں شریک ہوئیں اور پکار پکار کر مجاہدین کے حوصلے بڑھاتی رہیں۔

دوپہر کے بعد پورے محاذ پر بڑی گھمسان کی جنگ لڑی گئی۔ اور بڑے بڑے پہلوانوں نے مبارزتیں بھی طلب کیں اور کئی مسلمانوں نے رومیوں کو واصل جہنم بھی کیا۔ مسلمان بہادروں میں اس جنگ میں پہلی دفعہ مالک اشتر کا نام سننے میں آیا، جنہوں نے کئی رومیوں کو واصل جہنم کیا۔ تیسری اور چوتھی کتاب میں وہ اکثر ہمارے ساتھ رہیں گے۔

چوتھے دن کی شام

چوتھے دن سورج غروب ہونے کے بعد جنگ تھم گئی۔ مسلمان اپنی صفیں بحال کر چکے تھے۔ رومی بُری طرح مار کھانے کے بعد اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے۔ دونوں لشکروں کی تھکاوٹ کی کوئی حد نہ تھی۔ حضرت خالد اپنی صفوں کو درست کر کے فارغ ہوئے ہوں گے کہ اُن کو خبر ملی کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے بیٹے عمر رضی اللہ عنہ زخموں سے چور ہو کر زندگی کے آخری لمحوں میں داخل ہو چکے ہیں اور اس محاذ پر متعدد مسلمان مجاہدین جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ادھر چل پڑے۔ اور جب وہاں پہنچے تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے بیٹے عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک زندہ تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دونوں باپ بیٹے کے سر اپنی گود میں رکھ لیے۔ گو مورخین نے ذکر نہیں کیا لیکن ضروری ہے کہ اُمِ حکیم بھی اپنے عظیم خاوند کے چہرے سے خون صاف کر رہی ہوں گی۔ بہرحال روایت ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں کو شہادت کا تحفہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی گود میں پیش ہوا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی اپنی قسمت میں میدانِ جنگ کی شہادت نہ تھی اور یہ ذکر بعد میں آئے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے قریب ترین رشتہ داروں کو خالد رضی اللہ عنہ کی گود میں شہادت کا تحفہ پیش کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی شہادت کی پیاس کو کچھ نہ کچھ ٹھنڈا ضرور کر دیا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا تبصرہ

غمناک آنکھوں سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ صرف یہ کچھ کہہ سکے کہ: ''بنومخزوم نے اسلام کی اوّل اوّل دشمنی کے داغ آج دھودیئے ہیں۔اور ہماری بہن کے بیٹے کے اب تو سارے شکوک دور ہو جائیں گے۔''

مخزوم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پردادا کے دادا کا نام تھا اور وہی ابوجہل کے دادا پردادا بھی تھے۔اس خاندان سے بہت کم لوگ مکہ میں اسلام لائے اور اسلام کی انہوں نے شروع میں بڑی مخالفت کی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی والدہ اسی خاندان سے تھیں اور ابوجہل کی بہن تھیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا افسوس تھا کہ اُن کی ماں کے خاندان سے شروع میں بہت کم لوگ مسلمان ہوئے اور اُنہوں نے شروع شروع میں اسلام کی خدمت نہ کی تھی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ یہی فرما رہے تھے، کہ اب ہم جو اسلام لے آئے تو اسلام کی خدمت میں پرانے داغوں کو بھی دھو رہے ہیں۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اب تو ہماری کارکردگی سے تسلی ہو جانی چاہیے۔یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے صحیح الفاظ یہ ہوں کہ ہماری بہن حنتمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے کے اب تو شکوک دور ہو جانے چاہئیں۔کہ حضرت حنتمہ رضی اللہ عنہا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام تھا۔اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں نہ کوئی ہجو ہے نہ طعنہ ہے اور نہ کوئی شک وغیرہ۔لیکن طبری اور اس زمانے کے ایک مبصر نے ان الفاظ کی ادائیگی کو ایسا رنگ دیا ہے کہ سارے معنی اُلٹ ہو جاتے ہیں۔بات تو سیدھی تھی کہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے ننھیال پر اب فخر کرنا چاہیے۔لیکن طبری نے یہ الفاظ استعمال کیے۔'' کیا حنتمہ رضی اللہ عنہا کا بیٹا یہ سمجھتا ہے کہ ہم شہید نہیں ہو سکتے؟ یہ لفاظی ہے اور سارے واقعہ کو اس طرح غلط رنگ مل جاتا ہے۔ دراصل جو لوگ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا کا ادب ملحوظ نہیں رکھتے وہ ایسی غلطیاں کر ہی جاتے ہیں۔اللہ معاف کرے۔

بیوہ کی عزت افزائی

حصہ اول کے بیسویں باب میں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اُن کی بیوی کی عزت افزائی کے سلسلے میں تفصیلی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی مثال پیش کی کہ انہوں نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی عزت افزائی کی۔اس سلسلے میں اگر ہم مثالیں پیش کرنا شروع کر دیں تو کتاب انہی مثالوں سے بھر جائے گی لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ماموں زاد بہن اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بھتیجی حضرت اُم حکیم رضی اللہ عنہا زوجہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی مثال پیش کرنے میں ایک مقصد ہے کہ یہ بات عام تھی، اُم حکیم رضی اللہ عنہا کوئی معمولی ہستی نہ تھیں۔حضرت عکرمہ کو اسلام کی طرف راغب بھی اُنہوں ہی نے کیا۔بہر حال حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسلام کے کئی مایہ ناز فرزندوں نے آپ کو نکاح کے پیغام بھیجے۔جن میں حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے شام میں ایک لشکر کی شروع شروع میں کمانڈ کی تھی۔حضرت اُم حکیم رضی اللہ عنہا نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے پیغام کو منظور فرمایا اور چار ماہ کے بعد شمالی شام میں نکاح ہوا اور نکاح دوسرے یا تیسرے دن حضرت خالد

بن سعید رضی اللہ عنہ بھی ایک جھڑپ میں شہید ہو گئے۔ اور عدت پوری ہونے کے بعد اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ کہ ماموں کی بیٹی، دوسرے ماموں کے بیٹے اور شہید عکرمہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ اور پھر دوسرے شہید حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی زوجہ کی عزت افزائی کی ضرورت تھی۔

چوتھے اور پانچویں دن کی درمیانی رات

چوتھے دن کی جنگ شدید ترین تھی۔ تمام مجاہدین تھک کر چور ہو گئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے احکام کے مطابق اور حضور پاک ﷺ سے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق امراء رات کے وقت چکر لگا کر دیکھتے تھے کہ آگے والے محافظ چوکنے ہیں یا نہیں۔ رات کے وقت دشمن پر بھی کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی، اور اس کام کے لیے بھی کچھ لوگ مقرر کئے جاتے تھے جو دشمن کے نزدیک جا کر مخبری کرتے تھے۔ اُمرا جو رات کو ملاحظہ کرتے تھے اُن کو پہلے سے مقرر کیا جاتا تھا اور پھر یاددہانی بھی کرائی جاتی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری بھول نہ جائیں اور ہماری فوج میں جو ڈیوٹی افسر یا ڈیوٹی جے سی او اور اوپر والی سطح پر پوری چھاؤنی کے لیے ملاحظہ والے افسر مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ کام اہل یورپ نے مسلمانوں سے سیکھا۔

بہرحال اس رات حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کسی کو یاددہانی کرانا مناسب نہ سمجھا اور حضور پاک ﷺ کے چیدہ چیدہ صحابہ جو آپ کے نزدیک تھے اُن کو لے کر آپ خود ڈیوٹی افسر بن گئے۔ ایک طرف مجاہدین کو دیکھتے گئے کہ وہ چوکنے ہیں یا نہیں اور ساتھ ہی حوصلہ افزائی اور دلجوئی بھی کرتے گئے۔ لیکن آپ حیران ہو گئے کہ آگے حضرت زبیر[1] بن عوام گھوڑے پر سوار اپنے آپ بالکل ایسی ہی کاروائی کر رہے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ اکیلے نہ تھے دوسرے گھوڑے پر آپ رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ سوار تھیں۔ اور اسلام کے ان دونوں عظیم خاوند اور بیوی نے ایک نئی روایت قائم کی تھی کہ جب مجاہدین تھک گئے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت اسلام کی ایک عظیم دخترنے کی۔ دونوں نے ساری رات جاگ کر گزاری اور مجاہدین کی دلجوئی کرتے رہے۔

پانچواں دن

جنگ کے پانچویں دن طرفین نے صف آرائی ضرور کی۔ مسلمان مجاہدین بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے اور وہ ابھی تک کسی جوابی یا جارحانہ کاروائی کے بارے میں کچھ زیادہ نہ سوچ سکے، لیکن مسلمانوں کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ

(۱) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام حضور پاک ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، اور اُن کی یہ اہلیہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، جو ذوالنطاقین کی کنیت سے مشہور ہیں۔ جلالِ مصطفےٰ کے صفحہ ۵۳، ۸۱، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۲۳۱ اور ۲۶۲، ۳ پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے۔

رومیوں نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ دو تین گھنٹے مسلمان انتظار کرتے رہے کہ شاید رومی کوئی حیران کن کاروائی کریں، یا بھرپور حملہ کر کے زندگی اور موت میں سے ایک چیز کو حاصل کر لیں۔ اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ رومی زندہ تھے۔ لیکن کسی محاذ سے رومیوں کی کوئی حرکت نظر نہ آئی، ہاں دو تین گھنٹے کے بعد ایک آدمی آگے نکلا اور امن کے سمجھوتے کی پیشکش کی کہ لڑائی سے کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اس لیے بہتر ہے کہ امن کا کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تو بات چیت کے لیے تیار تھے لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کیا جائے۔ یہ تبصرے صحیح نہیں معلوم ہوتے اور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بڑے امن پسند تھے، اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بڑے جنگجو تھے۔ بات سیدھی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء بڑے جنگجو بھی تھے اور بڑے امن پسند بھی تھے کہ امن طاقت سے قائم ہو سکتا ہے۔ اب جب اہل روم جنگ ہار چکے تھے، تو اُن کے ساتھ کیا سمجھوتہ کیا جاتا؟ اہل اسلام پر ظاہر ہو چکا تھا کہ رومی اب کوئی جارحانہ کاروائی کرنے کے قابل نہ تھے۔ لیکن اُس وقت تک بھی رومیوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی کہ چالیس ہزار تو صرف گھڑسوار تھے۔ اور باقی اسی ہزار یا ایک لاکھ فوج سے کم از کم آدھے تو لڑنے کی سکت رکھتے ہوں گے۔ رومی ایک چال کا سوچ رہے تھے کہ موسم اور زمین دونوں نے اُن کا ساتھ نہ دیا تھا اور اُن کی طاقت ویسے جواب دے گئی تھی کہ بنیان المرصوص کے ساتھ چار دن ٹکرا کر وہ اپنا سر ہی پھوڑتے رہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح میدانِ جنگ سے فرار اختیار کر کے کسی اور مقام پر مسلمانوں کے ساتھ اپنی چنی ہوئی زمین اور موسم میں ٹکر لینے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اس میں بھی مسلمانوں کی فتح تھی، لیکن ادھوری فتح۔ مسلمان رومی لشکر کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اُن کو اس میدانِ جنگ میں برباد کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے خواہ کتنی تھکاوٹ کیوں نہ ہو، اب مسلمانوں کو دشمن کی فوجی قوت برباد کرنے میں دیر نہ لگانا چاہیے تھی۔

چھٹا دن

چنانچہ امین الامت رضی اللہ عنہ اور لشکر کے سالار نے اگلے دن کے لیے جو تجویز مرتب کی اُس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا کہ تمام محاذ پر رومی فوجوں کو ایک ہی دن میں ختم کیا جائے گا۔ اور اُن کے بھاگ کر جانے والے راستے کی ناکہ بندی رات کو ہی کر دی جائے گی۔ حملہ دائیں بازو سے کیا جائے گا اور اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے سارے دشمن کو ختم کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ زمین کے مطالعہ میں ہم کہہ آئے ہیں کہ دایاں بازو محدود پھیلاؤ دیتا تھا اور گو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا لشکر جس نے حملہ کی ابتدا کرنی تھی وہ پچھلے چار پانچ دن لگاتار سخت دباؤ کے نیچے کام کرتا رہا۔ لیکن اس محاذ پر رومیوں کی بھی ایسی گت بنائی گئی تھی کہ قناطیر اور باہان کے لشکر بھی ادھ موئے ہو چکے تھے۔ رومی فوج کی تعداد کافی تھی۔ سامنے سے کوئی کاروائی کوئی فائدہ نہ دیتی کہ رومی تیراندازوں نے جنگ کے چوتھے دن مسلمانوں کو جو نقصان

پہنچایا تھا وہ سبق آموز تھا۔

اس جارحانہ کاروائی کے لیے تمام گھڑ سوار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متحرک دستوں میں آکر شامل ہو گئے کوشش یہ کرنا تھی کہ رومی رسالے کو جنگ میں اُلجھا کر ناکارہ کر دیا جائے یا اُن کی ہمت توڑ دی جائے تا کہ دشمن جوابی جارحانہ کاروائی یا مقامی طور پر بھی جوابی حملہ کرنے کے قابل نہ رہ جائے۔ رومی رسالے والے تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ لیکن چند عرب غسانی شہسواروں کو چھوڑ کر باقی رومی رسالہ میں بہت بھاری بھر کم قسم کے سوار تھے۔ اوّل تو رومی گھوڑے، عرب گھوڑوں کی طرح ہلکے پھلکے نہ تھے۔ دوم رومی شہسوار بھاری بدن تھے اور گھوڑوں پر بوجھ زیادہ ہوتا تھا۔ سوم ہر رومی سوار کی ضروریات زندگی اور ہتھیار زیادہ ہوتے تھے، اور وہ سب گھوڑے پر لادے ہوتے تھے۔ مسلمان سوار صحرائی عقابوں کی طرح جھپٹ پلٹ کر متحرکانہ طریقے سے حملے کرتے تھے اور وہ رومی سواروں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔

رومیوں کی ناکہ بندی

سپہ سالار اعظم اپنی کامیابی کے لیے بالکل پُر امید تھے اور رومیوں کی ناکہ بندی کے لیے انہوں نے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو پانچ سو سواروں کے ساتھ وادی رقاۃ میں بھیج دیا تھا تا کہ رومیوں کی پسپائی کی صورت میں وہ مناسب کاروائی کریں۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ پل بنت یعقوب کے عقب میں جا کر چھپ گئے۔

تبصرہ

یہاں پر کچھ تبصرہ اور موازنہ ضروری ہے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ اتنی بڑی فوج کی پسپائی کی ناکہ بندی صرف پانچ سو شہسواروں سے کی گئی۔ یہ ایک اصول ہے کہ پسپائی کے راستوں کی ناکہ بندی جتنی کم نفری سے کی جائے اتنی ہی بہتر ہوتی ہے۔ اگر زیادہ نفری سے پسپائی والوں کا گھیرا ڈالنے کی کوشش کی جائے تو اپنا بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ پسپائی کے راستے مسدود کرنے کی کاروائی بڑی مہنگی بھی پڑ سکتی ہے اور یہ ایک مشکل قسم کی حربی چال ہوتی ہے۔ صحیح مقام کو چننا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ مقام کو چننے کے بعد اُس مقام پر دستوں کی تعیناتی کا کام اور مشکل ہو جاتا ہے اور تعیناتی کے بعد دستوں سے کام لینا اور کاروائی کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اور بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

گریگوری کی مبارزت

بہر حال چھٹے دن صبح سویرے جب مسلمان جوابی حملہ کے لیے کمر بستہ ہو رہے تھے تو رومی فوج کے دائیں بازو کے لشکر کا کمانڈر گریگوری آگے نکلا اور اونچی آواز میں پکار اُٹھا لڑائی کا فیصلہ نہیں ہو رہا کہ میں مسلمانوں کے سپہ سالار کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے اور اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے گریگوری کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ بہادر آدمی اور

دنیا کا مانا ہوا شہسوار تھا۔ تیغ زنی کا ماہر اور لڑاکا تھا۔ رومیوں کی چال یہ تھی کہ اس طرح مسلمانوں کے سپہ سالار کو اگر وہ ختم کر سکے تو اُن کے اپنے لشکر کے حوصلے قائم ہو جائیں گے اور مسلمانوں پر اس کا بھیانک اثر پڑے گا جس کے بعد وہ ضرور کسی صلح کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو اس کامیابی کے بعد وہ اعلان کر کے اپنے لشکر کو پسپا کر لیں گے اور بعد میں لڑائی لڑیں گے۔ دراصل رومی موسم کی وجہ سے بھی بڑے تنگ تھے۔ اور اُن کی یہ بھی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا مقابلہ کسی سرد علاقے میں ہوتا تو بہتر تھا۔

گریگوری کا یہ اعلان سن کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا علَم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور فرمایا کہ اگر وہ شہید ہو جائیں تو خلیفۂ دوم کے نئے احکام آنے تک حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی سپہ سالار رہیں گے اور پھر وہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کی طرف چل پڑے۔

تبصرہ

یہاں پر چند نکتوں کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ اوّل اُن مورخین اور مبصرین پر ہنسی آتی ہے کہ ساری جنگ کے دوران اُن کا قلم یہی لکھتا رہا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی عملی طور پر سپہ سالار تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اُن کے ماتحت کام کر رہے تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو صرف درمیان والے لشکر کا کمانڈر ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ سب یہاں آکر واقعات کی حقیقت کے تحت اپنی غلطی کو بھول جاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے وقتی طور پر کمانڈ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سونپ دی۔ ظاہر ہے کہ یہ لفاظی والے لوگ ''وقتی'' لوگ ہوتے ہیں اور اُن کو یاد نہیں رہتا کہ پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہی مبصرین میں سے ایک لکھتا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذاتی مبارزت کے سلسلے میں اہل لشکر کو شکوک تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اُن سے گزارش بھی کی کہ اُن کو آگے جانے کی اجازت دی جائے۔ ہم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی آگے جانے کی اجازت والی بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کئی اور مجاہد بھی ایسے موقع پر جانا چاہتے ہوں گے لیکن اہل لشکر کے شکوک والی بات بیچ میں لا کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سوم جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی کامیابی کا ذکر بیان کرتے ہیں تو اپنے قلم کے اُتار چڑھاؤ سے قارئین کو لطف اندوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چہارم: یہاں پر یہ پہلو بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ اپنا نائب سالار سمجھا اور ہر خطرے کے وقت حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی اپنی جگہ منتخب کیا کرتے تھے۔ کیا وہ یہ سب کچھ خلیفۂ دوم سے پردہ پوشی کے طور پر کر رہے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں! ایسی کوئی بات نہ تھی۔ خلیفۂ دوم بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مقام کو سمجھتے تھے اور اُن کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی ناراضگی نہ تھی اور نہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو خلیفہ دوم

کے ساتھ کوئی رنجش تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں کو خیال ہو گیا ہے کہ سب فتوحات حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ بن حارث رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ دونوں کو سپہ سالاری سے ہٹا لیا جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فتوحات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو شہادت مل گئی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو صرف ایک درجہ نیچے لایا گیا۔

گریگوری اور حضرت امین الامت کا آمنا سامنا

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان کو سب اہل لشکر خوب سمجھتے تھے کہ وہ امین الامت ہیں۔ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی ذاتی بہادری، شہسواری، تیغ زنی، اور حربی خوبیاں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ جیسے ہی دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ تیغ زنی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقابلہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں شہسوار وار کرنے، بچاؤ کرنے، تلوار کے استعمال اور ہاتھوں کی حرکت کے ماہر تھے۔ دونوں لشکر محو حیرت تھے اور اُن کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کون برتر ہے اور کون اپنی برتری سے دوسرے کو نیچا دکھا سکے گا کہ اتنے میں گریگوری نے بچاؤ کرتے ہوئے اپنے گھوڑے کو سرپٹ اپنی فوج کی طرف دوڑا دیا۔ مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کی کہ دشمن ہار گیا۔ لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اس کا کام تمام کرنے پر تلے ہوئے تھے، اور اُس پر نظر رکھے ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔

گریگوری کا قتل

کوئی سو قدم جانے کے بعد گریگوری نے جان بوجھ کر اپنی رفتار ایسی مدہم کر دی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اُس کے نزدیک پہنچ گئے، تو وہ اچانک ایسا رُکا کہ اگر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بجائے اگر کوئی اور ہوتا اپنا توازن کھو بیٹھتا، اور اسی حساب سے گریگوری نے اپنی تلوار کا سخت وار کر دیا۔ یہ دھوکا تھا، اس کو داؤ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ دغابازی کے تحت نہیں آتا۔ بہر حال جنگ میں ایسے دھوکے یا داؤ بڑے نتیجے کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن امین الامت کا دل اللہ تعالیٰ کے نور سے منور تھا۔ انہوں نے اپنی روشن ضمیری پر پردے ڈالے ہوئے تھے جیسے ہی گریگوری نے رُک کر تلوار کا وار کیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ مسکرائے اور اپنی تلوار کے معمولی اشارے سے اس کی تلوار کا رُخ دوسری طرف کر دیا اور جلدی سے اپنی تلوار کے ساتھ گریگوری پر ایسا وار کیا کہ اس کا سر اُس کے دھڑ سے جدا ہو کر زمین پر گر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گریگوری کا دھڑ بھی گھوڑے سے نیچے لڑھک گیا۔ گریگوری نے سر پر جو ٹوپی پہنی ہوئی تھی اس کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی اور یہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آتی تھی لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے اس طرف نگاہ بھی نہ کی۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑے کو واپس موڑ کر اپنے لشکر کی طرف چل پڑے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتظار تھا اور اُن کے اپنے مقام پر واپس آ جانے کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مرحبا کی صدا دی اور پھر اپنے متحرک دستوں میں پہنچ گئے۔

چالیس ہزار کا یہ لشکر ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اب رومی لشکر اس کے آگے کیسے ٹھہر سکتا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے سب اُمراء سے تیاری کے اشارے کو دیکھ کر اللہ اکبر کی صدا اس طرح دی کہ پورے چالیس ہزار مجاہدین کے نعرۂ تکبیر سے وادی یرموک گونج اُٹھی۔ اہل روم ہر طرف دھیاں دیئے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے محاذ پر مجاہدین آگے بڑھ رہے ہیں رومی کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دستوں نے اُس رومی رسالے پر دائیں بازو سے حملہ کر دیا جو قناطیر کے پیچھے کھڑا کسی جوابی کاروائی کی تیاری کر رہا تھا۔ مسلمان شہسوار پچھلے چار پانچ دن سے دفاعی اور محدود جارحانہ لڑائی لڑ رہے تھے۔ انہوں نے نہ صرف قناطیر کے عقب والے رسالہ کو تہس نہس کر دیا بلکہ قناطیر کے لشکر کے عقب میں پیدل صفوں کو بھی لتاڑ کر رکھ دیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس انتظار میں تھے۔ انہوں نے محدود محاذ پر آگے بڑھ کر قناطیر کے لشکر کے بچے کھچے آدمیوں کو روند ڈالا۔ یہ ساری کاروائی بجلی کی تیزی کی طرح کی گئی۔ یہ تمام کاروائی ایک آدھ گھنٹہ میں ہوگئی اور اس سے پہلے کہ رومی کچھ سمجھتے قناطیر کا لشکر ختم ہو چکا تھا۔ یعنی اب وہ جنگ میں شرکت کرنے کے قابل نہ تھے۔ کچھ تو زخموں کو چاٹ رہے تھے اور کچھ میدان میں کراہ رہے تھے، ایک آدھ آدمی جو زندہ بچا اُس نے آرمینیا والوں کے لشکر میں پناہ لی اور کچھ لوگوں نے میدانِ جنگ کو خیر باد کہہ دیا اور وہ بالکل عقب میں نکل گئے۔

رومی رسالے کا جوابی حملہ

باہان نزدیک تھا۔ اُس نے تمام رسالے والوں کو حکم دیا کہ اپنے لشکر کو چھوڑ کر آرمینیا والوں کے لشکر کے پیچھے پہنچ جائیں۔ اور اسلامی رسالے اور متحرک دستوں کو روکیں۔ اُس نے رسالہ کی کمانڈ خود سنبھال لی اور جو اسلامی آرمینیا کے لشکر کے عقب میں تھا اُس کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی یہی کچھ چاہتے تھے، بلکہ باہان نے اُن کی خواہش سے کچھ بڑھ کر کیا۔ باہان کے لیے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ آرمینیا والے لشکر کے رسالہ کو بھی قرین کے لشکر کے پیچھے لے جاتا اور وہاں پر بچے ہوئے تینوں رسالے کے دستوں سے مل کر مسلمانوں پر جوابی حملہ کرتا۔ لیکن اُس نے جلد بازی میں جو کچھ مل سکا اُس کے ساتھ مسلمانوں کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی۔ نقشہ دہم الف کے دوسرے مرحلہ کی کاروائی سے دونوں رسالوں کے ٹکرانے کی بات سمجھ آ جائے گی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی خواہش یہ تھی کہ اہلِ روم کی پیدل فوج اور رسالہ کو الگ الگ کر دیا جائے اور یہ مدعا پورا ہو گیا۔ چنانچہ باہان کے رسالہ والے جیسے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متحرک دستوں کے سامنے آئے تو اہل روم کو صحرائی گھوڑوں کے مسلمان شہسواروں نے جنگ کے وہ تماشے دکھائے کہ

رومی رسالہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

مسلمان شہسوار کھلے میدان میں ہلکے پھلکے عربی نسل کے گھوڑوں کی شہسواری اور گھوڑوں کی پیٹھ پر لڑائی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ گو رومی رسالے والے تعداد میں زیادہ تھے، لیکن وہ منتشر گروہوں میں میدان جنگ میں آئے، انہوں نے لڑائی کے میدان میں کچھ بہادری ضرور دکھائی، لیکن اوّل تو وہ لوگ ردِعمل کے طور پر آگے آئے تھے۔ دوم تینوں حصوں میں کوئی ربط نہ تھا۔ وہ بے ترتیبی سے لڑ رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متحرک دستے ربط وضبط کے ساتھ تجویز کے مطابق باری باری ایک ریلے کی طرح دستوں کو بڑھاتے تھے اور ہر ریلے کے یہ سوار جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرتے ہوئے رومی رسالے کی صفوں کو چیر کر رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ رومیوں کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ ان کا رسالہ، مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور بعض سواروں نے فرار اختیار کرنا شروع کر دیا۔

رومی رسالہ کی شکست

جنگ یرموک کے چھٹے دن کی یہ کاروائی بڑی اہم ہے کہ تقریباً تیس ہزار نفری کا رومی رسالہ ہاتھوں ہاتھ کی جنگ میں متحرک مسلمانوں کے رسالے سے شکست کھا گیا جن کی نفری آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس میں چند نکتے ہیں۔ اوّل: مسلمان جنگ کے سلیقے یا فن میں رومیوں سے بہتر تھے۔ دوم: مسلمانوں کا جذبہ بہت اعلیٰ وارفع تھا۔ سوم: وہ ربط کے ساتھ اپنے امیر کی تجویز کے تحت اپنے چھوٹے امیروں کے ماتحت لڑائی لڑ رہے تھے اور اہل روم بے ترتیبی سے ردِعمل کے طور پر جنگ لڑ رہے تھے۔ بے ترتیبی میدانِ جنگ میں ساتھ نہیں دیتی۔ اس لیے اہل روم میدانِ جنگ چھوڑ کر شمال کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو رہے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ باہان جو اپنے آرمینیا کے لشکر کو چھوڑ چکا تھا۔ وہ بھی رسالے والوں کے ساتھ میدانِ جنگ سے فرار ہو رہا تھا۔ اب وہ باقی تین لشکروں کے پیدل دستوں کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔

جنگ کی فیصلہ کن گھڑی

یہ جنگ کی فیصلہ کن گھڑی تھی۔ اور جنگ کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ دراصل اسلامی لشکر کے سالاروں کے حساب سے تو یہ جنگ کا فیصلہ اُن کے مطابق ایک دن پہلے ہو چکا تھا کہ انہوں نے رات کو اپنے دستے رومیوں کی ناکہ بندی کے لیے بھیج دیے تھے، لیکن ابھی سورج دوپہر تک نہ پہنچا تھا۔ ایک طرف گریگوری مارا جا چکا تھا۔ باہان رسالے والوں کے ساتھ مل کر میدانِ جنگ سے فرار اختیار کر رہا تھا۔ دیرجان پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ قناطیر کا لشکر تہس نہس ہو چکا تھا۔ لیکن رومیوں کے تین لشکر ابھی تک باقی تھے اور دیرجان کی جگہ نیا کمانڈر قرین اس وقت تک میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ اور

تینوں لشکروں کی تعداد مسلمانوں کے لشکر سے دوگنا تھی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا آرمینیا کے لشکر پر حملہ

اب سوال یہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ دشمن کے رسالے کا پیچھا کرتے یا پہلے باقی ماندہ پیدل فوج پر حملہ کر کے پیدل فوج کو تہس نہس کرتے۔ یہ بڑا مشکل فیصلہ تھا۔ تعاقب کے جو ثمرات جلدی میں حاصل ہوتے ہیں وہ بعد میں حاصل نہیں ہوتے۔ لیکن پسپائی صرف رسالے والے کر رہے تھے۔ صرف رسالے کے تعاقب سے فائدے کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رسالے والوں کا محدود تعاقب کیا کہ اُن کو میدانِ جنگ سے بھگا دیا اور خود آرمینیا کے لشکر کے عقب پر حملہ کر دیا۔

ادھر حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ جو اسی انتظار میں تھے، انہوں نے سامنے سے آرمینیا والوں پر حملہ کر دیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی قناطیر کے لشکر کو روندتے ہوئے اب آرمینیا والوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی دوران حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لشکروں نے اپنے سامنے پیش قدمی شروع کر دی۔ اس لیے قرین اور مرے ہوئے گریگوری کا لشکر آرمینیا والوں کی کوئی مدد نہ کر سکا ہر طرف سے شدید حملوں کی وجہ سے آرمینیا والوں کی ہمت بھی جواب دے گئی، اور پھر وہ شمال کی طرف تو بھاگ نہ سکتے تھے کہ اُدھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متحرک دستے تھے اس لیے آرمینیا والوں نے مغرب کا رُخ اختیار کیا کہ دریا کو پل سے عبور کر کے وہ وادی رقاۃ والے راستے سے فرار ہو جائیں۔

تبصرہ

باہان بڑی غلطی کر چکا تھا۔ اور رسالے کی کمانڈ خود سنبھال کر اُس نے اپنے آپ کو رسالے کے ساتھ باندھ دیا اب رومی فوج کسی سپہ سالار کے بغیر لڑ رہی تھی۔ اگر باہان کچھ متحرک دستے اپنے پاس رکھتا اور خود لشکروں کی کمانڈ آخری وقت تک کرتا تو شاید حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ میدانِ جنگ کے بڑے کمانڈر کو اپنے آپ کو مکمل طور پر متحرک دستوں کے ساتھ وابستہ نہیں کر دینا چاہیے۔ متحرک دستوں کے جب قدم اُکھڑ جائیں تو وہ بھاگتے بھی اتنا تیزی سے ہیں جتنا تیز وہ حملہ کرتے ہیں۔ باہان اگر گھوڑے پر سوار رہ کر بھی پیدل دستوں کے ساتھ رہتا تو رومی رسالے والے اتنی تیزی کے ساتھ نہ بھاگتے۔ اور دوم پیدل دستے اس افراتفری سے فرار اختیار نہ کرتے۔ اور یہ اصول ہمیشہ یاد رہے۔ یہ آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا اُس زمانے میں تھا۔

دوپہر کے وقت جنگ کا رنگ

چھٹے دن دوپہر کے وقت جنگ کا رنگ یہ تھا کہ قناطیر اور آرمینیا کے لشکر تہس نہس ہو چکے تھے اور مغرب کی

طرف بھاگ رہے تھے۔ رسالہ شمال کی طرف بھاگ گیا۔ اب صرف قرین اور گریگوری کے لشکر باقی تھے اور ویسے تو ان دونوں لشکروں کی ملی جلی تعداد اب بھی مسلمانوں کے لشکر سے زیادہ تھی۔ میدانِ جنگ میں جب آدھے سے زیادہ لشکر کے قدم اُکھڑ چکے تھے تو یہ دو لشکر بھی نہ ٹھہر سکے۔ اور ابھی تک حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متحرک دستوں نے ان کی پچھلی طرف حملہ نہ کیا تھا۔ لیکن ان لشکروں کی پچھلی صفوں نے خود بخود میدانِ جنگ کو چھوڑ کر مغرب یا شمال مغرب پل بنت یعقوب کی طرف فرار شروع کر دیا۔

کچھ مبصرین کا خیال تھا کہ دونوں لشکر کس ترتیب کے ساتھ پسپائی کر رہے تھے اور شاید ایسا ہو لیکن ہمارا تجزیہ ہے کہ ان حالات میں کوئی ترتیب قائم رکھنی بڑی مشکل بات ہے۔ آگے والی صفوں پر تو مسلمان حملے کر رہے تھے اور پیچھے سے لوگوں نے ''کڑکوں''[1] والا کام شروع کر دیا تھا۔ اور اب پیچھے والے فاصلہ لے کر بھاگ رہے تھے۔ سامنے سے البتہ گریگوری کی پابہ زنجیر فوج بری طرح پٹ گئی۔ گو اُن کی زنجیریں لچکدار تھیں لیکن زنجیریں کھولنے کا کام ہر جوان نہ کر سکتا تھا کہ زنجیر کھول کر بھاگ جائے۔ جس کمانڈر کو تالا کھولنا ہوتا تھا۔ وہ خود شاید اپنے آپ کو بیچ سے نکال کر ویسے ہی بھاگ گیا اور گریگوری کے لشکر والے اس طرح بھاگ رہے تھے جس طرح بچے ایک دوسرے کے ساتھ ٹانگیں باندھ کر دوڑنے کا مقابلہ کرتے ہیں چنانچہ مسلمان مجاہد اُن پر پے در پے آسانی سے حملے/وار کر سکتے تھے۔

رومی پیدل فوج کا حشر

یرموک کے میدانِ جنگ میں ڈیڑھ لاکھ رومی فوج سے تقریباً چالیس ہزار آدمی کھیت رہے ہوں گے اور تیس ہزار کے قریب رسالہ جنگ سے فرار اختیار کر چکا تھا۔ باقی تقریباً اسی ہزار رومی تقریباً چالیس ہزار مجاہدین کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ رومی پیدل فوج جو فرار اختیار کر رہی تھی اُس کا رُخ بھی پل بنت یعقوب کی طرف تھا۔ یہ سب کچھ دوپہر تک ہو چکا تھا، کیونکہ جیسے ہی ظہر کا وقت ہوا۔ مسلمانوں نے جنگ کا پانچویں مرحلہ شروع کر دیا اور اس کی بسم اللہ اس طرح کی جا رہی تھی کہ رومی پیدل فوج اپنے فرار کے لیے رسالے والا راستہ نہ استعمال کرے۔ پھر جیسے رومیوں کے پہلے دستے نے پل کو پار کیا اور پل سے چند قدم نیچے وادی میں گئے تو حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کے دستوں نے اُن کو تہِ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ یعنی یہاں پر آسمان سے گرے اور کھجور میں اَٹکے والی بات ہو گئی۔

پہلے تو رومیوں کو بات کچھ سمجھ نہ آئی۔ کچھ دستے تو تہِ تیغ ہو گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد رومیوں نے دیکھا کہ پل کو پار کرنے والے سیدھے راستے پر جانے کی بجائے دائیں بائیں بھاگ رہے ہیں یا پل سے واپس آنے کی کوشش کر

(۱) بھارتی جاٹ رجمنٹ کا لنگر پر کھانا کھانے کے لیے جانے کے لیے لفظ جس کے معنی جنگ سے بھاگنا بھی ہے۔

رہے ہیں اور پل کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ یہ دھکا پیل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پہلے گزارش کردی گئی تھی کہ ناکہ بندی محدود علاقے میں ایسے مقام پر ہونی چاہیے جس کا کچھ فائدہ اُٹھایا جا سکے اور وہاں پر تھوڑی نفری ہی کام آتی ہے۔ جس نے رومیوں کو بھاگنے سے روک دیا اور اب اسلامی لشکر جو پیچھے سے رومیوں کا تعاقب کر رہے تھے انہوں نے رومیوں کو تہِ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کے پانچ سو مجاہدین ناکہ بندی کے لیے بہت کافی تھے۔

رومیوں کے لیے اب یہ طریقہ کار باقی رہ گیا تھا کہ پل کی بجائے انہوں نے دریا کے بیچ میں جہاں جگہ ملتی وہاں پر چھلانگ لگانا تھی لیکن جگہ کہاں تھی۔ دریا کے کنارے کھڑے تھے۔ اور دریا میں پانی تھا یہ ایک ایسی گھڑی تھی جس کی تفصیل میں کوئی مورخ نہیں گیا۔ نقشہ یازدھم حالات کی کچھ نشاندہی کرتا ہے کہ رومی پل بنت یعقوب کے نزدیک ایک جمگھٹ کی صورت میں ریوڑ کے گلہ کی طرح تھے، اور ایک ایک دو دو کر کے رومی جس جگہ سے بھی فرار اختیار کر سکتے اُنہوں نے کیا۔ سورج کے غروب ہونے تک مزید تیس یا چالیس ہزار رومی مردہ حالت میں پل بنت یعقوب کے علاقے میں باقی رہ گئے، اور باقی جا چکے تھے۔ باقی کہاں گئے اور کیا صورت اختیار کی یہ جاننا کسی رومی کے بس کی بات نہ تھی کہ دراصل جس کسی کا جدھر منہ آیا وہ اُدھر چل دیا۔ لڑائی کے چھٹے دن جب سورج غروب ہوا تو یرموک کا میدانِ جنگ رومیوں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ مسلمان مجاہدین وادی رقاۃ تک پہنچ گئے تھے، لیکن وہ بھی تھک کر چور ہو چکے تھے۔ تعاقب کا وقت گزر چکا تھا اور کس کا تعاقب کرتے؟ تتر بتر فوج اور اکیلے جوانوں کے فوری تعاقب سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے مسلمان مجاہدین رات کو جہاں تھے، وہیں لیٹ گئے۔

ساتواں دن

حضرت خالد رضی اللہ عنہ البتہ تعاقب کے بارے میں سوچ چکے تھے اور ساتویں دن صبح سویرے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن کو تعاقب کی اجازت دے دی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے طریقوں کے مطابق تعاقب کو مسلمان بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اور یہاں علاقہ بھی میدانی تھا۔ لیکن یہ تو معلوم نہ تھا کہ دشمن نے آگے سے کیا ترتیب اختیار کی ہو گی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ باہان رسالے کے ساتھ چھٹے دن دوپہر سے پہلے ہی میدانِ جنگ سے فرار اختیار کر چکا تھا، پہلے تو وہ لوگ خوب بھاگے، لیکن چند میل جانے کے بعد باہان رُک گیا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ اُس کے لشکر کے ابھی ستر اسی ہزار لوگ ضرور زندہ ہوں گے اس لیے وہ اُن کا انتظار کرنے لگا کہ وہ کیسے اور کس حالت میں اُس کے پاس پہنچتے ہیں اور اسی حالت میں اُس کو شام پڑ گئی اور اس نے پڑاؤ کر لیا۔ رات کے وقت پیدل فوج کے بھگوڑے اُس کے پاس پہنچے اور اس کو حالات سے کچھ آگاہ کیا۔ بہر حال ایسے بھگوڑے لوگ حالات کو کبھی صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ ہر ایک اپنی رام کہانی بیان کرتا ہے۔ ایک تو اسے میدانِ جنگ چھوڑنے کا جواز پیش کرنا ہے۔ دوسرا وہ کچھ عجیب تذبذب میں ہوتا

ہے کہ باقی لوگ مر گئے اور وہ کیسے بچ گیا حالانکہ ایسے حالات میں تقدیر بچا کر لے آتی ہے۔ لیکن لوگ اپنی کہانی میں اپنی بہادری اور دشمن کے حملوں کی سختی کو ضرور لے آتے ہیں۔

باہان کا خاتمہ

باہان کو جب اس قسم کی خبریں ملیں تو اس کو معاملات کچھ سمجھ نہ آئے اس لیے صبح سویرے اس نے اپنے پڑاؤ سے کوچ ضرور کیا۔ لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ بار بار پیچھے دیکھتا تھا کہ کوئی اور بچے کھچے لوگ آ کر اس کے لشکر میں شامل ہو جائیں یا حالات اور واضح ہو جائیں۔ وہ خود بھی تو بھگوڑا تھا۔ اپنے جواز کی تلاش میں اس کو اپنے جیسے کافی ساتھیوں کا انتظار تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دستے تیزی سے بڑھ رہے تھے اور جہاں باہان کا لشکر اُن کو نظر آیا، وہاں سے ایک چھوٹا راستہ اختیار کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے رسالے رومیوں کو عقب میں جا لیا۔ باہان اب فکر مند ہوا اور اپنی عقبی فوج کو ترتیب دے کر مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی۔ کہ اس طرح وہ چاہتا تھا کہ عقب میں کچھ دستے یلغار کو روکیں اور باقی لشکر دور نکل کر پھر راستہ میں ایک دستہ چھوڑیں جس کی مدد سے پسپائی جاری رکھی جائے، یعنی وہ اپنی پسپائی کو ترتیب دینا چاہتا تھا کہ باری باری رکاوٹیں پیدا کر کے پسپائی جاری رکھی جائے۔ لیکن قسمت نے یاوری نہ کی۔ باہان ایک مسلمان شہسوار کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اس طرح رومی سپہ سالار کے قتل کے بعد رومی بھاری بھرکم رسالے کی تیز اور پھرتیلے اسلامی رسالے نے جو گت بنائی وہ ظاہر ہے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر مسلمان مجاہدوں نے بھاگتے رومی سواروں کو نشانہ بنایا اور اکثر رومی گھوڑے بغیر سواروں کے دمشق پہنچے۔ لیکن زیادہ تر گھوڑے سوار کے مرنے کے بعد رُک جاتے تھے اور تعاقب ختم کرنے کے بعد مسلمان مجاہد اِن گھوڑوں کو ہانک کر واپس لے گئے۔ مرنے والے رومی سواروں کی لاشیں راستے میں بکھری پڑی تھیں۔

ایک مبصر کے مطابق حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رومی رسالہ والوں کا دمشق تک تعاقب کیا۔ جہاں لوگوں نے اُن کو خوش آمدید کہا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تسلی دی کہ مسلمان جلدی اُن کی حفاظت کے لیے پہنچ جائیں گے اور دوسرے دن واپس آ کر اپنے لشکر میں مل گئے۔ دمشق یرموک سے پینسٹھ میل دور ہے۔ اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ دمشق تک گئے تو جاتے ہوئے دو دن لگے ہوں گے۔ اور دو دن واپسی پر۔ لیکن خیال ہے کہ تعاقب صرف ایک دن ہوا ہو گا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُس وقت دمشق تک نہ گئے ہوں گے۔ اکثر پرانے مورخین اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ بہر حال کچھ لوگ اپنی تحریروں کی لفاظی میں رنگ بھرنے کے لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے نام کو استعمال کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کو ''اندھی عقیدت'' کی وجہ سے مسلمانوں کی ہر جنگ اور ہر کاروائی میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی نظر آتے ہیں۔ اور شاید یہی

وجہ تھی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنے مقام پر رکھا کہ لوگ اُن کی پرستش نہ شروع کر دیں۔ کہ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ سب فتوحات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور انسان عاجز ہے، اس سلسلے میں ہم سلسلہ اول میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بیان کو اُس حصہ کے چھبیسویں باب میں واضح کر چکے ہیں کہ انسان عاجز ہے۔ بے شک ہم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے قدموں کی خاک ہیں اور اُن کی فتوحات اور دین اسلام کی خدمات کے بیان کے سلسلے میں اپنے قلم کو عاجز پاتے ہیں۔

لیکن اسلام کے عظیم فرزندوں میں ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے۔ ہمارے لحاظ سے جنگِ یرموک کی فتح کا شرف مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت امین الامت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کو ملتا ہے، یہ اللہ کی دین ہے۔ جنگ یرموک سے چھ ماہ پہلے ایک ایسا شرف عشرہ مبشرہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص قادسیہ کے مقام پر حاصل کر چکے تھے کہ ایران کی بادشاہت کے پرخچے اُڑ گئے۔ آج یہ شرف عشرہ مبشرہ سے حضرت امیر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن جراح کو حاصل ہوا۔ کہ یرموک کے مقام پر رومی سلطنت کے بلادِ شام میں پرخچے اُڑا دیئے گئے، اور یہ دونوں شرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو حاصل ہونے تھے کہ اُن کے رفیق، مسلمانوں کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار حضرت عبداللہ بن ابوقحافہ رضی اللہ عنہ جس حکمت عملی کو متعین فرما گئے اُس کو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پروان چڑھایا۔ یہ سب اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتیں ہیں:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اُجالا کر دے

(اقبالؔ)

دنیا کی عظیم ترین فیصلہ کن جنگ

جنگ یرموک دنیا کی عظیم ترین فیصلہ کن جنگ ہے۔ عقلی پیمانوں سے ناپتے ہوئے جنگ یرموک کے ساتھ تاریخ میں بہت کم جنگوں کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی فیصلہ کن کوئی جنگ نظر نہیں آتی جس کے تاریخ پر اتنے اثرات ہوں بلکہ چودہ سو سال سے اس جنگ کے اثرات جاری و ساری ہیں اور حق و باطل کی ٹکر انہی مقامات پر ہو رہی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے لکھا تھا کہ اگر اس جنگ کو پہلی صلیبی جنگ کا نام بھی دے دیں تو کوئی ہرج نہیں کہ اتنے صلیبی جھنڈے نہ اس سے پہلے کسی جنگ میں اُٹھائے گئے اور نہ بعد میں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے جھنڈے کسی جنگ میں کبھی بھی اس طرح سرنگوں نہ ہوئے۔

حکمت عملی اور تدبیرات کے لحاظ سے بھی طرفین نے ہر سطح پر کوئی کسر نہ چھوڑی۔ واقعات کے بعد کمانڈروں کی غلطیاں نکالنا بڑا آسان ہوتا ہے، اور کلاسوٹز کہتا ہے کہ ہر کاروائی کے بعد نقادوں کے لیے طرفین کی کارکردگی میں

سے کیڑے نکالنے آسان ہوتے ہیں۔لیکن ایسے کیڑے نکالنے والوں نے خود کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر اُن حالات میں وہ ہوتے تو کیا کرتے۔اس میں شک نہیں کہ یرموک مسلمانوں کی ایک عظیم فتح ہے۔لیکن ہرقل کی حکمت عملی اور تدبیرات پر حرف نہیں آنا چاہیے اور باہان کی جنگی کارروائی پر بھی زیادہ تنقید نہیں ہوسکتی۔بڑی سے بڑی غلطی اُس نے لڑائی کے آخری دن یہ کی کہ جلد بازی کر گیا اور پیدل فوجوں کو رسالے کی مدد کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکا۔اس طرح رومی چھوٹے لشکروں کے کمانڈروں نے بہادری سے مقابلے کیے اور بہادری سے لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے،مرتا وہی ہے جو لڑتا ہے۔بھاگنے والوں میں سے تو کچھ بچ ہی جاتے ہیں۔

بہرحال مسلمانوں کو یہ سب کامیابیاں اس لیے ہورہی تھیں کہ وہ اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کرتے تھے،لیکن بدقسمتی سے اس فلسفہ حیات پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ہم چوتھی کتاب میں اس پہلو کو ایک پورے باب میں بیان کریں گے۔مانا کہ جنگ یرموک تاریخ کی ایک عظیم ترین فیصلہ کن جنگ ہے۔لیکن مسلمان تاریخ کی یا شہرت کی پرواہ نہیں کرتا۔اُس کا نظریہ حیات یہ ہے کہ وہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دے گا اور تاریخ کے بامقصد مطالعہ کا حکم ہے نہ کہ تاریخ برائے تاریخ،یا نام پیدا کرنے کے لیے۔اس سلسلہ میں محمود غزنویؒ کا ایک فقرہ کافی ہے کہ میں روز قیامت بت شکن کے نام سے پکارا جانا پسند کروں گا۔

جنرل فلر کا تعصب

یہ تو تاریخ کا اسلامی پہلو تھا۔لیکن غیر یہ بھی نہیں چاہتے کہ تاریخ سے ہم اپنے کارناموں سے سبق سیکھ کر اپنی حالت کو ٹھیک کریں۔اب ایک طرف ان واقعات پر نظر ڈالیں،جو بیان کئے گئے ہیں۔دوسری طرف جنرل فلر کے بیان پر نظر ڈالیں کہ مسلمانوں کی کل نفری پچیس ہزار بتاتا ہے کہ اُن کے ہاتھوں پچاس ہزار رومی ایک ہی دن میں شکست کھا گئے۔اس سے دو سال پہلے جنرل فلر کے حساب سے حضرت خالدؓ پانچ سو کی نفری کے ساتھ عراق فتح کر کے اجنادین کے مقام پر پہنچ گئے اور مسلمان دستوں کی کمانڈ سنبھال لی جو چند سو یا ایک ہزار ہوں گے۔اب دو سال بعد مسلمانوں کو جنرل فلر نے پچیس ہزار تو بنا دیا۔چلو حالات کو کچھ وقعت تو دی۔

۲۔ لیکن مشہور یورپین مورخ گبن تو تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی اور رومی فوج ایک لاکھ سے تجاوز کرتی تھی۔جن سے آدھے میدانِ جنگ میں مارے گئے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ جنگ کئی دن جاری رہی۔

۳۔ البتہ جنرل گلب اور جنرل فلر کے لحاظ سے مسلمانوں کی فتح ایک آندھی کی وجہ سے ہوئی،اور ریت کے چھینٹے

(۱) جلالِ مصطفےٰ صفحہ ۳۷۹،اور ۳۸۰ سے استفادہ کریں۔

رومیوں کے منہ پر پڑ رہے تھے۔ مسلمانوں نے اس سے فائدہ اُٹھالیا، ہم نے میدانِ جنگ میں آندھیاں چلتی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ آندھی میں دفاع والا تو پھر بھی گزارہ کرلیتا ہے لیکن حملہ کرنے والے کو یا تو ہاتھ سے ہاتھ بجھائی نہیں دیتا یا ہوا آدمیوں کا رُخ ہی پھیر دیتی ہے۔ آندھی ایک رُخ پر قائم نہیں رہتی بلکہ تھوڑا تھوڑا سمت تبدیل کرتی رہتی ہے تب ہی درخت اُکھڑ جاتے ہیں۔ پھر کسی مسلمان مورخ نے آندھی کا ذکر نہیں کیا۔

۴۔ اگست کا مہینہ تھا اُس مہینہ میں اگر کوئی آندھی چلتی تو اُس کا رُخ شمال سے جنوب کو ہوتا یا شمال مغرب سے جنوب مغرب کی آندھی ٹھنڈے علاقے کی ہوا کو گرم علاقے میں لے جاتی ہے۔ مسلمان جو ریگستان کی سمت میں تھے۔ وہاں سے پہاڑوں کی طرف کبھی آندھی نہیں چلتی۔ بلکہ چھوٹے پہاڑ بھی آندھی کو روک لیتے ہیں۔ تھل اور ضلع خوشاب سے کوہستان نمک کی طرف آج تک کوئی آندھی کبھی نہیں چلی۔ اگر تیز ہوا کسی طرف سے آئے بھی تو پہاڑ روک لیتے ہیں اس لئے اگر کوئی آندھی چلتی تو وہ مسلمانوں کے حملے کے رُخ پر اثر کرتی۔

۵۔ کیا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو پتہ چل گیا تھا کہ آندھی چلے گی؟ اور انہوں نے حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو پل بنت یعقوب پر رات کے وقت بھیج دیا۔ یہ سب سوچنے والی باتیں ہیں۔

۶۔ کیا سلطنت روم کی فوج اتنی گئی گزری تھی کہ آندھی سے ایسی شکست کھا گئی کہ قیصر روم ایشیاء اور خاص کر ملک شام کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ گیا؟

۷۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ لیکن ہم کیا کریں کہ اہل یورپ کو ہمارے نام ہی سے نفرت ہے، اور اس کا صرف ایک علاج ہے کہ ہم پھر قرونِ اولیٰ والے مسلمانوں کی طرح فقر اختیار کریں:۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر　　　دوسرا نام اِسی دین کا ہے فقر غیور

(اقبالؔ)

نتائج واسباق

ا۔ جنگ یرموک کے نتائج اوران کے اثرات چودہ سوسالوں سے قائم دائم ہیں۔ اور جاری وساری بھی ہیں کہ حق وباطل کی ٹکر جاری ہے۔ آج بھی اُس وادی بلقا یا وادیِ یرموک کے ذکر سے ہمارے اخبار بھرے پڑے ہیں۔ آج وہی جولان کی پہاڑیاں، وہی بیت المقدس، وہی بیروت، وہی دریائے اُردن اور اُس کا مغربی کنارہ ہر روز کسی واقعہ کے ساتھ وابستہ ہوکر ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ اہلِ یورپ نے اسرائیل کو ''جنم'' دے کر صلیبی جنگوں کی شکل و صورت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مقاصد وہی ہیں۔ اُنہوں نے پہلے ''عربوں'' اور ''ترکوں'' کو عرب اور ترک بنایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کے مسلمان دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور اُن کے بیوی بچوں کو بھی تہِ تیغ کیا جا

رہا ہے۔علامہ اقبال آنے والے حالات کو بھانپ چکے تھے:۔

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت — پر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق — ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟

مقصد ہے ملوکیت انگلش کا کچھ اور — قصہ نہیں نارنج کا یا شہدورطب کا

۲۔ بہر حال اُس وقت مسلمانوں میں جان تھی ،تو یرموک کی فتح کے ثمرات اور عطیات اتنے زیادہ حاصل ہوئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سارے فلسطین وشام پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور کئی سوسال اہل روم کو اُس طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی سے صلیبی جنگوں کا جو سلسلہ شروع کیا گیا اُس کا بھی مسلمانوں نے بھر پور جواب دیا۔ پہلے عمادالدین زنگی ○اور نورالدین زنگی ○ نے صلیبیوں کی طبیعت صاف کی۔ پھر سلطان صلاح الدین ایوبی نے اُن کے مزاج درست کئے۔لیکن سلطان بیبرس اور اس کے مملوک جانشینوں نے صلیبیوں کو بحیرہ روم میں پکے طور پر ڈبودیا۔ اس کے بعد ترکوں نے اللہ ﷻ اور رسول ﷺ کے جھنڈے اُٹھالیے اور یلغار پہ یلغار کر کے دودفعہ وہ یورپ کے وسط میں ویانا تک گئے اور آخر کار پندرہویں صدی کے وسط میں قسطنطنیہ کو فتح کر کے انہوں نے قیصر روم کی سلطنت کو آبنائے باسفورس میں پکے طور پر ڈبودیا۔

ان شکستوں کے بعد اہل یورپ نے سوداگروں کا روپ دھارلیا اور جو کچھ ہمارے ساتھ کیا۔اُس پر کسی تبصرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔آخری وار جنگ عظیم کے بعد ترکی کی خلافت کو ختم کروا کے مسلمانوں کی رہی سہی وحدت کو پارہ پارہ کردیا۔کمال ترکی کی غیروں کی اس سازش میں شرکت اور سرسید کی اس براعظم میں اسلام کو غیروں کے رنگ میں پیش کرنے کی سازش میں شمولیت ازخود ایک کتاب کا مضمون ہیں،اس کی جھلک البتہ ندوی[1] صاحب کی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش''میں ملتی ہے۔خدا کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ افواجِ پاکستان نے اس کتاب کو پاکستان میں شائع کروا کے سب یونٹوں کی لائبریریوں کا حصہ بناڈالا اور ہر افسر کو ایک ایک کتاب دی گئی ہے۔خدا کرے ہم غیروں کی سازش کو سمجھ جائیں کہ حق وباطل کا معرکہ جاری ہے اور اب ہماری باری ہے:۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے — شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

(اقبال)

(۱) جلالِ مصطفےٰ کے صفحہ ۱۸، پر اس سلسلہ میں صرف اشارہ کیا گیا تھا۔اب کھل کر وضاحت کی جارہی ہے۔مصنف کتاب مولانا سید ابوالحسن ندوی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

۳۔ جنگ یرموک کی فتح کے فوری نتائج اگلے ابواب میں آئیں گے کہ کس طرح جنگ یرموک کے بعد ایک طرف بیت المقدس اور دوسری طرف شمالی شام کے سارے علاقے آسانی سے فتح کر لیے گئے۔ایک پہلو البتہ تجزیہ طلب ہے روایت ہے کہ مدینہ فتح کی خبر دینے کے لیے قاصد بھیجا گیا اور آئندہ کی حکمت عملی کی وضاحت طلب کی گئی۔ لیکن خلیفہ دوم کا کوئی اضطراب یا انتظار اس جنگ کے نتائج کے واسطے کسی مورخ نے بیان نہیں کیا کہ تو کیا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سمجھ رہے تھے کہ وہ خود وہاں موجود ہیں۔

۴۔ یہاں پر جنرل گلب کے تبصرہ کا جائزہ بھی ضروری ہے۔اُس کے مطابق اگر مسلمان اہل روم کو اتنی بڑی شکست دے سکتے تھے تو پھر انہوں نے اتنی لمبی چوڑی پسپائی کیوں اختیار کی؟ رومیوں کو شمالی شام میں ہی کیوں شکست نہ دے دی۔سوال بڑا اہم ہے۔ہم کلاسوٹز کی زبان میں جواب دیں گے۔وہ کہتا ہے کہ اگر اپنے علاقے کی وسعت زیادہ ہو اور پسپائی کو اندرونِ ملک طول دیا جا سکے،تو بہتر ہوتا ہے کہ دشمن کو اپنے اندرون ملک لے جا کر اپنی مرضی کے مطابق اور وقت پر شکست دی جائے۔حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا تجزیہ کچھ اس طرح کا معلوم ہوتا ہے:۔

(ا) درمیانی علاقے کو اس لیے چنا گیا کہ پانچوں لشکر جلدی سے اکٹھے ہو جائیں اور مسلمانوں کی منتشر طاقت ایک ''بنیان مرصوص'' بن جائے۔

(ب) جنگی مقام ایسا تھا کہ بازوؤں کی حفاظت بھی تھی۔لیکن اگر اس مقام پر رومیوں کو شکست نہ دی جا سکتی تو مسلمان مجاہدین دائیں بازو سے نکل کر ریگستان میں جا سکتے تھے اور رومیوں کو یرموک سے آگے عمان یا موتہ کی طرف پیش قدمی کی ہمت نہ پڑتی۔

(ج) رومی اپنے دوست سمندر سے دور ہو گئے تھے۔

(د) موسم ایسا تھا کہ مسلمان گرم علاقے میں زیادہ دن ٹھہر سکتے تھے، یورپ اور آرمینیا کے سرد علاقوں کے لوگ اگست کے مہینے میں یرموک کے میدان کی گرمی برداشت نہ کر سکے۔

۵۔ مسلمان متحرک طرز جنگ کے اصولوں کو اپنائے ہوئے تھے۔اُن کے لیے کسی جگہ کو چھوڑ دینا یا کسی جگہ اچانک پہنچ جانا معمولی بات تھی۔ان کو کسی بندوبستی دُم کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔یرموک کے میدان میں بھی وہ کمک کی اُمید کے لیے ٹھہر گئے اور رومیوں کو پہل کاری دینا چاہتے تھے۔ورنہ وہ کسی مقام پر لاؤ لشکر زیادہ دیر اکٹھا نہ رکھتے تھے۔ اُن کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی زمین میں بڑی وسعت ہے اور وہ اُس میں پھیل جاتے تھے۔

۶۔ مسلمانوں کے سامنے ایک مقصد تھا کہ اللہ اور رسول کے احکام نافذ کریں اور ایسا کرنے کے لیے اہل روم کو ایسی شکست دینے کی ضرورت تھی کہ وہ شام کو الوداعی سلام کر جائیں۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں

نے یرموک کے مقام کو چنا۔ اور رومی اُن کے داؤ میں آ گئے۔

۷۔ تدبیراتی طور پر مسلمانوں کی صف آرائی اور دفاعی جنگ کو جارحانہ جنگ میں تبدیل کرنا ایک ایسی کاروائی ہے کہ دنیا کی عسکری تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کلاسوٹز دفاع کو جنگ کے ایک طاقتور عنصر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ مسلمانوں کی عسکری تاریخ کا مطالعہ کرتا تو وہ حیران رہ جاتا کہ دشمن سے طاقت میں کمتر ہوتے ہوئے مسلمانوں نے صف بندی کر کے اُس کے ساتھ توازن پیدا کیا۔ دفاعی انتظار سے فائدہ اُٹھایا اور دفاعی جنگ میں اپنی اندرونی طاقت یا ذرائع سے جارح دشمن کا منہ پھیر دیا۔ اور پھر اسی دفاعی تعیناتی سے جارحانہ کاروائی پیدا کی۔ اور دشمن کی ناکہ بندی کر کے جارحانہ کاروائی کے فوری عطیات اور ثمرات وصول کئے اور دوسرے دن فوری تعاقب کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ جنگ کے تمام مبصر اور نقاد یہ باتیں جانتے ہیں لیکن کسی ایک جنگ میں یہ سارے عملی سبق نہیں ملتے اور نہ ہی دنیا کے کسی ایک جرنیل نے کسی جنگ میں ایسا کر کے دکھایا، ہاں حق و باطل کے پہلے معرکے میں سرکار دو عالم اور ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہمیں یہ سبق سکھا گئے تھے کہ متحرک دفاع اپنا کر پہلے دشمن کے وار کا مقابلہ کیا جائے اور پھر اُس دفاع سے جارحانہ کاروائی پیدا کی جائے یہ بدر[1] کے مقام پر ہوا۔

۸۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے ہم نے جو دفاعی طریق کار اپنایا۔ اس میں بھی کارفرما اصول یہی تھا کہ دفاع کو جارحانہ صورت میں تبدیل کر دیں گے۔ لیکن طریقہ یہ اپنایا کہ ایک تہائی حصہ کو دفاع میں استعمال کریں گے اور دو تہائی کو پیچھے رکھیں گے کہ وہ جارحانہ کاروائی کریں گے۔ لیکن جب محاذوں پر پہنچے تو پھیلاؤ اور طول کے باوجود یہ ایک تہائی حصہ اگلی دفاعی لائن پر پورا نہ ہو سکا اور نوے فی صد فوج اگلی دفاعی لائن پر تعینات کر دی۔ چنانچہ ایک اصول کے تو جنگ سے پہلے ہی پرخچے اُڑ گئے، لیکن جنگ کے دوسرے یا تیسرے دن باقی دس فی صد کو بھی اگلی دفاعی لائن میں جانا پڑا اور ایسا وقت آ گیا کہ بعض مقامات پر ''سپاہی محمد خان'' اور اس کے سامنے ''چھانچ مٹی'' پاکستان کی دفاعی لائن تھی۔ ان میں سے بھی متعدد مجاہدین نے آخری دن اللہ کے نام پر اپنی جان قربان کر دی اور پاکستان کو بچا لیا۔ جن میں سو کے قریب میرے ساتھی اور ماتحت بھی تھے۔ یہ دفاع جو ہم نے اپنایا تھا، غیروں کی نقالی تھی۔ اگر ہم جنگ یرموک کے اسباق کی نقل کرتے اور خلفائے راشدین کی حکمت عملی اپناتے جس کے تحت پوری قوم کو اللہ کی فوج بنانا پڑتا ہے، تو اس برعظیم کی تاریخ تبدیل ہو چکی ہوتی۔

۹۔ جنگ یرموک میں مسلمانوں نے دشمن کو مجبور کر دیا کہ وہ پہل کاری کرے، جب دشمن کو پہل کاری پر مجبور کر دیا جائے تو یہ پہل کاری نہیں ہوتی۔ یہ ردعمل ہوتا ہے جس کو انگریزی میں ''بلا ضرورت'' (NECESARY EVIL)

(۱) جلال مصطفےٰ کے پہلے باب سے استفادہ کریں۔

کہتے ہیں۔ ہم اس کو مجبوری کہتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ اور مزاج کے لحاظ سے ضرورت بری یا بدنہیں ہوسکتی۔

۱۰۔ مسلمان عورتوں کی جنگ میں شمولیت اور محاذ جنگ میں لشکروں کے ساتھ ہونے والی بات سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ عورت کے پردہ والے معاملہ کے مطالعہ کی ضرورت ہے، عورت نہ تتلی ہے کہ بازار میں اپنے حسن کی زیبائش کا مظاہرہ کرتی پھرے اور نہ گٹھڑی ہے کہ چاردیواری سے اُس کو اُٹھا کر باہر لایا جائے اور پھر واپس آ کر گٹھڑی کی طرح چاردیواری کے اندر پھینک دیا جائے۔ چادر کو "پردہ" کے طور پر سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس چادر کے ساتھ عورت کو گٹھڑی کی طرح باندھ دیا جائے۔ پردہ کے فلسفے کو پوری قوم کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ جس معاشرے میں شرارت پسند لوگوں کو اتنی آزادی ہو کہ وہ عورتوں اور لڑکیوں پر آوازے کسیں یا اُن کا پیچھا کریں وہاں چادر کا پردہ کس کام کا ہے، پردہ کی زیادہ ضرورت مردوں کے لیے ہے کہ وہ عورت کی عزت، ماں، بہن اور بیٹی کی طرح کریں۔ یہ دین فطرت کے احکام ہیں:

نَے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی   نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

(اقبالؔ)

۱۱۔ تدبیرات، فن، ہنر، سلیقہ اور اسلامی فلسفہ حیات کے جو اسباق ہمیں جنگ یرموک سے ملتے ہیں اُن کا ذکر ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کی ہر جنگ میں ہمیں کچھ مشابہ قسم کے اسباق ملتے ہیں۔ لیکن ایک ضروری سبق ہے جس کو دہرانا ضروری ہے، وہ مسلمانوں کے لیے حضور پاک ﷺ کی ذات ہے۔ علامہ اقبال ؒ نے تو بالکل واضح کر دیا کہ خدائے پاک کے تصور کے سلسلہ میں اپنی عقل کو کبھی بھی استعمال نہ کریں۔ ہمارا خدا وہی ہے جو ہمارے آقا حضور پاک ﷺ نے بیان فرمایا اور اس سے آگے ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے لیے حضور پاک ﷺ ہی قرآن، فرقان، یٰسین، اور طٰہٰ ہیں اور نگاہِ عشق و مستی میں اول و آخر بھی وہی ہیں۔ اس لیے یہاں یہ اسلام کے دو عظیم فرزندوں کی مثال دینا ضروری ہے۔

(ا) حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حسین و جمیل تھے لیکن جنگ اُحد کے بعد آپ کا حسن نکھر گیا۔ کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کے بدن مبارک سے خود کے ٹکڑے نکالتے وقت آپ رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کا خونِ مبارک اور پسینہ چوس لیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ بے فکر گریگوری کے مقابلہ کے لیے نکل کھڑے ہوئے کہ آپ پر نہ دشمن کا کوئی وار اثر کر سکتا تھا، نہ میدانِ جنگ کی شکست بھی، اور نہ میدانِ جنگ کی شہادت۔ آپ رضی اللہ عنہ نے گریگوری کی ایک لاکھ درہم والی ٹوپی پر کیوں نظر نہ کی۔ آپ روشن ضمیر تھے، اور آپ کو نظر آ رہا تھا کہ چند لمحوں کے بعد سارا میدان جنگ رومیوں کی ٹوپیوں سے بھر جائے گا اور یہی ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ تب ہی انہوں نے یرموک کی جنگ کے نتائج کے لیے کسی قاصد کا انتظار نہ کیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بدن پر ہر وقت اللہ کے حبیب ﷺ کا سایہ ہوتا تھا۔

اور یہ سب کچھ حضور پاک ﷺ کی غلامی کی وجہ سے تھا۔

(ب) دوسری مثال حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ہے۔ ہم اُس ٹوپی کا ذکر کر چکے ہیں جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سر پر ہوتی تھی اور اُس میں حضور پاک ﷺ کے بالِ مبارک تھے۔ جنگ کے چوتھے دن یہ ٹوپی گم ہوگئی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ پریشان ہوگئے اور ٹوپی ٹوپی کر کے پکار اُٹھے۔ روایت ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو کسی نے اتنا پریشان زندگی میں نہ دیکھا جتنا اس ٹوپی کے گم ہونے کی وجہ سے ہوئے۔ چند لمحوں بعد ٹوپی مل گئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ٹوپی کو بوسہ دیا اور پھر ٹوپی کو سر پر رکھا اور پکار اُٹھے۔ مسلمانو! فتح مل گئی۔

دسواں باب

فتح بیت المقدس

جنگ یرموک کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ ستر ہزار رومیوں کو دفن کرنے میں بھی دو تین دن لگ گئے ہوں گے۔ مالِ غنیمت کو اکٹھا کرنا تھا۔ اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال اور شہداء کے دفن کرنے کے کام تھے۔ روایت ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ایک فوجی دستے کو اہل دمشق کے اصرار پر جلدی ہی بھیج دیا کہ وہاں پر امن وامان بحال کیا جائے۔ آگے سارے شام پر کسی ترتیب یا ترجیح کے تحت قبضہ کیا گیا۔ اُس میں تھوڑا سا اختلاف ہے کچھ مورخین کا خیال ہے کہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ دمشق چلے گئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ حمص کی طرف، اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ فلسطین کی طرف چلے گئے اور بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ مورخین نے سارے اسلامی لشکر کو فلسطین بھیج دیا اور اُن کے لحاظ سے صرف چند مجاہدین دمشق تک گئے۔

آگے فلسطین میں بھی قساریہ اور بیت المقدس یعنی دو مقامات پر رومیوں کا قبضہ تھا۔ یہاں بھی کچھ مورخین کا خیال ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مشاورت طلب کی، کہ ترجیحات کا فیصلہ کیا جائے کہ پہلے کونسا مقام فتح کیا جائے۔

کچھ امراء کا خیال تھا کہ پہلے قساریہ فتح کیا جائے اور کچھ کا خیال تھا کہ بیت المقدس کو پہلے فتح کیا جائے۔ بے شک دونوں شہر اہم تھے۔ قساریہ سمندر کے ذریعہ سے اہل روم کو رابطہ مہیا کر رہا تھا۔ بیت المقدس فلسطین کا دل تھا اور مسلمان کچھ عرصہ اس طرح منہ کر کے نماز پڑھتے رہے یعنی اُن کا قبلہ[1] رہ چکا تھا۔ وہاں سے دشمن کو نکالنا ضروری تھا۔ اس لیے فلسطین کے علاقے میں ترجیح کے طور پر بیت المقدس کو پہلے فتح کرنے کی کاروائی کی گئی اور بعد میں قساریہ کو فتح کیا گیا، اور شمالی شام کے سلسلہ میں ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ محدود کاروائی اُسی زمانے میں کی گئی، اور بھرپور کاروائی بیت المقدس کی فتح کے بعد۔ کچھ مورخین نے محدود اور بھرپور کاروائی کو ملا کر تمام واقعات کو اکٹھا کر کے بیت المقدس کے بعد کے واقعات میں شامل کر دیا اور کچھ نے محدود کاروائی کو 'طول' دے کر سب واقعات کو، بیت المقدس کی فتح سے پہلے کے واقعات قرار دے دیئے۔

یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس کی فتح کی دو الگ الگ تاریخیں بیان کی جاتی ہیں۔ کچھ مورخین نے ربیع الاوّل سولہ ہجری بتایا ہے اور کچھ نے ذی قعد سولہ ہجری۔ جو لوگ ربیع الاوّل کی تاریخ بتاتے ہیں اُن کے لحاظ سے تمام لشکروں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا اور چار ماہ کے محاصرہ کے بعد بیت المقدس پر قبضہ ہوگیا۔ جو لوگ ذی قعد سولہ ہجری کی تاریخ بتاتے ہیں۔ وہ اسلامی لشکروں کو پہلے شام کے شمالی علاقوں میں کاروائی دکھاتے ہیں اس لئے فتح بعد میں بتاتے ہیں۔

ہمارے لحاظ سے افواج شمالی شام میں ضرور گئیں لیکن کاروائی محدود تھی اور جب حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیت المقدس کی کنجی لینے کے لیے مدینہ سے آئے تو وہ پہلے جابیہ آئے اور سب مورخین یہ کہتے ہیں کہ وہاں پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ ملے۔ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے لیے سب مورخ یہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں کہ وہ اپنے علاقوں سے جنوب کی طرف آ کر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ظاہر ہے کہ وہ دمشق یا اس کے شمال میں تھے جہاں تک بیت المقدس کی فتح کا تعلق ہے، اُس سلسلے میں ہمارا حساب کتاب وقت کے لحاظ سے ربیع الاوّل سولہ ہجری صحیح بیٹھتا ہے کہ سب لشکروں کی بجائے صرف حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کے لشکروں نے جا کر بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور سارے لشکروں کو محاصرہ پر بھیجنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ بیت المقدس میں فوجی نفری کم تھی۔ جو کام پورا لشکر کر سکتا وہ دو لشکر بھی کر سکتے تھے وہ اس لیے کہ

(۱) یہاں پر قبلہ اول کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کئے جا رہے۔ مکہ قبلہ اول ہے یا بیت المقدس قبلہ اول ہے۔ ہمارے لیے دونوں برابر ہیں۔ بلکہ مکہ کو ترجیح ہے۔ مکہ میں رہتے ہوئے مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے ہر جگہ سمت الگ ہو جاتی، ہجرت کے بعد ایسا کیا کہ وحدت عمل کے طور پر سب کے منہ ایک طرف ہوں اور ہجرت میں ایک راز یہ بھی تھا کہ مکہ کو قبلہ مانا جائے۔ اور ہمارا مکہ ہی خانہ کعبہ ہے اور بیت المقدس ہماری سر آنکھوں پر ہے لیکن مکہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے رکھی تھی۔

رومیوں کو باہر سے امداد کی زیادہ اُمید نہ تھی۔ کیونکہ اب ساحلی علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

پرانے مورخ تو واقعات کو ویسے بھی تسلسل سے بیان نہیں کرتے۔ لیکن جنرل اکرم اور جنرل گلب نے بھی بیت المقدس کے واقعات کو بہت مختصر طور پر بیان کیا ہے، اور اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی جائزہ پیش نہیں کیا۔ دونوں کے بیانات الگ الگ ہیں۔

جنرل اکرم کا بیان

جنرل اکرم لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے احکام ملنے کے بعد اور فتح یرموک کے کچھ عرصہ بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی کی۔ حضرت خالدؓ جیش المقدم پر کام کر رہے تھے۔ رومی فوجوں نے مسلمانوں کو دیکھا تو وہ قلعہ بند ہو گئیں۔ مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا جو چار ماہ تک جاری رہا۔ اُس کے بعد وہاں کے بڑے پادری نے کہا کہ اگر خلیفہ وقت حضرت عمرؓ خود تشریف لے آئیں تو وہ ہتھیار ڈالنے پر تیار ہیں۔

حضرت شرجیلؓ نے مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ کو تکلیف نہ دی جائے۔ حضرت خالدؓ خلیفہ دوم کے ہم شکل ہیں اُن کو حضرت عمرؓ جیسے کپڑے پہنا کر مشہور کر دیا جائے کہ خلیفہ وقت تو ادھر ہی موجود ہیں اور ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن بڑا پادری بات کو تاڑ گیا اور کامیابی نہ ہو سکی۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو مدینہ شریف میں خبر دی گئی اور وہ تشریف لے آئے۔ حضرت عمروؓ بن عاص کو محاصرہ پر چھوڑا گیا اور باقی تمام سپہ سالاروں نے حضرت عمرؓ کو جابیہ کے مقام پر خوش آمدید کہا۔ حضرت یزیدؓ اور حضرت خالدؓ نے ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ نے اس بات کو ناپسند فرمایا وغیرہ۔

تبصرہ

جنرل اکرم نے یہ نہیں بتایا کہ جابیہ کا مقام کوئی اور تھا جو بیت المقدس کے نزدیک بیر شیبہ یا اجنادین کے پاس تھا۔ تمام مورخین نے ایک ہی جابیہ کا ذکر کیا ہے جو اُردن اور شام کی سرحد میں وادیٔ یرموک میں دیرہ کے پاس ہے اور جنرل گلب بھی اسی جابیہ کا ذکر کرتا ہے اور الفاروق کے مصنف مولانا شبلی بھی اسی جابیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جنرل گلب سمیت سب مورخ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ پہلے جابیہ آئے اور وہاں سے فحل اور بیسان کے راستے بیت المقدس گئے طبری کے حوالے سے ایک جگہ کسی راوی نے سرغ کے مقام کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو شام کی فوج کے اُمراء نے وہاں خوش آمدید کہا۔ پرانے زمانے کے مورخ نقشوں اور جغرافیہ کا حوالہ نہیں دیتے تھے اور نہ ہی زماں و مکاں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بیان بھی کچھ مددگار ثابت نہیں ہوتا۔

لیکن جنرل اکرم کا بیان تجزیہ طلب ہے کہ انہوں نے تمام مقامات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور نقشے بھی بنائے،

اب کسی نقشہ پر دیکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر مدینہ شریف سے سیدھے جابیہ گئے اور وہاں سے بیت المقدس گئے تو اس کی نسبت اگر مدینہ شریف سے ایلہ (عقابہ) کے راستے بیر شیبہ سے ہو کر بیت المقدس جاتے تو اُن کو دو سو میل کم سفر کرنا پڑتا۔ جابیہ بیت المقدس سے سو میل شمال کی طرف ہے۔ اوّل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو سو میل فالتو سفر کیوں کیا؟ اور دوم یہ کہ اگر سارے لشکروں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا ہوا تھا تو پھر لشکر کے امراء سو میل شمال کی طرف جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صرف خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں گئے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر سارے لشکر بیت المقدس میں تھے اور صرف چند دستے دمشق تھے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جابیہ کس کو ملنے گئے؟ اور چوتھا سوال یہ ہے کہ کیا یرموک کی فتح کے بعد سارے شمالی شام میں چند دستے دمشق کے مقام پر رکھے گئے اور یرموک کی فتح کا کوئی فائدہ نہ اُٹھایا گیا کہ شمالی شام میں کوئی فوج چھوڑی جاتی۔

ان سوالوں سے ایک ہی بڑا جواب نکلتا ہے کہ تقریباً آدھے سے زیادہ اسلامی لشکر کے دستے جابیہ اور اُس سے شمال میں تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُن اُمراء کو ملے اور پھر آپ رضی اللہ عنہ چند مشہور صحابہ کو بیت المقدس کی فتح کی رسم میں شرکت کے لیے وہاں لے گئے۔ ظاہر ہے کہ بیت المقدس میں صرف حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور زیادہ سے زیادہ شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کے لشکر تھے۔

جنرل گلب کا بیان

جنرل گلب اس ساری کہانی کو مختصر طور پر بیان کرتا ہے اور اُس کے لحاظ سے یرموک کی فتح کے بعد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص فلسطین کی طرف واپس چلے گئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے پہلے حمص اور بعلبک وغیرہ تک پیش قدمی کی اور پھر سارے شمالی شام یعنی قنسرین، انطاکیہ، حلب وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے بیت المقدس کے بڑے پادری کے ساتھ رابطہ قائم کیا لیکن اُس نے کہا کہ وہ بیت المقدس کی کنجی صرف مسلمانوں کے خلیفہ کو دیں گے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر بھیجی گئی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کا دورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پرانے قافلوں والا راستہ استعمال کیا اور پھٹے پرانے کپڑوں میں دیرہ[1] پہنچ گئے۔ جو اَب ملک شام کی جنوبی سرحد پر ہے جہاں پر سرحد اُردن سے ملتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت کوفت ہوئی کہ وہاں کے لوگ ناچ ناچتے اور گانا گاتے باہر نکل آئے اور اُن کی عورتیں بھی تنبور بجا رہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس بے حیائی کو بند کر دیا جائے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کے رسم و رواج کے لحاظ سے ٹھیک ہے۔ اگر ان کو روکا گیا تو یہ لوگ سمجھیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دشمن کی حیثیت سے آئے ہیں۔ اس قسم کے بیانات

(۱) دیرہ کا ذکر جنگ یرموک میں بھی ہو چکا ہے۔ اور پرانے زمانے میں اسرائیلیوں اور بادشاہ اوگ کی لڑائی بھی یہاں ہوئی تھی۔

سے خلیفہ وقت کو کچھ تسلی دی گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ مسلمان سپہ سالاروں پر سخت ناراض ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ، حضرت خالدؓ، اور حضرت یزیدؓ جو جنوب میں حضرت عمرؓ کو خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ اُنہوں نے ریشمی لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کو بھی سنگار پہنائے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ سخت ناراض ہوئے کہ اُن کو ایسے ہمت کیسے ہوئی، کہ وہ اُن کے سامنے ایسے لباس میں آئے۔ اُن سب کو معزول کر دینا چاہیے وغیرہ تو سب سالاروں نے کہا کہ وہ خود پہنے ہوئے ہیں اور اس لباس کے نیچے ہتھیار بھی پہنے ہوئے ہیں یہ اُوپر کی ظاہری کاروائی یہاں بسنے والوں کے لیے دکھاوا ہے وغیرہ۔

جابیہ کی چھاؤنی ہی میں بڑے پادری سوفورینس کا وفد آیا ہوا تھا جس نے ہتھیار ڈالنے کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے، اور پھر خلیفۂ دوم بیسان والے راستے بیت المقدس چلے گئے۔ جنرل گلب کے حساب سے معاہدہ کے لیے بات چیت ۶۳۷ عیسوی کے آخری ایام میں شروع ہوئی لیکن ساتھ ہی وہ تسلیم کرتا ہے کہ کچھ مورخین کے حساب سے یہ واقعہ ایک سال پہلے کا ہے۔

تبصرہ

جنرل گلب نے بھی یہ واقعات پرانے تاریخ دانوں کی کتابوں سے نچوڑ کے طور پر نکالے ہیں اور اس سے کوئی خاص اختلاف نہیں ہوسکتا۔ سوائے اس کے کہ اگر بیت المقدس ربیع الاوّل سولہ ہجری میں فتح ہوگیا جس کے بارے میں جنرل گلب کوئی شک ظاہر نہیں کرتا تو پھر یہ تسلیم کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں انطاکیہ تک سارا شمالی شام بھی فتح ہوگیا تھا اور حضرت عمروؓ بن عاص نے انطاکیہ تک حضرت ابوعبیدہؓ کی خبر پہلے پہنچائی جو بیت المقدس سے چار سو میل دور تھا اور پھر سارا کام اُن کی نگرانی میں ہوا۔ تو زماں و مکاں کے تانے بانے نہیں ملتے۔ ہمارا تجزیہ بین بین ہے اور مختلف تاریخوں کے مطالعہ کے بعد اور دو جرنیلوں کے بیانات پڑھنے کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ وادی یرموک کی اہمیت مسلمانوں پر ظاہر ہوگئی کہ تیسری دفعہ مسلمانوں کو وہاں جمگھٹ کرنا پڑا۔ حضرت عمرؓ پہلے ہی احکام دے چکے تھے کہ فتح شدہ علاقوں میں چھاؤنیاں بنائی جائیں اور اس کے نتیجہ کے طور پر ایران کے محاذ پر کوفہ اور بصرہ کو چھاؤنی بنایا گیا اور حضرت عمرؓ کے احکام کے تحت وادی یرموک میں جابیہ کو بھی چھاؤنی بنایا گیا۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے حکم کے تحت یا حکمت عملی کے تحت اور خلیفہ دوم کی اجازت سے حضرت ابوعبیدہؓ نے جابیہ کے مقام کو اپنا ایک ہیڈ کوارٹر بنالیا، یا وہاں پر کچھ ہیڈ کوارٹر کے عملہ کے قسم کے لوگوں کو رکھا اور خود بھی وہاں آ کر اکثر ٹھہرتے ہوں گے کہ سارے علاقے کے وہ سپہ سالار تھے۔

۳۔ حضرت عمروؓ بن عاص اور حضرت شرجیلؓ کے لشکر فلسطین کی طرف چلے گئے اور بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا۔ علاقہ حضرت عمروؓ بن عاص کا تھا تو وہ سپہ سالار تھے۔ رومیوں اور نصرانیوں کو کچھ پتہ تھا کہ جس شخص نے بیت المقدس کو فتح کرنا ہے اس کا نام عمرؓ ہوگا کہ کچھ پیشگوئیاں اس قسم کی تھیں۔ پہلے تو نصرانیوں نے جب دیکھا کہ عمروؓ بن عاص نے محاصرہ کرلیا تو اُن کو خیال ہوا کہ بیت المقدس کا فاتح آ گیا۔ لیکن ساتھ ''واؤ'' کے اضافہ کی وجہ سے نصرانیوں نے کہا کہ نہیں یہ وہ شخص نہیں پھر نصرانی یہ بھی چاہتے تھے کہ کچھ التواء ہو اس لیے انہوں نے بہانہ بنایا کہ اپنے خلیفہ عمرؓ کو بلاؤ۔ حضرت ابوعبیدہؓ نزدیک ہی جابیہ میں تھے اُن کو حالات سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے خلیفہ دوم کو خبر دی جو شام کا دورہ کرنے اور بیت المقدس کی فتح کی سعادت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

۴۔ بیت المقدس میں زیادہ فوج نہ تھی اور نہ ہی مسلمان اس کی دیواروں کو گرانا چاہتے تھے، محاصرہ کرنے سے وہ لوگوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے سارے اسلامی لشکروں کو بیت المقدس لانے کی ضرورت نہ تھی۔

۵۔ ان وجوہات کے تحت حضرت یزیدؓ کا لشکر دمشق چلا گیا اور حضرت خالدؓ کا حمص۔ لیکن ابھی شمالی شام میں فتوحات بڑھانے کا وقت نہ آیا تھا کہ مسلمان جنوب میں اُلجھے ہوئے تھے بلکہ ابھی تو قساریہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ نہ تھا اور دمشق کے مغرب میں بیروت کی بندرگاہ بھی رومیوں کے ہاتھ میں تھی۔

۶۔ جب تک جنوب میں دشمن کا مکمل قلع قمع نہ کیا جاتا شمالی شام میں اپنے آپ کو حمص سے آگے اُلجھا دینا فضول تھا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جنرل گلب بھی یہاں بھول گیا۔

زماں مکاں کا تجزیہ

زماں و مکاں کا ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ رجب پندرہ ہجری میں یرموک کی جنگ ہوئی۔ شعبان کا مہینہ وہاں گزر ا ہو گا یا رمضان میں بھی آرام کیا ہو گا۔ بہرحال رمضان اور شوال میں حضرت عمروؓ بن عاص، حضرت شرجیلؓ بیت المقدس کے لیے رواں دواں ہو گئے اور اُس کا محاصرہ کرلیا اور مورخین کے مطابق چار ماہ محاصرہ رہا۔ تو محرم میں بات چیت شروع ہوگئی اور صفر تک پیغام رسانی اور صفر ختم کر کے ربیع الاوّل سولہ ہجری میں بیت المقدس فتح ہوگیا۔ زیادہ مورخین نے یہی تاریخ بتائی ہے اور اوپر کے واقعات کو جو تسلسل دیا گیا ہے وہ بھی مورخین کے بیانات سے ہے اور یہی طریقہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بیت المقدس کی فتح

ہمارے تجزیہ کے مطابق حضرت عمرؓ پہلے جابیہ تشریف لائے جہاں پر حضرت ابوعبیدہؓ نے انہیں

خوش آمدید کہا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ، حضرت یزید رضی اللہ عنہ اور حمص و دمشق سے کئی امراء اور لشکر سے صحابہ کرام جابیہ آئے ہوئے تھے اُن سب کے ساتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ملاقات کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے جابیہ تک کا سفر بھی چند مجاہدین کے ساتھ کیا اور تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آپ کے ساتھ صرف ایک غلام تھا اور سواری کے لیے ایک اونٹنی یہ قصہ گوئی والی باتیں ہیں۔ بلکہ جابیہ سے آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور متعدد امراء کو بیت المقدس ساتھ لے جانے کا شرف بخشا۔ ممکن ہے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے گئے ہوں کہ وہاں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آئندہ کے لیے ملک کی فوجی حکمت عملی کو بھی متعین کیا۔

آپ نے فحل، بیسان والا راستہ اختیار کیا اور جودہ کے پہاڑوں کو عبور کر کے بیت المقدس پہنچے۔ معاہدہ کے سمجھوتے پر بیت المقدس میں دستخط ہوئے اور نہ کہ جابیہ میں، جس طرح جنرل گلب کہتا ہے۔ سمجھوتہ مسلمانوں کی شرائط کے مطابق تھا اور مسلمانوں کی طرف سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خود دستخط کیے۔ گواہ کے طور پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف، حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان نے دستخط کیے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف شاید حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے کہ مدینہ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب چھوڑا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی گواہی یہ ثبوت پیش کرتی ہے کہ معاہدہ پر دستخط بیت المقدس میں ہوئے۔ جنرل گلب جس معاہدہ کے کاغذات کا ذکر کرتا ہے کہ جابیہ میں دستخط ہوئے۔ اس سلسلہ میں ممکن ہے کہ صرف کاغذات جابیہ لے گئے ہوں۔ ہمارا تجزیہ ہے کہ یہ مسودہ کم تھا اور مسلمانوں کے طریقہ کار کا اعلان زیادہ تھا کہ مفتوحہ علاقے میں اللہ جل جلالہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام جاری کرنے کا ایک اعلان تھا۔

اللہ کے گھر میں داخلہ

ہمارے لیے جونکتہ زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام یہاں بھی اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پورا کر رہے تھے۔ بیت المقدس بھی اللہ کا گھر ہے اور جس طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بغیر لڑائی کے مکہ میں داخل ہوئے آج اُن کے غلام بھی اسی طرح بیت المقدس میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ بھی حکمت عملی کی فتح تھی اور یہ بھی حکمت عملی کی فتح۔ مسلمان خواہ مخواہ خونریزی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ تو ایک مقصد کے لیے جنگ لڑتے ہیں اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا کو ایک کریں اور تمام انسانیت کو ایک راستے یعنی صراطِ مستقیم پر گامزن کریں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان

آج ایک عظیم دن تھا۔ چوٹی کے صحابہ میں کئی اصحاب بدر موجود تھے اور عشرہ مبشرہ میں سے بھی چار عظیم صحابہ موجود تھے لیکن دوسروں سے اسلام کی آغوش میں سبقت لے جانے والے ایک عجمی بھی موجود تھے۔ جو ہماری تاریخ میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ افریقہ کے رہنے والے تھے لیکن آج اسلامی دنیا کے ہر خطہ میں آپ کے نام مبارک پہ نام رکھنے کو ایک بڑی سعادت سمجھا جاتا ہے کہ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن بھی تھے۔ چنانچہ جب نماز کے لیے اذان کا وقت ہوا۔ تو اُس نیک گھڑی میں سب کی نظریں حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر پڑیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آ گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: "یا امیر المومنین! آج پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان دیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی یاد تازہ ہو جائے۔" حضرت بلال رضی اللہ عنہ خاموش تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُن کے لیے اذان کی ادائیگی مشکل ہوگئی تھی۔ خاص کر جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک پر آتے تھے تو ایسی رقت طاری ہو جاتی تھی کہ الفاظ زبان سے نہ نکلتے تھے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی زبان سے تو کوئی الفاظ نہ نکل سکے۔ لیکن انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا ضرور اور نبوت سے مستیز حضرت بلال رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ امیر المومنین کی کیا خواہش ہے۔ انہوں نے ہمت کی اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی پیاری آواز میں اذان دینا شروع کر دی۔ اُن پر رقت طاری تھی، آبدیدہ تھے، آنسو جاری تھے اور اذان ادا کرتے جاتے تھے لیکن جب اشهدُ اَنَّ مُحَمَّدُ الرَّسولَ الله پر پہنچے تو پھوٹ کر رو پڑے لیکن اس میں وہ اکیلے نہ تھے بلکہ سب مجاہدین کی یہی حالت تھی۔

سب جہاں و دنیا و مافیہا سے بے خبر یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! پکار رہے تھے۔ کوئی یا حبیب الله! یا حبیب الله! کی صدا دے رہا تھا اور کوئی یا سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم! یا سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم! کی صدا دے رہا تھا پھر کسی کی زبان سے نکلا قرۃ العینی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یا حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انہوں نے اپنے ہونٹوں سے یہ لفظ نکالتے وقت دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو اپنے منہ کے قریب کیا چوما اور پھر ان انگوٹھوں کو اپنی نم آنکھوں پر رکھ دیا تو افاقہ ہوا اور وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آ گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں میں یہ طریقہ عام تھا کہ اس طرح وہ اپنے دل کی پیاس بجھاتے تھے۔

قارئین! اُمید واثق ہے کہ آپ کی آنکھیں ضرور نم ہوئی ہوں گی اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کو چوم کر دل کی پیاس بجھائی ہوگی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کے اگلے فقرے کس حالت میں میں ادا کیے اس سلسلے میں نہ کسی راوی نے کچھ لکھا ہے اور نہ ہی ہم کوئی تصور پیش کرنے کے قابل ہیں۔ ان فقروں میں نماز اور بھلائی کی طرف بلاوا بھی ہے۔ اور آج اللہ تعالیٰ کے گھر میں نماز اور بھلائی کی نشاندہی کرنے والے کی طرف سے پہلے ہی بلاوا آ چکا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی عطا تھی

کہ حضور پاک ﷺ کے عظیم رُفقا اور لشکروں کے نئے مجاہد آج اذان سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے گھر میں اکٹھے ہو چکے تھے اور اذان کے آخری فقروں میں جو اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا ذکر ہے۔ اس کا عملی ثبوت پیش ہو رہا تھا۔ صحرا کے بسنے والے آج اللہ تعالیٰ کے گھر میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے آگے سر جھکائے کھڑے تھے، اور اس گھڑی کو تاریخ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی گھڑی کہیں گے۔

لیکن بلال وہ حبشی زادہ حقیر — فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امین ازل سے ہوا سینہ بلال — محکوم اس صدا کے ہیں شہنشاہ و فقیر

(اقبالؔ)

تبصرہ

اذان کا ایک فوجی پہلو بھی ہے۔ قرونِ اُولیٰ کے سب موذن فوجی اور مجاہد تھے اسی وجہ سے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں ملاّ کی اذان اور مجاہد کی اذان کے الگ الگ اثرات کا ذکر کیا ہے لیکن میدانِ جنگ میں اذان کی آواز میں جو لطف ہے اور اس سے جو سرور پیدا ہوتا ہے اس کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتی۔ بلکہ اذان کی آواز کا دشمن کی فوجوں پر اتنا رعب ہوتا ہے کہ اس آواز سے وہ بھی سہم جاتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی فائر بندی کے دوران بھی بھارت کی طرف سے کئی دفعہ اقوامِ متحدہ کے مبصر یہ شکایت لے کر آئے کہ ہماری فوجی فائر بندی کے نزدیک اونچی آواز میں اذان نہ دیں۔ بہانہ تو یہ تھا کہ اس سے اشتعال پیدا ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اشتعال اور جذبہ مسلمانوں میں پیدا ہوتا تھا اور بھارتی اپنی کمتری اور خوف پر پردہ ڈال رہے ہوتے تھے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے — اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

(اقبالؔ)

غیروں کی عبادت گاہیں

روایت ہے کہ بیت المقدس میں رہتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن ایک گرجا کے صحن میں تشریف فرما تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ گرجا کے صحن سے باہر نماز پڑھیں گے۔ ورنہ میری نقل کرتے ہوئے مسلمان جہاں جائیں گے تمام گرجوں کو مسجدیں بنا دیں گے۔ یہ بات صحیح بھی ہو سکتی ہے یا ممکن ہے کہ عیسائی مورخین نے بعد میں یہ بات گھڑلی ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو غیروں کی عبادت گاہوں کا بڑا احترام کیا۔ دراصل عیسائی دنیا کا مسلمانوں پر بڑا اعتراض مسجد صوفیا کے سلسلے میں ہے کہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے اس گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ صوفیا دراصل گرجا نہ تھا۔

عیسائیوں سے پہلے وہاں پر بت پرستوں نے اپنا کچھ مذہبی رسم ورواج جاری رکھا ہوا تھا۔ عیسائیوں نے ایک طرف گرجا بھی بنا دیا۔ جب مسلمان وہاں پہنچے تو اس زمانے میں بھی اختلاف تھا۔ لیکن غیر عیسائی یا بت پرست مسلمان ہو گئے تو اُنہوں نے اس جگہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ کمال اتاترک نے اُس جگہ کو عجائب گھر میں تبدیل کر کے معاملات کو ختم کرنے کی کوشش کی واللہ اعلم۔ معاملات کیسے ''ختم'' ہوئے کہ کمال کی کاروائیاں ازخود ابھی طشت ازبام ہونا باقی ہیں۔ بہرحال یہ لمبی بحث ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں نے دوسروں کے احساس کا بہت خیال رکھا، اور بڑی رواداری سے کام لیا۔ لیکن مسلمانوں میں اب ایسا ایک گروہ جنم لے رہا ہے جن کا خیال ہے کہ ہم نے اللہ کے دشمنوں کے ساتھ زیادہ مہربانیاں کیں اور ان کو مکمل طور پر کیفر کردار تک نہ پہنچایا۔ ہمیں بھی یہ چاہیے تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو ان کے جانشین ہمارے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہم اس رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے۔ مسلمان اپنے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور وہ اِن چھوٹی حرکتوں سے بہت بلند ہے۔

مسلمان کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا ... مروّت حسین عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

(اقبالؔ)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس میں دس روز قیام کیا اور اُس کے بعد چھوٹے راستہ سے مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ انہوں نے جو ہدایات دیں اُن کو ہم اگلے باب میں زیر بحث لائیں گے۔ بیت المقدس کی فتح کا بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہونا شروع ہو گئی۔

کسی یک جائی سے اب عہدِ غلامی کر لو ... ملت احمد مرسل کو مقامی کر لو

(اقبالؔ)

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی دعوت

اس بات کو ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ کا بیان ضروری ہے اور وہ ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعوت۔ اور اس سلسلہ میں پچھلے ایک باب میں وعدہ کیا گیا تھا کہ یہ ذکر بعد میں ہوگا۔ دنیا میں شاید یہ اپنے قسم کی واحد دعوت ہے کہ دنیا کے ایک عظیم حاکم کی دعوت اس کی افواج کے ایک محاذ کے سپہ سالار اعظم نے اس طرح کی ہو۔ بیت المقدس میں چند روز قیام کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ''اے رفیق خاص! جب دوست دوستوں سے ملتے ہیں تو خاندانی رواج کے مطابق میزبان دوست مہمان دوست کی دعوت کرتا ہے اور آپ رضی اللہ عنہ نے اب تک میری کوئی دعوت نہیں کی۔'' حضرت امین الامت نے فرمایا کہ ہاں وہ اس سلسلہ میں کافی سوچ چکے ہیں لیکن وقت نہیں مل رہا۔'' بہرحال آخر ایک دن دعوت کا بندوبست کیا گیا اور اس نرالی دعوت میں مہمان بھی ایک تھا اور میزبان

بھی ایک۔ اُس دن حضرت ابوعبیدہ ؓ بھی ویسا ہی پرانا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے جیسا کہ وہ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں پہنتے تھے۔ اور خیر حضرت فاروقِ اعظم ؓ تو ہمیشہ سے ایک جیسا لباس پہنتے رہے۔ اور اُسی لباس میں بلادِ شام وفلسطین میں تشریف لے آئے۔ دنیا کے اس عظیم حاکم جن کا نام سن کر قیصر وکسریٰ کے درباروں میں کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ آج مہمان کے طور پر اکیلے ہی اپنے رفیقِ خاص کی جاءِ رہائش پر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ کے ہاں کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی بچھی ہوئی تھی، جس پر دونوں عظیم صحابہ بیٹھ گئے۔ اور کچھ باتیں شروع ہی کیں کہ حضرت ابوعبیدہ ؓ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مہمان سے عرض کی کہ پہلے وہ دعوت کا کھانا ذرا تیار کرلیں تو پھر تسلی سے بات چیت کریں گے۔ آپ ؓ نے پہلے جو کی سوکھی روٹی توڑ رکھی تھی۔ اب اُس روٹی کو ایک پیالہ میں ڈال کر اوپر تھوڑا سا پانی ڈال دیا تا کہ جب تک باتیں ہوتی ہیں یہ روٹی پانی کی وجہ سے نرم ہوکر گھل مل جائے تا کہ کھانے میں آسانی ہو۔

اس دعوت کے انتظار میں اسلام کے ان عظیم فرزندوں نے اپنے ماضی کے زمانے کی باتیں شروع کیں۔ ملک عرب کے چرواہے صحراؤں میں، خیموں میں گزارہ کرنے والے آج کہاں پہنچ چکے تھے اور یہاں پر اُن کو اللہ تعالیٰ نے کس کے وسیلے سے پہنچایا۔ چنانچہ حضور پاک ﷺ کی یاد میں دونوں پر رقت طاری ہوگئی، اور آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ بات بات پر آنکھیں نم ہوتی تھیں اور دونوں صاحب، زندگی کا سرور حاصل کر رہے تھے۔ بلکہ حضرت ابوعبیدہ ؓ کے جو خدمتگار نزدیک تھے اور یہ نظارہ دیکھ رہے تھے وہ بھی اس جہانِ دُنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے نہ کوئی ایسی مجلس یا دعوت دیکھی اور نہ آئندہ دیکھنے کی اُمید ہے۔ حضور پاک ﷺ کی یاد اور اُن کی رفاقت کی باتیں حضور پاک ﷺ کی اپنے رُفقا پر مہربانیاں، شفقتیں، احسان، بھلا کیا یاد کیا ہوگا، کہ وہ کیا تھے۔ اور حضور پاک ﷺ نے اُن کو کیا بنا دیا۔ اور اس قسم کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں بلکہ اپنے عظیم رفیق حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو بھی یاد کیا اور باقی رفقا جو بچھڑ چکے تھے اُن کی یاد بھی آئی۔ حضور پاک ﷺ کے عاشقوں اور غلاموں کا ذکر خیر بھی ہوا، اور کچھ پتہ نہیں یہ مجلس کتنا عرصہ جاری رہی۔

قارئین! اگر کبھی کوئی ایسے ہم نشین مل جائیں جو صرف حضور پاک ﷺ کی باتیں کرتے ہیں تو رات کٹتے دیر نہیں لگتی۔ یا اگر کسی وقت کوئی ایسی گھڑی میسر آجائے تو اُسی کو زندگی کہا جاتا ہے گو ہمارے ہاں الفاظ یہ ہے کہ ''وہ وقت زندگی سے باہر'' تھا۔ کہ باقی زندگی ہم مادیات کے چکر میں گزار دیتے ہیں اور اصلی زندگی وہی ہے۔

بہر حال ان عظیم ساتھیوں نے اُس کھانے کا جو لطف اُٹھایا ہوگا جو امین الامت نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا اور جس ماحول میں وہ کھانا تیار ہوا تھا وہ ماحول سرکارِ دوعالم ﷺ کی خوشبو سے ضرور بر ضرور مہک اُٹھا ہوگا۔ قارئین! اگر یہ پڑھتے وقت آپ کو بھی کچھ خوشبو آجائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا　　　خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

(اقبالؔ)

بیت المقدس کی فتح سے ایک ماہ پہلے صفر سولہ ہجری میں حضرت سعد بن ابی وقاص مدائن کو فتح کر چکے تھے۔ یعنی ایک ہی وقت اُس زمانے کی دو عظیم سلطنتیں پاش پاش ہو رہی تھیں اور وہاں اللہ تعالیٰ اور رسول کے نام کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

ناگاہ فضا بانگ اذاں سے ہوئی لبریز　　　وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار

(اقبالؔ)

گیارہواں باب

بلادِ شام کی دیگر فتوحات

جہاں تک پہلے دو خلفائے راشدین کے سرزمین شام و فلسطین کے لیے جنگی حکمت عملی کا تعلق ہے اس کے تحت عسکری تاریخ کا با مقصد مطالعہ فتح یرموک پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے سب کاروائیاں اس حکمت عملی اور یرموک کی فتح کے ثمرات اور عطیات ہیں۔ چونکہ بعد کے چند سالوں میں کچھ کاروائیاں ضرور ہوئیں، اس لیے اُن کے مختصر بیان سے ہماری کہانی کچھ مکمل ہو جاتی ہے۔ خلیفہ دوم نے بیت المقدس میں دس دن کے قیام کے دوران مختلف اُمراء سے ملاقات کی اور اُن سے حالات سنے۔ بعض کے ساتھ تفصیلی بات چیت بھی ہوئی اور مدینہ جانے سے پہلے کچھ فیصلے کیے جن کا مورخین نے بڑا سرسری ذکر کیا ہے۔ ذکر درج ذیل ہے:۔

۱۔ جابیہ کو مکمل طور پر چھاؤنی بنا دیا جائے اور یہی مقام مدینہ شریف اور بلادِ شام کے لیے رابطہ کے طور پر استعمال ہوگا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جو شام کے سپہ سالارِ اعظم ہیں اُن کا یہ ایک مرکز ہوگا جس کو وہ ضرورت کے تحت استعمال کر سکیں گے۔

۲۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ شمالی شام میں حمص سے آگے انطاکیہ اور شمالی شام کے ساحلی علاقوں میں اب مکمل طور پر اللہ اور رسول کا نام بلند کریں گے۔

۳۔ جناب یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ فتح بیت المقدس کے وقت بھی جابیہ سے واپس دمشق چلے گئے تھے کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ بھی شمالی شام میں حمص سے بیت المقدس کی فتح میں شریک ہوئے تھے۔ اُن کا وہاں ہونا ضروری تھا کہ شمال میں رومیوں پر نظر رکھی جائے۔ اب جب جناب خالد رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شمال میں چلے جائیں گے تو جناب یزید رضی اللہ عنہ تھوڑے لشکر کے ساتھ دمشق کا بندوبست سنبھالیں گے وہ لشکر کا زیادہ حصہ اپنے چھوٹے بھائی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیں گے جو قساریہ کا دوبارہ محاصرہ شروع کریں گے۔

۴۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص قساریہ سے جنوب کے علاقے یعنی باقی ماندہ فلسطین کا انتظام سنبھال لیں گے۔ دراصل جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی نظر مصر پر تھی اور اُن کو خیال تھا کہ جب تک اسکندریہ پر قبضہ نہیں ہو جاتا۔ اہل روم

مصر کے راستے سمندر کو استعمال کر کے فلسطین و شام کے ساحل کے لیے ہر وقت خطرہ پیدا کرتے رہیں گے۔ اس لیے وہ جنوبی فلسطین ہی میں رہنا چاہتے تھے خلیفہ دوم کے ساتھ انہوں نے اس سلسلہ میں بات چیت بھی کی۔ اور یہاں پر سرسری اشارہ ہی کافی ہے کہ افریقہ کی فتح کے لیے بنیادی اینٹ رکھی جا رہی تھی تفصیل تیسری کتاب میں ہے۔

۵۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جناب شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کے لیے کوئی کام باقی نہ رہ گیا تھا۔ کچھ راویوں کا خیال ہے کہ اردن اور شمالی فلسطین کا عامل جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ہی مقرر کر دیا گیا کہ قساریہ میں وہ ایک جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ کام بیت المقدس کی فتح سے جلد بعد کیا گیا یا قساریہ کی فتح کے بعد ایک چیز واضح ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کے بیت المقدس آنے کے بعد جناب شرجیل رضی اللہ عنہ کا نام کسی امیر یا بڑے کمانڈر کے طور پر نہیں آتا۔ اسی لیے ممکن ہے کہ اُن کے لشکر کا کافی حصہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا گیا ہو اور کچھ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو، کہ وہ بھی جنگوں میں مصروف ہونے والے تھے۔ البتہ جناب شرجیل رضی اللہ عنہ اس کے بعد ملک شام میں ہی رہے اور طاعون کی وبا میں اُن کو بھی شہادت نصیب ہوئی۔

اسلام میں امارت پر تبصرہ

اسلام میں امارت نہ کسی کا حق ہے اور نہ اُس کو دی جاتی ہے جو اس کی چاہت کرے اور اسلام کے لحاظ سے کسی بھی امیر کے ماتحت کام کرنا ضروری ہے اور امارت کا یہ تصور ہرگز نہیں جو آج کل ہم لوگوں میں ہے۔ اس لیے اگر جناب شرجیل رضی اللہ عنہ کو ضرورت کے تحت امارت سے ہٹا دیا گیا تو بڑی معمولی بات تھی۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے ماتحت کام کیا۔ اور اب جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اُن کے ماتحت تھے۔ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح، جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بھی اُن کے ماتحت کام کر چکے تھے اور متعدد عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ اور اُن کے والد جناب زید رضی اللہ عنہ بن حارث کے ماتحت کام کیا۔ اس پہلو کو آگے چل کر جناب خالد رضی اللہ عنہ کی سبکدوشی کے وقت اور زیادہ واضح کیا جائے گا۔ ویسے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ یمامہ کے وقت سے جنگوں میں شرکت کر رہے تھے۔ وہ کاتب وحی بھی رہ چکے تھے۔ جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی دوررس نگاہ بھانپ چکی تھیں کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے ذہین اور تدبر والے ہیں اور آئندہ اُن پر جو ذمہ داریاں آنے والی تھیں اُن کے لئے اُن کو تیار کرنے کے لیے آپ کو اردن کا عامل بنا دیا۔

قساریہ کا دوسرا محاصرہ

بیت المقدس کی فتح کے بعد پہلی فوجی کارروائی قساریہ کا محاصرہ تھا، جو جناب معاویہ ؓ بن ابوسفیان ؓ نے کافی بڑے لشکر سے کیا۔ جس کی تعداد کے بارے میں مورخین خاموش ہیں۔ لیکن رومیوں کی تعداد اسی ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے تو اسلامی لشکر بھی پندرہ بیس ہزار کے قریب ضرور ہوگا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جنگ یرموک سے پہلے بھی جناب معاویہ ؓ نے قساریہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا جو بعد میں اٹھانا پڑا۔ اس لئے یرموک کی فتح کے بعد کچھ افراد نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ بیت المقدس سے پہلے قساریہ کو فتح کیا جائے اور اس کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ بہر حال اب ربیع الثانی یا جمادی الاوّل سولہ ہجری میں قساریہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔

محاصرے کی کاروائی کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی اور محاصرہ تین طرف سے تھا سمندر پر اس وقت تک مسلمانوں کا کنٹرول نہ تھا۔ لیکن روایت ہے کہ کوشش جاری تھی اور اس علاقے کے نومسلم ملاح اسلامی لشکر میں شامل ہو چکے تھے۔ آگے بھی بحری جنگوں کی ابتداء جناب معاویہ ؓ نے کی اس لیے ممکن ہے کہ اس کی بسم اللہ آپ ہی نے قساریہ سے شروع کی ہو۔ قساریہ کی جنگ کے مورخین یہی کہتے ہیں کہ رومی قلعہ سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتے تھے اور مار کھا کر پھر قلعہ بند ہو جاتے تھے۔ آخری بار ذرا زیادہ گھمنڈ میں آگئے یا مسلمانوں نے اپنی پسپائی کی شہہ دی۔ جس سے وہ زیادہ ہی باہر نکل آئے۔ اور مار بھی کچھ اتنی زیادہ کھائی کہ قلعہ کے دروازے نہ بند کر سکے اور قساریہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ بعض روایت کے مطابق محاصرہ ایک سال یا اُس سے زیادہ عرصہ جاری رہا۔

قساریہ کی فتح حکمتِ عملی کے لحاظ سے بڑی اہم تھی۔ کہ اہل روم کا فلسطین کے ساحلی علاقوں سے قلع قمع ہو گیا۔ اور اس کی سخت ضرورت تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اوپر والے علاقوں میں بیروت اور اطاکیہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اب مسلمانوں نے اپنا رخ افریقہ کی طرف پھیرنا تھا اور مصر پر قبضہ کرنے کے لیے فلسطین و شام کے سارے سمندری ساحل پر مسلمانوں کا قبضہ ہونا لازی تھا تا کہ اہل روم ان بندرگاہوں کے ذریعے مصر کو کوئی کمک نہ بھیج سکیں۔ اور مصر پر قبضہ اس لیے ضروری تھا کہ مصر کے علاقہ کو استعمال کر کے اہل روم شام و فلسطین کے ساحلوں پر قبضہ کی دوبارہ کوشش نہ کریں۔

شمالی شام

جناب ابوعبیدہ ؓ اب شمالی شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جناب خالد ؓ کے دستے پہلے ہی حمص میں موجود تھے اور جناب ابوعبیدہ ؓ سپہ سالار اعظم کے طور پر حمص تک ایک چکر لگا چکے تھے۔ نقشہ دوازدہم اور نقشہ

سیاز دہم شام کے شمالی علاقوں کے محل وقوع اور پرانے شہروں اور پرانے قلعہ کے راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہاں بھی حکمت عملی یہی تھی کہ پہلے مشرقی حصوں کو فتح کیا جائے جو ریگستان یا عراق کی سرحد کے ساتھ ملتے ہیں اور پھر ساحلی علاقوں پر توجہ دی جائے۔ شیراز تک کے علاقے تو مسلمان جنگِ یرموک سے بھی پہلے فتح کر چکے ہیں۔ اب ان علاقوں میں جب مسلمان دوبارہ داخل ہوئے تو لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور جشن منائے۔

مسلمانوں کا طریق کار

چنانچہ حمص سے آگے مسلمانوں نے پہلے قنا سرین اور...... کا رُخ کیا۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ اپنے متحرک دستوں کے ساتھ جیش المقدم کا کام کر رہے تھے۔ قنا سرین کا رومی کمانڈر فیاس تھا جو بہادر آدمی تھا۔ اُس نے قلعہ بند ہو جانے کے بجائے قنا سرین سے نکل کر کھلے میدان میں حاضر کی مقام پر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔

حاضر کی جنگ

حاضر کا مقام قنا سرین سے تقریباً دو میل جنوب کو تھا اور کچھ مبصرین کا یہ خیال بھی ہے کہ کھلے مقابلہ کی بجائے فیاس نے حاضر کے مقام پر اسلامی لشکر کے خلاف گھات لگانے کی کوشش کی۔ مسلمان البتہ چوکنے تھے جنہوں نے فیاس کے لشکر کو تہ دبالا کر ڈالا۔ مورخین جنگ کی تفصیلات کے بارے خاموش ہیں لیکن سب یہ ضرور کہتے ہیں کہ فیاس نے بڑا داؤ لگایا تھا اور اس جنگ میں جناب خالد رضی اللہ عنہ نے چوکنا ہو کر دشمن سے برتر حربی خوبیوں سے داؤ لگا کر کچھ ایسی کاروائیاں کی تھیں، کہ لوگ عش عش کر اُٹھے، اور خلیفہ دوم کے پاس جب خبر پہنچی اور خاص کر امین الامت جناب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جب پوری تفصیل لکھی تو جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور جناب خالد رضی اللہ عنہ کے لیے بڑی دعائیں کیں۔ البتہ وہاں کے لوگ مسلمانوں کی آمد کے مدت سے منتظر تھے کہ مسلمانوں کے حسن اخلاق کی اُن کو خبر مل چکی تھی، اس لئے انہوں نے اسلامی لشکر کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حاضر کی جنگ ایک بہت بڑی جنگ تھی کہ خلیفہ دوم نے اتنی تعریف کی۔

قنا سرین کی فتح

حاضر کی فتح کے بعد اسلامی لشکر نے قنا سرین کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور جو لوگ فیاس کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمانوں نے قنا سرین کا محاصرہ کر لیا اور ساتھ ہی لوگوں کو خبردار کیا کہ مسلمان ان علاقوں میں اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے نفاذ کے لئے پہنچ چکے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ وہ لوگ راہِ راست پر آ جائیں۔ مسلمانوں کا پیغام سن کر قلعہ بند لوگوں نے غیر مشروط طور پر مسلمانوں کا باجگزار بننا منظور کر لیا

یہ جمادی الاوّل سولہ ہجری کا واقعہ ہے۔

حلب

اس کے بعد جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور جناب خالد رضی اللہ عنہ نے مل کر حلب کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہاں اہل روم کی طرف سے جوشم نامی ایک جنرل متعین تھا اور اس کی بہادری بھی مانی ہوئی بات تھی اُس نے بھی فیاس کی طرح شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور بری طرح مار کھائی۔ لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور حلب میں جا کر قلعہ بند ہوگیا۔ مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جوشم نے قلعہ سے نکل کر کئی دفعہ مسلمانوں پر حملے کئے وہ اس امید میں تھا کہ قیصر روم اُس کی مدد ضرور کرے گا، لیکن ہرقل کی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچ سکی۔ جوشم بہادر آدمی تھا دو تین ماہ تک لڑائی لڑتا رہا اور حلب، رمضان سولہ ہجری میں فتح ہوا۔ لیکن جوشم پہ اللہ تعالی نے رحمت کی کہ وہ مسلمان ہو گیا اور جوشم کی سفارش پر جو رومی سپاہی یورپ جانا چاہتے تھے اُن کو اجازت دے دی گئی کہ وہ ادھر جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مالک اشتر کے ماتحت ایک دستہ عزاز پر لشکر کشی کے لیے بھیجا۔ اسلام کی گود میں آنے والے نئے جنرل جوشم بھی اُن کے ساتھ تھے۔ مالک اشتر نے عزاز پر قبضہ کر کے اُن لوگوں کو بھی باجگزار بنالیا اور...... کی طرف واپس آ گئے۔ مالک اشتر کو اشتر نخعی بھی کہتے ہیں آپ بہادر آدمی تھے۔ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آپ کا ذکر اکثر آئے گا۔

انطاکیہ

کچھ مورخین کے لحاظ سے انطاکیہ ہی ہرقل کا ایشیائی دارالخلافہ تھا اور ہرقل نے اپنی زندگی کا کافی حصہ ایشیاء میں گزارا تھا۔ پہلے اہل ایران کے ساتھ جنگوں کی وجہ سے اور پھر اپنے علاقوں کی بازیابی کے بعد ابھی شکرانے ہی ادا کرتا پھرتا تھا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام مل گیا کہ اسلام کی آغوش میں آ ؤ۔ اور اس کے چند سال بعد مسلمانوں اور اہل روم کی جنگیں چھڑ گئیں چنانچہ ہرقل نے بیت المقدس اور دمشق میں بھی شاہی دربار لگائے اور حمص کو بھی کچھ عرصہ دارالخلافہ بنایا۔ لیکن اجنادین کی شکست اور مسلمانوں کے دمشق کو فتح کر لینے کے بعد ہرقل نے حمص کو چھوڑ کر انطاکیہ کو دارالخلافہ بنا لیا۔ اور یرموک کی جنگ کے بعد انطاکیہ کو چھوڑ کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ گو اُس کی فوج شمالی شام میں موجود رہی۔ مسلمان انطاکیہ پر جلد قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ساحلی راستہ استعمال کرنے کی بجائے انہوں نے مشرقی راستہ اختیار کیا اور حلب سے انطاکیہ کی طرف کوچ کر دیا۔

مسلمانوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی شہر کا تب محاصرہ کرتے تھے کہ اُس کے ارد گرد ایسے حالات پیدا کئے جائیں

کہ دشمن کو یہ ہمت نہ پڑے کہ وہ محاصرہ کرنے والوں کا ''محاصرہ'' کر دے۔ پہلی کتاب کے تیرھویں باب میں دومۃ الجندل کے سلسلے میں اس پہلو کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ شہروں کا محاصرہ مجبوری کی حالت میں کیا اور اگر محاصرہ اٹھا لینے سے کوئی خاص نقصان نہ ہوتا تھا تو محاصرہ اٹھا بھی لیتے تھے۔ شہروں کی جنگ پچھلے سو یا دو سو سالوں میں کچھ زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی، کہ اس میں کچھ تفاخر تھا۔ کچھ مال و دولت تھی اور قبضہ بھی رکھا جاسکتا تھا کہ حکومت کے پاس چھوٹے فائر کرنے والے ہتھیار یعنی رائفل وغیرہ ہوتے تھے، اور شہریوں کے لئے ان ہتھیاروں کا بارود رکھنا یا اُن سے لڑنا مشکل تھا، کہ جلد پتہ لگ جاتا تھا کہ فلاں جگہ سے مخالفت ہو رہی ہے۔ لیکن اب پھر شہروں پر قبضہ کرنا مہنگا پڑتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کو لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں بہت نقصان ہوا۔ اب اسرائیل کا بیروت میں جو مقابلہ ہوا ایسا مقابلہ کسی اور جگہ نہ ہوا۔ پھر آج کل کے زمانے میں تلوار کے ساتھ شہروں پر قبضہ رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ شہر پر تب قبضہ رکھا جاسکتا ہے کہ ایسے شہروں کے لوگوں اور قبضہ رکھنے والے کا سیاسی فلسفہ ایک ہی قسم کا ہو یا ایک ہو۔

انطاکیہ پر حملہ

چنانچہ جناب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے انطاکیہ پر مشرقی راستے سے حملہ کیا۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اہل روم کی وہاں پر کافی فوج موجود تھی جنہوں نے شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور گھمسان کا رن پڑا۔ جس پر متعدد رومی تہ تیغ ہوئے۔ مورخین کے لحاظ سے رومیوں کے لیے یرموک اور اجنادین کی جنگوں کے بعد یہ تیسرے نمبر پر مہنگی جنگ تھی کہ اُن کا بے پناہ جانی نقصان ہوا۔ لیکن جنگ کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ جو رومی قلعہ کے باہر لڑ رہے تھے انہوں نے نہایت افراتفری میں میدانِ جنگ کو چھوڑ دیا۔ جو لوگ انطاکیہ کے قلعہ میں رہ گئے تھے انہوں نے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا لیکن وہ تعداد میں زیادہ نہ تھے۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے بھی غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ شوال سولہ ہجری کا واقعہ ہے۔ اُس زمانے میں عراق کے محاذ پر مسلمان موصل تک پہنچ چکے تھے جس کا ذکر پہلی کتاب کے چوبیسویں باب میں ہو چکا ہے۔

انطاکیہ پر قبضہ کرنے کے بعد اسلامی لشکر کے دستے شمال کی طرف سے جنوب کی طرف کے ساحلی علاقوں کی طرف بڑھے اور انہوں نے انطاکیہ اور جبلہ کے بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ نیچے سے جناب یزید رضی اللہ عنہ کے دستوں نے آگے بڑھ کر بیروت پر قبضہ کیا۔ اور اب شام کے سارے ساحلی علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ انطاکیہ پر قبضہ کرنے کے بعد جناب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ وہاں سے حلب واپس آ گئے اور مشرق میں منبج تک کے علاقوں کو فتح کیا اور آخر میں خود حمص واپس چلے گئے کہ یہ اُن کا آگے والے یعنی ایڈوانس ہیڈ کوارٹر تھا اور جابیہ پیچھے والا یا ایئر ہیڈ کوارٹر تھا۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ

نے قیام کے لیے قناسرین کے مقام کو چنا اور آپ ﷛ مسلمانوں کے اگلے دستوں کے کمانڈر اور شمالی شام کے عامل تھے۔ وہ دشمن پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ کہ آگے والی سرحدی ذمہ داری اُن کی تھی۔

مفتوحہ علاقے

بلادِ شام و فلسطین میں اب حالات مکمل طور پر مسلمانوں کی مرضی کے مطابق ہو چکے تھے اور تمام علاقے جو فتح کیے گئے تھے ان میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام نافذ کئے جا رہے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں عاملوں کے علاوہ مبلغ اور وصولی کرنے والے حاکم مقرر کر دیئے گئے تھے اور علاقوں کی حدود مقرر کیے گئے۔ کہ وہ کس کی عملداری میں آتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں امرا کو مقرر کیا کہ سول نظام چلا رہے تھے۔ علاقہ کے لوگوں کو حکومت میں شریک کیا جاتا اور علاقہ کے نومسلم لوگوں کو اُس علاقہ کا نظم ونسق سپرد کر دیا گیا۔ ادھر ایران و عراق میں اُس وقت تک مسلمانوں نے مشرق کا رخ نہ کیا تھا۔ جناب سعد ﷛ بن ابی وقاص نے مدائن کو فتح کرنے کے بعد جلولہ، تکریت اور موصل کا رخ کیا۔ اور دریائے فرات کے ساتھ ساتھ انبار اور فراض وغیرہ پر پہلے قبضہ ہو چکا تھا مسلمانوں نے سول نظام کے لیے جو طریق کار اختیار کیے وہ الگ کتاب کا مضمون ہے۔ لیکن اوپر سے لے کر نیچے تک وظائف اور سالانہ اخراج پورے کرنے یا پنشن کے جو طریقے مقرر کئے اُن کو پڑھ کر مغربی مبصر حیران ہو جاتے ہیں کہ اُس زمانے میں اتنا اعلیٰ پایہ کا نظام تھا جب بہت کم لوگ لکھے پڑھے تھے۔ اور لکھنے کے لیے کاغذ تک میسر نہ تھے۔ ہم صرف یہی کچھ کہیں گے کہ مسلمانوں میں دیانتداری تھی اور اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اُن کی زبان کی اہمیت تحریر سے بڑھ کر ہوتی تھی۔ اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ یاددہانی کے لیے لکھ لیا کریں ورنہ مسلمان زبانی حکومت چلا سکتے تھے۔

جزیرہ

عراق اور شام کے سرحدوں کے درمیان صرف ایک ایسا علاقہ باقی رہ گیا تھا۔ جس پر مسلمانوں کا قبضہ نہ ہوا تھا اور اس کو جزیرہ کہتے تھے۔ نقشہ دوازدہم اور چہاردہم سے اس علاقہ کے محل وقوع سے معلوم ہوگا کہ یہ علاقہ وہ ہے۔ جہاں موجودہ عراق، شام اور ترکی کی سرحدیں ملتی ہیں یہ علاقہ دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے بالائی حصوں اور معاونوں سے گھرا ہوا ہے۔ بلکہ جزیرہ کے بیچ جزیرے ہیں۔ یعنی کئی معاون دریا یہاں بہتے ہیں۔ ویسے جغرافیائی لحاظ سے اس کو جزیرہ نہیں کہہ سکتے کہ خشکی کے "ایسے" ٹکڑے موجود ہیں۔ جہاں سے کوئی دریا نہیں گزرتا لیکن یہ جگہیں تھوڑی ہیں نقشہ سے یہ ظاہر ہے کہ عراق میں یہ علاقہ موصل کے مغرب اور شمال مغرب میں ہے۔ اور شام میں حلب سے شمال مشرق میں۔

ظاہر ہوتا ہے اُس زمانے میں حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا کہ اس علاقے کو فتح کیا جائے۔اس علاقے کے کافی حصے اہل روم کے باجگزار تھے لیکن قیصرِ روم اس قابل نہ تھا کہ اس طرف کوئی لشکر بھیج کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے۔ بہرحال اس کو فکر یہ بھی تھی کہ مسلمان اناطولیہ کی طرف یا آبنائے باسفورس کی طرف جلد پیش قدمی کر کے اُس کی سلطنت کو ختم کر دیں گے اس لیے اُس نے ایک چال چلی کہ مسلمانوں کی توجہ جزیرہ کے علاقے کی طرف ہو جائے۔ اُس نے وہاں آباد لوگوں کو مبلغوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔اس علاقہ کے لوگ کچھ جنگجو قسم کے بھی تھے جن میں کرد، ترکمان، دروز اور آرمینیا نسل کے کئی قبیلے شامل تھے۔ مذہب کے لحاظ سے یہ لوگ بھی نصرانی تھے۔تو قیصرِ روم نے ایک تجویز کے تحت ان تمام لوگوں میں اتحاد پیدا کیا اور یہ لوگ ایک لاؤ لشکر تیار کر کے بلادِ شام کی طرف چل پڑے۔ مسلمان دستے شمالی شام کے دور دراز مقامات میں پھیلے ہوئے تھے ان چھوٹے چھوٹے دستوں کے لیے اتنے بڑی ٹڈی دل قسم کے لشکر کے ساتھ الگ مقام پر مقابلہ کرنا فوجی لحاظ سے ٹھیک نہ ہوتا۔

جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے تھے کہ خطرہ کتنا بڑا ہے۔ اُدھر کے کچھ دستے ساحلی علاقوں میں اترنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یا تو انطاکیہ کو دوبارہ حاصل کر لیا جائے یا کم از کم مسلمانوں کے لیے ساحلی علاقوں میں کچھ خطرات پیدا کیے جائیں۔ کچھ مورخین کے لحاظ سے رومی دستوں نے کچھ علاقوں پر دوبارہ قبضہ بھی کر لیا تھا۔

جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ردعمل

چنانچہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق اپنی منتشر طاقت کو اکٹھا کیا اور تمام چھوٹے چھوٹے دستوں کو حمص میں اکٹھا ہونے کے احکام جاری کر دیئے مسلمانوں نے ایسی کارروائی تیسری بار کی پہلے اجنادین کے مقام پر دوسری دفعہ یرموک کی دوسری جنگ کے موقع پر اور تیسری دفعہ حمص کے مقام پر۔اب فرق یہ تھا کہ جنوب میں دستوں کو دمشق وغیرہ سے نچلے مضافات پر اپنے کام پر رہنے دیا۔ روایت ہے کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ آگے بڑھ کر جزیرہ سے پیش قدمی کرنے والے بے ترتیب لشکر کو کسی بھی میدانی علاقہ میں تہ تیغ کر دیا جائے لیکن جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بہتر سمجھا کہ پہلے اپنی طاقت کو اکٹھا کر کے دشمن کے بارے میں صحیح اندازہ لگایا جائے۔ ساتھ ہی حمص کا مقام ایسا تھا جس کی چار دیواری دمشق سے بہتر تھی اور ٹڈی دل بے ترتیب لشکر کے سامنے کچھ عرصہ قلعہ بند ہو جانے میں کوئی ہرج نہ تھا۔ گو مسلمان ساکن جنگ کو پسند نہ کرتے تھے۔

جناب خالد رضی اللہ عنہ کی تجویز بھی ٹھیک تھی کہ اس قسم کی ''جذباتی اور بے ترتیب'' فوج کسی میدانِ جنگ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کسی اور تجویز کے تحت کام کر رہے تھے۔ انہوں نے مدینہ شریف میں خلیفہِ دوم کو حالات سے آگاہ کیا اور اپنی تجویز بھی لکھی کہ اہل جزیرہ کے حمص آ جانے کے بعد پورے کا پورا دشمن

مسلمانوں کے رحم پر ہوگا اور اگر اسی دوران عراق سے کچھ دستے جزیرہ کی طرف پیش قدمی کریں تو دوطرفہ کارروائی سے سارے دشمن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر اسی دوران سمندر کے راستے ہرقل کی کوئی فوج اہل جزیرہ کی امداد کے لیے آ جاتی ہے تو جناب ابوعبیدہ ﷛ دونوں حملہ آوروں کا کئی دن تک حمص میں قلعہ بند ہو کر مقابلہ کر لیں گے۔

معاملات فکرمندی کے بالکل نہ تھے یہ سب کچھ ایک تجویز کے تحت ہو رہا تھا لیکن چونکہ ایک طرف خلیفہ دوم خود مدینہ سے چل پڑے۔ اور ادھر آپ ﷛ نے جناب سعد ﷛ بن ابی وقاص کو مدائن میں لکھا کہ کچھ دستے اہل جزیرہ کی سرکوبی کے لیے وہ جزیرہ کے علاقہ میں بھیجیں۔ اور ایک دستہ جناب قعقاع ﷛ بن عمرو کے ماتحت جناب ابوعبیدہ کی مدد کے لیے حمص بھیجیں۔

کچھ مورخین اور مبصرین نے صورت حال کو بھیانک بتایا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جناب فاروق اعظم ﷛ مدینہ سے بعد میں چلے بھی، لیکن جب وہ جابیہ کی چھاؤنی میں پہنچے تو حالات ٹھیک ہو چکے تھے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ظاہر ہے کہ جناب فاروق اعظم ﷛ آگے اس لیے آ رہے تھے کہ دو محاذوں کی افواج نے مل کر کام کرنا تھا۔ اور اگر حالات جلدی سے مسلمانوں کی مرضی کے مطابق نہ ہوتے تو جناب فاروق ﷛ کے نزدیک ہونے سے تجویز میں تبدیلی اور طاقت جلدی سے پیدا کی جا سکتی تھی۔ اور ایسی کوئی بات نہ تھی کہ حالات بھیانک تھے تو اس وجہ سے جناب عمر فاروق ﷛ آئے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جناب یزید ﷛ کا لشکر دمشق میں، جناب معاویہ ﷛ کا قساریہ کے محاصرہ میں۔ اور جناب عمرو ﷛ بن عاص کا لشکر فلسطین میں موجود تھے۔ جناب ابوعبیدہ ﷛ سپہ سالار اعظم تھے اور اگر حالات بھیانک ہو جاتے تو آپ اُن لشکروں سے مدد مانگتے یرموک کے وقت کہیں سے مدد نہ مانگی۔ اور اب حالات کونسے بھیانک تھے۔ یہ غیر فوجی ذہنوں کی لفاظی ہے، اور جس کسی فوجی مبصر نے ایسا لکھ دیا کہ حالات بھیانک تھے تو وہ غیر فوجیوں کی لفاظی کے چکر میں آ گیا۔ حالات اتنے اچھے تھے کہ جناب عمرو ﷛ بن عاص فلسطین میں مجاہدین کو اکٹھا کر کے مصر پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور انہوں نے اگلے سال یہ کارروائی کی جس کا ذکر تیسری کتاب میں ہوگا۔ یہاں جو کچھ کیا گیا، حکمت عملی اور ضرورت کے تحت کیا گیا۔ اور آسانی کو مدنظر رکھا گیا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان دشمن کے ردعمل کو معلوم کر لینے کے بعد سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور پھر تجویز کے تحت کارروائی کرتے تھے اور ہماری طرح نہ تھے کہ دشمن ہم کو بے خبری میں آ لیتا ہے۔

جناب سعد ﷛ کی کارروائی

جناب فاروق اعظم ﷛ نے جناب سعد ﷛ بن ابی وقاص کو جزیرہ کی کارروائی کے لیے تفصیل کے ساتھ احکام دیئے۔ انہوں نے تین لشکر جزیرہ میں روانہ کئے۔ ایک جناب عیاض ﷛ بن غنم کے ماتحت، ایک خالد ﷛ بن

عرفطہ کے ماتحت اور تیسرا اپنے بھتیجے ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ کے ماتحت۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صرف عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم آگے گئے کہ خبر ملی کہ اُس علاقہ میں زیادہ فوج نہ تھی جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم نے آگے اپنے لشکر کو تین دستوں میں تقسیم کیا۔ ایک دستہ سہل رضی اللہ عنہ بن عدی کے ماتحت رقہ بھیجا اور دوسرا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عتبان کے ماتحت نصیبین۔ اور پھر ان دونوں لشکروں نے مل کر حراں اور رہا کو فتح کیا۔ تیسرے دستہ کو جناب ولید رضی اللہ عنہ بن عتبہ کے ماتحت جزیرہ کے قبائل ربیعہ اور تنوج کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کسی تعارف کے محتاج نہیں حصہ اول میں دومتہ الجندل کی مہم کے سلسلہ میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ آپ جناب خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ عراق سے شام آئے تھے اور پھر ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ کے ماتحت شام سے عراق چلے گئے تھے جہاں قادسیہ کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ اب جزیرہ کے علاقہ کو تاخت و تاراج کرنے یا وہاں حربی مظاہرہ کرنے کے بعد شام میں جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لیے آپ موزوں سپہ سالار تھے علاوہ آپ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد اور چچیرے بھائی تھے۔

دوسرے موزوں سپہ سالار جناب قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو تھے جن کے بارے خلیفہ دوم احکام دے چکے تھے کہ وہ ایک لشکر کے ساتھ حمص تک کے علاقہ میں جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ اسلام کے ایک عظیم فرزند ہیں۔ اور جنگ قادسیہ میں شرکت کے لیے عراق گئے تھے اب دوبارہ شام میں آ کر عراق اور شام کی فتوحات کو مکمل کرنے کی شرکت کی سعادت اُن کا حق تھا جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو نصیب کیا۔ کہ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ وہ اکیلے مجاہد تھے جن کو جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب خالد رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے یمامہ اس وقت روانہ کیا جب وہ عراق کی فتوحات کی بسم اللہ کر رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں اوّل تو کوئی ایسی مثال نہیں کہ کبھی امداد کے طور پر لشکر کے لیے صرف ایک آدمی بھیجا گیا ہو۔ اور شاید کوئی ایسی بات ہو تو ایسے اکیلے آدمی نہ اتنی ذاتی مبارزتوں میں حصہ لیا ہوگا۔ اور نہ ہی اتنے تعاقب کئے ہوں گے۔ شام کی فتوحات کے سلسلہ میں ہم جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کی شرکت کی وجہ سے اُن کو ایک دفعہ پھر سلام کرتے ہیں۔ اور کتنے عظیم تھے وہ ماں و باپ جن کے بیٹے قعقاع رضی اللہ عنہ اور عاصم رضی اللہ عنہ جیسے ہوں۔

چنانچہ جن مورخین کے حساب سے جناب قعقاع رضی اللہ عنہ صرف قرقستیا تک آئے ہمارا ان کے ساتھ اتفاق نہیں ہے۔ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ حمص تک آئے کہ گو اُن کے آنے سے پہلے جزیرہ کے قبائل منتشر ہو چکے تھے۔ لیکن روایت ہے کہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم سے پوچھا کہ مال غنیمت میں جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کے لشکر کا حصہ ہوگا یا نہیں تو جناب عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان کو مال غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا کہ وہ لوگ کامیاب ہوئے۔ اور قبائل کچھ اس وجہ سے بھی منتشر ہوئے کہ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کو لشکر کی آمد کی خبر ان کو مل گئی تھی۔

جزیرہ کے قبائل

جزیرہ کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف کارروائی مہنگی پڑی وہ گھروں کو خیر باد کہہ کر چل پڑے تھے اور اُن کے گھروں میں جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کے لشکر پہنچ گئے جنہوں نے سارے علاقہ کو فتح کرڈالا۔ایک قرقیشا کا شہر رہ گیا تھا اُس کو جناب قعقاع رضی اللہ عنہ نے اپنی پیش قدمی کے دوران فتح کرلیا۔ بے ترتیب قبائل کوئی کارروائی نہ کرسکے جب حمص کے نزدیک پہنچے تو جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن کی بے ترتیبی کو دیکھتے ہوئے اُن پر حملہ کردیا اور وہ سارا سامان اور بار برداری کے اونٹ وغیرہ تک وہاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔وہ جب منتشر ہوکر بھاگتے جارہے تھے تو آگے سے جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کے لشکر نے اُن کو نقصان پہنچایا۔اور اُن کا علاقہ جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم نے فتح کرلیا تھا۔

جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کی علمداری

جب قعقاع رضی اللہ عنہ تو حمص سے واپس چلے گئے لیکن جناب عیاض رضی اللہ عنہ نے چند دستے جزیرہ کے اہم مقامات پر چھوڑ دیئے اور خود کچھ لشکر کے ساتھ حمص میں جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رابطہ قائم کرلیا۔اُس زمانے میں ہرقل کی کچھ فوجوں کی طرف سے خطرہ تھا کہ ساحلی علاقوں میں وہ اترنے کی کوشش کریں گے۔چنانچہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جناب خالد رضی اللہ عنہ اور جناب عیاض رضی اللہ عنہ کو انطاکیہ وغیرہ کی طرف حربی مظاہروں کے لیے بھیجا اور کوئی اکا دکا رومی جو مخبری کے لیے وہاں تک آئے بھی تھے۔وہ بھی واپس بھاگ گئے۔اس لیے مسلمانوں نے جو علاقے فتح کئے تھے۔اُن پر اپنی علمداری کو بحال کردیا البتہ مفتوحہ علاقوں میں بہت زیادہ وسعت ہوچکی تھی۔اس لیے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم کو لکھا کہ اگر جزیرہ کے علاقوں کو شام کی عملداری میں شامل کرنا ہے۔تو جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کو بھی ادھر ہی رہنے دیا جائے۔کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ اکیلے طور پر سارے علاقوں کی دیکھ بھال نہ کرسکیں گے۔خلیفہ دوم نے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے رائے سے اتفاق کیا اور جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم اپنے لشکر سمیت شام کی اسلامی افواج کا حصہ بن گئے اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ ایران کے محاذ پر مشرق کی طرف نہاوند کارخ ہونے والا تھا۔

یہ تھی جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عراق وشام کو فتح کرنے کی حکمتِ عملی جس کو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے پروان چڑھایا۔اور وہ اب خود باقی ماندہ ایران اور مصر کو فتح کرنے کی حکمتِ عملی بنارہے تھے۔

فاتحین شام کے زندگی کے آخری ایام

شام وفلسطین کی فتوحات کے بیان کو ختم کرنے سے پہلے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے چند ساتھیوں کے شام میں آخری ایام اور وفات کا ذکر ضروری ہے۔کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق موت ایک دروازہ ہے اور

حضور پاک ﷺ کے فرمان کے مطابق موت کے بعد مومن کی طاقتیں ستر گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا اَلدُّنیَا سِجنُ المؤمِنِ وَجنۃُ الکَافِرِ یہ دنیا تو ہمارے لیے ایک قید خانہ کی طرح ہے اور یہاں پر ہم امتحان کے لیے آئے ہیں۔ دنیا میں اچھے کام کرنے میں یہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ کام آخرت کے لیے جزا کا کام دیتے ہیں۔ اسی لیے زندگی کے بیان کی نسبت موت کے بیان کو بہتر ولولے سے بیان کرنا چاہیے اسی طرح فوج یا نوکری سے ایک دن سبکدوشی ہوتی ہے اور اگر عزت کے ساتھ کسی کو سبکدوش کر کے وظیفہ یا پنشن دے دی جائے تو اُس کا ذرا بھر بھی افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ گو اسلام میں سبکدوشی کے لیے کسی عمر کا تعین نہیں ہے اور ستر یا اسی سالہ مجاہدوں نے جنگ میں حصّہ لیا۔ بدن کے کئی حصّوں سے معزور مجاہدین بھی جنگ میں حصّہ لیتے رہے۔

جناب خالد رضی اللہ عنہ کی سبکدوشی

شام میں ساری فتوحات کے مکمل ہو جانے کے بعد جناب خالد رضی اللہ عنہ شمالی شام میں مراش کے نزدیک ٹھہرے ہوئے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے غسل کے پانی میں ایک ایسی دوائی ڈالی جس کو موجودہ زمانے کی سپرٹ یا ڈیٹول کے مشابہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوائی بھی کسی ایسی بھٹی میں تیار کی ہوئی تھی جو شراب کی بھٹیوں کے مشابہ تھی۔ اور یہ ایک اس قسم کا عرق بھی بن جاتا تھا جس کو کچھ لوگ شراب کے طور پر نشہ لینے کے لیے استعمال کر لیتے تھے جیسے آج کل چرس وغیرہ دوائیوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اُسی زمانے میں جناب خالد رضی اللہ عنہ کی ملاقات اشعث بن قیس کے ساتھ ہوئی اور جس کا ذکر یمن کے مرتدین کے سلسلہ میں بھی ہو چکا ہے کہ بعد میں اُس کو معافی مل گئی اور ایران کی کئی جنگوں میں شرکت کی، اور بہادری کے جوہر بھی دکھائے۔ اشعث شاعر بھی تھا اور جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کے لشکر کے ساتھ جزیرہ اور شمالی شام آیا ہوا تھا۔ جہاں پہلے جناب خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات کر چکا تھا اور ان کی تمام جنگوں کے احوال سے آگاہ ہوا۔ واپس جا کر اُس نے جناب خالد رضی اللہ عنہ کے تمام کارناموں کو ایک نظم کی شکل دے دی اور یہ نظم جناب خالد رضی اللہ عنہ کو مراش میں آ کر سنائی اور پیش بھی کر دی۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ بڑے خوش ہوئے اور اُس کو ایک ہزار درہم انعام دے دیا۔

جناب عمر رضی اللہ عنہ کی برہمی

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس یہ دونوں خبریں کہ شراب کا غسل کے پانی میں استعمال اور اشعث کو انعام دینے کی خبر ایک ہی وقت پہنچیں۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جواب طلبی کی۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ نے دونوں باتوں کی وضاحت کی کہ پانی میں جو دوائی استعمال کی وہ صرف شراب کے نام سے مشہور ہے اور اشعث کو جو انعام دیا گیا۔ وہ جناب

خالد ؓ کی ذاتی ملکیت تھی۔ خلیفہ دوم کو دونوں جوابات سے تسلی نہ ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ جناب خالد ؓ جیسے مجاہد اعظم کا شراب کی کسی قسم کی چیز کو غسل کے پانی میں استعمال کرنا بھی ایک خراب نمونہ ہے اور گو اسی سلسلہ میں کوئی حد جاری نہیں ہو سکتی یعنی قانونی کارروائی نہیں کر سکتے۔ لیکن کچھ اور کارروائی تو کی جائے۔ اسی طرح اپنی خوشامد سے خوش ہو کر کسی کو انعام دینا بھی صحیح بات نہیں کہ امت کے لوگ اس کی نقل کریں گے۔ اس لیے جناب فاروق اعظم ؓ نے جناب خالد ؓ کو ملازمت سے سبکدوش کر کے مدینہ آنے کے احکام دیئے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے حصہ اوّل میں جناب سعد ؓ بن ابی وقاص جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے ان کی سبکدوشی کا ذکر ہے۔ بلکہ جناب عمار ؓ بن یاسر، جناب مغیرہ ؓ بن شعبہ اور جناب علا ؓ بن الحضرمی کی سبکدوشی کا ذکر ہے اور اس کتاب میں جناب خالد ؓ بن سعید اور جناب شرجیل ؓ بن حسنہ کی سبکدوشی کا ذکر ہے۔ کچھ مبصرین نے لکھا ہے کہ جناب خالد ؓ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایسی چھوٹی باتوں سے درگزر کرنا چاہیے تھا۔ یہ بیان غیر اسلامی ہے کہ حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ پہلی قومیں تباہ اسی وجہ سے ہوئیں کہ امرا کو قانونی رعاتیں دے دیتے تھے۔ اور آپ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی فاطمہ الزہرہ ؓ کا نام لے کر فرمایا کہ اُن کو بھی قصور پر اتنی ہی سزا ملنی چاہیے۔

مبصرین کی حاشیہ آرائی

بعض مبصرین نے اس واقعہ اور جناب خالد ؓ کے سپہ سالارِ اعظم سے ہٹانے کے واقعہ کو ملا کر یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جناب عمر ؓ نے تو خلیفہ بننے کے بعد ہی جناب خالد ؓ کو ہر قسم کی امارت سے ہٹا دیا تھا، اور یہ جو امارت ان کو ملی ہوئی تھی یہ جناب ابوعبیدہ ؓ کی طرف سے تھی یہ دروغ گوئی تو یہاں ہی ختم ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو پھر جناب عمر ؓ، جناب ابوعبیدہ ؓ کو لکھتے کہ اپنے فلاں امیر کو امارت سے ہٹا دو، یہ سب کہانیاں ہیں۔ بیت المقدس کی فتح کے وقت جناب عمر فاروق ؓ نے جناب خالد ؓ کی عزت افزائی کے طور پر اُن کو وہاں ساتھ لے گئے اور جس معاہدہ پر دستخط کئے اُس کے عظیم گواہوں میں جناب خالد ؓ بھی تھے۔ ایک مبصر نے جناب خالد ؓ اور جناب عمر ؓ کی بچپن کی ایک کشتی کا ذکر بھی کیا ہے جس میں جناب خالد ؓ نے جناب عمر ؓ کو گرا لیا اور اُن کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور اُس مبصر کے لحاظ سے جناب عمر ؓ نے جناب خالد ؓ کو کبھی معاف نہ کیا۔ یہ افسوسناک بیان ہے۔ اول تو کسی پرانی تاریخ میں ایسا واقعہ نہیں ملتا اور نہ کہیں حضرت عمر ؓ کی ٹانگ ٹوٹنے کا ذکر ہے۔ پھر یہ بہتان ہے۔ جناب عمر ؓ تو حُبُّ للہ اور بغض للہ کی مثال تھے۔ اور حق و باطل یا سچ و جھوٹ میں فرق کرنے والے تھے تو حضور پاک ﷺ نے اُن کو فاروق ؓ کا خطاب دیا۔ حضرت عمر ؓ کے خلاف ایسا بہتان لگانے سے حضور پاک ﷺ کی بے ادبی ہوتی ہے۔

بات صرف اتنی تھی کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کے باقی ننھیال میں سے کچھ لوگوں نے اسلام لانے میں دیر کی۔ حالانکہ ابوجہل کے رضائی بھائی حضرت عیاش رضی اللہ عنہ بن ابی ربیعہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِارقم میں داخل ہونے سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ ابوجہل کے سگے بھائی سلمہ رضی اللہ عنہ بن ہشام بھی اولین مسلمانوں سے ہیں اور حبشہ میں ہجرت بھی کی۔ خالد رضی اللہ عنہ کے اپنے بھائی ولید رضی اللہ عنہ جنگ بدر کے بعد ایمان لے آئے۔ اور جناب ہاشم رضی اللہ عنہ بن ابی حذیفہ جناب ہبار رضی اللہ عنہ بن سفیان اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سفیان جو بنومخزوم میں سے تھے۔ سب اول اسلام لانے والوں سے تھے۔ لیکن باقی لوگوں کے مقابلے میں بنومخزوم سے کم لوگ اول اول اسلام لائے اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کو افسوس تھا کہ ان لوگوں نے اسلام لانے میں دیر کی۔ اور جب یہ لوگ اسلام لائے تو جناب عمر رضی اللہ عنہ کو خوشی ہوئی۔ ہمیں ان واقعات میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کی دل میں کسی کے لیے بغض تھا۔

جناب خالد رضی اللہ عنہ کی مدینہ میں آمد

جناب خالد رضی اللہ عنہ جب مدینہ تشریف لے آئے تو تمام مورخین کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو خوش آمدید کہا کہ ''اے ابا سلیمان! آپ رضی اللہ عنہ نے جو اسلام کی خدمت کی ہے اُس کی مثال ملنا مشکل ہے لیکن یہ سب اللہ کی عطا ہے۔'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عام خطبے میں بھی یہی الفاظ دہرائے۔ اور بعض روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اکثر یہ فکر رہتی تھی کہ لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی پوجا نہ شروع کر دیں اور جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے وہ درخت بھی جڑ سے اکھڑوا دیا جس کو لوگوں نے متبرک کہنا شروع کر دیا تھا۔ فاروق کے معنی بھی یہی ہیں کہ حق اور باطل میں فرق کرنے والا۔ لیکن اس کے لیے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح مومن کی فراست کی ضرورت ہے کہ باطل کے آنے سے پہلے اس کو روکا جائے۔ اور سپہ سالارِ اعظم کے عہدہ سے جناب خالد رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر دوسری سطح کا امیر بنا دیا تو لوگوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ فتوحات اللہ کی طرف سے ہیں۔ اور اب جناب خالد رضی اللہ عنہ کو سبکدوش کر کے اور ظاہر کیا کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے کہ فتوحات بعد میں بھی جاری رہیں۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ کو جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی کہ جب اُن کی وفات ہوئی تو آپ نے اپنا وارث جناب فاروق رضی اللہ عنہ کو قرار دے دیا کہ وہ اُن کی جائیداد کو جس طرح چاہیں بانٹ دیں۔ جو مبصر اور جو مورخ سارا وقت جناب فاروق رضی اللہ عنہ اور جناب خالد رضی اللہ عنہ کے اختلاف کو ہوا دیتے رہے یہاں آ کر کہتے ہیں کہ آخری ایام میں جناب خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دانائی کے قائل ہو گئے تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ ہمیشہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دانائی کے قائل تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کی بہادری اور اصولوں کے۔

طاعون کی وباء

اللہ تعالیٰ کے عجیب رنگ ہیں اور مشیت ایزدی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا جب بلادِ شام کی فتوحات مکمل ہو گئیں۔ تو مشیت ایزدی کو کسی ٹھہراؤ کی شاید ضرورت پڑ گئی کہ جس رفتار سے مسلمان مجاہدین نے دو عظیم سلطنتوں کو پاش پاش کر دیا تھا اور اس رفتار سے تو وہ چند سال میں دنیا کے کناروں سے باہر نکل جاتے۔ لیکن خالق حقیقی نے حق و باطل کی ٹکر کو چلانا تھا اور چلانا ہے۔ اس لیے بیچ میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ٹھہراؤ کی شکل دوسرے سے الگ ہوتی ہے۔ پہلا ٹھہراؤ حضور پاک ﷺ کی وفات کی وجہ سے ہوا۔ جو چند ماہ تھا۔ دوسرا ٹھہراؤ اب آیا۔ یہ مکمل ٹھہراؤ بھی نہ تھا بس رکاوٹ کہہ لیں تو صحیح ہو گا اور یہ طاعون کی صورت میں سامنے آیا۔ کہ اہل حق سے کئی عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس دوران شہادت نصیب ہوئی اور اسلام کے قافلہ کی رفتار مدہم پڑ گئی۔ یہ وبا سترہ اور اٹھارہ ہجری میں دو دفعہ آئی۔ اس لیے کچھ مورخین نے جو صرف سترہ ہجری کا ذکر کیا ہے اور کچھ نے اٹھارہ ہجری کا تو اس کو اختلاف نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ کہا جائے کہ دونوں سنہ ہجری میں یہ وبا کہیں نہ کہیں کچھ نقصان کرتی رہی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تردد

روایت ہے کہ پہلی دفعہ وبا پھیلنے کے بعد حالات کچھ ٹھیک ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تیسری بار ملک شام کے سفر کا رخت باندھا اور جابیہ تک تشریف لے گئے لیکن جب وہاں پہنچے تو وبا پھر شروع ہو گئی۔ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے حضور پاک ﷺ کے اس سلسلہ میں جس فرمان کی وضاحت کی، وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ ''جب تم سنو کہ وبا کسی شہر میں پھیلی ہوئی ہے تو تم وہاں مت جاؤ۔ اور جب تم کسی شہر میں موجود ہو اور وہاں یہ وبا نازل ہو، تو تم وہاں سے اس طرح بھاگ کر نہ نکلو کہ تمہارے نکلنے کا سبب یہی ایک وجہ ہو۔''

یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ جہاں بیماری پھیل چکی ہو۔ وہاں نہیں جانا چاہیے۔ لیکن جو لوگ وہاں پر موجود ہوں اُن کو اگر کھلی چھٹی ہوتی کہ وہ بھاگ جائیں تو امرا بھاگ جائیں گے اور صرف غریب اور نادار لوگ وہاں رہ جائیں گے۔ اس لیے وہاں سے بھاگنے والی بات صحیح نہیں ہے کہ یا تو سب لوگوں کو صحت افزا مقام پر لے جایا جائے تو پھر بھاگنے کی بجائے یہ ایک ہجرت یا مصیبت سے بچنے کی کارروائی ہے جو جائز ہے۔ بہر حال یہ ساری بات بڑے وسیع فلسفہ والی ہے۔

لہٰذا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ چونکہ وہ بلادِ شام میں داخل نہیں ہوئے اس لیے وہ ملکِ شام میں داخل نہ ہوں گے۔ اور واپس چلے جائیں گے۔ جناب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بھی جابیہ اپنے ایئر ہیڈ کوارٹر میں آئے ہوئے

تھے کہ خلیفہ دوم کو خوش آمدید کہیں۔ ویسے سارا شام آپ کی عملداری میں تھا۔ اس لیے وہ بھی بات کو تو سمجھ گئے کہ اُن کو ملک شام سے نہ جانا چاہیے۔ لیکن انہیں کچھ خیال ہوا کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ بھی اب اس علاقے میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے اُن کو بھی واپس نہیں جانا چاہیے۔ اور وہ ہم نفس تھے اور اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا اس لیے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کہا۔

''کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر جا رہے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''ہاں! کہ ہم اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ ہی کی تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اگر کوئی شخص ایسی وادی میں اُترے جس کے دو کنارے ہوں ایک سرسبز اور دوسرا خشک جو خشک کنارے پر ہو وہ بھی اللہ کی تقدیر ہے اور جو سرسبز کنارے پر ہو وہ بھی اللہ کی تقدیر ہے۔''

جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف بھی نزدیک ہی تھے۔ پھر تینوں صحابہ رضی اللہ عنہم ایک طرف الگ ہو گئے اور آپس میں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آپس میں کیا بات ہوئی وہ کسی راوی نے بیان نہیں کی۔ ویسے تبصرے کافی موجود ہیں۔ کچھ نے یہاں تک لکھ دیا کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کو جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بات پسند نہ آئی اور انہوں نے یہ بھی کہا ''کاش! امین الامت یہ الفاظ آپ کی زبان سے نہ نکلتے۔'' کسی نے کچھ اور کہا وغیرہ۔ ہمارے لحاظ سے بات واضح ہے۔ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے خیال کو مکمل مجلس میں ظاہر کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کھلی مجلس میں جواب دیا۔ جس کا سیدھے طور پر مطلب یہ تھا کہ یہ مشیت ایزدی ہے۔ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اُس وقت خشک کنارے پر تھے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ اور جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سبز کنارے پر ہم قضا و قدر کے مسئلہ پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہ کریں گے اور اس کے لیے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے الفاظ کافی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خط

جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری، کوفہ اور ایران کے محاذ پر بعد میں گئے۔ طاعون کے زمانے میں شام میں تھے اُن سے روایت ہے کہ جب طاعون کی وبا دوسری دفعہ بھی عام ہو گئی تو جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھا وہ اس طرح تھا۔

> ''مجھے تمہارے ساتھ ایک ضروری کام درپیش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں تم سے بالمشافہ بات کروں۔ لہٰذا جب تم میرا خط مطالعہ کرو تو فوراً میرے پاس آنے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔''

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُن کو وبا سے نکالنا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے جواب

دیا۔''اے امیر المومنین! مجھے آپ کے مقصد کا علم ہوگیا ہے۔ مگر میں مسلمانوں کے لشکر میں اسی حالت میں ہوں کہ میں یہاں سے نہیں نکل سکتا بلکہ میں انہیں چھوڑ نا نہیں چاہتا ہوں تا آنکہ اللہ اُن کے اور میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر نہ کرے۔ لہٰذا آپ مجھے اس بات سے معاف فرمائیں۔ اور مجھے اپنے لشکر میں رہنے دیں۔''

روایت ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا تو رونے لگے تو لوگوں نے پوچھا یا امیر المومنین کیا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وفات پاگئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں مگر آپ نے کچھ ایسی بات کہی ہے۔ بہر حال روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دوسرا خط لکھا۔ جس کے لفظ یہ تھے۔

''السلام علیک۔ تم نے لوگوں کو گہرے اور نشیبی علاقے میں بسا رکھا ہے۔ انہیں بلند اور پاکیزہ مقام پر منتقل کر دو۔''

جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اس خط کے بعد جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مجھے حکم دیا کہ کوئی ایسا مقام تلاش کیا جائے لیکن ایسا کرنے سے پہلے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے اور وہ وفات پا گئے۔ ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ان رفیق کو سلام کرتے ہیں جن کی ایک مسکراہٹ کو بیان کرنے کی بھی ہماری قلم کو طاقت نہیں۔

طاعون کے اثرات

روایت ہے کہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین کے طور پر جناب معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو نامزد فرمایا وہ بھی چند دنوں کے بعد وفات پا گئے اور اسی دوران جناب یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان اور جناب شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ بھی طاعون کی وجہ سے وفات پا گئے۔ اب خلیفۂ وقت کے احکام کے تحت جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص شام کی افواج کے سپہ سالارِ اعظم بنے جنہوں نے افواج کو پاکیزہ اور بلند مقام کی طرف منتقل کر دیا۔ روایت ہے کہ ایک اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو اولین مسلمانوں میں سے تھے اور جن کا نام ابوواثلہ رضی اللہ عنہ ہندی تھا انہوں نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی اس سلسلہ میں سخت مخالفت کی کہ اُن کے خیالات کے مطابق وبا سے بھاگنا غلط تھا۔ لیکن جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے فرمایا کہ یہ خلیفۂ وقت کا حکم ہے اور مصلحت ہے اور فوجوں کو بلندیوں پر منتقل کر دیا گیا۔

تبصرہ

تاریخ اسلام میں ہم طبری کے حوالے سے پہلی دفعہ جناب ابوواثلہ رضی اللہ عنہ ہندی کا نام اس دعویٰ سے سنتے ہیں کہ وہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے بہت پہلے مسلمان ہوئے۔ مورخین آپ کے سلسلہ میں ویسے خاموش ہیں اور آپ کی زندگی کے حالات کہیں سے پتہ نہ چل سکے۔ بہر حال ہمارے لیے یہ بڑی عزت افزائی ہے کہ عجمیوں میں جناب

بلال حبشی رضی اللہ عنہ، جناب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، جناب صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی جناب ابوواثلہ رضی اللہ عنہ ہندی بھی تھے۔ جن کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف حاصل ہوا اور اُن کا تعلق اس خطہ سے تھا۔

طاعون سے اموات

مورخین نے طاعون سے اموات کی تفصیل نہیں دی کہ کل کتنے مجاہدین نے اس وبا کی وجہ سے وفات پائی۔ لیکن اثرات بڑے بھیانک تھے۔ جن اموات کا ذکر ہو چکا ہے اُن کے علاوہ بنواسد کے جانبازِ اعظم اور اسلام کے عظیم فرزند جناب ضرار رضی اللہ عنہ بن ازدر بھی اس موذی مرض کا شکار ہوئے ہم جناب ضرار رضی اللہ عنہ کو سلام کرتے ہیں۔ جن کا نام لینے سے رگ رگ میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ روایت ہے کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ بھی اُن دنوں واپس دمشق آ گئے تھے لیکن آپ اس بیماری سے بچ گئے البتہ آپ کے متعدد بیٹے اس وباء کا شکار ہو گئے۔ بلکہ بعض تاریخوں میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کے آگے کوئی اولاد ہی نہ چلی اور یہی کچھ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اُن کے ساتھ تھے۔ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے تھے جن میں ایک نام یزید رضی اللہ عنہ اور ایک کا عمیر رضی اللہ عنہ تھا۔ اور شاید کوئی اور بھی ہوں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بنوامیہ کے زمانے میں قریش کے خاندان بنو ہاشم کے فرزندوں کے نام تاریخ سے نکال دیئے گئے۔ یہی چیز اور عظیم صحابہ کی اولاد کے ساتھ کی گئی کہ وہ بنوامیہ سے حکومت نہ لے سکیں۔

جناب خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کے آخری ایام

جناب خالد رضی اللہ عنہ نے بھی زندگی کے آخری ایام حمص میں گزارے اور وہیں دفن ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا سپہ سالار نہیں ملتا جس نے اتنی جنگوں یا لڑائیوں میں کمانڈ کی ہو جتنی جناب خالد رضی اللہ عنہ کو اللہ نے نصیب کیں۔ اور کسی جنگ میں اُن کو وقتی شکست سے دوچار نہ ہونا پڑا لیکن دنیا میں کوئی ایسا سپہ سالار نہیں ہے جس نے ذاتی جنگوں یا مبارزتوں میں جناب خالد رضی اللہ عنہ کی طرح دشمن کو ہمیشہ چاروں شانے چت کیا ہو۔ یا اتنے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہو۔ یا میدانِ جنگ میں اتنے لوگوں کو تہ تیغ کیا ہو یا میدانِ جنگ میں اُن کے ہاتھوں سے اتنی تلواریں ٹوٹی ہوں۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ کی جنگ ایک سپاہی سے لے کر سپہ سالارِ اعظم کے عہدہ تک ہر میدان میں تھی اور اُس جیسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی زندگی کے حالات ادھورے ہیں۔ آپ کی جنگی کارروائی، جنگی حکمت عملی، جنگی تدبیرات، فن سپاہ گری، حربی تدبیرات، داؤ، جنگی چالوں محترک طرزِ جنگ، حیران کن کارروائیوں کے بارے ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ خالد رضی اللہ عنہ، جنگ یا جہاد کا دوسرا نام ہے۔ یہ خواہ میدانِ جنگ ہو یا جنگ کی تیاری یا کوئی جھڑپ یا مڈبھیڑ، یا چھاپہ یا پیش

قدمی یا تدبیراتی پسپائی یا دشمن کی صفوں کے اندر گھس جانے کی تربیت، یعنی جنگ کا کوئی ایسا فن نہیں ہے جس کو جناب خالد رضی اللہ عنہ کے عمل سے واضح نہ کیا جا سکے۔ خالد رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں غضب کی تیزی تھی۔ دیکھنے کے بعد ''دلِ بینا'' سے تیز ردعمل ہوتے تھے اور پھر عجب لطف ہے کہ ان تیز ردعملوں کو تیز کارروائی میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ آنکھ، دل اور ہاتھ پاؤں کا ایسا رابطہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ان کتابوں میں ہمارا مضمون خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی پر تھا اس لیے تمام جنگوں کو بہت اختصار سے بیان کیا۔ ورنہ کئی ایسی جنگیں ہیں جو ایک کتاب کا مضمون ہیں۔

البتہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کے پاس سب بڑے ہتھیار دو تھے۔ ایک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ خالد رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار ہیں اور دوسرا وہ سرخ ٹوپی جس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک سی رکھے تھے۔ جناب خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا خوب لطف اٹھایا اور جی بھر کے جہاد میں شرکت کی۔ لیکن ایک چیز سے وہ حیران تھے کہ اُن کو میدان جنگ میں شہادت کیوں نصیب نہ ہوئی۔ اور آخری ایام میں جنگ کے میدان سے اتنے دور چارپائی پر کیوں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ روایت ہے کہ اُن دنوں کسی صاحبِ نظر نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جناب خالد رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کی۔ راوی نام کے سلسلہ میں خاموش ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے کہ بچپن میں کہیں سے یہ بات سنی تھی۔ چنانچہ روایت ہے کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی پریشانی اُن کے آگے بیان فرمائی۔ تو یہ عظیم صحابی رضی اللہ عنہ اس طرح گویا ہوئے۔ ''اے ابا سلیمان سنو: یہ زندگی اس لیے اس قسم کی ہے کہ آپ جہاد کی زندگی اور چارپائی پر ایڑیاں رگڑنے کی زندگی میں فرق محسوس کر سکیں۔ جب تک برائی اور بھلائی میں سے آدمی خود نہ گزرے یا اچھی یا بری زندگی دونوں کا تجربہ نہ ہو تو صحیح موازنہ نہیں ہو سکتا۔ اب آپ رضی اللہ عنہ کو جہاد کی زندگی کا لطف یاد آتا ہوگا۔ اور ہاں میدانِ جنگ کی موت آپ رضی اللہ عنہ کے لیے نہ تھی۔ جب ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ اللہ کی تلوار ہیں اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم جو فرما دیتے تھے وہ ہو جاتا تھا تو اب خود ہی اس چیز کو سمجھیں کہ بھلا اللہ کی تلوار کو غیر کیسے توڑ سکتے ہیں۔''

جناب خالد رضی اللہ عنہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اللہ کے دربار میں عرض کی اے رب العالمین اگر جہاد کے میدان میں موت نہ تھی تو جہاد کی تیاری میں ہی موت ہو جاتی اور پھر اپنے بزرگ مہمان سے عرض کی کہ جہاد کہاں ہو رہا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ اُس علاقہ کا رختِ سفر باندھیں کہ موت کہیں میدانِ جنگ کے قریب آئے۔ روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کلمہ شہادت پڑھا اور اُسی وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مومن جہاد میں مصروف رہتا ہے۔ اگر جہاد میں مصروف نہ ہو تو جہاد کی تیاری میں مصروف ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو جہاد میں شمولیت یا تیاری کے بارے سوچتا ہے۔

فتوحاتِ عراق وایران اور شام و فلسطین کے

بڑے بڑے واقعات اور اُن کا تسلسل

عیسوی	ہجری	واقعہ	نمبر شمار
مئی ۶۳۲ عیسوی	۱۲ ربیع الاوّل گیارہ ہجری	حضور پاک ﷺ کی وفات	۱۔
مئی ۶۳۲ عیسوی	۱۲ ربیع الاوّل گیارہ ہجری	جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت	۲۔
مئی ۶۳۲ عیسوی	۴ ربیع الاوّل	جھوٹے نبی اسود عنسی کا یمن میں خاتمہ (حضور پاک ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے اسود کو مرنے کی خبر بتادی تھی)	۳۔
جون ۶۳۲ عیسوی	یکم ربیع الثانی گیارہ ہجری	جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی مدینہ شریف سے روانگی (واپسی تقریباً دو ماہ کے بعد ہوئی)	۴۔
جون ۶۳۲ عیسوی	آخر ربیع الثانی گیارہ ہجری	مرتدین اور باغیوں کا مدینہ شریف پر حملہ	۵۔
جولائی ۶۳۲ عیسوی	۸ جمادی الاوّلی گیارہ ہجری	جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ذوقصہ پر قبضہ اور نعمان رضی اللہ عنہ کی عملداری	۶۔
اگست ۶۳۲ عیسوی	شروع جمادی الثانی گیارہ ہجری	جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ذوقصہ کی کھلی فضاؤں میں گیارہ لشکروں کو مقرر کرنا اور مرتدین کے قلع قمع کی حکمتِ عملی	۷۔
اگست۔ستمبر ۶۳۲ عیسوی	آخری جمادی الثانی گیارہ ہجری	جناب خالد رضی اللہ عنہ بن ولید۔ بزوخا کی جنگ طلیحہ کا فرار۔ عینیہ کی گرفتاری	۸۔

۹۔	جناب خالد ؓ بن ولید۔ سلمہ پہاڑی اور ظفر کی جنگ۔ آم زمل کا خاتمہ	رجب گیارہ ہجری	اکتوبر ۶۳۲ عیسوی
۱۰۔	جناب خالد ؓ بن ولید اور طریفہ ؓ بن حاجز الفجاہ کا خاتمہ	رجب گیارہ ہجری	اکتوبر ۶۳۲ عیسوی
۱۱۔	جناب عکرمہ ؓ بن ابوجہل اور مسیلمہ کی جھڑپ (اس کے بعد جناب عکرمہ ؓ مہرہ کی طرف چلے گئے)	شروع شعبان گیارہ ہجری	نومبر ۶۳۲ عیسوی
۱۲۔	جناب خالد ؓ بن ولید کا بطحا پر قبضہ اور مالک بن نویرہ کا خاتمہ	شعبان گیارہ ہجری	نومبر، دسمبر ۶۳۲ عیسوی
۱۳۔	جناب عمرو ؓ بن عاص اور جناب خالد ؓ بن سعید کا شام کی سرحدوں کی طرف کوچ	رمضان گیارہ ہجری	نومبر، دسمبر ۶۳۲ عیسوی
۱۴۔	جناب شرجیل ؓ بن حسنہ کی مسیلمہ کذاب کے ساتھ جھڑپ	رمضان گیارہ ہجری	نومبر، دسمبر ۶۳۲ عیسوی
۱۵۔	جناب خالد ؓ بن ولید۔ یمامہ کی جنگ مسیلمہ کا خاتمہ اور جناب شرجیل ؓ کی شام کی سرحد کی طرف راونگی	شوال گیارہ ہجری	دسمبر ۶۳۲ عیسوی
۱۶۔	جناب عکرمہ ؓ بن ابوجہل۔ جناب عرفجہ ؓ بن ہرثمہ اور حذیفہ ؓ کا ملاپ دبا کی جنگ اور اومان میں مرتدین کا خاتمہ	رمضان گیارہ ہجری	نومبر، دسمبر ۶۳۲ عیسوی
۱۷۔	جناب عکرمہ ؓ بن ابوجہل اور مہرہ کے علاقہ میں جیروت کی جنگ	شوال گیارہ ہجری	دسمبر ۶۳۲ عیسوی
۱۸۔	جناب علا ؓ بن الحضرمی بحرین میں مرتدین کا خاتمہ	شوال ذی قعد گیارہ ہجری	دسمبر ۶۳۲ عیسوی

۱۹۔	جناب مہاجرین رضی اللہ عنہ امیہ اور زیاد رضی اللہ عنہ بن لبید۔ کنندہ ازد کے مرتدین کا خاتمہ	شوال ذی قعد گیارہ ہجری	دسمبر ۶۳۲ عیسوی جنوری ۶۳۳ عیسوی
۲۰۔	جناب مہاجرین رضی اللہ عنہ امیہ۔ عکرہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل کا ملاپ بحزان میں مرتدین کا خاتمہ	ذی قعد گیارہ ہجری	دسمبر ۶۳۲ عیسوی جنوری ۶۳۳ عیسوی
۲۱۔	جناب مہاجر رضی اللہ عنہ اور جناب عکرہ رضی اللہ عنہ یمن اور حضرت موت کے علاقوں میں مرتدین کا خاتمہ	ذوالحجہ گیارہ ہجری	جنوری ۶۳۳ عیسوی
۲۲۔	جناب مثنی رضی اللہ عنہ بن حارث شیبانی کی جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری	آخری ذی قعد گیارہ ہجری	جنوری ۶۳۳ عیسوی
۲۳۔	خلیفہ اوّل کے جناب خالد رضی اللہ عنہ کو عراق کی فتح کے لیے احکام اور جناب مثنی رضی اللہ عنہ اور مدغور بن عدی کو ہدایات	شروع محرم بارہ ہجری	مارچ ۶۳۳ عیسوی
۲۴۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ کا یمامہ سے کوچ	محرم بارہ ہجری	مارچ ۶۳۳ عیسوی
۲۵۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ۔ جنگ کاظمہ یا جنگ سلاسل	آخری ہفتہ محرم بارہ ہجری	مارچ ۶۳۳ عیسوی
۲۶۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ۔ ثنی یا فدار کی جنگ	شروع صفر بارہ ہجری	اپریل ۶۳۳ عیسوی
۲۷۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ و بحہ کی جنگ	آخری ہفتہ صفر بارہ ہجری	مئی ۶۳۳ عیسوی
۲۸۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ اُلیس کی جنگ	ربیع الاوّل بارہ ہجری	مئی ۶۳۳ عیسوی
۲۹۔	حیرہ کی فتح (جناب خالد رضی اللہ عنہ)	آخری ہفتہ ربیع الاوّل بارہ ہجری	جون ۶۳۳ عیسوی
۳۰۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ۔ انبار اور عین التمر کی فتح	ربیع الاوّل بارہ ہجری آخری ہفتہ	جون ۶۳۳ عیسوی
۳۱۔	دومۃ الجندل کی فتح اور جناب خالد رضی اللہ عنہ اور عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم کا رابطہ	جمادی الثانی بارہ ہجری	اگست ۶۳۳ عیسوی
۳۲۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ، حصید، فنانس، مصیخ الثنی اور بشر کی فتوحات	رجب رمضان بارہ ہجری	ستمبر، نومبر ۶۳۳ عیسوی

۳۳۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ فراض کی فتح	ذی قعد بارہ ہجری	جنوری ۶۳۴ عیسوی
۳۴۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ خاموشی سے حج پر روانگی	ذی قعد بارہ ہجری	فروری ۶۳۴ عیسوی
۳۵۔	جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فریضۂ حج	ذوالحجہ بارہ ہجری	آخر فروری ۶۳۴ عیسوی
۳۶۔	جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور شام کی فتوحات کی حکمت عملی اور چار لشکروں کے مقصود (جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، جناب یزید رضی اللہ عنہ جناب شرجیل رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص)	محرم تیرہ ہجری	مارچ ۶۳۴ عیسوی
۳۷۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ مدائن اور بغداد کے بازاروں پر چھاپے مارنا	محرم صفر تیرہ ہجری	مارچ ۶۳۴ عیسوی
۳۸۔	اسلامی لشکروں کی شام میں پیش قدمی	صفر تیرہ ہجری	مارچ ۶۳۴ عیسوی
۳۹۔	قیصر روم کا ردعمل اور جنوبی فلسطین میں رومیوں کا اجتماع	صفر تیرہ ہجری	مارچ اپریل ۶۳۴ عیسوی
۴۰۔	جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جناب خالد رضی اللہ عنہ کو شام جانے کا حکم اور جناب مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی عراق میں سپہ سالاری	ربیع الاوّل تیرہ ہجری	اپریل ۶۳۴ عیسوی
۴۱۔	جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، جناب یزید رضی اللہ عنہ اور جناب شرجیل رضی اللہ عنہ وادیٔ یرموک میں	ربیع الاوّل تیرہ ہجری	اپریل ۶۳۴ عیسوی
۴۲۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ کا عراق سے شام کی طرف کوچ	ربیع الثانی تیرہ ہجری	مئی ۶۳۴ عیسوی
۴۳۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ کی مرج الراحت کی کارروائی بصریٰ میں شرجیل سے ملاپ اور جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات	جمادی الاوّل تیرہ ہجری	جون جولائی ۶۳۴ عیسوی
۴۴۔	جناب مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث (عراق کے محاذ پر بابل کی جنگ اور مسلمانوں کی فتح)	جمادی الاوّل تیرہ ہجری	جون جولائی ۶۳۴ عیسوی

۶۶۔	جناب ابوعبیدہ ؓ اور جناب خالد ؓ کا حمص کی طرف کوچ اور دمشق کے نزدیک رومیوں کے ساتھ لڑائی	ذی الحجہ چودہ ہجری	جنوری فروری ۶۳۶ عیسوی
۶۷۔	ہاشم ؓ بن عتبہ اور قعقاع ؓ بن عمرو کے ماتحت عراق کی فوج کی شام سے قادسیہ کی طرف روانگی	ذی الحجہ چودہ ہجری	جنوری فروری ۶۳۶ عیسوی
۶۸۔	قادسیہ کی جنگ (جناب سعد ؓ بن ابی وقاص)	محرم پندرہ ہجری	فروری مارچ ۶۳۶ عیسوی
۶۹۔	جناب ابوعبیدہ ؓ اور جناب خالد ؓ شام کا محاذ، بلبک اور حمص پر قبضہ	محرم پندرہ ہجری	فروری مارچ ۶۳۶ عیسوی
۷۰۔	قیصر روم کا ردعمل اور بھرپور جنگ کی تیاری	محرم صفر پندرہ ہجری	مارچ اپریل ۶۳۶ عیسوی
۷۱۔	قیصر روم کی فوجوں کی شام کے محاذ پر یلغار کے لیے پیش قدمی	ربیع الاوّل، ربیع الثانی پندرہ ہجری	اپریل مئی ۶۳۶ عیسوی
۷۲۔	جناب ابوعبیدہ ؓ اور جناب خالد ؓ کا شمالی شام کو خالی کرنا	ربیع الثانی پندرہ ہجری	مئی جون ۶۳۶ عیسوی
۷۳۔	جناب یزید ؓ کا دمشق کو خالی کرنا اور جناب معاویہ ؓ کا قساریہ کو خالی کرنا	آخر ربیع الثانی پندرہ ہجری	جون ۶۳۶ عیسوی
۷۴۔	اسلامی لشکروں کا وادیٔ یرموک میں اجتماع	جمادی الاوّل پندرہ ہجری	جون ۶۳۶ عیسوی
۷۵۔	رومی فوجوں کی دمشق سے وادیٔ یرموک میں پیش قدمی	جمادی الثانی پندرہ ہجری	جولائی ۶۳۶ عیسوی
۷۶۔	یرموک کی دوسری جنگ، یا بڑی جنگ	رجب پندرہ ہجری	اگست ۶۳۶ عیسوی
۷۷۔	دمشق پر دوبارہ قبضہ۔ جناب یزید ؓ	رجب شعبان پندرہ ہجری	ستمبر اگست ۶۳۶ عیسوی

۷۸۔	جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو مدائن کی طرف پیش قدمی کی اجازت	شعبان پندرہ ہجری	ستمبر ۶۳۶ عیسوی
۷۹۔	جناب سعد رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی اور بابل کی جنگ اور کوثی۔ مقام ابراہیم علیہ السلام کی زیارت	رمضان شوال پندرہ ہجری	اکتوبر نومبر ۶۳۶ عیسوی
۸۰۔	جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور جناب شرجیل رضی اللہ عنہ کی بیت المقدس کی طرف پیش قدمی	شوال ذی قعد پندرہ ہجری	نومبر دسمبر ۶۳۶ عیسوی
۸۱۔	جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور جناب خالد رضی اللہ عنہ کی حمص کی طرف روانگی	شوال ذی قعد پندرہ ہجری	نومبر دسمبر ۶۳۶ عیسوی
۸۲۔	بیت المقدس کا محاصرہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ اور جناب شرجیل رضی اللہ عنہ	شوال ذی قعد پندرہ ہجری	نومبر دسمبر ۶۳۶ عیسوی
۸۳۔	جناب سعد رضی اللہ عنہ کا سباط پر قبضہ اور مدائن کا محاصرہ	ذی الحجہ پندرہ ہجری	جنوری ۶۳۷ عیسوی
۸۴۔	مدائن پر مسلمانوں کا قبضہ اور ایرانی دارالحکومت میں داخلہ	صفر سولہ ہجری	مارچ ۶۳۷ عیسوی
۸۵۔	بیت المقدس کی فتح خلیفہ دوم جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیت المقدس میں نماز کی ادائیگی	ربیع الاوّل سولہ ہجری	اپریل ۶۳۷ عیسوی
۸۶۔	قساریہ کا دوبارہ محاصرہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ	ربیع الثانی سولہ ہجری	مئی ۶۳۷ عیسوی
۸۷۔	جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور جناب خالد رضی اللہ عنہ کا شمالی شام کی طرف کوچ	ربیع الثانی سولہ ہجری	جون ۶۳۷ عیسوی
۸۸۔	شمالی شام۔ قناسرین اور حلب پر قبضہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور خالد رضی اللہ عنہ	جمادی الاوّل سولہ ہجری	جون ۶۳۷ عیسوی
۸۹۔	شمالی شام انطاکیہ کی فتح ساحلی علاقے اور انطاکیہ وغیرہ پر قبضہ	رمضان شوال سولہ ہجری	ستمبر اکتوبر ۶۳۷ عیسوی
۹۰۔	عراق کا محاذ جلولہ کا محاصرہ اور قبضہ ہاشم رضی اللہ عنہ بن عتبہ	ربیع الثانی شوال سولہ ہجری	مئی اکتوبر ۶۳۷ عیسوی

۹۱۔	عراق کا محاذ۔موصل پر قبضہ	ذی قعد سولہ ہجری	اکتوبر نومبر ۶۳۷ عیسوی
۹۲۔	عراق۔ایران کا محاذ قصرِ شیریں پر قبضہ	ذی الحجہ سولہ ہجری	نومبر دسمبر ۶۳۷ عیسوی
۹۳۔	قیصر روم کی شمالی شام پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش جزیرہ کے لوگوں کا حمص کی طرف کوچ۔ مسلمانوں کو دو محاذوں سے مل کر کارروائی	وسط سترہ ہجری	وسط ۶۳۷ عیسوی
۹۴۔	ایران کے محاذ پر بصرہ سے آگے جنوبی علاقوں میں پیش قدمی	وسط سترہ ہجری	وسط ۶۳۸ عیسوی
۹۵۔	شام کے محاذ پر طاعون کی وبا ، دو دفعہ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور متعدد عظیم صحابہ کی اموات	سترہ اٹھارہ ہجری	۶۳۸-۶۳۹ عیسوی
۹۶۔	اہواز خزستاں کی فتح	وسط اٹھارہ ہجری	وسط ۶۳۹ عیسوی
۹۷۔	علاء رضی اللہ عنہ بن الحضرمی کی بحری جنگ کے ذریعہ سے فارس پر ناکام کوشش	شروع انیس ہجری	شروع ۶۴۰ عیسوی
۹۸۔	تستر اور سوس کی فتح	آخری ایام انیس ہجری	آخری ایام ۶۴۰ عیسوی
۹۹۔	مصر کی فتح (جس کا ذکر تیسرے حصہ میں ہے)	بیس ہجری	آخری ایام ۶۴۱ عیسوی
۱۰۰۔	نہاوند کی فتح (نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ)	محرم اکیس ہجری	جنوری ۶۴۲ عیسوی
۱۰۱۔	ایران میں عام لشکر کشی	اکیس ہجری	جنوری ۶۴۲ عیسوی
۱۰۲۔	جناب خالد رضی اللہ عنہ کی وفات	اکیس ہجری	جنوری ۶۴۲ عیسوی
۱۰۳۔	اصفہان، آذربائیجان، طبرستان اور رے کی فتح	بائیس ہجری	جنوری ۶۴۳ عیسوی
۱۰۴۔	فارس، کرمان شاہ وغیرہ کی فتوحات	تئیس ہجری	جنوری ۶۴۴ عیسوی

قَالَ اللهُ تَعَالیٰ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ

اے نبی (ﷺ) مومنوں کو جنگ (جہاد) کی ترغیب دو۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ کُرْهٌ لَّکُمْ

تم (لوگوں) پر جنگ (جہاد) کو فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

لِیْ حِرْفَتَانِ الْفَقْرُ وَالْجِهَادُ

میرے دو ہنر (ہتھیار) ہیں فقر اور جہاد۔ (فرمان رسول ﷺ)

خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم

کی جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

حصہ سوم

(فتوحات مصر وافریقہ)

از قلم: حضور پاک ﷺ کا سپاہی
میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان مدظلہ

ناشر: علم دین پبلشرز اُردو بازار لاہور پاکستان

تعارف

خلفائے راشدینؓ کی جنگی حکمت عملی و تدبیرات کے تجزیہ پر مبنی سلسلہ کتب کی چوتھی اور آخری کتاب پیش نظر ہے۔ الحمدللہ کہ جس مشکل کام کا بیڑا آج سے دو ۲ سال پہلے اٹھایا گیا تھا۔ وہ آج بطریق احسن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ مصنف اور آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ نے اس بیش قیمت تحقیقی سلسلۂ کتب کی تصنیف ترتیب اور طباعت میں جو کاوش کی ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے ان کتب میں جن خیالات ونظریات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنف کے اپنے ذاتی ہیں اور انہیں بغیر کسی ردوبدل کے شائع کر دیا گیا ہے۔ ان نظریات سے اختلاف رائے بھی ممکن ہے اور اگر یہ سلسلۂ کتب ہمارے فوجی مبصرین کو سوچ کی نئی راہیں بجھا سکے تو میں سمجھوں گا کہ ان کتب کا ایک بڑا مقصد پورا ہو گیا۔

اسلام کی تاریخ ایک ایسی قوم کی تاریخ ہے جس نے دنیا کو جہالت کے ظلمت کدہ سے نکال کر ایک روشن اور تابندہ مستقبل کی راہ دکھائی۔ مسلمانوں کو اپنے مشن کی تکمیل میں ظالموں اور جابروں کے خلاف فیصلہ کن جنگیں بھی لڑنا پڑیں، لیکن جس طرح مسلمانوں نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اعتدال کی راہ دکھائی، اسی طرح میدان جنگ میں بھی اعتدال اور عدل وانصاف کا ایک قابل تقلید معیار قائم کیا۔ اسلام کی عسکری تاریخ کا یہ گہرا مطالعہ اور مختلف جنگوں اور مہمات کا تفصیلی جائزہ افواج پاکستان کی اخلاقی وعسکری تربیت کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

آخر میں، میں مصنف اور ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کو اس سلسلۂ کتب کی تکمیل پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میرے لئے بھی یہ امر باعث سعادت ہے کہ مجھے ان کتب کا تعارف لکھنے کا موقع ملا۔

میجر جنرل نصیر احمد ستارۂ جرأت

انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلیویشن

جی ایچ کیو

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط ہ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ط

پیش لفظ

تشکر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ''جلال مصطفےٰ ﷺ'' کے سلسلہ کی تیسری جلد بھی مکمل ہوگئی۔ یہ سب کچھ کسی کرامت سے کم نہیں۔ میں ایک دفعہ پھر اپنے تمام ساتھیوں اور ان صاحبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوکر سربسجود ہوتا ہوں۔ جن کو اللہ تعالیٰ اس کارِ خیر میں شرکت کی سعادت عطا کر رہا ہے اور اللہ کے حبیب ﷺ پر لاکھوں درود سلام کے ساتھ اس سلسلہ کتاب کا مختصر تعارف کراتا ہوں۔

تعارف

اس سلسلہ کی پہلی کتاب فتوحات عراق و ایران کو بیان کرتی ہے اور دوسری کتاب فتوحاتِ شام، فلسطین کو۔ اور یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فتوحات مصر و افریقہ و متفرق علاقوں کی فتوحات پر ہے، اس لیے اس کے تانے بانے پہلی دونوں کتابوں کے ساتھ ملائے گئے ہیں۔ مصر کی فتح، نہ صرف شام و فلسطین کی فتوحات کو قائم رکھنے کے لیے ایک اہم ضرورت تھی۔ بلکہ عرب شریف کے دفاع کے لیے بھی ضروری تھا کہ مصر اور اس کے گرد و نواح کو فتح کیا جائے۔ اور مصر سے آگے فتوحات کی اس لیے ضرورت تھی کہ بحیرہ روم پر تسلط قائم کیا جائے۔ یہ تو حکمت عملی کی باتیں تھیں اور اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کا نفاذ تھا۔ اس لیے اس کتاب کے پہلے حصہ میں یہ مقاصد سامنے رکھے گئے ہیں کہ قارئین سلسلہ در سلسلہ فتوحات کو سمجھیں۔

انہی دنوں جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وفات اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت نے کچھ تبدیلیاں لائیں جس کے کچھ فوری اثرات تھے اور کچھ بعد میں ظاہر ہوئے چنانچہ اس کو بھی ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔ دونوں محاذوں پر جو فتوحات ہو چکی تھیں، ان کو نہ صرف قائم رکھنا تھا، بلکہ آگے بڑھانا تھا۔ جس کو تین الگ ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔

بحری جنگیں

ان میں سے شام کا محاذ نہ صرف اس لیے اہم تھا کہ آگے اناطولیہ اور آرمینیا کی طرف پیش قدمی ہوئی، بلکہ

مسلمان پہلی دفعہ سمندروں میں بھی داخل ہوئے۔ اور اگر ایک طرف قبرص اور روڈس وغیرہ کے لیے ملی جلی بری و بحری کارروائی کی گئی۔ جس کو آج کل ہم کمبائنڈ اپریشن کہتے ہیں تو دوسری طرف خالص بحری جنگوں کی طرح بھی ڈالی گئی۔ جن میں سے ایک کارروائی تو مصر کے ساحل کے نزدیک تھی لیکن یہ کارروائی بعد میں گہرے سمندروں اور اناطولیہ کے ساحل تک بھی پھیل گئی۔ جس کے بعد مشرقی بحیرہ روم پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

ایران وعراق کا محاذ

مشرقی محاذ یعنی ایران وعراق پر جنگ نے وہ وسعت اختیار کی کہ ہم اس کو دو الگ الگ ابواب یعنی کوفہ اور بصرہ کے محاذ کے تحت بہت مختصر طور پر بیان کر رہے ہیں کہ یہاں پر حکمت عملی کے تحت فتوحات کے نتائج اور نتائج کے اثرات پر بہت مختصر تبصرہ ہے۔ کوفہ کے محاذوں کی وسعت کی یہ حالت تھی کہ ایک طرف شام کے محاذ سے لے کر جزیرہ، آرمینیا اور جھیل کیپسین تک پھیلا ہوا تھا تو دوسری طرف طبرستان اور خراسان کے محاذوں تک جا کر اس کی حدود ملتی تھیں۔ بصرہ کا محاذ آگے دو محاذوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طرف دریائے جیحوں اور سیحوں تک پہنچا ہوا تھا کہ اسی زمانے میں کابل، غزنی، بلکہ رنک اور بنوں کے نزدیک میراں شاہ والے علاقوں میں پھیلا ہوا تھا کہ وہاں پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو فوت ہوئے ان کی قبریں موجود ہیں۔ تو دوسری طرف ساحل سمندر اور فارس سے ہوتے ہوئے مکران میں دریائے سندھ کے مغرب کی طرف کوہ سلیمان اور قندھار تک پھیلا ہوا تھا۔

اشاعت قرآن

میدانِ جنگ اور محاذوں کی اتنی وسعت اور لشکروں کے اتنے سفر جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے زمانے سے پہلے کسی دنیاوی حاکم کے زمانے میں نہ ہوئے۔ اور پھر اتنے وسیع علاقوں میں زبان اور عمل کی وحدت پیدا کرنے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے ایک ہی نسخہ کی اشاعت کا جو بندوبست اور طریق کار اختیار کیا۔ وہ آپ رضی اللہ عنہ اور آپ کے رفقا کی ایک ایسی خدمت ہے۔ جس کے وحدتِ فکر اور وحدت عمل کے پہلو کا جائزہ پیش کر کے ایک مکمل باب میں طریق کار اور تبصرہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں ہماری حکمت عملیاں ایسی وحدت کی مرہونِ منت تھیں۔

فتنہ وفساد

ایسی عظیم فتوحات اور ایسی وحدتِ فکر کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری تین سال فتنہ وفساد کی نظر ہو گئے اور ہمیں ایسی سزا ملی کہ اب بھی یہ سلسلہ کبھی کبھی جاری ہو جاتا ہے۔ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے

پہلے نو سال اسلام کی تاریخ کے زریں ابواب ہیں۔لیکن فتنہ نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تو حالات نے ایسے تضاد والی شکل کیوں اختیار کی، اس پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ بے شک اس میں مشیت ایزدی بھی تھی اور ہر بات میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ عالم خلق ہے اور عالم امر نہیں۔ اگر حق باطل پر مکمل طور پر حاوی ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جو امتحان کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یا خیر وشر کی الگ نشاندہی کر دی ہے اور ہدایت دے دی ہے کہ یہ خیر و صراط مستقیم ہے۔ اس کو اختیار کریں، تو حق کے آ جانے کے بعد صرف صراط مستقیم ہی باقی رہ جاتا ہے، اس لیے یہ عالم بھی عالم امر کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ تو امتحان والا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

ہمارے فلسفہ حیات کے اس بنیادی اصول کے عملی پہلوؤں کے علاوہ، فتنہ وفساد، آزادی فکر کی شیطنیت، سازش اور انسانی کمزوریوں پر آخری ابواب میں کھل کر بحث کی گئی ہے کہ یہ فتنہ وفساد آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی جاری رہا۔ اور ہماری چوتھی کتاب کے سارے تانے بانے اس فتنہ وفساد سے شروع ہوتے ہیں۔ امت کے لیے اس میں بڑے اسباق ہیں کہ ہم نے کون سی غلطیاں کیں اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے خراب حالات میں بھی ہمارے مرکز کو سہارا دیا۔ اور صراطِ مستقیم سے ذرا بھر بھی نہ ہٹے۔ کچھ لوگ حیران ہو جاتے ہیں کہ ایسے عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہوتے ہوئے بھی حالات صحیح صورت کیوں نہ اختیار کر سکے۔ اس سلسلہ میں بھی جوابات اور جائزے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور چوتھی کتاب میں تو کافی سوالات کے جوابات ہوں گے۔ جن کا خلاصہ وہاں پر ہے۔ اس کتاب میں سب بڑا سبق جو نکالا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قوم نے جب بھی اسلامی فلسفہ حیات کے اصولوں سے بے راہروی اختیار کی تو نتیجہ فتنہ وفساد یا ذلت کی گھڑیوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تاریخ وراوی

بے شک طبری کی کتاب کو واقعات کے لیے مرکزی طور پر استعمال کیا گیا، لیکن افریقہ کی فتوحات کے لیے ابن خلدون اور متعدد مصری مورخین کی تاریخوں سے بھی استفادہ کرنا پڑا۔ اور مصری تاریخوں سے استفادہ بھی دوسروں کے حوالہ کے ذریعے سے کیا۔ اسی طرح کافی مغربی مورخین کی تاریخوں سے بھی مدد لینا پڑی۔ لیکن اشاعت قرآن اور فتنہ وفساد کے سلسلہ میں صرف اپنی تاریخوں یا دانشوروں کے مطالعوں کا استعمال کیا گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان

بے شک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا کی شان بیان کرنے کی ہم گنہگاروں کے بس کی بات نہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اس مطالعہ و تجسس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان کی جو بلندیاں اس گنہگار پر وارد ہوئیں، ان کو

لکھ کر خود راقم کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اکثر معترضین کی باتوں نے اس سے پہلے کئی دفعہ راقم کو بھی خاموش کر دیا تھا، اور جواب واللہ اعلم دینا پڑا تھا لیکن یہاں اسلام کے معطر باغ سے جب جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شان کو تلاش کیا، تو اپنی یہ تمام کوتاہیاں ختم ہوگئیں اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شان کی معطر خوشبو نے میرے اردگرد کے ماحول کو بھی خوشبو سے بھر دیا۔ اور معترضین کی ساری ''افلاطونی'' بودی نظر آئی۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کو　　　　یہ زندگی نہیں ہے طلسم افلاطوں!

(اقبالؔ)

امیر افضل خان

پہلا باب

مصر کی فتوحات ۔ حکمت عملی اور تجویز

ابتدائیہ

مصر کی فتح، شام و فلسطین کی فتوحات کا نتیجہ ہے۔ اسلام میں ویسے بھی فتح کا کوئی اختتامی مقام نہیں ہوتا۔ یہ عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ بہر حال اس کی ضرورت بھی تھی۔ عسکری تاریخ کے طالب علموں کو معلوم ہے کہ اکثر جنگوں کی وجوہات بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ کوئی فوجی جرنیل جب کسی علاقے کو فتح کر لیتا ہے۔ تو وہ اپنی حکومت سے اور آگے بڑھنے کی اجازت مانگتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ کئی سبب اور وجوہات پیش کرتا ہے۔ البتہ ایک سبب جو اکثر پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہوتا کہ اس مفتوحہ علاقے پر قبضہ تب رکھا جا سکے گا۔ جب آگے بڑھ کر فلاں فلاں ملک یا علاقوں پر ضرور قبضہ کیا جائے۔ اس لیے خالص دنیاوی حکمت عملی کو بھی اگر ذہن میں رکھا جائے، تو شام اور فلسطین میں فتوحات کو قائم رکھنے کے لیے مصر کی فتح ضروری تھی۔ گو اسلام میں فتوحات اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہیں، اور علاقے اس لیے فتح کیے جاتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو دنیاوی بادشاہوں یا حکمرانوں کی غلامی سے چھڑا کر اپنے پیدا کرنے والے خالق کی غلامی میں دے دیا جائے۔

مصر کی فتح کی بنیاد

دراصل مصر کو فتح کرنے کی بنیاد حضور پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خود اپنے زمانے میں رکھ گئے تھے۔ آپ ﷺ نے مختلف ممالک کے بڑے بڑے بادشاہوں کے علاوہ کئی باجگذار حاکموں کو بھی اسلام کی دعوت دی جیسے علاقہ شام میں روم کے باجگذار بادشاہ جبلہ یا شرجیل کو اسی طرح آپ ﷺ نے سکندریہ کے حاکم یا مصر کے باجگذار بادشاہ مقوقس کو بھی اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی تھی۔ حضور پاک ﷺ کا سفیر بننے کا یہ شرف جناب حاطب رضی اللہ عنہ بن ابو بالتہ کو نصیب ہوا تھا۔ جو مقوقس کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے سکندریہ گئے تھے۔ مقوقس کے جواب کے سلسلہ میں مورخین خاموش ہیں کہ اس نے کیا جواب دیا۔ البتہ مقوقس نے چار نوجوان مصری عورتوں کو باندیوں کے طور پر حضور پاک ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ تین باندیاں حضور پاک ﷺ نے صحابہ کرام میں بانٹ دیں۔ لیکن ان باندیوں کے

اپنے یا خاندانی نام یا جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ عطا کی گئیں ان کے نام یا حالات کہیں سے معلوم (۱) نہ ہو سکے۔ البتہ جو باندی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس رکھی۔ اس کا نام ماریہ قبطی رضی اللہ عنہا تھا۔ اور اہل یورپ اس کو (Mary Copts) کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کا تعلق مصر کے قبطی عیسائیوں سے تھا۔ لیکن شاہِ روم یا سکندریہ کا حاکم قدامت پسند یونانی گرجا کے پیرو عیسائی تھے۔ ماریہ قبطی رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے جناب ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ جو زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔

تاریخی پہلو

کسی ملک پر کچھ لکھنے سے پہلے اس ملک کے جغرافیہ اور تاریخ کا بیان ضرور ہوتا ہے لیکن ہم بہت مختصر طور پر جغرافیہ کو آگے جا کر فتح کی ضرورت کے تحت بیان کریں گے۔ لیکن تاریخ کا ہمارا مختصر بیان بھی با مقصد ہے کہ ہم اس کو فلسفہ حق کے تابع کریں گے۔ تمام غیر ملکی مبصر یا دانشور مصر کے نام کا ذکر کرتے ہی اہرام مصر پر جا پہنچتے ہیں اور اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ "دنیا وقت سے ڈرتی ہے اور وقت اہرام سے ڈرتا ہے۔" (نعوذ باللہ) یہ باطل تلمیحات ہیں۔ اسلام کے لحاظ سے "وقت" یا "دہر" کو برا کہنے کی اجازت نہیں اور اصل سب کچھ "زماں" پر ہی منحصر ہے کہ وہی "طول" ہے اور "مکاں" "عرض" ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اِسی وجہ سے قرآن پاک میں "زماں و مکاں" کے سلسلہ میں ایک طرف ایک دن اور دوسری طرف ہزاروں سالوں کو برابر بتایا اور یہی چیزیں ہماری سمجھ سے کافی مشکل ہیں۔ بہر حال غیروں سے اس اختلاف کے بعد ہم مصر کی پرانی اور باطل تہذیب کو علامہ اقبال کے چند شعروں کے ذریعہ ہی بیان پر اکتفا کریں گے۔

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم!

دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقریرِ امم
ہے وہ وقت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم!

ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، کبھی چوبِ کلیم علیہ!

فلسفہ حق

چنانچہ ہم چوبِ کلیم علیہ السلام اور شمشیرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے معاملات کو آگے چلائیں گے۔ مصر کے ساتھ ہمارا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ جناب ام المومنین حضرت ہاجرہ کا تعلق مصر سے تھا۔ آگے

---

۱ ابن سعد البتہ صرف دو باندیوں کا ذکر کرتا ہے اور اس کے مطابق دوسری باندی کا نام سیرین تھا۔ جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے عظیم شاعر جناب حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت کو بخش دیں، جن کے بطن سے عظیم محدث جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

چل کر ہم آپ کے خاندان اور آپ کے حریف خاندان کے مقامات کا ذکر بھی کریں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ ایک ام المومنین حضرت ہاجرہ اور دوسری حضرت سائرہ۔ اُم المومنین حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں آباد کر گئے۔ اہل قریش یعنی حضور پاک ﷺ کا خاندان حضرت اسمعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔

حضرت سائرہ کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے کہ آپ کو اولاد کی امید نہ تھی اور جب فرشتوں نے یہ بشارت دی تو آپ حیران رہ گئیں۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری کہانی قرآن پاک کی سورۃ یوسف میں موجود ہے کہ آپ کو جب بھائیوں نے بیچ دیا تو تجاران کو مصر لے گئے۔ لیکن بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا سارا خاندان ادھر ہی آباد ہو گیا۔ قرآن پاک میں ان لوگوں کو بنو اسرائیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور فرعونِ مصر ان کے بچوں کو قتل کر دیتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح بنو اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائی اور فرعون کس طرح غرق ہوا وغیرہ۔ یہ سب واقعات قرآن پاک کی متعدد سورۃ میں موجود ہیں۔ اور اس زمانے میں بنو اسرائیل مصر سے نکل کر زیادہ تر فلسطین میں آباد ہو گئے۔

اس کے بعد مصر پر بخت نصر نے بھی حملہ کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے ایرانیوں نے بھی مصر کو فتح کر لیا تھا لیکن ہم ان تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ ہم صرف اس پر اکتفا کریں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے مصر سلطنتِ روم کا حصہ بن چکا تھا۔ یہ سب پیونک جنگوں کے بعد ہوا۔

پیونک جنگیں اہل روم اور کارتھیج کے درمیان ہوئیں۔ عسکری تاریخ کے طالب علم ان جنگوں کے شرکا ہنی بال اور سکیپیو وغیرہ کی کارروائیوں کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں لیکن یہاں اتنا کافی ہو گا کہ اہل روم (موجودہ اطالیہ) اہل کارتھیج (موجودہ ٹیونس) پر غالب آئے اور اس کے بعد مصر تک کا علاقہ اہل روم کی عملداری میں چلا گیا۔ ہم دوسری کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ قسطنطنیہ کی حکومت جس کے ساتھ ہمیں شام کی فتوحات کے سلسلے میں واسطہ پڑ چکا ہے۔ اور اب مصر اور افریقہ کے سلسلے میں بھی واسطہ رہے گا یہی لوگ سلطنت روم کے جانشین ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں روم کے بادشاہ قسطنطین نے اپنا دارالخلافہ قسطنطنیہ کو بنایا۔ ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اہل یورپ اپنے احساس کمتری کی وجہ سے ان کو لاکھ دفعہ چھوٹا روم کہیں یا بازنطینی، ہم ان کو اہل روم ہی کہیں گے کہ قرآن پاک میں ان کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں۔

حضور پاک ﷺ کے زمانے میں اہل روم یعنی قیصر روم ہی دراصل مصر اور شمالی افریقہ کے اصلی حکمران تھے

اس کا ذکر جلالِ مصطفےٰ ﷺ میں ہو چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضور پاک ﷺ جب مکہ میں ہی تھے تو ۶۱۷ عیسوی میں ایرانیوں نے مصر پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ان جنگوں کی وجہ سے تھا جو ایران اور روم کے درمیان جاری تھیں اور کفار نے خوشی منائی کہ ایرانی جیت رہے ہیں۔ لیکن سورۂ روم جو مکہ میں نازل ہوئی اس میں واضح بیان تھا، کہ اہل روم دوبارہ کامیاب ہو جائیں گے اور پانچ ہجری تک ایرانی مصر سے پسپا ہو چکے تھے اور قیصر روم نے مصر پر مکمل قبضہ کر لیا تھا، بلکہ قیصر روم نے ایرانیوں کے خلاف فتح حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس قدر مضبوط سمجھا کہ اس نے عیسائیوں کے تمام فرقوں میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اہل روم قدامت پسند عیسائی یا یونانی گرجا والے عیسائی کے نام سے موسوم تھے اور ان کے عقائد مصری عیسائیوں سے، جو قبطی عیسائی کے نام سے موسوم تھے، بالکل مختلف تھے۔

مقوقسِ بادشاہ مصر

قیصر روم نے مصر کی باجگذار بادشاہت ایک پادری کے حوالے کی جو آرمینیا کا رہنے والا تھا۔ اہل یورپ اس کو سائرس کا نام دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان مورخین نے اس کو مقوقس کہا ہے اور ہم یہی نام استعمال کریں گے۔ مسلمان سفیر کے مقوقس کے پاس جانے سے پہلے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے، ایک دفعہ مصر گئے انہوں نے مقوقس کے ٹھاٹھ باٹھ کا ذکر یوں کیا تھا کہ ”وہ سمندر کے کنارے ایک سائبان کے نیچے سکندریہ میں بیٹھا کرتا تھا۔ حفاظت کی یہ حالت تھی کہ اس کو ملنے والے تمام لوگوں یعنی نوواردلوگوں کو کشتی کے ذریعہ سمندر استعمال کر کے اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ مقوقس نے قبطی عیسائیوں پر کچھ ظلم بھی ڈھائے اور ان کو زبردستی قدامت پسند عیسائی بنانے کی کوشش بھی کی۔“

مسلمانوں کی حکمت عملی

حصہ دوم میں مسلمانوں کی شام و فلسطین کی فتوحات کے سلسلے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلمان فلسطین اس کے ساحلی علاقوں اور صحرائے سینا کی بجائے پہلے اردن کے مشرقی ریگستانی علاقوں میں پیش قدمی کرتے رہے۔ اس سے ایک مقصد یہ حاصل ہو رہا تھا کہ مسلمان مشرق میں آسانی کے ساتھ عراق کے محاذ کے ساتھ رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ مسلمان اس وقت ساحلی علاقوں کی طرف پیش قدمی کر کے مصر کی طرف کوئی تیسرا محاذ کھولنے کو تیار نہ تھے۔

عمر رضی اللہ عنہ بن عاص کا فلسطین میں تقرر

حصہ دوم کے دوسرے باب میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی تھی کہ فلسطین کے علاقوں میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن

عاص کے تعین کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بڑے منجھے ہوئے سیاست دان تھے۔ اسلام لانے سے پہلے بھی وہ شام، فلسطین اور مصر سمیت افریقہ کے کئی علاقوں سے واقف تھے۔ اس لیے شام کی فتوحات شروع کرنے سے پہلے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو فسلطین اس لیے بھیجا گیا کہ وہ مصر کے علاقوں اور ساحلی علاقوں پر بھی کڑی نظر رکھیں۔ لیکن جیسا کہ حصہ دوم میں واضح کر دیا گیا ہے۔ شام و فلسطین کی فتوحات میں کافی دیر لگ گئی کیونکہ مقابلہ قیصر روم کے ساتھ تھا، جس نے پہلے اجنادین والے راستے سے اسلامی لشکروں کو ختم کرنے کی کوشش کی پھر شمالی شام میں لاؤ لشکر تیار کیے تاکہ مسلمانوں کو تہس نہس کر دے۔ لیکن اس کا عظیم لشکر یرموک میں پاش پاش ہو گیا اس لیے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، جناب خالد رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں ان سب جنگوں میں مصروف رہے اور مصر کی فتح کی طرف دھیان نہ دے سکے۔

ایک دلچسپ کہانی

یہاں پر ایک دلچسپ کہانی کا ذکر موزوں رہے گا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن اص اسلام لانے سے پہلے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ مصر اور فلسطین کے درمیان صحرائے سینائی میں آئے ہوئے تھے۔ سکندریہ کے شرفا میں سے ایک آدمی کی آپ نے جان بچائی۔ ایک دفعہ صحرا میں پانی پلا کر اور دوسری دفعہ ایک زہریلے سانپ کے حملہ سے۔ اس شخص کی وساطت سے آپ کو سکندریہ دیکھنے کا موقع ملا اور وہاں پر اس زمانے میں ایک بہت بڑا میلہ لگا ہوا تھا، جس میں صرف شرفا ہی شرکت کر سکتے تھے۔ چنانچہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بھی اپنے میزبان کے ساتھ اس ''دربارِ خاص'' میں شریک ہوئے۔ اس میلہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک سنہری گیند یا ''سونے کا انڈا'' اوپر پھینکا جاتا تھا اور جو آدمی اس کو گرنے سے پہلے حاصل کر لیتا وہ اپنی موت سے پہلے مصر کا حاکم ضرور بنتا تھا۔ چنانچہ جب یہ گیند اوپر پھینکا گیا تو جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے پکڑ لیا اور اپنے میزبانوں کو حیران کر دیا کہ وہ لوگ یہ بات سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ عرب کا ایک شتربان کبھی مصر کا حاکم بن سکے گا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے جب اسلام کے پھیلاؤ کو دیکھا اور پہلے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کے ساتھ تبوک آئے یا بعد میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کو شام کی سرحد پر تعین کیا۔ تو ممکن ہے آپ اس وقت سے مصر پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ ورنہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص جیسے مدبر ار فوجی ماہر، مرتدین کے خلاف یا عراق کی جنگوں میں ضرور شامل ہوتے اور اب بھی یہ روایت ہے کہ فتح بیت المقدس کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، نے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مصر کی طرف پیش قدمی کی اجازت مانگی۔ ہماری اس کتاب کے علاوہ چوتھی کتاب میں بھی مصر اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص میں یہ ''رشتہ'' قائم رہے گا۔

مصر کی فتح کی ضرورت

بیشتر ازیں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ شام و فلسطین کی فتوحات کو قائم رکھنے کے لیے مصر کو فتح کرنا ضروری تھا، ورنہ مصر کے ساحل سے اہل روم کسی وقت بھی فلسطین کے ساحل پر افواج اتار سکتے تھے۔ مسلمان اس وقت تک سمندروں میں داخل نہ ہوئے تھے اور سمندروں میں داخل ہونے کے لیے کچھ تیاری کرنا پڑتی ہے اور اس کے لیے بندرگاہوں اور بحری بیڑہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ شام و فلسطین کا ساحل تقریباً ایک سیدھی لائن میں ایسا تھا جیسے کسی دریا کا کنارہ ہوتا ہے۔ اور مسلمان اس دریا کے کنارے بیٹھے تھے اس ''دریا'' یعنی بحیرہ روم کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی اور اس پر اہل روم کا بندرگاہوں، جزیروں اور بحری بیڑہ کے ذریعہ قبضہ تھا۔ اب اسلام کو صرف خشکی یا خشکی ہی میں تو محدود نہ کرنا تھا اس لیے بحیرہ روم پر قبضہ ضروری تھا۔

کتاب اول میں عراق کی فتوحات کے سلسلہ میں کاظمہ کی جنگ کا ذکر ہے۔ جسے جنگ سلاسل بھی کہتے ہیں۔ وہاں پر ساتویں اور آٹھویں باب میں واضح کیا گیا ہے، کہ کاظمہ سے آگے نکل کر مسلمانوں نے ابلہ یا بصرہ کا رخ نہ کیا اور اگر قبضہ رکھا بھی تو محدود علاقے میں رکھا۔ اور پہلے حیرہ فتح کیا۔ اس زمانے میں خلیج فارس کے نزدیک صرف حربی مظاہرے جاری رکھے گئے۔ لیکن مدائن پر قبضہ ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے مشرق اور جنوب کا رخ کیا اور ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ بحیرۂ عرب کی طرف سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے آہستہ آہستہ خلیج فارس کے دونوں کناروں پر قبضہ کر لیا۔ اور خلیج فارس مسلمانوں کا علاقہ بن گیا۔

مغربی محاذ پر اجنادین کی فتح کے بعد مسلمانوں نے بحیرہ روم کے کسی ساحلی علاقہ میں الجھنا پسند نہ کیا۔ پہلے اوپر تک انطاکیہ اور بیروت کے علاقوں کو فتح کیا اور آخر میں بندرگاہ قساریہ پر قبضہ کیا۔ تو بحیرہ روم کے ایک ساحل یعنی مشرقی ساحل پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ سمندر میں البتہ آگے بڑھنے کے لیے، بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر بھی قبضہ کی ضرورت تھی اور اب شام کے ملک سے آگے اناطولیہ کے پہاڑی علاقوں میں پیش قدمی کی بجائے، مصر کو فتح کرنا آسان ہو گیا تھا۔

مصر کی مدینہ شریف سے نزدیکی

مصر کے ساتھ اہل روم کا رابطہ بذریعہ سمندر تھا۔ مصر میں ریگستان بھی تھا اور مصر کے درمیانی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد یہ علاقے مدینہ شریف سے نزدیک ہو جاتے تھے۔ حکمت عملی کے طور پر بھی مصر اور اس کے جنوبی علاقوں کو فتح کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ اس طرح مسلمان بحیرۂ قلزم کے دونوں کناروں پر بھی قابض ہو سکتے تھے۔

ساتھ ہی ایک دفاع یا حفظ ماتقدم کا پہلو بھی ہے اگر مصر اور بحیرہ قلزم کے مغربی کنارہ پر قبضہ نہ کیا جاتا تو

مسلمانوں کے مرکز مدینہ شریف اور خانہ کعبہ کے خلاف کسی وقت بھی افریقہ یا مصر سے کوئی بحری فوج بھیجی جاسکتی تھی۔ جدہ کی طرف سے تو کافی خطرات موجود تھے اور حضور پاک ﷺ کے زمانے میں کچھ شرپسند جدہ میں اکٹھے بھی ہو گئے تھے اور نویں ہجری میں حضور پاک ﷺ نے ایک مہم (ا) ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے جدہ بھیجی تھی۔

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مصر کے بارے میں پالیسی

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس تشریف لے گئے، تو انہوں نے مصر کے سلسلے میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے ساتھ مشورہ کیا، کہ مصر کی طرف سے رومیوں کے خطرات کے ساتھ کیسے نپٹا جائے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے صلاح دی کہ مصر کو جلد سے جلد فتح کیا جائے۔ یہ معمولی بات ہے اور بڑی تھوڑی فوج کے ساتھ مصر فتح کیا جا سکتا ہے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ اس سلسلے میں وہ مدینہ شریف میں مجلس مشاورت کے ساتھ صلاح کر کے کوئی فیصلہ کریں گے۔ لیکن اس زمانے میں ابھی شام و فسلطین کے ساحل پر قساریہ اور بیروت وغیرہ بھی فتح نہ ہوئے تھے۔ اس لیے بیت المقدس کی فتح کے بعد پہلے شام کے ساحل پر بندرگاہوں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی کیونکہ اس کی ضرورت بھی تھی۔

قساریہ کے محاصرہ نے یہ ظاہر کر دیا کہ جب تک مصر فتح نہیں کیا جاتا بلکہ سمندر میں آگے بڑھ کر قبرص (Cyprus) وغیرہ کے جزیرے بھی فتح نہیں کیے جاتے، اس وقت تک شام و فلسطین کے ساحل پر رومی حملے کرتے رہیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے علاقے کے کم از کم تین اور کچھ روایات کے مطابق چار سفر کئے اور ہر دفعہ جابیہ تک تشریف لے آئے۔ اور ہم اس کا ذکر حصہ دوم میں کر چکے ہیں۔

ملک شام میں اس زمانے میں بڑے واقعات ہوئے۔ مسلمانوں نے جزیرہ، شمالی شام اور ساحلی علاقوں کو فتح کیا۔ پھر طاعون کی وباء بھی پھیلی تھی، جس سے مسلمانوں کے کئی سپہ سالار یکے بعد دیگرے طاعون کا شکار ہو گئے۔ ان میں جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ۔ آپ کے چچیرے بھائی اور خالہ زاد بھائی عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم، عظیم صحابی اور اسلام کے عالم جناب معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل، کتاب وحی اور عظیم صحابی جناب شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی جناب یزید رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ اس لیے شام کی امارت بھی جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پاس چلی گئی جنہوں نے پہاڑوں میں جا کر لشکروں کو وبا سے بچالیا۔ بہر حال ان واقعات کی وجہ سے مصر کی فتوحات میں دیر لگ گئی۔

روایت ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب آخری دفعہ شام تشریف لائے تو جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ہی

ا جلال مصطفیٰ ﷺ صفحہ ۳۳۴۔

سپہ سالار تھے اور دونوں کے درمیان مصر کو فتح کرنے کی حکمت عملی کے بارے میں فیصلہ ہوا، اور اس کے بعد شام کی امارت جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص مصر کی فتح کی تیاری کرنے لگ گئے۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ مدینہ پہنچ کر پورے احکام جاری کریں گے۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی مدینہ میں مشاورت

چنانچہ روایت ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے مصر کی فتح کے سلسلے میں مدینہ شریف میں اپنی مجلس مشاورت سے صلاح کی اب مسلمان ایک نئے براعظم میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام سے الگ خاص طور پر مشورہ کیا۔ دونوں صحابہ عظیم کرام رضی اللہ عنہ نے مصر کی فتح کی ضرورت کے حق میں رائے دی۔ لیکن جناب فاروق رضی اللہ عنہ دل سے کچھ اس طرح چاہتے تھے کہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام مصر کی سپہ سالاری بھی قبول فرمائیں اور انہوں نے جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ پیش کش کر دی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح ایران اور شام کی سپہ سالاری عشرہ مبشرہ سے جناب سعد رضی اللہ عنہ اور جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کی، اسی طرح مصر کی سپہ سالاری جناب زبیر رضی اللہ عنہ کریں۔ ایک اور نکتہ یہ تھا کہ شام میں لشکر کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ طاعون کی وبا کے علاوہ سرحدوں پر کافی زیادہ افواج الجھی ہوئی تھیں۔ ان حالات میں مصر کی فتح کے لیے مجاہدین کو بھی مدینہ شریف اور ممالک عرب سے جانا تھا۔

جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا جواب

جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ''اے امیر المومنین! بخدا مجھے امارت کی بجائے، جنگ میں ویسے شرکت میں زیادہ سرور محسوس ہوتا ہے۔ شام کی جنگوں میں، میں یرموک کے بعد حمص سے بھی آگے تک گیا اور جہاد میں مصروف رہا، لیکن اب وہاں جہاد میں کچھ جمود آ گیا ہے۔ اس لیے واپس آ گیا ہوں۔ اب مصر کے جہاد میں شرکت کے لیے تیار ہوں۔ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے ماتحت کسی جگہ بھی مجاہدین کے ساتھ جنگ میں شرکت کر سکتا ہوں۔'' چنانچہ خلیفہ دوم نے جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو مجاہدین اکٹھے کرنے کا حکم دیا۔ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے سکندریہ دیکھا ہوا تھا اور ان کی نظر بھی سکندریہ پر تھی۔ لیکن جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ لشکر صرف پانچ ہزار کا ہوگا اور ساتھ سواری کے لیے اتنے اونٹ اور گھوڑے ہوں کہ یہ لشکر متحرک رہ سکے اور آپ اپنے آپ کو کسی بڑی جنگ میں نہ الجھائیں۔ دریائے نیل کے مشرق ہی کی طرف رہیں۔ زیادہ تر حربی مظاہرے کیے جائیں اور کمک کا انتظار کیا جائے۔ مدینہ سے جناب زبیر بن عوام مصر کی فتح کے لیے ایک بڑا لشکر تیار کر رہے تھے۔

خلیفہ دوم کی حکمت عملی

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ مصر کو فتح کرنے کے بعد اسلامی سلطنت کو بہت زیادہ وسعت مل جائے گی اور اتنے علاقوں اور ممالک پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے ان علاقوں میں اعلیٰ پایہ کی سول حکومت اور نظام کی بھی ضرورت ہوگی بلکہ مدینہ شریف اور باقی عرب علاقوں کے تمام مسلمانوں کو ایک نظام میں باندھنے کی ضرورت ہوگی تاکہ کسی بھی مسلمان کو کسی وقت اس کی قابلیت کے لحاظ سے کسی منتوحہ ملک میں کسی کام کے لیے بھیجا جا سکے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طریق کار پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اس زمانے میں آمنّا و صَدَقْنا کے تحت لوگ یہ کام کے لیے جلد تیار ہو جاتے تھے۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہ روایات جاری رہیں۔ لیکن آخر لوگوں کی کچھ ترجیحات ہوتی ہیں کہ وہ کیا کرنا چاہیں گے اور کس علاقے میں جانا چاہیں گے اور اس پہلو پر حصّہ اول اور حصہ دوم دونوں میں سیر حاصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ایک نظام میں باندھنے کے لیے ضابطوں کے ساتھ پوری قوم کو اللہ کی فوج بنانا تھا، تاکہ کسی بھی کو کسی وقت ضرورت کی جگہ پر بھیجا جا سکے۔ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے رائے شماری کرائی اور وظیفے مقرر کیے تاکہ اس کام میں آسانی ہو۔ اہل یورپ اس زمانے میں ایسی باتیں پڑھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اس زمانے میں جب لکھنے کے لیے کوئی کاغذ نہ ملتا تھا۔ مالیات اور رائے شماری کا بامقصد حساب کتاب جاری کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن اس سب نظام میں بنیادی باتیں یہ تھیں کہ مسلمان حد سے زیادہ دیانت دار تھے اور اطاعت امیر کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ان کی زبان کی وقعت کاغذ کے پرزہ سے زیادہ تھی۔ گو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے کہ بہتر ہوتا ہے، کہ یاد رکھنے کے لیے لکھ لیا جائے۔ چنانچہ یہ سویلین نظام فتوحات کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا تھا۔ لیکن ہم اس سے زیادہ اس کی تفصیل میں نہ جائیں گے اور صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ دین فطرت کے لحاظ سے ہر مسلمان اللہ کا سپاہی ہے اور اس کو قومی ربط ضبط میں باندھ کر قومی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے۔

يَا اَيُهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا و صَابِرُوْا و رَابِطُوْ واتَّقُوا اللهَ لَعَلكم تُفْلِحون (سورہ آل عمران ۱۹۹)۔

ترجمہ: اے ایمان والو صبر کرو اور باہم مصابرہ کرو اور باہمی رابطہ رکھو (یعنی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہو) اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان اللہ کے ساتھ عہد کر چکے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پھیلانا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے کسی ترتیب اور نظام کی ضرورت تھی۔

سرزمین مصر کا فوجی تجزیہ

حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ سرزمین مصر میں طاقت کی کشش کا مرکز سکندریہ تھا۔ جہاں مقوقس رہتا تھا اور جس کا مختصر ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ نقشہ اول میں سکندریہ کے محل وقوع اور مصر کے مدینہ شریف کے ساتھ جغرافیائی رابطہ کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی مصر اور فلسطین کی سرحد بھی اِس نقشہ میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ سکندریہ پر سمندر سے کسی بحری بیڑہ سے حملہ کیا جاتا کیوں کہ فلسطین سے آگے بڑھ کر ڈیلٹا کے راستے سکندریہ کو فتح کرنا ناممکن تھا۔ ایسا کرنے کے لیے درجن سے زیادہ چھوٹے چھوٹے دریا عبور کرنا پڑتے اور ڈیلٹا کی دلدل میں مسلمان مجاہدین پھنس کر رہ جاتے، مسلمانوں کے پاس کوئی بحری طاقت نہ تھی کہ وہ سمندر کے راستے سکندریہ پر حملہ کر سکتے۔

سکندریہ کی اہمیت

دارالحکومت ہونے کے علاوہ سکندریہ ایک بہت بڑی بندرگاہ بھی تھا۔ گو سکندریہ کے نزدیک ایک پرانا شہر رقوتی بندرگاہ کے طور پر موجود تھا۔ لیکن موجودہ سکندریہ جیسا اس زمانے میں تھا۔ یہ شہر سکندر یونانی نے آباد کیا یا اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی تفصیل میں ہم اگلے باب میں جائیں گے۔ یہاں پر اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس شہر میں مختلف قوموں کے لوگ آباد تھے اور یہ شہر جیسا کہ نقشہ اول اور دوم سے ظاہر ہے۔ ایسی جگہ پر ہے جہاں دریائے نیل کے ڈیلٹا کا سب سے مغربی معاون سمندر میں گرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جھیل بھی ہے اور اس زمانے میں بھی یہ شہر مصر کے تمام زرخیز علاقوں کے ساتھ دریائی اور خشکی والے راستوں سے اس طرح ملا ہوا تھا، کہ مصر کی ساری دولت وہاں پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ سکندریہ کی اہمیت اہل روم یا غیروں کے لیے تو بہت زیادہ تھی لیکن اگر کسی طرح سے سکندریہ کا رابطہ مصر کے زرخیز علاقوں یا مصر کے دل سے کاٹ دیا جاتا، تو پھر سکندریہ خالی بندرگاہ ہی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے سکندریہ کی نسبت مصر کے درمیانی شہروں مصر، باب الیون، جیزہ اور منف کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ اور ہم ان شہروں کو مصر کا دل کہیں گے۔

مصر کا دل

نقشہ دوم کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد چند مشہور شہر نظر آتے ہیں، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ تمام کے تمام بڑے تاریخی شہر ہیں اور موجودہ قاہرہ بھی اسی جگہ ہے۔ ان شہروں کی تاریخی پہلو سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ سب سے پہلے عین شمس کا شہر نظر آتا ہے۔ اس کو اہل یورپ ھیلو۔ پولس کہتے ہیں یہ شہر ان لوگوں نے آباد کیا تھا۔ جنہوں نے ام المومنین حضرت ہاجرہؓ کے شاہی خاندان کو شکست دی تھی اور مصر کی حکومت کے لیے انہوں نے اس شہر کو اپنا

دارالخلافہ بنایا۔ آگے باب الیون کا شہر آتا ہے جس کو اہل یورپ بابل کہتے ہیں۔ اور یہ نام اہل یورپ نے سلطنت روم کے زمانے سے اس شہر کو دیا ہوا ہے۔ بابل یا بابل کی تہذیب کا تعلق ملک عراق سے ہے لیکن یورپین مورخ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں بابل کے علاقہ سے قیدی وہاں رہے تو جگہ کا نام بابل پڑ گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ بخت نصر کو اس جگہ اور بابل میں کچھ مشابہت نظر آئی تو اس نے اس کا نام بابل رکھا۔ لیکن ہم اپنی کتاب میں اس کو اسلامی نام باب الیون سے ہی موسوم رکھیں گے۔ البتہ سب سے زیادہ اہمیت شہر مصر کو ہے، جس کی وجہ پورے ملک کو بھی مصر کہتے ہیں۔ اس جگہ مسلمانوں نے فسطاط کی چھاؤنی آباد کی۔ اور کئی سو سال بعد مسلمانوں نے موجودہ قاہرہ کے شہر کی بنیاد رکھی۔ یہی جگہ مصر کا دل ہے اور اس کی وجہ تسمیہ کچھ اس طرح ہے۔

مصر کی وجہ تسمیہ

روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ سام، حام اور یافث، سام بہت خوش قسمت تھے اور انہی کی اولاد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور یہ چیز پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ ہمارے آقا حضور پاک ﷺ اور باقی بڑے بڑے پیغمبر یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام، اپنے بیٹے حام کو بھی کچھ عطا کرنا چاہتے تھے اور ان کو کئی دفعہ پکارا۔ لیکن وہ بہت سست مزاج تھے اور لیٹے رہتے تھے البتہ ان کے پوتے مصر بن بسر نے جب اپنے پردادا جناب نوح علیہ السلام کی آواز سنی تو لبیک کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے لیے دعا کی تو وہی ملکِ مصر کے قائد ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ملک مصر کو زرخیزی اور ان کے نام سے موسوم کر دیا۔ آگے جو منف شہر کا ذکر اکثر آئے گا۔ اس شہر کی بنیاد بھی جناب مصر نے رکھی۔

دریائے نیل کا مغربی کنارہ

منف کو چھوڑ کر باقی تمام شہر جن کا اب تک ذکر ہو چکا ہے وہ دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر ہیں۔ منف مغربی کنارہ پر ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اسی شہر میں عزیز مصر کے وزیر اعظم تھے کہ اس زمانے میں یہی دارالخلافہ تھا۔ یہ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ستر رشتہ دار یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس خاندان کی جس کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی۔ اور ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام فلسطین لے گئے۔ ویسے یہ روایت بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے عین شمس میں آئے۔ عین شمس پرانے مصر کے فرعونوں کی عبادت گاہ بھی تھی کہ وہاں پر سورج کی پرستش ہوتی تھی۔

منف کے نیچے نقشہ دوم میں فیوم کا شہر ہے۔ روایت ہے کہ یہ شہر حضرت یوسف علیہ السلام نے بسایا۔ ویسے یہاں پر دریائے نیل میں کئی جزیرے بھی ہیں اور خاص کر ایک جزیرہ روضہ کا ذکر آگے کثرت سے آئے گا اور ایک پایاب یعنی دریا کو عبور کرنے والی مشہور جگہ بھی ہے، جس کو ام ذنین کہتے ہیں۔ یہ تھے وہ مقامات جو مسلمانوں کی حکمت عملی کے طور پر ان کے لیے زیادہ اہم تھے۔ لیکن ساتھ ہی ان مقامات کے ساتھ چونکہ ہمارا تاریخی رشتہ بھی حق کے فلسفہ کی وجہ سے ہے، اس لیے ایسی تاریخ کا ذکر ضروری تھا۔

مصر کے سیاسی حالات

مصر میں قدیم زمانے سے مختلف قوموں کے لوگ آباد رہے ہیں۔ جن میں بربر، یونانی، رومی (یعنی اطالیہ کے رہنے والے) نوبین یعنی سوڈانی یا حبشی زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ تعداد قبطی لوگوں کی تھی جن کو قبط بھی کہا جاتا تھا۔ مصر میں حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد اور ام المومنین حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا مصری ہونے وغیرہ کا ذکر آچکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی آمد۔ فرعون اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ یہاں اتنا مزید کہا جاتا ہے کہ جوانی کے زمانے میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام بھی اپنی والدہ محترمہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے ساتھ مصر میں تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے بھی چند دن باب الیون میں گزارے۔ لیکن لوگوں نے عیسائی مذہب پہلی صدی عیسوی کے آخری ایام میں اختیار کیا۔ پھر بھی کافی لوگ بے دین تھے۔ اہل روم نے البتہ عیسائیت کو سرکاری طور پر چوتھی صدی عیسوی میں اختیار کیا۔ جب ان کے بادشاہ قسطنطین نے اپنا دارالخلافہ روم سے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) میں تبدیل کیا۔

مصر کے عیسائی یا قبطی عیسائی، قدیم عیسائی تھے اور ان کے فلسفہ میں غیروں کے کچھ زیادہ اثرات نہ تھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قبطی عیسائیوں کے لیے اچھے الفاظ فرمائے اور حکم دیا تھا کہ جب مصر کو فتح کرنا تو قبطی عیسائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کہ وہ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ یہ رشتہ صرف اُم المومنین حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور ماریہ قبطی رضی اللہ عنہا کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ایک قبطی شہزادی سے شادی کی تھی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبطی مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد بھی کریں گے۔

روم یعنی مصر کے حاکم عیسائیوں اور قبطی عیسائیوں کے عقیدوں میں کافی فرق تھا۔ جس کی تفصیل میں جا کر ہم کسی کے عقیدے کو ٹھیس پہنچانا پسند نہ کریں گے لیکن اتنا کہیں گے کہ یہ اختلافات اس بات پر تھے کہ کیا حضرت عیسےٰ علیہ السلام انسان تھے یا خداوند یسوع مسیح۔ یا انسان بھی تھے اور خدا بھی تھے۔ اسی طرح حضرت مریم علیہ السلام کے سلسلہ

---

1 ان کا مکمل ذکر چوتھے باب میں آئے گا۔

میں بھی سخت اختلاف تھے۔ بلکہ ایک دوسرے کے خلاف تبرے کہے جاتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہرقل کو جب ایرانیوں کے خلاف فتح نصیب ہوئی تو اس نے تمام عیسائیوں میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ وہ خود اور ارباب حکومت یونانی گرجا والے عیسائی تھے، اور قبطی عیسائی کہتے تھے کہ ان لوگوں نے مذہب کو تماشہ بنا دیا ہے اور وہ ہر قسم کے انسانوں اور بے تکی باتوں کو مذہب میں لے آتے ہیں۔ عیسائیوں کے موجودہ گروہ یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ بھی یونانی گرجا کی شاخ ہیں۔ البتہ پروٹسٹنٹ میں کچھ ''جدت'' ہے اور چرچ آف انگلینڈ بین بین ہے۔

ہرقل نے مصر کی حکومت ایک پادری کے سپرد کر دی جس کو اہل یورپ سائرس اور مسلمان مقوقس کہتے ہیں اور وہ سکندریہ میں رہتا تھا۔ تمام مورخین کا کہنا ہے کہ وہ آرمینیا کے رہنے والا تھا اور یونانی گرجا کا پیرو تھا۔ اور ہرقل نے اس کو حکم دیا کہ وعیسائیوں کو ایک گرجا اور ایک عقیدہ کے تحت متحد کر دے۔ اس نے یہ کام سختی سے شروع کیا اور قبطی عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں کو قتل بھی کر دیا۔ جن میں سکندریہ کے بڑے پادری بنجیمن کا بھائی منیاس بھی شامل تھا۔ بنجیمن خود ریگستان میں بھاگ گیا لیکن اپنے پادریوں کو حکم دے گیا کہ ان کے لیے رومی عیسائیوں کی نسبت آنے والے مسلمان بدرجہا بہتر ہیں اور ان کی مدد کرنا۔ اس طرح ہمارے آقا حضور پاک محمد مصطفےٰ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوگئی۔ اور یہ تھے مصر کے سیاسی اور اندرونی حالات جس زمانے میں مسلمان مصر میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا نام بلند کرنے کے لیے پرتول رہے تھے۔

مسلمانوں کی تجویز

اپنی حکمت عملی پر عملدرآمد کے لیے مسلمانوں کی تجویز یہ تھی کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص شام سے پیش قدمی کریں اور آئرش کے راستے پہلے فرما(۱) تک آئیں۔ اور پھر جنوب میں مصر اور باب الیون کے علاقوں میں حربی مظاہرے کریں۔ اسی دوران جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام ایک بڑا لشکر لے کر ایلہ (عقابہ) کے راستے پیش قدمی کریں۔ یعنی باب الیون اور منف وغیرہ پر۔ اور سکندریہ تب فتح کیا جائے جب اس کام کے لیے تیاری مکمل ہو جائے۔ اس تجویز کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ مصر کے دل پر قبضہ ہو جانے کے بعد سکندریہ میں رومی حکومت ڈیلٹا کے علاقوں میں سے اور مصر کے زرخیز علاقوں کی پیداوار سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی وہ بحری جہاز جو سکندریہ اس لیے آتے تھے کہ وہاں سے مصر کا غلہ اور کپاس یورپ لے جاتے تھے ان کی تجارت بھی ختم ہو جاتی تھی چنانچہ مسلمانوں کی پیش قدمی کی تجویز کو نقشہ دوم پر دکھایا گیا ہے۔

---

۱ فرما کو اہل یورپ پلاسیم کہتے ہیں۔

پیش قدمی کا راستہ

نقشہ دوم پر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی مصر کے دل کی طرف پیش قدمی کا جو راستہ دکھایا گیا ہے وہ پرانی عسکری تاریخی روایات کے مطابق تھا۔ سکندر یونانی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا اور مصر کے دل پر قبضہ کر کے پھر شمال کی طرف مڑا اور سکندریہ کا شہر آباد کیا۔ ایرانیوں نے چند سال پہلے مصر پر قبضہ کے لیے یہی راستہ استعمال کیا تھا۔ ویسے اس راستے کے ساتھ ہمارے روحانی تعلقات بھی ہیں کہ ہمارے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب مصر کا سفر کیا تو یہی راستہ اختیار کیا۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنے والے سوداگروں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور بعد میں آپ کے بھائیوں اور سارے خاندان نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔

روایت ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے دس ذوالحجہ اٹھارہ ہجری میں فلسطین کی سرحد کو پار کیا اور اس دن گیارہ یا بارہ دسمبر سن ۶۳۹ عیسوی تھا۔ اس وجہ سے چند مورخین نے مصر کی فتح اٹھارہ ہجری میں لکھ دی۔ کچھ نے وہ تاریخ لکھی جس دن شہر مصر فتح ہوا اور کچھ نے وہ تاریخ جب سکندریہ فتح ہوا۔ بلکہ بعض نے مصر کی فتح کو ۲۴ ہجری میں بتایا جب سکندریہ دوسری دفعہ فتح ہوا۔ آگے کئی لوگوں نے ان تاریخوں کو اختلاف کی صورت میں پیش کر دیا۔ لیکن یہاں کوئی اختلاف نہیں۔ اس زمانے میں سن ہجری کا تعین ہو چکا تھا اور ہم ہر واقعہ کے ساتھ اس کی تاریخ بھی لکھ دیں گے۔

مورخین کی ایک عجیب وغریب روایت

کچھ مورخین نے فتوحاتِ مصر کے سلسلہ میں ایک عجیب وغریب روایات لکھی ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو مصر میں پیش قدمی کی اجازت دینے کے بعد حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص خود مختار امیر بننا چاہتا ہے اور اس کی بڑی خواہشات ہیں اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی حفظ ماتقدم اقدام کا خیال نہ کرے گا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو انہوں نے ایک تیز رفتار قاصد عقبہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو چٹھی لکھ کر روانہ کی کہ اگر مصر کی سرحد میں داخل نہیں ہوئے مت داخل ہوا اور یہ فوج کشی نہ ہوگی۔ لیکن اگر داخل ہو چکے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر آگے بڑھتے جاؤ۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ کوچ میں تھے اور گو قاصد راستے میں مل گیا لیکن چٹھی پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد کھولی۔ یہ پڑاؤ مصر کی سرحد میں تھا۔ اس لیے فوج کشی کی گئی۔

تبصرہ

یہ روایت اتنی نامکمل یا مہمل ہے کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے۔ اول تو عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے بارے میں ہم ہر

کتاب میں کافی کچھ لکھ چکے ہیں اور کسی نے کبھی ان کی تدبر پر شک نہیں کیا۔ اور وہ ہر کام میں قدم پھونک کر رکھتے تھے۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کبھی ایسا تبصرہ نہ کرتے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص حفاظت کا بھی خیال نہ کریں گے۔ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے سب مشیروں سے مشورہ کرلیا تھا اور اجازت دینے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ الگ مشورہ کرنا مہمل نظر آتا ہے۔ پھر مصر کا ملک بھی قیصر روم کی سلطنت کا حصہ تھا۔ اور مصر کے اندر داخل ہونے یا چند میل اِدھر اُدھر ہونے سے کوئی نئی جنگ تو نہ چھڑ رہی تھی۔ اہل روم کے ساتھ تو جنگِ موتہ کے وقت سے جنگ جاری تھی۔

اس کے علاوہ عام طور پر مورخین ایسی حالتوں میں خط کا متن نقل کرتے ہیں اور یہاں صرف خط کے مضمون کا ذکر ہے۔ اس لیے الفاظ پر شک ہوسکتا ہے۔ دراصل ایسی مثال، کسی نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی ہوشیاری یا تدبر کو بیان کرتے وقت پیش کر دی کہ مصر کی فوج کشی اور فتح سب کچھ انہی کی تجویز کے تحت تھا ورنہ خلیفۂ وقت نے تو ان کو آخری وقت تک روکنے کی کوشش کی۔ اور ہمارے سامنے پہلے بھی ایسی روایات آئی ہیں، کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کو جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے اس طرف مائل کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہا جاتا ہے کہ جناب مثنی رضی اللہ عنہ نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو عراق کی فتح کی طرف مائل کیا۔ لیکن ہمارے لحاظ سے یہ سب مشورے تھے۔

ایک مبصر کی حاشیہ آرائی

اس جائزہ کے بعد ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ ایک بے معنی روایت ہے۔ لیکن اس زمانے کے ایک مبصر نے اس روایت کے بل بوتے پر اپنی مصر کی فتوحات کی کتاب میں ایک پورا باب لکھ ڈالا ہے۔ جس کا عنوان ہی ''بے دل'' یا ''نارضامند خلیفہ'' ہے یعنی انگریزی کے لفظ Reluctant-Caliph استعمال کیے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مصمم ارادہ نہ رکھتے تھے۔ اور فیصلے کر لینے کے بعد بھی تذبذب کا شکار رہتے تھے۔ اس لیے کہ اس واقعہ کا مزید جائزہ پیش کر کے حالات کی مزید گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔

دراصل بات یہ تھی کہ حصرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا لشکر تو ایک جیش المقدم اور متحرک دستہ تھا۔ اصلی لشکر جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام کا تھا۔ جس نے مدینہ شریف سے آنا تھا۔ حکمت عملی کے تحت مصر کو فتح کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اور اب زماں و مکاں کے معاملہ کے رابطے جوڑنے تھے کہ دونوں لشکر کس وقت اور کس جگہ مل کر کارروائی شروع کریں۔ نقشہ اول اور نقشہ دوم کا مطالعہ ظاہر کرے گا کہ یہ دونوں لشکر جا کر مصر کے دل میں اکٹھے ہوئے۔ بلکہ زماں کے لحاظ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کافی عرصہ متحرک کارروائیاں کرتے رہے تو جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا لشکر کافی عرصہ بعد میں جا کر پہنچا۔ تو یہ بالکل ممکن ہے کہ خلیفہ دوم نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی طرف کوئی قاصد بھیجا ہو کہ اگر مصر کی سرحد میں داخل نہیں

ہوئے ہو اور دشمن کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں ہوا تو جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا انتظار کر لو۔ لیکن اگر ملک مصر میں داخل ہو چکے تو پھر محدود جارحانہ اور متحرکانہ کارروائیاں جاری رکھو اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی کمک کا انتظار کرو یہ سب کچھ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کی اعلیٰ سوچ کے تحت آتا ہے۔ اور اس میں نہ ''بے دلی'' ہے اور نہ ''نارضامندی''۔

جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام کی کمک

نقشہ اول اور نقشہ دوم دونوں پر جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی کمک کے پیش قدمی والے راستہ اور دونوں لشکر کے باہمی ملاپ کو واضح کر دیا گیا ہے۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر کی نفری کچھ مورخین نے آٹھ ہزار اور کچھ نے بارہ ہزار لکھی ہے۔ جلال الدین سیوطی کا جائزہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مصر والے تمام لشکر کی تعداد بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور چونکہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے لشکر کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی اس لیے جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یہاں ایرانی ''ہزار مرد'' کی نقل میں کچھ مورخین اور مبصرین یہ لفاظی بھی کر گئے کہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ از خود، اور آپ کے لشکر میں جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت، جناب مقداد رضی اللہ عنہ بن الاسود اور جناب خریجہ رضی اللہ عنہ بن خذافہ میں سے ہر ایک ہزار مجاہدین کے برابر تھا۔ بے شک چاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اولین مسلمانوں میں سے ہیں اور جنگِ بدر میں بھی شرکت کی۔ لیکن اسلام کا فلسفہ اجتماعی ہے اور وہ قرآن پاک میں موجود ہے کہ اگر ہو گے ایک سو تو غالب آؤ گے ایک ہزار پر اس لیے ہم مجاہدین کو الگ الگ ناپنے اور تولنے کے اصول کو نہیں مانتے۔ اسی طرح قاصد کے لیے بھی احکام تھے کہ اگر سخت ضرورت نہ ہو تو پیغام پڑاؤ پر دیا جائے۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو پیغام تب ملا ہو جب وہ پڑاؤ پر پہنچے ہوں۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا کوچ

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے کوچ جاری رکھا اور ان کو کوئی خاص مسئلہ پیش نہ آیا۔ اہل روم نے سب کچھ سکندریہ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ سکندریہ کو ناقابل تسخیر بھی سمجھ رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ مسلمان ڈیلٹا سے آگے نہ بڑھ سکیں گے، اور مسلمانوں کے پاس کوئی بحری طاقت بھی نہ تھی کہ سکندریہ پر سمندر کے راستے سے حملہ کر سکیں۔ ان کو اس کی بھی زیادہ امید نہ تھی کہ مسلمان مصر کے دل کی طرف کوئی زیادہ پیش قدمی کریں گے۔ ان کے تمام تر قلعہ جات دریا کے کنارے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ مسلمان محاصرہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ کے لشکر کی پیش قدمی پر کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔ انہوں نے اس کو ایک حربی مظاہرہ ہی سمجھا۔ ویسے بھی مسلمان ہلکے پھلکے اور متحرک تھے اور رومیوں کو خیال تھا، کہ اگر کبھی مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا تو محاصرہ توڑ سامان کے بغیر ایسا نہ کریں گے۔

فرما کی جنگ

جناب عمرو رضی اللہ عنہ آنرش سے آگے فرما پہنچے جو ایک بندرگاہ تھی۔ لیکن اس جگہ کی آب وہوا اتنی اچھی نہ تھی اور اہل روم نے یہاں معمولی سا قلعہ بنایا ہوا تھا۔ جس میں کچھ فوج رہتی تھی۔ اس کی تعداد کے بارے میں مورخین خاموش ہیں۔ مسلمانوں نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن ان کو کوئی زیادہ جلدی نہ تھی۔ انہیں کمک کا انتظار تھا اور نقشہ اول و دوم سے ظاہر ہوگا کہ مدینہ کا فاصلہ کافی دور تھا اور اس وقت تک کمک روانہ بھی نہ ہوئی تھی۔ یہ محرم انیس ہجری کا واقعہ ہے۔ پہلے تو رومی کچھ ڈر گئے تھے کہ شام میں لگاتار شکستیں کھانے کی وجہ سے انہوں نے اندازہ لگایا ہوگا کہ مصر پر بھرپور وار ہونے والا ہے اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی فوج کوئی ہراول دستہ ہے۔ بڑی فوج آنے والی ہوگی، اس لیے وہ قلعہ بند ہو گئے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان لشکر کو پیچھے سے کوئی کمک وغیرہ ہیں آئی تو رومی لشکر نے ایک آدھ دفعہ قلعہ سے باہر نکل کر اسلامی لشکر پر دھاوے کئے۔ مسلمان پیچھے ہٹ جاتے تھے کہ وہ وقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ رومیوں نے اس کو مسلمانوں کی کمزوری سمجھا اور ایک دفعہ کچھ زیادہ ہی باہر نکل آئے۔ مسلمان موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے لشکر کے بڑے حصہ کو الجھا رکھا اور کچھ مجاہدین نے آگے بڑھ کر قلعہ کے دروازہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمان فرما شہر میں داخل ہو گئے۔ رومی کچھ تو مارے گئے، کچھ قیدی بنے اور زیادہ تر تعداد کشتیوں میں بیٹھ کر سکندریہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

فرما کے قلعہ کی مسماری

مسلمانوں کو فرما کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس کو پکی فوجی چوکی بھی نہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ وہاں پر کوئی قلعہ بند فوج بھی نہ رکھنا چاہتے تھے ان کی تجویز کے مطابق ان کے لیے قلزم یا سویز کے مقامات زیادہ اہم تھے۔ مدینہ شریف کے ساتھ سیدھا رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی بحری طاقت نہ تھی اور رومی کسی بھی وقت اس بندرگاہ پر آ کر قبضہ کر سکتے تھے اور قبضہ کرنے کے بعد فرما کے قلعہ کو اپنی حفاظت کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے فرما کے قلعہ کی تمام دیواریں مسمار کر دیں۔ فوجی حکمت عملی اور تدبیرات کے طور پر اس کارروائی کو آج کل بھی Denial Plan کہتے ہیں کہ جو چیز اپنے استعمال کی نہ ہو اسے ناکارہ کر دو تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ مسلمانوں نے اس پر جلدی عمل کیا کہ وہ جنوب کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ ویسے عام طور پر جنگ کے دوران ''ناکارہ تجویز'' پر عمل پیدا ہونے کے بڑے اصول اور طریق کار ہیں۔ لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہ جائیں گے اور صرف اس پر اکتفا کریں گے کہ اس تجویز کو میدانِ جنگ سے لے کر بڑے بڑے شہروں تک عملی جامہ پہنانے کے لیے امن کے زمانہ میں بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی تھی اور ترجیحات مقرر کی جاتی ہیں کہ کونسا کام کس وقت کیا جائے گا۔ مسلمان اس

زمانے میں بھی اس اصول کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو مدینہ سے کمک ملنے کی امید ربیع الاول کے بعد تھی اور ایسی کمک عین شمس کے قریب ملنے کی امید تھی اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے البتہ مخبروں کو سویز اور قلزم کے علاقے میں بھیج دیا کہ کمک کے آنے کی خبر دیں اور خود "مصر کے دل" کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلی جھڑپ بلبیب کے مقام پر ہوئی جو عین شمس سے شمال کی طرف ہے۔ لیکن آگے جہاں اسلامی لشکر جاتا۔ رومی فوج قلعہ بند ہو جاتی۔ عین شمس، باب الیون ہر جگہ رومی قلعہ بند ہونا شروع ہو گئے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے متحرک دستوں کے بارے میں دشمن نے یہ اندازہ لگایا جیسے یہ کوئی جیش المقدم ہے اور کوئی بڑا الاؤ لشکر آنے والا ہے۔ اب جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اس پوزیشن میں بھی نہ تھے کہ کسی جگہ کا محاصرہ کر لیتے۔ اس طرح ان کی کم نفری والی بات سامنے آ جاتی۔ صرف باب الیون میں رومی لشکر کی تعداد دس، پندرہ ہزار کے قریب تھی اور اگر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کسی ایک جگہ تنگ پڑاؤ کر لیتے تو جنگ میں الجھ جاتے۔ اب تک انہوں نے اپنی تمام تر کارروائی کو حرکت کے محور کے گرد رکھا تھا کہ انہوں نے اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہ کیا۔ لیکن مصر کے دل میں پہنچ جانے کے بعد وہ اگر واپس مڑتے تو رومیوں کے حوصلے بڑھ جاتے اور وہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا تعاقب کرتے۔

نرالی تجویز

چنانچہ جناب عمرو بن عاص نے ایک نرالی تجویز اپنائی آپ نے امام الذنین کے مقام پر سے دریائے نیل کو عبور کیا اور منف سے گزر کر اپنی حرکت کو جنوب میں فیوم کے مقام تک جاری رکھا وہاں کے رومی بھی متحرک مسلمانوں کو دیکھ کر قلعہ بند ہو گئے۔ فیوم کے مقام پر بھی سخت اور مضبوط قلعہ تھا اور متحرک مسلمان دستوں کو کوئی ایسا چھوٹا قلعہ تو نہ مل سکا جس کو وہ سر کر لیتے لیکن راستے میں جو رومی ملا اس کو تہ تیغ کر دیا۔ غنیمت کا کافی سامان ہاتھ لگا۔ غلہ اور کھانے پینے کی کافی چیزیں میسر آ گئیں۔ حربی مظاہرہ کو دیکھ کر رومی سہم گئے۔ لیکن دریائے نیل کے مغرب میں زیادہ دیر ٹھہرنا فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے صحیح کارروائی نہ تھی۔ اس لیے جب حرکت اور زیادہ نہ کی جا سکی تو مسلمان واپس مڑے۔ اس ساری کارروائی کو نقشہ دوم میں دکھایا گیا ہے۔

تبصرہ

یہ کارروائی خراب نتائج بھی پیدا کر سکتی تھی۔ اگر رومی ہمت کر جاتے اور مغرب کی فوج جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو دریا کے مغرب میں الجھا لیتی اور مشرق میں جب جناب زبیر رضی اللہ عنہ پہنچتے تو مشرقی قلعوں کی فوج ان کا قلع قمع کر سکتی تھی۔ لیکن ایسا اس فوج کے ساتھ ہو سکتا ہے جو چوکنی نہ ہو اور کسی ایک جگہ پڑاؤ ڈال لے۔ مسلمان متحرک تھے۔ اور وہ

دشمن کو ردِ عمل کا موقع نہ دیتے تھے۔ جب جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص فیوم پہنچے تو جناب زبیر رضی اللہ عنہ سویز پہنچ چکے تھے اور پہلے اس سے کہ رومی کوئی ردِ عمل سوچتے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ یعنی جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے دریا کو پار کیا اور جیسا کہ نقشہ دوم پر دکھایا گیا ہے انہوں نے عین شمس کے مشرق میں سویز سے آگے بڑھنے والی جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی کمک کے ساتھ ملاپ قائم کیا اور دونوں لشکر آپس میں مل گئے۔ ہمارے ایک مبصر نے مورخین کے بیان سے تمام کارروائی کے تانے بانے کچھ اور طرح سے جوڑے ہیں کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے دریا کو واپس عبور کر کے باب الیون کا محاصرہ کر لیا اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو پھر مدینہ شریف سے کمک طلب کی اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا لشکر آیا۔ ہمارے لحاظ سے ان کا زمان و مکاں کا معاملہ یہاں ٹھیک نہیں لگتا اور حکمت عملی کے تحت بھی یہ تجویز غلط معلوم ہوتی ہے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سب کارروائی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کے تحت ہو رہی تھی۔ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اکیلے اپنی پانچ یا چار ہزار کی فوج کے ساتھ مصر کے دل پر کیسے قبضہ کر لیتے جب خود مقوقس پندرہ ہزار کی فوج لے کر باب الیون پہنچ چکا تھا اور کم از کم چار یا پانچ ہزار فوج وہاں پہلے موجود تھی۔ اور ظاہر ہے کہ کچھ رومی لشکر منف اور فیوم کے مقام پر بھی تھے۔ البتہ وہ سب دبکے بیٹھے تھے لیکن یہ مبصر لکھ دیتے ہیں کہ رومی عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے چھوٹے سے لشکر کو دیکھ کر ہنستے تھے کہ وہ چند ہزار نفوس کے ساتھ ان کا محاصرہ کر رہے ہیں۔ ہم اس کو افسانہ کہیں گے۔

عین شمس کی لڑائی

چنانچہ ہمارے لحاظ سے جناب عمرو نے جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر کو اپنی کمانڈ میں لینے کے بعد اہل روم کے ساتھ جو پہلی لڑائی لڑی وہ عین شمس اور باب الیون کے مقامات کے درمیان ایک جگہ لڑی گئی اور نقشہ سوم میں اس جنگ کے دو مرحلوں کے خاکے بھی موجود ہیں۔ ہمارے یہ مبصر اس جنگ کو بھی باب الیون کی جنگ کا نام دیتے ہیں، لیکن باب الیون کا باقاعدہ محاصرہ کرنا پڑا۔ جس کا ذکر بعد میں تفصیل سے آئے گا کہ وہ جگہ بعد میں فتح ہوئی۔ یہ جنگ عین شمس کے نزدیک رجب انیس ہجری میں ہوئی۔ عین شمس ایک شہری آبادی تھی اور وہاں ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ جس پر مسلمانوں کا قبضہ بھی ہو گیا تھا۔ مسلمان عین شمس کے قریب پڑاؤ کیے ہوئے تھے اور رومیوں کی کوئی بیس ہزار کے قریب فوج وہاں سے دس میل دور باب الیون میں ٹھہری ہوئی تھی عین ممکن ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے فیوم وغیرہ سے واپس آنے کے بعد مقوقس پندرہ ہزار فوج لے آیا اور پہلے وہاں صرف پانچ ہزار فوج ہی ہو اور اس وجہ سے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی دیکھ بھال اور متحرک کارروائیوں میں پہلے تو یونانی مخل نہ ہو سکے لیکن اب جو انہوں نے دیکھا کہ عین شمس کے

مقام پر اسلامی لشکر کی تعداد کوئی تیرہ یا چودہ ہزار کے قریب ہے تو انہوں نے اس فوج کا قلع قمع کرنے کے بارے میں سوچا۔ ان کے پاس کوئی بیس ہزار فوج تھی۔ اور مقوقس کے علاوہ اس فوج کا رومی کمانڈر انچیف بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا نام تھیوڈرس تھا لیکن مسلمان اس کو منذفور کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم منذفور ہی کہیں گے۔ گو مسلمان اس کو زہریلا سانپ بھی کہتے تھے۔

چنانچہ رومیوں نے فیصلہ کیا کہ ایک دن باب الیون سے نکل کر مسلمانوں کے پوزیشن پر حملہ کر دیں۔ باب الیون اور عین شمس کے درمیان فاصلہ تقریباً دس میل تھا لیکن مسلمان عین شمس سے آگے اونچی زمین اور کھلے میدان میں تھے۔ ان کے مشرق کی طرف مقدم کی پہاڑی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جب رومی باب الیون سے آگے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتے تو رومیوں کے دائیں ہاتھ پر مقدم کی پہاڑی ان کو حفاظت مہیا کرتی اور بائیں ہاتھ پر دریائے نیل اور اس کے کنارے کے باغ۔ اس لیے رومی اپنی تعداد کی وجہ سے بڑے پر امید تھے کہ وہ مسلمانوں کو تہس نہس کر دیں گے۔

مسلمانوں کی تجویز

رومی البتہ قلعہ کے اندر تھے اور باہر کی زمین کو وہ صرف دن کے وقت دیکھ سکتے تھے۔ مسلمانوں نے عین شمس کے شہر پر تو مکمل قبضہ کر لیا۔ لیکن مسلمان باب الیون کا محاصرہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی کل بارہ یا چودہ ہزار فوج رومی فوج سے آدھی بھی نہ تھی۔ پھر باب الیون کا محاصرہ صرف تین طرف سے ہو سکتا تھا۔ چوتھی طرف دریا تھا۔ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ ان کی کم تعداد دیکھ کر کس طرح رومی قلعہ سے باہر نکل کر ان پر حملہ آور ہوں۔ اور پھر مسلمان ان کے گرد گھیرا ڈال کر انہیں ختم کر دیں گے۔ کچھ مبصرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ رومی اکثر باہر نکل کر حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور ایک دن جب وہ حملہ کے لیے باہر نکلے تو مسلمانوں نے ان کو گھیرا ڈال کر تہس نہس کر دیا۔ یہ روایات ہمارے فوجی ذہن کو اپیل نہیں کرتیں کہ جو فوج قلعہ میں پناہ گزیں ہو وہ ہر روز ایسا کرے گی۔ ایسی افواج ایک آدھ کوشش میں حملہ آور یا محاصرین کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ ایسی کارروائی ایک سے زیادہ دفعہ کی گئی ہو کہ پہلی دو کتابوں میں واضح کر دیا گیا ہے کہ محاصرہ کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں نے دیکھ بھال والا محاصرہ اور خشکی کے راستوں کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ اہل روم کی تقریباً بیس ہزار کی فوج باب الیون کے قلعہ اور روضہ کے جزیرہ میں محصور تھی۔ جہاں رسد صرف دریا کے راستے سے حاصل کی جاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے تجویز بنائی کہ قلعہ سے نکل کر مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا جائے۔

مسلمان چوکنے اور باخبر تھے۔ ان کے مخبر رومی لشکر کے اندر بھی موجود تھے کہ قبطی مصریوں کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں چنانچہ انہوں نے حملہ والے متوقع دن سے ایک رات پہلے رات کے وقت دو فوجی دستے قلعہ

کے دائیں مکتم (۱) یا مقدم کی پہاڑی اور بائیں کھجوروں کے جھنڈ میں چھپا دیئے۔ دائیں والے دستہ کے کمانڈر جناب خریجہ رضی اللہ عنہ تھے اور بائیں والے دستہ کے امیر کا نام کسی کتاب میں نہیں مل سکا۔ بہرحال دستوں کو اس ہوشیاری سے چھپایا گیا کہ رومیوں کو اس کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ نقشہ سوم کے خاکہ مرحلہ اول میں اس تجویز کی نشاندہی کی گئی ہے۔

جنگ کی کارروائی

چنانچہ مقررہ دن صبح سویرے اہل روم کے لشکر نے باب الیون کے قلعہ سے نکل کر اپنے سامنے صحرا کا رخ کیا۔ جہاں پر اسلامی لشکر عین شمس سے دو تین میل آگے پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ دونوں لشکروں کے درمیان کوئی پانچ، چھ میل کا فاصلہ ہوگا۔ رومی قلعہ سے نکل کر کھلی فارمیشن میں مسلمانوں پر حملہ کے لیے تیار ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا رخ شمال کی طرف تھا۔ آگے سے اسلامی لشکر نے بھی صف بندی کی اور پھر دونوں لشکر گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی دوران مسلمانوں کے وہ دستے جو مشرق میں مکتم (مقدم) پہاڑی کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، انہوں نے جناب خریجہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت نعرۂ تکبیر کی صدا لگا کر رومیوں کی پچھلی طرف حملہ کر دیا۔ لیکن رومیوں کو اپنی تعداد پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا۔ انہوں نے مغرب کی طرف سے کچھ فوج ہٹا کر اپنا رخ شمال مشرق کی طرف کر دیا اور مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے۔ لیکن اب اُس اسلامی دستہ کی باری تھی، جو مغرب میں درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے رومیوں کی پچھلی طرف اور بائیں بازو پر حملہ کر دیا۔ نقشہ سوم کے خاکہ میں دوسرا مرحلہ اس تمام کارروائی کی ایک جھلک ہے۔

یہ لڑائی اہل روم کو بڑی مہنگی پڑی۔ چہار گوشہ دفاع تو لڑائی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن چومکھی لڑائی لڑنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ ایسی لڑائی کسی مقصد کے تحت لڑی جا سکتی ہے۔ اور جس حالت سے رومی دوچار تھے، ان کے لیے صرف ایک ممکنہ مدعا یا طریق کار باقی رہ جاتا تھا کہ چومکھی لڑائی لڑیں۔ اس طرح کہ سارا زور دے کر عقب کی طرف باب الیون کے قلعہ کے دروازوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اگر گھیرا توڑ کر دائیں یا بائیں نکلتے۔ تو مسلمان قلعہ کے دروازوں پر قبضہ کر لیتے۔ بے شک سامنے مسلمانوں کی بڑی صفوں کو چیر کر تباہ کرنے والا مقصد تو ختم ہو چکا تھا۔ سمجھنے والی بات یہ تھی کہ لڑائی عمل سے جیتی جاتی ہے اور عمل یہ تھا کہ سامنے والی مسلمان صفوں کو تباہ کر دیا جائے۔ اس عمل یا مدعا کو حاصل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ حالات تبدیل ہو گئے تھے۔ رومی فوج کا سپہ سالار منذفور (تھیوڈرس) سمجھدار آدمی تھا اور قلعہ میں رومی فوج کچھ نہ کچھ موجود تھی۔ چنانچہ منذفور نے حکم دیا کہ "پیچھے مڑ کر قلعہ کے دروازہ تک پہنچو اور واپس قلعہ بند ہو جاؤ"۔ افراتفری بے پناہ تھی۔ رومی گھبراہٹ میں ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔ صرف ایک فائدہ یہ تھا کہ مسلمان دستے

۱؎ مقدم یا مکتم کی پہاڑی کا نام حضرت نوح علیہ السلام کے پڑپوتے مصر کے بیٹے مکتم یا مقدم کے نام پر ہے کہ وہ اس پہاڑی پر آ کر رکتے تھے۔ اس پہاڑی کا ذکر انجیل مقدس میں بھی ہے اور یہ پہاڑی ہمیشہ مقدس رہی۔ آج کل بھی وہاں بہت بڑا قبرستان ہے۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جنہوں نے رومیوں کے عقب پر حملہ کیا تھا۔ ان کی تعداد کم تھی۔ اس لیے منذفور اور کافی رومی قلعہ باب الیون کے دروازہ تک پہنچ گئے اور قلعہ کے اندر داخل ہونا شروع کر دیا۔ رومی فوج کا زیادہ نقصان البتہ مسلمانوں کی بڑی فوج نے کیا جس پر انہوں نے حملہ کیا تھا وہ اب رومی فوج کے عقب میں تھے اور پسپا ہونے والی رومی فوج پر وہ بڑھ بڑھ کر وار کر رہے تھے۔

عین شمس کی لڑائی کے ثمرات

عین شمس کی لڑائی میں رومیوں کا بہت بڑا نقصان ہوا اور بیس ہزار کے لشکر سے کم از کم چودہ پندرہ ہزار آدمی باہر نکلے تھے۔ ان میں سے آدھے بھی واپس نہ جا سکے۔ نقصان کی صحیح تعداد نہیں معلوم ہو سکی۔ اب مسلمانوں نے حضور پاک ﷺ سے سیکھے ہوئے طریقہ کے مطابق اپنی فتح کے ثمرات وصول کرنے شروع کیے۔ سب سے پہلے انہوں نے شہر مصر کی طرف پیش قدمی کی تو اہل شہر نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح دریائے نیل کے مشرق میں باب الیون کے قلعہ کو چھوڑ کر باقی سب علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہمارے اس مبصر کے سارے تجزیئے یہاں آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ جس کے مطابق جناب عمروؓ نے چار ہزار کے لشکر کے ساتھ قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ رومی جو بارہ ہزار اسلامی لشکر پر پل پڑے۔ بھلا وہ چار پانچ ہزار کے لشکر کو کیسے خاطر میں لاتے۔ بہر حال وہ مبصر یہاں آ کر رومیوں کی شکست کی ذمہ داریوں کو غلط سوچ پر ڈال دیتے ہیں۔ اور ہم یہ اضافہ کریں گے کہ جناب عمرو کی متحرکانہ کارروائی نے روم والوں کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور جب رومیوں نے مسلمانوں کو "ساکن" دیکھا تو حملہ کیا لیکن جناب عمروؓ مقابلے کے لیے تیار تھے۔

اس کے بعد جناب عمروؓ نے دریائے نیل کو پھر عبور کیا اور جیزہ ومنف کے مقامات پر قبضہ کیا اور کچھ دستوں کو خشکی والے راستے فیوم بھیجا۔ ان میں ایسے مجاہدین شامل تھے جو فیوم تک پہلے حربی مظاہرہ کر چکے تھے۔ لیکن رومیوں نے جب فیوم میں عین شمس کی لڑائی کا حال سنا تو انہوں نے مسلمان دستوں کو خشکی پر دیکھ کر، اپنی کشتیوں کو دریا میں ڈال دیا۔ دریائے نیل میں تھوڑی تھوڑی طغیانی شروع ہو چکی تھی۔ رومی باب الیون سے گزرتے ہوئے ترانہ پہنچ گئے۔ مسلمان ان کا دریا میں تعاقب نہ کر سکے۔ لیکن فیوم شہر کے لوگوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ غیر مشروط طور پر صلح کر لی۔ اس کے بعد جناب عمروؓ بن عاص نے کچھ دستوں کو شمال میں ڈیلٹا کے علاقوں کی طرف بھیجا جنہوں نے عشریب اور مناف کے شہروں تک کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور مصر کے زرخیز ترین علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔

اب شعبان اور رمضان کے مہینے تھے۔ اِدھر اگست کا مہینہ آ گیا اور دریائے نیل میں طغیانی بڑھ گئی۔ ڈیلٹا کے دریا پانی سے بھر گئے اور ڈیلٹا کا تمام تر علاقہ دلدل میں تبدیل ہو گیا۔ یہ سیلاب یا طغیانی علاقے کے لیے باعثِ رحمت تھی کہ

دریائے نیل کی مٹی ہی زرخیزی کا سبب ہے اور اس کا پانی ہی فصلوں کی جان ہے۔ لیکن ان مہینوں میں ان علاقوں میں فوجی کارروائی مشکل تھی۔ ان حالات میں مسلمان شمال کی طرف کوئی بڑی کارروائی کرنے کے قابل نہ تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے باب الیون کا محاصرہ کر لیا۔ گو مسلمان محاصرہ کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن اس کے بغیر کوئی اور کارروائی نظر نہ آتی تھی۔

باب الیون کا محاصرہ

مسلمان اب محاصرہ بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ اب دریائے نیل اور اس کے دونوں کناروں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ لیکن باب الیون کوئی معمولی قلعہ نہ تھا۔ کچھ مورخین کے حساب سے اس کے دو دفاع تھے۔ ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ یعنی قلعہ کی دیواروں کے باہر ایک کھائی (۱) تھی۔ جس کو دریائے نیل کے پانی سے بھر دیا جاتا تھا۔ خیال ہے کہ بیس ہزار کی نفری قلعہ کے اندر نہ سما سکتی ہوگی۔ گو قلعہ کی اونچائی کی وجہ سے کئی منزلیں بنائی جا سکتی تھیں اور ساتھ روضہ کا جزیرہ تھا اور وہاں الگ قلعہ تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ بیس ہزار کی نفری کو قلعہ کے اندر رکھا جا سکتا ہوگا۔ گو اس وقت نفری کوئی دس ہزار کے قریب رہ گئی تھی۔ کیونکہ کافی نفری قلعہ سے باہر نکل کر ماری جا چکی تھی۔ بیرونی یا دوہرا دفاع تقریباً ہر قلعہ کا ہوتا ہے۔ کسی کا نزدیک سے اور کسی کو دور دور چکوں کی مدد سے۔ بہر حال قلعہ عام طور پر ایک اہم زمین پر ہوتا ہے۔ اور گو آج کل قلعہ جات کا دفاع میں تصور نہیں ہے، لیکن اصول وہی ہیں کہ اہم زمین کا بھرپور دفاع کیا جاتا ہے۔ البتہ ذرائع اور طریق کار میں تبدیلی آ گئی ہے۔

سکندریہ کا گورنر یا باجگذار بادشاہ مقوقس بھی اس قلعہ میں موجود تھا۔ اور اس قلعہ کی دیواریں تقریباً ساٹھ فٹ اونچی تھیں اور دیواروں کی موٹائی کم از کم آٹھ فٹ تک تھی۔ قلعہ کے دو بہت اونچے برج بھی تھے۔ قلعہ نے زیادہ زمین نہ گھیری ہوئی تھی۔ اس کا طول تقریباً ایک ہزار فٹ کے قریب تھا اور عرض چار سو سے پانچ سو فٹ تک۔ قلعہ کی ایک طرف دریائے نیل بہتا تھا اور جنوبی دروازہ دریائے نیل میں کھلتا تھا۔ وہاں پر چند کشتیاں موجود رہتی تھیں کہ سامنے روضہ کے جزیرہ میں آنے جانے میں آسانی ہو۔ وہاں پر بھی ایک چھوٹا سا قلعہ تھا اور اس میں بھی فوج اور کچھ اعلیٰ افسر رہتے تھے۔ اور دفاع کے لحاظ سے وہ بہتر جگہ تھی۔ بہر حال دونوں قلعوں کا آپس میں بہترین رابطہ تھا۔

رومیوں کے پاس کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا اور مسلمان دریا کی پوری ناکہ بندی نہیں کر سکتے تھے۔ چوری چھپے لوگ رومیوں کو سامان پہنچا سکتے تھے۔ گو مسلمانوں کا دریا کے دونوں کناروں پر قبضہ تھا، لیکن دریا کے چوڑے پاٹ کی دیکھ بھال رات کو مشکل ہو جاتی تھی۔

۱۔ پہلی کتاب بارہویں باب میں انبار کی لڑائی اور چوبیسویں باب میں جلولہ کی لڑائی میں کھائی کی وضاحت موجود ہے۔

مقوقس کی صلح کی کوشش

سکندریہ کا گورنر مقوقس البتہ کسی طرح سے کوئی سمجھوتہ کر کے وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مصر کی قبطی آبادی اس کے خلاف ہے۔ اور جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا اس وجہ سے ان کے دل میں مقوقس اور رومیوں کے لیے نفرت تھی۔ مقوقس کو کچھ تو اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا اور کچھ شاید اس کو کسی ذریعے سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ مشکل ہے۔ اس لیے وہ صلح پر تلا ہوا تھا۔ مصر کی قبطی آبادی بھی مسلمانوں کو ناپسند نہ کرتی تھی ان کو معلوم تھا کہ مسلمان کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بناتے اور رومیوں کی طرح دوسروں کے عقائد میں دخل اندازی بھی نہیں کرتے۔

چنانچہ مقوقس نے مسلمانوں کی طرف صلح کے پیغام بھیجنے شروع کر دیئے۔ مقوقس سمجھدار آدمی تھا اس نے صلح کی بات چیت کے لیے روضہ کے قلعہ کو پسند کیا۔ کہ باب الیون میں سارے لشکر کو حالات سے دور رکھا جائے۔ وہاں سے اس نے قبطی لوگوں کے ایک وفد کو مسلمانوں کے پاس بھیجا تاکہ صلح کی کوئی بات ہو جائے۔ مسلمانوں نے اپنی مشہور تین شرطیں دہرادیں کہ اوّل اسلام لے آؤ۔ اسلام میں داخل نہیں ہوتے تو جزیہ دو اور اگر یہ بھی منظور نہیں تو تلوار فیصلہ کرے گی۔ لیکن مقوقس نے گزارش کی کہ مسلمان کوئی وفد بھیجیں۔

جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت کی سفارت

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے اس کام کے لیے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت کو سفیر مقرر فرمایا۔ ان کا ذکر جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ آپ کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ اور رنگ کافی سیاہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دل روشن کر دیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے جلال کی یہ حالت تھی کہ ان کو دیکھ کر دشمن کانپنا شروع کر دیتے تھے اہل روم کو کچھ غلط فہمی بھی ہوئی کہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ حبشی النسل تھے۔ بلکہ یہ غلط فہمی دور بھی نہ ہو سکی کہ مغربی مورخین ان کو حبشی ہی کہتے ہیں اور جنرل گلب جیسے مورخ نے بھی ان کو حبشی النسل قرار دیا اور یہ لکھا کہ رومیوں پر رعب پڑ گیا کہ مسلمانوں میں رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہیں اور ایک حبشی بھی ان کا امیر ہو سکتا ہے۔

جب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت انصار تھے اور بیعت عقبہ(۱) ثانی میں موجود تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے جو بارہ نقیب مقرر فرمائے۔ آپ ان میں سے ایک تھے اور آپ کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ شاہد حبشی ہونے کا شک مسلمان مورخین کے دل میں بھی ہو سکتا ہے کہ ابن اسحاق نے آپ کے حسب و نسب کے سلسلے میں صرف پردادا تک نام لکھا اور باقی نقیبوں کی طرح دس بارہ پشتوں کا ذکر نہ کیا۔ اور بعد کے مورخین نے رنگ کی وجہ سے آپ کو کسی انصار قبیلہ کا

---

۱ جلال مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۲۷ سے استفادہ کریں۔

حلیف سمجھ لیا ہو۔ یہ شجرہ نسب مکمل نہ تھا۔ بہر حال ابن ہشام نے اپنے اضافوں میں شجرۂ نسب بھی مکمل کر دیا ہے اور اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بے شک آپ انصار سے ہیں۔

مقوقس کا تجزیہ

مقوقس مسلمانوں کے ساتھ صلح کا خواہاں ضرور تھا۔ لیکن وہ آرمینیا کا رہنے والا تھا۔ اور پھر بھی ایشیائیوں کی نفری میں آتا تھا۔ رومی جن میں زیادہ یونانی تھے وہ بھی ایک غلط فہمی کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے شام و فلسطین کو اس لیے فتح کر لیا کہ وہاں ریگستان تھے۔ مصر میں جب دریائے نیل میں طغیانی آ جائے گی اور آگے سمندر ہے تو اس علاقے میں مسلمان رومیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے مقوقس کو کہا کہ وہ مسلمانوں پر اپنی طاقت کا رعب ڈالے۔

چنانچہ مقوقس نے کہا۔ ''تم مسلمانوں کو ابھی اہل روم کی اصلی طاقت کے ساتھ واسطہ نہیں پڑا۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ حاصل کیا ہے اس کو لے کر اپنے ملک میں واپس چلے جاؤ۔ ورنہ مسلمان بری طرح شکست سے دوچار ہوں گے۔ اور ہاں، اگر مسلمان واپس جانے پر تیار ہو جائیں تو ان کو ان کے خلیفہ اور امرا کے لیے کچھ تحائف بھی دے دیئے جائیں گے''۔

جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت نے کہا۔ ''سنو اے آرمینیا والے! ہم صرف اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اور دولت کو ہمارے ہاں کچھ حیثیت حاصل نہیں۔ اس دنیا کی کچھ حقیقت نہیں۔ ہم تو دوسری دنیا یا آخرت کے لیے سب کچھ کرتے ہیں''۔

یہ سن کر مقوقس کی رہی سہی دانائی بھی ختم ہو گئی اور چپکے سے اپنے ایک ساتھی کو کہا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دنیا کو تہس نہس کرنے کے لیے بھیج دیا ہے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ مقوقس کو کچھ خود آگاہی تھی یا کسی عیسائی راہب کے ذریعے آنے والے واقعات کے بارے میں باخبر تھا۔ لیکن ظاہری طور پر اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت کو کہنے لگا۔ ''آپ نے ہمارے لشکر ابھی نہیں دیکھے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کے آنے سے پہلے کچھ تحفے اور رقم لے کر یہاں سے چلے جاؤ'' اس پر جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت نے کہا۔ ''نفری اور تعداد کو ہم کوئی وقعت نہیں دیتے۔ ہم تو شہادت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ہم کبھی ایسی دعا نہیں مانگتے کہ خیر و خیریت سے اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچ جائیں۔ اپنی کم تعداد کی ہم نے کبھی فکر نہیں کی۔''

اس کے بعد جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن الصامت اٹھ کھڑے ہوئے اور زور سے کہا۔ ''کہ سنو ہم تو صرف ان تین شرائط کے قائل ہیں، جو ہمارے سپہ سالار نے آپ کے وفد پر واضح کر دی تھیں۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تمہیں ان تین میں سے کون سی شرط منظور ہے۔''

اب تو مقوقس کی طبیعت بالکل صاف ہوگئی۔ لیکن اس کے رومی ساتھی حوصلہ میں تھے اور وہ صلح پر تیار نہ تھے ورنہ مقوقس تو جزیہ دینے پر تیار تھا، چنانچہ مقوقس نے ان کو راہِ راست پر لانے کی ترکیب سوچ لی اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے چار دن کی مہلت مانگی۔ لیکن جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے فرمایا کہ مسلمان صرف تین دن کی مہلت دیتے ہیں اور اس فیصلہ پر لڑائی تین دن کے لیے رک گئی۔

کچھ مورخین نے ایک اور کہانی بھی لکھی ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ذاتی طور پر مقوقس کے ساتھ بات کرنے گئے تھے اور رومی سپہ سالار منذفور نے ایک تجویز بنائی کہ مسلمانوں کا سپہ سالار قلعہ سے باہر نکل رہا ہو تو ایک بڑا پتھر اس کے سر پر پھینک دیا جائے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اس کی موت کسی حادثہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لیکن جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص رومیوں کی باتوں سے ان کے مکروفریب کو بھانپ گئے اور انہوں نے رومیوں کو کہا کہ وہ اپنے تمام امرا کو قلعہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ ناقابل تسخیر ہے اور پھر واپس چلے جائیں گے۔ رومیوں نے سوچا کہ اس طرح سب امرا کو تہ تیغ کرنے کا بڑا اچھا موقع مل جائے گا وغیرہ واللہ اعلم بالصواب۔ ہمارے پاس ایسی رومی شرارت کو جھٹلانے کی کوئی وجوہ نہیں کہ رومیوں نے شام کی جنگوں میں دغابازی کرنے کی کوشش کی تھی۔

جنگ میں داؤ یا دھوکے کی اجازت ہے۔ لیکن بدعہدی اور دغابازی کی اجازت نہیں۔ دھوکے اور بدعہدی میں فرق سمجھنا ضروری ہے۔ دھوکا ایک چال یا داؤ بھی ہوسکتا ہے۔ جو جنگ کے طریق کار کا حصہ ہوتا ہے اور جنگی کارروائی میں شامل ہوتا ہے کہ دایاں ہاتھ دکھانا اور بایاں مارنا وغیرہ۔ لیکن دغابازی یا بدعہدی اپنے اصول اور وعدہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور دشمن اس کی توقع نہیں کر رہا ہوتا۔ مسلمان اس اصول پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ البتہ کہتے ہیں کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔

بہرحال اگلے ابواب میں سکندریہ کی جنگ کے سلسلہ میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے بارے ایک اور کہانی بھی آئے گی کہ ایک دفعہ وہ کس طرح گھیرے میں آ گئے اور وہاں رومی وعدہ پر قائم رہے اس لیے ہمیں اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا۔ اور شاید مقوقس بھی اتنا گیا گزرا ہوا آدمی نہ تھا۔

رومیوں کا ایک اور حملہ

تین دن جنگ بند رہی۔ چوتھے دن رومیوں نے سوچا کہ بے خبری میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا جائے کیونکہ شاید وہ جنگ کے بند ہونے سے کچھ سست ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ رومیوں نے قلعہ سے باہر نکل کر محاصرہ کرنے والی فوج پر حملہ کر دیا۔ مسلمان چوکنے تھے۔ جیسے ہی رومی باہر نکلے، انہوں نے سب کو تہ تیغ کر دیا اور بڑی مشکل سے چند لوگ جان بچا کر واپس قلعہ میں پہنچے اور قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔ رومیوں کو عین شمس کی لڑائی اور اس حملہ سے بھی ایک فائدہ حاصل ہو

گیا تھا کہ ان کے اتنے آدمی مارے گئے کہ قلعہ کے اندر جو خوراک باقی تھی وہ اب باقی جوانوں کے لیے زیادہ عرصہ کے لیے کافی تھی۔ اور گورومیوں میں اب لڑنے یا حملہ کرنے کی سکت باقی نہ رہ گئی تھی لیکن اب وہ زیادہ دیر تک محصور ضرور رہ سکتے تھے۔

مقوقس کی سکندریہ کو روانگی

مقوقس نے آخری چال کے طور پر جزیہ دینے پر رضامندی ظاہر کردی لیکن ساتھ ہی یہ گزارش کی کہ معاہدہ تب ہوگا جب قیصر روم سے اس کی منظوری مل جائے۔ مسلمان اس بات پر راضی ہو گئے چنانچہ مقوقس یہ شرائط لے کر باب الیون سے کشتی کے ذریعے دریائے نیل کو استعمال کرتے ہوئے سکندریہ روانہ ہوگیا اور وہاں پہنچ کر ایک قاصد کے ذریعے ہرقل کو حالات سے آگاہ کیا اور معاہدہ کی منظوری کی درخواست کی۔ مغربی مورخین کے مطابق ہرقل نے مقوقس کو سکندریہ سے قسطنطنیہ بلا لیا اور وہاں نہ صرف اس کو برطرف کردیا بلکہ اس کی سخت بے عزتی کی کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی حکمت عملی صحیح نہیں بنائی اور مصر کی قبطی رعایا کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ ورنہ مسلمان اس طرح سارے مصر کے دل پر اتنی جلدی نہ چھا جاتے۔

ویسے ہرقل سنجیدہ آدمی تھا اور مغربی مورخین یا مبصرین کی یہ رائے کہ ہرقل نے حالات کی ساری ذمہ داری مقوقس پر ڈال دی، کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ہرقل کے تدبر پر ہم دوسری کتاب میں سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ اور اس کتاب کا شاید ہی کوئی ایسا باب ہو جس میں ہرقل کی تجاویز کا تجزیہ نہ پیش کیا گیا ہو۔ اور اس میں ہمارے لیے بڑے سبق ہیں کہ مسلمانوں کا دشمن کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ ہرقل کی یزدجرد کے دادا خسرو پرویز کے خلاف کامیابی تاریخ عالم کی ایک کامیاب ترین مثال ہے اور ایک فیصلہ کن حکمت عملی ہے۔ ہرقل بڑا حقیقت پسند آدمی تھا۔ اسلام کو بھی سمجھ گیا تھا اور اسلام قبول کرنے پر بھی تیار ہو گیا تھا۔ جس کا ذکر دوسری کتاب میں موجود ہے۔ لیکن حب دنیا اور حب سلطنت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور دین فطرت میں داخل نہ ہوا۔ گو اس نے مسلمانوں کے خلاف تمام لڑائیوں میں اعلیٰ پایہ کے تدبر اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن مسلمانوں کی فراست کے سامنے اس کا تدبر اور اس کی طاقت دونوں مار کھا گئے۔ کیونکہ مسلمان عشق حق کے ولولہ سے سرشار تھے۔

عشق و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات!

(اقبال)

لیکن بوڑھے ہرقل نے بستر مرگ پر بھی اپنی سلطنت کو سہارا دینے کی کوشش کی اور معاہدہ کو تسلیم کرنے سے

انکار کر دیا۔ اور ایسا کرنے کے لیے مقوقس کو برطرف کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔ دراصل ہرقل مصر کو اس طرح اپنے ہاتھوں سے جاتا دیکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مسلمانوں کی کارروائیوں نے اس کو حیران کر دیا تھا۔ وہ تدبر سے خالی نہ تھا، وہ سمجھ چکا تھا کہ باب الیون پر قبضہ کرنے کے بعد سارا مصر مسلمانوں کے پاؤں تلے آ جائے گا اور اہل روم سکندریہ میں بھی نہ ٹھہر سکیں گے۔

ہرقل کی موت

چنانچہ معاہدہ کے تسلیم نہ ہونے کی خبر جب مصر پہنچی تو مسلمانوں نے محاصرہ اور سخت کر دیا۔ لیکن ہرقل زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔ صفر بیس ہجری میں وہ مر گیا۔ مغربی مورخین کے حساب سے اس دن گیارہ فروری ۶۴۱ عیسوی تھی۔ اور اہم اس حساب کتاب کو صحیح سمجھتے ہیں۔ جن مصرین نے ہرقل کی موت سکندریہ کے محاصرہ کے زمانے میں بتائی ہے۔ ان کا خیال کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ مقوقس بھی سکندریہ میں موجود تھا۔ ہرقل نے اگر مقوقس کو برطرف کر دیا تھا تو اس کی زندگی میں وہ سکندریہ کیسے واپس آ جاتا۔ تو ان کا زماں و مکاں کا یہ حساب بھی صحیح نہیں بنتا۔ صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں نے انیس ہجری کے آخری مہینوں میں باب الیون کا محاصرہ کیا۔ صفر میں محاصرہ کو کئی دن ہو چکے تھے کہ ہرقل مر گیا۔ تو ظاہر ہے ہرقل باب الیون کے محاصرہ کے وقت ہی مرا تھا۔

باب الیون کی فتح

مسلمانوں نے ہرقل کے مرنے کی خبر ربیع الاوّل بیس ہجری میں سنی اور باب الیون کی فضائیں نعرۂ تکبیر سے گونج اُٹھیں۔ مسلمانوں نے بہت اونچی سیڑھیاں بنوائی تھیں اور اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان سیڑھیوں کو اچانک قلعہ کے سامنے لے جایا جائے اور کچھ مجاہدین بارش کا پہلا قطرہ بن کر ان سیڑھیوں کی مدد سے قلعہ کے اوپر چڑھ جائیں۔ چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بارش کا پہلا قطرہ بننے کے لیے شہادت پر بیعت کی۔ اس سے پہلے بھی مجاہدین اسلام شہادت پر کئی دفعہ بیعت کر چکے تھے۔ سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنگِ اُحد میں شہادت پر بیعت کی اور اس کے بعد جنگ جسر اور جنگ یرموک میں بھی ایسے واقعات پیش آئے۔ جن کا ذکر پہلی اور دوسری کتاب میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ مجاہدین نے جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ساٹھ فٹ اونچے قلعے کے ساتھ اچانک تیزی سے سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ تلواریں سب کے ہاتھوں میں تھیں۔ اور مجاہدین قلعہ کے اوپر پشتے پر پہنچ گئے اور جو سامنے آیا۔ اس کو تہ تیغ کر دیا۔ رومیوں نے دائیں بائیں سے تیروں کو بوچھاڑ کر دی۔ لیکن ایک دفعہ مجاہدین قلعہ پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔

چند لمحوں کے بعد جب قلعہ کے اوپر والے پشتوں سے نعرۂ تکبیر کی صدا گونجنے لگی تو رومی سالار نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مورخین نے یہ نہیں لکھا کہ یہ سالار منذفور تھا یا کوئی اس کا نائب تھا۔ بہر حال فیصلہ یہ ہوا کہ رومی تمام ہتھیار قلعہ میں چھوڑ دیں گے اور اپنے ذاتی سامان کے ساتھ تین دن کے اندر اندر باب الیون کو خالی کر دیں گے اور کسی اور سامان یا چیز کو ناکارہ نہ کریں گے۔ اور اس طرح مسلمان نہ صرف باب الیون پر قابض ہو گئے بلکہ وہ مصر کے زرخیز علاقوں کے ایک بہت بڑے حصے کے مالک بن گئے۔ اور وہاں کا سول انتظام سنبھال لیا۔ مصر کے قبطی مسلمانوں کی آمد سے خوش تھے، اور انہوں نے مسلمانوں کے ہر حکم کو بسر و چشم تسلیم کیا۔ مسلمانوں نے بھی حضور پاک ﷺ کی ہدایات کے مطابق قبطیوں کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا۔ اس طرح معمولی لڑائیوں سے مسلمانوں کا کل بارہ ہزار کا لشکر مصر کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔

نتائج و اسباق

۱۔ اب تک ملک مصر میں جو کارروائیاں ہوئیں ان کے مکمل نتائج اگلے باب میں ظاہر ہوں گے۔ کہ اس کے بعد رومی سکندریہ میں بھی ٹھہر سکے۔ البتہ لڑائیوں کے فوری نتائج بھی بڑے اہم تھے۔ کہ مسلمانوں نے مصر کے زرخیز علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اب مصر کا کشتیوں کے ذریعے بحیرۂ قلزم کے ساتھ ملاپ ہو گیا تھا۔ اور ایک طرف جدہ اور دوسری طرف مدینہ شریف کے سامنے جہینہ کے مقامات کے ساتھ مصر کا سمندری راستہ کھل گیا تھا۔

۲۔ نقشہ چہارم جو اگلے باب میں سکندریہ کی طرف پیش قدمی کے لیے بنایا گیا ہے۔ وہاں پر قلزم اور سویز سے جھیل بطر اور جھیل طمسہ دریائے نیل کے ایک حصہ کے ساتھ نہر طراجن کے ذریعہ بلمیب کے مقام پر ملے ہوئے تھے۔ اور پرانے زمانے میں عرب ممالک کے ساتھ اسی نہر کے ذریعے ہی تجارت ہوتی تھی۔ اس میں کچھ مٹی پڑ گئی تھی اور جب دریائے نیل میں طغیانی ہوتی تھی تو ان دنوں اس کے ذریعے جہاز رانی میں آسانی ہوتی تھی۔ لیکن جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے اس سے مٹی نکلوا دی اور مکہ و مدینہ کا باب الیون سے رابطہ قائم ہو گیا۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے جو راستہ استعمال کیا اور جسے نقشہ اول و نقشہ دوم میں دکھایا گیا ہے۔ وہ قلزم سے سیدھا عین شمس آملتا تھا۔ یہ اونٹوں کے قافلوں کا راستہ تھا۔ تو اس طرح اب دو راستے بن گئے۔

۳۔ بحیرہ قلزم کے دونوں کناروں پر اب مسلمانوں کے جھنڈے لہرانے لگے۔ ایک طرف ملک عرب کو بحیرۂ قلزم کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہ گیا تھا۔ دوسری طرف رومی اس قابل نہ رہے تھے کہ فرما کی بندرگاہ کو استعمال کر کے فلسطین کے ساحل پر کوئی کارروائی کریں۔

۴۔ سب سے اہم نتیجہ یہ تھا کہ سکندریہ اب صرف بندرگاہ ہی رہ گیا تھا۔ اندرون علاقے کا غلہ، جو سکندریہ سے باہر جاتا تھا، اس کی زیادہ مقدار ان علاقوں میں پیدا ہوتی تھی جہاں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور یہی حالت کپاس کی تھی۔

اہل روم کو چھوڑ کر جنیوا اور وینس کے سوداگر بھی سخت تذبذب میں تھے کہ یورپ میں افریقہ یا مصر سے کوئی کام کی چیز نہیں لے جاسکتے تھے اور نہ یورپ سے کوئی چیز سکندریہ لا سکتے تھے۔ اس طرح اندرونِ ملک کے ساتھ تجارت ختم ہوگئی۔

۵۔ مصر کے کئی مقامات ہمارے لیے مقدس ہیں۔ ہمارے پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ سب مصر میں تشریف لا چکے تھے یا مصر کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ ام المومنین حضرت ہاجرہؓ کا تعلق بھی مصر سے تھا۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد بھی یہاں آباد رہی۔ ان پیغمبروں کی صحیح پیروی کرنے والے ہماری ہی طرح دین حنیف کو مانتے تھے۔ مسلمان مجاہدین نے ان بزرگ ہستیوں کے ساتھ وابستہ مقامات کی زیارت کر کے روحانی تسکین حاصل کی۔ ہمارے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقامات خانہ کعبہ اور پھر عراق میں کوثی کے مقام اور مصر کا دورہ وغیرہ ازل کے روز ہی سے ہمارے دین کی وسعت کو ہم پر آشکارا کرتے ہیں۔ اور مصر کے علاقوں کی فتح کے بعد ہر جگہ دین حنیف کی صدا بلند ہونی شروع ہوگئی۔

۶۔ جہاں تک اسباق کا تعلق ہے وہ ساتھ ہی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ پہلے حکمت عملی کو لیں کہ ضرورت کے مطابق مشورے کے ساتھ تجویز بنائی کہ بسم اللہ فلسطین کی طرف سے ہوگی۔ لیکن آگے مرکز مدینہ بن جائے گا اور وہاں سے کمک پہنچنے کے بعد بھرپور کارروائی شروع کی جائے گی۔ اس سے اہل روم یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ مسلمان پہلے سکندریہ کی طرف پیش قدمی کریں گے یا مصر کے مرکز پر حملہ آور ہوں گے۔ یعنی اس طرح دشمن کو اپنے ارادوں کے بارے میں اندھیرے میں رکھا گیا اور جنگ میں یہ فائدہ حاصل کر لینا بڑا اہم ہوتا ہے۔

۷۔ اب ذرا آگے بڑھیں جناب عمروؓ بن عاص کے پاس کل چار یا پانچ ہزار مجاہدین تھے۔ اہل روم فرما بلیمیب۔ عین شمس، باب الیون، مصر، جیزہ، منف اور فیوم کے مقامات پر فوج رکھے ہوئے تھے جس کی تعداد چودہ یا پندرہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ پھر مقوقس اور منذفور بھی دس ہزار کی کمک لے کر پہنچ گئے۔ لیکن جناب عمروؓ بن عاص کے متحرک دستوں کے خلاف کوئی کارروائی یا ردِ عمل نہ کر سکے۔

متحرک طرزِ جنگ کا بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ دشمن کو ردِ عمل کا موقع نہیں مل سکتا۔ لیکن اس طریق کار کی تجویز آسان نہیں ہوتی اور اس پر عمل پیرا ہونا بھی کافی مشکل ہوتا ہے۔ بہت زیادہ مخبری، پھرتی اور حربی خوبیوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور یہ سب کچھ کسی مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ جناب عمروؓ بن عاص اس طرح حربی کارروائیاں کر کے ایک طرف دشمن پر رعب ڈال رہے تھے۔ دوم انہوں نے ہر چوکی کے دشمن کو قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ یعنی دشمن کو ساکن دفاع پر مجبور کر دیا اور یہی بڑی کامیابی تھی۔

۸۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد پڑاؤ۔ تب اختیار کا ی، جب دفاعی جنگ اور متحرک جنگ لڑنے کی صورت پیدا ہوگئی۔ مسلمان ہمیشہ دفاع سے حملہ پیدا کرتے تھے۔ حکمت عملی کے طور پر بھی وہ پہلے مدافعانہ کارروائیاں کرتے تھے اوران سے جارحانہ کارروائی پیدا کرتے تھے۔ جیسے حضور پاک ﷺ نے تین سال کی مدافعانہ کارروائیوں میں جارحانہ کارروائیاں پیدا کیں۔ اور تدبیرات کے طور پر بھی بڑی بڑی جنگوں یعنی قادسیہ اور یرموک میں دفاع میں سے حملہ پیدا کیا وہ شروع میں کسی جگہ پر حملہ تب کرتے تھے۔ جب کامیابی کا پکا یقین ہوتا تھا۔ لیکن عام طور پر وہ دشمن کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ پہلے ان پر حملہ کرے اور پھر اس کا وار روک کر اس کو ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عین شمس کے سامنے اونچی زمین پر پڑاؤ میں یہی مقصد تھا کہ دشمن کو حملہ کے لیے مجبور کر دیا۔ پھر اس کو ایسا تہس نہس کیا کہ اگر باب الیون کا قلعہ وہاں نہ ہوتا تو لڑائی کا فیصلہ اسی دن ہو گیا ہوتا۔

۹۔ مسلمان محاصرہ اور ساکن جنگ کو پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے باب الیون کا محاصرہ بہت مجبور ہو کر کیا اور محاصرہ ایسے وقت کیا جب اردگرد کے تمام علاقوں میں دشمن کا صفایا کر دیا۔ محاصرہ کی قسموں کے خاص مطالعہ کی ضرورت ہے۔ آج کل بھی قلعوں کی جگہ مضبوط چوکیاں ہوتی ہیں۔ وہاں اپنا سر پھوڑنے کی بجائے ان جگہوں پر ''دیکھ بھال'' والا محاصرہ کیا جاتا ہے اور ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ پوزیشن سے نکل کر کوئی لڑائی لڑیں یا ہتھیار ڈال دیں۔ مسلمان محاصرہ اگر کرتے بھی تو اس کو طول دیتے اور اس قلعہ یا مضبوط پوزیشن پر بھرپور وار اس وقت کرتے جب محاصرین تنگ آ چکے ہوتے۔

۱۰۔ بہت ہی کم فوج کے ساتھ مسلمانوں نے مصر کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ ان میں ریگستان کا استعمال، دوطرفہ پیش قدمی، صحیح وقت اور جگہ پر رابطہ یعنی زماں و مکاں کا حساب کتاب، اسلامی فلسفۂ حیات پر عمل، علاقے کی جغرافیائی واقفیت، زمین کا استعمال اور مخبری وغیرہ کے ہر پہلو کی داد دینا پڑتی ہے۔

۱۱۔ ان میں امارت کی نہ چاہت تھی اور نہ یہ تصور تھا کہ کون امیر ہو۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام اسلام لانے والے اولیں مسلمانوں میں سے تھے۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے لیکن آپ نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے ماتحت خوشی سے کام کیا۔ بلکہ بارش کا پہلا قطرہ بننے پر تیار ہوئے۔ ان عظیم مسلمانوں کے کردار میں ہمارے لیے بڑے سبق ہیں۔

۱۲۔ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت کی مقوقس کے ساتھ گفتگو میں ہمارے لیے ایک لائحہ عمل موجود ہے۔ وہ غیرت مند مسلمان تھے اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے۔ اور آیئے ہم ان سے کچھ سبق سیکھیں۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ ۔۔۔ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جان پیدا کرے

(اقبال)

دوسرا باب

سکندریہ کی فتح

پچھلے باب میں وضاحت کر دی گئی تھی کہ دریائے نیل جہاں پر آ کر چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں بٹنا شروع کر دیتا ہے اور جہاں آج قاہرہ آباد ہے وہاں پر مسلمانوں کے قبضہ کر لینے کے بعد مصر کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ بے شک اہل روم کے لحاظ سے سکندریہ بڑی اہم جگہ تھی۔ لیکن سکندریہ کی یہ اہمیت اہل روم کے لیے تھی، مسلمان مصر کی اہم جگہوں پر قبضہ کر چکے تھے اور سکندریہ اب پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں گرنے والا تھا۔ لیکن فتح کو قائم رکھنے کی تیاری کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اتنے علاقوں پر قبضہ کیا جائے جن کا دفاع بھی کیا جا سکے۔ مغربی جنگیں ماہرین بھی ہمیں یہ سبق سکھلا چکے ہیں کہ فتح سے شکست نکلتی ہے اور ایسی شکست بڑی خطرناک ہوتی ہے۔

اسلامی لشکر ڈیلٹا کے مغربی دریا کے کنارے کے ساتھ پیش قدمی کر کے کسی وقت بھی سکندریہ کا محاصرہ کرنے کے قابل تھے۔ لیکن سکندریہ ایک بہت ہی مضبوط بحری چھاؤنی یا چوکی تھی اور سارے علاقے میں اپنی مثال آپ تھی۔ سپہ سالار لشکر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سمیت کئی مجاہدین سکندریہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور اب مصر کے قبطیوں سے مزید اطلاعات وخبریت حاصل کر لی گئی تھی۔ مسلمانوں کو قساریہ کے محاصرہ کا بھی تجربہ تھا کہ کسی قلعہ بند بندرگاہ پر قبضہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر سکندریہ کی ایک طرف سمندر تھا اور دوسری طرف ایک جھیل، خشکی کے ساتھ سکندریہ کا ملاپ مغرب اور مشرق میں دو جگہوں پر تھا لیکن ان دونوں جگہوں کے درمیان جھیل تھی۔ فرما کی بندرگاہ کا سکندریہ کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ تھا۔ گو نقشہ دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دریائے نیل کے ڈیلٹا کے مشرقی علاقوں کی کنجی فرما ہے اور مغربی علاقوں کی سکندریہ اور اگر فرما پر آسانی سے قبضہ کر لیا گیا تو سکندریہ کے لیے اتنی فکر مندی کیوں تھی تو بات یہ تھی کہ دونوں میں زمین وآسمان کے برابر فرق تھا۔

سکندریہ کو فتح کرنے سے پہلے کچھ اور ضروریات بھی تھیں کہ سکندریہ کا گلا ''بھینچ'' لیا جائے اور وہ اپنی موت آپ مر جائے۔ پھر سکندریہ کی فوج مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ ایسا کرنے کے لیے باقی ڈیلٹا کے زرخیز علاقوں پر قبضہ ضروری تھا اور اگر تمام ڈیلٹا کے علاقوں پر قبضہ کر لیا جاتا تو کچھ عرصہ کے بعد سکندریہ والے ہتھیار ڈال

دیتے لیکن اس پر کئی سال بھی لگ سکتے تھے۔ اور جب تک سکندریہ کے لوگوں کو اہل روم کی طرف سے کھانے پینے کی چیزیں مہیا ہوتی رہتیں، وہ سکندریہ میں ڈٹے رہتے۔ سکندریہ اس زمانے میں دنیا کا ایک عظیم شہر تھا۔ لوگ بہت امیر تھے اور دنیا میں زندگی کی جتنی سہولتیں اس زمانے میں موجود تھیں وہ سب سکندریہ کے لوگوں کو میسر تھیں۔ ڈیلٹا کے تمام شہروں پر قبضہ کرنا تو زیادہ مشکل نہ تھا۔ گو جگہ بجگہ دلدل تھی۔ لیکن ڈیلٹا کے علاقہ پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے بہت زیادہ فوج اور چوکیوں کی ضرورت تھی اور جب تک سکندریہ دشمن کے ہاتھوں میں رہتا، ان چوکیوں کے لیے خطرات موجود رہتے اور مسلمانوں کی طاقت منتشر ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی رواداری

مسلمانوں نے مصر کو فتح کرنے کے بعد اپنے فلسفہ حیات کا عملی مظاہرہ کیا اور ان کی رواداری نے مصر کے مظلوم قبطی قوم کو ان کا گرویدہ بنا لیا کہ ان کے اخلاق بہترین تھے اور انصاف پسندی کی ایسی مثال لوگوں نے سنی بھی نہ ہوگی۔ البتہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس سے بڑھ کر کچھ ایسی کارروائیاں بھی کرنا چاہتے تھے جن کو آج کل ہم نفسیاتی کارروائیاں کہتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں اور دماغ پر چھا جانا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دعوت کا بندوبست کیا جس میں کچھ قبطی امرا کو دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں صرف اونٹ کا گوشت پیش کیا گیا، جس کو مسلمان امرا نے خوب مزے سے کھایا۔ لیکن قبطی امرا لذیذ کھانوں کے عادی تھے، اونٹ کا گوشت ان کے حلق سے نیچے نہ اتر سکا۔ یہی حال مسلمانوں کی روٹیوں کا تھا کہ وہ سخت تھیں تو قبطی لوگوں نے خیال کیا کہ یہ لوگ صرف ایسی ہی غذا کے عادی ہیں۔ لیکن جناب عمرو رضی اللہ عنہ نے چند دن کے بعد ایک اور دعوت کا انتظام کیا۔ اور انہی پرانے مہمانوں کو مدعو کیا۔ علاوہ کھانے بھی بڑے لذیذ پکائے گئے۔ قبطی یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ مسلمانوں نے وہ لذیذ کھانے بھی عام کھانوں کی طرح کھائے۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ کی تقریر

جب کھانا ختم ہوا تو جناب عمرو نے ایک تقریر کی کہ اہل مصر کو شاید یہ غلط فہمی ہو کہ ہم غریب لوگ ہیں اور جہان و دنیا کی لذتوں سے نا آشنا ہیں۔ نہیں، ایسی بات نہیں۔ ہم لذیذ سے لذیذ کھانا پکانا بھی جانتے ہیں اور کھانا بھی۔ ہم مل کر پاکیزگی کے ساتھ ایک برتن میں کھاتے ہیں کہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ کھانا وہ لذیذ ہوتا ہے جس میں زیادہ ہاتھ پڑیں۔ ہمارے کھانوں میں لذت ہمارے اتحاد و اتفاق اور مل کر کھانے کی وجہ سے ہے۔ ہم بسیار خوری کو پسند نہیں کرتے اور نہ پیٹ کی غلامی کرتے ہیں کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمانوں کا ایک پیٹ ہوتا ہے اور کافر کے سات پیٹ...... یہی وجہ ہے کہ ہم ایرانیوں کو شکست دے چکے ہیں اور اہل روم کو شام و فلسطین سے بھگا چکے ہیں۔

اس تقریر کا بڑا اثر ہوا۔

شہروں میں پریڈ

اس دعوت کے ایک آدھ دن بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے حکم دیا کہ سب مجاہدین نے اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہر شہر کے بازاروں میں سے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کرتے ہوئے گزریں گے۔ یہ حربی مظاہرے تھے اور گو حربی مظاہروں کی تاریخ بڑی پرانی ہے اور مصر میں تو فرعونِ مصر کے زمانے سے ایسے حربی مظاہرے سننے میں آتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا طریقہ نرالا تھا۔ ان کی تلواروں کی دھاریں بڑی تیز تھیں اور ان کے نیزے بڑے ہلکے پھلکے تھے۔ جب وہ مجاہد نعرۂ تکبیر کی صدا لگاتے ہوئے بازاروں سے گزرے تو مصر کے شہری حیران رہ گئے۔ اس کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے اہل مصر کے سامنے ایک اور تقریر کی اور کہا کہ ہم ہر وقت جنگ کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مصر کے مرغوب کھانے اور آب وہوا ہم میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکے گی۔ اور تم لوگ یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دو کہ غریب مسلمانوں نے تمہارے ملک کو فتح کر لیا ہے۔ ہم اللہ والے ہیں اور یہ سب فتوحات اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف سے ہیں۔ ہم سب کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں فتوحات نصیب کر رہا ہے۔

مصری اسلام کی آغوش میں اور جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی خوشی

روایت ہے کہ اہل مصر میں سے کئی لوگ ان واقعات کے بعد اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے بلکہ جہاں جہاں یہ خبریں پہنچتی گئیں، لوگ خوشی سے جوق در جوق آغوش اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ طبری کے مطابق جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس جب ان واقعات کی خبر پہنچی تو وہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے بڑے خوش ہوئے اور فرمایا۔ ''خدا کی قسم اس کی جنگ نرم ہوتی ہے مگر اس کی کاٹ بہت سخت ہوتی ہے۔'' اور پھر آپ نے فرمایا کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص مصر یا کسی علاقہ کی عمل داری کے لیے بڑا موزوں شخص ہے۔

اہل روم اور ان کے جانشینوں کی سازش

اہل روم نے اس زمانے میں مشہور کر دیا تھا کہ عرب لوگ مصر پر اس لیے حملہ آور ہو رہے ہیں کہ وہ مصر کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں لیکن جب مصریوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ہاں مساوات ہے اور وہ مال و دولت کو اکٹھا کرنے کو ناپسند کرتے ہیں، ہر چیز اصول کے تحت ہوتی ہے تو اس وجہ سے بھی کئی مصری اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے۔

تبصرہ:

اہل روم یا ان کے جانشینوں کی یہ سازش اب بھی جاری و ساری ہے۔ ہمارے زمانے میں سر تھامس آرنلڈ کو ''سر'' کا خطاب اس لیے دیا گیا کہ پہلے تو وہ عربوں کی تاریخ کا ماہر بن کر سامنے آیا یعنی ایک بہت بڑا ''اورینٹلسٹ'' (Orientalist) بنا، پھر ایک نظریہ پیش کیا کہ عربوں کی تمام تر فتوحات اس وجہ سے نہ تھیں کہ وہ مسلمان تھے بلکہ اس وجہ سے تھیں کہ وہ بھوکے تھے اور زرخیز علاقوں پر پل پڑے۔ پھر اس نظریہ میں کئی اور مورخین کو اپنے ساتھ ملا کر کتابوں کی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اور اب ساری دنیا ''مالیات'' اور ''تاویات'' کے چکر میں پھنس چکی ہے۔ ہم بھی روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں اور ہمارے سکولوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ دنیا میں تمام تر جھگڑا ''کچھ ہونے اور کچھ نہ ہونے'' کا ہے۔

یہ بڑی افسوس ناک سازش ہے۔ اہل یورپ کی اپنی بھوک تو الگ کہانی ہے اور اس کا سرسری اشارہ راقم نے کلاسوِز کے فلسفہ جنگ کے حصہ اول کی تاریخی عوامل کے مضامین اور پہلے باب کے ایک تبصرہ میں پیش کر دیا ہے کہ اہل یورپ نے کس طرح دنیا کو لوٹا اور اب بھی لوٹنے میں مصروف ہیں۔ اور اس صدی کی جنگوں کی ایک وجہ اس لوٹ کا حسد تھا۔ جنرل گلب البتہ اپنے تعصب کے باوجود آرنلڈ کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ اگر واقعات کو اندر سے جھانکا جائے تو مسلمانوں کی فتوحات ان کے بہتر فلسفۂ حیات کی وجہ سے تھیں اور اس چیز سے اہل مصر بڑے متاثر ہوئے۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے لشکر میں حبشی بھی تھے اور یمنی بھی، بلکہ کئی ایسے ایرانی بھی تھے جو کسی زمانے میں یمن میں آباد ہو گئے تھے۔ شام و فلسطین کے علاقے کے لوگ بھی تھے اور یونان یا یورپ کے باقی علاقوں کے لوگ بھی جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا خدمتگار خاص وردن یونانی تھا اور جنگ یرموک کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ چنانچہ جب اہل مصر نے دیکھا کہ مسلمانوں میں کوئی اونچ نیچ نہیں، کوئی قومیت کا جھگڑا نہیں، سب ایک برتن میں کھاتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں تو ان کے دل میں اسلام کے لیے اور کشش پیدا ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔

سکندریہ کی فتح کی تجویز

جب مصر کے مفتوحہ علاقوں میں حالات اتنے اچھے ہو گئے تو فوجی حکمت عملی کے طور پر پیش رفت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے سکندریہ کی فتح کے لیے سوچنا شروع کر دیا کیونکہ بارشوں کا موسم آنے والا تھا۔ دریاؤں میں طغیانی سے سارا راستہ دلدل ہو سکتا تھا اور حرکت محدود ہو جاتی تو اس سے مسلمانوں کے سب سے

"بڑے ہتھیار" متحرک طریقہ جنگ پر خراب اثر پڑتا۔ سکندریہ کی فتح میں دیر کی جاتی تو رومی بحری بیڑا فرما کی بندرگاہ پر دوبارہ قبضہ کر لیتا اور مسلمانوں کا فلسطین سے ملاپ ختم ہو جاتا، بلکہ فرما سے آگے بڑھ کر اگر رومی نہر طراجن * (نہر امیر المومنین) یا جھیل طمسہ تک بھی آ سکتے تھے اور مسلمانوں کا رابطہ مدینہ شریف سے ٹوٹ جاتا۔ اس لیے اگر سکندریہ جلدی فتح نہ بھی ہو سکتا تو اس کے دروازے کھٹکھٹانے کی لازماً ضرورت تھی کہ اہل روم کوئی عمل کرنے کی بجائے ردعمل پر لگے رہیں۔ اور اس اہم اصول پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور فوجی ضرورت بھی تھی کہ سکندریہ کی مکمل ناکہ بندی کی جائے تاکہ اس کے نزدیک کے ڈیلٹا کے علاقوں کا غلہ یا پیداوار بھی وہاں نہ پہنچ سکے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ فرما کی فتح کے بعد مسلمان ڈیلٹا کے علاقوں کی دلدل میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے، یا وہ دریاؤں کو بار بار عبور کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ نقشہ دوم میں جہاں ان کی پیش قدمی کو مصر اور باب الیون کی طرف دکھلایا گیا تھا وہاں ایک فوجی آنکھ کو نظر آ جاتا تھا کہ باب الیون کی فتح کے بعد مسلمان سکندریہ پر حملہ دریائے نیل کے مغربی دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ پیش قدمی کر کے کریں گے اور اہل روم کو بھی یہ بات معلوم تھی لیکن ہم نے مسلمانوں کی اس متوقع تجویز کو نقشۂ چہارم میں الگ طور پر اس لیے ظاہر کیا ہے کہ اول خلیفہ دوم سے اجازت لینا تھی اور دوم حکمت عملی کے تحت یہ دوسرا مرحلہ تھا اور اس کو الگ دکھانا ضروری تھا تاکہ تمام حکمت عملی ایک دوسرے میں گڈمڈ نہ ہو جائے۔ اس طریق کار کو اپنانے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دوست ریگستان کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر پیش قدمی کر سکتے تھے اور سکندریہ کے نزدیک پہنچنے کے بعد سکندریہ کا رابطہ ڈیلٹا کے متعدد علاقوں سے خود بخود ٹوٹ جاتا تھا۔ یہ تھی حکمت عملی جس کے تحت مسلمان مصر کو آغوش اسلام میں لانا چاہتے تھے لیکن اس تجویز کی منظوری جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے لینے کی بھی ضرورت تھی کیونکہ مسلمان افواج اب دو کی بجائے تین محاذوں پر برسرپیکار تھیں اور اصلی حکمت کا تعین تو مدینہ شریف میں ہو رہا تھا۔

خلیفۃ المسلمین کی حکمت عملی

تو چلیے اپنے ان بیانات کے تانے بانے ملانے کے لیے مدینۃ النبی ﷺ میں حاضری دی جائے۔ قارئین! جب کبھی مدینہ شریف جانے کا ذکر ہو تو اپنے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر درود و سلام ضرور بھیجا کرو۔ روایت ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بہت لمبی عمر پائی اور عبدالملک بن مروان کا زمانہ بھی دیکھا۔ قیام کبھی مکہ میں ہوتا تھا،

* یہ نہر جو نقشہ چہارم میں دکھائی گئی فراعنہ مصر کے زمانے میں بھی تھی، اس کے بعد مٹی سے بھر گئی اور روم کے بادشاہ طراجن (Trojan) نے اس کو بنوایا تو اس کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے کھولی گئی تو نام نہر امیر المومنین پڑ گیا۔

کبھی مدینہ میں اور کبھی اور علاقوں میں بھی تشریف لے جاتے تھے لیکن جب کبھی مدینہ تشریف لے جاتے تھے تو سب سے پہلے حضور پاک ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری دیتے تھے اور عرض کرتے تھے۔ السلام علیک یا رسول اللہ ﷺ پھر کہتے تھے السلام علیک یا ابوبکر صدیق ؓ، السلام علیک یا عمر فاروق ؓ۔ (طبقات ابن سعد، حصہ چہارم)

بزرگوں کی یہ روایتیں اور ادائیں ہمارے لیے نشانِ راہ ہیں۔ بزرگوں پر سلام بھیجنا یا ان کو یاد کرنے سے اپنے ایمان کو تقویت پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں واقعات کے علاوہ جگہ جگہ اللہ فرماتا ہے کہ یاد کرو حضرت آدم علیہ السلام کو، یاد کرو حضرت نوح علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یعنی سب پیغمبروں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس فلسفہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے، روح زندہ رہتی ہے اور بزرگوں کے ساتھ روحانی تعلقات قائم رکھنے ضروری ہیں۔ گو یہ ایک الگ کتاب کا مضمون ہے۔

اب ذرا خلیفہ دوم کی فوجی حکمت عملی کا مطالعہ کریں۔ نقشہ پنجم میں مسلمانوں کے تینوں محاذوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ کس جگہ کیا کچھ ہو رہا تھا تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ تمام تر حالات کیسے تھے۔ ایران و عراق کے محاذ پر اسلامی لشکر جلولہ کو فتح کرنے کے بعد حلوان تک پہنچ چکے تھے اس سے آگے نہاوند کا پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ جنوبی ایران کے محاذ پر خزستان اور اھواز کے علاقے فتح ہو چکے تھے۔ آگے صوبہ فارس شروع ہو جاتا تھا جس سے آگے ایرانی بلوچستان اور مکران کے لمبے چوڑے ریگستانی علاقے تھے۔ ان سب علاقوں کی فتوحات کا ذکر گو پہلی کتاب میں ہو چکا ہے۔ لیکن ہم اس وقت ۲۰ ہجری کی بات کر رہے ہیں اور زماں کے لحاظ سے فتح نہاوند وغیرہ کے واقعات بعد میں ہوئے تھے۔ اس سے قارئین کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ کس وقت کہاں کیا ہو رہا تھا۔

اسی طرح شام کے تمام تر میدانی اور ریگستانی علاقوں پر قبضہ ہو چکا تھا اور آگے اناطولیہ یا انطاکیہ کے پہاڑ تھے جزیرہ کے علاقے کے نزدیک آرمینیا اور کاکیشیا کے پہاڑی علاقے تھے۔ ان سب علاقوں میں رومی موجود تھے۔ اور وہ کھڑے دیکھ رہے ہوتے تھے کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو وہ مسلمانوں پر پل پڑیں۔ ساحلی علاقوں پر قساریہ کا محاصرہ کافی دیر رہا اور اس کی فتح کے بعد شام و فلسطین کے ساحل پر مسلمانوں کا قبضہ ضرور تھا۔ لیکن مسلمانوں کے پاس کوئی بحری طاقت یا بڑی کشتیاں نہ تھیں کہ وہ ساحل سے ذرا زیادہ آگے بڑھ کر سمندری علاقوں کی دیکھ بھال کریں البتہ خلیج فارس، خلیج عقابہ اور یمن کے علاقوں سے کافی ملاح مجاہدین، علاقہ شام میں جناب امیر معاویہ ؓ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی بندرگاہوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ یعنی بیروت سے قساریہ اپنے ساحل پر ہی کشتیاں اور جہاز چلاتے تھے۔

جناب معاویہ ؓ البتہ قبرص (Cyprus) اور روڈس (Rodes) کے جزیروں پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ جب تک ان جزائر پر قبضہ نہ کیا جاتا مسلمان شام و فلسطین کے ساحل پر بے فکر ہو کر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ رومی خطرہ ہر وقت سر پر

منڈلا رہا تھا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص جلد سے جلد سکندریہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے کہ مصر میں جو کچھ حاصل ہو چکا تھا اس علاقہ پر قائم ودائم رہنے کے لیے ایسا ضروری تھا۔ اب ان حالات میں نقشہ پنجم کا مطالعہ کر کے جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سوچ کا اندازہ لگائیں، خاص کر مشرقی محاذ کے حالات، جو پہلی کتاب میں بیان ہو چکے ہیں۔ ان کو دہرائیں کہ یزدجرد اس وقت تک زندہ تھا اور نہاوند کے مقام پر ایک بہت بڑا ایرانی لشکر تیار ہو رہا تھا تا کہ مسلمانوں سے ایران وعراق کے علاقے چھین لیے جائیں۔ اہل روم، شام کے ملک کو للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ہم سکندریہ کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ملک فتح کرنے تو آسان ہوتے ہیں۔ لیکن فتوحات کو قائم رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ پہلی اور دوسری کتاب میں مغربی مفکروں اور جنگی ماہرین کی اس کوشش پر سیر حاصل تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ وہ فتح کے اختتامی مقام کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن آج تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ بلکہ فتح کو قائم رکھنے کا کوئی فلسفہ بھی پیش نہیں کر سکے ہیں نہ اس کی تلاش میں انہیں کوئی کامیابی ہوئی ہے۔ جنرل فلر کا ذکر دوسری کتاب میں کیا گیا تھا کہ اس نے دنیا کی سینکڑوں سے زیادہ جنگوں کو فیصلہ کن جنگیں قرار دے کر تین کتابیں لکھیں۔ ان جنگوں نے تاریخ پر اثرات ضرور چھوڑے۔ لیکن وہ سب وقتی اور تھوڑے عرصہ کے لیے تھے۔ وہ کسی فلسفہ یا نظریہ کو قائم نہ رکھ سکے کہ اول ایسی جنگیں کسی فلسفہ کے تحت نہیں لڑی گئی تھی اور اگر باطل فلسفہ کے تحت کوئی جنگ لڑی بھی گئی تو اس فلسفہ کے اثرات مٹ گئے۔ انیسویں صدی میں مشہور جرمن جنگی ماہر کلاسوٹز نے اول حملہ کے اختتامی مقام کو تلاش کیا۔ لیکن کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بغیر چند الفاظ لکھے اور اپنی ساتویں کتاب کے پانچویں باب میں شامل کیا اور لکھا کہ بیان نامکمل ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بستر سے کچھ تحریریں ملیں جس کا عنوان فتح کا اختتامی مقام تھا اور اس کی بیگم نے اس باب کو بس کلاہوٹز کی ساتویں کتاب کے بیسویں باب میں شامل کر دیا۔ یہ بھی نامکمل کوشش ہے کہ فتح سے شکست نکلتی ہے وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان تمام معاملات کا تجزیہ کئے ہوئے تھے، وہ نہ چاہتے تھے کہ فتح کے بیچ سے شکست پیدا ہو، یا فتح کو قائم نہ رکھا جا سکے اور وہ اس سلسلہ میں فکر مند بھی ہو جاتے تھے اور ان فتوحات کو قابو میں رکھنے یا مرحلہ در مرحلہ بڑھنے کی وجہ سے یہ فتوحات آج بھی قائم ہیں۔ اس سلسلہ میں چوتھی کتاب میں مکمل تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ بہر حال ان مرحلہ در مرحلہ تجاویز اور ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے جناب عمر رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحری جنگ کی اجازت نہ دی کہ اس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ لیکن مورخین نے نا سمجھی کی وجہ سے یہ تبصرہ کر دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحری جنگ سے کتراتے تھے (نعوذ باللہ)۔ کیا جناب عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو خشکی پر محدود کرنا چاہتے تھے؟ یا نہیں، ایسی وکی بات نہ تھی۔ یہ

زمان ومکاں کا معاملہ تھا کہ ابھی وقت نہ آیا تھا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ ایران کے پہاڑی علاقوں میں بھی مکمل طور پر اس وقت پیش قدمی کرنا چاہتے تھے۔ جب تیاری مکمل ہو جائے۔ جنوب میں زیادہ کامیابیاں ہو جائیں اور مغرب میں مصر بھی مکمل طور پر فتح ہو جائے تو پھر ایران کے وسطی علاقوں اور بعد میں شمالی علاقوں میں پیش قدمی کی جاسکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایرانی نہاوند کے قریب اکٹھے ہو رہے تھے تو آپؓ نے فرمایا کہ کاش اس وقت ویران اور ہمارے درمیان ایک لوہے کی دیوار ہوتی۔ اور کچھ مورخین نے لکھا کہ آپؓ نے فرمایا کہ اہل ایران اور ہمارے درمیان آگ کا دریا ہوتا۔ واللہ اعلم۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ہمارے لحاظ سے یہ بات اس وقت کے لیے تھی کہ جناب عمرؓ جن حالات سے دوچار تھے۔ ان کے لحاظ سے اس وقت وہ اپنے اور ایران کے درمیان کوئی رکاوٹ دیکھنا پسند کرتے تھے کہ ایک وقت میں صرف ایک محاذ پر ہی بھرپور کارروائی ہونا چاہیے تھی۔ دوسری کتاب میں اس پہلو کی خوب تر وضاحت کی گئی ہے اور اس کتاب کے آخری باب میں واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے میں مقصد یہی تھا کہ خلفائے راشدین کی حکمت عملی کی سمجھ آ جائے کہ کس طرح وہ ایک محاذ پر جب بھرپور کارروائی کرتے تھے تو دوسرے محاذ پر صرف دیکھ بھال اور تیاری کی کارروائیاں کی جاتی تھیں۔

لیکن اسلام سلطنت میں اب وسعت بہت زیادہ آ چکی تھی اور دو کی بجائے تین محاذ بن گئے تھے۔ جناب فاروق اعظمؓ کسی وقتی دیوار کے لیے دعا بھی مانگ رہے تھے اور ساتھ تینوں محاذوں پر تیاری بھی شروع تھی کہ ایسی دیواروں کو بعد میں پاش پاش بھی کرنا تھا اور اپنے زمانے میں پاش پاش کیا بھی۔ آپ صرف وقت مقرر کر دیتے تھے۔ نہاوند کے محاذ پر تیاری شروع تھی۔ شام وفلسطین کے محاذ پر بحری جنگوں کی تیاری ہو رہی تھی اور سکندریہ کی فتح یا محاصرہ کچھ آسان نظر آ رہا تھا۔ اس نے اس کی اجازت دے دی۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مولانا شبلی جیسے عالم دین بھی ان حالات کہ سمجھ سکے اور غیروں کی سازش والی بات کو اپنی کتاب کا حصہ بنا دیا۔ اور لکھ گئے کہ جناب عمرؓ ایران کے علاقوں میں اپنی فتوحات کو روایتی عرب علاقوں تک محدود کرنا چاہتے تھے۔ اور عربوں کو اپنا ہم قوم کہتے ہوئے ان کو ایرانیوں کے خلاف ابھارا۔ (نعوذ باللہ)

تبصرہ:

یہ الفاظ بڑے افسوسناک ہیں اور جناب عمرؓ کبھی بھی ایسے الفاظ یا خیالات کا اظہار نہ کرتے کوئی شاید آگے بڑھے کہ مصلحت کے طور پر ایسے لفظ کہے مگر ہم اس کو بھی تسلیم نہیں کرتے، مصلحت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ مصلحت میں اپنے فلسفہ حیات اور عقائد کی نفی کی اجازت نہیں۔ ہمارے لحاظ سے عرب مسلمانوں کے ہاتھ سے بدر کے مقام پر شکست کھا چکے تھے۔ اور فتح مکہ کے بعد سارے عرب مسلمان ہو گئے تھے۔ ہم اپنے آپ کو عرب ایرانی یا مصری کہنے کے چکر میں

نہیں ڈالتے۔ اور نہ ہی یہ ماننے کو تیار ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے آپ کو عرب کہتے تھے۔ ان کی ننھیال سے کافی لوگ اسلام کی آغوش میں دیر سے داخل ہوئے تو اس کا بھی حضرت عمرؓ کو افسوس تھا اور جنگ یرموک میں جناب عکرمہ کی شہادت کے وقت جناب خالدؓ کے یہ الفاظ ثبوت ہیں کہ اب تو ہماری بہن کے بیٹے کہ ہم سے راضی ہو جانا چاہیے کہ ہم اس طرح اسلام کے لیے قربانی دے رہے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے لکھا جاتا ہے کہ جناب عکرمہؓ جناب عمرؓ کے ماموں کے بیٹے تھے اور جناب خالدؓ، جناب عمرؓ کی والدہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ چنانچہ ہمارے لیے سارے رشتہ اللہ اور رسول ﷺ کی وجہ سے ہیں اور بہتر ہوگا کہ ہم غیروں کے فلسفوں کے غلام نہ بنیں۔ جب حضرت عمرؓ کی ننھیال اسلام لے آئے تو وہ ان کے رشتہ دار بن گئے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

(اقبالؔ)

اسلامی لشکر کی پیش قدمی

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ سے اجازت ملنے کے بعد جمادی الثانی یا رجب بیس ہجری میں جناب عمروؓ بن عاص سکندریہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مدینہ شریف سے کمک بھی پہنچ گئی اور راستہ وہ استعمال کیا گیا جو نقشہ چہارم میں تجویز کے طور پر دکھایا گیا ہے البتہ پیش قدمی کرنے سے پہلے ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

فاختہ کی سپہ سالار کے خیمہ میں پناہ

جب پیش قدمی کا وقت نزدیک آیا اور خیمے اتارنے کا بندوبست شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ جناب عمرو بن عاص کے خیمہ کے جوڑوں میں ایک فاختہ نے انڈے دے دیئے ہیں۔ چنانچہ جناب عمروؓ بن عاص نے حکم دیا کہ وہ خیمہ اسی طرح وہاں رہے گا بلکہ جو لوگ وہاں رو رہے تھے ان کو حکم دیا کہ وہ اس کی حفاظت بھی کریں گے اور خیمہ تب اکھیڑیں گے جب فاختہ کے انڈوں سے بچے نکل کر اڑ جاتے ہیں۔ اس کارروائی میں انصار مدینہ کی عزت افزائی تھی کہ انہوں نے حضور پاک ﷺ اور مہاجرین کو مدینہ منورہ میں پناہ دی تھی اور اس کے بعد ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ جب بھی کوئی اس سے پناہ مانگتا ہے یا اس کی پناہ اختیار کرتا ہے تو اس کی حفاظت کی جائے، کچھ مغربی مورخین نے جناب عمرو بن عاصؓ

کی اس کارروائی کو پرانی عرب روایات کی نقل دے دیا کہ عربوں میں یہ روایت تھی کہ اگر کوئی خونخوار بھیڑیا بھی آ کر ان کے ہاں پناہ لے تو اس کو پناہ دی جاتی تھی۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عربوں میں ایسی روایت ضرور ہوگی، لیکن اسلام میں کسی خونخوار بھیڑیئے کو پناہ دینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کمزور اور ضرورت والے کو پناہ دی جاتی ہے، نہ کہ قاتل کو بلکہ اسلام میں تو قاتلوں اور ظالموں کے قلع قمع کرنے کا حکم ہے بہر حال مثال بڑی اچھی تھی لیکن ہمیں یہ یاد رہے کہ غیر ہمیں اپنی علاقائی روایتوں کی یاد دلا کر ہمارے اصل وحدت والے نصب العین سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت اپنی وحدت کا خیال ہونا چاہیے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی ﷺ دین بھی، ایمان بھی ایک

(اقبالؔ)

ایک فاختہ کے بارے میں مسلمان سپہ سالار کے یہ احکام سن کر اہل مصر حیران ہو گئے کہ یہ لوگ بڑے عظیم ہیں کہ کمزور کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ اور لوگ بھی جلدی سے اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے۔ روایت ہے کہ مصر کے لوگوں نے جتنا جلدی اسلام میں داخل ہونا شروع کیا اور کسی ملک میں اسلام میں اتنی تیزی سے داخل نہیں ہوئے اور حضور پاک ﷺ میں فرما گئے تھے کہ قبطی لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا کہ دو دشمنوں کے خلاف بھی تمہاری مدد کریں گے اور موجودہ فسطاط کی چھاؤنی اسی خیمہ والی جگہ پر ہے اور اسی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے۔

قسطنطنیہ

اب ذرا قسطنطنیہ کے حالات کا جائزہ بھی لیا جائے۔ ہرقل بیس ہجری میں مرگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا قسطنطین (Constaitine) قیصر روم بن گیا۔ لیکن ہرقل کی دوسری بیوی، جو اس کی بھتیجی یا بھانجی تھی، وہ اپنے بیٹے ہرقلون کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ ہرقل کی اس بیوی مارٹینا لوگ پسند نہ کرتے تھے کہ ہرقل نے اس کے ساتھ شادی پادریوں کی اجازت کے بغیر کی تھی اور اس کے بیٹے ہرقلون کی عمر پندرہ سال تھی۔ ہرقل کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا قسطنطین، جس کی عمر تیس سال تھی اور اس کو آگسٹس کا خطاب بھی مل چکا تھا، تخت نشین ضرور ہوا۔ لیکن ساڑھے تین ماہ بعد جمادی الثانی ۲۰ ہجری میں مرگیا۔ لیکن مرنے سے پہلے مقوقس کو واپس سکندریہ بھیج گیا تھا۔ اور کچھ مورخین کے لحاظ سے وہی گورنر تھا اور کچھ کا خیال ہے کہ وہ صرف آرچ بشپ یعنی بڑا پادری ہی تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ قسطنطین نے جنرل منذفور کو بھی سکندریہ سے بلایا اور اس کے ساتھ مشورہ کیا۔

بہر حال قسطنطین کے مرنے کے بعد مارٹینا اپنے بیٹے ہرقلون کو تخت پر بٹھانے میں آدھی کامیاب ہوئی کہ کچھ

لوگ قسطنطین کے لڑکے اور ہرقل کے پوتے قسطنطین (Consten) جس کی عمر بارہ برس تھی، کو تخت نشین کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے لیکن چونکہ قسطنین (Consten) کو تخت میں حصہ داری مل گئی اس طرح ہرقلون کوئی کام قسطنین کے مشورہ کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ گو ہرقل نے اپنے مرنے سے پہلے سکندریہ کے دفاع پر بڑا زور دیا تھا اور وہ مصر میں مزید کمک بھیجنا چاہتا تھا لیکن یہ کمک مصر میں جمادی الثانی یا رجب کے مہینہ میں پہنچی، کیونکہ تخت کے دو مالکوں کی وجہ سے افراتفری برپا تھی۔

مسلمانوں کی تجویز

مسلمانوں نے سکندریہ پہنچنے کی تجویز بنالی تھی اور وہ رواں دواں تھے۔ جمادی الثانی کا مہینہ تھا یعنی ادھر مئی یا جون کا مہینہ تھا اور دریاؤں میں طغیانی نہیں آئی تھی۔ مسلمان طغیانی سے پہلے سکندریہ کے گردونواح میں پہنچ جانا چاہتے تھے چنانچہ جب مسلمان چلے تو ان کے ساتھ پہلا مقابلہ چالیس میل شمال میں ترانہ کے مقام پر ہوا، جہاں اسلامی لشکر کے جیش مقدم کے ساتھ ایک رومی چوکی پر فوجیوں نے مقابلہ کیا۔ جھڑپ سخت تھی لیکن جیسے ہی رومیوں کو معلوم ہوا کہ پورا اسلامی لشکر پیش قدمی کر رہا ہے تو رومیوں نے میدان چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اگلا مقام ترانہ سے دس میل شمال میں معاون دریا کے مشرقی کنارے پر تھا جسے نوکیہ یا نوضیہ کہتے تھے۔ وہاں کی رومی فوجی چوکی کو خیال تھا کہ مسلمان شاید دریا کو پار نہ کریں گے اور یہ ان کا کوئی حربی مظاہرہ ہے اس لیے وہ لوگ اپنی چوکی پر ڈٹے رہے لیکن مسلمان اب تو دریاؤں کو عبور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ انہوں نے دریا کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر رومی فوجیوں نے افراتفری کی حالت میں جو سامان ہاتھ لگا اس کو لے کر کشتیوں میں ڈال دیا اور سکندریہ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ مسلمان اس کی اجازت نہ دے سکتے تھے اس لیے انہوں نے کشتیوں سے آگے بڑھ کر یا کنارے سے آگے نکل کر رومیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ دریا میں ابھی طغیانی نہیں آئی تھی۔ پانی بھی کم تھا اس لیے مسلمانوں نے بڑھ بڑھ کر حملے کئے جس میں کافی زیادہ رومی تہ تیغ ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر بچے کھچے رومیوں اور اہل شہر نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر مسلمانوں نے اس کے اندرون علاقے میں دور دور تک حربی مظاہرے کئے اور سب علاقوں کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دریا کو دوبارہ عبور کیا اور جیسا کہ نقشہ چہارم میں دکھایا گیا ہے مسلمان دریا کے مغربی کنارے پر آ کر پھر شمال کی طرف رواں دواں ہو گئے۔

قوم شریق کی لڑائی

مسلمانوں کے کوچ یا پیش قدمی کا طریقہ موجودہ زمانے کے ایڈونس ٹو کنٹیکٹ کے مشابہ تھا اور ایڈونس گارڈ کو

مسلمان ہراول یا جیش المقدم کا نام دیتے تھے۔اب جو پیش قدمی ہوئی تو مسلمانوں کے جیش المقدم کے امیر یا کمانڈر شریق تھے۔لشکر کوئی بیس میل اوپر پہنچے ہوں گے۔اور وہاں سے آگے مسلمان دریا کو عبور کر کے قیروں والے راستے سکندریہ جانا چاہتے تھے لیکن ابھی وہ دریا سے کچھ دور ہی تھے کہ آگے سے ایک رومی لشکر نے ان پر حملہ کر دیا۔عام طور پر کمزور دشمن ایسی حرکت نہیں کرتا کہ رومی پسپا ہو رہے تھے اور اس صورت میں بہتر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جگہ جگہ پوزیشن لے کر دشمن کی پیش قدمی کو روکا جائے۔اس کا وقت ضائع کیا جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے لیکن جو طریقہ رومی دستے کے کمانڈر نے اختیار کیا اس کی داد دینی چاہیے۔اور یہ ایک بہت بڑا سبق ہے۔جنگ کے طریق کار کے اسباق جہاں سے بھی حاصل ہوں ان کی نقل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

شریق رضی اللہ عنہ بن سمیہ بڑے سلجھے ہوئے کمانڈر تھے اور ان کے دستے پھیلاؤ میں تھے۔آپ نے ایک ٹیکری تلاش کی جو باقی زمین سے اونچی تھی اور اپنی تمام فوج یا دستے کو حکم دیا کہ وہ اس ٹیکری پر پوزیشن لے لیں یا صف بندی کر دیں۔یہی ٹیکری بعد میں قوم شریق کے نام سے مشہور ہوگئی کہ ٹیکری کو عربی میں قوم کہتے ہیں۔بہر حال رومی لشکر پہلے دن تو صرف اتنی کامیابی حاصل کر سکا کہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو گڑ مگو کر دیا۔اور ہم اس طریق کار کا موجودہ زمانے کے Spoiling Attack یا اس قسم کی کسی کارروائی سے موازنہ کر سکتے ہیں اور رومیوں کی چھوٹی سطح پر یہ ایک کامیابی تھی لیکن پھر رات ہوگئی اور لڑائی ختم ہوگئی۔

جب شریق رضی اللہ عنہ نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو بروقت خبر دے دی اور یہ اچھا ہی ہوا کہ رومی دستہ مسلمانوں کے جیش مقدم سے بہت زیادہ تھی اور سورج چڑھتے ہی رومیوں نے مسلمانوں پر ایک زبردست حملہ کر دیا۔لیکن ان رومیوں نے مسلمانوں کے ہاتھ پہلے نہ دیکھے تھے۔

مسلمان مجاہدین دفاع میں جم کر نہ لڑتے تھے۔وہ حملہ آور پر صرف جھپٹا مارتے تھے۔رومیوں نے سخت نقصان اٹھایا۔لیکن انہوں نے اپنی زیادہ تعداد کو استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک بازو اور پچھلی طرف سے ہو کر ٹیکری سے اکھیڑنے کی کوشش کی۔لیکن مسلمانوں نے ان کو یہاں پر بھی بری طرح مار دی۔اب سورج ڈھلنے والا تھا کہ دور جنوب کی طرف سے گرد اڑتی دکھائی دی۔یہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے بڑے لشکر کے متحرک دستے تھے، جو تیزی سے جیش المقدم کی مدد کے لیے آ رہے تھے۔رومی ان کو دیکھ کر میدان چھوڑنے لگے۔جناب شریق رضی اللہ عنہ کے دستوں نے ان کا تعاقب کیا۔رومی بھی اگرچہ متحرک تھے مگر انہوں نے میدان جنگ کو خالی کرنے میں ہی فائدہ سمجھا اور پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ گئے۔رومیوں کی اس تدبیراتی کارروائی کا مطالعہ ضروری ہے۔اور اس کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص پر عیاں ہوگیا کہ اہل روم سکندریہ کا سخت دفاع کریں گے اور سکندریہ تک جو فاصلہ باقی رہ گیا تھا تو اس پر بھی پیش

قدمی میں رکاوٹیں ڈالی جائیں گی۔

سلطین کی کارروائی

اگلی صبح مسلمان لشکر رواں دواں تھا اور اب جیش المقدم تبدیل کر دیا گیا۔ کچھ تازہ دم لشکریوں سے ایک جیش المقدم تیار کیا گیا۔ اس کی کمانڈ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے بیٹے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دے دی گئی۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ اسلام کے ایک ایک عظیم عالم اور اونچے رتبہ کے صحابی تھے۔ روایت ہے کہ آپ اپنے والد سے بھی پہلے اسلام لے آئے تھے۔ سچائی اور تقویٰ کے بہت اونچے مقام پر فائز تھے بہر حال ایک بڑا لشکر بھی آپ کے جیش المقدم کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند میل اوپر جانے کے بعد سلطین کے مقام پر رومیوں سے ایک سخت جھڑپ ہوئی اور پورا دن اسی کارروائی پر لگ گیا۔ لیکن شام سے پہلے رومی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

قیرون کی لڑائی

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو اندازہ ہو گیا تھا کہ رومی اور بھی سخت مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ آپ نے اگلے دن کے لیے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے جیش المقدم کی نفری بڑھا دی۔ اور اپنے نومسلم اور وفادار یونانی خدمت گار دورون کو بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیج دیا۔ بلکہ جیش المقدم کا جھنڈا اٹھانے کی سعادت بھی درون کو نصیب ہوئی۔ دورون شاید پہلا یورپین ہے جس کو اسلامی فوج میں علمبرداری کا شرف حاصل ہوا۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ جب قیرون پہنچے جو سکندریہ سے تقریباً بارہ میل جنوب میں تھا۔ تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں رومیوں کا ایک لاؤ لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے تیار کھڑا ہے۔ ممکن ہے یہ لشکر کئی دنوں سے وہاں پر ہو کہ اس کا کمانڈر بھی باب الیون والا منذفور (تھیوڈرس) ہی تھا جس کو صلاح کے لیے قیصر روم نے قسطنطنیہ بھی بلایا تھا اور وہ پھر واپس آ گیا تھا۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا۔ بعد میں جب جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص وہاں پہنچے تو لڑائی جاری تھی اور وہ اپنے بیٹے کی کارروائی سے خوش ہوئے اور وہ خود بھی جنگ میں شریک ہو گئے۔ مورخین کے حساب سے گو کھلا میدان تھا لیکن رومی سخت مقابلہ کر رہے تھے، ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعداد مسلمان لشکر سے زیادہ تھی، ورنہ کھلے میدان میں اپنے برابر دشمن کو مسلمان ایک آدھ دن میں ختم کر دیتے تھے۔ مورخین کے حساب سے مسلمانوں نے بھرپور حملے کیے اور آخر ان کو دشمن کی صفوں میں کمزور مقامات کا پتہ چل گیا اور وہ مقامات ایسے تھے، جہاں مصر کے قبطی صف بند تھے کیونکہ سمجھوتے کے تحت مصر کے باشندے جنگ میں شریک نہ ہو سکتے تھے اور رومی ان کو زبردستی اپنی صفوں میں شریک کر رہے تھے۔ جب مسلمانوں کو ان کمزور مقامات کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنی جگہوں پر حملے کیے اور دشمن کی صفوں کو تہس نہس کر دیا اور رومی بڑی مشکل کے ساتھ

جان بچا کر بھاگے منذفور بھی بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

سکندریہ کے دروازے پر

قیرون کی لڑائی کے دوسرے دن مسلمان مجاہدین سکندریہ پہنچ گئے۔ شہر کو دیکھ کر اکثر مجاہدین حیران رہ گئے۔ ان کے لیے یہ ایک الگ دنیا تھی۔ جناب عمرو بن عاص کے لشکر میں کوئی بارہ ہزار مجاہدین تھے۔ البتہ مصر کے کچھ قبطی بھی امداد کر رہے تھے۔ وہ مخبری کا کام کرتے تھے۔ مسلمانوں کو رسد کا سامان اکٹھا کرنے میں مدد دیتے تھے۔ سڑکوں کی مرمت اور بار برداری کے لیے جانور اکٹھے کرنے اور اس قسم کے کئی کام ان کے ذمے تھے۔ سکندریہ کا دفاع بھی بڑا مشکل تھا لیکن حملہ بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ عام بندرگاہیں سمندر کے کنارے ہوتی ہیں اور ایک طرف خشکی اور دوسری طرف پانی ہوتا ہے۔ سکندریہ کے عجیب حالات تھے۔ شمال میں سمندر تھا اور جنوب میں ایک جھیل تھی۔ خشکی مشرق میں بھی تھی اور مغرب میں بھی لیکن دونوں خشک علاقوں کا آپس میں کسی خشکی کے ذریعے ملاپ نہ تھا اور نہ سمندر اور جھیل کا پانی کے ذریعے آپس میں کوئی ملاپ تھا۔

سکندریہ کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا لیکن اس زمانے میں کتنا پھیلاؤ تھا اور قلعہ کی دیواریں کہاں پر تھیں۔ اس سلسلہ میں مورخین خاموش ہیں۔ آبادی کوئی چھ لاکھ تھی۔ جس میں یہودی، یونانی، اطالوی، حبشی، مصری اور قبرص کے یونانی یا باقی یورپ کے علاقے کے لوگ آباد تھے۔ اہل یورپ کی تعداد کوئی تین لاکھ تھی۔ یعنی آدھے یورپین تھے۔ بعض مورخین نے سکندریہ کے پھیلاؤ کو دس میل تک بتایا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ طول میں دس میل تھا یا رقبہ دس مربع میل تھا۔

سکندریہ کا نقشہ کچھ مددگار ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی تدبیرات پر بحث ہو سکتی ہے کہ کسی مورخ نے اس زمانے کی زمین کی نشاندہی نہیں کی۔

موجودہ زمانے میں ایسے کسی شہر کے خشکی کے علاقے پر قبضہ ہو جائے تو بندرگاہ پر بھی جلد قبضہ ہو جائے گا۔ اس لیے اگر ہمیں اس زمانے کے کچھ تدبیراتی پہلو معلوم بھی ہو جائیں تو ہمارے فوجی مطالعہ کے لیے وہ کسی اہمیت کے نہ ہوں گے۔ ہم اس تفصیل میں بھی اس لیے جا رہے ہیں کہ بارہ ہزار مسلمان مجاہدین نے اتنا بڑا شہر فتح کر لیا۔ دمشق اس زمانے میں سکندریہ کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ البتہ مدائن، سکندریہ کے مقابلے کا شہر تھا جس پر سکندریہ سے پہلے قبضہ ہو چکا تھا۔ سکندریہ میں بھی مدائن کی طرح ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ جس میں باطل تہذیب پر لاکھوں کی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔

سکندریہ کا محاصرہ

چنانچہ جناب عمرو بن عاص نے سکندریہ کا خشکی کے دونوں مقامات کی طرف سے محاصرہ کرلیا اور جھیل پر بھی مسلمانوں کا قبضہ تھا اور اس میں صرف وہ کشتیاں رہنے دی گئیں جن کو مسلمان استعمال کرتے تھے اور سکندریہ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ جھیل والی جو جگہ تھی وہاں کوئی کشتی باقی نہ رہ گئی تھی۔ لیکن علاقہ اتنا وسیع تھا کہ اہل سکندریہ جھیل کے راستے تیر کر یا کوئی اور چیز استعمال کر کے کسی نہ کسی طرح خشکی پر رات کو آ جاتے تھے۔ مقوقس بھی سکندریہ میں موجود تھا۔

محاصرہ کتنی مدت رہا اس میں بھی اختلاف ہے۔ کچھ کے حساب سے تین ماہ تک رہا اور کچھ کے حساب سے چھ ماہ سے ایک سال تک۔ بہرحال اہل سکندریہ کو روم کی طرف سے کوئی زیادہ مدد نہ مل سکی اور نزدیک سے نزدیک قبرص یا کریٹ کے جزیرے تھے یا مغرب میں بن غازی اور طرابلس کی بندرگاہیں تھیں اور وہاں سے کوئی امداد پہنچنا مشکل بھی تھی۔ کسی مورخ نے کسی خاص امداد کا ذکر نہیں کیا۔

رومیوں کے حالات اچھے نہ تھے اور مسلمانوں کے سکندریہ کو جلد فتح کر لینے میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہرقل مر چکا تھا اور گو کچھ مورخ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت مرا جب مسلمان سکندریہ پہنچے لیکن ہم ہرقل کے پہلے مرنے اور جانشینی کے جھگڑوں کی وضاحت پیچھے کر چکے ہیں کہ تخت مکمل طور پر ہرقل کے پوتے قسطین کے قبضہ میں تھا اور مصر میں مقوقس اور منذفور دونوں موجود تھے۔

اس لیے کچھ مغربی مورخین کے لحاظ سے لڑائی زیادہ نہیں ہوئی اور مقوقس نے مسلمانوں کے ساتھ باب الیون کی قسم کا کوئی معاہدہ کرلیا اور سکندریہ ان کے حوالے کر دیا لیکن یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اتنا لمبا عرصہ محاصرہ رہے اور لڑائی کیسے نہ ہو؟ مسلمان مورخین تو یہاں تک جاتے ہیں کہ محاصرہ کے پہلے دو تین ماہ تو رومی فوجی قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ پہ حملہ کرتے رہے کہ شاید مسلمان تنگ آ کر محاصرہ ہی اٹھالیں۔ علاوہ مسلمان مجاہدین نے بھی کئی دفعہ قلعہ کی دیواریں توڑ کر قلعہ کے اندر گھس جانے کی کوشش کی اور کئی دفعہ نقصان بھی اٹھایا۔

ایک کہانی

اس سلسلہ میں ایک کہانی جو اکثر مورخین نے لکھی ہے، اس کا بیان ضروری ہے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص از خود قلعہ کی دیواریں توڑنے والا دستہ میں موجود تھے اور وہ قلعہ کے ایک تہ خانے میں پھنس گئے۔ ایسے مجاہدین کی تعداد چار بتائی جاتی ہے اور جگہ ایسی تنگ تھی کہ اہل روم ان مجاہدین پر وار بھی نہ کر سکتے تھے۔ صرف بھوک سے مار سکتے تھے کہ تنگ جگہ کے اوپر مضبوط پہرے دار بٹھا دیئے جاتے لیکن ایک مجاہد جناب مسلمہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کو

کہا کہ ان کا کوئی پہلوان اس کے ساتھ مقابلہ کر لے۔ اگر وہ ہار گیا تو چاروں مجاہدین ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن اگر جناب مسلمہ رضی اللہ عنہ جیت گئے تو رومی مجاہدین کو اپنے لشکر میں شامل ہونے کی اجازت دے دیں۔

رومی یہ تجویز مان گئے۔ اور جناب مسلمہ رضی اللہ عنہ مقابلے میں جیت گئے تو رومیوں نے وعدہ کے مطابق مسلمانوں کو اپنے لشکر میں جانے دیا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو رومی نہ پہچان سکے اور ان کے ایک حبشی مجاہد نے جان بوجھ کر ایک تھپڑ بھی رسید کیا کہ ان کو سب سے کم تر مانا جائے۔ یہ کہانی صحیح بھی ہو سکتی ہے کہ جنگ میں کئی دفعہ ایسے کھیل تماشے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن شاید رومی حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو تہ خانہ میں دیکھ نہ سکے ورنہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رومی فوج کے جوان مسلمانوں کے سپہ سالار کو نہ پہچانتے ہوں۔ بہر حال باب الیون کے مقام پر تو یہی منذفور جناب عمرو رضی اللہ عنہ کو دھوکے سے بھی شہید کرنے کو تیار تھا۔ اور یہاں کا شکار اس کی بے خبری کی وجہ سے نکل گیا یا رومی وعدہ کے پکے تھے۔ یہ سارا واقعہ افسانہ یا کہانی بھی ہو سکتا ہے کہ اہل روم نے وعدہ نبھایا۔ واللہ اعلم ہم نے تصویر کے دونوں رخ قارئین کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔

فتح میں دیر

بہر حال سکندریہ کی فتح میں دیر ضرور لگ رہی تھی۔ اور گو رومیوں میں اختلاف تھا۔ ان کی حکومت کے حالات بھی کچھ ڈانواں ڈول تھے۔ لیکن دیر لگنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ رومیوں کے لشکر کی تعداد پچاس ہزار تھی اور مسلمانوں کے لشکر کی بارہ ہزار۔ لیکن شاید ایسا نہ ہوا اور اسلامی لشکر اب پندرہ ہزار کے قریب ہو سکتا ہے اور رومیوں کی نفری بیس یا تیس ہزار کے قریب ہو۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی فکر مندی

سکندریہ وسیع علاقے میں پھیلا ہوا تھا اور مسلمانوں نے بھی محاصرہ کو ختم کرنے کی سر توڑ کوششیں کیں۔ وہ کئی دفعہ کامیاب بھی ہو گئے اور کسی ایک آدھ جگہ سے قلعہ کی دیوار پھلانگ کر یا کوئی شگاف کر کے وہ کئی دفعہ سکندریہ کے قلعہ کے اندر داخل ہوئے۔ لیکن رومیوں کی نفری زیادہ تھی وہ ان کو باہر پھینک دیتے تھے۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی فکر ہو رہے تھے اور انہوں نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو لکھا۔ "دو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے اور آپ مصر کو فتح نہیں کر سکے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجاہدین اسلام میں وہ پہلے والا ولولہ اور جذبہ جہاد نہیں رہا اور انہوں نے دنیاوی سہولتوں اور لذتوں کی طرف زیادہ دھیان دینا شروع کر دیا ہے۔ جب آپ کو میرا خط ملے تو تمام مجاہدین کو پڑھ کر سنائیں اور ان کو ہمت کے ساتھ لڑنے کا خطبہ دیں۔ آپ کے پاس کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان کو ہراول یا آگے والے دستوں میں متعین

کریں اور کسی دن نماز جمعہ کے بعد اللہ کا نام لے کر دشمن پر ہلہ بول دیں۔ یہ نیک ساعت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ ہمارے آقا ﷺ بھی بعد دو پہر حملہ کے لیے حکم دیا کرتے تھے۔''

بھرپور حملہ

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے یہ خط مسلمانوں کو سنایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اکٹھے ہوئے جن میں جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام اور جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت کے علاوہ عظیم صحابی جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور میزبان رسول ﷺ جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے بلکہ جناب مقداد رضی اللہ عنہ بن الاسود، خریجہ رضی اللہ عنہ بن حزافہ اور کئی دوسرے صحابہ شامل تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت حملہ کرنے والوں کی رہنمائی کریں گے اور حملہ کے وقت اگلے دستوں کے وہ امیر ہوں گے۔ چنانچہ اگلے جمعہ کے روز نماز کے بعد مسلمانوں نے بھرپور حملہ کے لیے صف بندی کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آگے والی صف میں تھے۔ درمیان میں جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت تھے۔ حملہ اس جگہ پر ہوا جس جگہ سنہری گرجا والا دروازہ تھا اور مسلمانوں کے نعرۂ تکبیر سے قلعہ کے اندر کی دیواریں بھی گونج اٹھیں۔ صرف چند لوگوں نے مقابلہ کیا۔ باقی لوگوں پر اس طرح ہیبت چھا گئی کہ وہ سکندریہ کو چھوڑ کر کشتیوں میں سوار ہو گئے اور جدھر جی میں آیا ادھر کی راہ لی۔ ستر ہزار یہودی بھی اس دن سکندریہ کو چھوڑ کر بھاگ گئے گویا لوگ زیادہ تجارت پیشہ تھے اور اپنی دولت میں سے جو چیز اٹھا سکے لے کر چلتے بنے۔ تیس ہزار یورپین بھی اسی دن بھاگ گئے اور رومی فوج کا بھی کافی حصہ سکندریہ کو چھوڑ گیا۔ صرف وہ فوجی سکندریہ میں رہ گئے جن کا تعلق مصر سے تھا۔ ہمارے ایک مبصر نے خوب حساب و کتاب لگا کر لکھا ہے کہ سکندریہ شوال ۲۰ ہجری میں فتح ہوا۔ مورخین میں سے کچھ نے شروع اکیس ہجری اور کچھ نے آخر اکیس ہجری کا وقت بتایا ہے۔

زمان و مکاں کا حساب

ہمارے تجزیہ اور مطالعہ کے مطابق جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ذوالحجہ اٹھارہ ہجری کو مصر میں داخل ہوئے۔ انیس ہجری کے پہلے چند ماہ حربی مظاہروں میں گزار دیئے اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص میں رابطہ جمادی الاول، جمادی الثانی انیس ہجری میں ہوا۔ اور پھر عین شمس کی لڑائی ہوئی جس کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے معر کے دل پر قبضہ کر لیا اور باب الیون کا محاصرہ کر لیا۔ انیس ہجری کے آخر میں مقوقس صلح نامہ کی شرائط لے کر سکندریہ گیا، جس کو قیصر نے نامنظور کر دیا اور صفر بیس ہجری میں قیصر مر گیا۔ تمام یورپین مورخ ہمارے ساتھ اس سلسلہ میں اتفاق کرتے ہیں اور ربیع الاول بیس ہجری میں مسلمانوں نے باب الیون فتح کر لیا۔ جمادی الثانی بیس ہجری میں مسلمانوں نے سکندریہ کی طرف پیش قدمی کی اور سکندریہ پہنچے ہیں اور باہر کی لڑائیوں میں کوئی دو ماہ لگ گئے۔ دس دن تو

صرف قیرون کی لڑائی میں لگے۔ بہر حال مسلمانوں نے سکندریہ کا محاصرہ کہیں جا کر شعبان، رمضان بیس ہجری میں کیا۔ اور محاصرہ چھ ماہ ضرور رہا۔ اس لیے سکندریہ اکیس ہجری جمادی الاول یا جمادی الثانی میں فتح ہوا اور تمام مسلمان مورخ یہی کہتے ہیں البتہ جنرل گلب کے حساب سے سکندریہ شعبان، رمضان اکیس ہجری میں فتح ہوا لیکن ہمارے مصر کا حساب کتاب کہ سکندریہ شوال میں ہجری میں فتح ہوا، ٹھیک نہیں بیٹھتا۔

مصر آغوش اسلام میں

سکندریہ کے فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے سارے مصر کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر دیا۔ نقشہ چہارم میں ڈیلٹا کے علاقوں میں اسلامی دستوں کی حربی کارروائیوں دکھائی گئی ہیں کہ انہوں نے سکندریہ سے سخا اور توج والے دستے سے آگے بڑھ کر دمسیس اور پھر بلہسب کا رخ کیا۔ اور اس طرح مصر کے پورے ڈیلٹا کے علاقوں میں اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند ہو گیا۔ مصر کی فتح پر وقت ضرور صرف ہوا لیکن عراق و ایران یا شام و فلسطین کی فتوحات کے مقابلے میں یہ فتح کم خرچ پر حاصل ہوگی۔ مشہور جرمن جنگی ماہر کلاسوٹزا کثر کہتا ہے کہ فتوحات کے خرچ کا حساب کتاب کرنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کچھ فتوحات مہنگی پڑتی ہیں۔ اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند کرنے والے البتہ خرچ کا اتنا خیال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنی جان کی قربانی کسی وقت میں بھی پیش کرنے کو تیار ہو جاتے تھے اور اس پہلو کو کبھی نظر انداز نہ کرتے تھے۔ لیکن خواہ مخواہ انسانی جانوں کے ضیاع کی اجازت کسی مسلمان امیر نے نہیں دی۔

فتح کی خوشخبری کا قاصد

روایت ہے کہ مصر کی فتح کے بعد جناب عمرو بن عاص نے جس قاصد کو مدینہ شریف بھیجا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو خبر دے کہ مصر فتح ہو گیا ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہو گئے ہیں تو قاصد نے گزارش کی کوئی خط بھی دیا جائے۔ تو جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے فرمایا کہ مسلمانوں کی زبان ہزار خطوط سے بہتر ہے۔ زبانی احکام سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم ملکوں کے ملک فتح کر چکے ہیں۔ اور زبانی خوشخبری بہتر ہوتی ہے۔ خط اس وقت لکھا جاتا ہے جب کوئی پردہ والی بات کہیں پہنچانی ہو کہ بات عام نہ ہو جائے۔

چنانچہ جب قاصد مدینہ شریف پہنچا تو اس نے اپنی سواری کو مسجد نبوی کے قریب بٹھا دیا۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو آپ باہر نکل آئے اور مصر کی فتح کی خوشخبری سنی اور دیکھا کہ سورج معمولی ڈھل چکا تھا۔ پس اسی وقت اذان دینے کا حکم صادر فرمایا۔ اذان کی آواز سن کر مسلمان جوق در جوق مسجد نبوی میں داخل ہونا شروع ہو گئے تو جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ مسلمانو تم مبارک ہو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں مصر میں فتح و نصرت حاصل ہوگئی ہے۔ آؤ مل کر

عاجزی کریں اور اپنے رب کا شکر ادا کریں۔

کچھ دن بعد جب قاصد واپس مصر روانہ کیا تو خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور تمام اہل لشکر کا شکریہ ادا کیا، ان کی دعائیں مانگیں اور فرمایا کہ مصر کے علاقے میں بھی کوفہ، بصرہ اور جابیہ کی طرح ایک چھاؤنی قائم کی جائے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے سکندریہ کے حالات سنے تو بڑے فکر مند ہوئے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے اطلاع دی تھی کہ سکندریہ میں چار ہزار عالی شان کوٹھیاں اور بنگلے ہیں۔ چالیس ہزار کے قریب امیر ترین یہودی ہیں، چار سو عیاشی کے اڈے ہیں اور بارہ ہزار کے قریب امیر ترین سوداگر ہیں۔ ان حالات نے خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کو سخت فکر مند کر دیا۔ انہوں نے فرمایا۔ ''سکندریہ کے نزدیک ضرورت کے مطابق تھوڑی سی فوج رکھی جائے اور چھاؤنی باب الیون کے علاقے کے قریب دریائے نیل کے مشرق کنارے بنائی جائے۔''

تبصرہ:

سکندریہ کی فتح اور مصر کے آغوش اسلام میں آنے کے نتائج و اسباق کا تجزیہ اور تبصرہ بعد میں کیا جائے گا لیکن یہاں ایک تبصرہ ضروری ہے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے صوبوں کے دارالحکومت مدینہ شریف سے نزدیک سے نزدیک رکھے اور چھاؤنیاں بھی اسی لحاظ سے بنوائیں۔ اس سلسلے میں کچھ تبصرہ چھٹے اور ساتویں باب میں بھی آئے گا، لیکن یاد رکھیں کہ دور دراز علاقوں یا ملکوں کا دارالخلافہ مرکز سے نزدیک تر ہونا چاہیے۔ انگریزوں نے سارے ہندوستان کو کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی بندرگاہوں میں دارالخلافے بنا کر فتح کیا اور ۱۹۱۱ء میں دارالخلافہ دہلی میں لے آئے اور وہ بھی اس وقت جب خطرہ کم ہو گیا تھا۔ انگریزوں کے حساب سے ہندو پاکستان کی بندرگاہیں ہی ان کے ملک کے نزدیک ترین علاقے تھے۔ چنانچہ اگر ہم بھی ڈھاکہ کی بجائے چٹاگانگ کو سابق مشرقی پاکستان کا دارالخلافہ رکھتے تو یہ حالات نہ ہوتے جو ۱۹۷۱ء میں پیش آئے۔ اول تو چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں وسیع دفاع کر سکتے تھے۔ پھر سمندر کے راستے کچھ نہ کچھ بچا کر لے آتے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ ہم اپنی تاریخ کا بامقصد مطالعہ نہیں کرتے اور نہ اس سے کوئی سبق سیکھتے ہیں۔

فسطاط کی چھاؤنی

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے خط میں صاف لکھ دیا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے اور ان کے عاملوں کے درمیان کوئی دریا یا کوئی بڑی رکاوٹ ہو، چنانچہ چھاؤنی کو نیل کے مشرقی کنارے پر ہی رکھنا تھا اور اس کے لیے جگہ وہی تجویز ہوئی جہاں پر سکندریہ کی طرف پیش قدمی سے پہلے مسلمانوں نے پڑاؤ کیا تھا۔ وہ خیمہ جس میں سالار لشکر رہتے

تھے۔ اوراس کے بیچ سے فاختہ کے بچے پر نکال کراڑ چکے تھے، اسی جگہ کو چھاؤنی کا مرکزی مقام قرار دیا گیا۔ اور وہاں پر ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ جو آج بھی مسجد عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے نام سے موسوم ہے۔ مسجد کا محراب وہیں ہے جہاں فاختہ کے بچوں والا خیمہ تھا۔ باقی شاید کئی تبدیلیاں ہو چکی ہوں گی کہ مسجد میں کئی دفعہ توسیع ہوئی یا عمارت کو نئے سرے سے بنایا گیا۔ البتہ روایت ہے کہ پہلی دفعہ جب مسجد میں نماز ادا کی گئی تو اسی (۸۰) صحابہ کرام بھی نماز میں شریک تھے۔ ان میں جناب زبیر، جناب ابوذر غفاری، جناب عبادہ اور کئی دوسرے عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ جن صاحب نے پہلی اذان دی وہ بھی صحابی تھے اور ان کا نام ابومسلم الغفاتی رضی اللہ عنہ تھا۔ جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں بھی روایت ہے کہ آپ بھی موجود تھے۔

فسطاط کے نام کی وجہ تسمیہ وہی فاختہ والا خیمہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ خیمہ کو عربی میں فسط اور فسطاط کہتے ہیں۔ یہ چھاؤنی اتنی پھیلی کہ باب الیون کا سارا علاقہ اور مصر شہر تک اس کا حصہ بن گئے آج کل اس جگہ کو لوگ قدیم مصر کہتے ہیں اور قاہرہ بھی نزدیک ہے۔ مکتم (مقدم) کی پہاڑی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، وہ بھی نزدیک ہے۔ اور اس جگہ پر جناب عمرو بن عاص سمیت کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دفن ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے بلکہ بعد میں نکیوس کی جنگ کا عظیم مسلمان پہلوان حمال رضی اللہ عنہ جنہوں نے اہل روم کے چوٹی کے پہلوان کو پچھاڑا تھا اور بعد میں زخموں کی تاب نہ لاکر وفات پا گئے ان کو بھی اسی جگہ دفن کیا گیا۔

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نہر طراجن کو صحیح کرنے یا اس سے مٹی نکالنے کے جو احکام دیئے تھے اس وجہ سے اب فسطاط کا مدینہ شریف سے دوسرا رابطہ قائم ہو گیا تھا اور نہر کا نام بھی نہر امیر المومنین پڑ گیا۔

بعد میں جب مکہ شریف اور مدینہ منورہ میں قحط پڑ گیا تو جناب عمرو بن عاص نے غلہ بھیجنے کے لیے اس نہر کو بھی استعمال کیا۔ گو خشکی پر اونٹوں والے راستہ کو بھی استعمال کیا گیا اور بعض مورخین کچھ مبالغہ میں کر گئے کہ اونٹوں کا قافلہ اتنا لمبا تھا کہ پہلا اونٹ جب مدینہ شریف پہنچا تو آخری اونٹ فسطاط میں تھا۔ یہ شاید بہت زیادہ غلہ بھیجنے کے لیے مبالغہ کا طرز بیان ہو، ورنہ خشکی کے راستے مدینہ شریف فسطاط سے سات سو میل دور ہے تو اس طرح اگر فی گز ایک اونٹ کا حساب کریں تو بارہ لاکھ اونٹ بنتے ہیں۔

جناب عمرو بن عاص سمیت کئی صحابہ کرام نے فسطاط کی چھاؤنی میں اپنے لیے مکانات بھی بنوائے بلکہ زمین کا ایک قطعہ جناب امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے بھی رکھ چھوڑا۔ آپ نے فرمایا کہ "بے شک اگر وہ لشکر کے ساتھ ہوتے تو ضرور وہاں پر مکان بنواتے کہ تمام دنیا مسلمانوں کی اپنی ہے اور جہاں وہ ہوتا ہے وہی اس کا عارضی وطن ہوتا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ہر مصر کو وہ اپنا کنعان ہی سمجھتا ہے۔"

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

(اقبالؔ)

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی مزید فتوحات

سکندریہ کی فتح اکیس ہجری میں ہوئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات چوبیس ہجری محرم میں ہوئی۔ یعنی بائیس اور ۲۳ ہجری میں بھی مصر اور افریقہ کے علاقے میں کچھ فتوحات ہوئیں جن کو مورخین نے سرسری طور پر بیان کیا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ایک نوبہ کی مہم کا ذکر ہے جس کو ہم نے نقشہ ششم میں دکھایا ہے۔ یہ مہم جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مصر سے جنوب کی طرف موجود سوڈان کے علاقوں میں بھیجی اور خرطوم تک گئی۔ اس مہم کے سالار جناب عقبہ رضی اللہ عنہ بن نافع تھے۔

جناب عقبہ رضی اللہ عنہ کے والد نافع یا تو جناب عمرو رضی اللہ عنہ کے یا ان کے والد عاص کے اخیافی بھائی تھے۔ آپ کا اب اکثر ذکر ہوگا، خاص کر چوتھی کتاب میں آپ نے جو بحر اوقیانوس میں اپنے گھوڑے کو ڈال دیا، اس کی تفصیل ہوگی۔ اخیافی بھائی اس کو کہتے ہیں جو صرف ماں کی طرف سے بھائی ہو۔

بہر حال آپ کی نوبہ کی مہم زیادہ تر حربی مظاہرہ تھا اور نوبہ کے لوگ بڑے اچھے تیر انداز تھے، اس میں مسلمانوں کا کوئی زیادہ جانی نقصان بھی ہوا۔ اس مہم کے مقاصد اور نتائج مورخین نے زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کئے، البتہ جنوب کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اور اگر خطرہ تھا تو وہ ختم ہوگیا کہ آپ کے حربی مظاہرہ کی وجہ سے نوبہ کے لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہ کی۔ ویسے وہ لوگ بھی اچھے تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ بہترین دوست نوبہ کے علاقے کے لوگوں میں سے ہوتا ہے۔

جناب عقبہ رضی اللہ عنہ بن نافع ایک مہم لے کر افریقہ کے وسط میں بھی گئے اور زویلہ کے مقامات تک عربی مظاہرہ کیا۔ جس کو نقشہ ششم میں دکھایا گیا ہے۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص خود بحیرۂ روم کے ساحل پر برقہ کے مقام تک گئے جو موجودہ بن غازی* کے نزدیک

* بن غازی، سدی برانی، مرسا مطروح وغیرہ کے نام دوسری جنگ عظیم میں ہر زبان پر تھے کہ یہاں پر انگریزوں کے متعدد جرنیلوں، دیول، آکنلیک، منٹگمری وغیرہ مشہور جرمن جرنیل رومیل کے درمیان لڑائیوں نے کبڈی والی شکل اختیار کرلی تھی۔

ہے۔ برقہ، سکندریہ سے تقریباً چھ سات سو میل دور ہے اور وہاں پہنچنے تک ایک ماہ ضرور لگ گیا ہوگا لیکن ان علاقوں کے نہ تو ساحل کٹے پھٹے تھے کہ کافی بندرگاہیں ہوتیں اور نہ اندازاً علاقے آباد تھے۔ اس لیے لڑائی چند مقامات پر ہوئی بلکہ بعض روایات کے مطابق جناب عمرو بن عاص طرابلس (موجودہ ٹریپولی) تک بھی گئے بلکہ اس سے آگے سباطرہ کے مقام تک حربی مظاہرے کئے جو وہاں سے چالیس میل دور تھا۔ طرابلس، برقہ سے کم از کم آٹھ سو میل دور ہوگا کہ راستہ سیدھا نہیں اس لیے اگر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص وہاں تک گئے تو کافی عرصہ لگ گیا ہوگا۔ ہم آگے چل کر چوتھے باب میں افریقہ کی مزید فتوحات کے تحت ان علاقوں میں پھر واپس آئیں گے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ نے فتوحات ضرور حاصل کیں لیکن مفتوحہ علاقوں میں زیادہ فوج نہ چھوڑی اور نہ کوئی چھاؤنی بنائی۔

فتوحات کی وسعت

اسی زمانے میں یعنی اکیس ہجری میں نہاوند کے مقام پر مسلمانوں کو ایک عظیم فتح حاصل ہوئی جس کا ذکر پہلی کتاب میں ہو چکا ہے اور اس فتح کے عطیاب اور ثمرات پر بھی تبصرہ ہو چکا ہے اور اب اس کتاب کے چھٹے اور ساتویں باب میں ایران و عراق کی مہمات اور مزید فتوحات پر سیر حاصل تبصرہ کریں گے۔

نقشہ پنجم میں ہم بیس ہجری تک کے حالات کا خاکہ بھی پیش کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کی فتوحات کتنی وسعت اختیار کر چکی تھیں۔ لیکن ذہن نشین کرنے والی بات یہ ہے کہ اتنی فتوحات کو قائم رکھنے کے لیے کوئی صحیح کارروائی کرنا پڑتی ہے، ورنہ سکندر یونانی مقدونیہ سے چل کر مصر ہوتا ہوا دریائے بیاس کے کنارے تک پہنچ گیا تھا لیکن فتوحات کا کوئی مقصد نہ تھا۔ اہل روم بھی مصر تک آ چکے تھے ان کے جانشین رومی جن کو اہل یورپ بازنطینی کہتے ہیں اور ان جنگوں میں ہمارا ان کے ساتھ واسطہ ہے، وہ بھی شام و فلسطین فتح کر چکے تھے، لیکن اب سکڑ رہے تھے اور اپنی تہذیب و تمدن کو بھی ساتھ لے جا رہے تھے کہ فتوحات صرف حکومت کے لیے تھیں۔

مسلمان صراط مستقیم کی نشاندہی کے لیے ملک فتح کرتے ہیں، اگر صرف دنیا کو روند ڈالنے کی بات ہوتی تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی مسلمان دنیا کے کنارے سے نکل جاتے، لیکن یہاں پر بات فلسفہ حیات کی ہوتی ہے کہ عملی طور پر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نافذ کئے جاتے ہیں۔

یہ نکتہ وضاحت طلب ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد فتوحات میں کمی آ گئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ اور سال بھی زندہ رہتے تو فتوحات کو آگے نہ بڑھاتے، اگلی فتوحات میں اور خاص کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کے حالات سے یہ بات واضح کی جائے گی کہ کوشش بھرپور طور پر جاری رہی لیکن فتوحات اتنی ہی بڑھائی جا سکیں جو سنبھالی جا سکتی تھیں۔ اسلام میں ملک فتح کر کے اسلامی فلسفہ حیات کو جاری کیا جاتا

ہے۔حق کے طالب چندلوگ ہوتے ہیں، باطل والے ہمارے اندر بھی آ جاتے ہیں اور سامنے سے بھی مقابلہ کرتے ہیں اور یہ کشمکش جاری ہے۔''جلالِ مصطفیٰ امیں'' میں (ص ۱۸ پر) مولانا سید ابوالحسن ندوی کی جس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا نام بھی یہ ہے کہ ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش''۔اس کتاب کو پڑھنے سے یہ عیاں ہوگا کہ باطل اسلام کو زنگ آلود کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ہمارے اندر ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو یا تو باطل کے فلسفوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں یا اہل مغرب کی مادی ترقی ان کے ذہنوں پر سوار ہو جاتی ہے۔علامہ اقبال نے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔

ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر، بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

دریائے نیل آغوش اسلام میں

یہ عنوان مغربی فلسفہ والوں کو کچھ عجیب نظر آئے گا لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی تمام مخلوق کا وجود بھی ہے اور ان کو شعور بھی ہے۔اور وہ مخلوق جس کو ہم بے جان سمجھتے ہیں ان میں بھی شعور ہے۔قرآن پاک کی سورۃ حشر میں یہ ذکر ہے کہ...... ''اگر ہم یہ قرآن پہاڑوں پر نازل کرتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔''اس کے علاوہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ کئی پتھروں نے بھی حضور پاک ﷺ کو عرض کی۔

''السلام علیک یارسول اللہ''

پھر ہرنی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے خاص کر درخواست کی کہ اس کو حضور پاک ﷺ کے قدم مبارک پر سر رکھنے کی سعادت حاصل ہو جائے۔

چنانچہ روایت ہے کہ اسلام سے پہلے دریائے نیل میں ہر سال طغیانی تب آتی تھی کہ ایک مقررہ موسم میں ایک خوبصورت دوشیزہ کو دریا کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔یہ رسم کب شروع ہوئی، مورخین اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

بہر حال مصر کے آغوش اسلام میں آ جانے کے بعد بائیس ہجری میں دریائے نیل میں طغیانی کا پانی بہت کم آیا۔ اور وہ وقت بھی نزدیک آ گیا جس روز ایک دوشیزہ کو قربانی کے لیے دریا میں پھینکا جاتا تھا تا کہ سیلاب آ جائے کہ اس طغیانی ہی میں مصر کی زرخیزی کا راز تھا۔اور انہی دنوں قبطی عیسائی ایک عید مناتے تھے یعنی یہ مصر کی زرخیزی کا جشن ہوتا تھا۔

چنانچہ مصر کے لوگ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو پورے واقعات سے آگاہ کیا۔جناب عمرو رضی اللہ عنہ نے ایک تیز رفتار قاصد کو مدینہ شریف بھیجا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے ہدایات لی جائیں۔جناب

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دو خط دیئے۔ ایک جناب عمرو رضی اللہ عنہ کے نام اور دوسرا دریائے نیل کے نام۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ کو خط میں حکم دیا گیا کہ تمام لوگوں کو اکٹھا کرنا اور یہ خط جو دریائے نیل کے نام ہے اس کو اونچی آواز میں پڑھنا اور پھر دریائے نیل میں ڈال دینا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے تمام تر کارروائی خلیفہ دوم کی ہدایات کے مطابق کی۔ اور خط کے الفاظ یہ تھے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... اللہ کے بندے اور مسلمانوں کے امیر عمر (رضی اللہ عنہ) کی طرف سے ......

بنام مصر کے دریائے نیل ......

اگر تم اپنی مرضی سے چلتے ہو تو رک جاؤ، لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے چلتے ہو جو زبردست طاقت والا ہے تو ہم اس کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ وہ تمہیں چلا دے۔''

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے یہ خط ایک جم غفیر کے سامنے ...... اونچی آواز میں پڑھا اور پھر دریا میں پھینک دیا۔ اسی رات کو دریا میں طغیانی آ گئی اور دریا کی سطح کوئی تیس فٹ کے قریب اونچی ہو گئی۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جس میں ہمارے لیے ہزاروں سبق ہیں کہ سب کچھ ہمارے اندر موجود ہے۔ اگر ہم یقین پیدا کر لیں اور پوری امت میں وہی وحدت ہو جو اس زمانے میں تھی تو اللہ تعالیٰ ہر چیز کو ہمارے لیے مسخر کر دے گا۔ قرآن پاک کی سورۃ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے نہروں، سورج، چاند اور دن اور رات کے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ میں نے تمہارے لیے ان کو مسخر کر دیا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے دریا جس کو ہم بے جان کہیں گے یا یہ کہیں گے کہ ہم اس کے شعور کے بارے میں علم نہیں رکھتے تو وہ بھی باطل فلسفے سے متاثر ہو کر باطل قسم کی بدعت میں شریک ہو چکا تھا کہ ہر سال ایک دوشیزہ کی قربانی مانگتا تھا لیکن جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک غلام نے اس کی توجہ حق کی طرف دلائی تو دریا بھی چل پڑا۔ بے شک اس کو اللہ تعالیٰ نے چلایا اور ہمارے لیے اس میں سبق ہے کہ ہم صراط مستقیم پر آ جائیں تو اللہ تعالیٰ سب دنیا کی چیزوں کو ہمارے لیے مسخر کر دے گا اور تمام علوم ہمارے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔

اے مسلماں ہر گھڑی پیش نظر آیہ لا یخلف المیعاد رکھ
یہ لسان العصر کا پیغام ہے ان وعد اللہ حق یاد رکھ

(اقبالؔ)

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ اب اختتام پذیر ہونے والا ہے اور اگلے باب میں ہم آپ کی شہادت اور اس فتنہ و سازش کا مختصر ذکر کریں گے جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔

فتوحات مصر کے نتائج واسباق

ا۔ فتوحات مصر کے نتائج روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ ہم براعظم افریقہ میں داخل ہو گئے اور مصر کی فتح کے بعد افریقہ میں پیش قدمی کا راستہ کھل گیا۔ اس سلسلہ میں ہم چوتھے باب میں کچھ مزید تعارف کے ساتھ افریقہ کی فتوحات کا ذکر کریں گے۔

۲۔ یہ پہلو بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ مدینہ شریف کے دفاع، بحیرۂ قلزم پر مکمل قبضہ اور شام و فلسطین کے ساحلی علاقوں کی حفاظت کے لیے مصر کو فتح کرنا ضروری تھا اور اب اس فتح سے وہ تمام تر ضروریات پوری ہو گئیں۔

۳۔ اہل روم اب یورپ میں سکڑنے لگے اور مسلمانوں کے لیے بحیرۂ روم کے دروازے کھل گئے۔

۴۔ تاریخ کے طالب علم اور خاص کر عسکری تاریخ کے ماہرین یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ مصر کے راستے افریقہ کا رخ کرنے کی بجائے مسلمان اگر زیادہ زور شمال کی طرف لگاتے اور مدائن کی طرح قسطنطنیہ کو فتح کر لیتے تو سلطنت روم ان کے سامنے اسی وقت گھٹنے ٹیک دیتی اور تاریخ کا دھارا ابھی تبدیل ہو جاتا۔

۵۔ یہ بات سطحی طور پر تو ٹھیک نظر آتی ہے لیکن فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے اس زمانے میں سیدھے قسطنطنیہ جانا مشکل تھا۔ بعد میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لگاتار ایسی کوششیں کی گئیں تو وہ بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول خشکی کا راستہ پہاڑی تھا اور آرمینیا کے علاقے پر بھی قبضہ مشکل سے رکھا جا رہا تھا وہاں سے آگے پیش قدمی نہ کی گئی بلکہ آذربائیجان میں بھی بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ اس نے اس زمانے میں اناطولیہ کے علاقے میں آگے بڑھنا مشکل تھا۔ دوم بحری راستہ بہت لمبا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں کوشش جاری کی گئی اور پانچویں باب میں اس کا مختصر ذکر آئے گا اور پھر باقی ذکر چوتھی کتاب میں ہوگا۔ تیسری بات یہ ہے کہ شمالی علاقے مقابلتاً زیادہ سرد تھے اور سرد علاقوں میں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے سردی کا عادی ہونا پڑتا تھا یا تجاویز ایسی ہونی چاہئیں کہ موسم سرما میں کسی نزدیک والی جگہوں پر آرام کیا جا سکے اور گرمیوں میں لڑائی لڑی جائے۔

۶۔ یہاں پر اہل یورپ کی چند مثالیں ضروری ہیں کہ کے ہاں جو جنگ ہفت سالہ یا جنگ صد سالہ ہم عسکری تاریخوں میں پڑھتے ہیں، ان جنگوں میں صرف گرمیوں کے چند ماہ لڑائی ہوتی تھی اور وہ بھی بعض دفعہ سیاسی یا کسی اور وجہ سے نہیں ہوتی تھی۔ ہاں وہ لوگ کچھ "حالت جنگ" میں رہتے تھے اور انیسویں صدی میں کلا ہوئز بھی اپنی کتابوں میں بار بار موسم اور سردی کے موسم کی بارکوں کا ذکر کرتا ہے کہ سردیوں میں جنگیں بند ہو جاتی تھیں۔

۷۔ چنانچہ مسلمانوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ پہلے افریقہ پر قبضہ کر کے بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر قابض ہوں، تاکہ اول وہ ایک بحری طاقت بن جائیں اور پھر افریقہ کے کسی مقام سے یورپ میں جا سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

کے زمانے میں جو کارروائیاں ہوئیں اور جن کا ذکر چوتھے اور پانچویں باب میں موجود ہے وہ اسی حکمت عملی کی پیش رفت تھی۔ پھر اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے چار سال بیرونی وسعت رک گئی لیکن امیر معاویہ کے زمانے میں پھر وسعت شروع ہوگئی جس کو ہم چوتھی کتاب میں بیان کریں گے۔ یاد رہے کہ اسلامی فتوحات اور حکمت عملی گہری سوچ بچار اور طریق کار پر مبنی تھی اور فتوحات برائے فتوحات کا کوئی چکر نہ تھا۔

۸۔ اس کے بعد سانحہ کربلا کی وجہ سے اندرونی خلفشار کئی سال جاری رہا۔ اور جب حالات کچھ ٹھیک ہوئے اور اس کے بعد فتوحات میں پیش رفت اور اسلامی سلطنت میں وسعت ہوئی تو وہاں پر فتوحات کو قائم نہ رکھ سکا کہ اپنے فلسفہ حیات کے عمل میں تبدیلی آچکی تھی اور اس کی وضاحت سرسری طور پر چوتھی کتاب میں ہوگی کہ ہمارا علم بھی زنگ آلود ہو گیا تھا۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

(اقبالؔ)

اور اب اس سلسلہ میں صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔

حدیث دل کسی درویش بے کلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

(اقبالؔ)

اسباق

الف: جہاں تک اسباق کا تعلق ہے ان کو حسب معمول ساتھ ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف دہرائی ہے کہ مسلمانوں کی مصر کی فتح کی حکمت عملی اور تدبیرات کے ہر مرحلے میں سبق ہے۔ متحرک طریقہ اختیار کر کے دشمن کو ردعمل سے روکا۔ اپنا ارادہ دشمن پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ کمک بروقت پہنچی۔ دشمن کو عین شمس پر حملہ کے لیے مجبور کر دیا اور پھر سارے وسط مصر کے شہروں سے دشمن کا قلعہ قمع کیا گیا اور باب الیون کا محاصرہ اس وقت کیا جب باقی تمام کارروائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔

ب: ریگستان کا استعمال اور موسم کے لحاظ سے پیش قدمی اور سکندریہ کا بروقت محاصرہ۔ پھر حضور پاک ﷺ کی غلامی اور حضور پاک ﷺ کے مقرر کردہ وقت پر حملہ کی سنت۔ یعنی مسلمانوں کے ہر مرحلہ میں متعدد اسباق ہیں۔

ج: لیکن سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ وہ اپنے فلسفہ جنگ اور تدبیرات کا تانا بانا ایسی تجویز پر بناتے تھے جس کے لیے ان کے پاس ذرائع موجود ہوتے تھے۔ اول اسلام کا فلسفہ حیات جس کو جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت نے رومیوں پر واضح کیا اور دوم اپنی اندرونی طاقت پر ہی بھروسہ کیا۔ لیکن ہمیں فائر بندی کا انتظار ہوتا ہے کہ غیروں سے حاصل شدہ

سامان زیادہ دیر نہیں چلتا۔ ہمارے آرسنل اورڈپو جلدی خالی ہوجاتے ہیں۔

د: جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے فوجی چھاؤنی کے لیے احکام، سکندریہ کی سہل زندگی سے دوری، مصر کے دارالخلافہ کی مرکز اسلام سے نزدیکی ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ واضح کردیا گیا ہے کہ ان سے سبق سیکھیں۔

ر: جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی طرف سے اہل مصر کی دعوت، فاختہ کی حفاظت، لوگوں کے ساتھ سلوک اور زندگی کے ہر پہلو کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے سنت چھوڑ گئے ہیں۔ ان چیزوں کو اپنا کر ہم آج بھی کھویا ہوا مقام حاصل کرسکتے ہیں۔

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

(اقبالؔ)

س: اہل یورپ کا یہ طریقہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی بات ان کو اچھی نظر آجائے تو اس کو وہ عرب روایات یا ان ملکوں کی روایت سے وابستہ کردیتے ہیں جو مسلمانوں نے فتح کے تمام مورخ خواہ ہٹی ہو یا گبن یا ٹوان بی ہی ہو اور خواہ گلب ہو، سب ایسا کرتے ہیں۔ بس ہم یہ اصول یاد رکھیں عرب مسلمانوں کے ہاتھ سے بدر کے مقام پر شکست کھا گئے، مصری و ایرانی اور تورانی بعد میں شکست کھا گئے۔ ہم ایک ملت ہیں۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر رضی اللہ عنہ، فقر بوذر رضی اللہ عنہ، صدق سلمانی

(اقبالؔ)

❖❖❖

تیسرا باب

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت

اور جناب عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی خلافت

جناب فاروق کی شہادت اسلام کی تاریخ کا ایک سانحہ عظیم ہے۔ حضرت عمر کو غیروں کی سازش کے تحت شہید کیا گیا۔ شہید کرنے والا فیروز جو ابولولو کے نام سے مشہور ہے، صرف ایک مہرے کے طور پر استعمال کیا گیا اور شہادت کا اصلی سازشی ہرمزان ایک ایرانی جرنیل تھا اور اس کا ساتھی حیرہ کا ایک عیسائی تھا جس کا نام جفینہ تھا۔ باطل ہمیشہ مہروں کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اور ایرانی جرنیل ہرمزان جو مدینہ میں مقیم تھا۔ مجبوری کے تحت اوپر سے اسلام لایا تھا۔ دل سے مسلمان نہ ہوا تھا۔ جفینہ کی بھی کچھ ایسی حالت تھی کہ دونوں کی دوستی ہوگئی۔

ہرمزان اور جفینہ

پہلی کتاب میں ہرمزان کا ذکر بھی آتا ہے۔ بے شک وہ رستم، نخیر جان، یا شاہ مردان کے پایہ کا جرنیل تو نہ تھا۔ لیکن فیرزان، ہرمزا اور جالینوس قسم کے جرنیلوں کی صف میں آتا تھا اور لاکھ درہم کی ٹوپی ضرور پہنتا تھا۔ اس کا ذکر قادسیہ کی جنگ میں بھی آیا تھا کہ وہ بچ گیا تھا اور جب مسلمانوں نے مدائن کی طرف پیش قدمی کی تو وہ بھی کچھ دستوں کی کمانڈ کر رہا تھا۔ بعد میں وہ جنوبی ایران یعنی خوزستان وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ اس علاقے میں اس کی جاگیر تھی۔ وہاں ایک دو دفعہ شکست کھانے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا لیکن اس پر قائم نہ رہا۔ وہ ابن الوقت اور بدعہد شخص تھا۔ جب بھی موقع ملا مسلمانوں کے خلاف کام کیا۔ اور آخری دفعہ جب گرفتار ہوا تو پھر مسلمانوں کے سالار لشکر کے پاؤں پکڑ کر کسی طرح مدینہ پہنچ گیا کہ خلیفہ وقت سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔

وہاں پر ہرمزان کو جب جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو جناب عمر نے فرمایا۔ ''اے دشمن خدا، کیا تیرا کوئی اصول بھی ہے؟'' تو ہرمزان نے اپنے اوپر کپکپاہٹ طاری کر لی اور پانی پانی پکارنا شروع کر دیا۔ تو اس کے

لیے پانی ایک پیالہ میں لایا گیا، پھر کچھ ہوش وحواس کی شکل بنا کر کہنے لگا کہ "وہ اپنی کہانی بیان کرنا چاہتا ہے لیکن اس کو ڈر ہے کہ جب وہ کہانی کے درمیان میں ہوگا تو اس کا سر نہ کاٹ دیا جائے، اس لیے اس کے ساتھ کم ازکم یہ وعدہ تو کیا جائے کہ اس پیالہ میں جو پانی ہے کے پینے تک اس کو قتل نہ کیا جائے۔"

جناب عمرؓ نے فرمایا کہ سنو، مسلمان اتنے ظالم نہیں وہ بڑے سے بڑے دشمن کو صفائی کا موقع دیتے ہیں تو بڑی خوشی سے پانی پی اور پھر کہانی شروع کر۔ ہرمزان نے یہ سننے کے بعد پیالے کا پانی زمین پر ڈال دیا اور کہنے لگا کہ وہ پانی ختم ہوگیا۔ وہ پانی اب وہ کبھی نہ پی سکے گا اور مسلمان اس کو قتل نہیں کر سکتے کہ وعدہ کیا گیا ہے کہ پانی پینے سے پہلے وہ قتل نہیں ہوسکتا۔

جناب عمرؓ نے فرمایا۔ "اے مکار! تیرا مکر وقتی طور پر تیرے کام آیا لیکن تو ایران نہ جاسکے گا کہ وہاں لوگ تیرے شر سے محفوظ رہیں، تو مدینہ ہی میں رہے گا اور اگر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو قتل کر دیا جائے گا۔"

جہاں تک حیرہ کی عیسائی جفینہ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں روایت ہے کہ وہ جناب سعدؓ بن ابی وقاص کا رضاعی بھائی تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہے کہ جناب سعد اپنے والدین کے ساتھ بچپن میں حیرہ سے گزرے یا حیرہ سے کوئی قافلہ مکہ شریف آیا جس میں جفینہ اور اس کی والدہ تھی کہ کسی طرح جناب سعدؓ کے خاندان کے ساتھ جفینہ کے خاندان کا تعلق ہوگیا۔ جناب سعدؓ جب کوفہ میں گورنر تھے تو اس زمانے میں تعلقات بڑھے ہوں گے کہ جفینہ کو بھی مدینہ شریف میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

فیروز ابولولو

فیروز جو ابولولو کے نام سے موسوم تھا وہ بھی ایرانی تھا اور عظیم صحابی جناب مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام تھا۔ وہ بڑا ہنرمند تھا۔ آہن گری اور نقاشی وغیرہ کا کام کرتا تھا اور جناب مغیرہؓ بن شعبہ نے اس کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جتنا چاہے کام کرے، ہر روز کی کمائی سے دو دینار ان کو دے اور باقی اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ لیکن فیروز کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ جناب مغیرہ کو بہت تھوڑی رقم دینا چاہتا تھا۔ ایک دن فیروز کو بازار میں جناب عمر فاروقؓ نظر آ گئے تو اس نے آگے بڑھ کر جناب عمر سے شکایت کی کہ ان کے مالک جناب مغیرہ (ؓ) ان کی کمائی سے روزانہ دو دینار لے لیتے ہیں۔ جناب عمرؓ کو معلوم تھا کہ فیروز بہت کچھ کماتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "یہ رقم کچھ زیادہ تو نہ تھی، فیروز بہت کچھ کماتا ہے۔" یہ سن کر فیروز کے تیور بدل گئے، جناب فاروقؓ کو سمجھ آ گئی کہ وہ جذباتی آدمی ہے اور ان کی بات کو اس نے پسند نہیں کیا لیکن فیروز کے ساتھ سلسلہ کلام جاری رکھنے کی غرض سے اور اس کو کچھ تسلی دینے کے لیے جناب عمرؓ نے اس سے پوچھا۔ "سنا ہے تو پن چکی بڑی اچھی بناتا ہے اگر ایک ایسی اچھی پن چکی میرے لیے بنا دو تو تمہیں خاطر خواہ

مزدوری دے دی جائے گی۔'' فیروز سخت غصہ میں تھا، کہنے لگا۔''ایسی چکی بنا کر دوں گا کہ سب لوگ دیکھیں گے۔''
جناب عمر رضی اللہ عنہ سمجھ تو گئے لیکن انہوں نے بات کو ٹال دیا۔

جناب عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت

ہرمزان اور جفینہ کسی ایسے ہی آدمی کی تلاش میں تھے، جس کے جذبات کو بھڑکایا جا سکے۔ فیروز ویسے بھی ہرمزان کو ملتا رہتا تھا۔ چنانچہ ہرمزان او جفینہ نے فیروز کو بھڑکانا شروع کر دیا اور فیروز جناب عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے پر تیار ہو گیا۔ ہم واقعات کی زیادہ تفصیل میں نہ جائیں گے۔ ایک روز صبح کے وقت جب جناب عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے تو فیروز نے چھپ کر آپ پر سخت وار کیا۔ آپ سخت زخمی ہوئے اور ذوالحجہ ۲۳ ہجری کے آخری ایام میں یا یکم محرم الحرام ۲۴ ہجری کو زخموں کی تاب نہ لا کر وفات پا گئے۔ ویسے فیروز کے سامنے جو مسلمان بھی آیا۔ اس نے اس پر وار کیا۔ روایت ہے کہ تیرہ مسلمان زخمی ہوئے اور ایک صحابی جناب کلیب رضی اللہ عنہ بن ابی بکر لیثی شہید بھی ہو گئے۔ اور آخر میں فیروز نے خودکشی کر لی۔ جو چھرا اس نے استعمال کیا تھا وہ جناب عبدالرحمٰن بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دیکھا ہوا تھا اور وہ ہرمزان کا تھا اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گواہی دی کہ ہرمزان اور جفینہ، فیروز کے اس حملہ سے ایک دن پہلے ملے تھے اور فیروز کے ساتھ اس روز بھی سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

سازشیوں کے ہدف

مسلمانوں کے مرکز پر وار ہمیشہ وہ لوگ کرتے ہیں جو اسلام کے ازلی دشمن ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ بھی اوڑھ لیتے ہیں اور اپنی تاریخ کے بامقصد مطالعہ میں ہم اسی پہلو کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سازش جاری و ساری ہے۔ اور اب بھی ہمارے اندر پنپ رہی ہے۔ بلکہ اب یہ سازش اتنی گہری ہے کہ سازش کرنے والے کھلم کھلا کسی باطل فلسفہ کا پرچار کر کے پوری قوم کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور ان سازشیوں کے پاس اتنے ذرائع موجود ہیں اور ان کو باہر سے باطل والوں کی طرف سے اتنی امداد ملتی ہے کہ یہ لوگ دندناتے پھرتے ہیں۔ ان سازشیوں کا قلع قمع کس طرح کیا جائے۔ یہ بڑا وسیع مضمون ہے۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ ان کتابوں کا سلسلہ شروع کرتے وقت ہم نے پہلی کتاب کے پہلے باب میں تمام تر توجہ وحدانیت اور مرکزیت پر دی تھی اور یہی اس باب کا عنوان تھا۔ پس یہ اصول یاد رکھیں کہ جو لوگ یا طاقت ہمارے مرکز یا مرکزی قوت کے خلاف زبانی یا عملی وار کرے وہی اہل سازش ہیں اور غیروں کے فلسفوں سے متاثر ہو کر اگر کوئی ایسا فلسفہ اپنا لیں جو ہماری صفوں میں تفرقہ ڈالے تو وہ فلسفہ بھی غیر اسلامی ہے۔ اگر طریق انتخاب سے ہمارے بیچ تفرقہ پڑتا

ہے جیسے ۱۹۷۰ء میں پڑا تو وہ طریقہ انتخاب غیر اسلامی تھا۔ اگر ہمارے کالجوں اور سکولوں میں خاکبازی یا مادیت پرستی کے سبق دیئے جاتے ہیں یا اسلامی فلسفہ حیات پر پردے ڈالے جاتے ہیں تو یہ تعلیم غیر اسلامی ہے۔ اگر ہمارے سکولوں میں ایسی معاشرت اور ثقافت پڑھائی جاتی ہے جس کا تعلق خطوں یا علاقوں سے ہو تو وہ سب غیر اسلامی ہے کہ اسلام جغرافیائی خطوں کی ثقافت کی غلامی کی اجازت نہیں دیتا۔

شہادت کے دن منانا

اسی طرح ہم غیروں کی نقل کر کے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت منا لیتے ہیں لیکن تمام تر کارروائی بے مقصد ہوتی ہے۔ اسلام دن منانے کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔ بے شک جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے سے بھی ہمارا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''جب صالح لوگوں کا ذکر کرو، تو جناب عمر کا ذکر ضرور کیا کرو کہ اس سے اپنے ایمان کو تقویت پہنچتی ہے۔'' لیکن اس سلسلہ میں کچھ اور ضروریات بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ایسے دن مناتے وقت جناب عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کی عملی مثالیں دے کر ان پر عمل کرنے کے وعدے کئے جائیں کہ ہم آئندہ اپنی زندگی اس طرح گزاریں گے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گزاری۔ اس کے علاوہ نظر دوڑائی جائے کہ جو کچھ آج ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو ایسا ہوتے دیکھتے تو کیا احکام دیتے، تو حکومت کو بھی ایسے احکام دینا چاہئیں بلکہ ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے اندر تفرقہ پیدا کر رہے ہیں۔ اور ان لوگوں کا محاسبہ کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

اسلام کا مثالی دور

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے کو یا پہلے دونوں خلفاً راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے کو اسلام کا مثالی دور کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں بڑی وحدت تھی لیکن فی الحال ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ بعد کے دو خلفائے راشدین کے زمانے میں اس وحدت کو اس طرح قائم کیوں نہ رکھا جا سکا۔ ہم ان حالات کا جائزہ واقعات کی پیش رفت سے پیش کریں گے اور یہاں پر جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بیان کو کافی سمجھیں گے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ پہلے دو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا زمانہ بڑا اچھا تھا بعد میں حالات میں کیوں تبدیلی آ گئی۔ تو آپ مسکرا دیئے اور فرمایا۔ ''ان کے مشیر ہم تھے اور ہمارے مشیر آپ ہیں۔''

ہمارے لیے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عظیم ہیں اور خاص کر عشرہ مبشرہ اور چاروں یاروں کی عظمت کے سلسلہ میں دوسری کتاب میں سیر حاصل تبصرہ ہو چکا ہے۔ کچھ مشیت ایزدی کی بات بھی ہوتی ہے کہ اسلام عملی طور پر اسی طرح مثالی

دور کا مظاہرہ کرتا رہتا اور باطل بالکل دب جاتا تو شاید اس دنیا کا کھیل تماشہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ ہر طرف سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام کی صدا بلند ہو رہی ہوتی اور خیر ہی خیر ہوتی۔ تو پھر عالم خلق اور عالم امر میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں خیر اور شر کو ساتھ ساتھ رکھ کر ہمیں امتحان کے لیے بھیج دیا ہے لیکن اگر شر یا باطل ختم ہو جاتے اور مثالی دور ہوتے تو پھر امتحان کیسے ہوتا۔ بہر حال یہ بڑی گہری باتیں ہیں اور ہمارا یہ تجزیہ بھی شاید صحیح ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو سب کچھ حق کے لیے پیدا کیا ہے اور خود فرماتا ہے۔

ربنا ما خلقت هذا باطلاً.

''اے ہمارے رب تو نے یہ باطل پیدا نہیں کیا۔''

ہاں امتحان یہ ہے کہ ہم حق کو پہچان سکیں اور وہ بھی عاجزی کے ساتھ اس کے دربار میں عرض کرتے ہیں کہ اے رب العالمین تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو نے ہمیں اپنے حبیب ﷺ کی امت میں پیدا کیا ہے۔ اب حق کے راستے میں تو مہربانی سے ہماری مدد کر اور ہمیں صراط مستقیم پر چلا اور ہم خاتمہ بالخیر کی دعا بھی مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نظام عجیب و غریب ہے اور ہمارا سارا بیان واقعات کے لحاظ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال اور بیانات پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی کتاب میں گزارش کر دی گئی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام اعمال اور بیانات قرآن پاک کے احکام اور حضور پاک ﷺ کی سنت کے مطابق ہیں۔ جو چیز ان اصولوں کے باہر ہو وہ حضور اکرم ﷺ کے عظیم رفقاً کا عمل یا بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ اضافے ہیں اور لوگوں کے انگل پچو بیانات ہیں اور صحیح حالات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآن پاک کے تابع کرنا پڑتا ہے۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحب کشاف

(اقبالؔ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سلطنت کی وسعت

نقشہ پنجم کسی حد تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی سلطنت کی وسعت کی نشاندہی کرتا ہے۔ مشرق میں اسلامی لشکر نہاوند سے نکل کر ایک طرف دریائے سندھ تک شمال میں دریائے جیحوں تک اور مغرب میں برقہ اور طرابلس تک پھیل چکے تھے۔ بہر حال کچھ تجسس والے طالب علموں کو طول و عرض یعنی لمبائی چوڑائی میں بھی دلچسپی ہوتی ہے تو وہ حساب اس طرح بنتا ہے کہ مکہ سے جنوب مشرق کوئی ۱۴۸۳ میل تک، مشرق کی طرف ۱۰۸۷ میل، شمال کی طرف ۱۰۳۶ میل اور شمال مغرب میں مصر کی طرف اگر صرف برقہ تک فاصلہ ناپیں تو ایک ہزار میل کے قریب بنتا ہے۔ گو طرابلس

آگے اور ہزار میل دور تھا۔ یہ تھی سلطنت کی وسعت۔

لیکن جناب عمرؓ کو زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اس سلطنت کو قائم کیسے رکھا جائے اور اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کو کس طرح جاری و ساری کیا جائے تا کہ مفتوحہ علاقے کے لوگ مسلمانوں کے کردار اور فلسفہ حیات کو اپنانے کی صحیح مثال سے متاثر ہو کر اللہ کے دین میں شامل ہو جائیں۔ جب تک مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اس فلسفۂ حیات کو جاری نہ کریں گے تو آگے ملک فتح کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسلام کا مقصد حق کو لانا ہے اور اگر گھر میں حق نہ ہو تو آگے بڑھنے کا کیا فائدہ، لیکن جس چیز نے حضرت عمرؓ کو زیادہ فکر مند کیا وہ گروہ بندی تھی۔

گروہ بندی یا جماعت بندی

گروہ بندی یا جماعت بندی ایک ہی چیز ہے۔ حضور پاک ﷺ نے اس سلسلہ میں سختی سے منع فرمایا اور آپ نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں میں کوئی گروہ یا الگ الگ جماعت نہیں۔ اور اس زمانے میں تو جماعت بندی نظر نہیں آتی تھی۔ اور کچھ لوگ شاید سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ مسلمانوں میں بھی گروہ ہو سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور طبری کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کو ہم لفظ بہ لفظ نقل کر رہے ہیں۔

''مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ تم نے (مخصوص) محفلیں قائم کر رکھی ہیں، یہاں تک کہ جب دو اشخاص بھی کہیں بیٹھتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں کے ساتھیوں میں سے ہیں اور وہ فلاں کا ہم نشیں ہے۔ یہاں تک کہ ہر طرف مجالس و محافل کی کثرت ہو گئی ہے۔ خدا کی قسم! یہ چیز تمہارے دین و مذہب میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ نیز تمہاری عزت و شرافت اور خود تمہاری ذات میں بھی دخیل ہو رہی ہے۔ مجھے وہ زمانہ نظر آ رہا ہے کہ تمہارے بعد جو آئیں گے وہ یہ کہیں گے، یہ فلاں کی رائے ہے۔ یہ لوگ اسلام کو کئی حصوں میں بانٹ دیں گے۔ تم اپنی مجالس کو وسیع کرو اور مل کر بیٹھا کرو۔ اس طرح تمہارا اتحاد و اتفاق ہمیشہ قائم رہے گا اور دوسرے لوگوں میں تمہارا رعب زیادہ قائم رہے گا۔''

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہ کریں گے۔ صرف ایک سوال پوچھیں گے کہ کیا یہ پڑھنے کے بعد مسلمان کسی گروہی سیاست یا فرقہ بندی کے چکر میں پڑ سکتا ہے؟ اگر اس روایت پر یقین نہ آئے تو قرآن پاک کی سورۃ انعام کی آیت ۱۵۹ پڑھ لیں۔

''تحقیق، جن لوگوں نے ٹکڑے کیا دین اپنے کو اور ہو گئے گروہ گروہ، نہیں تو ان میں سے۔''

بین الاقوامی تعلقات

جناب فاروقؓ کے زمانے میں ایران کی سلطنت کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن روم کی سلطنت باقی تھی۔ ہرقل کا پوتا

قسطین تخت کا وارث ہو گیا اور اکیس ہجری کے بعد مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان جنگوں کی شدت میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ کچھ باہمی قاصد اور سفیر بھی مدینہ شریف اور قسطنطنیہ کے مابین چکر لگاتے رہے۔ شروع میں روم کے ارباب حکومت یہ سمجھتے رہے کہ عرب ملکوں کے لوگ بھوک سے تنگ آ کر اور متحد ہو کر ان پر ہلہ بول رہے ہیں۔ اور یہی بات اس ''تہذیب یافتہ'' زمانے میں جناب آرنلڈ صاحب کو نظر آئی جو اہل مغرب کے ایک عظیم دانشور مانے جاتے ہیں۔ بہرحال ہم اس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں تو روم کی سلطنت میں دوبارہ جب کچھ جان پیدا ہوئی تو انہوں نے اپنے علم کے ذریعے مسلمانوں کو مات کر دینے کی کوشش کی اور یہ کوشش گو اس زمانے میں کامیاب نہ ہوئی لیکن عباسیہ خاندان کے زمانے میں پھر شروع ہو گئی اور ہمارے اندر معتزلہ اور جبریہ و قدریہ فرقے پیدا ہو گئے اور آج کل بھی یہ سازش جاری ہے۔

بہرحال اس زمانہ میں قیصر روم نے جناب عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ ایک ایسا جامع مقولہ تحریر کریں جس میں میرے لیے بڑا علم ہو۔

جناب عمر نے جواب دیا۔ ''جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔''

اس کے بعد شاہ روم نے ایک بوتل بھیجی اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ کے ملک میں جو جو چیز موجود ہے اس کا ایک ایک نمونہ اس بوتل میں ڈال دیں۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اس بوتل میں پانی ڈال دیا اور لکھا کہ اس میں دنیا کی ہر چیز کے سب اجزا موجود ہیں۔

حق و باطل میں فرق

اس کے بعد شاہ روم کی طرف سے ایک خط آیا۔ خط میں لکھا تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو اہل حق کہتے ہیں تو ایک عام آدمی حق و باطل میں فرق کیسے محسوس کرے گا۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حق، سچ کی طرح نظر آ جاتا ہے اور باطل جھوٹ کی طرح پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح شاہ روم نے کئی اور سوالات کئے کہ آسمان اور زمین میں کتنا فاصلہ ہے تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کئی سو سالوں کی مسافت کا ذکر کیا کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے زمان و مکاں کے الفاظ میں بیان کیا جیسے دنیا آج اس بات پر پہنچی ہے کہ فلاں ستارہ یا سیارہ زمین سے اتنی روشنی کے سال دور ہے یا اتنے نوری سال دور ہے یعنی طول کو یا مسافت کو ''زماں'' سے بیان کیا جاتا ہے اور ہم چوتھی کتاب میں اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

تحفے تحائف

طبری کے مطابق روایت ہے کہ روم کی شہزادی نے جناب ام کلثوم زوجہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے ایک قیمتی ہار تحفہ کے طور پر بھیجا۔ جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے شام روم کی بیوی کے لیے کچھ خوشبوئیں اور باقی تحائف بھیجے۔ حضرت

عمرؓ مصر تھے کہ ہار زیادہ قیمتی ہے اور جو تحفے جناب ام کلثوم نے بھیجے ہیں ان سے بڑھ کر جتنی قیمت ہار کی زیادہ ہے اتنے پیسے جناب ام کلثوم بیت المال میں جمع کرائیں کہ ان کو یہ تحفہ اس لیے ملا کہ وہ مسلمان کے امیر کی زوجہ محترمہ ہیں۔
اور حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں مجلس مشاورت بھی طلب کی۔ اور سب کی رائے تھی کہ یہ معمولی بات ہے لیکن جناب عمر فاروقؓ نے حکم دیا کہ حساب کتاب اور محاسبہ ضروری ہے اور ان کے گھر بھی یہ حکم لاگو ہوگا اور آپ اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔

تبصرہ:

ہم حضرت عمرؓ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی شہادت کے دن مناتے ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے فیصلوں پر عمل کرنا بھی سیکھیں۔ اور اس پر اتنا تبصرہ ہی کافی ہے۔ لیکن علمی بحث کے سلسلے میں بڑی ضرورت ہے کہ غیروں کی سازش کے تحت ہم فضول بحثوں سے گریز کریں۔ جلال مصطفیٰ کے پیش لفظ میں ایسی ہی فضول بحثوں اور تفرقوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جناب عمر نے مختصر جواب دیئے اور اپنی طرف سے کوئی سوال نہ بھیجا۔ قرآن پاک میں حکم ہے کہ ایسے مشکل مسائل میں انہی لوگوں کو پڑنا چاہیے جو علم میں پختہ ہوں اور ہم جیسے انکل پچو والے لوگوں کے اجتہاد یا اپنی زنگ آلود فکر کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔

اجتہاد وہ کرے جس کو ضرورت ہو اور جو اس کے نتائج کا نفاذ کر سکے۔ میں گنہگار ہوں لیکن خدا کی قسم! مجھے تو آج تک اسلام میں کوئی تفرقہ نظر نہ آیا اور نہ کوئی اختلاف۔ مجھے تو اس باغ سے خوشبو ہی خوشبو آئی اور ہر چیز کا جواب قرآن پاک حضور پاک ﷺ کی سنت اور بزرگوں کے اقوال میں مل گیا اور میرے لیے اسلام کے ہزاروں بزرگ میرے سر کے تاج ہیں۔ میں تو سب کا مقلد ہوتے ہوئے بھی ایک راستے پر رہا اور ان کتابوں کے سلسلہ میں اگر قارئین کے سامنے میں نے کوئی ایک اختلافی مسئلہ پیش کیا یا تضاد بیانی سے کام لیا تو وہ اس کی نشاندہی کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ قوم خواہ مخواہ غیروں کی سازش کی وجہ سے تفرقہ میں گرفتار ہے۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

(اقبالؒ)

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی جانشینی

حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد خلیفہ اول کی جانشینی کو پہلی کتاب میں زیر بحث لایا جا چکا ہے اور جناب

صدیق اکبر ؓ نے وفات سے پہلے جناب فاروق ؓ کو نامزد کیا جس کا ذکر دوسری کتاب میں ہو چکا ہے۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ ان کے سامنے دو مثالیں موجود ہیں۔ پہلی حضور پاک ﷺ کی اور وہ اس طرح کر سکتے ہیں لیکن پیغمبر کا مقام بہت بلند ہے ان رازوں کو ہم نہیں سمجھتے کہ حضور پاک ﷺ نے سیدھی طرح جانشین کا نام کیوں نہ لیا۔ پھر جناب صدیق اکبر ؓ کی مثال موجود ہے اور میں بھی کسی کو نامزد کر سکتا ہوں لیکن میرا وہ مقام نہیں جو صدیق اکبر ؓ کا تھا۔ میں نامزدگی کے سلسلے میں غلطی کر سکتا ہوں اس لیے میں یہ کام حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقاً کے سپرد کئے جاتا ہوں جو میرے اور صدیق اکبر ؓ کے مشیر ہے۔ اس کے لیے طریق کار یہ ہوگا کہ میرا بیٹا عبداللہ ؓ اس مجلس مشاورت کا ردیف ہوگا کہ وہ مجلس مشاورت کو اکٹھا کرے گا لیکن نہ وہ خلافت کے لیے رائے دے سکے گا نہ خود اس کا امیدوار ہوگا۔

مجلس مشاورت

میں اس کام کے لیے حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقاً میں سے چھ اشخاص کو مقرر کرتا ہوں اور وہ جناب عبدالرحمٰن ؓ بن عوف، جناب عثمان ؓ بن عفان، جناب علی ؓ بن ابی طالب، جناب سعد ؓ بن ابی وقاص، جناب طلحہ بن عبیداللہ ؓ اور جناب زبیر ؓ بن عوام ہوں گے اور ان میں سے آپس میں صلاح ومشورہ کے بعد ایک صاحب کو مسلمانوں کا امیر چنا جائے گا۔ جناب طلحہ ؓ مدینہ میں موجود نہیں، ان کا دو تین دن انتظار کیا جائے گا اور اگر نہیں آتے تو پھر باقی پانچ صاحبان مل کر فیصلہ کریں گے۔ اور جب فیصلہ ہو جاتا ہے کہ فلاں امیر ہیں تو اس کے بعد جو اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا اس کا سر وہیں قلم کر دینا کہ ایسا آدمی مزید فتنہ وفساد کو نہ بڑھائے۔ ان دنوں نماز کی امامت جناب صہیب ؓ بن سنان رومی کریں گے کہ ان کا کسی کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں اور امامت کے سلسلہ میں ان دو تین دنوں میں اختلاف نہ ہو۔ آپ نے ان دو تین دنوں کے لیے فوجی امارت جناب ابوطلحہ ؓ انصاری* کے سپرد کی کہ مدینہ میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری ان کی ہوگی۔ وہ اپنے ساتھ دو سو مجاہدین کو رکھیں گے۔

وہ خود یا ان کا نمائندہ اور چند مجاہد اس جگہ پر متعین کئے جائیں گے جہاں عظیم صحابہ صلاح ومشورے میں لگے ہوں گے تاکہ کوئی اور آدمی آ کر وہاں مخل نہ ہو۔ یا کوئی اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ جناب ابوطلحہ ؓ کے مجاہد مدینہ میں امن وامان قائم رکھیں گے کہ لوگ چہ میگوئیوں سے پرہیز کریں اور کسی جگہ گروہ بندی کا مظاہرہ نہ ہو۔ جناب ابوطلحہ ؓ بیعت عقبہ ثانی میں شریک ہو چکے تھے۔ آپ بلند آواز شاعر اور بڑے بہادر تھے۔ حضور پاک ﷺ کے

* آپ جناب انس ؓ بن مالک اسلام کے عظیم فقیہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔

عمر رضی اللہ عنہ مصر تھے کہ ہار زیادہ قیمتی ہے اور جو تحفے جناب ام کلثوم نے بھیجے ہیں ان سے بڑھ کر جتنی قیمت ہار کی زیادہ ہے اتنے پیسے جناب ام کلثوم بیت المال میں جمع کرائیں کہ ان کو یہ تحفہ اس لیے ملا کہ وہ مسلمان کے امیر کی زوجہ محترمہ ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں مجلس مشاورت بھی طلب کی۔ اور سب کی رائے تھی کہ یہ معمولی بات ہے لیکن جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ حساب کتاب اور محاسبہ ضروری ہے اور ان کے گھر بھی یہ حکم لاگو ہوگا اور آپ اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔

تبصرہ:

ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی شہادت کے دن مناتے ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے فیصلوں پر عمل کرنا بھی سیکھیں۔ اور اس پر اتنا تبصرہ ہی کافی ہے۔ لیکن علمی بحث کے سلسلے میں بڑی ضرورت ہے کہ غیروں کی سازش کے تحت ہم فضول بحثوں سے گریز کریں۔ جلال مصطفیٰ کے پیش لفظ میں ایسی ہی فضول بحثوں اور تفرقوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جناب عمر نے مختصر جواب دیئے اور اپنی طرف سے کوئی سوال نہ بھیجا۔ قرآن پاک میں حکم ہے کہ ایسے مشکل مسائل میں انہی لوگوں کو پڑنا چاہیے جو علم میں پختہ ہوں اور ہم جیسے انکل پچو والے لوگوں کے اجتہاد یا اپنی زنگ آلود فکر کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔

اجتہاد وہ کرے جس کو ضرورت ہو اور جو اس کے نتائج کا نفاذ کر سکے۔ میں گنہگار ہوں لیکن خدا کی قسم! مجھے تو آج تک اسلام میں کوئی تفرقہ نظر نہ آیا اور نہ کوئی اختلاف۔ مجھے تو اس باغ سے خوشبو ہی خوشبو آئی اور ہر چیز کا جواب قرآن پاک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور بزرگوں کے اقوال میں مل گیا اور میرے لیے اسلام کے ہزاروں بزرگ میرے سر کے تاج ہیں۔ میں تو سب کا مقلد ہوتے ہوئے بھی ایک راستے پر رہا اور ان کتابوں کے سلسلہ میں اگر قارئین کے سامنے میں نے کوئی ایک اختلافی مسئلہ پیش کیا یا تضاد بیانی سے کام لیا تو وہ اس کی نشاندہی کریں۔ ظاہر ہے کہ قوم خواہ مخواہ غیروں کی سازش کی وجہ سے تفرقہ میں گرفتار ہے۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

(اقبالؒ)

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی جانشینی

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلیفہ اول کی جانشینی کو پہلی کتاب میں زیر بحث لایا جا چکا ہے اور جناب

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا جس کا ذکر دوسری کتاب میں ہو چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کے سامنے دو مثالیں موجود ہیں۔ پہلی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اور وہ اس طرح کر سکتے ہیں لیکن پیغمبر کا مقام بہت بلند ہے ان رازوں کو ہم نہیں سمجھتے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدھی طرح جانشین کا نام کیوں نہ لیا۔ پھر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مثال موجود ہے اور میں بھی کسی کو نامزد کر سکتا ہوں لیکن میرا وہ مقام نہیں جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تھا۔ میں نامزدگی کے سلسلے میں غلطی کر سکتا ہوں اس لیے میں یہ کام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم رفقاً کے سپرد کئے جاتا ہوں جو میرے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مشیر رہے۔ اس کے لیے طریق کار یہ ہوگا کہ میرا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ اس مجلس مشاورت کا ردیف ہوگا کہ وہ مجلس مشاورت کو اکٹھا کرے گا لیکن نہ وہ خلافت کے لیے رائے دے سکے گا نہ خود اس کا امیدوار ہوگا۔

مجلس مشاورت

میں اس کام کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم رفقاً میں سے چھ اشخاص کو مقرر کرتا ہوں اور وہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف، جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان، جناب علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص، جناب طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام ہوں گے اور ان میں سے آپس میں صلاح ومشورہ کے بعد ایک صاحب کو مسلمانوں کا امیر چنا جائے گا۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں موجود نہیں، ان کا دو تین دن انتظار کیا جائے گا اور اگر نہیں آتے تو پھر باقی پانچ صاحبان مل کر فیصلہ کریں گے۔ اور جب فیصلہ ہو جاتا ہے کہ فلاں امیر ہیں تو اس کے بعد جو اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا اس کا سر وہیں قلم کر دینا کہ ایسا آدمی مزید فتنہ وفساد کو نہ بڑھائے۔ ان دنوں نماز کی امامت جناب صہیب رضی اللہ عنہ بن سنان رومی کریں گے کہ ان کا کسی کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں اور امامت کے سلسلہ میں ان دو تین دنوں میں اختلاف نہ ہو۔ آپ نے ان دو تین دنوں کے لیے فوجی امارت جناب ابوطلحہ رضی اللہ عنہ انصاری* کے سپرد کی کہ مدینہ میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری ان کی ہوگی۔ وہ اپنے ساتھ دوسو مجاہدین کو رکھیں گے۔

وہ خود یا ان کا نمائندہ اور چند مجاہد اس جگہ پر متعین کئے جائیں گے جہاں عظیم صحابہ صلاح ومشورے میں لگے ہوں گے تاکہ کوئی اور آدمی آکر وہاں مخل نہ ہو۔ یا کوئی اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ جناب ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے مجاہد مدینہ میں امن وامان قائم رکھیں گے کہ لوگ چہ میگوئیوں سے پرہیز کریں اور کسی جگہ گروہ بندی کا مظاہرہ نہ ہو۔ جناب ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ ثانی میں شریک ہو چکے تھے۔ آپ بلند آواز شاعر اور بڑے بہادر تھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے

*آپ جناب انس رضی اللہ عنہ بن مالک اسلام کے عظیم فقیہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔

زمانے میں بعد میں بھی جہاد بھی شریک ہو چکے تھے۔ اور آپ اس کام کے لیے موزوں ترین تھے کہ انصار تھے اور مجلس مشاورت میں صرف مہاجرین تھے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس مشاورت کو حکم دیا کہ تین دن کے اندر اندر امارت کا فیصلہ کریں گے اور اگر نہ ایسا کریں گے تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب برابر کے جوابدہ ہوں گے کہ قوم کو تفرقہ میں ڈال دیا۔

تبصرہ:

اب ان ہدایات کو بار بار پڑھیں کہ کتنی مکمل ہیں اور ان میں کتنا فلسفہ ہے کتنی فیصلہ کن ہیں، کتنی وحدت فکر ہے اور عملی باتیں کتنی اصولی ہیں۔ ان ہدایات کی وضاحت کے لیے کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ اور ایک لفظ بھی اختلافی نہیں۔ ان ہدایات کی مطابقت میں جو روایت کہیں تاریخ میں نظر آ جائے اس کو تو ہم تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جو روایت یا کہانی ان ہدایات کی مطابقت نہیں کرتی ہم اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں اس لیے اس سلسلے میں ہمارے سامنے جو روایات آئی ہیں ان کا تجزیہ ضروری ہے تا کہ ہم روایات کے بامقصد مطالعہ یا تحقیق کے اصولوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

شکیہ روایتوں کا تجزیہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بڑے قریب تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے علم سے بھی متاثر تھے۔ کچھ مورخین نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کا نام استعمال کر کے کچھ صحابہ کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو آپ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ نامزد کرتے۔ ان صحابہ میں جناب سالم مولائے جناب ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ جناب معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل اور جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے اسماء گرامی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اول تو اس روایت پر اس وجہ سے شک پڑ جاتا ہے کہ یہ روایت جناب عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلہ میں آخری وصیت سے مطابقت نہیں رکھتی کہ آپ نے فرمایا، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جانشین نامزد نہ فرمایا، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نامزد فرمایا۔ لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا میں سے جو بہترین صحابہ اس سلسلہ میں مجھے نظر آئے ان کو یہ فرض سونپے جاتا ہوں تو نامزدگی والی روایت یہاں ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن آگے بڑھیں اور جو اسمائے گرامی زیر بحث آئے ہیں ان کے بارے میں کچھ اور معلومات کا جائزہ لیں۔

جناب سالم مولائی ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ

آپ مکی بھی ہیں مدنی بھی ہیں۔ شجرہ نسب کی تفصیل موجود نہیں سوائے اس کے کہ والد کا نام معقل تھا اور آپ اصطخر یعنی جنوبی فارس کے رہنے والے تھے اور مدینہ میں ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے غلام تھے۔ انہوں نے بچپن میں ہی

آزاد کر دیا اور آپ مکہ چلے گئے۔ وہاں جناب ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کو اپنا ولی بنالیا اور ان کی بیوی سہلہ بنت سہیل کو ماں۔ اسی دوران جناب ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے تو سالم بھی اسلام لے آئے اور بلوغت کو بھی پہنچ گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص اجازت سے جناب سہلہ نے ان کو اپنا بیٹا بنایا اور ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے متبنیٰ۔ پھر آپ نے مہاجرین کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ آپ حافظ قرآن تھے اور...... قرآن پاک کی آیات کو جلدی یاد کر لیتے تھے۔ آپ نے مکہ و مدینہ دونوں جگہوں پر کئی دفعہ ایسے عظیم صحابہ کی امامت کی جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہر جنگ میں شریک ہوئے اور جنگ یمامہ میں اپنے ولی ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ ساتھ ہی شہید ہوئے۔ جناب ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی شان کو ''جلال مصطفیٰ'' (ص ۵۹) میں بیان کیا جا چکا ہے کہ باپ عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید رضی اللہ عنہ تینوں جنگ بدر میں مارے گئے کہ کفار کے علمبردار تھے اور جناب ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں میں شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور سالم رضی اللہ عنہ دونوں سے بہت متاثر تھے کہ جناب ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے بعد میں اپنی بھتیجی اور ولید کی بیٹی کے ساتھ جناب سالم رضی اللہ عنہ کی شادی کرا دی اور اپنے خاندان کا آدمی بنا دیا۔ جب آپ شہید ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب سالم رضی اللہ عنہ بڑے اچھے حافظ اور مسلمانوں کے امام تھے۔ تو اس وجہ سے بعد میں اس کہانی میں اضافہ کر دیا گیا کہ خلافت کے لیے بھی موزوں تھے۔

جناب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ انصار تھے، اسلام کے عظیم عالم۔ دوسری کتاب میں ہم اکثر آپ کا ذکر کر چکے ہیں اور ''جلال مصطفیٰ'' میں بھی آپ کا ذکر موجود ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی جناب معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کی فراست کی تعریف فرما چکے تھے۔ جب طاعون میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ مسلمانوں کے عظیم عالم اور امام تھے۔ چنانچہ اس کہانی میں بھی بعد میں اضافہ کر دیا کہ آپ خلافت کے لیے بھی موزوں تھے۔

تبصرہ:

کسی سے متاثر ہونا الگ بات ہے لیکن امارت کے لیے مقرر کرنا الگ بات ہے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو اپنی خلافت کے زمانے میں کوئی الگ امارت بھی نہ دی۔ اس لیے ہمیں اس روایت میں شک ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کی عظمت اپنی جگہ ہے اور وفات کے بعد ویسے بھی صرف عظمت کی باتیں کرنا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور جناب بلال رضی اللہ عنہ سے بھی بہت متاثر تھے اور جناب بلال رضی اللہ عنہ کو بھیج کر جناب خالد رضی اللہ عنہ کو

امارت سے سبکدوش کیا۔ جناب بلال رضی اللہ عنہ تو اس وقت وفات پا چکے تھے لیکن جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ زندہ تھے۔ان کو جناب عمر رضی اللہ عنہ میرے آقا کہہ کر پکارتے تھے، لیکن نہ آپ کو خلافت کے لیے نامزد کیا نہ مشاورت میں آپ کی شمولیت کا ذکر کیا۔ ہم نے اس تجزیہ کی ضرورت اس لیے سمجھی ہے کہ ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے عالم نے صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر جناب سالم رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو حضرت عمر انہی کو خلیفہ مقرر کرتے اور تجزیہ اتنا بھی نہیں کیا کہ جناب سالم کون تھے۔ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام لکھ دیا۔ بہرحال ہم یہ چیز سوچ بھی نہیں سکتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ سے باہر جاتے۔ وہ تو سپہ سالاری کے لیے بھی عشرہ مبشرہ کو ترجیح دیتے تھے۔

جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے بارے میں اگر یہ کہہ دیا ہو کہ وہ ان کو نامزد کرتے تو یہ ممکنات میں سے ہے۔ آپ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بہت متاثر تھے۔ آخری وقت ان کو ملک شام سے نکالنے کی بھی کوشش کی کہ طاعون سے بچ جائیں جس کا ذکر دوسری کتاب میں ہو چکا ہے۔ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت ایک مہم میں کام کر چکے تھے۔ (''جلال مصطفیٰ''/ص ۲۳۱) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ امین الامت ہیں اور خلافت سنبھال لیں۔ تو جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صدیق رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے کوئی اور اس کا اہل نہیں۔ یہ سب کچھ پہلی کتاب میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اور ممکن ہے کہ آپ نے جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں کچھ فرما دیا ہو یا لوگوں نے پچھلے واقعات کے تانے بانے ملا کر یہ بات اپنی طرف سے کہہ دی ہو۔

ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ وہی کچھ کرتے جو انہوں نے کیا۔ آپ جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی عظمت کو سمجھتے تھے۔ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے باقی صاحبان کی عظمت کو بھی سمجھتے تھے اور جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اگر زندہ ہوتے تو ان کو بھی مشاورت میں ضرور شریک کرتے لیکن یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ آپ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے ہوتے ہوئے جناب سالم رضی اللہ عنہ یا جناب معاذ رضی اللہ عنہ کو عشرہ مبشرہ پر ترجیح دیتے، بلکہ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب عباس رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ عم رسول کی اپنی شان تھی اور جب وہ آتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو جاتے تھے اور ان پر بچھے جاتے تھے کہ چچا باپ کے برابر ہوتا ہے۔ جناب عباس رضی اللہ عنہ بھی اس وقت زندہ تھے اور مدینہ میں موجود تھے لیکن آپ نے ان کو مشاورت میں بھی شامل نہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو بھی مشاورت میں شامل نہ کیا اور نہ ہی اس کا ذکر کیا۔ وہ مدینہ سے باہر ہو سکتے ہیں لیکن جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرح ان کا ذکر تو ہو سکتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں اور آپ کی وجہ سے جناب عمر رضی اللہ عنہ اسلام میں داخل ہوئے اور

آپ ﷺ آپ اس وقت تک زندہ تھے۔ اس سب بیان میں بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم حضرت عمر ؓ کی شان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کے لحاظ سے وہی لوگ خلافت کے زیادہ مستحق تھے جن کو انہوں نے مشاورت کے لیے نامزد کیا اور ان کے لحاظ سے ان میں لاتفرق بین احد والی بات تھی تو ہمارا اصول بھی یہی ہونا چاہیے۔

مزید شکیہ روایت

اب اگر راوی انہی باتوں تک اکتفا کرتے تو شاید امت میں تفرقہ کچھ کم ہوتا۔ لیکن بعض مورخین نے حضرت عمر ؓ کے منہ میں کچھ ایسے الفاظ ڈال دیئے کہ وہ کسی کو بھی خلافت کے لیے موزوں نہ سمجھتے تھے۔ پرانے مورخین نے تو ایسی باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ باتیں اس زمانے کی تاریخوں میں موجود ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر ضروری ہے ورنہ جب یہ باتیں پرانی تاریخوں میں موجود نہیں تو دراصل ان کے بارے میں سوچنا بھی صحیح نہیں۔ بہر حال یہ روایات بھی جناب عبداللہ بن عباس ؓ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کہ انہوں نے بیماری میں جناب عمر ؓ سے متوقع خلفا کے بارے میں پوچھا کہ "کسی ایک کو نامزد کیوں نہیں کر دیتے؟" تو جناب عمر ؓ نے سوال کیا کہ "کس کو نامزد کروں؟"

"جناب عبداللہ بن عباس ؓ، سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کو۔"

جناب عمر ؓ: "وہ بڑے بہادر ہیں لیکن امن کے زمانے میں عراق کا انتظام نہ سنبھال سکے اور ان کو کوفہ کی گورنری سے سبکدوش کرنا پڑا، پورے عالم اسلام کے معاملات کو سنبھالنا ان کے لیے مشکل ہے۔"

حضرت عبداللہ ؓ: "تو پھر جناب طلحہ ؓ کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

جناب عمر ؓ: "وہ صاحب احد ہیں، ان کی شان بہت بلند ہے لیکن کسی کسی وقت ان میں حسد یا نجسلیت آ جاتی ہے اس لیے یہ نظام نہ سنبھال سکیں گے۔"

جناب عبداللہ ؓ: "جناب زبیر ؓ بن عوام کیسے رہیں گے؟"

جناب عمر ؓ: "بہت بہادر شخص ہے لیکن امارت کا تجربہ نہیں، ذاتی بہادری کی وجہ سے خود پسند ہو گئے ہیں، اس لیے کامیاب نہ ہو سکیں گے۔"

جناب عبداللہ ؓ: "حضرت عثمان ؓ کیسے رہیں گے؟"

جناب عمر ؓ: "بہت نیک، حیادار اور تقویٰ والے ہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ ان کے خاندان کے لوگ یعنی بنوامیہ حکومت پر چھا جائیں گے۔"

"جناب عبداللہ ؓ: "حضرت علی ؓ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

جناب عمر ؓ: "موزوں ترین شخص ہیں لیکن ان کے دل میں خلافت کی چاہت رہی ہے اور جس چیز کے ملنے کی چاہت

رہے جب وہ مل جائے تو اس کو نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ: "اب صرف جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ باقی رہ گئے ہیں ان کے بارے میں بھی بتا دیں۔"

جناب عمر رضی اللہ عنہ: ہاں وہ خلافت کے لیے موزوں ہیں، لیکن وہ بوڑھے ہیں ان کی عمر ان کے ساتھ اتنا وفا نہ کرے گی۔"

تبصرہ اور تجزیہ:

اوپر بیانات پڑھ کر ایک دفعہ تو انسان ان باتوں کو صحیح تسلیم کر لے گا کہ جس کسی کی یہ ذہنی اختراع تھی اس کے لفظ بڑے جچے تلے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب کی تعریف بھی کی اور ایک آدھ نقص نکال کر سب کو خلافت کے لیے موزوں نہ سمجھا اور دراصل ایسی ہی باتوں سے تفرقہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اول تو ہم ساری کہانی کو تسلیم نہیں کرتے کہ جناب عمر کسی کی غیر حاضری میں اس کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کریں جو ان کے منہ پر نہ کہہ سکیں۔ اور یہاں تقریباً سب عظیم ہستیوں کے بارے میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے منہ پر نہ کہتے۔ اس کو اسلام میں گلہ کہتے ہیں اور اس کی اجازت نہیں۔

لیکن کچھ باتیں اصل میں بھی صحیح نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے عمر میں تین یا چار برس بڑھے تھے اور جناب عبدالرحمٰن، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے تقریباً آٹھ سال بعد ۳۲ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر پچھتر برس تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ تھے اور آپ کی عمر اٹھہتر برس تھی کہ آپ چار سال بعد چھتیس ہجری میں بیاسی سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جناب عمر اگر جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بڑی عمر کا ذکر کرتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر کا ذکر بھی کرتے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی خلافت کی چاہت نہ تھی اور کئی سال بعد تاریخوں میں یہ الفاظ شامل کر کے تفرقہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باتوں سے بہت بلند تھے۔ آگے چوتھی کتاب میں اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں قرابت داری کا الزام ایک سازش کی پیداوار ہے۔ اسی کتاب کے آخری ابواب میں ہم واضح کریں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار امارت میں آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ یہ سازشیوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی خواہ مخواہ بیچ میں شامل کر کے وہ لوگ اپنی سازش کو تقویت دے رہے تھے۔ جہاں تک حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے آپ تو کبھی کسی دستہ کی کمانڈ کی خواہش بھی نہ رکھتے اور آپ کو امارت کی بالکل چاہت نہ تھی۔ اس کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے۔ یہی بات جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب سعد رضی اللہ عنہ کے لیے ہے کہ وہ صاحبان پہلے ہی دن خلیفہ بننے کی ذمہ داری سے دستبردار ہو گئے اور ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی زندگی میں ہی بتا دیا ہو، یا ایسا اعلان کر دیا ہو۔ ہم اس سلسلہ میں صرف اتنی گزارش کریں گے کہ ہمیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے

رفقاء کو اپنے پیمانوں سے نہ ناپنا چاہیے اور غیروں کے الزام کو تسلیم کرنے سے پہلے ان کی شان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بے شک ہم مشکل دور میں داخل ہو رہے ہیں لیکن امید واثق ہے کہ ہم صراط مستقیم پر ہی رہیں گے اور گمراہی سے بچ جائیں گے کہ پھر اللہ کے دربار میں عاجزی سے سر جھکا رہے ہیں۔

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

(اقبالؔ)

مجلس مشاورت کی کارروائی

اس مشکل دور کے بیانات کے ایک ایک لفظ کو سوچ کر لکھنا ہوگا کہ قوم میں وحدت فکر پیدا کرنے کی بجائے ہم خود کوئی ایسی بات نہ لکھ جائیں جس سے تفرقہ پیدا ہو۔ ہم اپنے رب سے پھر عاجزی کرتے ہیں اور اللہ کا نام لے کر قلم چلاتے ہیں۔ عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم مشاورت کے لیے اکٹھے ہوئے۔ جناب طلحہ بھی واپس آ چکے تھے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ وصیت کرنے کے بعد دو تین دن زندہ رہے۔ تو جناب طلحہ رضی اللہ عنہ نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا کہ وہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہیں گے۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ جن کو ساری عمر کسی امارت کی خواہش نہ رہی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے اور فاتح ایران جناب سعد رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں کچھ شک ہو سکتا تھا کہ شاید ان کو امارت پسند ہے وہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ پچاس فیصد معاملات باہمی مشاورت سے ایک لحظہ میں حل ہو گئے۔ اب جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے گزارش کی کہ مشاورت کی التوا کی جائے اور کچھ باہمی مشورہ کی اجازت دی جائے۔ یہ بات بھی منظور کر لی گئی۔

چنانچہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ طویل ملاقات کی اور ان سے یہ پوچھا کہ ان کو اپنی بجائے کسی اور خلیفہ بنانے کے لیے کہا جائے تو آپ کس کو خلیفہ بنانا پسند کریں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو۔ اس کے بعد جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ طویل ملاقات کی اور ان سے یہی سوال کیا تو ان کا جواب تھا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پھر اکٹھے ہوئے تو جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ لوگ اگر مجھے یہ حق دے دیں کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے جس کو میں چاہوں کہ خلیفہ منتخب کروں تو میں بھی خلافت سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی بھی منظوری دے دی اور اب اختلاف یا جانبداری والے معاملات عملی طور پر بھی ختم ہو چکے تھے۔

بعد کے کچھ مورخین نے اضافی روایات سے جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پر جانبداری کا الزام لگایا ہے۔ لیکن اگر یہ

تسلیم کرلیا جائے کہ وہ جانبدار تھے تو بات صرف ادھر تک پہنچتی ہے کہ وہ بھی جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرح جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو جاتے اور بات ادھر ہی ختم ہو جاتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے حق میں زیادہ صحابہ تھے۔ لیکن جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اس سے بلند تھے۔ وہ اسلام میں مشاورت کے لیے ایک اصول بنانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے دن رات ایک کر کے کوئی راہ نکالنا چاہی۔ بات تو سیدھی تھی۔ اختلافات اسلامی طریقہ سے ختم ہو چکے تھے، صرف فیصلہ کا اعلان کرنا تھا۔ اب مجلس مشاورت میں جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اکیلے تھے اور جناب ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ان کی حفاظت کرتے پھرتے تھے۔ جناب صہیب رضی اللہ عنہ ہی نے جناب عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھایا اور آپ مسجد میں امامت کے لیے موجود رہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی تفرقہ نہ ہو۔ لیکن جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے پاس تین دن میں سے دو دن باقی تھے۔ انہوں نے یہ دن بھی مشورے میں گزار دیئے۔

جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا عام مشورہ

اب جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے عام لوگوں، واقفوں، مدبروں اور خاص کر اول اسلام لانے والے صحابہ کرام سے جا کر مشورہ شروع کر دیا۔ لیکن جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہ گئی کہ زیادہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے حق میں تھے اور چند لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بات کی تہ میں جانا چاہا تو ان کو پتہ چلا کہ لوگ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں بھی شروع میں خوش نہ تھے اور انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی تھی کہ اتنے سخت انسان کو خلیفہ کیوں بنایا جا رہا ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ڈر قائم رہا اور دولت کی ریل پیل جب ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی سختیاں کیں۔ صحابہ کرام کو باہر زمینیں نہ خریدنے دیں۔ محاسبہ بڑا سخت تھا۔ اب لوگ سوچتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح سختی کریں گے۔ لیکن ان کو امید تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اتنی سختی نہ کریں گے۔ گو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی غصہ تو بالکل نہ آتا تھا اور ان کے اندر حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی سختی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ردعمل کے طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کو زیادہ "آزادی" ہو گی۔ قارئین اس لفظ "آزادی" کو یاد رکھیں کہ لوگوں کی خواہش تھی اور لوگوں کی خواہش والی بات بھی یاد رکھنا کہ اس میں تبدیلیاں کتنی زیادہ آتی ہیں اور جناب علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں بھی یاد رکھنا کہ وہ ان باتوں سے بلند تھے۔

جناب عبدالرحمٰن کی سوچ

اب جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ گہری سوچ میں پڑ گئے۔ وہ خلیفہ نامزد کرنے کی ذمہ داری اٹھا چکے تھے اور ظاہر ہے کہ اپنی دستبرداری کے بعد ان کو خیال تھا کہ ان کے اس رویہ پر کوئی انگلی نہ اٹھائے گا۔ لیکن عوام کے ساتھ جب انہوں نے مشورہ

کیا تو انہوں نے بھانت بھانت کی بولیاں سنیں کہ خبردار یہ نہ کرنا اور وہ نہ کرنا اور اگر ایسے کرو گے تو یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ عوام کے ان خیالات سے کچھ خواص بھی متاثر ہو چکے تھے اور اس سلسلہ میں کچھ عجیب روایات نظر سے گزرتی ہیں۔ اور لوگوں کے خیالات میں تبدیلی اتنی جلدی آ جاتی تھیں کہ کوئی ایک کسی ایک بات پر قائم نہ رہتا تھا ادھر وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا اور اگر زیادہ دیر ہوتی تو تفرقہ اور بڑھ جاتا اس لیے جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ایک اعلان کرنے کی سوجھی۔

جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا اعلان

چنانچہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ خلیفہ اس کو تسلیم کریں گے جو اللہ کے احکام، حضور پاک ﷺ کی سنت اور پہلے خلفاء راشدین کے طریق کار کا سختی سے نفاذ کرے گا۔ اور جناب علی رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا کہ آیا وہ یہ وعدہ کرتے ہیں تو جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک اللہ کے احکام اور حضور پاک ﷺ کی سنت پر سختی سے عمل کیا جائے گا لیکن حکومت چلانے کا طریق کار ان کا اپنا ہوگا۔ پھر آپ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ بے شک وہ اللہ کے احکام، حضور پاک ﷺ کی سنت اور پہلے دو خلفاء راشدین کے طریق کار پر سختی سے عمل پیرا ہوں گے۔ یہ سننے کے بعد جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ وہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کو مسلمانوں کا امیر منتخب کرتے ہیں اور ان کی بیعت کرتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت مجلس شوریٰ کے تمام ارکان نے حضرت عثمان کی بیعت کی۔ اور پھر تمام مسلمانوں نے بیعت کی اور یہ متفقہ فیصلہ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دس سال اسلامی عہد کے زریں ترین سال مانے جاتے ہیں۔ نہ کوئی تفرقہ تھا، نہ کوئی اختلاف۔ جہاد جاری رہا اور عظیم صحابہ اور ان کے عظیم فرزندوں نے جہاد میں شرکت کی۔ جس کا ذکر آگے آئے گا لیکن بعد میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے اس طریق کار کو اور جو کچھ ہوا اختلاف کا سبب بنا کر پیش کیا گیا، اس لیے ان اختلافی نکتوں کا جائزہ ضروری ہے۔

اختلافی نکتوں کا جائزہ

ایک نکتہ یہ سامنے لایا گیا کہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو پتہ تھا کہ جناب علی کو پہلے خلفائے راشدین کے کچھ طریقوں سے اختلاف تھا اس لیے انہوں نے اللہ کے احکام اور سنت کے ساتھ پہلے خلفائے راشدین کے طریق کار کو بھی شامل کر دیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف یہ گزارش کریں گے کہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ویسے بھی یہ اعلان کر سکتے تھے کہ وہ فلاں کو خلیفہ نامزد کر رہے ہیں تو یہ نکتہ ساتھ شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی جناب علی رضی اللہ عنہ کو پہلے دو خلفائے راشدین کے طریق کار سے

اختلاف تھا۔تو یادرکھنے والی بات یہ ہے کہ طریق کار اصول نہیں ہوتے۔ یہ وقتی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ان چیزوں یا طریقوں کوحضور پاک ﷺ کی سنت کے برابر نہیں سمجھا جاسکتا کہ حضور پاک ﷺ کامل تھے، جناب علی جوعلم کے شہر کے دروازے تھے وہ معاملات پر بہت گہری نظر رکھتے تھے ان کی دوررس نگاہیں بھانپ چکی تھیں کہ حضور پاک ﷺ کے بعد کے طریق کار کو اصول نہیں بنایا جاسکتا اس لیے وہ کوئی ایسا وعدہ کرنے کو تیار نہ تھے جس کا نباہ نہ ہو سکے یا جس کو آگے چلایا نہ جاسکے۔اسلام اللہ کے احکام اور حضور پاک ﷺ کی سنت تک محدود ہے، آگے صرف ان احکام کے مطابق اعمال کی تقلید کی جاسکتی ہے۔

تو پھر کیا حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ان طریق کار کو لازم شرط نہیں بنانا چاہیے تھا یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسا وعدہ نہیں کرنا چاہیے تھا جس کا نباہ مشکل یا عملی نہ ہو؟ نہیں، یہ بات سوچ کی ہے۔ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو پہلے خلفائے راشدین کے طریق کار میں کوئی غلط بات نظر نہ آئی اور اس لیے جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی سوچ میں بھی یہ لفظ آ گئے اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے ان پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کرلیا۔اور بات یہاں ختم ہو جانی چاہیے۔ ہمارے لحاظ سے چار یاروں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عظمت اس میں بھی ہے کہ آپ کی بیٹیوں کو بھی ام المومنین کے عظیم نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی عظمت اس میں ہے کہ آپ کو اللہ کے حبیب ﷺ کے داماد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بے شک اسلام میں عظمت اور شان ذاتی کردار کی طفیل ہوتی ہے اور یہاں قرابت داری کا اصول نہیں چلتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت بھی عم رسول جناب عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ زندہ تھے اور اگر اس وقت کے چناؤ کو امیہ کی سازش قرار دیا جائے تو اس وقت جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب بھی زندہ تھے۔ وہ اپنے لیے کچھ کرتے تو جناب صدیق، جناب فاروق، جناب عثمان اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی عظمت وکردار پر جب کوئی بات کی جائے تو یہ پہلو ضرور یادرکھا جائے کہ سرکار دوعالم اور ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بھی آپ کے ساتھ یہ رشتہ داری اور قرابت داری قائم کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جہاد

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ہم پھر سلام عرض کرتے ہیں کہ آپ کو بھی روضہ پاک میں لیٹنے کی سعادت نصیب ہوئی اور یکم محرم ۲۴ ہجری کو آپ کو دفنایا گیا۔ ۳ محرم ۲۴ ہجری کو جناب عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امیر بن گئے۔ جناب فاروق کی عظمت کو کوئی قلم بیان نہیں کرسکتا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بعض دفعہ وہ زمان ومکاں پر بھی حاوی ہو جاتے تھے کہ مسجد نبوی میں کھڑے خطبہ دیتے ہوئے ایک دفعہ اچانک فرمایا۔ یا ساریہ الی الجبل۔لوگ یہ بات سن کر حیران رہ گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ شمالی ایران میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہو رہی تھی جہاں مسلمانوں کا امیر

سار یہ تھا، آپ اس کو ہدایات دے رہے تھے کہ پہاڑی کی اوٹ کی طرف دیکھ۔ بعد میں اس جگہ کے اہل لشکر نے بتایا کہ انہوں نے فضا میں عجیب وغریب آواز سنی تو چوکنے ہو گئے کہ پہاڑ کی اوٹ میں دشمن تھا۔

یہ روایت کہ حضرت عمرؓ نماز میں کئی دفعہ بھول جاتے تھے کہ نماز پڑھتے وقت بھی ان کے ذہن میں جہاد اور جنگ ہوتا تھا اور ایسے ہی کسی خیال میں خطبہ دیتے وقت زمان ومکاں پر حاوی ہوتے ہوئے ایک لحظہ کے لیے شمالی ایران پہنچ گئے۔ یہ اللہ کی دین اور عطا ہے اور زمان ومکاں پر حاوی ہونے والا معاملہ وقتی عطا ہوتی ہے، جس کو اب موجودہ سائنس نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ ہر انسان ہر وقت ہر جگہ موجود ہے۔ اگر ٹیلی ویژن کے آلے یہ تماشا دکھا سکتے ہیں تو روحانی طور پر بھی ایسے کام ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بہت وسیع مضمون ہے، ہم زور نہ دیں گے کہ ہر آدمی اس نکتہ کو تسلیم کرلے۔ ہمارے ایک مسلمان تاریخ کے طالب علم اور مصنف اس روایت کو اس وجہ سے تسلیم نہیں کرتے کہ اگر ایسا ہوتا تو جناب فاروق اعظم کو فیروز ابولولو بہت پہلے نظر آجاتا اور وہ آپ پر وار نہ کر سکتا۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے۔ کیا خبر حضرت عمرؓ دیکھ رہے ہوں اور مشیت ایزدی کے آگے خاموش رہے ہوں۔ یا زمان ومکاں پر انسان اگر ہر وقت حاوی رہے تو اس دنیا میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ وقتی نظارے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کو دکھاتا ہے سائنس بھی ہے۔ البتہ اسلامی روحانیت شریعت کے تابع ہے۔

نتائج واسباق

یہ باب ہمارے لحاظ سے بڑا اہم ہے لیکن صرف ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اکثر تجزیے ساتھ ہی پیش کر دیئے گئے ہیں لیکن ایک نکتہ کو یاد رکھیں۔ جناب صدیقؓ کی خلافت میں ہی ظاہر ہو گیا تھا کہ آپ کے جانشین عمر فاروقؓ ہی ہوں گے کہ آپ مکمل طور پر نائب امیر یا نائب خلیفہ کا کام کرتے تھے لیکن جناب فاروق نے اپنی خلافت میں یہ بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان کا نائب کون ہے یا ان کی ترجیحات کیا ہیں۔ آپ کے ردیف یا بڑے منشی جناب عثمانؓ تھے۔ جب مدینہ سے باہر جاتے تو حضرت علیؓ کو جانشین بنا کر چھوڑ جاتے۔ شام گئے تو جناب عبدالرحمٰن بن عوف کو ساتھ لے گئے کہ مشورہ کی ضرورت پڑے تو وہ بھی ساتھ ہوں۔ شام کو فتح کرنے کے لیے عشرہ مبشرہ سے جناب ابو عبیدہؓ کو مقرر فرمایا تو ایران کی فتح کے لیے عشرہ مبشرہ سے جناب سعدؓ بن ابی وقاص کو مقرر کیا۔ مصر کی فتح کے لیے عشرہ مبشرہ سے جناب زبیرؓ کو مقرر کرنے کی پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے وہاں امارت کے بغیر جانے کو ترجیح دی۔ ظاہر ہے کہ جناب عمرؓ کسی اور کو عشرہ مبشرہ پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ اور عشرہ مبشرہ کے بارے میں ان کا رویہ یہ تھا کہ **لا نفرق بين احد** ...... کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ اور طبقات ابن سعد میں جناب علیؓ خود اس روایت کے راوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو ذکر کیا ہے کہ وہ بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے، یہ آیت ہمارے لیے ہے۔

۲۔ حضور پاک ﷺ کے رفقا کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ وقتی طور پر ایک دوسرے کو سخت بات کہہ دیتے تھے لیکن کوئی بات دل میں نہ رکھتے تھے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو کوفہ کی امارت سے سبکدوش کیا لیکن خلافت کے لیے مشاورت میں جناب سعد رضی اللہ عنہ کو بھی اسی طرح شامل کیا جس طرح دوسرے عشرہ مبشرہ کے ارکان کو کیا۔

۳۔ جناب فاروق کسی بات کا فیصلہ نہ کرتے تھے جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ نہ کر لیتے۔ اور اکثر آپ کے یہ الفاظ ہوتے۔ ''اے ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ! اللہ کا شکر ہے کہ آپ آ گئے اور یہ رائے دی ورنہ میں کوئی غلطی کر جاتا۔''

۴۔ زخمی حالت میں جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جب آپ کی عیادت کے لیے گئے تو فرمایا کہ دونوں مہربانی فرما کر ان کی چارپائی کے اوپر بیٹھیں۔ پھر فرمایا، میری وفات قریب آ گئی ہے اور حساب کتاب کا ڈر ہے۔ تو جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اے امیر المومنین! آپ کیوں فکر مند ہیں، آپ کا اسلام تھا تو نصرت تھی، امامت تھی تو فتح تھی۔ واللہ آپ کی امارت نے روئے زمین کو عدل سے بھر دیا۔ کوئی دو فریق جھگڑا کرتے تو آپ کے فیصلہ پر بہ رضا و رغبت اپنا جھگڑا ختم کر دیتے۔'' یہ سن کر فرمایا۔ ''مجھے بٹھا دو۔'' جب بیٹھ گئے تو فرمایا۔ ''اے ابن عباس! اپنی اس گفتگو کا میرے سامنے پھر اعادہ کرو۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اعادہ کیا تو فرمایا۔ ''اے ابن عباس! روز قیامت کو اسی طرح اللہ کے سامنے شہادت دینا''

۵۔ لڑکے کھیل رہے تھے، جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کے منہ سے نکل گیا کہ سب لوگ میرے نانا کے غلام ہیں۔ لڑکوں میں جناب عمر رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے بھی تھے۔ انہوں نے جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آگے ذکر کیا تو فرمانے لگے۔ بیٹا دوڑ کر جاؤ امام حسین رضی اللہ عنہ سے لکھوا کر لاؤ کہ عمر رضی اللہ عنہ اور اس کی اولاد، حسین کے نانا کی غلام ہے، روز قیامت کو اسی لکھائی کو اپنی اور اپنی اولاد کی بخشش کے لیے پیش کروں گا۔

۶۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی کہانی پہلی اور دوسری کتاب میں بھی تھی اور جگہ جگہ تبصرے ہو چکے ہیں لیکن یہ چند الفاظ لکھنے میں ایک مقصد تھا کہ یہ تو رواج بن گیا ہے کہ ہر سال ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ایک سانحہ عظیم بنا کر پیش کرتے ہیں اور اوپر لکھی ہوئی اس قسم کی باتیں بھی اخباروں میں شائع کرتے ہیں اور تقریروں میں بھی ذکر کرتے ہیں لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ ان باتوں پر عمل پیرا ہونے کی کوئی راہ نکالیں اور جن چیزوں کی انہوں نے عملی طور پر نشاندہی کی ہے ان کو اجتماعی طور پر اپنائیں، کچھ وعدے کریں، کچھ وعدوں کا پاس کریں، محاسبے کریں، تاکہ کوئی فائدہ بھی ہو۔

۷۔ موت ایک دروازہ ہے اور حضور پاک ﷺ کے فرمان کے مطابق موت مومن کو تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور علامہ اقبال فرماتے ہیں ''چوں مرگ آید۔ تبسم برلب اوست'' بے شک وقتی طور پر کسی بھی موت کو سانحہ کہہ سکتے ہیں کہ

ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ قربت داروں کو رنج ہوتا ہے لیکن اسلام کا قافلہ اس دنیا میں رواں دواں ہے۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جب یہ خلا پیدا ہو تو اس کو پر کرنے کی کوشش کی جائے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کچھ طریق کار مقرر کئے اور عملی طور پر حضور پاک ﷺ کے احکام کو اپنے اوپر نافذ کیا۔ ہمارے سامنے بہار بالنفس کی مثال پیش کی۔ حق و باطل کی پہچان کی مثال پیش کی۔ اجتماعی زندگی اور جہاد کی مثال پیش کی اور پھر امارت کا ایک نمونہ پیش کیا۔ بے شک روز قیامت آپ رضی اللہ عنہ کو اس امت کی مثالی شخصیت کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ لیکن ہمیں تو نتائج اور اسباق کی ضرورت ہے کہ ہم بھی اسی قسم کی زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔

۸۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتوحات بہت ہوئیں، لکن یہ سلسلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی جاری رہا اور اگلے ابواب میں ان کا ذکر ہوگا۔ اصلی چیز فلسفہ حیات ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زور اسی پر تھا کہ پہلے اسلامی فلسفہ حیات کو صحیح طور پر اپناؤ اور پھر آگے بڑھو۔ اس لیے ہمارے لیے چند اسباق ضروری ہیں جو ہم کو سیکھنے چاہئیں اور ان کا ذکر حسب ذیل ہے۔

الف: اسلام اللہ کی آمریت ہے۔ اللہ کی آمریت کو جاری و ساری کرنے کے لیے ایک ''اُولوالامر'' کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی وضاحت چوتھی کتاب میں ہے۔

ب: یہ ''اُولوالامر'' خود اَطِیْعُوا اللهَ وَاَطِیْعُو الرَّسُوْلَ کا نمونہ ہو۔ اس لیے ہر آدمی مسلمانوں کا امیر نہیں ہوسکتا۔ ہر سطح پر امیر کے لیے اللہ اور رسول ﷺ کی عملی اطاعت فرض ہے۔ زبانی تو ہم سب کہیں گے لیکن اگر ہم اسلام کے فلسفہ حیات کو سمجھے ہی نہیں تو عمل تو دور کی بات ہے۔ مگر یہاں پر غیروں کے فلسفے کا پرچار کرنے والے بھی ہمارے امیر بننا چاہتے ہیں۔ اس رجحان کو ختم کرنا ہوگا۔ اسلامی فلسفہ حیات کا مکمل بیان بھی چوتھی کتاب میں ہے۔

ج: اسلام میں اختلافات کو بازاروں میں لے جانے کا حکم نہیں۔ چھوٹی سطح کے اختلافات مسجدوں میں طے ہوتے ہیں کہ امام ہر محلّہ کا امیر ہوتا ہے۔ آگے جو اختلاف ہیں تو اس کو مجلس شوریٰ طے کرتی ہے نہ کہ وہ سیاسی گروہ جو غیروں کے فلسفہ کی پیداوار ہیں۔

د: ضرورت اس چیز کی ہے کہ پوری قوم کے لیے ایک لائحہ عمل بنایا جائے جس میں ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کی نشان دہی کی جائے کہ کون سی چیز اسلامی ہے اور کون سی غیر اسلامی۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایسے انتخابات کرائیں جو قوم میں تفرقہ ڈالیں تو وہ انتخابات غیر اسلامی ہیں۔ مکمل سفارشات چوتھی کتاب میں ہیں۔

ر: اب کئی لوگوں نے عوام کو اللہ کا شریک بنا دیا ہے اور پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بجائے یہ لیا جاتا ہے کہ ''پاکستان کی تقدیر...... بےنظیر'' ایسے غیر اسلامی نعرے لگانے والے لوگوں کی پاکستان میں کوئی جگہ

نہیں ہونی چاہیے۔

س: عملی طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے کا نظام تب ہی نافذ کیا جا سکتا ہے کہ پوری قوم کو رابطوں میں باندھ دیا جائے اور اسلامی فلسفہ حیات کی نشان دہی کر کے اس پر ساری قوم اجتماعی شکل میں عمل پیرا ہو۔

ص: ایسا کام آج کل کے زمانے میں زیادہ آسان ہے۔ ذرائع آمدورفت تیز ہیں اور ذرائع ابلاغ کی مدد یا ہدایات جلدی جلدی جاری کر کے پوری قوم کو زیادہ آسانی کے ساتھ رابطوں میں باندھا جا سکتا ہے۔

ض: اسباق بے حساب ہیں لیکن اب ہم جناب عثمانؓ کے زمانے میں داخل ہو رہے ہیں۔ جناب عثمانؓ اور آپ کے رفقاء نے بھی وہی کچھ کیا جو حضرت عمر کے زمانے میں ہوتا رہا۔ لیکن جناب عثمانؓ نے حضرت عمرؓ والا دبدبہ استعمال نہ کیا۔ جب ہم اس کتاب کے آخر میں پہنچیں گے تو قارئین خود اندازہ لگائیں کہ حالات میں کتنی تبدیلی آ گئی۔

ط: معاملات اتنے آسان نہیں اور اس کتاب میں کسی مکمل نظام حیات یا نظام سلطنت کی نشاندہی کرنا، ناممکن ہے۔ موجودہ آغا خان کے دادا مرحوم آغا خان نے ۱۹۵۰ء میں ہمیں ہوشیار کیا تھا کہ ہم لوگ پہلے سو سال کے اسلام کو تلاش کریں اور اس سے سبق سیکھ کر اپنی زندگی پاکستان میں اس زمانے کی طرح بنالیں۔ چنانچہ ان کتابوں کے لکھنے میں ایک یہی مقصد ہے کہ پہلے سو سالوں کی عملی اسلام یا خلافت راشدہ کے زمانے کے عملی پہلوؤں پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں ان کو ہٹا دیا جائے۔

ظ: ہمارے ہاں وعظ بھی بہت ہوتے ہیں۔ تبلیغ بھی کافی ہے اور عمل کے بارے میں بھی کافی باتیں ہوتی ہیں لیکن عملی نفاذ کس طرح کیا جائے۔ یہاں آ کر بات رک جاتی ہے۔ ہمارے لحاظ سے عملی نفاذ کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ پوری قوم کو اللہ کی فوج بنا دیا جائے۔ یہ کام صرف قانون کے نفاذ سے نہ ہوگا۔ قانون میں ضابطے ہوتے ہیں لیکن ان کو نافذ کرنے کے لیے کسی نظام کی ضرورت ہوتی ہے اس کو نظام اسلام کہیں یا نظام مصطفیٰ یا نظام جہاد، بات ایک ہے۔ قوم کو نظام میں باندھ کر رواں دواں کرنا ہوگا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

❖❖❖

چوتھا باب

افریقہ کی مزید فتوحات

ابتدائیہ

جب ہم افریقہ کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے موجودہ براعظم افریقہ نہیں اس زمانے میں موجودہ شمالی افریقہ کو ہی سارا افریقہ سمجھا جاتا تھا یعنی افریقہ کے جو ملک مشرق میں مصر سے لے کر مغرب میں مراکو تک بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہیں، یہی افریقہ کے ملک تھے۔ پھر کسی نے مصر کو شامل کر کے مغرب تک تنجیر کے علاقے کو افریقہ کا نام دیا اور کسی نے موجودہ لیبیا سے لے کر مراکو تک کے علاقے کو افریقہ کہا۔ اس زمانے میں موجودہ سوڈان، چڈ، مالی یا مغربی افریقہ کے ممالک گھانا، نائیجریا یا اردگرد کے دوسرے چھوٹے ملک اتنے مشہور نہ تھے۔ طلوع اسلام کے وقت مصر کو چھوڑ کر سنڈی برانی، یا برقہ سے آگے تمام شمالی افریقہ کو افریقہ کہتے تھے۔ روایت ہے کہ مصر بن بسر بن ہام بن نوح کے دوسرے بھائی فریق نے، افریقہ کے ان علاقوں کو آباد کیا۔ ویسے افریقہ کی پرانی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سارے صحرائی علاقے کسی زمانے میں بہت آباد تھے اور یورپ یا ایشیا کے لوگ جن کو یوریشین کہا جاتا ہے، وہ اکثر شمالی افریقہ کے ساحل پر جا کر آباد ہوتے رہے اور وہاں کے باشندوں کو جنوب کی طرف دھکیلتے رہے۔

اس سلسلے کی کچھ وضاحتیں آگے آئیں گی۔ لیکن معاملات کچھ اسی طرح چلتے رہے جس طرح آریہ قوم شمالی ہند میں آ کر آباد ہوتی رہی اور اصلی باشندوں کو جنوب کی طرف دھکیلتی رہی اور وہ پھر دراوڑ بن گئے جو آج کل مدراس میں آباد ہیں۔ اسی طرح شمالی افریقہ کے لوگوں کو جب جنوب کی طرف دھکیلا گیا تو وہ حبشی بن گئے۔ تاریخی ثبوت موجود ہیں کہ لیبیا یا طرابلس کے لوگ بھی شام اور اناطولیہ سے گئے اور اسی طرح جن لوگوں نے موجودہ ٹیونس میں کارتھیج کے شہر کو آباد کیا اور کسی زمانے میں دنیا کی حکومت کے لیے وہ اہل روم کے ساتھ ٹکر لیتے رہے وہ بھی فناکسی تھے اور موجودہ ترکی کے ساحلی علاقوں یعنی اناطولیہ وغیرہ سے نکل کر وہاں آباد ہو گئے تھے۔

سکندریہ کی دوسری جنگ

اس ابتدائیہ کے بعد ہم دوسرے باب میں واپس جاتے ہیں۔ جہاں ہم نے مصر اور سکندریہ کی فتح کہ کہانی ختم

کی تھی۔ سکندریہ کی فتح کو قائم رکھنے کے لیے بھی بڑی تیاری اور کارروائیوں کی ضرورت تھی چنانچہ سکندریہ کی فتح کے اڑھائی سال بعد جب حضرت عمرؓ نے وفات پائی تو قسطنطنیہ کے حالات کچھ بہتر ہو چکے تھے۔ اہل روم کے لیے سکندریہ کی بڑی اہمیت تھی۔ سکندریہ کو کھو دینے کے بعد ان کا ایشیا اور افریقہ سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ نوجوان قیصر روم اور ہرقل کے پوتے شاہ قسطنطین نے سکندریہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی اور بھاری تعداد میں فوج، بحری جہازوں پر سوار کر کے بھیجی تا کہ سکندریہ پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو مصر سے نکال دیا جائے۔

اس فوج کے رومی کمانڈر کو مسلمان مورخ منوئیل خصی کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی (Manual The Eunch) مصر کے گورنر جناب عمروؓ بن عاص تھے اور ان کا قیام فسطاط میں تھا۔ نیچے والے مصر، جس کو سعید بھی کہتے تھے اور سکندریہ کا علاقہ اس میں شامل تھا، اس کے والی عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح تھے۔ عبداللہ اولین مسلمانوں میں سے تھے اور حضرت عثمان غنیؓ کے رضائی بھائی تھے، لیکن بعد میں مرتد ہو گئے۔ فتح مکہ کے وقت ان کا نام بھی ان لوگوں میں شامل تھا جن کے لیے قتل کا حکم تھا، لیکن جناب عثمانؓ کی سفارش پر ہمارے آقا اور رحمۃ للعالمین ﷺ نے انہیں معاف کر دیا اور جناب عبداللہ دوبارہ اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے۔ کچھ مورخین نے اختصار کے لیے آپ کو صرف عبداللہ بن سعد لکھا ہے اور کچھ نے دادا کے نام سے صرف عبداللہ بن ابی سرح لکھا کہ وہ بھی آپ کو اکثر ابن ابی سرح پکارتے تھے اس لیے ہم بھی عبداللہ بن ابی سرح ہی لکھیں گے۔

اہل روم نے ۲۴ ہجری کے موسم خزاں میں سکندریہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ہم اس جنگ کو سکندریہ کی دوسری جنگ کا نام اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ ہمارے کئی مورخین نے پہلی کارروائی کے کچھ واقعات دوسری کارروائی میں ملا دیئے ہیں جس سے پوری کہانی گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ معاملات بالکل صاف ہیں۔ یرموک کی وادی کی جنگوں کی طرح یہاں پر بھی کچھ مورخین اور مبصرین نے معاملات میں گہرا غوطہ نہیں لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اگر سکندریہ کی پہلی فتح یا جنگ کو دوسرے باب میں بیان کیا ہے تو یہاں واقعات کو ایک الگ اور چوتھے باب میں بیان کر رہے ہیں۔

غلط فہمیاں

ایک غلط فہمی مقوقس کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ سائرس الگ آدمی تھا اور وہ یونانی گرجا کا پیرو عیسائی تھا اور مقوقس الگ آدمی تھا۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ ایک ہی آدمی کو اہل روم سائرس کہتے تھے اور ہم مقوقس۔ ہمارے اپنے اور متعدد مورخین کی یہی رائے ہے کہ وہ یونانی گرجا کا پیرو تھا اور آرمینیا کا رہنے والا تھا بعد میں اس پر حقیقت پسندی وارد ہو گئی اور مسلمانوں کے ساتھ حالات کے مطابق پیش آیا۔ اس نے سکندریہ کی دونوں جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ میانہ روی برتی۔ لیکن کچھ مبصرین نے اس کو سکندریہ کی دوسری جنگ سے پہلے ہی مرنے والوں میں

دکھا دیا۔ اس لیے سکندریہ کی دوسری جنگ میں مقوقس کے رویہ کو پہلی جنگ کا حصہ بنا دیا۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ اکثر مسلمان مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالتے ہی جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو مصر کی گورنری سے سبکدوش کر دیا اور ان کی جگہ عبداللہ بن ابی سرح کو مصر کا عامل مقرر کر دیا۔ عبداللہ کی گورنری کے زمانے میں اہل روم نے سکندریہ پر قبضہ کر لیا تو جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے حالات سے مجبور ہو کر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو دوبارہ مصر کا گورنر بنایا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے سکندریہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ لیکن اس فتح کے جلد بعد عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو ہٹا کر عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ مصر کا گورنر بنا دیا۔ بہر حال کہانی کو جان بوجھ کر ایسی شکل دی گئی کیونکہ سکندریہ کی دوسری جنگ کے بعد عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو ضرور تبدیل کر دیا گیا تھا اور پوری کہانی آگے آئے گی۔ لیکن پہلے جب رومیوں نے سکندریہ پر حملہ کیا تو اس وقت جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ہی مصر کے گورنر تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ نچلے علاقوں کی ذمہ داری عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کی تھی اور سکندریہ ان کی عمل داری میں آتا تھا اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سارے مصر کے حاکم تھے اور وہ اس وقت فسطاط میں تھے۔

اس کہانی کو یہ شکل بعد کے فتنہ پردازوں نے دی اور وہ اس وجہ سے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگانا چاہتے تھے کہ وہ مشکل وقت میں تو قابل لوگوں کو استعمال کر لیتے تھے لیکن عام حالات اور امن کے زمانے میں حاکمیت اپنے رشتہ داروں کو دے دیتے تھے۔ اصل میں یہ ساری سازش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ کھڑا کرنے کے سلسلے میں تھی اور قارئین یہ اصول یاد رکھیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہدف بنانے کا مقصد اسلام کے مرکز پر وار کرنا تھا۔ طبری نے سیف کی روایت سے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو سال تک یا کم از کم ایک سال تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر شدہ عاملوں میں سے کسی کو بھی تبدیل نہ کیا۔ اور مغربی مورخین میں بٹلر سمیت اکثر مورخین اس چیز کے قائل ہیں کہ جب رومیوں نے سکندریہ پر حملہ کیا تو عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص فسطاط میں موجود تھے اور آگے واقعات کے ذریعے بھی ہم ثابت کریں گے کہ اگر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اس زمانے میں فسطاط کی جگہ مدینہ شریف یا کسی اور جگہ ہوتے تو آپ اتنی جلدی منویل خصی کے لشکر کو نکیوس یا نخیوس کے مقام پر نہ روک سکتے۔

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح مصر یا شمالی مغربی مصر کے گورنر تھے۔ دراصل آپ کی ذمہ داری بحری علاقوں سے ٹیکس وصول کرنا تھی۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آپ کی ذہانت دیکھ کر آپ کو اس کام پر لگایا اور ساتھ ہی کچھ انتظامی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکندریہ کے علاقے میں صرف حفاظتی فوج رکھی جائے۔ کیونکہ آپ نے جب سکندریہ کی باتیں سنیں تو آپ اس قسم کی بین الاقوامی تہذیب والے شہر سے مجاہدین کو دور رکھنا چاہتے تھے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ہی سارے مصر کے سپہ سالار اعظم اور فوجی گورنر تھے۔ جناب

عبداللہ رضی اللہ عنہ کی وہ پوزیشن تھی جو ملک شام میں حمص یا انطا کیہ وغیرہ کے عاملوں کی تھی اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی مصر میں وہی پوزیشن تھی جو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی شام میں تھی۔

بے شک سکندریہ کے بحری دفاع کے سلسلے میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ یا جو فوجی وہاں پر موجود تھے وہ اتنے چوکنے نہ تھے، شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کی وجہ سے ہر محاذ پر لوگ کچھ ستانے لگ گئے تھے۔ لیکن دراصل یہ ستانے والا چکر جناب عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا اور آپ کے وہ خط، جو دوسرے باب میں ہیں یا اور محاذوں کے امرأ کو لکھے اور ان کا ذکر پہلی اور دوسری کتابوں میں ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مجاہدین فتوحات کے بعد کچھ آرام طلب ہو رہے تھے۔

سکندریہ کے سلسلے میں کچھ مجبوریاں بھی تھیں۔ مسلمان افریقہ میں برقہ اور اس کے مغرب تک جا چکے تھے۔ رومی بحری بیڑہ جنوب کی طرف کوئی کمک نہیں بھیجتا تھا۔ ہر جگہ مسلمان اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند کر چکے تھے۔ مسلمان یہ توقع بھی نہ کر سکتے تھے کہ اہل روم سمندر کے راستے مصر کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کریں گے جس قوم کو وہ خشکی سے دھکیل چکے تھے اور مصر کے لوگ رومیوں کے چلے جانے پر اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے تو ان کی مصر میں دوبارہ آنے کی توقع کم ہی تھی۔ پھر مسلمان اس وقت تک کوئی بحری طاقت بھی نہ بنے تھے۔ وہ سمندر کے بارے میں بے خبر تھے، اس لیے رومیوں کی سکندریہ پر حملے کی کارروائی ان کے لیے ایک حیران کن کارروائی ضرور تھی۔

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات

رومیوں کا سکندریہ پر قبضہ کرنا اور وہاں سے آگے پیش قدمی کر کے نقیوس تک پہنچ جانا، ایسے واقعات تھے جو مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرے۔ اس لیے سب مورخین نے اس پسپائی اور شکست کی ذمہ داری جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے سر تھوپ دی۔ حالانکہ اس سے پہلے ایران وعراق کے محاذ پر ایک دفعہ اور شام کے محاذ پر دو دفعہ پسپائی اختیار کی گئی جس کی تفصیل پہلی دو کتابوں میں موجود ہے لیکن وہ حکمت عملی کی پسپائی تھی اور یہاں پر حیران کن کارروائی کے سامنے مسلمانوں نے سکندریہ کو بغیر کسی تجویز کے چھوڑ دیا کہ وہ سمندر کے بارے بے خبر تھے۔

لیکن ہمارے مورخین جذبات میں بہہ گئے۔ طبری نے لکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امرأ میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ آخری نمبر پر آتے ہیں۔ حالانکہ مغربی دنیا کے تمام نئے اور پرانے مصرین اور مورخین جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی ذہانت کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ وہ مالیات، بری جنگ اور بحری جنگ کے علاوہ ہر کام میں بڑے ماہر تھے۔ ہم آگے چل کر عملی طور پر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اپنے صحیح پر ان کے سنہری کارناموں کے ذریعہ سے دکھائیں گے۔ لیکن اپنوں کی زیادہ تنقید کی وجہ سے مغربی مصرین بھی یہ کہہ گئے کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ میں کردار کی کمی تھی اور غیروں نے ہماری غلط کہانیوں کی آڑ لی۔

ایک کہانی

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک کہانی اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا کہ ان کو معافی دی جائے تو حضور پاک نے معافی دینے میں دیر لگائی۔اور بعد میں جب جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ چلے گئے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے دیر اس لیے لگائی تھی کہ شاید تم میں سے کوئی اٹھ کھڑا ہوتا اور عبداللہ کا سر کاٹ دیتا۔تو ایک انصار نے عرض کی۔''اے اللہ کے رسول،آپ مجھے اشارہ ہی کر دیتے۔''تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ''پیغمبر قتل کرنے کے اشارے نہیں کرتے۔''

یہ کہانی ابن اسحٰق نے اپنی تاریخ میں بیان کی ہے، اور ابن ہشام نے اس پر کچھ اضافے کئے کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بعد میں مسلمان ہو گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو نچلے مصر کا عامل مقرر کیا وغیرہ۔ابن اسحٰق نے اس کہانی کے راوی کا ذکر بھی نہیں کیا اور ان انصار کا نام بھی نہیں لکھا جو اشارہ چاہتے تھے۔

تبصرہ:

اب اس کہانی کو کسی بھی پہلو سے پرکھیں تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔دنیا کے عام بادشاہ کے سامنے بھی جب کوئی آدمی پیش کیا جائے تو دوسرا آدمی کیسے مخل ہو سکتا ہے اور جب شہنشاہوں کے شہنشاہ کے سامنے اور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جناب عثمان رضی اللہ عنہ ذوالنورین بیعت الرضوان کے سبب اور شرم و حیا کے عظیم مظہر ایک آدمی کو پیش کرتے ہیں،تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم معافی کیوں نہ دیتے۔اور کسی دوسرے کو ان کو قتل کرنے کی کیسے ہمت ہوتی۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل اور صفوان رضی اللہ عنہ بن امیہ کو ان کی اپنی عورتوں کی سفارش پر معافی مل گئی۔جناب علی رضی اللہ عنہ،بنو مخزوم کے کچھ آدمیوں کو قتل کرنا چاہتے تھے،جن کو اپنی بہن جناب ام ہانی رضی اللہ عنہا نے معافی دے دی تھی۔دونوں بہن بھائی میں تکرار ہوا اور معاملہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جایا گیا،آپ نے فرمایا۔''اے علی رضی اللہ عنہ! جس کو میری بہن* نے معافی دے دی،اس کو معافی ہے۔''اور پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو فرما چکے تھے کہ جو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر داخل ہوا،اس کو بھی معافی ہے،حالانکہ جناب ابوسفیان اس دن اسلام لے آئے اور جناب حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبانے والی ہندہ کو بھی معافی مل گئی۔

کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ عبداللہ (رضی اللہ عنہ) مرتد ہو گیا تھا اور مرتد کی سزا قتل ہے۔نہیں،مرتد بھی اگر اسلام میں واپس آجائے تو اس کو سزا نہیں دی جاتی۔پہلی دو کتابوں میں ہم طلحہ رضی اللہ عنہ عینیہ رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بن معدی کرب کا ذکر

*جناب ام ہانی رضی اللہ عنہا، جناب علی رضی اللہ عنہ کی سگی بہن تھیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چچیری بہن۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ہانی کے لیے میری بہن کے الفاظ استعمال کر کے آپ (رضی اللہ عنہا) کی شان اور بڑھادی اور معافی کو اور واضح کر دیا۔

کر چکے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے لیکن پھر جب توبہ کی تو معافی مل گئی۔

روحانی پہلو

ہمارے لحاظ سے اس ساری کہانی میں روحانی پہلو زیادہ ہے ، جس کو مورخ نظر انداز کر گئے۔ جناب عبداللہ ؓ کبھی کاتب وحی تھے، بعد میں مرتد ہوئے۔ جب حضور پاک ﷺ کے سامنے پیش ہوئے ہوں گے تو حضور پاک ﷺ کو وہ زمانہ ضرور یاد آیا ہوگا، اس لیے ذرا سوچ میں پڑ گئے ہوں گے، جس کو بعد میں غلط رنگ دے دیا گیا کہ حضور پاک ﷺ معافی نہ دینا چاہتے تھے۔ دراصل ہمارے لحاظ سے تو کاتب وحی کے لیے دوزخ کی آگ نہ تھی اور گناہ کرنے کے بعد توبہ کی لذت زیادہ ہوتی ہے اور حضور پاک ﷺ دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہوں گے کہ جناب عبداللہ ؓ کا نفس لوامہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔

ہمارے جن مورخین نے حضرت عثمان ؓ پر قرابت داری کا الزام لگایا۔ وہ یہاں بھی غلطی کر گئے اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عثمان ؓ اور جناب عبداللہ ؓ دونوں حضور پاک ﷺ کی نگاہ ناز سے مراد پا گئے۔

رومیوں کا سکندریہ پر حملہ

چنانچہ حضرت ؓ عثمان کی خلافت کے پہلے سال ۲۴ ہجری ہی میں اہل روم نے ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ساتھ سکندریہ فتح کرنے کی کوشش کی۔ کچھ مورخین کے حساب سے ۲۴ ہجری کے آخری ایام میں رومی فوج سکندریہ پر قبضہ کر چکی تھی اور ۲۵ ہجری کے شروع میں سکندریہ سے باہر نکل کر مصر کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش شروع کی اور بعض کے مطابق سکندریہ کو بھی ۲۵ ہجری میں فتح کیا۔

روایت ہے کہ رومی بیڑے میں تین سو جہاز تھے اور ان جہازوں کو روکنے کے لیے مسلمانوں کے پاس کوئی بحری فوج موجود نہ تھی۔ اس لیے رومی فوج کا سکندریہ میں کسی نے مقابلہ نہ کیا۔ رومی فوج کی تعداد الگ طور پر نہیں بتائی گئی۔ لیکن تین سو جہازوں میں ایک سو جوان فی جہاز کی اگر اوسط بھی لگائی جائے تو رومی فوج تیس ہزار سے کم نہ تھی۔ مسلمانوں کی بری فوج کوئی ایک ہزار تھی اور اہل روم نے جہازوں سے اتر کر سکندریہ پر بھرپور حملہ کر دیا۔ دراصل سکندریہ میں ایک لاکھ بیس ہزار رومی یا یورپین آبادی تھی۔ ان لوگوں نے پوشیدگی میں قیصر روم اور اس کی حکومت کے ساتھ رابطہ قائم کیا ہوا تھا بلکہ خط و کتابت ہوتی رہی تھی اور اس میں سکندریہ کے لوگ اکیلے نہ تھے بلکہ ڈیلٹا کے علاقوں کے کچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔

مسلمان مورخین یا یورپین مورخین نے یہ نہیں واضح کیا کہ ایک ہزار مسلمان مجاہدین کس طرح لڑے اور ان کی

کمانڈ کون کر رہا تھا، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کہاں تھے اور رومیوں کے ساحل پر اترنے کے بعد وہ کہاں گئے۔ صرف اتنا کہاں گیا ہے کہ فسطاط میں خبر پہنچی کہ سکندریہ پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں سے مسلمانوں کا ایک وفد یہ بتانے مدینہ شریف گیا کہ مصر کے حالات خراب ہو گئے ہیں اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو دوبارہ مصر بھیجا جائے۔ لیکن ہمارا تجزیہ ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ ہی گورنر تھے اور پندرہ ہزار فوج فسطاط میں موجود تھی کیونکہ کوئی مورخ یہ ذکر نہیں کرتا کہ مدینہ سے کوئی اور کمک آئی بلکہ یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ نے فسطاط میں جان بوجھ کر دیر لگائی۔ جناب خریجہ رضی اللہ عنہ نے عرض بھی کی کہ جلدی اہل روم کو مصر سے نکالا جائے تو جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے کہا کہ نہیں، ان کو سکندریہ سے باہر نکلنے دو کہ ان کو سکندریہ کے باہر ہی برباد کرنا بہتر رہے گا۔ اگر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص مدینہ سے آتے تو کیا ان کے آنے سے پہلے پندرہ ہزار فوج فسطاط میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی اور رومیوں کے ساتھ لڑائی کے لیے کوئی تجویز نہ بنتی یا یہ نہ لکھا ہوتا کہ کون کمانڈر تھا جس نے پندرہ ہزار فوج کو اس طرح بٹھائے رکھا۔

زمان و مکان کا حساب

ہمارا تجزیہ ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص فسطاط میں موجود تھے کہ زمان و مکان کے حساب سے سکندریہ پر رومیوں کے قبضہ کی خبر فسطاط پہنچنے تک کم از کم پندرہ دن لگتے اور آگے مدینہ تک ایک مہینہ۔ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے فسطاط پہنچنے میں ایک اور مہینہ لگ جاتا۔ تو ان دو اڑھائی ماہ میں رومی آسانی کے ساتھ پیش قدمی کر کے فسطاط کے سامنے دریائے نیل کے مغربی علاقوں پر قبضہ کر چکے ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حالات سے کچھ اس طرح پیش رفت کی کہ رومی سکندریہ میں اتر گئے۔ ایک ہزار مسلمان مجاہدین تتر بتر ہو گئے کہ تیس ہزار رومیوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور سکندریہ کی آبادی کا بڑا حصہ رومیوں کے ساتھ مل چکا تھا، لیکن مقوقس اور قبطی عیسائیوں میں سے اکثر نے اہل روم کے ساتھ کوئی خاص تعاون نہ کیا۔

رومیوں کے مسائل

رومی اب عجیب و غریب مسائل سے دوچار تھے۔ تیس ہزار کے لشکر کے لیے خوراک کا بندوبست کرنا اب پہلے کی طرح آسان نہ تھا۔ پہلے وہ سارے علاقے کے حکمران تھے۔ سب کچھ ان کے پاس موجود تھا۔ اب انہوں نے خوراک اور سامان اکٹھا کیا اور لوگوں نے اس چیز کو بہت ناپسند کیا۔ تیس ہزار کا تو ہمارا اندازہ ہے۔ پتہ نہیں کتنے ملاح اور بندوبستی قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک روایت کے مطابق جناب عمرو بن عاص کا یہ خیال تھا کہ لوگ اہل روم سے خود بخود نفرت کرنا شروع کر دیں گے۔ کیونکہ رومی ان کے پاس سے سب کچھ چھین لیں گے کہ انہیں بہت زیادہ خوراک اور سامان کی ضرورت ہوگی۔

رومیوں کی پیش قدمی

رومی صرف سکندریہ پہ قبضہ کر کے وہاں نہ بیٹھ سکتے تھے۔ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ پیش قدمی کر کے ڈیلٹا کے دوسرے علاقوں پر بھی قبضہ کریں تا کہ رسدرسانی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔اس لیے انہوں نے کچھ دن تو انتظار کیا کہ شاید مسلمان کوئی لشکر بھیجیں لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ جنوب کی طرف چل پڑے۔انہوں نے بھی وہی راستہ استعمال کیا، جو مسلمانوں نے سکندریہ فتح کرتے وقت کیا تھا۔ہم نقشہ چہارم میں اس راستہ کو دکھا چکے ہیں۔لیکن تھوڑی تبدیلی یہ تھی کہ رومی دریائے نیل کے ڈیلٹا کے مغربی دریا کے مغربی کنارے کی بجائے مشرقی کنارے پر پیش قدمی کر رہے تھے۔

منوئیل خصی، جس کو مسلمان کسی نام سے پکارنے کی بجائے صرف ہیجڑہ یا خصی کے نام سے پکارتے تھے۔فوجی تدبیرات کا ماہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے طرز جنگ کا مطالعہ کر چکا تھا کہ اگر وہ دریا کے مغربی کنارے پر پیش قدمی کرتا تو مسلمان ریگستان کو اپنے بائیں پر رکھ کر کسی ایک جگہ اس کو روک کر یا جگہ بجگہ ریگستان کے علاقے کی طرف سے ایسے حملے کرتے کہ رومی فوج کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔رومی یہ سمجھ چکے تھے کہ جس جگہ کے نزدیک ریگستان ہو، وہاں متحرک مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ کر کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔چنانچہ ان کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ محدود علاقے میں، ان کی مرضی کی جگہ پر ہو۔ایک اور چیز جو منوئیل نے کی وہ یہ تھی کہ جب وہ دریا کے کنارے پیدل پیش قدمی کرتے تھے تو دریا میں ساتھ ساتھ کشتیوں کا بحری بیڑہ بھی ان کے دائیں بازو پر حرکت میں رہتا تھا اور آبی راستوں کے استعمال کے لیے ایسا ضروری ہوتا ہے۔

نکیوس کی لڑائی

جناب عمرو بن عاص کو جب منوئیل خصی کی اس طرز اور ارادوں کا پتہ چل گیا تو آپ نے بھی دریائے نیل کو جیزہ کے مقام پر عبور کیا اور دریا کے مغربی کنارے پر ترانہ تک پیش قدمی کی۔یہ کوئی تیس چالیس میل کا فاصلہ تھا یہاں پر آپ نے دشمن کے بارے میں پوری خبر حاصل کی اور آپ کو پتہ چلا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔وہ مسلمانوں سے دوگنا یا اس سے کچھ کم ہیں۔یعنی جناب عمرو بن عاص کی فوج کی تعداد پندرہ سے بیس ہزار بتائی جاتی ہے اور اندازہ ہے کہ رومی تیس ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تھے۔اگر رومی بہت زیادہ ہوتے تو جناب عمرو کبھی بھی دریا پار نہ کرتے۔آپ مغربی کنارے پر رہ کر دشمن کے ساتھ ''حرکتی چالوں'' سے لڑائی لڑتے۔لیکن اب دشمن پھنس چکا تھا۔دشمن جناب عمرو بن عاص کے مرضی کے علاقے میں پہنچ چکا تھا اور وہ نکیوس کے قریب تھا۔نکیوس نہ کوئی اہم مقام تھا اور نہ ادھر کوئی اہم زمین تھی لیکن یہاں فوجی اصلاح صحیح ثابت ہوئی۔اور فوجی لحاظ سے یہ سب کچھ اصول ضرورت کے تحت ہوا کہ لشکر مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو کھینچ لیتے ہیں۔

چنانچہ جناب عمرو ﷛ بن عاص نے دریا کو پار کیا، اور اگلے دن دشمن کے سامنے صف بندی کر لی۔ ہم اس جنگ کا کوئی خاکہ یا نقشہ نہیں بنا رہے کہ زمین نے تدبیرات میں کوئی موثر کام نہ کیا۔ یہ فوجوں کی حرکت کی جنگ تھی۔ اس کی حرکتی چال کہیں یا مُنور کہ کسی زمانے میں یہ بھی جنگ کا ایک اعلیٰ پایہ کا اصول مانا جاتا تھا اور یہ اصول اب بھی اہم ہے لیکن ایسی باتوں کی طرف ہم دھیان نہیں دیتے۔ بہرحال جناب عمرو بن عاص نے فسطاط سے اس لیے پیش قدمی نہ کی تھی کہ دشمن کو صرف روک دیں گے بلکہ وہ دشمن کو تباہ و برباد کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے، تاکہ اسے اس طرح تباہ کیا جائے کہ اور کچھ نہ ہو تو وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ تو جائے، اس لیے انہوں نے دشمن پر حملہ کرنے کی تجویز بنائی لیکن جناب عمرو بن عاص یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کچھ رومی کشتیوں میں سوار ہونے لگے۔

منوئیل خصی کی تجویز

منوئیل کی تجویز بڑے اعلیٰ پائے کی تھی اس نے دفاع میں رہ کر مقابلہ کرنے کی بجائے کچھ فوج کو کشتیوں میں سوار کیا اور باقی فوج کو خشکی کے راستے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ خشکی والے، خشکی سے آگے بڑھے اور ان کے دائیں بازو سے کشتیوں میں سوار رومی مسلمانوں کے بائیں بازو پر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے دریا کے بیچ کشتیوں میں سوار رہتے ہوئے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اس طرح رومی فوج سامنے سے مسلمانوں کے کافی نزدیک پہنچ گئی۔ یہ لڑائی کا پہلا مرحلہ تھا اور اس میں رومیوں نے مسلمانوں کا کافی نقصان کیا۔

اس کے بعد رومی کشتیوں سے اتر کر اپنی بڑی فوج میں شامل ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کے بائیں بازو پر ایک سخت حملہ کیا۔ روایت ہے کہ کچھ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور جناب شریق ﷛ جو بائیں بازو کے کمانڈر تھے انہوں نے بڑی مشکل کے ساتھ رومی کو روکا اور اپنی صفوں کو بحال کیا۔ رومیوں نے البتہ حالات کا صحیح اندازہ نہ لگایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا کافی نقصان ہو چکا تھا اور ایک بھرپور حملہ کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کا زیادہ نقصان تیروں کی وجہ سے ہوا تھا۔ اب جو ہاتھوں ہاتھ لڑائی کا موقع مجاہدین کو ملا تو انہوں نے رومیوں کو میدان جنگ میں ڈھیر کر دیا اور رومی پسپا ہونا شروع ہو گئے۔ لڑائی کا دوسرا مرحلہ بھی ختم ہو گیا۔

اب مسلمان سوچ رہے تھے کہ رومی شاید ایک آدھ حملہ اور کریں گے اور رومی یہ سوچ رہے تھے کہ مسلمان جلد جوابی حملہ کریں گے۔ اس وجہ سے لڑائی تھم گئی کہ اتنے میں ایک رومی افسر بڑی شان و شوکت والے لباس میں ملبوس آگے نکلا اور اجازت طلب کی۔ مسلمانوں کی طرف سے جناب حمال نکلے جو مبارزت میں نام پیدا کر چکے تھے۔ یہ مبارزت کافی دیر جاری رہی اور جناب حمال نے بڑی مشکل کے ساتھ رومی افسر کو ختم کیا بلکہ خود اتنے شدید زخمی ہوئے کہ چند دن بعد وفات پا گئے۔ جناب عمرو ﷛ کو بڑا رنج ہوا۔ کیونکہ آپ حمال کے بڑے مداح تھے۔ اس لیے آپ کو مقدم پہاڑی

کے قبرستان میں ایک نمایاں جگہ پر بڑی عزت کے ساتھ دفن کیا گیا۔

مسلمانوں کا حملہ

بہر حال جناب حمال رضی اللہ عنہ کی کامیابی نے لڑائی کا رخ پھیر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں نے رومیوں پر جوابی حملہ کر دیا، جس سے رومی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب رومی بھاگتے جا رہے تھے اور مسلمان تعاقب کر رہے تھے۔ یہ تعاقب اپنی قسم کا آپ تھا۔ سکندریہ کا فاصلہ نکیوس سے تقریباً سو میل ہے اور اگلے چار پانچ دن مسلمانوں نے رومیوں کا لگاتار تعاقب کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رومی سکندریہ میں پہنچ کر پھر قلعہ بند ہو جائیں لیکن رومی بھاگنے میں تیز نکلے اور مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ ایک دفعہ پھر قلعہ بند ہو چکے تھے۔

سکندریہ کا محاصرہ اور دوسری فتح

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص جب سکندریہ پہنچے اور انہوں نے سکندریہ کے دروازے بند دیکھے تو ان کو سخت افسوس ہوا کہ انہوں نے سکندریہ کا قلعہ اس طرح مسمار کیوں نہ کر دیا جس طرح فرما کے قلعہ کو کیا تھا لیکن ان کا یہ افسوس بڑا وقتی تھا چند دنوں بعد کچھ لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ ملاپ قائم کیا کہ اگر ان کی جان بخشی ہو تو وہ قلعہ کے دروازے رات کو کھول دیں گے۔ مسلمانوں نے مان لیا اور قلعہ کے دروازے کھل گئے۔ مسلمان دوسری دفعہ سکندریہ میں نعرۂ تکبیر کی صدا کے ساتھ داخل ہوئے اور سکندریہ کی فضا اللہ اور رسول ﷺ کے نام سے گونج اٹھی۔

مغربی مبصرین کے تبصرے:

سکندریہ کی دوسری فتح پر مغربی مبصرین نے عجیب وغریب تبصرے کئے ہیں۔ کوئی لکھتا ہے کہ رومیوں نے دیر کر دی، سکندریہ پر قبضہ کرنے کے بعد اگر وہ فسطاط پہنچ جاتے تو مصر دوبارہ سلطنت روم میں شامل ہو گیا ہوتا۔ کوئی کہتا ہے کہ قبطی عیسائیوں اور مقوقس نے مدد نہ کی اور پھر کچھ لوگوں نے سکندریہ کے لوگوں پر غداری کا الزام لگایا کہ انہوں نے سکندریہ کے دروازے کھول دیئے اور رومیوں کو بھاگنا پڑ گیا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر کچھ ٹھیک ہیں، سوائے فسطاط تک پیش قدمی کے۔ اگر رومی یہ بات کر بیٹھتے تو ان میں سے ایک بھی بچ کر واپس سکندریہ نہ پہنچتا۔ وہ مصر میں جنگ ہار چکے تھے، لوگ ان کے مخالف تھے اور مسلمانوں کی متحرک طاقت کے سامنے وہ سکندریہ کے باہر کسی جگہ نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

لیکن رومیوں کے سکندریہ پر قبضہ رکھنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ پہلے بھی رومیوں نے سکندریہ کو اس لیے چھوڑا تھا کہ کوئی اکیلی اکیلی بندرگاہ قبضہ میں نہیں رکھی جا سکتی۔ دوسری جنگ عظیم میں سنگاپور کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انگریز اس کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ لیکن جب ملایا پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو انگریزوں اور امریکہ کی ملی جلی بحری طاقت اور

سنگاپور کا اندرونی دفاع سنگاپور کو نہ بچا سکا بلکہ ۱۹۴۲ء میں رنگون کی بندرگاہ پر قبضہ کے سلسلہ میں جب جاپانی رنگون سے تیس میل شمال میں پیگو کے مقام پر پہنچ گئے تو انگریزوں کو رنگون چھوڑنا پڑ گیا۔ پھر ۱۹۴۵ء میں راقم خود جب برطانوی فوجوں کے ساتھ رنگون پر حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ اترا تو دفاع کے لیے کوئی جاپانی وہاں موجود نہ تھا اور ہمارے اوپر ایک گولی بھی فائر نہ ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ چودھویں فوج جس کے ساتھ راقم خود شمالی برما* میں رہ چکا تھا جس وقت پیگو پہنچی تو جاپانیوں نے رنگون خالی کر دیا۔

کسی بندرگاہ کا دفاع یا اس پر قبضہ رکھنے کا مضمون بڑا اہم ہے اور بندرگاہ تب تک بندرگاہ ہے کہ اس کے اوپر والے خشکی کے علاقوں کے ساتھ ہر طرح کا رابطہ موجود ہو، جب اس میں خلل آ جائے تو ایک دوسرے کو بھی لے ڈوبے گا۔ ہر بندرگاہ کا دفاع اپنی قسم کا آپ ہوتا ہے کہ ہر بندرگاہ کے جغرافیائی اور سیاسی حالات ایک جیسے نہیں ہوتے اس لیے خاص مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصاً ہماری بندرگاہ کراچی کے بارے میں اور زیادہ دقیق اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اکیلا بحری بیڑہ کسی بندرگاہ کی حفاظت نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنا مضبوط ہو، یہاں ملی جلی کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

سکندریہ کی دوسری جنگ کے نتائج

۱۔ سکندریہ اور مصر پر اہل روم کا دوبارہ حملہ ضرور کسی بڑی تجویز کا حصہ تھا۔ رومیوں نے شام کے ساحل پر کسی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ شام کے محاذ پر کوئی اور بھرپور حملہ نہ کیا۔ آخر مصر اور سکندریہ کو کیوں چنا گیا جو اتنا دور تھا اور بحری جنگ اس زمانے میں ایک مشکل عمل تھا کہ کشتیاں بادبانوں اور چپوؤں کی مدد سے چلتی تھیں۔ جنگ بھی اتنی گھمسان کی تھی کہ منوئیل خصی اس جنگ میں مارا گیا۔ کچھ رومی کشتیوں میں سوار ہو کر یورپ واپس چلے گئے۔ ان کی کافی بڑی بڑی کشتیاں بندرگاہ میں رہ گئیں۔ ان کشتیوں نے مسلمانوں کو بڑا فائدہ دیا کہ اس کے بعد مسلمانوں نے جو بحری فوج بنائی اس میں یہ کشتیاں بڑے کام آئیں۔

۲۔ بہرحال اس جنگ کے نتائج بڑے واضح تھے کہ رومیوں کی طبیعت خوب صاف ہوئی اور آئندہ انہوں نے بحری بیڑے کے ساتھ اتنی بڑی فوج کو کسی ساحل پر اتار کر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ سمندر کے ذریعے بری فوج کے ساتھ حملہ کرنے کے لیے بہت تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور مشکل کام یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح ایک دفعہ وہاں پر قدم ٹک جائیں۔ لیکن ایک یہ مرحلہ بھی مشکل ہوتا ہے کہ جہاں پر اترا جائے وہاں کے لوگ بھی حملہ آور کے ساتھ تعاون کریں۔

* راقم شمالی برما میں زخمی ہو گیا تھا اور ٹھیک ہونے کے بعد چودھویں فوج کی بجائے رنگون پر حملہ کرنے والی فوج میں شامل ہو گیا تھا تو دونوں طرف کی لڑائی دیکھنے کا موقع مل گیا۔

اتحادیوں نے دوسری جنگ عظیم میں سمندری حملہ کے لیے پہلے سسلی اوراطالیہ کو چنا۔ وہاں کامیابی کے بعد بحیرہ اوقیانوس یار دو بار انگلستان سے بڑا حملہ جون ۱۹۴۴ء میں فرانس کے جزیرہ نما شیر برگ پر کیا، وہاں کے لوگوں نے بھی اتحادیوں کو خوش آمدید کہا اور پیچھے بے پناہ طاقت بھی موجود تھی جس سے کامیاب ہوئی۔

۳۔ رومیوں کے اس حملے اور شکست میں مسلمانوں کے لیے بڑے سبق تھے اوران پر ظاہر ہوگیا کہ اہل روم کے لیے مصر اور افریقہ کی شام سے بھی زیادہ اہمیت ہے اس لیے مسلمانوں کو آگے بڑھنا ہوگا اور رومیوں کو طرابلس وغیرہ سے مکمل طور پر خارج کرنا ہوگا۔ ورنہ رومی خشکی اور سمندر دونوں طرف سے حملہ کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں پر ظاہر ہوگیا کہ ان کو کوئی بحری بیڑا بنانا ہوگا کہ سمندر پر قبضہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ اسلام کے لحاظ سے فتح کا اختتامی مقام، باطل فلسفوں سے مختلف ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ملک فتح کر کے اللہ کے احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے تا کہ حق کو لایا جائے اور باطل کو مٹایا جائے۔ اس عمل کو بتدریج آگے بڑھایا جاتا ہے، نہ کہ اس طرح جیسے سکندر یونانی یا منگول ملک فتح کرتے گئے لیکن فتوحات قائم نہ رہ سکیں۔ نپولین بھی دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ اور کبھی مصر پہنچ گیا اور کبھی ماسکو۔ لیکن یہ سب فتوحات اس کو مہنگی پڑیں۔ اس صدی میں جرمنی اور جاپان نے بھی ایک ایسی کوشش کی۔ لیکن یہ عارضی اور ضرورت کی فتوحات ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی فتوحات کے لیے کچھ تیاری کی ضرورت ہوتی تھی۔

۵۔ اور یہ سبق آج کل بھی اتنا اہم اور ضروری ہے، اسلام کو جغرافیائی طور پر ملکوں کی فتوحات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسلام ایک فلسفہ حیات کا دعویدار ہے اور اس فلسفہ حیات کو پہلے اپنے ملک میں جاری وساری کرنا ہوتا ہے تا کہ اوروں کے لیے یہ ایک مثال ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہی فرماتے تھے کہ جہاں تک وہ پہنچ چکے تھے، وہاں تک اسلامی فلسفہ حیات کو جاری وساری کیا جائے۔ اور مسلمانوں کے کردار، طرز معاشرت یعنی رہنے سہنے کے طریقے اور عمل کو دیکھ کر لوگ اسلام میں داخل ہوں۔

مسلمانوں کی عظمت

سکندریہ کی دوسری جنگ میں مسلمانوں کی عظمت کی ایک درخشاں مثال موجود ہے کہ کئی مغربی مورخین نے بھی اس کو سراہا ہے۔ جنگ کے بعد کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ جب رومی آئے تو انہوں نے ان کا مال چھین کر اس پر قبضہ کر لیا یا استعمال کیا۔ چونکہ مسلمان ان کو اس عرصہ میں حفاظت نہ دے سکے تو یا تو ان کے نقصانات کو پورا کیا جائے یا ان کا ٹیکس واپس کیا جائے۔ یہ درخواست جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے منظور فرمائی۔ لیکن فرمایا کہ لوگوں کے تمام نقصانات کو پورا کیا جائے۔ اس عمل سے کئی مصری مسلمان ہوگئے۔ بلکہ پہلے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ عربی زبان کو جاری کرو تو اہل مصر نے عربی زبان کو اپنانا بھی شروع کر دیا تھا۔

لسانی وحدت

اہل مصر غیر عرب ہیں، جنہوں نے عربی زبان کو اپنا کر افریقہ کے مغرب تک اس کارِ خیر کو پہنچا دیا۔ اور اہل مصر کا یہ رویہ اس جہان اور آخرت دونوں میں ان کے لیے باعث رحمت ہے۔ کاش! مشرق میں بھی ایسا ہوتا تو آج مسلمانوں میں اور زیادہ وحدت ہوتی، یا کم از کم وحدت کا ذریعہ تو موجود ہوتا۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔

''پسند کرو عربی کو کہ قرآن پاک کی زبان ہے۔ پسند کرو عربی کو کہ اہل جنت کی زبان ہے اور پسند کرو عربی کو کہ یہ میری زبان ہے۔''

یہ آخری فقرہ، ہم عجمیوں کے لیے اور جس نے اس فقرہ کے سامنے آمنا و صدقنا کے الفاظ کہے، وہ عجمی نہ رہ گیا۔ اور ہم آج بھی عجم کے چکر میں ہیں کہ عرب و عجم کا سوز ساز ایک نہ ہو سکا۔

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

(اقبالؔ)

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی عمل داری

سکندریہ کی دوسری جنگ کے بعد خلیفہ وقت نے مصر کے علاقہ کے لیے وہی نظام تجویز کیا جو بصرہ اور کوفہ میں رائج تھا کہ مالیات کے افسر کو مرکز مقرر کرتا تھا۔ نظامت اور سپہ سالاری کے لیے گورنر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص جوابدہ ہوں گے۔ لیکن مالیات کو عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کے حوالے کیا جائے جو ضرورت کے مطابق مصر کے گورنر کو بھی رقم دے گا اور وہ مرکز کا نمائندہ ہوگا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانے سے خود مختار طور پر سپہ سالاری کر رہے تھے۔ صرف ضرورت کے تحت شام میں انہوں نے جناب خالد رضی اللہ عنہ اور جناب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کام کیا تھا اور مصر کی نظامت ان کو بہت پسند تھی۔ اس لیے انہوں نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اس تجویز کا یہ مطلب ہے کہ میں ''گائے کے سینگ پکڑنے والا بن جاؤں اور دودھ دوہنے والا کوئی اور ہو۔''

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کہاوت میں کتنی سچائی ہے۔ پہلے جناب عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور سب گورنروں کا محاسبہ کیا تھا اور جو رقم ان کے پاس حساب سے فالتو نظر آئی وہ بیت المال میں ڈال دی گئی۔ اور جناب

فاروق ہی نے ملک شام، کوفہ اور بصرہ میں مالیات کے نظام کو الگ کر دیا تھا لیکن مصر میں ایسا نہ ہو سکا تھا کہ اس وقت ملک نیا نیا فتح ہوا تھا۔ اور مہمات آگے جاری تھیں۔ بہرحال یہ سب معاملات اتنے پیچیدہ نہیں جتنے تاریخ دانوں نے بنا دیئے ہیں ایسی باتیں اختلاف ضرور پیدا کرتی تھیں اور آگے یہ ذکر آئے گا۔ کہ کوفہ میں ایسا اختلاف جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص اور جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان بھی پیدا ہوا تھا۔ مصر کے حالات کچھ مختلف تھے وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص میں اختلاف ضرور ہوا ہوگا۔ البتہ یہ گائے کے سینگوں والی بات سے ہوا یا کسی اور ایسے لفظ سے کہ جناب عثمان نے رضی اللہ عنہ ،عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کو مصر کا گورنر بنا دیا۔ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو سبکدوش کر دیا گیا۔

سازشیوں کے حلوے مانڈے

یہ واقعہ پچیس یا چھبیس ہجری کا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ ۳۲ اور ۳۳ ہجری میں شروع ہوا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ اگلے پانچ چھ سالوں میں بڑی فتوحات ہوئیں۔ ایران اور شام کے علاوہ سب سے زیادہ فتوحات افریقہ میں ہوئیں اور ان کا سہرا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کے سر باندھا جانا چاہیے۔ لیکن تاریخوں میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی سبکدوشی کو بھی بعد میں نزاع کا باعث بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں کسی نے کوئی بات نہ کی اور متعدد عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرزند افریقہ میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں جہاد میں مصروف رہے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا تقرر خلیفہ اول نے گیارہ ہجری میں ایک لشکر کے کمانڈر کے طور پر کیا تھا۔ ان کے ساتھ والے اس زمانے کے باقی کمانڈر یا تو سبکدوش کر دیئے گئے تھے یا وفات پا چکے تھے، کتاب دوم میں خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے جن سترہ لشکروں کے کمانڈروں کا ذکر ہے ان میں جناب عمرو بن عاص سب سے آخر میں سبکدوش کیئے گئے اور ان کے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ جن کا ذکر ہو چکا ہے، وہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کی فوج میں ایک امیر کے طور پر مامور تھے۔

اب تاریخ میں جو یہ روایات موجود ہیں، کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے خود تسلیم کیا کہ مصر کی گورنری سے ہٹ جانے کے بعد وہ عثمان اور ان کے امراء کی تنقید کو ہی اپنا شغل بنائے رکھتے تھے۔ تو یہ روایت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ فتنہ وفساد کے بعد کئی کہانیاں گھڑ لی گئیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ماضی کو بھی خواہ مخواہ بیچ میں لایا گیا۔

افریقہ کی فتوحات

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عمل داری سنبھالنے کے بعد رہے سہے افریقہ کو فتح کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ مصر کی حدود موجود سڈنی برائی تک تھیں۔ باقی سب علاقے افریقہ کے صوبے یا ملک کی عمل داری میں تھے۔ یعنی برقہ سے

لے کر تنجیر تک ایک ہی ملک تھا جس کا دارالخلافہ کارتھیج تھا جو موجود ٹیونس شہر کے نزدیک تھا۔ یہاں بھی اہل روم کا ایک باجگذار بادشاہ رہتا تھا جس کا نام جرجیر تھا اور اہل یورپ اسی شخص کو گریگوری (Gregory) کہتے ہیں۔ یہ وسیع علاقے پر حکومت کرتا تھا اور جگہ جگہ اس کے عامل یا گورنر تھے۔ کچھ یہ روایات بھی ہے کہ ہرقل کے مرنے کے بعد جرجیر نے اہل روم کی باجگذاری ختم کردی اور خودمختاری کا اعلان کردیا۔ لیکن مسلمانوں کے حملوں اور پیش قدمی کے دوران رومی جہاز بھی کئی دفعہ کمک لے کر افریقہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے رہے اور جہاں مسلمانوں کی زیادہ نفری دیکھی وہاں وہ جہازوں میں سوار ہو کر یورپ واپس چلے جاتے تھے۔ اس لیے رومیوں کا افریقہ کے ساتھ تعلق ضرور تھا۔ نقشہ ششم یہاں پر حالات کی کچھ سرسری نشاندہی کرتا ہے۔ اس میں پہلے جناب عمروؓ بن عاص کی برقہ تک کی مہم اور جناب عقبہؓ بن نافع کی زویلہ تک کی مہمات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اگر جناب عمرو بن عاص طرابلس تک بھی گئے تو مانا جاسکتا تھا۔ نقشہ ظاہر کرتا ہے کہ برقہ سے لے کر طرابلس کے ساحلی علاقے یورپ کے ساحل سے کافی دور ہیں اور یہاں پر اہل روم کا زور نہ تھا لیکن طرابلس سے آگے بحیرۂ روم کی وسعت تنگ ہوجاتی ہے اور سسلی واطالیہ کے علاقوں کے ساتھ رابطہ نزدیک سے ہوجاتا ہے، ہم مختلف مقامات کے فاصلوں کا ذکر کرچکے ہیں کہ اب مسلمان وسیع علاقوں میں سرپٹ گھوڑے دوڑانے کے لیے پرتول رہے تھے۔

اسلامی لشکر

جناب عثمان نے جناب عبداللہؓ کو افریقہ کی فتوحات کی اجازت دے دی اور مدینہ شریف سے بیس ہزار کا ایک لشکر تیار کر کے فسطاط بھیجا گیا۔ اس لشکر میں جناب امام حسن بن علی، امام حسین بن علی، عبداللہ بن جعفر طیار، عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبداللہ بن عمر فاروق اور حضرت عثمان کے چچیرے بھائی مروان اور حارث بن حکمؓ بھی تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکرؓ بھی لشکر میں شامل تھے لیکن کچھ مورخین نے ان کا نام نہیں لکھا۔ عبداللہ بن زبیر کے بارے میں بھی اسی طرح اختلاف ہے کہ لشکر کے ساتھ تھے یا بعد میں کمک یا خبر حاصل کرنے کے لیے آئے۔ لیکن آگے چل کر جنگ میں شرکت ضرور کی جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ یہ تمام نام ہم نے مختلف تاریخوں سے لیے ہیں کسی تاریخ میں سارے نام ہیں اور کسی میں تھوڑے۔ طبری نے جناب امام حسنؓ، امام حسینؓ کے علاوہ صرف چار اور نام لکھے ہیں اور آگے وغیرہ کے لفظ پر اکتفا کی ہے۔ ہمارا تجزیہ ہے کہ سب صحابہ کرامؓ کے عظیم فرزند ضرور ایسی جنگوں میں شامل ہوئے ہوں گے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جناب عقبہؓ بن نافع بھی جنہوں نے پہلے زویلہ تک کے علاقے فتح کیے تھے۔ اس لشکر میں شامل تھے۔ چنانچہ ان سب روایات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسلامی لشکر بہت بڑا تھا۔ بعض مورخین کے

حساب سے بیس ہزار مجاہدین مدینہ شریف سے آئے اور بیس ہزار فسطاط سے اکٹھے ہوئے اور کل لشکر کی تعداد چالیس ہزار تھی لیکن کچھ مورخین نے کل لشکر کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ سب سوار تھے یعنی وہ گھوڑوں پر سوار تھے یا اونٹوں پر۔ آگے سے جرجیر کے لشکر کی نفری ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے اور کچھ مبصرین کا خیال ہے کہ یہ زیادتی ہے۔ تعداد زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار ہوگی۔ گوگبن بھی ایک لاکھ بیس ہزار کی نفری تسلیم کرتا ہے اور اکثر مسلمان مورخین بھی جن کا تعلق شمالی افریقہ سے رہا ہے یہی کہتے ہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بھی تیس ہزار سے کم نہ تھی کہ اتنا دور جانے کے لیے زیادہ نفری کی ضرورت تھی اور جرجیر کی فوج بھی ساٹھ یا ستر ہزار تک ہوگی۔

افریقہ کے سیاسی اور ملکی حالات

افریقہ کی پرانی تاریخ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ کسی زمانے میں طرابلس بھی زیادہ اہم رہا ہے۔ ایشیا یا یورپ سے جو لوگ افریقہ جاتے تھے۔ وہ ادھر ہی آباد ہو جاتے تھے۔ پھر ٹیونس جس کو اس زمانے میں کارتھیج کہتے تھے زیادہ اہم ہو گیا اور اناطولیہ سے فناکس لوگ باقی پوریشیسن اور جرمنی سے ونڈال لوگ وغیرہ وقفوں کے ساتھ افریقہ میں جا کر آباد ہوتے رہے۔ مسلمان مورخین نے البتہ شمالی افریقہ کے تمام لوگوں کو بربر یا زناتہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ روایت ہے کہ جالوت انہی لوگوں کا بادشاہ تھا۔ حضرت طالوت کے ساتھ جب جالوت کی لڑائی ہوئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا کہ آپ بھی حضرت طالوت کے لشکر میں تھے۔ یہ ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شکست کے بعد یہ لوگ مواتہ اور برقہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان مقامات کو زمانہ قدیم میں اطابلس بھی کہتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے ان علاقوں کو طرابلس کا نام دے دیا۔ یہ نام اسی صدی میں دوسری جنگ عظیم تک عام رہا اور سارے ملک کو ہی طرابلس کہتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس ملک کو لیبیا کہا جانے لگا کہ سارنیکا، طرابلس اور لیبیا سب علاقے مل کر ایک ملک بن گیا۔

اس کے بعد موجودہ ٹیونس آتا ہے جس کو پرانے زمانے میں کارتھیج کہتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو بھی مسلمان بربر ہی کہتے تھے۔ گو بنیادی طور پر وہ بھی فناکس اور پوریشین ہیں اور کسی زمانے میں اہل روم کے مقابلہ کی سلطنت تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے پرانی رومی سلطنت جس کا دارالخلافہ موجودہ روم تھا ان کے اور کارتھیج والوں کے درمیان بڑی جنگیں ہوئیں جن کو عسکری تاریخ کے طالب علم پیونک کی جنگیں کہتے ہیں۔ انہی جنگوں کے دوران ہنی بال نے متجیر سے سمندر پار کر کے سپین کو فتح کیا اور وہ ایپلس کے راستے اہل روم پر حملہ کیا، جو عسکری تاریخ ایک عظیم مثال ہے۔ لیکن جواب میں سکیپیو نے یہی کچھ کارتھیج میں کیا کہ ہنی بال کے ساتھ اطالیہ میں لڑائی لڑنے کی بجائے وہ ہنی بال کے ملک میں پہنچ گیا۔ ہنی بال بے شک ایک عظیم جرنیل تھا لیکن اپنوں نے اس کے ساتھ غداری کی اور اس نے زندگی

کے آخری ایام گمنامی کی حالت میں دمشق میں گزارے۔ گویہ جنگیں بعد بھی جاری رہیں تو ظاہر ہوا کہ بربر اہل یورپ کے پرانے دشمن بھی تھے۔

تبصرہ:

یہاں ایک تبصرہ بھی ضروری ہوگیا ہے۔ مسلمانوں نے چند سال بعد پورے شمالی افریقہ کو فتح کرلیا۔ اور بربر قوم کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ بنوامیہ کے زمانے میں موسیٰ بن نصیر رحمۃ اللہ علیہ اور طارق ﷺ بن زیاد نے ہنی بال کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تنجیر سے آگے بڑھ کر اندلس (سپین) پر حملہ کیا' تو اسلامی لشکر میں بربر بھی شامل تھے' جو مسلمان ہو چکے تھے۔ اہل یورپ نے اپنی شکست کی ذمہ داری بربر قوم کی تختی پر ڈال دی جو پہلے بھی ان کے دشمن تھے۔ اور اہل یورپ نے اپنی زبان میں ایک نئے لفظ کو اپنایا کہ جب کسی جگہ ظلم کا ذکر کیا جاتا تو فلاں بڑا Barbaric ہے یعنی بربر قوم کی طرح ظالم ہے۔ ہم نے انگریزوں کی نقل کرتے ہوئے اس لفظ کی اردو میں بھی جگہ دے دی اور آج ''بربریت'' کا لفظ ظلم کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ کیا یہ بات افسوس ناک نہیں!

قسطنطنیہ کے رومی

بہر حال ہم جس زمانے کا ذکر کررہے ہیں۔ اس زمانے میں قسطنطنیہ کے رومی طرابلس اور ٹیونس کے علاقوں پر قابض رہ چکے تھے کہ ہرقل کے باپ بھی کس زمانے میں کارتھیج کا گورنر تھا اور ہرقل چھوٹا بڑا بھی وہاں پر ہی ہوا تھا۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ قسطنطنیہ والے اپنے آپ کو اطالیہ والی روم کی سلطنت کے جانشین کہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ سے ایک دفعہ افریقہ نکل گیا تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ کے رومیوں نے افریقہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ آخر ۵۳۳ عیسوی میں بلارس نے افریقہ کو فتح کرلیا۔ یہ وہ جرنیل ہے جس کو لارڈ ویول اپنی کتاب ''سولجری'' (Soldiering) میں مارلبرو کے ساتھ دنیا کا عظیم ترین جرنیل کہتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں تو کوئی انگریز اچھے الفاظ کب کہتا ہے۔ لیکن چرچل کو خوش کرنے کے لیے اس کے دادا مارلبرو اور بلارس کو ویول نے ہنی بال، نپولین، سکندر یونانی چنگیز خان اور پتہ نہیں دنیا کے کن کن عظیم جرنیلوں سے اوپر رکھ دیا۔ کلاسوٹز جو جنگ کا ماہر سمجھا جاتا ہے اس نے بلارس اور مارلبرو دونوں کی خوش قسمت اور معمولی تدبر کا جرنیل کہا ہے اور راقم اس سلسلے میں کلاسوٹز کی کتابوں کے اردو تراجم اور ہفتہ وار ''ہلال'' کے جولائی، اگست ۱۹۸۱ء کے پرچوں میں اس تعصب پر تفصیل سے تبصرہ کر چکا ہے کہ ویول کی کتاب ''سولجری'' کو ہمارے کچھ لوگ خواہ مخواہ بڑی اہم کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ ایک گھٹیا قسم کی کتاب ہے۔ جہاں سپاہی کو چور اور ڈاکو کہا گیا ہے۔ انگریز نامی ایسے ہوسکتا ہیں۔ مسلمان مجاہد ایسے نام پسند نہیں

کرتے اور جنرل دیول ایک ابن الوقت جرنیل تھا۔

اسلامی لشکر کی پیش قدمی

اسلامی لشکر فسطاط سے روانہ ہوا اور دریائے نیل کو جیزہ کے مقام پر عبور کیا۔ پھر دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ ہی رہا اور سکندریہ کو اپنے دائیں ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے مصر اور لیبیا کے ریگستان میں داخل ہو گیا لیکن سفر ساحل سمندر کے نزدیک نزدیک تھا۔ یہ شروع ۲۷ ہجری کی بات ہے۔ اب نقشہ ششم سے مدد لیں۔ برقہ کوئی چار یا پانچ سو میل دور تھا اور وہاں پہنچنے تک ایک ماہ لگ گیا ہوگا، برقہ سے طرابلس راستہ سیدھا نہیں اس لیے فاصلہ کوئی آٹھ سو میل ضرور ہوگا۔ جس کو طے کرنے میں ڈیڑھ ماہ ضرور لگا ہوگا۔

افریقہ کے ساحلی علاقے زیادہ آباد نہیں ہیں۔ ساحلی علاقے تب آباد ہو سکتے ہیں کہ وہاں اگر کوئی دریا ڈیلٹا بنائے یا سمندر کی بہت زیادہ جھیلیں یا کھاڑیاں خشکی کے اندر گھسی ہوئی ہوں۔ افریقہ کے ساحل پر یہ دونوں باتیں نہ تھیں۔

بہرحال اسلامی لشکر کی یہ پیش قدمی اہل روم کے لیے بھی اتنی حیران کن تھی کہ انہوں نے مقابلے کے بارے میں کوئی کارروائی نہ کی اور مسلمان لشکر جب طرابلس پہنچے تو رومی فوجوں نے کچھ مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مسلمانوں کی تعداد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ جلد ہی انہوں نے طرابلس کے قلعہ میں پناہ لے لی اور اپنے بادشاہ جرجیر کو خبر دے دی۔ جرجیر یونانی نسل کا تھا۔ اس لیے ہم اس کو بھی رومی ہی کہہ رہے ہیں۔ گو ان دنوں وہ کافی خود مختار ہو چکا تھا اور قسطنطنیہ والوں کی ذرا بھی پروا نہ کرتا تھا۔ لیکن اب وہ یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اس کا ایک اور دشمن کے ساتھ واسطہ ہے اس لیے اس نے جہازوں کے ذریعے طرابلس کو مدد بھیجی اس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے پاس کوئی بحری طاقت نہیں ہے۔

طرابلس کی دوبارہ فتح

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بھی طرابلس کے قلعہ کو فتح کر چکے تھے اور پھر واپس چلے گئے تھے۔ افریقہ کے ساحل کی بندرگاہیں رومیوں کے لیے اہم تھیں کہ ان کا بحیرۂ روم پر قبضہ تھا اور جرجیر کے لیے بھی اہم تھیں۔ لیکن مسلمان ابھی ریگستان کو ہی استعمال کر رہے تھے انہوں نے خشکی کی طرف سے طرابلس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اور اسلامی لشکر میں کچھ مجاہدین ایسے بھی تھے جو عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے لشکر کے ساتھ آئے تھے اور انہیں قلعہ کے کمزور مقامات کا پتہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے جرجیر کی بحری کمک وہاں پہنچنے سے پہلے ہی طرابلس پر قبضہ کر لیا اور جرجیر کے لوگ بھاگ گئے۔ چنانچہ جو کمک سمندر کے راستے آ رہی تھی وہ بھی واپس چلی گئی اور جرجیر کو خبر دی کہ مسلمانوں نے نہ صرف طرابلس کو فتح کر لیا ہے

بلکہ اس دفعہ وہ اتنی زیادہ نفری رکھتے ہیں کہ آگے بھی ضرور پیش قدمی کریں گے۔

سبیطلہ کی جنگ

جرجیر نے کارتھیج کو کب خیر باد کہا، اس واسطے میں مورخین خاموش ہیں۔ روایت ہے کہ رومیوں سے خود مختاری حاصل کرنے کے بعد اس نے بہتر سمجھا کہ دارالخلافہ سمندر سے کچھ دور فاصلے پر رکھے۔ اس لیے اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے جرجیر کا دارالخلافہ سبیطلہ تھا۔ نقشہ ہفتم میں نقشہ ششم کی نسبت کارتھیج کے ملک کو زیادہ وسیع طور پر دکھایا گیا ہے، تاکہ مسلمانوں کی حکمت عملی اچھی طرح سمجھ آ جائے کیونکہ اب وہ افریقہ کے بہتر علاقے کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ طرابلس سے آگے دو سو میل سفر کرنے کے بعد مسلمانوں نے اپنا رخ مغرب کی بجائے شمال کی طرف پھیر دیا۔ جرجیر اپنا لاؤ لشکر لے کر مسلمانوں کو روکنے کے لیے جنوب کی طرف آگے بڑھا۔ مورخین اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر بتاتے ہیں اور ہم ساٹھ ستر ہزار کا اندازہ کر چکے ہیں۔ جرجیر کے دستے فیض کے مقام پر پہنچے ہی تھے کہ متحرک مسلمان دستوں نے ان پر حملہ کر دیا اور اس زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا کہ ٹیونس کی فضا اللہ اور رسول ﷺ کے نام سے گونج اٹھی۔

ناگاہ فضا بانگ اذان سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار

(اقبالؔ)

مسلمان مجاہدین کافی عرصہ سے کسی بھرپور جنگ میں حصہ نہ لے سکے تھے وہ جنگ کے لیے بے تاب تھے، پھر اسلام کا لشکر بہت بڑا تھا اور اس کے متحرک ہونے کی وجہ سے گرد و غبار اڑا جس نے جرجیر کے لشکر کو ڈرا دیا۔ اس نے جلدی سے لشکر کو واپس کیا اور سبیطلہ کے سامنے شمال سے جنوب کی طرف اپنے لشکر کی تقریباً چار یا پانچ میل لمبے علاقے میں صف بندی کر دی۔ لشکر کے پیچھے ایک اونچی جگہ پر اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا، جس کے چاروں طرف حفاظتی افواج لگا دیں۔ موسم گرمیوں کا تھا اس لیے مسلمان سبیطلہ پہنچ کر رک گئے اور ان کو بھی رومی صفوں کے سامنے صف بندی کرنا پڑ گئی۔

مسلمانوں کی تین شرائط

جنگ شروع کرنے سے پہلے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جرجیر کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی اور اگر یہ بھی منظور نہیں تو جزیہ ادا کیا جائے۔ اگر یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں تو پھر مسلمان بھرپور جنگ کر کے سبیطلہ کو فتح کریں گے۔ جرجیر نے پہلی دونوں شرطیں نامنظور کیں اور جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔

جنگ کی کارروائی

جنگ کی کارروائی اور صف بندی کے سلسلے میں مورخین خاموش ہیں۔ واقعات کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ایک بازو ایک امیر تھے اور ہر روز سورج چڑھتے وقت جنگ شروع ہو جاتی اور دو پہر تک گھمسان کی جنگ ہوتی لیکن گرمی سخت تھی اس لیے دو پہر کے وقت دونوں لشکر ستانے لگتے۔ ظہر کی نماز کے بعد پھر جنگ شروع ہو جاتی اور سورج غروب ہونے تک جنگ جاری رہتی۔ کسی مورخ نے زمین اور طرفین کی تجویز کو بیان نہیں کیا اس لیے ہم بھی کوئی تدبیراتی تجزیہ یا تبصرہ نہیں کر رہے۔ البتہ اس جنگ کے نفسیاتی اور رومانی پہلوؤں کی طرف کچھ ایسی پیش رفت ہوئی کہ تدبیراتی معاملات پر پردے پڑ گئے۔

نفسیاتی جنگ

جرجیر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو کیسے شکست دے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر کسی طرح وہ مسلمانوں کے سپہ سالار کو تہ تیغ کروا سکے، تو شاید لڑائی جیت جائے۔ اس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کو ابن خلدون نے صبیحہ کا نام دیا ہے۔ جرجیر نے اس کو اس کی تقریباً چالیس خوبصورت سہیلیوں کے ساتھ بلا کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں کھڑا کر کے یہ اعلان کیا کہ جو آدمی مسلمانوں کے سپہ سالار کا سر کاٹ کر لائے گا اس کے ساتھ وہ اپنی لڑکی کی شادی کر دے گا۔

مسلمان سپہ سالاروں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اگلی صفوں میں رہ کر جنگ لڑتے تھے یا وہاں حاضر ہوتے تھے۔ یہی کچھ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی کرتے تھے۔ لیکن جب رومی ان کو صفوں میں دیکھ لیتے تو ان کی طرف ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس وجہ سے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ وہ میدان جنگ میں پچھلی صفوں میں رہیں گے تاکہ رومی ان پر جلدی سے حملہ نہ کر سکیں۔

مدینہ سے کمک

اسی زمانے میں مدینہ شریف میں امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فکر مند ہوئے کہ افریقہ کے علاقے سے کوئی خبر نہ مل رہی تھی۔ ابن خلدون کے مطابق جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن زبیر کو فوج کے دستہ کے ساتھ کمک کے طور پر بھیجا کہ افریقہ کی خبر لائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے کہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے کسی بیٹے کا نام عبدالرحمٰن نہ تھا۔ آپ شہدأ کے نام پر اپنے بیٹوں کا نام رکھتے تھے۔ اس لیے ہم ان کو عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کہیں گے۔ بہر حال جب جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں پہنچے تو انہوں نے حکم دیا کہ مجاہدین باری باری میدان جنگ میں

داخل ہوں گے اور نعرۂ تکبیر لگائیں گے۔ اس طرح گو کمک تو تھوڑی تھی لیکن یہاں بھی جنگ قادسیہ والا طریقہ دہرایا گیا اور مسلمانوں کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ جو مجاہد میدان جنگ میں پہنچتے تھے وہ نعرۂ تکبیر لگا کر پہلی صفوں میں پہنچ کر دشمن کو تلوار کے ہاتھ دکھاتے تھے۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ خود سب سے آخر میں داخل ہوئے اور وہ بھی جنگ میں شریک ہو گئے۔ کافی دیر جنگ لڑنے کے بعد انہوں نے پوچھا کہ سپہ سالار کہاں ہیں تو ان کو بتایا گیا کہ وہ پیچھے ہیں۔

ہر دو عبداللہ کی ملاقات

جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح سے ملے اور خلیفہ سوم کا سلام دیا تو حیرانگی سے پوچھا کہ وہ لشکر کی اگلی صفوں سے اتنا دور کیوں ہیں۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح نے ساری کہانی سنائی۔ تو جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ تو نفسیاتی جنگ ہے۔ آپ اعلان کر دیں کہ مسلمان مجاہدین سے جو جرجیر کا سر کاٹ لائے گا اس کو جرجیر ہی کی بیٹی عطا کر دی جائے گی۔ چاہے وہ اس سے نکاح کرے چاہے لونڈی کے طور پر رکھے، بلکہ اس کی سہیلیوں میں سے بھی اس کو کچھ لڑکیاں عطا کی جائیں گے۔ چنانچہ اسی وقت اسلامی لشکر میں اعلان کر دیا گیا۔ اب صبیحہ کے دعویداروں میں اضافہ ہو گیا تو ساتھ جرجیر کو بھی اپنے سر کی فکر پڑ گئی۔

تبصرہ:

یہ جنگ تمام تدبیری پہلوؤں سے باہر نکل آئی۔ تمام مغربین و مبصرین اور اپنوں نے بھی اس تمام واقعہ کو بڑا رومانی بنا دیا ہے اور جی بھر کر تبصرے کئے۔ اگر ہم سب باتوں کو یہاں لکھیں تو اپنے مقصد سے دور ہٹ جائیں گے۔ البتہ چند پہلو وضاحت طلب ہیں۔ جرجیر نے نفسیاتی جنگ شروع کی اور اس میں اس کو اتنی کامیابی ہوئی کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ اتنے موثر نہ رہے یا ان کو صحیح مشورہ نہ دیا گیا۔ جب ان کو صحیح مشورہ دیا گیا جو ردعمل کے طور پر تھا تو وہ بھی موثر ہو گئے اور جرجیر کو اپنی فکر پڑ گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان کمانڈر کو کہاں ہونا چاہیے۔ بے شک ہم مانتے ہیں کہ امیر کی حفاظت ضروری ہے۔ حضور پاک ﷺ بدر کے میدان میں ایک حفاظتی مقام پر تھے، یہی حالت جنگ اُحد میں تھی۔ لیکن ضرورت پڑی تو اگلی صفوں میں بھی شریک ہو گئے۔ تمام اسلامی جنگوں میں امرأ کی ذاتی دلیری اور میدان جنگ میں اگلی صفوں میں لڑنے کی روایات موجود ہیں۔

امیر لشکر کے میدانِ جنگ پر اثرات

اسلام میں امیر کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی حفاظت بھی اسی طرح اہم ہے۔ لیکن جو امیر اپنی افواج کی اگلی صفوں میں جانے یا رہنے کی ہمت نہ رکھتا ہو وہ اسلامی افواج کے کسی دستہ کا امیر نہیں ہو سکتا۔ اسلامی فلسفہ جنگ کے لحاظ

سے امیر کو باخبر ہونا چاہیے اور وہ اپنے ماتحتوں کو نظر آئے۔ جو کمپنی کمانڈر اپنے ماتحتوں کو نظر نہ آئے وہ کمپنی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اور جو بٹالین کمانڈر کم از کم اپنی پلٹن کی آدھی نفری کو نظر نہیں آتا وہ بٹالین بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جس بریگیڈ کمانڈر یا ڈویژن کمانڈر کے سامنے زمین کا چپہ چپہ بول نہ رہا ہو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے تو وہ کمانڈر اپنے عہدے کے لیے موزوں نہیں۔ اس کو باہر نکل کر اپنی آنکھوں کا استعمال ضرور کرنا چاہیے۔

کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ کمانڈر کی جان کی حفاظت ضروری ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے لیکن کسی حد تک۔ جنگ موتہ میں کیا ہوا؟ جنگ جسر میں کیا ہوا؟ حصہ اول اور حصہ دوم میں وضاحت کردی گئی ہے کہ مسلمان فتح وشکست کے لیے نہیں لڑتا۔ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے لیے لڑتا ہے۔ فتح کے لیے دعائیں مانگتا ہے اور ہر سطح پر امیر موجود ہوں تاکہ اوپر والے کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔

رومانی پہلو اور عورت

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جو مسلمان جرجیر کا سر اس وجہ سے کاٹتا کہ اس کو صبیحہ ملے گی تو اس کا ثواب کہاں گیا؟ اصلی بات یہ ہے کہ مسلمان مجاہدین اللہ اور رسول ﷺ کے لیے لڑ رہے تھے اور جرجیر کا سر کاٹنے کا کوئی فالتو انعام اس دنیا میں مل جاتا تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ یعنی مسلمان مجاہدین صبیحہ حاصل کرنے کے لیے نہیں لڑ رہے تھے۔ اگر وہ مل جاتی تو یہ ایک ایسا انعام تھا جس طرح حیرہ کی فتح کے بعد جناب شویل رضی اللہ عنہ کو کرامہ مل گئی اور جس کا ذکر پہلی کتاب میں موجود ہے اور حضور پاک ﷺ اس انعام کے لیے خود اپنی زندگی میں فرما گئے تھے اور مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ سب حضور پاک ﷺ کی وجہ سے ہے۔

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو تو نے دیا طلوع آفتاب

(اقبال)

جرجیر کا قتل

اس جنگ کا فیصلہ جرجیر کے قتل کی وجہ سے جلدی ہوا، ورنہ بڑی دیر لگ جاتی۔ گو تدبیراتی طور پر واقعات کا زیادہ علم نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے اس جنگ کا کوئی خاکہ نہ بنایا تھا لیکن جرجیر کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کی تجویز اور مسلمانوں کے بھرپور حملہ کو سمجھنے کے لیے نقشہ ہشتم میں ہم بغیر سکیل کے اس جنگ کے دو مرحلوں کو دکھا رہے ہیں۔ روایت ہے کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ دائیں بازو پر متعین تھے، وہاں پر ایک بربر سردار جو اسلام کی طرف مائل ہو چکا تھا، اس نے

پوشیدگی میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات کی اور ان کو بتایا کہ جرجیر کے ہیڈ کوارٹر تک ایک راستہ موجود ہے۔ اور دوپہر کے وقت سب لوگ آرام کرتے ہیں۔ اگر اس راستے سے اچانک چھاپہ مارا جائے تو جرجیر کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ابن سرح رضی اللہ عنہ سے اس چیز کا ذکر کیا اور خود تیس سواروں کے ساتھ ہی اس چھپے راستے جرجیر کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کرنے کی تجویز بنائی۔ ساتھ ہی فیصلہ ہوا کہ اسلامی رسالہ دوپہر کے وقت مسلمانوں کے دائیں بازو کے پیچھے تیار رہے اور جیسے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشارہ ملے وہ دشمن کے بائیں بازو پر حملہ آور ہو جائے۔ اس کے بعد سامنے سے تمام اہل لشکر دشمن پر یلغار کر دیں۔ نقشہ ہشتم کے پہلے مرحلہ میں تجویز کی بنیادی صف بندی اور طریقہ کار دکھایا گیا ہے۔ دوسرے مرحلہ میں تجویز کے عملی پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ معاملات آسانی سے سمجھ میں آ سکیں۔

چنانچہ ایک مقررہ دن حسب معمول مسلمانوں اور رومیوں نے سورج نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملے شروع کر دیئے۔ مسلمانوں کے حملے بڑے پرزور تھے لیکن کچھ حملے ایسے بھی تھے کہ رومیوں کو زیادہ مشقت کا سامنا تھا کہ مسلمان آگے بڑھ کر پیچھے ہٹتے تھے۔ مسلمانوں نے دوپہر تک سخت لڑائی کی، پھر ظاہر کیا کہ وہ تھک ہار کر آرام کے لیے جا رہے ہیں۔ رومی بھی تھک کر آرام کرنے لگے۔ اس دوران ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے تیس سواروں کے ساتھ جیسا کہ نقشہ ہشتم کے پہلے مرحلہ میں دکھایا گیا ہے۔ ایک لمبا چکر لگایا اور جرجیر کے ہیڈ کوارٹر کے نزدیک پہنچ گئے۔ جرجیر بھی گھوڑے پر سوار تھا اور لشکر کی دیکھ بھال کر کے آرام کی غرض سے قلعہ کے اندر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ جناب عبداللہ بن زبیر نے للکار کر اس پر وار کر دیا۔ جرجیر نے گھوڑے سے اتر کر کسی جگہ چھپنے کی کوشش کی تو جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ بھی گھوڑے سے اتر گئے اور جرجیر کو پکڑ کر گرا لیا اور سر کاٹنے لگے تو صبیحہ کی دو تین سہیلیاں ابن زبیر پر جھپٹنے لگیں جنہیں دوسرے مجاہدین نے ہٹا لیا۔ جرجیر کا سر کاٹ کر جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے نیزہ کی نوک پر اوپر اٹھایا اور اسی دوران مسلمانوں کے رسالے نے جرجیر کے لشکر کے بازو پر حملہ کر دیا۔

جرجیر کے لشکر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی اور مسلمانوں نے سامنے سے بھی یلغار کر دی لیکن اب ضرورت اس امر کی تھی کہ سبیطلہ کے قلعہ کے دروازے سے یہ لوگ قلعہ میں داخل نہ ہو سکیں، اس لیے جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ چند مجاہدوں کو لے کر قلعہ کے دروازے پر پہنچ گئے تو قلعہ والوں نے دروازہ بند کر دیا۔ چنانچہ جرجیر کی ساری فوج قلعہ کے باہر تھی اور افراتفری میں اس نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور شام تک قلعہ کے اندر کی فوج نے بھی غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو اتنا مال غنیمت حاصل ہوا کہ آج تک کسی جنگ میں حاصل نہیں ہوا تھا۔ جرجیر کے جانشینوں نے دس لاکھ دینار سالانہ جزیہ دینا منظور کیا۔ روایت ہے کہ مسلمانوں نے آگے پیش قدمی کی اور وہ کارتھیج تک گئے اور اس جگہ پر بھی پڑاؤ کیا جہاں بعد میں قیروان کی چھاؤنی بنائی گئی۔

جرجیر کی لڑکی

مورخین اور مبصرین جب کسی بیان کو پر لطف بنانا چاہیں تو کہانی بھی گھڑ لیتے ہیں۔ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ لڑائی کے بعد کوئی مجاہد بھی جرجیر کی لڑکی کا دعویدار نہ بنا تو سالار لشکر نے حیرانگی سے پوچھا کہ جرجیر کا قاتل کون تھا جس کو صبیحہ عطا کی جائے تو پھر دعویداروں کی تعداد بڑھ گئی۔ تو سالار لشکر نے لڑکی سے پوچھا کہ تمہارے باپ کو کس نے قتل کیا۔ لڑکی نے کہا کہ وہ جوان اس کو دکھائے جائیں۔ یہ جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا دستہ تھا، اس دستہ کو دیکھ کر لڑکی نے جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ پر جا کر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس غم میں اس کے لیے ایک خوشی ضرور تھی کہ جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ بڑے خوش شکل اور وجیہہ تھے۔ بے شک ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا کئی لحاظ سے مقام بہت اونچا ہے کہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کے آنے کے بعد وہ پہلے لڑکے تھے جو کسی مہاجر کے گھر پیدا ہوئے۔ پھر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے اور حضور پاک ﷺ کی عظیم پھوپھی صفیہ رضی اللہ عنہا کے پوتے...... ہر لحاظ سے عظیم تھے۔

تبصرہ:

ہمارا خیال ہے کہ اس میں شک والی کوئی بات نہ ہوگی۔ جناب ابن زبیر نے کوئی دعویٰ نہ کیا ہوگا اور سالار لشکر نے شاید ان سے پوچھا ہو کہ جرجیر کو کس نے قتل کیا تھا تو آپ نے کہہ دیا ہوگا کہ جرجیر کی لڑکی سے پوچھ لیا جائے۔ بہر حال اس جنگ کے واقعات نامکمل ہیں۔ چالیس ہزار کے قریب اسلامی لشکر جس میں عظیم صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عظیم فرزند موجود تھے۔ کئی مہینوں کا سفر تھا اور کئی دن یا مہینے جنگ جاری رہی۔ ہزاروں کے قریب دشمن کو تہ تیغ کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک لاکھ کے قریب لشکر کو شکست دی جا سکی۔ کئی مسلمان شہید ہوئے لیکن حضور پاک ﷺ کے چچیرے بھائی حضرت معبد رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور شہید کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ اسلامی لشکر شمال کی طرف حربی مظاہروں کے لیے روانہ ہو گیا اور جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ہی مدینہ منورہ بھیجا گیا کہ اس فتح کی خبر دیں۔ وہی مال غنیمت بھی ساتھ لے گئے۔

اب آگے دو قسم کی روایتیں ہیں۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ جناب عبداللہ بن زبیر نے اپنی کارروائی کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ تو اتنی بڑی فتح کا سہرا ابن سرح کے سر بندھ گیا اور امیہ خاندان کے لوگ اس پر فخر کرتے تھے کہ ان کے رشتہ دار خلیفہ کے زمانے میں اتنی زیادہ فتوحات ان ہی کے خاندان کے ایک سپہ سالار کی وجہ سے ہوئیں۔

اور اب ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قاصد بنا کر بھیجنے میں بڑی غلطی کی۔ انہوں نے تمام تر فتوحات کا سہرا اپنے سر باندھ دیا۔ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اگلی صفوں میں نہ

ہونے کی کہانی کو اتنا مشہور کیا کہ آئندہ کی فتوحات بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کا یہ داغ نہ دھو سکیں۔

ایک نام کے کئی مجاہدین

اول تو اس جنگ میں عبداللہ نام کے اتنے مجاہدین تھے کہ حساب نہیں۔ مثلاً عبداللہ بن ابی سرح، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر طیار، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم ...... اس کے علاوہ دو اور عبداللہ تھے جن دونوں کے والد کا نام نافع تھا اس لیے دادا کے نام لکھ کر معاملات کچھ الگ ہو سکتے تھے۔ وہ عبداللہ بن نافع بن الحصین اور عبداللہ بن نافع بن عبدالقیس رضی اللہ عنہ تھے۔ الحصین کے پوتے عبداللہ کو افریقہ میں ابن سرح نے اپنا جانشین بھی چھوڑا کہ وہ وہاں سے جزیہ اور خراج وصول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کے فرزندوں کا ذکر ہم نے کیا ہے کہ اس لشکر میں شریک تھے لیکن آگے کوئی ذکر نہیں ملتا کہ کس نے کیا کچھ کیا۔

دراصل اس وقت سازشی لوگ مسلمانوں کے صفوں میں داخل ہو چکے تھے اور انہوں نے اور باتوں کے علاوہ قبائلی حسد یا خاندانی رقابت کو بھی مسلمانوں کے اندر داخل کر دیا۔ تاریخوں میں جو کچھ لکھا ہوا تھا اس کو بھی بعد میں شاید خرد برد کر دیا گیا۔ امیہ خاندان کی کوشش تھی کہ کسی ہاشمی خاندان کے آدمی کی بہادری کا ذکر نہ ہو کہ حکومت ہاشمیوں کے پاس نہ چلی جائے۔ اور چال یہ چلی کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ حضور پاک ﷺ کے بعد ہاشمیوں میں سے کسی نے جہاد میں حصہ نہ لیا۔ کیوں کہ ان کو خلفاء رضی اللہ عنہم کے ساتھ اختلاف تھا۔ حالانکہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے جنگ کربلا میں اپنی شہادت والے روز بھی اسلامی سلطنتوں کی سرحدوں پر جہاد پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ اہل بیت کے ساتھ محبت رکھنے والوں نے بھی یہ بات تسلیم کر لی کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی اور اس کے بعد یہ بات بھی مان لی کہ اہل بیت یا ہاشمی خاندان کے لوگوں نے پہلے تین خلفاء رضی اللہ عنہم کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھا اور جہاد میں حصہ نہ لیا۔ یہ افسوس ناک رویہ ہے اور اس پہلو کا مزید تجزیہ چوتھی کتاب میں پیش کیا جائے گا کہ ہم جہاد اللہ اور رسول ﷺ کے لیے کرتے ہیں نہ کہ حاکم وقت کے لیے۔ اور اصولی طور پر ہمارا حاکم وہ ہوتا ہے جو اطیعو اللہ و اطیعو الرسول کے فرمان کا پابند ہو۔ اس لیے ہر کتاب میں ہم نے ہاشمی خاندان کے لوگوں کی کارروائی کا ذکر ضرور کیا ہے کہ وہ جہاد میں شریک ہوتے تھے۔

افریقہ کے اتنے دور دراز علاقوں کو فتح کرنے کے باوجود مسلمانوں نے اس علاقہ کو باجگزار بنانے پر ہی اکتفا کی اور صرف جزیہ لینے کی شرط پر اسلامی لشکر واپس چلے گئے۔ اور مسلمانوں کے واپس چلے جانے کے بعد اہل روم کا قاصد بھی افریقہ پہنچ گیا کہ اپنا خراج لے جائے۔ جرجیر کے جانشینوں نے یہ خراج دینے سے انکار کر دیا۔ بہر حال مسلمان اور خاص کر مصر کے گورنر عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح اس کے بعد اہل روم کے ساتھ بحری جنگوں میں مصروف ہو گئے جن کا ذکر

اگلے باب میں آئے گا۔ بعد میں اندرونی خلفشار شروع ہوگیا۔البتہ چوتھی کتاب کے آخری ابواب میں ہم پھر افریقہ کے حالات کو آگے بڑھائیں گے۔

افریقہ کی جنگ کے نتائج و اسباق

۱۔ افریقہ کی یہ فتوحات دنیا کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں سے یورپین لوگ جب چاہتے تھے، افریقہ کو تاخت وتاراج کر دیتے تھے۔ اہل یورپ اور اہل کارتھیج کی جنگیں بھی یورپ کے لوگوں اور افریقہ میں یورپ کے پرانے آبادکاروں میں تھیں۔ لیکن مسلمانوں نے افریقہ کو فتح کر کے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اور اہل یورپ نے ایک ہزار سال تک بحیرۂ روم والے راستے سے افریقہ کا رخ نہ کیا۔ وہ پہلے وسطی اور جنوبی افریقہ پر قابض ہوئے اور پھر انیسویں صدی میں شمالی افریقہ میں آنا شروع ہوے۔ اور اب بیسویں صدی میں پھر ان کو یہاں سے خارج کر دیا گیا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی افریقہ کی اس فتح کے بعد شمالی افریقہ کے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر مسلمانوں نے سپین اور سسلی کی طرف یلغاریں شروع کر دیں۔ گو اس فتح تک مسلمانوں نے صرف طرابلس تک کے علاقوں پر قبضہ رکھا اور تیونس کے لوگ صرف خراج دیتے تھے لیکن چند سال بعد مسلمان مراکو پہنچ گئے۔

۳۔ مسلمانوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی علاقے کو فتح کرتے جہاں تک حربی مظاہرے کرتے تھے وہاں سے تھوڑا پیچھے رہتے تھے اور دوسری یا تیسری کوشش میں آہستہ آہستہ آگے پیش رفت کرتے تھے۔ مسلمانوں کی اس حکمت عملی کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

۴۔ مسلمان اب بے فکر تھے۔ مصر کے علاقے پر اہل روم ملا جلا بحری اور خشکی کا حملہ نہ کر سکتے تھے۔ مسلمان بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر قابض ہو چکے تھے۔ اب ان کا رخ جزائر، قبرص، روڈس اور بحیرۂ روم کے اہم سمندر کی طرف تھا۔

۵۔ مسلمان اس وقت دنیا کی ایک عظیم طاقت بن چکے تھے۔ ان کے مقابلے کی کوئی طاقت دنیا میں موجود نہ تھی اور بڑے بڑے اندرونی خلفشار یا خانہ جنگیاں بھی مسلمانوں کو ختم نہ کر سکیں۔

۶۔ افریقہ کی فتوحات کی لڑائیوں کے تدبیراتی پہلوؤں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ دنیا کی عسکری تاریخ میں اتنے بڑے لشکر کا اتنا لمبا سفر ان حالات میں آج سے پہلے نہ ہوا ہوگا۔ اور مسلمان یہ سب کچھ اپنے فلسفہ حیات پر عمل کرنے کی وجہ سے کر سکے۔ مدینہ یا فسطاط سے کارتھیج کی مہم اور دشمن کو اپنے سے تین گنا فوج کو سبیطلہ کے مقام پر شکست دینا ایک عظیم عسکری کارنامہ ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے پاس ذاتی بہادری اور تدبیرات کی تفصیل موجود نہیں ہے۔

۷۔ یہ فتوحات عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عظیم فرزندوں کی جہاد میں شمولیت کی وجہ سے حاصل ہوئیں لیکن بنوامیہ کے

زمانے میں جب پرانی چھوٹی تاریخوں سے الگ تاریخ کی کتابیں لکھی گئیں تو عظیم صحابہ کے عظیم فرزندوں کی ذاتی بہادری والی باتوں کو تاریخ سے خارج کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے واقعات میں امام حسن، امام حسین، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی ذاتی کارروائی کا کوئی ذکر نہیں۔ بہر حال ہمارے سامنے ایک مقصد ہے کہ ہم نے عظیم صحابہ کے عظیم فرزندوں کی جنگ میں شرکت کا ذکر کر کے تفرقہ والی کہانیوں کو توختم کر دیا، ہمارے بعض مورخین نے ناموں کا ذکر بھی تاریخ سے خارج کر دیا ہے۔

پانچواں باب

شام کے محاذ کی مزید فتوحات اور بحری جنگیں

دوسری کتاب

اس سلسلے میں دوسری کتاب میں شام وفلسطین کی فتوحات کو مفصل طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ان فتوحات کا پھیلاؤ بھی کچھ رک چکا تھا۔شمال میں اناطولیہ کا پہاڑی علاقہ آ چکا تھا، مغرب میں سمندر تھا کہ قساریہ کی بندرگاہ فتح کرنے میں کافی دیر لگ گئی۔ اس کے علاوہ طاعون کی وبا سے سرزمین شام میں بڑے نقصانات ہوئے۔ جناب ابوعبیدہ ﷜ کی وفات ایک سانحہ عظیم تھا۔ان کی عمر اس وقت صرف اٹھاون برس تھی اور اسلام کے اس فرزند کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا وہ پور نہ ہو سکا۔ جناب فاروق اعظم ﷜ ان کی وفات سے پہلے ہی بھانپ گئے تھے کہ جناب ابوعبیدہ ﷜ کا آخری وقت آ چکا ہے۔ جب جناب ابوعبیدہ ﷜ نے مدینہ نہ آنے کی درخواست کی تو جناب عمر نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور فرمایا کہ وہ اب اپنے اللہ سے ملنے والے ہیں۔

روایت ہے کہ جناب ابوعبیدہ ﷜ نے اپنی وفات سے تھوڑا پہلے جناب معاذ ﷜ بن جبل کو اپنا جانشین منتخب کیا تو وہ بھی چند دن کے بعد وفات پا گئے۔ کچھ روایات میں ہے کہ جناب عیاض ﷜ بن غنم بھی چند دن ملک شام کے سپہ سالار رہے اور پھر وفات پا گئے۔آپ جناب ابوعبیدہ ﷜ کے چچیرے بھائی بھی تھے اور خالہ زاد بھی۔آپ عراق سے جزیرہ کی فتح کے لیے آئے تو ادھر ہی رہ گئے۔انہی دنوں جناب یزید بن ابوسفیان ﷜ نے چند دن سپہ سالار رہنے کے بعد طاعون سے وفات پائی۔اس کے چند دن جناب عمرو ﷜ بن عاص سپہ سالار رہے اور افواج کو پہاڑوں کی طرف منتقل کیا پھر جناب عمرو ﷜، مصر کی فتح کے لیے چلے گئے جس کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے۔اس کے بعد شام وفلسطین کی سپہ سالاری جناب معاویہ بن ابوسفیان ﷜ کے سپرد ہوئی۔آپ نے جابیہ کی بجائے دمشق کو مرکز بنانے کی تجویز پیش کی جسے جناب عمر فاروق نے منظور فرمایا۔

چھوٹے صوبوں کی امارتیں

مدینہ شریف سے مرکز صرف بڑے صوبوں کے عاملوں کو ذمہ داری دیتا تھا اور آگے صوبے چھوٹے صوبوں یا

ضلعوں میں بٹے ہوتے تھے۔ جناب صدیق اکبر کے زمانے سے فلسطین کا امیر الگ مقرر کیا گیا تھا اور جناب فاروق نے بھی فلسطین، اردن، حمص وغیرہ سب علاقوں کے الگ الگ امیر مقرر کیے تھے۔ اصول یہ تھا کہ جنگ کی صورت میں ایک سپہ سالار اعظم یا بڑا صوبیدار بن جاتا تھا چنانچہ جناب عمر فاروق کے زمانے سے چار صوبے تھے۔ مصر کا دارالخلافہ فسطاط تھا۔ شام، فلسطین کا دارالخلافہ جابیہ اور بعد میں دمشق تھا۔ ایران وعراق کے دو حصے تھے، ایک کی ذمہ داری کوفہ سے نبھائی جاتی تھی اور دوسرے علاقے کی بصرہ سے۔ ان دونوں صوبوں کا مزید ذکر چھٹے اور ساتویں باب میں موجود ہے۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی عمل داری

ہمارے مورخین نے یہ معاملات کچھ گڈمڈ کر دیئے اور جگہ جگہ صوبے اور امرأ کا ذکر شروع کر دیا کہ حمص کا صوبہ الگ تھا۔ پھر یہ بھی جناب معاویہ کے ماتحت کر دیا گیا۔ فلسطین کا صوبہ بھی جناب معاویہ کو دے دیا گیا۔ اور اس طرح یہ کہانی گھڑ لی گئی کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ کو زیادہ علاقوں کی ذمہ داری دے دی۔ بات یہ نہ تھی۔ اصلی حقیقت یہ تھی کہ بعض دفعہ بڑے صوبیدار کو اجازت دے دیتے تھے کہ وہ اپنے علاقے میں کوئی چھوٹا امیر مقرر کر دے۔

چنانچہ حمص کے امیر جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں پر جناب عمیر رضی اللہ عنہ بن سعید انصاری کو مقرر کیا۔ ان کے بعد مورخین لکھتے ہیں کہ اس جگہ کی صوبہ داری جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے سنبھال لی۔ حالانکہ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہاں پر پہلے حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ رہے اور پھر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن خالد رضی اللہ عنہ بن ولید۔ ظاہر ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ علاقے کے عظیم سپہ سالار تھے اور حمص بھی ان کے ماتحت تھا۔ اسی طرح مورخین لکھتے ہیں کہ فلسطین کا صوبہ پہلے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پاس تھا۔ وہ مصر گئے تو ان کی جگہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن علقمہ مقرر ہوئے اور ان کی وفات کے بعد جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے فلسطین کی عمل داری بھی سنبھال لی۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت جب عمال کا ذکر کرتے ہیں تو فلسطین میں علقمہ رضی اللہ عنہ بن حکیم کو عامل بتاتے ہیں۔ اردن میں ابوالاعور سلمی رضی اللہ عنہ کو اور قنسرین میں حبیب بن رضی اللہ عنہ مسلمہ کو۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ قارئین یہ پہلو سمجھ لیں کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ سرزمین شام کے سالار اعظم تھے اور چھوٹے صوبوں کے الگ حکمران تھے۔ اور یہ غلط ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کچھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔

جناب عمر فاروق اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم

ہم یہاں پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو سرزمین شام کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا جناب ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے جانشین کے طور پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

گو چنانچہ اس سلسلہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک بہت بڑا خراج تحسین ہے۔ گو جناب عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملک شام میں کوئی بڑی فتوحات حاصل نہ کیں لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ ملک شام کو اسلامی سلطنت میں جو اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانے میں کسی اور علاقے کو نہ تھی، باقی ہر جگہ سے دشمن فرار ہو چکا تھا لیکن یہاں قیصر روم سامنے قسطنطنیہ میں بیٹھا تھا اور اس کی سلطنت کو اس وقت تک بھی سمندروں اور خشکی دونوں جگہوں پر بڑی وسعت حاصل تھی۔

لیکن ہمارے ہاں ایک ضرب المثل چلتی ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے سیزر (Ceaser) ہیں۔ کسی پرانی تاریخ میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ اور جیسے ہم ''جلال مصطفیٰ'' (ص ۱۹۸) اور دوسری کتاب کے پانچویں باب میں بیان کر آئے ہیں کہ تمام اہل یورپ کے لیے سیزر کا نام مقدس ہے تو ہمارے دانشور بھی سیزر سے متاثر ہو گئے اور خواہ مخواہ ایک ضرب المثل گھڑ لی اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کا نام استعمال کر لیا۔ ہم یہ چیز تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کسی مسلمان کا موازنہ کسی باطل فلسفہ والے ساتھ کریں۔ سیزر، جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں کی خاک کے بھی برابر نہیں ہے۔ ایسے ہی دانشوروں کے لیے علامہ اقبال نے یہ فرمایا:

فکر عرب کو دے کر فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

امیر معاویہ کی سوچ

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے ہی میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم سے گزارش کی کہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان سمندروں پر قبضہ کریں اور جب تک جزیرہ قبرص اور بحیرۂ روم کے باقی جزیروں پر قبضہ نہیں کیا جاتا، فلسطین اور شام کے ساحلی علاقوں کے لیے رومی خطرہ پیدا کرتے رہیں گے۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے جناب علا رضی اللہ عنہ بن الحضرمی کی مثال موجود تھی۔ انہوں نے صوبہ فارس پر قبضہ کرنے کے لیے بحرین میں ایک بحری فوج تیار کی تھی۔ اور اس فوج نے صوبہ فارس پر حملہ بھی کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی اور جناب فاروق رضی اللہ عنہ کو اس فوج کی امداد کے لیے بصرہ سے بڑے لشکر بھیجنا پڑے۔ یہ کہانی پہلی کتاب کے پچیسویں باب میں بیان کیا جا چکی ہے۔

چنانچہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے بحری جنگوں کے سلسلہ میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے مشورہ کیا جو مصر کو فتح کر چکے تھے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا جواب طبری اور ابن خلدون دونوں نے نقل کیا ہے۔ جناب ابن عاص رضی اللہ عنہ

نے سمندر کی بڑی بھیانک تصویر پیش کی کہ وہاں پر پانی اور آسمان کے بغیر اور کچھ نظر نہیں آتا اور لوگ کشتیوں پر اس طرح سوار ہوتے ہیں جس طرح لکڑی پر کیڑا۔ اگر یہ کشتیاں الٹ پلٹ ہو جائیں تو لوگ ڈوب جاتے ہیں اور اگر کشتیوں کو کچھ نہ ہو تو لوگ صحیح وسالم رہتے ہیں۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ

جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب یہ حالات سنے تو آپ نے بحری جنگ کی اجازت نہ دی اور فرمایا۔ ''بخدا مجھے ایک مسلمان کی جان پوری سلطنت روم سے زیادہ عزیز ہے۔ اور ہم نے سنا ہے کہ بحیرۂ شام (بحیرۂ روم) خشکی کے طویل ترین حصہ کے قریب ہے اور روز وشب اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگتا ہوں کہ وہ سیلاب کی صورت میں آگے بڑھ کر زمین کو غرق کردے تو میں ایسے کافر اور پیچیدہ سمندر پر کیسے مسلمانوں کو سوار کردوں۔''

تبصرہ:

ہمارے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں کہ ہم اس خط یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کی تردید کرسکیں۔ خط کا پہلا فقرہ ہمارے لیے نیا نہیں ہے۔ اس قسم کی ہدایات جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے اکثر دیں۔ جن کا ذکر پہلی اور دوسری کتاب میں ہو چکا ہے کہ اسلام خواہ مخواہ مسلمانوں کو کسی مشکل میں ڈالنے کے حق میں نہیں۔ اور صرف سلطنت پر قبضہ کرنا مسلمانوں کے مقصد میں شامل نہ تھا۔ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ انہیں دنیا کو اللہ کے احکام سے آگاہ کرنے کی اجازت ہو۔ اور جہاں پر لوگ ان احکام کو تسلیم کر لیتے تھے، وہاں پر مسلمان ان احکام کو جاری وساری کرتے تھے۔ قیصر روم ان احکام کے نفاذ میں رکاوٹ ڈال رہا تھا اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنا چاہتا تھا، تو ضروری تھا کہ اس کے مزاج کو درست کیا جاتا۔

جہاں تک خط کے دوسرے فقروں کا تعلق ہے تو اس میں جناب عمر رضی اللہ عنہ نے پانی یا سمندر کے شعور کی بات کی ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ اجازت دے تو وہ زمین پر غالب آسکتا ہے۔ اس زمانے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ پانی خشک سے اتنا زیادہ ہے لیکن شک یہ پڑتا ہے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمندر سے ڈرتے تھے اور کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو خشکی تک محدود رکھنا چاہتے تھے؟ ہمارا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطوط یا ہدایات کے آدھے حصوں کو بیان کیا گیا ہے۔ بے شک انہوں نے اس زمانے میں جنگ کی اجازت نہ دی ہوگی، بلکہ صرف تیاری کے احکام دیئے ہوں گے ورنہ آپ کی وفات کے چار سال کے عرصہ میں مسلمان سمندروں پر کیسے چھا سکتے تھے۔ آگے تفصیل آتی ہے کہ جب قبرص پر حملہ کیا گیا تو اس میں مصر سے آ کر بھی فوج شامل ہوئی تھی۔ اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس تجویز کے اکیلے بانی ہوتے تو مصر کی بحری فوج قبرص کی جنگ میں کیسے شامل ہو جاتی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن

عاص تو رومیوں کے ساتھ خشکی پر لڑتے رہے کہ انہوں نے دوبارہ سکندریہ پر قبضہ کر لیا تھا اور دوسرے گورنر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ افریقہ پہنچ گئے تو مصر میں بحری جنگ کی تیاری کس کے حکم کے تحت ہوتی رہی اور اتنا جلدی تیاری کیسے ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان خلیفہ اول اور دوم دونوں کے زمانے سے ایسی تیاریوں میں مصروف تھے۔

حقیقت پسندانہ جائزہ

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سمندر کی جنگ کو معطل رکھا اور سمندر کو سمجھنے کی تیاری کے احکام دیئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کو جہاد اکبر کا نام دیا ہے اور ظاہر ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے بھی تیاری کے لیے احکام دیئے۔ ایک روایت کے مطابق جن لوگوں نے آگے چل کر بحری جنگوں میں حصہ لیا ان میں مصری ملاحوں کے علاوہ یمن اور خلیج فارس کے مجاہد بھی شامل تھے۔ یہ لوگ کافی پہلے ملک شام میں آ چکے ہوں گے اور قرآن پاک میں سیروا فی الارض کے احکام ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم تک دور دور لوگوں کو اسلام کی آغوش میں داخل ہونے کی دعوت دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو سمندری سفر یا سمندری جنگوں سے کیسے روک سکتے تھے۔ جنگ بدر کی مشاورت کے وقت جناب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور المقداد تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر ان کو برق الغمند * میں کودنا پڑے تو وہ اس سے بھی گریز نہ کریں گے کہ جہاد میں رکاوٹوں کی پرواہ نہیں ہوتی اس لیے اسلام کو خشکی پر محدود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے سمندری جہاد کی تیاری میں ضرور مصروف رہے اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں تیاری مکمل ہو گئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ہدایات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد تمام سپہ سالاروں کو جو ہدایات دیں وہ بڑی دلچسپ ہیں کہ ان ہدایات میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت کی ایک جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی ہدایات میں جناب عمر والے دبدبہ کو تو استعمال نہ کیا۔ البتہ یہ ضرور فرمایا کہ جناب عمر کی تمام ہدایات ان کے مشوروں کے تحت ہوتی تھیں یعنی جناب عمر اپنے طریق کار کو مجلس مشاورت کے ساتھ صلاح و مشورہ کے بعد فیصلہ کرتے تھے اور وہ تمام ہدایات اب بھی قائم دائم ہیں یعنی ان پر سختی کے ساتھ عمل جاری رکھا جائے اس سلسلہ میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے خط کا متن حسب ذیل ہے۔

"تم مسلمانوں کے حامی اور محافظ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمہیں جو ہدایات بھیجی تھیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ ہمارے مشورہ سے جاری کی گئی تھیں۔ لہٰذا تمہاری طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل

* "جلال مصطفیٰ"/صفحہ ۴۸

نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ اللہ تمہیں بھی تبدیل کر دے گا اور تمہاری بجائے کوئی دوسرا مقرر ہوگا۔ تم دھیان رکھو کہ تم کیسا کام کرتے ہو، اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے جو کام مقرر کر دیئے ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔"

آپ نے اسی قسم کے خطوط محصلین اور عوام کے نام بھی لکھے جن میں فوجی پہلو کم ہیں اس لیے ہم ان کو یہاں نقل نہیں کر رہے۔ ان خطوط اور اوپر والے خط سے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے طریق کار اور ان کی شخصیت کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ چند لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ گئے، اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ پھر پیدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن افسوس کہ آپ آگے دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ عوام نے کیا کیا۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر صوبے میں محصلین الگ تھے اس لیے جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف مصر میں الگ محصل مقرر کیا بلکہ ہر صوبہ میں ایسے ہی محصلین موجود تھے۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمان سپہ سالاروں، محصلین اور عوام کو چوکنا کر دیا تھا کہ وہ ملک میں اندرونی انتظام کو صحیح چلانے اور سرحدوں کی حفاظت میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پہلے دو خلفائے راشدین کے مقابلے میں سلطنت کو زیادہ وسعت حاصل ہوگئی تھی۔ مغرب میں مسلمان ٹیونس تک پہنچ چکے تھے۔ شمال میں عموریہ سے ہوتے ہوئے آرمینیا، جزیرہ، آذربائیجان، جھیل کیپسین، طبرستان اور دریائے جیحون تک سرحد جاتی تھی۔ مشرق میں کابل، زبلستان سے ہوتے ہوئے مکران اور دریائے سندھ کے علاقے اسلامی سلطنت میں شامل ہوگئے تھے۔ ان حالات میں رومیوں نے دیکھا کہ جزیرہ کے علاقوں میں اسلامی فوج کم ہے تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ علاقے مسلمانوں سے واپس لے لیے جائیں۔

محاذ عراق اور محاذ شام کی ملی جلی کارروائی

چنانچہ رومی جنرل بطریق جندران نے ایک بڑی فوج اکٹھی کی اور خبر ملی کہ قونیہ، سواص اور قس کے علاقوں میں کوئی اسی ہزار فوج اکٹھی ہو چکی ہے۔ جناب امیر معاویہ کی طرف سے ان سرحدوں کی ذمہ داری پر جناب حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ مامور تھے۔ پہلے وہ حمص میں تھے، لیکن پھر آگے قنسرین کو مرکز بنا کر انہوں نے آگے پیش قدمی کی۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اس زمانے میں بحری جنگوں کی تیاری میں مصروف تھے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ چنانچہ انہوں نے خلیفہ سوم کو حالات سے باخبر کیا کہ عراق سے کسی فوج کو بھیج کر ان کے افسر جناب حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ کی مدد کی جائے۔ عراق میں کوفہ کے عامل کی ذمہ داری کا علاقہ شام کے محاذ کے نزدیک تھا جس کا مکمل ذکر اگلے باب میں آئے گا۔ بہر حال اس زمانے میں جناب ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کوفہ کے عامل بن چکے تھے اور وہ خود آذربائیجان سے نیچے کچھ علاقوں میں بغاوتیں فرو کرنے کے کام میں لگے ہوئے تھے۔

آرمینیا کی فتح

جناب ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر سے سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ کو الگ کیا اور حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ کی امداد کے لیے بھیج دیا۔ اس مہم کو سمجھنے کے لیے نقشہ یازدہم سے استفادہ کریں جہاں دونوں مسلمان سپہ سالاروں کے رابطے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جناب حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ، البتہ عراق کی امدادی فوج کے آنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ پھر ان کو خبر ملی کہ بطریق جندراں کا ایک جرنیل جس کا نام موریان ہے وہ جیش القدم کے ساتھ آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ جناب حبیب رضی اللہ عنہ نے اس کو مہلت نہ دی اور اس کی پیش قدمی سے پہلے ہی اس کو جالیا۔ علاقہ مشکل تھا اور دونوں لشکروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے ٹیلے آجاتے تھے جو مسلمانوں کو متحرک طرز جنگ کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔ اس لیے جناب حبیب رضی اللہ عنہ نے چند مجاہدین کو اکٹھا کر کے فیصلہ کیا کہ شبخون مار کر رومی جنرل موریاں کا خاتمہ کیا جائے۔ جناب حبیب رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ام عبداللہ رضی اللہ عنہا بن یزید کہیں نزدیک تھیں۔ انہوں نے ساری بات سن لی۔ جناب حبیب رضی اللہ عنہ رات کے اندھیرے میں چھپ کر موریاں کے خیمے تک پہنچ گئے اور موریاں کے نگہبانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ پھر مجاہدین موریاں پر جھپٹ پڑے اور جس مجاہد نے موریاں کا سر قلم کیا وہ مجاہد کی بجائے اسلام کی مجاہدہ اور جناب حبیب رضی اللہ عنہ کی اپنی زوجہ تھیں جنہوں نے بھی تبدیل کر کے مردوں کے کپڑے پہن لیے تھے۔ جناب حبیب رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک جنگ میں شہید ہو گیے تھے تو ان کی زوجہ محترمہ ام عبداللہ رضی اللہ عنہا کی عزت افزائی کے لیے متعدد مجاہدین نے ان سے نکاح کی درخواست کی لیکن یہ عزت عظیم صحابی جناب ضحاک رضی اللہ عنہ بن قیس فہری کو نصیب ہوئی۔

موریاں کے خاتمے کے بعد رومی لشکر وہاں سے بھاگ گیا اور اس دوران جناب سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ بھی، جناب حبیب رضی اللہ عنہ کے ساتھ آکر مل گئے۔ سلمان کے لشکر کی تعداد کوئی دس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد دونوں سپہ سالاروں نے مل کر آرمینیا کے کافی علاقے پر قبضہ کر لیا بلکہ بطریق جندران بھی مسلمانوں کے خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اس کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ ورنہ وہ مسلمانوں کا وفادار ہے۔ اس نے وہ امن نامہ پیش کیا جو جناب عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم نے اس کو دیا تھا۔ دونوں صحابیوں نے جناب عیاض رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی کا امان نامہ دیکھا تو انہوں نے جندران کو معاف کر دیا اور ریلیقاں اور بروعہ کے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

اس دوران جناب معاویہ نے انطاکیہ کے مقامات سے آگے پیش قدمی کی اور رومیوں نے انطاکیہ اور طرطوس

کے درمیان تمام تر قلعے خالی کر دیئے۔ مسلمانوں نے ان قلعوں کو مسمار کر دیا۔ رومیوں کا طریقہ تھا کہ سردیوں سے پہلے کسی قلعہ میں آ کر قبضہ کر لیتے تھے۔ مسلمان اہل لشکر سردیوں میں کسی قلعہ کا محاصرہ کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس طرح رومی سردیوں میں ان علاقوں پر قابض ہو جاتے تھے۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کا نقشہ مہم پر مطالعہ کریں تو اس پیش قدمی اور حکمت عملی کی خود بخود سمجھ آ جائے گی۔ مسلمان اب بحری جنگوں کی تیاری کر رہے تھے اور ان کا پہلا حملہ قبرص پر تھا۔ اس لیے حکمت عملی کے طور پر اناطولیہ کے کچھ نزدیکی ساحلی علاقوں پر قبضہ کی ضرورت تھی۔

قبرص پر پہلا حملہ

جزیرہ قبرص جس کو Cyprus کہتے ہیں اور آج بھی مسلمانوں اور غیروں کے درمیان وجہ نزاع ہے۔ یہ ملک کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ کا پہلا بحری حملہ اسی جزیرہ پر ہوا جس میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ گورنر شام اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح گورنر مصر دونوں شریک ہوئے تھے۔ بحری جنگوں میں ان دونوں صحابہ کا مقام اولین حیثیت رکھتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پچھلے باب میں ذکر ہو چکا ہے کہ رومی جب سکندریہ سے ناکام بھاگے تو وہ کافی زیادہ کشتیاں سکندریہ کی بندرگاہ میں چھوڑ گئے تھے۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان سب کشتیوں کا خوب استعمال کیا۔ گو ان کشتیوں کے ملاح زیادہ تر مصری ہی تھے لیکن مجاہدین جنہوں نے حملہ میں حصہ لیا ان سب کا تعلق عرب سے تھا اور سب مسلمان تھے اور کچھ روایات ہیں کہ کشتی بان کے طور پر صرف ان مصریوں کو استعمال کیا گیا جو اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحری جنگ کی زیادہ تیاری قساریہ کے مقام پر کی تھی کہ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس شہر کے محاصرہ پر کافی وقت گزارا۔ اور اسی زمانے میں جناب معاویہ سمندر پر قبضہ کی ضرورت کو بھانپ چکے تھے۔ بہرحال پورے شام پر قبضہ اور عمل داری کے بعد بیروت، صور (Tyre) اور طرابلس، شام، Tripoly کی بندرگاہوں پر بھی مسلمانوں کا قبضہ تھا اور یہ مقامات چونکہ قبرص کے نزدیک تھے اس لیے شام کے علاقے سے مجاہدین حملہ کے لیے ان مقامات سے کشتیوں پر سوار ہوئے تھے۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے احکام

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ کو بحری جنگ کی اجازت دیتے ہوئے یہ ہدایات بھی تھیں کہ وہ ازخود اس مہم کی قیادت کریں گے۔ بلکہ اگر ہو سکے تو اپنی زوجہ محترمہ کو بھی ساتھ لے جائیں۔ ساتھ ہی جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ عظیم صحابہ جو شام اور مصر میں ہیں ان کو دعوت دیں کہ وہ دستوں کی کمانڈ کریں۔ چنانچہ صحابہ کرام میں سے جناب

عبادہ ؓ بن صامت اور ان کی زوجہ محترمہ ام حرام، جناب ابوذر غفاری ؓ، جناب المقداد ؓ، جناب الدرداؓ، جناب شداد ؓ بن اوس، جناب عبداللہ بن قیس، جناب سفیان ازدی ؓ ان جنگوں میں شریک ہوئے۔ حضرت عثمان ؓ نے یہ حکم بھی دیا کہ صرف وہی لوگ جہاد میں شریک ہوں جو خوشی سے رضا کارانہ طور پر اس جنگ میں شرکت کرنا چاہیں۔ دونوں موخرالزکر صاحبان یمن کے علاقے کے ہونے کی وجہ سے سمندر کے حالات سے واقف تھے۔ بحری جنگ میں ایسے لوگوں کی ضرورت بھی تھی۔

تبصرہ:

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جہاد سب مسلمانوں پر فرض ہے اور جب کسی طرف جہاد پر جانے کے احکامات مل جائیں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلاں کام میں مصروف ہے۔ صرف امیر کی اجازت سے ہی کوئی آدمی کسی اور کام کے لیے پیچھے رہ سکتا ہے اور پھر جتنے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اتنے آدمیوں کو جہاد پر بھیجا جاتا ہے اور یہ حکومت کی مرضی ہوتی ہے کہ کس کو کس طرف بھیجا جائے۔ لیکن یہاں پر حکم سخت نہ تھا۔ کچھ لچک رکھی گئی کہ سمندر کی جنگ کا پہلا تجربہ تھا اور محدود ضرورت تھی۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ جہاد جو فرض کفایہ ہے، اس سے گریز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس پہلو کو ہم ''جلال مصطفیٰ'' کے آٹھویں باب میں اچھی طرح سے اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت عملی طور پر واضح کر چکے ہیں کہ جہاد سے گریز کی اجازت نہیں۔ بدقسمتی سے تفرقہ ڈالنے والوں نے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں کچھ صحابہ کرام نے عملی طور پر جہاد میں حصہ نہ لیا۔ وہ خلیفہ وقت کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے تھا اور جہاد میں شرکت اپنی مرضی سے ہوتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہ تھی بلکہ عظیم صحابہ اور کاموں پر لگے ہوئے تھے اور اختلاف ہو بھی تو جہاد فرض ہے کہ امام حسین ؓ نے یزید کے ساتھ اختلافات ہوتے ہوئے بھی میدان کربلا میں ایک شرط یہ پیش کر دی تھی کہ ان کو جہاد پر جانے دیا جائے۔ ہم اس کی مزید وضاحت چوتھی کتاب کے آخری ابواب میں کریں گے۔

حضرت عثمان ؓ کی مزید ہدایات

چنانچہ حضرت عثمان ؓ نے جناب معاویہ کو مزید یہ لکھا کہ جناب عمر ؓ نے جب سمندری جنگ کی اجازت نہ دی تھی تو انہوں نے ایسا ہمارے ساتھ مشورہ کے بعد کیا تھا۔ اور جناب عمر ؓ کے اس خط کی نقل بھی موجود ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں آپ کو لکھا تھا۔ اس کے باوجود اب حالات میں تبدیلی کے تحت میں آپ کو اس مہم کی اجازت دیتا ہوں اور عبداللہ ؓ بن ابی سرح آپ کی امداد کے لیے مصر سے بحری فوج لے کر آ رہے ہیں۔

جنرل گلب اپنی کتاب میں اس خط پر یہ تبصرہ کرتا ہے کہ ''بڑی حیرانگی کی بات ہے کہ اس زمانے میں مسلمان امرأ

اپنے خطوط کی کاپیاں یا نقلیں بھی دفتر کے ریکارڈ میں رکھتے تھے۔''

بے شک دینِ فطرت کے پیروکار زبانی وعدہ اور احکام پر دل و جان سے عمل کرتے تھے لیکن ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جب کوئی وصیت یا وعدہ کرو تو بہتر ہوتا ہے کہ کسی کو اس پر گواہ بنالو اور اگر ایسی بات لکھ دی جائے تو اور بہتر ہے۔'' اس وجہ سے مسلمان خلفاءٔ اپنی اکثر ہدایات کی نقلیں سنبھال کر رکھتے تھے ان نقلوں اور روایتوں کو صحیح رکھنے کی وجہ صحابہ کرام کے عظیم فرزندوں نے چالیس المغازی* کی کتابیں لکھیں جن کا اکثر ذکر ہو چکا ہے اور ہماری موجودہ تاریخیں یعنی ابن اسحاق، ابن سعد اور واقدی کی تاریخ انہی کتابوں سے تیار کی گئیں بلکہ محدثین نے بھی ان کتابوں سے استفادہ کر کے فقہ کی کتابیں لکھیں۔

قبرص کی فتح

قبرص پر بحری حملہ کے سلسلہ میں مورخین کسی تفصیل میں نہیں جاتے کہ لشکر کی تعداد کتنی تھی اور شام والی فوج اور مصر والی فوج میں رابطہ کہاں پر اور کیسے قائم ہوا اور نہ ہی یہ تفصیل موجود ہے کہ قبرص کو فتح کرنے والی افواج، قبرص کے کون سے علاقے میں جا کر اتریں۔ پس اتنا کہا جاتا ہے کہ جناب عبداللہ ؓ بن ابی سرح بھی بحری بیڑہ لے کر شام پہنچ گئے۔ اور امیر معاویہ ؓ کے لشکر میں اور کون تھا۔ اس پہلو کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بحری جنگوں کے لیے بڑی تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگ کی حالت میں ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا عبور کرنے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود ایسی جنگوں کے لیے بڑی تیاری اور اعلیٰ پایہ کے رابطے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم صرف یہ تبصرہ کریں گے کہ مسلمانوں نے بھرپور تیاری کی رابطہ اعلیٰ پائے کا تھا۔ تجویز کافی سوچ بچار کے بعد بڑے اعلیٰ پائے کی اور عملی بنائی گئی تو تب ہی مسلمانوں کے لیے یہ مشکل اور اپنی قسم کی پہلی مہم اس شاندار طریقہ سے انجام پا گئی۔

حیران کن کارروائی

شام کے ساحل پر سے کشتیوں میں بیٹھ کر مسلمان مجاہدین قبرص کی طرف روانہ ہو گئے اور جب مسلمان مجاہدین قبرص کے ساحل پر اترے تو وہاں کے لوگ اور حکومت حیران رہ گئی کہ یہ مسلمانوں کی ایک حیران کن کارروائی تھی۔ اہل قبرص نے شاید اس وقت تک کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مسلمان اس طرح کشتیوں میں سوار ہو کر بحیرۂ روم کو عبور کر لیں گے اور ان کے ملک کے چپہ چپہ پر چھا جائیں گے۔ قبرص کی کسی بندرگاہ کے دفاع کا بندوبست تو ضرور ہو گا۔ لیکن سارے ساحل کا دفاع اس زمانے کی سوچ میں ابھی نہ آیا تھا اور مسلمانوں نے اپنی پہلی بحری جنگ میں دنیا کی عسکری تاریخ میں ایک

* فلسفہ جنگ کو کہتے ہیں۔

نئے طریق کار کو جنم دیا۔

چنانچہ روم کی طرف سے قبرص کے گورنر نے مسلمانوں کی اطاعت منظور کر لی اور مسلمانوں کو سالانہ سات ہزار دینار خراج دینے رضامند ہو گیا۔ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ جزیرہ قبرص کو مسلمانوں کے خلاف کسی کارروائی کے لیے رومیوں کو استعمال کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ علاوہ اس طرف کوئی بڑا رومی بحری بیڑہ آیا تو قبرص کی حکومت مسلمانوں کو بروقت خبر بھی دے گی البتہ قبرص کے گورنر نے یہ اجازت چاہی کہ اسے اہل روم کو بھی خراج دینے کی اجازت ہو کہ ان کے ساتھ بھی اس کا وعدہ قائم رہ سکے۔ دوسرے لفظوں میں قبرص کا گورنر غیر جانبدار رہنے کی ایک ظاہراً سعی کر رہا تھا۔ مسلمان یہ نہ چاہتے تھے کہ قبرص خواہ مخواہ میدان جنگ بنے۔ اس لیے ان کو قبرص اور اہل روم کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

اسلامی لشکر اور بحیرۂ روم

قبرص میں فوجیں اتارنے میں کئی مقصد تھے۔ اول تو مسلمان بحیرۂ روم کے اندر داخل ہونے کی ایک سعی کر رہے تھے اور سمندری حالات سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ اس کام کے لیے قبرص کا جزیرہ موزوں ترین جگہ تھی۔

دوم، قبرص کے ساتھ تعلقات رکھ کر مسلمان اہل روم کے بحری بیڑہ کا کھوج آسانی سے لگا سکتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں نے جان بوجھ کر آسان اور سہل شرطوں پر سمجھوتہ کر لیا کہ سمندر میں ان کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ روایت ہے کہ مسلمانوں نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم کے تحت پچاس سمندری حملے کیے۔ البتہ مورخین نے وضاحت نہیں کی کہ یہ حملے تجرباتی تھے یا عملی اور کتنے حملے قبرص کی فتح سے پہلے کیے۔ کتنے اناطولیہ کے ساحل پر کیے اور کتنے حملے بعد میں جزیرہ روڈس یا آبنائے باسفورس کے علاقوں میں کیے۔ بہر حال قبرص کی پہلی فتح ۲۸ ہجری میں ہوئی اور شاید سال کے آخری مہینے ہوں گے کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح افریقہ کی فتوحات سے ۲۸ ہجری کے شروع ہی میں واپس آئے تھے۔

مسلمانوں کی پہلی بحری جنگ

مسلمانوں کی قبرص کی فتوحات نے اہل روم کو پریشان کر دیا۔ وہ فکر مند ہو گئے کہ مسلمان سمندروں میں داخل ہو رہے تھے۔ اہل روم کے پاس مسلمانوں کے خلاف تین بڑی رکاوٹیں تھیں۔ اناطولیہ کے پہاڑ، سردی کا موسم اور سمندر، مسلمان ان تینوں رکاوٹوں کو ختم کرنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن ایسے کاموں پر وقت لگتا ہے۔ اہل روم یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے جو بحری بیڑہ یا کشتیاں بنالی ہیں۔ ان کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ بلکہ اہل روم کی نظر سکندریہ پر تھی اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح سکندریہ پر قبضہ کرنے کی ایک اور کوشش کی جائے۔

چنانچہ اہل روم نے ایک بہت بڑا بحری بیڑا تیار کیا جس میں تقریباً پانچ سو جہاز تھے۔ اہل روم کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کا چھوٹا سا بحری بیڑا مصر کے ساحل کے نزدیک ہے۔ اس لیے ان کے بیڑے نے بھی مصر کے ساحلوں کی طرف رخ کیا۔ اگر وہ بیے اسلامی بحری بیڑے کو سمندروں میں شکست دے دیتے تو سکندریہ پر قبضہ ضرور کر لیتے خواہ یہ قبضہ عارضی ہی ہوتا۔ اور اس سے اہل روم کئی مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ مسلمانوں نے جو دور تک افریقہ کے ساحل پر قبضہ کیا ہوا تھا اس میں خلل پڑ جاتا اور قبرص پر بھی قبضہ نہ رہ سکتا تھا۔ مسلمانوں نے اس وقت تک جتنی کشتیاں یا جہاز حاصل کیے تھے ان سب کو ڈبو دیا جاتا یا یہ جہاز مسلمانوں سے چھین لیے جاتے تا کہ مسلمان بحری طاقت نہ بن سکیں۔

گو قبرص والوں نے مسلمانوں کے رومی بیڑہ کی حرکت کے بارے میں کوئی خبر نہ دی لیکن مسلمانوں نے اب سمندر کی مخبری بھی شروع کر دی تھی۔ ان کو رومی بحری بیڑہ کی حرکت کی خبر مل گئی لیکن وہ گہرے سمندر میں جا کر جنگ کرنے کا اس وقت تک ارادہ نہ رکھتے تھے اور ان کے جہاز ہلکے پھلکے تھے اور وہ ساحل کے نزدیک ایک پھیلاؤ میں تھے۔ جناب عبداللہ بن ابی سرح مسلمانوں کے پہلے بحری جرنیل کہے جا سکتے ہیں اس لیے ان کو اسلام کا پہلا عملی امیر البحر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے باقی کارکردگیوں پر سیر حاصل تبصرہ ہو چکا ہے۔

صواری کی جنگ

نقشہ وہم پر اس بحری جنگ کا ایک خاکہ ہے کہ ہمارے لحاظ سے یہ پہلی بحری جنگ تھی۔ دوسری کا ذکر آگے آئے گا۔ اس جنگ میں رومی جہاز سکندریہ کے نزدیک جب مصر کے ساحل کے پاس پہنچے تو شام کا وقت ہونے والا تھا اور ہوا تھم گئی تھی چنانچہ طرفین نے کشتیوں اور جہازوں کے بادبان کھول دیئے اور جو جہاز جہاں تھے ادھر ہی لنگر انداز ہو گئے۔ مسلمان اس وقت تک دفاعی جنگ کے لیے صف بندی کر رہے تھے۔ لیکن جب رومی جہاز لنگر انداز ہو گئے تو جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے رات ہی کے وقت تجویز بنائی تا کہ صبح سویرے مسلمان مجاہدین چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر رومی جہازوں کے نزدیک پہنچ جائیں چنانچہ اس تجویز کے تحت مسلمانوں نے صبح سویرے رومی جہازوں کے نزدیک پہنچ کر ان پر حملہ بول دیا۔

طریقہ یہ تھا کہ مسلمان تیز اندازی کی مدد سے جہاز کے نزدیک پہنچ جاتے تھے اور پھر جہازوں یا بڑی بڑی کشتیوں کے عرشے پر چڑھ جاتے اور رومیوں کو نیزوں یا تلواروں سے تہ تیغ کر دیتے۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی۔ رومی جو مصر کے ساحل پر اترنے کی امید میں آئے تھے ان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کے کئی جہاز اور کشتیاں ڈبو دی گئیں۔ جانی نقصان کی کوئی حد نہ رہی۔ رومی سمندر کے سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ مسلمان تازہ دم تھے اور ساحل کے نزدیک تھے۔ وہ چھوٹی کشتیوں کے ساتھ جس طرف چاہتے تھے حرکت کر سکتے تھے رومیوں کے نقصان کا اندازہ مشکل

ہے کہ ہر چیز سمندر کی تہ میں چلی گئی۔ کچھ لاشیں سمندر میں تیرتی نظر آئیں یا سمندر نے بعد میں زمین پر پھینک دیں۔ رومیوں کے پاس اب صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ جو کشتیاں یا بڑے جہاز بچ گئے تھے ان پر سوار ہو کر بھاگ جائیں۔ انہوں نے لڑتے ہوئے ان کے بادبان باندھے اور سمندر کی راہ لی۔ مسلمانوں نے محدود تعاقب کیا اور ایسا تعاقب نہ کر سکے جس طرح وہ ریگستان میں کرتے ہیں۔ اس کو صواری کی جنگ میں کہتے ہیں کہ جہازوں کے بادبان کھلے ہوئے تھے۔

جنرل گلب سمیت کئی مغربی مبصرین نے یہ تبصرہ بھی کیا ہے کہ رومی بحری بیڑہ کو اتنی سخت شکست ہوئی تھی کہ اگر مسلمان مجاہدان کا سمندر میں تعاقب کرتے تو کوئی بھی رومی بچ کر واپس نہ جاتا اور رومیوں کو مسلمانوں کے ساتھ دوسری بحری جنگ لڑنے کی اتنی جلدی یعنی تین سال بعد میں ہمت نہ ہوتی۔ ہمارے لحاظ سے مسلمانوں نے بہت اچھا کیا۔ جو تعاقب نہ کیا۔ ہلکے پھلکے جہازوں کو گہرے سمندر میں لے جانا مشکل ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تنبیہ کام آ رہی تھی۔ مسلمانوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا اور رومی اپنے مقصد میں ناکام ہوئے۔ یہ جنگ ہماری عسکری تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قبرص پر دوسرا حملہ

رومیوں کے بحری بیڑہ کا اس طرح مصر کے ساحل تک پہنچ جانا ایک بڑی ہمت والی کارروائی تھی اور وہ آئندہ بھی ایسی کارروائی اور وہ آئندہ بھی ایسی کارروائی کر سکتے تھے۔ مسلمانوں نے اس بیڑے کا سمندر کے اندر تو تعاقب نہ کیا۔ لیکن تعاقب سے جو ثمرات وصول کئے جا سکتے تھے، ان کے لیے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا، کہ شام کے ملک سے جناب معاویہ نے ایک لشکر جرار کے ساتھ قبرص پر حملہ کر کے اس پر مکمل قبضہ کر لیا اور وہاں پکے طور پر بارہ ہزار مجاہدین کو تعینات کر دیا گیا۔ قبرص کے گورنر نے مسلمانوں کو رومی بیڑے کی حرکت کی کوئی خبر نہ دی تھی بلکہ قبرص سے بھی کئی کشتیاں اور جہاز اس رومی بحری بیڑہ میں شامل ہو گئے تھے چنانچہ مسلمانوں کی مہم نے ان لوگوں کے خلاف بھی کارروائی کی جو رومیوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور ساتھ ہی قبرص کو اسلامی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبرص کے علاقہ میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن قیس کو امیر البحر مقرر کیا اور ان کو حکم دیا کہ قبرص سے اناطولیہ کے ساحل پر بحری حملے کئے جائیں ان حملوں کی نشان دہی بھی نقشہ دہم میں کی گئی ہے اور ایسے ہی ایک حملے میں عبداللہ رضی اللہ عنہ بن قیس شہید ہو گئے۔ دراصل وہ باقی مجاہدین سے کچھ الگ ہو گئے تھے اور ان کی شہادت کے بعد رومیوں نے بڑی خوشیاں منائیں کہ ان کے نام سے سارا اناطولیہ خوف و ہراس سے کانپنا شروع ہو جاتا تھا۔ رومیوں کی یہ خوشیاں کچھ پکی قسم کی نہ تھیں کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے جانشین جناب سفیان رضی اللہ عنہ بن عوف ازدی نے یہ بحری

کارروائیاں زیادہ بھرپور طریقے سے جاری رکھیں کہ آپ کا تعلق قبیلہ ازد سے تھا اور آپ یمن کے علاقہ میں بحری سرگرمیوں کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ آپ بھی ایک بحری جنگ میں شہید ہوئے کہ مسلمانوں نے اپنا رخ جزیرہ روڈس کی طرف کر لیا تھا لیکن اب مسلمان ایک بحری طاقت بن چکے تھے۔

دوسری بحری جنگ

مسلمانوں کی ان بھرپور بحری کارروائیوں اور قبرص پر قبضہ کے بعد رومیوں کو معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمان جلد ہی بحیرۂ روم پر مکمل قبضہ کر لیں گے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو بحیرۂ روم میں آگے بڑھنے سے روکنے کی ایک اور کوشش کی۔ اس بحری جنگ کو بھی نقشہ دہم میں دکھایا گیا ہے اور اس جنگ کا مقصد قبرص پر دوبارہ قبضہ کرنا تھا۔ کچھ مسلمان مورخین نے صرف ایک بحری جنگ کا ذکر کیا ہے۔ اس جنگ میں ایک طرف قیصر روم قسطنین اور دوسری طرف امیر معاویہ ؓ اور عبداللہ ؓ دونوں کو اس جنگ میں لڑتے دکھایا ہے۔ لیکن سب مغربی مورخین دو بحری جنگوں کا ذکر کرتے ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ اتفاق ہے کہ مسلمانوں کی تاریخوں کو غور سے پڑھنے کے بعد دونوں جنگوں میں وقفہ کا بیان نظر آتا ہے۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق پہلی بحری جنگ مصر کے ساحل کے قریب ہوئی جس میں مسلمانوں کی کمانڈ جناب عبداللہ کر رہے تھے۔ رومیوں کے کمانڈر کا نام معلوم نہیں اور ہم اس جنگ کا ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری بحری جنگ قبرص سے شمال مغرب میں فناکس کے علاقے میں ہوئی اور مسلمانوں کے کمانڈر امیر معاویہ ؓ تھے اور شہنشاہ روم قسطین رومی بحری فوجوں کی کمانڈ کر رہا تھا۔ نقشہ دہم میں اس جنگ کو الگ طور پر دکھایا گیا ہے۔

جن مسلمان مورخین نے دو بحری جنگوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ پہلی بحری جنگ کو سکندریہ پر قبضہ کرنے کی تیسری کوشش کا نام دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ جنگ ۳۱ ہجری میں ہوئی اور رومی سکندریہ پر قبضہ نہ کر سکے۔ دوسری بحری جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ۳۴ ہجری میں قبرص کے نزدیک ہوئی۔ یہ بیانات بھی ظاہر کرتے ہیں کہ سمندر میں تین سال کے وقفے سے دو الگ الگ جنگیں ہوئیں اور جو مورخین امیر معاویہ ؓ اور شاہِ روم کو سکندریہ کے نزدیک لے جاتے ہیں، انہوں نے دونوں جنگوں کو ایک کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ شاہ روم اپنے ملک سے اتنا دور کیسے جاتا۔ یا امیر معاویہ ؓ اپنے ذمہ داری کے علاقے کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

چنانچہ ہم پہلی جنگ کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور دوسری فناکس کے نزدیک ہوئی جہاں پر قیصر روم زخمی ہوا اور بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ سکا اور صقلیہ چلا گیا۔ وہاں پر تخت کے دوسرے دعویداروں نے اس کو قتل کر دیا اور رومی سلطنت میں پھر تخت کی وراثت کا جھگڑا شروع ہو گیا۔

یہ ۳۴ ہجری کے واقعات ہیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے باقی صوبوں میں سازش کے اثرات کے تحت فتنہ

وفساد شروع ہو چکا تھا جس کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔ یہ بھی اللہ کی رحمت تھی کہ شام کے علاقے میں کوئی فتنہ برپا نہ ہوا کہ مسلمان دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے پھر رومیوں میں خود تخت نشینی کا جھگڑا شروع ہوا، تو اس وجہ سے اگلے ایک دو سال رومی خاموش ہو گئے۔ ہم شام کے حالات کو ادھر ہی چھوڑ کر اگلے باب میں مشرقی محاذ کا رخ کریں گے اور پھر چوتھی کتاب میں یہاں سے حالات کو شروع کر کے آگے مسلمانوں کے قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ تک جائیں گے۔

نتائج و اسباق

۱۔ یہ باب بڑا اہم ہے، ایک طرف بری اور بحری فتوحات کو شیر وشکر کرتا ہے تو دوسری طرف آرمینیا کی فتح سے مشرقی محاذوں کے ساتھ رابطہ قائم ہوتا ہے۔ علاوہ اناطولیہ کی طرف بھی پیش قدمی جاری رکھی جاتی ہے۔

۲۔ ہم نے عملی طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحری جنگوں کے مخالف نہ تھے بلکہ اس سلسلہ میں انہوں نے تیاری کے لیے احکام دیئے۔ بہر حال کچھ مشیت ایزدی بھی ہوتی ہے۔ کیا خبر حضرت عمر کے زمانے میں اگر بحری جنگیں ہوتیں تو وہ سمندروں کو بھی ایک ایسا خط لکھتے جیسا دریائے نیل کو لکھا۔

۳۔ اور سمندر بھی ہمارے لیے مسخر ہو گئے ہوتے۔ پس اس میں اللہ کا راز تھا اور گو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے سمندر کو مسخر کرنے کا اہم کام سرانجام دیا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے سمندر کو مسخر کرنے کی طرف اتنا دھیان نہ دیا جتنا کہ دینا چاہیے تھا۔ اور اگلے چھ سات سو سال صرف بحیرۂ روم میں رہے۔ پھر انہوں نے بحیرۂ عرب کا استعمال بھی چھوڑ کر مشرق کی طرف بھی خشکی کا راستہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے سپین میں زوال اور ترکوں کی پندرہویں صدی عیسوی کی فتوحات نے اہل یورپ کو سمندروں میں پھینک دیا اور سمندروں کی مدد سے انہوں نے ہم پر دو سو سال حکومت کی۔ وہ اب خلاؤں میں جا رہے ہیں اور ہمارے سکولوں میں مادیت کے سبق پڑھائے جا رہے ہیں کہ اس زمین کے گرد و غبار سے کھیلو۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

(اقبال)

۴۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سمندری لڑائیوں کے سلسلہ میں وقتی التوا کو پرانے زمانے سے غلط رنگ میں پیش کیا گیا کہ یہ سمندر بڑا کافر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس میں داخل نہ ہونے کی رائے دے چکے ہیں وغیرہ۔ اس لیے معاملات کو خشکی تک محدود رکھا جائے۔ اس زمانے میں یا بنوامیہ کے زمانے تک اس قسم کی سازش زیادہ گہری نہ تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنوعباسیہ کے زمانے سے یہ سازش گہری ہوتی گئی کہ علم کا زور تھا اور عملی علم، جو عشق سے حاصل ہوتا ہے

اس میں جمود تھا۔

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

(اقبال)

۵۔ بہرحال جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی اجازت اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ کی کوشش سے قبرص کی فتح، سمندری جنگوں اور اناطولیہ کی طرف مزید پیش قدمی نے شام اور مصر کی فتوحات کو قائم دائم کر دیا۔ مشرقی محاذ پر دارالحکومت مدائن پر قبضہ ہو جانے سے ایران کا کسریٰ تو سرگرداں پھر رہا تھا۔ اور نہاوند کی شکست نے اس کی رہی سہی جان بھی ختم کر دی تھی لیکن مصر و شام کے محاذوں کے آگے قیصر روم قسطنطنیہ کے مضبوط قلعوں میں آرام سے بیٹھا تھا۔ ایک طرف اناطولیہ کے وسیع علاقے، موجودہ بلقان کے علاقے اور متعدد سمندری جزیروں پر اس کا قبضہ تھا اور بحیرۂ روم میں اس کا طوطی بول رہا تھا اور مسلمانوں نے ابھی بحیرۂ روم میں پہلا قدم ہی رکھا تھا۔

۶۔ سلطنت روم دنیا کی مانی ہوئی اول نمبر کی بحری طاقت تھا۔ بحیرۂ روم ان کی جھیل تھی اور بحیرۂ اسود ان کا تالاب تھا۔ ایران روم کی جنگوں میں جب ایرانی قسطنطنیہ کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے۔ تو اس زمانے میں بھی بحیرۂ اسود میں اہل روم کی اتنی زیادہ بحری طاقت تھی کہ اس بحری طاقت کی مدد سے ہرقل نے آرمینیا کے راستے مدائن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں نے آرمینیا پر قبضہ کر لیا تھا اور بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر ٹیونس تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام بلند ہو رہا تھا۔ لیکن سب کامیابی کی بسم اللہ مصر اور شام کے ساحلوں پر کی گئی اور بے شک جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ فاتح بحیرۂ روم بھی ہیں۔

۷۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ان کارناموں اور اسلام کی اس خدمت کو ہماری سیاسی اور عسکری تاریخ میں سنہری لفظوں میں لکھا جانا چاہیے کہ انہوں نے اپنے سیاسی تدبر، عسکری خوبیوں اور انتھک کوششوں سے سات سال کے عرصہ میں مسلمانو کو دنیا کی ایک بحری طاقت بنا دیا۔

۸۔ مغربی مورخین اور مبصرین نے اس سلسلے میں بڑے حقیقت پسندانہ تجزیے پیش کیے کہ ان بحری جنگوں میں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد قیصر روم کے لیے شام اور مصر پر دوبارہ قبضہ کرنے والی بات بالکل ختم ہو گئی لیکن افسوس کہ اپنے مورخ سمندر کو "کافر" ہی کہتے رہے۔

۹۔ اہل روم فکرمند ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے بحری جنگوں میں شکست کھانے کے بعد اہل روم اور اہل یورپ مسلمانوں کے ساتھ نپٹنے کے نئے طریقے سوچ رہے تھے۔ ایک طریقہ جو انہوں نے سوچ، وہ یہ تھا کہ اپنے لوگوں

کواسلام کے نظریۂ حیات سے نفرت کرنا سکھایا اور اس کے لیے طریقہ یہ استعمال کیا کہ اسلام کو ہی غلط رنگ میں پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے لوگوں کو اتنا گمراہ کر دیا ہے کہ ان کو اب اسلام میں کوئی اچھی بات نظر نہیں آتی اور اسلام کا مطالعہ وہ تعصب والے اور بودے پیانوں سے کرتے ہیں جس کا ذکر جگہ بجگہ ہو چکا ہے۔

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینہ بے نور میں محروم تسلی!
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں میں
یہ وادی ایمن نہیں شایان تجلی

(اقبالؔ)

۱۰۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے ایک طریقہ ہر سطح پر کافی کامیاب رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تمہیں دشمن ختم کرنے پر تلا ہوا ہو تو تم دشمن کے گھر پر حملہ کر دو یا اس کے گھر کے اندر آگ لگا دو۔ مسلمانوں نے عام طور پر اس طریقہ کو کبھی نہ اپنایا کہ وہ حالت جنگ میں ہوتے تو سیدھی کارروائی کرتے تھے اور حالات امن میں وہ کسی کے ساتھ دغابازی یا بدعہدی نہ کرتے تھے، غیروں نے یہ طریقہ اپنایا۔ چنانچہ اہل یورپ نے قسطنطنیہ کو بچانے کے لیے ہمیشہ کسی سازش سے مسلمانوں کے گھر کے اندر آگ لگائی یا صلیبیوں کو بھیج کر ہمیں اپنے دفاع پر مجبور کر دیا اور ہم بحیرۂ روم یا اناطولیہ کی طرف سے آگے اتنی تیزی سے نہ بڑھ سکے اور سپین میں بھی رک گئے۔

۱۱۔ یہ بڑے وسیع مضامین ہیں اور اپنی ساری تاریخ کے بامقصد مطالعہ کے بعد ہم پر روشن ہو سکتا ہے کہ ہم نے کیا غلطیاں کیں۔ غیروں نے ہمیں کس طرح خراب کیا اور اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

۱۲۔ جہاں تک اسباق کا تعلق ہے تو چھوٹے چھوٹے سبق تو بے شمار ہیں اور کارروائیوں کے ایک ایک پہلو میں ہمارے لیے اسباق موجود ہیں۔ جناب فاروق ﷺ کی جانب سے تیاری کا حکم، جناب عثمان ﷺ کی اجازت، مسلمان امراً کی ذاتی شمولیت، صحیح حکمت عملی، تدبیرات کا قابل عمل ہونا۔ اسلامی فلسفہ حیات پر عمل۔ غرضیکہ کئی پہلو ہیں جو بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن بہتر ہے کہ ہم کچھ وسیع تر اسباق میں بھی جائیں۔ اس باب میں ہم نے اہل روم کے ساتھ اپنی کشمکش کی نشاندہی کی ہے اور یہ دراصل ہماری دوسری کتاب پر ایک اضافہ ہے۔ آگے جا کر چوتھی کتاب میں ہم اس میں اور اضافہ کریں گے اور ہمارے بامقصد اسباب حسب ذیل ہیں۔

الف: یہ جنگ جاری وساری ہے۔ آج فلسطین اور لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ اسی جنگ کا سلسلہ ہے۔

ب: اہل یورپ اور طرح سے بھی ہم پر یلغار کر رہے ہیں۔ ہمیں وہ اپنے بودے فلسفوں کا غلام بنانا چاہتے ہیں،

بلکہ بنا چکے ہیں۔ادب،تہذیب اور ثقافت کی آڑ میں وہ اسلام پر وار کر رہے ہیں اور ہماری نادانی کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ج:وہ لوگ خلاؤں میں جا رہے ہیں،زیر زمین جا رہے ہیں اور ہم اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہمیں وہ لوگ ٹیکنالوجی سکھلائیں گے۔ہمیں اپنی سیاسی وحدت کے تحت ہی سب کچھ سیکھنا ہوگا۔پہلے پاکستان میں پوری قوم کو اللہ کی فوج بنانا ہوگا۔اور پھر پوری امت کو،تو تب ہی ہمارے لیے دنیا میں عزت کے ساتھ رہنا ممکن ہو سکے گا۔

د:ایک اور ضروری سبق یہ ہے کہ تاریخ کا بامقصد مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے کتنا ضروری تھا کہ وہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کو مصر و شام میں رکھتے کہ اہل روم کا مقابلہ ہوتا رہتا۔افسوس کہ ان باتوں کو وجہ نزاع بنا کر ہم خواہ مخواہ قوم میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔

قارئین! ہم اب مشکل دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارے تبصرے محدود اور بامقصد ہونا چاہئیں کہ پرانے زمانے کے اختلافات اور غلط الزام تراشیوں سے سبق سیکھیں کہ فی الحال تو کافی کچھ کھو بیٹھے ہیں۔

اب باد صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام میرا
قبضے سے امت بے چاری کے دین بھی گیا دنیا بھی گئی

(اقبالؔ)

چھٹا باب

کوفہ کا محاذ، امرا اور جنگی کارروائیاں

اس سلسلے کی پہلی کتاب میں مشرقی محاذ یعنی ایران وعراق کی فتوحات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ جناب صدیق اکبر ﷛ اور فاروق اعظم ﷛ کی خلافت کے زمانوں کو الگ الگ بیان کرنے کی بجائے واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ پوری حکمت عملی آسانی سے سمجھ آ جائے اور جس طرح پانچواں باب کتاب دوم پر اضافہ ہے، اس طرح چھٹا اور ساتواں باب کتاب اول پر اضافے ہیں۔ فتوحات ایران میں سرسری طور پر حضرت عثمان ﷛ کے زمانے کے کچھ واقعات بیان کر دیئے گئے تھے لیکن پورے واقعات اگر ادھر ہی بیان کر دیئے جاتے تو زمان کا سلسلہ بہت وسیع ہو جاتا اور ایک طرف وقت کے لحاظ سے ہم بہت آگے نکل جاتے تو دوسری، کتاب کے واقعات کے تانے بانے پہلی کتاب کے ساتھ ملانے میں کافی محنت کرنا پڑتی۔

اس کے علاوہ حضرت عثمان ﷛ کے زمانے میں مشرقی محاذ پر اتنے زیادہ واقعات ہوئے، اتنے امرا تبدیل ہوئے، اتنی بغاوتیں ہوئیں اور اتنے نئے علاقوں پر قبضے ہوئے کہ ان واقعات کو الگ کتاب میں رکھنا ضروری ہو گیا تھا بلکہ آگے جو سازش ہوئی اس نے بھی زیادہ تر انہی مشرقی علاقوں میں جنم لیا اور اگر ان سب واقعات کو ملا دیا جاتا تو قارئین بھول بھلیوں میں کھو جاتے۔

چنانچہ قارئین کی آسانی کے لیے آگے ہم نے اس علاقہ یا محاذ کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ کوفہ کا محاذ اور بصرہ کا محاذ۔ انتظامی طور پر بھی یہ دو الگ الگ صوبے تھے اور ہم نے کوفہ کے لیے نقشہ یازدہم ساتھ لگا دیا ہے اور بصرہ کے محاذ کے لیے نقشہ دوازدہم۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ خلیفہ دوم نے حکم دیا تھا کہ عراق وایران کے علاقوں میں دو بڑی فوجی چھاؤنیاں بنائی جائیں۔ بالکل اسی طرح کے احکام شام کے ملک کے لیے دیئے گئے کہ وہاں پر جابیہ میں چھاؤنی بنائی گئی اور مصر میں بھی ایسے احکام دیئے کہ وہاں پر فسطاط کی چھاؤنی بنائی گئی۔ اسی طرح پہلی کتاب میں ذکر آ چکا ہے کہ ایران و عراق کے محاذ پر کوفہ اور بصرہ کی چھاونیاں وجود میں آئیں۔ دونوں چھاونیوں میں سے ہر ایک میں تیس سے چالیس ہزار کے قریب مجاہدین رہتے تھے اور ضرورت کے وقت اپنی ذمہ داری کے علاقوں میں پھیل جاتے تھے۔ اس نفری سے کوئی

دس ہزار کی نفری باری باری آگے والی سرحدوں میں متعین رہتی تھی۔

کوفہ کے عامل کی ذمہ داری وہاں سے شروع ہوتی تھی جہاں شام کے عامل کی ذمہ داری ختم ہوتی تھی۔ یعنی موصل، آذربائیجان اور جرجان وغیرہ کے علاقے جھیل کیسپین تک کوفہ کے تحت آتے تھے اور اس کی نشاندہی نقشہ یازدہم میں کردے گئی ہے کہ تقریباً سارا شمال مغربی ایران ان کے پاس تھا۔ بصرہ کے گورنر کا علاقہ اور زیادہ وسیع تھا اس کی نشاندہی نقشہ دوازدہم میں ہے۔ جنوب میں صوبہ فارس، مکران سے ہوتے ہوئے مشرق میں قندھار، کابل، ہرات وغیرہ کو شامل کر کے دریائے جیحوں تک کے علاقے اس عامل کی ذمہ داری میں تھے۔ کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کے درمیان حدود تقریباً اصفہان اور نہاوند کے علاقوں سے گزرتی تھیں۔ اور ضرورت پڑنے پر آگے والے علاقوں میں ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔

کوفہ اور بصرہ کے عامل ایک دوسرے کی مدد بالکل اسے طرح کرتے تھے جس طرح شام کے عامل جناب معاویہ اور مصر کے عامل جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ اور ایسے واقعات آپ پچھلے باب میں پڑھ آئے ہیں۔ کوفہ کے محاذ سے شام کے عامل کے لیے جو مدد بھیجی گئی اس کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں علاقے بہت وسیع اختیار کر چکے تھے اور مشرقی محاذ کا نقشہ یازدہم اور نقشہ دوازدہم سے اندازہ لگائیں کہ علاقے کتنے وسیع تھے۔ صرف کوفہ کے محاذ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ کئی امارتوں میں بٹا ہوا تھا۔ جناب عثمان کی خلافت کے آخری سالوں میں جو چھوٹے عامل کوفہ کے سپہ سالار اعظم کے نیچے آتے تھے ان کی تفصیل کچھ اس قسم کی تھی۔ آذربائیجان میں اشعث رضی اللہ عنہ بن قیس، اصفہان میں سائب رضی اللہ عنہ بن اقرع، رماہ میں مالک رضی اللہ عنہ بن حبیب یربوئی موصل میں کلیم رضی اللہ عنہ بن سلامہ۔ قرقیسیا میں جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ باب میں سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ اور حلوان میں عتبہ رضی اللہ عنہ بن النہاس۔ یہ تمام عامل سول انتظام کے ذمہ دار بھی تھے اور اپنے علاقہ کے سپہ سالار بھی کوفہ میں جناب قعقاع رضی اللہ عنہ بہ عمرو عامل کے فوجی مشیر تھے اور تمام علاقوں میں فوجی رابطہ، ضبط اور فوجی کاروائیوں کی تجویز کا معاملہ بھی ان ہی کے ہاتھوں میں تھا۔

تبصرہ

یہاں ایک تبصرہ ضروری ہو گیا ہے۔ ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کے چھوٹے عاملوں کا ذکر شام کے محاذ پر بھی کر چکے ہیں۔ ان میں کوئی بھی جناب عثمان رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار نہ تھا۔ سوائے جناب امیر معاویہ کے۔ اور جن عاملوں کا اب ذکر کیا گیا ہے ان میں بھی کوئی جناب عثمان رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار نہ تھا۔ ظاہر ہوا کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ داروں میں سے بہت کم لوگوں کو امارت پر مقرر کیا۔ حالانکہ رشتہ داری کے معاملہ میں جناب عثمان کچھ زیادہ ہی خاندانوں

کے ساتھ رشتہ میں منسلک تھے اور وہ سب تفصیل آگے آتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رشتہ داری

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ فساد شروع کیا گیا تو اس وقت بھی یہ الزام لگایا کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ اپنے رشتہ داروں کو امارت دیتے ہیں۔ بلکہ ہمارے لحاظ سے غلط طور پر یہ الفاظ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیے گئے کہ بخدا وہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو اس لئے خلیفہ نامزد نہیں کرتے کہ ان کے رشتہ دار اور خاص کر بنوامیہ حکومت پر چھا جائیں گے۔ ہم نے اس چیز کا تجزیہ کر کے اس روایت کو تیسرے باب میں ہی رد کر دیا تھا۔ لیکن اب چونکہ ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کے درمیان میں پہنچ چکے ہیں تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ پچھلے دو ابواب میں ان کے کتنے رشتہ دار امارت پر تھے۔ ہمیں تو کل دو نظر آتے ہیں اور اب اس باب کے امرا کا ذکر کیا گیا ہے تو ان میں سے ایک بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار نہیں ہے۔ آگے البتہ تین ایسے امرا کا ذکر آئے گا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے رشتہ دار اگر کسی کام کے اہل ہوں تو کیا ان کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے اور ان کو کوئی ذمہ داری نہ سونپی جائے تو یہ ایک بے انصافی ہوگی۔ ساتھ ہی حکومت کو بھی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح جیسے لوگوں کی خدمات کی ضرورت تھی اور آگے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کا ذکر آئے گا جنہوں نے کابل فتح کیا تو کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان رشتہ داروں کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھایا جاتا؟

لیکن ایک اور پہلو یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام میں شاید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رشتہ کے لحاظ سے زیادہ خاندانوں کے ساتھ منسلک تھے اور آپ کے رشتہ داروں کی تعداد قریش میں سب سے زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو ہی صلح حدیبیہ * وقت قریس کے پاس اپنا سفیر بنا کے بھیجا۔ آپ کے قریبی رشتہ داروں کی تفصیل لکھی جائے تو بہتر ہوگا۔ آپ بنوامیہ یعنی عبدشمس بن عبدالمناف کے خاندان سے تھے۔ اس طرح تمام بنوامیہ اپ کے رشتہ دار تھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا جناب ہاشم بھی عبدشمس کے بھائی اور عبدمناف کے بیٹے تھے۔ اس لئے بنو ہاشم بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ قریش کے علمبردار بھی عبدشمس کی اولاد سے تھے جن میں عتبہ، شیبہ اور ولید شامل تھے، جو جنگ بدر میں مارے گئے۔ لیکن ان کی اولاد اسلام لائی بلکہ ابوحدیفہ رضی اللہ عنہ بن عتبہ تو جنگ بدر کے وقت سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ تو یہاں پر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ داروں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔

* جلال مصطفیٰ ۳، ص ۱۷۰۔۱۷۱

حضرت عثمان ﷜ کی والدہ ماجدہ اردی ﷝ بنت کریز کو اول تو یہ سعادت حاصل تھے کہ آپ اسلام لے آئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ دوم آپ ﷝ کا تعلق بھی بنو عبد شمس سے تھا کہ عبد شمس کے بیٹے حبیب کی پوتی تھیں۔ اس لئے عبد شمس کی اولاد کا ہر فرد آپ کا رشتہ دار بن گیا۔ لیکن خاص بات تھی کہ آپ کی والدہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ام حکم ﷝ کی بیٹی تھیں۔ اس لئے جناب عثمان ﷜ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بھانجے بھی تھے۔ تو بنو ہاشم میں جناب علی ﷜، جناب جعفر طیار ﷜، جناب عقیل ﷜، جناب عبداللہ ﷜ بن عباس ﷜ یعنی حضور پاک ﷺ کے تمام چچیرے بھائی حضرت عثمان ﷜ کے ماموں تھے۔ جناب زبیر ﷜ بن عوام اور عبداللہ ﷜ بن جحش بھی آپ کے ماموں تھے کہ وہ آپ کی والدہ کے خالہ زاد بھائی تھے اور ام المومنین جناب زینب ﷝ آپ کی خالہ تھیں۔

ان سب باتوں سے بڑھ کے بات یہ ہے کہ جناب عثمان ﷜ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے تو ام المومنین جناب خدیجہ ﷝ کے سارے خاندان کے ساتھ آپ کا رشتہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ جناب عثمان ﷜ نے ولید بن عبد شمس بن مغیرہ کی ایک بیٹی کے ساتھ شادی کی ہوئی تھی اس طرح بنی مخزوم کے ساتھ بھی رشتہ قائم ہو گیا۔ دوسری شادی جناب عتبہ ﷜ بن غزوان کی بہن کے ساتھ کی تو بنی نوفل * کے ساتھ بھی رشتہ داری ہو گئی۔ اس کے علاوہ جناب عثمان ﷜ کی ایک سوتیلی بہن کی شادی جناب عمرو ﷜ بن عاص کے ساتھ ہوئی تھی۔ عبداللہ ﷜ بن سعد آپ کے رضاعی بھائی تھے۔ ولید بن عقبہ بن ابی محیط اخیافی بھائی تھے۔ عبداللہ ﷜ بن عامر ماموں زاد بھائی تھے۔ سعید ﷜ بن العاص بھی بنو امیہ کے خاندان سے تھے کہ آپ جناب خالد ﷜ بن سعید بن العاص بن امیہ کے بھتیجے تھے۔ آپ کی پرورش جناب معاویہ ﷜ نے کی۔

چنانچہ ہم اگر خونی یا خاندانی رشتہ کی تہ میں جائیں تو معلوم ہوگا کہ سب کے سب رشتہ دار تھے۔ لیکن اسلام میں اول رشتہ اللہ اور رسول ﷺ کی وجہ سے ہے۔ اور اگر یہ رشتہ صحیح ہو تو اس کے بعد قرابت داروں کے حقوق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے لیکن اگر یہ رشتہ صحیح نہ ہو تو پھر اس طرح ہوگا جس طرح جنگ بدر میں ہوا۔ جلال مصطفےٰ ﷺ کے پہلے باب میں اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ باپ بیٹے اور بھائی ایک دوسرے کے مقابلہ میں تھے بلکہ جناب ابوعبیدہ ﷜ کا باپ انہیں کے ہاتھوں سے قتل ہوا، کہ بار بار بیٹے پار حملہ کرتا تھا۔ جناب عمر ﷜ کا ماموں العاص انہی کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔ اور دوسرا ماموں ابوجہل بھی سامنے تڑپ رہا تھا۔ جناب ابوبکر ﷜ کو افسوس رہا کہ ان کا بیٹا عبدالرحمٰن ﷜ جو اس وقت تک اسلام نہ لایا تھا، وہ ان کے ہاتھوں سے کیوں کر بچ گیا۔ چنانچہ اس سب وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ ہم مشکل دور میں داخل ہو رہے

* شادیوں کی وجہ سے اور خاندانوں کے ساتھ بھی رشتہ تھا، جس کی تفصیل نہیں دی جا رہی۔

ہیں۔ ہمیں اسلامی فلسفہ حیات کو سامنے رکھ کر حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقا کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے، تا کہ صحیح حالات ہمارے سامنے آ جائیں اور ہم انسانی کمزوریوں یا غیروں کی سازش میں فرق کو سمجھ سکیں۔ تا کہ ہم آئندہ کے لئے کوئی سبق سیکھ سکیں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب بھی دینا ہوگا۔

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

(اقبالؔ)

کوفہ کے عامل

پہلی کتاب میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کے طرز عمل سے بیزاری کا اظہار کیا تھا کہ جب وہ ان پر کسی سخت شخص کو عامل مقرر کرتے تو چیخ و پکار شروع ہو جاتی اور جب کسی معتدل شخص کو عامل مقرر کیا جاتا تو وہ کہتے کہ وہ موثر نہیں اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ کوفہ کے پہلے عامل حضرت سعدؓ بن ابی وقاص تھے۔ دوسرے حضرت عمارؓ بن یاسر۔ اور حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت جناب مغیرہ بن شعبہ کوفہ کے عامل تھے۔ جناب مغیرہ پہلے بصرہ کے علاقے میں تھے اور جب وہ ان علاقوں میں تھے تو ان پر لوگوں نے زنا کا الزام لگایا۔ اسلام میں امراء سے بھی جواب طلبی کی جاتی ہے۔ چنانچہ جناب فاروق اعظمؓ نے ان کو اس مقدمہ کے لئے مدینہ شریف طلب کیا لیکن صرف تین گواہ کسی غیر عورت کا ذکر کر سکے۔ چوتھا گواہ زیاد تھا جو ابن ابی یعنی اپنے باپ کے بیٹے کے نام سے موسوم تھا، اس نے کہہ دیا کہ اس نے عورت کا منہ نہ دیکھا، صرف پاؤں دیکھے اس لئے وہ نہیں کہہ سکتا کہ عورت کون تھی۔ دوسرے گواہ بھی دوسرے بالا خانے میں تھے، جہاں زیاد تھا اور جب سوال جواب ہوئے تو ان کی گواہی شکیہ قرار دی گئی اور ان کو الٹا سزا ملی اور جناب عمرؓ نے جناب مغیرہ کو زنا کے الزام سے بری الذمہ قرار دے دیا۔

زیاد

زیاد کے باپ کے معاملات مشکوک تھے۔ آپ کی ماں طائف میں رہتی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں بڑے لوگ اس کے پاس آتے تھے اور اس طرح زیاد پیدا ہوا۔ لیکن جب طائف کے لوگ مسلمان ہوئے تو زیاد بھی مسلمان ہو گیا۔ پڑھا لکھا تھا۔ اور کافی ذہین بھی تھا۔ اس لئے بصرہ کے گورنر کا ردیف یا میر منشی مقرر ہوا۔ یعنی اسلام میں انسان کا ذاتی کردار دیکھا جاتا ہے نہ کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا باپ کون ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بھی زیاد کی ذہانت سے متاثر ہوئے اور آگے جناب علیؓ بھی زیاد پر بڑا بھروسہ کرتے تھے۔ جناب علیؓ کی وفات کے بعد جناب

معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کی خدمات سے فائدہ اٹھایا بلکہ اس کو اپنا بھائی بنا دیا کہ اس کی شکل جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ملتی تھی۔ چنانچہ زیاد ابن ابی کی بجائے آخری زمانے میں زیاد بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہوا۔ زیاد اور اس کے بیٹے عبیداللہ کا ذکر آگے آئے گا۔ یہی عبیداللہ، یزید کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا اور واقعہ کربلا کا ذمہ دار بنا۔

مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ

جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ''جلال مصطفیٰ'' (ص ۱۶۹، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳) کتاب اول اور اس کتاب کے پہلے باب میں بھی آپ کا ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آخری سالوں میں جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کو کوفہ کا عامل مقرر کیا کہ کسی سخت شخص کی ضرورت تھی تا کہ وہاں کے حالات ٹھیک کرے۔ جناب مغیرہ ثقیف خاندان میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ جناب عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ثقفی شہید ایران آپ کے چچا تھے اور جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو سیاسی اور فوجی لحاظ سے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پایہ کی شخصیت قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی وصیت کی کہ اگر ممکن ہو سکے تو ان کے مقرر کردہ عاملوں کو کم از کم ایک سال ان کے عہدوں پر برقرار رکھا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک سال تک جناب مغیرہ کو کوفہ میں عامل رکھا لیکن اہل کوفہ شکایات پر شکایات بھیجتے تھے۔ گو بیچ میں بات کوئی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک سال بعد جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی عمل داری سے سبکدوش کر دیا۔

جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص

حضرت عثمان کی نظر جناب سعد بن ابی وقاص پر پڑی اور ان کی عظمت اور تجربہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کو کوفہ کا عامل مقرر کر دیا۔ وہاں پر مالیات کا محکمہ ایک اور عظیم صحابی جناب عبداللہ بن مسعود کے پاس تھا۔ لیکن قارئین یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اہل کوفہ نے ان دونوں عظیم صحابہ کے درمیان اختلافات پیدا کر دیئے۔ نظامت بھی کچھ عجیب سلسلہ ہے۔ جناب سعد فوجی سپہ سالار بھی تھے اور گورنر ہوتے ہوئے سیاسی معاملات بھی آپ کے سپرد تھے اس سلسلہ میں جناب سعد کو کچھ فالتو رقم خرچ کرنا پڑتی تھی۔ کچھ لوگوں کو رقم دلوائی کہ کوئی سیاسی یا فوجی ضرورت تھی۔ جناب عبداللہ نے یہ تمام رقم جناب سعد کے کھاتے میں ڈال دی اور تنخواہ سے کاٹنے کی سفارش کی۔ جناب سعد نے اختلاف کیا اور معاملات اسلام کے مرکز کو بھیج دیئے گئے۔ وہاں پر طرفین نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ جناب عبداللہ بن مسعود فقیہ تھے اور جناب سعد سپاہی تھے۔ مقدمات میں فقہا کی رائے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ چنانچہ فیصلہ جناب عبداللہ کی رائے کے مطابق ہوا۔ جناب سعد کو یہ بات منظور نہ تھی تو آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ کچھ مورخین نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ حضرت

عثمان کو مجبوراً جناب سعد کو سبکدوش کرنا پڑا۔ بہر حال بات ایک ہی ہے۔ نہ تو جناب سعدؓ اور نہ ہی جناب عبداللہؓ میں سے کوئی ایک بھی جناب عثمان کا رشتہ دار تھا۔ اس لیے سازش والے یہاں پر کوئی جانبداری کا الزام نہ پیدا کر سکے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یہ شان تھی کہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اور وہ اصول کو نہ توڑتے تھے اسی میں ان کی عظمت تھی۔ ہم نے اس کو تفرقہ بنالیا۔

ولید بن عقبہ

بہر حال جناب سعد کے کوفہ کی گورنری کو چھوڑنے کے بعد ولید بن عقبہ کو کوفہ میں عامل مقرر کیا گیا۔ جناب ولید اس سے پہلے جزیرہ کے علاقے میں عامل تھے اور آپ کو وہاں پر جناب عمر فاروقؓ نے متعین کیا تھا۔ اس سے پہلے جناب صدیق اکبر کے زمانے میں آپ ہی نے جناب خالدؓ اور جناب عیاضؓ بن غنم میں رابطہ قائم کر دیا۔ علاوہ اس بات کا مختصر ذکر دوسری کتاب میں ہو چکا ہے کہ آپ بھی جناب عیاض بن غنم کے ساتھ تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد جزیرہ کے سارا علاقہ آپ کی عمل داری میں تھا۔ آپ جناب عثمان کے اخیافی بھائی تھے اور کوفہ میں جناب عثمان کسی ایسے آدمی کو مقرر کرنا چاہتے تھے جس پر وہ مکمل بھروسہ کر سکیں۔

اب بد قسمتی یہ تھی کہ ولید کا باپ عقبہ بن ابی محیط کافر تھا اور جنگ بدر میں باقی کافروں کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ عقبہ نے مسلمانوں پر بڑے ظلم کئے تھے اور ابن اسحاق کے مطابق عقبہ کے پکڑے جانے کے بعد اس کا سر قلم کیا گیا کہ یہ تو وہی آدمی تھا، جس نے اس وقت حضور پاک ﷺ پر اوجھ پھینکا جب آپ سجدے میں تھے۔ یہی آدمی مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ ملاپ کر کے حضور پاک ﷺ سے آ کر سوال پوچھتا تھا۔ اور مسلمان اس کو کفار کا شیطان کہتے تھے۔ ویسے یہ بھی روایت ہے کہ عقبہ جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔ باپ کے مارے جانے کے بعد ولید مسلمان ہو گیا تھا۔ اور جہاد میں نہ صرف شرکت کرتا رہا بلکہ بڑا نام پیدا کیا اور حضرت عمرؓ آپ کے ساتھ بہت خوش تھے۔ کوفہ والوں نے بھی پانچ سال جناب ولید کے ساتھ اچھی طرح گزارنے کے بعد ان کے خلاف طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لیں کہ حضور پاک ﷺ نے ولید سمیت عقبہ کی تمام اولاد کو در بدر کرنے کا حکم دیا تھا اس میں کوئی سچائی نہ تھی۔ باپ کے گناہ کی وجہ سے اولاد کو کیسے سزا دی جاتی۔ ہاں رشتہ والی بات ٹھیک تھی کہ آپ نہ صرف جناب عثمان کے اخیافی بھائی تھے بلکہ خاندان امیہ میں سے بھی تھے۔ تو ہم نے اگلے صفحہ پر بنوامیہ کا شجرہ وضاحت کے ساتھ دیا کہ رشتہ والی بات آسانی سے سمجھ آ جائے۔ لیکن رشتہ والے معاملات لمبے چوڑے تھے۔ ولید کی ایک بہن کی شادی جناب عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ بھی ہوئی تھی۔ جناب عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمان کے ہم زلف بھی تھے کہ دونوں کی شادیاں شیبہ کی بیٹیوں کے ساتھ ہوئی تھیں۔ یہ وہی شیبہ تھا جو جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔ اس لیے رشتہ میں تو سب ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے لیکن کفر اور اسلام کی لڑائی

میں سب رشتے ختم ہو جاتے تھے۔

مصر کا گورنر عبداللہ بن عثمان رضی اللہ عنہ کا رضاعی بھائی تھا اور بصرہ کا گورنر عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر ماموں زاد بھائی تھا اور اپنی خلافت کے آخری سالوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی درخواست پر ان کو گورنر بنایا۔ اپنے خاندان سے آپ کے والد طلوع اسلام سے پہلے وفات پا گئے۔ آپ کے چچا حکم اسلام نہ لایا تھا۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مکہ سے طائف جلاوطن کر دیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حکم اسلام لے آیا لیکن حکم کے اسلام والی بات مشکوک ہے۔ اس کا بیٹا مروان مسلمان ہوا اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے ردیف کا کام کیا۔ دوسرا چچا سعید رضی اللہ عنہ حالت کفر میں مر گیا۔ اس کے بیٹے جناب خالد رضی اللہ عنہ اور جناب عمر رضی اللہ عنہ اولین مسلمانوں میں ہیں اور حصہ دوم میں ان کا کثرت سے ذکر ہے۔ جناب خالد کے دو بھائی العاص اور عبیدہ حالت کفر میں جنگ بدر میں مارے گئے۔ العاص کا نوجوان بیٹا سعید اسلام لے آیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سالوں میں کوفہ کا گورنر بنا۔ ولید کا باپ عقبہ بھی جنگ بدر میں حالت کفر میں مارا گیا۔

ابوسفیان، حضرت عثمان کے والد کے چچیرے بھائی تھے۔ آپ اسلام لے آئے اور آپ کے دو بیٹے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید رضی اللہ عنہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جناب یزید رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں طاعون کی وبا میں شام میں وفات پا گئے۔

امیہ کا ایک بھائی ربیعہ تھا جس کے بیٹے عتبہ اور شیبہ۔ اور عتبہ کا بیٹا ولید جنگ بدر میں مارے گئے تھے۔ عتبہ کے بیٹے جناب ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ اولین اسلام لانے والے ہیں اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ عبد شمس کے بھائی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا جناب ہاشم تھے۔ اور دونوں عبد مناف کے بیٹے تھے۔ عبد مناف، قصیٰ کے بیٹے تھے۔

ولید بن عقبہ کے جہاد میں مصروفیت

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی خلافت سنبھالی اس زمانے میں ملک شام میں قیصر روم کی طرف سے کچھ خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ خلیفہ سوم نے ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کو حکم دیا کہ وہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے اس طرف کوچ کریں۔ روایت ہے کہ جناب ولید رضی اللہ عنہ نے سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ کو جیش المقدم کے طور پر آگے بھیجا اور اس کے بعد آپ خود ایک لشکر جرار لے کر آذربائیجان کی طرف روانہ ہو گئے۔ دراصل یہ علاقے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ بن الیمان نے فتح کئے تھے اور اس کا ذکر دوسری کتاب میں ہو چکا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے سالانہ آٹھ لاکھ درہم خراج دینے پر صلح کر لی تھی لیکن اب خراج دینا بھی بند کر دیا۔ جناب ولید رضی اللہ عنہ جب آذربائیجان پہنچے تو مدینہ شریف سے حکم ملا کہ سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ کو تو حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ

کے ساتھ آرمینیا کی طرف پیش قدمی کرنے دیں اور خود باقی علاقوں سے بغاوت فرو کریں۔

آپ نے ایک لشکر عبداللہ رضی اللہ عنہ بن شبیل احمسی کے ماتحت آگے بھیجا جس نے لوقان، البسیر اا اور طلیسان پر قبضہ کر لیا تو پھر لوگوں نے صلح کی عرض کی اور حسب وعدہ آٹھ لاکھ درہم خراج ادا کر دیا۔ ویسے جناب ولید اکثر بغاوتوں کو فرو کرنے یا جہاد کے لیے کوفہ سے باہر رہتے تھے۔

علاوہ سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ کے دوسرے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، ولید رضی اللہ عنہ کے احکامات کے تحت اسی علاقہ میں جہاد میں مصروف تھے اور ترکوں کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

ظاہر ہے کہ جناب ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ پانچ سال تک کوفہ کے عامل رہے اور وہ خود اکثر سرحدوں پر جہاد میں جاتے رہتے تھے۔ ان کی فوج کا ایک بڑا حصہ ویسے بھی سرحدوں پر جہاد میں مصروف تھا اور جب سرحدوں پر امن بحال ہو گیا تو جناب ولید واپس کوفہ آ گئے۔ لوگ ان کے ساتھ بڑے خوش تھے کہ انہوں نے اپنے دروازے پر کوئی دربان مقرر نہ کیا اور ہر قسم کے لوگ کسی روک ٹوک کے بغیر ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔

لیکن انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا۔ اس کو جتنی سہولت ملتی جائے، اس کی خواہشات بڑھتی رہتی ہیں اور فتنہ والے تو ویسے بھی ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ اور موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں اور جیسے موقع ملے وہ شرارت کر دیتے ہیں۔

فتنہ کی بنیاد

کوفہ میں فتنہ کی بنیاد چند مفسدوں نے باندھی کہ انہوں نے ایک نوجوان ابن حلیمان فراعی کو شہید کر دیا۔ ان مفسدوں کو گرفتار کر لیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اطلاع بھیجی گئی کہ مفسدین نے برسر عام قتل کیا ہے۔ اسلامی سلطنت میں یہ اپنی قسم کا پہلا واقعہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ تمام مفسدین کو قتل کر دیا جائے۔ مفسدین کی تعداد نہیں بتائی گئی اور صرف چار اشخاص کے نام دیئے ہیں۔ لیکن وہ لوگ کوفہ کے گرد و نواح کے باشندے تھے اور ابن حلیمان دور کے علاقے کے تھے پس نسلی اور علاقائی تعصب کو ہوا دینے کے لیے سازشی آگے آ گئے۔ قتل کے سلسلہ میں تو کچھ نہ سکتے تھے کہ صحیح بات تھی۔ لیکن جناب ولید بن عقبہ کے خلاف بہتان تراشیوں اور الزامات کی بھرمار کر دی۔

جس زمانے میں جناب ولید رضی اللہ عنہ جزیرہ میں عامل تھے تو وہاں پر آپ کی بنو تغلب کے ایک شاعر کے ساتھ ملاقات ہوگئی۔ اس کا نام ابوزبید تھا اور نصرانی تھا۔ شراب کا سخت رسیا تھا۔ وہ ظاہراً اسلام تو لے آیا لیکن شراب پینے سے باز نہ آیا تھا۔ گویہ کام چوری چھپے کرتا تھا۔ اب ابوزبید بھی کوفہ آ گیا اور جناب ولید کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ دوستی کی وجہ سے جناب ولید نے ابوزبید کو اپنے گھر ٹھہرالیا۔ اس پر لوگوں نے جناب ولید پر بھی تہمت لگادی کہ دونوں مل کر شراب

پیتے ہیں اور یہ دوستی شراب کی وجہ سے ہے۔ پھر ایک دن ایک مفسد نے جناب ولید کے گھر میں داخل ہو کر ان کی مہر چوری کر لی اور مشہور کر دیا کہ وہ تو اپنی مہر کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ادھر ہی تھے تو مفسدین نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جناب ولید کی ایسی کردار کشی کی کہ جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی بات مان لی اور ولید سے پوچھا یا بلکہ بات چیت میں اتنی بدمزگی پیدا ہو گئی کہ دونوں کے درمیان تو تو میں میں کی نوبت آ گئی۔

شراب نوشی کا الزام

لیکن سازشیوں نے صرف اسی پر اکتفانہ کی۔ وہ مدینہ پہنچ گئے اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے چار گواہ پیش ہو گئے کہ جناب ولید شراب پیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جناب ولید کے ظاہراً شراب پینے کو ثابت کرنا تو مشکل تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ انہوں نے جناب ولید کو قے کرتے دیکھا اور یہ قے شراب کی تھی۔ یہ مقدمہ اپنی قسم کا آپ تھا کہ شراب کی قے وہی کر سکتا ہے جس نے شراب پی ہو۔ سازش کرنے والوں میں تو جندب، ابوحبثہ غفاری اور حثامہ بن صعب وغیرہ شامل تھے۔ جندب کا لڑکا ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے ایک بے گناہ کو قتل کیا تھا اور اس کے بعد اس کو قتل کی سزا مل گئی تھی۔ اسی طرح باقی سازش میں شمولیت والے بھی ان لوگوں کے رشتہ دار تھے، جنہوں نے قتل کیا تھا کہ گواہوں میں ابوزینب اور ابومورع بھی شامل تھے جن کے لڑکوں نے قتل کیا تھا اور سزا پا چکے تھے۔

مقدمے کا فیصلہ

مورخین میں اختلاف ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود کیا یا اس کے قاضی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اکثر مورخین کی رائے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی قاضی تھے یا ان سے مشورہ ضرور کیا گیا اور ولید کو چالیس کوڑوں کی سزا دی گئی۔ روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے جرم میں صرف چالیس کوڑوں کی سزا دیتے تھے۔ اور جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے بعض دفعہ جرم سخت ہونے کی وجہ سے اسی کوڑوں کی سزا بھی دی اور وہ بھی ٹھیک تھا۔ لیکن جناب علی نے اس سلسلے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی اور صرف چالیس کوڑوں کی سزا دی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوڑے مارنے کے لئے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ لیکن وہ معذرت کر گئے اور کوڑے جناب عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے مارے۔ ایک راوی نے ذکر کیا کہ جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص نے کوڑے مارے کہ وہ بھی بنوامیہ کے خاندان سے تھے اور ان کو جناب ولید کی جگہ کوفہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔

مسلمانوں میں یہ بھی رواج تھا کہ جب اپنا کوئی شخص گناہ کرتا تو اس کو خود سزا دی جاتی تھی یا سزا دیکھی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کو کوڑوں کی سزا اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ اور جب کسی کو اس دنیا میں اپنے گناہ کی سزا مل جائے تو وہ آخرت میں سزا سے بچ جاتا ہے۔ یہ اسلامی فلسفہ حیات ہے اور کسی کے سزا ملنے کے بعد اس کی عیب جوئی نہیں کرنے چاہیے۔ وہ ہم سے بہتر تھا کہ سزا یہاں مل گئی۔ ہم اپنے گناہوں پر پردے ڈالے پھرتے ہیں۔ یہاں بھی اللہ کے چور اور آخرت میں بھی سزا کے منتظر ہیں۔

تبصرہ:

یہاں چند تبصرے ضروری ہیں کہ شراب کے بوتے میں آئی تو ایک گورنر کو نہ صرف اپنے عہدے سے معزول کر دیا جائے گا بلکہ اس کو کوڑے بھی لگے اور یہاں ہمارے ملک کا ایک سربراہ کھلم کھلا اعلان کرتا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے، لوگوں کا خون نہیں پیتا تو عوام ''پاکستان زندہ باد'' اور ''سربراہ ملک زندہ باد'' کے نعرے لگتے ہیں۔ کیا ہم نے اسی لئے پاکستان بنایا تھا؟ تو اس طرح تو یزید بن معاویہ بھی شراب ہی پیتا تھا اور لوگ آج بھی کسی ایسے ہی شخص کو منتخب کرنے کو تیار ہیں۔ راقم پر بھی یہ الزام لگ سکتا ہے کہ وہ اس زمانے میں کیوں خاموش رہا۔ خدا کے فضل سے راقم نے ایوب ہال میں چھ سو افسروں کے سامنے اس سربراہ ملک کے منہ پر یہ باتیں کیں جن کو آج اس کتاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قرابت داری کا الزام لگانے والے بھی سوچیں کہ انہوں نے اپنے قرابت دار کو نہ صرف گورنر کی عہدے سے معزول کیا بلکہ بر سر عام کوڑے بھی لگوائے۔ کیا اس سے بہتر انصاف کی مثال مل سکتی ہے؟ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنہوں نے ولید کے ساتھ ایسا کیا، کیا وہ باقی لوگوں کے ساتھ بھی اسی طرح نہ کرتے؟ تیسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فقہ میں لچک کو بیان کر دیا تھا کہ شرابی کو کوڑے لگ سکتے ہیں۔ وہ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور کم بھی۔ دین فطرت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ہر سوال کا جواب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم رفقا کے اعمال و اقوال میں ملتا ہے۔ صرف ڈھونڈنے کے ضرورت ہے اور صرف اپنے قلم میں پاکیزگی ہونی چاہیے۔

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامہ حق نے تری جبیں

(اقبالؔ)

سعید بن العاص رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ولید کی جگہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ آپ کا تعلق بھی امیہ

خاندان سے تھا۔ آپ کی پرورش آپ کے چچا اور عظیم صحابی خالد(۱) بن سعید رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ جناب سعید کے والد العاص (۲) حالت کفر میں بدر میں مارے گئے تھے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ اس وقت بچے تھے اور اپنے مسلمان چچاؤں خالد رضی اللہ عنہ بن سعید اور عمرو رضی اللہ عنہ بن سعید کی پرورش میں رہے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن سعید جنگ اجنادین میں شہید ہوئے اور جناب خالد بن سعید جنگ یرموک کے بعد شام کی ایک جھڑپ میں مرج الصفر کے پاس شہید ہو گئے تھے۔

جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب سعید رضی اللہ عنہ کی شادی سفیان بن عوف کی بیٹی سے کرائی۔ سفیان شہید ہو گئے اور ان کی چار بیٹیاں رہ گئی تھیں۔ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف نے بھی جناب سفیان رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی کے ساتھ شادی کی تو وہ جناب سعید رضی اللہ عنہ کی ہم زلف بن گئے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی جناب مسعود رضی اللہ عنہ بن نعیم کی بیٹی کے ساتھ کی ہوئی تھی اور مشہور صحابی جناب جبیر رضی اللہ عنہ بن مطعم بھی ان کے ہم زلف تھے۔

یہ سب واقعات بیان کرنے اور تفصیل میں جانے کا مقصد یہ ہے کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ولید کے بعد بھی انہوں نے اپنے ایک رشتہ دار کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ جناب عثمان کے جناب سعید کے ساتھ رشتہ داری یہ تھی کہ حضرت عثمان کے دادا جناب سعید کے پردادا تھے۔ لیکن ہم نے جناب سعید کے باقی رشتہ داروں کا ذکر بھی کر دیا ہے کہ جناب سعید بن العاص کے نہ صرف بہت زیادہ رشتہ دار تھے بلکہ آپ کے دو چچا اللہ کے راستے میں شہید ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جناب سعید رضی اللہ عنہ کو بہت پسند کرتے تھے۔

جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کی جہاد پر روانگی

جناب سعید رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ساتویں سال امارت سنبھالی یعنی تقریباً ۳۰ ہجری میں کوفہ کے عامل بنے اور انہی دنوں میں طبرستان کے علاقے میں جہاد کے لئے روانہ ہو گئے۔ ایران اور عراق کے علاقوں کی جنگوں کو طبری نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور خاص کر طبرستان تو ان کا اپنا علاقہ تھا لیکن ایک واقعہ کو تین یا چار دفعہ مختلف راویوں کی زبان سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان بھول بھلیوں میں پڑ جاتا ہے۔ نقشوں کا استعمال تو خیر اس زمانے میں بالکل نہ تھا لیکن فاصلوں کا بھی بالکل ذکر نہیں ملتا۔ طبرستان کے مشرق میں ساتھ ہی خراسان کا علاقہ جو بصرہ کے عامل کے ماتحت تھا اور کسی مورخ نے واضح نہیں کیا کہ مغرب میں شام اور کوفہ کے علاقوں کی درمیانی حد کون سے تھی اور مشرق میں بصرہ اور کوفہ کے علاقوں کے درمیانی حد کیا تھی۔ اس لئے نقشہ یازدہم میں کوفہ کے محاذ پر پہلے ولید

---

۱ جلال مصطفیٰ، ص ۲۸۲ اور ۲۹۰

۲ جنگ بدر میں حالت کفر میں دو العاص مارے گئے تھے۔ دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ماموں تھا جو ان کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا، یہ اس لیے لکھ دیا کہ شک نہ رہے۔

بن عقبہ کے زمانے میں آرمینیا کی کارروائی اور بعد میں جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کے زمانے میں جرجان اور طبرستان کی کارروائی دکھائی گئی ہے۔ اگلے باب میں نقشہ دوازدہم میں بصرہ کا محاذ دکھایا گیا ہے۔ یہ دونوں نقشے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ درمیانی علاقے دونوں نقشوں میں موجود ہیں کہ دونوں کی "حدود" کا خاکہ سمجھ میں آ جائے۔

جناب سعید رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ کی امارت سنبھالی تو وہ لوگ جنھوں نے جناب ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف الزام لگائے تھے، واپس کوفہ آ گئے۔ ان میں ابوحشہ الغفاری، جندب اور صعب کے نام آتے ہیں لیکن ساتھ اشتر کا بھی پہلے دفعہ ذکر آتا ہے کہ وہ بھی فسادیوں کے ساتھ کچھ تعلق رکھتا تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ لوگ واقعی کسی سازش میں شریک تھے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ نادانی کی وجہ سے کیا ہو کہ ان کے لڑکے جو قتل میں شریک تھے اور ان کو سزا مل گئی تو اس وجہ سے وہ لوگ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔

جناب سعید رضی اللہ عنہ جب کوفہ پہنچے تو انہوں نے تمام لوگوں کو خطبہ دیا اور سمجھایا کہ وہ لوگ اسلامی اخوت قائم رکھیں اور جہالت کے زمانے والی باتوں کی طرف واپس نہ جائیں لیکن حالات خراب ہو چکے تھے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ چند دن میں ہی حالات کو بھانپ گئے اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ کوفہ کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ اہل شرف و سابقین اسلام مغلوب ہو چکے ہیں۔ اور نئی پود کوفہ کے بازاروں میں دندناتی پھرتی ہے۔ البتہ طبرستان کے علاقے میں کچھ بغاوت ہو چکی ہے اور میں ایک لشکر لے کر وہاں جا رہا ہوں۔ ممکن ہے جہاد پر جانے کے بعد یہ لوگ کسی شغل میں مصروف ہو جائیں۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے نیک کردار والے لوگوں کی کمک بھیجنے کی گزارش کی۔

مدینہ سے کمک

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب سعید رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ کوفہ کے حالات کو ٹھیک کرنے کی کوشش کریں اور بصرہ کا عامل بھی اگلی حدود پر جہاد کے لیے پیش قدمی کرنے والا ہے۔ آگے دونوں لشکر ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کن کن صحابہ کرام کو سعید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیجا اور کون پہلے سے وہاں موجود تھے۔ اس سلسلے میں مورخین خاموش ہیں۔ وہ صرف قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو کا ذکر کرتے ہیں کہ وہاں موجود تھے۔ لیکن جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جناب سعید رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے ان کا ذکر موجود ہے۔ چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔

جناب امام حسن، جناب امام حسین، جناب سلمان فارسی، جناب ابوہریرہ، جناب عبداللہ بن عمر، جناب عبداللہ بن زبیر، جناب عبداللہ بن عمرو بن عاص اور جناب حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہم خراسان کا علاقہ بھی ساتھ تھا اور وہاں نیشاپور کے علاقے تک بصرہ کے محاذ سے مجاہدین پہنچ گیے جن کا ذکر اگلے باب میں ہوگا۔ یہ اس لیے جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص نے اپنا تمام تر رخ طبرستان کی طرف پھیر دیا۔

شمالی ایران میں جہاد

جناب حذیفہ ؓ بن الیمان سے ان علاقوں سے واقف تھے اور حضرت عمر کے زمانے میں انہوں نے یہاں پر کئی مقامات فتح کئے تھے ان کو جناب سعید ؓ نے قومس بھیجا جو انہوں نے جلدی فتح کرلیا۔ اور جناب سعید ؓ خود ایک لشکر لے کر جرجان پہنچ گئے جرجان کے حاکم نے دو لاکھ دینار سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ اس کے بعد جناب سعید ؓ نے طمیسہ کا رخ کیا۔ طمیسہ دریا کے کنارے سرحد جرجان اور طبرستان پر ایک بڑا آباد شہر تھا۔ اور وہاں کے لوگ مقابلہ کے لیے باہر نکل آئے۔ سخت خونریز جنگ ہوئی لیکن کھلے میدان میں ایرانی، مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے۔ جناب سعید ؓ خود صف اول میں تھے اور چند مجاہدین کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ جہاں طمیسہ کا والی کھڑا تھا۔ جناب سعید ؓ نے طمیسہ کے والی پر اتنا سخت وار کیا کہ اس کی زرہ بھی کٹ گئی اور تلوار پاؤں تک پہنچ گئی۔ اب ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے اور کھلے میدان میں بری طرح مار کھانے کے بعد اہل طمیسہ نے بھاگ کر اپنے قلعہ میں پناہ لے لی۔ مسلمانوں نے محاصرہ کرلیا جو کئی ماہ تک جاری رہا۔ مسلمانوں کے پاس اس وقت بڑی اعلیٰ قسم کی منجنیقیں بھی تھیں۔ چنانچہ ہر جگہ سے ان منجنیقوں کو اکٹھا کیا گیا اور اس زور سے سنگ باری کی گئی کہ اہل شہر بوکھلا گئے اور مسلمانوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

طمیسہ سے فارغ ہونے کے بعد جناب سعید نے فامنہ کے صحرائی علاقوں کو بھی فتح کیا۔ پھر قومس پہنچ کر اہل جرجان کے ساتھ امن کا سمجھوتہ کرلیا اور تمام لوگوں نے مسلمانوں کی اطاعت کرلی لیکن جناب سعید ؓ ادھر ہی ٹھہر گیے تاکہ حالات کا مزید مطالعہ کرسکیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ جناب ولید ؓ بن عقبہ نے آذربائیجان کے علاقے میں جناب سلمان ؓ بن ربیعہ کو متعین کیا تھا اور ان دونوں بھائیوں سلمان ؓ اور عبدالرحمٰن ؓ کی کارروائیوں کا ذکر ہوچکا ہے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر آرمینیا کی فتح میں جناب حبیب ؓ بن مسلمہ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اس زمانے میں شام کے لشکر قبرص یا اناطولیہ کے ساحل کی طرف زیادہ مصروف تھے۔ اس لیے آرمینیا اور آذربائیجان کی سرحد پر پھر کچھ بغاوت ہوگئی۔ جناب سعید ؓ نے جناب حذیفہ ؓ بن الیمان ؓ کو پھر اس علاقے میں باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ بلکہ مورخین نے دو لشکروں کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ جناب ابوہریرہ ؓ اور جناب سلمان فارسی ؓ بھی ان لشکروں میں شامل تھا یا ایک لشکر کی سرداری بھی ان دو صحابہ میں سے کسی ایک کے سپرد تھی۔ مسلمانوں نے مل کر بغاوت تو فرو کردی۔ لیکن روایت ہے کہ کوفہ کے لشکر اور شام کے لشکر والوں کے درمیان کچھ تو تو میں میں ہوگئی۔ یہ نادانی کی وجہ سے یا دولت آجانے کے سبب سے تھا۔ اس بارے میں کوئی پکی رائے نہیں دی جاسکتی۔ ممکن ہے سازش ہر سطح پر کام کررہی ہو۔ لیکن

پھر بھی قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم ان سازشیوں کے کھلونے کیوں بنتے ہیں۔ محاذ پر یہ پہلی طبقاتی تفرقہ کی کہانی ہے۔

بلنجر کی لڑائی

اسی زمانے میں سرحد پر بلنجر کی لڑائی ہو۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں پر ترکستان کے ساتھ حدود ملتی تھیں۔ اس لڑائی کو سب مورخین بہت بڑی لڑائی کہتے ہیں، جس میں متعدد مسلمان شہید ہوئے۔ کچھ صحابہ کرام بھی شہید ہوئے جن میں جناب یزید بن معاویہ نخعی، عمرو بن عتبہ اور منصد شیبانی رضی اللہ عنہ قابل ذکر ہیں۔ بلکہ اسی جنگ میں جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن ربیعہ خود بھی شہید ہوئے اور ان کی لاش پر دشمن کا قبضہ ہوگیا۔ انہوں نے جہاں ان کو دفن کیا ہے وہاں ایک مزار بنالیا گیا۔ اس جنگ میں بھی جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور جناب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی شرکت کا ذکر ہے۔

یہ موٹے موٹے حالات تھے، جو جناب سعید رضی اللہ عنہ کو بغاوت فرو کرنے میں پیش آئے اور ان مقامات کا سرسری ذکر کر دیا گیا ہے جہاں وہ خود گئے یا جہاں انہوں نے کوئی لشکر بھیجا۔ یہ تمام تر بڑی دلچسپ مہمات ہیں لیکن اس علاقے کے مورخین نے ان مہمات کی تفصیل میں جانے کی کوشش نہ کی۔ بلاذری یا اصفہانی وغیرہ نے بھی اختلافی باتوں اور افسانوں پر زیادہ زور دیا، حالانکہ ان علاقوں کے مورخ، جو بعد کے زمانوں میں ہوئے۔ اگر وہ لوگوں کی مدد سے پرانے زمانے کے حالات کی تفصیل میں جاتے تو ہر شہر سے اس زمانے کی جنگوں کے کچھ حالات مل جاتے۔ جس طرح بعد کے مورخین نے مصر وافریقہ کے حالات کے جنگی پہلوؤں کو بہتر طور پر بیان کیا ہے جن میں ابن حکیم، مراکشی اور ابن خلدون خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

البتہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ عظیم صحابہ کرام اور خاص کر جناب امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی شمولیت کے ذکر کے علاوہ اور کسی کارروائی کا ذکر نہیں ملتا۔ حضور پاک ﷺ کے نواسے جن کو آپ نے کندھوں پر اٹھایا۔ وہ جہاں جاتے ہوں گے لوگ محبت کا اظہار کرتے ہوں گے اور آپ دونوں نے نہ صرف افریقہ اور کوفہ کے صوبوں میں کام کیا بلکہ آگے بصرہ کے اس لشکر میں بھی شامل تھے جو شمالی وزیرستان میں آیا کہ وہاں کٹر یشنڈی کے مقام پر حسن ماہان (۱) برکی کا ایک کتبہ ملا ہے، جس پر درج ہے کہ یہاں وادی بویہ (بالائی ڈور) کے مقام پر ان مشرکین کا ہیڈکوارٹر تھا جن کے خلاف جہاد میں امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کی کوفہ واپسی

بغاوت فرو کرنے کے بعد جب ہر جگہ حالات ٹھیک ہو گئے تو جناب سعید رضی اللہ عنہ کوفہ واپس آ گئے۔ گو کافی مجاہدین

۱۔ خاندان عباسیہ کے زمانے میں حسن ماہان برکی وزیرستان کا گورنر تھا۔

سرحدوں پر ہی متعین رہے جب تک مجاہدین سرحدوں پر رہتے یا جہاد میں مصروف رہتے تو حالات ٹھیک رہتے تھے۔ لیکن اب چھاؤنی میں واپسی ہوگئی اور محفلیں لگنا شروع ہوگئیں۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ کو ازخود بھی ایسی محفلوں میں کوئی خامی نظر نہ آئی لیکن یاد رہے کہ محفلیں کسی مقصد کے تحت جمائی جانی چاہئیں۔ بے مقصد محفلیں ایک دن اپنے بداثرات لے آتی ہیں۔ اسلام کی محفلیں مسجد میں ہوتی ہیں گھر میں محفلوں کی ممانعت نہیں لیکن جب کوئی چیز حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو پھر اس میں خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔

کوفہ کی محفلیں

جہاد سے واپس آنے کے بعد جناب سعید نے کوفہ کے لوگوں کے ساتھ بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ہدایات دے چکے تھے کہ لوگوں کے ساتھ میل ملاپ کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ عام قسم کی محفلیں بھی لگاتے تھے جن کو آج کل کی زبان میں ''دربارِ عام'' کہہ لیں اور کچھ خاص قسم کی محفلیں بھی لگاتے تھے۔ اس مجلس کے شرکائے کے نام ابن خلدون نے تفصیل سے لکھے ہیں جن میں تقریباً ہر قبیلہ کے لوگ ہوتے تھے یعنی سرزمین عرب سے قریش یا مہاجرین، انصار، بنواسد، بنوتمیم وغیرہ کوفہ کے گردونواح سے بنوبکر، نخعی، ہمدانی وغیرہ ہوتے تھے۔ رات کو صحبت گرم ہوا کرتی، ہنسی مذاق اور لطیفہ گوئی کی باتیں شروع ہوتیں۔ پھر ہوتے ہوتے اس ہنسی مذاق نے طعن، تشنیع اور سخت کلامی کی صورت اختیار کر لی۔ اگر بات کو اسلامی فلسفہ حیات تک محدود رکھا جاتا۔ اور فلسفہ، اصول یا نظریہ کی باتیں کی جاتیں، تو ٹھیک تھیں لیکن جہاں طنز وطعن آئے وہاں مادیات اور ذاتیات کی باتیں بھی شروع ہوگئیں۔ پھر قبائل کی برتری اور رقابت تک بات جا پہنچی۔ اور آخر ہاتھا پائی تک نوبت آئی۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ کے اعلیٰ پولیس افسر جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو اشتر نخعی وغیرہ اس کو پڑ گئے کہ وہ قبیلہ بنواسد کا تھا۔ بہرحال اتنی خرابی پیدا ہوئی کہ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے یہ محفلیں لگانی بند کر دیں اور یہ محفلیں گروہوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اب ہر گروہ نے الگ الگ اپنی اپنی مجالس لگانا شروع کیں۔ جہاں پر ایک دوسرے اور حکومت کے خلاف بھی باتیں کی جاتیں۔ ان باتوں کی تفصیل نانویں باب میں ہے۔ بہرحال حالات اتنے خراب ہو گئے کہ جناب سعید کے قابو سے باہر ہو گئے۔ آپ مدینہ میں گئے کہ جناب عثمان کو حالات سے باخبر کریں تو آپ کی غیر حاضری میں حالات اتنے خراب ہوئے کہ یزید بن قیس نے تو حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو نے حالات کو سنبھالا دینا شروع کیا۔ لیکن جیسا کہ آگے ذکر آئے گا جن اب بوتل سے باہر نکل چکا تھا۔ ہر آدمی مکمل آزاد تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ کوئی آدمی برسربازار کھڑا ہو جاتا اور بغیر کسی وجہ کے حکومت کے خلاف بہتان تراشیاں شروع کر دیتا۔ جناب سعید، حضرت عثمان سے ہدایات لے کر واپس آئے کہ اہل کوفہ سے پوچھا جائے کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو سعید کو کوفہ میں داخل بھی نہ ہونے دیا

گیا۔ اور جرعہ کے مقام پر قادسیہ کے قریب ہی روک دیا گیا۔ بلکہ اتنی سخت کلامی ہوئی کہ جب جناب سعید رضی اللہ عنہ کا غلام آگے سے بول پڑا تو اس کو قتل کر دیا گیا۔ باغیوں کا سردار تو یزید بن قیس ہی تھا۔ لیکن روایت ہے کہ جناب سعید رضی اللہ عنہ کے غلام کو اشتر نخعی نے قتل کیا۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ تو اہل کوفہ نے کہا کہ تمہاری جگہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو عامل بنایا جائے۔

جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

جناب ابوموسیٰ اشعری کا ذکر "جلال مصطفیٰ" (ص ۲۴۶) میں بھی ہو چکا ہے اور پہلی کتاب میں اکثر ابواب میں آپ کا تذکرہ آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت آپ بصرہ کے عامل تھے اور جیسا کہ اگلے باب میں ذکر آئے گا کہ لوگوں کے کہنے پر جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو سبکدوش کر کے وہاں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کو عامل مقرر کیا تھا۔ اب جناب سعید رضی اللہ عنہ راستے سے ہی واپس چلے گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو بڑی معمولی بات ہے انہوں نے جناب سعید رضی اللہ عنہ کو سبکدوش کر دیا اور جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا عامل مقرر کر دیا اور چند دنوں کے لیے حالات میں خاموشی آ گئی۔ لیکن سازش اور فساد میں کمی نہ آئی۔ اور اس کا ذکر آخری تین ابواب میں ہوگا۔ اب جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قرابت داری کا الزام لگاتے ہیں، وہ سوچیں کہ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے کیا قصور کیا اور پھر بھی جناب عثمان نے لوگوں کی بات تسلیم کر کے اُن کی مرضی کے عامل کا تقرر کر دیا۔ لیکن سازش جاری رہی۔

نتائج و اسباق

۱۔ کوفہ کے محاذ کے حالات کچھ نامکمل ہیں کوفہ، ایران، عراق کے محاذ کا مغربی حصہ یا سیکٹر تھا اگلے باب میں مشرقی حصہ کے بیانات کے بعد عراق و ایران کا کچھ مکمل خاکہ ٹھیک طور پر نظر آ سکے گا۔ بدقسمتی سے محاذ اب سرحدوں پر نہ تھا بلکہ اندرون خانہ تھا۔

۲۔ ایک طرف مسلمان اپنی سرحدوں پر جہاد میں مشغول تھے۔ اور گو ایران کا بادشاہ اپنا پایہ تخت چھوڑ چکا تھا لیکن وہ ابھی بھی زندہ تھا (اُس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا) اسی وجہ سے اندرون ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں، جن میں یزدجرد اور ایرانی امرا کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا۔

۳۔ مسلمان مجاہدین کے لیے غیروں کی ان بغاوتوں کا قلع قمع کرنا کچھ تو آسان تھا اور سرحدوں کی حفاظت بھی ہو رہی تھی لیکن اپنی اندرونی محاذ آرائی عجیب شکل اختیار کر گئی تھی۔ غلطی یہ ہوئی کہ مسجدوں کے علاوہ باقی مقامات پر بھی مجالس اور محفلیں قائم ہو گئیں دولت کی ریل پیل تھی۔ طرح طرح کی کانا پھوسیاں شروع ہو گئیں۔ عمر رسیدہ صحابہ کرام یا تو وفات

پا چکے تھے یا محدود جگہوں یعنی گھروں اور مسجدوں تک جاتے تھے۔نو جوان مسلمان دنیا کی مانی ہوئی سلطنتوں کوشکست دے کراُن کے باجگذار ملکوں کے مالک بن چکے تھے۔امرا حاکم ضرور تھے،لیکن مساوات کی سختی سے پابندی کی وجہ سے کچھ لوگوں نے ایسی برابری اور آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔

۴۔ امراء کی ہر کاروائی پر انگشت نمائی ہوتی تھی۔امراء بھی نوجوان تھے۔نادانی اور انسانی کمزوری تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ ان امراء کی معمولی لغزش والی بات بھی خلیفہ تک پہنچادی جاتی تھی۔حاکموں کی زندگی مشکل ہوگئی۔لوگ ان کے سر پر سوار ہو رہے تھے۔ہر آدمی کوئی جائز یا ناجائز شکایت لئے پھرتا تھا۔وہ آزادی اور جمہوریت کا دلدادہ ہو چکا تھا۔وہ کہتا تھا کہ فرد آزاد ہے وہ جو کچھ چاہے کرے۔

۵۔ سازش والے بھی بیچ میں موجود تھے۔انہوں نے تمام تر حالات کی ذمہ داری خلیفۂ وقت اور امراء پر ڈال دی۔کچھ اچھی مثالیں بھی تھیں کہ جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسے صحابی گوشہ نشین ہو گئے اور انہوں نے اطاعت امیر کے اصول کو اپنی ذاتی باتوں پر ترجیح دی، جس کا ذکر آگے آئے گا۔لیکن نوجوان طبقے میں اکثر لوگ دندناتے پھرتے تھے اور اُن میں سے بعض سازشوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ کرام کے ناموں کو غلط طور پر استعمال کیا گیا کہ یہ عظیم صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اُن کے امراء کی کارکردگی سے نالاں ہیں۔ان کی طرف لوگوں کو جھوٹے خط لکھے جاتے، کہ ہاں لوگ خروج کریں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عاملوں کو وہاں سے ہٹا دیں۔ دوسری طرف ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غلط اطلاعات مہیا کی جاتیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عامل یہ کر رہے ہیں اور وہ کر رہے ہیں۔اور عظیم صحابہ حیران تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ ان عاملوں کے خلاف کوئی کاروائی کیوں نہیں کرتے۔

۷۔ مصر میں ایک گروہ پیدا ہو گیا اُن کی خط وکتابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے کو تیار ہیں،کوفہ، بصرہ میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے جنہوں نے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زُبیر رضی اللہ عنہ کے لیے ایسی باتیں مشہور کر دیں،اور ایک دوسرے کے لیے یہ خط وکتابت شروع کر دی تھی، کہ کسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہٹا دیا جائے اور اپنی مرضی کا خلیفہ مقرر کریں۔اہل سازش اتنے ہوشیار تھے، کہ خلافت کے دعویدار بھی آگے تین رکھے، کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے ہٹ جانے کی صورت میں خلافت کا جھگڑا جاری رہے۔

۸۔ شر پسند لوگوں اور سازش والوں کی تعداد تو تھوڑی تھی۔لیکن وہ عام لوگوں کی نادانی کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔بھیڑ چال والی بات تھی۔کانا پھوسیاں شروع تھیں اور لوگوں کے ساتھ اس قسم کے وعدے کیے جا رہے تھے جس طرح آج کل سیاستدان عوام کے ساتھ کرتے ہیں۔"جلال مصطفیٰ" (ص ۲۹) کے پیش لفظ میں ان حالات کی تفصیل ہے۔

۹۔ جنرل گلب اور کچھ مغربی مبصرین نے ان حالات کا موجودہ حالات کے ساتھ موازنہ کیا ہے کہ اس طرح آج کل بھی کئی ملکوں میں لوگوں کو بہکا کر بازاروں اور گلیوں میں بھیج دیا جاتا ہے، جہاں پر وہ اپنے ملک کے سامان کی توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ نعرے لگاتے ہیں کہ ہم باغی ہیں اور ایسے حقوق مانگتے ہیں جو پورے کرنے مشکل ہوتے ہیں۔ اخبار والے بڑے مزے کی سُرخیاں جماتے ہیں کہ عوام اور پولیس کی آنکھ مچولی ہوئی ہے۔ اور جب کوئی فساد کرنے والا مر جاتا ہے تو اس کو شہید بنا کر قوم کا ہیرو بنایا جاتا ہے۔

۱۰۔ جنرل گلب کو شاید معلوم ہوگا کہ انگریز ایسا خود کر چکے ہیں، کہ سولھویں صدی میں اُن کے عوام نے اپنے بادشاہ چارلس اول کو پھانسی دی، تو آگے سے کرام ویل کی آمریت ملی۔ تو پھر اُسی بادشاہ کو شہید بادشاہ کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔ اور کچھ عرصہ بعد تخت اُس کے بیٹے کے حوالے کر دیا۔ فرانس والوں نے بادشاہت ختم کی، تو نپولین کی آمریت ملی۔ جرمنوں نے اپنے قیصر کو نکالا تو ان کے آگے ہٹلر کی آمریت ملی۔ اس وجہ سے یہ بڑا بہتر ہوتا ہے کہ بے ربط وضبط عوام کو معاملات ہاتھ میں نہ لینے دیے جائیں۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی اس آزادیٔ فکر کی وجہ سے کتنا نقصان ہوا۔

۱۱۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ لوگوں کو بادشاہوں کی غلامی سے نکال کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی غلامی میں دیتا ہے۔ لیکن فرد کو مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے، "جو اکیلا رہ گیا وہ آگ کے لیے ہے"۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: لَیسَ الاِسلامَ اِلا بِالجَمَاعَت (اسلام جماعت کے بغر قائم نہیں رہ سکتا) اب جماعت تب قائم رہ سکتی ہے کہ ہر سطح پر امیر ہو اور امیر کا حکم مانا جائے اور اگر ہر فرد قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے یا اپنی مرضی کرے، تو پھر ملک کیسے چل سکتا ہے۔ ہمارے اندر اگر کسی وجہ سے تفرقہ کا مظاہرہ ہوتا ہے، تو وہ قول یا عمل جس کی وجہ سے ایسا ہو۔ وہ غیر اسلامی ہے۔ اس کی تفصیل البتہ الگ کتاب کا مضمون ہے۔

۱۲۔ اسلام اللہ کی آمریت ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ہر امیر اَطِیعُوا اللهَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ کے فرمان کا پابند ہو۔ اور اصول یہ ہو کہ ہم امیر کی ہر حالت میں اطاعت کریں۔ اگر ہم سب اپنی مرضی کریں، یا غیروں کے فلسفے پر عمل کریں تو حالات وہی ہو جائیں گے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہو گئے تھے۔

۱۳۔ جب ایسا وقت آتا ہے تو ہم نہیں دیکھتے کہ جس حکومت کو ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں اُس کے بعد کیا ہوگا۔ چودہ سو سال میں پہلی دفعہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر ایک ملک قائم ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی خود غرضی یا غیروں کا کھلونا بننے کی وجہ سے پاکستان کو حقیقت دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اُن لوگوں کی پہچان یہ ہے، کہ وہ پاکستان کی ہر حکومت کی مخالفت کریں گے، کہ حکومت کو نقصان پہنچا کر وہ دراصل پاکستان یا اُس نظریے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، جس کے تحت یہ ملک قائم ہوا تھا۔ ایسے لوگوں کی ہمیں پہچان ہونی چاہئے۔ اور اُن کو ان کے مقام پر رکھنا چاہیے۔

۱۴۔ اب ہماری بدقسمتی یہ ہے، کہ ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ہماری عالم، دانشور اور اہل قلم حضرات جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور اس زمانے کے باقی عظیم صحابہ پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہم نے کیا کیا کہ اس ملک کو دولخت کر دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم لوگ اسلامی فلسفہ حیات کے اصول، اس زمانے کے مطابق ڈھالیں اور جو بات اصولوں کے خلاف جاتی ہے، یا جو کوئی ان اصولوں کے خلاف بات کرتا ہے اُس کو اپنی جگہ پر رکھیں یہ لوگ منافق ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔

ساتواں باب

بصرہ کے امرأ......اور محاذ کی جنگی کاروائیاں

نقشہ دیکھ کر ہم کوفہ اور بصرہ دونوں کی صورت حال بہتر طور پر سمجھ آسکتی ہے۔ گو کچھ حیرانی ضرور ہوتی ہے، کہ کوفہ اور بصرہ نزدیک نزدیک ہیں۔ اور صوبوں کی بانٹ اس طرح کیوں کی گئی، کہ جغرافیائی طور پر عراق، ایران کی الگ الگ عملداری بنائی جاسکتی تھی یا اس کے تین چار صوبے بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اگر حالات اور جغرافیہ کا گہرا مطالعہ کیا جائے، تو فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ طریقہ ٹھیک تھا۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے مصر اور سارے افریقہ کے لیے فسطاط کی چھاؤنی بنائی، جو مدینہ شریف سے نزدیک تھی اور یہاں سے ہی افواج نے نکل کر ٹیونس تک کے علاقے فتح کیے۔ بعد میں البتہ قیروان کی چھاؤنی کی ضرورت پڑی۔ شام، فلسطین کے لئے جابیہ کے مقام پر فوجی چھاؤنی بنائی گئی۔ لیکن چند انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے دارالحکومت کو دمشق لے جانا پڑا۔ عراق و ایران کے علاقوں کو آدھا آدھا بانٹ دیا گیا مغربی علاقے کے لیے کوفہ کی چھاؤنی تھی، اور مشرقی کے لیے بصرہ کی۔ گو دونوں مقامات عراق میں تھے لیکن مدینہ شریف کی حکمت عملی کے تحت یہی مقامات زیادہ بہتر تھے۔

اس کا فائدہ یہ تھا، کہ صوبائی دارالخلافے یا چھاؤنیاں مدینہ شریف کے نزدیک تھیں۔ اور ان مقامات سے آگے چھوٹی چھوٹی چھاونیاں سارے علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بالکل اس طرح جس طرح ایک ہیڈ کوارٹر سے آگے دو تین ڈویژن ہیڈ کوارٹر۔ اور پھر ہر ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے آگے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر۔ اور اُس سے آگے بٹالین وغیرہ ہوتی ہیں۔ ایسے بھی اصول یہ ہوتا ہے کہ مرکز سے صوبائی دارالخلافے نزدیک سے نزدیک ہوں کہ فوجی لحاظ سے یہ ضروری ہوتا ہے۔ اب انگریزوں کو دیکھو ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے انہوں نے سارا زور بمبئی، مدراس اور کلکتہ پر لگا دیا اور وہاں مضبوط قلعے قائم کئے کہ انگریز سمندر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ جب پورے ملک پر قبضہ ہو گیا تو پھر بھی دارالخلافہ کلکتہ میں ہی تھا۔ اور ۱۹۱۱ء میں دارالخلافہ دہلی میں تبدیل کیا گیا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ اس زمانے میں انگریزی سلطنت کو اتنی وسعت مل چکی تھی کہ اس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا کہ اسلام تو پہلے ہی دن سے ہر معاملہ کو فوجی طریقہ پر حل کرتا تھا۔

بصرہ: چند بنیادی پہلو

قارئین کی توجہ اس سلسلہ کی پہلی کتاب کی طرف مبذول کروائی جاتی ہیں۔ عراق کی فتوحات کی بنیاد انہی علاقوں میں ڈالی گئی۔ بارھویں ہجری میں جناب خالد ﷛ نے مرمز کو کاظمہ کے مقام پر شکست دی، اور پھر مسلمان مجاہدین ابلہ پہنچ گئے جو بصرہ کے نزدیک ہے اس علاقے میں عامل مقرر کیے اور یہ ذکر تھا، کہ جناب حسن بصری ﷬ کے والد اسلام میں داخل ہو گئے لیکن ساتھ ہی قارئین کو یاد ہوگا کہ مسلمانوں کا اس وقت بڑا مقصود حیرہ تھا اور انہوں نے بصرہ کے علاقے میں جنگی کاروائیاں حربی مظاہروں کے طور پر کیں، لیکن آگے زیادہ پیش قدمی نہ کی۔ یہ ذکر پہلی کتاب کے ساتویں اور آٹھویں باب میں ہے۔ لیکن آگے چل کر پچیسویں باب میں بصرہ سے آگے خرستان، اہواز، فارس اور خراسان کے کچھ علاقوں کی فتوحات کا ذکر ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان ﷛ نے جب خلافت سنبھالی تو جناب ابوموسیٰ اشعری ﷛ بصرہ کے عامل تھے۔ اور اُن کی عمل داری جیسا کہ نقشہ دوازدہم میں دکھایا گیا ہے، ایک طرف خراسان سے لے کر مشرق میں سیستان تک تھی اور جنوب وجنوب مشرق میں فارس سے لے کر مکران تک کے علاقے اُن کی عملداری میں تھے۔

جناب عبداللہ بن عامر ﷛

حضرت عثمان ﷛ کی خلافت کے پچھلے سالوں میں جناب ابوموسیٰ ﷛ ہی بصرہ کے عامل رہے اور انہوں نے تمام علاقوں کے نظام کو بڑی اچھی طرح سے چلایا۔ جناب عثمان ﷛ کی خلافت کے چھٹے سال بصرہ اور ارد گرد میں کچھ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ اس محاذ پر آگے فتوحات کی ضرورت ہے اسی لئے کسی نوجوان کو وہاں پر سپہ سالار مقرر کیا جائے۔ جناب عثمان ﷛ نے یہ تجویز منظور کی اور جناب عبداللہ ﷛ بن عامر کو بصرہ کا مقرر کیا اور جناب ابوموسیٰ ﷛ کو آگاہ کیا کہ ان کی سبکدوشی باعزت طور پر ہے اور ان کے کام میں کوئی کمی نہیں۔ جناب ابوموسیٰ کو بھی اس میں کوئی رنجش نہ تھی اور جب جناب عبداللہ ﷛ بن عامر وہاں پہنچے، تو جناب ابوموسیٰ ﷛ نے ان کو خوش آمدید کہا، اور بصرہ میں خطبہ دیا کہ اہل بصرہ بڑے خوش قسمت ہیں کہ اُن کے نئے عامل نجیب الطرفین ہیں۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے عظیم صحابہؓ کے رشتہ دار ہیں۔

آپؓ کی سب سے بڑے رشتہ داری تو یہ تھی، کہ آپ کی دادی حضور پاک ﷺ کی پھوپھی تھیں جن کا نام ام حکم رضی اللہ عنہا تھا۔ اس لئے سارے بنو ہاشم آپ کے ننھیال والے تھے۔ آپ خود بنو عبد شمس سے تھے جہاں امیہ خاندان کے ساتھ آپ کا شجرہ مل جاتا تھا اور عبد شمس حضور پاک ﷺ کے پردادا ہاشم کے بھائی تھے۔ آگے چل کر واقعات ظاہر کریں گے کہ حضرت عثمان ﷛ کا یہ چناؤ بہت اچھا تھا، کہ آپ نے نہ صرف اپنے علاقے سے بغاوت فرد کی بلکہ کئی اور نئے علاقے بھی فتح کیے جن میں کابل بھی تھا۔ اس زمانے میں میں کسی نے آپ کے چناؤ پر اعتراض نہ کیا۔ لیکن آپؓ

چونکہ حضرت عثمان ؓ کے ماموں زاد بھائی بھی تھے تو بعد میں آپ ؓ پر بھی اعتراض کیے گئے۔ ایسی الزام تراشیاں بالکل فضول اور بے جا حرکتیں تھیں۔ حضرت عثمان ؓ نے البتہ ایک اور تبدیلی بھی کی کہ بحرین کا عامل جو پہلے خود مختار تھا اور مدینہ سے احکام لیتا تھا اس کو بھی آپ نے بصرہ کے عامل کے ماتحت کر دیا۔ بحرین چھوٹی جگہ تھی۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے سے جزیرہ ہونے کی وجہ سے یہاں کا عامل الگ چلا آتا تھا۔ لیکن اب ضرورت کے تحت اور نزدیکی کی وجہ سے کچھ یکجائی کی ضرورت تھی۔ بحرین کے عامل حضرت عثمان ؓ بن ابوالعاص تھے، اور انہوں نے اس نئے فیصلے کو قبول کیا۔

صوبہ فارس میں بغاوت

عبداللہ ؓ بن عامر کے عامل اور سپہ سالار بننے سے پہلے اکثر مفتوحہ علاقوں میں کچھ بغاوتیں پھوٹ رہی تھیں، خاص کر صوبہ فارس مکران اور ایرانی بلوچستان میں باغی کافی طاقت پکڑ چکے تھے اور اصطخر کے اہم قلعے پر ان کا قبضہ تھا۔ یہاں سے انہوں نے بغاوت کو تقریباً سارے صوبہ فارس میں پھیلا دیا۔ اسی زمانے میں جناب عبداللہ ؓ بن معمر خراسان سے تبدیل ہو کر نئے فارس کے صوبہ میں آئے تھے۔ انہوں نے باقی تمام علاقوں سے بغاوت کو جلدی ختم کر دیا لیکن کافی زیادہ باغیوں نے بھاگ کر اصطخر کے قلعے میں پناہ لے لی۔ جناب عبداللہ ؓ بن معمر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں باغیوں کی پوزیشن کافی مضبوط تھی اور ایک جھڑپ میں جناب عبداللہ ؓ بن معمر شہید ہو گئے بلکہ شدید جنگ میں کئی مجاہدین بھی شہید ہو گئے اور مسلمانوں کو قلعے کا محاصرہ چھوڑنا پڑا۔

جناب عبداللہ ؓ بن عامر کو جب یہ خبر ملی تو آپ ؓ نے یہ لشکر جرار تیار کیا۔ اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئے۔ آپ نے اپنے جیش المقدم پر جناب عثمان ؓ بن العاص کو مقرر کیا جو بحرین سے آ چکے تھے۔ میسرہ پر ابو برزہ ؓ الاسلمی کو اور میمنہ پر معقل ؓ بن بسیار کو مقرر کیا۔ رسالہ اور متحرک دستوں کی کمانڈ جناب عمران ؓ بن حصین کر رہے تھے۔ باغی حالات کو نہ بھانپ سکے۔ وہ قلعہ کے باہر تھے، کہ پہلے مسلمان دستے پسپا ہو چکے تھے۔ اور باغیوں کے دل بڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے جیش المقدم کو دیکھ کر قلعہ کے باہر ہی صف بندی کر دی۔ لیکن یہ ان کو بہت مہنگی پڑی، کہ باقی اسلامی لشکر بھی وہاں پہنچ گیا۔ چنانچہ قلعہ کے باہر ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں اہل فارس کو اتنی سخت شکست ہوئی کہ وہ قلعے میں بھی پناہ نہ لے سکے۔ جو لوگ وہاں پر تھے انہوں نے قلعہ کے دروازے غیر مشروط طور پر کھول دیئے۔ اور آئندہ امن وامان سے رہنے کا وعدہ کیا۔

دارالجبر کے علاقہ میں کوچ

اصطخر کے معاملات سے فارغ ہونے کے بعد جناب عبداللہ ؓ بن عامر نے دارالجبر کے علاقے کا رُخ کیا۔ وہاں پر جور شہر میں بغاوت ہو گئی تھی، اس شہر کو اردشیر بھی کہتے تھے۔ اس علاقے کے مسلمان عامل جناب ہرم بن عیان

نے اس شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ جناب ہرم ؓ نے البتہ اس مقام کو جناب عبداللہ ؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی فتح کر لیا۔ واقعات اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ تھا اور گو جہاد کے وقت روزہ قضا ہو سکتا ہے، لیکن جناب ہرم ؓ روزہ رکھتے تھے۔ سارا دن وہ اپنی ذمہ داری نبھاتے تھے۔ ان کے خادم کو دن کو چھٹی ہوتی تھی۔ وہ افطاری اور سحری کا کھانا بنا کر ایک جگہ رکھ جاتا اور پھر اپنی ذمہ داری والی جگہ پر پہنچ جاتا تھا کہ دشمن پر نظر رکھے۔

ایک دن جب جناب ہرم ؓ واپس آئے تو کھانا نہ ملا۔ آپ نے پانی سے روزہ افطار کیا اور پانی ہی پی کر روزہ رکھا۔ دوسرے دن صبح اپنی ذمہ داری والی جگہ پر چلے گئے۔ روایت ہے کہ آپ نے چند دن یوں ہی گزار دیے لیکن خادم سے نہ پوچھا کہ شاید سامان خوراک کی کمی تھی۔ روایت ہے کہ آپ کافی کمزور ہو گئے تو ایک دن خادم نے پوچھ لیا کہ ان کو کیا تکلیف ہے۔ فرمایا کہ شاید محاصرہ اٹھانا پڑے گا۔ خوراک کی اتنی کمی ہو گئی ہے کہ مجھے بھی کھانا نہیں مل رہا تو خادم نے عرض کی جناب وہ ہر روز کھانا بنا کر فلاں جگہ رکھ جاتا رہا۔ اس لیے خادم نے اجازت چاہی کہ اُس دن وہ اپنی ذمہ داری پر دیر سے جائے تا کہ چھپ کر دیکھے کہ کھانا کدھر جاتا ہے۔

خادم چھپ کر بیٹھ گیا جب ذرا اندھیرا پڑا تو ایک کتا آیا اور خاموشی کے ساتھ کھانا اٹھایا اور پھر قلعہ کی طرف چل پڑا۔ کتے والی بات عجب تھی کہ قلعہ کے اندر کوئی کتا ہو سکتا ہے۔ باہر تو کبھی کوئی کتا نظر نہ آتا تھا۔ خادم نے کتے کا پیچھا کیا اور دیکھا کہ قلعہ کی دیواروں میں ایک جھاڑی کے پیچھے ایک شگاف ہے جہاں سے کتا قلعہ کے اندر چلا گیا۔ چنانچہ اللہ نے یہ سبب بنا دیا اور خادم نے جناب ہرم ؓ کو وہ شگاف یا سوراخ دکھا دیا۔ جناب ہرم ؓ نے مجاہدین کو اکٹھا کیا اور کافی تعداد میں مجاہدین اس سوراخ سے قلعے کے اندر داخل ہو گئے اور تجویز کی مطابق قلعے کے ایک دروازے پر قبضہ کر کے اس کے دروازے کھول دیئے۔ جس سے باقی مجاہدین قلعے میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ یہ شہر حضرت عبداللہ ؓ کے وہاں پہنچنے سے چند دن پہلے ہی فتح ہو گیا اور جناب عبداللہ ؓ نے البتہ حربی مظاہرے جاری رکھے۔ فارس کے علاقے میں جناب ہرم ؓ بن عیان کے ماتحت جناب حرث ؓ بن ارشد اور ریجمان ؓ جہمی کو مختلف اضلاع میں مامور کیا کہ ہر جگہ سے بغاوت کو مکمل طور پر ختم کر دیں۔ جب حالات ٹھیک ہو گئے تو آپ ؓ نے حضرت عثمان ؓ کو ان فتوحات کے خبر دی اور بہت بڑا لشکر تیار کر کے آپ خراسان اور کرمان کی طرف روانہ ہو گئے۔

خراسان کی مہم

جناب عبداللہ ؓ فارس کے علاقوں سے سیدھے خراسان کی طرف روانہ ہو گئے یا بصرہ واپس آئے اور وہاں سے شمال کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں سے شمال کی طرف روانہ ہوئے، اس سلسلہ میں مورخین میں کچھ اختلاف ہے۔ آپ البتہ دور دراز کے علاقوں میں مہم پر جا رہے تھے، جس پر کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ اس لئے آپ ؓ نے جناب

زیاد ؓ بن عامر بصرہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور پھر شمال کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ فوجی معاملات میں آپ کے مشیر جناب عاصم ؓ بن عمرو تھے، جن کے دوسرے بھائی قعقاع ؓ کوفہ میں مشیر تھے۔ ان دونوں عظیم بھائیوں کا پہلی کتاب میں کثرت سے ذکر کیا گیا ہے۔ جناب عبداللہ ؓ خراسان ۲۹ ہجری کے آخر یا ۳۰ ہجری کے شروع میں گئے۔ زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دارالجبر کے علاقے سے واپس اصطخر آئے جہاں کا عامل جناب شریک ؓ بن اعور حارثی کو مقرر کیا۔ انہوں نے وہاں پر ایک بہت بڑی مسجد بنوائی جس کو تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ فارس کے صوبہ میں بغاوت کے فرد ہو جانے کے بعد اس مسجد کا سنگ بنیاد جناب شریک ؓ نے رکھا۔

خراسان کی مہم پر جانے کے لیے آپ ؓ نے دو راستے اختیار کیے۔ مورخین میں جو اختلاف ہے کہ آیا آپ نے کرمان والا راستہ اختیار کیا یا اصفہان والا، وہ اسی وجہ سے ہے اصل میں لشکر دونوں راستوں پر گئے تھے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ ؓ بصرہ نہ گئے تھے اور صوبہ فارس سے ہی شمال کی طرف چلے گئے۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ ایک لشکر اصطخر کے راستے سیدھا شمال کی طرف چلا گیا۔ ہم نے نقشہ دوازدہم پر یہ دونوں پیش قدمی کے راستے دکھا دیئے ہیں اور ہمارا تجزیہ ہے کہ آپ ؓ نے اصطخر والے راستے سے کرمان کی طرف جناب امیر ؓ بن احمر یشکری کو بھیجا۔ اور خود بصرہ آئے اور وہاں سے اصفہان والا راستہ استعمال کیا اور آپ ؓ کے جیش المقدم کے طور پر جناب احنف ؓ بن قیس تھے۔

یہ دو رخی پیش قدمی فوجی لحاظ سے تدبیرات اور حکمت عملی کی ایک بڑی حربی خوبی مانی جاتی ہے۔ اس میں باہمی روابط کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر دشمن کمزور ہو تو ضروری نہیں کہ ہر وقت رابطہ قائم ہو۔ مقامات اور وقت دے دیئے جاتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں وقت یہ کام ہو گا یعنی سارا کھیل زماں و مکاں کا ہوتا ہے لیکن ایسی تجویز تب بنتی ہے کہ زمین کے چپہ چپہ سے واقفیت ہو اور پہلے سے اندازہ ہو کہ کس جگہ دشمن کیا کرنے کے قابل ہو گا۔

چنانچہ جناب عبداللہ ؓ نے امیر ؓ بن احمر کو ہدایات دیں کہ کرمان پر قبضہ کرنے کے بعد وہ وہاں پر جناب مجاشع* ؓ بن مسعود کو چھوڑ دیں۔ کہ وہ مشرق میں سیستان کے علاقوں پر نظر رکھ سکیں اور امیر بن احمر شمال کا کوچ کرتے ہوئے خراسان کے علاقے میں ان کے ساتھ رابطہ قائم کریں۔

جناب عبداللہ ؓ جس راستے پر خود جا رہے تھے ان کے آگے آگے جناب احنف ؓ بن قیس تھے۔ انہوں نے طبسین کے دو ضلعوں کو فتح کر لیا جو خراسان کے دروازے سمجھے جاتے تھے اور اس کے بعد کوہستانی علاقہ آ جاتا تھا۔ تو جناب عبداللہ ؓ نے حکم دیا کہ اب لشکر میں پھیلاؤ نہ رکھا جائے اور ایک دوسرے سے نزدیک رہتے ہوئے ہر شہر یا قلعہ یا فوجی چوکی پر قبضہ کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق فوج بھیجی جائے گی۔ یہ تجویز بڑی کامیاب رہی اور اس طرح

---

* آپ عظیم صحابی جناب عبداللہ کے چھوٹے بھائی تھے اور آپ ہمارے شمالی وزیرستان کے شیر تلہ کے مقام تک آئے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

کوہستانی علاقے کے ہر شہر پر مسلمانوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا اور چھ لاکھ سالانہ خراج پر دوبارہ سمجھوتہ ہوگیا۔ علاوہ جناب امیر بن احمر اور جناب مجاشع رضی اللہ عنہ نے بھی مشرق میں کچھ علاقے فتح کیے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب عبداللہ کے مغربی یا بائیں بازو پر جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص طبرستان کے علاقوں میں بغاوت فرو کر رہے تھے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص طبرستان کی بغاوت کو ختم کرنے کے بعد مشرق کا رخ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اسی دوران جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے جرجان تک کے علاقوں کو دوبارہ فتح کرلیا تو جناب سعید رضی اللہ عنہ نے اپنا تمام تر رخ مغرب کی آذربائیجان کے علاقوں کی طرف کردیا اور آگے ان کے دستے ترکستان تک پہنچ گئے۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے عاملوں کی اس حکمت عملی اور طریق کار کو جب گیارہویں اور بارہویں نقشہ پر دیکھا جائے تو انسان عش عش کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سعید کے لشکر سے کچھ عظیم صحابہ کرامؓ مشرقی افواج میں شامل ہوگئے۔ اس کی تفصیل بھی بعد میں آتی ہے۔

بیہق کی فتح

اب جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نیشاپور کے علاقوں میں داخل ہو چکے تھے انہوں نے ایک لشکر کے ساتھ حضرت اسود رضی اللہ عنہ بن کلثوم کو بیہق شہر کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا یہ جگہ ابر کے مقام سے کوئی پندرہ بیس میل تھی اور وہاں پر دشمن قلعہ بند ہوگیا لیکن قلعہ میں ایک شگاف تھا جس کے بارے میں مخبروں نے مسلمانوں کو خبر کردی اور ایک رات چھپ کر مسلمان قلعہ میں داخل ہوگئے۔ قلعے میں گھمسان کی جنگ ہوئی بیہق شہر تو فتح ہوگیا لیکن جناب اسود رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوگیے اور لشکر کی کمانڈ ان کے بھائی ادھم رضی اللہ عنہ بن کلثوم نے سنبھال لی اور چند دوستوں کو وہاں چھوڑ کر آپ نیشاپور کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کے پیچھے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر بھی سب لشکر کو لے کر نیشاپور پہنچ گئے۔

نیشاپور کی فتح

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے شہر کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ شہر کے چار دروازے تھے، دفاعی لحاظ سے شہر چار حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر دروازے کا ایک سردار تھا جو اپنے علاقے کے دفاع کا ذمہ دار تھا۔ ایک دروازے کے سردار نے جب اسلامی لشکر پر نظر دوڑائی تو گھبرا گیا اور اپنی جان کی امان پر رات کو دروازہ کھولنے کی پیش کش کی جو مسلمانوں نے منظور کرلی۔ لیکن قلعے کا بڑا کمانڈر اس سے پہلے ہی دل چھوڑ چکا تھا اور دروازہ کھولنے سے پہلے جان کی امان کی شرط پر اس کا بھی ایک قاصد آچکا تھا۔ اس طرح نیشاپور پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔ دس لاکھ درہم سالانہ خراج دینے پر صلح ہوگئی۔ نیشاپور کے اردگرد چند اور قصبوں کو بھی مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا جن میں استاق رام، ہرمزاور جیبر فت وغیرہ

شامل ہیں۔ وہاں کے تمام لوگ بھی مسلمانوں کے مطیع ہو گئے۔ ان علاقوں کے نظام کے لیے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے قیس رضی اللہ عنہ بن ہیثم سلمی کو مامور کیا۔ نیشاپور اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد، ہماری تہذیب اور تمدن کا مرکز بن گیا۔ جناب فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ یہاں پر ہی تھے اور جلال الدین خوارزم نے یہاں مغلوں کا بڑا مقابلہ کیا۔

رَے اور مرو کی فتوحات

اب جناب عبداللہ نے رے اور مرو کا رخ کیا۔ راستے میں سرحش اور بیور کے مقامات آتے تھے، ان کو بھی سر کیا اور وہاں پر حاتم بن باہلی کو امیر مقرر کیا۔ رے اور مرو کو دوبارہ فتح کرنے کا سہرا بھی جناب احنف بن قیس کے سر ہے کہ وہ جیش المقدم کے کمانڈر تھے خاص کر مرو کی باجگذاری بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہاں پر دو کروڑ سالانہ خراج پر صلح ہوئی۔ اسی دوران جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے ایک لشکر ہرات بھیجا جس کی کمانڈ جناب عبداللہ بن حازم کر رہے تھے۔ انہوں نے ہرات فتح کیا اور دس لاکھ سالانہ خراج پر صلح ہو گئی۔ ہرات موجودہ افغانستان میں ہے اور کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

بلخ کی فتح

اس طرح ہرات کے بارے میں تسلی ہو جانے کے بعد جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے اپنے عظیم ساتھی جناب احنف رضی اللہ عنہ بن قیس کو ساتھ لیا اور بلخ کی طرف روانہ ہو گیے۔ راستے میں دار البجر * کا شہر آیا، وہاں کے حاکم نے تین کروڑ سالانہ خراج دینے کی پیش کش کی لیکن جناب احنف رضی اللہ عنہ نے یہ شرط لگائی کہ یہ نیا علاقہ ہے پچھلے علاقوں کا نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، یہاں کے حاکم جگہ جگہ مسجدیں بنائیں جن میں ہمارے مبلغ آ کر دین اسلام کی تبلیغ کریں گے اور اس علاقے کے حاکم یہ ذمہ داری لیں کہ وہ ان مبلغین کی حفاظت بھی کریں گے اور اذانیں ہر شہر میں باقاعدگی سے دی جائیں گی۔ یہ شرائط منظور کر لی گئیں اور مسلمان وہاں سے مہر والروز کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پر اہل شہر نے سخت مقابلہ کیا لیکن بری طرح شکست کھائی اور چھ لاکھ سالانہ خراج پر سمجھوتہ ہو گیا۔ صوبہ جر جان کے چند شہر باقی تھے جہاں پر لوگ مسلمانوں کے مطیع نہ تھے۔ ان شہروں میں طالقان اور فاریاب قابل ذکر ہیں۔ وہاں دو الگ الگ لشکر بھیجے گئے۔ ایک کی کمانڈ جناب اقرع رضی اللہ عنہ کر رہے تھے اور دوسرے کی جناب امیر رضی اللہ عنہ بن احمر جنہوں نے ان شہروں اور گردونواح کے علاقوں کو فتح کر لیا۔

اس طرح تمام علاقوں کو فتح کرتے ہوئے جب ہر طرف سے اسلامی لشکر بلخ پہنچے تو اہل شہر سمجھ گئے کہ مقابلہ نہیں ہو سکتا تو انہوں نے غیر مشروط طور پر صلح کر لی اور سات لاکھ سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ اس علاقے کو طخارستان بھی کہتے

* اس زمانے میں کافی علاقے کو دار البجر کا علاقہ کہتے تھے۔

ہیں اور فرغانہ کا مقام بھی نزدیک ہے جہاں پر بعد میں اس خطہ کے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کی آبائی سلطنت تھی۔ اس لیے فرغانہ کے مقام سے ہمارے تاریخ کے طالب علم اچھی طرح سے واقف ہیں کہ ساتھ خوارزم کا علاقہ بھی ہے جہاں اسلام کا جلیل فرزند جلال الدین خوارزم بعد میں پیدا ہوا۔

البتہ مسلمان پہلی دفعہ اس علاقہ میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں داخل ہوئے لیکن اہل خوارزم، جو دریائے جیجون کے دونوں کناروں پر آباد تھے انہوں نے مسلمانوں کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر پل توڑ دیا اور ہر مقام سے تمام کشتیاں دریا کی دوسری طرف لے گئے۔ یعنی اس کنارے سے آمد ورفت بند ہوگئی۔ دریا میں طغیانی تھی۔ اس لیے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے جناب احنف رضی اللہ عنہ کو واپس بلا لیا۔ بلخ پر جناب اسید بن المتشمس کو امیر مقرر کیا اور مشرقی علاقوں کا رخ کیا۔ بلخ سے آگے وسط ایشیا کی فتوحات کا ذکر چوتھی کتاب میں ہے۔

کابل اور مشرقی علاقوں کا رخ

قارئین کو یاد ہوگا کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے ایک لشکر کو کرمان بھیجا تھا۔ اس لشکر کے کرمان کو فتح کرنے کے بعد مجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ تو ادھر ہی متعین ہو گئے۔ لیکن باقی لشکر کو جناب امیر رضی اللہ عنہ بن احمر کے تحت آگے پیش قدمی کرنے کا حکم تھا۔ اور وہ ہرات پہنچ چکے تھے۔ اس طرح جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کا دایاں بازو حفاظت میں آ چکا تھا۔ بائیں طرف سے ویسے ہی حفاظت موجود تھی کہ جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کے ساتھ رابطہ قائم ہو چکا تھا اور ان کے لشکر جھیل کیپسن سے بائیں طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ اب جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کی سامنے والی حدود جھیل کیپین اور دریائے جیجون کی وجہ سے محفوظ ہو چکی تھی۔ اس لیے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مشرق میں ہندوکش کے علاقوں، زابلستان، غزنی اور کابل کو فتح کرنے کی تجویز بنائی۔

کابل کی فتح کا پیش خیمہ

کوہ ہندوکش کے ان علاقوں کو فتح کرنے کے لیے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے ایک لشکر جرار تیار کیا جس کی کمانڈ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن سمرہ کو سونپی۔ آپ خود نیشاپور کے گرد ونواح میں تھے اور آگے پیش قدمی کرنے والوں کے ساتھ مکمل رابطہ تھا کہ اب جس علاقے میں مسلمان داخل ہو رہے تھے وہ ایران سے مختلف تھا۔ یہاں پر ہندوانہ تہذیب اور رسم ورواج تھے۔ مذہب کے لحاظ سے کچھ لوگ بدھ مذہب تھے لیکن ان کو مغربی بدھ کہتے تھے اور ان کے عقائد موجودہ بدھ کے لوگوں سے مختلف تھے۔ ان بدھوں کا ایک بڑا بادشاہ راجہ کنشک ہو گزرا ہے۔ جس کا ذکر ہم اپنی تاریخوں میں بھی پڑھتے ہیں کہ وہ ہمارے خطوں کا بادشاہ رہ چکا ہے۔

بہر حال اسلامی لشکروں میں بڑے بڑے عظیم مجاہد تھے جن میں عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حازم، مہلب رضی اللہ عنہ اور عباد رضی اللہ عنہ بن الحصین قابل ذکر ہیں، لیکن ایک خاص بزرگ جناب حسن بصری* رحمۃ اللہ علیہ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ جناب حسن بصری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اکثر صوفیا اور فقرا اپنے سلسلوں کو جناب حسن بصری کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچاتے ہیں کہ بعد میں جناب حسن بصری جناب علی کے ساتھ بھی رہے۔ لیکن ہماری تاریخوں میں آپ اس مہم میں پہلی دفعہ کھل کر سامنے آئے ہیں۔ گو آپ کے والد بزرگوار کے اسلام لانے کا ہم پہلی کتاب میں کاظمہ کی فتح کے بعد ذکر کر چکے ہیں۔ اس مہم میں جناب حسن بصری میر منشی تھے اور واقعات کو بڑی صفائی سے بیان کیا ہے یعنی لکھ کر چھوڑ گئے ہیں اس لیے واقعہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

رستم کا گھوڑا

کابل کی وادی میں داخل ہونے سے پہلے وادی سینا کے سرے پر زرنج کا قلعہ تھا یہاں پر لوگوں نے مسلمانوں کا بڑا سخت مقابلہ کیا۔ لیکن آخر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے اور دو لاکھ درہم سالانہ خراج دینے پر صلح ہو گئی۔ وادی سینا میں داخل ہونے سے پہلے مسلمان اس گاؤں سے بھی گزرے جہاں رستم پہلوان کسی زمانے میں اپنا گھوڑا باندھا کرتا تھا۔ رستم کے گھوڑے اور چور کی کہانی ہمارے بچوں کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔

زرنج کی فتح کے کچھ عرصہ بعد جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ہندوکش کے علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، جہاں پر کابل اور ازبلستان کے مشہور مقامات تھے۔ غزنی بھی نزدیک ہی ہے اور جس زمانے میں طبری تاریخ لکھ رہا تھا اور غزنی زیادہ مشہور تھا۔ بعد کے مورخین نے ان علاقوں کو بلاد غزنی کا نام دیا اور افغانستان کے ان علاقوں کو جناب محمود غزنوی ☆ کی وجہ سے بلندیاں حاصل ہوئیں، نقشہ دوازدہم واضح کرے گا کہ جن علاقوں کو مسلمانوں نے اس مہم میں فتح کیا وہ غزنی سے لے کر کابل تک پھیلے ہوئے تھے اور ان علقوں میں بت پرست لوگ آباد تھے۔ ایران کی حکومت کا ان علاقوں پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان علاقوں کے لوگ خودمختار تھے۔

جبل زور کا بت خانہ

ان علاقوں میں سب سے بڑا بت خانہ جبل زور کے مقام پر تھا۔ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر قبضہ کرنے کے بعد اس سندر کے سب سے بڑے بت کی آنکھیں نکال دیں اور ہاتھ کاٹ دیئے۔ پھر آپ اس مندر کے مہنت سے یوں مخاطب ہوئے۔ سنو، اے کافر! اس بت کے گلے میں جو سنا، چاندی و جواہرات کے ہار ہیں یہ تم لوگ

* جلال مصطفیٰ، صفحہ ۱۴، ۳۵۵ ☆ جلال مصطفیٰ، صفحہ ۱۴، ۳۷۹، ۳۸۰

لے لو۔ میں یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ تمہیں شک نہ پڑے کہ ہم بتوں کو کسی لوٹ مار کی غرض سے توڑتے ہیں گو اس سونے اور چاندی پر ہمارا حق ہے، لیکن میں اس دولت کو ٹھکرا رہا ہوں کہ تم لوگوں کو ہمارا فلسفہ حیات سمجھ آ جائے۔ اور تم لوگ یہ نہ سمجھ جاؤ کہ ہم ان بتوں کو کسی طمع کی خاطر توڑتے ہیں۔ نہیں ہم ان کو اس لیے توڑتے ہیں کہ تم لوگوں پر ظاہر ہو کہ یہ بت کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتے۔ نفع ونقصان پہنچانا اللہ کے ہاتھ میں ہے جو ہم سب کا خالق ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کے احکام کے نفاذ کے لیے ان علاقوں میں داخل ہوئے ہیں۔ ہم ملکوں کو اس لیے فتح نہیں کرتے کہ وہاں پر لوٹ مار کریں بلکہ ہم اللہ کے احکام کے نفاذ کی خاطر ملک فتح کرتے ہیں۔ مہنت اور باقی لوگوں پر ان باتوں کا بہت اثر ہوا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان کے لوگ دائرہ اسلام میں جلدی داخل ہو گئے۔

تبصرہ:

یہاں ایک تبصرہ ضروری ہے۔ انگریزوں نے اس ملک میں آ جانے کے بعد ہماری تاریخ کو مسخ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ انہوں نے کئی ہندوؤں یعنی جادو ناتھ سرکار وغیرہ ناتھ وغیرہ کے ہاتھوں سے اس خطہ کی تاریخ اس طرح لکھوائی کہ محمود غزنوی اس علاقہ پر لوٹ مار کی غرض سے حملہ کرتا تھا۔ اور مندروں کو نشانہ بنانے میں بھی یہی غرض تھی۔ حالانکہ محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کا فلسفۂ حیات * ایک جملے میں بیان کیا ہے کہ وہ روزِ قیامت بت شکن کے نام سے پکارا جانا پسند کرے گا، یعنی وہ یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان اس دنیا میں صرف یہ سوچتا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دے گا۔ ایسے شخص کو لوٹ مار سے کوئی غرض نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ تو جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن سمرہ کی روایات کو پھیلا ؤ دے رہے تھے اور دوسرا فوجی حکمت عملی کے تحت مندروں میں بتوں کو توڑنا ضروری تھا۔ اس علاقے کے لوگوں میں کسی عقیدہ یا کسی چیز میں نہ وحدت عمل تھی نہ وحدت فکر۔ ہاں بت پرستی کے لحاظ سے ان میں جو وحدت فکر تھی اس کو پاش پاش کرنا ضروری تھا۔ کسی دشمن قوم کی وحدت فکر کو پاش پاش کر دیا جائے تو فوجی حکمت عملی کامیاب ہوتی ہے۔

کابل کی فتح

جبل زور کی فتح کے بعد جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس فتح میں کچھ دیر ضرور لگ گئی کہ کابل کا محاصرہ کرنا پڑ گیا۔ مسلمانوں کے پاس بڑی اچھی منجنیقیں تھیں اور انہوں نے ان کا خوب استعمال کیا لیکن کابل کا قلعہ بہت مضبوط تھا۔ آخر عباد رضی اللہ عنہ بن الحصین نے مشورہ دیا کہ جنگ رات دن جاری رکھی جائے کہ محاصرین رات کو آرام کر لیتے ہیں۔ یہ تجویز بڑی کارگر ثابت ہوئی اور جب مسلمانوں نے آٹھ پہر سنگ باری جاری رکھی تو کابل کے درو

* جلال مصطفیٰ، صفحہ ۳۷۹، ۳۸۰

دیوار ہل گئے۔ چنانچہ محاصرین قلعے سے نکل آئے اور باہر نکل کر مسلمانوں کے ساتھ مقابلے میں سردھڑ کی بازی لگادی۔ ان کے پاس دو ہاتھی بھی تھے، جن پر سوار ہو کر وہ مسلمانوں کی صفوں پر حملہ آور ہوئے۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حازم نے ایک ہاتھی پر حملہ کر کے اس کی سونڈ کاٹ دی اور دوسرے ہاتھی کی سونڈ جناب مہلب رضی اللہ عنہ نے کاٹ دی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ کابل کی فضا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے گونج اٹھی اور کافروں کا لشکر تہس نہس ہو گیا۔ تاریخوں میں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر خود بھی کابل تک آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہیڈ کوارٹر نیشاپور ہی میں رہا۔

عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی عاجزی اور حج

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نوجوان آدمی تھے۔ اس وقت ان کی عمر کوئی تیس پینتیس سال کی ہو گی اور آپ کو اتنی فتوحات حاصل ہوئی تھیں جن پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ آپ نے ان جنگوں کے لیے جو سفر کیے وہ تقریباً تین ہزار میل بنتے ہیں۔ نوجوانی کے باوجود آپ کے دل میں کوئی گھمنڈ نہ پیدا ہوا بلکہ عاجزی آ گئی۔ آپ اپنے مرکز نیشاپور گئے اور وہاں سے حج کا احرام باندھ کر مکہ شریف روانہ ہو گئے کہ وہاں جا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ خلیفہ وقت ہر سال حج پر جاتے تھے۔ انہوں نے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کو فتوحات کی مبارک دی اور ان کی عاجزی پر خوش ہوئے۔ لیکن ساتھ نیشا پور سے احرام باندھنے پر اعتراض کیا اور فرمایا احرام صرف وہاں سے باندھا جائے جہاں سے حکم ہوا ہے تا کہ مسلمانوں کی وحدت فکر و وحدت عمل میں فرق نہ پڑے۔

بصرہ کے محاذ کے چھوٹے امرأ

ہم نے پچھلے ابواب میں وعدہ کیا تھا کہ ہم ثابت کریں گے کہ بصرہ کے محاذ کے چھوٹے امرأ میں سے بھی کوئی بھی جناب عثمان رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار نہ تھا۔ اب سب امرأ حق کا ذکر ہو چکا ہے ان کی کارکردگی پر نظر ڈالیں اور دوبارہ نام یاد کریں کہ جناب ہرم رضی اللہ عنہ بن عیان یشکری، جناب جربث رضی اللہ عنہ بن راشد، جناب احنف رضی اللہ عنہ بن قیس، جناب حبیب رضی اللہ عنہ بن قرہ، جناب خالد رضی اللہ عنہ بن عبداللہ، جناب مجاشع رضی اللہ عنہ بن مسعود، جناب قیس رضی اللہ عنہ بن ہیثم سلمی، جناب امیر رضی اللہ عنہ بن احمر، جناب عمر رضی اللہ عنہ بن عثمان جناب قیس رضی اللہ عنہ بن ہمیرہ میں سے کوئی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار نہ تھا۔ ہاں جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن سمرہ فاتح کابل نہ صرف جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے بلکہ سرکار دو عالم حضور پاک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار بھی تھے۔ افسوس کہ لوگ جناب عثمان رضی اللہ عنہ پر قرابت داری کے سلسلہ میں غلط الزام لگاتے ہیں۔

عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے قدم مبارک پاکستان میں

کسی کو کیا معلوم تھا کہ جن خطوں میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے لشکر اور عظیم صحابہ کرام یا عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے عظیم صحابی فرزند، پھر رہے ہیں وہاں پر ایک دن اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ایک مملکت کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اس لیے پرانے مورخین نے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لشکروں کو کابل، وادی زبلستان اور غزنی کے صوبوں تک ضرور پہنچایا لیکن آگے یہ ذکر نہیں کیا، کہ مشرق میں ہمارے موجودہ صوبہ سرحد یا قبائل علاقوں تک یہ لشکر کس کس مقام تک آئے۔ اُس زمانے میں کابل اور غزنی کے صوبوں کی حدود مشرق میں پشاور اور بنوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہر حال اب جو آثار یا تاریخ کے اور مطالعے ہوئے ہیں۔ تو اُن سے معلوم ہوا کہ شمالی وزیرستان کی وادی شیر تلہ میں جناب مجاشع رضی اللہ عنہ بن مسعود کا فوجی کیمپ تھا۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ آپ عظیم صحابی عبداللہ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے اور امیر رضی اللہ عنہ بن احمر کے لشکر کے ایک حصہ کے کمانڈر۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ذمہ داری کا علاقہ مشرق میں وزیرستان تھا کہ فتوحات کے سلسلہ میں یا بعد میں آپ اپنے لشکروں کے ساتھ وادی شیر تلہ میں رہے۔

اِس کے علاوہ وادی بوبہ یعنی بالائی دوڑ کے علاقے سے کچھ آثار قدیمہ دریافت ہوئے ہیں کہ رزمک اور امیر علی کے نزدیک کٹر یشنڈی کے مقام پر ایک پرانہ کتبہ ملا، جس کو وہاں پر عباسیہ کے خاندان کے زمانے میں حسن ماہان برمکی نے لگوایا، کہ وہاں پر اُس کا ہیڈ کوارٹر یا صوبائی دارالحکومت تھا۔ اس کتبہ پر یہ لکھا تھا کہ اس جگہ کسی زمانے میں کفار اور مشرکین کا ہیڈ کوارٹر تھا، اُن کے خلاف مسلمانوں کے جو لشکر جہاد کے لیے آیا، اُس میں سید الشھد اامام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ پیچھے ہم نے جناب سعید رضی اللہ عنہ کے اُس لشکر کا ذکر کیا تھا، جس میں امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ شامل تھے اور آگے لکھا تھا کہ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کے ساتھ فوجی رابطہ قائم کر لیا۔ اور اُس کے بعد وہ خود مغرب کی طرف چلا گیا، لیکن اُس کے لشکر سے کچھ لوگ یا ایک حصہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ تو ظاہر ہوا کہ جناب امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ سمیت کافی لوگ بصرہ والے لشکر میں شامل ہو گئے تھے کہ انہوں نے وادی غزنی اور زبلستان کے علاقہ میں جہاد میں حصہ لیا، تو تب ہی ایسا کتبہ وزیرستان کے علاقہ میں ملا۔

قارئین! یہاں آ کر ہمارا یہ جائزہ صحیح ثابت ہوتا ہے، کہ کسی سازش کے تحت ہماری تاریخ سے عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کی بہادریوں کے قصوں کو خارج کر دیا گیا، اور کچھ نے یہ کہہ دیا، کہ اُن کو اختلاف تھا۔ وہ شریک نہ ہوئے۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔

یزدجرد کا خاتمہ

پہلی کتاب میں جنگِ نہاوند کے بعد اِن محاذوں کے حالات سرسری طور پر بیان کر دیئے گئے تھے۔ ساتھ ہی یہ بیان کیا گیا تھا کہ یزدجرد کا خاتمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا تھا کوفہ اور بصرہ کے محاذ پر جس جگہ بھی بغاوت ہوئی مورخین نے اُس میں یزدجرد کے ہاتھ کا ذکر ضرور کیا۔ لیکن یہ کہانیاں اور روایات افسانے زیادہ ہیں اور اِن میں حقیقت کم ہے۔ بے شک یزدجرد ایک چکی والے کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ لیکن یزدجرد کے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے اور تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کے بارے میں جو روایات تاریخوں میں موجود ہیں اگر اُن سب کو یکجا کیا جائے تو ایک کتاب بن جائے۔

مصیبت یہ ہے کہ ان واقعات کے ''چشم دید گواہ'' یا اپنے آپ کو ایسی کہانیوں سے ''وابستہ'' کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ بہرحال یہ قدرتی امر ہے کہ ایک آدمی کے ہاتھ سے جب حکومت نکل جائے اور وہ حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو کئی لوگ ایسی کارروائیوں میں خود بخود ''شریک'' ہو جاتے ہیں۔ بہرحال یزدجرد کا اِن بغاوتوں میں کتنا حصہ تھا یہ تجزیہ ہمارے لیے بے معنی ہے۔

ہمارے لحاظ سے یزدجرد بدقسمت تھا۔ اسلام قبول کر لیتا تو اس جہان میں بھی عزت مل جاتی اور آخرت میں بھی۔ جس طرح گمنامی میں پیدا ہوا اُسی طرح گمنامی میں مر گیا۔ اور ساتھ ہی ایرانی بادشاہت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ایران کے اکثر لوگوں نے چونکہ اسلام قبول کر لیا۔ تو یزدجرد کی اولاد سے ''دانشور'' تخت کا کوئی دعویدار بھی نہ پیدا کر سکے۔ کہتے ہیں کہ یزدجرد جب دَردَر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا، تو کہیں شادی کی اور اُس کا ایک اپاہج قسم کا لڑکا پیدا ہوا۔ افسانہ نویسوں کا یہ ''حق'' ہے کہ ''وارث'' پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اور آج کل بھی نہرو خاندان کے وارث نہ صرف بھارت میں حکومت کر رہے ہیں، بلکہ آئندہ وراثت قائم رکھنے کے بارے میں تجویزیں بنا رہے ہیں۔ ایوب خان کے ''وارث'' کا جھگڑا بھی شروع ہوا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قائداعظم کی وراثت کا کوئی جھگڑا نہ چلا۔ ہاں ہمارے ملک کے ایک ''عوامی لیڈر'' کے وارث اِس ملک کے وارث بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ اسلام کسی وراثت کا قائل نہیں۔ پہلی کتاب میں اس پہلو کو سرسری طور پر واضح کیا گیا تھا۔ اور آگے چوتھی کتاب میں اِس کا مزید ذکر آئے گا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس میں غیروں کی نقالی، بادشاہت، یا وراثت کا کوئی سوال نہیں۔ ساری امت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث ہے۔

نتائج واسباق

۱۔ یہ سات ابواب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے کی فتوحات کی کہانی ہیں، اور آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے سات آٹھ سال ایسے تھے، جس میں مسلمان دنیا کی ایک عظیم طاقت تھے۔ یہ ہمارے عزت وقار کے دن تھے۔ اور ہماری غیرت قائم تھی۔ گو جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کی کل فتوحات کا اجمالی خاکہ کتاب کے آخری باب میں بیان کیا جائے گا۔ لیکن یہ باب اس لیے اہم ہے کہ عملی طور پر ایک محاذ پر مسلمانوں نے فتوحات کے سلسلہ کو کیسے جاری رکھا۔ حکمتِ عملی اور تدبیرات کتنی اعلیٰ پایہ کی تھیں۔

۲۔ فتوحات کا سلسلہ ۳۳ ہجری میں جا کر رک گیا۔ کہ اندرونی خلفشار شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ اور آئندہ چار یا پانچ اندرونی خانہ جنگی شروع رہی۔ لیکن جیسے ہی یہ خانہ جنگی ختم ہوئی۔ دونوں مشرقی اور مغربی سرحدوں پر فتوحات شروع ہو گئیں۔ ان فتوحات کے لیے کوئی کوشش بھی نہ کی گئی۔ معمولی لشکروں نے اپنے نزدیکی علاقوں کو روندڈالا۔ فوجی لحاظ سے اس کامیابی کی ایک ہی وجہ تھی اور کلاسیوٹز اگر اِن فتوحات پر تبصرہ کرتا تو کہتا کہ یہ عطیات حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین کی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھے۔

۳۔ اسلام کا فلسفہ حیات کیا ہے، اور اُس پر مکمل عمل سے کیسے فائدہ ہوا۔ یہ ہمارا بڑا موضوع رہا ہے اب ضرورت کے تحت ہم چوتھی کتاب میں اپنے فلسفہ حیات اور فلسفہ جنگ کی تفصیل میں جائیں گے۔

۴۔ یہ فتوحات آگے کیوں رُک گئیں۔ اس کا جائزہ بھی آگے آتا ہے کہ تاریخ کے با مقصد مطالعہ کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

۵۔ پس یہی نکتہ اہم ہے کہ اجتماعی فلسفہ حیات کیا ہے اور اس پر عمل کیسے کیا جائے؟ ہمارا عندیہ یہ ہے کہ یہ کام حکومت کا ہے اور حکومت کو فلسفہ حیات کے نظام کو جاری وساری کرنا ہوگا۔ چاہے وہ اس کو نظام جہاد کا نام دے یا نظام مصطفیٰ ﷺ کا۔ قانون یا فقہ ثانوی چیز ہے اور اُس کی گاڑی کو گھوڑے کے آگے نہ رکھیں۔ حکومت گھوڑا ہے۔ لوگ گاڑی ہیں۔ اُن کو نظام کے ساتھ اس طرح باندھا جاتا ہے کہ گھوڑا گاڑی کو چلائے۔ البتہ اس نظام کے لیے اصول فقہ کے تحت وضع کیے جاتے ہیں کہ فقہ کا مطلب سوجھ بوجھ ہے اور سورہ توبہ کے مطابق تفقہ دین کا مطلب جہاد کی سوجھ بوجھ ہے۔

۶۔ باطل فلسفوں کے اصول یا غیروں کے طریق کار کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

۷۔ اب ذرا تدبیرات کی طرف آئیں۔ قارئین نے دیکھا ہوگا کہ مسلمانوں نے اکثر مقامات دو یا تین دفعہ فتح کیے اور اس پہلو کی ہر کتاب میں خوب تر وضاحت کی گئی ہے کہ مسلمان پیش قدمی کر کے دشمن کے ملک میں گھس جاتے

تھے اور اُس کے علاقوں کو ہلا کر رکھ دیتے تھے۔ لیکن اگر مسلمان دیکھتے کہ آگے سے دشمن نے کوئی سخت ردعمل کیا ہے تو وہ وہاں پیچھے ہٹ آتے تھے۔ اور دشمن کو اپنی مرضی کے مقام پر تہس نہس کر دیتے تھے۔ قادسیہ، نہاوند، اجنادین اور یرموک کی جنگیں اِسی طریق کار پر لڑی گئیں۔

۸۔ یاد رکھیں کہ لڑائی میں بڑا مقصد دشمن کی افواج کو تہس نہس کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ دشمن میں آئندہ لڑنے کی ہمت اور سکت ختم ہو جائے۔ اب ایران کے باقی علاقوں میں بھی یہی ترتیب اپنائی گئی، گو کہ سطح چھوٹی تھی۔ فارس، اصفہان، کرمان، سیستان اور جرجان کے اکثر علاقے مسلمان فتح کر چکے تھے۔ دوبارہ جب وہاں بغاوت ہوئی تو جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کی حکمت عملی اور تدبیرات دیکھیں کہ کس طرح نہ صرف بغاوتوں کو طریقے سے ختم کیا بلکہ جیسے ہی موقع ملا کابل اور غزنی کے نئے علاقوں کو بھی اسلامی سلطنت میں شامل کر دیا۔

۹۔ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد پورے ملک میں جلدی قبضہ نہیں ہو جاتا۔ یہ قبضہ بڑے شہروں اور ذرائع آمدورفت والی بڑی بڑی سڑکوں پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کسی علاقے کو مطیع کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ اسلام میں لوگوں کو مطیع کرنے کے بڑے اصول یہ ہیں۔ کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا نفاذ اس طرح کرو کہ پہلے خود اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کریں اور اس عمل کا ایسا مظاہرہ کریں کہ لوگ ہمارے فلسفہ حیات سے اثر لے کر مسلمان ہو جائیں۔

۱۰۔ یہ پہلو اب ڈھیلا پڑ رہا تھا کہ نوجوان مسلمان اسلامی فلسفہ حیات سے کچھ دور ہو رہے تھے، جس کے اثرات اچھے نہ ہوئے، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر بھی نوجوان تھے لیکن واقعاتِ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کسی بھی چیز کے سلسلے میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی کسی کارروائی پر اُنگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ نتائج سامنے ہیں...... اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قرابت داری کا الزام غلط ہے۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو تین سال لگاتار جہاد کے بعد اپنی عاجزی کا مظاہرہ بھی کیا۔

۱۱۔ جہاں تک اسباق کا تعلق ہے۔ وہ ساتھ ساتھ بیان ہو گئے ہیں۔ مرحلہ وار کارروائی، زماں و مکان پر کنٹرول، پیش قدمی کے طریق کار، اسلامی فلسفہ حیات، بت شکنی کے اصول، باہمی ملاپ اور رابطہ ہر ایک کارروائی میں کئی اسباق ہیں۔

۱۲۔ پہلی کتاب کے پیش لفظ میں واضح کیا گیا تھا کہ اس سارے مطالعہ کو ہم ہر واقعہ کے نتائج اور نتائج کے اثرات کے تحت پرکھیں گے۔ جہاں نتائج اور اُن کے اثرات پکے اور دوامی قسم کے تھے۔ وہاں پر کارروائی والوں کے خلاف انگشت نمائی ٹھیک نہ ہوگی۔ البتہ ایک دوامی اثر کا مطالعہ اب تک جاری ہے، کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں جہاں تک فتوحات ہوئیں اسلام وہاں قائم دائم ہے۔ باقی علاقوں میں یعنی سپین، بلقان، وجنوبی یورپ، وسط ایشیا اور

ہندوستان میں ایسا کیوں نہ ہوسکا۔کیا خلفائے راشدین ﷺ کے بعد کی فتوحات،خودغرضی کی فتوحات تھیں؟یا کیا فرق رہ گیا کہ وہاں اسلام مکمل طور پر قائم نہ رہ سکا۔سوال بڑا اہم ہے۔اس پر مکمل تبصرہ چوتھی کتاب میں کیا جائے گا۔گو اشارے اِن کتابوں میں موجود ہیں۔

آٹھواں باب

قرآن پاک کی اشاعت

قرآن پاک کا محافظ خود اللہ ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن پاک کے معجزوں کو زبانی یا تحریری طور پر بیان کرے۔ اللہ کے نیک بندے اس کو اپنے سینہ میں اٹھائے پھرتے ہیں۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے کی جنگوں کے سلسلے میں ہر باب میں قرآن پاک کی کچھ آیات کا ذکر کر دیا گیا ہے کہ قرآن پاک فوجی زبان (۱) میں ہے اور سب مسلمان اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں۔ فلسفہ جنگ، فوجی حکمت عملی اور فوجی تدبیرات کے بنیادی اصول قرآن میں موجود ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان اصولوں پر اپنے فلسفہ جنگ کو استوار کریں۔

جہاد ایک سیاسی فلسفہ ہے کہ امن کے زمانے میں قوم کو اس فلسفہ پر تیار اور متحد کیا جاتا ہے۔ جہاد بالسیف کا مطلب قوم اور ہتھیاروں کا رابطہ ہے (یعنی پوری قوم کی ہتھیار بندی اور جنگ کی تیاری) حرب جنگ کو کہتے ہیں جو جہاد بالسیف کی ایک شاخ یا ضرورت ہے قتال یعنی لڑائی حرب کی ایک شاخ ہے کہ تدبیرات اور تجاویز کے تحت میدانِ جنگ ''مارتے'' ہیں۔ یہ سب چیزیں چونکہ قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اور قرآن پاک میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ضمن میں کافی سے زیادہ ہدایات اپنے مزاج میں فوجی قسم کی ہیں اس لیے قرآن کی اشاعت کو ہم فوجی پہلو کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کی بنیاد کہیں گے۔ چنانچہ اس باب کو ہم نے فوجی حکمت عملی کتابوں میں ایک خاص مقام دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ سارا قرآن، یا دین فطرت کی ہدایات ایک ہی دن میں ایک کتاب کی شکل میں نازل فرما دیتا۔ جب ساری کائنات کو پیدا کرنے والا وہ ہے تو ساتھ ہی اپنے احکام کی ایک کتاب بھی پیدا کر دیتا۔ لیکن اُس نے اپنے بھید کسی کو نہیں دیئے۔ جب کچھ ہو جاتا ہے تو ہم کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ہو گیا۔ تو قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کے احکام سے کچھ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام عملی صورت میں کرنا چاہتا تھا۔ کہ احکام آہستہ آہستہ کسی ترتیب سے اتارے جائیں اور انسان ویسے بھی پیدا ہونے کے بعد عمل آہستہ آہستہ سیکھتا ہے۔ کوئی دنیاوی مثال اللہ تعالیٰ کے طریق کار کی صحیح نشاندہی تو نہیں کر سکتی۔ لیکن کسی دنیاوی فوج میں جب آدمی بھرتی ہوتا ہے تو

---

۱ جلال مصطفیٰ ﷺ، صفحہ ۱۰۱۔

اُس کی تربیت آہستہ آہستہ عملی طور پر کی جاتی ہے۔اس طرح قرآن پاک میں احکام بتدریج نازل ہوئے کہ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ پیش رفت ہو۔

قرآن پاک کے حافظ

حضور پاک ﷺ کی وفات سے پہلے دین مکمل ہو چکا تھا اور قرآن پاک بھی مکمل طور پہ نازل ہو چکا تھا۔متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک کو سینہ میں بھی اُٹھائے ہوئے تھے اور قرآن پاک صحیفوں کی صورت میں لکھا ہوا بھی موجود تھا۔لیکن ہر گھر یا ہر مسجد میں کسی مکمل کتاب کی شکل میں قرآن پاک اس طرح موجود نہ تھا،جس طرح آج گھر گھر موجود ہے۔تو وقت کی ضرورت تھی کہ امت میں وحدت فکر کے لیے ایک جامع شکل وصورت میں ایک جیسا قرآن پاک ہر مسلمان کے گھر یا مسجد میں موجود ہو۔یہ بات ذرا مشکل تھی کہ ہر مسلمان قرآن پاک کو سینہ میں محفوظ کر سکے۔ہر ایک کی یاد ایک جیسی نہ تھی۔گو متعدد مسلمانوں نے قرآن پاک کے بڑے حصے کو حفظ کیا ہوا تھا اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکمل طور پر قرآن پاک کے حافظ تھے۔

ہمارے پاس کوئی واضح روایت موجود نہیں،جس کے ذریعہ سے ہم یہ ثابت کریں کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی حافظ قرآن تھے۔لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کا اس سلسلہ میں ذکر ضروری ہے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ کئی دفعہ عشاء اور فجر کی نماز کے درمیان کسی نفل نماز کی ایک دو رکعت میں پورا قرآن پاک زبانی پڑھ لیتے تھے۔اپنی خلافت کے زمانے میں آپ رضی اللہ عنہ جب حج پر مکہ شریف لے گئے تو اکثر راتیں اپنے ایک خادم کو مقتدی کے طور پر اپنے پیچھے کھڑا کر دیتے تھے اور سارا قرآن پاک ختم کرتے تھے۔علاوہ آپ کاتب وحی بھی تھے۔جناب علی رضی اللہ عنہ کا مقام البتہ حفاظ میں بلند ترین مانا جاتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ویسے بھی اُس علم کے دروازہ تھے جس کے حضور پاک ﷺ شہر تھے۔آپ بھی کاتب وحی تھے۔لیکن جب آپ یمن جانے لگے اور حضور پاک ﷺ نے آپ کی چھاتی پر ہاتھ پھیرا تو اس کے بعد قرآن پاک جناب علی رضی اللہ عنہ کے قلب میں سمو دیا گیا۔یہی وجہ تھی کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک کے نسخے اکٹھے کرتے تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ضرور دکھایا کرتے تھے۔

جنگ یمامہ اور حفاظ

بارہ ہجری میں جنگ یمامہ ہوئی۔جس میں تین سو حافظ قرآن شہید ہوئے۔ان میں جناب سالم رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت رنج ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ،حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے بہت مداح تھے اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کے لحاظ سے جناب سالم رضی اللہ عنہ کا حفاظ میں بہت اونچا مقام تھا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا

کہ قرآن پاک لکھ کر کتابی صورت دی جائے جناب ابوبکرؓ نے فرمایا کہ حضور پاک ﷺ نے یہ کام خود نہیں کیا تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور باقی عظیم صحابہ سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے رائے دی کہ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے کہ اسے کتابی شکل دی جائے اُس زمانے میں کوئی اختلاف تو تھا نہیں اور فرق بھی صرف لفظوں کی ادائیگی اور لہجہ کا ہوتا تھا کہ کوئی ''س'' کو ''ش'' کی آواز کے ساتھ پڑھ جاتا تھا تو بعد میں آنے والوں کے لیے اختلاف پیدا ہو سکتا تھا۔

قرآن پاک کو جمع کرنا

چنانچہ فیصلہ ہوا کہ سینوں میں موجود یا کہیں کہیں متفرق طور پر لکھے ہوئے قرآن پاک کو کاغذ پر خوش خط لکھ لیا جائے اور خلیفہ وقت اپنے پاس رکھ لیں تا کہ اگر کہیں سے کوئی شک یا سوال ہو تو خلیفہ وقت اسے دور کر سکیں۔ قرآن پاک کے لکھنے کا یہ شرف ایک انصار جناب زیدؓ بن ثابت کو نصیب ہوا۔ آپ کاتب وحی بھی تھے اور خوش نویس بھی اور یہ قرآن پاک جناب صدیق اکبرؓ کی خلافت کے آخری دنوں میں مکمل ہوا۔ جناب صدیق اکبرؓ نے چونکہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا تو ساتھ قرآن پاک کا یہ نسخہ بھی جناب عمر فاروقؓ کو دے دیا۔ جناب فاروقؓ کی خلافت میں یہ نسخہ اُن کے پاس رہا۔ لیکن انہوں نے چونکہ کسی کو خلیفہ نامزد نہ کیا تو قرآن پاک کا یہ نسخہ اپنی بیٹی اور ام المومنین حضرت حفصہؓ کو دے دیا۔

روایت ہے کہ اس وقت تک اس قرآن پاک سے کئی نسخے نقل کئے گئے اور آگے ان نقل کیے ہوئے نسخوں سے بھی کئی نسخے نقل کیے گئے ہوں گے۔ لیکن اکثر یہ ہوتا تھا کہ ہر جگہ حافظ موجود ہوتے تھے ان سے سن کر لوگ قرآن پاک کو لکھ لیتے تھے۔ یعنی قرآن پاک کی کوئی سورت یا آیت جو ان حفاظ سے سنی وہ لکھ لی۔ اب حفاظ سے سن کر لکھتے وقت کئی دفعہ لفظوں کے ہجے یا زیر وزبر کو اس طرح نہ لکھا گیا جیسے مدینہ شریف کے نسخے میں موجود تھا۔

جناب حذیفہؓ بن الیمانؓ

قارئین کو یاد ہو گا کہ جناب حذیفہ بن الیمان (۱) نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی شمالی اور شمال مغربی عراق میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے اور ملک شام کی حدود تک گئے تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی آپ لشکروں کے دستوں کو لے کر نہ صرف آذربائیجان تک گئے بلکہ جناب عبدالرحمٰنؓ بن ربیعہ کے ساتھ مل کر شام کے کئی علاقوں اور خاص کر باب کی جنگ میں شرکت (۲) کی۔ بہر حال جب آپ کوفہ واپس آئے تو آپ نے

۱ الیمان بھی صحابی تھے اور جنگ اُحد میں شہید ہو گئے۔
۲ اس کی تفصیل پچھلے ابواب میں موجود ہے۔

جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص اور باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے عرض کی کہ قرآن پاک کا محافظ اللہ ہے لیکن ایک چیز انہوں نے عجیب وغریب سنی کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ قرآن پاک صحیح پڑھتے ہیں۔ان کا لہجہ صحیح ہے لیکن فلاں علاقے کے لوگ اُن کی طرح نہیں پڑھتے۔اس بحث میں آگے یہ پتہ چلا کہ اس فرق کی وجہ مختلف علاقوں کے لوگوں کے لہجہ کے فرق کے علاوہ حفاظ کے لہجہ میں فرق بھی شامل تھا۔

کچھ صحابہ کرام کو یہ بات معمولی بات نظر آئی کہ لہجہ میں فرق ہوسکتا ہے جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص اور کچھ صحابہ کرام کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں کسی وحدت کی ضرورت ہے لیکن جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کا خیال تھا کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود خداتعالیٰ کی ہے۔اتنے حفاظ قرآن پاک کو سینہ میں اٹھائے پھرتے ہیں۔آج تک کبھی کوئی اختلاف سننے میں نہیں آیا۔اس لیے اس سلسلہ میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔لیکن جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک کی تمام نقلوں کو ایک نسخہ کی نقل بنانا چاہتے ہیں۔وہ کہنے لگے کہ آخر قرآن پاک کے لکھنے میں ہرج ہی کیا ہے جب حضور پاک ﷺ نے خود لکھنے کا حکم دیا اور اب سب لکھے ہوئے قرآن پاک کو لفظ بلفظ ایک جیسا ہونا چاہیے۔

مدینہ شریف میں مشاورت

کوفہ کی اس بحث میں اختلاف موجود تھا اور اسی نکتہ کو سوچتے ہوئے جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ بن الیمان رضی اللہ عنہ مدینہ شریف روانہ ہوگئے۔وہاں پر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے مشاہدات اور کوفہ میں قرآن پاک کے سلسلے میں بحث سے متعلق باتوں سے آگاہ کیا جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے مشاورت طلب کی جس نے صلاح دی کے اب کاغذ کی کوئی کمی نہ تھی اور بہتر ہے کہ قرآن پاک جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تیار کروایا تھا کی نقلیں بنا کر تمام ممالک میں بھیجی جائیں اور لوگوں پر واضح کیا جائے کہ آئندہ لکھا ہوا قرآن پاک سن لینے کے بعد جب بھی لکھا جائے تو نقلیں صرف اُسی قرآن پاک سے بنائی جائیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب ممالک میں بھیجیں گے۔

کتابت اور اشاعت

چنانچہ اس کام کے لیے تین قریش نوجوان جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ، جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن حارث رضی اللہ عنہ اور جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کو مقرر کیا گیا اور چوتھے جناب زید رضی اللہ عنہ بن ثابت انصار تھے جو کاتب وحی تھے اور پہلا قرآن پاک جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تیار کروایا تھا اور انہی نے لکھا تھا اور اس وقت ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس موجود تھا۔ظاہر ہے کہ اُس وقت جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ افریقہ کے جہاد سے واپس آچکے تھے اور جناب سعید رضی اللہ عنہ کو بھی کوفہ سے بلایا گیا ہوگا۔ہمارے پاس یہ تفصیل موجود نہیں ہے۔دراصل اس زمانے

کے لحاظ سے یہ ایک عام سی بات تھی کہ شاہد عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر عام آدمیوں نے اس طرف زیادہ دھیان بھی نہ دیا کہ مسلمانوں میں کم از کم دس فی صدی لوگ حافظ تھے اور یہ اندازہ جنگ یمامہ سے لگ سکتا ہے کہ بارہ سو مسلمان شہدا میں سے تین سو یعنی ایک چوتھائی تعداد حفاظ کی تھی۔ تو دس فی صدی والی بات میں تو کوئی شک نہیں، بلکہ باقی مسلمانوں میں بھی اور ایسے صاحبان کافی تھے جن کو آدھا قرآن پاک یاد تھا۔ اور خیر کئی سورتوں کا یاد ہونا تو معمولی بات تھی۔

یہ جو نئے قرآن پاک لکھ کر بھیجے گئے تو ساتھ پرانے قرآن پاک ضائع کرنے کے احکام بھی تھے اور کچھ عرصہ کے لیے نئے قرآن پاک کا نام مصحف عثمانی ہو گیا۔ یہ صرف ''الفاظ'' کی بات تھی کہ پرانے قرآن پاک ضائع کیے جائیں اور ''مصحفِ عثمانی'' کو استعمال کیا جائے۔ ضائع کرنے کے بارے میں بھی کسی مبصرین نے جلا دینے کے الفاظ استعمال کیے۔ لیکن ہم اپنے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ پرانے قرآن پاک دفن کر دیئے گئے تھے اور اس کی روایت کے طور پر ہر محرم کے مہینے میں ہمارے مسجد کے مولوی صاحب ہمیں ساتھ لے کر گھر گھر جاتے تھے کہ قرآن پاک اور عربی قاعدوں کے پرانے کاغذ ہم اکٹھے کرتے تھے پھر اُن سب پرانے سپاروں، یا کاغذوں کو ادب کے ساتھ لے جاتے تھے اور قبرستان میں ایک گڑھا کھود کر دبا دیتے تھے اور جب ہم نیا قرآن پاک یا سپارہ خریدتے تھے تو بھی ہمارے استاد حافظ اُس کا لفظ لفظ دیکھتے تھے کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں۔

قرآن پاک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

روایت (۱) ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں کوفہ میں ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور شکایت کی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مصحف کیوں جاری کیا۔ اُس کے شاید الفاظ یہ تھے کہ مصحف عثمانی (۲) کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو سختی کے ساتھ ٹوک دیا اور فرمایا کہ اللہ کے کلام قرآن پاک کو کسی ایک آدمی کے نام سے مت منسوب کرو۔ یہ کام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہمارے مشورہ سے کیا اور اگر وہ یہ کام نہ کر جاتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں یہ کام از خود کرتے۔ اس کے بعد لوگوں نے لفظ ''مصحف عثمانی'' کو زیادہ استعمال نہ کیا۔ جس کسی نے یہ لفظ استعمال کیا تو وہ صرف سعادت کے لیے یا موازنے کے طور پر کیا کہ قرآن پاک ایک ہے ایک اللہ، ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ایک قرآن اور ایک اُمت۔ ان چار چیزوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب ایک ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بیان کے مطابق یہ لوح محفوظ میں ہے۔ لوح محفوظ کیا ہے، ہم اس تفصیل میں نہ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ان بیانات کو دنیاوی زبان میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

---

۱ تاریخ ابن خلدون۔

۲ کچھ لوگ مصحف صدیقی بھی کہتے تھے۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو قرآن پاک اکٹھا کیا گیا تھا اس کے بارے میں پوری اُمت کو معلوم تھا۔ اور اس زمانے میں ضروری نہیں کہ صرف ایک کاپی بنائی گئی ہو۔ کئی صاحبان نے اُس سے نقل کی ہوگی۔ لیکن جب دوبارہ نقل کرنے کا سرکاری انتظام کیا گیا تو بہتر سمجھا گیا کہ اُس قرآن پاک سے نقلیں تیار کی جائیں۔ جو جناب زید رضی اللہ عنہ بن ثابت نے لکھ کر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پیش کیا اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں امت میں وحدت رہی۔ یعنی سرکاری طور پر بھی وحدت فکر و وحدت عمل موجود تھی تو اللہ تعالیٰ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ سعادت بخشی کہ یہ عظیم کام ان کے ہاتھوں سے کروایا۔

یہاں ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں خلفائے راشدین نے قرآن پاک کو ایک کر کے امت میں باقی رکھنے کی سعادت حاصل کرنی تھی۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو ایک کتاب کی صورت دلوائی۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے اشاعت کرائی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے پہلے ذاتی طور پر قرآن پاک اکٹھا کیا پھر جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ کی تائید کی کہ ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی تو تب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ کام کیا۔ آخر میں جناب علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے اشاعت کی اور کوفہ میں ایک اعتراض والے کے اعتراض کو رد کر کے امت کے لیے وحدت کی نشاندہی کی۔

فوجی نظام سے موازنہ

یہ تھا اسلامی وحدتِ فکر کا عملی مظاہرہ۔ ہماری دنیاوی فوج میں جب نئے لوگ بھرتی ہو کر آتے ہیں تو اُن کو ایک خاص تربیت دی جاتی ہے اور سبق ہوتا ہے۔ ''فوجی لفظوں کا ایک کرنا'' یعنی سب جوانوں پر واضح کیا جاتا ہے کہ یہاں بھانت بھانت کی بولیاں نہ بولی جائیں گی ایک زبان ہوگی اور زبان اردو ہوگی۔ لہجہ فوجی ہوگا۔ ہر حکم یا کام کے لیے جو فوجی لفظ مقرر کیا ہوا ہے وہی استعمال کیے جائیں گے۔ اور ساری فوج کو یہ عملی تربیت ڈرل کے طور پر پریڈ گراؤنڈ میں دی جاتی ہے اور احکام پر عمل کرنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ ڈرل جرمنی کے اٹھارویں صدی کے بادشاہ فریڈرک اعظم نے مسلمانوں کی نماز، قرآن پاک کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے اخذ کی۔ مسلمان میدانِ جنگ میں صف بندی اور حرکت کے جو طریقے اپناتے تھے، فریڈرک نے اُن کو بھی ڈرل میں تبدیل کیا۔ بلکہ مسلمان امرا جو تلوار ہاتھ میں لے کر اپنی صفوں کے آگے قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ اُس کی نقل کرتے ہوئے فریڈرک نے یہ طریقہ اپنایا کہ بڑی پریڈ جہاں جھنڈے وغیرہ عطا ہوتے تھے یا جھنڈوں کی عزت افزائی کی جاتی تھی وہاں اُس نے افسروں کو حکم دیا کہ پریڈ سے پہلے افسر جب گراؤنڈ میں اپنے دستوں کی کمانڈ سنبھال لیں گے تو بڑے افسر کے آنے تک تلوار ہاتھ میں لے کر ٹہلائی کریں گے۔ یہ طریقہ انگریزوں کی نقل میں آج بھی ہماری ''ٹرپنگ آف کلر'' میں رائج ہے۔ تو ان تمام فوجی

کارروائیوں میں مقصد فوجی لفظوں کو ایک کر کے وحدت کے طور پر اُس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ یہی قرآن پاک سکھاتا ہے اور یہی اُس ''کو ایک'' کرنے کا مقصد تھا۔ اِسی وحدت کا اسلام کی ہر عبادت میں مظاہرہ ہوتا ہے۔

چنانچہ سورۃ بقرۃ کی پہلی آیت ایسی ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ یہ قرآن پاک اُن پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب پر ہے۔ یہی وہ وحدت ہے جس کی قرآن پاک ہم کو ہدایت کرتا ہے کہ ہم ایک امت ہیں۔ اسلام نے کسی گروہ بندی کی اجازت نہیں دی۔ یہ بات ہم قارئین پہ چھوڑتے ہیں کہ وہ فیصلہ کریں کہ آیا سیاسی پارٹیاں، مذہبی فرقے یا ٹریڈ یونین یا اس قسم کے دوسرے ادارے گروہ بندی کے تحت آتے ہیں یا نہیں، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس سلسلہ میں یہ لکھا ہے۔

منفعت ایک ہے اُس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی ﷺ دین بھی ایمان بھی ایک

نواں باب

آزادی فکر و آزادی عمل

اب ہم اسلام کی آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کے دور میں داخل ہوتے ہیں ہمارے دانشور صبح وشام زور دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرد کو آزاد پیدا کیا ہے۔اس کے فکر وعمل میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔اور جب کسی آدمی کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے تو لکھا جاتا ہے کہ عجب آزاد مرد تھا۔ ہمارے عالم دین اپنے ناموں کے ساتھ ''آزاد'' کا لفظ ایک تخلص کے طور پر شامل کرتے ہیں اور ہم اگر سیدھے طور پر یہ کہہ دیں کہ اسلام میں آزادیٔ فکر وعمل آزادی عمل کی حدود مقرر ہیں اور ہم ان سے باہر نہیں نکل سکتے ،تو شور مچ جائے گا کہ یہ کون ہوتا ہے ہماری آزادی میں دخل دینے والا۔ بہر حال اپنی مدد کے لیے ہم علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا سہارا لیتے ہیں کہ شاید اس سلسلے میں ہمارے دانشور اور نوجوان اس فلسفہ یا طریق کار کی گہرائیوں میں اتر سکیں۔علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار ۔۔۔ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

بے شک حضور پاک محمد مصطفیٰ ﷺ محسن انسانیت ہیں اور آپ ﷺ نے انسانوں کو انسان کی غلامی سے نجات دلائی اور انسانیت کو اس کی عزت اور غیرت واپس دلائی۔لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی حدود امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی نشاندہی بھی کر دی کہ انسان کو ان حدود کے اندر رہنا ہوگا اور فرد کی ذاتی ذمہ داریاں بھی طے کی گئیں کہ وہ معاشرہ میں کیسے کام کرے گا اور اس کے اصول مقرر کر دیئے اسلام نہ شتر بے مہار بننے کی اجازت دیتا ہے نہ مادر پدر آزادی کی۔ لیکن جب انسانوں کو انسان کی غلامی سے چھٹکارا مل گیا تو پہلے دو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو لوگ من وعن دین فطرت کی پابندی کرتے رہے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ کچھ اپنے آپ سے باہر نکلنے شروع ہو گئے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے آٹھ نو سال اسلام کا زریں دور تھا۔مسلمان جب بھی کسی جنگ میں شریک ہوئے فتح یاب ہوئے۔پریشانی کا کوئی دور بھی نہ آیا۔اور ہر لحاظ سے فکر مندی میں کمی آ گئی۔اگرچہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مرتدین کی وجہ سے مشکل وقت بھی آئے۔پھر جب آپ رضی اللہ عنہ بستر مرگ پر تھے تو اس زمانے میں جناب مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث ایران کے محاذ سے آئے اور وہاں کے پریشان کن حالات بیان کئے۔جناب عمر رضی اللہ عنہ کو نہ صرف ان حالات کے ساتھ نپٹنا پڑا، بلکہ بعد میں جسر کی جنگ ،قادسیہ کی جنگ اور یرموک کی جنگ وغیرہ بڑی مشکل

اور صبر آزما کارروائیاں تھیں۔ حاکم وقت کے ساتھ مجاہدین بھی فکر مند ہو جاتے تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حالات نے کبھی پریشان کن صورت اختیار نہ کی۔

زر، زمین اور زن تینوں کی بہتات تھی اور مسلمان اب حاکم تھے وہ ایسے مقامات اور محلات پر قبضہ کر چکے تھے، جہاں پر پہلی حکومتوں کے بادشاہ اور امراء رہتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ مسلمانوں کی طرزِ زندگی میں فرق آ رہا تھا اُن کے لباس میں تبدیلی ہوئی اور کھانے پینے کے طریقوں پر اثر پڑا اور جب جہاد سے فراغت ہوئی۔ تو طرح طرح کی محفلیں لگنا شروع ہوئیں پھر ان محفلوں میں وہاں کے حالات و واقعات پر تبصرے شروع ہوئے۔

آنے والے خطرات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان خطرات کو بھانپ چکے تھے، وہ دولت کا سخت حساب رکھتے تھے۔ جہاں پر کسی امیر کے پاس ایک پیسہ فالتو نظر آیا، اُس کو لے کر آپ بیت المال میں ڈال دیتے تھے۔ وہ ہر حکم نہایت سختی سے دیتے تھے۔ اور تمام امراء آپ کا نام سن کر کانپنا شروع کر دیتے تھے۔ دوسری کتاب میں ذکر ہو چکا ہے کہ جب لوگوں نے سنا کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت کے لیے جناب عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کر رہے ہیں تو وہ سخت گھبرا گئے تھے۔ اُس کتاب کے پانچویں باب میں ہم نے یہاں تک واضح کر دیا ہے کہ عظیم صحابی جناب طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبیداللہ جو عشرہ مبشرہ میں تھے۔ انہوں نے جا کر جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سخت بحث کی کہ وہ مسلمانوں پر ایسے سخت آدمی کو امیر کیوں مقرر کر رہے ہیں۔

لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو گھر گھر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آٹھ سال کو زریں دور کہا جاتا ہے کہ لوگ بے فکر ہو گئے جب بے فکری پیدا ہوئی تو رویے میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اس تبدیلی نے غور و فکر میں آزادی پیدا کر دی جگہ جگہ مجلسیں جمنا شروع ہو گئیں۔ لوگوں نے گپ شپ لگانے کے طریقے وضع کر لیے اور ہر معاملے میں اپنی فکر کو خوب آزادی کے ساتھ استعمال کیا۔ کہیں سے کوئی پرستش نہ ہوئی اور لوگوں نے ''افلاطون'' بننا شروع کر دیا۔ ہر آدمی زندگی کے ہر پہلو اور ہر معاملہ پر رائے دینے لگ گیا اور اپنے آپ کو کچھ ''سمجھنا'' شروع کر دیا۔ دوسروں میں اس کو نقص نظر آنے لگے خاص کر امیر میں تو اسے کئی نقص نظر آتے اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر میں امیر ہوتا تو یہ کرتا۔ اب ان باتوں نے پھیلنا شروع کر دیا۔ کانا پھوسیاں اور چہ مگوئیاں بحث و مباحثہ کی شکل اختیار کر گئیں۔

امراء کی تبدیلیاں

اس طرح ہر امیر کے خلاف جائز اور ناجائز شکایات کی بھرمار ہو گئی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے امراء اور عاملوں میں تبدیلیاں بھی کیں۔ مصر میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے

محاسبہ کیا تھا ان کے پاس کچھ رقم فالتو نکلی تھی وہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں ڈال دی تھی اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن کو تبدیل کر دیا۔ کوفہ میں پہلے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کو تبدیل کیا گیا۔ پھر جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو اور اُن کے بعد جناب ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذکر بھی موجود ہے۔ تو اہل بصرہ نے سوچا کہ وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔ انہوں نے جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی تبدیلی کی گزارش کی تو وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مان لیا۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دنوں میں اہل کوفہ نے کہا کہ انہیں امارت کے لیے جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ چاہیں۔ صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رہ گئے تھے کہ ملک شام میں کسی نے اُن کے خلاف شکایت نہ کی۔ لیکن ایک گروہ مدینہ میں پیدا ہو گیا کہ آخر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام میں اتنے عرصہ سے عامل کے طور پر کیوں رکھا جا رہا ہے اور جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی الزام نہ مل سکا تو لوگ کہنے لگے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں کرتے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان سے کوئی باز پرس نہیں کرتے وہ کیا غلط کام کرتے تھے اس سلسلے میں کسی راوی یا مورخ نے کچھ نہیں کہا تو ظاہر ہے یہ سب کچھ کسی سازش کا نتیجہ تھا۔

اعتراضات

اب حالات کچھ عجیب صورت اختیار کرتے جا رہے تھے، جہاں پر لوگوں کی بات مان لی جاتی تو کچھ دن امن رہتا۔ لیکن پھر وہی بے ڈھنگی چال شروع ہو جاتی اور جہاں لوگوں کی بات نہ مانی جاتی وہاں پر لوگ تمام تر ذمہ داری خلیفہ وقت کے سر تھوپ دیتے کہ خلیفہ بڑے کمزور ہیں۔

ہم نے واضح کر دیا ہے کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ تو جلدی تبدیلی بھی کر دیتے تھے، لیکن آخر خلیفہ کی بھی کچھ ذمہ داریاں تھیں ان کے بھی ذرائع اور ضرورتیں تھیں، وہ ہر معاملہ میں لوگوں کے آگے کیسے جھک جاتے۔ لوگ تو اعتراض کرتے ہی رہتے ہیں۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جب جناب خالد رضی اللہ عنہ کو سبکدوش کیا تو کچھ لوگوں نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتراض کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو خاموش کر دیا پھر یمن سے چادروں کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا گیا۔ اور یہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے لیکن راقم کو اس واقعہ کی صحت اور الفاظ پر شک ہے۔

تبصرہ

علامہ عنایت اللہ مشرقی نے اس کہانی پر بہت کچھ لکھا ہے کہ وہ کون بدقسمت تھا جس نے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی پر اعتراض کیا۔ اور راقم نے ساری تاریخیں چھان ماریں کہ کسی پرانی تاریخ میں اعتراض کرنے والے کا نام مل جائے۔ لہٰذا بعد کی تاریخوں میں کسی ایک آدھ راوی نے جناب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے کہ یہ

اعتراض انہوں نے کیا تھا۔ اول تو حضرت عمرؓ کے خلیفہ بننے کے بہت جلد بعد جناب سلمانؓ ایران کے محاذ پر چلے گئے اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں وہیں فوت ہوئے۔ آپ مدائن کے نزدیک ایک جگہ دفن ہیں جو آپؓ ہی کے نام سے آج مسلمان پاک کے نام سے موسوم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جناب سلمانؓ جیسے عظیم صحابیؓ کو جناب عمرؓ کے انصاف پر شک ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ یہ کہانی آزادی فکر والوں نے بعد میں گھڑلی۔ کہ حضرت عمرؓ پر بھی اعتراض ہوسکتا تھا۔ اور ہم نے اس لیے مان لی کہ اس میں جناب عمرؓ کی بڑائی تھی۔

دین فطرت کے اصول

چنانچہ دین فطرت نے اس سلسلے میں کچھ قوانین اور ضابطوں کی نشاندہی کی ہے اور حضور پاک ﷺ نے زندگی کے ہر معاملہ پر زبانی اور عملی روایات چھوڑی ہیں ان روایات کو صرف حکومت ہی جاری وساری کر سکتی ہے نہ کہ عوام۔ امیر کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا پابند ہو۔ اُس کے بعد امیر کے احکام کو بغیر کسی چون وچرا کے یا حجت کے مانا جائے۔ اگر حکومت کا فیصلہ صحیح نہ بھی ہو تو حکم عدولی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم مسلمان اٰمنّا و صَدقنا کے قائل ہیں اگر ہمیں حکومت کے احکام میں کوئی خامی نظر آتی ہے تو ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم ان احکام کا مذاق اڑائیں یا قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اول تو عوام کو حکومت کے حالات کا پتہ ہی نہیں ہوتا اس لیے احکام کے فلسفہ کو سمجھنا عوام کے بس کی بات نہیں۔ اگر واقعی حکومت کا کوئی حکم نا قابل عمل ہو یا بالکل بودا ہو تو عوام حکومت کو آگاہ کریں اُن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حکومت کے احکام نہ مانیں۔

اسلام اس چیز کی بالکل اجازت نہیں دیتا کہ لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اسلام بغاوت کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اسلام میں تمام اختلافات کو مسجدوں کے اندر بیٹھ کر نپٹانے کے احکام ہیں اور اختلافات کو بازاروں میں لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام کے اجتماعی فلسفہ حیات کا ایک ستون اطاعت پر ہے اور دوسرا ربط وضبط پر جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا معاملہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے اور اسلام میں کسی یاکستان (۱) کی اجازت نہیں۔

قارئین نے پچھلے ابواب میں ضرور اندازہ لگالیا ہوگا کہ لوگ بے جا اور ناجائز اعتراضات کر رہے تھے۔ پہلے جگہ جگہ امراء کی تبدیلی کے لیے شور مچایا اور جب اس میں کچھ کامیابی ہوئی تو لوگوں نے خلیفہ وقت کو تبدیل کرنے کے لیے فتنہ شروع کر دیا۔ دراصل فتنہ پسند یا شرارت پسند لوگ تعداد میں زیادہ نہ تھے۔ لیکن سازش سخت گہری تھی اور عوام کو گمراہ کیا جارہا تھا۔ کئی لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن دل سے مسلمان نہ تھے اور اندر ہی اندر اسلام کی جڑوں کو

---

۱ ایک ایسا علاقہ ضلع ہزارہ سوات اور چلاس کے درمیان موجود ہے۔ ان کے معاشرتی حالات کا مطالعہ بڑا دلچسپ رہے گا۔ اہل یورپ بھی دیکھ کر حیران رہ گئے۔

کھوکھلا کرنا چاہتے تھے۔ ہرمزان اور حیرہ کے عیسائی جفینہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ ابوزبید شاعر نے جناب ولید رضی اللہ عنہ کو ہدف بنایا اور کوفہ کے گردونواح میں تو کافی لوگ پیدا ہو چکے تھے جو شرارت پر تلے ہوئے تھے اور ہر فساد کی بنیاد وہی ہوتے تھے۔ لیکن ایک شخص خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ عبداللہ بن سبا تھا۔

عبداللہ بن سبا

عبداللہ بن سبا جو السودا کے نام سے بھی مشہور تھا پہلا یہودی تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان ہو کر مدینہ شریف میں قیام پذیر ہوا۔ اس نے لوگوں کے عقائد کو خراب کرنے کی عجیب وغریب طرح سے کوشش کی۔ کہنے لگا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام اگر دنیا میں واپس آ سکتے ہیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو نبیوں کے سردار ہیں کیا وہ واپس نہ آ ئیں گے؟ نہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ضرور واپس آ ئیں گے اور ایسی باتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کئی لوگوں کو یہ بات پسند آئی اور انہوں نے اس بات کو مان لیا۔ گو عبداللہ کی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غلامی اور عقیدت کی اس بات کو بڑا سراہا گیا کہ لیکن چونکہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں کوئی ایسی بات نہ فرمائی۔ اور دنیا کو قید خانہ سے تشبیہہ دی۔ تو ہم یہ بات کیسے مانیں کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کے بعد مومن کی طاقتیں ستر گنا بڑھ جاتی ہیں۔ تو اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ علاوہ صحیح بخاری کی احادیث سے واضح ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم حاضر وناظر ہیں تو پھر اور کیا ضرورت ہے۔

عبداللہ بن سبا کو پہلی سازش میں کچھ کامیابی ہوئی تو اس نے ایک اور شوشہ چھوڑا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دابۃ الارض ہیں اور آخر زمانے میں زمین سے نکلیں گے۔ اسی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ابوتراب کا خطاب دیا۔ خیر یہ بات تو صحیح ہے کہ العیشرہ (۱) کی مہم میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوتراب کے نام سے پکارا کہ پسینہ آیا ہوا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک جھاڑی کے سایہ میں سو گئے۔ ہوا چلی تو چہرہ اور بدن پر مٹی کی تہ جم گئی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جگایا اور فرمایا کہ اے ابوتراب یعنی مٹی کے باپ یہ اپنے اردگرد اتنی مٹی کیسے اکٹھی کر لی۔ یہ تو ایک واقعہ تھا۔

دابۃ الارض

دابۃ الارض کا ذکر قرآن پاک میں ہے لیکن جہاں تک ہم نے اس لفظ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور مفسرین کے بیان پڑھے ہیں تو قرآن پاک کے الفاظ دَابَّةُ الْاَرْض کی تفسیر یہ ہے "کہ جب لوگ آیاتِ ربانی سے روگردانی کر جائیں گے تو زمین سے ایک جانور نکالا جائے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا۔" مفسرین نے تو استعاروں کے ذریعے

۱؎ جلال مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۰۳۔

آخری زمانے کی مخلوق کی طرف اشارے کیے ہیں کہ یہ اُن کا ذکر ہے۔ اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات کے نام سے یاد کیا اور انسان کو جانور یا حیوان لغوی طور پر کبھی نہ کہا گیا۔ ہاں البتہ خراب کردار کی صورت میں تو انسان کو جانور سے بدتر بھی کہا گیا ہے۔ لیکن پچھلی کئی صدیوں سے اہل مغرب تو انسان کو حیوان یا جانور ہی کہہ رہے ہیں۔

تبصرہ

مغربی تعلیم کے ایسے بُرے اثرات ہوئے ہیں کہ ہمارے لوگوں میں بھی اسلام سے نابلد لوگ، اسی رو میں بہ گئے ہیں۔ اور ہمارے علماء ہمارے فلسفہ حیات کو موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی زبان میں بیان نہیں کرتے سورۃ رحمٰن میں ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرآنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانُ ○ اب اسی ترتیب سے ان آیات کے معنی کریں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا علم یا روشنی پیدا کی۔ جس کے لیے ہمارے فقرا نے حضور پاک ﷺ کا نور یا آپ ﷺ کی آمد کی روشنی کے الفاظ استعمال کیے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی کہ انسان ہی کائنات کا مرکز ہے جب انسانی قافلہ اس دنیا یا کائنات سے گزر جائے گا تو یہ دنیا لپیٹ لی جائے گی۔ اس کی تفصیل چوتھی کتاب میں ہے۔ لیکن یہاں پر ہم یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اہل مغرب یا ہندو انسان کو کائنات کا مرکز نہیں مانتے بلکہ ایک عام حیوان سمجھتے ہیں اور اس چھوٹی سی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اپنے ملک کو مادر وطن کہتے ہیں۔ دنیا کی اور دھرتی کی پوجا کرتے ہیں اور میری ماں دھرتی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے حساب سے انسان زمین کا ایک کیڑا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے روحِ انسانی کو ایک پرندے سے تشبیہ دی ہے۔ جس کا آشیانہ عرش پر ہے اور جو موت پر اپنی منزل کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اس خاکدان میں اُس کا بسیرا عارضی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو منطق الطیر کی تعلیم دی گئی۔ حضرت فرید الدین (۱) عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو منطق الطیر کا نام دیا۔ اسلام کی ساری تعلیمات کو منطق الطیر کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان تعلیمات کے مطابق عابد و معبود کے درمیان ایک تعلق استوار کرنا ہوتا ہے تاکہ موت کے بعد انسان اپنی منزلیں خوش اسلوبی سے طے کرے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ کی رائے

زمین یا مادہ پرستی کو اسلام نے ناپسند کیا اور خالص دابۃ الارض یعنی زمین کے اندر سے پیدا ہونے والی چیز کو جانور کے نام تو دیئے جا سکتے ہیں لیکن اس کو انسان کے ساتھ تشبیہ دینے والی بات کو ہمارے بزرگوں نے پسند نہیں کیا۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس سے تشبیہ دی جائے۔ لیکن عبداللہ بن سبا نے جناب علی

۱۔ جلال مصطفےٰ ﷺ، ص ۱۲، اور ۳۷۳۔

المرتضیٰ ؓ کی وفات کے بعد ایک نیا شوشہ اور چھوڑا کہ جناب علی ؓ کے ساتھ لوگوں نے انصاف نہیں کیا۔ اُن کو زمین سے پھر نکالا جائے گا اور دوسری دفعہ اُن کو اُن کے پورے حقوق ملیں گے اور وہی دابۃ الارض ہیں۔ لوگوں نے اس بات پر یقین کر لیا اور امام حسن ؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو طبری کے مطابق امام حسن ؓ یہ سب بات سن کر سخت ناراض ہوئے۔ اور یہاں تک فرمایا کہ حضرت علی ؓ کی وفات کے بعد ان کی بیویوں نے دوسرے نکاح کر لیے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ کیسے دوسرا نکاح کرتیں یا ہم ایسا کرنے کی اجازت دیتے۔ بلکہ آپ ؓ نے یہ بھی فرمایا کہ جناب علی ؓ نے کبھی اس شخص یعنی عبداللہ بن سبا کو منہ نہ لگایا تھا۔

عبداللہ بن سبا کی سازش

عبداللہ بن سبا نے جب سازش شروع کی تو پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق کی بات کی اور اس بات کو اس طرح آگے بڑھایا کہ حضرت عثمان ؓ اور ان کے خاندان کو غاصب قرار دینا شروع کر دیا۔ اور قبیلوں یا خاندانوں میں جھگڑا کرنے والا پہلو جو زمانہ جہالت میں موجود تھا اُس کو عبداللہ نے دوبارہ شروع کر دیا۔ حالانکہ جنگ بدر نے سب فیصلے کر دیئے تھے اور باقی جو کسر تھی وہ حضور پاک ﷺ نے آخری خطبہ میں پوری کر دی تھی کہ تمام خاندانی برتریوں کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا تھا۔ عبداللہ بن سبا کی سازش حضرت عثمان ؓ کے خلاف تو خوب چلی کیونکہ لوگ فطرتاً حکومت کے خلاف بات سننے کو تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن عبداللہ کو معلوم تھا کہ نفرت کو مکمل کرنے کے لیے پہلے دو خلفائے راشدین کو بھی غاصب کہا جائے تو تب معاملات اس کی مرضی کے مطابق ہوں گے اور وہ مسلمانوں میں ہر طرح سے تفرقہ پیدا کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے گڑے مردے اکھاڑنے شروع کر دیئے کہ حضور پاک ﷺ کی وفات کے وقت سے لوگ گمراہ ہو گئے تھے کہ حضرت علی ؓ کو ان کا حق نہیں دیا اور بنو امیہ کو آگے لانے والے جناب عمر ؓ ہیں کہ انہوں نے جناب معاویہ ؓ کو شام کی امارت دی۔ عبداللہ ؓ بن ابی سرح کو مصر میں مالیات کے کام پر لگایا۔ ولید ؓ بن عقبہ کو جزیرہ کی امارت دی۔ سعید ؓ بن العاص کی پرورش پر توجہ دی وغیرہ۔ اس لیے عبداللہ بن سبا ملک شام کی طرف چلا گیا کہ سب سے پہلے جناب معاویہ ؓ کے خلاف وہاں پر ایک محاذ تیار کرے۔

عبداللہ کی جناب ابوذر غفاری سے ملاقات

جناب ابوذر غفاری ؓ عرصہ سے ملک شام میں جہاد میں مصروف تھے۔ دوسری کتاب میں بھی آپ ؓ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور قبرص کی فتح میں بھی آپ شامل تھے۔ بلکہ سکندریہ کی پہلی فتح کے وقت آپ مصری فوج میں شامل تھے۔ لیکن اب جہاد میں جمود آ گیا تھا۔ لیکن جناب ابوذر غفاری ؓ نے ایک اور محاذ پر جہاد شروع کر دیا تھا...... جناب

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تقویٰ میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے اور پہلی دو کتابوں میں جب آپ کا ذکر آیا تو گزارش کی تھی کہ آپ کے سلسلہ میں تفصیلی حالات تیسری کتاب میں لکھے جائیں گے۔ اب جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جہاد بالنفس کی تلقین کرنے کے لیے ایک محاذ کھول دیا تھا کہ مال دولت کا طمع نہ کیا جائے وغیرہ۔

ابن سبا جب شام پہنچا تو اُس کی ملاقات جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی۔ اور جب جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ لوگ کس طرح طمع میں پڑ چکے ہیں تو ابن سبا بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اس کے ذمہ دار امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ جو بیت المال میں دولت اکٹھی کرتے ہیں اُس کو بعد میں اپنے خاندان کے لیے استعمال کریں گے اور عام مسلمانوں کا حق ختم کرنے کے لیے اس کا نام اللہ کا مال رکھ دیا ہے۔

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کا غصہ

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو اُن کو غصہ آ گیا اور وہ فوراً جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور اُن کے ساتھ اُلجھ پڑے۔ لیکن جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اولین صحابہ کرام کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ انہوں نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو عرض کی کہ آئندہ اس کو مال المسلمین کہہ دیں گے۔ ویسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ کا مال بھی مسلمانوں کا مال ہے اور مسلمانوں کے مال و جان بھی اللہ کے ہیں۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو کچھ تسلی تو آ ئی لیکن ابن سبا نے کہا کہ یہ سب کہنے والی باتیں ہیں۔ دل میں کچھ اور ہے۔ لوگوں کو دیکھو تو سہی وہ کس شان و شوکت سے رہتے ہیں۔ ابوذر رضی اللہ عنہ پہلے بھی لوگوں کو سادگی اختیار کرنے کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ اور جناب فاروق رضی اللہ عنہ جو جناب خالد رضی اللہ عنہ اور جناب یزید رضی اللہ عنہ پر برس پڑے تھے اس کا حوالہ بھی دیا کہ ایسا نہ کیا جائے۔ لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ اور جناب یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی حالت کی وضاحت کر دی تھی اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ نہ کہنا تھا۔ لیکن ابوذر رضی اللہ عنہ کو یہ طور طریقے ناپسند تھے۔ کچھ ابن سبا کی سازش نے کام کیا اور جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے ساتھ اُلجھنا شروع کر دیا۔ یعنی زیادہ سختی سے منع کرنے لگ گئے۔ چنانچہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سفارش پر جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو مدینہ طلب کر لیا اور انہوں نے اسلام میں اطاعت امیر کے اصول کے تحت یہ حکم مان لیا۔ اب ابن سبا نے سازش کو اور آگے بڑھایا کہ سچی بات کرنے والے کے لیے کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے کہ دیکھو جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو شام سے نکال دیا گیا ہے۔

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ میں

بہر حال جب جناب ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ شریف پہنچے تو حیران رہ گئے یہاں پر بھی حالات اور معاملات تبدیل ہو چکے تھے۔ مدینہ وہ پہلا مدینہ نہ تھا۔ بہت کم صحابہ کرام مدینہ شریف میں باقی رہ گئے تھے اکثر صحابہ کرام یا اُن کے

خاندان کے لوگ دوسرے ملکوں میں جا چکے تھے۔ کافی غیر ملکیوں اور کاریگروں نے مدینہ میں رہائشیں اختیار کر لی تھی۔ غلاموں کی تعداد کافی تھی اور مجاہدین غلاموں کو آزاد کرتے رہتے تھے لیکن محاذ سے پھر اتنے ہی اور غلام آ جاتے تھے۔ آزاد شدہ غلام بھی مدینہ ہی میں رہائش اختیار کر چکے تھے۔ مال و دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ کچھ لوگ بہت امیر ہو چکے تھے لیکن غریب لوگ بھی تھے۔ جو چیز ابوذر رضی اللہ عنہ کو سخت ناپسند آئی وہ یہ تھی کہ لوگ مال و دولت اکٹھا کرتے تھے اور اپنے غریب ہمسایہ کی پروا نہ کرتے تھے۔ غریب بھی کچھ خودغرض تھے اور اُن کے دلوں میں اپنے ہمسایوں کی یا مہربانی کرنے والوں کی وہ عزت نہ تھی۔ یعنی جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں میں جو ربط وضبط دیکھا تھا یا جس طرح مسلمانوں کے دل جڑے ہوئے تھے وہ بات ختم ہوتی نظر آتی تھی۔ چنانچہ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے کھلم کھلا تبلیغ شروع کر دی کہ مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے جب مجلس میں یہ بات کی۔ تو جناب کعب احبار رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "جس نے اپنے فرائض ادا کر دیئے اس نے گویا کل حقوق اللہ ادا کر دیئے۔" کعب پہلے یہودی تھے اور نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ بڑے اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ تو جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے اور اس کو دبوچ لینے پر بھی تیار ہو گئے تھے کہ یہ اسلام کے چند فرائض پر اکتفا کرنے والا کون ہوتا ہے۔

لیکن جس چیز سے جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو زیادہ تکلیف ہوئی وہ کانا پھوسیاں اور نجی محفلیں تھیں۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں کے خفیہ اڈے بھی تھے کہ وہاں ہر قسم کی مجلسیں لگائی جاتی تھیں اور کوئی چیز حکومت سے حاصل کرنا ہوتی تھی تو وہاں کھچڑی پکتی تھی کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے کسی کے خلاف محاذ بنانا ہوتا تو بھی ایسے مقامات پر صلاح ومشورہ ہوتا اور تمام گروہ بندیوں کی بنیاد ایسے ہی خفیہ اڈوں میں باندھی جاتی۔ عبداللہ بن سبا کے پھیلائے ہوئے عقائد بھی وہاں پر زیر بحث آتے تھے۔

چنانچہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ اُن کو مدینہ سے باہر ربدہ کے مقام پر رہنے کی اجازت دی جائے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب مدینہ کے مکانات صلع پہاڑی تک پہنچ جائیں یا مدینہ کی عمارتیں خفیہ اڈے بن جائیں تو تم وہاں سے نکل جانا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے آقا ﷺ کا حکم سر آنکھوں پر اور اُس کی ضرور تعمیل کی جائے گی لیکن لوگ کہیں گے کہ خلیفہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو جلاوطن کر دیا یا مدینہ بدر کر دیا۔ لیکن جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگ خواہ کچھ کہیں وہ مدینہ میں نہیں رہ سکتے۔ تو حضرت عثمان نے پھر بھی کوشش کی۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ میں رہیں اور فرمایا کہ لوگ یہ تو کہیں گے کہ حکومت کے حالات اتنے خراب تھے کہ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ جیسے آدمی گوشہ نشین ہو گئے، لیکن جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اپنے آقا ﷺ کا حکم مانیں گے اور مدینہ چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ مقرر کیا، دو خدمت گار اور ایک اونٹ دیا اور جناب

ابوذر رضی اللہ عنہ ربدہ چلے گئے اور وہیں پر آپ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی جن کا ذکر جلالِ مصطفےٰ ﷺ (ص ۱۷۱) میں موجود ہے۔

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ اور اسلام

ویسے تو سارے صحابہ کرام چلتا پھرتا اسلام تھے۔ اور تاریخ کے اس بامقصد مطالعہ اور تحقیق میں ہم نے ان چاروں کتابوں میں صحابہ کرام کی کارکردگی سے عملی اسلام پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اُن میں کوئی سپہ سالارِ اعظم تھا اور کوئی سپہ سالار۔ کئی امرا تھے اور کئی دستوں کے امیر تھے۔ لیکن اب ہم ایک سپاہی کی کہانی پیش کر رہے ہیں۔ اور عظیم سپاہی کی کہانی۔ انصاف تو یہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے احوال کو بھی جناب مثنٰی رضی اللہ عنہ بن حارث کی طرح ایک الگ باب میں بیان کیا جاتا۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ چونکہ ہماری ہر کتاب میں ایک طرح سے چھائے رہے کہ عاشق رسول ﷺ تھے۔ تو ہم نے آپ رضی اللہ عنہ کے حالات کو واقعات کے تحت بیان کیا ہے اور یہاں پر وہ واقعات بیان کریں گے جہاں مختلف حالات میں آپ رضی اللہ عنہ نے ایک عملی مسلمان والے رویہ کا مظاہرہ کیا۔ اور گہرے مطالعے اور تحقیق کے بعد ان عملی مثالوں سے امت کی کئی تفرقہ والی باتوں کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ بھی چلتا پھرتا اسلام تھے۔

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کی شان

آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا ''کہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ سچے آدمی کو نہ زمین نے اٹھایا اور نہ آسمان نے سایہ ڈالا'' آپ رضی اللہ عنہ جناب فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دوسری شخصیت ہیں۔ جن کے کان میں بھری مجلس میں حضور پاک ﷺ نے سرگوشی کی۔ حالانکہ حضور پاک ﷺ نے ایسی سرگوشی سے منع فرمایا۔ لیکن ساتھ ہی فرما دیا کہ ''ہاں! میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ابوذر رضی اللہ عنہ اس سے مبرا ہیں۔'' جب جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کسی گلی سے گزر رہے ہوتے اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ سامنا ہو جاتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گلی میں دبک کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور آپ رضی اللہ عنہ کو پہلے گزرنے کی گزارش کرتے۔

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ غفار سے تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام سے پہلے کبھی کسی بت کی پوجا نہ کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ جب مکہ شریف! حضور پاک ﷺ کی تلاش میں آئے تو کئی روز کچھ کھائے آپ رضی اللہ عنہ نے آبِ زمزم پر گزارہ کیا۔ خانہ کعبہ میں جب جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اُن کو اسلامی طریقہ سے سلام کیا۔ یعنی ''اسلام علیکم'' کے الفاظ کہے۔ حضور پاک ﷺ نے ''وعلیکم السلام'' کے الفاظ فرمائے اور ساتھ ہی مسکرا بھی دیئے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ وہ اُن رضی اللہ عنہ کو مہمان ٹھہرائیں۔ جناب

صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کی تواضع کشمش سے کی۔ جو ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک ماہ میں پہلا کھانا تھا۔ روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا اسلام چوتھا یا پانچواں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ تلاش میں مکہ شریف آئے تھے۔ باقی لمبی کہانی ہے۔ البتہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب کھجوروں والی زمین میں ملنا اور جناب ابوذر جنگ اُحد کے بعد مدینہ شریف پہنچے۔

جناب ابوذر رضی اللہ عنہ اور جہاد

اُس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جہاد میں باقاعدگی سے شرکت کی۔ ایک دفعہ امارت طلب کی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اباذر رضی اللہ عنہ! جس نے اسلام میں امارت طلب کی۔ اُس کو نہ ملی۔'' اُس کے بعد جناب ابوذر رضی اللہ عنہ ہمیشہ سپاہی رہے۔ دوسری کتاب اور اِس کتاب کے پہلے ابواب میں آپ رضی اللہ عنہ کی جہاد میں بھرپور شرکت کا ذکر ہو چکا ہے۔

اطاعت امیر

آپ رضی اللہ عنہ نے جہاد کے دوران نوجوانوں کے ماتحت کام کیا اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حکم ملا کہ شام کے ملک سے واپس آجائیں تو ذرا دیر نہ لگائی اور آگے حالات کی وجہ سے مدینہ شریف کو بھی چھوڑ کر ربذہ کے مقام پر ''گوشہ نشینی'' اختیار کر لی۔ ویسے اسلام گوشہ نشینی کے حق میں نہیں۔ لیکن جب فتنہ فسادات بہت زیادہ ہو جائے تو اس کی اجازت ہے۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ خود بھی صاحب نظر تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہ کے لیے اس زمانے کی نشاندہی بھی فرما گئے تھے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہر محلّہ، ہر بستی اور ہر گاؤں کا ایک امیر ہوتا تھا جو مسجد میں نماز کی امامت بھی کرتا تھا۔ ربذہ کے امیر جناب مجاشع رضی اللہ عنہ تھے جو آزاد کردہ غلام تھے۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ اس مسجد میں پہنچے تو جناب مجاشع رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹے اور جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو گزارش کی کہ وہ نماز کی امامت کروائیں۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''آپ میرے بھی امیر ہیں آپ ہی امامت کرائیں'' میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ امیر کی اطاعت کرو۔ خواہ کان اور ناک کٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو!

انہی دنوں حج کا وقت آ گیا۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی کہ اُن کو بھی حج پر جانے کی اجازت دی جائے۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ از خود اُس سال حج پر جا رہے تھے اور مفسدین نے یہ بات پھیلا دی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو مدینہ شریف سے دیس نکالا دے دیا ہے۔ اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ نہ چاہتے تھے کہ مکہ شریف میں حج کے دوران مفسدین اس بات کو اور اچھالیں۔ اس لیے انہوں نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو

مشورہ دیا کہ وہ حج کی بجائے چند ماہ بعد عمرہ کرلیں۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس مشورہ کو حکم کے طور پر مان کر اطاعت امیر کا ایک اور مظاہرہ کیا۔

فلسفہ نماز اور اُمت میں وحدت

چند ماہ بعد جناب ابوذر رضی اللہ عنہ عمرہ کے لیے مکہ شریف گئے تو آپ رضی اللہ عنہ کے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہوگیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں نماز عصر کا وقت ہوگیا۔ زائرین اور مشتاقین نے آپ رضی اللہ عنہ سے گزارش کی کہ آپ عصر کی نماز پڑھائیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ مسافر ہیں دو رکعت پڑھیں گے اور آپ میں سے اکثر لوگ مقامی ہیں۔ اُن کو دو رکعت بغیر جماعت کے پڑھنا ہوگا۔ لوگوں نے عرض کی کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ تو مکہ شریف میں بھی چار رکعتیں پڑھ گئے کہ یہ بھی اپنا گھر ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ لوگوں کو انہیں منع کرنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چھوٹ دی ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بہر حال کافی باتیں ہوئیں اور آخر لوگوں نے آپ ہی کو امامت کے لیے کھڑا کر دیا لیکن لوگوں کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب آپ نے چار رکعتیں پڑھیں۔ لوگوں کی پرسش پر آپ نے جواب دیا۔ ''اب خلیفہ وقت جو چار رکعتیں پڑھ گیا تو امت میں وحدت کے لیے ضروری ہے کہ میں بھی ایسا کروں ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں اگر اس دن ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسا کرنے سے ضرور روکتا۔''

اس سلسلہ میں جنگ خندق کے بعد کا ایک بیان ضروری ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اُسی دن بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ کہ گو عصر کی نماز کا وقت قریب تھا لیکن حکم تھا کہ اتنی تیزی سے جائیں کہ عصر کی نماز بنو قریظہ کے قلعوں کے باہر پڑھیں اب سورج غروب ہونے والا تھا اس لیے وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے کچھ صحابہ کرام نے عصر کی نماز راستہ میں پڑھ لی اور کچھ نے بنو قریظہ کے قلعوں کے باہر۔ بعد میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون صحیح تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دونوں گروہ ٹھیک تھے کہ دونوں کی نیت ٹھیک تھی۔ ہاں البتہ مشورہ کر کے ایک فیصلہ کر لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔''

یہ ہے اسلام کا فلسفہ نماز اور اطاعت امیر۔ ہم اس پر مزید تبصرہ نہ کریں گے سوائے اس کے کہ جو لوگ اس سلسلہ میں امت میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔ اُن کو اللہ تعالیٰ صراط مستقیم پر لگائے۔

عبداللہ بن سبا اور ملک شام

ظاہر ہے کہ ملک شام سے جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے آجانے کے بعد۔ ابن سبا نے اور لوگوں کے سامنے فتنہ فساد کو بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن عظیم صحابی جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت اور جناب ابوالدردر رضی اللہ عنہ نے اُس کو پکڑ

کر جناب معاویہ ﷛ کے سامنے پیش کر دیا۔ تو جناب معاویہ ﷛ نے ابن سبا کو شام بدر کر دیا۔ اور اس کے بعد ابن سبا کوفہ روانہ ہو گیا۔

کوفہ میں فساد

کوفہ کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ اس جگہ کی مٹی ہی ایسی ہے کہ وہاں ہمیشہ فساد ہوتا ہے۔ لیکن وہاں ہی حضرت علی ﷛ اور حضرت عبداللہ ﷛ جیسے عظیم صحابہ نے اسلامی درسوں کی بنیاد رکھی۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سمیت متعدد فقہاء نے وہاں سے اسلام کی روشنی کو پھیلایا۔ البتہ حضور پاک ﷺ نے جناب سعد ﷛ کے لیے فرمایا تھا کہ اُن کی زبان بھی تلوار ہے اور انہی کو حق کے راستے میں پہلا تیر چلانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی شاید جناب سعد ﷛ کی زبان سے یہ نکل گیا کہ ''اہل کوفہ تم فتنہ سے باز نہ آؤ گے'' تو اس کے اثرات بھی ہو سکتے ہیں کہ اہل کوفہ نے جناب سعد ﷛ جیسے عظیم صحابی کے خلاف غلط الزام لگائے۔ اس لیے کوفہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ فسادات ضرور ہوتے رہے۔

ہم پچھلے باب میں لکھ چکے ہیں کہ کوفہ میں فتنہ وفساد شروع ہو چکا تھا۔ جناب سعید ﷛ نے حضرت عثمان ﷛ کو اطلاع بھی دی تھی اور جہاد پر جانے کی وجہ سے حالات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ لیکن جہاد سے واپسی کے بعد مجلسوں اور محفلوں میں بحث اب تفرقہ کا رخ اختیار کر چکی تھی۔ جناب سعید ﷛ نے خلیفہ سوم کے پاس چند لوگوں کے نام لکھ کر بھیجے کہ وہ فتنہ سے باز نہیں آتے۔ اُن میں اشتر نخعی، ابن ذی الجبکہ، جندب، صعصہ اور ابن الکوا(۱) وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں کی آزادی فکر کی یہ حالت تھی کہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنا لیتے تھے اور ہر چیز میں کیڑے نکالنا ان کی عادت میں شامل ہو چکا تھا۔

جناب عثمان ﷛ نے حکم دیا کہ ان تمام لوگوں کو ملک شام میں جناب امیر معاویہ ﷛ کے پاس بھیج دیا جائے۔ جو ان کی اصلاح کریں اور نگرانی بھی کہ دراصل یہ لوگ چاہتے کیا ہیں اور ان کے دل میں کیا بات ہے اگر یہ لوگ ٹھیک ہو جائیں تو بہتر ورنہ ان کو شام سے میرے پاس مدینہ شریف بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اُن سب لوگوں کو ملک شام بھیجا گیا۔ اور جناب معاویہ ﷛ اُن کے ساتھ بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ اُن کی خاطر مدارت کی اور ان کو اپنی مجلس میں شریک کیا۔ ان سے بات چیت کے بعد پتہ چلا کہ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اہل قریش یا انصار اسلام میں اولین حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن زیادہ ملک اس وقت فتح ہوئے جب عراق اور کوفہ کے گردونواح کے لوگ مسلمان ہوئے اور ان کے اسلام پر بڑے احسان ہیں۔ جناب معاویہ ﷛ نے اُن کو سمجھایا کہ اسلام پر احسان مت جتاؤ۔ اللہ کا شکر

۱؎ یہی ابن الکوا بعد خارجیوں کا امیر بن گیا۔

کرو کہ اُس نے تمہیں اسلام کی خدمت کا موقع دیا ہے۔ یہ بات سن کر صعصہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ پر جھپٹ پڑا اور اُن کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی حرکت پر درگذر کی اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے اہل شام نے یہ شرارت نہیں دیکھی۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ویسے بھی بہت سنجیدہ انسان تھے۔ انہوں نے اُن کی خوب نگرانی کی اور آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اُن لوگوں کے سر پہ بھوت سوار تھا۔ فتح اور کامیابیوں نے اُن کے دماغ خراب کر دیئے تھے۔ علم الکلام کے وہ پہلے ہی ماہر تھے۔ لیکن آزادیٔ فکر کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتے تھے اور ہر معاملہ میں اپنی ٹانگ ضرور اڑاتے۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ سمجھ چکے تھے کہ یہ لوگ لاعلاج ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک اور کوشش کی کہ اُن کو حمص میں جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کے پاس بھیج دیا۔ آپ حمص کے امیر تھے اور جزیرہ اور رقہ کے حاکم جن کا نام حراں تھا۔ اُن کا بھی جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ساتھ رابطہ تھا۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے دونوں امراء کو خط لکھا کہ میں آپ کے پاس کچھ لوگوں کو بھیج رہا ہوں۔ اِن کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ یہ لوگ جاہلیت کے زمانے کی باتوں کی طرف جا رہے ہیں اور انہوں نے اپنی فکر کو آزاد کر دیا ہے۔ اور ہر بات کو بغیر سوچے سمجھے اُس پہ رائے دینا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی چیز کی گہرائی میں بھی نہیں جاتے اور ہر بات میں اِن کے ردِعمل غلط اور تیز ہوتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھیں۔ اور اپنے آپ کو دین فطرت کی اجتماعی مفادات کے تابع کریں۔ یہ لوگ حقوق العباد کو غلط معنی پہنائے پھرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ بغاوت، سازش، گستاخی، فتنہ وفساد یا شوروغل سب حقوق العباد کے تحت آتے ہیں۔ اور کسی کے ساتھ الجھ پڑنے کو یہ غلط نہیں سمجھتے۔ احکام کو نبھانا یا ذمہ داری کو پورا کرنے والی بات ان کے ذہنوں سے نکل گئی ہے۔

جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے البتہ یہ لوگ کچھ مرعوب تھے کہ اللہ کی تلوار رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور چونکہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو مکمل تصویر سے آگاہ کر چکے تھے۔ اس لیے جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بھی جب وہی باتیں کیں جو جناب معاویہ کر چکے تھے تو اُن لوگوں پر کچھ اثر ہوگیا۔ اور سب نے توبہ کی۔ اشتر کو جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا گیا کہ سب کی طرف سے معافی مانگے اور باقی کوفہ چلے گئے۔ اشتر مدینہ شریف میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ اور اپنے کیے پر پچھتایا۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن سب کو معاف کر دیا اور اشتر کوفہ چلا گیا۔

یہ سب نتیجہ ہے غلط آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کا۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ جب زر، زن اور زمین تینوں چیزیں میسر ہو جائیں تو لوگ اپنے آپ سے باہر نکل جاتے ہیں اور وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیں گے۔ یا تو وہ لیڈر بننے کی کوشش

کریں گے۔ یا کوئی فساد کریں گے۔ یعنی اُن میں ''میں'' آ جاتی ہے اور وہ اپنی ''میں'' کو کسی طرح ضرور ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور جن لوگوں کے پاس یہ تینوں چیزیں ہوں تو دل سے وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور سازش میں لگتے رہتے ہیں۔ اور چھپے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگ پڑیں گے وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بہت دولت مند تھے اور اُن کے دل میں کسی دوسرے کے لیے حسد کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو رقابت کے بارے میں بھی سوچ نہ سکتے تھے۔ وہ ہر امیر آدمی کو اپنے معیار سے پرکھتے تھے۔ اور اُن کی شرافت کو لوگوں نے کمزوری سمجھ لیا۔ اصل بات یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو غصہ آتا ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ نہ تو سختی کرتے تھے اور نہ ہی سختی کرنا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے پچھلے چودہ سو سالوں سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے اور ہمارے بیچ تفرقہ ڈالنے والے اس اختلاف کو آگے ہی بڑھا رہے ہیں اور جناب عثمان کی شان کو سمجھنے کی بہت کم کوششیں ہوئی ہیں۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شان

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شان کو کوئی قلم بیان نہ کر سکے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بات کے راوی ہیں کہ حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بخدا اگر میری چالیس بیٹیاں ہوتیں اور ایک کے بعد دوسری کی وفات ہوتی رہتی تو میں اُن کو یکے بعد دیگرے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دیتا رہتا'' یہی الفاظ اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ اور کچھ بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کہ یہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ ہیں۔ لیکن ذرا بیعت رضوان پر دھیان دیں جس کا نتیجہ فتح مبین کی صورت میں نکلا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اور تو کسی کام یا صحابی رضی اللہ عنہ کے لیے کبھی بیعت نہ لی۔ صرف اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پابندی کے وعدہ کی بیعت لی۔ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بدلہ لینے کے سلسلہ میں بیعت لی۔ پھر جناب عثمان رضی اللہ عنہ کا مدینہ شریف میں بیر روم کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دینا۔ جہاد کے لیے سامان مہیا کرنا وغیرہ۔ آپ کے ایک ایک عمل پر کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک حیا کا تعلق ہے۔ تو یہ لفظ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام سے وابستہ ہو گیا کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حیا کی وسعتوں کو بیان کر گئے۔

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے کے واقعات اور آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اسی طرح بڑے وسیع مضامین ہیں اور اس پر ایک الگ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہوا اور ایسا کیوں ہوا؟ افسوس کہ ایسے تجزیئے کی طرف بہت کم دھیان دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان ؓ نے اپنی خلافت کے آخری سال اور آخری ماہ جس صبر کا مظاہرہ کیا اس کی تفصیل میں جانے کے بعد ہر مسلمان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کے ایک عظیم رفیق کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا اور وہ صبر کرتے رہے۔ آپ ؓ نے جو تکالیف برداشت کیں۔ ایسی تکالیف دنیا کا کوئی حاکم بھی برداشت نہیں کرسکتا اور اُس وقت دنیاوی لحاظ سے بھی وہ دنیا کے عظیم ترین بادشاہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو فتنہ فساد والوں کو ایک دن میں ختم کر سکتے تھے۔ کچھ مورخین اور راوی یہ تاثر بھی دیتے ہیں کہ شاید آخری دنوں میں حضرت عثمان ؓ بے یارومددگار ہو گئے تھے۔ اور باغیوں کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے۔ تو یہ بھی غلط ہے۔ اگر حضرت عثمان ؓ جنگ کی اجازت دیتے تو اہل مدینہ تمام باغیوں کو تہس نہس کر دیتے۔ باغی یا فتنہ والوں کی تعداد ہزار ڈیڑھ سے زیادہ نہ تھی۔ باقی سب ''تماشہ بین'' تھے یا تالیاں بجانے والے تھے گو ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جب گڑبڑ شروع ہوتی تو کس طرف جاتے اور ایسے لوگوں کے بارے میں آج بھی یہی خیال ہے لیکن ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ مدینہ شریف میں کافی زیادہ صحابہ کرام اور ان کے خاندان کے لوگ موجود تھے۔ اگر حضرت عثمان ؓ جنگ کی اجازت دے دیتے تو یہ باغی چند لمحے بھی نہ ٹھہرتے اور آگے ہم واقعات کے ساتھ اس نظریہ کو ثابت کریں گے۔

یہ فقط مشیت ایزدی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اسباق پیدا کر رہا تھا کہ ہم اپنے عمل کے بارے میں سوچیں۔ ویسے اگر حضرت عثمان ؓ باغیوں کو تہس نہس کر دیتے تو پھر یہ ایک روایت بن جاتی کہ ہر مسلمان امیر اپنے مخالفین کو معمولی بات پر تہس نہس کر دیتا ہے۔ اور آئندہ لوگ ایسے ڈر جاتے کہ صحیح بات بھی حاکم وقت کے سامنے پیش نہ کرتے۔ لیکن اگر حضرت عثمان ؓ سخت کارروائی کرتے تو اسلام میں اندھی آمریت یا فرعونیت کا رواج پڑ جاتا۔ اس لیے حضرت عثمان ؓ نے صبر سے کام لے کر آئندہ کے مسلمان امیروں کے لیے ایک نمونہ پیش کیا۔ کہ لوگوں کو فتنہ سے باز رکھنے کے سلسلہ میں تبلیغ کرو۔ انہیں سمجھاؤ اور نرمی سے پیش آؤ۔ لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے نتیجہ بھی نکال دیا کہ ایسے فتنے کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور ان نتائج کے اثرات کتنے بھیانک ہوتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہو گیا کہ جب عوام اُٹھ کر قومی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو داخلی انتشار کس طرح پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ہم خود اپنے ملک میں تجربہ کر چکے ہیں یہاں بھی گھیراؤ اور جلاؤ کے نعرے لگے لوگوں کو مکمل آزادی تھی اور یہ نتیجہ قوم کے سامنے ہے کہ ملک دولخت ہو گیا۔

جو لوگ حضرت عثمان ؓ کو ہٹانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ آگے کیا ہو گا۔ اور فتنہ والوں یا سازشیوں کو چھوڑ کر جو لوگ بے وقوفی سے ایسا کر رہے تھے۔ انہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ حضرت عثمان ؓ تو آخری عمر میں پہنچ چکے ہیں۔ اُن کی طبعی موت بھی دور نہ تھی۔ تو وہ خواہ مخواہ ہڑبونگ کیوں مچا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر روز حکومت کی تبدیلی کا فلسفہ موجود نہیں ہے۔ حضرت عثمان ؓ امارت سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے کہ حضور

پاک ﷺ آپ رضی اللہ عنہ کو آنے والے واقعات سے آگاہ فرما گئے تھے۔

کچھ روایات طبقات ابن سعد کے مطابق اُم یوسف بن مالک نے اپنی والدہ سے روایت کی کہ لوگ اُس حالت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر جاتے تھے۔ جب تقریباً وہ محصور حالت میں تھے۔ اور کہتے تھے کہ لباسِ خلافت اتار دیجئے۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں اس کرتے کو نہ اتاروں گا جو مجھے اللہ تعالیٰ نے پہنایا۔ البتہ اس چیز سے باز رہوں گا۔ جسے تم لوگ ناپسند کرتے ہو۔

عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ تمہیں ایک روز ایک کرتہ پہنائے گا۔ اگر منافقین تم سے اتروانا چاہئیں تو تم اسے کسی ظالم کے لیے نہ اتارنا۔

ابوسہلہ رضی اللہ عنہ مولائے جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے اپنی بیماری کے زمانے میں فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ بعض اصحاب میرے پاس ہوں۔ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی ''یارسول اللہ کیا میں جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلاؤں'' تو حضور پاک ﷺ خاموش رہے۔ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ سمجھ گئیں کہ آپ ﷺ کے خیال میں کوئی اور صاحب ہیں۔ پھر عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا میں جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلاؤں تو حضور پاک ﷺ خاموش ہی رہے۔ تو تیسری بار میں نے عرض کی کہ ''یارسول اللہ ﷺ! کیا میں جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بلاؤں؟ تو حضور پاک ﷺ سکوت میں ہی رہے۔ آخر میں نے عرض کی کہ ''یارسول اللہ ﷺ! کیا میں عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کو بلاؤں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ہاں۔

''جب جب عثمان رضی اللہ عنہ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور پاک ﷺ نے مجھے اشارہ کیا۔ جس کا مطلب تھا کہ آپ ﷺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں وہاں سے ہٹ گئی۔ میں دور تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور پاک ﷺ کے پاس بیٹھے تھے اور حضور پاک ﷺ کی باتوں سے اُن کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔

جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت یہاں ختم ہوتی ہے لیکن جناب ابوسہلہ رضی اللہ عنہ نے جناب قیس رضی اللہ عنہ سمیت کئی لوگوں کو بعد میں بتلایا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گوشہ نشین ہو گئے تو لوگ اُن کو کہتے کہ آپ رضی اللہ عنہ جنگ کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ حضور پاک ﷺ نے اُن سے ایک عہد لیا ہے اور وہ اُس پر صابر ہیں یعنی اُس عہد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے ہاتھ روکے ہوئے ہیں۔ جناب ابوسہلہ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اکثر لوگ بعد میں کہتے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے جو حضور پاک ﷺ کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تخلیہ میں بات کا ذکر کیا ہے۔ وہ شاید یہی وعدہ تھا یا حضور پاک ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔

تبصرہ

ہم نے پہلی کتاب کے پیش لفظ میں گزارش کردی تھی کہ ہمارے لحاظ سے حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقاء رضی اللہ عنہ کے تمام عمل قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی سنت کے مطابق ہیں اور جو چیز ہم نہ سمجھ سکیں اُس میں کوئی راز ہوتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گھر میں بیٹھ کر راضی برضا اپنی جان اللہ کے سامنے پیش کردی اور ہاتھ تک نہ اُٹھایا۔ جناب امام حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی جان اللہ کے سامنے پیش کردی اور شہادت اُن کو بھی نظر آ رہی تھی۔ لیکن آخری وقت تک وہ باطل کے مقابلے میں لڑتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی طرح آگے سے لڑائی کیوں نہ کی حالانکہ مدینہ شریف میں اُن کے ساتھیوں کی تعداد اگر فسادیوں سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی تو یہ مشیت ایزدی تھی۔

اللہ کا راز تھا۔ جس کو ہم صرف اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمان امیر گمراہوں کو سمجھانے کی بے شک اتنی کوشش کریں کہ اگر اس میں جان کے جانے کا خطرہ ہو تو پھر بھی پرواہ نہ کریں۔ ہم اس سلسلہ میں پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگر باغیوں کو تہس نہس کردیتے تو آئندہ کسی کو شاید سچی بات کرنے کی ہمت بھی نہ ہوتی اور اسلام میں اندھی آمریت کا رواج پڑ جاتا۔

ہم نے آنے والے حالات کے بیان سے پہلے کچھ روایتوں کو اس لیے لکھ دیا ہے کہ قارئین اُن واقعات کو ان روایت کے تحت اور ہمارے تجزیہ کو مدنظر رکھ کر جانچیں تاکہ خواہ مخواہ کسی عظیم صحابی کے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم نہ کرلیں۔ یہ نکتہ یادرہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن خطرات کو اپنے حبیب ﷺ کی رفاقت کا شرف بخشا اُن کی شان کو ہم اپنے بود سے دنیاوی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔ یہ عشق ومحبت کے معاملات ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومت عشق سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

(اقبال)

تاریخ کے بامقصد مطالعہ میں ایک بہت بڑا مدعا یہ ہے کہ ہم حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقا کی شان کو سمجھیں۔ مکمل ذات صرف حضور پاک ﷺ کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں اور انہوں نے وہی کچھ فرمایا جس کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا۔ آپ ﷺ کو خیر البشر کے نام مبارک سے یاد کریں یا محسن انسانیت یا رحمۃ اللعالمین کے ناموں سے۔ آپ ﷺ کی شان کو بیان کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ اب آپ ﷺ نے جو رفقا چنے ان کی شان کو بھی بیان کرنا ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ حضور پاک ﷺ کے رفقاء کو بھی انسانی کمزوریوں سے بالاتر کردیتا۔ لیکن یہاں امتیاز کی ضرورت تھی۔ حضور پاک ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا میں جو حضور پاک ﷺ کے غلام اور فدائی تھے۔ کچھ فرق کی ضرورت تھی۔ اب ہم حضور پاک ﷺ کے غلاموں کے غلام بھی اگر ہوجائیں تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت سمجھیں۔

حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے: بہترین زمانہ میرا ہے اس کے بعد بہتر زمانہ میرے رفقا کا ہے۔ اس کے بعد

بہتر زمانہ میرے رفقا کے رفقا کا اور پھر تابعین اور تبع تابعین کا وغیرہ اور اس طرح ہم تو درحقیقت بالکل گئے گزرے لوگوں میں آتے ہیں۔ سورۃ واقعہ میں بیان ہے کہ مقربین میں زیادہ تعداد پہلے زمانوں کے لوگوں میں سے ہوگی۔ اور گنہگاروں میں زیادہ تعداد پچھلے زمانے کے لوگوں کی ہوگی۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اصحابِ شمال کا نام دیا۔ یعنی بائیں بازو والے۔ اور آج ہمارے ملک میں کئی آدمی خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بائیں بازو والے ہیں اور ادھر اسلام کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ فرد کے آزاد یا باغی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے علماء سمیت کچھ لوگ اپنی فکر اس قدر آزاد کر چکے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کے رفقا پر بھی تنقید کرتے ہیں۔

ہر سینہ نشین نہیں جبرئیل امین کا — ہر فکر نہیں طاہر فردوس کا حیاد

گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ — آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

(اقبال)

مصر میں فتنہ وفساد

کوفہ کے فساد کا ذکر ہو چکا ہے۔ شام میں کوئی فساد نہ ہوا اور کوفہ سے جو لوگ وہاں آئے وہ بھی اُس وقت تو نادم ہو کر چلے گئے۔ لیکن کوفہ کی آب و ہوا پھر ان کے اندر شر پیدا کر دیا مصر میں البتہ فتنہ فساد والے کامیاب ہو رہے تھے۔ اور افسوسناک پہلو یہ تھا کہ فتنہ وفساد والوں میں دو عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے بھی شریک ہو گئے۔ ان میں ایک جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ تھے۔ محمد رضی اللہ عنہ کی پرورش جناب علی رضی اللہ عنہ کے گھر ہوئی تھی۔

جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو شاید یہ رنجش تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کہیں امارت نہ دی تھی۔ اس لیے جناب محمد رضی اللہ عنہ کا یہ رویہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور اس سلسلے میں آگے واقعات بیان کرنے کے بعد ہم اپنا جائزہ پیش کریں گے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ دوسرے صاحب جو مصر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باتیں کرنے والوں میں شامل تھے وہ محمد رضی اللہ عنہ بن ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے۔ جناب ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ اول مسلمانوں میں سے ہیں۔ جنگ بدر میں شرکت کی۔ جناب ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تو اُن کے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ کی پرورش بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی وہ بھی بنو عبد شمس سے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ہندہ زوجہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ، محمد رضی اللہ عنہ بن ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کی پھپھی تھیں اور ظاہر ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اُن کو شاید یہ شکایت تھی کہ اُن کو کوئی امارت نہیں ملی۔ اس لیے وہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ چلو اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرابت داروں کو بھی اُن کے خلاف ''شکایات'' تھیں۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص

اس کے علاوہ یہ بھی روایت ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دلی طور پر خوش نہ تھے کہ اُن کی جگہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کو مصر کا گورنر بنا دیا۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے ایک شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اخیانی یا سوتیلی بہن کے ساتھ کی ہوئی تھی اور روایت ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ کو جب گورنری سے ہٹایا گیا تو انہوں نے اُس بیوی کو طلاق دے دی۔ طلاق کے سلسلے میں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ طلاق دینے کے کئی اور واقعات بھی ہیں اور طلاق کے بعد اُن خاندانوں کے تعلقات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ بلکہ کبھی کسی نے سابقہ بیوی یا سابقہ خاوند کی برائی بھی نہ کی۔ اس سلسلے میں ہم مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کی مثال پچھلی کتابوں میں دے چکے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جناب امام حسن رضی اللہ عنہ کے رویہ کے بارے میں ہم چوتھی کتاب میں ذکر کریں گے۔ بہرحال جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے شاید زیادہ خوش نہ ہوں، لیکن ہم یہ روایت ماننے کو تیار نہیں کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے خود تسلیم کیا کہ گورنری سے ہٹ جانے کے بعد انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہر کام میں نکتہ چینی کی۔ ایسی کارروائی گلہ کے زمرہ میں آتی ہے۔ اور ہم نہیں سمجھتے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے ایسا کیا ہو۔ کیونکہ آگے ذکر آئے گا کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو مشورہ کے لیے بھی طلب کیا تھا اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریبی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے دائیں بازو بن گئے۔ جن کا ذکر چوتھی کتاب میں ہوگا۔ اس لیے ہم کو اُن روایات پر یقین نہیں آتا کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف نفرت پھیلاتے رہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

خاتم مبارک کی گمشدگی

جب حالات خراب ہونے لگیں تو ہر طرف خرابی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ حالات میں خرابی کی ابتدا ۳۱ ہجری میں ہوئی۔ ۳۰ ہجری میں حضور پاک ﷺ کی خاتم مبارک، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہنی ہوئی تھی، وہ کنوئیں میں گر گئی۔ اس کنوئیں کو بیر اویس کہتے ہیں اور یہ کنواں مدینہ شریف سے باہر دو میل دور تھا۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ اُس کے کنارے پر کھڑے تھے اور خاتم مبارک پر ہاتھ لگا کر اس کو ڈھیلا کرنے لگے تو وہ انگلی سے پھسل کر کنوئیں میں گر گئی۔

یہ خاتم مبارک چاندی کی تھی جو حضور پاک ﷺ نے بنوائی تھی اُس پر محمد الرسول اللہ کے الفاظ کندہ تھے۔ اور جو خط بھی حضور پاک ﷺ کی طرف سے کہیں لکھا جاتا تھا۔ اس پر یہی مہر لگا دی جاتی تھی۔ اسی خاتم مبارک کو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی خلافت کے دوران استعمال کیا۔ وہ اس خاتم مبارک کو ہمیشہ اپنے

ہاتھ میں پہنے رکھتے تھے اور جب کوئی خط باہر بھیجتے تھے تو اپنے دستخطوں کے علاوہ ہر خط پر یہ مہر مبارک یا خاتم مبارک لگائی جاتی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی یہی خاتم مبارک پہنے رکھی اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہیں اتارتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک نیا کنواں کھدوایا کہ لوگوں کو پینے کے پانی کی دستیابی میں آسانی ہو۔ اور آپ اس کنوئیں پر بیٹھے ہی تھے اور شاید خاتم مبارک کو آگے پیچھے ہلایا تو وہ انگلی سے گر گئی۔ بڑی تلاش کی گئی لیکن وہ خاتم مبارک دوبارہ نہ مل سکی۔ اس واقعہ نے کافی لوگوں کا سکون ختم کر دیا تھا اور کافی باتیں مشہور ہو گئیں کہ مشکل وقت آنے والے ہیں۔ فتنہ فساد والے تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے طرح طرح کی کہانیاں گھڑنا شروع کر دیں اور اس گمشدگی کو کئی رنگ دیئے اور فتنہ کو خوب اچھالا۔ البتہ ہم ایسی باتیں لکھنے سے گریز کر رہے ہیں کہ وہ فضول باتیں تھیں۔ اور دراصل اعمال واحوال ظاہر کر رہے تھے کہ مشکل وقت آنے والا ہے۔

وفدوں کی تشکیل

ہر ملک کے حالات کو بیان کر دیا گیا ہے اور کسی جگہ دراصل کوئی خرابی نہ تھی لیکن مدینہ شریف میں ہر روز ایک نیا شوشہ چھوڑا جاتا تھا کہ فلاں جگہ یہ ہو گیا اور فلاں جگہ وہ ہو گیا۔ ایسی باتیں صحابہ کرام تک پہنچائی جاتیں کہ حضرت عثمان کے مقرر کردہ امراء لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ صحابہ کرام یہ باتیں حضرت عثمان تک پہنچا دیتے تھے اور جب ایسی باتیں کچھ زیادہ بڑھیں تو حضرت عثمان نے مشاورت طلب کی کہ لوگوں کی شکایات کی حقیقت میں جایا جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان الزامات میں کتنی سچائی ہے۔ چنانچہ چند عظیم صحابہ کو الگ الگ ملکوں میں بھیجا گیا تاکہ حالات کا مطالعہ کریں کہ امراء یا عامل لوگوں کو کون سے حقوق نہیں دے رہے یا کسی قسم کی بے انصافی ہو رہی ہے اس وفد میں جن صحابہ کرام کو بھیجا گیا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف بھیجا گیا۔ آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں جلال مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی دو کتابوں میں آپ کا ذکر کثرت سے ہے۔

۲۔ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ۔ آپ رضی اللہ عنہ کو بصرہ کے عملداری میں بھیجا گیا۔ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام جناب زید رضی اللہ عنہ شہید کے بیٹے تھے۔ آپ کا ذکر بھی جلال مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی کتاب میں ہو چکا ہے۔

۳۔ جناب محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ۔ آپ کو کوفہ کی طرف بھیجا گیا۔ آپ عظیم صحابی جناب محمود رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے جو جنگ خیبر میں شہید ہوئے۔ آپ ہی نے کعب بن اشرف کو قتل کیا اور جنگ احد میں حفاظتی دستوں کے کمانڈر تھے۔ آپ کا ذکر جلال مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں کثرت سے آیا ہے۔

۴۔ جناب عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ۔ آپ رضی اللہ عنہ کو ملک مصر کی طرف بھیجا گیا۔ جناب عمار رضی اللہ عنہ کا ذکر پہلی کتاب میں شرکت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ آپ کوفہ کے گورنر بھی تھے اور آپ ہی کے عہد میں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن رضی اللہ عنہ کو ایران میں نہاوند کے مقام پر عظیم فتح نصیب ہوئی۔ آپ اول اسلام لانے والوں سے ہیں۔

جو عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تحقیقاتی طور پر بھیجے گئے ان کی عظمت بیان کرنے میں ایک مقصد یہ ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار نہ تھے اور باقی صحابہ کرام کی صلاح سے جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو اس تحقیق کے لیے نامزد کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اُن ملکوں میں گئے تو انہوں نے لوگوں کو بلایا اور تفصیل سے تحقیقات کی کہ کس جگہ کیا خرابی ہے۔ لیکن کوئی خرابی کیسے بتاتا۔ خرابی تو کوئی نہ تھی بلکہ یہ مفسدوں کی شرارت تھی۔ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے واپس آ کر اپنی رپورٹ پیش کی کہ کسی جگہ کوئی بے انصافی نہیں ہو رہی۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کو البتہ مصر میں کچھ دیر لگ گئی۔ حضرت محمد رضی اللہ عنہ بن ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت محمد رضی اللہ عنہ بن ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کچھ شکایات کیں۔ البتہ خالد بن ملجم سودان بن حمران اور کنانہ بن بشر کے قسم کے لوگوں کو آگے کر دیا گیا اور انہوں نے چیونٹی کو ہاتھی بنا دیا۔ جناب عمار رضی اللہ عنہ نے تفتیش پر کچھ وقت لگایا تو مشہور کر دیا گیا کہ مصر میں جناب عمار رضی اللہ عنہ کے پاس شکایات کے انبار لگ گئے ہیں۔ بہر حال وہاں بھی کوئی بات نہ نکلی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ واپس تشریف لائے اور انہوں نے بھی یہی رپورٹ پیش کی کہ وہاں کوئی خرابی نہ تھی۔

ان حالات میں ہم تو صرف یہ تبصرہ کر سکتے ہیں کہ بات کوئی نہ تھی۔ سازش والے لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ خواہ مخواہ فضول باتیں پھیلائی جاتی تھیں اور لوگ اُن پر یقین کر لیتے تھے مکمل طور پر آزادئ فکر تھی اور لوگ اپنے آپ سے باہر ہو رہے تھے۔ بقول جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جہالت والی باتیں لوگوں میں واپس آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اب چونتیس ہجری میں شروع ہو چکی تھی اور ہم نے واقعات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بات کچھ بھی نہ تھی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موثر نہ تھے۔ یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت موثر تھے۔ صبح و شام فتنہ کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے تھے اور جتنی کوشش انہوں نے کی۔ شاید کوئی دوسرا کر ہی نہ سکتا۔ یہ اُن کا صبر تھا کہ وہ ایسے حالات کو برداشت کر رہے تھے۔ ہاں وہ طبعاً سخت نہ تھے۔ اُن میں حیا اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ وہ سختی کر بھی نہ سکتے تھے۔

ایک اور کوشش

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حالات کو سنبھالا دینے کی ایک اور کوشش کی۔ آپ نے تمام عاملوں کو لکھا کہ ۳۴ ہجری میں حج کے موقع کے بعد وہ پہلے مکہ مکرمہ یا بعد میں مدینہ شریف میں اکٹھے ہوں اور وہاں ایک مشاورت کے طور پر تمام

عامل اپنے اپنے صوبوں کے حالات بتائیں گے اور یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ان حالات سے کیسے نپٹا جائے اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے کہ اسلامی ملکوں میں جو فتنہ پھیل رہا ہے اُس کا قلع قمع کیسے کیا جائے۔ چاروں صوبوں کے عاملوں یعنی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر اور جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کو اس مشاورت میں اکٹھا ہونا تھا یہ بھی روایت ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو خاص طور پر طلب کیا گیا کہ وہ نہایت سلجھے ہوئے سیاستدان تھے اور وہ شاید اس سلسلہ میں کچھ بہتر اور صحیح مشورہ دیں۔

چنانچہ جب تمام عامل اکٹھے ہوئے تو سب عاملوں نے عرض کی "آپ تحقیقاتی طور پر عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھیج چکے ہیں۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا ہوگا۔ تو اُس سلسلہ میں آپ رضی اللہ عنہ کا ردِعمل کیا ہے۔" جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہوں نے خبر دی ہے کہ سب افواہیں ہیں اور تمام الزامات جھوٹے ہیں۔ لیکن لوگ ان پر یقین کر لیتے ہیں، اب آپ یہ مشورہ دیں کہ ان حالات سے کیسے نپٹا جائے۔

جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص نے کہا "یہ جعلی اور بناوٹی معاملہ ہے جو پوشیدہ طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اور ایسی باتیں جب نادانوں یا جاہلین کے پاس پہنچتی ہیں تو وہ ردِعمل کے طور پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور خواہ مخواہ فتنہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ پھر ان کا علاج کیا ہے؟

جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص۔ "یہ افواہیں پھیلانے والوں اور خواہ مخواہ ایسی باتوں پر یقین کرنے والے جب کوئی غلط کام کریں تو اُن سب کو قتل کر دیا جائے۔"

تبصرہ: جناب سعید رضی اللہ عنہ کی رائے ٹھیک تھی اگر قتل نہ کرتے تو کم از کم کچھ سزا دیتے یا ڈر پیدا کرتے۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باقی لوگوں سے رائے پوچھی۔

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر۔ "اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! میری رائے یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو جہاد کا حکم دیں جس میں وہ مشغول رہیں گے۔ آپ انہیں فوجی لہموں کی طرف آمادہ کریں تا کہ وہ آپ کے مطیع رہیں اور اپنے کاموں میں لگے رہیں۔"

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح۔ ابن خلدوں کے مطابق ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ لوگ اکثر لالچی ہوتے ہیں ان کو مال دے کر اپنا بنا لیا جائے لیکن طبری کے مطابق الفاظ یہ ہیں" کہ آپ رضی اللہ عنہ اگر ان کو حقوق عطا کرتے ہیں تو اُن سے ان کے واجبات بھی وصول کریں"

ہمارا خیال ہے کہ طبری والا قول زیادہ صحیح ہے اور مقابلتاً پرانا بھی ہے۔

بہر حال جناب عثمان رضی اللہ عنہ پھر سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان تجاویز کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کہ ہر قوم کی قیادت کرنے والی چند شخصیتیں ہوتی ہیں جب وہ رخصت ہو جاتی ہیں تو قوم میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر اُن کی شیرازہ بندی مشکل سے ہوتی ہے۔''

تبصرہ

جناب سعید رضی اللہ عنہ کی رائے بڑی سلجھی ہوئی تھی اور اصل بات یہ تھی کہ عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وفات سے ایک خلا پیدا ہو چکا تھا۔ اب نئی نسل کو کچھ نئی قسم کے لیڈروں اور امراء کی ضرورت تھی جو اُن کو قابو میں رکھ سکتے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بہترین زمانے کا ذکر کیا وہ ختم ہونے والا تھا۔

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھانپ چکے تھے کہ حالات کو سنبھالا دینا مشکل ہے اور سب سے آخر میں انہوں نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ سے رائے پوچھی۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! میری رائے یہ ہے کہ آپ تمام معاملات کو اپنے حکام پر چھوڑ دیں میں اپنے علاقے کے معاملات کا ذمہ دار ہوں۔ میں اہل شام کو ہر طرح سے قابو میں رکھوں گا اُن کے حالات ٹھیک کروں گا۔ اور ہر علاقے کا عامل یا سپہ سالار اپنے علاقے کا ذمہ دار اور موثر ہونا چاہیے۔''

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ رائے پسند کی اور اسی پر فیصلہ ہوا کہ خلیفہ وقت فضول باتوں کو سننے کی بجائے اپنے اعمال پر بھروسہ کرے کہ وہ حالات کو ٹھیک کریں۔ لیکن اہل سازش زیادہ ہوشیار تھے اب انہوں نے اپنی سازش کا رُخ مرکز کی طرف موڑ دیا جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص

اول تو جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے بارے اختلاف ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اس مجلس مشاورت میں شریک بھی ہوئے یا نہیں۔ اور طبری نے اپنی تاریخ میں اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب کافی شکیہ باتیں ہیں۔ طبری کے مطابق جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے کہا:

''میری رائے ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ لوگوں پر بری طرح سوار ہو گئے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ اعتدال کے ساتھ کام کرنے کا قصد کریں۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ یہ نہ کر سکیں، تو الگ ہو جائیں اور اگر الگ نہیں ہونا چاہتے تو پھر مضبوطی اور سخت دلی

سے کام کریں۔"

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا وہ سنجیدگی سے باتیں کر رہے ہیں اور اپنے جلے دل کے پھپھولے تو نہیں پھوڑ رہے؟

جناب عمرو رضی اللہ عنہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن جب باقی لوگ چلے گئے تو عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے کہا۔ "اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! آپ رضی اللہ عنہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ یہ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچے گی کہ میں نے آپ رضی اللہ عنہ پر تنقید کی اور اس کے بعد وہ لوگ مجھ پر اعتماد کریں گے کہ میں آپ رضی اللہ عنہ کے کام آسکوں اور آپ رضی اللہ عنہ کی طرف سے شر و فساد کو دور کر سکوں۔"

تبصرہ

اول تو یہ کہانی کسی زرخیز دماغ کی اختراع تھی۔ اور کیا حالات اس ڈگر پر پہنچ چکے تھے کہ لوگ صرف اس آدمی پر بھروسہ کرنے کو تیار تھے جو خلیفہ وقت کی تنقید کرتا۔ اور پھر لوگ کون تھے، جن کے سامنے جناب عمرو رضی اللہ عنہ نے تنقید کی، یہ تو گورنروں یا عاملوں کا اجلاس تھا۔ تو ظاہر ہے کہ ہر جگہ مفسدین بات کا بتنگڑ بناتے پھرتے تھے اور کچھ باتیں ایسے ہی تاریخ میں شامل کر دی گئیں۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظیم صحابہ کے ساتھ ملاقات

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملک شام واپس جانے کے لیے مدینہ شریف والا راستہ اختیار کیا اور وہاں پر عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ملاقات کی اور اُن کو اپنے جائزوں سے آگاہ کیا۔ اس سلسلہ میں دو روایات ہیں اور دونوں کا الگ الگ ذکر ضروری ہے۔

پہلی روایت

ایک روایت کے مطابق جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شام کی طرف کوچ کرنے والے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر قیام پذیر تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عظیم صحابہ جناب علی رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ جناب سعد رضی اللہ عنہ اور اُن کے فرزندوں کو اپنے گھر بلایا کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اُن کے ساتھ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عظیم صحابہ کے سامنے یہ تقریر کی۔

"آپ لوگ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، کیونکہ آپ لوگوں کے علاوہ اور کوئی حکمرانی کی توقع نہیں رکھتا۔ آپ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کا جبر اور طمع کے بغیر انتخاب کیا۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ سن رسیدہ ہو گئے ہیں۔ اور اُن کی عمر ختم

ہونے والی ہے۔اور اگر آپ ان کے بڑھاپے کی انتہائی عمر کا انتظار کریں گے۔تو وہ بھی قریب ہے۔تاہم مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ اس قدر عزیز ہیں کہ وہ انہیں اس عمر یعنی بہت زیادہ بڑھاپے تک نہ پہنچائے گا۔

وہ افواہ بھی پھیل گئی ہے جس کا مجھے اندیشہ تھا۔آپ رضی اللہ عنہ لوگ اس کے لیے قابل ملامت نہیں ہیں۔میرا یہ ہاتھ بھی تمہارے ساتھ ہے۔تاہم آپ لوگ عوام کو اپنے بارے میں کوئی توقع نہ دلائیں۔کیونکہ اگر وہ اس چکر میں پڑ گئے تو آپ ہمیشہ اس میں تنزل وادبار دیکھیں گے۔" (ظاہر ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کا مطلب آئندہ خلیفہ کے بارے کی افواہ سے تھا)۔

دوسری روایت

دوسری روایت یہ ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملک شام کی طرف جاتے وقت مدینہ شریف میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں کافی روز قیام کیا۔اور جب دمشق جانے لگے تو آپ نے سفری لباس پہنا ہوا تھا۔گلے میں تلوار تھی۔تیر کمان سے لیس تھے کہ آپ کی نظر مہاجرین میں جناب علی رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ پر پڑ گئی۔جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں سلام کرنے کے بعد اپنی کمان کا سہارا لیا اور عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ یوں مخاطب ہوئے۔

"جاہلیت کے عہد میں چند گنتی کے لوگ حکومت کرتے تھے اور وہ کسی سے مشورہ نہ لیتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے حضور پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔اور اُن کی پیروی کرنے والوں کو عزت بخشی۔اس کے بعد مسلمان باہمی مشورہ سے حاکم مقرر کرنے لگے۔اور اس سلسلہ میں حاکم کے چناؤ کے لیے اس کی بزرگی، سابق اسلامی خدمات اور ذاتی صلاحیت ومحنت کو ترجیح دیتے تھے۔اگر آئندہ بھی ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اس پر قائم رہے تو ہماری حکومت برقرار رہے گی اور لوگ ہماری پیروی کریں گے۔

اگر مسلمان دنیادار بن گئے اور طاقت کے ذریعے دنیا طلبی میں لگ گئے تو اُن سے یہ نعمت چھین لی جائے گی۔اور اللہ تعالیٰ اُن پر رئیسانہ نظام قائم کر دے گا اور ہمیں غیروں کے تسلط سے بھی ڈرنا چاہیے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ تبدیل کرنے پر قادر ہیں اور اپنی خدائی سے اُسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔"

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری الفاظ یہ تھے۔" میں اِس "بوڑھے" کو تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ان رضی اللہ عنہ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اُن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون کرو اور اس کی وجہ سے تم زیادہ خوشحال رہو گے۔" (ظاہر ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کا "بوڑھے" سے مطلب جناب عثمان رضی اللہ عنہ تھے)۔

تبصرہ اور ردِ عمل

ان دونوں راویتوں میں کچھ تضاد ضرور نظر آتا ہے لیکن وہ طرزِ بیان بھی ہوسکتا ہے۔ کہ اُس میں فرق ہو۔ پہلی روایت میں سنجیدگی زیادہ ہے۔ دوسری روایت میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے تفاخر اور زیرکی کا اظہار کیا گیا ہے۔ بہرحال اگر دونوں روایات کے اندر سے جھانکا جائے تو دونوں ایک ہی مطلب کا اظہار کرتی ہیں۔ اب طبری کے مطابق جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تقریر سنی تو ان پر بڑا اچھا اثر ہوا اور کہنے لگے کہ اُن کے دل میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قدر اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کا ردِ عمل

طبری کے مطابق جناب علی رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پہلی روایت والے بیان کی اُن کے سامنے سخت تنقید کی۔ اور پوچھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات کیسے اور کہاں سے معلوم ہوئی کہ کچھ لوگ خلافت کے دعویدار ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کررہے ہیں اور دوسری روایت کے بیان کے خلاف تو جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اے ابن ابوسفیان رضی اللہ عنہ! تمہاری اس تقریر میں کوئی بھلائی والی بات موجود نہیں۔"

تبصرہ

اب قارئین ضرور حیران ہوں گے کہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی باتوں سے اتنے متاثر ہوگئے اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے پہلے بیان پر بھی تنقید کی اور دوسرے بیان کو تو بالکل رد کردیا۔ تو یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ جذباتی اور سادہ انسان تھے اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیان میں ظاہراً کوئی خرابی نہ نظر آتی تھی تو انہوں نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ اس علم کے شہر کے دروازہ تھے جس کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم خود شہر تھے۔ آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیانات کے لفظ لفظ کی تحقیق کررہے تھے۔ اور قارئین خود سوچیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کن صاحبان کو نصیحتیں کررہے تھے اور وہ کیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے "رکھوالے" بن گئے کہ جو عظیم صحابہ کو کہہ رہے تھے کہ میں اس "بوڑھے" کو آپ کے "سپرد" کئے جارہا ہوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے والد کے مسلمان ہونے سے پندرہ سال پہلے اپنے آپ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے "سپرد" کرچکے تھے۔ جہاں پر آپ رضی اللہ عنہ جناب علی رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ صف بندھے کئی سال امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے والد کے خلاف جنگ کرتے رہے۔

پھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا بھی جناب علی رضی اللہ عنہ نے ناپسند کیا کہ عظیم صحابہ لوگوں کو یقین دلائیں کہ وہ خلافت کے دعویدار نہیں۔ ہمارے لیے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ہمارے سردار ہیں اور ہم صرف واقعات کو دہرائیں گے اور اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ لکھنا ضروری ہے کہ مکہ شریف میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی مشرقی صوبوں کے عاملوں کو الوداع کیا اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ شریف روانہ ہونے لگے تو کسی نے ایک شعر پڑھ دیا۔ جس کے معنی یہ تھے۔

''یہ سب لاغر سواریاں ہیں اور لوگ جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ بھی پسندیدہ جانشین ہیں اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اس کے حق دار ہیں۔''

یہ شعر پڑھنے والا کون تھا۔ اس میں کچھ طنز تھی اور کچھ حقیقت کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر کافی ہو چکی تھی اور فتنہ و فساد والوں نے سر اٹھایا ہوا تھا۔ اور امرا کو لوگ کمزور کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ کعب احبار، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم سفروں میں سے تھا اور ہمدرد بھی اُس نے جواباً یہ شعر پڑھ دیا۔

''بخدا تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس کے بعد سفید خچر والے خلیفہ ہوں گے۔''

کعب رضی اللہ عنہ کا اشارہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تھا اور قارئین خود اندازہ لگا سکتے تھے کہ خلافت کی جانشینی کی بات کس طرح کھل کر کی جاتی تھی اور اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کچھ پہلی پیشگوئیاں کی وجہ سے اور کچھ حالات کی وجہ سے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو امید تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن خلیفہ ضرور بن جائیں گے۔ لیکن ساتھ ہی اُن کو یہ خطرہ تھا کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ یا جناب طلحہ رضی اللہ عنہ یا کوئی اور عظیم صحابی خلیفہ بن گیا تو وہ اُن کو شام کی امارت سے سبکدوش کر دے گا تو پھر اُن کو موقع نہ ملے گا۔ علاوہ بنوامیہ میں ایک گروہ تھا جو چاہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جتنا فساد زیادہ ہوگا۔ بنوامیہ بعد میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو ''مظلوم'' ظاہر کر کے خود فائدہ اٹھائیں گے۔ قارئین یہ سب باتیں ذہن میں رکھنا تو اگلے جائزے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

نتائج و اسباق

بتیس ہجری سے لے کر چونتیس ہجری تک آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کا یہ باب ہر لحاظ سے بڑا اہم ہے جس کا مطالعہ قارئین کے سامنے جگہ جگہ نتائج اور اسباق ظاہر کرتا رہا ہے۔ اس کا صرف ایک علاج تھا کہ فتنہ پھیلانے والوں کو قتل کر دیا جاتا۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص نے یہ رائے دی تھی۔ لیکن جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بات نہ مانی۔

۲۔ اگر فتنہ کرنے والوں میں سے چند کو قتل کر دیا جاتا تو بھی حالات ٹھیک ہو سکتے تھے لیکن یہ بھی خدشہ تھا کہ فتنہ اور

پھیل جائے اور یہ بڑے مشکل معاملات ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ازخود فتنہ پھیلانے والوں کو قتل اس لیے نہیں کرتے تھے کہ یہ روایت نہ بن جائے کہ ہر امیر آئندہ ذرا بھی سر اُٹھانے والے کو تہ تیغ نہ کردے۔ عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسا مشورہ دینے کو تیار نہ تھا اور اگر وہ خود ان حالات میں ہوتے تو بھی یہی کرتے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ چوتھی کتاب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ایسے واقعات سے دوچار ہوئے۔

۴۔ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ اہل سازش، چوری چھپے کام کرتے تھے، اُن کو پکڑنا تو آسان تھا لیکن اُن پر جرم ثابت کرنا مشکل تھا کہ یہ لوگ سازش کر رہے ہیں کیونکہ زبانی بات چیت ہوتی تھی اور وہ لوگ افواہیں پھیلاتے تھے۔ یا غلط قسم کی الزام تراشی ہوتی تھی لوگ ان باتوں پر یقین کر لیتے تھے اور حکومت کے خلاف محاذ بنا لیتے تھے۔ اُن کا پکڑا بھی نہ جا سکتا تھا کہ تماشہ بین زیادہ تھے اور جب ان کو کچھ کہا جاتا تھا کہ تمہاری غلطی ہے تو وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ لیکن فساد والے پھر ان لوگوں کو استعمال کر لیتے تھے۔

۵۔ خلا ہر جگہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے جاہلیت کا دور بھی دیکھا تھا اور پھر اسلام میں آئے تھے۔ اُن میں سے چند لوگ باقی رہ گئے تھے جو موازنہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر کتنی رحمت کی ہے۔ نوجوان لوگ تھے اور اپنے حقوق کے غلط چکر میں پڑ کر ہر بات پر شتر بے مہار کی طرح الجھ جاتے تھے۔ تو ظاہر ہوا کہ اسلام کی ایسی آزادیٔ فکر یا آزادیٔ عمل کی اجازت نہیں دیتا کہ اُس کے نتیجے بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔

۶۔ اسباق حسب ذیل ہیں:

الف۔ جہاد بالنفس کی جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی عملی کہانی میں ہمارے لیے نشان راہ ہے۔

ب۔ تو پھر کیا اسلام میں گوشہ نشینی کی اجازت ہے؟ بے شک جب معاملات اس حد تک پہنچ جائیں کہ انسان وہاں کچھ نہ کر سکے تو پھر گوشہ نشینی کے بغیر چارہ نہیں۔

ج۔ حکومت کا ہاتھ بٹانا البتہ ہمارا فرض ہے اور اطاعت امیر کے فلسفہ سے روگردانی کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے جو اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کو پورا نہیں کرتے تو پھر حکومت کی مخالفت کی اجازت ہے۔ اس کی تفصیل چوتھی کتاب میں آئے گی۔

د۔ اب یہ فیصلہ کون کرے گا کہ حاکم اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کو مان رہا ہے یا نہیں تو اسلام کے لحاظ سے یہ فیصلہ عدلیہ کرتی ہے یا اونچی سطح کے علما یا اہل فکر یا مجلس مشاورت۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ اور جناب ولید رضی اللہ عنہ جو گورنر تھے اُن کے خلاف الزامات کی چھان بین مدینہ شریف میں خود خلیفہ وقت نے کی۔

ر۔ آزادیٔ فکر کی وجہ سے پہلے خارجی گروہ پیدا ہوا۔ پھر معتزلہ اور ساتھ ہی کئی اور گروہ پیدا ہوئے جو اپنے آپ کو جبریہ یا قدریہ وغیرہ کہتے تھے۔ایسے سب گروہوں کے عقائد پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔اور اب یہ لوگ خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔لیکن اپنے زمانے میں ان لوگوں نے قرآن پاک کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے، تضاد قدر کے مباحثوں اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے بحثوں کے ذریعہ سے امت میں ایسا تفرقہ مچایا کہ ہم اب تک ان تفرقوں اور گروہ بندیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

س۔ اسلام کسی دوعملی کا قائل نہیں۔ یہاں دین و دنیا ایک ہیں اور احکام حکومت کے چلنے چاہیں۔عوام اپنی الگ بنسری نہیں بجا سکتی۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری! ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری!
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری!
(اقبال)

دسواں باب

فتنہ وفساد کا مرکز اسلام کی طرف رُخ

ہر فتنہ وفساد کا اصلی ہدف کوئی مرکز ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر فتنہ وفساد کی بنیاد بھی اُسی مرکز میں ہی رکھی جاتی ہے۔ اگر اس فتنہ کو باہر سے کسی ملک یا قوم کی امداد بھی حاصل ہو، تو پھر بھی ضروری ہے کہ اس فتنہ کی بنیاد کو اپنے اصلی ہدف کے مرکز کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم سے تھوڑا پہلے جب سپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ تو جنرل فرانکو میڈرڈ شہر کی چار اطراف سے پیش قدمی کر رہا تھا۔ اخبار نویسوں کو اپنی تجاویز بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ اس کی فوج کی چار کالمیں چاروں اطراف سے پیش قدمی کر رہی ہیں اور ''پانچویں کالم'' شہر کے اندر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک مرکز کے اندر کوئی چوٹ نہ ماری جائے تو مرکز کو ختم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور ''پانچویں کالم'' کا لفظ اندرونی چوٹ یا جاسوسی یا اندرونی سازش کے لیے استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ایسی ہی سازش کے تحت ہوئی لیکن سازشیوں کا جلد قلع قمع ہو گیا پھر عبداللہ بن سبا بھی مدینہ شریف میں ظاہر ہوا۔ بعد میں مصر، بصرہ، کوفہ اور شام ہر جگہ پر گیا۔ ملک شام میں تو اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن مصر، کوفہ اور بصرہ میں ہر جگہ اُس کو کچھ نادان اور کچھ شرپسند لوگ مل گئے۔ اب اگلا مرحلہ یہ تھا کہ ان گمراہوں، نادانوں اور شرپسندوں کا کوئی استعمال کیا جائے اور اُن کو اسلام کے مرکز مدینہ شریف بھیجا جائے کہ وہاں پر شر پھیلائیں۔ بہر حال مرکز کی حفاظت اس زمانے میں بھی ایک الگ کتاب کا مضمون ہے۔ جس سلسلہ میں چند اشارے چوتھی کتاب میں موجود ہیں اور اُس زمانے کے حالات تو یہ تھے خلیفہ وقت اپنی حفاظت کا بندوبست بھی نہ کرتا تھا۔

مدینہ شریف میں اُس وحدتِ فکر اور مرکزیت کو دھچکا لگ چکا تھا۔ اول تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نفری کم ہو گئی تھی اور مدینہ شریف میں غلاموں یا غلامی سے تازہ آزاد شدہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ ان میں شاید کچھ غیر مسلم بھی ہوں اکثر کی مسلمانی نئی اور وقتی تھی لیکن زیادہ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ پرانے مسلمان بھی گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ کانا پھوسیاں شروع تھیں۔ نادانوں کی تعداد کافی تھی۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر دور دراز ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔

فتنہ والوں کا ہدف جناب عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امراء کے خلاف الزامات کی بھرمار

کر رہے تھے۔ دراصل وہ فکری اور ذہنی طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مفلوج کرنا چاہتے تھے۔ عام آدمی کو یہ بات سمجھ نہ آئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش دراصل اسلام اور اسلام کے مرکز کے خلاف سازش تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس طرح منظر سے ہٹ جانے سے اسلام کی مرکزی وحدت پارہ پارہ ہو رہی تھی اور قوم بڑے بڑے گروہوں میں بٹ رہی تھی بدقسمتی سے کئی صحابہ کرام بھی سازش کے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے۔ کہ اُن کو فتنہ والوں کے اصل ارادوں کے بارے میں صحیح خبر نہ تھی۔ دوم اُن کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ فتنہ پرداز اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیں گے۔

فتنہ برپا کرنے والے تو بڑے مظلوموں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے" کہ اُن کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ بڑی بے انصافی ہو رہی ہے اور یہ ظلم ختم ہونا چاہیے۔" اور ہر جگہ فتنہ پرداز ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی یہی ہو چکا ہے کہ کچھ لوگ بڑے مظلوم بن کر آگے آئے اور اُس ملک کی جڑیں اکھیڑ کر رکھ دیں۔ یہ لوگ جو اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی مدد کرنے والا ایک گروہ آجکل بڑا مشہور ہے جس کو "سیاستدانوں کا گروہ" کہتے ہیں ہر "مظلوم" کی مدد ان کا حق ہے اور ملک کی جڑیں اکھیڑنے کے بعد بھی ان لوگوں کی حب الوطنی پر حرف نہیں آتا۔ ان لوگوں کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ غیروں کا باطل فلسفہ پیش کر کے قوم کو "گمراہ" کریں۔ یہ اُن کا حق ہے کہ میکاویلی یا چانکیا کے طریقے اپنا کر یہ لوگ قوم پر مسلط ہو جائیں۔ ذرائع ابلاغ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہوتے ہیں کہ اُن کا دانت بھی دکھ جائے تو اخبار میں خبر شائع ہو جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے شیطان کو بھی کافی آرام ہو گیا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست ‏ ‏ ‏ باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک!

(اقبال)

مفسدین کی تجویز

اب اندر ہی اندر ایک تجویز بنائی گئی اور تمام مفسدین ایک ہی وقت شوال کے مہینے میں مصر، کوفہ اور بصرہ سے نکل کھڑے ہوئے کہ حج کو جا رہے ہیں اور حج سے پہلے یا بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملیں گے اور اپنے امراء کی شکایات بیان کریں گے۔ اہل مصر نے تو مدینہ شریف والا راستہ استعمال کرنا تھا اور وہ مدینہ شریف کے نزدیک آ کر ذوالمرہ میں رُک گئے اُن لوگ کے پاس ایسے خطوط تھے جو اُن کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرضی سے لکھے گئے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے پر تیار تھے۔ اسی دوران بصرہ سے ایک گروہ وارد ہوا اور ذوحشب کے مقام پر آ کر ٹھہر گیا۔ ان کے پاس ایسے خطوط تھے جو اُن کے مطابق جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کی مرضی سے لکھے گئے تھے اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جناب طلحہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے پر تیار تھے۔ اب تیسرا گروہ کوفہ سے آیا اور انہوں نے اعوص کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ ان کے پاس ایسے خطوط تھے جو اُن کے مطابق حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی مرضی سے لکھے گئے تھے اور وہ جناب

عثمان ؓ کے بعد خلیفہ بننے پر تیار تھے۔ طبری کے مطابق عبداللہ بن سبا بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ لیکن اسے اندر ہی اندر کام کرنا تھا۔ کسی جگہ سامنے ظاہر نہ ہوا۔

اہل مدینہ کا ردِ عمل

جب اہل مدینہ کو پتہ چلا کہ اس قسم کے گروہ مدینہ کے گرد و نواح میں پہنچ چکے ہیں اور ان کی نیت کچھ فساد کی ہے تو اہل مدینہ تیار ہو گئے کہ ان فسادیوں کو مدینہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور اگر انہوں نے کوئی ایسی کوشش کی تو ان کا سخت مقابلہ کیا جائے گا۔ لیکن مفسدوں کی باگ ڈور عبداللہ بن سبا اور اس کے بنائے ہوئے گروہ کے ہاتھ میں تھی کہ اُن کی ہر کارروائی کسی تجویز کے تحت ہوئی تھی۔ وہ پہل کاری حاصل کر چکے تھے اور ان میں اتحاد اور وحدتِ فکر تھی گو یہ وحدت فکر بڑی وقتی قسم کی تھی اور منفی بنیادوں (۱) پر قائم تھی۔ لیکن پھر بھی ایسی صورت میں وحدتِ فکر کے تحت تباہی اور فساد تو مچایا جا سکتا ہے، صرف کوئی ٹھوس کام نہیں کیا جا سکتا۔ تمام مفسد حضرت عثمان ؓ کو خلافت سے ہٹانا چاہتے تھے۔ آگے کیا ہو گا اس سلسلہ میں وہ خود گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور یہ بھی فسادیوں کو شہ دینے والے سازشیوں نے جان بوجھ کر کیا تھا کہ فساد سے فساد نکلے۔ بہر حال اُن کی اس "وحدت فکر" نے اُن کو پہل کاری ضرور دے دی۔

اِدھر حضرت عثمان ؓ یا مدینہ کے رہنے والے عظیم صحابہ اپنی وحدتِ فکر کھو چکے تھے۔ اُن کی تمام تر کارروائیاں ردِ عمل کے طور پر تھیں اور ردِ عمل کسی وحدتِ فکر کے تحت نہ تھا۔ ہر صحابی کا ردِ عمل مختلف رُخ میں تھا اور یہ نکتہ یاد رکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ جب کسی جگہ کسی قوم کو وحدتِ فکر کو دھچکا لگ جائے تو کبھی بھی کوئی ملے جلے یا متحدہ ردِ عمل نہیں ہو سکتے۔ اور زوال چند دنوں کی بات ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے لحاظ سے آزادیٔ فکر کو حدود کے اندر رکھا جاتا ہے۔

اہل مدینہ کے ردِ عمل کے بعد مفسدین کی کارروائی

تمام مفسدین کی باگ و دوڑ جس کے ہاتھ میں تھی وہ بڑی ہوشیاری سے اپنا کام کر رہا تھا۔ جب اُس کو پتہ چلا کہ اہل مدینہ کا ردِ عمل بڑا سخت ہے اور وہ ان کو مدینہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ تو انہوں نے دو نمائندے چنے جن کا نام زیاد بن النصر اور عبداللہ بن اصم تھے۔ یہ دونوں آدمی باری باری جناب علی ؓ، جناب طلحہ ؓ، جناب زبیر ؓ اور جناب امہات المومنین ؓ میں سے کئی ایک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مظلوم بن کر عرض کی کہ دراصل وہ تو حج پر جا رہے تھے اور راستہ میں ایسے ہی رک گئے ہیں۔ تا کہ آپ لوگوں کو اپنی تکالیف سے آگاہ کریں کہ ہم حضرت عثمان ؓ کے عاملوں سے بہت تنگ ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر کسی طرح سے ان عاملوں سے ہمارا چھٹکارا کرائیں۔

۱؎ اسلام کبھی منفی بنیادوں پر کسی اتحاد کی اجازت نہیں دیتا۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے مفسدین کو بڑے سخت جواب دیئے کہ ابھی ابھی تحقیقاتی وفد گئے تھے اور وہاں تمہارا کوئی الزام بھی صحیح ثابت نہیں ہوا۔ ہر ملک سے عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آ کر رپورٹ دی ہے کہ ہر جگہ حالات ٹھیک ہیں اور پھر یہ شکایات کس سلسلہ میں ہے بہر حال مفسدین کے وفد کے یہ دونوں آدمی ناکام لوٹے۔

اب مفسدین نے پینترا تبدیل کر لیا اور مصر کے مفسدین سے ایک وفد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر لعنت بھیجی اور فرمایا کہ تم لوگ ذومرہ، ذوخشب اور اعوص میں قیام پذیر ہوا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ قیام کرنے والے لشکروں پر لعنت بھیجی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمہارے وہی لشکر تھے اور اب تمہارا فتنہ ظاہر ہو گیا ہے۔ اہل مصر میں سے کچھ لوگ یہ سن کر حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ پھر آپ ہمیں خط کیوں بھیجتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سن کر حیران ہو گئے اور انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے کبھی کوئی خط نہ بھیجا اور نہ کسی کو اجازت دی کہ وہ اُن کے نام کو استعمال کرے۔ یہ سب سازش ہے پھر آپ نے اہل مصر کے وفد کو منتشر کر دیا۔

مفسدین کی پہلی کامیابی

بعینیہ یہی واقعات جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور بصرہ والوں کے درمیان ہوئے اور اسی طرح کے واقعات جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور کوفہ والوں کے درمیان ہوئے تینوں عظیم صحابہ نے نہ صرف مفسدین پر لعنت بھیجی بلکہ اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ شر پسندوں کے مدینہ شریف میں داخلو کو روکیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کریں، لیکن شر پسند اپنا کام کر گئے تھے۔ وہ تفرقہ کا بیج بونا چاہتے تھے۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں۔ اہل بصرہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور اہل کوفہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی شکوک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اب ایک طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ تو دوسری طرف خلافت کے زیادہ امیدوار پیدا کر کے مفسدین نے اہل مدینہ کی رہی سہی وحدتِ فکر کو بھی پاش پاش کر دیا۔ بلکہ یہ خبر بھی پھیلائی گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں۔ یا اُن کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہی ایک دن مسلمانوں کے خلیفہ ہوں گے۔ اس سلسلہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی پیشگوئی کو بھی آگے لایا گیا اور پچھلے باب میں ہم کعب احبار رضی اللہ عنہ کے ایک شعر کا بھی ذکر کر چکے ہیں۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی بات چیت

اب فتنہ مرکز اسلام میں داخل ہو گیا تھا تو عظیم صحابہ کرام جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے الجھے

ہوئے معاملات کو سلجھانے کے لیے ایک کوشش کی۔ اُن کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کو کچھ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ: آپ رضی اللہ عنہ کے اُمرا میں سے اکثر وہ کچھ کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ: ان عاملوں اور امرا میں سے اکثر کو جناب عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ عہدہ دیا اور اس وقت بھی دور دراز ہوتے ہوئے زیادہ کام اپنی مرضی سے کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ: یہ صحیح ہے لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اتنا ڈرتے تھے جتنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام یرفا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ لیکن آج امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو کچھ چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نام آپ رضی اللہ عنہ کا استعمال کرتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: یہ صحیح ہوسکتا ہے لیکن جہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں وہاں کوئی گڑبڑ نہیں اور باقی جگہوں پر فتنہ ہی فتنہ ہے۔ میں ہر جگہ حاضر تو نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو نتائج دیکھنے ہوتے ہیں جس جگہ نتائج اچھے نکل رہے ہوں وہاں دخل اندازی پسند نہ کروں گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ: یہ آپ کی مرضی۔ میں نے حقیقت بتا دی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: اے ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ! حکومت کے اندر اور باہر کے حالات میں کچھ فرق ہوتا ہے جس زمانے میں میں بھی خالی مشیر تھا۔ تو میرا حالات کا اندازہ کچھ اور قسم کا تھا۔ لیکن اب حالات کی شکل وصورت ہی مختلف نظر آتی ہے بہر حال میں بہت جلد سب لوگوں کے اعتراضات کے جواب مسجد نبوی میں دوں گا۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے جوابات

جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن اعتراضات کا جواب دینے کی ٹھانی اور مفسدین یعنی باہر سے آئے ہوئے لوگوں میں سے بھی چند کو اجازت مل گئی کہ وہ مسجد میں آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جوابات سنیں اور فیصلہ ہوا کہ اُس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مدینہ سے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مفسدین کو تتر بتر کرادیں گے۔ چنانچہ جمعہ کے اجتماع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو وضاحتیں بیان کیں۔ وہ حسب ذیل تھیں۔

نمازِ قصر (1)

لوگ کہتے ہیں کہ میں نے سفر میں پوری نماز پڑھی۔ یعنی مکہ شریف میں میں نے نمازِ قصر نہ پڑھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس شہر میں میرے اہل وعیال تھے تو میں نے گھر سمجھ کر پوری نماز پڑھی اور یہ میرا ذاتی اجتہاد بھی تھا کہ یمن کے

1 حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک زوجہ محترمہ بھی مکہ شریف رہتی تھیں اس سلسلہ میں جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کے فتویٰ اور عمل کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

کچھ لوگ جواب مکہ شریف میں آباد ہو گئے ہیں اب بھی نماز قصر پڑھتے ہیں۔ میں اس کو روکنا چاہتا تھا۔

محفوظ چراگاہ

لوگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے لیے کوئی چراگاہ محفوظ کر لی ہے۔ یہ غلط الزام ہے صدقہ کے جانوروں کے لیے میں نے کچھ علاقہ مخصوص کیا۔ اور مسلمانوں کو جو جانور حج کے لیے صدقہ پر دیئے جاتے ہیں وہ جگہ اُن مخصوص جانوروں کے لیے حج سے چند ماہ پہلے استعمال ہوتی رہتی ہے۔

مال ودولت

کہا جاتا ہے کہ میں نے بہت مال اکٹھا کر لیا ہے۔ بخدا میں جب خلیفہ بنا تو میرے پاس تمام مسلمانوں سے زیادہ بھیڑ اور بکریاں تھیں۔ لیکن اب حج کی سواری کے لیے دو اونٹوں کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

قرآن پاک کی اشاعت

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی کئی کتابیں تھیں میں نے ایک قرآن کر دیا۔ قرآن پاک ایک ہے جو ایک خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ یہ میرے سابق رفقاءؓ اکٹھا کر گئے اور میں نے آپ لوگوں کے ساتھ مشاورت کے بعد اس کی اشاعت کی۔

میرے چچا حکم کا معاملہ

میرے چچا حکم کو مکہ سے حضور پاک ﷺ نے جلاوطن کر دیا تھا۔ پھر حضور پاک ﷺ ہی نے اپنے زمانے میں اُس کی جلاوطنی ختم کر دی تھی۔ حضور پاک ﷺ ہی نے اُن کو مکہ سے طائف بھیجا اور طائف سے پھر مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ حضور پاک ﷺ کی ذات ان معاملات کو بہتر سمجھتی تھی۔ لیکن اب بہتان میرے اوپر لگ رہا ہے کہ میں نے اُن کی جلاوطنی ختم کی۔ نعوذ باللہ۔ میں کون ہوتا ہوں کہ حضور پاک ﷺ کے احکام میں تبدیلی کروں۔

نو عمر حکام

لوگ کہتے ہیں کہ میں نے نو عمر لوگوں کو حاکم بنایا۔ بے شک میں نے سعیدؓ بن العاص اور عبداللہؓ بن عامر کو حاکم بنای جو نو عمر تھے لیکن انہوں نے جو فتوحات حاصل کیں وہ بھی آپ لوگ دیکھ چکے ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے جب اسامہؓ بن زیدؓ کو حاکم بنایا تھا تو بھی لوگوں نے اعتراضات کیے۔ لیکن اسامہؓ نے بڑی کامیابی دکھائی۔ تو لوگ تو ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کو انعام

بے شک میں نے افریقہ کے مالِ غنیمت سے ایک لاکھ روپیہ کا انعام افریقہ کی مہم کے سالار عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کو دیا تھا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ میں نے یہ رقم اُن سے واپس لے کر اہل لشکر میں بانٹنے کا حکم دے دیا۔

تبصرہ: اس سلسلہ میں کچھ مورخین نے مروان کا نام لیا ہے کہ اُس نے ایک لاکھ روپے کی رقم لے لی۔ کچھ کا خیال ہے کہ افریقہ کا سارا مال غنیمت مروان نے سستے داموں یعنی پانچ لاکھ میں خرید لیا۔ یہ سب کہانیاں ہیں۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مالِ غنیمت لے کر ہی جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تھے۔

رشتہ داروں کو عطیات

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے عطیات دے کر اپنے رشتہ داروں کے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ میں سرکاری خزانے سے رشتہ داروں کو انعامات دیتا ہوں بخدا سرکاری خزانہ یا بیت المال تو میرے ہاتھ میں ہے بھی نہیں۔ یہ مسلمانوں کا مال ہے اور کسی کو اگر میں یہ مال دوں گا تو یہ اُن پر حلال نہ ہوگا۔ ہاں البتہ میں نے اپنا مال اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دیا ہے میں نے اپنی اراضی بھی اُن کو دے دی ہے۔ آپ اس سلسلے میں یہ کہیں کہ میں گھر والوں یا رشتہ داروں سے زیادہ محبت کرتا ہوں یا جو کچھ بھی کہیں۔ میرے لیے یہ سب ہمارے آقا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے تحت ہے اور میں اس کو صلہ رحمی کہوں گا۔

خطبہ کے اثرات

اسی طرح سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کئی اور باتیں بھی کیں۔ اور سارے جوابات بڑی عاجزی کے ساتھ دیئے۔ لوگوں پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ کئی لوگ اتنے روئے کہ آنسوؤں سے اُن کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ مفسدین بھی ٹھنڈے پڑ گئے اور اُن کو کچھ خطوط بھی دیئے گئے جو ان کے حکماء کے نام تھے، کہ اُن لوگوں کی شکایات کا ازالہ کریں۔ لیکن قارئین یہ یاد رکھیں کہ وہ "مفسدین" ٹھنڈے پڑے جو نادان تھے۔ سازش والوں پر اس کا کیا اثر ہونا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ و مہاجرین و انصار کا وفد

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تیس چیدہ چیدہ مہاجرین اور انصار کے ساتھ مفسدین کے پاس گئے ان صحابہ کرام میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ جناب محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ، جناب سعید رضی اللہ عنہ بن زید (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی) جناب زید رضی اللہ عنہ بن ثابت جو کاتب وحی تھے۔ جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص (سابق گورنر کوفہ) اسلام کے عظیم شاعر جناب حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت عالم دین جناب کعب رضی اللہ عنہ بن مالک، عظیم صحابی جناب جبیر رضی اللہ عنہ بن مطعم اور حکیم رضی اللہ عنہ بن حزام۔ کچھ مورخین

نے مروان بن حکم، عبدالرحمٰن بن عقاب، ابواسدی ساعدی، ابوحمید اور نیاز بن کرز کے نام بھی لکھے ہیں۔ بہر حال چونکہ تیس کا ذکر ہے اس لیے صحابہ کرام اور بھی ہو سکتے ہیں اور روایت ہے کہ سب سے پہلے اس وفد میں سے جناب علی رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ نے مصریوں سے بات کی اور مصری واپس جانے پر تیار ہو گئے۔ اور پھر باقی مفسدین بھی جانے پر تیار ہو گئے اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ فتنہ ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ مفسدین نے اپنے پڑاؤ چھوڑ دیئے اور ظاہر کیا کہ وطن واپس جا رہے ہیں، لیکن یہ دھوکہ اور سازش تھی۔ سازش والوں میں زیادہ تعداد مصریوں کی تھی اُن کی تعداد کم سے کم چھ سو اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار بتائی جاتی ہے۔ بصرہ اور کوفہ سے سازش والوں کی تعداد فی مقام تقریباً دو سو تھی۔ اور سازشیوں کی کل تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ پہلی دفعہ وہ مدینہ میں داخل نہ ہو سکے۔ اب وہ کسی اور طریقہ کار کو اختیار کرنے والے تھے جس کا ذکر اگلے باب میں ہوگا۔

نتائج واسباق

اس باب میں مفسدین کی تجویز اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے لیے جو ہتھکنڈے انہوں نے استعمال کئے خاص مطالعہ کا موضوع ہے ہمارے سرسری مطالعہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ بات سمجھ آ جائے کہ یہ ایک سازش ہے اور مفسدین بڑے منجھے اور سلجھے ہوئے طریقے سے اپنی تجویز کو آگے بڑھا رہے تھے۔ شیطان (ا) نے اُن کو کوئی بڑے چنے ہوئے ''ابوجہل'' دے دیئے کہ اُن کی ہر کارروائی سے وہ اسلام کے مرکز پر چوٹ کر رہے تھے اور یہ سب کچھ عباد اللہ بن سبا کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ جو خود آگے نہ ہوتا تھا۔

۲۔ ایک آدمی کو نظر آئے گا اور مدینہ میں بھی اکثر سادہ لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ مفسدین نے کچھ مطالبے صحیح کئے تھے یا وہ غلط فہمی کا شکار تھے اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد میں وضاحت کر دی اور حضرت علی نے مفسدین کو تسلی کر دی تو وہ واپس چلے گئے۔ لیکن یہ ڈرامہ تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

۳۔ مفسدین اپنا پہلا کردار کر چکے تھے۔ وہ مدینہ کی ''دیکھ بھال'' کر گئے تھے۔ اُن کو اُس وقت کسی نے مدینہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ لیکن اب وہ مدینہ کے اندر ''مظلوم'' بن کر داخل ہونے کا ڈرامہ رچانے والے تھے۔ اگر مفسدین پر انہی دنوں کوئی کاری ضرب پڑ جاتی تو شاید سازش ختم ہو جاتی۔

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار　　　جب تک تو اسے ضربِ کلیم سے نہ چیرے

(اقبال)

لیکن ہمارے اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔

ا؎ طبری نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ہر مقام سے سازشیوں کی تعداد تقریباً برابر تھی تو پھر مفسدین کی کل تعداد اٹھارہ سو سے اڑھائی ہزار تک ہو سکتی ہے۔

گیارہواں باب

مفسدین کا مرکز اسلام میں داخلہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت

مفسدین کی سازش اتنی گہری تھی کہ اُس کو سمجھا نہ جا سکا۔ وہ اپنی قیام گاہوں کو چھوڑ گئے تھے لیکن کس طرف گئے؟ روایت ہے کہ مصر والے مصر کی طرف روانہ ہو گئے اور کوفہ و بصرہ والے کوفہ اور بصرہ کی طرف۔ اور اُن لوگوں کو مکہ شریف سے گزر کر جانا تھا۔ لیکن مصر والے مصر کی طرف کیوں روانہ ہو گئے؟ وہ بھی توحج کرنے آئے تھے اور ان کو بھی مکہ شریف جانا چاہیے تھا۔ کسی مورخ نے آج تک اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی۔ کہ مفسدین کب اور کس وقت اور کس سمت کو روانہ ہوئے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سمجھانے پر وہ اپنی قیام گاہوں کو چھوڑ گئے اور تین دن اہل مدینہ نے امن کا سانس لیا۔

لیکن چوتھے دن مدینہ کی گلیوں میں مفسدین ایک ایک کر کے داخل ہو رہے تھے، انہوں نے بڑی مظلومانہ کل بنائی ہوئی تھی۔ اور ایک تجویز کے تحت شور مچ گیا۔ ''کہ دیکھو جی ظلم کی کوئی حد ہوتی ہے۔ وعدہ کا کوئی پاس ہوتا ہے۔ دغا بازی کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ خلیفہ وقت نے ہمارے سات دھوکا کیا ہے۔ وہ ہماری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ ہمیں قتل کروا دینا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھو یہ خط ہے۔ یہ حاکم مصر کے نام ہے۔ اس خط پر خلیفہ وقت کی مہر لگی ہوئی ہے آپ خط کا مضمون پڑھیں۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ فلاں فلاں کے مصر پہنچتے ہی اُن کو قتل کر دیا جائے۔ خلیفہ وقت کی دو زبانیں ہیں۔ خلیفہ وقت بہروپیا ہے۔ ہمیں کچھ کہتا ہے اور اندر اندر کچھ اور کرتا ہے۔ یہ خط ہم نے ان کے ایک تیز رفتار قاصد سے چھینا ہے اور وہ قاصد مصر جا رہا تھا اور ہم سے پہلے مصر پہنچ جاتا۔''

''اور پھر ایک گروہ آگے نکلا اور کہنے لگا۔ یہ نہیں! نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسے نہیں ہو سکتے۔ وہ کمزور طبیعت ضرور ہیں لیکن اس حد تک نہیں جا سکتے۔ یہ سب شرارت مروان کی ہے۔ اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصور اتنا ضرور ہے کہ مروان جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور انہوں نے مروان کو اتنا سر پر چڑھا دیا ہے یا اتنے اختیار دے دیے ہیں

کہ مروان اس حد تک جا سکتا ہے لیکن خلیفہ سوم کو ان کارروائیوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

''کہاں ہیں جناب علی رضی اللہ عنہ! کہاں ہیں جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ۔ اے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم صحابیوں ہم انصاف چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں نے ہمیں واپس کیا تھا۔ اور اب ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ بڑا دھوکا ہوا۔ اچھا ہوا۔ وقت پر پتہ چل گیا۔ لیکن اب ہم دھوکا کھانے والے نہیں ہیں۔ مومن ایک سوراخ سے صرف ایک دفعہ ڈسا جا سکتا ہے۔ اب نہ ہمیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بھروسہ ہے اور نہ اُن کے امراء پر۔ اب ہم خود فیصلہ کریں گے ہمارا خلیفہ کون ہو اور ہمارے باقی امراء کون ہوں۔ اے اہل مدینہ آپ پر فرض ہے کہ آپ ہماری مدد کریں۔''

مفسدین مدینہ شریف میں

اور اس قسم کی مظلومیت اور آہ و پکار کر کے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار مفسدین مدینہ شریف میں داخل ہو گئے۔ مدینہ شریف کے حالات ہم بیان کر چکے ہیں کہ کچھ غلام یا غلامی سے تازہ تازہ آزاد شدہ لوگ بھی آباد تھے۔ اُن میں سے اکثر ''تماشہ بین'' بن کر مفسدوں کے ساتھ شامل ہو گئے ویسے بھی جب کوئی گروہ کسی وقت حاکموں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتو کئی لوگ ہڑبونگ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران تھے کہ کیا ماجرا ہے۔ لیکن کچھ روایات کے مطابق جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کی مفسدین کے ساتھ شرکت یا حوصلہ افزائی کا ذکر ضرور ہے۔

جعلی خط

وہ خط جس کا ذکر اہل مصر کرتے تھے۔ اس کا کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔ مورخین اس نکتہ کو واضح نہیں کر سکے کہ یہ خط ایسا تھا یا اس کا متن حسب ذیل تھا، اس لیے خط کے وجود سے بھی انکار ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ خط میں لکھا تھا کہ مصریوں میں سے عبدالرحمٰن (۱) بن عدلیس عمرو بن الحق اور عمرو بن البیاع کو درے لگائے جائیں اور قید کر کے ان کے سر اور ڈاڑھیاں مونڈ لی جائیں۔ اور بعضوں کو سولی دینے کے بارے میں لکھا تھا۔ وہ کون تھے؟ مورخین اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ خط لے جانے والا کون تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کا کوئی غلام تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ جناب ابو الاعور اسلمی رضی اللہ عنہ تھے۔ طبری اور ابن خلدون تو خط کے سلسلہ میں صرف یہ کچھ لکھتے ہیں۔

البتہ کچھ مصرین اور مغربی مورخین نے متعدد دوسرے مسلمان مورخین کے حوالے سے یہ بات بھی لکھی ہے کہ یہ سارا خط جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف لکھا گیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ مجبوری کے تحت محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر کر رہے ہیں اور جیسے وہ مصر پہنچے اُس کو قتل کر دیا جائے۔

۱۔ عمرو بن الحق کو میسرہ بھی کہتے تھے اور اس نے بعد میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا۔

ہم اس کا جائزہ نہ پیش کریں گے۔ ہمارے لحاظ سے خط کا کوئی وجود ہی نہیں اور اگر کوئی کاغذ کا ٹکڑا مفسدین اٹھائے پھرتے تھے تو وہ جعلی یا جھوٹا خط تھا۔ تمام مورخین نے یہ لکھا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ نے تمام مفسدین کے سامنے یہ صفائی پیش کی کہ یہ خط حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہیں لکھوایا۔ لیکن مفسدین نہیں مانتے تھے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ذرا یہ بتاؤ کہ اہل مصر کو تو یہ خط واپس لے آیا۔ کوفہ اور بصرہ والے جو مشرق یا جنوب مشرق کی طرف دوسرے راستے پر جارہے تھے۔ وہ کیوں واپس آگئے۔ لیکن مفسدین کا طریقہ سب دنیا کو معلوم ہے کہ وہ کہتے تھے کہ فلاں سے پوچھا یا یہ بات فلاں کو پتہ ہے۔ اب ہڑبونگ مچی تھی کوئی کسی سے کیا پوچھتا اور بھلا ان حالات میں مروان کو ایسا خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

طبری کے مطابق جب مصری واپس جارہے تھے تو انہوں نے ایک سوار کو دیکھا۔ جو کبھی اُن کے سامنے آتا تھا اور کبھی الگ ہو جاتا تھا پھر لوٹ کر آتا تھا۔ اور پھر چلا جاتا تھا۔ جب اس سوار سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا قاصد ہے اور ایک اہم کام پر جارہا تھا۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو یہ خط ملا۔

تبصرہ

طبری یا کسی پرانے مورخ نے اس بات پر تبصرہ نہیں کیا۔ تو کیا یہ قاصد خط کو ظاہر کرنے کے لیے مفسدین کے قافلہ کے آگے پیچھے پھرتا تھا؟ دراصل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفسدین اور سازشی تھوڑے تھے۔ نادانوں کو بتانے کے لیے قاصد کا ڈرامہ بھی رچایا گیا اور مصر کے قافلہ کے ساتھ یہ ڈرامہ اس لیے کیا گیا کہ کوفہ میں لوگوں کی مرضی کے حاکم جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ عامل بن چکے تھے۔ بصرہ میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کے خلاف کوئی خاص شکایت نہ تھی۔ اور مصر میں جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کے خلاف ہی شکایات تھیں اور صرف انہی کو تبدیل کرنے کی تگ و دو ہو رہی تھی۔ کچھ مورخین کے لحاظ سے مرض کے اندر بھی سخت فساد تھا۔ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ مصر سے فرار ہو کر فلسطین پہنچ چکے تھے۔ واللہ اعلم۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر تو خط یقینی طور پر جعلی معلوم ہوتا ہے۔

ایک ڈرامہ

ہمارے لحاظ سے یہ سب ڈرامہ تھا اور اس ڈرامے کا ایک ایک منظر ایسا جچا تلا تھا کہ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ مفسدین چلے گئے تو کہاں اور کس سمت؟ تو کوئی جواب نہیں! مفسدین واپس آگئے؟ سارے کیسے واپس آگئے؟ کوئی جواب نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ مفسدین کا کنٹرول ایک آدمی (۱) کے ہاتھ میں تھا اور آگے اس کے

۱؎ اور یہ ایک آدمی عبداللہ بن سبا ہی ہو سکتا ہے۔

ماتحت مفسدین اندر ہی اندر کام کر رہے تھے۔ مفسدین نے اپنے پڑاؤ چھوڑنے سے ضرور، لیکن زیادہ دور نہ گئے۔ راستے بھی الگ الگ اختیار کیے گئے اور مصر والے حج کے لیے مکہ نہ گئے کہ خط کا ڈرامہ بنانا تھا۔

مصر والے قافلہ کے ڈرامہ کی خبر کوفہ اور بصرہ کے مفسدین کے لیڈروں کو پہلے سے تھی اور شاید کوئی تیز رفتار قاصد بھی بھیج دیا ہوگا۔ مفسدین مدینہ شریف چوتھے دن آ گئے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مدینہ سے ڈیڑھ دن کے فاصلہ پر سے واپس آ ئے۔ ایک دن سفر کیا۔ دوسرے دن جعلی خط کا ڈرامہ کیا اور مصری واپس ہوئے اور کوفہ و بصرہ والوں کو خبر دے دی گئی کہ وہاں بھی کوئی ڈرامہ یا جائے۔ تینوں گروہ تیسرے دن شام کو اپنے پرانے پڑاؤ میں ہوں گے اور چوتھے دن ایک ایک کر کے مدینہ شریف میں مظلوموں کی صورت بنا کر داخل ہو گئے۔

مفسدین کی پہلی بڑی کامیابی

مفسدین نے مدینہ شریف کے اندر داخل ہو کر ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہ مظلوموں کی صورت میں مدینہ شریف داخل ہوئے تھے۔ مدینہ شریف کے تماشہ بین بھی اُن کے ساتھ شریک ہو گئے۔ عظیم صحابہ کرام کو بات سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ اور مفسدین لوگوں کے جذبات بھڑکا رہے تھے کہ خلیفہ وقت نے عہد شکنی کی ہے۔ اس لیے اُن کا خون حلال ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو یہ کام مروان نے کیا ہے۔ اس خط پر خلیفہ وقت کی مہر ہے اور یہ مہر مروان کے پاس ہوتی تھی۔ تو خلیفہ وقت مروان کو ان کے حوالے کر دیں اور ان کو اجازت دیں کہ وہ مروان کے خلاف کارروائی کریں اب اول تو خط بھی کوئی تھا یا نہیں اور مہر کیسی تھی کہ ان کو تو کوئی پوچھ بھی نہ سکتا تھا کہ بھائی کیا بات ہے؟ اور وہ ہڑبونگ مچائے پھرتے تھے۔

واقعات کا تسلسل

یہاں سے آگے کے واقعات طبری میں اتنے زیادہ لکھے گئے ہیں کہ اگر تمام واقعات کو لکھ دیا جائے تو آدمی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف بیانات اور روایات میں تضاد ہے بلکہ واقعات میں تسلسل بھی نہیں اور آگے کی بات پیچھے۔ اور پیچھے کی آگے لکھی ہے۔ ابن خلدون کچھ بہتر ہیں۔ طبقات ابن سعد میں بھی ذکر کا سلسلہ کچھ بہتر ہے۔ اور ان واقعات کے سلسلہ میں کئی مورخین نے بھی کچھ تجزیے پیش کیے ہیں۔ اُن سب کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہمارا تجزیہ یہ ہے۔

مفسدین کے سامنے دو مقصد تھے۔ اول مقصد یہ تھا کہ اُن کو مدینہ میں داخلہ مل جائے اور دوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو وہ قصوروار کہہ سکیں یا اُن پر الزام لگا سکیں کہ سب قصور اُن کا ہے۔ انہوں نے یہ دونوں مقصد حاصل کر لیے۔ اس کے

بعد انہوں نے تین شرطیں پیش کر دیں۔ وہ شرطیں پیش کرنے کے پوزیشن میں ہو گئے تھے اور من مانی کر سکتے تھے جس کو موجودہ زمانے میں Dictating Terms کہتے ہیں۔ وہ تین شرطیں کیا تھیں؟

۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مستعفی ہو جائیں۔ اگر یہ منظور نہیں تو۔

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تمام عاملوں کو معزول کر دیں اور نئے عمال مقرر کرنے کا حق مفسدین کو دے دیا جائے۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو۔

۳۔ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

مروان کا حصہ

کچھ روایات میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ مفسدین کہتے تھے کہ خط اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہیں لکھا تو مروان نے لکھوایا یا مروان کا اُس میں ہاتھ ہے اس لیے مروان ان کے حوالے کر دیا جائے اور وہ اس سے نپٹ لیں گے۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق یہ بات کچھ صحیح نہیں۔ مروان کھلم کھلا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کرتا رہا۔ اور آپ کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی بھی ہوا۔ بعد میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں بھی شریک ہوا۔ مروان کے اوپر تمام تر ذمہ داری عباسی خاندان کے زمانہ خلافت میں ڈالی گئی کہ انہوں نے مروان کی اولاد سے حکومت لی تھی اور ایسی روائتیں گھڑ لیں اور مروان کو اتنا بدنام کیا گیا کہ ہر بری بات اس کے ذمہ لگا دی گئی اور پھر سارا بوجھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پڑ گیا کہ انہوں نے ایسے خراب آدمی کو مشیر رکھا ہوا تھا۔ مروان اگر اتنا ہی برا آدمی ہوتا تو جنگ جمل کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو اس طرح نہ چھوڑ دیتے۔ جس کا ذکر آگے چوتھی کتاب میں آئے گا۔ ہمارا تجزیہ ہے کہ سازشیوں کے لیے مروان ایک چھوٹا آدمی تھا۔ اُن کے ہدف جناب عثمان رضی اللہ عنہ تھے اور وہ اسلام کے مرکز پر وار کرنا چاہتے تھے۔

مدینہ شریف میں ہڑبونگ

مورخین نے مدینہ شریف میں سازشیوں کی ہڑبونگ کا عرصہ چالیس دن تک بتایا ہے کہ تیس دن تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امامت کرتے رہے اور آخری دس دن آپ رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں محصور ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مورخین اور مبصرین نے باغیوں کی مدینہ میں پہلی بار آمد اور دوسری بار آمد کو آپس میں ملا دیا ہے۔ مفسدین شوال کے مہینہ میں اپنے گھروں سے نکلے اور شوال کے آخر میں یا ذی قعد کے شروع میں مدینہ شریف پہنچے اگر پہلے ایک مہینہ مدینہ کے باہر ٹھہرے اور دوسری دفعہ مدینہ شریف کے اندر چالیس دن لگائے تو پھر حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ نئے سال محرم میں ہوتا ہے۔

ہمارا تجزیہ ہے کہ مفسدین نے پہلی دفعہ مدینہ شریف کے باہر کوئی ایک مہینہ کا عرصہ گزارا اور دوسری دفعہ مدینہ شریف کے اندر کوئی پندرہ یا بیس دن ہڑبونگ مچاتے رہے۔ زماں ومکاں کا حساب کچھ اس طرح بنتا رہا۔ پہلی دفعہ جب باغی آئے تو کافی لوگ ڈانواں ڈول ہوگئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ باغیوں کے مدینہ کے اندر داخل ہو جانے کے بعد بھی کچھ روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود امامت کرتے رہے۔ اور پھر جب آپ رضی اللہ عنہ گھر میں ''محصور'' ہو گئے تو آپ نے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (میزبانِ رسول ﷺ) کو امامت کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ کچھ روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امامت کی اور پھر آپ رضی اللہ عنہ نے سہل رضی اللہ عنہ بن حنیف کو کہا کہ وہ امامت کیا کریں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دوران بلوائیوں یا باغیوں کے لیڈروں عافقی (ا) بن حرب امامت کراتا رہا۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس وقت تک تمام عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اور ان میں سے کوئی بھی مسجد نبوی میں نہ آتا ہوگا۔

اس افراتفری کو مورخین نے جس طرح بیان کیا ہے۔ اس سے کسی صحیح صورتِ حال تک پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن جو روایات ہمیں صحیح نظر آئیں ان کے مطابق جب باغی اور مفسدین مدینہ شریف میں داخل ہوگئے۔ تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے شکایت کی کہ وہ اُن کی مدد کریں۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات کی اور فیصلہ ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں ایک اور خطبہ دیں اور مفسدین کی تسلی کریں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر مسجد نبوی میں خطبہ دیا اور جب مسلمانوں کی یک جہتی کا ذکر کیا تو کئی لوگوں پر رقت طاری ہوگئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس خط کے سلسلہ میں وہ تفتیش کریں گے اور اگر مروان کا اس خط میں کوئی حصہ ثابت ہوا تو اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔

مسجد میں فتنہ

اب یہاں ایک فکری اختلاف واضح ہوتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مروان کے سلسلہ میں یہ بات شاید اس لیے کہنا پڑی کہ مدینہ میں کچھ سنجیدہ لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ مروان کا اس خط میں ضرور کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جناب محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ نے بھی جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے علی الاعلان فرما دیا کہ اُن کا اس خط کے ساتھ کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن مروان کی بریت کا انہوں نے بھی ذکر نہ کیا۔ بات اتنی بڑی نہ تھی جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے کہ اس خط کی کوئی حقیقت نہ تھی تو معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن لوگ مان نہیں رہے تھے چنانچہ کچھ دن بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ انہوں نے تفتیش کی ہے کہ مروان کا بھی ایسے کسی خط کے ساتھ واسطہ نہیں۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ مفسدین نے منبر پر ہلہ بول دیا۔ جناب محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ اور جناب زید رضی اللہ عنہ بن

ا یہ آدمی آگے اُن لوگوں میں بھی شامل تھا جو دیوار توڑ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھس گئے تھے۔

ثابت نے لوگوں کو صبر کی تلقین کی۔ لیکن مسجد میں بلوائیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے حضرت عثمان ﷛ کو دھکے دے کر مسجد سے نکال دیا۔ اور پھر حضرت عثمان ﷛ پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس وقت جناب علی ﷛ یا جناب طلحہ ﷛ یا جناب زبیر ﷛ تو مسجد میں نہ تھے۔ لیکن مورخین کے مطابق جناب سعد ﷛ بن ابی وقاص، جناب حسین ﷛ بن علی ﷛، جناب زید ﷛ بن ثابت اور جناب ابوہریرہ ﷛ نے اہل مدینہ کے ساتھ مل کر باغیوں پر حملہ بول دیا اور ان کو وہاں سے بھگا دیا۔ اور حضرت عثمان ﷛ کو اٹھا کر اُن کے گھر لے گئے جناب علی ﷛، جناب طلحہ ﷛ اور جناب زبیر ﷛ جو باہر تھے۔ جب اُن کو یہ خبر ملی تو وہ بھاگتے ہوئے حضرت عثمان ﷛ کے گھر پہنچے۔ تاکہ حضرت عثمان ﷛ کی عیادت کریں اور اُن ﷛ کے ساتھ صلاح مشورہ کریں۔ وہاں پر بنوامیہ کے کافی لوگ بیٹھے تھے۔ گو مورخین نے ان کے نام نہیں لکھے انہوں نے تینوں عظیم صحابہ ﷛ کے خلاف بڑے سخت الفاظ استعمال کیے اور کہا۔

''تم نے ہم کو ہلاک کر ڈالا۔ تمہاری ہی یہ ساری کارروائیاں ہیں۔ واللہ تم لوگ اگر اپنے مقصد کو پہنچ گئے۔ تو دیکھیں گے کہ تم دنیا کو صحیح کر لو گے۔''

باغیوں کی ایک اور کامیابی

عظیم صحابہ ﷛ یہ باتیں سن کر کچھ حیران ہوئے۔ جناب معاویہ ﷛ بھی کچھ اس قسم کے اشارے کر گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ تینوں صحابہ کرام ﷛ کو یہ باتیں بہت ناگوار گزریں اور وہ اپنے گھر چلے گئے۔ مورخین اس سلسلہ میں خاموش ہیں کہ حضرت عثمان ﷛ کا کیا ردعمل تھا۔ یا یہ باتیں انہوں نے سنیں یا نہ سنیں۔ اب باغیوں نے تیسرا مقصد بھی حاصل کر لیا کہ حضرت عثمان ﷛ اپنی مجلس مشاورت کی مدد سے بھی محروم ہو گئے۔ تو باغیوں نے جناب عثمان ﷛ کے گھر کے باہر ڈیرے ڈال دیئے اس کو محاصرہ کہیں یا جو کچھ مناسب سمجھیں۔ لیکن میرا ذاتی تجزیہ ہے کہ ابھی تک محاصرہ والی بات کوئی نہ تھی۔ حضرت عثمان ﷛ کچھ زخمی تھے اور وہ گوشہ نشین ہو گئے اور باغی جو اپنے آپ کو مظلوم کہتے تھے وہ دھرنا مار کر حضرت عثمان کے گھر کے باہر بیٹھ گئے۔ تو اس کو ''گھیراؤ'' کہہ لیں۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت

اب باغی چونکہ حضرت عثمان ﷛ پر ایک دفعہ ہاتھ اُٹھا چکے تھے۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر چند مہاجرین اور انصار اور خاص کر بنوامیہ کے خاندان کے لوگ حضرت عثمان ﷛ کے گھر پہنچ گئے اور ان کی حفاظت کرنے لگ گئے۔ حضرت علی ﷛، حضرت طلحہ ﷛ اور حضرت زبیر ﷛ خود تو جناب عثمان ﷛ کے گھر نہ گئے کہ پہلے اُن کے ساتھ برتاؤ اچھا نہ ہوا تھا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ حضرت عثمان ﷛ کی حفاظت کریں۔ اس سلسلہ میں

جناب امام حسن رضی اللہ عنہ، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر اور جناب محمد رضی اللہ عنہ بن طلحہ کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہ حالت جنگ تھی اور نہ ایسا محاصرہ کہ باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں زبردستی داخل ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنا چاہتے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو فیصلہ پہلے ہی دن ہو جاتا۔ یہ ایک عجیب وغریب حال تھی کہ نہ جنگ تھی اور نہ صلح۔ یہ محاصرہ بھی نہ تھا بلکہ آج کل کی زبان کے مطابق ''گھیراؤ'' تھا۔

اس دوران حج کا وقت بھی آ گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس کو امیر حج مقرر کیا۔ تو ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کاروبارِ حکومت کو چلا رہے تھے اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی اُن پر پہرہ دے رہے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی حج پر جا رہی تھیں۔ انہوں نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو مشورہ بھی دیا کہ وہ حج پر نہ جائیں۔ وہ اچھے مقرر ہیں اور بلند آواز ہیں اور وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت پر ہی قائم رہیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مکہ شریف میں بھی جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے خطبہ کی ضرورت ہے۔ اب ہم ایک چھوٹا سا تبصرہ کریں گے کہ جن لوگوں کے مطابق یہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی رقابت تھی۔ اُن کے پاس کیا جواب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچیرے بھائی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُن حالات میں بھی امیر حج بنا کر بھیج رہے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اور تفرقات بعد میں ''تراشے'' گئے۔ عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم ان باتوں سے بہت بلند تھے۔

یہ بھی روایت ہے کہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن ابوبکر نے جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کو رائے دی کہ وہ اپنے بھائی جناب محمد رضی اللہ عنہ کو بھی حج پر ساتھ لیتی جائیں کہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ڈر لگ رہا تھا کہ جناب محمد رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو فسادیوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیں گے۔ اور روایت ہے کہ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے کوشش بھی کی لیکن جناب محمد رضی اللہ عنہ نہ مانے۔

جنگ کی اجازت

اُس وقت تک حالات اتنے خراب نہ ہوئے تھے۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو عرض بھی کی کہ اجازت دی جائے تا کہ اہل مدینہ کو دعوت دے کر مدینہ شریف کو بلوائیوں سے پاک کیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ مدینۃ النبی (حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر) میں خون وخرابہ کی اجازت نہیں دے سکتے، تو ان حالات میں جو بلوائی نزدیک آئے تھے۔ اُن کو وہاں سے ضرور بھگا دیا جاتا تھا اور گو چند مفسدوں نے زیادتیاں بھی کیں لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جنگ کی اجازت نہ دی۔ ان زیادتیوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مفسدین جناب ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے بھی بدتمیزی سے پیش آئے۔

کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ ملک شام میں خبر دے دی گئی اور وہاں سے فوج مدینہ شریف کی طرف روانہ بھی ہوئی۔ لیکن اُن کے پہنچنے سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے تھے اور وہ لوگ واپس مڑ گئے۔ اسی طرح یہ بھی

لکھا ہے کہ بصرہ میں جناب عبداللہ ؓ بن عامر نے ایک فوج تیار کی۔ اُن میں چیدہ چیدہ مجاہدین کے نام گرامی بھی تاریخوں میں موجود ہیں کہ وہ بصرہ سے چل پڑے تھے۔ لیکن ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ حضرت عثمان ؓ نے کسی فوج کو کوئی دعوت دی۔ اگر وہ اہل مدینہ کو جنگ کی دعوت دینے پر آمادہ نہ تھے تو باہر سے فوج کیسے منگواتے۔ ممکن ہے کہ مدینہ کے حالات سن کر کوئی فوج دمشق اور بصرہ سے چل پڑی ہو۔ لیکن یہ بھی باغی لوگوں کی پھیلائی ہوئی افواہ معلوم ہوتی ہے اور مورخین نے بعد میں اس کو سچ سمجھ کر تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

باغیوں کا نیا ہتھکنڈہ

اصل بات یہ تھی کہ مفسدین اس حد تک جا چکے تھے کہ اب اگر وہ حضرت عثمان ؓ کو شہید کئے بغیر یا شرطیں منوائے بغیر مدینہ سے چلے جاتے تو ان کی خیریت نہ تھی۔ ان کی تمام سازش ظاہر ہو جاتی۔ اب حج سے بھی لوگ واپس آنے والے تھے۔ اس لیے باغی جلدی میں تھے۔ وہ اہل مدینہ کے تیور بھی دیکھ چکے تھے۔ اس لیے مفسدین کے اندر سازشیوں نے ایک نیا ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ اپنے لوگوں کو کہا کہ دمشق اور بصرہ سے افواج چل پڑی ہیں۔ حج والے واپس آنے والے ہیں۔ اب ہم حضرت عثمان ؓ سے اپنے مطالبات منوالیں۔ ورنہ ہماری خیر نہیں۔ انہوں نے جناب محمد ؓ بن ابو بکر ؓ کو بھی ساتھ ملا لیا کہ تمہاری بھی خیر نہیں۔ سامنے سے ہم اندر داخل نہیں ہو سکتے کہ متعدد لوگ دروازہ پر پہرہ دے رہے ہیں۔ حضرت عثمان ؓ کے مکان کا گھیراؤ کیا جائے اور کچھ لوگ عقب سے داخل ہو کر ان سے اپنی شرطیں منوالیں۔ ورنہ وقت ہمارے خلاف جا رہا ہے۔

حالات میں بھیانک تبدیلی

اب حالات میں بھیانک تبدیلی آ گئی۔ مفسدین جلدی میں تھے اور کچھ کرنا چاہتے تھے حضرت عثمان ؓ اہل مدینہ کو جنگ کی اجازت نہ دے رہے تھے کہ وہ اپنی قوم کو جنگ وجدل سے بچانا چاہتے تھے کہ ان پر الزام آتا کہ انہوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے قوم میں خانہ جنگی کی بنیاد رکھی۔ اور شاید یہی وعدہ تھا جو حضور پاک ﷺ نے حضرت عثمان ؓ سے لیا تھا۔ جس کے بعد آپ کا رنگ متغیر ہو گیا تھا اور جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے کہ حضور پاک ﷺ یہ نہ چاہتے تھے کہ اُن کی قوم میں خانہ جنگی کی بنیاد ان کے ایک رفیق خاص ؓ کی طرف سے رکھی جائے۔

دوسری طرف حضور پاک ﷺ کے باقی عظیم رفیق، عجیب تذبذب میں گرفتار تھے۔ ایک روایت ہے کہ جناب طلحہ ؓ جناب، زبیر ؓ اور جناب سعد ؓ بن ابی وقاص گوشہ نشین ہو گئے تھے اور مدینہ سے باہر جا کر کسی مقام پر قیام پذیر تھے۔ حضرت مغیرہ ؓ بن شعبہ حالات کو بھانپ چکے تھے اور انہوں نے جناب علی ؓ کو مشورہ دیا

کہ وہ بھی مدینہ سے باہر چلے جائیں۔ ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو کچھ ہونے والا ہے اس کا الزام ان کے سر آ جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا معاملہ میرے اللہ کے سپرد ہے۔ ویسے اگر میں آج سے چھ ماہ پہلے بھی مدینہ چھوڑ چکا ہوتا تو بھی جو کچھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہورہا ہے۔ اُن کے رشتہ دار اس تمام کارروائی کے ذمہ دار مجھے ہی ٹھہراتے۔

یہ بھی روایت ہے کہ جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص مدینہ ہی میں تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ حالات بہت خراب ہو گئے ہیں تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابن ابی طالب۔ اب اگر ابن عفان رضی اللہ عنہ اجازت نہ بھی دیں تو ہماری عزت کا سوال ہے اور جنگ کے بغیر چارہ نہیں آئیں مل کر باغیوں کی سرکوبی کریں اور ان کو مدینہ شریف سے جس طرح بھی ممکن ہو نکال دیا جائے۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اچانک خبر

جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب سعد رضی اللہ عنہ ابھی صلاح ومشورہ کر رہے تھے کہ جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ معاملات ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے ہیں۔ جناب محمد رضی اللہ عنہ نے تسلیم کیا کہ وہ ان تیرہ افراد میں شریک تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر داخل ہو گئے تھے۔ یہ داخلہ عمر رضی اللہ عنہ بن حزم انصاری کے گھر کی طرف سے تھا کہ انہوں نے ڈر سے دروازہ کھول دیا اور اس طرف سے دیوار پھاڑ کر ہم لوگ اندر چلے گئے۔ لیکن ہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف بات چیت کرنا چاہتے تھے اور اپنی شرطیں تسلیم کروانا چاہتے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہماری شرطیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مجھے شرم بھی دلائی۔ اس پر میں تو واپس آ گیا۔ لیکن باقی لوگوں کو میں ساتھ واپس نہ لا سکا۔ اور جھگڑا ہو گیا۔ جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے اور ایک ان کا غلام بھی اور ایک آدھ باغی بھی مارا گیا بخدا مجھ سے اُن کے گھر میں گھس جانے کی غلطی ضرور ہوئی۔ لیکن آگے معاملات میرے بس سے باہر ہو گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سیدھا ذمہ دار نہ ٹھہرایا۔ بالواسطہ طور پر کون کون ذمہ دار تھے۔ تو یہ معاملہ قارئین پر چھوڑا جاتا ہے اور وہ بھی چوتھی کتاب کے پڑھنے کے بعد کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

شہادت کا واقعہ

حالات کچھ اس طرح واقعہ ہوئے۔ اہل مصر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا گھیراؤ کیا ہوا تھا لیکن مصریوں میں سے کسی شخص کو یہ ہمت نہ ہو رہی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرے اور شہادت والا معاملہ دراصل چند مفسدوں اور

چند سازشیوں کے دل میں تھا۔اب اگر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید نہ کرتے تو اُن کی خیر نہ تھی۔اہل کوفہ زیادہ تر مالداشتر کے کنٹرول میں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کی چھت سے مالداشتر کو بلا کر شرمندہ کیا کہ وہ تو پہلے تو بہ کر کے واپس چلا گیا تھا۔اب کس منہ سے واپس آیا تھا۔اب مالداشتر خود عجیب وغریب تذبذب میں گرفتار تھا۔اگر وہ مفسدوں کو اس حالت میں چھوڑ کر واپس جانے کی کوشش کرتا تو مفسدین اس کو قتل کر دیتے کہ پہلے اُن کو وہاں لایا کیوں گیا،لیکن ساتھ ہی اشتر کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ہاتھ اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہو رہی تھی،لیکن کوفہ کے لوگوں میں کافی ایسے آدمی موجود تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

نیار رضی اللہ عنہ بن عیاض کی موت

واقعات نے کچھ یہ صورت اختیار کی کہ ایک صحابی نیار رضی اللہ عنہ بن عیاض بھی وہاں پر آئے۔ جہاں لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ وہ دراصل حضرت عثمان کے ساتھ کچھ صلح وصفائی کی بات کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محافظوں میں سے کسی نے پتھر مارا اور وہ نیار رضی اللہ عنہ کو لگ گیا اور وہ فوت ہو گیا۔ اُن کی موت حادثاتی تھی یا کیسی (واللہ اعلم) جناب نیار رضی اللہ عنہ تماشہ بین تھے یا مفسدین کے ساتھ تھے یا واقعی صلح وصفائی کی بات کرنا چاہتے تھے۔ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔البتہ آپ کی موت نے مفسدین کو ایک اور ''ہتھیار'' مہیا کر دیا۔مفسدین پکار اٹھے قصاص! قصاص! کہ جس آدمی نے جناب نیار کو پتھر مارا ہے وہ اُن کے حوالے کر دیا جائے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا اُن کے گھر کے محافظ یہ کیسے کر سکتے تھے۔انہوں نے انکار کر دیا۔اب مفسدین نے قصاص! قصاص! کے نعرے لگاتے ہوئے سامنے والے دروازہ پر حملہ کر دیا۔جس سے مغیرہ رضی اللہ عنہ بن اخنس ثقفی اور زیاد رضی اللہ عنہ بن نعیم مہری جو دروازہ پر تھے وہ شہید ہو گئے اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مروان زخمی ہو گئے۔لیکن امام حسن رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ بن طلحہ رضی اللہ عنہ سمیت متعدد مہاجرین اور انصار نے باغیوں کو سامنے والے دروازہ سے گھر کے اندر داخل ہونے سے روک لیا۔

عقب سے داخلہ

البتہ تیرہ مفسد جناب عمر رضی اللہ عنہ بن حزم انصاری کے گھر والے راستے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر داخل ہو گئے۔ جن میں محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔روایت ہے کہ غصہ میں جناب محمد رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی بھی پکڑ لی۔تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھتیجے آپ کے والد بزرگوار اگر زندہ ہوتے تو اُن کو یہ بات سخت ناپسند آتی۔تو محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو شرم آ گئی۔اور وہ واپس چلے گئے لیکن باقی مفسدین کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکے کہ حالات ان کے بس سے باہر ہو گئے تھے ہم نے محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں پہلے بھی بیان دے دیا ہے اور ہم اس سلسلہ

میں اپنا کوئی تجزیہ نہ پیش کریں گے البتہ امام حسن رضی اللہ عنہ ان کو اُس دن کے بعد ہمیشہ فاسق کہتے تھے کہ وہ فاسق نکلا کہ اس حد تک چلا گیا۔

بہر حال واقعات کچھ اس طرح پیش آئے کہ جو تیرہ شخص اندر داخل ہوئے ان میں سودان بن حمران اور ایک قتیرہ یا عمر تھے جو کوفہ کے قبیلہ سکون سے تعلق رکھتے تھے اور انہی لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کر کے ان کو شہید کیا۔ تیسرا شخص جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر وار کیا وہ عافقی بن حرب مصری بتایا جاتا ہے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک غلام بھی اُن کے پاس تھا اور جیسے ہی قتیرہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر وار کیا تو اپ کے اس غلام نے قتیرہ کو قتل کر دیا لیکن سودان بن حمران نے آگے بڑھ کر اس غلام کو شہید کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بھی سخت وار کیا۔ ایک اور غلام نے آگے بڑھ کر سودان کو بھی قتل کر دیا لیکن اسی دوران سودان اور عافقی یا باقی مفسد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اتنے وار کر چکے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور پھر کہرام مچ گیا۔

کچھ روایات کے مطابق جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والوں میں کنانہ بن بشیر بھی تھے اور قتیرہ کا نام مورخین نے عمر بن الحق بھی لکھا ہے۔ ایک اور شخص نہراں اصحی کا نام بھی لیا جاتا ہے اور آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی تجویز بنانے والوں میں عبداللہ بن بسر کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ علاوہ دروازے پر جو لڑائی ہوئی اس کے حکم دینے والے کا نام عروہ بن بشم لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے لحاظ سے یہ کچھ چھپے ہاتھ سے عبداللہ بن سبا کر رہا تھا۔ جو سامنے نہ آیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ جنازہ میں کتنے لوگ شریک ہوئے اس میں بے حد اختلافات ہیں۔ وقت اور طریق کار کے بیان میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن ہم ان اختلافات میں نہ جائیں گے۔ جب قوم کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل ہی ختم ہو جائے اور دنیا میں اپنے زمانے کی عظیم اسلامی حکومت کے حاکم کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئیں تو قصور پھر بھی ہمارا ہی ہے۔ کہ اس وقت بھی کچھ نہ سوچا جا سکا اور نہ آج کچھ سوچ رہے ہیں یہ سب کچھ آزادیِ فکر اور آزادیِ عمل کی وجہ سے ہوا۔ اور دنیا میں صرف وہی قومیں کامیاب رہتی ہیں جن میں وحدتِ فکر و وحدتِ عمل ہو۔ اور وہ مکمل ربط وضبط کا مظاہرہ کریں۔

تبصرہ

قارئین! تاریخ کے بامقصد مطالعہ سے ہمارا ایک مدعا یہ تھا کہ ہم مسلمانوں کی فتوحات اور فوجی حکمت عملی سے سبق سیکھیں۔ اور یہ مقصد بالکل نہ تھا کہ اندرونی خلفشار کی اتنی تفصیل میں جائیں، لیکن اس اندرونی خلفشار نے چونکہ فتوحات کو روک دیا۔ مسلمانوں کا مرکز پارہ پارہ ہو گیا۔ تو ان حالات کی نشاندہی بھی ضروری تھی جو اس کا سبب بنے۔ افراتفری اور واقعات کا سرسری بیان ضروری تھا تا کہ ہم معاملات کی تہ تک پہنچ سکیں۔ ہمارے کچھ دانشوروں نے عظیم

صحابہ ؓ پر تنقید بھی کی ہے۔ ہمارے لحاظ سے کسی عظیم صحابہ ؓ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ہاں محمد ؓ بن ابوبکر ؓ اور اشتر نخعی کی واقعات میں شرکت کا ذکر ہم نے ضروری سمجھ کر دیا کہ آگے یہ دونوں حضرت علی ؓ کے لشکر میں شریک ہو گئے اور حضرت علی ؓ پر اعتراض ہوئے انہوں نے جناب عثمان کے قاتلوں میں سے محمد ؓ بن ابوبکر ؓ اور اشتر نخعی کو پناہ دی۔ اس سلسلے میں چوتھی کتاب میں بھی کچھ واقعات اور تبصرے آئیں گے۔ اور ہم اپنا اختتامی تجزیہ اس وقت بیان کریں گے۔ یہاں اتنا کہیں گے کہ جناب علی ؓ کو معلوم تھا کہ جناب محمد ؓ اور اشتر سیدھے طور پر حضرت عثمان ؓ کی شہادت میں شریک نہ تھے۔

بالواسطہ طور پر حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی ذمہ داری کس کس پر ڈالی جائے۔ یہ بڑا وسیع مضمون ہے اور شاید مشیت ایزدی بھی یہی تھی۔ گو ہر معاملہ میں مشیت ایزدی ہی کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں یہ اسباق سیکھنے چاہیں کہ کون کون سی چیزیں حالات کو اس حد تک لے گئیں۔ صرف یہ یاد رکھیں کہ جب ایسے واقعات ہونے لگیں تو ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہم خود اپنے گریبان میں منہ ڈالیں کہ چودہ سو سال کے بعد اسلام کے نام پر ایک ملک بنایا تھا اور اس کو بھی دولخت کر بیٹھے ہیں۔ کیا ہمیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ راقم نے ۱۴ ستمبر ۱۹۷۰ء بھرے ایوب ہال میں جنرل یحییٰ خان کو زبانی کہا کہ خدارا شراب کی بوتلوں کو توڑو اور قوم کو اسلام کے راستے پر لگاؤ۔ ورنہ یہ ملک ختم ہونے والا ہے اور یہ انتخابات ہمیں ختم کر دیں گے۔ پھر ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو لکھ کر دے آیا اور کاغذات جنرل یحییٰ کے ملٹری سیکرٹری کے ہاتھ میں دیئے کہ ملک کو بچاؤ۔ یہ کاغذات آج بھی میرے پاس موجود ہیں اور آگے کیا ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

تو ان تفرقات کو بڑھانے کی بجائے۔ آیئے ہم تاریخ اسلام اور اپنی موجودہ تاریخ سے سبق سیکھیں۔

جناب عثمان ؓ کی شہادت پر چند تاثرات (۱۸ ذوالحجہ ۳۵ ہجری)

جناب عثمان ؓ کی شہادت ایک عظیم سانحہ ہے اور رہتی دنیا تک اہل دل اس سانحہ پر اپنے اثرات بیان کرتے رہیں گے۔ ہم صرف چند تاثرات ابن سعد اور طبری سے نقل کر رہے ہیں۔

۱۔ جناب علی ؓ۔ "اے اللہ میں حضرت عثمان ؓ سے تیرے سامنے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ نہ میں نے قتل کیا۔ نہ میں نے حکم دیا۔ لیکن میں مغلوب ہو گیا" راویت ہے کہ ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے جناب علی ؓ نے یہ کلمات تین دفعہ ادا کئے۔ (ابن سعد)

۲۔ جناب عائشہ صدیقہ ؓ "تم لوگوں نے انہیں میل کچیل سے پاک صاف کپڑے کی طرح کر دیا۔" (ابن سعد)

۳۔ جناب عبداللہ ؓ بن عباس ؓ۔ "اگر لوگوں نے خون عثمان ؓ کا مطالبہ نہ کیا تو ضرور ان پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں گے۔" (ابن سعد)

۴۔ جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص ''اے اللہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو اپنی گرفت میں لے۔'' (طبری)

۵۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ ''اللہ تعالیٰ جناب عثمان پر رحم کرے اور ان کا مددگار رہے۔ (طبری)

۶۔ جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ بن الیمان ''اسلام میں شگاف ہو گیا اور اس شگاف کو پہاڑ بھی نہیں پُر کر سکتا۔'' (ابن سعد)

۷۔ جناب ثمامہ رضی اللہ عنہ بن عدیٰ امیر صفا ''خلافت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے چھین لی گئی۔ اب جبری سلطنت ہو گی اور آپ اتنے روئے جس کی کوئی حد نہ تھی۔'' (ابن سعد)

۸۔ جناب ابو حمید رضی اللہ عنہ اساعدی اصحاب بدر ''اے اللہ میں آج کے بعد نہ ہنس سکوں گا۔''

۹۔ جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب شہادت عثمان کا ذکر ہوتا ہے تو وہ رونا شروع کر دیتے تھے اور ان کی ہچکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ (ابن سعد)

۱۰۔ جناب زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کاتب وحی ''شہادت عثمان پر اس قدر روئے کہ جس کو بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔'' (ابن سعد)

جناب عثمان کے عہد کی فتوحات کا اجمالی جائزہ

ہم موجودہ باب کے اسباق یا نتائج کے بارے میں صرف ایک فقرہ کہیں گے کہ ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے بامقصد اسباق حاصل کرنا چاہیں اور چونکہ ہماری کتاب کا موضوع خلفاء راشدین کے زمانے کی فتوحات کی حکمت عملی ہے تو ہم صرف جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کی فتوحات کا اجمالی جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے تفصیلات پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ چند دن کم پورے بارہ برس ہے۔ آپ کی خلافت کے زمانے میں اول تو چند مقامات پر بغاوتیں ہوئیں اور آپ نے ان کو فرد کیا۔ سب سے پہلے ہمدان میں بغاوت ہوئی جس کو کوفہ کے گورنر جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نے فرد کیا۔ اس کے بعد رے میں بغاوت ہوئی جس کو بصرہ کے گورنر جناب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرد کیا۔ اس کے بعد آذربائیجان میں بغاوت ہوئی تو اس کو جناب ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ نے فرد کیا اور پھر جناب ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ اور سلمان رضی اللہ عنہ بن ربیعہ نے آگے بڑھ کر آرمینیہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس علاقے میں بعد میں جناب سعید رضی اللہ عنہ بن العاص کی فتوحات ہوئیں۔

بصرہ کے محاذ پر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر نے پہلے فارس کے علاقوں کی بغاوت کو فرد کیا اور اصطخر وغیرہ متعدد مقامات پر دوبارہ قبضہ کیا۔ اس کے بعد جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو راستوں سے آگے بڑھ کر جناب آخف رضی اللہ عنہ بن قیس جناب ہرم رضی اللہ عنہ بن عیان اور جناب مجاشع رضی اللہ عنہ بن مسعود کے لشکروں سے سیستان، خراسان اور دریائے جیحوں

تک کے علاقوں میں اللہ اور رسول ﷺ کے نام کو بلند کر دیا، ہرات، رے، نیشا پور اور بلخ وغیرہ تک تمام شہروں پر اسلامی پرچم لہرا دیا تھا کہ جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن سمرہ نے مشرق کی طرف بڑھ کر کابل، زبلستان اور بلادِ غزنی اور موجودہ وزیرستان تک کے علاقوں کو فتح کر ڈالا۔ مصر و افریقہ کے محاذ پر آپ کی خلافت میں سب سے پہلے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے اہل روم کو دوبارہ بحیرہ روم کے اندر پھینک دیا اور سکندریہ و مصر کو دوبارہ فتح کرنے کی رومی کوشش کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس کے بعد جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح نے ٹیونس تک تمام افریقہ کے ممالک فتح کر ڈالے اور کسی عسکری تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اپنے ملک سے اتنی دور کسی لشکر نے اس طرح ممالک فتح کئے ہوں۔ مدینہ شریف سے ٹیونس تک سفر کوئی تین ہزار میل کے قریب ہے۔ شام کے محاذ پر جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اگر ایک طرف اناطولیہ، اناطاکیہ اور آرمینیہ کے قلعوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف اسلام کی تاریخ میں پہلی دفعہ بحری جنگ کی طرح ڈالی گئی اور سمندر کے راستے قبرص کو دو دفعہ فتح کیا اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مسلمان نہ صرف ایک بحری طاقت بنے بلکہ انہوں نے دو بحری جنگوں میں اہل روم کو شکست دے کر اپنے آپ کو دنیا کی ایک مانی ہوئی بحری طاقت تسلیم کروایا اور رومیوں کو ایسی شکست دی کہ قیصر روم قسطنطین اس لڑائی میں سخت زخمی ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ یا انہی زخموں سے جاں بحق ہوا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جتنی جنگیں ہوئیں شاید ہی دنیا کی تاریخ میں کسی ایک حکمران کے زمانے میں ہوئی ہوں۔ اور ان سب جنگوں میں کامیابی ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ سوائے معمولی جھڑپوں کے جن میں کسی جگہ وقتی طور پر مسلمانوں نے کوئی نقصان اٹھایا ہو۔ لیکن کوئی مقابلہ یا جھڑپ یا لڑائی شکست کی صورت نہ لائی۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے ماتحت جن لوگوں نے جنگی حکمت عملی کو آگے بڑھایا اور ان کو سپہ سالار اعظم کہا جا سکتا ہے ان کی تعداد بھی آٹھ ہے۔ جن میں جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ، سعید رضی اللہ عنہ بن العاص، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر، عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ایک وقت میں تین سے چار لشکر برسرپیکار رہے۔ ورنہ ان چھوٹے امرا یا چھوٹے سپہ سالاروں کی تعداد تو کئی دفعہ سات سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جتنے جنگی سفر ہوئے۔ دنیا کے کسی حاکم کے زمانے میں سفروں کی مسافت اتنی نہیں ملتی۔ اکیلے طور پر جناب محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ، جنگی سفروں میں دنیا میں پہلے نمبر پر آتے ہیں۔ امیر تیمور دوسرے پر، چنگیز خان اور نپولین تیسرے اور سکندر یونانی چوتھے نمبر پر۔ لیکن اگر کسی حاکم کے تمام لشکروں کے جنگی سفروں کا حساب کیا جائے تو اس سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لشکروں کے سفروں کی مسافت سب سے زیادہ بنتی

ہے۔ایسے فاصلے افریقہ کے محاذ پر کوئی دس بارہ ہزار میل بنتے ہیں۔شام کے محاذ پر تین ہزار میل،کوفہ کے محاذ پر پندرہ ہزار میل اور بصرہ کے محاذ پر کوئی بیس ہزار میل ہیں۔بصرہ کے محاذ پر اکیلے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کا سفر تین ہزار میل بنتا ہے اور اس علاقہ میں دس سے زیادہ لشکروں نے سفر کئے۔اس لیے سفروں کی مسافت میں قارئین کو کوئی مبالغہ نہیں نظر آنا چاہیے۔اور ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسے سفروں کی مسافت کوئی پچاس ہزار میل بنتی ہے۔جو دنیا میں اول نمبر پر ہے ہاں وقت کے لحاظ سے جیسا کہ ہم دوسری کتاب میں گزارش کر چکے ہیں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے کے لشکروں کے سفر اوسط لحاظ سے ان سے بہتر اور دنیا میں اول نمبر پر ہیں اور سلطنت کی وسعت کا پہلو ہم اس کتاب کے تیسرے باب میں جناب عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے حالات کے تحت بیان کر چکے ہیں۔اب مزید نقشوں کے مطالعے سے قارئین اس پہلو کو بہتر طور پر سمجھ گئے ہوں گے۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے فرزندوں نے افریقہ اور ایران و عراق کے محاذ پر جنگ میں شرکت کی۔جن میں جناب امام حسن رضی اللہ عنہ،امام حسین رضی اللہ عنہ،عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ،عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ،وغیرہ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہ ابن صحابہ رضی اللہ عنہ شامل ہیں گو جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن خالد رضی اللہ عنہ وغیرہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ یا جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے سے جنگوں میں شرکت کر رہے تھے۔لیکن افسوس ان کے کارناموں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ہمیں تحقیق اور مطالعہ کر کے ان کی کارروائیوں کو قوم کے سامنے لانا چاہیے۔

اس کتاب کو ختم کرنے سے پہلے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جو پیدا ہوا ہے اُس نے موت کا مزہ ضرور چکھنا ہے۔اور موت سے فرار نہیں اور جو فوت ہو گئے اُن کی وفات پر اب آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔بس یہ یاد رکھیں کہ وہ ہمارے لیے بہترین مثالیں چھوڑ گئے اور ہمیں اُن پر عمل کرنا چاہیے۔وہ عاجز بھی تھے اور عزت کی زندگی گزار کر راہی عدم ہوئے۔اور ہم بھی عزت کی زندگی اختیار کریں۔

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ　　　نہیں ممکن امیری بے فقیری

(اقبال)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الْقُرْاٰنِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ

اے نبی (ﷺ) مومنوں کو جنگ (جہاد) کی ترغیب دو۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ کُرْهٌ لَّکُمْ

تم (لوگوں) پر جنگ (جہاد) کو فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

لِیْ حِرْفَتَانِ اَلْفَقْرُ وَالْجِهَادُ

میرے دو ہنر (ہتھیار) ہیں فقر اور جہاد۔ (فرمان رسول ﷺ)

خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم

کی جنگی حکمتِ عملی اور تدبیرات کا تجزیہ

حصہ چہارم

(فتوحات وسط ایشیاء تا بحیرۂ اوقیانوس)

از قلم: حضور پاک ﷺ کا سپاہی

میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان مدظلہ

ناشر: علم دین پبلشرز اُردو بازار لاہور پاکستان

تعارف

خلفائے راشدینؓ کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کے تجزیہ پر مبنی سلسلہ کتب کی تیسری جلد پیش نظر ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں حضرت عثمانؓ کے زمانے کی فتوحات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ مسلمانوں کے بحری طاقت بننے کے جائزے کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کی تفصیلات کا تجزیہ ایک نئے انداز سے کیا گیا ہے جو مصنف کی ذاتی تحقیق اور آراء پر مبنی ہے اور جی ایچ کیو کی کسی پالیسی یا سوچ کا غماز نہیں۔

یہ سلسلہ کتب جو چار جلدوں پر مشتمل ہے شائع کرانے کا مقصد ایک نئے انداز فکر کو جلا دینا ہے جو اسلامی تاریخ پر تحقیق کرنے والے اصحاب کے لئے دعوت فکر اور باعث حوصلہ افزائی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب میں دیئے گئے تجزیات کا مطالعہ عام قارئین اور تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لئے مفید ہوگا۔ اور تحقیق میں نئی راہیں متعین کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ فلسفہ جنگ ایک وسیع مضمون ہے اور اس میں ابھی تک کام کرنے کے وسیع مواقع موجود ہیں خاص طور پر اسلامی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا تجزیہ تاریخ اسلام سے وابستہ مصنفین کو دعوت فکر دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنی تحقیق سے پڑھنے والوں کے علمی ذوق کی پیاس بجھائیں۔

بریگیڈیئر عبدالمجیب
ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم و خاتم النبیین

اختتامی وضاحت

حرف تشکر

سب تعریفیں دو جہانوں کو پیدا کرنے والے اللہ کے لیے ہیں اور لاکھوں درود وسلام اس کے حبیب پاک ﷺ کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقاً کی زندگی کے جلالی پہلوؤں کی یہ آخری کتاب بھی مکمل ہوگئی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی جنگی حکمت عملی کے سلسلہ کی یہ چوتھی اور آخری کتاب ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا زمانہ تقریباً تیس سال ہوگا اور ۴۱ ہجری کے شروع میں امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد خلافت راشدہ کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وسط ایشیا اور شمالی افریقہ میں مزید فتوحات ہوئیں اور اسلامی لشکر بحیرۂ اوقیانوس تک پہنچ گئے۔ انہی دنوں میں اسلامی لشکر پہلی دفعہ قسطنطنیہ (استنبول) کی دیواروں تک پہنچ گئے جہاں سات سو سال تک کسی نہ کسی شکل میں لڑائی جاری رہی۔ یعنی مسلمان اور رومی حالت جنگ میں رہے اور آخر ۱۴۵۳ء میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کرلیا۔

حکمت عملی کے ثمرات اور عطیات

علاوہ ہم اپنے جائزہ سے یہ ثابت کریں گے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ وفساد شروع نہ ہو جاتا اور جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان خانہ جنگی نہ ہوتی تو یہ علاقے بہت پہلے فتح ہو جاتے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان فتوحات کے لیے کوئی خاص حکمت عملی وضع نہ کی گئی۔ پس اسلام میں مرکزیت اور وحدت واپس آ گئی تھی اور یہ فتوحات اس حکمت عملی کے ثمرات اور عطیات تھے جو حضور پاک ﷺ نے بنائی اور اپنے عظیم رفقا کو اس پر عمل پیرا ہونے کی عملی تربیت دی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اسی حکمت عملی کو آگے بڑھایا اور اس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں کو پاش پاش کردیا۔ ایک کا نام ہی مٹ گیا اور دوسری سکڑ تو رہی تھی، اگر آپ میں خانہ جنگی نہ شروع ہو جاتی تو دوسری بھی یعنی سلطنت روم بھی اسی زمانے میں ختم ہوگئی ہوتی۔

بہر حال جیسے ہی مسلمانوں میں خانہ جنگی ختم ہوئی اور امام حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو گئے تو مسلمان پھر

ایک جماعت بن گئے اور ۴۱ ہجری کو اسلام کی تاریخ میں سنۃ الجماعت کہتے ہیں۔ چنانچہ چند سال بعد یعنی ۴۷ یا ۴۹ ہجری میں مسلمانوں نے سلطنت روم کے دارالخلافے کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیئے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سات سال لگاتار مسلمان درۂ دانیال اور آبنائے فارسفورس کی فضاؤں میں نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کرتے رہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ جنگ ایک طرح سے سات سو سال جاری رہی اور مکمل طور پر اب بھی ختم نہیں ہوئی۔ بہر حال ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر لیا تو سلطنت روم تو ختم ہو گئی لیکن اسی زمانے میں یورپ کے مغربی کنارے یعنی سپین سے ہمارا انخلا شروع ہو چکا تھا اور یہ انخلا کچھ اس قسم کا تھا کہ ہم سپین میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔

تاریخ کا بامقصد مطالعہ

تاریخ کے اس بامقصد مطالعہ میں ایک چیز جو کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے جو فتوحات حاصل کیں وہاں اسلام کسی نہ کسی طرح آج بھی قائم ہے۔ لیکن بعد کی فتوحات اتنی موثر ثابت نہ ہوئیں۔ سپین میں سات سو سال تک حکومت کی۔ وی آنا کا دو دفعہ محاصرہ کیا۔ بلقان کے اکثر ممالک یعنی یونان، یوگوسلاویہ بلکہ ہنگری تک بھی مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔ علاوہ رومانیہ، بلغاریہ، کریمیا اور روس کے سارے تاتاری علاقے، سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہے۔ وسط ایشیا میں بخارا، سمرقند، بلکہ یارقند (موجودہ چینی ترکستان کا ایک شہر) تک کے علاقے ہماری تہذیب کے مراکز رہے۔ امیر تیمور تو ماسکو تک پہنچ گیا تھا اور چین کے علاقوں میں بھی مسلمان دور دور تک چلے گئے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں دکن تک اسلام کے جھنڈے لہراتے رہے۔ لیکن ان سب علاقوں میں مسلمان اس طرح مکمل طور پر حاوی نہ ہو سکے جس طرح وہ ان ممالک میں حاوی ہو گئے جو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں فتح ہوئے یا ان کی حکمت عملی کے ثمرات کے طور پر ہماری جھولی میں گر گئے۔

بنگال اور جنوبی ایشیا کے کچھ ممالک میں البتہ اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ بے شک بنگال بھی صحابہ کرام کے زمانے کے بعد فتح ہوا اور جنوبی ایشیا یعنی انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ میں اسلام صرف تبلیغ سے پھیلا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے راز ہیں کہ چند ممالک میں اسلام بغیر فتوحات کے پھیل گیا اور ایک آدھ جگہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کے بعد فتح ہوئی وہاں بھی اسلام قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کچھ اور اسباب و ذرائع پیدا کر دیئے اور چونکہ ان علاقوں کے لوگ محدود قسم کی زندگی گزارتے ہوئے کنویں کے مینڈک بن چکے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کر دی کہ ان کو اسلام کی وسعت کا حصہ بنا دیا۔ ''محدودیت'' کی وجہ سے ان لوگوں کے پاس کوئی ملا جلا نظریہ یا فلسفہ موجود نہ تھا جو اسلام کے ساتھ ٹکر لیتا۔ ساتھ ہی کچھ روایتوں کے مطابق کچھ صحابہ کرام نے ان علاقوں کی طرف بحری سفر ضرور کئے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ

موجودہ پاکستان کا مسئلہ البتہ کچھ الگ ہے۔ اول تو اس کی حدود تک صحابہ کرام کے قدم مبارک خیبر، میران شاہ، بنوں اور مکران کے علاقوں تک پہنچے جس کو تیسری کتاب میں کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ تو چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی موجودہ پاکستان میں کافی آبادی غیر مسلموں کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ مہربانی اب کی ہے کہ یہ علاقہ مکمل طور پر مسلمانوں کا ملک بن گیا۔ اس سب میں راز کیا اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو کسی دنیاوی پیمانے سے ناپنا مشکل ہے۔ بہر حال ہم کسی بہتری کی توقع کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کو پاکستان اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز منظور ہو۔ اس ضمن میں حکیم الامت علامہ اقبال کا اشارہ ملاحظہ ہو۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

ایک جائزہ

اس سلسلہ میں ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ جس جگہ بھی مسلمان اپنے فلسفۂ حیات پر صحیح طور پر عمل پیرا ہوتے ہوئے داخل ہوئے اور وہاں اسلام کا عملی مظاہرہ کیا وہاں اسلام قائم دائم رہ گیا۔ چونکہ حضور پاک ﷺ کے صحابہ کرام اسلام کا صحیح اور عملی مظاہرہ کرتے رہے تو جہاں تک وہ پہنچے وہاں اسلام کی جڑیں زیادہ مضبوط ہو گئیں اور جو علاقے بعد میں فتح ہوئے وہاں پر یہ عملی پہلو کم تر تھا تو اکثر جگہوں پر اسلام کی جڑیں مضبوط نہ ہو سکیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لشکر اسلام میں اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنھم یا ان کے فرزند موجود تھے تو ان کے کردار کے عملی اور روحانی اثرات بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر قسطنطنیہ (استنبول) ۱۴۵۳ء میں فتح ہوا۔ لیکن صحابہ کرام کے قدم چونکہ وہاں پر ۴۷ ہجری میں پڑنے شروع ہو گئے تو وہاں آج بھی اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند ہو رہا ہے پھر میزبان رسول ﷺ جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا جسد خاکی بھی وہیں رہ گیا، تو اس کی برکت کے طفیل بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ یہ ایک سبق ہم نے اکثر دہرایا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی پیروی، حضور پاک ﷺ کا ذکر اور حضور پاک ﷺ کی نگاہ کی طلب گاری کی اس زمانے میں بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ حضور پاک ﷺ کے اپنے زمانے میں تھی اور ان کتابوں کے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قوم کو احساس دلایا جائے کہ حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال کے چشمے اب بھی جاری ہیں اور اگر ہم اللہ تعالیٰ سے ہر وقت ہر کام میں یہ عرض کر کے شروع کریں کہ اپنے حبیب ﷺ کے طفیل ہم پر رحمت فرما، تو نتائج وہی ہو سکتے ہیں جو حضور پاک ﷺ اور حضور پاک ﷺ کے رفقاء کے زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔

نظام حکومت

دوسرا پہلو جس کی ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں وہ نظام حکومت ہے۔ اسلام وحدانیت اور مرکزیت پر بہت زور دیتا ہے۔ اس کا نظام حکومت اسلامی فلسفہ حیات کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے سارے ڈھانچے کی بنیاد اسلامی اقدار اور قرآن پاک کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر رکھی جاتی ہے۔ اسلامی نظام حکومت کا الگ ایک مزاج ہے۔ دنیا کے باقی نظام حکومت یا فلسفوں کا اسلام کے کسی نظریہ کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا، اسلام کا فلسفہ دفاع یا فلسفہ جنگ بھی الگ ہے۔ اس کتاب میں ان سب معاملات کو بیان کرنا ممکن نہیں جو نظام حکومت کے تحت آتے ہیں یا جن سے نظام حکومت کے چشمے پھوٹتے ہیں تاہم کتاب کے آخر میں ہم اسلام کے نظام حکومت کا ڈھانچہ اسلامی فلسفہ حیات کی بنیادی باتیں اور اسلامی فلسفہ دفاع کا ایک اجمالی خاکہ میں پیش کر رہے ہیں گویا یہ ''جلال مصطفیٰ'' اور ان چار کتابوں کے عملی پہلوؤں کے بامقصد مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ یہ سب مضامین اتنے وسیع ہیں کہ ان میں سے ہر مضمون پر ایک کتاب درکار ہے۔ اس لیے ہم اپنے آپ کو ان مقاصد کے چند بنیادی اصولوں کی نشاندہی تک محدود رکھیں گے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیس سالہ دور حکومت بھی ایک کتاب کا مضمون ہے لیکن ہم اس زمانے کو خلافت راشدہ کا حصہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے صرف فتوحات کے اجمالی خاکہ کو ثمرات کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ سانحہ کربلا بھی کئی کتابوں کا مضمون ہے لیکن ہم اس سانحہ کا مختصراً ذکر ایک مقصد کے تحت کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس اسلامی فلسفہ حیات کی ان کتابوں میں بار بار نشاندہی کی گئی ہے وہ اس کہانی کے بغیر نامکمل ہی رہ جاتا چنانچہ ہم نے امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کی عملی قربانی کے مقصد اور اس دنیا کے بارے ان کے کنبے کے رویے کا جائزہ لیا ہے۔ اس لیے یہ ابواب خلفائے راشدین کے زمانے سے ہٹ کر ہے، لیکن یہ اس زمانے کے واقعات کا کس حد تک عملی اختتام ہیں۔

سانحۂ کربلا

ایک چیز کی وضاحت یہاں بہت ضروری ہے اور آگے چل کر ہم نے اپنی کتاب میں اس سلسلہ میں سرسری جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ہمارے لحاظ سے مسلمانوں کی تمام فتوحات، تمام جنگیں اور تمام شہادتیں حضور پاک ﷺ کے جلال کا مظہر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کتابوں کو بھی ''جلال مصطفیٰ ﷺ'' کے سلسلہ جات کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری چاروں کتابیں، غازیوں اور شہیدوں کی کارروائیوں سے بھری ہوئی ہیں اور ہم نے یہ نکتہ اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ تمام لڑائیاں فتوحات کی بجائے اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کو جاری وساری کرانے اور حق کو لانے یا حق کے نام پر قربان ہونے کے لیے لڑی گئی تھیں، لیکن سانحہ کربلا ان سب سے الگ نوعیت کا ہے۔ یہاں کوئی خواہش یا امید کارفرما نہ تھی۔ یہاں پر مقصد

حق کے لیے لڑ کر قربان ہو جانا تھا اور یہ ذبح عظیم تھا۔ چنانچہ قرآن پاک میں سورۃ الصّٰفّٰت میں جو حضرت ابراہیم السلام کو اللہ تعالیٰ کا پیغام ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک ذبح عظیم کے بدلے بچالیا تو اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ سانحہ کربلا ہی ذبح عظیم تھا اور یہ سب کچھ عشق کا ایک ارتقائی مظہر تھا۔

صدق خلیل علیہ السلام بھی عشق صبر حسین ﷛ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

(اقبالؔ)

اضافی ابواب

بہرحال اس ساری کہانی کو مکمل کرنے کے لیے ان دو ابواب کے علاوہ تین اور ابواب کا اضافہ کیا جا رہا ہے ان میں پہلا باب اسلامی نظام حکومت کے ایک خاکہ پر مشتمل ہوگا، جہاں غیروں کے نظام ہائے حکومت سے موازنہ کرتے ہوئے اور غیر اسلامی اقدار کی نشاندہی کے ساتھ چند بنیادی باتیں لکھی گئی ہیں چونکہ نظام حکومت اسلامی فلسفہ حیات کے تابع ہونا چاہیے تو اس سے اگلے باب میں اسلامی فلسفہ حیات کی چند جھلکیاں ہیں اور حکومت کے بنیادی ڈھانچہ کی وضاحت ہے جس میں زیادہ زور اسلام کے سیاسی فلسفہ پر دیا گیا ہے۔ تیسرا اور آخری باب اسلام کے فلسفہ دفاع اور جنگ کے طریق کار کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس میں اسلام کے اصولوں کے تحت جنگ کے لیے تنظیم، حکمت عملی اور تدبیرات کا سرسری بیان ہے۔

پرانی تواریخ

اس کتاب کے لیے بھی بنیاد تو طبری اور ابن خلدون کی تاریخوں کو بنایا گیا ہے اور طبقات ابن سعد سے بھی ثانوی مدد لی گئی ہے لیکن اس کتاب کے مضامین اور واقعات ہماری کتابوں، اخباروں اور رسالوں میں بہت دفعہ زیر بحث آ چکے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں بھی ان پر بہت تبصرے ہو چکے ہیں لیکن ان واقعات کا جائزہ اور تحقیق آپ لوگوں کو یہاں پر بالکل مختلف نظر آئے گی۔ اکثر لوگ یہاں آ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور کئی لوگ ان واقعات کے سلسلہ میں شکوک لیے پھرتے ہیں۔ بے شک مجھے بھی اس زمانے میں کچھ غلط مثالیں ضرور نظر آئیں۔ لیکن کچھ ایسی ارفع مثالیں بھی نظر آئیں کہ انہوں نے میری زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیا اور میں صرف مسلمان رہ گیا۔ تمام تفرقے میرے سامنے محض حادثات بن گئے۔ بے شک مشیت ایزدی کی کئی باتوں میں کچھ راز تھے، اسباق تھے، انسانی کمزوریوں کے مظہر تھے اور بہت کچھ تھا لیکن عظیم صحابہ ﷡ کی شان پر کوئی حرف نہیں آتا اور ان کے کردار میں ہمارے لیے بڑے

اسباق ہیں کہ ناموافق حالات میں بھی وہ کس طرح حق پر قائم رہے۔

چنانچہ فضول قسم کی اختلافی اور تفرقہ والی باتوں کے سلسلہ میں جائزے پیش کر کے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام کے فلسفہ حیات پر جو پردے ڈال دیئے گئے ہیں ان کو ہٹانے کی سعی کی گئی اور غلط روایات کو قرآن پاک و حدیث کی روشنی میں پرکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ہم نے نادانی میں غیروں کی جو نقالی شروع کر دی ہے یا غیر اسلامی باتوں کو اسلامی بنالیا ہے۔ ان کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ بڑا مقصد قوم میں وحدت فکر اور وحدت عمل پیدا کرنا ہے اور یہی مقصد مکمل طور پر ذہن میں رہا۔ گو جنگوں کے مطالعے تفصیل سے نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن بنیادی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اگر کسی کو جنگی پہلو نمایاں نظر آئیں تو یہ بھی یاد رہے کہ ہم نے قرآن پاک اور سنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ پوری ملت اللہ کی فوج ہے اس لیے زیادہ زور ان باتوں پر دیا ہے، جن کی مدد سے پوری قوم کو اللہ کی فوج بنایا جا سکے۔

فقہ یعنی اسلام کا اخلاقی اور معاشرتی فلسفہ یا مادی ضرورتوں کے فلسفے اور قوانین کو اسلام میں ثانوی حیثیت حاصل ہے کہ ان کی مدد سے پوری قوم کو اللہ کی فوج بنایا جاتا ہے۔ اس لیے قوم میں اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ہم نے "فقہ عسکریت" کی اصطلاح کو اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ اسلام یا کسی قوم کے لیے اولین حیثیت سیاسی فلسفہ کی ہوتی ہے۔ ہمارا سیاسی فلسفہ ہمارے فلسفہ حیات کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو نظام مصطفیٰ یا نظام جہاد کا نام بھی دے سکتے ہیں اور آگے اس کتاب میں بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے کہ فلسفہ دماغ یا جہاد بالسیف اس سیاسی فلسفہ یا نظام جہاد کے تابع ہے۔

بہرحال اس گنہ گار کی کوشش قارئین کے سامنے ہے اور اس چیز کا بڑا خیال رکھا گیا ہے کہ بیانات میں تضاد نہ ہو اور ساتھ ہی یہ خیال تھا کہ واقعات کے جائزوں یا تبصروں میں کسی فرد، کسی مکتب فکر یا کسی وقائع نگار یا مورخ کی دل آزاری نہ ہو لیکن یہ بڑا مشکل کام تھا جہاں وحدت اور مرکزیت کی بات تھی وہاں ہم نے اختلاف کرنے والوں یا تفرقہ ڈالنے والوں کی کھل کر مخالفت کی، لیکن ساتھ ہی لکھ دیا کہ شاید یہ کسی کی نادانی تھی یا کسی اور نے کوئی اضافی بات کسی کے ذمہ لگا دی۔ اس سلسلہ میں بھی اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو ان سے معذرت خواہ ہوں۔ میں اپنی کتابوں کو تحقیق کا نام نہیں دے سکتا۔ البتہ تاریخ کی تحقیق کے سلسلہ میں بسم اللہ ضرور کہوں گا۔

آخر میں پھر امت واحدہ کے اتحاد کی دعا کرتا ہوں۔

امیر افضل خان

❖❖❖

کچھ اپنے اور کرم فرماؤں کے بارے میں

کتابوں کے اس سلسلے میں، میں اپنے ماں باپ، فقیر بہن، رشتہ داروں، استادوں اور دیگر کرم فرماؤں کا سرسری ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ میری ماں اور فقیر بہن نے جو مجھ سے عمر میں تیرہ سال بڑی تھیں۔ مجھے پنگھوڑے میں اسلام کی لوری دی میں اپنے عظیم والد بزرگوار کو نہ دیکھ سکا، کہ میں چالیس دن کا تھا اور وہ وفات پا گئے۔ اپنی ماں،، بہن یا رشتہ داروں اور اپنے والد کے رفقاء سے یہی سنا کہ وہ اسلام کے عظیم فرزند تھے۔

وہ برٹش انڈین آرمی میں شامل ضرور ہوئے اور موجودہ سات پنجاب رجمنٹ میں نائب صوبیدار تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع ہی میں عراق کے علاقہ میں قط العمارہ کے مقام پر جنرل ٹاونسنڈ کی فوج کے ساتھ ترکوں کی قید میں چلے گئے۔ وہاں آپ کو پہلے ترک فوج کے کرنل نورالدین اور پھر جنرل خلیل پاشا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہی صراط مستقیم نظر آنے لگی کہ ان کی جگہ تو ترک فوج میں تھی۔ رہی سہی کسر موصل کے مقام پر نکل گئی جہاں غازی انور پاشا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ بروسہ کے مقام پر برائے نام جنگی قیدی رہے اور گو سلطنت عثمانیہ زوال پذیر تھی، لیکن پھر بھی اسلامی حکومت کی عظمت دیکھ کر اپنی حالت پر اور نادم ہوئے۔ ساتھ ہی خلیفہ المومنین غازی سلطان محمد ارشاد خان خامس کی طرف یکم اگست ۱۹۱۶ء کو ایک قرآن پاک عطا ہوا جو اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

بہر حال قید سے واپس آ کر والد بزرگوار نے انگریزی فوج چھوڑ دی گو ان کے افسروں نے ان کو فوج میں رکھنے اور ترقی دینے کی امید لائی کہ ان سے جونیئر بھی کہاں پہنچ چکے تھے لیکن والد بزرگوار اپنی بقایا زندگی توبہ میں گزارنا چاہتے تھے اور زندگی کے آخری سالوں میں امت واحدہ کی باتیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ انہوں نے میری بڑی بہن کو اسلامی تعلیم دی جو سلسلہ ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ میرے لیے والد صاحب کی تین نشانیاں میرے حصہ میں آئیں۔ ایک یہ قرآن پاک جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری ان کی تلوار اور تیسری ان کی ہاتھ لے کر چلنے والی کھونٹی۔ اور ان تین چیزوں میں میرے لیے سبق ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ کا علم اور احکام ہیں۔ کھونٹی پکڑ کر صراط مستقیم پر چلنا حضور پاک ﷺ کی سنت ہے اور تلوار ہماری غیرت کی نشانی ہے کہ عسکریت کے بغیر اسلام بے جان فلسفہ ہے۔ میری پرورش میری بزرگ ماں اور بزرگ بہن نے کی۔ والدہ ماجدہ نے ۱۹۷۶ء تک میری رہنمائی کی اور بزرگ بہن نے مجھے اسلامی تعلیم دی اور جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا تو وہ اپنی شادی کے دن بغیر کسی بیماری کے اللہ کو پیاری ہو گئیں اور

مجھے وہ اس چیز سے آگاہ کر چکی تھیں۔ گو ان کے سلسلہ میں، میں کئی غیر مرئی چیزیں دیکھ چکا تھا لیکن ان کی موت کا یقین نہ آ رہا تھا لیکن وہ کہہ چکی تھی کہ انہوں نے میری اسلامی تعلیم کی بنیاد باندھ دی آگے تعلیم عملی طور پر ہوگی۔

بے شک میں نے اسلامی تعلیم کسی ادارہ میں حاصل نہیں کی البتہ حوصلہ افزائی کرنے والے لاتعداد تھے۔ میرے ساتھی طالب علموں میں میاں نذیر عالم مرحوم کا ذکر ضروری ہے جن کے ساتھ بعد میں ہم نے مل کر تحریک پاکستان میں کام کیا۔ اور وہ خود ۱۹۴۷ء میں چند دن سرگودھا ضلع کی مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ میرے استادوں میں مولوی میاں محمد مرحوم اور قاضی منظور الحق مرحوم کا ذکر ضروری ہے کہ وہ ہمارے اردو اور عربی کے استاد تھے۔ انہوں نے مجھے اسلام کا مایہ ناز فرزند کہنا شروع کر دیا کہ مجھے خود اس قدر حوصلہ افزائی سے شرم آتی تھی بلکہ قاضی منظور الحق فرمایا کرتے تھے کہ یہ غلطی بھی کرے تو اس پر غصہ نہیں آتا۔ اس کے علاوہ میرے والد کے دوست میاں محمد اولیاء زرگر مرحوم اور ان کے تمام گھر والوں یعنی ان کی زوجہ محترمہ اور ان کے بڑے بیٹے محمد لطیف جو میرے ہم جماعت تھے کا ذکر ضروری ہے کہ ان کے گھر میں راقم نے دو سال گزارے وہاں بھی اسلام ہی اسلام تھا اور اس نے میری آئندہ زندگی پر بہت اثر کیا۔

دادا، دادی کو میں نے نہ دیکھا، اپنی نانی نانے کو میں نے دیکھا ضرور لیکن وہ بھی میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے لیکن ان سب کے لیے ہر جگہ سے اچھے الفاظ سنے کہ وہ کردار والے لوگ تھے۔ ویسے میرے رشتہ داروں، بزرگوں اور رفیقوں کا ایک انبوہ ہے جن کے سینوں سے میں نے اسلام کے نکتے سیکھے لیکن ان سب کا نام لکھنے سے یہ وضاحت طول پکڑ جائے گی کہ اپنے چچاؤں، بڑے بھائی اور والد صاحب کے رفیقوں میں سے کس کا ذکر کروں اور کس کا نہ کروں، البتہ بزرگ چچا فتح نور خان مرحوم کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۸۰ء میں برما چلے گئے تھے اور وہیں آباد ہو گئے۔ آج بھی ان کی اولاد وہاں آباد ہے۔ ۱۹۳۶ء میں گاؤں آئے اور پورا ایک سال میری ذہنی پرورش کر کے برما واپس گئے۔ وہ عالم دین تھے اور مولانا ظفر علی خان مرحوم اور مولانا نصر اللہ خان عزیز کے ساتھ بڑی دوستی تھی۔ بہر حال انہوں نے بھی امت واحدہ کا سبق دہرایا۔

اس سب کے باوجود راقم خود ۱۹۳۸ء میں انگریزی فوج میں شامل ہو گیا بلکہ یہی نہیں ان کے سو سالے بھی مٹائے جنہوں نے دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی حکومت کو روند ڈالا۔ اس سب کے لیے ندامت کے طور پر ایک اخبار میں اظہار کر چکا ہوں کہ میں ''جدید اسلام'' کے چکر میں رہا۔ بہر حال یہ لمبی کہانی ہے۔ یہاں فوج کے دو صاحبان کا ذکر ضروری ہے جو ان کتابوں کے سلسلہ میں، ہر لفظ میں میرے ساتھ رہے۔ اول میجر جنرل احسان الحق ڈار ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے تو میں ان کتابوں کے لکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ سارا کام انہی نے کروایا اور ''جلال مصطفیٰ ﷺ'' میں ان کا نام لیے بغیر اس سلسلہ میں اشارہ بھی کیا جا چکا ہے۔ اب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے

ہیں اوران کی خدمات پرایک الگ کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔

دوسرے کرنل شیر محمد ستارۂ جرأت ہیں جو ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں ٹھوال محاذ سے آگے جنرل خالد کے نام سے جہاد کرتے رہے۔ شیر محمد ۱۹۴۸ء میں کرنل بنے اور اسی عہدہ سے ۱۹۶۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ اسلامی موضوعات پر ان کے ساتھ جتنا تبادلہ خیالات ہوا، وہ ایک ہزار کتابوں کی مطالعہ کی نسبت زیادہ فائدہ مند رہا۔ گوان کتابوں کے لکھنے میں وہ عملی طور پر اپنی بیماری کی وجہ سے کوئی مدد نہ کر سکے لیکن میرے اکثر جائزوں میں ان کے خیالات میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے اوراس کتاب کے آخری تین ابواب میں میں نے نہ صرف ان کے کتابچوں یا خیالات سے استفادہ کیا ہے بلکہ بعض جگہ الفاظ بھی انہی کے استعمال کئے ہیں۔

میں صرف اس پر اکتفا کروں گا کہ قارئین مل کر میرے ان تمام کرم فرماؤں کے لیے دعا کریں کہ جوفوت ہو چکے ہیں۔ ان کی اللہ تعالیٰ مغفرت کرے، جوزندہ ہیں ان کو اس دنیا میں آسودگی حاصل ہواوران کا خاتمہ نیک ہواور یہ سب جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی خواہش کے مطابق روزِ قیامت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں شامل ہوں۔ خاص کر میری اولاد کی اولاد کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی صراط مستقیم پر رکھے۔ میں اپنی بیوی، بچوں اور بہوؤں کا شکر گزار ہوں کہ ان سب نے گھر میں ایسا ماحول قائم رکھا کہ اس نے ان کتابوں کے لکھنے کے سلسلہ میں میری حوصلہ افزائی کی اور خاص کر میرے تین پوتے فیصل، قاسم اور سلمان جو معصوم ہیں لیکن ان کتابوں پر کام کرنے والی جگہ پر بیٹھ کر وہ راحت اوراطمینان محسوس کرتے ہیں۔

مصنف کتاب

❖❖❖

پہلا باب

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت

اسلام کی تاریخ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت بلاشبہ ایک سانحہ عظیم ہے۔ اسلام کا مرکز پاش پاش ہو گیا۔ ایسے حالات میں مرکز کو سہارا دینا یا ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خانہ جنگی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہر شہر میں ایسے واقعات ہو سکتے ہیں کہ لوگ اپنے امرأ کو شہید کر دیتے یا امارت کے لیے ہر جگہ آپس میں ٹکر لینا شروع کر دیتے۔ ہر صوبے کا عامل اس صورت سے دوچار ہوتا کہ ماتحتوں کو کیسے قابو میں رکھے اور مرکز سے کیا ہدایات لے یا کیسے تعلقات قائم رکھے۔ اسلام میں جانشینی کا مسئلہ ایسے تو نہ تھا کہ بادشاہ کی وفات کے بعد اس کا وارث تخت پر بیٹھ جاتا۔ اب اسلام کے مرکز میں ایک خلا پیدا ہو چکا تھا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت چند لمحوں کے لیے ایک خلا پیدا ہوا تھا جس کو باہمی مشاورت سے طے کر لیا گیا تھا۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی وفات سے پہلے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین منتخب کر چکے تھے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ کام مجلس مشاورت کو سونپ دیا۔ لیکن یہاں پر تو حالات کا رخ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کسی کو نامزد کر گئے اور نہ کسی مجلس مشاورت کے ذمہ یہ کام لگا گئے کہ وہ کسی امیر کا تقرر کریں۔ البتہ قوم کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی جان اللہ تعالیٰ کو پیش کر دی۔ اب مدینہ شریف میں جو عظیم صحابہ کرام موجود تھے، وہ خلافت کے سلسلہ میں کوئی مشاورت کیسے طلب کرتے کہ بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ خود مغلوب ہو چکے تھے۔ یہاں سے آگے بڑھنے سے پہلے قارئین ذہن میں ان حالات کے تصور کا نقشہ بنائیں تو اگلے حالات بہتر طور پر سمجھ آ سکیں گے۔

مرکز کو سہارا

چنانچہ ان حالات میں مرکز کو سہارا دینے کی ذمہ داری قبول کر کے جناب علی رضی اللہ عنہ نے اسلام کی عظیم خدمت کی ہے اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوتے تو حالات اتنے بھیانک ہو جاتے کہ نتائج کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا۔ باغی اور مفسدین

اس وقت تک مدینہ شریف میں دندناتے پھرتے تھے۔ وہ ان بھیڑیوں کی طرح تھے۔ جن کے منہ خون لگ جائے۔ مدینہ کے نئے آبادکار یا غلاموں کی زیادہ تعداد بھی اب ان ''بھیڑیوں'' کی طرف مائل ہورہی تھی یا یہ لوگ ان سے متاثر ہورہے تھے۔ یعنی آزادی کا بھوت ان کے سر پر بھی سوار ہورہا تھا۔ روایت ہے کہ چار دن تک مفسدین کا لیڈر رعافقی بن حرب ہی مدینہ کا امیر بنا رہا اور وہی مسجد نبوی میں امامت کراتا رہا۔ مدینہ کے پرانے لوگ یعنی خاص کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گوشہ نشین ہو چکے تھے۔

''نادانوں'' کو ہوش آنے لگا

سازشیوں کو اپنے گہرے مقاصد میں سے ایک مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ باقی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ حالات کا جائزہ لیں اور پھر کوئی تجویز بنائیں۔ اس لیے وہ کچھ خاموش تھے لیکن مفسدین اور باغیوں میں ''نادان'' لوگوں کو اب سمجھ آئی کہ وہ ایک بھیانک غلطی کر چکے ہیں اور ایسے لوگوں میں اشتر نخعی پیش پیش تھا۔ اس نے سوچا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عظیم صحابی کو آگے لایا جائے کہ وہ خلافت سنبھالے۔ تیسری کتاب کے آخری ابواب میں ذکر ہو چکا ہے کہ بنوامیہ کے کئی لوگوں نے جناب علی رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو طعنہ دیا تھا بلکہ ان کے خلاف ایسے سخت الفاظ استعمال کئے تھے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اور دونوں عظیم صحابہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے اٹھ آئے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے کہ فساد کے ذمہ دار ہی تینوں عظیم صحابہ ہیں کہ وہ خلافت کے امیدوار ہیں۔ ان حالات میں تینوں عظیم صحابہ میں سے کوئی ایک بھی آگے بڑھ کر خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ اب باغیوں میں سے نادان لوگوں کے دماغ کچھ درست ہورہے تھے۔ انہوں نے جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص اور جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تک رسائی حاصل کی اور ان کو خلافت سنبھالنے کے لیے کہا۔ لیکن دونوں عظیم صحابہ نے انکار کر دیا۔ باغیوں کے نادان گروہ کو اب اگر ''ذی ہوش'' گروہ کا نام دے دیں تو کوئی حرج نہیں کہ انہوں نے سوچا کہ امام یا خلیفہ کے بغیر اسلامی سلطنت جو اتنی وسعت اختیار کر چکی ہے، اس کے کام کیسے چلیں گے۔

مدینہ شریف میں سنجیدہ لوگوں کی تعداد کوئی ایک ہزار کے قریب تھی جن میں سے سات سو تو حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے جنگ کرنے پر بھی تیار تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یہ سب گوشہ نشین ہو گئے اور کچھ نزدیک کے دیہات میں چلے گئے۔ غلاموں یا نئے آبادکاروں کی تعداد بھی ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی اور باغی یا مفسدین بھی اتنی ہی تعداد میں تھے چنانچہ باغیوں اور مدینہ کے نئے آبادکاروں نے مل کر اہل مدینہ کے گوشہ نشین لوگوں کو گھروں سے باہر نکالنا شروع کر دیا اور اعلان کیا کہ اہل مدینہ کا سنجیدہ طبقہ اگر عظیم صحابہ کو امارت یا خلافت سنبھالنے کے لیے مجبور نہیں کرتا تو باغی عظیم صحابہ کو باری باری شہید کرتے جائیں گے اور ابتدا جناب علی رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور

جناب زبیر رضی اللہ عنہ سے کریں گے۔

اشتر نخعی

اب جو حالات پیدا ہوئے تو باغیوں کی باگ ڈور تقریباً اشعر نخعی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ وہ مفسدین میں ضرور شامل تھا۔لیکن جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں وہ سیدھے طور پر ملوث نہ تھا لیکن جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے اشتر کو بلا کر نادم بھی کیا تھا اور گھیراؤ کے آخری دو دنوں میں وہاں پر اشتر کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اشتر بہادر آدمی تھا اور اس سلسلہ کی دوسری کتاب میں اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ جنگ یرموک کے بعد اس نے کئی دستوں کی کمانڈ کی تھی لیکن وہ کچھ زیادہ ہی ''آزاد'' ہو گیا تھا اور امرأ پر اعتراض کرنا اس کی عادت میں شامل ہو گیا تھا۔ بہرحال وہ اہل کوفہ کا لیڈر ضرور تھا اور اہل کوفہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اس لیے یہ سب لوگ جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو خلافت سنبھالنے کے لیے کہا۔لیکن جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے بالکل انکار کر دیا۔ اہل مصر کی سرداری حکیم بن جبلہ کے ہاتھ آ چکی تھی اور اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ خلافت سنبھال لیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ امیر ہونے کی بجائے وزیر ہونا زیادہ پسند کریں گے۔ ویسے اس زمانے میں حکیم بن جبلہ، بصرہ میں آباد تھے اور اس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ اس لیے حکیم بن جبلہ اہل بصرہ کے ساتھ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اہل بصرہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے لیکن جناب طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی انکار کر دیا۔

اب باغیوں نے اشتر نخعی کی سرداری میں مدینہ شریف سے تمام گوشہ نشین لوگوں کو باہر نکالا اور مسجد نبوی میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا اور کہا کہ یہ اہل مدینہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے میں سے کسی کو مسلمانوں کا خلیفہ یا امام بنائیں۔ اشتر کے الفاظ یہ تھے۔

> ''آپ لوگ اہل شوریٰ ہیں۔ آپ کا حکم تمام امت محمدیہ پر جائز و نافذ ہے۔ آپ امام مقرر کریں ہم آپ کے مطیع ہیں اور آپ اس کام کو انجام دیں۔ ہم آپ کو دو دن کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر اس مدت میں امام مقرر نہ کیا گیا تو ہم عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کو شہید کرتے جائیں گے۔''

ابن اثیر کے مطابق ترجیحات کے طور پر جناب علی، جناب طلحہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہم کے نام لیے گئے۔

تبصرہ:

اگر سوچا جائے تو اصولی طور پر مفسدین کا یہ ''نادان گروہ'' آگے چل کر ''ذی ہوش گروہ'' بن گیا تھا۔ اس کی سوچ

یا طریقہ کار صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امیر کی موجودگی ہر وقت ضروری ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خلافت

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے گھر میں گوشہ نشین تھے اور اس وقت تک باغیوں کو یہ ہمت نہ پڑی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا باقی عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم کو دوسروں کی طرح زبردستی گھروں سے نکال کر مسجد نبوی میں لے جاتے۔ چنانچہ اہل مدینہ کے سنجیدہ لوگ باغیوں کی تنبیہ سننے کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ خلافت سنبھال لیں۔ جناب علی تذبذب میں تھے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اول تو خلافت قبول ہی نہ کی جائے لیکن اگر مجبوری ہے تو پھر بھی تمام بلاد اسلامیہ سے وفود منگوائے جائیں اور جب تک سب وفود جناب علی رضی اللہ عنہ کو خلافت سنبھالنے کی گزارش نہیں کرتے، تب تک خلافت قبول نہ کی جائے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ یہ معاملہ بڑا مشکل تھا۔ وفود کے آنے میں بڑی دیر لگتی اور آ بھی جاتے تو اگر ان میں اختلاف ہوتا تو حالات اور خراب ہو جاتے۔ پھر لوگوں کا کیا بھروسہ، وہ وفود بھیجنے کے بعد بھی تبدیل ہو سکتے تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ علم کا دروازہ تھے اور ان سے کوئی پہلو پوشیدہ نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ صوبوں کے عامل اپنے چھوٹے علاقوں کے امراء سے مشورہ کریں گے اور ہر جگہ سے بھانت بھانت کی بولیاں بولی جائیں گی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مرکز میں کسی ایک آدمی کا امیر مقرر ہونا بہت ضروری ہے اور یہ کارروائی جتنی جلدی کی جا سکے بہتر ہوگا۔ تذبذب یہ تھا کہ وہ خود یہ کام سنبھالنے کو تیار نہ تھے۔

آخر جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کل تمام لوگ مسجد نبوی میں اکٹھے ہوں اور یہ فیصلہ وہاں پر ہوگا۔ چنانچہ مسجد میں جمع ہونے کا اعلان کر دیا گیا لیکن عظیم یا مشہور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بہت کم لوگ مسجد نبوی میں آئے یہاں تک کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ بھی نہ آئے۔ یہ حالات دیکھ کر باغی یا باغیوں کا ذی ہوش گروہ مدینہ میں پھیل گیا۔ حکیم بن جبلہ، جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو لے آئے اور اشتر نخعی، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کو۔ اس طرح کافی صحابہ کرام کو زبردستی مسجد نبوی میں لایا گیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ وہ اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرکز میں ایک امیر کی ضرورت ہے اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ میں سے جو صاحب بھی خلافت قبول کریں وہ ان کی بیعت کرنے کو تیار ہیں۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حق دار ہیں اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد جناب زبیر رضی اللہ عنہ سمیت مسجد نبوی میں جتنے لوگ موجود تھے سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے بیعت کرتے وقت اونچی آواز میں یہ الفاظ ادا کئے۔

> ''ہم اس شرط پر بیعت کر رہے ہیں کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کام کریں گے اور شرعی حدود کو قائم کریں گے۔''

تبصرہ:

قارئین! جن حالات کے تحت جناب علی رضی اللہ عنہ کو خلافت قبول کرنا پڑی، وہ بڑے عجیب وغریب تھے۔ ان حالات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آگے چل کر اس بیعت کے طریق کار یا بیعت کرتے وقت الفاظ کی ادائیگی بڑے مسئلے بن جائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجبور تھے لیکن اگر مدینہ میں رہنے والے صحابہ کرام میں سے کوئی اس امیر پر بیعت کر رہا تھا کہ خلیفہ بن جانے کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ تمام قاتلین عثمان کو اسی دن یا چند ماہ کے اندر اندر قتل کر دیں گے یا قصاص کا مقدمہ چلائیں گے تو یہ خیالات ٹھیک نہ تھے یا اگر کسی کو یہ خیال تھا کہ اس نے جناب علی رضی اللہ عنہ کی بیعت مجبوری کے تحت کی تو اس بات میں بھی کوئی جان نہ تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود مجبوری کے تحت خلافت سنبھال رہے تھے اور اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ امت میں تفرقہ سے حالات اتنے بھیانک تھے کہ مسلمان گروہوں میں بٹ کر وہ سب کچھ کھو بیٹھے جو انہوں نے پچھلے چالیس سالوں میں حاصل کیا تھا۔ اگلا سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل کون تھے اور یہ مقدمہ کن لوگوں پر چلایا جاتا۔ تمام وہ لوگ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا ہوا تھا، ان پر مقدمہ چلانا تو عملی طور پر ناممکن تھا، انہی لوگوں کے کہنے پر جناب علی رضی اللہ عنہ نے خلافت قبول کی اور وہ کہتے تھے کہ ان کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ شہادت ایک حادثہ تھی اور اس میں چند لوگ شامل تھے اور کچھ بیوقوفی کر بیٹھے اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والوں میں سے دو آدمی تو ادھر ہی مارے گئے۔ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی دیوار توڑ کر ان کے گھر میں داخل ہوئے لیکن اندر جا کر ندامت ہوئی تو واپس آ گئے۔ اب ان پر مقدمہ چلانا بھی کچھ عجیب معلوم ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص طلب کرنے والے لوگ دراصل وہ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پسند نہ کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر تمام گھیراؤ کرنے والوں کو پکڑ بھی لیتے تو یہ لوگ راضی نہ ہوتے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کن لوگوں کی مدد سے گھیراؤ کرنے والوں کو پکڑتے۔ بس قارئین اس پہلو کو مد نظر رکھیں۔

باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کبار کا رویہ

گو مسجد میں کافی صحابی موجود تھے لیکن کئی صحابہ کرام غیر بھی تھے۔ ان میں جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص اور جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قابل ذکر ہیں۔ اس لیے اشتر کا گروہ، جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو گھر سے نکال لایا۔ مسجد میں پہنچ کر جناب سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب باقی صحابہ بھی بیعت کر لیں گے تو وہ تب بیعت کریں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''ان کو رہنے دو اور کچھ مت کہو۔'' پھر جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو لایا گیا۔ انہوں نے بھی یہی بات

کہی۔ لوگوں نے کہا، ضامن دو۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ ضامن نہیں دے سکتے۔ اشتر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی کہ اسے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی اجازت دی جائے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "نہیں چھوڑ دو، میں ان کا ضامن ہوں۔"

تبصرہ:

قارئین اس واقعہ کو بھی یاد رکھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر بیعت نہ کرنے والوں پر سختی کرتے یا لوگوں کو اجازت دیتے کہ وہ ایک آدھ مخالف کو قتل کر دیتے، تو معاملات اسی دن حل ہو جاتے اور طرح بعد میں کسی کو بھی بغاوت کرنے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے کی ہمت نہ ہوتی لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ اس سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح اپنی امارت کو قائم رکھنے کے لیے کسی خون خرابے کے حق میں نہ تھے۔ وہ قوم میں وحدت چاہتے تھے لیکن بااصول اور پرامن وحدت۔ آگے جو انہوں نے بغاوت ختم کرنے کے لیے تلوار اٹھائی تو وہ مجبوری کے تحت تھی۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت سخت تھے وہ غلطی پر ہیں، اپنوں کے لیے جناب علی رضی اللہ عنہ جتنا رحم دل ہونا ناممکن ہے، غصہ تو ان کو آتا ہی نہیں تھا اور یہی بہادر آدمی کی نشانی ہے کہ اس کو غصہ نہیں آتا۔

بیعت میں دیر

ابن خلدون کے مطابق کچھ اور صحابہ نے بھی اس دن بیعت نہ کی لیکن پانچ روز کے بعد مدینہ کے سب لوگوں نے بیعت کر لی جنہوں نے اس دن بیعت نہ کی ان میں انصار سے حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت، کعب رضی اللہ عنہ بن مالک، مسلمہ رضی اللہ عنہ بن مخلد، ابوسعید خذری رضی اللہ عنہ، محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ، زید رضی اللہ عنہ بن ثابت، رافع رضی اللہ عنہ بن خدیج، فضالہ رضی اللہ عنہ بن عبید، کعب رضی اللہ عنہ بن عجزہ اور سلمہ رضی اللہ عنہ بن سلامہ شامل ہیں بلکہ نعمان رضی اللہ عنہ بن بشیر، جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ نائلہ رضی اللہ عنہا کی کٹی ہوئی انگلیاں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیض لے کر شام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے۔ جن مہاجرین نے اس دن بیعت نہ کی ان میں عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سلام، صہیب رضی اللہ عنہ بن سنان (ان کو صہیب رومی بھی کہتے ہیں) اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید، قدامہ رضی اللہ عنہ بن فطعون اور مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کا نام لیا جاتا ہے۔

ابن سعد، طبری اور ابن خلدون سب آگے چل کر یہ کہتے ہیں کہ چند روز بعد سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ ہم اس پر شک نہیں کر سکتے۔ لیکن ان صاحبان میں سے اکثر لوگوں اور جناب سعد رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر سمیت کسی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مکمل طور پر ان کا ساتھ نہ دیا۔

ان میں سے کچھ غیر جانبدار رہے، کچھ انتقال فرما گئے لیکن ان میں سے جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ، مسلمہ رضی اللہ عنہ

بن مخلد اور ابو سعید خذری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے بعد میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھر پور مدد بھی کی اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کے منظور نظر بھی رہے۔ ان لوگوں کے علاوہ بنو امیہ کے خاندان میں سے متعدد لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی۔ ان میں مروان وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ شام چلے گئے تھے، وہاں سے کچھ مکہ چلے گئے اور آگے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹوں سمیت متعدد لوگوں نے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

یہ مدینہ شریف کے حالات تھے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو پکڑنے میں دیر لگائی وہ یہ سوچیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کس کس کو پکڑتے۔ حکومت کے ساتھ مکمل وفاداری نہ دکھانا بھی ایک کوتاہی ہے اور اس وقت زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکمل وفاداری دکھاتے اور جو لوگ وفاداری نہ دکھاتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل حق بجانب تھے کہ وہ ان کو پکڑ کر ان کے خلاف کارروائی کرتے۔ قارئین اس نکتہ کو بھی مدنظر رکھیں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان

یہاں تک حالات کا سرسری جائزہ پیش کرنے کے بعد ہم قارئین کو پہلی کتاب کے پہلے باب میں واپس لے جاتے ہیں جہاں پر ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان بیان کی تھی کہ وہ دنیاوی معاملات سے بہت بلند تھے اور آج اس کا عملی مظاہرہ ہو رہا ہے کہ اپنی امارت کی خاطر وہ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔

قارئین! یاد رکھیں کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی عمر نو یا دس سال تھی کہ حضور پاک ﷺ نے اسلام کی دعوت دی۔ جن چار عظیم ہستیوں کا اول اسلام لانے کا ذکر ہے ان میں ام المومنین جناب خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کا ذکر آتا ہے۔ ہم اس چکر میں نہ پڑیں گے کہ فلاں چند لمحے پہلے اسلام کے آغوش میں آ گئے اور مردوں میں فلاں پہلے تھے اور عورتوں، لڑکوں یا غلاموں میں فلاں کو پہل حاصل ہے۔ ہمارے لیے سب ہمارے سر کے تاج ہیں۔ لیکن ہمارے اس بامقصد مطالعہ میں ایک پہلو نکھر کر سامنے آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کے چچا زاد بھائی بھی بہت تھے اور نو دس سال کے بچے بھی کئی ہوں گے لیکن یہ اللہ کی شان ہے کہ خانہ کعبہ میں پیدائش اور آنکھیں اس وقت کھولنا جب حضور پاک ﷺ سامنے ہو، یہی ایک پہلو ایسا ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے اس عمر میں اپنے عظیم چچیرے بھائی کے ساتھ جو وقت گزارا اس کے ایک ایک لمحہ پر تمام دنیا کے علوم اور عشق قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''علی رضی اللہ عنہ علم کا دروازہ ہے۔'' اور عشق

کی مثال جناب علی رضی اللہ عنہ کے فرزند اور حضور پاک کے اپنے فرزند میدان کربلا میں قائم کر گئے اس لیے اس گھرانے کی بات کرتے وقت اپنے قلموں کو لگام دینا ہی ادب کا پہلا قرینہ ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو جناب علی کو اپنے بستر پر چھوڑ گئے۔ مدینہ میں عقد مواخذہ کرایا تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ "میرے بھائی علی رضی اللہ عنہ ہیں۔" اپنی پیاری بیٹی فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو جناب علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دے کر اس دنیا میں ایک ایسے عظیم گھر کی بنیاد رکھی اور لاثانی مثال قائم کی کہ وہاں پر جنت کے نوجوانوں کے سردار امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ جناب فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی شان کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون افضل ہے، ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہمارے لحاظ سے چاریاروں کے بارے میں وہی الفاظ بہتر ہوں گے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے لیے قرآن پاک میں استعمال کئے یعنی ﴿لا نفرق بین احد﴾ کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ ویسے مسلمانوں کے سواد اعظم میں یہ دستور چلا آتا ہے کہ صحابہ کرام کے نام لکھتے ہوئے وہ ترتیب استعمال کی جاتی ہے جس ترتیب سے انہوں نے خلافت سنبھالی یعنی خلیفہ راشد اول، دوم، سوم اور چہارم وغیرہ۔

ایک بیان جناب مجدد الف ثانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو مسلمان درجوں کے لحاظ سے چاریاروں کو اس طرح ترجیحی طور پر افضل نہیں سمجھتا جس طرح انہوں نے خلافت سنبھالی تو ایسے مسلمان کو اہل سنت والجماعت سے خارج سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ بیان ان کے ایک خواب کی وضاحت میں تھا لیکن ہمیں اس کی صحت پر شبہ ہے کہ امام شافعی جو اہل سنت والجماعت کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب فاطمہ الزہرہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں تو اب ہم اس چکر میں پڑ جائیں کہ کون افضل ہے تو وحدت کی بجائے ہم میں تفرقہ بڑھ جائے گا۔ قرآن پاک کے لحاظ سے اور حضور پاک کی سنت کے لحاظ سے ہم سے روز قیامت یہ نہ پوچھا جائے گا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاً یا اولاد میں سے کون افضل تھا اور ہم کس کو افضل مانتے تھے اور اگر ایسا سوال پوچھا بھی جائے تو میرا جواب تو یہ ہو گا کہ سب ہمارے سروں کے تاج ہیں اور ہم ان کی جوتیوں کے بھی غلام ہیں۔

پہلے تین خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی شان بیان ہو چکی ہے۔ یہ خیال رہے کہ جب ہم ان کی شان بیان کرتے رہے تو ان کی عظمت کی بلندیوں تک ہماری پہنچ نہ تھی۔ اب جب جناب شیر خدا رضی اللہ عنہ پر پہنچے ہیں تو مہم تبوک کی بات یاد آتی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ شریف میں اپنا جانشین چھوڑا تو فرمایا: "اے علی رضی اللہ عنہ! آپ میرے لیے اسی طرح ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ ہاں، بے شک میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔"

خلافت کا بوجھ

البتہ خلافت کے سلسلہ میں ایک بات تسلیم شدہ اور عمل ہے کہ خلافت راشدہ کا جو بوجھ حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے آخری چند ماہ میں نبھایا یا حضرت علی نے اپنی ساری خلافت اس بوجھ کے تحت گزاری، ایسا بوجھ پہلے دو خلفائے راشدین کو نہ اٹھانا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلے دو خلفاء رضی اللہ عنہم کا امت کے بہت لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑا تھا، ان کی مشیر جناب عثمان اور جناب علی کرم اللہ وجہہ جیسی عظیم ہستیاں تھیں لیکن جناب علی کے پاس کوئی بہت بڑے پایہ کا مشیر نہ رہ گیا تھا۔ اس پہلو کو ہم آگے پانچویں باب میں اور وضاحت سے بیان کریں گے۔

حضرت علی کی شان کی تاویلات

ہم نے اپنے بس کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ کی شان کو آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ بعض لوگوں نے جناب علی رضی اللہ عنہ کی شان کو بڑھانے کی کوشش کی جس کا ذکر تیسری کتاب میں بھی ہو چکا ہے اور بعض نے ردعمل کے طور پر یا ذاتی عداوت کی وجہ سے آپ کی شان کو گھٹانے کی کوشش کی۔ شان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے سلسلہ میں ہم عبداللہ بن سبا اور اس کی تاویل دابۃ الارض کا ذکر تیسری کتاب کے نویں باب میں کر چکے ہیں اور اس سلسلہ میں امام حسن رضی اللہ عنہ کے بیانات کے بعد اس معاملہ کو ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں لیکن شان کو گھٹا کر بیان کرنے والوں نے معاملات کو جناب علی رضی اللہ عنہ کے عظیم والد پر ناجائز حملوں کے ذریعہ سے شروع کیا۔ آگے بنو امیہ کے کچھ لوگوں نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی ذمہ داری بھی آپ پر ڈال دی اور یہاں سے آگے بڑھ کر یہ یہ اعتراض کیا کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اشتر نخعی جیسے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں بھرپور حصہ لیا اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

اب جناب عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے کہ "اے عمار! آپ کو باغی لوگ شہید کریں گے۔" تو ان کے سلسلے میں سب الزام بے معنی ہو جاتے ہیں لیکن محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اشتر سیدھے طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ذمہ دار نہ تھے اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دشمنی کرتے تو وہ اسلام کے مرکز کو سہارا کیسے دیتے کہ بڑے بڑے عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تو غیر جانبدار ہو چکے تھے یا کھل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ یہ جناب علی رضی اللہ عنہ ہی کی شان ہے کہ ان حالات میں اسلام کے مرکز کو سہارا دیا۔ اگلے ابواب میں ان الجھنوں کی عملی تفصیل آئے گی۔

جناب ابوطالب کا اسلام

لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ چودہ سو سالوں کے بعد بھی ہم فضول باتوں کی وجہ سے تفرقوں میں پڑے ہوئے ہیں اور جناب ابوطالب کا سلام خواہ مخواہ آج بھی امت میں ایک وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس فضول تفرقہ کے عملی پہلو کو بیان کر کے کئی اور فضول تفرقوں کے بارے میں بھی ایسے ہی رویہ پر عمل کیا جائے۔

سب سے پہلے بنوامیہ کے کچھ لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ خلافت کے لیے جناب علی رضی اللہ عنہ کی نسبت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زیادہ حق دار ہیں کہ ان کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے والد جناب ابو طالب اسلام نہ لائے۔ اسلام کی تاریخ یا مغازی کی کتابیں زیادہ تر بنوامیہ کے زمانے میں لکھی گئیں۔ اس لیے بنوامیہ کو خوش کرنے کے لیے اکثر لوگوں نے تاریخوں میں لکھ دیا کہ جناب ابوطالب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا کوئی پکا ثبوت موجود نہیں ہے۔ بنوامیہ رضی اللہ عنہ کے بعد بنوعباس نے خلافت سنبھالی تو ان کو علویوں سے خطرہ تھا کہ پہلے علوی اور عباسی یا سارے ہاشمی مل کر بنوامیہ کی مخالفت کر رہے تھے اور ان کا امام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ بن حنیفہ کا پوتا تھا۔ انہوں نے چونکہ خلیفہ سفاح کے بڑے بھائی ابراہیم کے گھر وفات پائی اس لیے انہوں نے ابراہیم کو امام نامزد کر دیا اور بنوامیہ کی شکست کے وقت ابراہیم بھی چونکہ جنگ میں مارا گیا اس لیے خلافت اس کے بھائی سفاح نے سنبھال لی۔

اب خلافت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کی اولاد نے سنبھال لی تو انہوں نے بھی بنوامیہ کے اس شوسہ کو تقویت دی کہ جناب ابوطالب کے اسلام کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور ان کے دادا جناب عباس رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے اس لیے خلافت کے وہ زیادہ حق دار ہیں۔ بدقسمتی سے امیہ اور عباسی خاندان کے زمانے میں علم حدیث بڑے بڑے اماموں یا عالموں تک محدود رہا اور اس کی تدوین تقریباً تین سو سال بعد عباسی خاندان کے زمانے میں ہوئی۔ گو اس وقت عباسی خاندان کی شوکت کو بھی دھچکا لگ چکا تھا لیکن خلیفہ برائے نام سہی وہ انہی کے خاندان سے تھا اور کئی سو سال ایسے ہی رہا بلکہ سقوط بغداد کے بعد بھی ایک خلیفہ کو کہیں سے تلاش کر کے مصر میں ایک برائے نام خلافت کو مملوکوں کے زمانے میں بھی قائم رکھا گیا کہ عباسی خاندان کا ایک آدمی کہیں سے مل گیا تھا، عباسی خلافت کا خاتمہ سولہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے سلطان سلیم نے کیا اور وہ خود خلیفہ المسلمون بن گیا اور خلافت کا خاتمہ اسی صدی میں کمال ترکی نے کیا۔

اب چونکہ ہم امت واحدہ کی طرف واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں تو بہتر ہے کہ تفرقوں کی تاریخ میں جا کر ان کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور یہاں پر ایک عملی قصہ سے اس تفرقہ کو ختم کر دیں۔ چنانچہ جب علویوں کے مخالفین نے جناب ابوطالب کے اسلام پر شک کیا تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے ہمدردوں نے جواب دیا کہ جناب ابوطالب کیسے دوزخ میں جا سکتے

ہیں کہ انہوں نے باپ کی طرح حضور پاک ﷺ کی پرورش کی۔ مخالفین کا جواب تھا کہ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ یعنی چچا آذر دوزخ میں جائے گا کہ وہ بت پرست تھا اور یہ دوزخ میں جانے والی بات لوگوں نے اتنی بڑھائی کہ حضور پاک ﷺ کے عظیم والدین کے بارے میں بھی کہہ گئے کہ وہ بھی مسلمان نہ تھے۔ (نعوذ باللہ)

یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ بن جانے ہم لوگ دوزخ اور بہشت کا فتویٰ اس جہان میں دے دیتے ہیں، اول تو اس سے گریز ضروری ہے، دوم ہمارا ایمان ہے اور ہمارے بزرگوں میں متعدد فقراؑ اور ابن اثیر نے یہ لکھا ہے کہ جس کی پشت میں نبی کا نور چلتا رہا، وہ دوزخ کی آگ میں نہ جلے گا۔ آذر اول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام نہ تھا کہ ابن اسحٰق نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح لکھا ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ آذر ہی تھا تو ضرور مسلمان ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ہر نماز کے آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی دعا کو دہراتے ہیں کہ اے رب ہمارے ماں باپ اور باقی مسلمانوں کو بخش دے۔ یہی بات حضور پاک ﷺ کے والدین کے لیے ہے کہ وہ دین حنیف کے پیرو تھے اور خدارا ہم ایسی بے ادبیوں سے بچیں۔

جناب ابوطالب رضی اللہ عنہ کی شان

اسی طرح ابوطالب کی اپنی شان ہے۔ ان کے مسلمان نہ ہونے کی روایت کا راوی جناب ابوسعید خذری رضی اللہ عنہ کو کہا گیا ہے جو انصار تھے اور روایت منسوب کرتے وقت قرآن پاک کی آیت کا ذکر ہے کہ یہ آیت جناب ابوطالب کے لیے ہے کہ ان کی بخشش نہ ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابوسعید کا نام استعمال کیا گیا کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ دوسرے راوی حضرت مشیب ہیں جن کا تعلق بنومخزوم سے تھا۔ آپ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔

ہم اس بحث کو مزید طول نہ دیں گے۔ ابن اسحاق میں واضح الفاظ میں حضور پاک ﷺ کے چچا جناب عباس رضی اللہ عنہ اس چیز کے خود راوی ہیں اور ان کے بیٹے معبد کی اولاد جو خلافت کے دعوے داروں میں نہ تھی۔ تین سو سال یہ روایت کرتے رہے کہ ان کے دادا جناب عباس رضی اللہ عنہ، جناب ابوطالب رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت وہاں موجود تھے اور آخری وقت بھی جو ان کے ہونٹ ہل رہے تھے تو وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ رہے تھے اور جناب عباس رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کو عرض کی یہ تو کلمہ پڑھ رہے ہیں تو حضور پاک ﷺ مسکرا دیئے۔

حضور پاک ﷺ شاید جناب عباس رضی اللہ عنہ کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ جناب ابو طالب تو ہمیشہ کلمہ پڑھتے رہے۔ اب جناب عباس رضی اللہ عنہ کی باری ہے اور اس دن کے بعد جناب عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا اسلام پوشیدہ رکھا لیکن بیعت عقبہ ثانی وغیرہ ثابت کرتی ہیں کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ بھی دل سے مسلمان ہو گئے تھے۔

جناب ابو طالب نے حضور پاک ﷺ کے ساتھ اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت کی۔ جب سوتے تھے کہ حضور پاک ﷺ بھی ان کے پہلو میں سوتے، جب باہر نکلتے تو حضور پاک ﷺ بھی ساتھ ہوتے تھے اور جب حضور پاک ﷺ اپنے دادا کی وفات کے بعد ان کے گھر آئے تو ساتھ برکت اور رحمت بھی آ گئی۔ جب کھانا شروع ہوتا تو جناب ابو طالب اپنی اولاد کو روک دیتے اور فرماتے۔ ''ٹھہر جاؤ، میرے بیٹے کو آنے دو، ان کی وجہ سے میرے گھر میں رحمت آ گئی ہے ورنہ تم لوگ تو کھانے سے سیر ہی نہ ہوتے تھے۔'' جب قریش کے کئی خاندانوں نے حضور پاک ﷺ کی مخالفت پر کمر باندھ لی تو جناب ابو طالب نے سو اشعار کی جو نظم فی البدیہہ پڑھ دی وہ بنو ہاشم کے بچے بچے کی زبان پر تھی اور آپ نے صاف فرما دیا۔ ''ہمیں ہماری جانوں کی قسم! چمکتی تلوار میرے ہاتھ میں ہے اور میرے خاندان کے لوگ میرے ساتھ ہیں۔ خبر دار! جو حضور پاک ﷺ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔''

علاوہ قریش کے سرداروں کے ساتھ جناب ابو طالب رضی اللہ عنہ کی ایک بحث کے الفاظ ادب کے لحاظ سے عربی زبان میں ایک شہ پارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''واللہ تم لوگ میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہے۔ یہ بڑا غریب اور ذلیل سودا ہے کہ تم کہتے ہو کہ میں اپنا بیٹا تمہیں دے دوں کہ آپ اس کو قتل کر دیں اور میں آپ کے بیٹے کی پرورش کروں۔''

جناب ابو طالب رضی اللہ عنہ کو یہ سعادت حاصل ہے کہ آپ نے سب سے پہلے حضور پاک ﷺ کی شان میں نعت کہی جس میں آپ کو پیغمبر تسلیم کیا، ایک شعر یہ ہے۔

''ہمیں محمد (ﷺ) مل گئے ہیں
اور وہ بھی حضرت موسیٰ کی طرح پیغمبر ہیں''

چنانچہ جناب ابو طالب رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کے سینکڑوں ثبوت موجود ہیں لیکن اگر کوئی صاحب پھر بھی شک میں رہے تو یہ ان کی اپنی قسمت۔ بہر حال اس پہلو کو امت میں تفرقہ بنانے کا وجوہ تو نہ بنایا جائے۔

سازش جاری تھی

یہ تجزیہ اور تبصرہ پیش کرنے کے بعد ہم پھر مدینہ شریف واپس جاتے ہیں جہاں مشکل حالات میں جناب علی رضی اللہ عنہ نے خلافت تو قبول کر لی لیکن اہل سازش کی سازش ختم نہ ہوئی تھی۔ ان میں سے چند لوگوں نے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو بھڑکایا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے سلسلہ میں کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے۔ چنانچہ دونوں عظیم صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک ملاقات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے سلسلہ میں بات کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس معاملہ پر دھیان دینے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ابھی تک مدینہ شریف میں

ان لوگوں کی تعداد بہت کافی ہے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا تھا۔صوبوں کے بارے میں مجھے کوئی خبر نہیں کہ وہاں کیا حالات ہیں جو امراٗ جس جگہ پر موجود ہیں کس حد تک حالات ان کے قابو میں ہیں اور میں ان پر کتنا بھروسہ کر سکتا ہوں۔ یہ ایسے معاملات ہیں جو فوری توجہ چاہتے ہیں اور میں پہلے ملک کے حالات ٹھیک کرلوں اور بعد میں ان معاملات پر توجہ دوں گا۔ اگر میں حالات کا جائزہ لیے بغیر پکڑ دھکڑ شروع کردوں تو اس کا ردعمل دور دور تک ہوگا اور ایک فتنہ کی بجائے کئی فتنے شروع ہو جائیں گے۔''

اس کے کچھ عرصہ بعد جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کوفہ جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کو ان دونوں عظیم صحابہ کی مشاورت کی مدینہ شریف میں ضرورت ہے اور ان کی اول کوشش یہ ہے کہ جو لوگ باہر سے آئے ہیں انہیں اپنے گھروں کو واپس کیا جائے۔ انہیں اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ جناب طلحہ و زبیر ان کی مدد کریں کہ فی الحال مدینہ شریف میں من مانی نہیں کی جاسکتی۔ مفسدین اور باغیوں کا کافی اثر ہے اور ان کے پاس طاقت بھی ہے۔

جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ یہ سننے کے بعد کوفہ تو نہ گئے لیکن وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوئی مشورہ بھی نہ دیتے تھے اور اکثر لوگوں نے اس بات کو غلط رنگ میں پیش کردیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کا دروازہ تھے اور ان کو مشورہ دینا سورج کو چراغ دکھانے والی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے فرمایا تھا کہ وہ امیر کی بجائے وزیر ہونا زیادہ پسند کریں گے اور پہلے خلیفہ آپ کے مشورہ کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگوں کا کام تھا کہ ان کے احکام کی تعمیل کرتے جاتے اور پھر نتیجے دیکھتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عامل

اب جناب علی رضی اللہ عنہ کے لیے سب سے بڑا اور مشکل مسئلہ یہ تھا کہ صوبوں میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عاملوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں۔ اکثر عامل یہ کہہ چکے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کی چاہت ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد تو ایسے لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ فتنہ وفساد میں جناب علی رضی اللہ عنہ کا بھی ہاتھ تھا۔ پہلے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا نام بھی لیتے تھے۔ لیکن اب انہوں نے تمام تر بوجھ جناب علی رضی اللہ عنہ پر ڈال دیا اور جناب علی رضی اللہ عنہ اس سلسلہ میں پیش گوئی کر چکے تھے۔ ان حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عاملوں کو تبدیل کردیں۔

جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ

جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ جو منجھے ہوئے سیاست دان تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے جناب علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کی کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عاملوں کو تبدیل نہ کیا جائے۔ اس پر جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنا نقطہ نظر جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ پر واضح کر دیا اور جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ لاجواب ہو گئے کہ سیاست صحیح علم کا سیدھا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں سوچ بچار کرنے کا وعدہ کیا اور عرض کی کہ دو تین دن کے بعد وہ حتمی رائے دیں گے۔ چنانچہ دو تین دن کے بعد جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ وہ ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ دراصل جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جناب علی کے سامنے وہ اکثر لاجواب ہو جایا کریں گے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے طریقوں کے سامنے جناب مغیرہ کے طور طریقے کوئی مقام حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور قارئین اس نکتہ کو ذہن نشین کریں۔

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے صاف گوئی سے کام لیا اور فرمایا، جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی پہلی رائے یا تجزیہ سیاسی لحاظ سے بالکل صحیح تھا۔ اب یہ دوسری رائے مصلحت کے تحت ہے کہ ہاں میں ہاں ملائی جا رہی ہے اور بے شک جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ صحیح تھے۔ اس کے بعد جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ مکہ مکرمہ چلے گئے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی مدد نہ کی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے کچھ عرصہ پہلے آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اب جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اور عظیم صحابی موجود نہ تھا جو ان کو کوئی مشورہ دے سکے۔ کچھ صحابہ کرام یعنی حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ کچھ بین بین تھے اور کچھ دل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف تھے اس لیے حالات کو سہارا نہ مل رہا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول ہر جگہ افراتفری تھی۔ پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امرأ کے خلاف شکایات تھیں، ایسی شکایات کرنے والوں کا ایک گروہ بن چکا تھا جس میں کچھ اہل سازش تھے، کچھ نادان اور کچھ تماشا بین۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے فائدے اٹھائے اور اس فکر میں تھے کہ اب کیا ہوگا۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے اور اس کا ازالہ ہونا چاہیے اور چوتھا گروہ ان سنجیدہ لوگوں کا تھا جو کہتے تھے کہ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کی جائے کہ وہ حالات کو ٹھیک کریں اور

باقی معاملات پھر طے ہوں۔

اب جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس چوتھے گروہ کے علاوہ پہلے گروہ کے نادان لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ کچھ اہل سازش نے بھی ادھر ہی پناہ حاصل کر لی۔ اور کچھ غیر جانبدار لوگ بھی وقتی طور پر جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل تھے۔ قارئین اس نکتہ کو نوٹ کریں کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو لوگ تھے، ان میں مکمل طور پر وحدت فکر نہ تھی۔

مکمل غیر جانبداری

سب سے عجیب وغریب پہلو یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے مکمل غیر جانبداری اختیار کر لی۔ ان لوگوں میں عظیم صحابہ میں سے جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص، جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، جناب زید رضی اللہ عنہ بن ثابت اور جناب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے پایہ کے لوگ تھے۔ ایسے لوگ مکمل طور پر گوشہ نشین ہو گئے اور جناب سعد رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ وہ اس صورت میں باہر نکلیں گے کہ ان کی تلوار کی آنکھیں ہوں اور وہ پہچان سکے کہ صحیح کون ہے اور غلط کون...... تاکہ وہ صرف غلط آدمی پر وار کر سکیں۔ قارئین اندازہ لگائیں کہ قوم کتنے گروہوں میں بٹ چکی تھی۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت

اب جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ خود گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر مشیر کی رائے میں اس کے ذاتی مقاصد کی جھلک ہوتی تھی اس لیے ثقہ مشیر صرف جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ باقی عاملوں کو تو تبدیل کر دیا جائے لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو نہ چھیڑا جائے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ ہر کام کسی اصول کے تحت کرتے تھے۔ وہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو کیسے رہنے دیتے۔ اول اگر عمال کو تبدیل کرنا ضروری ہے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سرفہرست ہونا چاہیے تھا کہ ان کی امارت کو بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ دوم دمشق میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات کی ایک مہم شروع کر دی تھی اور ان کی وفاداری پر نہ صرف شبہ تھا بلکہ صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل سے مخالف ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ چونکہ شام کے علاقہ کی سرحدیں ملک روم کے ساتھ ملتی ہیں اس لیے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایسے علاقہ کی ذمہ داری سنبھال لیں لیکن جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کی ذمہ داری قبول نہ کی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظیم انصار صحابی جناب سہل رضی اللہ عنہ بن حنیف کو ملک شام کے لیے عامل مقرر فرمایا۔ آپ اسلام لانے والے اولین لوگوں میں سے تھے اور انصار میں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی رضی اللہ عنہ کا عقد مواخذہ انہی سے کرایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل

سب سے پہلے جناب علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سہل رضی اللہ عنہ کو عامل بنا کر ملک شام کی طرف روانہ کیا۔ آپ جب تبوک کے مقام پر پہنچے تو وہاں پر انہیں ملک شام سے آنے والا ایک سوار دستہ ملا۔ ان لوگوں کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے متعین کیا ہوا تھا کہ ملک شام میں داخل ہونے والے ہر آدمی سے پوچھ گچھ کریں اور جس شخص کی ہمدردیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوں اس کو ملک شام میں داخل نہ ہونے دیں۔ لیکن ظاہری طور پر یہ الفاظ نہ استعمال کئے جائیں۔ چنانچہ ان سواروں نے جناب سہل رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ جناب سہل نے فرمایا کہ وہ امیر شام ہیں اور خلیفہ وقت رضی اللہ عنہ نے ان کو اس کام پر مامور کیا ہے۔ سوار کہنے لگے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کا کوئی خط ہے تو وہ دکھا کر آگے جا سکتے ہیں اگر ایسا نہیں اور اگر وہ اپنی جان کی خیر چاہتے ہیں تو واپس مدینہ شریف چلے جائیں۔ جناب سہل رضی اللہ عنہ کے پاس اتنی طاقت تو نہ تھی کہ وہ فوجی سواروں کے ساتھ لڑائی لڑتے۔ یہ سب کچھ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی تجویز سیاست کے تحت ہو رہا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا سیدھے طور پر تو انکار نہ کر رہے تھے بلکہ حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ یہ طریقہ بالواسطہ تھا کہ وہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور اس کارروائی کا یہ پہلا مظاہرہ تھا۔

جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد

مصر کے حالات عجب صورت اختیار کئے ہوئے تھے وہاں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظیم انصار صحابی جناب سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ* کے بیٹے قیس رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔ جناب سعد رضی اللہ عنہ کا ذکر پہلی کتاب میں بھی ہو چکا ہے کہ آپ خلافت کے امیدوار تھے اور سقیفہ بنو ساعدہ میں اجتماع آپ ہی کی رائے سے ہوا تھا۔ بہر حال آپ اسلام کے عظیم فرزند تھے اور آپ کے بیٹے قیس رضی اللہ عنہ بھی مانے ہوئے بہادر اور مدبر مسلمان تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ انتخاب بڑا صحیح نکلا۔ مصر کے حالات بہت خراب تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کے عامل عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح مصر کو چھوڑ چکے تھے کہ بغاوت ہو گئی تھی اور عارضی طور پر محمد بن ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے امارت سنبھال لی تھی۔

جناب قیس رضی اللہ عنہ نے بڑی مصلحت سے کام لیا۔ انہوں نے راستے میں اپنی امارت کا کسی کے سامنے ذکر نہ کیا۔ انہوں نے ایلہ (عقابہ) والا راستہ استعمال کیا اور خاموشی کے ساتھ فسطاط پہنچ گئے۔ وہاں جا کر اعلان کر دیا کہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر مقرر کیا ہے اور لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت لینے کا اعلان بھی کیا۔ کافی لوگوں نے

* جلال مصطفیٰ، صفحہ ۱۳۳، ۱۸۱، ۲۵۰ اور ۲۹۰ پر ان کا ذکر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ لیکن جو لوگ کسی تذبذب میں تھے ان کو جناب قیس رضی اللہ عنہ نے مہلت دے دی اور کہا کہ وہ سوچ لیں۔ اس طرح مصر کے کافی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر جناب قیس رضی اللہ عنہ نے مصر کی عمل داری سنبھال لی۔

عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف

جناب علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ پر جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کو عامل بنا کر بھیجا۔ وہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر تھے اور آپ کے والد عامر حضرت علی کے بھی پھوپھی زاد بھائی تھے۔ یہاں رشتہ داری تو دونوں طرف تھی لیکن حالات کے تحت جناب علی رضی اللہ عنہ ان کو تبدیل کر رہے تھے کہ غلط یا صحیح لوگوں نے ان کے خلاف شکایات کی تھیں۔ تیسری کتاب کے ساتویں باب میں ہم جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا ذکر کر چکے ہیں۔ بہرحال بصرہ میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف نے امارت سنبھال لی۔ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ چل پڑے۔ روایت ہے کہ ان کے پاس چھ لاکھ درہم کی رقم تھی اور یہ شاید ان کی اپنی ملکیت * ہو کہ انہوں نے کافی جنگوں میں حصہ لے کر مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ بہرحال بصرہ کے لوگوں نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا۔

جناب عمارہ رضی اللہ عنہ بن شہاب

جناب علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ بن شہاب کو کوفہ کا عامل مقرر کیا۔ وہ جب زبالہ کے مقام پر پہنچے تو ان کی ملاقات طلحہ رضی اللہ عنہ بن خویلد سے ہو گئی۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اس علاقے میں کوفہ کے عامل جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر تھے۔ انہوں نے جناب عمارہ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ اس علاقے میں جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے اعلان پر تمام لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی لیکن یہاں کے لوگ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے بغیر کسی اور شخص کو دیکھنا پسند نہ کریں گے اور میں تم کو یہاں سے آگے نہ جانے دوں گا۔ یہ بڑے عجیب حالات تھے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ خود بخود ایسا کر رہے تھے یا جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا حکم تھا، بہرحال جناب عمارہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ واپس لوٹنا پڑ گیا، جس کے بڑے خراب اثرات نکلے۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

جناب عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

جناب علی رضی اللہ عنہ نے یمن کے علاقے میں جناب عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کے عامل یعلی رضی اللہ عنہ بن منبہ اپنا مال و اسباب لاد کر مکہ مکرمہ روانہ ہو چکے

---

* طبقات ابن سعد کے مطابق ان فتوحات سے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارش پر بیس ہزار درہم تو جناب علی رضی اللہ عنہ کو بھی پیش کئے تھے۔

تھے۔اس لیے جناب عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔

تبصرہ:

یہ تھے وہ حالات جن سے جناب علی رضی اللہ عنہ دوچار تھے۔حضرت عثمان کی رضی اللہ عنہ شہادت نے اسلام کے مرکز کو پاش پاش کر دیا تھا۔اور فتنہ سے فتنہ نکل رہا تھا۔شام میں ایک طرح سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تسلیم نہ کیا گیا۔مصر میں کئی لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی۔ہاں،امیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرضی کا تھا۔کوفہ میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا اعلان کر دیا کہ تمام لوگوں نے برضا و رغبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا ہے۔لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے عامل واپس چلے جانے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوئی بھروسہ نہ تھا کہ وہ کوفہ کے عامل یا لوگوں پر انحصار کر سکتے ہیں یا نہیں۔بصرہ کے علاقہ کی باگ ڈور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل نے سنبھال لی لیکن بصرہ اہل سازش کا گڑھ تھا اور ان میں سے اکثر لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ جناب طلحہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔یمن کو اتنی اہمیت نہ تھی اور مدینہ کے حالات لکھے جا چکے ہیں کہ اکثر لوگ غیر جانبدار تھے۔ان حالات میں جو لوگ یہ تنقید کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو پکڑنے میں دیر کی،وہ حالات کا بغور جائزہ نہیں لیتے۔

بہر حال جناب علی رضی اللہ عنہ نے حالات کو سنبھالا دینے کی کوشش کی،انہوں نے سب عاملوں کو ہدایت کی کہ وہ حالات ٹھیک کریں۔آپ نے جناب سبرہ جہنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط بھیجا کہ نہ تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وفاداری کا اعلان کیا تھا اور نہ ان کے عامل کو اپنے علاقہ میں داخل ہونے دیا تھا۔اس لیے بہتر ہے کہ اب بھی وہ راہ راست پر آ جائیں۔جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاصد کو تین ماہ تک اپنے پاس روکے رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔آخر ربیع الاول ۳۶ ہجری میں جناب سبرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنے ایک قاصد قبیعہ عبسی کو بھی ایک خط دے کر بھیجا اور کہا کہ کچھ باتیں زبانی بھی کرنا۔خط میں صرف یہ کچھ لکھا تھا۔"علی رضی اللہ عنہ کی طرف اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے۔"یعنی خط اس لیے دیا کہ قاصد کی حیثیت تسلیم ہو جائے ورنہ بات کوئی نہ لکھی تھی۔

جناب علی رضی اللہ عنہ یہ خط دیکھ کر حیران رہ گئے اور قبیعہ عبسی سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔قبیعہ نے کہا۔"میں قاصد ہوں اور آپ میرے لیے امن کا وعدہ کریں تو حالات عرض کروں گا۔"حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔"امن ہے۔" قبیعہ کہنے لگا کہ"میں شام میں ایسے لوگوں کو چھوڑ کر آیا ہوں جو کسی طرح آپ سے راضی نہ ہوں گے یعنی آپ کو خلیفہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔میں نے ساٹھ ہزار شیوخ کو دیکھا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیض پر روتے ہیں اور

یہ قمیض لوگوں میں جوش پیدا کرنے کی غرض سے جامع دمشق کے منبر پر رکھی گئی ہے۔''

جناب علی رضی اللہ عنہ نے جواباً یہ فرمایا۔''اے اللہ میں خونِ عثمان رضی اللہ عنہ سے بری ہوں، قاتلین عثمان سے اللہ سمجھے۔''

لیکن وہاں کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھیراؤ میں شریک تھے۔ وہ پکار اٹھے کہ قبیعہ کتے کو مارو۔ قبیعہ نے کہا کہ وہ امن طلب کر چکا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے قبیلہ کے چار ہزار لوگ تیار کھڑے ہیں، اگر میرا بال بھی بیکا ہوا تو وہ بدلہ لیں گے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے معاملہ رفع دفع کر دیا کہ قاصد کو امان ہے اور قبیعہ چلا گیا لیکن وہ صحیح تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف کے شمال میں قبیعہ کے حسبی قبیلہ کے ساتھ رابطہ قائم ہوا تھا اور اگر قبیعہ کے ساتھ کوئی گڑ بڑ ہوتی تو یہ قبیلہ مدینہ کی طرف پیش قدمی ضرور کرتا۔

بدتر حالات

حالات ابھی اور بھیانک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ زمانہ جاہلیت کی طرح قبیلے اور گروہ آگے آ رہے تھے۔ بنوامیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اہل شام کو بھی ساتھ ملا لیا تھا اور باقی جگہ بھی ہمدردیاں پیدا کر رہے تھے۔ کئی قبیلوں کو بھی ساتھ ملا رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چند مخلص اور سنجیدہ لوگوں کو چھوڑ کر زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو یا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ میں شریک تھے یا گھیراؤ والوں کے حامی تھے یعنی وہ لوگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا ان کے امراء کی کسی نہ کسی طرح مخالفت کر چکے تھے وہ تمام تر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی بنتے جاتے تھے کیونکہ دمشق میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پرانے مخالفین کو ایک ایک کر کے حضرت علی کی طرف دھکیل دیا۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی شام پر لشکر کشی کی تیاری

اب جناب علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو طاقت کے ذریعے راہ راست پر لاتے اور اگر لڑائی نہ بھی ہو تو جب تک کوئی فوج وہاں نہ بھیجی جاتی دمشق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نامزد کردہ عامل کا امارت حاصل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اہل مدینہ نے حالات کو بھانپنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ردعمل معلوم کرنا شروع کر دیا اور اس سلسلہ میں زیاد رضی اللہ عنہ بن حنظلہ تمیمی، جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا کہ ان کے کیا ارادے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صاف صاف بتا دیا کہ جنگ کے بغیر چارہ نہیں۔ زیاد رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ وہ اس سلسلہ میں اور سوچیں۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زبانی کوشش تب کامیاب ہو سکے گی جب اس کی

طاقت موجود ہو۔ اور آپ نے مجاہدین جمع کرنے شروع کر دیئے۔

لیکن اہل مدینہ کو جیسے ہی پتہ چلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوئی فوج اکٹھی کرنا چاہتے ہیں تو ان میں سے اکثر نے مدینہ کو چھوڑ دیا بلکہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی کہ وہ مکہ مکرمہ میں عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو نہ روکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کے بارے میں اس وقت تک فکر مند نہ تھے اور ان کو امید بھی نہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں بھی کوئی فساد ہوسکتا ہے اور بے شک فساد تو نہ ہورہا تھا لیکن مکہ مکرمہ میں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے جنہوں نے الزام تراشی شروع کر رکھی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کر رہے۔ مروان، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر سابق گورنر بصرہ، سعید رضی اللہ عنہ بن عاص سابق گورنر کوفہ وغیرہ سب مکہ مکرمہ پہنچ چکے تھے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ بھی وہیں تھے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی مکہ مکرمہ میں تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ شریف میں لشکر اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ بن حنیفہ کے علاوہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عمرو رضی اللہ عنہ بن ابی سلمہ، عمرو رضی اللہ عنہ بن سفیان اور جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے بھتیجے ابو لیلیٰ بن عمر کو لشکر کے دستوں پر امیر مقرر فرمایا تا کہ وہ مدینہ کے گرد و نواح سے فوج اکٹھی کریں۔ پھر اپنے وفادار عاملوں کو بصرہ، کوفہ اور فسطاط میں خط لکھے کہ وہ فوج اکٹھی کر کے مدینہ شریف بھیجیں۔

تجویز میں تبدیلی

جناب علی رضی اللہ عنہ اس تیاری میں تھے کہ ان کو خبر ملی کہ مکہ مکرمہ میں لوگ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گرد اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہاں پر ایک تحریک چل رہی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا جائے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو کیوں نہیں پکڑتے۔ چنانچہ لوگ اس تحریک میں اکٹھے ہو کر مدینہ شریف کی طرف کوچ کریں گے۔ اب جناب علی رضی اللہ عنہ نے اہل مدینہ کو اکٹھا کیا اور ان کو حالات سے آگاہ کیا کہ بجائے اس کے کہ عظیم صحابہ میری مدد کرتے انہوں نے میرے ہی خلاف تحریک شروع کر دی ہے۔ اس لیے شام پر فوج کشی کرنے کا تو فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے پہلے مکہ مکرمہ چلیں اور عظیم صحابہ سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مدینہ شریف میں بھی اکثر لوگ تذبذب میں پڑ گئے اور ان کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ لیکن جناب خزیمہ * بن ثابت، زیاد بن حنظلہ اور ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہم نے لوگوں کو کچھ شرم دلائی۔ تب کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئے۔

* آپ کا مکمل ذکر تیسرے باب میں ہوگا جہاں آپ جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

تبصرہ:

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیاست کے ذریعہ سے تین ماہ کی التوا حاصل کر لی تھی۔ اب مکہ مکرمہ میں الزام تراشی کے حالات سے بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو فائدہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رخ بھی تبدیل ہو گیا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دمشق میں بیٹھ کر اپنی پوزیشن مضبوط کر رہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بصرہ کی طرف کوچ

حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ خبر ملی کہ جناب زبیر، رضی اللہ عنہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ سے بصرہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کو یہ امید تھی کہ وہاں پر زیادہ لوگ ان کی حمایت کریں گے اور وہاں سے تحریک شروع کر کے وہ طاقت کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور کریں گے۔ اب اس چیز کو بغاوت کا نام دیں یا نہ دیں، ہمیں خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں عظیم صحابہ ملوث ہیں۔ لیکن یہ طریقہ کار صحیح نہ تھا اور خود عظیم صحابہ اس تمام کارروائی پر نادم ہوئے۔ اس لیے ہمیں بھی یہ الفاظ لکھنے کی ہمت ہوئی۔

مکہ مکرمہ میں اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا وہ ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔ فی الحال اتنا کافی ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے جب یہ خبر سنی تو آپ نے فیصلہ کیا کہ اب مکہ مکرمہ کی بجائے بصرہ کا رخ کیا جائے۔ روایت ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہت روکا کہ وہ مدینہ شریف کو اس طرح نہ چھوڑیں۔ اگر مسلمانوں کا امیر مدینہ شریف سے چلا گیا تو پھر امارت مدینہ شریف میں کبھی واپس نہ آئے گی اور امام حسن رضی اللہ عنہ کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن مشیت ایزدی بھی تھی اور حالات ایسی صورت اختیار کر چکے تھے کہ یا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو جاتے یا حالات کو سنبھالا دینے کے لیے پہلے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے معاملات طے کرتے اور یہ وہ ذاتی طور پر خود ہی کر سکتے تھے۔

بہر حال ابھی ایسے ہی صلاح و مشورے جاری تھے کہ خبر ملی کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بصرہ پر قابض ہو گئے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف شکست کھا چکے ہیں۔

بصرہ میں کیا کچھ ہوا۔ وہ سب ہم اگلے باب میں بیان کریں گے کہ یہ تمام واقعات جنگ جمل کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور اگلا باب اسی موضوع پر ہے۔

نتائج واسباق

۱۔ ہمارا خیال ہے کہ قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کن حالات میں خلافت سنبھالی اور کن حالات سے دوچار ہوئے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی شخصیت تھی کہ وہ مرکز کو کچھ سہارا دیتے رہے ورنہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو حالات سے بدتر ہو جاتے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بیس سال تک بڑے پرامن طریقے سے حکومت کی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یا عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص جیسا کوئی سیاسی آدمی اس زمانے میں خلافت سنبھال لیتا تو حالات ٹھیک ہو جاتے۔ ہمارا تجزیہ ہے کہ اگر اس وقت ان میں سے کوئی اوپر آ جاتا تو اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر جناب طلحہ رضی اللہ عنہ یا جناب زبیر رضی اللہ عنہ یا جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص یا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر جیسا کوئی صحابی خلیفہ بن جاتا تو صورت حال اور زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور وہ بہت جلد خلافت سے دستبردار ہو چکے ہوتے اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا۔ اس پر وہ خود بعد میں نادم ہوئے اور قارئین اگلے صفحات پڑھنے کے بعد خود تسلیم کریں گے کہ مرکز کو ان چار سال کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو سہارا دیا۔ وہ صرف آپ ہی دے سکتے تھے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بعد میں چوبیس سال حکومت کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان چار سال کے بھیانک حالات نے لوگوں کو خاموش کر دیا لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد دس سال کے عرصہ میں حالات دوبارہ بدتر ہو گئے اور مسلمان ایک اور نئی ڈگر پر چل پڑے۔ یہ سب دراصل اسی زمانے کی آزاد فکری کا نتیجہ تھا جس کا ذکر ہم تیسری کتاب میں کر چکے ہیں۔

۲۔ اب ایسی باتوں کے کچھ لوگ بڑے عجیب و غریب تجزیے شروع کر دیتے ہیں کہ اسلام عملی طور پر صرف پہلے دو خلفاء رضی اللہ عنہم کے زمانے میں نافذ رہا یا چند سال تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں، تو پھر کیا اسلام عملی مذہب نہیں؟ معاذ اللہ ایسی بات نہیں۔ یہی تو دین فطرت کا راز ہے کہ امتحان جاری ہے اور گئے گزرے زمانے میں بھی بلند مرتبہ لوگ صراط مستقیم پر قائم رہتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جان قربان کر کے اس راستے پر رہنے کا عملی ثبوت دیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ سب قباحتوں کے باوجود اسلام کے مرکز کو چار سال سہارا دیتے رہے اور صراط مستقیم کی نشاندہی کرتے رہے اور امتحان اتنا سخت تھا کہ بڑے بڑے لوگ بھی متزلزل ہو گئے اور کئی لوگ تو مکمل طور پر دنیا کی طرف مائل ہو گئے۔

۳۔ پہلے ہی گزارش کر دی گئی ہے کہ زمانہ تبدیل ہو چکا تھا اور جناب علی رضی اللہ عنہ تبدیل شدہ حالات میں بھی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح راستے کی نشاندہی فرما رہے تھے اور جن مشکل حالات میں انہوں نے خلافت کا بوجھ سنبھالا، یہ آپ ہی کی شخصیت تھی جو ایسا کر سکی۔

۴۔ قارئین! ہم اب بہت مشکل زمانے میں داخل ہو رہے ہیں۔ قدم قدم اور لفظ لفظ میں اسباق ہیں جن پر تبصرہ سے

بات لمبی ہو جائے گی لیکن اصلی بات یاد رکھیں اپنی آزادی فکر "افلاطونی" حب دنیا، گروہ بندی، ذاتی مفاد، نادانی، سازشیوں اور دانشوروں کا روپ دھار کر ہمیں گمراہ کرنا، فلسفہ حیات سے روگردانی اور جاہلیت کے قبائلی گروہ سب چیزیں واپس آ رہی تھیں۔ حق پر عمل کرنے والے چند لوگ تھے اور بڑے بڑے عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی ماحول کے اثرات ہو جاتے تھے۔ انسان توبہ کرے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم مانگتا رہے۔

❖❖❖

دوسرا باب

جنگ جمل (ایک حادثہ)

مکہ مکرمہ کے حالات

پچھلے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ کے حالات پر اس باب میں تفصیل کے ساتھ تبصرہ پیش کیا جائے گا۔اب قارئین خود ہی اندازہ لگائیں کہ جب قوم میں وحدت فکر ختم ہو جائے تو حالات کیا صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ایسے حالات جنہیں جناب علی رضی اللہ عنہ جیسی عظیم ہستی بھی مکمل طور پر سنبھالا نہ دے سکی۔ بڑے بڑے عظیم صحابہ کو یہ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ ترجیحات کیا ہیں۔ کچھ نے تو گوشہ نشینی کو پسند کیا اور کچھ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ مضبوط کرنے کی بجائے قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح دی۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

اب لطف کی بات یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی معاملات کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں۔ آپ مکہ میں تھیں۔ جب آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کی خبر سنی تو آپ نے جناب احنف رضی اللہ عنہ بن قیس کی ایک روایت کے مطابق لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کا مشورہ دیا اور مدینہ منورہ میں افراتفری کے حالات کی خبر سن کر مکہ مکرمہ ہی میں رک گئیں۔آپ کے ساتھ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ بعد میں جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر مروان بھی مکہ شریف میں تھا۔اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں کو لوگوں کے سامنے کیا اور جگہ جگہ یہ تقریر شروع کر دی کہ ان کے مظلوم باپ کا قصاص نہیں لیا گیا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بصرہ کے عامل عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر اور یمن کے عامل یعلی رضی اللہ عنہ بن منبہ بھی وہاں آ گئے اور کوفہ کا سابق گورنر سعید رضی اللہ عنہ بن عاص بھی مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ جس نے ایک نئی تحریک شروع کی کہ اب خلافت بھی مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کو ملنی چاہیے تا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جا سکے۔

مکہ مکرمہ میں صلاح ومشورہ

چنانچہ مکہ مکرمہ میں صلاح ومشورہ کے بعد تحریک یہ شروع کی گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سلسلے میں قصاص لینا امت پر فرض ہے اور اتنے مہینے گزر گئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قصاص عثمان کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ بنوامیہ کے لوگوں نے یہ شبہہ دی کہ اب بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ کرنے والوں اور ان شہید کرنے والوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کس کی مدد سے قصاص لیتے۔ ان کے پاس صرف چند وفادار ساتھی تھے اور باقی ایسے لوگ تھے جن کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ تھیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کر چکے تھے۔

بہر حال جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے لوگوں کو اکٹھا کیا کہ وہ ایک تحریک کی صورت اختیار کریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے مجبور کریں۔ اس اکٹھ میں وحدت فکر پیدا نہ ہوسکی۔ صرف چند آدمیوں نے عظیم صحابہ کے ساتھ اتفاق کیا۔ زیادہ لوگ غیر جانبدار رہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی تھی جنہوں نے اعلان کیا کہ پہلے جناب علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں اور تمام مملکت میں امن قائم کیا جائے۔ قصاص والی بات کو اس کے بعد لایا جائے۔ یعنی پہلے فتنہ اور تفرقہ کو ختم کیا جائے اور بے شک اسلام کے لحاظ سے یہی طریقہ کار درست ہے کہ جس امیر سے کام مطلوب ہو تو پہلے اس کی اطاعت کا دم بھرا جائے۔

اب جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور جناب عائشہ صدیقہ عجیب وغریب حالات سے دوچار ہوگئے۔ وہ کھلم کھلا طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف باتیں کر چکے تھے لیکن اہل مکہ نے ان کی مدد نہ کی اور وہ اگر مدینہ شریف واپس جاتے تو ان کو نادم ہونا پڑتا۔ اس لیے ان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقید ہو چکی تھی۔ تحریک کے الفاظ کو استعمال کر لیا تھا لیکن جب اہل مکہ سے کوئی خاطر خواہ امداد نہ ملی تو عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ ان کے پاس کافی رقم موجود ہے، سفر کے لیے سواریاں اور خرچ کا بندوبست وہ کر سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ بصرہ کا رخ کیا جائے، وہاں کے لوگ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کو پسند کرتے ہیں، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کی وجہ سے کافی لوگ ہمارے ساتھ مل جائیں گے اور ہم طاقت کے ذریعے جناب علی کو مجبور کریں گے کہ یا تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا بندوبست کریں یا خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔

اس بات پر اتفاق ہوگیا لیکن اسی دوران سعید رضی اللہ عنہ بن العاص نے کہا کہ اگر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کامیاب ہو جائیں تو پھر خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے کو ملنی چاہیے۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسی کوئی بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ نوعمر لڑکوں کو خلیفہ بنایا جائے، خلیفہ وہ ہوگا جس کو امت چاہے گی اور وہ عمر

رسیدہ آدمی ہونا چاہیے۔ اس بات کا کچھ آدمیوں نے یہ مطلب لیا کہ جناب طلحہ ؓ اور جناب زبیر ؓ خلافت کے لیے اپنے آپ کو موزوں سمجھتے ہیں یا خلافت کے امیدوار ہیں اور حضرت عثمان ؓ کا قصاص ایک بہانہ ہے۔ چنانچہ وہاں پھر اختلاف پیدا ہوگیا۔

گریہ وزاری والا دن

یہ اختلافات کئی قسم کی جدائیاں لے آئے۔ اول تو جناب سعید ؓ بن عاص سابق گورنر کوفہ جناب مغیرہ ؓ بن شعبہ اور عبداللہ ؓ بن خالد وغیرہ کئی لوگوں نے جناب طلحہ ؓ اور جناب زبیر ؓ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جناب سعید ؓ بن عاص نے حضرت عثمان ؓ کے بیٹوں کو بھی روکنے کی کوشش کی کہ وہ جناب طلحہ ؓ اور جناب زبیر ؓ کا ساتھ نہ دیں۔ لیکن مروان کی کوشش کی وجہ سے حضرت عثمان ؓ کے دو بیٹے جناب ابان اور جناب ولید نے جناب طلحہ ؓ اور جناب زبیر ؓ کا ساتھ دیا۔ البتہ جناب عثمان ؓ کے دو بیٹے جناب سعید اور جناب خالد کم عمری کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے مکہ ہی میں ٹھہر گئے۔

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ہی تھیں اور ان کو بھی جناب عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے ساتھ بصرہ لے جانا چاہتی تھیں لیکن جناب عبداللہ ؓ بن عمر ؓ، ان کے بھائی نے ان کو روک لیا۔

اب ایک گروہ یعنی جناب طلحہ ؓ جناب زبیر ؓ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، بصرہ کا سابق گورنر عبداللہ ؓ بن عامر، مروان اور حضرت عثمان ؓ کے دو بیٹے وغیرہ تو بصرہ جانے کو تیار تھے اور دوسرا گروہ جن میں جناب عبداللہ بن عمر ؓ، جناب حفصہ، جناب سعید، جناب مغیرہ اور حضرت عثمان ؓ کے دو چھوٹے بیٹے شامل تھے وہ مکہ میں ٹھہر گیا۔ روایت ہے کہ جب یہ لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دونوں گروہوں میں لوگ اس قدر روئے کہ تاریخ میں اس کو گریہ زاری والا دن کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثر صحابہ کرام یا ان گروہوں میں شامل لوگ بھی بڑے مخلص تھے لیکن اختلافات نے ان کی وحدت فکر کو پاش پاش کر دیا تھا۔ گریہ زاری میں بھی وہ مخلص تھے کہ جدائی ہو رہی تھی صرف بدنی طور پر نہیں بلکہ فکری طور پر بھی۔ لیکن ہر آدمی اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہا تھا اور جب قوم کی وحدت فکر ختم ہو جائے تو ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔

امامت میں اختلاف

بہر حال بصرہ جانے والوں کو اب ہم حضرت عثمان ؓ کے خون بہا کا مطالبہ کرنے والا گروہ کہیں گے کہ ان

کے ساتھ کافی لوگ شریک ہو گئے تھے اور سازش یا فتنہ کرنے والوں میں سے بھی کئی لوگوں نے اب پینترہ بدل کر اس گروہ میں شرکت اختیار کر لی تھی۔ مکہ مکرمہ سے نکلے ہی تھے کہ ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ سب لوگ رک گئے تو مروان نے اذان دی۔ اب بحث شروع ہو گئی کہ امامت کون کرائے، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ یا جناب رضی اللہ عنہ زبیر۔ اور یہ بحث اور زیادہ اختلافات پیدا کرتی کہ ام المومنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما امامت کرائیں کہ وہ حافظ قرآن بھی ہیں۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرآن پاک کے سلسلہ میں خدمات کا ذکر تیسری کتاب کے آٹھویں باب میں بیان ہو چکا ہے۔ لیکن جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے ان کی امامت ''نظریہ ضرورت'' کے تحت تھی کہ اس گروہ کے اندر بھی کوئی وحدت فکر نہ تھی۔ ان کا اتحاد بھی منفی بنیادوں پر تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں وہ متحد تھے یا اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کا نام بھی دیا گیا ہے۔ بہر حال ہم صرف یہ کہیں گے کہ اسلام میں ہر اتحاد اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکاموں کے تحت ہونا چاہیے اور منفی بنیادوں والے اتحاد کی ضرورت نہیں اور اسی وجہ سے معاملات حل نہ ہو رہے تھے۔

چشمہ خواب کے کتے

چنانچہ یہ قافلہ بصرہ کی طرف چلتا رہا کہ ایک منزل ''چشمہ خواب'' کے نزدیک پہنچ گئے، وہاں پر آ کر کتے اس زور زور سے بھونک رہے تھے کہ سب حیران تھے، بلکہ یہ کتے دوڑ دوڑ کر آتے تھے اور قافلہ کے اوپر حملہ کرتے تھے۔ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کون سا مقام ہے۔ عرض کی گئی کہ ''چشمہ خواب''

جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ یاد آ گئی جس میں آپ نے فرمایا تھا۔ ''اے عائشہ! جب چشمہ خواب پر کتے بھونکیں گے تو تم غلطی پر ہو گی۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ ان کو اونٹ کو بٹھا دیا جائے اور اب ہم آگے نہیں جائیں گے۔ چنانچہ ایک دن وہاں پر ہی قیام کیا اس گروہ میں جو سازش والے تھے۔ انہوں نے تاڑ لیا کہ اگر جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان کا کھیل ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ڈھونگ رچایا۔ چند آدمی ایک طرف دوڑتے ہوئے آئے اور شور مچا دیا کہ خبر ملی ہے کہ جناب علی کا لشکر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس لیے یہاں سے بھاگ کر بصرہ پہنچیں کہ اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست کریں اور ایسی ہڑبونگ اور افراتفری مچائی گئی کہ جلدی میں جناب عائشہ کے اونٹ کو بھی اٹھا کر قافلہ میں شامل کر لیا کہ اب بات بچاؤ کی تھی۔ قارئین نقشہ اول پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوچ کا راستہ دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ان کا راستہ بھی الگ تھا اور شاید انہوں نے اس وقت مدینہ بھی چھوڑا تھا یا نہیں لیکن سازشی ہر جگہ کامیاب ہو رہے تھے۔

بصرہ میں بحث مباحثہ

بہر حال جناب طلحہ، جناب زبیر اور جناب عائشہ رضی اللہ عنہا جب بصرہ کے قریب پہنچے تو انہوں نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کو بصرہ بھیجا کہ جناب احنف بن قیس اور صبرہ بن شیمان وغیرہ کے ساتھ بات کریں۔ یہ لوگ شہر کے عمائدین تھے اور ان کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی اور جناب احنف پہلے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کام کر چکے تھے جس کا ذکر تیسری کتاب میں موجود ہے۔ ادھر جناب علی رضی اللہ عنہ کے عامل جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف نے عمران رضی اللہ عنہ بن حصین اور ابوالاسود دولی کو جناب عائشہ صدیقہ کی خدمت میں بھیجا کہ ان سے معلوم کریں کہ وہ کس غرض سے آئی ہیں۔ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے سلسلہ میں لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا چاہتی ہیں تو عمران وغیرہ نے کہا کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ ہیں جو حضرت کی بیعت کر چکے ہیں تو اب اس خروج یا بغاوت کا کیا مطلب ہے۔ تو دونوں عظیم صحابہ کا جواب یہ تھا کہ ''بیعت کے وقت تلوار ہمارے سر پر تھی اور بیعت اس شرط پر تھی کہ قاتلین عثمان سے قصاص لیا جائے گا۔

تبصرہ:

قارئین تھوڑی دیر کے لیے مدینہ شریف واپس چلیں کہ بیعت کن حالات کے تحت ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں تو جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ ٹھیک تھے کہ بیعت کے الفاظ شرعی حدود کو قائم کرنے کے بارے میں تھے اور شاید یہ بات عظیم صحابہ کے دل میں ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے لحاظ سے اس سلسلے میں جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کا ردعمل صحیح تھا جس کا بیان آگے آتا ہے۔

عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کا ردِ عمل

اب عمران نے واپس جا کر بصرہ کے عامل جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بصرہ کے لوگوں نے تو شہید نہیں کیا اور نہ ہی قاتل یہاں موجود ہیں، پھر ام المومنین حضرت عائشہ اور عظیم صحابی بصرہ کس کام کے لیے آئے ہیں۔ میں تو مرکز اور جناب علی رضی اللہ عنہ کا وفادار ہوں۔ چنانچہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف نے اہل بصرہ کو بڑی مسجد میں اکٹھا کر کے انہیں صحیح حالات سے آگاہ کیا اور کہا کہ ہم باہر نکل کر ام المومنین اور عظیم صحابہ کو روکیں کہ وہ واپس مدینہ چلے جائیں اور یہ معاملات جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ طے کریں۔ لیکن گورنر بصرہ کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ مسجد میں چند لوگوں نے ان کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ سازش والے ہر جگہ تفرقہ پھیلا رہے تھے۔

جناب عثمان رضی اللہ عنہ حالات کو زیادہ خراب نہ کرنا چاہتے تھے جن لوگوں پر ان کو بھروسہ تھا ان کو اکٹھا کیا اور شہر سے باہر نکل کر بصرہ میں داخلے کے راستوں کو مسدود کر دیا۔ زیادہ نفری کے ساتھ آگے بڑھ کر جناب عائشہ رضی اللہ عنہا اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کو بصرہ سے واپس ہونے کے لیے کہا آگے سے جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی وضاحت کی تو جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کے ساتھیوں میں حکیم بن جبلہ قسم کے لوگ بھی تھے۔ پہلے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ یہی حکیم بن جبلہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو گھر سے مسجد نبوی میں لے آیا تھا کہ خلافت کا فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے سب کو سخت سست کہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سخت طرف داری کی اور ساتھ ہی کہا کہ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کا کوئی حق نہ تھا کہ وہ اس طرح گھر سے باہر نکلتیں۔ اس بات پر تو تو میں میں کی وجہ سے دونوں گروہوں میں لڑائی شروع ہو گئی جس کو بڑی مشکل کے ساتھ روکا گیا اور پھر بحث شروع ہو گئی کہ معاملات کے ساتھ کیسے نپٹا جائے۔

طرفین کی بحث

اب بحث نے ایک اور شکل اختیار کر لی۔ یہ سوچنے کی بجائے کہ امت کے معاملات کو کیسے حل کیا جائے۔ انہوں نے جناب طلحہ وزبیر کے طرز عمل پر بحث شروع کر دی کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کے بعد یہ طریقہ کیوں اختیار کیا۔ جناب طلحہ وزبیر کے ساتھیوں کا جواب تھا کہ بیعت مجبوری کے تحت کی گئی ہے۔ بات تو صحیح تھی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت بھی مجبوری کے تحت سنبھالی تھی کیونکہ مرکز کو سہارا دینے کی ضرورت تھی لیکن معاملات بحث مباحثے میں تبدیل ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک وفد تشکیل دیا جائے جو مدینہ شریف جا کر معلوم کرے کہ صحیح صورت حال کیا ہے چنانچہ کعب رضی اللہ عنہ بن مسعود قاضی کے ماتحت بصرہ سے مدینہ شریف کی طرف ایک وفد بھیجا گیا۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ شریف چھوڑ چکے تھے۔

مدینہ شریف پہنچ کر کعب رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں جا کر حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید بول اٹھے کہ جناب طلحہ وزبیر نے مجبوری کی حالت میں بیعت کی۔ یہ سنتے ہی کچھ لوگوں نے جناب اسامہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا کہ وہ غلط کہتا ہے اور بڑی مشکل کے ساتھ جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ نے ان کو بچایا۔

کعب رضی اللہ عنہ جب واپس بصرہ پہنچے تو ان کی رپورٹ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں تھی۔ لیکن جب انہوں نے پوری کہانی سنائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ رپورٹ تو بین بین ہی ہے اور پھر بحث شروع ہو گئی لیکن اس دوران جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کی تعداد بڑھ چکی تھی اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں

میں اب صرف حکیم بن جبلہ رہ گئے تھے جنہوں نے جوابی حملہ کر کے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن لڑائی میں وہ خود ہی مارا گیا اور بصرہ پر جناب طلحہ وزبیر کے حامیوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ روایت ہے کہ ان تمام جھڑپوں میں تقریباً چھ سو مسلمان شہید ہو گئے۔ البتہ بصرہ پر قبضہ کر لینے کے بعد جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا اور بعد میں وہ ذی قار کے مقام پر جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوچ

پچھلے باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ شریف ہی میں خبر مل گئی تھی کہ بصرہ پر جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کا قبضہ ہونے والا ہے۔ بہرحال جناب علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف سے بصرہ کی طرف کوچ کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ پہلے کوفہ سے کچھ امداد لیں گے اور پھر بصرہ کا رخ کریں گے۔ نقشہ اول کے مطالعہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوچ کے راستے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ آپ نے مکہ والا راستہ اختیار نہ کیا۔ جناب سہل رضی اللہ عنہ بن حنیف کو مدینہ شریف میں اپنا نائب مقرر کیا اور مکہ میں قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کو عامل بنایا اور خود مدینہ شریف میں سے بڑی مشکل کے ساتھ کوئی سات سو مجاہدین اکٹھے کر سکے۔ آپ ان کو لے کر ذی قار کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ وہی ذی قار ہے جس کا ذکر پہلی کتاب میں اکثر ہوتا رہا کہ قادسیہ کی فتح کے لیے یہاں پر مسلمانوں کا پڑاؤ ہوتا تھا۔ آج بدقسمتی سے اسی مقام پر اپنوں کو راہ راست پر لانے کے لیے اکٹھ ہو رہا تھا۔

بہرحال مدینہ شریف سے چلنے کے بعد کچھ اور مجاہدین بھی جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہوتے رہے اور تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ آپ کو زیادہ امداد کوفہ کے گرد و نواح سے ملنے کی امید تھی لیکن آپ کوفہ چھاؤنی کی طرف نہ جانا چاہتے تھے۔ آپ کا رخ ذی قار کی طرف تھا اور ذی قار پہنچنے سے پہلے ہی آپ نے محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اپنے بھتیجے محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو کوفہ بھیجا کہ گورنر کوفہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو کہہ کر وہاں سے مجاہدین اکٹھے کریں لیکن جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے صاف جواب دے دیا کہ ان حالات میں کسی جنگ پر نکلنے کی بجائے وہ بیٹھے رہنے کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ ان دونوں صاحبزادوں نے جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس ذی قار جا کر یہ خبر پہنچائی بلکہ روایت ہے کہ جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی تو تو میں میں بھی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور اشتر کو جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا لیکن جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے پھر بھی تامل کیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کو جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں قائم مقام کے حقوق بھی دے دیئے تھے اور اشتر نے جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ پر واضح کیا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے قائم مقام کے طور پر وہ ان کو معزول کر سکتے ہیں۔ لیکن جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ پھر بھی کسی مدد پر تیار نہ ہوئے بلکہ غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے۔

یہ بڑی عجیب وغریب صورت حال تھی اور جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو معزول نہ کیا گیا اور ایک دفعہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ اب جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ ان سے پہلے جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ میں زید رضی اللہ عنہ بن صوحان کو قاصد بنا کر بھیجا کہ وہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ ملانے کی کوشش کرے۔ البتہ جناب ابوموسیٰ نے مکمل غیر جانبداری کا اعلان کر دیا اور جناب عائشہ کو بھی امداد دینے سے انکار کر دیا۔

بصرہ کا سابق گورنر

اس دوران ذی قار میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کئے ہوئے بصرہ کے سابق گورنر جناب عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف بھی پہنچ گئے اور آپ کو تمام حالات سے آگاہ کیا، اپنے زخم دکھائے۔ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف داری کرتے ہوئے شہید ہوئے ان کا ذکر کیا۔ خاص کر حکیم بن جبلہ کی بہادری کی بات کی اور جناب امیر المومنین کو بتایا کہ ان کے متعدد ساتھی شہید ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہداء کے لیے دعا فرمائی اور جناب عائشہ صدیقہ اور عظیم صحابہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ و جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل پر افسوس کیا۔ خاص کر اس بات پر زیادہ افسوس ہوا کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ نے بیعت کرنے کے بعد یہ سب کچھ کیا۔

قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو

کوفہ کے مقام پر صرف ایک بات امید افزا تھی اور وہ جناب قعقاع* رضی اللہ عنہ کی وہاں موجودگی تھی اور جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے تو اہل کوفہ نے تو اہل کوفہ کو صلاح دی کہ وہ اپنی تلواریں نیام میں رکھیں اور وہ ٹیکری بن جائیں جس کے سایہ کے نیچے ہر طبقہ کا مسلمان بیٹھ سکے۔ جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا مطلب مکمل غیر جانبداری سے تھا کہ کچھ بھی نہ کیا جائے لیکن ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بصرہ کے سابق گورنر نے حالات کی صحیح نشان دہی کی تھی کہ رب کعبہ اسلام کی چکی چل چکی تھی، دیکھئے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ چھ سو آدمی بصرہ میں شہید ہو چکے تھے اور لوگوں کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کون صحیح کون غلط ہے لیکن قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو نے کوفہ میں اعلان کر دیا کہ ان پر فرض ہے کہ وہ مرکز کی وفاداری کریں۔

ادھر جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سنو قریش دار الہجرت یعنی مدینہ شریف کو چھوڑ چکے تھے تو تم لوگ کسی کا ساتھ نہ دو۔ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کے خیالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جناب عبد خیر اٹھ کھڑے ہوئے اور جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ

*قعقاع رضی اللہ عنہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، پہلی تینوں کتابوں میں آپ کا ذکر کثرت سے موجود ہے۔

کی بیعت کی تھی۔'' جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے ہاں میں جواب دیا۔ اب جناب عبد خیر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کیوں توڑی جا رہی ہے؟'' تو جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ اب عبد خیر رضی اللہ عنہ نے ادھر کھڑے ہوئے بڑی پیاری تقریر کی کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان حالات میں جناب علی رضی اللہ عنہ کی مدد کرے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ اور جناب عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر بھی مسجد میں پہنچ چکے تھے۔ اب امام حسن رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر منبر سنبھال لیا۔ انہوں نے حالات کا جائزہ بڑے پیارے الفاظ میں پیش کیا اور امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ ویسے جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا رضی اللہ عنہا کے عظیم فرزند اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے جناب امام حسن رضی اللہ عنہ کے جلال و جمال کو شاید اہل کوفہ میں سے کچھ لوگ پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے اور روایت ہے کہ آپ کافی حد تک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل تھے تو جناب حسن رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر اہل کوفہ نے دیوانہ وار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ اشتر نخعی بھی نزدیک تھا اور اس کے تمام قبیلے نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کا اعلان کیا۔ اس طرح نو ہزار مجاہدین نے جناب علی رضی اللہ عنہ کی امداد کا اعلان کر دیا اور جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو کہا کہ وہ کوفہ کی امارت سے مستعفی ہو جائیں۔ دراصل کچھ لوگ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا سامان لوٹنے پر تیار ہو گئے لیکن اشتر نے انہیں منع کیا۔

لشکر کی ترتیب

امام حسن رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے لشکر کو ترتیب دی۔ جناب معقل بن بسیار کو قبیلہ اسد، کنانہ، تمیم، رباب اور مزینہ پر امیر مقرر کیا۔ قبائل قیس زیادہ تعداد میں تھے ان پر مختار ثقفی کے چچیرے بھائی سعد بن مسعود ثقفی کو امیر مقرر کیا اور مخدوج زہل کو بنو بکر، بنو تغلب اور بنو علتہ کا امیر بنایا۔ حجر بن عدی کو قبائل مذحج اور اشعریین پر امیر مقرر کیا۔ مخف بن سلیم کو قبیلہ بجیلہ، انمار، خثعم اور ازد کا امیر بنایا۔ کوفہ والوں کے چار لشکر بنائے گئے جن پر سعد بن مالک، ہند بن مالک، ہندن عمرو، شہیم بن شہاب امیر تھے اور ان چاروں پر آگے جناب قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو امیر مقرر کئے گئے۔ جنگ کی ترغیب دینے والے یعنی جو لوگ خطبات دیتے تھے ان میں عدی بن حاتم، اشتر نخعی، زید بن صوحان، حبیب بن بجنہ اور یزید بن قیس وغیرہ شامل تھے۔ زید بن صوحان کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کا پیغام لے کر ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تھے۔ لیکن اب وہ بھی جناب علی کے ساتھ شامل ہو گئے۔

ذی قار میں اجتماع

یہ تمام لشکر کوفہ سے ذی قار کی طرف کوچ کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی طرح قبیلہ

عبدالقیس کے لوگ یا دوسرے لوگ جو بصرہ میں جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کرتے تھے یا وہ لوگ جن کے رشتہ دار بصرہ کی جھڑپوں میں شہید ہو چکے تھے وہ بھی سب ذی قار کی طرف آ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ وغیرہ میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سب قبیلوں کے لوگ تھے اور اب غیر جانبدار رہنے کی بجائے ان میں سے کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے اور کچھ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنی حفاظت بہتر طور پر کر سکیں گے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے تمام مجاہدین کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ ان کی اگلی منزل بصرہ ہے۔ آپ نے تمام تر حالات کا جائزہ پیش کیا اور فرمایا کہ ''وہ خانہ جنگی نہیں چاہتے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ سے بات کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے میں قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو کو بصرہ بھیج رہا ہوں کہ وہ ام المومنین اور عظیم صحابہ کے ساتھ بات چیت کریں ہم ان کے پیچھے پیچھے کوچ کریں گے۔ اگر ہمارے ساتھ کوئی معاملہ طے کرنے کی ضرورت ہوئی تو ہم نزدیک ہی ہوں گے۔ اس طرح آپ نے جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کو بصرہ روانہ کرنے کے بعد اپنے لشکر کو بصرہ کی طرف کوچ کے احکام دیئے۔ لشکر کی تعداد پندرہ سے بیس ہزار بتائی جاتی ہے۔

جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کا وفد

جناب قعقاع رضی اللہ عنہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہونے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اے قعقاع تم صحابی ہو، میں نے تمہیں کوئی زیادہ ہدایات نہیں دیں، آپ معاملات کیسے طے کریں گے؟'' جناب قعقاع رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ ''اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! آپ حق پر ہیں اور ہمیں سب معلوم ہے اور جو بات ہمیں معلوم نہ ہو گی اس کے سلسلہ میں ہمارا اجتہاد ان شاء اللہ صحیح ہوگا۔'' جناب علی رضی اللہ عنہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور جناب قعقاع رضی اللہ عنہ جس طرح میدان جنگ کے شیر تھے، مسلمانوں میں مصالحت کرانے یا وحدت پیدا کرنے میں بھی اتنے ہی شیر تھے اس لیے وہ سیدھے ام المومنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے پوچھا۔ ''آپ کو کس چیز نے خروج پر آمادہ کیا؟'' ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ ''اختلافات اور ان کی اصلاح نے۔''

اب جناب قعقاع رضی اللہ عنہ، جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔ ''آپ لوگ اس معاملہ میں کیا کہتے ہیں؟'' انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

قعقاع: اس اصلاح کی وجہ کیا ہے اور آپ کو اس کا کیا حق حاصل ہے؟''

جناب طلحہ و زبیر: قاتلین عثمان سے قصاص لینا، اگر وہ لوگ قصاص سے بری کر دیئے جائیں تو عمل بالقرآن ترک ہو

جائے گا۔''

قعقاع رضی اللہ عنہ: آپ لوگوں نے قاتلین عثمان کا قصاص لینے کی تحریک میں بصرہ کے چھ سو مسلمانوں کو شہید کر دیا جس کی وجہ سے چھ ہزار سے زیادہ آدمی آپ کے دشمن ہو گئے۔ آپ نے اس کے بعد حرقوص بن زہیر کا تعاقب کیا تو ایسے چھ ہزار آدمیوں نے اس کو بچالیا۔ اس طرح اگر یہ عمل جاری رہا تو دشمنیاں بڑھتی جائیں گی۔ ایسی صورت میں اصلاح کہاں سے آئے گی؟''

ام المومنین حضرت عائشہ: (قعقاع سے مخاطب ہو کر) پھر تمہاری کیا رائے ہے؟''

قعقاع: اس امر کا علاج بالفعل فتنہ فرو کرنا ہے اور مصالحت سے کام لینا ہے۔ اس کے بعد قصاص کی بات ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو عافیت حاصل ہو۔ آپ لوگ خیر و برکت کی کلید ہیں ہم کو مصیبت میں نہ ڈالیں ورنہ آپ بھی آزمائش میں پڑ جائیں گے اس سے ہر دو گروہ کو نقصان پہنچے گا اور فتنہ ختم نہ ہوگا۔

اس تقریر کا جناب ام المومنین اور جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم پر بڑا اثر پڑا اور انہوں نے فرمایا کہ ''تمہاری رائے بڑی صائب ہے۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں اور ان کو ہمارے رائے سے آگاہ کریں کہ صلح ہو سکتی ہے۔''

چنانچہ جناب قعقاع رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس جا کر ان کو یہ خوشخبری سنائی۔ اس کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو اور آگے کوچ کرنے کا حکم دیا کہ بالمشافہ بات چیت ہو سکے۔ آپ قبیلہ عبدالقیس کے فرودگان سے ہوتے ہوئے زاویہ پہنچے اور وہاں سے بصرہ کی طرف کوچ کیا۔ جناب ام المومنین اور جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے لشکر نے بھی بصرہ سے نکل کر فرضہ پر پڑاؤ کیا اور پھر آگے بڑھے اور دونوں لشکر قصر کے مقام پر ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر آمنے سامنے ہو گئے۔ بصرہ کے لشکر کی تعداد بیس سے تیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔

سازش

اس سے آگے کے حالات میں کافی تضاد بیانی ہے اور حالات کی ترتیب میں مورخین نے الگ الگ آراء دی ہیں کہ پہلے کیا کچھ ہوا۔ بہر حال جس چیز پر سب مورخین اور راوی متفق ہیں، وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ میں سے کوئی بھی فریق جنگ و جدل کے خواہاں نہ تھے بلکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد سخت کوشش میں تھے کہ کسی طرح سے صلح ہو جائے۔ وہ ذاتی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت مداح تھے اور ان کو حق پر سمجھتے تھے۔ روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس سلسلہ میں ملاقات بھی کی۔ یہی حالت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تھی۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ ان کے خسر تھے کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام اسحٰق رضی اللہ عنہا ان کے نکاح میں تھیں بلکہ آپ کی وفات کے بعد امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ نکاح کیا۔ یہی حالت جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی اپنی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے

ماموں کے بیٹے بھی تھے۔

لیکن ایسے لوگ دونوں لشکروں میں شامل تھے جو جنگ چاہتے تھے۔ اول تو عبداللہ بن سبا کے فرقہ کے لوگ دونوں لشکروں میں موجود تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھیراؤ میں حصہ لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اشتر نخعی وغیرہ کی ہمدردیاں بھی ان لوگوں کے ساتھ تھیں اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر میں مروان وغیرہ چاہتے تھے کہ جنگ ہو جائے اور وہ چھپے ہاتھوں سے ایسے سازشیوں کی مدد کر رہے تھے جو جنگ چاہتے تھے۔

جناب قعقاع رضی اللہ عنہ کے وفد کے نتائج کے طور پر دونوں لشکروں میں اعلان کر دیا گیا کہ قاتلین عثمان ان کے لشکروں سے الگ ہو جائیں۔ اب قاتلین عثمان کے بڑے وسیع معنی ہونے لگے تھے اور اس پہلو کو مورخین اور راوی ٹھیک طور پر نہیں بیان کر سکے۔ بہر حال مختلف تاریخوں کے مطالعہ سے جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں اس لحاظ سے قاتلین عثمان دراصل وہ چند آدمی تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کے اندر گھس گئے تھے اور ان میں سے بھی محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ایک دو واپس آ گئے کہ وہ چند مطالبے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن دوسروں کی نیت میں فتور دیکھ کر وہ واپس آئے تھے۔ فتور والوں کی تعداد درجن بھر تھی جن میں سے تین مارے جا چکے تھے۔

لیکن اصل بات یہ تھی کہ ابھی تفتیش ہونا باقی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے اصل محرکین کون تھے ورنہ ہزار ڈیڑھ ہزار آدمی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کئے ہوئے تھے وہ سب قاتلین کے زمرہ میں نہ آتے تھے اور نہ ہی ان سب کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جا سکتا تھا لیکن حالات نے ایسا چکر کھایا کہ سب لوگ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا ان کو قاتلین عثمان کے نام سے پکارا جانا شروع کر دیا گیا اور ان میں سے بعض نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم سب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت یا قتل کے ذمہ دار ہیں بلکہ ان کے قبیلہ کے لوگ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امرأ کے مخالف کئی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں حق بجانب تھے۔ علاوہ ازیں اب بصرہ میں چھ سو آدمی مارے گئے تھے ان کے ورثا بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہمدردوں کے خلاف ہو چکے تھے۔

یہ ہے وہ پہلو جس کو مبصرین نے ہمیشہ نظر انداز کیا اور اس کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نہ آتی تھی جو غیر جانبدار یا گوشہ نشین ہو گئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد نہ کی یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غلط وقت پر قاتلین عثمان سے نپٹنے کے لیے کہہ رہے تھے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک چلائی یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ ہی تسلیم نہ کیا۔ اب ''قاتلین عثمان'' ایک گروہ تھا اور وہ ایک طاقت تھے اور ایسے لوگ دونوں لشکروں میں موجود تھے۔ جب دونوں لشکر خالی یہ اعلان کر چکے کہ ان کے ہاں قاتلین عثمان کے لیے کوئی جگہ نہیں تو یہ کوئی ایسا طریقہ نہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جن لوگوں نے گھیراؤ میں حصہ لیا تھا۔ ان کو پکڑ پکڑ کر باہر نکالا جاتا بلکہ یہ اعلان تھا، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف

بغاوت کرنے والوں میں سے کچھ لوگ ضرور الگ ہوئے لیکن کچھ خاموشی سے دونوں لشکروں میں موجود رہے اور ایسے اشخاص کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ تھا۔

قاتلین عثمان

ابن خلدون کے مطابق اشتر نخعی، عبداللہ بن سبا اور خالد بن ملجم، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود تھے اور ان کو شک تھا کہ اگر تفتیش ہوئی تو ان پر کچھ نہ کچھ بات ضرور آئے گی بلکہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں عدی بن حاتم، شرتح بن اوفی، سالم بن ثعلبہ اور علیا بن الہیثم کی ہمدردیاں بھی قاتلین عثمان کے ساتھ تھیں۔ جناب طلحہ و زبیر کے لشکروں میں قاتلین عثمان پردے اور پوشیدگی میں کام کر رہے تھے۔ دونوں لشکروں کے ایسے لوگوں نے خفیہ ملاقات کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ صلح ان کو بڑی مہنگی پڑے گی اور ان میں سے ایک ایک کو پکڑ کر تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ عدی بن حاتم نے کہا کہ سیدھے طور پر ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث نہیں اور ہم سب کو کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ ہاں جو ملوث ہیں ان کو سزا ملنی چاہیے اور اگر سب کو پکڑ کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر ہم بھی آگے سے لڑائی لڑیں گے۔

اشتر نے کہا کہ اس کی نوبت نہ آنے دی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا جائے لیکن عبداللہ بن سبا نے کہا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں کوئی اور طریقہ اختیار کرو۔

تبصرہ:

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے وہ ابن خلدون کی متعدد تاریخوں سے نچوڑ کے طور پر لکھا اور سب تاریخوں میں اشتر اور عدی بن حاتم کی اس خفیہ اور پوشیدہ میٹنگ میں ان باتوں یا اس قسم کی کچھ باتوں کا ذکر ہے لیکن دونوں کے کردار کو جانتے ہوئے مجھے ذاتی طور پر جناب عدی کی اس میٹنگ میں شرکت پر بھی شک ہے اور اشتر یہ لفظ نہ کہتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا جائے۔ خیال ہے کہ یہ محض اضافی باتیں ہیں۔ اصل میں سب شرارتیں عبداللہ بن سبا کی تھیں اور اس نے قاتلین عثمان کے گروہ کو سمجھایا کہ صلح انہیں بہت مہنگی پڑے گی اور اس نے یہ تجویز پیش کی۔

> ''تمام قاتلین عثمان اپنے اپنے قبیلوں میں شامل رہیں اور صلح کے اعلان والے دن صبح کو دونوں طرف سے قاتلین عثمان اپنے ساتھیوں کو ورغلا کر اپنے بالمقابل لشکروں پر حملہ کر دیں جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ہیں وہ شور مچائیں کہ حملہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر نے کیا اور جناب طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر والے سارا الزام حضرت علی کے لشکر والوں پر دیں۔ اس طرح جب لڑائی شروع ہو جائے گی تو اس کے بعد جو گروہ بھی فتح حاصل کرے گا اس کو ہماری ضرورت ہوگی۔''

اور آگے چل کر یہی ہوا۔ اس صلاح میں کون کون لوگ شامل تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی رائے دے دی ہے۔ لیکن ہر لشکر میں گروہوں کی حد نہ تھی جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں یہی نہیں بلکہ دونوں لشکروں کے علاوہ ایک اور گروہ بھی تھا جو بصرہ سے الگ ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ یہ جناب احنف رضی اللہ عنہ بن قیس کا گروہ تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ تیسری کتاب کے ساتویں باب میں جن فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں جناب احنف رضی اللہ عنہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت آپ مکہ میں تھے اور جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کے بعد مدینہ شریف گئے۔ وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور واپس بصرہ چلے گئے۔

اب جب ام المومنین رضی اللہ عنہا واپس بصرہ آئیں تو انہوں نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کو جناب احنف رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان کا ساتھ دے۔ جناب احنف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر چکا ہوں اور اس بیعت کو توڑنا پسند نہ کروں گا۔" اب جبکہ ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر تھا اور دوسری ام المومنین اور جناب طلحہ وزبیر کا تو جناب احنف کو غیر جانبدار ہی رہنا چاہیے تھا اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے حضرت احنف رضی اللہ عنہ کو غیر جانبدار رہنے کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ وہ خود کوئی جنگ وجدل نہیں چاہتے وہ تو جناب طلحہ اور زبیر کے ساتھ بھی ہر قیمت پر مصالحت کرنے کو تیار ہیں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی جناب طلحہ وزبیر سے بات چیت

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب طلحہ وزبیر کو بلا کر پوچھا کہ ان لوگوں نے ان کے خلاف کیوں خروج کیا ہے۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش میں شامل تھے۔ جواباً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "جن لوگوں نے ایسا کیا ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔" اس جواب پر جناب طلحہ رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ اب جناب علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر کو بلایا اور یاد کرایا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "اے زبیر! بے شک ایک دن تم ایک ایسے شخص سے لڑو گے جس پر تم ہی ظلم کرنے والے ہو گے۔" جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "مجھے یاد آ گیا ہے اور اگر آپ یہ بات پہلے یاد کرا دیتے تو میں کبھی بھی خروج نہ کرتا۔"

اس کے بعد جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی میں شامل نہ ہوں گے۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے کہا۔ "آپ جنگ سے ڈر گئے، ہمیں عجیب حالات میں چھوڑ کر یہ کہہ رہے ہیں۔" جناب زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "بیٹا! جو کچھ مرضی ہے کہہ لو، میں اس تمام معاملہ سے اب کنارہ کش ہوں۔" یہ بھی روایت ہے کہ بات چیت کے دوران جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی نظر جب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پر پڑ گئی جو نوے برس کی عمر کے قریب ہوتے ہوئے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شریک تھے تو جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث

یاد آ گئی کہ "اے عمار تم کو باغی لوگ شہید کریں گے۔" اس لیے جناب زبیر رضی اللہ عنہ اپنے لشکر میں الگ تھلگ بیٹھ گئے اور صلح کی بات چیت کا انتظار کرنے لگے۔

اہل بصرہ کا لشکر

جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جو اہل کوفہ شامل تھے، ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے لشکر میں جو اہل بصرہ شامل تھے ان میں قابل ذکر قبیلہ مضر اور رباب تھے جن کی امارت بسر کر رہے تھے۔ بنو تمیم اور بنو عمر کے لوگ بھی تھے جن کے امیر ابوالحرباتھے۔ بنو حنظلہ کی کمانڈ ہلال بن ربیع کر رہے تھے۔ بنو سلیم کے کمانڈر جناب مجاشع بن مسعود تھے، جن کا ذکر تیسری کتاب کے ساتویں باب میں خراسان کی فتح کے سلسلہ میں اکثر کیا جا چکا ہے۔ بنو عامر اور بنو غطفان کے امیر زفر بن الحارث تھے۔ قبیلہ ازد کی کمانڈ صبرۃ بن شیمان کر رہے تھے اور بنو بکر، مالک بن مشمع کے ماتحت تھے۔ بنو ناجیہ کے سردار حریث بن راشد تھے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ لشکر کی کل تعداد بیس، تیس ہزار کے لگ بھگ تھے اور تقریباً ہر قبیلہ کے لوگ دونوں لشکروں میں شامل تھے۔

صلح کا فیصلہ

صلح کی بات چیت جاری تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی۔ صلح کی شرائط ہو گئیں۔ ان شرائط کا چونکہ اعلان نہ ہوا۔ اس لیے مورخین تفصیل میں نہیں گئے کہ یہ شرطیں کیا تھیں۔ ہم بھی اس تفصیل اور تضاد بیانی کو موضوع نہیں بنانا چاہیے لیکن شرائط وہی تھیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تھے اور جناب قعقاع رضی اللہ عنہ ان کا اعلان کر چکے تھے۔ بے شک اس میں جناب علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور اس سلسلہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بیانات پہلے سے موجود تھے اس لیے یہ معاملہ بالکل اختلافی نہیں ہو سکتا۔

بہر حال شرائط کا اعلان دوسرے دن صبح سویرے ہونا تھا کہ ان پر کارروائی کی جاتی تھی۔ اس لیے دونوں طرف کے لشکر والے بڑے آرام سے سوئے اور وہ صبح کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک جنگ شروع ہو گئی

لیکن ابھی صبح کی اذانیں نہ ہوئی تھیں بلکہ پو پھٹنے کے بھی کوئی آثار نہ تھے کہ دونوں لشکر سے شور اٹھا کہ "دھوکا ہو گیا، وعدہ خلافی ہو گئی، یہ دغا بازی ہے۔"

بصرہ کے لشکر والے شور مچا رہے تھے کہ ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر نے حملہ کر دیا۔ عبداللہ بن سبا نے جو سازش تیار کی تھی وہ کامیاب ہو گئی اور دونوں لشکر گتھم گتھا ہو گئے۔

اب جناب علی ﷛ آگے بڑھے اور انہوں نے اعلان فرمایا کہ ”بے شک جناب طلحہ ﷛ اور جناب زبیر ﷛ آج دوسری دفعہ اپنے عہد سے پھر گئے ہیں اس لیے اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہیں اور انہوں نے اپنے لشکر کو ترتیب دے کر بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا۔

بصرہ کے لشکر سے جناب طلحہ ﷛ اور جناب زبیر ﷛ نکلے اور انہوں نے اعلان کیا کہ بے شک حضرت علی ﷛ اپنے وعدہ پر قائم نہ رہے لیکن ہم جنگ سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ پہلے جناب زبیر ﷛ نے میدان جنگ چھوڑ دیا اور بصرہ کا رخ کیا لیکن ایسی جگہ سے گزرے جہاں جناب احنف ﷛ کا غیر جانبدار لشکر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ وہاں ایک آدمی نے آپ کو پہچان لیا وہ عمر بن الجرموز تھا اور اس کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ ادھر اہل بصرہ اور اہل کوفہ کے درمیان جنگ شروع ہے۔ اس نے ایک جگہ جناب زبیر ﷛ کو نماز پڑھتے دیکھا اور ادھر ہی شہید کر دیا۔ جنگ ختم ہوئی تو وہی عمر، حضرت علی ﷛ کے پاس انعام لینے کے لیے پہنچا تو جناب علی ﷛ نے فرمایا کہ تم نے بغیر وجہ کے جناب زبیر ﷛ کو شہید کیا ہے اس لیے تو جہنمی ہے۔

جناب طلحہ ﷛ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے میدان جنگ ذرا دیر سے چھوڑا، اور وہ میدان جنگ سے نکلنے ہی والے تھے کہ مروان نے پوشیدگی کے ساتھ زہر میں بجھا ہوا ایک تیر ان کو مار دیا جس کی وجہ سے وہ بھی شہید ہو گئے۔

طاقت کا مرکز

حضرت علی ﷛ کا لشکر تعداد میں کم تھا لیکن لوگ ترتیب سے لڑ رہے تھے۔ اہل بصرہ کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا لیکن اس میں افراتفری تھی اور لعن وطعن بھی تھی۔ اہل کوفہ کہتے تھے کہ تم نے جنگ شروع کی۔ اہل بصرہ کہتے تم نے جنگ شروع کی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں اور اہل بصرہ نعرہ پر نعرہ لگا رہے تھے کہ ہماری ماں کی عزت کا سوال ہے اور ان کے اونٹ کی مہار کو ہاتھ لگا لگا کر اور پھر آگے بڑھ بڑھ کر شہادت حاصل کریں۔

حضرت علی ﷛ بھانپ چکے تھے کہ جنگ کسی سازش کے تحت شروع کی گئی ہے اور وہ جنگ بند کرنا چاہتے تھے لیکن اہل بصرہ اپنی جان پر کھیل رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار حملہ پہ حملہ کر رہے تھے۔ جناب علی ﷛ نے حکم دیا کہ خبردار کسی زخمی کو شہید نہ کرنا، بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرنا، کسی کا سامان نہ لوٹنا بلکہ وار بھی اس طرح کرنا کہ اگلے میں لڑنے کی سکت نہ رہے، اس کو بالکل ختم نہ کرنا وغیرہ۔

جنگ کی کارروائی

ایسی جنگوں کی تفصیل بیان کرنے کو کسی کا جی نہیں چاہتا کہ یہ سچائی بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ لیکن مجبوری ہے کہ حالات سے کچھ پردہ ضرور اٹھایا جائے تا کہ شاید ہم سبق سیکھیں کہ ایسے بھیانک حالات بھی ہو سکتے ہیں۔ دراصل جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے میدان جنگ سے چلے جانے کے بعد ایک دفعہ تو جنگ ختم ہوتی نظر آئی لیکن جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ کھڑا تھا جس کی وجہ سے اس جنگ کا نام بھی جنگ جمل پڑ گیا اور وہی طاقت کا مرکز تھا۔ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا جنگ سے فرار نہ کر سکتی تھیں اور نہ ان کو حالات کے بارے میں کچھ علم تھا لیکن آپ صلح چاہتی تھیں اور کعب بن سور کو حکم دیا کہ قرآن پاک لے کر آگے بڑھیں اور اہل کوفہ کو بتائیں کہ اس قرآن پاک کے مطابق ہمارا فیصلہ ہونا چاہیے لیکن جیسے ہی کعب رضی اللہ عنہ آگے نکلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے کسی سازش والے یعنی عبداللہ بن سبا کے چیلے نے ان کو شہید کر دیا۔

جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب یہ افسوس ناک خبر ملی تو آپ نے حضرت عثمان کو شہید کرنے والوں پر لعنت بھیجی اور پورے لشکر میں شور اٹھا جس سے اہل بصرہ کی صفیں بحال ہو گئیں۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بصرہ والے کیا کہہ رہے ہیں۔ جب لوگوں نے ان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہم بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس پر اہل کوفہ نے بھی ایک ایسا نعرہ لگایا اور اہل بصرہ پر جوابا حملہ کر دیا۔

بصرہ کے بازوؤں والے سردار عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عتبہ اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن حارث بڑی بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ درمیان میں جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ تھا اور لوگ اونٹ کے گرد شہید ہونے میں سعادت سمجھتے تھے۔ روایت کے مطابق اونٹ کے گرد بصرہ کے لشکر سے ستر مجاہد شہید ہوئے۔

شوق شہادت

اس سلسلہ میں جنرل گلب لکھتا ہے کہ مسلمان جو دنیا پر چھا چکے تھے اور موت سے محبت کرتے تھے، ان کی جنگوں میں یہ حالت ہو جاتی تھی کہ جب کوئی آدمی زخمی ہو جاتا تو وہ اور زیادہ بہادری سے لڑ کر جلد سے جلد شہادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اب پہلی دفعہ وہ آپس میں لڑ رہے تھے لیکن ہر ایک اپنے آپ کو صحیح سمجھتا تھا اور شہادت کا جذبہ اتنا ہی زیادہ تھا جو دوسری جنگوں میں ہوتا تھا۔

تبصرہ:

ہم اس پر تبصرہ کریں گے کہ غیر مسلم مسلمانوں کی تاریخ کو بھی سمجھتے ہیں اور مقصد حیات کو بھی۔ گو ان کے پیمانے

متعصب ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ اول بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانے میں مومن کے مقصد حیات پر پردے ڈالے گئے اور اب دوسو سال کی غلامی کے بعد سارا تانا بانا ہی بگڑ گیا ہے اور موت سے کراہت پیدا ہو چکی ہے۔

تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلمان کی موت مر

(اقبالؔ)

بہر حال لڑائی اس زور شور سے جاری تھی کہ اہل بصرہ لشکر میں بے ترتیبی کے باوجود بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عتاب کا بازو کٹ گیا تو وہ شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے اہل کوفہ پر حملہ آور ہوئے اور شہید ہو گئے۔ ناقہ کی مہار کو پکڑے ہوئے اسود بن ابوالجنتر ی، یزید بن قیس، عبداللہ بن رقیہ، ابوعبیدہ بن راشد اور ربیعہ وغیرہ شہید ہو چکے تھے بلکہ اونٹ کے گرد قبیلے کے قبیلے ختم ہو رہے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مروان زخموں سے نڈھال ہو کر میدان جنگ میں پڑے تھے اور جناب علی بھانپ گئے کہ یہ لڑائی تب تک ختم نہ ہو گی جب تک یہ سب کے سب ناقہ یعنی اونٹ کے گرد شہید نہ ہو جائیں۔

ناقہ پر حملہ

ان حالات میں جناب علی رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ جنگ کو ختم کرنے کا اب صرف ایک طریقہ باقی رہ گیا ہے کہ آہستہ سے جا کر جناب ام المومنین رضی اللہ عنہا کے اونٹ کو اس طرح زخمی کیا جائے کہ بھاگنے کی بجائے وہ ادھر ہی بیٹھ جائے۔ یہ کام جناب قعقاع رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کی مدد سے بڑی خوبی سے اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ورنہ بصرے والے کسی کو اونٹ کے نزدیک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ پس اونٹ کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں پر بیک وقت ایسا وار کیا گیا کہ اونٹ بیٹھ گیا۔ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے جلدی سے ہودہ کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور ہودہ کو اونٹ سے الگ کر دیا کہ اونٹ کھڑا ہونے یا لیٹنے کی کوشش کرے تو ہودے کو نقصان نہ پہنچے۔ پھر ہودے کو اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور اس پر پردہ کر دیا گیا۔ یہ حالت دیکھ کر بصرہ والوں نے بھاگنا شروع کر دیا لیکن جناب علی نے حکم دیا کہ خبردار کسی کا تعاقب نہ ہوگا۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات

اس کے بعد جناب علی خود ہودے کے پاس گئے اور ام المومنین کو سلام عرض کیا اور پوچھا۔ ”اے ماں! آپ کیسی

ہیں؟'' جناب عائشہ نے فرمایا۔ ''الحمدللہ میں خیریت سے ہوں، اللہ تعالیٰ آپ سے درگزر کرے۔'' جناب علی نے فرمایا۔ ''اور آپ سے بھی اللہ تعالیٰ درگزر کرے۔''

تبصرہ:

ان الفاظ کو تفرقہ ڈالنے والوں نے خوب اچھالا کہ دونوں ایک دوسرے کو قصوروار سمجھتے تھے اور ہر تفرقہ ڈالنے والے نے جائزہ ایسا پیش کیا کہ کسی نہ کسی طرف الزام ڈال دیا۔ قارئین! بات سیدھی تھی۔ صلح ہو چکی تھی۔ ام المومنین جناب عائشہ اور جناب طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شرائط پر صلح کر رہے تھے اور مان چکے تھے کہ وہ حق پر تھے لیکن اب جواچانک لڑائی شروع ہوگی تو جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لڑائی شروع کرائی۔ علاوہ وہ لڑائی بند کرانے میں بھی ناکام ہوئیں کہ ان کے قاصد کعب رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ ان حالات کی وجہ سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ناراض ضرور تھیں۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ آپ کو معاف کرے۔ لیکن الفاظ کو دیکھیں کہ وہ اتنے سخت نہ تھے۔ روایت ہے کہ جب جناب قعقاع رضی اللہ عنہ اور آپ کے بھائی محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حقیقت حال سے آپ کو آگاہ کیا کہ جنگ انہوں نے شروع نہ کی تھی تو آپ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا۔ ''کاش وہ آج سے بیس سال پہلے مرچکی ہوتیں۔''

دراصل حضرت علی اور ان کے لشکر والوں کو بھی جنگ کے کئی دن بعد معلوم ہوا کہ یہ جنگ کسی شرارت سے شروع ہوئی تھی لیکن پوری حقیقت تو کوئی سال بعد واضح ہوئی۔ بہرحال جیسے ہی جنگ ختم ہوئی تو جناب علی، ام المومنین رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو آپ نے بھی جواباً یہ کہا کہ آپ سے بھی اللہ تعالیٰ درگزر کرے۔ تو جناب علی، ام المومنین کو حضور پاک ﷺ کی وہ حدیث یاد دلا رہے تھے جس میں حضور پاک ﷺ نے چشمہ خواب کے کتوں کے بھونکنے کی پیش گوئی فرمائی تھی۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا کی عزت افزائی

جناب علی رضی اللہ عنہ کے احکام پر جناب محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ، جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بصرہ میں عبداللہ رضی اللہ عنہ خزاعی کے گھر لے گئے۔ جناب عبداللہ، جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے تھے اور اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے تو ان کے خاندان والوں نے ایسی عزت افزائی پر جناب علی رضی اللہ عنہ کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ عرصہ بعد جناب ام المومنین نے وہاں قیام کیا۔ پھر رجب ۳۶ ہجری میں جناب علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو حجاز روانہ کر دیا۔ چالیس خواتین معیت میں دیں اور محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ماتحت ایک فوجی دستہ ساتھ بھیجا جب یہ قافلہ وہاں سے چلا تو خود جناب علی رضی اللہ عنہ کئی میل تک

ساتھ پیدل چلتے گئے۔ پھر جناب امام حسن رضی اللہ عنہ نے ایک دن کی مسافت تک ہمراہی کی۔ آپ پہلے مکہ شریف گئیں وہاں حج تک ٹھہریں اور پھر مدینہ شریف چلی گئیں۔ آپ (رضی اللہ عنہا) کی وفات جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدینہ شریف ہی میں ہوئی۔

جنگ کے فوری نتائج

جنگ جمل ایک حادثہ ہے اس میں عبرت ہے کہ حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقا میں بھی ایسے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ اس میں بہت بڑا سبق ہے کہ اپنے اختلافات کو مسجد یا گھر کے اندر ختم کیا جائے۔ اگر ایسے اختلافات بازاروں یا میدانوں میں چلے گیے تو پھر ہم فتنہ وفساد والوں یا سازش کرنے والوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جائیں گے۔

بہرحال میدان جنگ کی عجیب وغریب حالت تھی۔ ایک روایت ہے کہ دس ہزار مسلمان شہید ہوئے جس میں نو ہزار بصرہ کے لشکر میں تھے اور ایک ہزار کوفہ کے لشکر کے۔ دوسری روایت ہے کہ چھ ہزار مجاہدین شہید ہوئے جن میں پانچ ہزار بصرہ کے لشکر تھے اور ایک ہزار کوفہ کے لشکر کے۔ ہم کسی روایت پر شک نہیں کرتے، مسلمان جذبہ شہادت سے سرشار تھے اور ضرور کافی لوگ شہید ہوئے ہوں گے، لیکن قربانی بے مقصد تھی۔

جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر سے جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور بیٹا محمد رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کو جناب محمد رضی اللہ عنہ کے ساتھ بڑا پیار تھا وہ کالی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے کئی دفعہ فرمایا۔ ''سیاہ ٹوپی والے کا خیال رکھنا۔'' لیکن بقول ابن خلدون کے میرے اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ باقی شہدأ میں جناب کعب رضی اللہ عنہ بن سور، محرز رضی اللہ عنہ بن حارث، مجاشع رضی اللہ عنہ بن مسعود اور ان کے بھائی خالد رضی اللہ عنہ قابل ذکر ہیں اور کچھ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے شہدأ میں سے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حکیم خزاعی اور ہند رضی اللہ عنہ بن ابی ہالہ قابل ذکر ہیں۔ جناب ہند ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند سے بیٹے تھے۔

شہدأ کا جنازہ

جناب علی نے سب شہدأ کی لاشوں کو اکٹھا کرایا اور دونوں طرف کے شہدأ کی نماز جنازہ پڑھی۔ شاید یہ اپنی قسم کی ایک عجیب وغریب جنگ تھی کہ دونوں طرف کے لڑنے والوں کو شہید کہا جاتا ہے کہ جنگ غلط فہمی یا حادثہ کی وجہ سے ہوئی۔ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی۔ حالات کیسے ہاتھ سے نکل گئے کہ ایک غلطی کرنے کے بعد بہتر ہوتا ہے کہ غلطی کو تسلیم کر لیا جائے ورنہ جس طرح ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے سو اور جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے اور معاملات وہیں کے وہیں رہتے

ہیں۔اسی طرح غلطی کو تسلیم نہ کرنے سے غلطیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔

جنگ جمل میں بنو امیہ کے لوگ

بنوامیہ کے متعدد لوگ اس جنگ میں جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر میں شامل تھے۔ان میں سے شہید تو کوئی نہ ہوا لیکن اکثر زخمی تھے اور انہوں نے میدان جنگ سے بھاگ کر بصرہ کے متعدد مقامات پر جا کر پناہ لی۔ان میں عتبہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ (امیر معاویہ کا سگا بھائی)،عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دو بیٹوں ابان اور ولید کے علاوہ مروان اور اس کے دو بھائی عبدالرحمٰن اور یحییٰ بھی شامل تھے۔کچھ لوگوں نے ان کو گرفتار کر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے لے آئے۔جناب علی نے سب کو رہا کر دینے کا حکم دیا بلکہ روایت ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حجاز جانے کی اجازت دے دی اور باقی سب کو اجازت دی کہ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اور اکثر ملک شام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے۔روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اکثر لوگوں نے کوشش کی کہ کم از کم مروان کو تو قید میں رکھا جائے۔لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مروان نہ ہوتا تو ام المومنین رضی اللہ عنہا چشمہ خواب سے واپس مدینہ شریف چلی جاتیں یا بعد میں صلح ہو جاتی اور مروان کسی گہری سازش میں ملوث تھا وغیرہ۔جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہ وہ لشکر کا سپہ سالار تھا اور نہ نائب۔اس کے لیے وہی احکام ہیں جو باقی لوگوں کے لیے۔مروان سامنے کھڑا تھا اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔''جامیاں جا تم نے پتہ نہیں ابھی کیا کیا کرنا ہے۔''

فقرا اور اہل نظر کا بیان

صوفیا اور فقرا کے تین سلسلے یعنی قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں ان کے لحاظ سے مروان کو چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی جو جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے رفقا کو تین دن بعد بتائی کہ ان کو مروان کی پشت میں اسلام کے تین اولعزم بادشاہ* نظر آ رہے تھے وہ مروان کو کیسے قتل کرواتے یا قید رکھتے۔بے شک تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ مروان نے بعد میں خلافت سنبھالی اور اس کی اولاد میں سے عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک وغیرہ اپنے زمانے میں دنیا کی اس وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے سربراہ تھے بلکہ جناب عمر بن عبدالعزیز بھی مروان کے پوتے تھے جن کو خلافت راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

بے شک بہترین زمانہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقا کا تھا لیکن مروان یا باقی بنوامیہ کے حکمرانوں کے زمانوں میں بھی اسلام کی عظمت، دبدبہ اور غیرت قائم رہی۔موجود آغا خان کے دادا مرحوم آغا خان نے ایک دفعہ

* حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کا لفظ استعمال نہ کیا بلکہ ملوک (بادشاہ) کا لفظ استعمال کیا۔

ہمارے دانشوروں کومشورہ دیا کہ اسلام کے پہلے سو سالوں کی تحقیق کر کے وہ پہلے سو سال والا اسلام قوم کے سامنے پیش کریں کسی نے کہہ دیا کہ بنوامیہ کا زمانہ بھی ان سو سالوں میں شامل ہے تو آغا خان نے کہا کہ بے شک وہ بھی ہماری عظمت کا زمانہ تھا۔

اور قارئین! محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر بلکہ جناب عقبہ بن نافع رحمۃ اللہ علیہم جیسے عظیم فاتح سب کے سب بنوامیہ کے زمانے میں ہوئے بلکہ ہمارے عظیم علماً امام باقر، امام جعفر صادق، امام شعبی، امام اعظم، امام مالک، امام زہری (ابن شہاب) رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے علاوہ جناب حسن بصری، جناب سفیان ثوری، جناب حبیب عجمی، جناب داؤد طائی، جناب عبداللہ بن مبارک، جناب حماد بن ابی سلیمان، جناب زید بن امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہم بھی بنوامیہ کے زمانے میں ہوئے، سلطنت اور حکومت معمولی چیزیں ہیں اصلی چیز اسلام کا صراط مستقیم ہے اور فلسفہ حیات ہے جس پر عمل کرنے والے عظیم مسلمان ہر زمانے میں موجود رہے۔

زیاد بن سمیہ

تیسری کتاب میں جناب مغیرہ بن شعبہ کے خلاف گواہی کے سلسلہ میں ہم زیاد کا ذکر کر چکے ہیں جس کو یا تو زیاد بن ابی یعنی اپنے باپ کا بیٹا کہتے تھے اور یا وہ اپنی ماں سمیہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بصرہ پہنچے تو آپ نے زیاد کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن ابوبکرہ سے زیاد کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا وہ بیعت نہ کرے گا۔ عبدالرحمٰن نے عرض کی کہ وہ بیمار ہیں۔ اور پھر زیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اس کی قابلیت کے مدنظر، اس کو امارت دینا چاہی تو زیاد نے گزارش کی کہ وہ مالی امور کا مشیر ہی ٹھیک رہے گا۔ یہاں پر بھی فقراٗ اور صوفیاٗ کے مطابق جناب علی رضی اللہ عنہ زیاد کو بڑے غور سے دیکھتے رہے لیکن کچھ کہا نہیں اور صرف مسکرا دیئے اور پھر چہرہ پر سخت سنجیدگی آ گئی۔

قارئین آگے چل کر اسی زیاد کے بیٹے عبداللہ کا ذکر ساتویں باب میں پڑھیں گے کہ سانحہ کربلا کی زیادہ ذمہ داری اسی پر آتی ہے اور کچھ بزرگوں نے لکھا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو نظر آ رہا تھا کہ زیاد کی اولاد ان کی اولاد کے ساتھ کیا کرے گی لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ نے زیاد کو مالی امور پر مقرر رکھا بلکہ زیاد، جناب علی رضی اللہ عنہ کا بہت وفادار تھا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے مستعفی ہونے کے بعد بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو جس شخص سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا وہ زیاد تھا۔ چنانچہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو زیاد بن سفیان بنا کر اپنا بھائی بنا لیا کہ روایت ہے کہ جہالت کے زمانے میں ابوسفیان بھی سمیہ کے پاس طائف میں اکثر جایا کرتے تھے اور زیاد کچھ جناب ابوسفیان کا ہم شکل بھی تھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بصرہ کی امارت

چنانچہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ پر جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا اور جو کچھ بصرہ کے خزانے میں تھا وہ اہل لشکر میں بانٹ دیا لیکن یہ رقم بہت تھوڑی تھی۔ لوگوں کو مال غنیمت یا لوٹ مار ہاتھ نہ آئی۔ غیروں کے خلاف جنگوں کے نتائج مختلف تھے۔ اب اپنوں کو کیسے لوٹا جائے۔ اس لیے جن لوگوں کو دنیا کی چاہت تھی ان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمراہی میں کشش کم ہوتی چلی گئی۔ بصرہ کے حالات ٹھیک کرنے کے بعد آپ کوفہ روانہ ہو گئے اور اسی جگہ کو اپنا دارالخلافہ یا مرکز بنایا کہ آگے ایک اور جنگ کی تیاری کرنا تھی جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا اور یہ مشیت ایزدی تھی کہ اسلام کے مرکز کو بھی حرکت کرنا تھی گو حرکت خراب حالات کے تحت ہوئی لیکن ایسی ہمت شاید کسی اور کو نہ ہوتی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے راہ نکالی اور یاد رکھیں دین اسلام متحرک دین ہے اور اس کا قافلہ رواں دواں ہے۔ ساکن اور مقامی چیزوں کی اسلامی فلسفہ میں محدود حد تک گنجائش ہے۔

نتائج واسباق

۱۔ جنگ جمل ایک حادثہ تھی اس کے نتائج واسباق پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے کہ ایسی عظیم ہستیوں کے ساتھ بھی اس قسم کے حادثے ہو سکتے ہیں۔ یہاں جناب علی کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اللہ کے شیر ہر جنگ میں دشمن کی صفوں کو چیر کر رکھ دیتے تھے۔ ان کے خطاب میں وہ رعب تھا کہ کوئی اس کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے کچھ یہ تاثر بھی لے لیا کہ آپ بڑے سخت ہیں۔ نہیں، ایسی بات نہ تھی دراصل آپ رضی اللہ عنہ دشمنوں کے لیے اشدا علی الکفار کا اور اپنوں کے لیے رحما بینھم کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔

۲۔ ایک مغربی مبصر لکھتا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جناب علی کے علم اور عمل کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے اور حیرانگی اور بڑھ جاتی ہے کہ اتنے عظیم انسان کے ساتھ ان کی قوم نے کیا برتاؤ کیا۔ بے شک مغربی مبصر کا یہ تبصرہ کافی حد تک حقیقت پسندانہ ہے اور تاریخ کے بامقصد مطالعے کے تحت ہم آگے جو جائزے پیش کر رہے ہیں ان میں یہ واضح کریں گے کہ حضرت علی اور اصحاب ثلاثہ اتنے بلند ہیں کہ ان کے مقامات کو بیان کرنا ہماری قلم کے بس سے باہر ہے۔

۳۔ بدقسمتی سے ایک طرف حسد و بغض کی وجہ سے چند غلط روایات گھڑ لی گئیں اور ان کی مدد سے غلط جائزے پیش کر دیئے گئے۔ دوسری طرف عبداللہ بن سبا کی سازش کے تحت آپ کے بارے میں ایسی باتیں مشہور کر دی گئیں جن کے بارے میں نہ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فرمایا اور نہ ہی اسلام کے پہلے سو سالوں میں آپ کی اولاد میں سے کسی نے ایسی

بات کہی۔ البتہ اللہ تعالیٰ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس زمانے میں کم از کم آپ یا حضرت عثمان کی شان کو گھٹانے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی سوائے ایک کالم نویس کے جو خود ساختہ عالم دین بھی بن گئے۔

۴۔ چند جائزے حسب ذیل ہیں:

الف: جن لوگوں نے مدینہ شریف میں آپ کی بیعت نہ کی ان سے بھی درگزر کیا۔

ب: جن لوگوں نے مدد کرنے کی بجائے آپ کے راستے میں مشکلات پیدا کیں ان کو بھی راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

ج: جنگ وجدل سے گریز کیا اور جنہوں نے آپ کی کھلم کھلا مخالفت کی ان کو بھی سمجھانے کی انتہائی کوشش کی۔

د: جو لوگ آپ کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے ان کو بھی معاف کر دیا۔ ان میں سے جو شہید ہوئے ان کی نماز جنازہ بھی ساتھ ہی پڑھائی بلکہ جو لوگ آپ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے ان کو بھی معاف کر دیا۔

ر: البتہ یہ معافی صرف اس لیے تھی کہ جناب علی کی ذات بیچ آ جاتی تھی۔ ویسے آپ اس وقت کبھی بھی معاف نہ کرتے جب کوئی آدمی اللہ اور رسول ﷺ کے خلاف فتنہ کھڑا کرتا۔ بے شک جناب کے خلاف فتنہ بھی اللہ اور رسول ﷺ کے خلاف فتنہ تھا کہ حضرت علی اسلام کے مرکز کو سہارا دے رہے تھے لیکن جناب امیر المومنین نے اپنی ذات کے بیچ آ جانے کی وجہ سے درگزر کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ امارت کی بجائے مشاورت کو پسند کرتے تھے اور خدا کرے ہم اس پہلو کو سمجھ جائیں۔

س: اگر جنگ جمل کے بعد آپ مخالفین کو تہس نہس کر دیتے تو امیر معاویہ کو بغاوت کی ہمت نہ ہوتی اور نہ کئی اور لوگ جا کر اس طرح امیر معاویہ کے لشکر میں شامل ہو جاتے۔ امیر معاویہ سمیت ایسے لوگوں کو معلوم تھا کہ شکست کی صورت میں جناب علی ان کو معاف کر دیں گے۔

ص: ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم جناب طلحہ، جناب زبیر یا جناب ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کارروائی کو بغاوت یا خروج کا نام دیں۔ ہم صرف اسی پر اکتفا کریں گے جو ام المومنین اور عظیم صحابہ نے خود زبان سے کہا اور عملی طور پر مظاہرہ بھی کیا۔ دونوں عظیم صحابہ نے اپنی غلطی تسلیم کی اور جنگ سے الگ ہو گئے۔ ام المومنین کی حجاز واپسی کی کہانی، جناب علی کی ان کی عزت افزائی، ہماری تاریخ کے درخشاں باب ہیں لیکن افسوس کہ کچھ لوگوں کو اسلام کے معطر باغ سے ایسی خوشبوئیں کم آتی ہیں۔

ض: جنگ جمل کے بعد مال غنیمت زیادہ نہ ملا۔ اس لیے دنیا کی طمع رکھنے والوں کے لیے حضرت علی میں کشش ختم ہو رہی تھی اور کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا۔ جناب علی کے پیچھے نماز پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے اور جناب

معاویہ کا دستر خوان وسیع تر ہے بلکہ لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ جناب علی کے ساتھ ملو گے تو آخرت میں فائدہ ہوگا اور جناب معاویہ کے ساتھ ملنے سے دنیا ملے گی پھر توبہ کر لیں گے اور آخرت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔

۵۔ جنگ جمل سے فائدہ صرف امیر معاویہ کو ہوا۔ سیاست کو التوا میں ڈالنے سے فائدہ ملتا ہے۔ حق کو التوا میں رکھنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہاں حق کا مقابلہ سیاست کر رہی تھی اور اس نے ایک اور التوا حاصل کر لی۔

۶۔ جناب عثمان کے قاتلین کا معاملہ الجھ گیا۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا کہ قاتلین کی تلمیح وسعت اختیار کر رہی تھی۔ جناب علی کے تمام ساتھیوں کو قاتلین عثمان کہہ کر پکارا جا رہا تھا۔ بصرہ کی پہلی جھڑپوں میں چھ سو مجاہد شہید ہوئے۔ اب کم از کم چھ ہزار مجاہد شہید ہوئے۔ حضرت عثمان کی شہادت کا مسئلہ روز بروز الجھ رہا تھا اور اس سلسلہ میں قصاص لینا مشکل کام بنتا جا رہا تھا۔

۷۔ خانہ جنگی ختم نہ ہوئی، ایک جنگ ختم ہوتی تو دوسری کی تیاری ہو جاتی۔

۸۔ جناب علی کو البتہ اتنا فائدہ ہوا کہ بصرہ اور کوفہ کے صوبے مکمل طور پر ان کی عمل داری میں آ گئے اور جناب احنف بن قیس بھی اپنے لشکر سمیت جناب علی کے ساتھ مل گئے۔

۹۔ اسلام کے مرکز کی حرکت پہلے مدینہ سے کوفہ میں ہوئی تو ایسی حرکت بھی کوئی عظیم صحابی ہی کر سکتا تھا ورنہ لوگ اعتراض کرتے تو پھر اسلام کا مرکز حرکت میں آ گیا۔ کوفہ سے دمشق پھر بغداد پھر قاہرہ اور آخر میں قسطنطنیہ اب پھر مرکز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بن رہے ہیں۔

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

(اقبالؔ)

❖❖❖

تیسرا باب

جنگ صفین

جنگ صفین کے واقعات بیان کرنے سے پہلے چند اور وضاحتیں بھی پیش کرنا ہوں گی اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ ہی کو دارالحکومت قرار دے دیا۔ مدینہ شریف دور تھا اور اندرونی حالات کچھ صحیح نہ تھے۔ کوفہ اور بصرہ کے وسیع علاقے تھے اور یہی علاقے زیادہ آباد تھے۔ ان دونوں صوبوں کی حدود کا تیسری کتاب کے دو ابواب میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے اور اسی زمانے میں علاقہ بجستان میں بھی کچھ بغاوت ہوئی جس کے لیے جناب علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے گورنر جناب عبداللہ بن عباس کو لکھا اور انہوں نے یہ بغاوت فرو کر دی۔ اس کام کے لیے چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ ربعی بن کاس عنبری کو بھیجا جنہوں نے حالات کو ٹھیک کر دیا۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو اس لیے بھی پسند کیا کہ اب ملک شام میں جناب معاویہ کی بغاوت کو فرو کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے کسی لشکر کو بھیجنے کی بجائے جناب علی رضی اللہ عنہ خود جانا چاہتے تھے کہ معاملات بڑے نازک تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ بصرہ اور کوفہ کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ہی یہ کام کرنا چاہتے تھے لیکن پچھلے باب میں جن حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ان کی وجہ سے آپ یہ کام نہ کر سکے۔

ملک مصر

مصر کے حالات کو پہلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہاں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل جناب قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے امارت سنبھال لی تھی۔ انہوں نے مصر کے حالات کو کافی ٹھیک کر لیا تھا۔ اکثر لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا۔ معاویہ بن خدیج، یزید بن الحارث اور مسلمہ بن مخلد وغیرہ نے غیر جانبدار رہنا چاہا تو جناب قیس رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ معیادی معاہدہ کر لیا اور حالات کو خراب نہ ہونے دیا۔ بہر حال جس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ کے معاملات میں الجھے ہوئے تھے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس پوزیشن میں تھے کہ مصر پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے لیکن انہوں نے سیاست سے کام لینے کی کوشش کی یعنی سیاست کے ذریعہ سے جناب قیس بن

سعد رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ بلکہ ایک خط میں یہ وعدہ کیا کہ امیر معاویہ جب امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کو شکست دے چکیں گے تو وہ عراق کی حکومت جناب قیس رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیں گے۔ علاوہ ملک حجاز میں بھی ایسے آدمی کو عامل مقرر کریں گے جو جناب قیس رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار ہو۔

جناب قیس رضی اللہ عنہ کا جواب

جناب قیس رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک مصلحت آمیز جواب دیا جس کا متن یہ ہے۔

''جناب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ تھے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کس چیز میں میری متابعت یا موافقت چاہتے ہیں۔''

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی دھمکی

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب کے طور پر بڑا سخت خط لکھا اور لڑائی کی دھمکی دی۔ خط کے الفاظ کچھ اس طرح تھے:

''میں نے تمہارا خط پڑھا، اس میں کوئی امر صاف نہیں اور کوئی چیز بھی واضح نہیں۔ میں تم کو صلح و مصالحت کے لیے بلاتا ہوں، تم اس سے دور نہ بھاگو۔ میں تمہیں لڑائی سے بچانا چاہتا ہوں۔ میرے جیسا شخص مکر و فریب میں نہیں آ سکتا اور نہ کسی حیلے میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے پاس پیادوں اور سواروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ والسلام!''

جناب قیس رضی اللہ عنہ کا ردعمل

جناب قیس رضی اللہ عنہ کوئی معمولی شخصیت نہ تھے۔ سیاست میں آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پایہ کی شخصیت تھے۔ غیرت مند اور بہادر بھی تھے لیکن سب سے بڑھ کر بہت زیادہ اصول پرست تھے۔ پھر ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو انصار میں اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا ذکر ہو چکا ہے کہ اپ بیعت عقبہ ثانی میں موجود تھے اور بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے۔ قبیلہ خزرج بلکہ تمام انصار کے سردار تھے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا۔ جناب قیس رضی اللہ عنہ نے لڑکپن میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ شریف ہجرت کرتے دیکھا اور کئی دفعہ اپنے والد کی طرف سے تحفے تحائف لے کر دربار رسالت میں حاضر ہوئے جن کو مورخین نے سعد رضی اللہ عنہ کے بادیہ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ جناب قیس رضی اللہ عنہ کا جناب علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے ساتھ بچپن سے والہانہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ اب مصلحت سے کام نہ چلے گا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا۔ اس کا اردو ترجمہ ہم تاریخ کامل ابن اثیر سے نقل کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہم اس پر تبصرہ نہ کریں گے کہ وہ لوگ ہم زمانہ تھے وہ ایک دوسرے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے کا حق رکھتے تھے کہ ان

الفاظ کے باوجود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں جناب قیس رضی اللہ عنہ سے کوئی باز پرس نہ ہوئی جس کا ذکر بعد میں ہوگا۔ خط کا متن یہ ہے۔

''مجھے تعجب ہے کہ تو مجھے فریب دینا چاہتا ہے اور تو مجھ سے یہ امید رکھتا ہے کہ میں تیرے دام فریب میں آ جاؤں گا اور تو مجھے اپنی کوششوں سے شکست دے دے گا۔ کیا تو امید رکھتا ہے کہ میں اس شخص کی اطاعت سے نکل جاؤں جو امارت کے لیے بہترین آدمیوں میں سے ہے اور زیادہ سچ کہنے والا ہے۔ وہ راہ حق کا بہت بڑا ہادی ہے اور از روئے تعلق اور اسلام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہے۔ کمال ہے تو مجھے اپنی اطاعت میں داخل ہونے کا حکم دیتا ہے کہ تو امر میں لوگوں سے بعید تر ہے اور بہت بڑا مکار اور گمراہ ہے۔ از روئے قرابت اور تعلق تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بہت دور ہے۔ گمراہ اور گمراہ کرنے والے کے لڑکے ہو اور یہ کارروائی شیطانی ہے اور تیرا یہ کہنا کہ تو سواروں اور پیادوں سے مصر کو بھر دے گا اس سے مجھے کوئی ڈر نہیں۔ ان شاء اللہ اگر ادھر آ ؤ تو تمہیں جان کے لالے پڑ جائیں گے۔''

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نئی چال

یہ خط پڑھنے کے بعد جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوگیا کہ قیس رضی اللہ عنہ بن سعد، امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو ڈگمگایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے انہوں نے ایک نئی چال چلی۔ اسی زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ جمل کے بعد کوفہ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شام کے حالات کی مخبری کے لیے جناب محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اپنے بھتیجے جناب محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو شام کی سرحد کی طرف بھیجا ہوا تھا۔ یہ دونوں اخیافی بھائی بھی تھے جس بات کا اکثر جگہوں پر ذکر ہو چکا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان نوجوانوں تک یہ بات پہنچانے کی کوشش کی کہ وہ جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد کے ساتھ خط و کتابت کر رہے ہیں اور وہ ان کو جلد اپنے ساتھ ملا لیں گے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ طریقہ کامیاب رہا اور ان دونوں نوجوانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آگاہ کیا کہ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کسی وقت بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

جناب قیس رضی اللہ عنہ کی تبدیلی اور محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تقرر

یہ خبر جب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور اشتر نخعی نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا۔ اشتر ہر معاملہ میں بڑا سخت رویہ اختیار کرتا تھا اور جناب علی رضی اللہ عنہ اگر اشتر کی باتوں کو سنتے تو شاید معاملات جلدی حل بھی ہو گئے ہوتے کہ اشتر کہتا تھا کہ تلوار کے ساتھ جلدی جلدی فیصلہ ہو جائے اور اکثر جناب علی رضی اللہ عنہ صبر کی تلقین کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کی بات مان لی کہ اس میں وزن تھا۔ اشتر کہنے لگا کہ ملک مصر

میں ایسا شخص عامل ہونا چاہیے جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دشمن ہوتا کہ ہم مصر کے معاملات سے بے فکر ہو جائیں اور ایسا شخص صرف محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کبھی بھی نہیں مل سکتا۔

چنانچہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مصر کا عامل مقرر کر دیا۔ جناب قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے امارت محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالے کی اور خود مدینہ شریف آ گئے۔ وہاں سے جناب سہل رضی اللہ عنہ بن حنیف کو ساتھ لیا اور کوفہ میں امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ یہ سب سن کر جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بہت افسوس ہوا اور فرمایا کہ یہ جلد بازی ہوگئی ہے۔ بہر حال جناب علی رضی اللہ عنہ کا بھروسہ جناب قیس پر بہت زیادہ بڑھ گیا اور جناب قیس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشیر خاص بن گئے اور آخری دم تک جناب علی رضی اللہ عنہ کے وفادار رہے بلکہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے بھی وفادار رہے۔

تبصرہ:

یہاں ایک تبصرہ بھی ضروری ہے۔ ہم فقراءٔ اور صوفیأ کا ذکر کر چکے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حالات کی پہلے سے آگاہی ہو جاتی تھی۔ اب یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ پہلو کیوں نہ معلوم ہو سکا۔ اس سلسلہ میں تیسری کتاب میں ہم جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ اول مکمل ذات صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقأ کے اس سلسلہ میں مقامات کے سلسلہ میں ہم عاجزی سے عرض کریں گے کہ وہ کہاں تک معاملات کو جانتے تھے یا مشیت ایزدی کے تحت اور بشری تقاضوں کے تحت خاموش تھے۔ یہ تبصرہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آگے آنے والے واقعات کے سلسلہ میں کئی ایسی باتیں آئیں گی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خواہش کے مطابق نہ ہوں گی یا ان کو اپنے ارادوں میں مکمل کامیابی نہ ہوگی تو وہاں پر کوئی اپنے پیمانوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روحانی اور باطنی طاقتوں کو ناپنا شروع کر دے اور اعتراض فقراءٔ اور صوفیأ پر کر دے۔

محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ناکامی

جناب محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ مصر کے گورنر کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اول تو کئی لوگ ان کو ناپسند کرتے تھے اور ایسے لوگوں میں امام حسن بھی شامل تھے۔ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں کافی حد تک ملوث تھے اور پھر انہوں نے مصر کے لوگوں کے ساتھ سختی کی۔ اب وقت کے لحاظ سے تو یہ ضرورت تھی کہ امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ جب عراق کی طرف سے شام میں امیر معاویہ کے خلاف پیش قدمی کرتے تو مصر کا گورنر عقب سے شام پر حملہ آور ہوتا لیکن جناب محمد رضی اللہ عنہ مشکل کے ساتھ مصر کے حالات کو سنبھالا دیئے ہوئے تھے۔ اگر قیس بن سعد رضی اللہ عنہ

مصر میں رہ جاتے تو وہ یقینی طور پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عقب کی طرف سے حملہ کرتے۔ یہ سبق یاد رکھا جائے کہ اوپر والی سطح پر ایک آدمی سے اتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ اگر جناب قیس رضی اللہ عنہ ہی مصر کے عامل رہتے تو آج تاریخ یکسر مختلف ہوتی۔

انصار مدینہ کی وفاداری کا ذکر ''جلال مصطفیٰ'' کے ساتویں باب اور ان کتابوں کے سلسلہ میں جا بجا موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے کہ ان کی جزا آخرت میں ہے اور ان کے لیے اس دنیا میں شہرت نہیں ہے۔

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص

ایک طرف جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس قسم کے نقصانات اٹھانے پڑ رہے تھے تو دوسری طرف بڑے بڑے سیاست دان امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہو رہے تھے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کب کا چھوڑ چکے تھے۔ اور روایت ہے کہ وہ بھی ملک شام میں پہنچ چکے تھے گو مورخین، جنگ صفین میں ان کا نام لے کر کسی کارروائی میں ان کی شرکت کا ذکر نہیں کرتے۔ ویسے آپ کے قبیلہ کے زیادہ لوگ جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ اس لیے شاید اس وقت تک جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ غیر جانبدار ہی رہے ہوں یا یہ بھی ممکن ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی موجودگی میں مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کچھ زیادہ اوپر نہ آئے ہوں، عرب کے یہ دو سیاست دان اس سے پہلے کبھی کسی محاذ پر اکٹھے نہ ہوئے۔ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام سے پہلے مصر کا دورہ کر چکے تھے جس کا ذکر تیسری کتاب میں موجود ہے۔ لیکن شاید عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی مصر کے لیے دلچسپی کے سامنے جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی دلچسپیوں کو اس رخ پر نہ جانے دیا۔

بہر حال جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شرکت اختیار کر لی۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص عمر کے لحاظ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت بڑے تھے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد کے ساتھ مل کر اسلام دشمنی میں بھی بڑا کام کر چکے تھے لیکن آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد دونوں سے پہلے اسلام لے آئے اور اسلام میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے دو خلفاء کے زمانے میں بھی جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو ہر لحاظ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر ترجیح حاصل رہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے اختلافات کا ذکر ہم نے تیسری کتاب میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا اتحاد اسلام کی تاریخ میں ایک موڑ پر چکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پہل کس نے کی اس میں بھی اختلاف ہے۔ البتہ ان حالات کی تفصیل کافی سبق آموز ہے اور ہم کم سے کم تبصرے کے ساتھ ان واقعات کا ذکر کریں گے۔

اکثر راوی کہتے ہیں کہ یہ سب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی ذاتی اختراع تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت وہ فلسطین میں تھے جب انہوں نے سنا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا تو الجھن

میں پڑ گئے۔ اکثر گنگناتے تھے۔ ''علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ آخرت ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دنیا ہے۔'' بہر حال جو کچھ بھی ہوا جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو پتہ تھا کہ جو حالات ظہور پذیر ہو رہے تھے ان میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں زیادہ وقعت نہ ہوگی۔ لوگ دنیا کی طرف مائل ہو رہے تھے، کچھ سیاست بازی تھی، ساتھ ہی آزادیٔ فکر تھی اور لوگوں کو سختی کے ساتھ دبا دینے کی ضرورت تھی لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ کے لیے ان چیزوں کی کچھ وقعت نہ تھی وہ سیدھی اور حق بات جانتے تھے اور اپنی امارت کو قائم رکھنے کے لیے لوگوں کو تہس نہس کرنے کو تیار نہ تھے۔

چنانچہ انہی دنوں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کے بڑے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ، امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کو صحیح سمجھتے تھے اور انہوں نے اپنے والد کو روکا بھی لیکن چھوٹے بیٹے محمد کا خیال تھا کہ دنیاوی زمانہ آ گیا تھا۔ بہر حال جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی باپ کا ساتھ نہ چھوڑ سکے۔ پہلے پہلے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی شک گزرا اور کئی دن تک عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی نگرانی کی۔ لیکن عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے امیر معاویہ کو کہہ دیا کہ دنیا داری کا زمانہ آ چکا تھا اور کامیابی امیر معاویہ کی ہوگی۔ لوگ آہستہ آہستہ جناب علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہوتے جائیں گے اور وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مکمل امداد کریں گے۔ اس کے بدلے ان کو مصر کی حکومت چاہیے۔

مصر اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ تیسری کتاب کے پہلے دو ابواب میں ہم ساری تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ شرط پسند تھی اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے بھی اپنی وفات سے پہلے ندامت کا اظہار کیا۔ اپنی ساری زندگی پر تبصرہ کیا اور موت سے گھبراہٹ نہ پیدا ہوئی اور اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ لیکن یہ الفاظ منہ سے ضرور نکلے کہ ''اے عمرو! تو نے آخرت کی بجائے مصر کو پسند کیا۔'' پورا بیان البتہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ان باتوں میں ہمارے لیے بڑے سبق ہیں کہ ایک دن ندامت اٹھانا پڑتی ہے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کے لیے مسائل

یہ تھے وہ حالات جن سے امیر المومنین اسد اللہ الغالب، ابوتراب جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ دو چار تھے۔ آپ نے جب خلافت سنبھالی تھی تو جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کو عرض کی تھی۔ الحرب خدمة جنگ میں بڑے دھوکے ہوتے ہیں۔ آپ اپنی تلوار پر بھروسہ کرتے ہیں اور بہادر ہیں۔ آپ ہر جگہ پر موجود نہیں ہو سکتے۔ ہر مقام پر آپ کے خلاف دھوکے اور داؤ استعمال کیے جائیں گے۔ سیاست بازی ہوگی اور پتہ نہیں کیا کیا ہوگا اور آج حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لوگ عجیب وغریب رنگ اختیار کر رہے تھے۔ وہ وقت کے لحاظ سے تبدیل ہو جاتے تھے اور اصولوں کو بھی قربان کر دیتے تھے۔

لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ پھر بھی چاہتے تھے کہ مسلمان قتل وغارت سے بچ جائیں۔ چنانچہ آپ نے مشورہ کے لیے

جریر بن عبداللہ بجیلہ گورنر ہمدان اور اشعث بن قیس گورنر آذر بائیجان کو بلایا۔ یہ دونوں صاحبان کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جناب جریر صحابی ہیں اور جنگوں میں کثرت سے شرکت کی۔ اشعث ایک دفعہ مرتد بھی ہوا لیکن پھر معاف مانگ لی اور اب وہ اکثر ہمارے ساتھ رہے گا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو امیر معاویہ کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔

جناب جریر رضی اللہ عنہ کا وفد

چنانچہ فیصلہ ہوا کہ جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بجیلہ کو دمشق بھیجا جائے اور جریر کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو راضی کریں کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کو بھول جائیں۔ اور اب امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے امت میں فتنہ ختم کر دیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایسے مواقع کی تاک میں رہتے تھے اور التوا پیدا کر کے فائدہ اٹھاتے تھے۔ انہوں نے جناب جریر رضی اللہ عنہ کو کافی عرصہ شام میں روکے رکھا اور ایسے لوگوں کے ساتھ ملاقات کرائی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص طلب کرنے پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔ جناب جریر رضی اللہ عنہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گئے۔ ادھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ بھی ارادہ تھا کہ جریر کے بارے میں جناب علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں میں شک ڈالا جائے کہ وہ شام میں زیادہ دیر اس لئے ٹھہر گئے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساز باز کرتے رہے۔

چنانچہ جب کافی عرصہ کے بعد جناب جریر واپس کوفہ آئے تو انہوں نے جناب امیر المومنین کے سامنے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اشتر بھی پاس ہی تھا۔ اس نے کہا کہ ''میرے لحاظ سے تو جریر اس کام کے لئے موزوں نہ تھے اور میں جانے کو تیار تھا لیکن مجھے نہ بھیجا گیا۔''

جناب جریر: ''اگر تم جاتے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تمہیں قتل کر دیتے کہ وہ تمہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین میں شمار کرتے ہیں۔''

اشتر: ''میں مرنے سے نہیں ڈرتا، امیر المومنین ہم کو اجازت نہیں دے رہے ورنہ ہم آپ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے کئی آدمیوں کو ٹھیک کر چکے ہوتے۔''

جناب علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو خاموش رہنے کی ہدایت کی لیکن جریر کافی رنجیدہ ہو گئے اور قرقیسیا چلے گئے۔ وہاں سے شرجیل بن السمط کندی کی وساطت سے امیر معاویہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔

تبصرہ:

جناب جریر رضی اللہ عنہ کا جائزہ بھی کسی حد تک صحیح تھا اور اشتر کا بھی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ ہر پہلو پر کھل کر بحث کی اجازت

دیتے تو ان کے ساتھیوں میں اختلاف ہو جاتا تھا جس سے بڑے بڑے فرق پڑے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ان کا حکم چلتا تھا اور اکثر لوگ اس لئے ان کے ساتھ تھے کے دنیاوی فائدہ ہوگا تو ان کے خیالات میں وحدت رہی یہ بھی اللہ کا راز ہے کہ ان حالات میں جب الدنیا والے دنیاوی طور پر کامیاب رہے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی تجویز

اب جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ملک شام کی طرف کوچ کر کے معاملات کو سختی کے ساتھ سلجھائیں۔ آپ نے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بصرہ سے بلالیا۔ وہ ایک لشکر بھی ساتھ لائے اور کوفہ میں آکر جناب امیر المومنین کے ساتھ مل گئے۔ جناب امیر المومنین نے کوفہ میں ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور ملک شام کے لئے روانہ ہو گئے۔ نقشہ دوم پر آپ کے کوچ والے راستے اور صفین کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کچھ روایت کے مطابق آپ کے لشکر کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی اور بعض نے صرف تیس ہزار بتائی ہے۔ آپ کی فوج میں ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرام اور ان کے فرزند موجود تھے۔ تقریباً چھ سو وہ صحابہ شامل تھے جنہوں نے بیعت رضوان میں حصہ لیا تھا بلکہ ستر ہ اصحاب بدر بھی شریک تھے۔

لشکر کا کوچ

جناب امیر المومنین نے زیاد بن بصر حارثی کو آٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے روانہ کیا۔ ان کے پیچھے چار ہزار رابطہ والی فوج شریح بن ہانی کے ماتحت تھی اور اس کے ذمے جناب علی رضی اللہ عنہ کے بڑے لشکر کے درمیان رابطہ کا کام کرنا تھا خود کوچ کر کے نحیلہ آئے اور وہاں سے مدائن پہنچے۔ معد بن مسعود ثقفی کو جو شہید ایران ابو عبید ثقفی کے بھائی تھے۔ مدائن میں امیر مقرر کر کے اپنا جانشین چھوڑا اور وہاں سے تین ہزار کا لشکر جناب معقل بن قیس کی سرکردگی میں موصل والے راستے روانہ کیا۔ (نقشہ دوم سے لشکر کے کوچوں کے راستوں کا مطالعہ کریں) آپ اس وقت تک صرف طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ شاید ہر طرف سے لشکروں کی پیش قدمی کی خبر سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ راہ راست پر آجائیں۔ لشکروں کو یہ بھی ہدایت تھیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی بڑی جگہ میں نہ الجھنے دیں۔ چنانچہ آپ جب رقہ پہنچے تو جناب زیاد اور جناب شریح کے لشکر بھی آکر مل گئے اور یہاں پر دریا کو عبور کرنے کے بعد آپ نے جناب زیاد رضی اللہ عنہ اور شریح رضی اللہ عنہ کو پھر آگے بھیج دیا۔

شام کی فوج سے پہلا ٹکراؤ

دونوں مقدمۃ الجیش والوں کا ٹکراؤ میر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے ایک دستہ کے ساتھ ہوا۔ جس کی کمانڈ ابو الاعور کر

رہے تھے جب جناب امیر المومنین کو یہ خبر ملی تو آپ نے اشتر کو آگے بھیجا کہ دونوں لشکروں کی کمانڈ سنبھال لیں لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ جب تک آگے اہل شام مقابلہ نہیں کرتے خود لڑائی کے لئے صف بندی کر کے عملہ نہ کرنا۔ لیکن یہاں پر ابوالاعور سلمی رضی اللہ عنہ نے لشکر کے جیش المقدمہ کو روکا تو جنگ چھڑ گئی لیکن جنگ کم تھی اور جھڑپیں زیادہ تھی بلکہ لعن طعن کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر والے اہل شام کو باغی اور گمراہ کہتے تھے اور ادھر وہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کا نام دیتے تھے۔ انہی حالات میں دوسرے دن جناب علی رضی اللہ عنہ بھی آگے پہنچ گئے اور انہوں نے جیسے ہی اشتر آگے بڑھنے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک ٹڈی دل لشکر وہاں پہنچ چکا تھا جنہوں نے دریائے فرات کے پانی پر بھی قبضہ کیا ہوا تھا۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی نرمی

جناب امیر المومنین نے جناب صعصہ رضی اللہ عنہ بن صوحان* کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ "ہم لڑائی میں پہل نہیں کرنا چاہتے اور ہم اب بھی بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مقصد آپ کے نزدیک پہنچنا تھا اور میں نے سختی سے حکم دیا تھا کہ لڑائی میں پیش رفت نہ کرنا لیکن آپ کے لشکر والوں نے ہمیں روکا تو ان کو پیچھے دھکیلنا پڑا۔ اب آپ لوگوں نے پانی پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ پانی کے مسئلہ پر خواہ مخواہ لڑائی ہو۔" امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا۔ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص پانی پر سے قبضہ اٹھانے کہ حق میں تھے لیکن عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح سابق گورنر مصر اور ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ سابق گورنر کوفہ پانی پر قبضہ کے حق میں تھے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پانی پر سے قبضہ نہ اٹھایا۔

پانی پر لڑائی

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ ابوالاعور اسلمی رضی اللہ عنہ پانی پر قابض تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشعث بن قیس کو چند ہزار سواروں کے ساتھ بھیجا کہ پانی کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیں لیکن آگے سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور یزید بن اسعد کو بھیج دیا۔ اب مجبوراً امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کو ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ آگے بھیجا اور اشتر نے ایک سخت لڑائی کے بعد دریائے فرات کے چشموں پر قبضہ کر لیا۔ اب کچھ لوگوں نے جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ شامی فوج پر پانی بند کر دیا جائے۔ اللہ کے شیر مسکرا دیئے۔ بھلا وہ ایسا کب کر سکتے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ کچھ چشموں کو خالی چھوڑ دیا جائے تاکہ

---

*جناب زید رضی اللہ عنہ کے بھائی

امیر معاویہ کے لشکر کے لوگ بغیر کسی ڈر کے آئیں اور پانی لیتے رہیں۔ سبحان اللہ کیا شان والی بات ہے۔

تبصرہ:

کہتے ہیں کہ جنگ میں اور محبت میں سب کچھ جائز ہے لیکن یہ جنگ تو اپنوں کے ساتھ تھی، مسلمان تو غیروں پر بھی پانی بند نہ کرتے تھے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہمارے لیے یہی اسباق ہیں کہ مشکل حالات میں بھی اصولوں کو نہ توڑا جائے اور غیروں کی طرح یہ نہ کہا جائے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ اسلام کی اس میں بڑائی ہے کہ ہر زمانے میں عظیم مسلمان موجود رہے اور یہ غلط تاثر ہے کہ اسلام صرف پہلے چند سال نظر آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عمل سے ہر زمانہ میں اپنے فلسفہ حیات کا اصولی اور عملی مظاہرہ کیا اور غلامی کے زمانے میں بھی غازی مرید حسین شہید اور غازی علم دین شہید جیسے عظیم مسلمان پیدا ہوئے جو ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو گئے اور ایک ہی عمل سے غازی اور شہید بن گئے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج

کچھ مورخین نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کی تعداد نوے ہزار بتائی ہے لیکن ان مورخین نے جناب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فوج کی تعداد بھی اسی ہزار بتائی ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار تھی کہ آپ اکثر ساٹھ ہزار شیوخ کا ذکر کرتے تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار فوج اکٹھی کر سکتے تھے اور اسی حساب سے ہم نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی فوج کی تعداد چالیس یا پچاس ہزار کے قریب بتائی ہے کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج سے چند ہزار کم تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں بھی کئی صحابہ کرام تھے جن میں عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، ان کا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ، عبیداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر فاروق، حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ، ضحاک رضی اللہ عنہ بن قیس، ابوالاعور اسلمی رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرہ، ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ وغیرہ شامل تھے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس بات پر مصر تھے کہ قصاص کے طور پر وہ لوگ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ کیا ان کے حوالے کر دیئے جائیں لیکن یہ ناممکن قسم کی شرط تھی اور پہلے وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی بیعت کرتے اور پھر مقدمہ دائر کرتے لیکن اب تو حالات بالکل ہی تبدیل ہو چکے تھے کہ امت گروہوں میں بٹ چکی تھی اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہو چکے تھے جو کہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل واجب تھا بلکہ یہ بھی کہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امرائیں سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سمیت کئی لوگوں کو پکڑ کر ان کی تمام جائیداد حکومت کو لے لینی چاہیے۔ اس کے علاوہ بصرہ میں کئی لوگ شہید ہو چکے تھے اور لوگوں کا خیال تھا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شہ پر مروان وغیرہ نے سازش کر

کے بصرہ میں خانہ جنگی کرائی اور لوگ شہید ہو گئے۔ ان سب کا قصاص امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنوامیہ سے لیا جائے۔

چنانچہ لوگ کہتے تھے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا ان کے خاندان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں وہ ان کی مظلومی کی بہانہ بنا کر حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ قارئین کی توجہ تیسری کتاب کے آخری ابواب کی طرف دلائی جاتی ہے جہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف میں عظیم صحابہ کو کہا کہ وہ اس بوڑھے یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کئے جاتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا تھا کہ یہ ایک غلط طرز ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وارث ساری امت ہے کہ مسلمانوں کا امیر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین ہوتا ہے اور اب چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جانشین تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی ذمہ داری ان پر تھی۔ باقی لوگ دخل اندازی کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پوزیشن کو خراب کر رہے تھے۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی صلح کی ایک اور کوشش

چنانچہ پانی پر قبضہ کر لینے کے بعد بھی جناب علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کو آگے نہ بڑھایا اور دو دن تک صبر سے کام لیا اور اس کے بعد ایک وفد تشکیل دیا جس میں اپنے قبیلہ قریش میں سے کسی کو شامل کرنے کی بجائے انصار سے بسیر بن محض، قبیلہ تمیم سے شبث بن ربعی اور ہمدان کے علاقہ سے نومسلم سعید بن قیس کو شامل کیا اور فرمایا کہ آپ لوگ لشکر شام میں جائیں اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔

چنانچہ وفد نے امیر معاویہ کے پاس پہنچ کر اول اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا اور عرض کی۔ ''اے معاویہ! امت میں تفریق نہ پیدا کرو اور خون ریزی سے باز آ جاؤ۔''

امیر معاویہ: ''ایسی نصیحت اپنے امیر، علی کو بھی کرو۔''

وفد: ''خدا کی قسم وہ اسلام کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں، وہ سابق الاسلام ہیں اور وہ حق پر ہیں۔''

امیر معاویہ: ''میں تو صرف حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ کرتا ہوں کہ سب قاتلین ہمارے حوالے کر دیئے جائیں۔''

شبث بن ربعی: ''اے معاویہ! خدا سے ڈر، حضرت عثمان کی شہادت کی ذمہ داری تمام بنوامیہ پر آتی ہے اور خاص کر تمہارے اوپر۔ تم لوگوں نے مشکل وقت میں حضرت عثمان کی کوئی مدد نہ کی کہ تم لوگ چاہتے تھے کہ حضرت عثمان شہید ہو جائیں اور ان کی شہادت کے ذریعہ سے آپ لوگ حکومت کے وارث بن جائیں۔ یہ آپ لوگوں کی سیاست ہے۔''

اس طرح کافی تلخ کلامی ہوئی۔ ہم شبث کے بیان پر زیادہ تبصرہ تو نہ کریں گے کہ وہ کوئی سخت قسم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حامی بھی نہ تھا۔ جنگ کربلا میں عمرو شمر کے لشکر میں شامل تھا جس کا ذکر ساتویں باب میں آئے گا۔

بہر حال وفد نے واپس آ کر جناب امیر المومنین کو حالات سے آگاہ کیا تو پھر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ لیکن ذوالحجہ کا مہینہ تھا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شدت سے حملہ نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوگا۔ سب مورخین اور

مصرین یہ کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر کوئی بھرپور حملہ کر دیتے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو شکست ہو گئی ہوتی۔ حملہ یا جارحانہ کارروائی صرف جناب علی رضی اللہ عنہ ہی کر سکتے تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دفاعی طرز اپنائے ہوئے تھے کہ اس وقت تک ان کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صفین کے مقام پر کوئی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ فتح کو آگے بڑھا سکتے۔ اس لیے وہ وقت گزارنے اور ٹالنے کی کوشش میں تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ "وقت" * ان کا ساتھی ہے اور وقت ہی کی وجہ سے وہ اتنا کچھ حاصل کر چکے تھے۔ اگر بصرہ میں حالات خراب نہ ہوتے تو جناب علی رضی اللہ عنہ شام میں بغاوت کب کی ختم کر چکے ہوتے۔ اسی وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مروان کو مکہ بھیجنے کی تجویز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تھی کہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ کا رخ کیا کہ ان سب واقعات سے فائدہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کو ہوا۔ جنگ میں التوا سے فائدہ ان کو ہوتا ہے جو سیاست کا داؤ استعمال کرتے ہیں۔ کلاسوٹز نے اپنی کتابوں میں اس پہلو کی خوب وضاحت کی ہے کہ التوا اچھی چیز نہیں ہے اور ہم خود کشمیر کی فائر بندی کے نتائج دیکھ چکے ہیں کہ معاملات الجھتے جا رہے ہیں۔

جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی مصالحت کی ایک اور کوشش

اب محرم ۳۷ ہجری تھی اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے مصالحت کی ایک اور کوشش کی۔ اس دفعہ شبث بن ربعی کے علاوہ وفد میں چار نئے امراُ کو بھیجا گیا جن میں عدی بن حاتم، زید بن قیس اور زیاد بن حفصہ تینوں صحابی تھے۔ اب سب لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت سمجھایا لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب سیاسی الفاظ میں تھا، کہنے لگے۔

"کمال ہے کہ تمہاری اس تقریر کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں تمہارے دوست کی اطاعت قبول کر لوں۔ سمجھوتے کبھی یک طرفہ بھی ہوتے ہیں۔ نہیں، نہیں، میرے لیے یہ ناممکن ہے۔ تمہارے دوست نے ہمارے خلیفہ کو قتل کروایا اور پھر قاتلوں کو پناہ دی۔"

اس دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ داری کی بجائے خلیفہ کا لفظ استعمال کر کے اپنے آپ کو مسلمانوں کا ایک جائز امیر ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ جو حق طلب کر رہا تھا تو شبث بن ربعی کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔

"اے معاویہ! تو باغی ہے، اللہ سے ڈر۔ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ہیں اگر وہ شہید ہو گئے تو تمہاری بغاوت پر مہر لگ جائے گی۔"

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "مجھے عمار کو شہید کرنے میں کوئی تامل نہیں۔"

* وقت سے مطلب التوا ہے۔

تبصرہ:

اب یہ بات کہاں تک صحیح ہے، سب مورخین نے ایسے ہی لکھا ہے اور ایسا صحیح ہوسکتا ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اگر جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار تھے تو جناب عمار رضی اللہ عنہ کے لیے بھی وہ ایسے الفاظ استعمال کر سکتے تھے۔ واللہ اعلم۔ بہر حال اگر یہ صحیح ہے تو پھر بھی یہ معاملہ اللہ تعالیٰ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہے۔

بہر حال جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اب ایک داؤ کھیلا۔ انہوں نے دیکھا کہ زیاد رضی اللہ عنہ بن حفصہ خاموش تھے کہ وہ فطرتاً کم گو تھے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ان کو ایک طرف الگ لے گئے اور ان کے سامنے امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کا گلہ کر کے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی امارت کا لالچ بھی دیا لیکن جناب زیاد رضی اللہ عنہ نے اونچی آواز میں جواب دے کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حیران کر دیا، ان کا جواب یہ تھا۔ ''میں موید من اللہ ہوں میں گنہ گاروں کا معین نہیں ہوسکتا اور نہ مجھے حکومت کی پرواہ ہے۔''

شامیوں کا وفد

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اندازہ لگالیا کہ وہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے کسی اور کو ساتھ نہ ملا سکیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کئی مصالحاتی وفد بھیج چکے تھے۔ اس سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ڈر لگا کہ ان کے لشکر والے ان پر تہمت لگائیں گے کہ وہ مصالحت نہیں چاہتے لیکن ان کو اصلی خوف یہ تھا کہ ان کے وفد والے جناب علی رضی اللہ عنہ کی باتوں سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اس لیے ایسے آدمیوں کو وفد میں شامل کیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل عراق کے لیے ناپسندیدہ شخصیتیں تھیں۔ ان میں ایک حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تھے جن کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراقی لشکر کے ساتھ آذربائیجان میں کئی جھگڑے ہوئے۔ دوسرے شرجیل رضی اللہ عنہ بن السمط تھے جن کی وساطت سے جناب جریر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو چھوڑ کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور تیسرے معن بن یزید تھے جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پروردہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچتے ہی حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر کر ڈالی جس کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔ ''آپ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر ڈالا۔ اگر آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ آپ نے ان کو قتل نہیں کیا تو پھر ان کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ آپ امارت چھوڑ دیں اور مسلمان جس کو چاہیں متفق ہو کر امیر بنالیں۔''

امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ اہل شام اس حد تک جاسکتے ہیں۔ انہوں نے ادھر ہی اپنے امرا کو بھی بلالیا اور فرمایا کہ ''سنو! اہل شام اس حد تک بھی جاسکتے ہیں۔'' اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک خطبے میں تمام حالات کا جائزہ پیش کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کس طرح شہید ہوئے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی کیا سیاست ہے۔ تقریراتی

رقت آمیز تھی کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے تمام امرأ کے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر شامی وفد نے ماحول میں تبدیلی لانے کی کوشش کی اور جناب علی رضی اللہ عنہ سے یہ سوال کیا۔ ''کیا آپ شہادت دیں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم نہیں مارے گئے؟''

امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''میں نہ ان کو مظلوم کہتا ہوں اور نہ ظالم۔''

شامی وفد کو بہانہ چاہیے تھا، کہنے لگے۔ ''دیکھو عجیب بات ہے جناب علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلوم بھی نہیں کہتے۔'' اور اٹھ کر چلے گئے۔ شامی وفد کے واپس ہونے پر جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی۔ ﴿انک لا تسمع الموتی فتھم مسلمون﴾ پھر اپنے ساتھیوں کو خطاب فرمایا۔ ''یہ لوگ گمراہی میں اس قدر کوشش کرتے رہیں گے جس قدر تم لوگ طلب حق اور اطاعت رب میں سعی کرو گے۔''

تبصرہ:

قارئین! ہم ان واقعات پر تبصروں سے گریز کریں گے کہ ہم تفرقہ کو بڑھانا نہیں چاہتے لیکن تاریخ کے بامقصد مطالعہ سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور قصاص ایک شرعی یا فقہی مسئلہ تھا۔ حضرت علی نے جناب حالات میں اسلام کے مرکز کو سہارا دیا اور خلافت قبول کی اس سلسلہ میں پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ بحث ہو چکی ہے لیکن اب جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ایک سیاسی مسئلہ بن چکا تھا اور لوگوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت بنوامیہ کی سازش کے تحت ہوئی جس میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شریک تھے اور اگر یہ لوگ ہم پر قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ ہونے کا الزام لگاتے ہیں کہ ہم جناب علی رضی اللہ عنہ کی مدد کر کے اسلام کے مرکز کو سہارا دے رہے ہیں تو بے شک ہم قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ پہلے ایسی بات صرف وہ لوگ کہتے تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ میں حصہ لیا تھا یا جن کے رشتہ دار بصرہ میں شہید ہو گئے تھے لیکن اب اہل شام کا رویہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں لوگوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا کہ بنوامیہ ایسا کہتے ہیں کہ ہم قاتلین عثمان ہیں تو چلو مان لیتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں۔ جب قوم سے وحدت فکر ختم ہو جائے تو پھر حالات بھی ایسے ہو جاتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

(اقبالؔ)

جنگ کے واقعات

اب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا لیکن بھر پور جنگ یا پورے لشکر سے حملہ کرنے کی بجائے جناب علی رضی اللہ عنہ نے لشکر کو دستوں میں بانٹ دیا کہ باری باری حملہ کریں گے۔ چنانچہ صفر ۳۷ ہجری میں جنگ پھر شروع ہوگئی اور جنگ کے پہلے دن امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لشکر سے اشتر علم لے کر آگے بڑھا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا لشکر مقابلہ پر آیا اور سارا دن بھر پور لڑائی ہوتی رہی۔ دوسرے دن جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہاشم[1] رضی اللہ عنہ بن عتبہ علم لے کر آگے نکلے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے ابی الاعور اسلمی نے مقابلہ کیا۔ تیسرے دن امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نوے برس کی عمر والے جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ علم لے کر آگے نکلے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو آگے نکلنے کا حکم دیا کہ وہ بھی اسی برس کی عمر کے قریب تھے۔ آپ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان کو منع کیا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یاد دلائی کہ کم از کم سیدھے طور پر تو جناب عمار رضی اللہ عنہ کے سامنے نہ جاؤ۔ لیکن یہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست تھی اور مصر کی حکمرانی کی خاطر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بقول ان خود کے آخرت کو بھول چکے تھے۔

چوتھے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے جناب محمد رضی اللہ عنہ بن حنیفہ علم لے کر آگے نکلے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آگے سے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبیداللہ[2] رضی اللہ عنہ کو علم دیا۔ یہ بھی سیاست تھی اور سارا دن بھر پور لڑائی ہوتی رہی بلکہ شام کو عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے محمد رضی اللہ عنہ بن حنیفہ کو مبارزت کی دعوت بھی دے دی اور محمد رضی اللہ عنہ آگے بڑھ رہے تھے کہ امیر المومنین نے گھوڑا دوڑا کر اپنے بیٹے کو بلا لیا گو بعد میں جنگ میں عبیداللہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ اولاد علی رضی اللہ عنہ اور اولاد عمر رضی اللہ عنہ میں دشمنی بڑھے۔

پانچویں روز جناب علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ علم لے کر آگے بڑھے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے اخیافی بھائی ولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ سابق گورنر کوفہ کو علم دیا اور بڑی خون ریز جنگ ہوئی لیکن معاملات بین بین ہی رہے۔ چھٹے دن جناب علی رضی اللہ عنہ نے پھر اشتر کو آگے بڑھایا تو مقابلہ میں حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ ہی آیا لیکن لڑائی کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہ پہنچ رہی تھی۔ امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کوئی بھر پور حملہ نہ کر رہے تھے کہ شاید کسی طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے حواریوں کو عقل آ جائے لیکن اب جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ مجبور ہو گئے اور بھر پور لڑائی کی تجویز بنائی۔

۱۔ جنگ قادسیہ میں شام کے لشکر کو لا کر شریک کیا جس کا ذکر پہلی کتاب میں موجود ہے۔

۲۔ عبیداللہ رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کی طرف سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ میں منسلک ہو چکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باقی اولاد غیر جانبدار تھی۔

بھرپور لڑائی

جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو نئے سرے سے ترتیب دی۔ میمنہ پر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن بدیل خزاعی کو مقرر کیا، میسرہ پر جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ درمیان میں قرآن پاک کے قاری تھے جن میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زید اور جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد بن عبادہ قابل ذکر ہیں۔ آگے سے حبیب رضی اللہ عنہ بن مسلمہ حسب معمول نکلا لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر نے بھرپور حملہ کر دیا جس کی وجہ سے حبیب بن مسلمہ اور شامی لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ چوکنے تھے اور لشکر کی پچھلی صفیں تیار تھیں۔ اسی دوران امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے موت پر بیعت بھی لے لی اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کرنے والی فوج پر اہل شام نے اتنا سخت حملہ کیا کہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن بدیل اور ان کے دستے گھیرے میں آ گئے۔ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے ان کی مدد کے لیے جناب سہل* رضی اللہ عنہ بن حنیف کو بھیجا تو وہاں حالات کو سنبھالا مل گیا لیکن اب میسرہ کی طرف سے حالات کچھ خراب ہو رہے تھے تو جناب علی اپنے تینوں بیٹوں جناب امام حسن رضی اللہ عنہ، جناب امام حسین رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر اس طرف بڑھے کہ آگے سے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے پرانے خادم کیسان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور جناب علی رضی اللہ عنہ کا دفاع کرتے ہوئے ان کے خادم جناب احمر شہید ہو گئے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کو غصہ نہیں آتا تھا اور خود تو وہ کسی مسلمان پر ہاتھ نہ اٹھا رہے تھے کہ شاید کون کس مجبوری کی وجہ سے ان کے خلاف جنگ میں شریک ہے لیکن یہاں کیسان کی دیدہ دلیری کو دیکھ کر آپ نے اپنے ہاتھوں سے اس کو سر سے پکڑ لیا اور زمین سے اٹھا کر ایک گیند کی طرح ایسے دور پھینک دیا کہ اس کے سب اعضا ٹوٹ گئے۔ اللہ کے شیر کی یہ طرز دیکھ کر آگے سے شامی لشکر بھاگ گیا۔

جنگ کا پانسہ تبدیل ہو چکا تھا اور اہل شام کے کچھ مزاج درست بھی ہوئے کہ دائیں بازو سے اشتر بھی ان پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ اس سے آگے پیش قدمی نہ کرنا چاہتے تھے لیکن جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن بدیل پھر آگے نکل گئے اور شام والوں کی صفوں میں اتنے دور تک گھس گئے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو گھوڑا منگوا کر اپنی پوزیشن تبدیل کرنا پڑی یعنی اہل شام کی فوج کی اگلی چار صفیں میدان جنگ چھوڑ چکی تھیں لیکن گہرائی میں جو لوگ تھے وہ موت پر بیعت کی وجہ سے ڈٹ گئے۔

اب بھرپور جنگ جاری تھی اور دوپہر کے بعد جنگ میں سخت شدت آ گئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جناب عبیداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور مشہور صحابی ذوالکلاح رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے

*ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقد مواخذہ تھا، شام میں ان کو عامل مقرر کرنے کا ذکر ہو چکا ہے۔

جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود میسرہ کی طرف مصروف ہیں تو وہ بھی جذبہ جہاد کی وجہ سے اگلی صفوں میں پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ آپ کی عمر نوے برس کے قریب تھی اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے صرف ایک دن آپ کو علم دے کر لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت اس لیے دی کہ اہل شام پر واضح ہو کہ جناب عمار رضی اللہ عنہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود ہیں۔

جناب عمار رضی اللہ عنہ کا خطبہ

کتابوں کے اس سلسلہ میں اس پہلو کی اکثر وضاحت کردی گئی ہے کہ جب شہادت کا تحفہ پیش ہونے والا ہوتو اس سے چند لمحے یا چند دن پہلے اللہ تعالیٰ شہید کو ایک خاص نشے میں مخمور کر دیتا ہے۔ کسی کے لیے یہ عطا تھوڑے وقت کے لیے ہوتی ہے اور کئی عظیم شہداُ زیادہ دن اس نشے میں مخمور رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی ادا کو کسی قلم سے بیان کرنا مشکل ہے چنانچہ ایسے ہی نشہ میں مخمور جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے تلوار ہاتھ میں لی اور پکار اٹھے۔

''اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تیری مرضی اس میں ہے کہ میں اپنے آپ کو دریا میں پھینک دوں تو میں بے شک ایسا ہی کرتا۔ اے اللہ! تجھے یہ معلوم ہے کہ اگر میں جانتا کہ تیری خوشنودی اس میں ہے کہ تلوار کی دھار اپنے پیٹ پر رکھ لوں اور اس کو اس زور سے دباؤں کہ پشت سے نکل آئے تو میں بلاشبہ ایسا ہی کرتا۔ اے اللہ! آج میں ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ تو ان فاسقوں کی جنگ سے زیادہ اس سے راضی ہو۔''

پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا۔

''کوئی شخص ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا خواہش مند ہو تو پھر اسے مال اولاد کی طرف واپس جانے کی امید نہ رکھنی چاہیے۔''

مجاہدین کا جذبہ جہاد

جناب عمار کے یہ الفاظ سن کر متعدد مجاہدین نے نعرۂ تکبیر بلند کیا لیکن کسی میدان جنگ میں پہلی دفعہ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے آج نعرۂ تکبیر کے بعد یا رسول اللہ کے علاوہ ''یا علی'' کا نعرہ لگا دیا۔ عاشق رسول جناب عمار رضی اللہ عنہ کی یاد میں آج بھی کئی پہلوان یا فوجی ''یا علی'' کا نعرہ لگاتے ہیں۔

علاوہ ایک اور روایت ہے کہ کچھ مجاہدین نے یہ بھی کہا۔ ''آؤ آگے بڑھیں اور ایسے لوگوں پر حملہ کر دیں جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کو سیاسی مسئلہ بنا کر مکر وفریب کیا ہے۔'' ان حملہ کرنے والے مجاہدین کی کمانڈ

جناب عمار رضی اللہ عنہ کے علاوہ جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کے بھتیجے جناب ہاشم بن عتبہ بھی کر رہے تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقابلہ میں جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص تھے۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت

جناب عمار رضی اللہ عنہ ایک علم اٹھائے ہوئے تھے اور جیسے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نظر آئے تو پکار اٹھے۔

''اے عمرو! تف ہے تجھ پر تو نے اپنے دین کو مصر کے عوض فروخت کر ڈالا۔''

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے کہا۔ ''نہیں، بلکہ میں خون عثمان کا معاوضہ طلب کرتا ہوں۔''

جناب عمار رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ''میں اپنے علم ویقین سے شہادت دیتا ہوں کہ تو اپنے ان اعمال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نہیں چاہتا۔ مرنے کے بعد تجھ پر اس کا حال ظاہر ہوگا تو صرف آج کے دن اس لشکر کے ایک علم بردار (جناب عمار خود) کے ساتھ نبرد آزما نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی تین بار تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس علم بردار کے ساتھ نبرد آزما ہو چکا ہے اور آج یہ چوتھا واقعہ ہے۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔''

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کچھ جواب نہ دے سکے اور جناب عمار رضی اللہ عنہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور آپ نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو جو پہلے تین موقعے یاد کرائے تھے وہ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق تھیں۔ جناب عمار رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر میں تھے اور عمرو بن عاص اس وقت کفار میں تھے۔ یہ شہادت کی کہانی اس عظیم شہید کی ہے جن کی والدہ اسلام کی پہلی شہید تھیں اور اسلام لانے کے سلسلہ میں کفار کے جتنے ظلم جناب عمار رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان نے سہے ان کی مثال نہیں مل سکتی۔ یاد رہے کہ حق پر چلنے والوں کی بسم اللہ بھی اتنی عظیم تھی جیسے آخری لمحے تھے۔ جناب عمار رضی اللہ عنہ کے ایک ایک لفظ میں اسلامی فلسفہ حیات کے اسباق ہیں اور آپ کی اداؤں پر کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ ہم جناب عمار رضی اللہ عنہ کو سلام پیش کرتے ہیں۔

شیر خدا رضی اللہ عنہ کا اعلان

امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کو جب جناب عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک پہنچ گئے اور اعلان کیا۔

''اے ابن ابوسفیان رضی اللہ عنہ! تیرے اور میرے درمیان آج اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ میرے ساتھ تھے۔ تم لوگوں نے ان کو شہید کر دیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ کو باغی لوگ شہید کریں گے۔ آج تیری بغاوت پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کر دی۔ اگر شک ہے تو اپنے لشکر میں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھ لے۔''

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے بیٹے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ یہ حدیث مبارکہ میں نے بھی سنی ہے۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی طرف دیکھا کہ تیرا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ کیا کہتا ہے۔عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے کہا کہ بات تو صحیح ہے چاہے تو اس سے کوئی اور مطلب نکال لے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پکار اٹھا۔"عمار (رضی اللہ عنہ) کی شہادت کا قصور آپ لوگوں کے سر ہے کہ اتنے بوڑھے کو میدان جنگ میں لے آئے۔"

جناب علی رضی اللہ عنہ کی مبارزت طلبی

جناب علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا۔

"اے معاویہ رضی اللہ عنہ! تف ہو تجھ پر، تیری ہر بات کی تاویل اپنی قسم کی ہوتی ہے۔اب چھوڑو باقی باتوں کو اور آ میرے مقابلہ پر آ جا کہ فیصلہ ہو جائے۔مسلمانوں کا خون خواہ مخواہ رائیگاں نہ جائے گا اور امارت کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔"

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے بھی صلاح دی کہ مقابلہ کر لو لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کنارہ کشی اختیار کی اور مقابلے کے لیے آگے نہ آئے۔

جنرل گلب کا تبصرہ

جنرل گلب لکھتا ہے کہ اس زمانے میں جناب علی (رضی اللہ عنہ) کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی عمر پچاس برس سے بھی کم تھی۔ویسے جناب علی کے بارے میں مسلمانوں نے تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بہادری، اصول پسندی، تدبر اور سنجیدگی یعنی ہر قسم کی برتری ٹپکتی ہے لیکن یہاں پر آ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اتنا ذاتی خطرہ مول لینا چاہتے تھے۔خیر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر نہ آنے کی بات تو سمجھ آ سکتی ہے کہ وہ کبھی کوئی ذاتی خطرہ لینے کو تیار نہ تھے۔"

تبصرہ:

یہاں قارئین ہمیں بھی تبصرہ کی اجازت دیں۔دنیاوی لحاظ سے جنرل گلب کا تبصرہ کافی حقیقت پسندانہ ہے۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا وہ صحیح ہے لیکن گلب نے جناب علی شیر خدا کی شان کو دنیاوی یا بودے پیمانوں سے ناپا ہے۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو البتہ معلوم تھا کہ جناب شیر خدا رضی اللہ عنہ ان کو بھی پکڑ کر گیند کی طرح اس طرح پھینک دیں گے جس طرح ان کے خادم کیسان کو پھینکا تھا اور کیسان سے تو کچھ نرمی برتی تھی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نرمی نہ برتتے کہ شاید ان کو اٹھا کر زیادہ دور پھینک دیتے۔جنگ بدر یا جنگ احد کے وقت تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شاید

چھوٹے تھے اور لشکر کفار میں شریک نہ ہوئے لیکن سن چکے تھے کہ شیر خدا کیا کر سکتے ہیں اور معلوم تھا کہ خیبر کی لڑائی میں ہاتھ سے ڈھال گر گئی تو قلعہ کے دروازہ کو اکھیڑ لیا اور اس کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔

جنرل گلب کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ مسلمان فتح کے لیے جنگ نہیں لڑتے بلکہ حق کے لیے لڑتے ہیں۔ جنرل گلب واحد مغربی مبصر ہے جو دبی زبان میں کچھ ایسی باتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن یہاں کچھ بھول گیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لڑائی میں شہید ہو جاتے تو پھر بھی انہوں نے مقصد حاصل کر لیا ہوتا۔ اہل حق ذاتی خطروں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کی مزید وضاحت ساتویں باب میں آئے گی۔

لیلۃ الحریر

جب سورج غروب ہونے لگا تو جنگ اس وقت بھی جاری تھی اور اگر ایک دو گھنٹے اور روشنی رہتی تو شام کی فوج کے قدم اکھڑ جاتے لیکن اندھیرا ان کو آڑے آیا اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ اہل شام کچھ ٹھہر گئے البتہ کئی محاذوں پر جنگ رات کو بھی جاری رہی اس لیے اس رات کو لیلۃ الحریر کہتے ہیں۔ تمام رات امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے والی صفوں میں چکر لگاتے رہے اور مجاہدین کو آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے رہے۔

سورج نکلتے ہی جناب علی رضی اللہ عنہ بھانپ گئے کہ شامی لشکر میں اب لڑنے کی کوئی سکت باقی نہیں تھی۔ اس لیے جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کو ایک بازو سے ایک لشکر کے ساتھ آگے بھیجا جس نے اہل شام کے عقب پر حملہ کر دیا۔ پس اہل شام کے قدم اکھڑ گئے اور اس کے بعد شام کی فوج میدان جنگ میں چند لمحے ہی ٹھہر سکتی تھی۔

آخری حربہ

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ البتہ ان حالات سے نپٹنے کے لیے تیار تھے اور میدان جنگ کی شکست کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیاست سے التوا میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے فوج کو حکم دیا کہ قرآن پاک کو نیزوں پر اٹھا کر آگے بڑھو اور اعلان کرو کہ

''اے اہل عراق! تمہارے اور ہمارے درمیان قرآن پاک فیصلہ کرے گا اور لڑائی بند کر دو۔''

روایت ہے کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ صلاح دی اور یہ بالکل ممکن ہے لیکن یہ کوئی وقتی صلاح نہ تھی بلکہ ظاہر ہے کہ یہ امیر معاویہ کی تجویز کا ایک حصہ تھی۔ اہل شام اس حربہ کو استعمال کرنے کے لیے پہلے سے تیار تھے کہ شکست کی صورت میں یہ آخری حربہ استعمال کریں گے۔

قرآن پاک کا ایسا استعمال سیاست کے طور پر اب بھی ہر سطح پر ہوتا ہے۔ کبھی قرآن پاک کو ضامن بنایا جاتا ہے اور کبھی کوئی سیاست دان قرآن پاک کو اٹھا کر اعلان کرتا ہے کہ یہ ہمارا منشور ہے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ یہ سیاست

والی بات ہے یا نفسیاتی اور وقتی بچاؤ کی۔ دراصل قرآن پاک پر عمل کا حکم ہے اور اس کے علاوہ جو آدمی قرآن کا کوئی اور استعمال کرتا ہے اس کی نیت دیکھی جائے اور جنگ صفین کا یہ بڑا سبق ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام اگر قرآن پاک کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار تھے تو لڑائی کے پہلے دن یہ کارروائی کرتے۔

ابن خلدون کی تاریخ کے مترجم جناب حکیم احمد حسن اللہ آبادی لکھتے ہیں کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے قرآن پاک کو نیزوں پر اٹھا کر اسلام کی بڑی خدمت کی کہ خون خرابہ بند ہو گیا۔ افسوس ہے کہ ہم ایسے خیالات کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ ہمارے لحاظ سے اس وجہ سے فتنہ بڑھا اور خون خرابے ہوئے۔ سانحہ کربلا ہوا اور اس کے بعد دس سال مسلمانوں میں خانہ جنگی جاری رہی۔ اگر قرآن پاک نہ اٹھایا جاتا اور اس دن جنگ جاری رہتی تو تاریخ کی شکل کچھ اور ہوتی۔ بہر حال ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔

حیران کن باتیں

لیکن قرآن پاک کے اٹھانے کے سلسلے میں کچھ حیران کن باتیں بھی ہیں۔ شام کے لشکر میں متعدد لوگ اس کام کے لیے تیار تھے اور اتنے قرآن پاک نیزوں پر نظر آئے کہ حضرت علی کے لشکر پر نفسیاتی اثر ہو گیا اور انہوں نے تلواریں میان میں ڈال دیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق کی فوج میں کچھ لوگ اس طریقہ کار کے منتظر تھے کہ جب اہل شام قرآن پاک اٹھائیں گے تو عراق کی فوج میں وہ اور لوگوں کو بھی جنگ کرنے سے روک دیں گے۔ قرآن پاک جنگ جمل میں بھی اٹھائے گئے لیکن وہاں کوئی اثر نہ ہوا۔ یہاں کیوں اثر ہوا۔ ظاہر ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کچھ لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے کام کر رہے تھے یعنی میدان جنگ میں بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست کام کر رہی تھی۔

بہر حال جیسے ہی اہل عراق نے قرآن پاک کو نیزوں پر دیکھا تو تلواریں نیام میں ڈال دیں اور لڑائی سے ہاتھ روک لیے۔ پھر بلند آواز میں کہنے لگے۔ ''ہم کتاب اللہ کا فیصلہ منظور کرتے ہیں۔''

جناب علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے للکارا۔ ''اے اللہ کے بندو! حق کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھو۔ یہ اہل شام کا مکر و فریب ہے۔ ہم تو ان کے ساتھ اس لیے لڑ رہے ہیں کہ وہ قرآن پاک پر عمل کریں لیکن یہ لوگ قرآن پاک کی آڑ لے کر مکر و فریب کر رہے ہیں۔''

خارجی فرقہ کی ابتدا

جناب علی رضی اللہ عنہ نے بڑی کوشش کی کہ لڑائی بند نہ ہو لیکن اب قبیلہ تمیم سے مسعر بن فدک اور قبیلہ طے سے زید بن حصین آگے بڑھے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے لیے امیر المومنین کے الفاظ استعمال کئے بغیر کہنے لگے۔ ''اے علی رضی اللہ عنہ!

کتاب اللہ کو منظور کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے ساتھ کر چکے ہیں۔'' یہ تھے آزادی فکر والوں کے کرتوت۔ ان لوگوں نے سامنے سے جنگ بالکل بند کرا دی اور جناب علی رضی اللہ عنہ اب عجیب وغریب حالات میں میدان جنگ میں کھڑے تھے۔ اب اگر وہ جنگ جاری رکھنے کا حکم دیتے ہیں تو لشکر کا زیادہ حصہ حکم ماننے سے انکار کر دیتا۔ یہی نہیں بلکہ کئی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور زور دے کر کہنے لگے کہ اشتر نے جنگ بند نہیں کی اس سے جنگ بند کرائی جائے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کو پیغام پہنچایا تو اشتر نے جواب دیا کہ اب فتح چند لمحوں کی بات ہے اور اسے جنگ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب زید رضی اللہ عنہ بن ہانی کو بھیجا کہ اشتر کو صحیح حالات سے آگاہ کریں۔

جناب زید رضی اللہ عنہ بن ہانی نے جا کر جب اشتر کو یہ کہا کہ تمہاری فتح کس کام آئے گی اگر اس دوران عراقی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیں۔ اشتر وہاں سے بھاگا اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور مسعر وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اہل شام کے مکروفریب میں نہ آئیں لیکن وہاں اتنی سخت کلامی ہوئی کہ الٹا جھگڑا ہو گیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے مشکل کے ساتھ بیچ بچاؤ کر کے حالات کو ٹھیک کیا اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔

تبصرہ:

جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آزاد فکر والے لوگ زیادہ تھے اور یہی لوگ آگے خارجیوں کے سرغنہ بنے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سازش بھی تھی۔ بہرحال پہلے گزارش کی جا چکی ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سنجیدہ لوگ بھی تھے اور آزادی فکر والے لوگ بھی۔ کچھ ابن الوقت لوگ بھی تھے اور ان میں وحدت فکر نہ تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں وحدت فکر تھی۔ ایک طرف سیاست کے طور پر ان کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص والا مسئلہ تھا تو دوسری طرف دنیا کی امارت کا پہلو بھی پیش نظر تھا۔ اگر جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سب لوگ سنجیدہ اور حق والے ہوتے جس طرح جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ یا متعدد صحابہ تھے تو پھر جنگ کی یہ صورت نہ ہوتی۔ وقتی وحدت فکر یا دنیاوی باتوں پر اتحاد بھی کام دے جاتا ہے۔ اس لیے یہ سبق بڑا اہم ہے کہ قوم میں وحدت فکر پیدا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی جائے۔

جنگ صفین کے شہدائ

بہرحال جس طرح بھی ہوا جنگ بند ہوگئی اور جو مسلمان بھی اس جنگ میں کام آئے ہم ان کو شہدا ہی کہیں گے۔ اصل بات نیت کی ہے اور ہم کسی کے الفاظ پر شک کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سب اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے۔ حضور

والی بات ہے یا نفسیاتی اور وقتی بچاؤ کی۔ دراصل قرآن پاک پر عمل کا حکم ہے اور اس کے علاوہ جو آدمی قرآن کا کوئی اور استعمال کرتا ہے اس کی نیت دیکھی جائے اور جنگ صفین کا یہ بڑا سبق ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام اگر قرآن پاک کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار تھے تو لڑائی کے پہلے دن یہ کارروائی کرتے۔

ابن خلدون کی تاریخ کے مترجم جناب حکیم احمد حسن اللہ آبادی لکھتے ہیں کہ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے قرآن پاک کو نیزوں پر اٹھا کر اسلام کی بڑی خدمت کی کہ خون خرابہ بند ہو گیا۔ افسوس ہے کہ ہم ایسے خیالات کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ ہمارے لحاظ سے اس وجہ سے فتنہ بڑھا اور خون خرابے ہوئے۔ سانحہ کربلا ہوا اور اس کے بعد دس سال مسلمانوں میں خانہ جنگی جاری رہی۔ اگر قرآن پاک نہ اٹھایا جاتا اور اس دن جنگ جاری رہتی تو تاریخ کی شکل کچھ اور ہوتی۔ بہر حال ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔

حیران کن باتیں

لیکن قرآن پاک کے اٹھانے کے سلسلے میں کچھ حیران کن باتیں بھی ہیں۔ شام کے لشکر میں متعدد لوگ اس کام کے لیے تیار تھے اور اتنے قرآن پاک نیزوں پر نظر آئے کہ حضرت علی کے لشکر پر نفسیاتی اثر ہو گیا اور انہوں نے تلواریں میان میں ڈال دیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق کی فوج میں کچھ لوگ اس طریقہ کار کے منتظر تھے کہ جب اہل شام قرآن پاک اٹھائیں گے تو عراق کی فوج میں وہ اور لوگوں کو بھی جنگ کرنے سے روک دیں گے۔ قرآن پاک جنگ جمل میں بھی اٹھائے گئے لیکن وہاں کوئی اثر نہ ہوا۔ یہاں کیوں اثر ہوا۔ ظاہر ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کچھ لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے کام کر رہے تھے یعنی میدان جنگ میں بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست کام کر رہی تھی۔

بہر حال جیسے ہی اہل عراق نے قرآن پاک کو نیزوں پر دیکھا تو تلواریں نیام میں ڈال دیں اور لڑائی سے ہاتھ روک لیے۔ پھر بلند آواز میں کہنے لگے۔ "ہم کتاب اللہ کا فیصلہ منظور کرتے ہیں۔"

جناب علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے للکارا۔ "اے اللہ کے بندو! حق کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھو۔ یہ اہل شام کا مکر و فریب ہے۔ ہم تو ان کے ساتھ اس لیے لڑ رہے ہیں کہ وہ قرآن پاک پر عمل کریں لیکن یہ لوگ قرآن پاک کی آڑ لے کر مکر و فریب کر رہے ہیں۔"

خارجی فرقہ کی ابتدا

جناب علی رضی اللہ عنہ نے بڑی کوشش کی کہ لڑائی بند نہ ہو لیکن اب قبیلہ تمیم سے مسعر بن فدک اور قبیلہ طے سے زید بن حصین آگے بڑھے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے لیے امیر المومنین کے الفاظ استعمال کئے بغیر کہنے لگے۔ "اے علی رضی اللہ عنہ!

کتاب اللہ کو منظور کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے ساتھ کر چکے ہیں۔'' یہ تھے آزادی فکر والوں کے کرتوت۔ ان لوگوں نے سامنے سے جنگ بالکل بند کرا دی اور جناب علی رضی اللہ عنہ اب عجیب وغریب حالات میں میدان جنگ میں کھڑے تھے۔ اب اگر وہ جنگ جاری رکھنے کا حکم دیتے ہیں تو لشکر کا زیادہ حصہ حکم ماننے سے انکار کر دیتا۔ یہی نہیں بلکہ کئی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور زور دے کر کہنے لگے کہ اشتر نے جنگ بند نہیں کی اس سے جنگ بند کرائی جائے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کو پیغام پہنچایا تو اشتر نے جواب دیا کہ اب فتح چند لمحوں کی بات ہے اور اسے جنگ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب زید رضی اللہ عنہ بن ہانی کو بھیجا کہ اشتر کو صحیح حالات سے آگاہ کریں۔

جناب زید رضی اللہ عنہ بن ہانی نے جا کر جب اشتر کو یہ کہا کہ تمہاری فتح کس کام آئے گی اگر اس دوران عراقی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیں۔ اشتر وہاں سے بھاگا اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور مسعر وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اہل شام کے مکروفریب میں نہ آئیں لیکن وہاں اتنی سخت کلامی ہوئی کہ الٹا جھگڑا ہو گیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے مشکل کے ساتھ بیچ بچاؤ کر کے حالات کو ٹھیک کیا اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔

تبصرہ:

جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آزاد فکر والے لوگ زیادہ تھے اور یہی لوگ آگے خارجیوں کے سرغنہ بنے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سازش بھی تھی۔ بہرحال پہلے گزارش کی جا چکی ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سنجیدہ لوگ بھی تھے اور آزادی فکر والے لوگ بھی۔ کچھ ابن الوقت لوگ بھی تھے اور ان میں وحدت فکر نہ تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں وحدت فکر تھی۔ ایک طرف سیاست کے طور پر ان کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص والا مسئلہ تھا تو دوسری طرف دنیا کی امارت کا پہلو بھی پیش نظر تھا۔ اگر جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سب لوگ سنجیدہ اور حق والے ہوتے جس طرح جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ یا متعدد صحابہ تھے تو پھر جنگ کی یہ صورت نہ ہوتی۔ وقتی وحدت فکر یا دنیاوی باتوں پر اتحاد بھی کام دے جاتا ہے۔ اس لیے یہ سبق بڑا اہم ہے کہ قوم میں وحدت فکر پیدا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی جائے۔

جنگ صفین کے شہدا

بہرحال جس طرح بھی ہوا جنگ بند ہو گئی اور جو مسلمان بھی اس جنگ میں کام آئے ہم ان کو شہدا ہی کہیں گے۔ اصل بات نیت کی ہے اور ہم کسی کے الفاظ پر شک کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سب اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے۔ حضور

پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ جناب عمار رضی اللہ عنہ کو باغی لوگ شہید کریں گے اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی کارروائی پر بغاوت کی مہر ضرور لگ جاتی ہے لیکن یہ معاملہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔

راویت ہے کہ جنگ صفین میں ستر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ ہمارے پاس اس روایت کی تردید کا کوئی ذریعہ نہیں لیکن یہ کچھ زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ بھرپور جنگ صرف دو دن رہی اور پھر عظیم صحابہ سے صرف چند صحابہ شہید ہوئے۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جناب عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور جناب ذوالکلاح رضی اللہ عنہ کا ذکر ہم کر چکے ہیں، جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا...... البتہ چند اور عظیم ہستیوں کا ذکر ضرور کریں گے جو جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھیں۔

جناب اویس قرنی رضی اللہ عنہ

روایت ہے کہ عاشق رسول جناب اویس قرنی رضی اللہ عنہ اس جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور شہید ہوئے۔ مورخین آپ کی شمولیت کا ذکر نہیں کرتے اور خواجہ اویس قرنی کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کو زندگی میں حضور پاک ﷺ کی زیارت نصیب نہ ہوئی لیکن آپ ''دیدارِ خاص'' سے مستفید ہو چکے تھے۔ آپ مدینہ شریف حاضر بھی ہوئے لیکن حضور پاک ﷺ وہاں موجود نہ تھے اور اگر حضور پاک ﷺ وہاں ہوتے تو شاید آپ پروانے کی طرح جل جاتے۔ بہرحال فقرا میں آپ کا مقام بہت اونچا ہے اور عاشقوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ جنگ اُحد میں جب خبر سنی کہ حضور پاک ﷺ کا ایک دندان مبارک شہید ہوا تو اپنے سب دانت باری باری اکھیڑ دیئے۔ روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ آپ کے لیے ایک جبہ مبارک چھوڑ گئے تھے جو حضور پاک ﷺ کے وصال کے بعد جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے آپ کے گھر جا کر آپ کو دیا اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی آپ کے ساتھ وہاں پر ملاقات ہوئی۔

جناب خزیمہ رضی اللہ عنہ بن ثابت

ایک اور شہید جناب خزیمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا تعلق انصار مدینہ کے ساتھ تھا۔ آپ کو خزیمہ ذوالشہادت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ''آپ کی شہادت یعنی گواہی کو دو گواہوں کے برابر تسلیم کیا جائے۔'' واقعہ یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ کا ایک یہودی کے ساتھ مقدمہ تھا جس میں یہودی نے حضور ﷺ کو کوئی گواہ پیش کرنے کے لیے کہا تو جناب خزیمہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے کہ میں گواہ ہوں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ آپ تو وہاں موجود نہ تھے۔ تو جناب خزیمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ ''اے آقا! آپ ہمیشہ سچ فرماتے ہیں اور میں گواہی دوں گا کہ آپ سچ فرما رہے ہیں۔'' حضور پاک ﷺ خوش ہوئے اور مسکرا دیئے۔ مقدمہ تو خیر معمولی بات تھی لیکن یہاں ایک مثال قائم ہوگئی کہ حضور

پاک ﷺ کے غلاموں میں لوگوں کے ایمان کے بڑے بلند درجے تھے۔

بہر حال جناب خزیمہ رضی اللہ عنہ کو جب پتہ چلا کہ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہیں اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جگہ جگہ بغاوت ہو رہی ہے تو آپ بھی جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ وہ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہتے تھے کہ ان کی شہادت بھی ان کے ساتھ ہو تو ایک اور خواہش بھی پوری ہو گئی۔

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن کعب

ایک اور عظیم شہید جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن کعب تھے۔ اہل شام پر حملہ کرتے وقت ان کے الفاظ یہ تھے۔

''اے مجاہدو! میدان جنگ کو پس پشت رکھو۔ بے شک جس شخص کی صبح اس حال میں ہوئی کہ میدان جنگ پس پشت رہا وہی فتح مند ہوا۔''

اسلامی فلسفہ جنگ کے سلسلہ میں ان الفاظ میں ایک پوری کتاب کا مضمون موجود ہے۔ بے شک اس زمانے میں جنگ کا نقشہ تبدیل ہو چکا ہے اور صفوں یا پوزیشنوں میں اتنی گہرائی ہوتی ہے کہ ہر ایک آدمی میدان جنگ کو پس پشت نہیں رکھ سکتا۔ لیکن ان الفاظ میں اسلامی فن سپہ گری کا مکمل فلسفہ ہے جس پر ہر سطح پر عمل ضروری ہے۔ تفصیلات حالات کے مطابق طے کی جا سکتی ہیں۔

مکر وفریب والوں کا دوسرا وار

اہل شام نے سیاست اور مکر وفریب کے ذریعے ایک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ جنگ میں التوا ہو گیا یا وقتی طور پر جنگ ختم ہو گئی۔ اس کو آج کل کی زبان میں فائر بندی کہتے ہیں۔ جنگ میں کتنا نقصان ہوا اور اس نقصان کی وجہ سے شاید کچھ لوگ ''فائر بندی'' پر تیار تھے۔ لیکن ستر ہزار مسلمانوں کا شہید ہونا کچھ ناممکن نظر آتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دونوں طرف سے امراء یا مشہور ہستیاں بھی اسی اوسط کے ساتھ شہید ہوتیں۔ جنگ یمامہ میں شہداً کی تعداد زیادہ تھی تو وہاں صحابہ کرام اور متعدد حفاظ کی شہادت کا ذکر ہے۔

بہر حال اب جناب علی رضی اللہ عنہ جو کچھ کر رہے تھے وہ مجبوری کے تحت کر رہے تھے۔ ویسے بھی انہوں نے حالات سے مجبور ہو کر خلافت سنبھالی اور حالات کی مجبوریوں کے تحت امارت اور اسلام کے مرکز کو قائم رکھنے کے لیے سب کچھ کر رہے تھے۔ ورنہ ماحول ایسا نہ تھا جس میں جناب علی رضی اللہ عنہ کے حق پر ہونے کی تائید ہو۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ اس لیے جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشعث بن قیس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ اہل شام سے معلوم کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہے تھے اور انہوں نے کہا

کہ طرفین ایک ایک منصف مقرر کریں اور ان منصفوں سے حلف لیا جائے کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں گے اور ان کے فیصلہ کو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو منصف مقرر کر دیا۔

اب اس فیصلہ میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کئی وفد بھیج چکے تھے کہ آؤ کتاب اللہ یعنی حق کا فیصلہ تسلیم کریں لیکن اس کے نتائج کچھ بھی نہ نکلے تھے۔ اس لیے جب اشعت نے واپس آ کر جناب علی رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتائی تو آپ مسکرا دیئے اور تجویز منظور فرمائی کہ کتاب اللہ کے فیصلہ سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ ہماری طرف سے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ منصف ہوں گے۔

خارجی گروہ کا پہلا وار

مسعر اور زید کے علاوہ اب شبت * بن عمرو بھی آزاد فکر والے گروہ میں شامل ہو چکا تھا اور وہ لوگ کہتے تھے کہ اب امیر المومنین ہر فیصلہ ان سے پوچھ کر کریں گے۔ اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ ان کو منصف کے طور پر جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ منظور نہیں بلکہ وہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو منصف منتخب کرتے ہیں۔ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن قارئین کو معلوم ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دل سے شامل نہ ہوئے تھے بلکہ ان کو کوفہ کی امارت سے بھی ہٹانا پڑا تھا۔ وہ جنگ جمل میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھے۔ بعد میں حالات سے مجبور ہو کر وہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے لیکن قارئین نے دیکھا ہوگا کہ جنگ میں انہوں نے کوئی خاطر خواہ کام نہ کیا تھا۔

چنانچہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ثقہ نہیں اور ان کی رائے وقتی ہوتی ہے میں ان کو منصف نہ بناؤں گا۔ خارجی کہنے لگے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ آپ کے رشتہ دار ہیں ہم ان کو منصف تسلیم نہیں کرتے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کا نام لیا تو خارجی کہنے لگے کہ وہ صحابہ کرام کے زمرے میں نہیں آتا تو جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب صحابہ کرام کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور ان میں سے کسی کو منتخب کر لیں گے۔ لیکن خارجیوں نے یہ تجویز بھی نہ مانی بلکہ جناب احنف رضی اللہ عنہ بن قیس کا نام بھی پیش کیا گیا، لیکن خارجیوں نے ہڑبونگ مچا دی۔ یہی نہیں بلکہ اب اشعت بن قیس بھی جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں بول رہا تھا تو یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشعت ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اگر اشعت کے سارے کردار پر نظر ڈالی جائے تو یہ بالکل واضح ہوتا ہے کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی کوئی رابطہ قائم رکھے ہوئے ہوں اور جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا منصف کے طور پر چناؤ کسی تجویز کا نتیجہ تھا۔ اس تجویز میں اشعث بھی شامل ہو سکتا ہے۔ ہاں البتہ جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے کردار پر کوئی حرف نہیں آتا کہ وہ ان باتوں سے بلند تھے۔ ان کی

* کچھ مبصرین نے شبت بن عمرو اور شبت بن ربیع کو ایک آدمی بنا دیا۔

شرافت کا استعمال اپنے حق میں کیا جا سکتا تھا۔ قارئین البتہ ان باتوں پر نظر رکھتے ہوئے ہمارے ساتھ چلیں۔

اشعث بن قیس وہی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں خلیفہ اول نے افسوس کیا کہ اپنی بہن کا رشتہ اس کو کیوں دیا۔ پھر اشعث ایک دفعہ مرتد بھی ہو گیا تھا اور دوبارہ اسلام کی آغوش میں آیا۔ وہ بلاشبہ اسلام کی جنگوں میں بہادری سے لڑا۔ شاعر بھی تھا اور جناب خالد رضی اللہ عنہ سے کچھ ذاتی انعام بھی حاصل کیا اور اس کا ذکر دوسری کتاب میں ہے لیکن اسی کی بیٹی تھی جو امام حسن رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھی، روایت ہے کہ اس نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید کے کہنے پر امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا۔ اس لیے قارئین اشعث بن قیس کی مستقبل کی کارروائیوں پر نظر رکھیں۔

منصف کا انتخاب

بہر حال جناب علی رضی اللہ عنہ اب حالات کو بھانپ چکے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا: ''اچھا جو چاہو اور جو تمہاری سمجھ میں آئے کرو۔'' جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا اور ان کو بتایا گیا کہ لڑائی موقوف کردی گئی ہے۔ جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بولے۔ ''الحمد للہ'' اور پھر ان کو بتایا گیا کہ تم منصف مقرر کئے گئے ہو۔ آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

تحکیم کا عہد نامہ

اسی دوران امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے عمرو بن عاص پہنچ گئے۔ اور اقرار نامہ لکھنے کے لیے کہا۔ کاتب نے بسم اللہ کے بعد جب آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''امیر المومنین'' کے الفاظ لکھے تو عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے قلم پکڑ لیا اور کہا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ ان کے امیر نہیں، یہ الفاظ ختم کردو۔

جناب احنف رضی اللہ عنہ پاس بیٹھے تھے، انہوں نے کہا کہ یہ الفاظ ختم نہیں کئے جا سکتے کہ بے شک وہ اکثر مومنین کے امام ہیں لیکن اشعث نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی رائے سے اتفاق کیا۔

امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ پر رقت طاری ہوگئی۔ آپ کو صلح حدیبیہ یاد آگئی جس میں آپ خود کاتب تھے اور کفار زور دے رہے تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ نہ لکھے جائیں اور آپ نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کہنے لگے کہ آپ ہمیں کفار سے تشبیہ دے رہے ہیں حالانکہ ہم مومن ہیں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

''اے عمرو! تو اس میں بھی حق کا مخالف تھا اور آج بھی ہے۔''

اور پھر کچھ سخت باتیں بھی ہوگئیں۔ تحریر البتہ حسب ذیل (۱) ہے۔

''یہ وہ تحریر ہے جس کو علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابوسفیان نے باہم طور پر اقرار نامہ کے لکھا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ اور ان لوگوں کی طرف سے جو ان کے ہمراہ تھے، منصف مقرر کیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی جانب سے اور اہل شام کی طرف سے جو ان کے ہمراہ تھے منصف مقرر کیا۔ بے شک ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی کتاب کو منحصر علیہ قرار دیتے ہیں اور اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ سوائے اس کے دوسرا کوئی دخل نہ ہوگا اور قرآن پاک شروع سے آخر تک ہمارے درمیان موجود ہے۔ ہم زندہ کریں گے اس کو جس کو اس نے زندہ کیا اور ماریں گے اس کو جس نے اس کو مارا ہے (قرآن پاک پر عمل کے لیے عربی طرز بیان کے یہ الفاظ ہوتے ہیں) اور منصفین جو کچھ قرآن میں پائیں گے ان پر عمل کریں گے اور وہ منصف ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس[۲] رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ہیں۔ جو کتاب اللہ میں نہ پائیں گے تو سنت عادلہ اور ایسی باتوں پر عمل کریں گے جو اختلاف پیدا نہیں کرتیں۔''

منصفین کے لیے ضوابط و شرائط

اس کے بعد دونوں منصفین کے لیے جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان دونوں کے لشکروں سے ان کی جانوں، مالوں اور ان کے اہل و عیال کے لیے امن کی ضمانت لی گئی اور منصفین پر فرض کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ یہ معاہدہ صفر کے مہینے میں ہوا اور منصفین کو اجازت تھی کہ رمضان ۳۷ ہجری تک کسی ایسے مقام پر فیصلہ کریں جو کوفہ اور شام کے درمیان میں واقع ہو۔

معاہدہ پر دستخط

اس معاہدہ پر جناب علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشعث بن قیس کندی، سعید بن قیس ہمدانی، قاہر بن سمی ابجلی، عبداللہ بن محل العجلی، حجر بن عدی کندی، عبداللہ بن طفیل عامری، عقبہ بن زیاد حضرمی، یزید بن قجیہ تمیمی اور مالک بن کعب ہمدانی رضی اللہ عنہم نے دستخط کئے۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ابوالاعور سلمی، حبیب بن سلمہ، سبیع بن یزید انصاری، عتبہ بن ابوسفیان، زمل بن عمرو عذری، حمزہ بن مالک ہمدانی، عبدالرحمٰن بن خالد مخزومی اور یزید بن عیسیٰ رضی اللہ عنہم نے دستخط کئے۔ یہ نام لکھنے میں ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رشتہ داروں یا مہاجر و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اشتر میں سے

۱۔ عربی کے عہد نامہ پر رضی اللہ عنہ وغیرہ کے الفاظ نہیں، ہم نے از خود ادب کے طور پر ناموں پر رضی اللہ عنہ کا لفظ لکھ دیا۔
۲۔ جناب ابوموسیٰ کا پورا نام۔

کسی نے بھی معاہدہ پر دستخط نہ کئے کہ یہ معاہدہ اہل عراق کی مرضی کی وجہ سے جناب علی رضی اللہ عنہ مجبوری کے تحت کر رہے تھے لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی کہ ان کے بھائی اور ان کے ساتھ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے ان سب نے دستخط کئے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک اور التوا حاصل کر لی۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ واپسی

اس کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ واپس جانے کے احکام دیئے تو خارجی آگے بڑھے اور کہنے لگے، یہ غلطی ہوگئی۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کے مطابق تو اسی وقت فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ چھ مہینے ٹال مٹول والی بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس معاہدہ کو ختم کر کے لڑائی دوبارہ شروع کی جائے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''معاہدے توڑنے کے لیے نہیں کئے جاتے۔ تم ہی لوگوں کے کہنے پر یہ معاہدہ کیا گیا ہے۔'' تو آزادی فکر والے کہنے لگے کہ انہیں ان نتائج کا خیال نہ تھا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے اور واپس کوفہ کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ خارجیوں میں سے کافی لوگ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے الگ ہو گئے اور ان لوگوں نے حرورا کی راہ لی۔ ان کی کمانڈ شبث[1] ابن عمرو تمیمی اور عبداللہ بن الکوالشکیری[2] نے سنبھال لی۔ ان لوگوں کو حروریہ بھی کہتے ہیں۔ بہر حال جناب علی رضی اللہ عنہ کی عمل داری میں لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک شیعان علی تھے جو کہتے تھے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں اور دوسرے خارجی یا حروریہ جو ہر روز ایک نئی تاویل آگے لاتے تھے اور اس کا ذکر آگے آ تا رہے گا۔

شیعانِ علی رضی اللہ عنہ

یہ بہتر ہوگا کہ شیعان علی کا تاریخی پہلو بھی بیان کر دیا جائے۔ اس زمانے میں جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھتے تھے۔ وہ سب کے سب شیعان علی ہی کہلاتے تھے۔ فقہی گروہ اس زمانے میں نہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اور امام حسن کی خلافت سے دستبرداری کے بعد لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا لیکن ایسے لوگ جن کی ہمدردی ان اصولوں کے ساتھ تھیں جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا وہ سب شیعان علی ہی کہلاتے رہے۔ کافی زمانہ بعد بھی فقہ کے لحاظ سے کوئی گروہ نہ تھے۔ اور فقہ شرعی مسائل کے عدالتی فیصلہ تک محدود تھا یا عبادت کے طریقوں یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عملی پہلوؤں میں کچھ فروعی قسم کی باتوں میں تقلید کا پہلو تھا۔ فقہ جعفریہ یا فقہ حنفیہ یا حنابلہ وغیرہ کے الفاظ اس زمانے میں سننے میں نہ آتے تھے۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے از خود امام جعفر صادق سے بھی فقہ کی تعلیم حاصل کی

1۔ آج کل کچھ تاریخ دانوں نے شبث بن عمر تمیمی اور شبث بن ابعی کو ایک ہی شخص بنا دیا ہے۔ شبث بن ابعی کا ذکر اب ساتویں باب میں آئے گا۔

2۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ میں شامل تھا۔

اور امام مالک رضی اللہ عنہ اور امام اعظم رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلافات اتنے معمولی تھے جس طرح کسی ایک مقدمہ کا فیصلہ سناتے وقت کوئی جج اختلافی رائے پیش کرے۔ دونوں نے از خود کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ کوئی فقہ کی کتاب امام حنبل نے لکھی البتہ مسند حنبل یعنی امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی کتاب ضرور لکھی۔

مامون الرشید کے زمانے تک بھی خارجیوں سے تو معتزلہ، جبریہ، جہمیہ اور قدریہ اور پتہ نہیں کتنے گروہ پیدا ہو چکے تھے اور خود معتزلہ میں بہت گروہ تھے لیکن شیعان علی یا سواد اعظم میں کوئی گروہ نہ تھے اور فقہ کے اختلافات کو گروہ بندی کے طور پر استعمال نہ کیا جاتا تھا بلکہ اہل سنت والجماعت یا شیعہ کے لفظ بھی گروہ بندی کے طور پر استعمال نہ ہوتے تھے۔ امام حنبل کے ماموں رشید سے اختلافات کے وقت تمام سواد اعظم، امام حنبل سے متفق تھے اور امام علی رضا اولاد حسین کی سفارش کی وجہ ماموں رشید نے امام حنبل کو قتل نہ کیا۔ ماموں نے اپنا جانشین بھی امام علی رضا کو نامزد کیا تھا۔ بہر حال اکثر چھوٹے چھوٹے گروہ یا فرقے سامنے آتے رہے جنہوں نے خود بھی اپنا کوئی نام رکھا ہوا تھا اور مخالفین نے ان کا کوئی نام رکھ دیا تو وہ اسی نام سے موسوم ہونے لگے۔ بہر حال ہم اس کی تفصیل میں نہ جائیں گے کہ ان میں سے اکثر فرقے یا گروہ خود بخود ختم ہو گئے۔ اسلام کی تاریخ پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام میں نہ کوئی گروہ بندی ہے نہ الگ الگ سیاسی جماعتیں، فقہی گروہ بھی ہماری سمجھ سے باہر ہیں کہ جس زمانے میں بڑے بڑے امام اور مفکر پیدا ہوئے۔ اس کے پورے ایک سو سال بعد بھی ان کے نام سے کوئی الگ فقہی گروہ نہ تھے۔

بے شک امام مسلم اور امام بخاری نے احادیث کی چھان بین کر کے اسلام کی بڑی خدمت کی اور ضعیف احادیث کو اپنی کتاب میں نہ شامل کر کے کافی تفرقے ختم کیے۔ اسی وجہ سے جو پہلے تین سو سالوں میں چھوٹے گروہ پیدا ہو گئے تھے ان میں سے کئی ایک ختم ہو گئے۔ صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کی زندگیوں کا مطالعہ اگر اس زمانے کے حالات کی مدد سے کیا جائے تو آگے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب تفرقے اس وجہ سے پیدا ہونے شروع ہو جاتے تھے کہ جہاد یا جہاد کی تیاری میں جمود آ جاتا تھا تو لوگ فضول بحث مباحثہ اور حب الدنیا کے تحت خود غرضی کا شکار ہو جاتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم نے قومی وحدت یا امت کی وحدت کے لیے ''فقہ وحدت'' یا ''فقہ عسکریت'' کی اصطلاح کا استعمال کیا ہے کہ اختلافات کو فقہ عسکریت کی مدد سے ختم کیا جائے یعنی پوری امت اللہ کی فوج بن جائے اور جہاد کو جاری وساری کر دیا جائے۔ علامہ اقبال نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا کہ ہماری ذلت جہاد سے گریز کی وجہ سے ہے اور غیر ہمیں ترک جہاد کی تعلیم دے رہے ہیں۔

تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجہ خونیں سے ہو خطر

منصفین کا اجتماع

دونوں منصف اذرح کے مقام پر اکٹھے ہوئے جو دومۃ الجندل کے پاس ہے۔ جناب علیؓ کی طرف سے ابن عباس چند ہمراہیوں کے ساتھ وہاں موجود تھے یعنی جیسے مقدمہ میں طرفین حاضر ہوتے ہیں اور امیر معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن عاص دونوں کام کر رہے تھے۔ منصف کا بھی اور امیر معاویہؓ کے مختار کا بھی۔

شام کے جو لوگ عمروؓ بن عاص کے ساتھ آئے وہ سختی کے ساتھ عمروؓ بن عاص کا حکم مانتے تھے لیکن ابن عباسؓ کے ساتھ جو لوگ عراق سے آئے ان کی آزادی فکر نے ان کو آزاد چھوڑا ہوا تھا اور وہاں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔

روایت ہے کہ کچھ غیر جانبدار لوگ بھی وہاں موجود تھے جن میں جناب سعدؓ بن ابی وقاص، جناب عبداللہؓ بن عمر، جناب عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکر اور جناب عبداللہؓ بن زبیر قابل ذکر ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جس سے ہمارے اس تجزیہ کو تقویت ملتی ہے کہ جنگ صفین تک وہ امیر معاویہؓ کے ساتھ شامل نہ تھے۔

منصفین کی بات چیت کو مورخین نے جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ عمروؓ بن عاص باتیں کرتے تھے اور جناب ابوموسیٰؓ سن کر ہاں یا نہ کر دیتے تھے۔ عمروؓ بن عاص نے پہلے امیر معاویہؓ کی حضرت عثمانؓ سے قرابت کا ذکر کیا تو ابوموسیٰؓ نے جواب دیا کہ اسلام امارت میں وراثت کو تسلیم نہیں کرتا۔ پھر عمروؓ بن عاص نے امیر معاویہؓ کی حضور پاکﷺ سے قرابت داری کا ذکر کیا کہ وہ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں تو ابوموسیٰؓ ہنس دیئے کہ اگر حضور پاکﷺ سے قرابت کو پیمانہ بناتے ہو تو پھر جناب علیؓ سے بہتر کوئی حق دار نہیں۔

اب عمروؓ بن عاص نے پینترا بدلا اور کہا۔ امیر معاویہؓ سیاست اور ملک داری میں بہت ہوشیار ہیں تو ابوموسیٰؓ نے کہا کہ پھر ابرہہ* بن الصباح کی اولاد سے کوئی آدمی تلاش کرو۔ اب عمروؓ بن عاص خاموش ہو گئے اور کہنے لگے کہ بہتر ہے جناب علیؓ اور جناب معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیں اور مسلمانوں کا کوئی اور امیر مقرر کر لیں۔ ابوموسیٰؓ نے یہ تجویز منظور کر لی تو عمروؓ بن عاص نے اپنے لڑکے عبداللہ کا نام خلافت کے لیے پیش کیا تو ابوموسیٰؓ نے کہا کہ ان سے عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ بن زبیر اور کئی عظیم صحابہؓ جو زندہ ہیں، بہتر ہیں۔ چنانچہ خلیفہ کے بارے کہ کون ہو، کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

آخر اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا کہ دونوں جناب علیؓ اور جناب معاویہؓ کو خلافت سے معزول کر دیا

* ابرہہ وہ تھا جس نے ہاتھیوں سے خانہ کعبہ پر حملہ کیا تھا اور جس کا ذکر سورۃ الفیل میں ہے۔

جائے اور مسلمان جس کو چاہیں خلیفہ مقرر کریں۔ یعنی بات ادھر کی ادھر ہی رہی کہ خلیفہ ابھی منتخب ہونا تھا۔

فیصلہ کا اعلان

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اولین اسلام لانے کی وجہ سے فیصلہ کا اعلان کرنے کے لیے کہا اور آپ نے سمجھوتہ کے مطابق اعلان کر دیا۔

جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ایک قدم آگے بڑھے اور کہنے لگے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصف نے ان کو معزول کر دیا۔ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا منصف ہوں میں ان کو امیر المومنین کے عہدے پر قائم رکھتا ہوں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو ملامت کی اور جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے معذرت کی۔ پھر عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص پر بدعہدی کا الزام لگایا۔ بہرحال وہاں کافی لعن وطعن بھی ہوئی۔ شریح بن ہانی نے تلوار کے ساتھ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص پر حملہ بھی کر دیا مگر لوگوں نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو بچالیا۔ ہاں غیر جانبدار صحابہ کرام نے بھی عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص پر بدعہدی اور فتنہ کا الزام لگایا۔

تبصرہ:

اس سارے واقعہ یا منصفین کی کارروائی پر اتنے زیادہ تبصرے ہوئے ہیں کہ ہم بھی اگر اس بحث میں پڑ گئے تو معاملات ادھر ہی رک جائیں گے۔ ابن خلدون کے مترجم حکیم احمد حسن کے تبصرے کا جواب تو ادھر ہی مل گیا کہ وہ صحیح نہ تھے۔ قرآن پاک کو نیزوں پر اٹھانے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تفرقہ اپنی جگہ پر موجود رہا۔ ہاں، اگر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بدعہدی نہ کرتے تو شاید معاملات حل ہو جاتے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کی کوئی خواہش نہ تھی اور ان کو یہ مشکل ذمہ داری چھوڑنے کا بہانہ مل جاتا۔ البتہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں جناب علی دستبردار نہ ہو سکتے تھے کہ اس سے ایک غلط راہ نکل آتی کہ آئندہ بھی لوگ باغی ہو کر فیصلہ اپنے حق میں کراتے۔

بہرحال چونکہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو خلافت سے معزول کیا جاتا ہے تو اب امت جس کسی کو خلیفہ چنتی یا مقرر کرتی تو جناب علی رضی اللہ عنہ بسر وچشم منظور کرتے اور وہ خلیفہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ مانگتا تو وہ مشورہ دیتے رہتے یا باقی عمر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزار دیتے لیکن اللہ تعالیٰ کو ایک ہی منظور تھا جو کچھ ہو گیا۔ خلافت یا جانشینی والا معاملہ بہت مشکل ہے۔ جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بھی کسی ایک نام پر متفق نہ ہو سکے، پوری امت کسی نام پر کیسے متفق ہوتی۔ آگے جب پوری امت جناب معاویہ رضی اللہ عنہ

کے سلسلہ میں متفق ہوئی تو معاملات صرف وقتی طور پر حل ہو سکے۔ عالم خلق میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ ایک طرف حق کا راستہ ہے دوسری طرف دنیا کی محبت ہے۔ بڑا مشکل امتحان ہے۔ کئی بڑے بڑے لوگوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ خدا تعالیٰ ہمارا خاتمہ بالخیر کرے اور کسی امتحان میں نہ ڈالے۔ یہ بہت مشکل پرچے ہیں۔ یہاں پر عمل و عقل اور علم کسی پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ صرف رحمت خداوندی سے ہی اس امتحان سے پاس ہو سکتے ہیں۔

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

(اقبالؔ)

نتائج واسباق

جنگ صفین کے فوری نتائج پہلے بیان ہو چکے ہیں اور باقی نتائج اب سامنے آ گئے کہ معاملات ادھر ہی رہے۔ اسباق حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جنگ بندی یا فائر بندی ایک التوا ہوتی ہے جس سے اہل حق ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں اور سیاست دان فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۲۔ جب جنگ شروع کر دی جائے تو اس کو ہمیشہ اختتامی مقام تک پہنچایا جائے۔

۳۔ اگر صلح کی جائے تو صلح حدیبیہ کی طرح تمام فیصلے اسی جگہ یا میدان جنگ میں طے کئے جائیں اور کارروائی کے تمام عطیات اور ثمرات ادھر ہی وصول کر لیے جائیں، التوا ہمیشہ نقصان دے گا۔

۴۔ اسلام میں گروہ بندی حضرت عثمان کے زمانے میں شروع ہوئی، اس کی بنیاد کوئی عقائدی تفرقہ نہ تھا۔ آزادی فکر کی اجازت دے دی گئی۔ اس وجہ سے سازش اور فتنہ والوں کی سازش کو نہ سمجھا جا سکا۔ ساتھ ہی حب الدنیا اور خود غرضی ہمارے اندر داخل ہو گئی تو نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ ہوا۔ بصرہ میں قتل و غارت ہوئی۔ پھر جنگ جمل ہوئی اور بعد میں جنگ صفین ہوئی، تفرقہ اپنی جگہ رہا۔ ساتھ ہی عقائدی گروہ بندی کی بنیاد بندھ گئی۔ اور یہ چیز جنگ صفین کے بعد کھل کر سامنے آئی کہ خارجی یا شیعان علی کے گروہ بن گئے۔

۵۔ حکومت یا مرکز کو سہارا دینا یا حکومت کی مدد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور اسلام تمام معاملات کو مسجدوں کے اندر بیٹھ کر حل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اختلافات کو بازار میں لے جانے سے یا کھلے میدان میں لے جانے سے معاملات حل نہیں ہوتے اور نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلتا ہے یا اندرونی خانہ جنگی اور افراتفری کی صورت میں۔

۶۔ ہمارے ملک میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں سیاسی جماعتوں کی اجازت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خارجیوں

کو کچھ نہ کہا اور سیاسی پارٹیاں بھی تھیں۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی پارٹی، جناب زبیر رضی اللہ عنہ کی پارٹی، شیعان علی یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پارٹی، امیر معاویہ کی پارٹی۔ اول تو اس میں سبق ہے کہ ایسی پارٹیوں نے اسلام کا بہت نقصان کیا اور آگے عقائدی گروہ بن گئے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے متعدد بار اعلان کیا کہ ان کی کوئی پارٹی یا گروہ نہیں ہے۔ ہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں البتہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایک گروہ کی بنیاد ضرور ڈالی جس کے نتائج بھی کچھ اچھے نہ نکلے۔

۷۔ اسلام میں جب بھی سیاسی گروہوں کی اجازت دی جائے گی آگے سے وہ سیاسی گروہ یا جماعتیں عقائدی گروہوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اور اس وقت ملک میں کئی ایسے سیاسی گروہ ہیں جن کی جتھا بندی کسی خاص عقیدہ کی وجہ سے ہے۔ مثال کے طور پر جمعیت العلمائے اسلام، دیوبندی عقیدہ رکھتے ہیں۔ جمعیت العلمائے پاکستان، بریلوی عقیدہ رکھتے ہیں۔ جماعت اسلامی میں زیادہ تر غیر مقلد اور کچھ اہل حدیث ہیں یعنی زیادہ وہ لوگ ہیں جو مودودی صاحب کے ہم عقیدہ ہیں اور بریلوی یا دیوبندی بھی تازہ بانٹ ہیں جس کے پیچھے سیاست کارفرما تھی۔

۸۔ اسی وجہ سے ان کتابوں کے ذریعے ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاؑ کے اسلام کی تلاش میں ہیں جن میں کوئی گروہ بندی نہ تھی وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ایک امت تھے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہ توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام

(اقبالؔ)

❖❖❖

چوتھا باب

جنگ نہروان اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مصر پر قبضہ

جناب علی رضی اللہ عنہ اور خارجی

جناب علی رضی اللہ عنہ کو منصفین کے فیصلہ کے بارے میں ذرہ بھر بھی شک نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے شامیوں کو قرآن پاک نیزوں پر اٹھانے والی بات کو ناپسند فرمایا۔ اگر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا کوئی اور صحابی منصفوں میں شامل ہوتا تو شاید کوئی بہتری نکل آتی۔ بہر حال ہم پچھلے باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچ چکے تھے۔ آپ کے لشکر سے دس بارہ ہزار آدمی الگ ہو چکے تھے اور وہ حرورا میں قیام پذیر تھے کوفہ پہنچ کر جناب علی رضی اللہ عنہ نے پہلے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیجا پھر خود بھی گئے اور ان کو سمجھا بجھا کر واپس لے آئے۔ یہ لوگ جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں دوبارہ شریک ہو گئے۔

جب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اذرح (دومۃ الجندل) کی طرف جا رہے تھے تو اسی دن ان خارجیوں کے گروہ میں سے حرقوس اور زرعہ وغیرہ نے جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو روکا کہ ان کو نہیں جانا چاہیے بلکہ جنگ کی جائے۔ وہ یہاں تک چلے گئے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو کہنے لگے کہ منصف کا تقرر کر کے آپ ایک بہت بڑا گناہ کر چکے ہیں، اس گناہ سے توبہ کریں، کفارہ دیں اور اس عہد کا پاس نہ کریں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر فرمایا کہ یہ گناہ تو نہیں ہے البتہ ایک لغزش ہے اور اس لغزش کے ذمہ دار بھی تم لوگ ہو اور اس وقت میں تمہاری بات نہ مانتا تو ہمارے لشکر میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی اب میں وعدہ کر چکا ہوں اور اس وعدہ کو پورا کروں گا چنانچہ اس خطبہ سے وقتی سکون ہو گیا اور جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل بھیج دیا گیا۔

خارجیوں کا نیا فتنہ

کچھ دنوں کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ جب مسجد میں خطبہ دے رہے تھے تو مسجد کے ایک کونے سے آواز آئی۔ ﴿لا حکم الا اللہ﴾ ''اللہ کے بغیر کوئی حکم نہیں۔'' جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ بے شک اللہ بہت بڑا ہے لیکن اللہ تعالیٰ

کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے اولی الامر کی بھی ضرورت ہے۔'' اس دن تو خاموشی ہو گئی لیکن **لا حکم الا اللہ** کے تحت خارجیوں کا گروہ پھر اکٹھا ہونا شروع ہو گیا۔

اب لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ویسے تو کہتے تھے کہ کسی امیر کی ضرورت نہیں لیکن اپنا امیر کسی نہ کسی کو مقرر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں زید بن حصین، ابن لکوا، شبت، زراعہ اور شریح، پتہ نہیں کتنے لوگوں کو باری باری امیر بنا چکے تھے لیکن آگے امیر کے ساتھ تماشہ بن جاتا تھا کہ ایسے آزاد فکر لوگوں کی امارت بڑا مشکل کام تھا۔ ہاں شرارت یا منفی کاموں میں متحد ہو جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ایک کر کے جناب علی کے لشکر کو چھوڑ دیں اور اس طرح وہ لوگ جناب علی کے لشکر سے پھر الگ ہو گئے۔ جناب عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم کے بیٹے طرفہ کو بھی گمراہ کر کے ساتھ لے گئے۔ جناب عدی رضی اللہ عنہ مدائن تک اپنے بیٹے کے پیچھے گئے لیکن اسے واپس لانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ بلکہ جب وہ خود واپس آرہے تھے، تو خارجیوں کے ایک گروہ نے ان کو پکڑ لیا۔ وہ ان کو شہید کر دیتے لیکن قبیلہ طے کے کچھ آدمی وہاں پہنچ گئے جنہوں نے جناب عدی رضی اللہ عنہ کو بچا لیا۔

افراتفری

اب حالات پھر وہی صورت اختیار کر گئے جیسے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد رونما ہوئے تھے۔ اس وقت لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب کسی کو حاکم یا امیر ماننے پر تیار نہ تھے کہ فرد آزاد ہے لیکن یہ عجیب وغریب قسم کی آزادی تھی۔ وہ آزاد ایسے تھے کہ کسی کا حکم نہ مانتے تھے لیکن جواباً اگر کوئی دوسرا آدمی اپنی آزادی فکر کو استعمال کر کے ان کی بات نہ مانتا تو اس کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ لوگ بصرہ اور کوفہ دونوں صوبوں میں تھے اور اب ہر جگہ سے نکل کر نہروان میں اکٹھے ہو رہے تھے۔

قارئین کو ان لوگوں پر ہنسی نہیں آنی چاہیے۔ ہمارے ملک میں بھی کچھ لوگ اپنی آزادئ فکر کا مظاہرہ کرنے کے لیے جب بازاروں میں نکل کھڑے ہوتے ہیں تو آگے سے جو آدمی اپنی آزادئ فکر کا استعمال کرتے ہوئے ان کی بات نہ مانے تو اس پر پتھراؤ کرتے ہیں اور اس کی گاڑی کو جلا دیتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔

تبصرہ:

بہر حال یہاں پر یہ تبصرہ ضروری ہے۔ پہلے باب میں گزارش کی گئی تھی کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھال کر اسلام کے مرکز کو سہارا دیا۔ یہی نہیں بلکہ اہم بات یہ تھی کہ اسلام کے فلسفہ حیات کو جاری و ساری رکھا ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسلام کا اجتماعی فلسفہ حیات، اطاعت امیر اور اولی الامر کا فلسفہ بھی پاش پاش ہو گیا ہوتا۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے نہ بڑھتے تو ساری اسلامی دنیا میں وہی کچھ ہوتا جو خارجی کر رہے تھے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقہ میں ایسی باتیں کچھ زیادہ نہ ہوئیں۔ اول تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مدت سے ان علاقوں میں عامل کے طور پر مکمل کنٹرول کر رہے تھے اور وہاں پر ان کی حکومت کا دنیا کی باقی حکومتوں کی طرح زیادہ دباؤ تھا۔ اسلام نے لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے چھٹکارا دلایا تو لوگ زیادہ آزاد ہو گئے اور اجتماعی فلسفہ میں ہر آدمی ذاتی طور پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ ایسے لوگوں کا قلع قمع کرنا آسان نہ تھا۔ یہ جناب علی رضی اللہ عنہ ہی کی شخصیت تھی کہ انہوں نے خارجی تحریک کو کافی حد تک ختم کر کے اسلام کو تقویت پہنچائی وگرنہ اگر کوئی اور شخص ان کو اس طرح ختم کرتا تو خارجیوں کو بھی لوگ مظلوم کہنا شروع کر دیتے کہ ان بے چاروں کا کوئی گناہ نہیں کہ وہ اللہ کی حاکمیت کو مانتے ہیں لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ کی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی قرابت کام آئی اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجیوں کے بارے میں پیش گوئیاں بڑی مددگار ثابت ہوئیں اس لیے قارئین آگے بڑھنے سے پہلے ان باتوں کو اپنے ذہن میں رکھیں۔

گو خارجی بعد میں معتزلہ کی شکل میں ظاہر ہوئے لیکن وہ عملی حملہ نہیں تھا، وہ امت پر فکری حملہ تھا جو آج بھی جاری ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ وضاحتیں آخری تین ابواب میں ہوں گی۔ فی الحال خارجیوں کی کہانی کو آگے چلاتے ہیں۔

خوارج کو دعوت اتحاد

تمام خارجی کوفہ و بصرہ اور مختلف مقامات سے نکل کر نہروان کی طرف اکٹھے ہو رہے تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے مدائن کے گورنر سعد بن مسعود ثقفی نے کچھ خوارج کو پکڑنے کی کوشش کی اور بصرہ سے جناب ابن عباس کے حکم پر ابوالاسود دولی نے بھی ان کا تعاقب کیا لیکن خارجی رات کی تاریکی میں نکل جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سوچ رہے تھے کہ خوارج کا قلع قمع کیا جائے کہ اسی دوران منصفین کے فیصلہ کا اعلان ہو گیا جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ اب جناب علی رضی اللہ عنہ نے جگہ بجگہ خارجیوں کو دعوت بھیجی کہ تم لوگ لڑائی کرنے کے خواہاں تھے اس کی راہ نکل آئی ہے آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ تاکہ مل کر ملک شام پر لشکر کشی کریں۔

آگے سے خوارجیوں کا جواب یہ تھا۔

''تم نے منصفین کا تقرر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا پاس نہ کیا اور اب اپنے نفس کی اتباع سے لڑنے کو کہتے ہو، پس اگر تم اپنے کافر ہونے کا اقرار کر لو اور توبہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں ورنہ ہم تم سے لڑنے کو تیار ہیں۔''

شام پر لشکر کشی کی تیاری

خارجیوں کے اس جواب نے جناب علی رضی اللہ عنہ کو مایوس کیا لیکن یہ لوگ تھوڑے تھے اس لیے جناب علی رضی اللہ عنہ نے

شام پر دوبارہ لشکر کشی کے احکام دے دیئے۔ شروع میں بڑے کم لوگ لڑنے کے لیے تیار ہوئے لیکن جب جناب علی رضی اللہ عنہ نے خطبات میں لوگوں کو شرم دلانے کی کوشش کی تو کافی بڑی فوج تیار ہوگئی۔ چالیس ہزار کے قریب پرانے مجاہدین تھے اور سترہ ہزار نوجوان بھی تیار ہو گئے جو لڑائی میں پہلی دفعہ شرکت کر رہے تھے، اس کے علاوہ آٹھ ہزار خادم بھی تھے۔ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی بصرہ سے آ گئے اور اب فوج تیار تھی کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حباب کی شہادت کی خبر ملی۔

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حباب کی شہادت

جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کی خارجیوں کے ایک گروہ کے ساتھ اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ خارجیوں نے ان سے پہلے دو خلفاء راشدین کے بارے میں رائے پوچھی۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ بہت اچھے تھے۔ پھر خارجیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی بڑے حق پسند تھے۔ پھر جناب علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ تم لوگوں سے زیادہ اللہ کے حکم کو سمجھنے والے اور جاننے والے ہیں اور دین حق پر چلنے والے ہیں۔

خارجی یہ سن کر چلا اٹھے کہ تم شخصیت پرست ہو...... اور آپ کو شہید کر دیا۔ اس کے علاوہ آپ کی زوجہ محترمہ اور تین اور قبیلہ طے کی عورتیں جو آپ کے ساتھ تھیں ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے۔ یہ سب کچھ سن کر جناب علی رضی اللہ عنہ کو بڑا صدمہ ہوا اور انہوں نے تفتیش کے لیے حرث بن مرہ العبدی کو بھیجا۔ خارجیوں نے ان کو بھی شہید کر دیا۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی نہروان روانگی

ان حالات میں اہل لشکر نے رائے دی کہ شام پر لشکر کشی سے پہلے خوارج کا قلع قمع کیا جائے۔ چنانچہ امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ نے نہروان کا رخ کیا کہ یہ خوارجیوں کا گڑھ تھا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے پہلے جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور بعد میں قیس رضی اللہ عنہ بن سعد انصاری کو خارجیوں کے پاس بھیجا انہوں نے ان لوگوں کو خطبات دیئے کہ وہ راہ راست پر آ جائیں لیکن خارجیوں نے انکار کر دیا۔ پھر جناب علی رضی اللہ عنہ خود گئے تو خارجیوں کے سرغنوں نے اعلان کیا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی بات مت سنو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملنے کے لیے دوڑ پڑو، یعنی جنگ کرو۔ چنانچہ مجبور ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام خوارج کو گھیرے میں لے لیا اور میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو علم دیا جنہوں نے خوارج کو ایک اور موقع دینے کے لیے اعلان کیا۔ ''جو شخص بلا جنگ ہمارے پاس آ جائے گا، جو شخص معترض نہ ہوگا یا جو کوفہ و مدائن کی طرف لوٹ جائے گا ان سب کے لیے امان ہے۔''

جنگ نہروان

نقشہ سوم پر نہروان کے مقام کی نشان دہی کر دی گئی ہے ویسے نقشہ سوم جناب علی ؓ کی خلافت کے آخری زمانے کی افراتفری کے حالات کی نشان دہی بھی کرتا ہے بہر حال اس زیادہ افراتفری کی بنیاد یہی خارجی ہی تھے جن کا کافی حد تک قلع قمع ہو گیا۔ جناب ابوایوب انصاری ؓ کا اعلان سن کر مزدہ بن نوفل اپنے پانچ سو سواروں کو لے کر خوارج سے الگ ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے کوفہ کی راہ لی اور کچھ جناب علی ؓ کے لشکر میں آ گئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کوئی چار یا ساڑھے چار ہزار ہو گی۔ اب خارجی کوئی اٹھارہ سو کے قریب باقی رہ گئے جنہوں نے دیوانہ وار جناب ابوایوب انصاری ؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ان خارجیوں کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ خارجی دیوانہ وار لڑے وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے کہ ان کی فکر آزاد ہے اور ان کا حاکم صرف اللہ ہے، وہ جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں لیکن ان کو یہ یاد نہ رہا کہ دوسروں کو بھی اسی قسم کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

بہر حال اٹھارہ سو خارجیوں میں سے کوئی دو سو کے قریب زخمی تھے اور عورتوں اور بچوں کو جناب علی ؓ نے چھوڑ دیا۔ باقی سب کے سب جنگ میں مارے گئے جن میں عبداللہ بن وہب، زید بن حصین، حرقوص، عبداللہ بن شجرہ اور شریح بن اوفی کے علاوہ جناب عدی کا لڑکا طرفہ بھی شامل تھا۔ جناب علی ؓ کے لشکر سے بھی سات مجاہدین شہید ہوئے اور کافی لوگ زخمی بھی ہوئے۔

ذوالشدہ کی تلاش

جناب علی ؓ نے فرمایا کہ یہ خارجی وہی لوگ معلوم ہوتے ہیں، جن کے بارے میں ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ فرما گئے ہیں کہ ''وہ لوگ اسلام کے دائرہ سے ایسے نکلے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔'' ان کی لاشوں میں ایک بونے کو تلاش کرو جس کے کندھے پر عورت کے پستان کی طرح گوشت ابھرا ہوا ہو گا تاکہ ہمارے دل کو تسلی ہو جائے کہ حضور پاک ﷺ جن لوگوں کی نشاندہی فرما گئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں اور آپ نے اس بونے کے بارے میں یہ ذکر بھی کیا تھا کہ اس کے ہاتھ بھی ٹیڑھے ہوں گے۔

اہل لشکر نے کافی تلاشی لی لیکن بونا کہیں نظر نہ آیا۔ جناب علی ؓ نے حکم دیا کہ لاشوں کو اٹھا کر ایسے عجیب آدمی کی تلاش کی جائے۔ آخر لاشوں کو ہلایا گیا تو نیچے سے اس بونے کی لاش ملی جو قد میں عام انسانوں سے آدھا بھی نہ تھا، اس کے ہاتھ پاؤں بھی ٹھگنے تھے، ایک کندھے پر گوشت ابھرا ہوا تھا جس کی شکل عورت کے پستان کی طرح تھی اور اس گوشت سے ایک گھنڈی اوپر نکلی ہوئی تھی، اس پر بال تھے۔ اس گوشت کے حصہ کو ہاتھ لگا کر اگر کھینچا جاتا تو وہ گوشت ربڑ

کی طرح ایک بازو کی لمبائی کے برابر بڑھ جاتا۔ سب دیکھنے والوں نے اس عجیب الخلقت شخص کو دیکھ کر توبہ کی اور کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ آدمی اس دن تک پوشیدہ کیسے رہا۔ اللہ کے راز ہیں، اس کو اس دن ظاہر ہونا تھا کہ آقا ﷺ جو فرما گئے تھے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ حق پر ہوں گے، اس پر ایک اور مہر لگنی تھی اور آزادئ فکر کے فلسفہ کا عملی قلع قمع ہونا تھا لیکن افسوس، ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ آج بھی اپنی فکر کو آزاد کیے ہوئے ہیں۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ کو واپسی

دراصل جناب علی رضی اللہ عنہ اب دریائے دجلہ کے علاقہ میں تھے اور مدائن سے ہوکر موصل کے راستے شام جانے کے لیے پہلے بھی آپ نے دریائے دجلہ والا راستہ استعمال کیا تھا۔ اب شام پر لشکر کشی کا وہی راستہ تھا جب آپ نے ملک شام کی طرف کوچ کا ارادہ ظاہر کیا تو اشعث بن قیس کہنے لگا کہ لشکر تھکا ہوا ہے پہلے کوفہ جائیں، کچھ دن آرام کر لیں اور پھر پوری تیاری کے ساتھ ملک شام پر لشکر کشی کرنا بہتر ہوگا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے لشکر پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ کافی لوگ اشعث کی رائے کے حامی ہیں۔ آپ مسکرا دیئے اور کوفہ جانے کا حکم دے دیا۔

مورخین و مبصرین نے اس پہلو پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اشعث، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو وقت حاصل کرنے میں ضرور مدد دے رہا تھا۔ اشعث کے عمل اور رویہ کا جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سے وہ آذر بائیجان کا گورنر تھا اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے اس کو صلاح کے لیے بلایا تھا، وہ اسی زمانے سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ اندرونی تعلقات قائم کیے ہوئے تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اشعث، جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں رہ کر کام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے کر رہا ہو۔ لیکن ایسی کسی چیز کا واضح ثبوت سامنے نہ آیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند دن بعد اشعث بھی فوت ہوگیا۔ اگر وہ زندہ رہتا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اس کو کچھ امارت دی جاتی تو وہ یہ راز پوشیدہ نہ رہتا۔ بہرحال یہ اشعث ہی کی بیٹی تھی جس نے یزید کے ساتھ مل کر امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا کہ وہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ جانتا تھا کہ اشعث کے خاندان کے لوگوں کو خریدا جا سکتا ہے کہ اشعث کا بیٹا قیس جس کا نام اپنے دادا کے نام پر تھا، سانحۂ کربلا کے وقت یزید کے امرائیں سے تھا جس کا ذکر ساتویں باب میں آئے گا۔

''پتا پہ پوت، گھوڑے پہ گھوڑا.......... بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا''

عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا مصر پر حملہ

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو جو یہ وقت مل گیا تو انہوں نے مصر پر حملہ کر دیا۔ دراصل جب جناب

علیؓ کوفہ واپس آئے تو لشکر کے کافی لوگ اپنے گھروں میں چلے گئے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ گھروں میں جانا منع تھا پھر بھی لوگ گھروں کو چلے گئے اور واپس نہ آئے۔ یہ بات تو ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ گھروں میں جانا کیوں منع تھا، کوفہ میں آرام کا مطلب ہی گھروں کا چکر لگانا تھا اور نہ ''ٹھنڈی چھاؤں'' تو مدائن اور شام کی طرف کوچ کرتے ہوئے کئی جگہوں پر مل جاتی اور کوفہ جا کر بارکوں کا سایہ لینا تو مقصود نہ تھا۔ گھروں میں جانے کی اجازت ضرور ہوگی، البتہ لوگ جلدی واپس نہ آئے تو یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے۔

البتہ وقت امیر معاویہؓ کا ساتھ دے رہا تھا اور یہ بڑا عجیب و غریب پہلو ہے کہ وقت نے ہمیشہ حق کے خلاف کام کیا۔ یا کہیں کہ ایسا ڈھیل یا التوا کی وجہ سے ہوا۔ اپنی ساری تاریخ کا مطالعہ کریں تو نتیجہ نکلے گا کہ وقت نے سیاست دانوں کا ساتھ دیا۔ حضرت علیؓ خود بھی ناگزیر وجوہات کی بنا پر وقت کو استعمال نہ کر رہے تھے۔ ان کے سامنے مسلمانوں کی جان اور مال کا سوال تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ شاید وقت معاملات حل کر دے، لیکن جن کے ساتھ مقابلہ تھا، وہ سیاست دان تھے۔ اس لیے انہوں نے اس التوا سے فائدہ اٹھایا۔ اس سلسلہ میں ہم نے اپنی پہلی کتاب سے اس پہلو پر زور دینا شروع کیا اور ''زمان و مکان'' کے سلسلہ میں اکثر جگہوں پر جائزے پیش کئے کہ پہلے دو خلفائے راشدین نے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیا۔ حضور پاکﷺ کے وصال کے وقت خلافت کا مسئلہ، جناب اسامہؓ کے لشکر یا مرتدین کا مسئلہ یا فتح کی حکمت عملی کے سلسلہ میں انہوں نے وقت کو اپنا غلام بنایا اور یہ زندہ قوموں کی نشانی ہے کہ وہ وقت کو اپنا غلام بناتے ہیں۔ اس پہلو کا گہرا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے اور اس پر کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

التوا اور ''وقت'' کا المیہ

امیر معاویہؓ وقت کے معاملات کو خوب استعمال کرتے رہے۔ جناب علیؓ نے اپنا عامل بھیجا تو بغیر سامنے آئے اس کو واپس بھیج دیا اور وقت حاصل کر لیا۔ جناب علیؓ نے بیعت کے لیے لکھ بھیجا تو تین ماہ تک جواب نہ دیا اور جب جواب دیا تو وہ بالکل بے معنی تھا اور پھر ''وقت'' حاصل کر لیا۔ اسی دوران مکہ اور بصرہ میں حالات خراب کرنے میں حصہ لیا تو جناب علیؓ ادھر الجھ گئے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ نے پھر وقت حاصل کر لیا۔ جنگ جمل کے بعد جناب علیؓ نے جناب جریرؓ کو امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا تو آپ نے ان کو کافی عرصہ اپنے پاس روکے رکھا اور وقت حاصل کر لیا۔ آخر جب جناب علیؓ صفین کے مقام پر پہنچے تو انہوں نے مسلمانوں کو خون خرابہ سے بچانے کے لیے دیر کی یا کئی وفد بھیجے تو وقت امیر معاویہؓ کو حاصل ہو گیا۔

آخر آپ نے جنگ شروع کی اور جب امیر معاویہؓ کو شکست ہونے لگی تو انہوں نے قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھا کر وقت حاصل کر لیا۔ پھر منصفوں کی تجویز کے تحت فیصلہ کی مدت چھ ماہ کر دی کہ انہوں نے لوگوں سے مشورہ کرنا ہے

اس سے بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو وقت حاصل ہو گیا۔ اور منصفوں کے فیصلے کے بعد جب جناب علی رضی اللہ عنہ تیار ہوئے کہ شام پر لشکر کشی کریں تو خارجی اٹھ کھڑے ہوئے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پھر وقت مل گیا جب خوارج کا قلع قمع ہو چکا اور آپ شام کی طرف جانے کے لیے تیار ہوئے تو اشعث نے آگے بڑھ کر کہا کہ لشکر کو آرام چاہیے اب لشکر کوفہ میں "آرام" کر رہا تھا تو یہ وقت جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا تو انہوں نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے مصر پر حملہ کروا دیا۔

محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ

جناب محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مصر پر امارت کا ذکر ہو چکا ہے، وہ حالات کو سنبھالا نہ دے سکے اور جو لوگ غیر جانبدار تھے ان کے ساتھ بھی جنگ چھیڑ دی اور معاویہ بن خدیج کو شکست ضرور دے دی لیکن اپنے ہمدردوں کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس برابر خبریں پہنچ رہی تھیں کہ مصر کے حالات محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بس سے باہر نکل رہے تھے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کی نظر اشتر پر پڑی کہ اس کو وہاں بھیجا جائے تو شاید وہ حالات کو سنبھالا دے سکے۔ اشتر جزیرہ کے علاقہ اور عراق کے سرحدی علاقوں پر جو ملک شام سے ملتے تھے، عامل تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر نظر رکھے اور ان علاقوں پر ان کا قابو تھا چنانچہ یہ تمام علاقے قیس بن سعد کی عمل داری میں دے دیئے گئے اور اشتر کو حکم دیا گیا کہ وہ جلدی سے جا کر مصر کی امارت سنبھال لیں۔

اشتر کی وفات

اشتر نے تیزی سے حرکت کی، لیکن سویز (قلزم) کے مقام پر عجیب حالات میں اشتر کا انتقال ہو گیا۔ روایت ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو اشتر کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اور انہوں نے سازش کر کے قلزم کے افسر مال سے اشتر کو زہر دلوا دیا۔ کچھ لوگ اس روایت کو پسند نہیں کرتے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی ہیں کیا وہ ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ معاملات جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور خدا کے درمیان ہیں اور ہم اس سے بڑھ کر اور کوئی تبصرہ نہ کریں گے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی بغاوت کی اور اس وجہ سے جنگ میں کئی مسلمان شہید ہوئے۔ اشتر کو تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں شمار کرتے تھے، اس لیے یہ کہانی سچی بھی ہو سکتی ہے۔

مصر پر حملہ کی تجویز

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نظر اکثر مصر پر رہتی تھی اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے ہی دن سے انہوں نے جناب قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو ساتھ ملانے کی کوشش کی پھر وہ اپنے دفاع میں مصروف تھے لیکن جیسے ہی ان کو جناب علی رضی اللہ عنہ کے

علاقے میں اندرونی خلفشار نظر آیا تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مصر کی طرف مرکوز کر دی۔ اول تو انہوں نے معاویہ بن خدیج یا ان لوگوں کو ساتھ ملانے کی کوشش کی جو محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نالاں تھے اور کوشش یہ تھی کہ مصر پر بغیر کسی لڑائی کے قبضہ ہو جائے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو مصر فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے لیے مصر پر حملہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تیسری کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور مصر کے چولی دامن والے ساتھ کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اس دفعہ بھی عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نہایت ہوشیاری کے ساتھ مصر میں داخل ہوئے وہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مطالبہ پر کئی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور فسطاط کے قریب پہنچ کر ایک میدان میں پڑاؤ کیا۔

وہاں پہنچ کر عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں جنگ کی دھمکی دی۔ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ خط جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے امداد بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن لوگ تیار نہ ہو رہے تھے، ویسے بھی کوفہ اور عراق کے لوگوں کے ساتھ مصر کا دفاع کرنا بڑی مشکل بات تھی، یہ کام تو تب ہو سکتا تھا کہ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ مصر ہی میں دس یا پندرہ ہزار فوج کے ساتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عقب کے لیے ایک خطرہ پیدا کرتے رہتے لیکن صفین کی جنگ کے وقت محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کا پتہ چل گیا تھا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ موقع دیکھ رہے تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ بھی بڑی مشکل کے ساتھ کوفہ میں کوئی دو ہزار مجاہدین اکٹھے کر سکے، جو مصر میں جانے کے لیے تیار ہو گئے جن کو جناب علی رضی اللہ عنہ نے کعب رضی اللہ عنہ بن مالک کے ماتحت مصر روانہ ضرور کر دیا۔

محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شکست اور شہادت

کوفہ سے کمک پہنچنے سے پہلے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص بھانپ چکے تھے کہ لوگ محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر کے ساتھ نہیں تھے اور وہ کوئی دو ہزار کا لشکر اکٹھا کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان آدمیوں پر کنانہ بن بشر کو امیر مقرر کیا۔ کنانہ وہی تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ کی تحریک میں شریک ہو چکا تھا اور دوسری طرف معاویہ بن خدیج وغیرہ بھی عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے ساتھ مل چکے تھے اور سب نے مل کر کنانہ کے لشکر کو گھیرے میں لے لیا۔ کنانہ بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اگر ہم اس کو شہید کہہ دیں تو بھی ٹھیک ہے کہ وہ اسلام کی مرکزی فوج کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ اب محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے جبلہ بن مسروق کے گھر میں پناہ لی تاکہ وہاں سے مکہ مکرمہ یا کوفہ چلے جائیں لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ بن خدیج کو پتہ چل گیا اور اس نے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نکل کر مقابلہ کیا اور شہید ہو گئے۔

روایت ہے کہ آپ کے جسد خاکی کو گدھے کی کھال میں سی کر جلا دیا گیا اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ بڑی افسوس ناک بات ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر داخل ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ بھی آپ کو فاسق کہتے تھے

لیکن آپ نے ندامت محسوس کی تھی اور وہاں سے واپس آ گئے تھے اور جنگ کرتے شہید ہو گئے، آ گے لاش کو جلانے کی کیا ضرورت تھی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کو زندہ گرفتار کرلیا گیا اور آپ کے بڑے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے سفارش بھی کی کہ آپ کو رہا کر دیا جائے لیکن عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص یہ کہہ کر نہ مانا کہ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اس کو زندہ گدھے کی کھال میں سی کر جلا دیا گیا۔ (واللہ اعلم)

بہر حال کعب رضی اللہ عنہ بن مالک دو ہزار کی امداد لے کر کوفہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر پہنچے تو آ گے سے حجاج بن عرفہ انصاری ملے جو مصر سے آ رہے تھے۔ انہوں نے کعب رضی اللہ عنہ بن مالک کو محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی تو کعب واپس کوفہ آ گئے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جارحانہ کارروائیاں

مصر کو فتح کر کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جارحانہ کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ اب وہ اپنے آپ کو ایک طاقت سمجھ رہے تھے جناب علی رضی اللہ عنہ جو پہلے لشکر کشی یا جارحانہ کارروائیوں کرتے رہے۔ اب سب کچھ ردعمل کے طور پر کر رہے تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ہمت بھی ہوگئی کہ انہوں نے عبداللہ بن حضرمی کو بصرہ بھیجا، جس نے وہاں پر خطبات دے کر کافی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت پر اتر آئے اور بصرہ کے نواح میں ایک طاقت بن رہے تھے لیکن وہاں پر جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ گورنر بصرہ کی طرف سے زیاد بن سمیہ امیر تھا۔ اس نے عبداللہ بن حضرمی کو کامیاب نہ ہونے دیا اور ایک جھڑپ میں عبداللہ بھی مارا گیا اور اس کے کافی ساتھی تہ تیغ ہوئے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی عملداری میں خارجی بھی مکمل طور پر خاموش نہ ہوئے تھے۔ فارس کے صوبہ میں چند خارجی اٹھ کھڑے ہوئے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے گورنر جناب سہل بن حنیف انصاری کو نکال دیا۔ اس بغاوت کو بھی زیاد بن سمیہ نے فرو کیا اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے زیاد کو فارس کا عامل مقرر کر دیا۔

اب ذرا نقشہ سوم کا مطالعہ کریں اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جارحانہ کارروائیوں پر نظر ڈالیں کہ ۳۸ اور ۳۹ ہجری میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج نے عراق کے علاقوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور شامی فوج کے لوگوں نے انباء اور عین التمر کے مقامات تک لوٹ مار کی۔ ان مقامات کا پہلی کتاب میں تفصیل سے ذکر آیا ہے کہ جناب خالد رضی اللہ عنہ نے یہ مقامات کیسے فتح کئے۔ بہر حال امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خود بھی دمشق سے نکلے اور رقہ سے لے کر موصل تک کے علاقوں کو تخت و تاراج کیا۔

یہی نہیں بلکہ شام سے ایک فوج نے مدینہ شریف اور مکہ مکرمہ کی طرف بھی پیش قدمی کی جس کو نقشہ سوم میں دکھایا

گیا ہے۔اس مہم کی تیاری امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے سال شروع کر دی تھی، قارئین کو یاد ہوگا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف میں جو قاصد بھیجا اور جس کا ذکر پہلے باب میں ہے وہ قبیصہ حبسی تھا، جس کا قبیلہ مدینہ شریف کے شمال میں آباد تھا اور قبیصہ نے تنبیہہ بھی کی تھی کہ اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو چار ہزار سوار اس کا بدلہ لینے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ظاہر ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف سے شمال کے کچھ قبائل کو اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا اور ان کے ساتھ مل کر اہل شام نے مدینہ شریف، مکہ مکرمہ اور یمن تک چھاپہ مارا اور زبردستی لوگوں سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لینے کی کوشش کی البتہ شامی فوج ان علاقوں پر قبضہ نہ کر سکی کہ لوگوں نے ساتھ نہ دیا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے بھی کوفہ سے چھ ہزار کا لشکر بھیجا، جس کی خبر سن کر اہل شام واپس چلے گئے۔

لیکن حالات ٹھیک نہ ہو رہے تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کے بھائی جناب عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بھی جا کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔ جناب عقیل یہ سارا عرصہ کہاں پر رہے مورخین اس سلسلہ میں خاموش ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ شروع ہی سے جناب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ پر زور طریقے سے شامل نہ تھے کہ ان کا کہیں ذکر نہیں آتا لیکن زیادہ افسوس ناک پہلو جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں ہے، وہ جناب علی کا بایاں بازو رہے لیکن آخری دنوں میں معمولی رنجش کی وجہ سے انہوں نے بصرہ کی گورنری سے استعفیٰ دے دیا اور مکہ شریف چلے گئے البتہ آپ نے امیر معاویہ کے ساتھ ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

یہ بھی روایت ہے کہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کے ساتھ کچھ خط وکتابت کر کے جنگ بندی والی صورت پیدا کر دی۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قیصر روم شمال کی طرف سے مسلمانوں کے علاقوں میں کچھ پیش قدمی کی سوچ رہا تھا کہ رومی سلطنت کے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔اس صورت میں جناب علی رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی خطرہ نہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور آپ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھ دیا کہ پرانی ایرانی اور رومی سلطنتوں کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ملک مصر اور شام پر حکمران رہیں اور جناب علی رضی اللہ عنہ حجاز، عراق اور ایران پر۔ بلکہ کچھ راوی کہتے ہیں کہ قیصر روم کے خلاف جناب علی رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امداد دینے کو بھی تیار تھے اور ہمیں ان روایات پر کوئی شبہ نہیں۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کی شان ہی ایسی ہے کہ تمام حالات میں انہوں نے ایسے اسلامی کردار کا مظاہرہ کیا جس کو بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔

عام طور پر اسلام کے بڑے بڑے عالم یا فقیہ، میدان جنگ میں وہ نام نہ پیدا کر سکے جو جناب خالد رضی اللہ عنہ، جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص، جناب شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ، جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل، جناب قعقاع رضی اللہ عنہ وغیرہ پیدا کر سکے۔ایسے عظیم مجاہد ہزاروں کی تعداد میں تھے، عالم اور فقیہ بہادر ضرور تھے لیکن امارت بہت کم

نے کی اور جنگ میں بھی بہت کم کمانڈر رہے۔ ان میں جناب عبداللہ بن مسعودؓ، جناب معاذؓ بن جبل، جناب عبداللہ بن عمرؓ، جناب انسؓ بن مالک، جناب عبداللہ بن عباسؓ، جناب ابو ہریرہؓ وغیرہ متعدد فقیہ شامل ہیں لیکن جناب علی المرتضیٰؓ واحد فقیہ ہیں جو میدان جنگ میں بھی شیر تھے اور اسلامی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس سے جناب علیؓ کا مقام اوروں سے بلند تر نظر نہ آئے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ کے شیر، حضور پاک ﷺ کے چچیرے بھائی اور داماد حضور پاک ﷺ کے زمانے کی ہر جنگ کے دولہا، جناب علیؓ اپنی امارت کے دوران میں ان حالات سے دوچار ہوئے جو پچھلے چند ابواب میں بیان ہو چکے ہیں اور خاص کر یہ باب تو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت علیؓ کے لیے اب امیر معاویہؓ کے خلاف بھرپور کارروائی کرنا مشکل ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے راز نرالے ہیں۔ اس نے حب الدنیا والوں کو کامیابی عطا کر دی اور اللہ تعالیٰ قرآن پاک کے اس فرمان کو ثابت کر رہا ہے کہ بیشک زیادہ لوگ گمراہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اکثریت، اقلیت، حزب اقتدار اور حزب اختلاف وغیرہ کے موجودہ طرز حکومت کے اصولوں کو غلط کہتا ہے اور پوری قوم کو اللہ کی فوج بنانے اور وحدت کا حکم دیتا ہے۔

بہرحال طبقات ابن سعد میں روایت ہے کہ اپنی شہادت سے چند روز پہلے جناب علی المرتضیٰؓ کو خواب میں حضور پاک سرکار دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زیارت ہوئی۔ جناب علیؓ نے عرض کی۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! مجھے آپ کی امت سے کس قدر فساد کے ساتھ واسطہ پڑا۔''

حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''اے علی! دعا مانگ لو کہ فساد سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔''

جناب علیؓ نے خواب ہی میں دعا مانگی۔ ''اے اللہ! مجھے ان لوگوں کے بدلے وہ دے جو ان سے بہتر ہے اور ان کو وہ دے جو ان جیسا ہو یا جس کے وہ حق دار ہیں۔''

ترجمے یا متن کے الفاظ کے بارے میں بعض کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ان لوگوں کو مجھ سے کم تر یا بدتر دے۔ واللہ اعلم۔ اول تو بات خواب کی ہے اس لیے ہم تبصرہ نہ کریں گے۔ البتہ آگے تفصیل میں جائیں گے کہ حضور پاک ﷺ کی اولاد اپنی بیٹی جناب فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علیؓ سے چلی اور اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کی حکومت سے داغدار نہ کرنا چاہتا تھا اس لیے یہ عجیب وغریب واقعات ہوئے کہ یہ امت جناب علیؓ کی امارت کا فائدہ نہ اٹھا سکی۔

❖❖❖

پانچواں باب

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت

اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت

جناب علی کرم اللہ وجہہ ۱۷، رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو شہید ہوئے۔ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اے علی! اگلوں کا سب سے زیادہ بدبخت حضرت صالح کی اونٹنی کے پاؤں کاٹنے والا تھا اور پچھلوں میں بدبخت ترین وہ ہوگا جو آپ پر یہاں وار کرے گا۔'' اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے بدن پر اس جگہ پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ رکھ کر نشاندہی فرمائی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی دنیا کا ایک بدترین شخص ہے۔

جناب ابوطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی تو مصر کے لوگوں میں عبدالرحمٰن بن ملجم تھا کہ وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گھیراؤ کے فتنہ میں شامل تھا۔ عبدالرحمٰن، جناب علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے لیے آگے بڑھا تو آپ نے رد کر دیا بلکہ عبدالرحمٰن کی دوسری کوشش کو بھی رد کیا اور فرمایا کہ امت کے اس بدبخت ترین شخص کو میرے قتل سے کوئی نہ روک سکے گا۔

تین خارجی

روایت ہے کہ نہروان سے جو خارجی جنگ سے پہلے وہ جگہ چھوڑ گئے تھے انہوں نے ایسا کسی ندامت کی وجہ سے نہ کیا تھا۔ یہ ان کی وقتی کارروائی تھی تا کہ اس کے بعد اپنے گروہ کو کسی اور شکل میں ترتیب دیں۔ ان کی افلاطونی اور آزادیٔ فکر ان پر برابر چھائی ہوئی تھی اور ان میں سے متعدد لوگوں نے بعد میں بغاوتوں میں حصہ لیا بہر حال ان میں سے تین شخص مکہ شریف میں ملے۔ ایک عبدالرحمٰن بن ملجم المرادی تھا جس کو مورخین نے مصری کہا ہے۔ دراصل مصری کہنے کی وجہ

یہ ہے کہ وہ مصر کے لوگوں کے ساتھ آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ میں شریک ہوا تھا اور شاید مصر کی فتح کے بعد مصر میں جا کر آباد ہو گیا تھا لیکن اس کا تعلق قبیلہ مراد سے تھا جو بنو کندہ کے حلیف تھے اور یمن وحضرموت کے علاقہ میں آباد تھے۔ قبیلہ مراد کو قبیلہ حمیر کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے دونوں ابرک بن عبداللہ اور عمر بن بکیر تھے جن کا تعلق مالک بن نویرہ کے قبیلہ تمیم سے تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ قبیلہ تمیم کے لوگ خراب تھے کالی بھیڑیں ہر جگہ ہوتی ہیں ویسے قبیلہ تمیم میں سے جناب قعقاع رضی اللہ عنہ اور جناب عاصم رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اسلام کی تاریخ میں درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

بہرحال ان تینوں گمراہوں نے مکہ میں عہد و پیمان کیا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ، جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص تینوں کو ختم کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کو ان جھگڑوں سے نجات ملے اور فیصلہ یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن بن ملجم، امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرے گا۔ ابرک نے جس کو حجاج بھی کہتے تھے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی ٹھانی اور عمر بن بکیر جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو شہید کرنے پر مقرر ہوا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ تینوں ۱۷، رمضان صبح کے وقت اپنی یہ کارروائی مکمل کریں اور تینوں اپنی منزلوں کی طرف چل پڑے۔

ابن ملجم کوفہ میں

عبدالرحمٰن بن ملجم کوفہ آیا اور وہاں پر سب سے پہلے شبیب بن شجرہ اشجعی کو ملا جو اس کا ہم خیال تھا اور اس زمانے میں مصلحتاً خاموش تھا۔ شبیب پہلے تو کچھ جھجھلایا لیکن عبدالرحمٰن نے جب نہروان میں خارجی دوستوں کے قتل ہونے کی بات شبیب کو یاد دلائی تو شبیب اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ انہی دنوں ابن ملجم کی نظر قبیلہ تمیم رباب کی ایک خوبصورت عورت پر پڑ گئی جو تاریخ میں قطام بنت شجنہ کے نام سے مشہور تھی۔ وہ ابن ملجم کو پسند آ گئی اور ساتھ ہی اس کو پتہ چلا کہ اس عورت کا باپ اور بھائی نہروان میں مارے گئے تھے۔ عبدالرحمٰن نے اس عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تو وہ کہنے لگی کہ حق مہر تین ہزار درہم باندھو اور امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ ہی شہید کرو۔ ابن ملجم کہنے لگا کہ رقم تو اس کے پاس نہیں البتہ وہ اس شہر میں آیا ہی جناب علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی غرض سے ہے اور اس طرح ابن ملجم نے وعدہ کر لیا۔

طبقات ابن سعد کے مطابق عبدالرحمٰن نے جس روز امیر المومنین کو شہید کیا اس شب لوگوں نے اس کو اشعث بن قیس کے ساتھ مسجد کے ایک کونے میں سرگوشیاں کرتے بھی دیکھا تھا اور تاریخوں میں ایسی روایات بھی ہیں کہ ۱۷، رمضان صبح کو اشعث مسجد میں نماز پڑھنے نہ آیا اور نماز کے بعد اپنے بیٹے قیس کو بھیجا کہ مسجد سے کوئی خبر لائے تو قیس نے

واپس جا کر باپ کو بتایا کہ عبدالرحمٰن بن ملجم نے جناب امیر المومنین پر حملہ کیا اور اب وہ سخت زخمی ہیں۔ اشعث کے بارے میں ہم اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں، اب بات قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ ہاں البتہ اس کا یہی بیٹا قیس سانحہ کربلا کے وقت یزید کی فوج میں تھا۔

ابن ملجم کا حملہ

ابن ملجم نے صبح نماز کے وقت جناب امیر المومنین پر حملہ کر دیا اور آپ شدید زخمی ہو گئے۔ آپ نے اپنے بھانجے جعدہ رضی اللہ عنہ بن ہبیرہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ جعدہ رضی اللہ عنہ کی ماں ام ہانی رضی اللہ عنہا تھیں جن کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حقیقی بہن سمجھتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ شریف کی فتح کے بعد ان تمام لوگوں کو بھی معاف کر دیا تھا جن کو ام ہانی رضی اللہ عنہا نے امن دیا تھا۔ بہر حال جناب علی رضی اللہ عنہ کو زخمی حالت میں اٹھا کر گھر لایا گیا۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کی وصیتیں

جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے متعدد وصیتیں کیں جن کی تفصیل میں ہم نہیں جا رہے۔ دو تین البتہ بڑی اہم یہ ہیں۔

الف: اگر میں جانبر نہ ہو سکا تو میرے قاتل کو ایک ہی وار سے ختم کرنا۔

ب: میرے قاتل کے بغیر کسی اور کو نہ مارنا (اور یہی وجہ تھی کہ باقی سازش والے بچ گئے اور شاید اشعث بھی اسی وجہ سے بچ گیا)

ج: میری شہادت کا بہانہ بنا کر اور لوگوں کی خونریزی کے لیے تلوار نہ اٹھانا۔ خاص کر میرا اشارہ بنو ہاشم اور زیادہ اپنے دادا عبدالمطلب کی اولاد کی طرف ہے کہ میرے خون کو قصاص کا مسئلہ نہ بنانا۔

(یہ وصیت بڑی اہم ہے کہ جناب علی کی وارث ساری امت ہے اور نہ کہ ان کے دادا کی اولاد)

ظاہر ہے کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ ان کی شہادت ایک سازش کا نتیجہ ہے اس سازش میں معلوم نہیں کون کون ملوث تھے اور یہ سازش اسی سازش کا حصہ تھی جس کے تحت جناب عمر رضی اللہ عنہ اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے غیروں کے ساتھ دنیاوی لالچ کے پیچھے اپنوں میں سے کون کون دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس میں شریک تھے، یہ ایک کتاب کا مضمون ہے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ بات کو آگے نہ بڑھانا چاہتے تھے اور آپ مسلمانوں میں خونریزی کو ختم کرنا چاہتے تھے ان کو خلافت یا امارت کی بالکل چاہت نہ تھی۔ لوگوں نے مجبور کیا اور حالات بہت بھیانک تھے اور مرکز کو سہارا دینے کے لیے

انہوں نے خلافت قبول کر لی اور پھر مسلمانوں کے امیر کے لحاظ سے ان پر فرض تھا کہ اس مرکز کو قائم کرنے کے لیے لڑائی اور جنگ سے کسی بھی فتنہ یا بغاوت کو فرو کرتے لیکن انہوں نے ان جنگوں میں وہ طریقہ کار استعمال نہ کیا، جو اللہ تعالیٰ کے اس شیر نے کفار کے ساتھ جنگوں میں استعمال کیا۔ انہوں نے خون خرابہ سے بہتر گریز کیا کہ ان پر یہ الزام عائد نہ ہو کہ اپنی امارت کے لیے لوگوں کو تہس نہس کر دیا اور جو کی باسی روٹی پر گزارہ کرنے والے کو امارت کا کوئی شوق نہ تھا۔

یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ مغربی مبصرین حیران ہیں کہ مسلمانوں نے جناب علی رضی اللہ عنہ جیسی عظیم شخصیت کی امارت کا فائدہ نہ اٹھایا، ورنہ ساری دنیا ان کے قدموں کے نیچے ہوتی اور مسلمانوں نے الٹا ان کے راستے میں روڑے اٹکائے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ حب دنیا کی وجہ سے ہوا۔

بیٹوں کے لیے وصیتیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے تین بڑے بیٹوں امام حسن رضی اللہ عنہ، امام حسین رضی اللہ عنہ اور امام محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ کو آپس میں اتفاق سے رہنے کی ہدایت کی، باقی بچے چھوٹے تھے۔ روایت ہے کہ سانحہ کربلا کے علم بردار جناب عباس رضی اللہ عنہ اس وقت تک بلوغت تک بھی نہ پہنچے تھے اور باقی اولاد شاید ان سے بھی چھوٹی تھی۔ ان سب باتوں کا ذکر ساتویں باب میں ہے۔

طبری کے مطابق جناب جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اگر آپ ہم سے جدا ہو جائیں تو کیا ہم امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا، نہ میں ایسا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ آپ لوگ خود سمجھ دار ہیں۔ بعض راویوں کے مطابق آگے یہ بھی فرمایا کہ یہ فیصلہ مجلس شوریٰ کرے گی لیکن اس بات کو مخالفین نے غلط رنگ بھی دیا کہ دبی زبان میں جناب علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا تھا کہ کہا تھا میں اس سے منع نہیں کرتا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے یزید کو خلافت کا وارث بھی قرار دیدیا۔ لیکن نعوذ باللہ کہاں نواسہ سرکار دو عالم جناب امام حسن رضی اللہ عنہ اور کہاں یزید۔

صحیح روایات

صحیح روایات کے مطابق جناب علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تخلیہ میں بھی باتیں کیں لیکن جو باتیں کھلم کھلا کیں ان میں سے کچھ اس طرح تھیں۔ "بیٹا! دنیا کی امارت سے اپنے دامن کو داغ دار نہیں کرنا اور جب کسی داغ داری یا خرابی کا پتہ چلے تو اس کو پرانے کپڑے کی طرح پھینک دینا۔"

یہ بھی روایت ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو آنے والے واقعات سے بھی کچھ آگاہ کیا۔ یہ جناب

علی ﷛ کا جائزہ بھی ہوسکتا ہے کہ مومن کی فراست کے بارے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔ بہرحال یہاں عقلی گھوڑے دوڑانے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جناب علی ﷛ نے یہ فراست اپنے لیے کیوں نہ استعمال کی، تو ہم اس سلسلہ میں پچھلے ابواب میں بھرپور تبصرہ کر چکے ہیں کہ وہ مرکز کو سہارا دینے کے لیے مجبور تھے اور اصولوں پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔ امام حسن ﷛ کی اپنی شان ہے اور یہاں پر ہم آپ کی اس تقریر کا متن دے رہے ہیں جو آپ نے جناب علی ﷛ کا جنازہ پڑھنے کے بعد کی۔ یہ تقریر دریا کو کوزے میں بند کر دیتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

''اے لوگو! کل ایک ایسا شخص تم سے جدا ہوگیا کہ نہ اولین اس سے آگے بڑھے اور نہ آخرین اسے پائیں گے۔ حضور پاک ﷺ اسے میدان جنگ میں بھیجتے تھے اور اسے جھنڈا دیتے تھے۔ وہ اس وقت تک واپس نہیں آتا تھا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ اسے فتح نہیں دے دیتا تھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام اس کی داہنی طرف رہتے تھے اور حضرت میکائیل اس کی بائیں طرف۔ اس نے نہ چاندی چھوڑی نہ سونا، سوائے سات سو درہم کے جو اس کی عطا سے بچ گئے اور جس سے اس کا ارادہ خادم خریدنے کا تھا۔ آپ کو اسی روز اٹھایا گیا جس روز جناب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی روح کو معراج ہوئی، یعنی رمضان کی سترہویں شب۔''

تبصرہ:

قارئین! یہ ترجمہ ہم نے تحت اللفظ کے اصول پر لکھا ہے کہ اردو الفاظ عربی صرف ونحو کی طرز ہیں۔ جناب علی ﷛ کی وفات کے بعد ایک زمانہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ حضور پاک ﷺ کی وفات سے ایک زمانہ آنکھوں سے اوجھل ضرور ہوا۔ لیکن وہ کارواں چلتا رہا۔ جس کو حضور پاک ﷺ صراط مستقیم پر اپنے سامنے لگا گئے تھے۔ اب اس کاررواں کے چوتھے اور آخری سردار بھی گئے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں ٹوٹے ہوئے زمانے کو تسلسل دینے کے لیے مبعوث ہوا۔ ٹوٹے ہوئے زمانے کو تسلسل تو مل گیا اور کارواں تو اب بھی چل رہا ہے لیکن اس کارواں کو جو شان پہلے چند سالوں میں نصیب ہوئی اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ ہاں، کبھی کبھی اس شان کی دھندلی سی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن نہ وہ خوش نصیب دور واپس آیا اور نہ غبار راہ کو وادیٔ سینا کا سا فروغ حاصل ہوا۔ آپ ﷺ کے سب رفقاء چلتے پھرتے اسلام تھے اور جو کچھ ان رفقاء کے حکموں کے تحت ہوا، وہ سب قرآن پاک اور حدیث نبوی کے مطابق تھا۔

روایت ہے کہ امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''سنو! مجھے خبر ملی ہے کہ تو میرے نانا کے دین میں قیاس کو ترجیح دیتا ہے۔''

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کو مسند پر بٹھا دیا اور خود دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گئے اور گزارش کی کہ ''جناب اگر میں قیاس سے کام لیتا تو عورت کمزور ہے، اس کے حصہ کو مرد سے زیادہ کر دیتا، عورت کی ناپاکی کی حالت میں روزہ کی قضا کے بجائے نماز کی قضا کا حکم دیتا کہ نماز، روزہ سے افضل ہے۔ جنابت کے بعد غسل کی بجائے پیشاب کرنے کے بعد غسل کا حکم دیتا کہ پیشاب، منی کی نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ میں تو احکام قرآن پاک اور آپ کے نانا کی سنت کے مطابق دیتا ہوں اور وہ چیز نکل کرنے کا حکم دیتا ہوں جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان احکاموں کے تحت کر گئے ہیں۔

جناب امام باقر رحمۃ اللہ علیہ، مسند سے اٹھے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو گلے لگا لیا۔ اور قارئین، ان کے ہاں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور شک کی صورت میں بات چیت کر لیتے تھے۔ اور یہ تھا عملی اسلام، جس پر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے خود عمل کیا اور دوسروں کو عمل کرنے کا حکم دیا۔ اور پہلے سو سالوں میں بھی عقائد کے کوئی اختلافات نہ تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے یا ان کی حکمت عملیوں کے ثمرات تک محدود کر کے آپ کے سامنے اس معطر باغ سے خوشبو پیش کر دی ہے اور ساتھ گزارش کی ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک زمانہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دیگر خارجی

عبدالرحمٰن بن ملجم، حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے میں اکیلا نہ تھا۔ اس کے ایک ساتھی شبیب کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ بھی ساتھ تھا لیکن وہ بھاگ گیا۔ اس کو ایک شخص ابن حضرمی نے پکڑ لیا اور تلوار بھی چھین لی۔ لیکن ابن حضرمی ڈر گیا کہ لوگ اس کو قاتلوں میں شمار نہ کر دیں۔ اس لیے اس نے شبیب کو چھوڑ دیا۔ تیسرا آدمی وردان تھا، جو ابن ملجم کو اس کی معشوقہ قطام بن شجنہ نے دیا کہ یہ اس کے خاندان کا آدمی تھا۔ وردان بھی بھاگ گیا۔ لیکن جن لوگوں کے پاس جا کر پناہ لی، وہ بھی گو خارجی تھے لیکن ڈر گئے کہ وردان کو بھی پکڑوا دے گا اس لیے انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔

عبدالرحمٰن بن ملجم کے دوسرے دو ساتھی جن کے ساتھ مکہ مکرمہ میں عہد و پیمان ہوئے تھے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ ابرک بن عبداللہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اتفاق سے زخم کاری نہ تھا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بچ گئے لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا زخم اتنا شدید تھا کہ اس کے بعد امیر معاویہ کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو سکی اور اطباً نے یہ چیز پہلے ہی بتا دی تھی۔ بہر حال امیر معاویہ نے ابرک کو قتل کرا دیا۔

تیسرے سازشی عمرو بن بکیر نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص پر حملہ کرنا تھا لیکن جناب عمرو اس دن بیمار تھے، نماز پڑھنے نہ آئے ان کی جگہ ان کے ایک فوجی افسر خارجہ بن ابی حبیبہ نے نماز پڑھائی۔ عمرو بن بکیر کو پتہ چلا کہ عمرو رضی اللہ عنہ بن

عاص بچ گئے ہیں تو اس نے بڑا افسوس کیا کہ ہائے اس نے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو شہید کرنا تھا چنانچہ اس وجہ سے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو پوری کہانی کا پتہ چل گیا اور انہوں نے عمرو بن بکیر کو قتل کرا دیا۔

تبصرہ:

قارئین! تھوڑی دیر کے لیے رک جائیں مشیت ایزدی کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ تینوں خارجی اپنے مقصد کو ہر حالت میں حاصل کرنے کے لیے نہ صرف تیار تھے بلکہ عملی طور پر انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو نبھایا لیکن اللہ کی قدرت دیکھیں کہ وار صرف امت کے درخشاں ستارہ پر کامیاب ہوا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد تقریباً بیس سال زندہ رہے اور ان کے زمانے کے حالات پر مختصر تبصرہ اگلے باب میں موجود ہے۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کو مصر کی حکومت جناب علی کے زمانے میں ہی مل گئی اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد پکی ہوگئی۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے بھی عمر میں چند سال بڑے تھے کہ کہتے تھے کہ ان کو یاد ہے کہ مکہ کی گلیوں میں شور اٹھا کہ خطاب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہرحال جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ''جلال مصطفیٰ'' اور اس سلسلہ کی چاروں کتابوں میں ہمارے ساتھ رہے اور صحابہ کرام میں سے کسی اور کو اتنے واقعات یا حالات سے نہ گزرنا پڑا جتنے سے جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص گزرے۔ آپ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے تیسرے سال ہی میں وفات پا گئے لیکن افریقہ کے حالات کو استحکام دے گئے۔ آپ از خود ایک کتاب کا مضمون ہیں۔ اور آپ نے اسلام کی جو خدمت کی وہ سنہری الفاظ میں لکھی جانے کے قابل ہے۔ لیکن منصف کے طور پر جو کچھ آپ نے کیا، اس پر بھی کوئی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ بہرحال وہ دوستوں کے بڑے وفادار دوست تھے اور ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی آدمی سے دھوکا نہیں کھایا۔ وہ فوجی معاملات اور سیاست کے علاوہ علم الکلام کے بھی ماہر تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ بستر مرگ پر تمام دوستوں اور خادموں کو بلایا اور کہنے لگے کہ تم لوگ میری خدمت کا بڑا وعدہ کرتے تھے، اب مجھے موت سے بچاؤ۔ پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ نہیں، مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں تمہارے سامنے اپنی لغزشوں پر افسوس کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد، اپنی تمام تر کہانی مختصر لفظوں میں دہرائی اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہوں ورنہ بخشش کی کوئی امید نہیں۔ البتہ ایک بات ہے کہ اسلام لے آنے کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال و جمال کی وجہ سے میری آنکھیں اس طرح جھکی رہتی تھیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک بھی بیان نہیں کر سکتا اور چونکہ میں نے اپنا ہاتھ ان کے مبارک ہاتھ میں دیا اس لیے شاید ان کی شفاعت ہو جائے اور یہی میری بخشش کی وجہ بن جائے۔

قارئین !اس اصول اور سبق کو یاد رکھنا کہ حضور پاک ﷺ کی غلامی ہی سب کچھ ہے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ کا دفن

جناب علی کرم اللہ وجہہ کو پوشیدگی میں دفن کیا گیا۔ خطرہ یہ تھا کہ خارجیوں کو اگر امیر المومنین کی آخری آرام گاہ کا پتہ چل گیا تو جب کبھی ان کو موقع مل گیا تو وہ جسد مبارک کی بے عزتی کریں گے۔ قبر کی جگہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے چند قریبی رشتہ داروں کو پتہ تھی اور سو سال بعد آپ کی قبر کی نشان دہی کی گئی۔ روایت ہے کہ آپ امام حسن رضی اللہ عنہ کو اس سلسلہ میں خود ہدایت دے گئے تھے۔ بہر حال یہ مقام نجف اشرف میں ہے اور آج خلائق کا جم غفیر وہاں ہر موسم میں حاضری دیتا ہے خاص کر ستر ہ رمضان المبارک کو لاکھوں زائرین وہاں حاضری دیتے ہیں۔

امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت

جناب علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کی مجلس مشاورت نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا اور جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد نے سب سے پہلے بیعت کی اور پھر سب مسلمانوں نے بیعت کی۔ اس کے بعد امیر المومنین جناب حسن رضی اللہ عنہ کے سامنے قاتل ابن ملجم کو پیش کیا گیا اور اس نے اپنا گناہ تسلیم کیا۔ اصل میں وہ یہ گناہ جناب علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے بھی تسلیم کر چکا تھا اور بار بار کہتا تھا کہ شاید امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بچ گئے ہوں گے اور اس کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ بھی ختم کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال ابن ملجم کی ایسی کوئی بات نہ سنی گئی اور امیر المومنین جناب امام حسن رضی اللہ عنہ نے ابن ملجم کے قتل کا حکم دیا۔

طبقات ابن سعد میں یہ روایت بھی ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابن ملجم کو زندہ جلا دیا جائے لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ، امام محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر طیار نے کہا کہ نہیں، وہ اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس کو ایذا دے کر قتل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اس کے پاؤں کاٹے، مگر اس نے کوئی فریاد نہ کی، ہاتھ کاٹے، آنکھوں میں سلائی پھیری، وہ خاموش تھا۔ لیکن جب زبان کاٹنے لگے تو چیخ اٹھا کہ اس کی زبان نہ کاٹی جائے کہ وہ آخری وقت تک اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری رکھنا چاہتا ہے۔

تبصرہ:

ہمیں اس روایت پر بالکل یقین نہیں آتا۔ جناب علی کرم اللہ وجہہ حکم دے گئے تھے کہ اگر وہ نہ بچ سکے تو ابن ملجم کو ایک ہی ضرب سے قتل کرنا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت پر عمل نہ کیا جاتا۔ پس تاریخ کے بامقصد مطالعہ کے بعد اس جیسی اضافی باتوں کو تاریخ سے نکال دینا چاہیے۔ ان سب میں ایک سوچی سمجھی

ہوئی شرارت ہے جو بنوامیہ کے زمانے میں خوب پھلی پھولی۔ اس میں ایک طرف جناب امام حسین پر حرف لانا مقصود تھا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ذاتی معاملہ بنا کر ابن ملجم کو کس طرح ایذا پہنچائی گئی۔

لیکن ایسی کہانیوں میں خارجیوں کے کردار کو بھی کچھ عجیب رنگ میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اصولوں کے بڑے پکے تھے اور آخری وقت تک اپنے اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ خارجی جنہوں نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حباب اور ان کی زوجہ محترمہ کو شہید کیا ان کے بارے میں عجیب وغریب افسانے گھڑ لئے گئے ہیں کہ وہ بڑے دیانت دار اور اصول پسند تھے وغیرہ۔ ویسے اکثر اہل قلم اور قصہ نویسوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی زیادہ برائی کی طرف راغب ہو جائے تو یہ لوگ کہیں سے اس کے کچھ اچھے اصول بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ قارئین نے اکثر چوروں اور ڈاکوؤں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ اہل قلم ان کے چور اور ڈاکو بننے کی ساری ذمہ داری معاشرہ پر ڈال دیتے ہیں اور باقی کسر ان ڈاکوؤں کو اصول پرست پیش کر کے نکال لی جاتی ہے۔ اس لیے ہم اس غلط روی کو ابن ملجم کی مثال سے ہی بھانپ سکتے ہیں۔

ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے کہ وہ دنیا کا بدبخت ترین ترین آدمی ہے۔ تو کیا ایسے آدمی کی زبان پر آخری وقت اللہ کا ذکر جاری ہو سکتا ہے۔ ہاں، شاید وہ اپنی محبوبہ قطام بنت شجنہ کو یاد کر رہا ہوگا۔ دراصل تمام خارجیوں کا یہی حال تھا کہ وہ آزاد فکر تھے، ان کا کوئی اصول نہ تھا۔ انہوں نے گروہ اس لیے بنا لیے تھے کہ ان میں منفی باتوں پر اتحاد تھا۔ خارجیوں نے اسلام کا بڑا نقصان کیا۔ انہوں نے فضول بحث کی بنیاد رکھی اور ایسی فضول بحث کی وجہ سے اسلام میں معتزلہ آئے۔ انہوں نے یونانی فلسفہ پڑھا اور اسلام میں قضا وقدر، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا قرآن پاک کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے پر ایسے فضول بحث اور مباحثے کیے، جنہوں نے امت کو مختلف عقائدی گروہوں میں بانٹ دیا۔ ہمارے ہاں اس زمانے میں کچھ دانشور خارجیوں کی کہیں سے اچھی باتیں نکال لاتے ہیں اور ان کے اصولوں کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ بڑا افسوس ناک رویہ ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ یہ لوگ امت سے اس طرح نکل گئے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ اور جنگ نہروان میں بونے کی لاش نے خارجیوں کے گمراہ ہونے پر مہر ثبت کر دی۔ اس لیے اس ''مردہ'' کو اب دفن ہی رہنے دیا جائے کہ اس سلسلہ میں مزید تحقیق ہمیں اور گمراہ کرے گی۔

امام حسن رضی اللہ عنہ اور خلافت

امام حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت میں کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی رائے دی تھی کہ خلافت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بہر حال اس زمانے میں جناب علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ مجبوری والی بات ہے کہ اسلام کے مرکز کو سہارا دینے کی ضرورت تھی اور کوئی آگے نہ بڑھ رہا تھا۔

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو الگ بات کی تھی، اس میں ضرور مشورہ دے گئے ہوں کہ خلافت کو خالی سہارا دینا، اب خلافت کا معاملہ ختم ہے اب امارت کا زمانہ آنے والا ہے۔

جناب علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی وفات سے پہلے چالیس ہزار کا لشکر تیار کیا تھا کہ وہ شام کی طرف کوچ کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ مسلمانوں میں امیر صرف ایک ہی ہوسکتا ہے اور اس کا فیصلہ ہو جائے۔ آپ نے جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد کو اسی وجہ سے بلایا ہوا تھا۔ وہ جزیرہ کے علاقوں کے عامل تھے کہ اس علاقہ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حربی کارروائیوں کی روک تھام کر رہے تھے۔ جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد فوجی اور سیاسی لحاظ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پایہ کی شخصیت تھے اور اب امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد وہ جلد جزیرہ واپس لوٹ گئے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی جارحانہ کارروائی کا موقع نہ مل سکے۔

البتہ کوفہ میں کسی شر پسند نے یہ خبر اڑا دی کہ اشتر کی طرح جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد کو بھی زہر دے کر شہید کر دیا گیا ہے۔ کسی نے افواہ کو اور بڑھایا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک لشکر جرار کے ساتھ کوفہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ایسی خبریں سننے کے بعد امام حسن رضی اللہ عنہ کے لشکر سے کئی آدمی بھاگنے شروع ہو گئے اور بعض نے جاتے وقت امام حسن رضی اللہ عنہ کے خیمہ سے کچھ سامان بھی لوٹ لیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے کہ خلافت راشدہ تیس سال رہے گی۔ وہ مدت پوری ہونے والی تھی۔ امام حسن رضی اللہ عنہ نے ازخود امیر معاویہ کو لکھ دیا تھا کہ کچھ شرائط کے تحت وہ خلافت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے بھیج چکے تھے کہ جو شرائط آپ لکھنا چاہتے ہیں اس کاغذ پر لکھ لیں، ان کو منظور ہیں۔ آگے مختلف روایات ہیں کہ بعد میں امیر معاویہ اپنی بات پر قائم نہ رہے۔ اور ایسی روایات بھی ہیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ یا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر وغیرہ کسی سے صلاح نہ کی تھی کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو رہے ہیں اور امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ بات پسند نہ کی تھی۔

تبصرہ:

یہ سب کہانیاں بنو امیہ یا فتنہ والوں نے گھڑیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو خلافت کی چاہت تھی۔ جناب علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد اس چیز سے بلند تھے اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے بیٹوں میں کبھی کوئی اختلاف نہ ہوتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کربلا میں سب اپنی جان کا نذرانہ اس طرح پیش نہ کرتے جس کا ذکر ساتویں باب میں ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں یا ساری اولاد علی کے دامن کو کسی غلط قسم کی امارت کی سیاہی سے داغ دار نہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر امارت اس گھرانے میں چلی جاتی تو شاید کسی سے غلطی ہوتی تو خواہ مخواہ لوگ انگلی اٹھاتے کہ اولاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہو

گیا۔ چنانچہ اگلے باب میں ہم امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری اور اس کے اثرات کی تفصیل میں جائیں گے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ اور کثرت ازواج

بنو امیہ نے ایک اور شوشہ بھی چھوڑا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ خلافت کر بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان کو زیادہ دلچسپی عورتوں سے تھی کہ متعدد شادیاں کیں۔ ہم پہلی کتاب میں جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کے سلسلہ میں کثرت ازواج کا ذکر کر چکے ہیں اور امام حسن کے سلسلہ میں وعدہ کیا تھا کہ اس پہلو کی چوتھی کتاب میں وضاحت کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے عام لوگوں کی نسبت زیادہ شادیاں ضرور کیں اور عام لوگوں کی نسبت زیادہ عورتوں کو طلاق دی۔ اسلام دین فطرت ہے اور اس کی ہر پہلو کی کھل کر وضاحت کرنی چاہیے۔ اول یہ بات کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا، شریعت کے لحاظ سے کوئی غلطی نہ کی۔ وہ چار عورتوں کی حد سے نہ بڑھے۔ اسلام انسانوں کی طرح مرد اور عورت کے درمیان قانونی رشتۂ نکاح کا قائل ہے اور جانوروں کی طرح غلط روی کو روکتا ہے۔ پھر امام حسن رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک جمال تھا اور آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کافی مشابہ تھے۔ آپ کو شادی کے بہت پیغام آتے تھے بلکہ کئی دفعہ ایسے پیغام بھی آئے کہ معیادی شادی کر لی جائے۔ کچھ عورتوں کا عقیدہ تھا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ بننے کے بعد ان کی بخشش ہو جائے گی اور اس میں کوئی غلط بات نہ تھی کہ یہ عورتیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی وجہ سے ایسا کرنا چاہتی تھیں۔

یہ بات عام ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ سے طلاق لینے کے بعد ان کی سابقہ کئی عورتیں ان کی اتنی ہی عزت کرتی تھیں جتنی اس وقت کرتی تھیں جب آپ امام حسن رضی اللہ عنہ کے گھر میں ہوتی تھیں تو امید واثق ہے کہ اب امام حسن رضی اللہ عنہ کی کثرت ازواج والی بات کی وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال

اس سلسلہ کی کتابوں میں ہم نے جناب خالد رضی اللہ عنہ کی شادیوں یا بیوہ سے شادی کے سلسلہ میں کھل کر بحث کی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنگوں کے بعد شادیاں کیں۔ لیکن غیروں کے الزامات سے متاثر ہو کر ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں بھی خواہ مخواہ تذبذب میں پڑ جاتے ہیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض حدیثوں کو کھل کر بیان کرتے وقت کچھ شرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے یا واقعہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ازواج مطہرات، خوشبو اور نماز سے محبت کی۔

اب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ازواج مطہرات سے محبت نے عورت کی شان کو چار چاند لگا دیئے کہ عورت دنیا کی

حسین ترین چیز ہے اور اسلام کے لحاظ سے عورت کی خوبصورتی اس کے شرم و حیا اور شرم و حیا کے تحت ہر ادا میں ہے اور حضور پاک ﷺ نے اپنی ازواج سے محبت کر کے امت کے لیے ایک پاکیزہ راستے کی نشاندہی کی۔ دراصل یہ واقعہ ایسا تھا کہ حضور پاک ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت تک جناب فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور آپ بھی جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ رہتی تھیں۔ آپ اس وقت نماز پڑھ رہی تھیں۔ جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور پاک ﷺ کو عطر یا خوشبو پیش کی۔ تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''میری تین محبوب ترین چیزیں یہاں موجود ہیں۔'' یعنی اول جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی زوجہ محترمہ تھیں اور آپ کو محبوب تھیں، دوم خوشبو جو جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو پیش کی اور سوم آپ کی بیٹی فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا جو آپ کو بہت محبوب تھیں۔ وہ چونکہ نماز پڑھ رہی تھیں تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔'' چنانچہ ہمارے محدثین نے حضور پاک ﷺ کی جن تین چیزوں کا ذکر کیا ہے کہ عورت، نماز اور خوشبو حضور پاک ﷺ کو محبوب تھیں تو اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے لیکن ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہمارے لوگ حضور پاک کی اپنی ازواج مطہرات سے محبت کی بات کرتے وقت شرما جاتے ہیں اور بڑے عجیب و غریب بیان دیتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے صرف ایک کنواری عورت سے شادی کی باقی شادیاں دلجوئی کے لیے کیں، ضرورت کے تحت کیں اور کچھ غیروں کی اس بات پر بھی ہم چپ کر جاتے ہیں کہ ان شادیوں میں کچھ سیاست تھی اور لوگوں کو ساتھ ملانے کے لیے یہ شادیاں کیں وغیرہ۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو حضور پاک ﷺ انصار میں بھی شادیاں کرتے کہ حضور پاک ﷺ کی سب سے زیادہ مدد انصار نے کی اور حضور پاک ﷺ کو ایسی مدد کی ضرورت تھی۔

رشتوں سے تعلق سونے پر سہاگہ ہے لیکن اسلام میں اصلی بات اللہ اور رسول ﷺ والا رشتہ ہے۔ ورنہ ہم تیسری کتاب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں اور اس کتاب میں جنگ جمل میں رشتہ داری والی بات کا بھرپور بیان کر چکے ہیں کہ رشتے ہر جگہ بہت گہرے تھے۔ لیکن وہاں اصول حب للہ اور بغض للہ تھا اور حضور پاک ﷺ کی شادیوں میں چند خوش قسمت عورتوں کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ اللہ کے حبیب ﷺ کی زوجہ محترمہ بنیں اور آج امہات المومنین یعنی امت کی مائیں کہلاتی ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے عورت کی ذات کو یہ شرف بخشا اور اس کو محبت کے ذریعہ سے وہ مقام عطا فرمایا جس کی وہ ازل سے حق دار تھی۔ لیکن جاہلیت یا باطل والوں نے عورت کو صرف دنیا اور کھلونا سمجھ رکھا تھا۔ بے شک عورت، دنیا کا دوسرا نام ہے اور وہ دنیا کی حسین ترین چیز ہے اور ہر عورت حسین ہے۔ لیکن اسلام نے اس حسن کو شرم و حیا، عزت، غیرت اور اصولوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ ازدواجی رشتہ کو قانونی حیثیت دی۔ لونڈیوں یا ام ولد کو وہ عزت بخشی کہ اولاد ہو جانے کے بعد ان کو بھی وہی برابری حاصل ہوگئی۔ اور آہستہ آہستہ کنیزوں اور لونڈیوں والا معاملہ

خود بخود ختم ہوگیا۔ بہر حال اسلام کسی کثرت ازدواج کے اصول کو اپنانے کے لیے کوئی زور نہیں دیتا۔ حضور پاک ﷺ کی مثال عطا اور شرف کے طور پر دی گئی کہ عورت کو مقام مل گیا۔ امام حسن رضی اللہ عنہ چونکہ حضور پاک ﷺ کے ہم شکل تھے، تو عورتوں نے ان کے ساتھ شادی کرنا ایک سعادت سمجھی۔ لیکن اس سے کثرت ازواج کی نہ حوصلہ افزائی ہوئی اور نہ راہ نکلی ..... کہ اسلام ازواج میں برابری اور انصاف کا علمبردار ہے اور حکم یہ ہے کہ اگر انصاف یا برابری نہ کر سکو تو دوسری شادی بھی نہ کرو۔

خلافت راشدہ یا نظام مصطفیٰ ﷺ

عملی طور پر خلافت راشدہ کا یہ آخری باب ہے کہ اگلے باب میں ہم سنت الجماعت اور خلافت راشدہ کے زمانے کی حکمت عملی کے عطیات اور ثمرات کا سرسری ذکر کریں گے۔ ہمارے ہاں آج نظام اسلام، قانون مصطفیٰ، نظام مصطفیٰ اور خلافت راشدہ کی تلمیحات اور اصلاحات اکثر زیر بحث رہتی ہیں کہ چودہ سو سال کے بعد اسلام کے نام پر جو ملک بنایا گیا اس میں کیا طریقہ کار رائج کیا جائے۔ نظام مصطفیٰ یا قانون مصطفیٰ وسیع تر معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں کہ قانون بنیادی چیز ہے اور یہ قانون اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعہ سے نازل کیا۔ حضور پاک ﷺ نے اپنی سنت کے ذریعہ سے اس پر عمل کیا اور عمل کروایا۔ چنانچہ سب طریق کار کو اگر نظام مصطفیٰ کہہ لیں تو بھی صحیح ہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں یہی نظام جاری وساری رہا۔ اس کے بعد امیر معاویہ کا زمانہ آتا ہے، اس کو کیا نام دیں، یہ بحث بڑی لمبی ہو جائے گی لیکن ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زمانے میں نظام مصطفیٰ کسی نہ کسی طرح جاری وساری رہا۔ بلکہ جناب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نظام مصطفیٰ اس شان سے جاری رہا کہ لوگوں نے اس زمانے کو خلافت راشدہ کا حصہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد چودہ سو سال میں سینکڑوں حکمران ایسے آئے جن کی حکومت میں نظام مصطفیٰ کے جاری رہنے کی جھلکیاں ملتی ہیں اور ہم تاریخ کے اس بامقصد مطالعہ میں یہی مدعا ذہن میں لیے ہوئے ہیں کہ ہم اپنے لیے تاریخ میں ایسے نشان راہ تلاش کریں۔

چنانچہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا زمانہ واپس نہیں آسکتا اور تلمیحات کے چکر میں پڑنے کی بجائے ہمیں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے نزدیک ترین زمانے میں کچھ نہ کچھ نشانِ راہ مل جائے گا کہ وہی حکمت عملی جاری تو رہے۔ اس لیے اگلا باب ان نشانات کا سرسری ذکر ہے۔

نتائج و اسباق

ا۔ یہ دونوں ابواب کئی لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ایک زمانہ ہر لحاظ سے اوجھل ہوگیا۔ حضور پاک ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی مشہور ہستیاں وفات پا چکی تھیں۔ اب چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باقی رہ

گئے تھے اور زیادہ تر عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرزند تھے اس لیے آنے والے بیس سال بھی اچھی طرح سے گزر گئے اور بعد میں زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو اسلام کے مرکز کو سہارا دیا، اس کو قائم رکھا اور جن حالات میں وہ ایسا کر سکے، یہ انہی کی عظمت تھی کہ ایسا ہو سکا۔

۳۔ دارالخلافہ کی تبدیلی میں حکمت پنہاں تھی کہ آپ ایسا کر سکے تو اوروں کو بھی ہمت ہو گئی کہ اسلام کے مرکز بعد میں دمشق، بغداد، قاہرہ یا قسطنطنیہ میں بھی رہے۔

۴۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کی شان کو سمجھنے کے لیے اس باب کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے کہ قوم اگر جناب علی کی شان کے بارے میں متفق ہو جائے تو ہمارے کئی تفرقے مٹ سکتے ہیں اور اس میں کچھ مشکل نہیں۔ ہمارا دین وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اصحاب ثلاثہ کے بارے میں بھی ہمارا وہی رویہ ہونا چاہیے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تھا اور دشمنوں یا حق و باطل کے سلسلہ میں بھی جناب علی رضی اللہ عنہ کی پیروی کر کے ہم اپنے سب تفرقے مٹا سکتے ہیں۔

۵۔ ان دونوں ابواب میں ہمارے لیے بے شمار اسباق ہیں، جو ساتھ ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں یا اشارے موجود ہیں کہ آزادیٔ فکر یا خارجیوں کے طور طریقوں نے اسلام کو بڑے نقصان پہنچائے اور ہمیں موجودہ زمانے میں بھی ایسے دانشوروں کی افلاطونی سے بچنا چاہیے، جو خارجیوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

۶۔ حب الدنیا، خود غرضی، سازش، مطلب پرستی وغیرہ نے اسلام کے مرکز کو کمزور کیا اور وقت آ گیا تھا کہ قیصر روم، شام پر حملہ کر دیتا۔ لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ نے اس زمانے میں امیر معاویہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی بجائے ان کو مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہمیں یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اپنوں اور غیروں میں تمیز کر سکیں۔

۷۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے روکھی سوکھی روٹی پر گزارا کیا اور صرف سات سو درہم کی پونجی چھوڑی اور وہ بھی ایک خادم خریدنے کے لیے اکٹھی کر رہے تھے۔ اسی ایک بات میں ہمارے لیے کئی اسباق ہیں لیکن جناب علی رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اپنی شہادت کے لیے قاتل کو چھوڑ کر کسی اور سے قصاص نہ لینے کی سختی سے ہدایات کیں کہ یہ پہلو امت میں وہ تفرقہ نہ ڈالے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت یا اس سلسلہ میں قصاص کے طلب کی وجہ سے ہوا۔ ہر مسلمان کی اصل وارث امت یا حکومت ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ حکومت از خود اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پیروی کرتی ہو۔

❖❖❖

چھٹا باب

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی حکمت عملی

عطیات وثمرات

سنۃ الجماعت

خلفائے راشدین کے زمانے کے واقعات امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں ہم کوئی مزید جائزے پیش نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف جاری حکمت عملی کے عطیات وثمرات کا سرسری ذکر کریں گے۔ ۴۱ ہجری کو سنۃ الجماعت کہتے ہیں اور اس لفظ کی اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم از خود پیشگوئی فرما گئے تھے۔ کہ میرے اس بیٹے یعنی امام حسن رضی اللہ عنہ کی وجہ سے مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان میں صلح ہو گی اور اس سے اسلام کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔ یہ صلح کیسے واقع ہوئی۔ اس کے کیا اثرات ظاہر ہوئے۔ دشمنیاں کیسے ختم ہوئیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں یا ان کی اولاد کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اولاد علی رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باقی ساتھیوں کا جناب معاویہؓ کے ساتھ رویہ کیسا تھا۔ پرانی حکمت وعملیوں کو کس طرح جاری وساری کیا گیا، اس کے نتائج کیا نکلے۔ فتوحات کو کتنی وسعت ملی، وغیرہ۔ ایسے معاملات ہیں جو ایک پوری کتاب کا مضمون ہیں لیکن ارساتھ جائزے بھی پیش کئے جائیں تو یہ ایک بہت بڑا مضمون ہے لیکن ہم یہاں پر بامقصد مصالعہ کے بعد چند سرسری اور عملی ذکر کریں گے۔ کہ عملی نتائج کیا نکلے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کے ساتھ وحدت اور مرکزیت کو کیسے دوبارہ قائم کیا۔ امارت کا اسلامی پہلو کیا ہے اور یہ اتنا بڑا مضمون ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے کے بامقصد مطالعے کا نچوڑ ان بیس سالوں میں ہمارے سامنے آ جاتا ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جیسی ہستیاں تو پھر واپس نہیں آ سکتیں عام مسلمانوں کا طرز کیا ہونا چاہیے۔ اور کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔

امام حسن رضی اللہ عنہ کا رویہ

ہم امام حسن رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں تفصیلی تبصرہ پچھلے ابواب میں کر چکے ہیں، کہ خلافت، امارت، میدان جنگ یا دنیا کے باقی معاملات کے بارے میں ان کا کیا رویہ تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہونے کو تیار تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قسم کا کوئی آدمی مقابلے میں ہوتا، تو کیا پھر بھی امام حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو جاتے؟ اکثر لوگوں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کی امن پسندی کے تحت جائزہ پیش کیا ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ ایسا برداشت کر لیتے کہ کئی عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے فرزندوں مثلاً عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر رضی اللہ عنہ یا عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے برداشت کر لیا۔ اول تو وہ حالات بھی مختلف تھے اور دوم عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی یزید کو خلیفہ تعلیم نہ کیا۔ لیکن امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار بالکل صحیح نہیں۔ یزید کے سلسلے میں امام حسن رضی اللہ عنہ کا رویہ، امام حسینؓ سے بھی سخت ہوتا اور یہی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کی شان ہے۔ کہ یہ چیز ان کو باقیوں سے اتم رکھتی ہے۔ دونوں بھائی جلال و جمال میں بالکل ایک جیسے تھے۔ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں امام حسین رضی اللہ عنہ بھی وہی کرتے اور کیا جو ان کے عظیم بھائی نے کیا۔ اور اس کا آگے چل کر ہم عملی ثبوت پیش کریں گے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری

بے شک اپنے نزدیک والے تمام ساتھیوں کو اطلاع دے کر اور ان کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہی جناب امام حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت سے دستبرداری اختیار کی۔ اور یہی نہیں بلکہ اپنے امرا کو جائز حقوق دلوائے۔ ساتھ ہی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے وعدہ لیا کہ وہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ بہتر برتاؤ اختیار کریں گے۔ جن لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگوں میں بھرپور حصہ لیا، ان پر عتاب نہ کریں گے۔ آگے چل کر ہم عملی طور پر واضح کریں گے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نہ صرف اپنی ان باتوں پر قائم رہے، بلکہ سب مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کئی خاص فرمانبردار لوگ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دست راست بھی بن گئے۔ اس لئے یہ روایات جن کا مختصر طور پر پچھلے باب میں ذکر تھا، کہ خلافت سے دستبرداری، امام حسن رضی اللہ عنہ کا ذاتی فعل تھا، بالکل غلط ہیں۔ اور بعد میں تفرقہ بڑھانے والوں نے کئی کہانیاں گھڑ لیں اور وہ لوگ یہاں تک چلے گئے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور افسوس ایسے لوگ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلہ کا فرمان بھی بھول گئے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سب کچھ جانتے تھے۔ ان کو دونوں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کے رویوں کی خوب خبر تھی۔ انہوں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو جو ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے بھیج دیئے، کہ اُن کو امام حسن رضی اللہ عنہ کی تمام شرائط منظور تھیں۔

اس کاغذ کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ جس میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ وہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلافت کے سلسلہ میں کوئی جنگ کرنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن ان کو بتایا کہ یہ دنیاوی معاملات بڑے عجیب وغریب ہیں۔ یہ امارت کا سلسلہ اس دنیا میں اب اس طرح نہیں چلے گا جیسا جناب صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چلا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دنوں اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مثال بھی دی، کہ لوگوں کا ان کے ساتھ کیا رویہ تھا۔ یہ حکومت اور یہ سیاست عجیب وغریب صورت اختیار کر چکی ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو گزارش کی، کہ آپ اپنے آپ کو ان مشکل باتوں سے داغ دار نہ کریں۔ وغیرہ

قارئین! ہم یہاں پر صرف چھوٹا سا تبصرہ کریں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اس کے حبیب ﷺ کے اولاد کو حکومت کے معاملات سے داغ دار نہ کیا جائے۔ ورنہ حق کے لحاظ سے لوگ ضروری طور پر انہی کو امت کا وارث قرار دیتے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کے کئی راز تھے۔ کہ اول حضور پاک ﷺ کی ساری اُمت آپ ﷺ کی وارث ہے۔ اور حضور پاک ﷺ کے نواسوں کی اولاد کو دنیا کی بادشاہی بے شک نہ ملی۔ لیکن وہ پھر بھی بادشاہ کہلاتے ہیں۔ اور آج بھی تمام سادات کو لوگ ''شاہ جی'' کے پیارے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب رائے شماری کرائی تو سب سے اوپر حضور پاک ﷺ کی اولاد کے نام لکھوائے اور پھر باقی ہاشمیوں کے یعنی حضور پاک ﷺ کے پردادا کی اولاد کو حضور پاک ﷺ کے وجہ سے یہ شرف دیا۔ حضرت جنید بغدادی پہلوانی کرتے تھے۔ ایک کشتی میں حضور پاک ﷺ کے نواسوں کی اولاد سے ایک پہلوان کے ساتھ مقابلہ آ گیا۔ اس پہلوان نے کان میں کہہ دیا کہ وہ اولادِ رسول ﷺ ہے۔ تو جناب جنید جھٹ زمین پر لیٹ گئے۔ اور پھر ان کے سامنے دنیا روشن ہوگئی۔ جناب اورنگ زیب جب اپنے بیٹوں یا عاملوں کو خط لکھتے تھے تو ساتھ لکھتے تھے کہ تمہاری عملداری میں جو سادات ہوں، ان کی حد سے زیادہ عزت کرو اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ عزت قائم ودائم ہے۔

دستبرداری کے عملی اور فوری نتائج

جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا، اس کی شرائط پر ہم تبصرے پہلے کر چکے ہیں۔ ہم معاہدہ کی شرطوں کی تفصیل میں نہ جائیں گے، کہ وہاں پر کچھ اختلافات ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی بات پر قائم نہ رہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے صرف اپنے ذاتی فائدہ کو ترجیح دی۔ ہمارے لحاظ سے یہ بات صحیح نہیں ہیں اور ہم یہ واضح کریں گے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تمام شرطوں پر قائم رہے۔

ایک حدیث مبارکہ کا ذکر آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا، ''کہ میرے صحابہ کی راحت معاویہ رضی اللہ عنہ تک ہے، اس کے بعد راحت نہیں، اور عرب کی راحت ہشام تک ہے اس کے بعد وہ راحت نہیں''۔ عملی طور پر یہ حدیث

مبارکہ صحیح ثابت ہوئی۔ اس لئے لوگ اس کو ضعیف نہیں کہتے۔ کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بڑی عزت رہی۔ بعد میں حالات خراب ہو گئے۔ اس طرح ہشام بن عبد الملک کے زمانے کے بعد بنوامیہ کا زوال شروع ہوا۔ اور عباسیہ کے زمانے میں خراسانی یا برمکی اور ترک یا باقی عجم کے لوگ ہر جگہ چھا گئے۔ اور عرب کے رہنے والوں کے لئے وہ راحت نہ رہی۔ اس سب میں شاید مشیتِ ایزدی بھی تھی کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہ سکتے۔

یہاں پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث مبارکہ کی وجہ سے شاید امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مدت سے حکومت یا خلافت کا خیال اپنے دل میں لئے ہوئے ہوں۔ جناب علی رضی اللہ عنہ اور ان کے درمیان جو کچھ ہوا، وہ ہم اسی طرح بیان کر آئے ہیں۔ سخت الفاظ جو استعمال ہوئے وہ اسی طرح لکھ دیئے۔ بغاوت کا ذکر بھی کر دیا لیکن وہ ہم زمانہ تھے اور جو کچھ ہوا وہ امیر معاویہ اور ان کے اللہ کے درمیان ہے۔ اب ہم یہ کہیں گے کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔ اور سنۃ الجماعت ہو گیا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے ہمارا رویہ بھی وہی ہونا چاہیے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں۔ باقی غیر جانبدار صحابہ رضی اللہ عنہم یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حواریوں کا تھا۔

غیر جانبدار صحابہ رضی اللہ عنہم

جناب علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لاتعداد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غیر جانبدار رہے۔ ان میں عشرہ مبشرہ سے جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص، اور جناب سعید رضی اللہ عنہ بن زید جو فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب کے خاوند تھے، خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے کئی لوگ غیر جانبدار تھے۔ ان کو چھوڑ کر جناب زبیر رضی اللہ عنہ کے تمام بیٹے، عبداللہ رضی اللہ عنہ، مصعب رضی اللہ عنہ اور عروہ رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبیداللہ کی اولاد اور انصار مدینہ سے بھی کچھ لوگ غیر جانبدار تھے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد ان سب صحابہ کرام نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا اور ان کی بیعت کی۔ بلکہ ان کے ماتحت کئی کام سرانجام دیئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار اور حواری

ہم پچھلے ابواب میں جناب قیس رضی اللہ عنہ بن سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ کا ذکر تفصیل سے کر آئے ہیں۔ جناب قیس رضی اللہ عنہ کے خط اور اس کت سخت الفاظ کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور ان سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوئی باز پرس نہ کی۔ میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریبی

رفیق تھے۔انہوں نے بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔اوران کا ذکر آ گے تفصیل سے آ تا ہے۔البتہ فارس کا گورنر زیاد بن سمیہ کچھ تذبذب میں تھا۔اوراس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو نہ صرف راضی کر لیا بلکہ اپنا بھائی بھی بنالیا۔زیاد کا بڑا بھائی ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ صحابی تھے اور طائف میں سے بھاگ کر اولین مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں۔انہی کے بیٹے عبدالرحمٰن کے ذریعہ سے جناب علی نے زیاد کے ساتھ رابطہ قائم کیا،جس کا ذکر جنگ جمل کے بعد ہو چکا ہے۔اب ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو بہت منع کیا،کہ جو کچھ ہو۔کہ ہم اپنی ماں کے بیٹے مشہور ہیں۔لیکن اسلام نے ہمیں بہت عزت دی ہے۔اب کسی کو باپ بنانے کی ضرورت نہیں،لیکن زیاد نہ مانا۔اوروہ زیاد بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باقی رشتہ داروں یعنی بہن ام ہانی رضی اللہ عنہ کے بیٹوں،جناب جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے بیٹوں، عبداللہ رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ وغیرہ سب نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور بنو ہاشم میں سے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تمام چچاؤں کے بیٹوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیعت کر لی۔

جناب عائشہ صدیقہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما

قارئین کو یاد ہوگا کہ مصر کو فتح کرنے کے بعد جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا ہوا،اس کا رنج جناب جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے بیٹوں عبداللہ رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ کو بھی تھا اور جناب علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے یحیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی،کہ وہ ان کے اخیافی بھائی تھے۔لیکن سب سے زیادہ رنج ام امومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تھا،کہ وہ ان کے بھائی تھے۔اس سلسلے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور گزارش کی کہ حالات کی وجہ سے مجبوری تھی۔چنانچہ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خاموش ہو گئیں لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب بھی مدینہ شریف آتے تو امہات المومنین کی خدمت میں حاضر ہوتے اوران کی باتیں سنتے بلکہ صلح مشورہ بھی کرتے۔

اہلِ مدینہ کی باتوں کو برداشت کرنا

جب خلافت سنبھالنے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پہلی دفعہ مدینہ شریف گئے تو کوچ انصار اور مہاجرین،جو مدینہ سے باہر اپنے کھیتوں میں رہتے تھے۔وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے استقبال کو نہ آئے۔کہ ان میں سے اکثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمدرد تھے۔امیر معاویہ نے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔اور ایک دعوت کا انتظام کیا،جس میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا مہاجرین وانصار کو بھی دعوت دی،جوان کو ملنے نہ آئے تھے۔ایک آدھ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا"کہ آپ لوگ پہلے نظر نہیں آئے"۔

کچھ نے جواب دیا کہ وہ دور زمینوں پر کام میں مصروف تھے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ: ''کسی سواری کا بندوبست کر لیتے''۔

مہمان: ''سواریاں کافی حد تک ختم ہو چکی ہیں''۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ: ''وہ کیسے''؟

مہمان: ''کچھ اس وقت ختم ہو گئیں جب آپ اور آپ کے والد مدینہ شریف پر حملہ آور ہوتے رہے، کچھ اب کی خانہ جنگی کی وجہ سے''۔ (یہ طنز تھی)

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ: ''(بغیر غصے کے) پھر آج کل وقت کیسے کاٹتے ہو''؟

مہمان: ''گوشہ نشینی'' سے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ: ''بڑا اچھا شغل ہے، اسے قائم رکھو''۔

وحدت اور مرکزیت

اس کہانی میں کتنی سچائی ہے اس پر تبصرہ کرنا فضول ہے لیکن واقعی حالات ایسے تھے اور قرون اولیٰ کے مسلمان بات منہ پر کر دیتے تھے اور پھر اختلاف ختم ہو جاتے تھے۔ تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ زیادہ ذمہ داری حاکم پر ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دنیاوی حاکم کے طور پر بھی بری اونچی سیاست کا مظاہرہ کیا اور دین پر بھی قائم رہا۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کے دستبرداری کے عملی نتائج پچھلے چند پیراگراف میں بیان کر دیئے گئے۔ اب قارئین خود اندازہ لگا لیں کہ کتنی وحدت اور مرکزیت آ چکی تھی۔

سیاسی استحکام

اس وحدت اور مرکزیت کی وجہ سے جو سیاسی اور اندرونی استحکام نصیب ہوا اس کا مختصر ذکر ضروری ہے کہ عملی نتائج سامنے آ جائیں۔

مدینہ شریف

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف میں مروان بن حکم کو گورنر بنا کر بھیجا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے سے مدینہ شریف کی ہر اونچ نیچ کا واقف تھا۔ وہاں پر اگر چند لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو آرام کا مشورہ دیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ شریف کو سیاسی اکھاڑہ نہ بنانا چاہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے سبق حاصل کر لیا وہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خود عزت

کرتا تھا۔ اور شرارت والوں پر مروان خود نظر رکھے ہوئے تھے لیکن مروان نے زرا خود مختاری دکھائی تو وہاں پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے ولید بن عتبہ کو گورنر بنا دیا بلکہ سعید رضی اللہ عنہ بن عاص سابق گورنر کوفہ کو ہمیشہ مدینہ شریف میں رکھا کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہر خبر سے آگاہ رکھتا تھا۔

مصر وافریقہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے ہی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص مصر کے گورنر بن چکے تھے اور ان کی برقہ اور صرابلس تک عمل داری تھی۔ اُسے مغرب والے علاقے خراج دیتے تھے۔ آپ کی وفات کی بعد آپ کے عظیم فرزند جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ کے لئے گورنر رہے۔ پھر پرانی حکمت عملی کے تحت افریقہ میں مزید فتوحات ہوئیں جو کا ذکر ہم آگے ثمرات کے تحت کر رہے ہیں۔

کوفہ

شروع میں کوفہ کی گورنری چند سال جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کے پاس رہی بعد میں جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کو گورنر بنا دیا گیا کہ وہاں پر کسی مضبوط آدمی کی ضرورت تھی۔ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر اس کتاب اور پچھلی تینوں کتابوں میں کثرت سے ہو چکا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ نے دس سال تک کوفہ کی گورنری کی۔ سیاست میں استقامت آئی اور فتوحات بھی ہوئیں جن کا ذکر ثمرات کے تحت آگے آتا ہے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کوفہ کی گورنری بھی بصرہ کے گورنر زیاد بن سمیہ کے حوالے کر دی گئی۔ زیاد کا ذکر ابھی ابھی ہو چکا ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبید اللہ گورنر بنا جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

بصرہ

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زیاد کے بارے میں کچھ عجیب تذبذب میں تھے اور ان کو خیال تھا کہ شاید زیاد ہمیشہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے یاد میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مکمل وفاداری نہ دکھا سکے گا لیکن آخر میں انہوں نے اس کو زیاد بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ بنا دیا۔ حالانکہ کئی لوگوں نے قسم اٹھائی کہ زمانہ جہالت میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے زیاد کی ماں سمیہ کی شکل بھی نہ دیکھی تھی لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسے کام پوشیدگی میں ہوتے ہیں۔ زیاد ان کے والد کا ہم شکل ہے اور اس کے بعد انہوں نے بصرہ کی گورنری زیاد کے سپرد کر دی کہ وہ خارجیوں پر نظر رکھے پہلے جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے تین سو خارجیوں کو قتل کرایا لیکن زیاد نے خارجیوں کا ایسا قلع قمع کرایا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسی خارجی کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

حکمتِ عملی کے ثمرات

یہ وحدت اور مرکزیت حاصل کرنے کے بعد اور مکمل اندرونی استحکام کا راستہ اختیار کرنے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعین کردہ حکمت عملی اور خلفائے راشدین کی اس حکمت عملی کو اپنانے کے ثمرات حاصل کرنے شروع کر دیئے۔ اندرونی خلفشار کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ رک گیا تھا اور حالات ایسی صورت حال اختیار کر گئے کہ قیصر روم شام پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔

اہل روم کے ساتھ جنگ

اب نقشہ چہارم پر نظر دوڑائیں۔ یہ اناطولیہ اور ایشیا کو چک کا محاذ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آرمینیا یا کاکیشیا کے پہاڑوں میں جارجیا تک جو پیش قدمی ہوئی تھی اندرونی خلفشار کی وجہ سے وہ کاروائی رک گئی۔ ادھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جزیرہ قبرص اور روڈس پر قبضہ کر رکھا تھا اور مسلمان بحری طاقت ضرور بن گئے تھے لیکن یہاں بھی جمود پیدا ہو چکا تھا اور یہ جمود بڑا خطرناک ہوتا ہے اس لئے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس جمود کو توڑ دیا جس کا مختصر حال کچھ اس طرح ہے۔

قسطنطنیہ کی دیواروں تک

مورخین لکھتے ہیں کہ ۴۷ ہجری سے ۵۴ یا ۵۵ ہجری تک مسلمان تقریباً سات سال قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ نے یہ بھی لکھ دیا کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے رکھا۔ یہ بات صحیح نہیں البتہ مسلمان لگاتار سات سال تک قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے رہے لیکن ایسا اکثر گرمیوں کے موسم میں ہوتا تھا۔ سردیوں میں مسلمان جزیرہ روڈس میں واپس آ جاتے تھے اور ۵۲ ہجری میں وہاں پر ایک پکی چھاؤنی بھی بنائی کہ سردیوں میں بہتر طور پر آرام کر سکیں۔

بہر حال قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی مسلمانوں کی یہ پہلی کوشش تھی۔ ویسے ایسی فتح میں پورے سات سو سال لگ گئے اور آخر قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) غازی سلطان محمد فاتح کے عہد میں ۱۴۵۳ میں فتح ہوا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے والے کے لئے جنت کی بشارت دی تھی۔ اس لئے خلیفہ اول کے زمانے سے مسلمان مجاہدین شام اور روم کے علاقوں کے افواج میں شامل ہو کر دراصل قسطنطنیہ کی فتوحات میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

قسطنطنیہ کو اللہ تعالیٰ نے عجیب وغریب قدرتی دفاع عطا کیا تھا۔ کئی طرف سمندر تھا، پھر خشکی اور بیچ میں کھاڑیاں، علاوہ آبنائے فاسفورس یا درہ دانیال کے علاقے دو سمندروں یعنی بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کو آپس میں ملاتے تھے۔ ایک

طرف اناطولیہ یاایشیا کوچک کا جزیرہ نما اور دوسری طرف یورپ یا جزیرہ نما بلقان کے ایک حصہ جس پر قسطنطنیہ کا شہر واقع تھا اور وہاں پر خود گیلی پولی یا ئی اور چھوٹے چھوٹے جزیرہ نما تھے۔ جن میں جزیرہ نما آڈر ینویل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سلطان محمد فاتح نے بھی خشکی پر بحری جہاز چلا کر یہ شہر فتح کرلیا اور دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی بارود کا بھر پور استعمال نہ ہوا تھا کہ اہل یورپ چلا اٹھے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ اور سلطان محمد فاتح کا یہ حملہ ایشیا سے نہ تھا بلکہ کئی سال پہلے اس کے آباؤاجداد یا پیش رو یورپ یا بلقان کے بڑے حصے پر قابض تھے لیکن قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکے تھے۔

ان تمام سات سو سالوں میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے یا قسطنطنیہ کے دفاع کے سلسلہ میں اہل یورپ نے جو کاروائیاں کیں اگر ان کا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب میں بھی کہانی ختم نہ ہوگی اور یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ قرون اولی کے مسلمانوں کا سلام کرتے ہیں کہ ۴۷ ہجری میں وہ قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچ گئے تھے۔

زمینی اور موسمی حالات کی رکاوٹیں

دراصل انطاکیہ اور طرطوس کے شہروں کو فتح کرنے کے بعد مسلمان اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ پہاڑی رکاوٹوں کی وجہ سے اور ایشیائے کوچک کی سطح مرتفع کی وجہ سے مسلمان سارے ایشیا کوچک پر قبضہ نہ رکھ سکیں گے۔ پھر موسمی حالات ایسے تھے کہ گرم علاقوں کے رہنے والے لوگ سردیوں میں ان خشکی کے علاقوں میں نہ رہ سکتے تھے جو موجودہ ترکی یا اناطولیہ کا حصہ ہیں اور ان علاقوں میں آباد ہو کر شاید مسلمانوں کی دوسری یا تیسری نسل خشکی کے علاقوں یعنی موجودہ انگورہ یا بروسہ وغیرہ کی طرف پیش قدمی کر سکے پھر ان علاقوں پر قبضہ رکھنے کے لئے لوگوں کو ایسی آب وہوا کا عادی ہونا چاہیے چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اور دعوتِ جہاد

البتہ قسطنطنیہ کے سلسلہ میں حضور پاک ﷺ کے فرمان پر سب مسلمان دل و جان سے قربان تھے اور اس سلسلے میں جب بھی جہاد کی دعوت ملتی، مسلمان تیار ہو جاتے خشکی کی طرف سے حمص کے گورنر جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن خالد رضی اللہ عنہ بن ولید رضی اللہ عنہ اور جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سعی ۴۳ ہجری سے اناطولیہ کے علاقوں پر حملہ کر رہے تھے اور متعدد مسلمان مجاہدین ان جنگوں میں شریک ہو رہے تھے لیکن ۴۷ ہجری سے جناب سفیان رضی اللہ عنہ بن عوف ازدی کے ماتحت مسلمانوں نے جزیرہ روڈس سے آگے بڑھ کر سیدھا قسطنطنیہ پر حملہ کر دیا جس کو نقشہ چہارم میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے لئے جو جہاد کی دعوت دی گئی تو مکہ مکرمہ اور مدینہ شریف سے بھی متعدد مجاہدین دمشق پہنچ گئے کہ وہ ایسے جہاد میں ہر وقت شرکت کے لئے تیار تھے لیکن حالات کا پورا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہدین باری باری جاتے تھے اور لشکر کے سپ

سالار بھی تبدیل ہوتے رہتے تھے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو بھی سپہ سالار بنا کر وہاں بھیجنا چاہا لیکن یزید ٹال گیا کہ اس نے سنا تھا کہ وہاں بڑی تکلیف ہوتی تھی اور کئی مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں یزید نے کچھ شعر بھی کہے جن کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

''مجھے اس کی مطلق پرواہ نہیں کہ لشکر کو ان علاقوں میں سختی اور بدبختی کا سامنا ہو جب کہ میں قالینوں پر تکیہ لگا کر بیٹھا ہوں اور میرے پاس ام کلثوم ہے''۔

(ام کلثوم یزید کی بیوی تھی جو عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر سابق گورنر بصرہ کی بیٹی تھی اور انہی دنوں میں یزید کی شادی ہوئی تھی)

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر ملی تو آپ نے یزید کو بھی زبردستی اس طرف بھیج دیا اور اسی زمانے میں جہاد کے شرکا کو معلوم ہوا کہ یزید عیاش اور شرابی ہے۔

جہاد کے شرکاء

ان سات سالوں میں کئی ہزار کے لشکر قسطنطنیہ کے نزدیک پہنچ جاتے تھے اور جیسا کہ نقشہ چہارم میں دکھایا گیا ہے وہ سمندری رستہ استعمال کرتے تھے لیکن قسطنطنیہ کو فتح کرنا مشکل تھا کہ مسلمان صرف ایک طرف سے حملہ آور ہو سکتے تھے۔ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے شہر کے مکمل محاصرہ کی ضرورت تھی جس کے لئے کم از کم ایک لاکھ فوج کی ضرورت تھی اور اس کے بعد قلعہ توڑ ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں کے پاس صرف جذبہ جہاد تھا اور آدمی حیران ہوتا ہے کہ اہل روم ان پر حملہ کر کے ان کو سمندر میں کیوں نہ پھینک دیتے تھے۔ کون کس زمانے میں سپہ سالار تھا اور عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے کون کس زمانے یا سنہ ہجری میں گیا۔ ان کی تفصیل نہیں ملتی اور مغربی مورخین بھی جنگ کی کاروائی کے سلسلہ میں خاموش ہیں اور ہم بھی اپنے مختصر مطالعہ میں صرف اسی پر اکتفا کریں گے کہ اس جہاد میں میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم جناب ابوایوب انصاری کے علاوہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کی شرکت کا ذکر ہے۔ جناب امام حسن رضی اللہ عنہ اس زمانے میں فوت ہو چکے تھے اور ممکن ہے کہ اور عظیم صحابہ کے فرزندوں نے اس جہاد میں شرکت کی ہو لیکن ہمیں مختصر تحقیق سے مطلب ہے اور وہ یہ ہے کہ سنۃ الجماعت اور مرکزیت کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی حکمتِ عملی کے وہ ثمرات ملنے شروع ہو گئے کہ انہوں نے قیصر روم کے گھر کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیئے۔ دوم غیر جانبدار صحابی جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی اس جہاد میں شرکت ہمارے اس جائزہ کو طاقت دیتے ہے کہ مسلمانوں نے ۴۱ ہجری میں تمام اختلافات ختم کر دیئے اختلاف کرنے والے کہتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زمانے میں جہاد میں کبھی شرکت نہ کرتے تو ہمارا جواب ہے کہ وہ تو یزید کے زمانے میں بھی سرحدوں پر

جہاد کرنے کے لئے تیار تھے، جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

میزبانِ رسول ﷺ کی قبر

ہاں البتہ میزبان رسول ﷺ جناب ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اسلام کی پہلی ہی صدی کے آدھے میں قسطنطنیہ پر اسلام کی مہر ثبت کر دی۔ آپ رضی اللہ عنہ ایک حملہ میں شہید ہو گئے۔ آپ کا فرمان تھا کہ آپ کو قسطنطنیہ کے دیوار کے نزدیک سے نزدیک لے جا کر دفن کیا جائے اور مسلمانوں نے ایسا ہی کیا بلکہ روایت ہے کہ ایسا کرنے کے لئے مسلمانوں کو ایک بھرپور حملہ کرنا پڑا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے قبر وہاں پر سات سو سال اسی طرح قائم رہی گو اس زمانے میں مسلمانوں کی باقی مہمات بھی وہاں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکیں اس سلسلہ میں مہمات بھیجی گئیں ان میں جناب بسر رضی اللہ عنہ بن اطارہ اور جناب فضالہ رضی اللہ عنہ بن عبید کی مہمات قابل ذکر ہیں۔ بہر حال ۱۴۵۳ میں سلطان محمد فاتح نے آپ کے قبر کو موجودہ مزار کی شکل دی۔ اللہ کی شان ہے کہ یورپ کے باقی علاقوں یعنی ایک طرف سپین اور دوسری طرف بلقان کے کئی علاقوں میں قسطنطیہ کی فتح سے بہت پہلے اسلام کے جھنڈے لہراتے رہے۔ وہاں سب جھنڈے اتر چکے ہیں لیکن جہاں میزبان رسول ﷺ دفن ہیں۔ وہاں آج بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا نام بلند ہو رہا ہے۔

مغربی محاذ کے باقی ثمرات

اب نقشہ پنجم کا مطالعہ کریں اور سارے مغربی محاذ یعنی شام، فلسطین، اناطولیہ، مصر اور افریقہ کے علاقوں پر دھیان دیں کہ حکمت عملی کے پھل کے طور پر مسلمان قسطنطنیہ کے علاوہ جزیرہ کریٹ اور سسلی کے علاقوں پر بھی حملے کر رہے تھے۔ علاوہ افریقہ کے مہاذ پر طرابلس سے آگے بڑھ کر بحیرہ اوقیانوس میں بھی گھوڑے ڈال دیئے۔ اس لئے افریقہ کی فتوحات کا مختصر ذکر ضروری ہے۔

افریقہ کی فتوحات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مجاہدین ٹیونس تک کے علاقے فتح کر چکے تھے لیکن مسلمانوں کا قبضہ صرف طرابلس تک تھا جب مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو مصر اور افریقہ میں بھی خاموشی ہوگئی لیکن سنتہ الجماعت کے بعد جناب عقبہ رضی اللہ عنہ بن نافع نے فسطاط کی چھاؤنی میں ایک لشکر جرار تیار کیا اور ڈیڑھ ہزار کے میل کا سفر طے کر کے وہ سطیلہ کے مقام تک پہنچ گئے۔ سطیلہ کا ذکر تیسری کتاب میں موجود ہے کہ وہاں پر جنگ ہوئی تھی۔ اب جناب عقبہ رضی اللہ عنہ بن نافع کے افریقہ کی فتوحات کے پورے واقعات ہماری تحقیق سے باہر ہیں اور ہم مختصر طور پر صرف یہ لکھیں گے کہ قیروان کی چھاؤنی کی آپ ہی نے بنیاد رکھی۔

قیروانی کے چھاؤنی

جناب عقبہ رضی اللہ عنہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک کوفہ، بصرہ اور فسطاط کی طرح شمالی افریقہ میں کوئی چھاؤنی نہیں بنائی جاتی، اس علاقہ پر قبضہ قائم نہیں رہ سکتا چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے ۴۹ ہجری میں قیروان کی بنیاد رکھی۔ روایت ہے کہ یہ بالکل جنگل تھا۔ اس علاقے میں جنگلی جانوروں، سانپوں اور بچھوؤں کی اتنی بہتات تھی کہ ڈر سے لوگ اس علاقے میں قدم نہ رکھتے تھے چنانچہ جناب عقبہ رضی اللہ عنہ نے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بیٹوں کو اکٹھا کیا یعنی وہ تمام لوگ جنہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہوئی تھی ان کو اکٹھا کیا اور ان کے تعداد کوئی ستر کے قریب بنتی تھی۔ ان سب نے ایک مقام پر نوافل ادا کئے جہاں چھاؤنی بنانے کا ارادہ تھا۔ اس کے بعد جناب عقبہ رضی اللہ عنہ اس علاقے کی ایک اونچی جگہ یا ٹیکری پر کھڑے ہو گئے اور سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عرض کی کہ میں اس علاقے کے جنگلی جانوروں کو ایک پیغام دے رہا ہوں۔ میں یہ پیغام اونچی آواز میں دوں گا اور آپ میں بھی میری نقل میں اس پیغام کو دہرائیں۔

پیغام یہ تھا:

''اے چرندو اور پرندو، میں آپ سے مخاطب ہوں اور خاص کر ان سے جو انسان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لے آیا ہوں۔ ہم یہاں پر ٹھہرنے کے لئے ایک پکا پڑاؤ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کو سات دنوں کی مہلت دیتے ہیں کہ ان دنوں میں اپنے بچوں اور انڈوں وغیرہ کو لے کر (اب جناب عقبہ رضی اللہ عنہ نے حدود کا تعین کیا جیسا ہم فوجی زبان میں کرتے ہیں کہ فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک) تمام علاقے کو خالی کر دو اور کسی اور جگہ رہائش اختیار کرو اور تمہارے جو ساتھی یہاں نہیں ہیں ان تک بھی ہمارا یہ پیغام پہنچا دو''۔

روایت ہے کہ سات دنوں کے اندر تمام جنگلی جانور وہ علاقہ خالی کر گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور باقی لشکر والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کچھ جانور اپنے بچوں کو اپنے اوپر لاد کر اس جگہ کو خالی کر رہے تھے بلکہ چھاؤنی بن جانے کے بعد بھی کئی سال تک کسی آدمی نے بھی چھاؤنی کے علاقے میں کوئی سانپ یا بچھو نہ دیکھا۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان کو چرند اور پرند بھی سمجھتے تھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو آگاہ کیا ہوا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کی سعادت ایک ہرنی کو نصیب ہوئی تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پرندہ یا چرندہ ایسی سعادت حاصل کرنا چاہے گا لیکن یہ اللہ کی شان ہے کہ ایسے نصیب کسی ایک آدھ کے ہوتے ہیں۔ اس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی بتا گئے کہ ان کے رفقاء کی کیا شان ہے کہ ہر وقت دیدار خاص میں محو ہیں۔

جناب عقبہ رضی اللہ عنہ بن نافع کی شخصیت

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر صحابہ کرام پر چند الفاظ لکھ کر مشہور مورخ ابن سعد نے ایک طرف قوم کی عظیم خدمت کی تو دوسری طرف اس خود کو ایسی سعادت نصیب ہوئی کہ پانچ ہزار صحابہ کرام، صحابیات اور تابعین کا تعارف لکھ گیا۔ یہ سب عظیم ہستیاں چلتے پھرتے اسلام تھے اور ہمارے لئے مثالیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ کتابوں کے اس سلسلہ میں ہمیں جہاں موقع ملا ہم نے ایسی عظیم شخصیتوں پر چند فقرے لکھ کر ان کا تعارف کر دیا اور جناب عقبہ بن نافع اس سلسلہ کی آخری ہستی میں وہ سیدھے سادے سپاہی تھے۔ وہ سیاست یا سفارتی باتوں سے بلند تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں انہوں نے بڑی مہمات میں حصہ لیا لیکن جب اندرونی خانہ جنگی شروع ہوئی تو آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ میدانِ جنگ میں آپ جناب خالد رضی اللہ عنہ بن ولید اور جناب مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث کے پایہ کی شخصیت تھے اور تدبیرات میں ایک شکاری کی طرح ماہر تھے۔ شمالی افریقہ میں ان کا واسطہ بربر قوم کے ساتھ پڑا جو موقع شناس اور بہادر تھے اور خطرات میں بھی کود جاتے تھے۔ جناب عقبہ کو دیکھ کر وہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے کہ جناب عقبہ کی رفاقت میں ان کو خوب "شکار" ملا لیکن جب زیادہ شکار کی امید نہ رہی تو انہوں نے دیکھا کہ بڑا شکاری (جناب عقبہ) بھی کچھ کمزور ہو گیا ہے تو اس شکاری کے پاس بھی جو کچھ تھا اس پر بھی ہاتھ صاف کرنے کو تیار ہو گئے۔ دراصل بربر قوم کے لوگ ریگستان کے کھلے علاقوں میں رہتے ہوئے بہادر تو بن گئے لیکن آزاد خیال بھی ہو گئے یعنی اصول کے پکے نہ تھے۔ بہر حال اسلام کی آغوش میں آ جانے کے بعد جب ان لوگوں کے اصول پکے ہو گئے تو انہی لوگوں نے جناب طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کے لشکروں میں شامل ہو کر سپین فتح کر ڈالا۔

جناب عقبہ پر کچھ مشکل اوقات بھی آئے کہ عمرو بن عاص کی وفات کے بعد تو کچھ دنوں کے لئے ان کا بیٹا عبداللہ مصر کا گورنر تھا اور انہی باپ، بیٹا نے جناب عقبہ کو افریقہ کی فتوحات کے لئے بھیجا تھا کہ وہ ان کا رشتہ دار تھا لیکن جب مصر کی گورنری مسلمہ رضی اللہ عنہ بن مخلد کو ملی تو اس نے افریقہ کی سپہ سالاری اپنے ایک آزاد کردہ غلام دینار بن ابوالمہاجر کو دے دی وہ بھی بہادر آدمی تھا اور اس نے بربر سردار کسیلہ سے مل کر تلمین شہر تک کے علاقے فتح کئے لیکن عقبہ والی بات پیدا نہ ہو سکی۔

جناب عقبہ رضی اللہ عنہ کی بحالی اور بحر اوقیانوس تک فتوحات

بہر حال جناب عقبہ رضی اللہ عنہ واپس مصر چلے گئے اور وہاں سے دمشق جا کر امیر معاویہ کو حالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے ان کو افریقہ کا خود مختار گورنر مقرر کر دیا اور وہ دوبارہ شمالی افریقہ روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد جناب عقبہ نے اگلے

پانچ چھ ماہ میں تسخیر سے ہوتے ہوئے مراکو کی سرحد کو بھی پار کیا۔ اور دریائے سوس تک کے علاقے فتح کر لئے۔ جناب عقبہ کی اس پیش قدمی کو نقشہ پنجم میں دکھایا گیا ہے۔ یہاں پر آگے ایک طرف دریائے سوس تھا اور دوسری طرف سامنے بحر اوقیانوس۔ اسی جگہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جناب عقبہ وہاں اپنے گھوڑے پر سوار سمندر کی موجوں کو چیرتے ہوئے بحر اوقیانوس میں داخل ہو گئے اور زور سے نعرہ تکبیر کی صدا بلند کی جس سے ساری فضا اللہ اکبر کی صدا سے گونج اٹھی پھر جناب عقبہ نے سر جھکا لیا اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ عرض کی:

''اے رب العالمین! اگر یہ سمندر میرے راستے میں حائل نہ ہوتا تو آگے بھی میں تیرے حبیب ﷺ کے نام کی اسی طرح صدا دیتا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

اس جگہ کو آغادیر کہتے ہیں اور وہاں پر آج بھی اسلام کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور اس واقعہ سے متاثر ہو کر علامہ اقبال یوں گویا ہوئے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مشرقی محاذ کے ثمرات

" خلفائے راشدین کی حکمت عملی کے ثمرات کو مشرقی محاذ پر نقشہ ششم میں دکھایا گیا ہے۔ ہم تیسری کتاب کے ساتویں باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان اگر ایک طرف دریائے جیحوں تک تھے تو دوسری طرف کوہ ہندوکش، کابل، موجودہ وزیرستان اور بلوچستان تک پہنچ چکے تھے اور مشرق میں ہماری سرحد کے نزدیک غزنی مسلمانوں کی ایک بڑی چھاؤنی تھی کہ اس زمانے میں اس علاقے کو زبلستان کہتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں میں اندرونی خانہ جنگی شروع ہو گئی تو فتوحات رک گئیں۔ مشرقی علاقوں میں بھی بغاوتیں ہوئیں لیکن وہ فرو کر دی گئیں۔ البتہ کوفہ سے مغیرہ بن شعبہ اور بصرہ سے زیاد نے مل کر سنتہ الجماعت کے بعد ایران و افغانستان کے اندرنی حالات کو کافی استحکام دے دیا۔ پھر جب جناب مغیرہ بن شعبہ وفات پا گئے تو زیاد کے لڑکے عبید اللہ نے فتوحات کو اور آگے بڑھایا وہ خراسان کا گورنر تھا۔ اس نے چوبیس ہزار کے لشکر کے ساتھ دریائے جیحوں کو پار کیا اور بخارا تک کے علاقے فتح کر ڈالے۔ اس نے پیش قدمی کو بھی نقشہ ششم پر دکھایا گیا ہے۔

جناب سعید رضی اللہ عنہ بن عثمان غنی رضی اللہ عنہ

بخارا کی فتوحات کے بعد عبید اللہ نے آ کر بصرہ کی گورنری سنبھال لی کہ اس کا باپ زیاد مر گیا تھا اور خراسان کی

گورنری جناب سعید رضی اللہ عنہ بن عثمان کو ملی جنہوں نے فتوحات کو آگے بڑھایا اور سمرقند بھی فتح ہو گیا۔

مسلم ترکستان

ان علاقوں کے بارے میں کسے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ صدیوں تک یہ علاقے مسلمانوں کے مرکز رہے۔ مشہور محدث امام بخاری کا تعلق بھی انہی علاقوں سے تھا۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کو پہلا جھٹکا تیرہویں صدی میں لگا جب منگولوں نے وہاں پر قبضہ کر لیا اور اسلام کے عظیم فرزند جلال الدین خوارزم نے اس علاقے میں آخری چٹان بننے کی کوشش کی گو اسے اس زمانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن شہیدوں کے شہادت رنگ لائی اور چودہویں صدی ہجری میں یہ علاقے پھر اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ امیر تیمور کا تعلق بھی انہی علاقوں سے تھا اور یہاں سے ہی وہ ماسکو گیا جو اس زمانے ایک معمولی گاؤں تھا لیکن بدقسمتی سے انگورہ کے مقام پر امیر تیمور کی بایزید یلدرم سے جو جنگ ہوئی اس نے یورپ میں ترکوں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ اس زمانے میں دنیا میں صرف دو عظیم سلطنتیں تھیں اور دونوں مسلمانوں کی یعنی امیر تیمور اور بایزید یلدرم کی۔

ظہیر الدین بابر کا تعلق بھی اسے علاقے سے تھا۔ وہاں سے پہلے وہ کابل آیا اور پھر دہلی فتح کی تو ظاہر ہوا کہ ان علاقوں کے ساتھ ہماری حد سے زیادہ روحانی، ثقافتی اور تاریخی وابستگی ہے کسی زمانے میں پشاور سے بخارا اور سمرقند اتنے ہی زیادہ وابستہ تھے جتنا آج کل پشاور کے ساتھ لاہور اور ملتان وابستہ ہیں۔ بدقسمتی سے یہ علاقے اب روس کے ماتحت ہیں اور روس آگے بڑھ رہا ہے۔ افغانستان کے مجاہدین کی طرح انیسویں عیسوی میں امام شامل نے روس کا مقابلہ کر کے وہاں بڑی قربانیاں دیں اور انشاءاللہ یہ قربانیاں رنگ لائیں گی کہ کاشغر تک ساری امت میں وحدت پیدا ہو۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

(اقبال)

موجودہ پاکستان میں صحابہ کرام کی آمد

تیسری کتاب میں جناب مجاشع بن مسعود اور ان لشکروں کا ذکر کر چکے ہیں جو وزیرستان تک آئے۔ سنۃ الجماعت کے بعد مسلمانوں کی سلطنت کو اور زیادہ وسعت ہوئی اور بنوں تک کے علاقے اسلامی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ ہم دوسری تکاب میں ذکر کر چکے ہیں کہ جناب عاصم رضی اللہ عنہ بن عمرو کا لشکر زاہدان تک پہنچا تھا اور مسلمان مجاہدین مکران کے علاقے میں دریائے سندھ تک پہنچ گئے تھے۔ بہرحال استحکام زیاد کے بصرہ کی گورنری کے زمانے میں آیا کہ

اس نے موجودہ مکران کے علاقے کو صوبہ فارس کی ایک امارت بنا دیا۔ نقشہ ششم میں ان تمام علاقوں کی نشاندہی کردی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ اس علاقہ میں جواب اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ایک ملک قائم ہوا تو اس کی بسم اللہ حضور پاک ﷺ کے صحابہ کرام کر گئے کہ جہاں ان کے قدم پڑ گئے۔ ان خطوں میں حق کا بول بالا ہو گیا۔ یہ چیز خاص مطالعہ سے تعلق رکھتی ہے کہ جو فتوحات صحابہ کرام کے زمانے میں ہوئیں وہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کا نام اب بھی بلند ہو رہا ہے لیکن مسلمانوں نے جو علاقے بعد کے زمانوں میں فتح کئے یعنی سپین، کریمیا، یوکرین کے کچھ حصے، رومانیہ، بلغاریہ، پولینڈ کے کچھ حصے، یونان، ہنگری، سسلی، اسٹریا کے کچھ حصے، بھارت کے بڑے حصے اور چینی ترکستان وغیرہ۔ وہاں پر یا تو مسلمان بالکل ختم ہو گئے یا بہت تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ صرف بنگلہ دیش میں مسلمان موجود رہے یا انڈونیشیا اور ملائیشیا میں لوگوں نے تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کے راز ہیں لیکن ایک چیز واضح ہے کہ جہاں پر عملی اسلام پہنچا وہاں قائم رہا کہ فتوحات اسلام کو پھیلانے کے لئے ہوئیں یا جنوب مشرقی ایشیا میں عرب ملاحوں نے عملی اسلام پہنچایا تو وہاں بھی وہ قائم و دائم ہے۔ اس لئے ان کتابوں میں لکھنے میں ہمارے سامنے بھی یہی مقصد تھا کہ عملی اسلام کو تلاش کریں اور صرف عمل لکھیں۔ اس کے علاوہ عملی اسلام کے لئے حضور پاک ﷺ کے عشق کی بھی ضرورت ہے اور صحابہ کرام اس عشق سے مخمور تھے تو نتائج یہ نکلے۔

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

(اقبالؔ)

نتائج و اسباق

اس باب میں ہم نے خلفائے راشدین کی حکمت عملی کے دور رس نتائج اور اسباق کا مختصر ذکر ہی کیا ہے جن کو جاری و ساری رکھا جا سکتا ہے ہاں شرط یہ ہے کہ اس سے چند موٹے موٹے سبق بھی سیکھیں جو حسب ذیل ہیں:

الف۔ مومن کا مقصد حیات کیا ہے اور ہم نے مثالوں کے ذریعے اس کو عملی طور پر جگہ جگہ واضح کیا ہے، بہرحال اگلے یعنی ساتویں باب میں اس کے عملی پہلو کی مزید وضاحت بھی کر دیں گے۔

ب۔ خلافت راشدہ کا زمانہ واپس نہیں آ سکتا لیکن امت نے اجتماعی طور پر مرکزیت اور وحدت پر عمل کرنا ہے اور ایسے عمل کے کچھ نتائج واضح کر دیئے گئے ہیں۔ آٹھویں باب میں ایسی وحدت اور مرکزیت کے لئے ہم اسلامی نظام حکومت پر مختصر تبصرہ کریں گے۔

ج۔ تمام تر کتابوں میں اچھے نتائج حاصل کرنے کے لئے اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کو ہی اہم اصول مانا گیا۔ اسلامی فلسفہ

حیات کے کئی عملی پہلو بھی جگہ بجگہ بیان کر دیئے ہیں لیکن کچھ مزید وضاحتوں کی ضرورت ہے کہ یہ دنیا کیا ہے، آخرت کیا ہے۔ انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ زندگی اور موت کیا ہے چونکہ غیروں کے اثرات سے ہمارے فلسفہ حیات پر پردے پڑتے جاتے ہیں۔ اس لئے نویں باب میں ہم روزمرہ کی سائنسی اور تکنیکی زبان میں اسلامی فلسفہ حیات یا نظریات حیات کا ازل اور آخر کی مدد سے عملی بیان کے ذریعہ سے خلاصہ پیش کریں گے۔

د۔ مسلمانوں کی نفری بھی کم تھی اور غیروں کے مقابلے میں ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے لیکن حکمتِ عملی اور تدابیرات ایسی اختیار کی گئیں کہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی ان تمام اصولوں کو عملی طور پر جگہ بجگہ بیان کرتے رہے لیکن اب اختصار سے ان تمام تر ضروریات اور اصولوں کو دسویں باب میں اسلامی فلسفہ دفاع کے عنوان کے تحت بیان کریں گے۔

ر۔ تاریخ کا با مقصد مطالعہ بڑا مشکل ہے۔ خاص کر جب عسکری تاریخ سے نتائج اور اسباق کو زیر بحث لایا جائے۔ اتنے سالوں کی تاریخ کے جائزے پیش کرتے وقت نتائج اور اسباق کے بیان میں تضاد آ سکتا ہے لیکن چونکہ سب بیانات کو ہم نے اسلامی فلسفہ حیات کی تابع کر دیا ہے۔ اس لئے انشاءاللہ خیالات میں وحدت ہی وحدت ہوگی اور اسی وحدتِ فکر اور وحدت عملی کی ہم کو تلاش ہے۔

❖❖❖

ساتواں باب

مومن کا مقصد حیات

عملی پہلو

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

(اقبالؔ)

مومن کا مقصد حیات تو علامہ اقبال کی زبان میں بیان ہو گیا لیکن ہمیں اس فلسفہ کے عملی پہلو اور عملی مثالوں میں جانا ہوگا۔ جب سے ہم نے جنگوں کے قصے شروع کیے تو شہیدوں کے ذکر سے قارئین کے خون کو گرمایا اور عظیم شہدأ کا ذکر خاص طور پر کیا۔ خواہ وہ بدر کے شہید جناب عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث تھے یا اُحد کے شہید جناب حمزہ رضی اللہ عنہ اور جناب مصعب رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ خواہ ایسی شہادت جنگ موتہ میں تینوں سپہ سالاروں جناب زید رضی اللہ عنہ، جناب جعفر رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ کے لیے تھی یا بیر معونہ، ذات اطلاع یا رجیع کے عظیم شہدأ تھے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہم نے بزدخا اور یمامہ کی جنگوں سے لے کر ہر جنگ کے عظیم شہدا رضی اللہ عنہم پر مختصر نوٹ بھی لکھے۔ خواہ یہ حفاظ کی شہادت تھی یا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ثقفی کی شہادت یا جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ کی جنگ یرموک میں شہادت پر بیعت۔ ہم نے یہ بھی واضح کیا کہ اللہ کی تلوار کے لیے شہادت نہ تھی اور نہ ہی جناب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لیے شہادت تھی کہ آپ کے بدن پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ اور خون کے اثرات تھے یعنی اللہ تعالیٰ کے نام سے تلوار کے طور پر موسوم ہو جانے کے بعد یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے اثرات والوں کے لیے جنگ میں شہادت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کے اپنے نام یا اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے وابستہ کوئی چیز دشمن یا کافر کی تلوار سے مار کھا جائے اور شاید یہی وجہ تھی کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عظیم رفقاء یعنی جناب عمر رضی اللہ عنہ، جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں کفار کے ہاتھوں سے شہید

نہ ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا راز

اللہ تعالیٰ کے راز نرالے ہیں، اس نے شہادت کی موت کو بہت بلندیاں عطا کیں کہ مومن کے مقصد حیات کے لحاظ سے اس دنیا کی حیثیت کچھ نہیں اور یہاں پر ہم امتحان کے لیے آئے ہیں جس کی مکمل وضاحت نویں باب میں ہو گی۔ اس امتحان میں اگر خاتمہ بالخیر ہو جائے اور شہادت کی موت مل جائے تو انسان کی صرف ایک خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو پھر زندگی دے اور پھر وہ اللہ کے نام پر شہید ہو اور خاتمہ بالخیر کا لطف اٹھائے اور اس میں وہ بلندیاں ہیں کہ انسان کی یہ خواہش ختم نہ ہو گی ورنہ دنیا کی زندگی کو حضور پاک ﷺ نے قید خانہ فرمایا اور موت کے بعد کون اس زندگی کی آرزو کرتا۔ لیکن سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اللہ کے نام پر یا حق کے نام پر موت کو شہادت کا درجہ ہے اور یہی پہلو وضاحت طلب ہے۔

راہِ حق کی شہادت

کتابوں کے ان سلسلوں میں ہم نے میدان جنگ کی موت یا جہاد میں شمولیت سے زخموں کے بعد موت کو شہادت حق کا نام دیا ہے اسی طرح اللہ کے راستے یا حق کی حفاظت کے لیے دشمن کے ہاتھوں شہید ہونا ہوتا ہے جیسے بیر معونہ یا رجیع کے شہید تھے یا جناب عمر رضی اللہ عنہ، جناب عثمان رضی اللہ عنہ یا جناب علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ طاعون یا وبا کی موت، جہاد کی تیاری کے سلسلہ میں موت، کسی حادثہ کی موت وغیرہ متعدد ان اموات کو شہادت کا رتبہ دیا گیا ہے جن میں انسان کی کوئی ذاتی خودغرضی نہ تھی بلکہ اپنے مال واسباب یا بال بچوں کی حفاظت کے سلسلہ میں موت کو بھی شہادت کا رتبہ دیا گیا ہے۔ بے شک یہ وسیع تر پہلو ہے اور ہم نے واضح کیا ہے کہ مسلمان کسی خودغرضی کے لیے ملک نہ فتح کرتے تھے بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرتے تھے اور ان کو غاصبوں کی غلامی سے چھٹکارا دلاتے تھے۔ بے شک یہ کہنے کی بات تھی لیکن ملک ضرور فتح ہوئے اور غیر کہہ سکتے ہیں کہ ہم جنگیں بھی صرف خودغرضی کے لحاظ سے کرتے تھے گو مسلمانوں نے ہر جنگ اور جھڑپ میں راہِ حق کو ایک عظیم مثال کے طور پر اپنا کر جنگ کی اور ہم نے جنگوں سے اس سلسلہ میں سینکڑوں مثالیں پیش کر کے راہِ حق کی موت اور شہادت کے عملی پہلو کی وضاحت کی لیکن ہماری کہانی پھر بھی نامکمل ہے اور اس سلسلہ میں سانحہ کربلا کا ذکر ضروری ہے کہ عملی پہلو کے علاوہ اس میں روحانی پہلو بھی ہے۔

فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (ایک روحانی پہلو)

قارئین کی توجہ قرآن پاک کی سورہ الصّفت کی آیت نمبر ۱۰۷ کی طرف دلائی جاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا: کہ میں نے اس کو بچالیا ایک ذبح عظیم کے بدلے۔ سورہ الصفت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو قربانی کے لیے لے جانے کا ذکر ہے اور آگے یہ اشارہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے راہ میں قربانی کو ضرور پسند کرتا ہے لیکن بھیڑ بکریوں کی طرح قربانی اور انسانوں کی قربانی میں فرق ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ غیرت اور عقیدہ کی حفاظت یا حق کے لیے شیروں کی طرح لڑ کر قربانی دے۔ بے شک واقعہ کربلا جس میں فتح کی ذرا بھی امید نہیں کہ وہ اس سلسلہ کی ایک عظیم مثال ہے کہ لڑ کر کس طرح اپنی جان اللہ تعالیٰ کے سپرد کی۔

علاوہ ایک اور بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے دنیاوی زندگی میں بشری تقاضوں کے تحت راہِ حق کا ہر کام سرانجام دیا اور خاص کر ہر ارفع اور اعلیٰ کام میں حصہ لیا۔ لیکن ایک اعلیٰ اور ارفع مقام شہادت کا بھی ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھا کہ اس کا وہ خود عملی نمونہ پیش کریں کہ غیروں یا باطل والوں میں سے کسی کو یہ اعتراض اٹھانے کا موقع نہ ملے کہ اللہ کا حبیب (ﷺ) فلاں کے ہاتھوں شہید ہوگیا۔ حضور پاک ﷺ کے بیٹے چھوٹی عمر میں وفات پا گئے اور یہ کام آپ کے نواسے نے بڑی شان وشوکت کے ساتھ انجام دیا۔ بلکہ حضور پاک ﷺ کے دوسرے نواسے جناب امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی باقی اولاد، کئی اور قرابت داروں اور دور دور سے امت کے چیدہ مجاہدین نے اس ذبح عظیم میں شرکت کر کے اسلام کے نام کو چار چاند لگا دیئے۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کی تعداد اگر کچھ زیادہ ہوتی یعنی دشمن کے لشکر کا ایک چوتھائی بھی ہوتی تو لوگ کہہ سکتے تھے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ لڑائی امارت کے لیے لڑ رہے تھے لیکن اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں پیش کرنا تھا کہ اس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے اور کسی ''افلاطون'' کو اپنے پیمانوں سے اس واقعہ کی ماہیت کو ناپنے کی ہمت نہ ہو۔

نظام حکومت کا پہلو

ان واضح، روحانی اور عملی پہلوؤں کے علاوہ ایک تیسرا پہلو ہے کہ خلافت راشدہ تو واپس نہیں آ سکتی لیکن حضور پاک ﷺ کے ایک نواسے نے امیر معاویہ کے ساتھ صلح کر کے قوم کے لیے راہ نکالی کہ مسلمانوں کا امیر اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا ہو تو اس کے ساتھ تعاون کرو اور امت نے تعاون کیا۔ نتائج اور ثمرات پچھلے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ اب دوسرے نواسے نے ایک عملی نمونہ پیش کیا کہ حکومت اگر یزید جیسے شخص کے پاس چلی جائے تو کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔ اس میں آپ نے امت کے لیے نشانِ راہ کی نشان دہی کر دی اور باقی مسلمانوں نے بھی اپنے رویہ کا اظہار کر دیا اور یہ ہیں وہ عملی پہلو کہ حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی حکمت عملی کی کہانی تب مکمل ہوتی ہے کہ سانحہ کربلا کو بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔

ہم اگر اپنی تنگ دامانی کے طفیل اظہار خیال میں شاید اس مضمون کے ساتھ انصاف نہ کریں اور ہمارے جائزے

اگر عاشقوں کے معیار پر پورے نہ اتریں۔ تو امید ہے وہ ہماری کم علمی اور کم مائیگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے طرز بیان کو ایک کوشش کا نام تو دے ہی دیں گے۔ بدقسمتی سے سانحہ کربلا اگر ایک طرف افسانوی رنگ اختیار کر گیا ہے تو دوسری طرف فلسفہ حیات کے عملی اور روحانی پہلوؤں پر بھی پردے پڑے ہوئے ہیں بلکہ سانحہ کربلا کے شرکا کے ناموں کو بھی قوم سے چھپایا جاتا ہے کتنی افسوس ناک بات ہے کہ میدان کربلا میں ابوبکر نام کی دو ہستیاں شہید ہوئیں جن میں سے ایک جناب علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے اور دوسرے امام حسن رضی اللہ عنہ کے لیکن قوم سے جناب علی رضی اللہ عنہ کے خاندان اور جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کی ایک دوسرے کے ساتھ الفت کو چھپانے کے لیے، ایسے نام ہماری تاریخ سے خارج ہوئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب میں گزارش کر دی گئی تھی کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو اصحابہ ثلاثہ کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ اپنے بیٹوں کے نام ان کے ناموں پر رکھے۔ اب اس چیز کو عملی طور پر پیش کر رہے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ روایت ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اکثر آپ راوی سے حلف بھی لے لیتے تھے کہ بیان کا تزکیہ ہو جاتا ہے ماسوا جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ..... کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

''صدیق رضی اللہ عنہ سے سوال نہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ''صدیق'' کا لقب عطا فرمایا۔''

یزید کی نامزدگی

سانحہ کربلا کی بنیاد اس روز بندھ گئی جب جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے اپنے بیٹے یزید کو نامزد کیا۔ اس سلسلہ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کئی وجوہ بیان کیں کہ جانشینی کے سلسلہ میں وہ جھگڑے نہ پڑیں جو جناب عثمان رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور نزدیکی حاصل کرنے کے لیے ان کو ایسا مشورہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نے دیا۔ بہرحال ایک یہ بھی روایت ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنوامیہ کے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قریش میں کافی عرصہ سے سیاست پر بنوامیہ کا قبضہ رہا، اب جو خلافت قریش میں ہی ہے تو امیہ اس کے نہ صرف حق دار ہیں بلکہ یہ کام وہ اوروں کی نسبت بہتر طور پر نبھا سکتے ہیں اور کئی تاویلیں پیش کی گئیں لیکن یہ سب باتیں اسلامی طرز حیات کے لحاظ سے بے معنی ہیں۔ اسلام میں حاکم کے لیے اول شرط کردار کی ہے اور یزید اس پر پورا نہ اترتا تھا۔ ہم اس سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہیں گے اور اس چیز کی وضاحت بھی آگے عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیٹوں کی زبان سے آتی ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسا کیوں کیا یہ بات ان کے اور ان کے اللہ کے درمیان ہے، ہمارے لیے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تراشے ہوئے ناخنوں کے ٹکڑے ان کے پاس تھے۔ مرتے وقت ان کو پسوا کر اپنی آنکھوں میں ڈلوانے کا حکم دیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک قمیض بھی آپ کے پاس تھی، اس کو اپنے کفن کا حصہ بنانے کا حکم دیا۔ اس لیے ہمارا قلم ان کے خلاف کوئی ترش لفظ

استعمال کرنے پر تیار نہیں۔

یزید کے لیے بیعت

یزید کی ولی عہدی کی بیعت کا کام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۵۵ اور ۵۶ ہجری یعنی اپنی وفات سے چار سال پہلے شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کو کوفہ اور بصرہ میں تو کامیابی ہوگئی۔ لیکن مدینہ میں ان کا گورنر مروان بن حکم اس سلسلہ میں ناکام رہا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یزید کو ولی عہد تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ خود مدینہ شریف آئے۔ انہوں نے طریق کار یہ استعمال کیا کہ اوپر مذکورہ صحابہ ابن صحابہ سے الگ الگ ملاقات کی اور ہر ایک کو یہ کہا کہ وہ باقی چاروں کی بھی قیادت کر رہا تھا چنانچہ ہر ایک نے اس سے انکار کیا لیکن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہر کسی سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ جو بات چیت ہو چکی ہے اس کو راز میں رکھا جائے، اس لیے پہلے تو یہ بات چیت پوشیدہ ہی رہی لیکن اس کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی طرح مشہور کرا دیا کہ سب نے الگ الگ بات چیت میں ان کی بات کو مان لیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے اعلان کیا کہ ان پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ میں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو صاف کہا تھا کہ جو طریقہ وہ اختیار کر رہے ہیں وہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے اور وہ اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ اس کے بعد تقریباً سب نے اعلان کر دیا کہ ان پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ یزید مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذاتی کردار گیا گزرا ہوا ہے، وہ شرابی اور زانی بھی ہے، وہ رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا ہے، لہو ولعب اس کی گھٹی میں ہیں۔ اس کے حرم لاتعداد عورتیں ہیں اور وہ عیش و عشرت میں پلا ہے چنانچہ وہ کسی لحاظ سے بھی خلافت کا مستحق نہیں۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے وفات سے قبل یزید کو بلایا اور اس کو اچھی نصیحتیں بھی کیں کہ مہاجرین اور انصار کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور تمام اسلامی ممالک کے حالات کا جائزہ بھی پیش کیا اور کہا کہ تمہاری خلافت کو تسلیم کرنے سے پانچ شخصوں نے انکار کیا ہے ان میں سے عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات چکے ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں لیکن دو اشخاص کا خیال رکھنا۔ ایک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جو لومڑی کی طرح قلابے لگا کر جب موقع ملا شیر کی طرح جھپٹ کر تمہارے اوپر حملہ آور ہوگا اور دوسرے امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں، ان کو کسی طرح قابو میں لا کر ان سے درگزر کرنا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید نے دمشق میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ مدینہ کا گورنر یزید کا چچیرا

بھائی ولید بن عتبہ تھا۔ یزید نے اس کو حکم دیا کہ سب لوگوں سے اس کی بیعت لی جائے لیکن ولید اس سلسلہ میں سختی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یزید کی بیعت لینے کی کوشش ضرور کی لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف چھوڑ دیا اور مکہ مکرمہ جا کر حرم میں پناہ لے لی اور جناب امام عالی مقام حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ شریف چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ولید شاید آپ کے ساتھ سخت بھی نہ کر سکتا تھا کہ مدینہ شریف میں کافی لوگ امام حسین کے ساتھ تھے۔ بہر حال امام حسین رضی اللہ عنہ کے مدینہ شریف سے بغیر یزید کی بیعت کے نکلنے کی وجہ سے یزید نے ولید کو مدینہ شریف کی امارت سے ہٹا دیا اور امام حسین مدینہ شریف کو اس لیے چھوڑ رہے تھے کہ وہ مدینۃ النبی میں خانہ جنگی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ مدینہ شریف میں کافی لوگ ان کی مدد کرنے کو تیار تھے۔

اہل بیت کا قافلہ

واقعات کو آگے چلانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس تمام قافلے سے قارئین کا تعارف کرایا جائے تا کہ آگے معاملات کو آسانی سے سمجھا جا سکے اور تاریخی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جائے۔ آپ کے بھائیوں میں سے (۱) عباس رضی اللہ عنہ، (۲) جعفر رضی اللہ عنہ (۳) عبداللہ رضی اللہ عنہ اور (۴) عثمان رضی اللہ عنہ تھے جن کی والدہ ام البنین بنت حزام تھیں۔ آپ چاروں کے ماموں کے بیٹے عبداللہ بن ابن محل بن حزام نے شمر بن ذی الجوشن سے سفارش کرا کے، آپ کے لیے عبیداللہ بن زیاد سے بھی امان طلب کر لی تھی لیکن آپ چاروں نے امان لینے سے انکار کر دیا۔ طبری نے ایک جگہ عنوان کی ایک غلطی سے ان چاروں کو شمر کا بھانجا لکھ دیا۔ حالانکہ وہ ابی محل کے بھانجے تھے جو شمر کا دوست تھا۔ اب یہ غلطی ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جناب ام البنین بنت خزام بن خالد بن جعفر بن ربیعہ وغیرہ کا تعلق قبیلہ کلاب سے تھا اور شمر بن ذی الجوشن کا اس قبیلہ کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے قارئین اس غلطی کو ٹھیک کر لیں۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، جن کی ماں لیلیٰ بن مسعود تھیں۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے کا نام بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ تھا جن کو آگے دسواں شہید بتایا گیا ہے تو بعض مورخین کا خیال ہے کہ صرف ایک ابوبکر رضی اللہ عنہ میدان کربلا میں شہید ہوئے لیکن واقعۂ کربلا کے بعد اولاد علی رضی اللہ عنہ میں سے کسی اور ابوبکر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ دونوں ابوبکر میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

ایک بھائی محمد تھے جن کو محمد اصغر کہتے تھے اور ان کی والدہ ام ولد تھیں۔ یہاں پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے تین بیٹوں کے نام محمد تھے۔ بڑے امام محمد بن حنیفہ تھے۔ جن کا ذکر پہلے ابواب میں ہو چکا ہے۔ وہ ساتھ نہ شریک ہوئے اور وہ مدینہ شریف میں رہ گئے تھے۔ انہوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی طرف سفر کرنے سے روکنے کے لیے بڑی عرض داشتیں بھیجیں۔ دوسرے محمد اوسط تھے جو امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول کے بطن سے

تھے، ان کی شاید پہلے وفات ہو گئی کہ ان کا کوئی ذکر نہیں۔ تیسرے محمد اصغر ساتھ تھے جو جنگ میں شہید ہوئے یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چھ اور بیٹے بھی میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو اور بیٹوں کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ یحییٰ اور عون تھے جو اسماء بنت عمیس کے بطن سے تھے اور جناب محمد بن ابوبکر اور عبداللہ بن جعفر طیار کے اخیافی بھائی تھے چونکہ ان سے آگے کوئی اولاد نہ چلی اس لیے شاید وہ بھی واقعہ کربلا سے پہلے فوت ہو گئے ہوں یا اپنے اخیافی بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ یا محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے پاس ہوں۔ محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی صرف ایک بیٹے عمر رضی اللہ عنہ نے کربلا میں شرکت نہ کی اور آگے ان کی نسل بھی چلی۔ ان کی والدہ کا نام صہبا* تھا جن کا ذکر پہلی کتاب کے پندرھویں باب میں ہو چکا ہے۔ ان عمر کا ذکر طبقات ابن سعد میں محدث کے طور پر بھی ہے۔ آپ ان دنوں اپنے ننھیال کے پاس گئے ہوئے تھے۔

جناب امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے اپنے تین بیٹے بھی ساتھ تھے۔ بڑے بیٹے علی بن حسین رضی اللہ عنہ تھے جن کو علی اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی ماں لیلیٰ، یزید کی پھوپھی کی بیٹی تھی۔ دوسرے بیٹے بھی علی بن حسین رضی اللہ عنہ تھے جن کو اس زمانے میں علی اصغر بھی کہا جاتا تھا۔ آپ ہی امام زین العابدین رضی اللہ عنہ ہیں۔ اب آپ کو علی اوسط کے نام سے لکھا جاتا ہے جس کی وجہ آگے بیان کی جائے گی۔ آپ کی والدہ شاہِ ایران یزدجرد کی بیٹی تھی جن کے ساتھ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شادی کا ذکر پہلی کتاب کے کئی ابواب میں ہو چکا ہے۔ تیسرے بیٹے کا نام عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا۔ آپ شیر خوار تھے۔ آپ کی والدہ رباب بنت امرالقیس تھیں۔ آپ بھی جنگ کربلا میں شہید ہوئے اور مورخین نے آپ کو علی اصغر لکھنا شروع کر دیا کہ علی اکبر اور علی اصغر شہید ہو گئے تو اس وجہ سے لوگوں نے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کو علی اوسط کہنا شروع کر دیا۔ ویسے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ بہت زیادہ احادیث کے راوی ہیں اور وہاں پر ان کے لیے صرف علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

امام عالی مقام امام حسین رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی امام حسن رضی اللہ عنہ کے خاندان کے اکثر لوگ آپ کے ساتھ ہی تھے لیکن آپ نے چونکہ متعدد شادیاں کیں اس لیے ممکن ہے کہ آپ کی اولاد میں سے کچھ لوگ ساتھ شامل نہ ہوئے ہوں۔ مورخین نے آپ کے پانچ بیٹوں کی شمولیت کا ذکر کیا ہے جن میں ابوبکر رضی اللہ عنہ، قاسم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اور دو ابھی بلوغت کو نہ پہنچے تھے وہ بچ گئے۔ ان کے نام عمرو بن حسن رضی اللہ عنہ اور محسن بن حسن رضی اللہ عنہ تھے۔ روایت ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد جناب محسن رضی اللہ عنہ سے چلی۔

آپ کے چچیرے بھائی جناب عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے بیٹے، جناب عون رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ، اپنے والد کا

* صہبا، عین التمر کے نزدیک علاقوں کے ایک سردار کی بیٹی تھیں۔

خط لے کر امام حسین رضی اللہ عنہ کے پاس مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔ خط میں عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی تھی کہ امام حسین کوفہ نہ جائیں لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ نہ مانے۔ تو ان دونوں عظیم فرزندوں نے اسلام کی لاج رکھتے ہوئے اپنے عظیم چچا کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح اپنے عظیم دادا جناب جعفر طیار اور عظیم پردادا جناب ابوطالب کے نام کو اور بلند کیا۔ آپ دونوں بھی شہید ہو گیے۔ کچھ مورخین نے انگریزی کتابوں سے جب یہ پڑھا کہ آپ امام حسین رضی اللہ عنہ کے Nephew تھے تو انہوں نے ان کو جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کا بھانجا بنا دیا۔ کسی نے آگے بڑھ کر ان کو جناب زینب بنت علی کا بیٹا قرار دے دیا اور مرثیئے لکھ ڈالے کہ جناب زینب رضی اللہ عنہا نے بیٹوں کو یہ فرمایا، وہ فرمایا وغیرہ۔ دراصل جناب عون رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام جمانہ بنت میثب اور جناب محمد رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام خوصاء بنت نصفہ تھا تو جناب زینب رضی اللہ عنہا کا ذکر خواہ مخواہ کر دیا گیا ہے۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے دوسرے چچا جناب عقیل رضی اللہ عنہ کے تین بیٹے، جناب جعفر، جناب عبدالرحمٰن اور جناب عبداللہ بھی ساتھ تھے اور تینوں میدان کربلا میں شہید ہوئے اور چوتھے جناب مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ پہلے کوفہ میں شہید ہو گئے تھے۔ جناب مسلم رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ بن مسلم رضی اللہ عنہ، امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ایک اور چچیرے بھائی، ابوسعید بن عقیل رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بھی امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

باقی ساتھیوں اور شہدأ کا ذکر واقعات میں آئے گا۔ اہل بیت میں سے امام حسین رضی اللہ عنہ سمیت ۲۳ عظیم ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے تین زندہ بچے جو امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے عمرو اور محسن ہیں۔ باقی بیس میں سے جناب مسلم کوفہ میں شہید ہوئے اور اہل بیت میں سے کربلا کے میدان میں امام حسین رضی اللہ عنہ، سترہ یا اٹھارہ عظیم ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوئے۔ ایک نام کا فرق ہے اور اختلاف صرف اتنا ہے کہ آیا ایک ابوبکر بن حسن رضی اللہ عنہ ہی شہید ہوئے یا دوسرے ابوبکر بن علی رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے۔ واللہ اعلم۔ باقی کوئی اختلاف نہیں اور باقی شہدأ کا ذکر بعد میں آئے گا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی

بہرحال امام عالی مقام رضی اللہ عنہ اس چھوٹے سے قافلہ کے ساتھ مدینہ شریف سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچے۔ آپ کے کوچ کے راستہ کو نقشہ ہفتم پر دکھایا گیا ہے۔ مکہ کے گورنر عمرو رضی اللہ عنہ بن سعید بن عاص* تھے۔ وہ آپ کو امان دینے پر تیار تھے بلکہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر طیار نے عمرو رضی اللہ عنہ بن سعید کو ایک خط لکھا اور ان کو بھی عمرو نے کہہ دیا تھا کہ امام

*وہی سعید رضی اللہ عنہ بن عاص جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوفہ کے گورنر تھے۔

حسین رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں قیام کر سکتے ہیں لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کے لیے تیار نہ تھے" حالانکہ مکہ مکرمہ میں کافی لوگوں نے امام حسین کو عرض بھی کی کہ وہ ان کے ساتھ ہیں لیکن امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث مبارکہ سنی ہے کہ ایک مینڈھا مکہ کی حرمت کو حلال کر دے گا۔ میں وہ "مینڈھا" نہیں بننا چاہتا۔ مکہ مکرمہ کے بارے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کی حرمت ہے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فتح مکہ کے وقت مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو ان کے لیے چند لمحوں کے لیے حلال کر دیا تھا کہ حق یہ چاہتا تھا کہ اہل حق مکہ مکرمہ میں کسی منظم طریقے سے داخل ہوں۔ اور اس پہلو کی ہم "جلال مصطفیٰ" کے چھٹے باب میں وضاحت کر چکے ہیں کہ اس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم از خود سر جھکا کر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔

اہل کوفہ کے خطوط

امام حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کے لوگوں کے متعدد خطوط موصول ہو رہے تھے کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور ایک لاکھ مجاہدین آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ چنانچہ یہ خط وصول کرنے کے بعد آپ مکہ مکرمہ میں چند دن رک گئے اور اپنے چچیرے بھائی جناب مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو کوفہ روانہ کیا کہ وہاں کے حالات کا صحیح طور پر اندازہ لگائیں اور ان کو صورت حال سے آگاہ کریں۔ کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ انصار تھے اور بے شک بنو امیہ کے منظور نظر تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون آلودہ کرتہ لے کر دمشق گئے تھے جس کا ذکر تیسری کتاب میں ہے لیکن صحابی ہونے کی وجہ سے کسی حتمی حد تک بھی نہ جا سکتے تھے چنانچہ جیسے ہی جناب مسلم رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچے تو پہلے روز اٹھارہ ہزار جوانوں نے ان کے ہاتھ پر امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کی اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ برائے نام گورنر رہ گئے۔ جناب مسلم رضی اللہ عنہ نے امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو ان حالات سے آگاہ کیا تو امام حسین رضی اللہ عنہ ذوالحجہ ۶۰ ہجری میں کوفہ روانہ ہو گئے۔

عبیداللہ بن زیاد

یزید بھی حالات سے باخبر تھا اور جس روز سے اس کو اہل کوفہ کے امام عالی مقام کی طرف خطوط کی بھنک پڑی وہ بصرہ کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کو لکھ چکا تھا کہ وہ جا کر کوفہ کی امارت بھی سنبھال لے۔ یزید کو معلوم تھا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکیں گے اور عبیداللہ بن زیاد اب کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ وہ یزید کے چچا کا بیٹا بن چکا تھا۔ اس کے باپ کی پیدائش خواہ کن حالات میں ہوئی لیکن بنو امیہ اس کے باپ کو ابو سفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا تسلیم کرتے تھے اور اس چیز نے عبیداللہ کے دماغ کو خراب کر دیا تھا۔ بہر حال وہ چالباز تھا۔ اس نے پہلے تو کچھ آدمی کوفہ بھیج دیئے۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچنے والے ہیں۔ اس کے بعد خود امام

حسین ﷜ کا روپ دھار لیا۔ وہ ایک یمنی چغہ پہنے ایک خچر پر سوار کوفہ میں داخل ہو گیا۔ اکثر اہل کوفہ نے امام حسین ﷜ کو نہ دیکھا تھا اور ویسے عبیداللہ نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا صرف آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ کھلا تھا۔ اس نے جناب حسین ﷜ والی متانت اختیار کی ہوئی تھی۔ چند ہمراہی اس کے ساتھ تھے جنہوں نے کچھ اسی قسم کا لباس پہنا ہوا تھا اور خچر سوار عبیداللہ کے لیے ایسا مودبانہ رویہ اور روپ اختیار کئے ہوئے تھے کہ اہل کوفہ نے سمجھا کہ واقعی امام حسین ﷜ کوفہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے اور اس طرح عبیداللہ قصر امارت میں داخل ہو کر اس پر قابض ہو گیا۔

قصر میں پہنچ کر اس نے تمام قبیلوں کے سرداروں کو بلایا جن میں سے کچھ تو اس کو امام حسین ﷜ سمجھ کر بڑی امیدیں لے کر گئے لیکن آگے سے جب عبیداللہ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوا تو وہ لوگ کانپنے لگے۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ اپنے قبیلہ کے تمام لوگوں کو جو جناب مسلم بن عقیل ﷜ کے ساتھ مل چکے ہیں، واپس لایا جائے ورنہ وہ سب کو تہ تیغ کر دے گا۔ جناب مسلم ﷜ کو جب ان حالات سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے آدمی دوڑا کر اپنے ساتھیوں کو کوفہ کے باہر اجتماع کرنے کا حکم دیا۔ اول تو کچھ لوگوں کو ان قبیلہ کے سرداروں نے راستے ہی سے واپس بلا لیا لیکن جناب مسلم ﷜ نے دیکھا کہ ان اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والوں میں سے ان کے ساتھ کل چار ہزار آدمی باقی رہ گئے تھے۔ اب انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ان چار ہزار آدمیوں کو کوفہ سے باہر ہی صف بندی کے احکام دے دیئے۔

جناب مسلم ﷜ کی شہادت

جناب مسلم ﷜ اب عجیب تذبذب میں تھے اور کوفہ کے باہر چار ہزار ساتھیوں کے ساتھ صف بند تھے کہ ابن زیاد کے کہنے پر قبیلہ کے سرداروں نے جناب مسلم ﷜ کے ساتھیوں کو نام لے لے کر بلانا شروع کر دیا اور طرح طرح کے لالچ دینا شروع کر دیئے۔ شام تک جناب مسلم ﷜ کے ساتھ صرف تیس آدمی رہ گئے تھے۔ اب جناب مسلم ﷜ نے سوچا کہ کسی جگہ وقتی پناہ لے کر اب تیس آدمیوں میں سے کسی کو مکہ مکرمہ بھیجا جائے کہ امام عالی مقام ﷜ کو اصل حالات سے آگاہ کریں اور خود تو ان کو اپنی شہادت نظر آ رہی تھی وہ خواہ کوفہ میں ہوتی، خواہ وہ فرار کرتے تو ہوتی لیکن پناہ کی تلاش میں دیکھا کہ تیس میں سے صرف دس آدمی ساتھ رہ گئے اور جب ذرا اندھیرا ہو گیا تو وہ بھی غائب ہو گئے۔ آگے کافی لمبی کہانی ہے۔ جناب مسلم ﷜ گرفتار ہوئے اور ابن زیاد نے ان کو شہید کرا دیا۔ اس سلسلہ میں اہل کوفہ کے کردار کی جو جھلک ملتی ہے اس سے آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ جب دنیا انسان کو اس طرح اندھا کر دیتی ہے کہ نہ ان کا کوئی اصول رہتا ہے نہ ان میں احساس زیاں باقی رہتا ہے یعنی انسانیت، انسانیت کا لبادہ اتار کر پھینک دیتی ہے اور اس جگ میں وہ اس طرح ننگا ہو جاتا ہے جس طرح ننگا وہ پیدا ہوا تھا۔ اس لیے ان وعدہ خلافیوں کی تفصیل میں جانے سے کراہت پیدا ہو گی کہ شیطان بھی ایسی حالت دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے
پرکالہ آتش ہوئی آدم کی کف خاک

(اقبالؔ)

امام حسین رضی اللہ عنہ ملک عراق میں

امام حسین رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ سے چل کر زرود کے مقام پر پہنچے تو خبر ملی کہ مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں پر قادسیہ کی فتح سے پہلے جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص نے قیام کیا تھا۔ ہم پہلی کتاب کے اکیسویں باب میں اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ جناب مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اب جینے میں کوئی مزہ نہیں۔'' یہاں ہم قارئین کی توجہ پانچویں باب میں جناب علی رضی اللہ عنہ کے خواب کی طرف مبذول کرائیں گے کہ انہوں نے کیا دعا مانگی تھی کہ چار سال خلافت کے دوران آپ مسلمانوں کی حالت پر نظر کر کے مایوس ہو چکے تھے اور امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو آج پھر ایسے ہی حالات نظر آ رہے تھے کہ لوگوں کا کردار ختم ہو چکا تھا ایسے لوگوں میں رہنے کی بجائے عزت کی موت یا شہادت کی دعا بدرجہا بہتر ہے۔

ویسے راستہ میں کافی لوگ آپ کے ساتھ شریک ہو چکے تھے اور جیسے ہی ان لوگوں کو کوفہ کے حالات کا پتہ چلا تو انہوں نے آپ کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ ایسے لوگ دراصل امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس امید پر شریک ہو گئے تھے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی حکومت میں ان کو ترجیحات حاصل ہوں گی لیکن جب آگے خراب حالات کی خبر ملی تو رفو چکر ہو گئے۔ لعنت ہو حب دنیا پر۔ بہر حال آپ کے ساتھ صرف وہی لوگ رہ گئے جو مکہ سے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان کی تفصیل واقعات کے ساتھ آتی رہے گی یا اہل بیت تھے جن کا ذکر ہو چکا ہے۔

شراف کے مقام پر

نقشہ ہشتم پر جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کے کوچ کے راستہ کا مطالعہ کریں کہ اس راستے پر چلتے چلتے آپ رضی اللہ عنہ شراف کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں جناب مثنیٰ بن حارث نے جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کے انتظار میں وفات پائی اور اس کا ذکر بھی پہلی کتاب میں ہو چکا ہے۔ اب ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ آنے والے حالات سے آگاہ تھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں بشارت دے چکے تھے کہ ''بیٹا! جلدی آؤ، تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔'' لیکن یہ بشری تقاضے تھے کہ امام عالی مقام رضی اللہ عنہ ہر کارروائی دنیاوی لحاظ سے کر رہے تھے۔ شراف سے قادسیہ کے مقام کی طرف امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا قافلہ آج ان حالات سے مختلف حالات میں پیش قدمی کر رہا تھا اور غیروں کی بجائے اپنے دشمن ہو چکے

تھے۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص * کا بیٹا عمرو بھی یزید کے لشکر میں آگے سے امام حسین رضی اللہ عنہ کی مخالفت کر رہا تھا اور اس نے حر بن یزید تمیمی کو ایک ہزار فوج کے ساتھ آگے بھیجا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے قافلہ پر نظر رکھے اور حر، امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو قادسیہ کے نزدیک ملا۔

حُر کی عرض

حر نے امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو عرض کہ وہ ابن زیاد اور عمرو بن سعد رضی اللہ عنہ کے حکم پر آیا ہے کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے چلے یا آپ واپس چلے جائیں یا کوئی اور راستہ اختیار کر لیں یا براہ راست یزید یا ابن زیاد کو خط لکھ کر اپنے مقاصد کا اظہار کریں کہ شاید کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ آپ کے معاملہ میں امتحان سے بچ جائے۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا فرمان

امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''میں اپنا ایک فرض پورا کر رہا ہوں۔ میں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ یزید کی حکومت غیر اسلامی ہے۔ اہل کوفہ نے میرے ساتھ اس سلسلہ میں اتفاق کیا اور مجھے دعوت دی کہ میں ان کی قیادت سنبھالوں۔ میں اس غرض سے یہاں تک آ گیا ہوں۔ میں اہل کوفہ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے وعدہ پورا کر دیا تم اپنا وعدہ پورا کرو تا کہ روز قیامت کوئی شک نہ رہ جائے اور ہم اس سلسلہ میں ایک دوسرے پر صحیح گواہی دے سکیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے سفر جاری رکھا ہوا تھا اور حر کے لشکر والے دائیں بائیں چل رہے تھے کہ اس طرح ایک جگہ قیام ہوا تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے حر کے لشکر والوں کو خطبہ دیا جس میں امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے مقاصد اور مسلمانوں کے فرائض کو واضح کر دیا۔ اس کے کچھ اقتباسات اس طرح ہیں۔

> ''لوگو! سنو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایسے امیر یا حکمران کو دیکھا جو ظالم ہے، اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرتا ہے، خدا کے عہد کو توڑتا ہے۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے اور دیکھنے والوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرتا ہے اور دیکھنے والوں کو اس پر اپنے قول و عمل سے غیرت نہ آئی تو خداوند تعالیٰ کو یہ حق ہے کہ اس بادشاہ یا حکمران کی بجائے ایسا دیکھنے والوں کو جہنم میں داخل کر دے۔ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت قبول کر لی ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت چھوڑ دی ہے زمین پر فتنہ فساد پھیلا رکھا ہے۔ حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے اور مال غنیمت میں اپنا

* جناب سعد رضی اللہ عنہ نے انہی مقامات سے ایران فتح کیا جس کا ذکر پہلی کتاب میں موجود ہے۔

حصہ زیادہ لیتے ہیں۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔ اس لیے مجھے حق ہے کہ ان حالات پر مجھے غیرت آئے۔"

تبصرہ:

اسلامی فلسفہ حیات کے لحاظ سے اول جہاد بالنفس ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند کرو اور پھر حاکم وقت کو مجبور کرو کہ وہ بھی ان باتوں پر عمل پیرا ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ ہمارا حاکم نہیں ہو سکتا اور جب تک قوم اس فلسفہ پر عمل نہیں کرتی تو باقی سب باتیں فضول ہیں بلکہ خرافات کا درجہ رکھتی ہیں اسی وجہ سے یہ عملی پہلو لفظ بہ لفظ پیش کیے جا رہے ہیں۔

کوفہ کے حالات

اب امام حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی اور مسافروں کے ساتھ رابطہ قائم کیا تو آپ کو بتایا گیا کہ شہر کے تمام قبائل کے سرداروں کو رشوتیں دے کر ابن زیاد نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے یعنی وہ یزید کے ساتھی بن چکے ہیں۔ عوام کے دل امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے مگر ان کی تلواریں امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف ہی نیام سے نکلیں گی۔ جناب مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ جو دو رہنما یا ساتھی بھیجے گئے تھے وہ شہید ہو چکے ہیں۔ یہ خبریں سن کر امام حسین رضی اللہ عنہ نے قیس رضی اللہ عنہ بن مسہر کو کوفہ بھیجا تا کہ اہل کوفہ کو اپنا وعدہ یاد دلائیں۔ جناب قیس رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا گیا اور قصر امارت کی چھت سے نیچے گرا کر شہید کروا دیا گیا۔ لوگ سہم گئے۔ اس کے بعد امام حسین رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن بقطر کو بھیجا تو ان کو شہر سے باہر ہی سے ابن زیاد کے ایک فوجی دستہ کے کمانڈر حصین بن نمر نے گرفتار کر لیا۔ آپ کے ساتھ بھی ابن زیاد نے وہی سلوک کیا جو وہ جناب قیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر چکا تھا۔

طرماح بن عدی رضی اللہ عنہ

اسی دوران طرماح رضی اللہ عنہ بن عدی حاتم پہنچ گئے اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات کی اور آپ کو بتا دیا کہ اہل کوفہ آپ کا ساتھ نہ دیں گے۔ آپ مہربانی فرما کر ہمارے ساتھ اوجا پہاڑ کے علاقوں میں چلیں اور وہاں پر ہمارا قبیلہ آپ کی نگہبانی کرے گا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے طرماح کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا۔ "میں ایک اصول کے تحت کوفہ آیا ہوں کہ ان لوگوں نے ظالم حکمران کے خلاف میری مدد کا وعدہ کیا۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور جب تک میرا یہ پیغام نہیں پہنچ جاتا کہ میں وعدے پر پورا اترا ہوں، تب تک میں راستے سے مڑنے والا نہیں ہوں اور اگر راستے سے مڑنا ہوتا تو میں زرود سے ہی واپس چلا گیا ہوتا وغیرہ۔ یہ زندگانی چند دن کی ہے اور سوال یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا

جواب دوں گا۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ میرے ساتھ مل کر اگر ایک آدمی بھی حق کے لیے لڑنے کو تیار ہے تو میں ضرور حق کے لیے لڑوں گا۔" اسلامی فلسفہ حیات کی یہ ایک اور عملی مثال ہے۔

میدانِ کربلا میں

اسی دوران امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا قافلہ نینویٰ کے قریب پہنچ گیا اور وہاں پر ہی ابن زیاد کا قاصد، حر بن یزید تمیمی کے پاس پہنچ گیا اور اس کو حکم دیا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے قافلہ کو دریا سے دور رکھا جائے۔ یہ محرم ۶۱ ہجری کا واقعہ ہے اور قافلہ ایک اجاڑ میدن میں پہنچا ہوا تھا جس کو میدان کربلا کہتے ہیں۔ یہ جگہ دریائے فرات سے دور تھی کہ اس میدان اور دریا کے درمیان ایک ٹیلہ یا ٹیکری قسم کی اونچی جگہ تھی اور وہاں پر ہی جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کا بیٹا عمرو، ابن زیاد کی طرف سے چار ہزار کا لشکر لے کر امام حسین رضی اللہ عنہ کی مخالفت یا مقابلہ کے لیے پہنچ گیا۔ روایت ہے کہ عمرو اس مہم پر نہیں آنا چاہتا تھا لیکن ایک طرف اس کو "رے" کی حکومت کا لالچ دیا گیا اور دوسری طرف اس کے دل میں خوف بٹھایا گیا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس کی خیر نہیں لیکن وہ بھی حر کی طرح اس امتحان سے بچنا چاہتا تھا اور اس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی۔

تبصرہ:

لیکن انسان کو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ عظیم صحابی اور عشرہ مبشرہ میں شامل سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کا بیٹا اس امتحان میں پاس نہ ہوا اور اپنے نام کو سیاہ دھبہ لگوا بیٹھا لیکن ایک غیر معروف آدمی حر نے دونوں جہان حاصل کر لیے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے اپنے خاتمہ بالخیر کی دعا مانگنی چاہیے۔

امام حسین رضی اللہ عنہ اور عمرو کی ملاقات

مورخین نے امام حسین رضی اللہ عنہ اور عمرو بن سعد کی ملاقات کو معاملات کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ بعض راویوں کے مطابق ملاقات علیحدگی میں بھی ہوئی۔ ستمبر اکتوبر کا مہینہ تھا۔ قافلے نے پڑاؤ کرتے وقت پانی کا خاص خیال نہ رکھا تھا۔ دریا سے تھوڑے فاصلہ پر ایک خشک جگہ، ایک ٹیلے کے پاس پڑاؤ کر لیا کہ ضرورت کے مطابق پانی دریا سے لے آئیں گے جو نزدیک ہی تھا۔ ابن زیاد نے پہلے ہی حکم دیا ہوا تھا کہ قافلہ کی ناکہ بندی کی جائے اور ان کو دریا سے پانی نہ لینے دیا جائے لیکن جناب عباس علمبردار رضی اللہ عنہ چند ساتھیوں کے ساتھ گئے اور دریا سے کچھ پانی بھر لائے کہ عمرو بن سعد نے زیادہ مزاحمت بھی نہ کی۔

عمرو کے ساتھ طویل ملاقات میں امام حسین رضی اللہ عنہ نے عمرو پر واضح کر دیا کہ وہ اہل کوفہ کی دعوت پر آئے ہیں، اگر

ان کا پیغام اہل کوفہ کو پہنچادیا جائے اور مجھ پر ثابت کر دیا جائے کہ اہل کوفہ مجھے پسند نہیں کرتے یا میرے ساتھ نہیں تو میں واپس جانے کو تیار ہوں۔ یہ بات سن کر عمرو خوش ہو گیا اور ابن زیاد کو اس کی خبر پہنچی۔ ابن زیاد نے البتہ حکم دیا کہ پانی کی مکمل ناکہ بندی کی جائے اور سیدھی بات یہ ہے کہ امام حسین (رضی اللہ عنہ) سے یزید کی بیعت لی جائے، ہم کوئی شرط ماننے کو تیار نہیں کہ اہل کوفہ سے ایک آدمی بھی امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ملنے کو تیار نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی آدمی تو امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مل جاتا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ اور عمرو کی دوسری ملاقات

اب عمرو نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسری ملاقات کی اور امام حسین رضی اللہ عنہ کو گزارش کی کہ کوئی آسان شرائط رکھیں کہ اہل کوفہ تو امام حسین رضی اللہ عنہ کی مدد کرنے کو تیار نہیں اور عمرو اس امتحان سے کچھ بچ جائے۔ عمرو کی اس گزارش پر امام حسین رضی اللہ عنہ نے تین آسان ترین شرائط پیش کر دیں جو حسب ذیل تھیں۔

۱۔ مجھے وہیں واپس جانے دو جہاں سے آیا ہوں تاکہ میں زندگی کے باقی ایام مکہ مکرمہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہ کر گزاروں۔

یا

۲۔ مجھے یزید کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لینے دو اور میں یزید کے پاس جاتا ہوں اور تم بھی میرے ساتھ چلو کہ تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ میں یزید کے پاس جانے کی بجائے کہیں اور چلا جاؤں گا۔

یا

۳۔ مجھے اسلامی ممالک کی سرحدوں پر جانے کی اجازت ہو، جہاں مجاہدین کو اکٹھا کر کے ہم کفار کے ملکوں میں آگے بڑھ کر جہاد کر سکیں۔

عمرو یہ شرائط پا کر بہت خوش ہوا کہ تینوں شرائط میں صلح اور صلح ہی تھی اور اس نے ابن زیاد کو خبر دی تو ابن زیاد بھی بڑا خوش ہوا اور خاص کر دوسری شرط کو بہت پسند کیا کہ وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر یزید کے پاس جائے گا اور اس کی بڑی سرخروئی ہوگی لیکن پاس ہی شمر بن ذی الجوشن بیٹھا تھا اس نے ابن زیاد کو کہا کہ یاد رکھو، امام حسین (رضی اللہ عنہ) ایک دفعہ یزید کے پاس پہنچ گئے تو پھر ان کے مقابلہ میں ابن زیاد کی وہ عزت نہ رہے گی۔ یہ موقع ہے کسی طرح لڑائی سے یا کسی اور طریقہ سے امام حسین (رضی اللہ عنہ) کو شہید کرا دو تو پھر یزید کو تیری ضرورت رہے گی اور تجھے یزید کی ضرورت۔ (قارئین اس مشورہ والے فقرہ کی شیطانیت کو ضرور بھانپ جائیں گے)

ابن زیاد کی گراوٹ

شمر کی یہ رائے ابن زیاد کو بڑی پسند آئی اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا طرزِ عمل ایسا ہو کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو کسی بہانے سے شہید کرا سکے۔ اس لیے اس نے عمرو کو بڑا سخت خط لکھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی کوئی شرط نہیں مانی جا سکتی۔ سیدھی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے امام حسین رضی اللہ عنہ غیر مشروط طور پر اپنے تمام ساتھیوں کو ہمارے سپرد کریں اور میرے ہاتھ پر یزید کی بیعت کریں اور تو پھر ان کی دوسری شرط منظور ہے، میں ان کو لے کر یزید کے پاس چلا جاؤں گا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کی وضاحت

عمرو نے جب یہ شرائط امام حسین رضی اللہ عنہ کو سنائیں تو آپ مسکرائے اور فرمایا کہ "سارا جھگڑا تو بیعت کا ہے اگر میں یزید کی بیعت کر لوں یعنی اس کو اپنا حاکم تصور کر لوں تو پھر بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ میرا یزید کے پاس جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں وہاں جا کر اس کی بیعت کر لوں گا۔ میں تو یزید کے پاس جانے کے لیے اس لیے تیار ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ میرے اور یزید کے درمیان ہے اور جو لوگ میری وجہ سے اس امتحان میں پڑے ہوئے ہیں، ان کے لیے شاید آسانی ہو جائے۔ میں اگر یزید کے پاس جاتا اور اس کے اور میرے درمیان کیا ہوتا، یہ آنے والا وقت ہی بتلا سکتا ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ایک فاسق و فاجر کی بیعت، اس سے سینکڑوں میل دور ایک اور فاسق و فاجر کے ہاتھ پر کروں۔"

تبصرہ:

قارئین! امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک کارروائی میں مومن کے مقصدِ حیات کی عملی مثالیں ہیں۔ حاکمِ وقت یا زندگی کی طرف رویہ کی ان مثالوں میں ہمارے لیے نشانِ راہ ہے لیکن کچھ لوگ شاید اعتراض کریں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ پہلے ہی مکہ مکرمہ میں عبادت کے لیے کیوں نہ ٹھہر گئے جواب تیار ہو گئے کہ وہ باقی عمر مکہ مکرمہ میں عبادت میں گزار دیں گے۔ امام عالی مقام رضی اللہ عنہ اس کی بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ وہ بیعت کرنے پر تو بالکل تیار نہ تھے اور مکہ کی حرمت کو بھی خراب نہ کرنا چاہتے تھے، اب ایک معاہدہ کے تحت گوشہ نشینی اختیار کر رہے تھے اور کوفہ آنے تک بھی ایک مقصد تھا کہ مسلمانوں نے آپ کو راہِ حق پر لڑنے کی دعوت دی تھی اس پر لبیک کہنا ضروری تھا لیکن اب ساری دنیا راہِ حق سے بھاگ گئی تو جنگ بے فائدہ تھی لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہ کرنا چاہتے تھے اور آخری وقت تک عزت اور غیرت کی زندگی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ہیں مومن کے مقصدِ حیات اور اس باب کو ان کتابوں کا حصہ بنانے میں یہی مدعا تھے کہ ہم اپنے مقصدِ حیات کے ان عملی پہلوؤں کو سمجھیں۔

ابن زیاد کا تذبذب

عمرو کو خط بھیجنے کے بعد ابن زیاد تذبذب میں پڑ گیا کہ شرائط بڑی ناجائز تھیں۔ عمرو بھی قریش ہونے کی وجہ سے امام حسین رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار بھی تھا اور ایسی ناجائز شرائط کو شاید وہ بھی ناپسند کرے اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل جائے اس لیے اس نے عمرو کے نام جلدی سے ایک دوسرا خط شمر بن ذی الجوشن کے ہاتھ بھیجا۔ قارئین اسلام کی تاریخ کا یہ بدترین خط تھا، جس کے اقتباسات لکھنے کو جی نہیں چاہتا لیکن کہانی سے عبرت حاصل کرنے کے لیے ابن خلدون کے حوالے سے اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

''امابعد...... میں نے تمہیں حسین (رضی اللہ عنہ) کی طرف اس غرض سے نہیں بھیجا تھا کہ تم اس کے ساتھ لیت ولعل میں وقت برباد کرتے رہو اور اس کی مجھ سے سفارشیں کرتے رہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اگر حسین (رضی اللہ عنہ) اور ان کے ساتھی میرے حکم کی اطاعت کریں تو صلح نامہ لکھ کر ان سب کو میرے پاس بھیج دو، اگر انکار کریں تو حملہ کر دو یہاں تک کہ ان کو قتل کر کے مثلہ کر ڈالو کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں اور قتل کے بعد اس کے جسم اور سینہ کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کرانا، وہ بڑا ظالم، جفاکار، خودسر اور نافرمان ہے۔ پس اگر ہمارے حکم کی تعمیل کرو گے تو تم سب تابعداروں اور فرمانبرداروں کو صلہ دیا جائے گا اور اگر کچھ بھی خلاف ورزی کا قصد ہو تو ہم تم کو معزول کرتے ہیں اور تمہارے بجائے شمر کو لشکر کی سرداری دیتے ہیں۔''

جس وقت یہ خط لکھا جا رہا تھا تو عبداللہ بن ابی نخل بن حزام پاس بیٹھا تھا، اس نے ابن زیاد سے اپنی پھوپھی ام البنین رضی اللہ عنہا کے چار بیٹوں کے لیے امان طلب کی جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ شمر نے عمرو کے پاس پہنچ کر یہ خط عمرو کے حوالے کیا اور ساتھ اعلان کیا کہ ہماری بہن کے بیٹوں یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چار بیٹے جو ام البنین رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں ان کو امان ہے۔ شمر نے بہن کا جو لفظ استعمال کیا تو مورخین نے شمر کو جناب عباس علمبردار رضی اللہ عنہ وغیرہ کا ماموں قرار دے دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد تک آج کل کے کئی مورخین نے یہ غلطی پھیلا دی اور تحقیق نہ کی۔ شمر ملعون نہ تو جناب عباس رضی اللہ عنہ کا ماموں تھا اور نہ انہوں نے اس کی امان قبول کی تھی بلکہ اس پر لعنت بھیجی۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کی ایک رات کی مہلت طلبی

عمرو نے جب جناب عباس علمبردار رضی اللہ عنہ کے ذریعے امام حسین رضی اللہ عنہ کو اس خط کے مضمون سے آگاہ کیا تو آپ نے ایک رات کی مہلت مانگی کہ آج کی رات وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں گے۔ عمرو نے شمر کی اجازت سے یہ

مہلت دے دی۔ امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے رات بھر عبادت ضرور کی لیکن اصلی بات کچھ اور تھی۔ رات کے اندھیرے میں امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان کو آنے والے حالات سے آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

''اب یہاں سے بچ کر جانے کی تمام صورتیں ختم ہو چکی ہیں، اس لیے شاید دن کے وقت آپ لوگ میرا ساتھ کچھ حیا کی وجہ سے نہ چھوڑ سکتے ہوں۔ اس مجلس کے بعد پڑاؤ میں تمام چراغ گل کر دیئے جائیں گے تاکہ جو صاحب یہاں سے نکلنا چاہے وہ خاموشی سے نکل جائے۔''

یہ سن کر تمام ساتھی (رضی اللہ عنہم) زار و قطار رونے لگے اور عرض کی۔ ''یا امام رضی اللہ عنہ ہم کو اور زیادہ امتحان میں نہ ڈالیے، ہماری حوصلہ افزائی کیجیے کہ ہم آخری دم تک آپ کے ساتھ رہ کر وہ فرض پورا کر سکیں جس میں آپ ہماری راہنمائی کر رہے ہیں کہ اس دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں کہ آپ کی رہنمائی میں ہم وہ کچھ کریں کہ آخرت میں آپ کے ساتھیوں کے ساتھ اٹھیں۔''

قارئین یہ تھی مومن کے مقصد حیات کی ایک اور جھلک۔ ہم ان ساتھیوں کے صحیح الفاظ سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں کہ آپ لوگوں کا ایمان بھی تازہ ہو جائے۔

جناب زہیر رضی اللہ عنہ بن القین نے عرض کی۔ یا امام! میں بلنجر کی لڑائی میں شریک تھا، وہاں پر بہت زیادہ مال غنیمت حاصل ہوا اور سب مجاہدین کو بے حساب حصہ ملا۔ جناب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی ہمارے ساتھ تھے، فرمانے لگے۔ اے مجاہدو! اسلام میں اگر آپ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا زمانہ ملے اور ان کی نصرت میں قتال کرو، تو اس مال غنیمت یا فتح سے وہ کام ہزار گنا بہتر خوشی کا مقام ہوگا۔'' جناب زہیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''میں تو یہ پسند کروں کہ آپ کی نصرت میں قتل ہوں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل ہوں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔''

جناب حبیب رضی اللہ عنہ بن مظہر فرمانے لگے۔ ''بخدا، آپ کی رفاقت میں تو صرف ایک دفعہ قتل ہوں گا۔ میں تو اس وقت بھی آپ کی نصرت میں لڑتا جب آپ کی ہمراہی میں لڑتے ہوئے ستر دفعہ قتل ہوتا۔''

جناب مسلم رضی اللہ عنہ بن عوسجہ نے عرض کی۔ ''اے امام! اب تو خدا کے فضل سے میرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ بخدا اگر یہ نہ ہوتی تو پتھروں اور ہاتھوں سے لڑ کر آپ کی نصرت میں شامل ہوتا۔ اب ان شاء اللہ اس تلوار کا حق ادا کروں گا۔''

اس طرح امام حسین رضی اللہ عنہ کے تمام ہمراہی جن کی کل تعداد ۷۲ تھی اپنے فلسفہ حیات کے امتحان کے عملی مظاہرے کو واقعہ سے چند دن پہلے اعلان کر رہے تھے یا نیت باندھ رہے تھے کہ اسلام میں نیت اور وعدہ کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے۔ روایت ہے کہ ان ۷۲ ہمراہیوں میں اہل بیت سمیت ۳۲ سوار تھے اور چالیس پیادہ، عورتیں اور

چھوٹے بچے الگ تھے۔

اب اندازہ لگائیں کہ یہ بہتر عظیم ہستیاں، پانچ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ ایک طریقہ "جلال مصطفیٰ(۱)" میں سقوط بغداد کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ایک منگول نے چالیس آدمیوں کو اکٹھا کرلیا اور ان کو قتل کرنے پر تیار ہوا تو ہاتھ میں تلوار نہ تھی کہ کوئی کلہاڑا وغیرہ تھا۔ وہ کہنے لگا کہ لیٹ جاؤ کہ وہ تلوار لے آئے تا کہ قتل کا کام جلدی ہو جائے۔ اس کے تلوار لانے تک صرف ایک آدمی کو فرار ہونے کی ہمت ہوئی، باقی بھیڑوں اور بکریوں کی طرح قربان ہو گئے۔ لیکن یاد رہے کہ اسلام میں تو پسپائی کی اجازت ہی نہیں۔ وہ بھی صرف حکمت عملی کے تحت اجازت ہے اور ایسی شرط میں کہ دوبارہ منظم ہو کر پھر لڑائی میں کود جاؤ۔ اسلام کے فلسفہ حیات کو سلطان ٹیپو (۲) نے ایک فقرہ میں بیان کیا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی ہزار سال کی زندگی سے بہتر ہے۔" محمود غزنوی (۳) نے بھی ایک فقرہ میں بیان کیا کہ وہ روز قیامت کو محمود بت شکن کے نام سے پکارا جانا پسند کریں گے کہ حق کے راستے میں وہ بتوں کو پاش پاش کر دیتے تھے۔

پس یہ ہے مومن کا مقصد حیات جس کی امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی کربلا کے میدان میں عملی نشاندہی کر گئے۔

۱۰ محرم کو صبح کی نماز کے بعد عمرو نے اپنے پانچ ہزار لشکر کی صف بندی کی۔ مورخین نے اس کی تفصیل لکھی ہے، کون معلون کہاں تھا، ہم کو اس سے دلچسپی نہیں۔ البتہ آگے سے جناب امام حسین نے بھی صف بندی کی کہ اسلام لڑ کے مرنے کی اجازت دیتا ہے چنانچہ علمبرداری کا شرف جناب عباس بن علی رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا۔ میمنہ پر جناب زہیر رضی اللہ عنہ بن القسین تھے اور میسرہ پر جناب حبیب رضی اللہ عنہ بن مطہر۔ اس کے بعد جناب امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے ایک اونٹنی منگوائی اور اس پر سوار ہو کر یزیدی لشکر کے سامنے خطبہ دیا۔ طبری سمیت متعدد مورخین نے اس خطبہ کو لفظ بہ لفظ لکھا ہے کہ سننے والے کہتے ہیں کہ طرزِ بیان فصاحت و بلاغت سے بھرپور یہ خطبہ اپنی مثال آپ ہے لیکن افسوس کہ حب دنیا والوں پر اس کا اثر نہ ہوا۔ بہرحال، ہم اس خطبہ کو تاریخ ابن خلدون کے ترجمے سے نقل کر کے پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا اور فرمایا۔

"اے لوگو! میری بات سنو تا کہ میں آپ لوگوں کو اپنے آنے کا سبب بتا سکوں پس اگر تم میرے سبب، وجوہات یا عذر کو مان لو گے، میری بات کی تصدیق کرو گے، حق پسندی کرو گے تو تمہاری اس میں سعادت مندی ہے اور تمہارا اس میں کوئی حرج نہ ہوگا، اگر تم لوگ میری وجوہات اور سبب کو نہیں مانتے

۱۔ صفحہ ۱۱ سے استفادہ کریں۔
۲۔ "جلال مصطفیٰ" صفحہ ۳۶۵ سے استفادہ کریں۔
۳۔ "جلال مصطفیٰ" صفحہ ۳۷۹ سے استفادہ کریں۔

تو تم لوگ الگ جمع ہو کر مشورہ کر و تا کہ تمہارے اوپر کوئی شک نہ رہ جائے اس کے بعد میرے سامنے آؤ تو تمہیں نظر آئے گا کہ بے شک میرا ولی اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ صالحین کا ولی ہے۔"

"اے لوگو! تم میرے نسب پر غور کر و اور دیکھو کہ میں کون ہوں۔ پھر اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھو اور غور کرو کہ کیا تمہارے لیے میرا قتل کرنا یا میری آبرو ریزی کرنا واجب ہے۔ کیا میں تمہارے نبی (ﷺ) کا نواسہ نہیں ہوں اور ان کے چچازاد بھائی کا بیٹا نہیں ہوں جو اول ترین مسلمان ہیں تو پھر کیا یہ تصدیق نہیں ہو جاتی کہ میں رسول اللہ ﷺ کا ہی بیٹا ہوں۔ کیا حمزہ سید الشہداؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے؟ کیا جعفر الشہیدؓ جو جنت میں اڑ رہے ہیں وہ میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا تم کو یہ خبر نہیں پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرمایا ہے کہ تم دونوں جنت کے نوجوانوں کے سردار ہو اور اہل جنت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو، پس میں جو تم سے کہتا ہوں اس کی تصدیق کرو کہ یہی سچ ہے۔ بخدا جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے والوں پر ناراض ہوتا ہے تو میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر تم مجھے جھوٹا جانتے ہو تو تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے یہ دریافت کرو گے تو وہ تم کو اس سے آگاہ کریں گے۔ جابر بن عبداللہ، ابو سعید خذری، سہل بن سعید، زید بن ارقم اور انس بن مالک (رضی اللہ عنہم) سے دریافت کرو کہ وہ تم کو بتلائیں گے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے۔ کیا تم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو تم کو میری خونریزی سے روکے؟ پس اگر تم لوگ میرے کہنے کو مشکوک سمجھتے ہو یا میرے نواسہ رسول ﷺ ہونے پر شک کرتے ہو، بخدا مشرق یا مغرب میں میرے سوا تمہارے نبی ﷺ کا کوئی نواسہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو بتلاؤ۔ کیا میں نے تم میں سے کسی کو مار ڈالا ہے جس کا قصاص مجھ سے طلب کرتے ہو؟ یا کسی کے مال کو میں نے دبالیا ہے جس کا مجھ سے معاوضہ مانگتے ہو، وغیرہ۔"

اہل کوفہ یعنی عمرو کے لشکر میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو امام حسینؓ پکار اٹھے۔

"اے شبث بن ربعی، اے حجاز بن الجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث، کیا تم لوگوں نے مجھے یہ نہیں لکھا تھا کہ میوے پک گئے ہیں، باغ سرسبز ہو رہے ہیں، تالاب چھلک رہے ہیں، آپ کی نصرت کے لیے لشکر یہاں آراستہ ہیں، آیئے۔"

آگے سے خاموشی چھا گئی اور گو یہ چاروں یزیدی لشکر میں شامل تھے لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ امام حسینؓ پھر پکار اٹھے۔ "واللہ تم نے لکھا تھا لیکن اب اگر وعدہ پر قائم نہیں رہ سکتے یا ویسے ناگوار گزرا کہ میں کیوں

آ گیا، تو اب مجھے دنیا میں کسی گوشہ امن کی طرف جانے دو۔''

اب کی دفعہ قیس بن اشعث بول اٹھا۔''ابن زیاد کی اطاعت کیوں قبول نہیں کر لیتے؟''

امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔''میں ایک ذلیل وخوار شخص کی اطاعت کرنے کی بجائے موت کو زیادہ پسند کروں گا۔''

یہ کہنے کے بعد آپ نے اپنی اونٹنی بٹھادی۔

تبصرہ:

ہمیں بار بار تبصرہ کرنے کی ضرورت اس لیے ہورہی ہے کہ افسانوی رنگ کے علاوہ جو لوگ اپنے بودے عقل کے دنیاوی پیمانوں سے واقعہ کربلا پر تبصرہ کرتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے فلاں مشورہ مان لیا ہوتا، یا یہ نہ کرتے اور وہ نہ کرتے...... ایسے لوگ اسلامی فلسفہ حیات اور مومن کے مقاصد زندگی سے نابلد ہیں۔ ہم نے ہر پہلو کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔ امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے اپنے کوفہ آنے کی وجہ بھی بتادی اور خط لکھنے والوں کے نام بھی بتادیئے۔ یہ شبث بن ربعی کوئی معمولی آدمی نہ تھا، اس کا ذکر جنگ صفین میں ہو چکا ہے کہ اپنے آپ کو مرد حق کہتا تھا۔ قیس اور اس کے باپ اشعث کا بھی جنگ صفین یا جنگ نہروان کے سلسلہ میں اور پہلے بھی تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔ باقی دونوں بھی اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے اپنے آنے کا مقصد اور وعدہ پورا کرنے والی بات کا اعلان کردیا اور اب امن کی طرف جانے کا اعلان کردیا اور ساتھ ہی عزت کی زندگی اور موت کی پسندیدگی کی بات بھی کردی۔ قارئین انہی زندگی کے مقاصد کی ہم کو تلاش تھی اور وہ بتدریج بیان کئے جارہے ہیں۔ ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ذکر کیا کہ وہ تمہارے بیچ موجود ہیں، کیا وہ صحابہ کرام لشکر میں موجود تھے؟ اگر ایسا ہوتا تو امام حسین رضی اللہ عنہ ان کو بھی پکارتے اور یہ موجودگی شاید ان کے زندہ ہونے کا ذکر ہے یا وہ لوگ کوفہ میں موجود ہوں۔ ویسے اس زمانے میں متعدد اور صحابہ کرام یعنی جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی زندہ تھے لیکن وہ لوگ مکہ شریف میں تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ جن صحابہ کرام کا نام لیا گیا وہ ملک عراق یا شام میں موجود ہوں۔ ہمارا ایمان ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یزیدی لشکر میں شامل تھے اور خیر قیس بن اشعث وغیرہ کی قسم کے لوگ تو ساری عمر کا ؤ مال رہے اور انہوں نے وقت کو سلام کیا ہے۔

حر رضی اللہ عنہ بن یزید

البتہ قبیلہ تمیم کے حر کے ضمیر پر ضرور اثر ہوا اور وہ اکیلے یزید کے لشکر سے الگ ہو کر امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے لشکر

میں شامل ہو گئے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ساتھ خاندان کے نام کو بھی چار چاند لگا گئے۔ یہ جہان اور آخرت دونوں حاصل کر لیے۔ ہم جناب حر رضی اللہ عنہ کو سلام کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہی عمل یا ادا سے سب کچھ حاصل کر لیا۔ اگر خالی لشکر سے الگ ہو کر ان حالات سے کنارہ کشی کر لیتے تو بھی عظیم کارروائی تھی بلکہ آپ نے الٹا یزید کے لشکر کو خطاب کیا اور ان کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی۔ آپ کے علاوہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے جناب زہیر رضی اللہ عنہ بن القین وغیرہ متعدد ساتھیوں نے یزیدیوں کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

عمرو بن سعد کا تیر

اب لشکر صف آرا ہو چکے تھے اور یزیدی لشکر کا کمانڈر عمرو آگے بڑھا اور دنیا کا لالچ سامنے رکھتے ہوئے ایک تیر امام حسین رضی اللہ عنہ کے لشکر پر چلا دیا اور پکار اٹھا کہ ''لوگو! گواہ رہنا سب سے پہلا تیر میں نے چلایا۔'' اور اس کے بعد یزیدی لشکر نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔

تبصرہ:

افسوس کہ عمرو یہ تیر ابن زیاد کی خوشنودی کے لیے چلا رہا تھا، بے چارہ بدنصیب تھا اور شاید اس کو یاد نہ رہا کہ حق کے راستے میں پہلا تیر چلانے والے اس کے عظیم والد جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص تھے۔ روزِ قیامت میں یہ معاملہ عمرو اور اس کے اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے لیکن عمرو کو دیکھ کر جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ وقفہ پوشیدگی اختیار کرنا پڑے گی یا بیٹے کی طرف سے نظریں موڑنا پڑیں گی۔ بہر حال چند سال بعد عمرو سمیت اس کی تمام اولاد والے مختار ثقفی کی تلوار کے سامنے تڑپتے رہے۔ قارئین! امتحان بڑا سخت ہے اور اللہ تعالیٰ سے خاتمہ بالخیر کی دعا کی جائے۔ حضرت نوح علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر کا بیٹا بھی گمراہ ہو گیا تھا۔

جنگ کی کارروائی

قارئین! ہم جنگ کی تفصیل میں نہ جائیں گے۔ ہمیں جو اصول اور حق کی باتیں کرنا تھیں اور جن چیزوں سے اسباق نکالنے تھے وہ سب بیان کر دی گئی ہیں۔ لڑائی کئی گھنٹے جاری رہی۔ دشمن کے اٹھاسی آدمی ہلاک ہوئے۔ امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے لشکر کے تقریباً تمام مجاہدین شہید ہوئے۔ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ بیمار تھے اور جنگ میں شرکت نہ کی، وہ بچ گئے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کے دو بچے جن کی عمر بارہ یا تیرہ سال تھی۔ وہ بھی جنگ میں شریک نہ ہوئے اور بچ گئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ شادی شدہ تھے اور ان کے لڑکے امام باقر رضی اللہ عنہ بھی اس وقت چند روز کے معصوم تھے لیکن پرانے مورخ ایسا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

شہدائے کربلا

کربلا کے میدان میں سترہ یا اٹھارہ شہدأ جن کا تعلق اہل بیت سے تھا، ان کے اسمائے گرامی لکھے جا چکے ہیں۔ باقی جو نام معلوم ہو سکے ہیں ان میں چند یہ عظیم ہستیاں ہیں۔

جناب حر بن یزید، جناب زہیر بن القین، جناب حبیب بن مطہر، جناب بریر بن حفیر، جناب مسلم بن عوسہ، جناب نافع بن بلال، جناب عبداللہ، جناب عبدالرحمٰن پسران عرزہ غفاری، جناب مالک بن عبد (دونوں صاحبان چچا زاد بھائی تھے) جناب سیف بن حارث، جناب حنظلہ بن اسد، جناب عابس بن ابی شبیب اور آپ کے خادم جناب شوذب، یزید بن ابی زیاد کندی مایہ ناز تیرانداز، جناب سوید بن عمر، جناب بشیر بن عمر حضرمی، جناب عمر بن خالد اور ان کے خادم جناب سعد، جناب جابر بن حارث، جناب مجمع بن عبداللہ رضی اللہ عنہم۔ یہاں پر یزید بن ابی زیاد کے بارے میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ آپ شاعر بھی تھے اور ابوشعثا کے نام سے مشہور تھے۔ تیراندازی میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ آپ عمرو بن سعد کے لشکر میں تھے اور جناب حر رضی اللہ عنہ سے بھی پہلے یزیدی لشکر چھوڑ کر امام حسین کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے تھے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو ناجائز شرطیں پیش کی جا رہی تھیں۔ ایک اور شہید عمر رضی اللہ عنہ بن قرظہ کا ایک بھائی یزیدی لشکر میں تھا۔ ان شہدأ کے نام لکھ کر ہم اپنے ایمان کو تازہ کر رہے ہیں کہ انہوں نے دو جہان حاصل کئے۔ یزیدی لشکر والوں پر اس جہان میں بھی پھٹکار اور آخرت بھی برباد اور پھر چند سال بعد ابن زیاد سمیت ان میں سے اکثر پر ذلت کا زمانہ آیا اور ان کے ساتھ جو کچھ مختار ثقفی یا ان کے لشکر والوں نے کیا وہ الگ کتاب کا مضمون ہے اور اس میں بڑی عبرت ہے۔

افسوس ناک رویہ

لیکن سب سے بڑھ کر افسوس ناک بات یہ ہے کہ یزیدی لشکر والوں نے تمام شہدأ کے سر کاٹ ڈالے اور میدانِ جنگ میں لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔ شہدأ کو دفن تک نہ کیا اور جو ان کے اپنے مردود جنگ میں مارے گئے صرف ان کو دفن کیا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بنو اسد کے ایک قبیلہ کے لوگوں نے جنگ سے دوسرے دن دفن کیا۔ یہ لوگ نزدیک ایک گاؤں غاضریہ سے آئے تھے۔ یزیدی لشکر والوں نے تمام عورتوں اور بچوں کو قید کیا اور شہدأ رضی اللہ عنہم کے سر نیزوں پر اٹھا کر پہلے کوفہ گئے اور پھر دمشق روانہ ہو گئے۔

ہم اگلے واقعات کی تفصیل میں بھی نہ جائیں گے لیکن جن قبیلوں نے یزید کی فوج میں شرکت کی تھی انہوں نے شہدأ کے سر اپنے نیزوں پر اس طرح اٹھائے ہوئے تھے جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ قبیلہ کندہ جس کا سردار قیس بن اشعث تھا انہوں نے تیرہ شہدأ کے سر اٹھائے ہوئے تھے، بنو اسد نے چھ، بنو فدرج نے سات اور اسی طرح اسی نسبت

سے باقی قبائل نے بھی شہدأ کے سر اپنے نیزوں پر اٹھائے اور وہ دمشق یزید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ (نعوذ باللہ)

یزید کا رویہ

کچھ مورخین کہتے ہیں کہ یزید نے کچھ افسوس ضرور کیا کہ اس نے ابن زیاد کو اس حد تک جانے کی اجازت نہ دی تھی لیکن کچھ کہتے ہیں کہ اس مردود نے اپنی چھڑی تک جناب امام حسین ﷛ کے دندان مبارک پر لگائی۔ یہ بھی روایت ہے کہ امام زین العابدین ﷛ اور عورتوں اور بچوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا اور یزید کے گھر سے رونے کی آواز بھی آئی۔ رونے والی بات البتہ تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یزید کی بیوی ام کلثوم کا دادا عامر حضرت علی ﷛ کی پھوپھی کا بیٹا تھا اور یزید کی دوسری بیوی ہندہ نے بھی آہ وزاری کی۔ یزید نے اگر کوئی نرم الفاظ استعمال کیے تو یہ سیاست تھی کہ وہ فکر مند ہوا ہو گا کہ دمشق میں کہرام نہ مچ جائے اور بے شک مدینہ شریف میں تو بعد میں کہرام مچ بھی گیا۔

ہم کہتے ہیں کہ کیا جو کچھ ہوا وہ یزید کی بے خبری یا نادانی کی وجہ سے ہوا؟ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ابن زیاد کے لشکر والے شہدأ کے سر اٹھا کر دمشق کی طرف اس طرح فخر سے نہ چل کر آتے۔ وہ ایسے چل کر آ رہے تھے جیسے انہوں نے ساری دنیا کو فتح کر ڈالا تھا۔

بے شک امام حسین ﷛ کی شہادت کی خبر بہت پہلے دمشق پہنچ چکی ہوگی اور اگر یزید نادم ہوتا تو شہدأ کے سر اس ڈرامائی انداز میں نہ اٹھائے جاتے اور نہ اہل بیت قیدیوں کی حالت میں دمشق پہنچتے۔ یہ سب ڈرامہ اور لوگوں کو ڈرانے کے لیے کیا جا رہا تھا اور ذرا بھر بھی ندامت نہ تھی۔ ہم نے یزید، ابن زیاد، شمر اور عمرو چاروں کی اس سلسلہ میں ذمہ داری پر تبصرہ کر دیا ہے اور ہم واقعہ کربلا کا جائزہ تو ویسے بھی پیش نہیں کر رہے۔ ہم نے تو یہ واقعہ مومن کی مقصد حیات کے عملی، روحانی اور واقعاتی پہلو کے تحت مختصر طور پر بیان کیا ہے اور اسی وجہ سے نتائج و اسباق پیش نہیں کیے جا رہے۔

یہ ہیں مومن کے مقصد حیات اور اسلام کے حاکم وقت کی ضرورات۔ اگلے باب میں ہم مسلمان حکمران کی ذمہ داریوں اور اسلامی نظام حکومت پر مختصر تبصرہ کریں گے اور پھر اسلامی فلسفہ حیات کے عملی پہلو کا خلاصہ پیش کیا جائے گا کہ ہم لوگ نہ تو حق و باطل کو سمجھتے ہیں اور نہ حرب و ضرب سے شدھ بدھ رکھتے ہیں۔

سرور جو حق و باطل کی کار زار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

(اقبالؔ)

❖❖❖

آٹھواں باب

اسلام کا نظام حکومت

اور

حاکم وقت اور لوگوں کی ذمہ داریاں

تمہید

ان چار کتابوں میں حکمت عملی کے تحت جو کامیابیاں نصیب ہوئیں یا غلطیوں کی صورت میں جو خراب نتیجے نکلے۔ ان سب حالات کے جائزے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہو کسی نظام حکومت کے تحت ہوا اور آگے حاکم وقت یا لوگوں کی کارروائیوں کے اثرات ہوئے۔ موٹے طور پر دو خلفائے راشدین کے زمانے میں اور حضرت عثمان کی خلافت کے پہلے آٹھ سالوں میں ہر طرح سے اور ہر پہلو میں کامیابی نصیب ہوئی۔ حاکم وقت جو ''الوالامر'' تھے۔ انہوں نے حکومت صحیح اسلامی کے تحت کی۔ لوگوں نے ہر طرح سے ان کے ساتھ تعاون کیا تو وہ اسلام کا سنہری دور قرار پایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دو سالوں میں حاکم وقت نے تو اسی طرح اپنی ذمہ داری نبھائی لیکن لوگوں نے آزادئ فکر اور آزادئ عمل اختیار کر کے فتنہ وفساد برپا کر دیا تو تمام فتوحات رک گئیں اور اسلام کے مرکز پر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے سخت چوٹ پڑی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجبوری کے تحت خلافت سنبھالی کہ مرکز کو سہارا دینا ضروری ہو گیا تھا لیکن فتنہ وفساد والوں کی سازش گہری تھی۔ حب دنیا بھی آ گئی، خودغرضی اور مطلب پرستی کا دور دورہ ہو گیا تو اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی شروع ہو گئی اور قوم میں کئی افلاطون پیدا ہو گئے۔ نتیجہ خارجیوں کی گروہ بندی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی صورت میں نکلا لیکن جناب امام حسن نے حب دنیا کو لات ماری اور خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ تو سنۃ الجماعت یعنی قوم میں

پھر وحدت شروع ہوگئی اور مرکزیت بھی مل گئی۔ آئندہ بیس سال اسلام کی تاریخ کا شاندار دور تھا کہ ہم وسط ایشیا سے لے کر بحراوقیانوس تک پہنچ گئے، قسطنطنیہ کے دروازے کھٹکھٹائے، بحیرۂ روم کو اپنی جھیل بنالیا اور سسلی و کریٹ پر بھی حملہ آور ہوتے رہے۔ لیکن پھر ایک فاسق وفاجر آ گیا جو ہماری تاریخ میں یزید کے نام سے موسوم ہے۔ پھر وہی حب دنیا، عیاشی، بےفکری اور باطل فلسفوں کی پیروی شروع ہوگئی لیکن نواسۂ رسول نے حق کے راستے کی نشان دہی کرتے ہوئے اپنے سارے کنبے اور رفقاً کی قربانی دے دی جو قرآن پاک کے الفاظ میں ذبح عظیم کے طور پر بیان کی گئی اور حق کے راستے یعنی صراط مستقیم کی نشان دہی ہوگئی۔

نشانِ راہ

تاریخ کے اس بامقصد مطالعہ کے بعد جہاں پر ہم نے صرف عمل لکھا اور عمل تلاش کیا تو اب ضرورت اس امر کی ہے کہ چودہ سو سال میں جو پہلی دفعہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر ایک ملک قائم ہوا ہے تو اس کے لیے کوئی ایسا نظام حکومت تلاش کیا جائے جہاں حاکم وقت اور لوگوں کی ذمہ داری کی نشاندہی بھی کردی جائے۔ مضمون بہت مشکل ہے اور پوری کتاب کا مضمون ہے لیکن ہم زیادہ تر صرف ان باتوں کی نشاندہی کریں گے جو دراصل باطل فلسفے کے اصول اور تلمیحات ہیں لیکن پچھلے دو سو سالوں کی غلامی اور کچھ پہلی غلطیوں کی وجہ سے ہم ان باطل چیزوں کو اسلامی اصول سمجھنے لگ گئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیں تنبیہ کر گئے تھے کہ ''خبردار جو باطل کو نہیں سمجھتا وہ اسلام کو پاش پاش کردے گا۔'' اس لیے ہم حق کی عینک پہن کر ان باطل چیزوں کو تلاش کریں گے جو آج کل ہمارا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی ہیں اور اس کے بعد چند اصولوں کا ذکر کریں گے کہ اسلامی فلسفہ حیات کیسے اپنائیں کہ اس سے اگلا باب ہمارے نظریۂ حیات پر ہے۔

نظام حکومت کی وضاحت

اسلام دین فطرت ہے، قرآن پاک عملی طور پر فوجی زبان میں ہے کہ زیادہ زور امر بالمعروف اور نہی المنکر پر ہے۔ سنت میں بے شمار عملی مثالیں موجود ہیں اور ان چار کتابوں میں ہم نے حضور پاک ﷺ کے عظیم رفقاء کے عمل لکھ دیئے یعنی ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے لیکن ان باتوں کا خلاصہ کہیں سے نہیں مل رہا کہ نظام حکومت کو چند لفظوں میں کسی عالم یا بزرگ کے الفاظ میں بیان کریں۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکم وقت کی ذمہ داریوں پر بہت کچھ لکھا اور پندرہویں صدی میں ابن خلدون نے اسلام کے سیاسی فلسفہ کی کچھ نشاندہی کی۔ لیکن یہ چیزیں بھی اب ''قدیم'' کے زمرہ میں آتی ہیں۔ پرانے فقہوں کے بارے میں پہلے گزارش ہوچکی ہے کہ ہمارے علماء نے بڑے کام کیئے لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ کہیں سے فقہ وحدت یا فقہ عسکریت تلاش کریں کہ پہلے ہم

پاکستان میں پوری قوم کو اللہ کی فوج بنا دیں اور پھر ساری امت کو ایک کر دیں۔ اس سلسلہ میں انیسویں صدی میں ہمارے دانشوروں میں جمال الدین افغانی کے خیالات سے مدد مل سکتی ہے اور اس صدی* میں علامہ اقبال اور سید قطب شہید کی کتابوں سے یا ابوالحسن ندوی کی چند کتابوں سے یہ مدد مل سکتی ہے کہ مغربی خیالات نے ہمیں کیا کیا نقصان پہنچائے ہیں۔

تجسس

چنانچہ ہمارا یہ باب ایک تجسس ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے ماضی قریب کی تاریخ میں جانا ہوگا کہ ہماری موجودہ سوچ پر اس زمانے نے کیا اثرات ڈالے اور اگر یہ خیالات یا اثرات غیر اسلامی ہیں تو پھر ان تلمیحات، نظریات یا اصطلاحات سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں۔

انگریزی دور

انگریز نے اپنے دور حکومت میں مغربی طرز کے تعلیمی ادارے کھولے اور ان کے ذریعے پورے برصغیر کو فرنگی تہذیب کا گرویدہ بنا دیا۔ غیر ملکی فرنگی حکومت نے اقتدار چونکہ مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا اسلام اور اس کے پیروکار، زیادہ تختہ مشق بنے۔ خاص کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اسلام کے فلسفہ جہاد کو دین سے نابود کرنے کی کوشش کی گئی یا اسے کچھ اس قسم کے معانی پہنا دیئے گئے کہ یہ فریضہ معطل ہو کر رہ گیا۔ ترک جہاد کی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں اہل اسلام بڑی سفاکی سے بھیڑ بکریوں کی طرح قتل و غارت کا نشانہ بنے یا انہیں بزور شمشیر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ انگریزی تعلیم کا مقصد بابو یا سرکاری نوکر پیدا کرنا تھا یا زیادہ سے زیادہ کچھ ڈاکٹر اور وکیل بن گئے لیکن یہ پیشے بھی مغربی ثقافت میں اس طرح رنگے ہوئے تھے کہ وہ ہمیں باطل تہذیبوں کا غلام بنا دیتے ہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے گرد بھی کچھ لادینیت کے چکر لپیٹ دیئے گئے ہیں کہ وہ بھی ہمیں اسلام سے دور کرتے ہیں۔ خیر وکالت یا عدلیہ تو مکمل یونانی اور رومن قانون کی غلامی ہے جس کا اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ معاشرتی علوم یعنی تواریخ یا فرنگی مدنیت اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ ملک صرف جغرافیائی یا لسانی بنیادوں پر بنتے ہیں اور اس لحاظ سے ہم ایک ملک ہو بھی نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہم نے ملک کی آزادی کی اینٹ ان علوم کے تحت رکھی۔

* ''جلال مصطفیٰ'' صفحہ ۱۸ سے استفادہ کریں۔

پاکستان کا وجود میں آنا

ہم اس تفصیل میں نہ جائیں گے کہ پاکستان کس طرح وجود میں آیا سوائے اس کے کہ عام آدمیوں کے سامنے یہ فلسفہ پیش کیا گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ ہے اور پاکستان اس وجہ سے وجود میں آیا، نہ کہ فرنگی مدنیت کے چند تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے جن کی تعداد پانچ فیصد ہوگی اور ان میں سے بھی آدھوں کی قریب لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ہاں قائداعظم اور اس کے چند مخلص رفقاء یا علامہ اقبال کی اس سلسلہ میں خدمات البتہ سنہری الفاظ میں لکھی جاسکتی ہیں لیکن پاکستان کے متعدد اور خالقوں نے برسر اقتدار قوم کے رخ کو مکہ و مدینہ کی طرف کبھی نہ کیا۔ ان لوگوں کو انگریزوں نے اپنی درسگاہوں میں تیار کیا تھا اور یہ لوگ کالجوں میں فرنگی مدنیت پڑھ چکے تھے۔ اس لیے یہ لوگ فرنگی نظام حکومت کے بغیر اور کسی نظام کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ اس سب کا ہمارے اوپر یہ اثر ہوا کہ بے شمار نظریات، تلمیحات اور اصطلاحات ہمارے ایمان یا عمل کا حصہ بن گئیں۔ ان میں چند یہ ہیں۔ آزادی، مغربی جمہوریت، سیاسی پارٹیاں، صدارتی نظام، پارلیمانی نظام، پارلیمنٹ، سپیکر، تحریک، تحریک التوائ، حق استحقاق، نکتہ استحقاق، الیکشن، الیکشن کمشنر، بیلٹ، بیلٹ پیپر، ووٹ، پریذائیڈنگ افسر، ریٹرننگ افسر، انتخابی مہم، بحث برائے بحث، مقننہ یعنی قانون ساز اسمبلی، کونسل اور یونین کونسل وغیرہ۔ اب غیر جانبدار قسم کی تلمیحات یا نظریات یا ایسی تلمیحات جو حق کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ ان کو اپنانے میں کوئی ہرج تو نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے یہ تلمیحات ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہمارے اوپر اس طرح چھا گئیں کہ ہمارا اپنا نظام جو ہم ان چار کتابوں میں پیش کر چکے ہیں وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا اور ان میں سے بعض اصطلاحات غیر اسلامی تھیں یعنی اسلام کے طریق کار کی ضد بھی تھیں۔ اس لیے ان اصطلاحات کا ہم مختصر ذکر ضرور کریں گے کہ انہوں نے ہمیں کیا نقصان پہنچائے۔ حالانکہ علامہ اقبال فرما گئے تھے:

سوال مے نہ کروں ساقی فرنگ سے
کہ یہ طریقہ رندان پاک باز نہیں

آزادئ فکر و آزادئ عمل

آزادی کا دل فریب نعرہ، دراصل مغربی جمہوریت کی پیداوار ہے۔ بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اس کو غلام نہ بنایا جائے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کو بندوں کی غلامی سے چھڑوایا لیکن مسلمان اللہ تعالیٰ کا محکوم ہے اور اسلام کسی مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ حیوانیت کی طرف ایک پیش قدمی ہوگی کہ علامہ اقبال کہتے ہیں۔

گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

ہم تیسری کتاب کے نویں باب میں اس آزادئ فکر کے نتائج بیان کر چکے ہیں کہ بقول علامہ اقبال کہ ایسی فکر خام ہو تو اس سے انسان حیوان بن جاتا ہے اور قارئین پڑھ چکے ہیں کہ اس آزادئ فکر اور آزادئ عمل نے پہلے ہمارے مرکز کو پاش پاش کیا پھر خارجی پیدا ہوئے جنہوں نے آگے معتزلہ، قدریہ، جبریہ اور باطنیہ وغیرہ گروہ پیدا کئے اور اس سب کے اثر مسلمانوں پر اس طرح ہوئے کہ گو ہمارے علماء یا آئمہ نے خود کسی فقہی گروہ کی بنیاد نہ ڈالی اور اکثر نے فقہ لکھا بھی نہ، لیکن ہم خواہ مخواہ فقہی گروہوں میں بٹ گئے اور جب کسی نے ان گروہوں کو ختم کرنے کی کوشش کی تو آگے چل کر ہم ''مقلد'' اور ''غیر مقلد'' گروہوں میں بٹ گئے۔ چنانچہ اس آزادئ فکر نے ہمیں ''فقہ وحدت'' یا ''فقہ عسکریت'' کے بارے میں کچھ نہ سوچنے دیا۔ اس لیے جو آزادئ فکر یا آزادئ عمل ہماری وحدت کو پارہ پارہ کرے اس کو اپنانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی مفسدین یا سازشی لوگوں کو حکومت ایسی اجازت دے سکتی ہے کہ وہ باطل فکر پھیلائیں اور لوگوں کو باطل عمل کی طرف مائل کریں یا لوگوں کو ایسی باتوں پر اکسائیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیویں۔

کلمۂ حق

آزادئ فکر کو محدود کرنے کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اسلام میں کلمہ حق کی بھی اجازت نہیں بلکہ اسلام کے لحاظ سے جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا جہاد ہے اور پہلی کتاب میں واضح کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ اول نے فرمایا کہ حاکم وقت کے سامنے سچ بولنا بہت بڑی وفاداری ہے اور سچ کو چھپانا غداری ہے۔ ہمارے خلفائے راشدین نے گورنروں کے خلاف الزام سنے اور تیسری کتاب میں واضح کیا جا چکا ہے کہ ایک گورنر بری قرار دیا گیا دوسرے کو گورنری سے ہٹا دیا گیا اور سزا بھی ملی حالانکہ ثبوت صرف اتنا تھا کہ اس نے شراب کی تے کی تو کلمہ حق دین فطرت کی ضرورت ہے لیکن کلمہ حق کہنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سچ بولنا تو پھر بھی آسان ہوتا ہے لیکن سچ سننا مشکل ہوتا ہے اس لیے کلمہ حق کسی ضرورت یا مدعا کے تحت بولا جائے اور حاکم وقت تو کلمہ حق سن لیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے دوسربراہوں کے ساتھ باری باری راقم کا ستمبر ۱۹۷۰ء اور فروری ۱۹۷۲ء میں واسطہ پڑا اور ان کو سچ بتایا گیا لیکن وہاں پر خوشامدی زیادہ تھے اور ہامان کی قسم کے مشیر تھے جو لوگوں کو فرعون بنا دیتے ہیں۔ اس لیے اس سلسلہ میں حاکم وقت اور لوگوں دونوں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اگر اسلامی حکومت میں اس کے لیے صحیح طریقہ نہیں بتایا جاتا تو پھر وہ دین فطرت کی حکومت نہیں رہتی۔

مغربی جمہوریت

دراصل اس آزادیٔ فکر کی بڑی ماں یہ مغربی جمہوریت ہے جس کو ہمارے دانشور ایک جدید سائنسی نظام کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اس کو اس زمانے میں اپنانا ضروری ہے ورنہ لوگ ہمیں قدامت پسند کہیں گے۔ اول تو اسلام اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کیا کہیں گے یہاں اللہ اور رسول ﷺ کا حکم چلتا ہے۔ دوم جمہوریت یونان میں قبل مسیح سے جاری ہے۔ حضور پاک ﷺ کی نبوت سے پہلے مکہ میں بھی قبائلی جمہوریت تھی اور یونانی فلسفہ کے تحت حکومت ایک وفاق تھی۔ عمر بن ہشام اس طرز حکومت اور فلسفہ کا ماہر تھا۔ تب ہی اس کو دانائی کا باپ (ابوالحکم) کہتے ہیں لیکن یہ بدقسمت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور آمریت اور حضور پاک ﷺ کے لائے ہوئے اللہ تعالیٰ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دشمن بن گیا تو آج ہم اس کو جہالت کے باپ (ابوجہل) کے نام سے یاد کرتے ہیں، مغربی جمہوریت اسلام کی ضد ہے کہ ہمارے لحاظ سے اللہ تعالیٰ حاکم ہے اور اس کا امر چلتا ہے اور مغربی جمہوریت میں لوگوں کی مرضی چلتی ہے اس لیے وہ غیر اسلامی فلسفہ ہے۔

دراصل ہماری قرارداد مقاصد ۱۹۴۹ء میں بھی ہم سے بھول ہوگئی کہ اس کی رو سے ہم خلیفہ اللہ یا اللہ کے نائب بن گئے۔ خلیفہ اللہ صرف نبی ہوتا ہے اور ہمارے خلفائے راشدین اپنے آپ کو خلیفہ الرسول کہتے تھے، دین مکمل ہو چکا ہے۔ اب اس کو جاری کرنا ہے۔ مشورہ اللہ تعالیٰ کے امر میں ہے، قانون مل چکا ہے۔ مقننہ یا قانون ساز اسمبلی یا اور ایسی اصطلاحیں غیر اسلامی ہیں جمہوریت گروہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کو جنم دیتی ہے اور انتخاب کے ذریعہ سے طبقاتی نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ بڑے وسیع مضمون ہیں اور ان تمام طریقوں کی علامہ اقبال بھی مخالفت کر گئے اور کہا۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن ممبری، کونسل صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

مشاورت

اسلام میں حزب اختلاف یا حزب اقتدار کا الگ الگ کوئی تصور نہیں اور نہ ہی سیاسی گروہ بندی یا کسی فرقہ بندی

کا تصور ہے۔ پوری قوم ایک بنیان المرصوص ہوتی ہے اور حکومت اسلامی فلسفہ حیات یعنی قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی سنت کے تحت چلائی جاتی ہے۔ ان اصولوں خاص کر اسلامی فلسفہ حیات کا خلاصہ اگلے باب میں پیش کیا جا رہا ہے لیکن جمہوریت کی طرح اسلام طبقاتی، یا گروہی نمائندگی کا کوئی تصور نہیں دیتا۔ وہاں مشاورت کے لیے کئی قسم کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اول ان لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلام کے فلسفہ حیات اور اصولوں کو سمجھیں کہ وہ صحیح مشورے دے سکیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ دوم ان ہنرمند لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو زراعت، مالیات، تجارت، بیرونی تعلقات، دفاع، تعلیم وغیرہ کے سلسلہ میں مشورہ دیں لیکن یہ اصول بھی اسلامی فلسفہ حیات کے تابع ہوں۔ سوم ایسے ماہرین یا علاقے کے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی خاص علاقے سے وابستہ خاص اور الگ قسم کے ماحول کے بارے واقف ہوں اور علاقائی اثرات کا مطالعہ کر کے وہاں کی بہتری کے لیے مشورہ دے سکیں۔ قوم کو ایسے لوگوں کو بھی تلاش کرنا ہوگا کہ اسلام میں خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو نمائندگی کے لیے یا حکومت کے لیے پیش نہیں کیا جاتا اور تمام تر مغربی طریقوں یعنی پارلیمانی نظام، صدارتی نظام وغیرہ کی اصطلاحوں کو ختم کر کے نظام مصطفیٰ کے لفظ کو استعمال کرنا ہوگا جو ہمارا ۱۹۷۷ء کا نعرہ تھا۔

نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بے شک نظام مصطفیٰ کی تمام باتوں پر یہاں تبصرہ کرنا مشکل ہے کہ ایسا کام کرنے کے لیے ایک ''اولی الامر'' کی ضرورت ہے جو قرآن پاک کے مطابق اطیعوا اللہ واطیعو الرسول ہو اور مجلس مشاورت کی مدد کے ساتھ ایسے ہی شخص نے اسلام کو زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کرنا ہوگا۔ یہ شخص کہاں سے آئے گا۔ اس کا جواب مشکل نہیں جو سربراہ حکومت موجود ہو اسی کو امیر پاکستان اور ''اولی الامر'' بننے کی دعوت دی جائے اور اگر وہ یہ نہ مانے یا **اطیعوا اللہ واطیعو الرسول** نہ ہو تو پھر کسی اور کو تلاش کرنا ہوگا اور آئندہ جانشینی کیسے ہو، اس میں ایک طریقہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا جس کا ذکر دوسری کتاب میں ہے کہ اپنا جانشین منتخب کر دیا۔ دوسرا طریقہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے کیا کہ معاملات مجلس مشاورت پر چھوڑ دیئے اور بے شک جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو کچھ کرنے کی مہلت نہ ملی۔

ان مثالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ''اولی الامر'' اور اس کی جانشینی کے معاملات کی کچھ اور زیادہ تفصیل میں جا سکتے ہیں کہ جانشین پہلے حاکم کا رشتہ دار نہ ہو اور اس کو مقرر کر کے مجلس مشاورت یا قوم سے منظوری لی جائے وغیرہ۔ یہ معاملات اتنے مشکل نہیں۔ اصلی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اسلام کیا ہے اور اس اسلام کو کیسے جاری و ساری کیا جائے۔ فی الحال ہمیں باقی غلط اور باطل یا غیر اسلامی اصطلاحوں یا طور طریقوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ جن میں چند اور بھی ہیں۔

بحث برائے بحث

مغربی نظاموں کی اسمبلیوں میں چونکہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف ضروری ہے تو اکثر بحث صرف بحث کے لیے کی جاتی ہے کہ حزب اختلاف کے لیے ضروری ہے کہ وہ حزب اقتدار کی مخالفت کرے۔ اس وجہ سے کئی فضول الفاظ جیسے سپیکر، تحریک، تحریک التوا، حق استحقاق، نکتہ استحقاق وغیرہ ہمارے اوپر چھا گئے۔ اول تو اسلام میں اکثریت اور اہلیت کا کوئی تصور نہیں کہ وہاں اللہ تعالیٰ کا حکم چلتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اکثریت کو گمراہ کہا ہے اور اگر خلیفہ اول کے زمانے میں لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو بحث نہ کی گئی بلکہ فوجی کارروائی کی گئی جس کا ذکر پہلی کتاب میں ہو چکا ہے اور مدینہ شریف میں اکثریت کا حساب لگاتے تو زیادہ لوگ جناب سعد بن عبادہ کو ووٹ دیتے اور ابوبکر صدیق خلیفہ نہ بنتے۔ اسلام اہل الرائے اور اسلام کے لحاظ سے موزنیت کو ترجیح دیتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے، اس کو اسلام میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ مجلس مشاورت میں ضروری معاملات پر فضول بحث کرنے کی بجائے ان کو حل کیا جاتا ہے اور خطابت پر وقت ضائع نہیں کیا جاتا جس کے بارے میں علامہ اقبال پہلے سے تنبیہ کر گئے۔

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

گروہ بندی

ان مغربی اصولوں کے تحت جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، گروہ بندی ضروری ہے، فرد آزاد ہے۔ عقیدہ یا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ معاشرہ نظریہ ضرورت کے تحت سیاسی گروہ بندی کی اجازت دیتا ہے جیسے مزدور، کسان، تجار، نوکری پیشہ لوگ یا مادی ضروریات کے تحت سیاسی گروہ کہ مختلف گروہوں کے درمیان نفرت پیدا کر کے چند لوگ اوپر آ جاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ فلاں سے لیں گے اور فلاں کو دیں گے اور اس طرح لوگوں کے نام پر خود حکومت کرتے ہیں اور لوگ بے چارے غلام کے غلام ہی رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی علامہ اقبال ہمیں تنبیہ کر گئے۔

گریز از طرزِ جمہوری کہ غلامِ پختہ کارِ شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

سیاسی پارٹیاں

چنانچہ مغربی نظام حکومت کے تحت سیاسی پارٹیوں کا وجود ضروری ہے اور ہمارے ملک میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ پاکستان، سیاسی عمل کا نتیجہ ہے کہ ایک سیاسی پارٹی پاکستان کی ''خالق'' ہے اس لیے ہمارے ملک میں سیاسی

پارٹیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر اس منطق کو بھی صحیح مان لیں تو پھر پاکستان میں صرف ایک سیاسی پارٹی ہونی چاہیے کہ قائداعظم نے کبھی کسی اور سیاسی پارٹی کو تسلیم نہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہماری ایک سیاسی پارٹی ہے۔

بہرحال ہم جس نکتہ کی طرف آنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان ایک اور صرف ایک پارٹی ہیں۔ ہمارا خدا ایک، رسول ﷺ ایک، قرآن ایک اور ہم ایک قوم ہیں۔ اس کو حزب اللہ کہیں یا ایک سیاسی پارٹی، اسلام میں تفرقہ یا گروہ بندی کی اجازت نہیں اور اسلام کا مزاج کسی سیاسی پارٹی کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ چیز عملی نہیں۔ موجودہ وقت میں کئی سیاسی پارٹیاں، اب عقائدی گروہوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور کئی فرقہ وارانہ گروہ اپنی سیاسی حیثیت کو تسلیم کرانے کے لیے میدان میں نکل آئے ہیں۔

چنانچہ مغربی طریقہ کی قسم کی سیاسی پارٹیوں کی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں اور چاروں کتابوں میں ہم عملی طور پر اس کے حق میں ثبوت پیش کر چکے ہیں بلکہ ایسے اصول یا عمل اپنانے کی بھی اجازت نہیں جو ہمیں سیاسی یا کسی اور گروہ بندی میں تقسیم کر دیں۔ اس سلسلہ میں حاکم وقت اور قوم کے لیے قرآن پاک کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو سنۃ الرسول ﷺ کی عملی مثالوں سے واضح الفاظ میں ذمہ داریاں تعین کرنا ہوں گی۔

بنیادی حقوق

مغربی طریقوں میں فرد کو آزاد مان لینے کے بعد جن بنیادی حقوق کا لوگوں کے سلسلہ میں بہت چرچا کیا جاتا ہے۔ وہ زبانی جمع تفریق ہے۔ خیر کئی روایات کو اپنا کر اہل مغرب نے اس سلسلہ میں کافی کام کیا لیکن اب نتیجہ مادر پدر آزادی کی صورت میں نکل رہا ہے۔ لوگ ہپی اور بے لگا ہو رہے ہیں۔ معاشرے کے بندھن ٹوٹ رہے ہیں، یعنی یہ حالت ہے۔

صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مے و خمار و ہجوم زنان بازاری

(اقبال)

ذمہ داریاں

اسلام میں حقوق اس طرح پورے کئے جاتے ہیں کہ حاکم وقت سے لے کر ایک ادنیٰ آدمی کو ہر سطح پر امارت کے ذریعے سے اوپر "اولی الامر" تک گانٹھ دیا جاتا ہے۔ یعنی حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر تم دو ہو تو پھر بھی ایک کو اپنا امیر مقرر کر دو اور ہر آدمی کی ذاتی یا عہدہ کے لحاظ سے ذمہ داریاں مقرر ہوتی ہیں۔ وہ جب ان ذمہ داریوں کو پورا

کرتے ہیں تو سب کو بنیادی حقوق اپنے آپ حاصل ہو جاتے ہیں کہ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کے حق پر ڈاکہ ڈالے اور اسلام برابر کے مواقع اور معاشی انصاف کا علمبردار ہے۔

مساوات

برابر کے مواقع اور معاشی انصاف کو ہم لوگوں نے مغرب والوں سے ایک قدم آگے بڑھنے کے لیے اسلامی مساوات یا مساوات محمدی کو اسلامی سوشلزم کے معنی پہنا دیئے اور اس طرح یہاں بھی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی۔ اول تو کسی سوشلسٹ ملک میں بھی برابری ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ایک جیسا پیدا نہیں کیا۔ ہر ایک آدمی نہ سربراہ مملکت بن سکتا ہے نہ عالم دین یا ڈاکٹر یا انجینئر وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کسی جگہ برابری کا ذکر نہیں کیا بلکہ اکثر لکھا ہے کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہوتے، جاہل اور عالم برابر نہیں ہوتے وغیرہ۔ اس لیے مساوات کے لفظ کو غلط طور پر اپنا کر ہم نے لوگوں کے درمیان طبقاتی نفرت پیدا کر دی ہے۔ بے شک اسلام بڑے اور چھوٹے کو الگ الگ مقام نہیں دیتا اور بڑائی صرف اسلامی کردار میں ہے لیکن مکمل طور پر برابری ناممکن ہے۔ ہاں معاشی انصاف اور برابر مواقع عین اسلامی اصول ہیں۔

انقلاب

اسی قسم کی غلط نقالی کے طور پر ہم لوگوں نے اسلامی انقلاب وغیرہ کی غلط اصطلاحیں اپنا کر اسلامی فلسفہ حیات کا بڑا نقصان کیا ہے حالانکہ مولانا محمد علی جوہر نے قوم کو تنبیہ کی کہ اسلام صراط مستقیم ہے نہ کہ انقلاب اور ایسی اصطلاحیں اپنا کر ہماری سوچ کے تانے بانے تبدیل ہو جائیں گے۔ انقلاب کے معنی پیچھے مڑنے کے ہیں یا واپس آنے کے ہیں اور قرآن پاک میں یہ لفظ اکثر جگہ اوندھے منہ گرنے یا غلط روی یا گمراہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ صرف ایک جگہ اچھے معنی میں استعمال ہوا۔ ضروری ہے کہ اپنا فلسفہ حیات کے ذریعے وحدت فکر پیدا کرنے کے لیے اصطلاحات کا صحیح استعمال ہو۔ ہم اس سلسلہ میں حضور پاک ﷺ کے الفاظ کا ذکر کر چکے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ وہ زمانے کو تسلسل دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں یعنی کاروانِ حق صراط مستقیم پر رواں دواں ہو گیا ہے۔

صراطِ مستقیم

چنانچہ پچھلی چار کتابوں میں ہر جگہ ہم نے عملی طور پر اس صراط مستقیم کی نشان دہی کر دی ہے کہ پیچھے مڑنے یا انقلاب لانے والی کوئی بات نہیں۔ قرآن پاک میں سو سے زیادہ جگہوں پر اسلام کو صراط مستقیم کہا گیا۔ سورۃ فاتحہ اور سورۃ فتح میں اس لفظ پر خاص کر زور دیا گیا۔ تو آیئے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں اور انقلاب کے چکروں سے نکل جائیں۔

وطن کی پوجا

پاکستان کسی جغرافیہ وحدت یا ضرورت کے تحت وجود میں نہیں آیا۔ ہم مصطفوی ہیں اور اس لیے ہم نے ایک الگ وطن بنایا۔ یہ وطن ہمارے لیے مقدس ہے کہ ہم اس کو اسلام کا قلعہ بنانا چاہتے ہیں اور یہاں پر اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ علاقوں یا صوبوں کی ثقافت، دریاؤں کے بہاؤ اور علاقائی لوگ ناچ اور گانے وغیرہ اسلامی فلسفہ حیات کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہڑپہ، ٹیکسلا یا مہاجن داروں کی تہذیبیں ہمارا ورثہ نہیں۔ مادر وطن اور شہید وطن وغیرہ کی اصطلاحوں کا اسلام کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ سوہنی دھرتی اور وطن کی پوجا کی اجازت نہیں اور نہ ہی وطن کو اللہ کا شریک بنایا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ساری امت وطن کے چکروں میں ہے۔ جغرافیائی نیشنلزم دنیا پر چھا چکا ہے۔ اور ہندو فلسفہ کے تحت مادر وطن (بھارت ماتا) کے معاملہ کو ساری دنیا نے اپنا لیا ہے اور ہم نے بھی اس کی نقل کی حالانکہ ہم نے ملک اسلام کے لیے بنایا تھا اور ہندوؤں کی نظم ''بندے ماترم'' سے نفرت کی وجہ سے اور اپنے رخ کو مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کی طرف کرنے کے لیے ہم نے یہ ملک بنایا تھا۔ اب اگر ہم نے بھی وطن کی پوجا شروع کر دی ہے تو یہ سخت غلطی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(اقبالؔ)

تتلی اور گبریلہ

''جلال مصطفیٰ'' کے حرف آخر (صفحہ ۳۴۱۔۳۴۳) میں تتلی اور گبریلہ کی کہانی سنائی گئی تھی کہ تتلی گبریلہ کو باغ میں لے گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پر دیئے ہیں کہ وہ اڑ کر باغوں کے پھولوں سے اپنے ذہن کو معطر کرے لیکن گبریلہ کو وہاں کوئی خوشبو نہ آئی کہ وہ ساتھ کچھ گوبر بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان کے لیے سارے باطل فلسفے گوبر کی طرح ہیں کہ ہم اپنی کتابوں میں ذکر کر چکے ہیں کہ ہماری تعلیم ''منطق الطیر'' ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی تعلیم دی گئی۔

یہ ہماری بدقسمتی ہوگی کہ ہم گبریلے کی طرح زمین کا کیڑا بن کر گوبر یا مادیات کی تعلیم پر گزارہ کریں اور اڑان والی تعلیم کو نہ اپنائیں تو ظاہر ہے ہمیں اسلام کے معطر باغ سے خوشبو نہ آ سکے گی اس لیے باطل فلسفہ کی مختصر نشاندہی کر دی گئی ہے کہ ہم اپنا خانہ کعبہ درست کریں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

(اقبالؔ)

وحدتِ فکر و وحدتِ عمل

ہم نے واضح کر دیا ہے کہ غیروں کا تمام تر فلسفہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل سے شروع ہوتا ہے اور ہمارا فلسفہ وحدتِ فکر و وحدتِ عمل ہے لیکن افسوس کہ ہمارے اکثر علمائے دین اس پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

(اقبالؔ)

پہلی کتاب کے پیش لفظ سے لے کر چاروں کتابوں میں جتنا زور اس پہلو پر دیا گیا ہے اتنا اور کسی چیز پر نہیں دیا گیا اور ان کتابوں کے لکھنے میں یہی ایک بڑا مقصد تھا کہ ہم اپنی فکر وحدت کو ایک کریں اور پھر اس پر عمل کریں۔ قرون اولیٰ میں ایک عیسائی دانشور سپین کے مسلمانوں کی فکری وحدت سے بہت متاثر ہوا اور اسلامی دنیا کے سفر میں قیرواں، فسطاط سے ہوتا ہوا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچا اور جو سوال کرتا تھا اس کے ایک جیسے جواب پاتا تھا تو خانہ کعبہ میں آ کر مسلمان ہو گیا۔

لیکن افسوس ہماری حالت یہ ہے کہ کسی ایک دن کی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں۔ وہاں پر بھانت بھانت کی بولیاں ہوں گی اور کئی لوگ ہمارے نظریۂ حیات کو بھی پاش پاش کر رہے ہوں گے۔ ہر مسجد سے الگ الگ آواز آ رہی ہے اور تفرقہ ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ ذاریت میں ایسی بھانت بھانت بولیاں بولنے والوں اور خراصوں کے قتل کرنے کا حکم ہے اور ان حالات کو دیکھ کر ان کتابوں میں عملی اسلام لکھا گیا کہ ان شاء اللہ خیالات یا بیانات میں تضاد نہ ہوگا اور جس نتیجہ پر ہم پہنچے ہیں اس سلسلہ کا یہ پہلا باب ہے جس میں حاکم وقت اور لوگوں کو بھاری ذمہ داریاں یاد دلائی جا رہی ہیں کہ وہ تفرقہ والی باتوں کو چھوڑ کر عملی اسلام پر فقہ وحدت یا فقہ عسکریت کے تحت متحد ہو کر اللہ تعالیٰ کے سپاہی (حزب اللہ) بن جائیں ایسا کرنے کے لیے ہمیں اپنے تمام تر زندگی زندگی کے شعبوں کو اسلامی فلسفہ حیات کے تابع کرنا ہوگا جس کا خلاصہ نویں باب میں دیا جا رہا ہے اور باقی چند اجتماعی ذمہ داریوں یا ضرورت کا مختصر ذکر یہاں آتا ہے۔

سیاسی فلسفہ

ہر قوم یا ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام زندگی کے شعبوں کو اپنے سیاسی فلسفہ کے تابع کریں۔ موجودہ سیاسی سائنس (Political Science) کے مضمون میں جو سیاسی فلسفے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں کمیونزم، سوشلزم، امپیریلزم، نازی ازم وغیرہ کئی فلسفے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مغربی دانشوروں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اسلام از خود ایک سیاسی فلسفہ ہے کہ یہ خالی مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مذاہب میں سے صرف ہندوازم، کچھ معاشرتی ضروریات پوری کرتا ہے اور شاید اس زمانے کے لیے وہ طریقہ موزوں تھا کہ مختلف عقائد کے لوگوں کو اجتماعی طور پر گروہوں میں بانٹ کر منوسمرتی نے ایک طرزِ زندگی کی نشان دہی کی اور ہندوؤں کی کتاب گیتا میں اس کی تفصیل موجود ہے لیکن یہ باتیں آج کل کے زمانے کے لیے موزوں نہیں اور آئے دن ہندو اپنی طرزِ زندگی میں تبدیل لا رہے ہیں۔

اسلام البتہ نہ قدیم ہے اور نہ جدید۔ یہ ایک طرف عقائد کی وحدت یعنی ایک اللہ اور ایک رسول ﷺ ایمان کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ دلوں کو جوڑ دینے کا حکم دیتا ہے پھر اس دنیا میں اپنے عقیدت اور غیرت کی حفاظت کے لیے اجتماعی طریق کار وضع کرتا ہے۔

(خُذُوا حِذْرَکُمْ) یعنی اپنی حفاظت آپ کرو۔

اور آگے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت حدود یا حلال وحرام کا تعین کرتا ہے۔ ساتھ ہی واضح کر دیا جاتا ہے کہ یہ دنیا ایک قید خانہ ہے اور ہم یہاں امتحان کے لیے آئے ہیں۔ یہ امتحان جلدی جلدی پاس کر کے جب موت کا دروازہ کھل جائے تو وہاں اس طرح داخل ہوں کہ ہم مومن یعنی ایمان والے ہوں تا کہ ہماری طاقتیں ستر گنا بڑھ جائیں اور آگے جنت نظر آ رہی ہو۔

فرنگی سیاست

لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ فرنگی سیاست نے دنیا بھر کو کچھ اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اہل اسلام بھی جمہوریت، سوشلزم، جغرافیائی نیشنلزم وغیرہ کے بنائے ہوئے دل فریب پھندوں میں پھنس گئے ہیں اور ان نظام ہائے زندگی کے پرستار یا تو سرے سے ہی اس بات کا انکار کر دیتے ہیں کہ دین اسلام نے کوئی اپنا نظام حیات یا سیاسی نظام دیا ہے یا دوسری صورت میں کھینچ تان کر کوئی اس کو جمہوریت بتاتا ہے تو کوئی اس کے ڈانڈے سوشلزم سے جا ملاتا ہے۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ میدانِ سیاست میں اترنے والے انسان دجل وفریب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں اور عوام الناس سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ ایسے ہی سیاست

دانوں کواس دجل وفریب میں الجھا کر ابلیس کہیں لمبی تان کر سویا ہوا تھا کہ کسی نے پوچھا۔''جناب! کیا دنیا میں اب کوئی باقی نہیں رہ گیا جو یوں مزے سے لیٹے ہوئے ہو۔''تو شیطان نے جو جواب دیا۔علامہ اقبال اس کو یوں کہتے ہیں۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

دراصل شیطان نے اپنے کافی چیلے بھی چھوڑے ہوئے ہیں اوران کووہ یہ ہدایت دیتا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

میر عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

(اقبالؔ)

بلاشبہ ہماری منزل نظام مصطفیٰ ہے،ہم نے چودہ سوسال میں پہلی دفعہ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ملک بنایا ہے اور اسی وجہ سے ان تمام کتابوں کا نام بسلسلہ ''جلال مصطفیٰ'' رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص حضور پاک ﷺ کی ذات کو زیر بحث لاکر ہمارے اندر سے حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال نکالنا چاہتا ہے وہ ہم میں سے نہیں کہ ہمارے ہی وطن سے حضور پاک ﷺ کو ٹھنڈی ہوا جاتی ہے تو اب ہم وضاحت کریں گے کہ نظام مصطفیٰ کیا ہے،جس کو یہاں جاری کرنا ہے۔

ایک جنگ سے واپس آتے وقت حضور پاک ﷺ نے امن کے زمانے کو جہادِ اکبر کا نام دیا اور جنگ کو جہادِ اصغر تو ظاہر ہوا کہ مومن امن کے زمانے میں ہر وقت جہاد میں مصروف رہتا ہے اور یہی نظام مصطفیٰ ہے اور یہی نظام جہاد ہے۔جنگ لڑنے کے فلسفہ کو جہادِ اصغر یا اسلامی فلسفہ دفاع کہہ سکتے ہیں جس کا خلاصہ دسویں باب میں ہے۔

اب غیروں کو اگر لفظ جہاد سے چڑ ہے تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ہم جہاد کے ذریعے دوسری قوموں پر کوئی ڈاکہ تو نہیں ڈالتے بلکہ ہمارے لیے یہ ایک طرز زندگی ہے کہ امن کے زمانے میں جہاد کا نظام اپنا کر ہم نے اپنے آپ کو غیروں کے ڈاکہ سے محفوظ رکھتے ہیں۔

جہاد کے بارے ناسمجھی

بدقسمتی سے ہمارے دانشور اور علماً بھی نظریۂ جہاد سے ناواقف ہیں۔سید سلیمان ندوی صاحب نے اسلام کی

بڑی خدمت کی لیکن جلال مصطفیٰ کے ضمیمہ (صفحہ ۲۹۹) میں ہم کہہ چکے ہیں کہ آپ کی چھ کتابوں میں نظریۂ جہاد پر کل چار صفحے ہیں شاید انگریزوں کا ڈر تھا کہ مولانا شبلی بھی تو یہ کہہ جاتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کے زمانے کی کہانی جنگ کی کہانی ہے کہ لڑائی عبادت بن گئی لیکن ساتھ دبی زبان میں جنگ سے گریز کی لوری بھی دے جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کی جہاد کی کتاب میں ''مصلحانہ جنگ'' اور ''مدافعانہ جنگ'' کے الفاظ نے جنگ کو بھیانک بنا دیا اور پھر حیدرآباد دکن کے ایک مولوی چراغ علی نے جہاد کو کوشش کے معنی پہنا کر جہاد سے رہی سہی جان بھی نکال دی۔ انگریزوں کی ایماء پر نظام حیدرآباد نے اس کو ''نواب اعظم یار جنگ'' کا خطاب دیا۔ حالانکہ اس کے لیے بہترین خطاب ''فرار جنگ''* تھا۔ کلاسوٹز کہتا ہے کہ جو آدمی جنگ کو بھیانک بنا کر قوم کو ڈراتا ہے، وہ قوم کا دشمن ہے۔

ہماری ناسمجھی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ جب مسلمانوں پر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہوتا ہے تو ہمارے علماء فتویٰ دے دیتے ہیں کہ فلاں جگہ جہاد واجب ہو گیا ہے۔ جہاد نہ کسی فتوے کے تابع ہے نہ محتاج ہے بلکہ یہ ایک طرز زندگی اور فرض ہے۔ البتہ فرض کفایہ کو کچھ لوگ غلط معنی پہنا کر جہاد سے گریز کر جاتے ہیں۔ فرض کفایہ، جہاد بالسیف پر لاگو ہے کہ کسی حکمت عملی کے تحت صرف کچھ لوگوں کو جنگ یا لڑائی کے لیے بھیجا جاتا ہے لیکن جہاد کی تیاری ہر مسلمان پر فرض ہے تاکہ ضرورت کے وقت وہ جہاد میں شرکت کر سکے کہ مومن کے مقصد حیات میں جہاد کے بیچ شرکت کو اولین حیثیت حاصل ہے۔

مومن کا مقصد حیات

از روئے قرآن مومن اللہ تعالیٰ کی فوج کا ایک سپاہی ہے اور یہ سپاہی کوئی برائے نام سپاہی نہیں بلکہ کسی فوج کے ایک بہترین سپاہی سے بھی افضل تر سپاہی ہے۔ سمعنا و اطعنا۔ یعنی ہم نے سنا اور ہم نے مانا۔ اس کا طرہ امتیاز ہے اور وہ اپنی فوج (یعنی امت) کے احکامات بلا چوں وچراں مانتا ہے وہ صحیح معنوں میں قلب سلیم رکھتا ہے اور مقام تسلیم پر ہمیشہ کھڑا رہتا ہے، وہ اپنے نفس کی تربیت کرتا ہے تاکہ میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہے مومن چونکہ دنیا میں قِتَالِ فِی سَبِیلِ اللّٰہ کے لیے آیا ہے اور جنگ میں ثابت قدمی ہی اس کا امتحان ہے۔ لہٰذا اس امتحان کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

''تحقیق اللہ نے خرید لی ہیں، مسلمانوں سے جانیں ان کی اور مال ان کے، بدلے اس کے کہ واسطے ان کے ہیں جنت، جنگ کرتے ہیں، بیچ راہ اللہ کے۔ پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔''

* کلاسوٹز فلسفہ جنگ حصہ سوم پہلا باب صفحہ ۲۷ اور ۳۰ سے استفادہ کریں۔

اب جو سیاسی نظام ہمیں جہاد میں شرکت کی بجائے آپس میں تفرقہ کی باتیں سکھلاتا ہے وہ غیر اسلامی ہے کیونکہ تبوک کی مہم کے بعد ۹ ہجری میں سورۃ توبہ کی آیت ۱۲۲ ہوئی۔ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

''پس کیوں نہ نکلے (جہاد کے لیے) ہر فرقے سے ان میں ایک جماعت تو کہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں تو کہ ڈرا دیں اپنی قوم کو جب پھر جاویں طرف ان کی، شاید کہ وہ بچیں۔''

اس آیت میں فن جہاد یا نظام جہاد کے لیے ''تفقہ فی الدین'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یعنی اصلی فقہ یا دین کی سوجھ بوجھ نظام جہاد کی سمجھ ہے اور اسی وجہ سے ہمیں فقوں کے تفرقوں کو ختم کرنے کے لیے ''فقہ عسکریت'' کی اصطلاح کا ذکر کر چکے ہیں اور جناب سلیمان ندوی صاحب نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں صبر، استقامت، ایثار، ہمت پر جو کئی ابواب لکھے ہیں وہ بھی دراصل نظریہ جہاد یا جہاد کی تیاری کی بنیادی باتیں ہیں اور جناب ندوی صاحب غلامی کی وجہ سے جہاد کا کھل کر پرچار نہ کر سکے لیکن ہم آگے جا کر دسویں باب میں ان کا خلاصہ دے کر اپنی اس رائے کو اور واضح کریں گے۔

ایسے فلسفہ کو اپنانے کے لیے، حکومت، اولی الامر، سول انتظامیہ، مجلس شوریٰ یا کسی مجلس اعلیٰ کی الگ الگ ذمہ داریاں تعین کرنا ہوں گی۔ لیکن اس کتاب میں ان کی تفصیل میں جانا ناممکن ہے اور ہم زندگی کے چند اور شعبوں کا سرسری ذکر کریں گے۔ جن میں تعلیم سرفہرست ہے۔

تعلیم

ہماری موجودہ تعلیم کے طور طریقوں یا جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس پر ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ موٹے لفظوں میں موجودہ تعلیم کا اسلام کے فلسفہ حیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور تعلیم کا مقصد بھی وہ نہیں جو اسلام کے عقائد کے مطابق ہو۔ مشنری سکول یا سرکاری ادارے یا دینی اسکول ہر جگہ پر حالات کو موجودہ ضرورتوں اور اسلام کے فلسفہ حیات کے تابع کرنے کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال اس سلسلہ میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں اور اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج تک ہم نے اس بنیادی چیز کو نہیں سمجھا کہ اسلام میں تعلیم کا اول مقصد اسلامی کردار پیدا کرنا ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا میں مسلمانوں کی طرح زندگی گزارے۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ تعلیم مرکزی حکومت کا مضمون ہے کہ تعلیم کے ذریعے پوری قوم میں وحدت وفکر پیدا کی جائے۔ یعنی تمام سلیبس کتابیں یا امتحانات مرکزی حکومت کے احکام کے تحت ہونا چاہئیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ معاملات کو آسانی سے چلانے کے لیے، نظام یعنی مدرسوں، عمارتوں یا استادوں وغیرہ کے سلسلہ میں کنٹرول صوبائی حکومت کے پاس ہو۔

علاوہ تمام تر سلیبس کو اس اسلامی فلسفہ حیات کے تابع کرنا ہوگا، جس کا خلاصہ اگلے باب میں دیا جارہا ہے موجودہ ادب، فلسفہ یا شیکسپیئر کے ڈراموں کا اسلام کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں بلکہ نفسیات اور معاشرتی مضامین سمیت تمام تاریخ کی کتابوں کو با مقصد کتابیں بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام آسان نہیں اور اس سلسلہ میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو سفارشات پیش کرنا ہوں گی۔ اس کے علاوہ ہمارے سکول اور کالجوں کے موجودہ طریقوں کو تبدیل کرنا ہوگا کہ بقول علامہ اقبال کالج میں بیٹھ کر ڈینگ مارے جاتے ہیں۔ یہ ہڑتالیں اور یہ اپنی موٹروں اور بسوں کو آگ لگانا، ایسی تعلیم فتنہ وفساد والی ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں اور طالب علموں کو قوم کے سامنے مثالی کردار کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور ایسا تب ہوسکتا ہے کہ سکولوں میں منظم طور اسلامی عسکری ربط وضبط کی عملی تعلیم دی جائے۔

لیکن سب سے بڑھ کر ضرورت اس چیز کی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو عام کیا جائے غیر ہمیں اپنی ایجادات سے آگاہ نہ کریں گے اور یہ کام ہم نے خود کرنا ہوگا۔ اول اپنے ملک کی تعلیمی اداروں میں سائنس اور ٹیکنالوجی یا ہر ہنر کی عملی تربیت دی جائے اور بنیادی یا ضروری تعلیم کے بعد، ہر لڑکے کی ذہنی قابلیت یا رویہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو ایسی چیز کی تربیت دی جائے جس کو وہ آسانی سے اپنا سکتا ہے۔

لسانی وحدت

ہماری بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمیں پہلے دو زبانوں یعنی اردو اور انگریزی میں مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے کہ اپنے گھروں میں ہم پنجابی، پشتو، سندھی یا بلوچی زبانیں بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یا روحانی اور عقائدی ضرورت کے تحت عربی زبان کو واقفیت بھی ضروری ہے۔ تیسری کتاب میں ہم اہل مصر کا ذکر کر چکے ہیں کہ انہوں نے عربی کو اپنا کر بحر اوقیانوس تک پہنچا دیا۔ اگر مشرق میں بھی ایسا ہوتا تو آج دنیا بھر کے مسلمانوں میں کم از کم لسانی وحدت تو ہوتی۔

بہر حال ابھی بھی وقت ہے اور بہتر ہوگا کہ قومی زبان کے طور پر ہم عربی زبان کو اپنا لیں اور پھر نتیجہ دیکھیں کہ ساری امت میں کیسے وحدت پیدا ہوتی ہے۔ حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے۔

''پسند کرو عربی کو کہ اہل جنت کی زبان ہے۔ قرآن کی زبان ہے اور میری زبان ہے۔'' اس آخری فقرہ پر قربان، یہ ہم عجمیوں کے لیے ہے اور موجودہ ذرائع ابلاغ کی مدد سے عربی زبان اپنانے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ بہر حال اگر قوم ایسا نہ کر سکے تو انگریزی سے تو جلد چھٹکارا حاصل کیا جائے کہ اس زبان کو اپنانے کی وجہ سے ہم اہل مغرب سے اتنے مرعوب ہو چکے ہیں کہ مجبوراً ہمیں ہر کام میں ان کی نقالی کرنا پڑتی ہے یعنی ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ

عربی زبان اپنانے کے بعد اہل پاکستان بارش کا پہلا قطرہ بن جائیں گے اور اس کے بعد تمام اسلامی ممالک ہماری پیروی کریں گے، جس سے اللہ کی رحمتوں کے اس امت پر وہ اثرات ہوں گے کہ ہمیں صرف جھولی پھیلانا ہوگا۔
یہ کام ہمارے ذرائع ابلاغ کی مدد سے انجام دینا ہوگا کہ دراصل یہ ذرائع بھی قوم کو ایک قسم کی تعلیم ہی دے رہے ہیں۔
بدقسمتی سے ہمارے ذرائع ابلاغ اس وقت جتنا قوم کا نقصان کر رہے ہیں اور جتنا تفرقہ یہ پھیلا رہے ہیں اتنا اور کوئی ادارہ نہیں پھیلا رہا۔ اسلام کے فلسفہ کو انہوں نے گڈمڈ کر دیا ہے۔ کبھی وطن کی پوجا، کبھی باطل فلسفوں کا پرچار اور ان لوگوں نے قوم کے اذہان پر ایسی یلغار کر دی ہے کہ ہمارے ذہنوں کو بھی ماؤف کر دیا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل میں نہ جائیں گے کہ اس سلسلہ میں تفصیلی سفارشات اور عمل کی ضرورت ہے کہ ذرائع ابلاغ کے تمام اداروں یعنی اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی کی تمام تر کارروائیوں کو اسلامی فلسفہ حیات کے تابع کرنا ہوگا۔

ادب، فلسفہ، ثقافت

یہی چیز ادب، فلسفہ، ثقافت اور ہمارے ان اداروں کو لاگو ہے جو فن کار پیدا کر رہے ہیں۔ آرٹ ہو یا فائن آرٹ یا وہ ادارے ہوں جو ہم نے مغرب کی نقالی میں کھول رہے ہیں۔ ان سب چیزوں سے قوم کے اذہان پر ایک عجیب قسم کی یلغار ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی علاقائی روایات یا طبقاتی رسم و رواج میں بھی بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اسلامی فلسفہ حیات کے لحاظ سے غلط ہوتی ہیں چنانچہ زندگی کے ان شعبوں کو بھی اسلامی فلسفہ حیات کے تابع کریں۔

عدلیہ، قانون اور سول انتظامیہ

ہماری حکومت کے تمام ڈھانچے خواہ وہ عدلیہ اور قانونی ادارے ہیں یا سول انتظامیہ وہ تمام تر مغربی نظام ہائے حکومت اور نو آبادیاتی طریق کار کی پیداوار ہے۔ ان سب چیزوں کے ہر پہلو کو اسلامی فلسفہ حیات کے طور طریقوں کے تابع کرنا ہوگا یعنی جگہ بالکل نئے ڈھانچے بنانے پڑیں گے کہ باطل کی بنیاد پر حق کی عمارت نہیں بنائی جا سکتی۔
مثال کے طور پر انگریزوں کا سول سروس ''کالے انگریز'' پیدا کرتا ہے۔ یہ لوگ، اسلامی قدروں کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ یہی چیز عدلیہ اور قانون کو لاگو کہ رومن قانون مادی نظریات کی پیداوار ہے اور اسلامی فقہ منطق الطیر کی تعلیم کے تابع ہے۔ اس سلسلہ میں بھی مکمل سفارشات ماہرین ہی کر سکتے ہیں کہ پورے ڈھانچے تبدیل کرنا ہوں گے۔

مادی ذرائع اور متعلقہ مدیں

یہی چیز مادی ذرائع یعنی پیداوار، زراعت، معدنیات اور ان کی مقلد مدیں یعنی مالیات، تجارت، کارخانوں وغیرہ کو بھی لاگو ہے کہ اسلام نے ان تمام ذرائع کے لیے کچھ اصول وضع کیے ہیں اور ان سب چیزوں کو ان کے تابع کرنا ہوگا۔ ماہرین ان سلسلوں میں کافی کام کر چکے ہیں اور ایسے ہی معاملات میں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ورنہ باقی ساری ضروریات کے تحت ہم نے اجتہاد کا ذکر نہیں کیا کہ وہاں پر اوامر اور نواہی موجود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ایسی ضروریات کے تحت ہر زمانے کے لیے موزوں بنایا ہے اور ایسا اجتہاد اسلام کے اصولوں یا اوامر ونواہی کی مدد سے کیا جاتا ہے لیکن اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد وہ کرائے یا اس چیز کے سلسلہ میں کرایا جائے جس کی جہاں ضرورت ہے اور پھر اس اجتہاد سے حاصل شدہ اصولوں کو نافذ بھی کیا جا سکے۔

منظّم قوم

یہ سب بڑے وسیع مضامین ہیں اور کئی متعلقہ یا متفرق باتیں رہ بھی گی ہیں لیکن ان تمام تر سفارشات کے تحت اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے سب سے اولین ضرورت منظّم قوم کی ہے۔ پہلے پوری کو منظّم طریقے کے ساتھ ربط وضبط میں باندھنا ہوگا۔ ہر سطح یعنی محلّہ، گاؤں، تھانہ، تحصیل وضلع کی سطحوں پر امیر مقرر کرنا ہوگا تو تب ''اولی الامر'' مجلس مشاورت یا مجلس اعلیٰ کی مدد سے نظام اسلام نافذ کر سکے گا تا کہ لوگ اور حکومت کے کارندے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اس کا کچھ ذکر دسویں باب میں بھی ہے کہ ساری قوم کو احکام الٰہی کا پابند کرنا ہوگا۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

(اقبالؔ)

❖❖❖

نواں باب

اسلامی فلسفہ حیات

تمہید

ان کتابوں کے سلسلہ میں جتنا ذکر یا زور اسلامی فلسفہ حیات پر دیا گیا ہے۔ اتنا اور کسی پہلو پر نہیں دیا گیا۔ حکمت عملیوں اور تدبیرات کے تمام تر اچھے نتائج کے بارے ہر مقام پر یہ کہا گیا کہ یہ سب اسلامی فلسفہ حیات پر عمل کی وجہ سے تھا لیکن اسلامی فلسفہ حیات ہے کیا؟ یہ سب ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا جاتا ہے۔ کسی بڑے سے بڑے دانشور کو بلا کر پوچھ لیں۔ اول وہ اس فلسفہ کو صحیح بیان ہی نہ کر سکے گا یا بات کو کچھ ایسا گڈمڈ کر دے گا کہ بیچ میں باطل اور غیروں کے فلسفہ آ جائیں گے۔

انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جارہا ہے؟ یا اس دنیا کی کیا حقیقت ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ آج اہل مغرب یا سوشلسٹ دانشور بھی اس سلسلہ میں حیران و پریشاں اور سرگرداں پھر رہے ہیں۔ ان کی سوچیں تضاد سے بھری پڑی ہیں اور ان کو زندگی بے مقصد نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض نے اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔

اسلام نے مومنوں کے لئے ان کے مقاصد زندگی اس دنیا کی حقیقت اور ازل و آخر کی تمام تر باتوں کو کھل کر بیان کیا ہے۔ قرآن پاک' احادیث' تفاسیر' صحابہ کرام کے اعمال اور بزرگوں کو اقوال میں سب کچھ موجود ہے اور آج سے پچاس سال پہلے نماز کے سبق کے ساتھ ہمیں ایمان کی شرائط صفات' رکن اور حقائق پڑھائے جاتے تھے جس میں اس دنیا کی حقیقت اور ہمارے مقاصد زندگی کا ذکر ہوتا تھا کہ ہمارا ان سب باتوں پر ایمان ہو تو تب ہم مسلمان کہلا سکتے ہیں اور یہ باتیں زبانی یاد کروانیکے بعد نماز پڑھنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ مختلف چھوٹی چھوٹی کتابوں یعنی حجۃ الاسلام بہشتی زیور اور پکی روٹی میں یہ ذکر موجود تھے لیکن وقت آیا کہ ہم نے ان کتابوں کا مزاق اڑانا شروع کر دیا اور یہ کتابیں ناپید ہوگئیں۔ ہم نے کچھ انگریزی اور کچھ اسلامی علموں کو آپس میں ملا جلا کر اپنے فلسفہ حیات کو بھی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کر دیا اس لئے حسب وعدہ اس باب میں ہم اسلامی فلسفہ حیات کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں اور مختلف پہلوؤں کے غیروں

کے ساتھ موازنے بھی کیے جائیں گے تا کہ ہم فرق سمجھ سکیں۔اس لئے سب سے پہلے غیروں کے فلسفہ حیات کا خاکہ پیش کیا جانا چاہیے۔

غیروں کے فلسفہ حیات

غیروں کے فلسفہ حیات میں یونانی فلسفہ اور ہندوانہ فلسفہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت ملتے جلتے ہیں۔ ہندووں کے لئے یہ دھرتی پوتر اور پاک ہے اور ان کی ماں ہے اور یہی سب کچھ ہے موجودہ جغرافیائی نیشنلزم کے باپ یہی لوگ ہیں جہاں وطن کی پوجا کی جاتی ہے۔ یونانی فلسفہ تمام یورپ پر چھایا ہوا ہے اور عیسائیت یا مذہب ہر آدمی کا نجی معاملہ بن چکا ہے۔ یونانی فلسفہ کے لحاظ سے انیسویں صدی تک یہ خیال عام تھا کہ ایٹم یا ذرہ ٹوٹ نہیں سکتا اور یہ دنیا ایک پکی اور دائمی چیز ہے۔ مرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے آدمی'' ساکن'' ہو جاتا ہے اور پھر جب آدمی دوبارہ زندہ ہوگا تو یہی دنیا ہوگی اور اس پر جنت اور دوزخ بھی ہوں گے۔ ہندووں نے اواگون کے چکر میں پڑ کر مرنے کے بعد آدمی کو دوسری مخلوق یعنی حیوانات میں تبدیل کر دیا اور جب گناہوں سے چھٹکارہ ملے گا تو آدمی نرک میں جائے گا جو اسی دنیا پر ہوگی اور یہ بھی ایک قسم کا جنت اور دوزخ کا تصور ہے کہ اسی دنیا میں سب کچھ ہوگا۔ان دونوں فلسفوں کی بنیاد مادیت پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ فلسفوں کے تحت اپنے اپنے ملکوں کی پوجا ہو رہی ہے کہ میری ماں دھرتی یا مادر وطن جیسے الفاظ لوگوں کے عقیدہ کا حصہ بن چکے ہیں۔اشتراکیت نے تو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے تصور کو ہی ختم کر دیا اور انسان وحیوان میں فرق ختم کر دیا۔ جزا وسزا والا پہلو بھی ختم ہے۔

بہر حال غیروں کے اس فلسفہ کے لحاظ سے یہ دنیا و جہاں ایک حادثہ کے طور پر وجود میں آئے۔ پہلے دھواں تھا یا کاربن پھر اس کاربن سے پانی اور ٹھوس چیزوں نے الگ الگ ہونا شروع کر دیا اور چاروں چیزوں کی ملاوٹ یعنی ہوا' پانی' آگ اور مٹی وغیرہ سے مخلوق یا حیوان پیدا ہونا شروع ہوئے اور چار عنصر دنیا پر چھا گئے۔ آدمی بھی حیوان یا بندر تھا اور اس کی موجودہ صورت اس کی ایک'' ترقی پزیر'' حالت ہے۔یعنی انسان بھی دابۃ الارض یا زمین کا کیڑا ہے اور وہ بھی حیوانات میں شامل ہے۔بوزنہ کا لفظ اس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسلام کا نظریہ حیات

اسلام کے لحاظ سے یہ دنیا اس کائنات میں ایک ادنی حیثیت رکھتی ہے اور وقت آنے پر اون دھنی کی طرح اڑ جائے گی یا یہ سب کچھ انسان کے کاروان حیات کی گزرگاہیں ہیں اور انسان کو اس کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اسلام انسان کو حیوانات کے زمرہ میں رکھنے کے حق میں نہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔یعنی وہ جن اور ملائکہ

سے بھی افضل ہے تو اس انسان کو اس دنیا تک محدود کرنا غیر اسلامی نظریہ ہے ہاں البتہ اسلام ایک دین ہے اور اجتماعی نظریہ ہے کہ کاروان حیات منزل بہ منزل رواں دواں رہے۔

ہم آگے یہ وضاحت کرتے ہیں کہ ایک حدیث قدسی میں تخلیق کائنات کا مقصد اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''میں ایک چھپا ہوا ایک خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔'' گویا کائنات کا مقصود انسان ہے اور انسان کا مقصود معرفت الٰہی ہے۔ یا یہ کہیں کہ حسن ازل نے اپنے جمال کو بے نقاب کرنا چاہا تو اس نے اس امر کو پسند کیا کہ اسے دیکھا جائے اور پہچانا جائے تو اس نے کاروانِ حیات جاری فرما دیا۔ اپنا عارف تیار کیا کہ اسے اپنے تک پہنچنے کے لئے دور دراز کے راستے پر ڈال دیا۔ یہی صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ ہے جس کی پچھلے باب میں نشاندہی کر دی گئی تھی۔ گو راستے کے اردگرد کچھ غلیظ اور دل لبھانے والی چیزیں بھی ڈال دیں تا کہ امتحان ذرا صحیح قسم کا ہو۔ بہر حال انسان اور خاص کر مومن اس منزل یا صراط مستقیم پر رواں دواں ہے۔

کاروانِ حق

منزل عشق کے یہ مسافر ازل سے چل کر ابد کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان کے پیچھے یا آگے کوئی زمانی و مکانی حد نہیں ہے۔ وہ خدائے ذی المعارج' یعنی سیڑھیوں یا منزلوں والے اللہ کی طرف زینہ بہ زینہ بڑھ رہے ہیں۔ ان کا مقصود صرف اللہ تعالےٰ کا ''چہرہ مبارک'' ہے۔ کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ کے چہرہ مبارک کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

کل شیء ھالک الا وجه...... (قرآن پاک)

اس کاروان محبت کو زمین کی تاریکیوں سے نکال کر سطح زمین پر لایا جاتا ہے۔ جہاں اسے عالم بالا کی گزرگاہوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہم جیسے گنہگاروں کے لئے یہ گزرگاہیں موت کے بعد کھولی جاتی ہیں۔ لیکن کچھ اللہ تعالےٰ کے پیارے اس زندگی میں بھی عالم امر کی گزرگاہوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ان راستوں کا نقشہ اپنی ایک نظم میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے جس کے دو شعر یہاں وضاحت کے لئے لکھے جاتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

منزلیں

مسافر جو فرش سے عرش کی طرف رواں دواں ہیں' وہ سات آسمانوں سے گزر کر ہی میدانِ قیامت میں قدم رکھیں گے اور یہ مقامات یا آسمان وغیرہ ویسے نہیں پیدا کئے گئے۔ان کے پیدا کرنے میں یہی مقاصد ہیں۔امنا ما خلقت ہذا باطلا''، یعنی یہ سب کچھ ایسے ہی باطل یا بے مقصد طور پر تو پیدا نہیں کر دیا گیا اور قرآن پاک میں اس کی مزید وضاحت بھی ہے:

''کہ اللہ تعالے وہ ہے جس نے سات آسمان وزمین اور ان کے مثل بنائے اور ان میں امر جاری فرمادیا۔''

یہ زمین جس پر ہم اب بستے ہیں اور اس پر یہ ستاروں والا آسمان جس کے حدود وحساب موجودہ سائنس کی بصیرت سے فی الحال باہر ہیں۔یہ تو انسانی سفر کا چھوٹا سا حصہ ہیں حالانکہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے اس کا نزدیک ترین ستارہ بھی' زمین سے کئی نوری سالوں (Light Years) کی مسافت پر مانا جاتا ہے۔ہم تیسری کتاب میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر سے جب قیصر روم نے زمین و آسمان کے فاصلوں کے بابت پوچھا تو جناب عمر نے ان فاصلوں کی مسافت کا بیان ''زماں'' کے الفاظ میں فرمایا اور نوری سال کا مطلب یہ ہے کہ روشنی ایک سال اتنا فاصلہ طے کرتی ہے یعنی طول کو ''زماں'' کے حساب سے نوری سالوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

بہر حال انسان جتنی بڑی دوربین تیار کرتا ہے' اسے مزید ستارے دکھائی دینے لگتے ہیں اور اس ''دنیاوی'' آسمان کی دوری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔حالانکہ یہ تمام ستارے پہلے آسمان پر ہیں کہ ارشاد ربانی ہے کہ دنیا کہ آسمان کو چراغوں سے مزین کیا گیا ہے۔اس کے بعد دوسرے آسمان کی محیط میں یہ چھوٹی سی زمین تیرتی پھر رہی ہے۔

شاید کہ زمین ہے یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

(اقبال)

سفر جاری ہے

خدا جانے ان سات آسمانوں کی وسعتوں میں کاروانِ حیات کے کتنے قافلے سرگرداں پھر رہے ہیں اور یوم الحساب کے منتظر ہیں۔یہ صرف اس زمین کی بات نہیں ہے بلکہ ہمارا سارا شمسی نظام اس پہلے آسمان کا معمولی جزو یا حصہ ہے کیونکہ شمسی نظام کے ستاروں کی مسافت کے بارے میں جو کئی نوری سال ہے ہم بے خبر ہیں۔اس لیے چاند تک پہنچ جانے والے ہم نالائقوں کے سامنے بے شک ڈینگیں مار سکتے ہیں لیکن وہ تو ابھی اللہ تعالیٰ کے نظام کے بال برابر حصہ

تک نہیں پہنچے۔

تو معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

(اقبالؔ)

یہ سارا بازار اور اس کے ساز و سامان' ان مسافروں کے لئے تیار کئے گئے ہیں جو ان میں سے گزر رہے ہیں اور رخ دوست (چہرہ مبارک) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے ان بازاروں کی رعنائیاں اور دلچسپیاں مومن کو زیادہ متوجہ نہیں کر سکتیں کیونکہ ان کا مقصود بازار سے بہت آگے ہے اور مقصود وہ ہستی ہے جسے لامکاں میں رونق افروز بتایا جاتا ہے۔ اس نے قرآن پاک میں ہمارے لئے واضح کر دیا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ تمام تمہارے تابع فرمان کیا گیا ہے۔'' تو ظاہر ہوا کہ اس محفل میں انسان کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے اور یہ سارا بازار صرف اسی لئے سجایا گیا ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے نہ آسماں تیرے لئے
جہاں تیرے لئے نہ تو جہاں کے لئے

(اقبالؔ)

دنیا کی حقیقت

یہ عالم کون و مکان بے شک عارضی چیز ہے اور جب یہ قافلہ حیات اس میں سے گزر جائے گا تو اسے لپیٹ دیا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: ''یہ تمام آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے' نہیں پیدا کیا ہے' مگر حق کے ساتھ اور مقرر وقت کے لئے'' پھر آگے اللہ تعالے مزید وضاحت کرتا ہے: ''جب صور پھونکا جائے گا تو ایک ہی پھونک کے ساتھ زمین اور اس کے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔'' اس طرح کی آیات ربانی کا ذکر قرآن پاک میں بار بار کیا گیا ہے تاکہ ہم پر واضح ہو جائے کہ یہ آسمان اور زمین فانی چیزیں ہیں جو انسان کے استعمال کے لئے بچھائی گئی ہیں۔ یہ مقامات کسی مستقل رہائش کی جگہ نہیں ہیں کہ ایک مقررہ وقت پر ان کو لپیٹ لیا جائے گا لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ایک مستقل چیز ہے اور وہ کائنات کا مرکز ہے۔

کارواں کا پڑاؤ

اللہ تعالے نے انسانی قافلہ کی گزرگاہوں کو تیار کرنے کے بعد اس پر کچھ پڑاؤ بھی مقرر فرمائے اور قرآن پاک

میں ہے'' کہ وہ ہی ہے جس نے موت وحیات کو پیدا فرمایا تا کہ تمہارا امتحان لیا جائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔'' اس آیات ربانی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں میں ہمارے لئے امتحان ہیں کہ ہمیں عملی پرچے حل کرنے پڑتے ہیں اور مرنے کے بعد کچھ سیدھے سوال پوچھے جائیں گے تو موت بھی ایک امتحان گاہ ہے یا ہمارے لئے پڑاو ہے۔ قرآن پاک میں ہے'' تم کیونکر اللہ تعالے سے کفر کرتے ہو' حالانکہ تم مردہ تھے پس تمہیں زندہ کیا' پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک موت ہمارے لیے واقع ہو چکی ہے۔ یعنی اس گزرگاہ پر زندگی اور موت کے پڑاؤ دو مرتبہ آتے ہیں۔ روزِ ازل یا عالم ارواح سے نکل کر انسان نے سب سے پہلے موت کے میدان میں قدم رکھا اور اب اس میدان سے نکل کر انسان باری باری حیات دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ یہاں سے چلتے چلتے دوسرے عالم موت میں داخل ہوں گے اور سوالوں کا پرچہ حل کرنے کے بعد پھر حیاتِ دوامی میں داخل ہوتے ہوئے اللہ کی طرف لوٹیں گے۔

روزِ ازل یا عالم ارواح

اس حالت کی مزید وضاحت یہ ہے کہ روزِ ازل جب اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو اپنے روبرو کھڑا کیا تو پوچھا۔ ﴿الست بربکم؟﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) تو ہم نے جواب میں کہا ﴿قالوا بلیٰ﴾ ہاں کیوں نہیں۔ چنانچہ ان سوالات اور جوابات کے ساتھ ہم عالم موت کے امتحان گاہ میں داخل ہوئے جس میں الست بربکم؟ کی صدائیں سنتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتے رہے۔ انسانی سفر کی یہ ابتدائی منزلیں ہمارے موجودہ شعور کی نگاہوں سے اوجھل ہیں لیکن ثبوت کے طور پر ہمارے لیے قرآن پاک کے الفاظ الست بربکم کافی ہیں۔

ہاں البتہ موجودہ زمانے میں علم نفسیات کے حوالے سے اس سلسلہ میں کچھ عملی دلائل بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ علم نفسیات کے ماہر اب وہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ انسان کے لاشعور میں اس کے اجداد کے تمام تجربات محفوظ رہتے ہیں۔ اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ نفس انسانی عالم شہود میں ظاہر ہونے سے پہلے مادہ کی تاریکیوں میں اس دنیا میں موجود رہتا ہے اور جب اس دنیا میں وہ موجودہ صورت اختیار کرتا ہے تو اس میں روح پھونک دی جاتی ہے تا کہ اس کا تعلق عالم امر کے ساتھ قائم کیا جائے یا پیدا ہو جائے چنانچہ عالم خلق میں ظاہر ہونے کے بعد یہ مسافر اپنی گزرگاہ یا صراط پر چل پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ رہبروں کے ذریعے اس کے لیے صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایات بھیج دیتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں فرمایا۔'' جو میری ہدایات پر عمل کریں گے انہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔'' ساتھ ہی عالم امر کی باتوں کو جذب کرنے یا وہاں پر داخل ہونے کے لیے وہاں سے بھی کچھ مل گیا یا عطا ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔'' کہ بس میں نے پھونک دیا اس میں روح اپنی طرف سے۔'' اور پھر روح کے بارے میں فرمایا۔'' کہ روح امر ربی سے ہے۔'' ان دونوں آیات سے استفادہ

کرنے کے بعد انسان کو عالم خلق اور عالم امر کے بارے میں کچھ کچھ سمجھ آ جانی چاہیے۔ دراصل اللہ تعالیٰ اس جہاں میں ہمیں عالم امر میں داخلہ کے لیے تیار کر رہا ہے۔

عالم خلق اور عالم امر

اب ذرا سوچیں کہ جب سے ہم اس عالم خلق میں داخل ہوئے ہیں، امتحان شروع ہے۔ ہم سے دو سوال اکثر پوچھے جاتے ہیں۔ مَنْ رَّبُّکَ وَمَا دِیْنُکَ...... تمہارا رب کون ہے اور تمہارا دین کون سا ہے؟ یہ عملی سوالات ہیں اور اس زندگی میں اپنے عملوں سے ہم ان کا جواب دے رہے ہیں۔ کچھ لوگ خدا کو مانتے ہیں ہی نہیں اور کچھ لوگ اس دنیا اور مادی چیزوں کو اپنا خدا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یعنی کچھ لوگوں کا دین بھی یہی دنیا ہے اور وہ اسی دنیا کو جنت ارضی بنانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو چھوڑ کر ساری دنیا اسی چکر میں پڑی ہوئی ہے اور ہم پر بھی اس کے اثرات پڑ رہے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ہم ہر روز اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں کہ اے رب تیری بڑی مہربانی ہے کہ تو نے ہمیں اپنے حبیب حضور پاک محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین پر پیدا کیا اور اس نے ہمارے لیے تیرے راستے کی نشان دہی کی، پس ہم صرف تیری غلامی کریں گے اور لگا ہم کو سیدھے راستے پر۔ (اھدنا الصراط المستقیم) آمین ثم آمین۔

حضور پاک ﷺ کی ذات

بہر حال عالم خلق کے یہ دو سوال عالم امر میں بھی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لیکن تیسرا سوال بھی ہے۔ جس کو اگر سوال عشق کا نام دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس سوال کا تعلق ہر روح سے ہے اور یہ سوال مرنے کے بعد فوراً بعد پوچھا جائے گا۔ اس سوال کا تعلق زینت کون و مکان، فخر انسانیت، مولائے کل حضور پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات و صفات کے ساتھ ہے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ سامنے نظر آئیں گے اور سوال ہوگا۔ ''ما تقول فی ھذا لرجل'' یعنی اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ انسانی شخصیت کی تکمیل اس آخری سوال کے صحیح جواب میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے ہر باب میں نتائج کے ذکر میں ہم حضور پاک ﷺ کی غلامی کا اکثر ذکر کیا کہ سب کچھ اس سے حاصل ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کے عام مکاتب فکر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ خاک جس نے حضور پاک ﷺ سے مس کیا عرش بریں سے افضل ہے۔ اس سلسلہ میں عزت بخاری فرماتے ہیں۔

ادب گاہست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

حضور پاک ﷺ حاضر و ناظر ہیں

مہاجر مکی نے پیر مہر علی شاہ کو کہا کہ وہ حدیث پاک سے حضور پاک ﷺ کے حاضر و ناضر ہونے کو ثابت کریں وتو پیر مہر علی شاہ نے اس حدیث کا حوالہ دیا کہ حضور پاک ﷺ ہر وقت ہر جگہ موجود ہیں کہ ہر مرنے والے کو نظر آ رہے ہیں تو مہاجر مکی عش عش کر اٹھے کہ انہوں نے یہ حدیث سینکڑوں مرتبہ پڑھی لیکن ان معنی تک نہ پہنچ سکے اور آپ نے پیر مہر علی شاہ کو مبارک دی تو پیر صاحب نے فرمایا کہ ابن عربی فتوحات مکیہ میں ایسی ہی تفسیر کر گئے ہیں۔ بہر حال یہ عشق اور محبت کی باتیں ہیں اور جناب ابن عربی اور پیر مہر علی شاہ جیسے خوش قسمت لوگوں کو جلد سمجھ آ جاتی ہے۔ علم والوں کو ذرا کم اور دیر سے آتی ہے۔ بہر حال مہاجر مکی کی قسمت بھی کھل گئی اور قارئین کو بھی یہ عطا مبارک ہو۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑائی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

(اقبالؔ)

جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا تجسس

لہٰذا یہ تیسرا سوال منزل کے ایک ایسے پڑاؤ پر پوچھا جائے گا جو نازک ترین ہے اور دعا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہوش و حواس قائم رکھے کہ ہم اپنے آقا ﷺ کو پہچان سکیں۔ کیونکہ اس پڑاؤ پر صحیح حالت میں پہنچنے کے لیے ایک زمانہ درکار ہے۔ جو لوگ کاروانِ محبت میں شامل ہونے کی صحیح تیاری اس عالم خلق میں حضور پاک ﷺ کی غلامی اپنانے سے کر لیں گے۔ ان کے لیے اس پڑاؤ پر اور قیامت کے روز آسانی ہوگی کیونکہ جب پورا انسانی قافلہ میدانِ محشر میں اترے گا تو ہر شخص اپنے امام کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اور آسانی ان کے لیے ہوگی جو زندگی میں ایسا سوچیں۔

بے تاب ہو رہا ہوں فراق رسول ﷺ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں حضور رسالت ﷺ پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

(علامہ اقبال کی زبان میں "جنگ یرموک کے ایک شہید کے آخری لمحے")

لیکن یہاں پر عظیم صحابی اور عاشق رسول ﷺ جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرنا

ضروری ہے۔ ایک دن جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضور پاک ﷺ کے سامنے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ ہم لوگ آپ کے بتائے ہوئے احکامات پر تو پورے نہیں اترتے لیکن آپ سے محبت ضرور کرتے ہیں کہ آپ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے ہیں۔ اب خدا جانے ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ہمیں روزِ قیامت کہاں رکھا جائے گا۔''

حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''اے ابوذر! قیامت کے روز تمہارا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ تم محبت کرتے ہو۔'' (اور اس بات کو تین دفعہ مکرر ارشاد فرمایا)

یہ سنتے ہی سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اٹھے اور حضور پاک ﷺ کے ساتھ لپٹ گے اور ساتھ ہی کہتے جاتے تھے۔ ''حضور ﷺ میں آپ کے ساتھ محبت کرتا ہوں، میں آپ کے ساتھ محبت کرتا ہوں، میں آپ کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔'' اور معلوم نہیں کتنی بار یہ کلام دہرائی۔

قارئین! حضور پاک ﷺ کے جمال کا چشمہ اب بھی جاری وساری ہے۔ اگر ہم گنہ گار تصور میں حضور پاک ﷺ کے قدموں سے لپٹ جائیں تو ہمارے اندر سے اتھاہ محبت کا دریا امڈ آئے گا جو اس دنیا میں بھی ہمارے لیے پاکیزگی کا باعث ہوگا اور آخرت کی تیاری بھی ہو جائے گی۔ علامہ مرحوم اس کی یوں وضاحت فرماتے ہیں۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

یعنی تو دونوں جہانوں کا خداوند ہے۔ میرے گناہوں کا حساب لینے سے مجھے ہی شرمندگی ہوگی لیکن اگر یہ ناگزیر ہے تو میرے آقا محمد مصطفیٰ سے چھپا کر حساب لیجئے گا۔

علامہ مرحوم کی یہ ایک ادا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بغیر حساب کے بخش دے ورنہ وہ کون سی جگہ ہوگی جو حضور پاک ﷺ سے چھپی ہوگی۔

روزِ قیامت یا میدانِ حشر

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''جب آسمان پھٹ جائے اور جب تارے جھڑ جائیں اور جب قبروں کو کھولا جائے۔'' ظاہر ہے کہ یہ قیامت کا ذکر ہو رہا ہے کہ اس روز انسانی قافلہ ارض وسمٰوات سے فارغ ہو کر آگے میدان حشر میں داخل ہو گا۔ اب ذرا اس پہلو پر دھیان دیں کہ قبروں کے کھولے جانے اور آسمان کے پھٹنے کو اکٹھا ایک نسبت کے ساتھ بیان کیا

گیا ہے یعنی جہاں قبر کے کھولنے کا ذکر ہے تو اس سے آگے عالم غیب یا عالم امر شروع ہوتا ہے اور ان مقامات سے نکل کر انسان روزِ حساب کی طرف بڑھے گا۔ عالم خلق میں انسان کی ایک قبر ہے لیکن سب انسانوں کی قبریں نہیں ہوتیں۔ کسی کو جلا دیا جاتا ہے اور کسی کو سمندروں میں پھینک دیا جاتا ہے وغیرہ۔ پھر یہ کون سی قبر ہوگی جس کو کھولا جائے گا؟ ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے عالم خلق کی قبر کا ذکر کیا ہے کہ ادھر ہی بارش ہوگی اور انہی قبروں میں انسان کی ہڈیوں پر مٹی چڑھے گی یا انسان کے جسمانی اجزا کو ادھر ادھر سے اکٹھا کیا جائے گا۔

ہم اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے لیکن ہم نے جو کچھ بزرگوں کی کتابوں میں پڑھا ہے اس کے لحاظ سے قبر ایک استعارہ ہے اور عالم برزخ کا دنیاوی نام ہے۔ ہم مسلمان ادب کے ساتھ اپنے مرنے والوں کے جسد خاکی کو ایک مقام میں دفن کر دیتے ہیں۔ قبر کا تقدس اس وجہ سے ہے کہ انسان کا جسد اس زمین کو شرف بخشتا ہے اور بزرگوں کے ایسے نشان اور قبریں مقدس ہیں۔ طبقات ابن سعد کے مطابق حضور پاک ﷺ جب اپنے بیٹے ابراہیم ؑ کو دفن فرما رہے تھے تو اوپر سے قبر کی مٹی ٹھیک کرائی اور فرمایا۔ "یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ورنہ مرنے والے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس ایک فقرہ سے قبروں کے بارے میں تمام اختلافات حل ہو جاتے ہیں کہ پس وہ ہماری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہیں لیکن اس کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔

ہم آگے چل کر جسم اور روحانی جسم کے موضوع کے تحت اس پہلو کو اور واضح کریں گے لیکن یہاں پر یہ باور کرانا ضروری ہے کہ ہماری قبروں پر حاضری سے عالم برزخ کی یاد آ جاتی ہے۔ بزرگوں کے نیک اعمال یاد آتے ہیں اور اس دنیا کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ یہ فانی جہاں ہے اس سے نیک عمل کرنے کی ترغیب ملتی ہے اور قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ فاتحہ بھی جنازہ کی طرح بخشش کے لیے ایک دعا ہے اور اس میں ہمارا اپنا فائدہ ہے۔ اسلام میں قبر پرستی یا بتوں کی طرح ڈالیاں چڑھانے کی کوئی سند نہیں۔ پس ادب کی جگہ ہے اور قبر کی حاضری کا فرمان خود حضور پاک ﷺ دے گئے لیکن قبر کی پوجا کی اجازت نہیں۔ امت میں اس سلسلہ میں اختلافات اس گنہ گار کی سمجھ سے باہر ہیں۔

مادی دنیا یا عالم خلق کی حیثیت

چنانچہ ہماری یہ مادی دنیا یا عالم خلق، عالم امر کے مقابلے میں اس قدر تنگ و تاریک ہے جتنا بچے کے لیے ماں کا رحم، یعنی عالم امر کو عالم خلق سے وہی نسبت ہے جو عالم خلق کو کسی بچے کے ماں کے رحم میں ہونے سے ہے۔ ماں کے رحم میں جب بچہ تیرتا ہے تو اس کو وہ جگہ بڑی وسیع نظر آتی ہے۔ بہرحال ہم یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ عالم شہادت یا مادی دنیا، عالم غیب یا عالم امر کے مقابلہ میں ایک رائی کے دانے کے برابر ہے۔ شیخ اکبر جناب محی الدین ابن عربی لکھتے ہیں کہ ہمارا مادی جہاں، عالم غیب کے سمندر میں گویا ایک قطرے کے برابر ہے۔

روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ ایک مسلمان کا جنازہ پڑھنے اور دفنانے کے بعد جب گھر تشریف لائے تو ام المومنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کی پیشوائی کے لیے آگے بڑھیں تو حضور پاک ﷺ کی دستار مبارک پر کچھ بوندیں دیکھ کر حیران ہوئیں کہ باہر موسم صاف تھا۔ حضور پاک ﷺ نے جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کی حیرانگی دیکھی تو بات کو بھانپ گئے کہ جناب عائشہ نے اپنا سر حضور پاک ﷺ کی ایک چادر سے ڈھانپ رکھا تھا کہ ان کو عالم غیب یا برزخ کی بوندیں بھی نظر آ گئیں۔ چنانچہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''اے عائشہ! عالم غیب میں بھی زمین و آسمان، چاند اور ستارے ہیں اور وہاں بارشیں بھی ہوتی ہیں۔ البتہ انہیں بجز اولیائے کاملین کے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔''

اس حدیث مبارکہ میں اتنی باتیں پنہاں ہیں کہ اس پہلو پر کئی مضامین لکھے جا سکتے ہیں لیکن ہم صرف دو باتوں پر اکتفا کریں گے کہ وہ مومن کتنا خوش قسمت تھا جس کو ہمارے آقا ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے دنیاوی قبر میں دفن کیا لیکن پھر اس کے ساتھ عالم برزخ تک بھی گئے جس کی بارش کی بوندیں جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی نظر آ گئیں۔ ایسے واقعات سے حضور پاک ﷺ اپنی امت کے لیے کئی عقدے کھول رہے تھے اور ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انسان کی اگلی منزل ایک بہتر جہاں کی صورت میں ہوگی۔[1]

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

(اقبالؔ)

مختلف پڑاؤ کی وضاحت

اول موت پھر زندگی، پھر موت اور اس کے بعد حیاتِ جاودانی۔ یہ انسانی سفر کے چار بڑے پڑاؤ تصور کیے جا سکتے ہیں جن کی گزرگاہ کائنات میں کچھ اس طرح سے تعین ہے۔ اول موت کا تعلق خالصتاً زمین کی تاریکیوں کے ساتھ ہے، جس میں نظام ربوبیت یا عالم خلق، نفس انسانی کو اس کے اجداد کی پشتوں میں پرورش کرتا رہتا ہے۔

بہرحال مادہ کی تاریکیوں یا خالص عالم خلق سے نکل کر جب انسان حیات دنیا میں قدم رکھتا ہے تو یہاں عالم خلق اور عالم امر کے اختلاط کی وجہ سے اس کے مادی جسم کے ساتھ اس میں روح بھی پھونک دی جاتی ہے۔ دوسرا عالم موت جس میں مرنے کے بعد انسان گامزن ہوتا ہے، ساتوں آسمانوں پر مشتمل ہے اور اسی لیے معراج کی رات تمام انبیاً علیہم السلام کو وہاں پر ہی حضور پاک ﷺ نے اپنی ملاقات سے نوازا۔ دوسری زندگی یعنی حیات جاودانی کا ظہور زمین و آسمان سے آگے ہوگا جب کہ اس کائنات کو لپیٹ لیا جائے گا اور نئے میدان بچھائے جائیں گے۔

[1] تفصیل کے لیے ''مثنوی رومی'' سے استفادہ کریں۔

زمان ومکاں

یہ افلاک جن سے ہم گزر رہے ہیں صرف عرض کی حیثیت رکھتے ہیں اور مکان یعنی Space کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔اس عرض کے ساتھ طول بھی ہے جسے زمان (Time) یا مسافت کہتے ہیں۔ایک طرف کی وسعتیں ہیں تو دوسری طرف زمان کی لامتناہیوں سے انسانی سفر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کس قدر طویل ہے۔البتہ زمان و مکاں کا مسئلہ بہت مشکل اور پیچیدہ ہے اور خالی طول وعرض کے الفاظ کے استعمال سے بیان مکمل نہیں ہوتا کہ دنیاوی زبان میں ہمارے پاس نہ ایسے الفاظ ہیں کہ ہم اس مسئلہ کی گہرائی میں جائیں اور نہ اس قسم کی کتاب میں اس پہلو کو مکمل طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

ہم البتہ آگے چل کر قرآن پاک کے الفاظ سے یہ بھی واضح کریں گے کہ وقت محض ایک پیمانہ ہے جس کے ذریعے کائنات کی وسعتوں کا بیان کیا جاسکتا ہے یا ان کو کچھ ناپا جاسکتا ہے۔اس کی مزید وضاحت جناب علی کرم اللہ وجہہ کے قول سے بھی آگے آتی ہے کہ یہ سفر کتنا لمبا ہے۔چنانچہ زمان ومکان کا مضمون بہت وسیع ہے اور یہاں صرف یہ باور کرانا مقصود ہے کہ ہمیں بھی غیروں کی طرح اپنے آپ کو اس دنیا میں محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہماری نگاہ پوری کائنات پر ہونی چاہیے اور کائنات کی وسعتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں یوں فرماتا ہے۔"تدبر کرتا ہے امر کا آسمان سے زمین کی طرف، اوپر چڑھ جاتا ہے طرف اس کی وہ امر ایک دن میں کہ جن کی مقدار تمہاری گنتی کے مطابق ایک ہزار برس ہے۔"اس طرح وقت یا زماں کی مقدار کے سلسلہ میں قرآن پاک میں ایک اور جگہ یہ الفاظ ہیں۔"ملائکہ اور روح اس کی طرف عروج کرتے ہیں ایک دن میں جن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔"

اب اندازہ لگائیں کہ ایک ہزار برس کی مقدار کا دن عالم امر کے متعلق ہے جو اس عالم دنیا کے بعد انسان کی اگلی منزل ہے اور اس سے بھی اعلیٰ تر جہاں میں ایک دن ہماری گنتی کے حساب سے پچاس ہزار برس کے برابر ہے۔غیروں نے بھی اس مادی دنیا سے نکل کر اب ان زمان ومکاں کے معاملات کو کچھ سمجھنا شروع کر دیا ہے اور جناب ابن عربی کی کتابوں پر روس اور امریکہ میں تحقیق ہو رہی ہے لیکن ہمارے ہاں کچھ لوگ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مرنے کے بعد آدمی اسی جہاں میں رہ جاتا ہے یا محدود مٹی میں سلا دیا جاتا ہے۔ایسے لوگ سخت غلط فہمی میں ہیں۔کائنات کا یہ طول و عرض کسی اور مخلوق کے لیے نہیں بنایا گیا بلکہ یہ تمام راستے انسان کے لیے ہیں اور موت پر قصہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ صحیح معنوں میں سفر تو موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

مسافر کے سفر کے راستوں کی وضاحت

اب انسان نے جن راستوں پر سفر کرنا ہے تو ہم معلوم کرتے ہیں کہ مکاں کی وسعتوں کو طے کرنے کے لیے اس کو کون سے وسائل مہیا کئے گئے ہیں چنانچہ اس مادی جسم کی پرورش کے لیے انسان کو چند مادی طاقتیں عطا کی گئی ہیں۔ ایک فوجی سپاہی کی پیدل رفتار، عام طور پر تین میل فی گھنٹہ ہوتی ہے اور اس چھوٹی سی زمین پر بھی اس رفتار کے ساتھ انسان کا دائرہ عمل ایک محدود سے خطہ ارضی پر ہو سکتا ہے۔ شاید انفرادی ضرورتوں کے لیے یہی رفتار کافی سمجھی گئی مگر زندگی نے جب اجتماعی شکل وصورت اختیار کی تو اس کے لیے تیز رفتار سواریوں کا وسیلہ ضروری ہو گیا۔ انسان نے آج اس دنیا کے فاصلوں کو طے کرنے کے لیے آواز سے بھی تیز اڑنے والے ہوائی جہاز بنائے ہیں جنہوں نے زمین کی وسعتوں کو سکیڑ دیا ہے۔ مگر زمین کے دائرے سے باہر یہ جہاز کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے۔ آگے چل کر شاید انسان راکٹوں کے ذریعے تمام نظام شمسی کو اپنے دائرہ عمل میں لے آئے مگر اس سے آگے بڑھنا مادی جسم کے ساتھ کچھ ناممکن ہے۔

نزدیک ترین ستارہ کئی نوری سالوں کے فاصلے پر ہے اور اگر برقی رفتار کے جہاز بھی بن جائیں تو بھی نزدیک ترین ستارہ تک بمشکل کئی نوری سالوں میں ہو سکے گی۔ ان آسمانی فاصلوں کو طے کرنے کے لیے روحانی رفتار کی ضرورت پڑتی ہے جہاں روح ایک دن میں آسمان سے زمین اور پھر زمین سے پلٹ کر آسمان میں پہنچ سکتی ہے۔ مگر وہ دن ہمارے حساب کتاب کے مطابق ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ لہٰذا اس زندگی میں اگر کوئی اپنی روحانی طاقتوں کو بیدار کر لیتا ہے اور اس رفتار سے عالم بالا کی سیر کی کوشش کرے تو وہ ایک محدود دائرے تک ضرور پہنچ جائے گا۔ لیکن پورے سمٰوات کا چکر لگانے کے لیے ہمارے حساب سے کم از کم ایک ہزار برس درکار ہوں گے۔ لیکن ان رفتاروں سے بڑھ کر ایک اور رفتار بھی ہے، جس کی بدولت پلک جھپکنے میں فرش سے عرش تک چکر لگایا جا سکتا ہے۔

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(اقبال)

علامہ مرحوم نے ہمارے لیے اس سفر کے عقدہ کو حل کر دیا کہ ایسی رفتار حضور پاک ﷺ کے عشق اور غلامی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حضور پاک ﷺ کا عشق دنیا و مافیہا اور عقبٰی و مافیہا سے بے نیاز بنا کر سیدھا تماشائے ذات کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ حضور پاک ﷺ کے صحابہ کرام آپ کے عشق سے سرشار دنیا و مافیہا سے اکثر بے خبر ہو جاتے تھے۔ بس بشری تقاضوں کے تحت اللہ تعالیٰ نے ان کو حضور پاک ﷺ کے جمال کے نظارہ کو برداشت کرنے کی طاقت دے دی تھی ورنہ یہ کوئی آسان بات نہ تھی۔ بعد کے زمانے کے اولیاء اللہ بھی ان باتوں کو سمجھتے تھے اور کچھ اشارے بھی کر گئے ہیں۔

پشتو کے مشہور شاعر رحمٰن بابا کچھ اس طرح فرماتے ہیں۔

پہ یو قدم تر عرش پورے اس
مالیدے دے رفتار دور دیشانو

(یعنی ایک قدم سے عرش پر پہنچتے ہیں، میں نے درویشوں کی یہ رفتار دیکھی ہے)

موت کیا ہے؟

اسلامی نظریۂ کائنات اور اس میں سے گزرنے والے مسافر کے سلسلہ میں اوپر بیان کئے گئے پس منظر میں اب ہم موت کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ موت وہ چیز ہے جس سے فرار ناممکن ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ایک دہریہ بھی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ چاروں طرف ہر لمحہ اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ''ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔'' اور اس وجہ سے ہر نفس کو موت کا پابند کردیا گیا ہے۔

غیروں کا نظریۂ موت

موت کے بارے میں غیر اسلامی نظریات کافی حد تک پریشان خیالی پیدا کرتے ہیں۔ عام طور پر مسلمان ان خیالات سے متاثر تو نہیں ہوتے لیکن کچھ وضاحتیں ضروری ہیں۔ ہندو مت اور بدھ مت کے پیرو آواگون کے قائل ہیں جس کے مطابق روحیں اپنی جزا و سزا بھگتنے کے لیے بار بار مختلف صورتوں میں اس زمین پر آتی رہتی ہیں کبھی انسان، انسان ہی کے بہتر یا بدتر روپ میں اور کبھی انسان جانور کے روپ میں۔ اس فلسفہ کے لحاظ سے بھی سفر تو جاری ہے اور شاید جاری سفر کے صحیح فلسفہ کو اہل ہند نے اپنی عقل لڑا کر محدود یا گھٹیا کردیا۔ بہرحال مسلمان آواگون کے فلسفہ سے متاثر نہ ہوئے۔ البتہ جیسا کہ تیسری کتاب میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ عبداللہ بن سبا نے کچھ اس قسم کی شرارت کی اور قرآن پاک کے دابۃ الارض کو اپنی تاویلیں دے کر آدمی کی دوبارہ دنیا میں آمد پر انگل پچو قسم کے تبصرے ضرور کئے۔

موت کا دوسرا نظریہ مادہ پرستوں کا پیش کردہ ہے۔ یہ لوگ دہریے ہیں اور خدا کی ذات اور روح کے منکر ہیں۔ سوشلسٹ ممالک کے علاوہ اور بھی کافی لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ حیات بعد الموت کی کسی صورت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں کافی تعداد میں موجود ہیں اور ان کو اس زمانے میں بڑی دنیاوی کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔ اس وجہ سے اہل اسلام میں ایک گروہ پیدا ہوگیا ہے جو ان سے متاثر ہے۔ گو ایسے لوگ کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار نہیں کرتے مگر حیات بعد الموت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت جزا و سزا اور جنت و دوزخ کو بھی استعارے سمجھتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں۔ ''اے جہان وڈا مٹھا...... اگلا کے نہ ڈٹھا'' یعنی یہ جہان بہت میٹھا ہے اور اگلا

جہاں کسی نے نہیں دیکھا۔ ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں، یہی لوگ جنت ارضی کے ''باپ'' ہیں، ان کے ہر بیان اور عمل پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ اسلامی معاشرہ میں یہ لوگ ناسور کی طرح ہیں۔

موت کا تیسرا نظریہ جو دراصل یونانی فلسفہ کی پیداوار ہے۔ اب یہودی یا نصرانی لوگوں میں بھی پھیل چکا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو آخری آرام گاہ میں سلا دیا جاتا ہے اور قیامت تک انسان وہاں ہی سوتا رہتا ہے۔ روزِ محشر انسان کو جب اٹھایا جائے گا تو اچھے یا برے اعمال کی وجہ سے جنت یا دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ بھی نصرانیوں کی پیروی کرتے ہوئے اس نظریہ سے متاثر ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد اس جہان دنیا کی قبر کو سب کچھ سمجھنے لگ گئے ہیں اور عالم برزخ میں انسانی طاقتوں کے ستر گنا بڑھ جانے کے حضور پاک ﷺ کے فرمان یا عالم برزخ کی وسعت یا معراج کے موقع پر حضور پاک ﷺ کے مشاہدات والی باتوں کو کچھ بھول گئے ہیں۔ اس میں نقصان یہ ہے کہ پہلے دو نظریوں کی طرح یہ نظریہ بھی مقامی ہوتا ہے اور اسلام کے فلسفہ حرکت یا سفر جاری اور صراط مستقیم پر رواں دواں رہنے والی باتوں کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہودی اور نصرانی بھی اس غلطی کا شکار اس لیے ہوئے کہ غیروں کے فلسفوں سے اثر لے لیا۔ ورنہ صحیح بخاری کے مطابق تمام پیغمبر ایک دین پر ہیں تو ظاہر ہے کہ تمام نبیوں نے تو فلسفہ موت وحیات صحیح طور پر اس طرح واضح کیا جس طرح اسلام یا دین فطرت میں بیان ہے کہ ایک مسافر کی حیثیت سے انسان نے بلندیوں کی طرف پرواز کرنا ہوتا ہے اور قرآن پاک کے لحاظ سے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعلیم کا نام بھی منطق الطیر تھا اور تیرہویں صدی عیسوی کے مشہور صوفی بزرگ فرید الدین عطار کی کتاب کا نام بھی منطق الطیر ہے یعنی پرواز کی بات ہے، اس لیے جب تک ہم غیروں کے فلسفہ حیات وموت سے نجات حاصل نہیں کرتے، ہمیں اسلام کا نظریہ حیات وموت سمجھ نہ آئے گا۔

اسلام کا نظریۂ موت

اسلام کے لحاظ سے انسان ایک مسافر ہے اور وہ ازل سے ابد کی طرف سفر کر رہا ہے۔ وہ کسی مقام پر رکتا نہیں بلکہ ہمیشہ بڑھے چلا جاتا ہے۔ پڑاؤ کا ذکر جو کیا گیا ہے وہ کوئی پکا قیام نہیں بلکہ منزل کا لفظ استعمال کر کے وہ پڑاؤ ایک ''ستانے'' والی جگہ بن جاتی ہے تو مرنا انسان کا خاتمہ نہیں، نقل مکانی ہے، جس کے مطابق وہ ایک ادنیٰ مقام سے اٹھ کر تکمیل شخصیت کے لیے ایک اعلیٰ مقام میں منتقل ہو جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ اولیاء اللہ نہیں مرتے، مگر ایک اور روایت ہے، جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ ''اسلام غربت سے اٹھا اور پروان چڑھا، عنقریب غریبوں کی طرف پلٹ جائے گا اور آخری زمانے میں غریبوں کے ذریعے ہی ایک مرتبہ پھر غلبہ حاصل کرے گا۔'' عربی میں غریب مسافر کو کہتے ہیں اور اس روایت میں کارواں کا ذکر بھی ہے اور علامہ اقبال بھی ہر زمانہ میں کسی قافلہ یا کارواں کا ذکر کرتے ہیں تو

یہ مسافر رواں دواں ہے اور موت سے ہماری ہلاکت ہرگز نہیں ہوتی۔

کشا در دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

(اقبالؔ)

موت اور نیند کی مماثلت

قرآن پاک میں ہے۔ ''اللہ قبض کرتا ہے نفس کو موت کے وقت اور جو نہیں مرتے ان کو نیند میں۔ پس جن پر موت قضا ہوئی اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک بھیج دیتا ہے۔ تحقیق اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔'' یہ آیت ربانی ہمیں بتاتی ہے کہ موت اور نیند میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ نیند کے دوران انسانی ہستی (نفس) اس جسم سے الگ ہو کر بھی بدستور قائم رہتی ہے اور وہ عالم بالا اور عالم دنیا کی سیر کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جاگ اٹھنے کے بعد ہمیں اکثر باتیں بھول جاتی ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ خواب میں نفس انسانی اس جسد خاکی کو چارپائی پر چھوڑ کر کسی اور جسم کے ساتھ ''زمان و مکاں'' میں غوطے لگاتا ہے اور خوابی یا روحانی جسم میں حواس خمسہ پوری طرح کام کرتے ہیں اور یہ خوابی جسم، خوشی یا غم ہر چیز کو محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ نیند کو سمجھنے کے بعد ہم موت کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ نیند کو موت کا بھائی کہا گیا ہے۔ ''النوم اخ الموت'' نیند اور موت دونوں میں اللہ تعالیٰ نفس کو قبض کرتا ہے اور دونوں میں اضافی ہستی اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

(اقبالؔ)

جسم کی حقیقت

یہ جسد خاکی یا جسم یا بدن جس پر بیٹھ کر مسافر حیات سفر کر رہا ہے اور جس کے ختم ہونے کا غم اسے کھائے جا رہا ہے، اصل میں کوئی مستقل حقیقت نہیں رکھتا۔ البتہ یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ جسم، نفس، بدن، روح، قلب اور دل وغیرہ کے الفاظ جو انسان کے وجود کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو بزرگوں نے اپنے خیالات یا تصورات کے لحاظ سے استعمال کیا ہے اور گہرائی میں جائیں تو کوئی فرق نہیں۔ ہاں طرز بیان الگ الگ ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ہماری مختلف جماعتوں کے لیے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے اور وضاحت کے طور پر ابن عربی فرماتے ہیں کہ

انسان ایک خیال یا تصور ہے۔ بہر حال یہ سب اللہ تعالیٰ کے بھید ہیں کہ ہمیں شعور دے کر بھی بے شعور رکھا کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کو وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ ساری دنیا کے قلم اگر سمندروں کا پانی بھی بطور سیاہی استعمال کریں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو بیان نہیں کر سکتے۔

تو بہر حال ہم یہاں پر بات ظاہری جسم کی کر رہے تھے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں کہ لحظہ بہ لحظہ کچھ نہ کچھ بدلتا رہتا ہے۔ ہر لمحہ اس میں جو خون پیدا ہوتا ہے وہ خون ایک سو بیس دن بعد باری باری گل سڑ جاتا ہے یعنی خون کی عمر ایک سو بیس دن یا اس سے کچھ کم ہے اور خون کے خلیوں سے جو جسم بنتا ہے، وہ بھی روزانہ اس حساب سے کچھ نہ کچھ ادھڑ جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے اور دس سال کے عرصہ میں ہڈیوں سمیت پورا بدن تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس معاملہ کو سوچا جائے تو مادی دنیا اور مادی جسم کی حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ بڑی وقتی چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے اگایا تم کو زمین سے ایک قسم کا اگانا، پھر لوٹاتا ہے تمہیں اس میں اور نکالتا ہے، ایک قسم کا نکالنا۔'' گویا یہ زمین میں لوٹانے اور نکالنے والا معاملہ موت تک جاری رہتا ہے اور مرنے پر جسم کی آخری کھیپ کو اس طرح زمین کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ قبر ہو یا کسی اور جگہ ذرہ ذرہ ہو جائے تو اس دنیاوی سوار یا سواری (بدن) کے ساتھ محبت بڑی وقتی قسم کی ہونی چاہیے۔

روحانی جسم

چنانچہ اس موجودہ جسم کے علاوہ ہم اس دنیا میں ایک اور جسم بھی رکھتے ہیں جس کو ہم خوابی یا روحانی جسم کا نام دے چکے ہیں۔ اس جسم کا تعلق اس زمین کے ساتھ عارضی ہے اور اس کا تعلق عالم بالا کے ساتھ ہے وہ چند لمحوں میں زمین کے گرد گھوم کر آسمان کی بلندیوں کی سیر کر کے واپس آ جاتا ہے۔ موت کے وقت یہی روحانی بدن اپنا عارضی تعلق اس دنیا سے ختم کر دیتا ہے اگر مرے ہوئے اپنی آواز کو سنا سکتے تو عزیز و اقارب کو ماتم کرنے سے ضرور منع کرتے۔

مومن کو موت کا تحفہ

حضور پاک ﷺ نے اس دنیا کو قید خانہ کا نام دیا کہ موت کے بعد مومن آزاد ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں صرف شیطان آزاد ہے اور اسلام کسی مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں دیتا تو موت کے بعد مومن اس طرح آزاد ہوتا ہے کہ اس کی طاقتیں ستر گنا بڑھ جاتی ہیں۔ دراصل ستر گنا بھی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی بہت اور بہت زیادہ کے ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے مزید فرمایا کہ موت مومن کو تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

شہادت

شہید کے سلسلہ میں البتہ ہمارے دانشور اور عالم کافی کچھ لکھ چکے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ایک یہ پہلو قوم کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔ اس لیے ہم شہادت کے فلسفہ کو اور زیادہ بیان نہ کریں گے اور اس کے عملی پہلو کو پیچھے کئی دفعہ بیان کر چکے ہیں۔ ہاں، البتہ چند غلط باتوں کی طرف قارئین کی توجہ ضرور دلائیں گے۔ شہید وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ کر شہادت حاصل کرے۔ اپنی بسوں اور لاریوں یا عمارتوں کو آگ لگانے والوں یا فتنہ فساد کرنے والوں میں سے جو مر جائیں انہیں شہید نہیں کہا جا سکتا اور شہادت کے سلسلہ میں کسی کو شہید وطن کہنے یا اپنا آج ہمارے کل پر قربان کرنے والی اصطلاحوں کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ غیروں سے اثر لینے والے ادیبوں سے گزارش ہے کہ وہ خدارا اسلام میں اپنے باطل ادبی گھوڑے نہ دوڑائیں۔ شہادت صرف اللہ اور رسول ﷺ کی راہ میں ملتی ہے بشرطیکہ اس میں عشق صادق، اخلاص مندی اور حسن نیت موجود ہوں۔

ہم تمام کتابوں میں یہ پہلو واضح کر چکے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کے تربیت یافتہ رفقاءؓ کے زمانے میں جو فتوحات حاصل ہوئیں وہ اس وجہ سے ہوئیں کہ مسلمانوں نے اس قسم کے فلسفہ حیات کو اپنایا لیکن یہاں پر ایک اور پہلو کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ اہل مغرب اور کئی دوسرے مفکر آج ان سوالات میں الجھے ہوئے ہیں کہ وہ کیا ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی طرح پریشان ہونے کی بجائے یہ چیزیں سمجھیں کہ ''میں کیا ہوں؟'' کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اپنے رب کو۔''

میں کیا ہوں؟

جب ہم عقلی اعتبار سے اپنی ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس پر تصور ٹھہر سکے اور جسے کہا جائے کہ یہ میری ذات ہے۔ باوجود اس کے کہ احساس ذات (Self) ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ بہر حال انسانی ذات کے بغیر عشق و وجدان کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ مشہور مغربی مفکر ڈیکارٹ نے کہا تھا۔ ''چونکہ میں فکر کرتا ہوں اس لیے میں ہوں۔'' لیکن حکیم الامت نے فرمایا۔ ''چونکہ میں عشق کرتا ہوں اس واسطے ہوں۔'' یہ عشق نہ صرف زندگی میں استحکام پیدا کرتا ہے بلکہ موت کے بعد بھی ''زندگی'' کی ضمانت دیتا ہے۔ زمانہ اس کا غلام ہے کیونکہ وہ زمانے سے بالاتر ہے اور روح کا حقیقی جوہر ہے۔ صاحب عشق ''سمانہ سکا دو عالم میں مرد آفاقی'' کے مصداق زمین و آسمان، حشر و نشر حتیٰ کہ جنت اور دوزخ کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے کوئے یار کی طرف گامزن ہے۔ زمانے کے تھپیڑ

اس کے قدموں میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اپنے سینے میں ایک سیلاب لیے پھرتا ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

(اقبالؔ)

اور ہم عملی طور پر واضح کر چکے ہیں کہ شخصیت میں جب تک عشق کا ظہور نہ ہو، انسان اس دنیا میں بھی اور عالم امر میں بھی حیران و سرگرداں رہتا ہے اور اپنی ہستی یا ذات کو نہیں پہچان سکتا۔ جہاں عشق کا ظہور ہو جائے وہاں سب نقاب اٹھ جاتے ہیں۔ حضور پاک ﷺ کے رفقاء نے کس طرح اپنی جانیں قربان کیں اور میدان جنگ میں ان کو کیسا لطف آتا تھا وہ سب کچھ بیان ہو چکا ہے اور آج بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

(اقبالؔ)

غلامان محمد ﷺ

راقم خود ایسا نظارہ دیکھ چکا ہے کہ میرے عظیم ساتھیوں نے تھرتھراتے ہوئے آسمان سے گرجتے ہوئے جہازوں، لہراتی ہوئی زمین پر سے بے پناہ بمباری اور دشمن کی ٹڈی دل فوج کے حملہ پر حملہ کا جواب نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری سے دیا۔ جو کچھ میرے ساتھیوں نے کیا، یہ عشق کے بغیر بالکل ناممکن تھا اور یہ ان کو اس لیے نصیب ہوا کہ وہ حضور پاک ﷺ کی محبت سے لبریز میدانِ جنگ میں اترے تھے اور اپنے عشق کا امتحان دے کر آج لاہور کی ایک گمنام جگہ پر ایک شہید گنج میں دفن ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

لیکن افسوس کہ دنیا کی محبت، عالم اسلام پر ایک جنون کی طرح سوار ہے اور مسلمان کی روح کا ذرہ ذرہ دنیاوی مفادات میں گھس گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے موت سے ڈرنا شروع کر دیا ہے۔ اصل میں یہ سازش بنوامیہ کے زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔ یزید بن معاویہ کا بیٹا خالد جس کو مروان نے خلیفہ نہ بننے دیا، پہلا مسلمان فلسفی بھی کہا

جا تا ہے۔قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں ایسے گروہ نہ تھے کہ فلاسفر کون ہے اور ادیب کون ہے۔ اسلام میں شرط ہی حضور پاک ﷺ کا عشق اور غلامی تھی۔ تاہم غیروں سے اثر لیتے ہوئے ان فلاسفر قسم کے لوگوں نے مسلمانوں کو زندگی سے محبت کرنا سکھایا اور موت سے نفرت کا درس دیا۔ اس میں حکمران طبقے کا بھی ہاتھ تھا کہ ''وہ فاقہ کش جو موت سے نہیں ڈرتا اس کے اندر سے روح محمدی نکال دی جائے۔'' اس سب کارروائی کا نتیجہ بعد میں سقوط بغداد اور صلیبوں کی یلغار کی صورت میں نکلا کہ ایک ایک منگو لنے چالیس چالیس آدمیوں کو لٹا کر ذبح کر دیا بلکہ حکم دیا کہ اس کے تلوار کے لانے تک وہ لیٹے رہیں اور چالیس میں سے ایک دو نے فرار اختیار کیا (۱) ورنہ سب ڈر سے لیٹے رہے اور بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دیئے گئے۔ ہمیں ان واقعات سے سبق سیکھنا چاہیے کہ اسلام غیرت کی زندگی کا درس دیتا ہے اور بھیڑ بکری کی طرح مرنا غیر اسلامی ہے۔ ہم سانحہ کربلا میں اس سلسلہ میں وضاحت کر چکے ہیں۔

حیات دنیا کی حرص اور موت سے فرار کے اثرات ہر زمانے میں ہم پر پڑتے رہے۔ ہر عقیدہ جو موت سے نفرت کی باعث بنتا ہے وہ غیر فطری بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اسی خیال خام کو اپنے دل سے نکال دیں کہ حیات انسانی کا مقصود صرف یہی چندروزہ زندگی ہے اور اس کا انجام صرف لحد کی تاریکی ہی تاریکی ہے خواہ اس میں قیامت تک سونا ہو یا بعد تک۔ ایک مسافر الی اللہ کی شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ قیامت تک زمین کی تاریکی میں سویا رہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی دنیاوی زندگی کے آخری ایام میں اکثر آہ بھر کر فرمایا کرتے تھے۔ ''سفر دراز ہے اور زادراہ کم'' یہ کون سے طویل سفر کی طرف اشارہ تھا؟ حالانکہ دنیاوی سفر تو آپ ختم کرنے والے تھے بلاشبہ یہ اسی سفر کا ذکر تھا جس پر انسانی قافلہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

وسیع تر مضمون

اسلامی فلسفہ حیات کا مضمون بہت وسیع ہے۔ دراصل ساری بات ہی یہی ہے کہ زندگی کس طرح گزاری جائے، ہم نے اس کا مختصر سا جائزہ پیش کر دیا ہے کہ انسان کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے۔ اس کے لیے صراطِ مستقیم کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔ تفصیل قرآن پاک، احادیث مبارکہ اور حضور پاک ﷺ کے رفقاء کے عملوں میں موجود ہے اور یہ ایک خلاصہ ہے۔

❖❖❖

۱۔ ''جلال مصطفیٰ'' صفحہ ۱۲ سے بھی استفادہ کریں۔

دسواں باب

اسلام کا فلسفہ دفاع

تمہید

پچھلے ابواب میں اس پہلو کو اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر قوم اور ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی سیاسی فلسفہ کے تحت ایک ملک یا قوم بن کر اپنے مقاصد پورے کریں اور ہر قوم کا فلسفہ دفاع اس فلسفہ کے تابع ہوتا ہے اور تمام ملکی اور قومی مقاصد کا دفاع ہر ملک پر فرض ہوتا ہے۔ سب قومیں آج اس پر سختی سے عمل کرتی ہیں۔ لیکن دین فطرت نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایک اجتماعی سیاسی نظام کو اپنایا، جس کو حضور پاک ﷺ نے جہادِ اکبر کے نام سے موسوم کیا کہ مومن ہر وقت یا تو جہاد اصغر یعنی جنگ وغیرہ میں مصروف رہتا ہے، یا جہاد اکبر یعنی جنگ کی یاری میں مصروف رہتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو کم از کم یہ سوچتا رہتا ہے کہ وہ ان فرائض کو کیسے پورا کرے۔

اسی وجہ سے ہم نے اپنے سیاسی فلسفہ کو نظام مصطفیٰ ﷺ یا نظام جہاد کا نام دیا ہے اور اپنے دفاعی فلسفہ کو جہاد بالسیف کے نام سے موسوم کیا۔ جنگ جس کو اہل اسلام حرب کہتے ہیں، اسی دفاعی فلسفہ کی حکمت عملی کے تحت لڑی جاتی ہے اور اس لڑائی کو اسلام میں قتال کا نام دیا گیا ہے۔ ان الفاظ کی اس طرح کی الگ الگ وضاحت بہت ضروری ہے کہ آج کل کی جنگیں یا اس سلسلہ کے باقی شعبے اتنی وسعت اختیار کر چکے ہیں کہ الفاظ کا محدود استعمال ضروری ہے اور اسی وجہ سے اہل مغرب نے سٹریٹجی (حکمت عملی) اور ٹیکٹیکس (تدبیرات) کو بڑی وضاحتوں کے ساتھ الگ الگ شعبوں میں بانٹ دیا ہے لیکن ہم اردو زبان میں، مغربی اصطلاحات کے اپنے مرضی کے معانی کر کے بعض دفعہ تمام معاملات کی ایک کھچڑی پکا دیتے ہیں۔

ان تمام کتابوں میں اس پہلو کا بڑا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر اصطلاح ہر جگہ ایک ہی قسم کے معانی میں استعمال ہو، اور چونکہ یہ اس سلسلہ کا آخری باب ہے، یہاں پر تمام تر فوجی اور جنگی اصطلاحات اپنے اصلی معانی کا خوب تر اظہار کرتی ہیں۔

ایک غلط فہمی

جہاد کا لفظ تو ہم سب نے بچپن میں سن رکھا تھا لیکن ہم اس خیال کے حامی رہے اور کئی لوگ اب تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جہاد صرف ایک جذبہ کا اظہار ہے اور اسلام نے اپنا کوئی الگ فلسفہ دفاع نہیں دیا۔ اس سلسلہ میں پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ہماری موجودہ کتابیں[1] یا دانشوروں کی تمام تر کوششیں کسی الگ فلسفہ دفاع کی نشان دہی آج تک نہیں کر سکیں۔ سوائے چند ایک اصولوں کے کہ اسلام کلی جنگ کا دعوے دار ہے اور ہر مسلمان اللہ کا سپاہی ہے وغیرہ۔

اس طرح کے کچھ مضامین، اخباروں میں آئے، یا کسی ایک آدھ کتاب میں خاص کر بریگیڈیئر گلزار احمد کی جہاد پر کتاب میں کچھ ایسے اصولوں کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

بہرحال ان سب مضامین اور کتابوں کے مطالعہ کے بعد اور اپنی ان کتابوں کی کہانی کی عملی تحقیق کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلام کا اپنا ایک دفاع کا فلسفہ موجود ہے جسے ہم جہاد بالسیف کہہ رہے ہیں اور اسی چیز کو اس باب میں مختصر طور پر بیان کریں گے۔

تحقیق

ایک فوجی ذہن قرآن حکیم میں غوطہ زن ہونے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلام کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی فوج تیار کرنا ہے، جو باطل قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے اور پھر انہیں پاش پاش کر دے۔ اگر اہل اسلام اس فرض سے پہلوتہی کرتے ہیں اور اپنی بے عملی پر مطمئن ہیں تو وہ اس بات میں بڑی خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ حضور پاک ﷺ کی حیات طیبہ[2] سے بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مومن خدا کا سپاہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کے لیے اس دنیا میں وارد ہوا ہے۔ مکی دور میں کچھ اس قسم کے الفاظ حضور پاک ﷺ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ یعنی قریش میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے مقصد سے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ اللہ کی بات پوری ہوگی یا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں اپنی جان دے دوں گا۔ آگے چل کر دس سالہ مدنی زندگی میں حضور پاک ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک فوجی مستقر قائم فرمایا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی فوج تیاری فرمائی اور ایک سو مہمات کا اہتمام فرمایا۔ بڑی جنگوں اور کچھ مہمات میں آپ نے بنفس نفیس فوج کے ساتھ شامل ہو کر عسکری زندگی پر احسان فرمایا اور جہاد بالسیف کو افضل ترین عبارت قرار دیا۔

۱۔ اسلام کے پہلے سو سالوں میں البتہ فن جنگ پر الگ کتابیں تھیں۔ (جلال مصطفیٰ، صفحہ ۲۹۸۔۲۹۹)

۲۔ جلال مصطفیٰ، خاص کر صفحہ ۲۵ سے استفادہ کریں۔

حضور پاک ﷺ کی مدنی زندگی میں عسکری پہلو سب سے غالب نظر آتا ہے مگر بدقسمتی سے آج یہی وہ پہلو ہے، جسے اہل اسلام کی عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ خاص طور پر گزشتہ دو تین صدیوں میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت حضور پاک ﷺ کی مجاہدانہ زندگی پر پردے ڈالنے کی کوشش کی گئی جس سے جہاد بالسیف ایک غیر اہم فریضہ معلوم ہونے لگا۔ دور کیوں جاتے ہیں، ہمارے ملک میں ہر سال عید میلاد النبی ﷺ منائی جاتی ہے، ریڈیو یا ٹی وی پر حضور پاک ﷺ کی عسکری زندگی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا جاتا۔

بہرحال مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے باطل پرست قوتیں ہمیشہ لرزہ براندام رہی ہیں اور اسی جذبہ کو سرد یا مفلوج کرنے کے لیے ہمارے دشمنوں کو طویل مدت تک پاپڑ بیلنے پڑے ہیں، بالآخر انہیں کامیابی ہوئی۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اہل اسلام آج بھیڑ بکریوں کے ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی وغیرہ اپنی جگہ پر ایک اعتبار سے ابھی تک قائم ہیں مگر جس مقصد یعنی جہاد کے لیے یہ تربیت شروع کی گئی تھی وہ نگاہوں سے سراسر اوجھل ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کے تن آسان مسلمان نے جنت حاصل کرنے کے لیے آسان راستے تلاش کر لیے ہیں۔ ہتھیار جو مسلمانوں کا زیور سمجھا جاتا تھا، اس سے ہم یوں بیگانہ ہوئے ہیں کہ اب ہم اس سے وحشت کھانے لگے ہیں اور ہماری قوم فن سپہ گری سے کلی طور پر نابلد ہو کر رہ گئی ہے۔

فن سپہ گری

جنگ یا جہاد کی متحمل صرف وہ قوم ہو سکتی ہے جو فن سپہ گری سے واقف ہو اور اس کے مرد و زن سپہ گری کے ہر داؤ پیچ میں پوری طرح تربیت یافتہ ہوں، قومی زندگی کا یہ ایک رہنما اصول ہے اور جو لوگ اس حقیقت ابدی سے لاپرواہی برتتے ہیں ان کی قسمت میں ذلت و خواری لکھ دی جاتی ہے۔ ہماری قرون اولیٰ کی تاریخ سے یہ راز کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ غازیانہ جھپٹ پلٹ ہی سے قومیں بنتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے والی قوم کو تو لامحالہ، یہ راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مکہ مکرمہ سے کسمپرسی کی حالت میں ہجرت کے بعد اہل اسلام نے جو تنظیم قائم کی، اس میں عسکری رنگ غالب تھا۔ ہم ''جلال مصطفیٰ'' میں اور کتابوں کے اس سلسلہ میں واضح کر چکے ہیں کہ جنگ خندق تک ایمان والوں پر آزمائشوں اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے مگر وہ ہر آزمائش میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور صحیح فلسفہ دفاع اپنانے سے کامیاب ہوئے۔ جنگ خندق کے بعد اسلام کی فوجیں چہار طرف بڑھیں اور حضور پاک ﷺ کی وفات کے وقت وہ ایک سپرنگ بورڈ پر کھڑی پر تول رہی تھیں کہ حکم ملے تو وہ ساری دنیا پر چھا جائیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے ''جلال مصطفیٰ''، صفحہ ۲۵ سے استفادہ کریں)

اسلامی فتوحات

اب ان چار کتابوں میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ چند سالوں میں یہ اسلامی افواج وسط ایشیا سے بحر اوقیانوس تک پہنچ گئیں۔ ادھر مشرق میں موجودہ پاکستان کے علاقہ وزیرستان اور مکران تک اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو رہا ہے تو شمال میں مسلمان قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچ چکے تھے بلکہ یورپ میں کریٹ اور سسلی کے جزیروں پر بھی یلغار کر رہے تھے۔ اس کے اگلے ساٹھ سالوں میں وہ سندھ اور ملتان تک پہنچ چکے تھے اور مغرب میں ملک سپین میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو رہا تھا۔

اس تمام عرصے میں اسلامی فوج کو کسی ایک مقام پر بھی پسپائی کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکا۔ تو ظاہر ہے کہ جنگ خندق سے پہلے مدینہ منورہ میں جو عسکری بنیادیں استوار ہوئیں۔ انہوں نے کئی پشتوں تک اپنی تلوار کا سکہ منوایا۔ بلاشبہ حضور پاک ﷺ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا فوجی نظام چھوڑ گئے جس کی بدولت بے سروسامانی کے باوجود، مسلمانوں نے اس زمانے کی دو عظیم سلطنتوں* کے ساتھ ٹکر لی اور یہی کچھ ہم ان کتابوں کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ دو محاذ کھول دیئے اور ایسی حکمت عملی اپنائی کہ بھرپور کارروائی ایک وقت میں ایک ہی محاذ پر ہوتی۔ لیکن دونوں محاذ ایکٹو یعنی باعمل ہوتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بڑی بڑی فوجی طاقتیں ہمیشہ سے دو محاذوں پر جنگ لڑنے کے نام سے گھبراتی رہیں، لیکن مسلمانوں نے دو محاذوں پر جنگ کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور ان کے حربی کارناموں کو آج بھی کسی فوجی پیمانے سے ناپنا مشکل نظر آتا ہے۔ اور ہم صرف یہ کہیں گے کہ ان تمام کارروائیوں میں اللہ تعالیٰ کا دست قدرت براہ راست کام کر رہا تھا۔ اس تمہید اور وضاحت کے بعد ہم اسلام کے حربی نظام کی طرف پیش رفت کرتے ہیں۔

اسلام کا حربی نظام (پہلی سطح)

اسلامی فلسفہ حیات اور مومن کے مقاصد زندگی پچھلے ابواب میں بیان کر دیئے گئے ہیں دراصل اسلام کا حربی ڈھانچہ تین سطحوں پر تیار ہوتا ہے۔ پہلی سطح میں ہر مومن مرد پر چونکہ جہاد فرض کر دیا گیا ہے تو یہ فرض اسی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ سب مومن سپاہیانہ زندگی کی تربیت حاصل کریں اور ہر سطح پر حملہ آور دشمن کے مقابلے میں اپنا دفاع کر سکیں۔ چنانچہ قوم کے ہر فرد کو فن سپہ گری سیکھنا ہوگا اور پیدل فوج کے بنیادی ہتھیاروں میں مہارت حاصل کرنا ہوگی تا کہ اپنی سطح پر دفاع کیا جا سکے۔ اور ضرورت کے مطابق ان ہتھیاروں کو استعمال کیا جائے، جن کو آج وہی حیثیت حاصل ہے جو پرانے زمانے میں تلوار، تیر کمان اور نیزے بھالے کو تھی۔ آج رائفل، پستول، سٹین گن یا خودکار ہلکی گن وغیرہ کو وہی حیثیت حاصل ہے۔

۱۔ ''جلال مصطفیٰ'' صفحہ ۲۵ سے استفادہ کریں۔

قرون اولیٰ میں بچوں پر نماز بارہ سال کی عمر میں فرض ہو جاتی ہے اور مسجد کا محراب لفظ ''حرب'' سے ہے جہاں ہتھیار رکھے جاتے ہیں۔ سب مسلمان مسجدوں کے تحت ہتھیاروں کا استعمال سیکھتے تھے۔ پچھلے باب میں پوری قوم مسجدوں کی سطح پر ربط وضبط میں باندھنے کی جو سفارش کی گئی ہے اس میں یہ مقصد بھی تھا کہ پوری قوم کو حربی نظام میں باندھ دیا جائے اور ہماری پہلی ضرورت اٹھارہ کروڑ بندوقیں اور بنیادی ہتھیار ہیں، یعنی گرنیڈ، پستول، ہلکی خودکار گنیں وغیرہ۔

دوسری سطح

دوسری سطح پر اسلام کے حربی نظام کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ غیروں کے فلسفوں میں عوام کو فوج کی امداد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی فلسفہ دفاع کے تحت پیشہ ور فوج کی جڑیں اس عوامی ''بنیان المرصوص'' میں ہوتی ہیں جس کی مدد سے دفاعی ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے کہ حکمت عملی اور تدبیرات کے طور پر اس بنیان المرصوص کی کیا ذمہ داریاں ہوں گی اور پیشہ ور فوج کی کیا کیا ذمہ داریاں ہوں گی۔

اس کی مزید وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ پہلی سطح پر مجاہدین تیار کرنے کے بعد انہیں نظم وضبط میں پرو دیا جاتا ہے، تاکہ اس نظام کے ذریعے ایک سیسہ پلائی دیوار پیدا کر دی جائے۔ اس بنیان المرصوص کے عملی پہلو کو ہم اپنی کتابوں میں اکثر جگہوں پر واضح کر چکے ہیں خاص کر پہلی کتاب میں جنگ سلاسل میں اور دوسری میں جنگ یرموک کے بیان کے وقت۔

قرون اولیٰ میں یہ ڈھانچہ مسجد کی بنیاد پر کھڑا کیا جاتا تھا، جس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے ذریعے مجاہدین کو دینی اور اخلاقی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ہم پہلی کتاب میں یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کے احکام کے تحت خلفائے راشدین کے دور میں کس طرح دس دس کی ٹولیاں بنائی جاتی تھیں، اس سلسلہ کو پورے ملک پر پھیلا دیا جاتا تھا اور ایسے مجاہدین پیشہ ور یا باقاعدہ فوج میں شمولیت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ علاوہ ازیں پہلی سطح پر جو مجاہدین تیار ہوتے ہیں ان کو دوسری سطح پر رابطوں میں باندھنے کے بعد علاقائی دفاع کی ذمہ داری بھی سونپی جاتی ہے۔

تیسری سطح

اسلام کے حربی نظام کی تیسری سطح پیشہ وارانہ افواج کا قیام یا ضرورت ہے جس کے سپاہی فنی اعتبار سے اپنے معراج کو پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جدید ہتھیاروں سے لیس ہوتے ہیں اور ساتھ ہی تیز رفتار حرکت کے اہل ہوتے

ہیں۔ دشمن کے علاقے میں میدان کارزار کو یہی لوگ گرم کرتے ہیں لیکن اس فوج کی ثابت قدمی کا انحصار پہلی اور دوسری سطحوں کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ خندق کے بعد اسلامی فوجوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدم نہیں رکے، خاص کر حضرت عمرؓ کے زمانے میں۔ ہم اس تفصیل میں جا چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے چھوٹے عاملوں کو خط لکھتے تھے تو امدادی طور پر فن سپہ گری سے واقف لوگ آگے پہنچ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مسجدوں نے ایک ایسا نظم وضبط پیدا کر دیا تھا کہ محاذِ جنگ کے عقب میں پورا علاقہ ایک سیسہ پلائی دیوار بن جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ایران اور روم جیسی مانی ہوئی طاقتوں کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ کسی طرف سے نکل کر ہمارے لشکروں کے عقب پر حملہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسلامی علاقوں پر حملہ کرنا چٹانوں کے ساتھ ٹکرانے کے مترادف ہے۔ پیشہ ور افواج کے سلسلہ میں البتہ یہ ضروری ہوگا کہ ہم زیادہ بھروسہ ان چیزوں پر کریں جو اپنے ملک میں آسانی کے ساتھ میسر ہو سکیں۔ مجاہدین اور ان کے جذبہ کے علاوہ وہ سامان جو ہم خود بناتے ہیں یا ملک میں موجود ہے وہی ہمارے دفاع کا محور ہو اور جو کچھ باہر سے مل جائے اس کو انعام خداوندی سمجھ کر نہایت کفایت شعاری کے ساتھ استعمال کریں۔ اس کے لیے اپنی حکمت عملیوں، تدبیرات اور مختلف سطحوں پر دفاعی تنظیموں یا لڑاکا طور طریقوں میں بھی مناسب تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ بہر حال پہلے اس سے کہ ہم اسلامی فلسفہ دفاع اور قرآن پاک کے حربی نظام کے اصولوں کو زیر بحث لائیں، یہ ضروری ہوگا کہ اس وقت دنیا میں رائج باقی دفاعی فلسفوں پر بھی تھوڑا سا تبصرہ ہو جائے تاکہ کچھ موازنہ ہو سکے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آیا ان لوگوں سے ہم کچھ سیکھ سکتے بھی ہیں یا نہیں۔

غیروں کے دفاعی سلسلے

اس وقت دنیا میں دفاع کے دو بڑے فلسفے رائج ہیں، ایک مغربی دنیا کا فلسفہ ہے اور دوسرا سوشلسٹ ممالک کا۔ مغربی دنیا میں پیشہ ور فوج رکھنا حکومت کا کام ہے اور دفاع کا سارا بندوبست سرکاری تنخواہ دار لوگ کریں گے۔ اور لوگ صرف واہ واہ کریں گے یا فوج کو سامان ضرورت وغیرہ مہیا کریں گے۔ یہ طریقہ بالکل اسی طرح ہے جس کا ذکر ہم ''جلال مصطفیٰ''* میں جنگ بدر کے تحت کر چکے ہیں کہ جناب مقدادؓ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی مثال دی کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ لڑائی آپ اور آپ کا خدا کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حاکم ہیں اور تنخواہ دار فوج تیار کریں اور اس کی مدد سے لڑائی لڑیں، وغیرہ۔ یہ طریقہ غیر اسلامی ہے۔ ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے اور اسلام کے لحاظ سے پوری قوم لڑتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا موجودہ فلسفہ دفاع بھی کافی حد تک اہل مغرب کی نقالی ہے اور ہمارے علماء بھی اس سلسلہ میں قوم کو نشانِ راہ نہیں بتا سکتے۔

* ''جلال مصطفیٰ''، صفحہ ۴۸ اور ۴۹ سے استفادہ کریں۔

دوسری قسم کا فلسفہ دفاع سوشلسٹ ممالک میں رائج ہے جو اسلام کی بھونڈی نقل بھی ہے۔ اور کچھ لوگوں کی فوج میں شمولیت کو عوامی فوج کا نام دے دیا ہے۔ یعنی پورے عوام لڑ رہے ہیں۔ خیر ان ممالک میں مقابلتاً کافی لوگ فوج میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کی بھونڈی نقل کا لفظ استعمال اس لیے کیا گیا ہے کہ جس طرح اسلام کلی جنگ پر یقین رکھتا ہے یہ لوگ بھی لفظی طور پر یا اصول کے طور پر کلی جنگ کا پرچار کرتے ہیں اور اپنا آج قوم کے کل پر قربان کرتے ہیں۔ یہ نعرہ غیر اسلامی ہے کہ اسلام میں لڑائی اللہ اور رسول ﷺ کے لڑی جاتی ہے۔ بہر حال طریق کار میں بھی کافی فرق ہے کہ صرف چند لوگوں کو فوج میں رکھا جاتا ہے اور پوری قوم کی جنگ میں شرکت اس طرح نہیں جس طرح اسلام میں ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے، وہاں سب کچھ سیاسی کمشنروں کے ہاتھ ہوتا ہے۔

موازنہ

تو ظاہر ہوا کہ غیروں کے فلسفہ دفاع اور اسلامی فلسفہ دفاع کے طریق کار میں کافی فرق ہے۔ لیکن اصل فرق مقاصد کا ہے۔ غیروں میں جنگ، اقتصادی مقاصد، ملک فتح کرنے، خاندانی دشمنی اور نظریہ ضرورت کے تحت لڑی جاتی ہے۔ اسلام کے فلسفہ حیات کے لحاظ سے جنگ اللہ اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے لڑی جاتی ہے۔ اپنی غیرت اور عقیدہ کی حفاظت کے لیے میدان میں نکلتے ہیں اور ملک فتح نہیں کئے جاتے، بلکہ لوگوں کے دلوں کو فتح کیا جاتا ہے۔

ہماری موجودہ دفاعی پالیسی

اس کتاب میں ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ دفاع کے سلسلہ میں آج تک ہمارے ملک میں کیا کیا محنتیں ہوئیں۔ بے شک ہر لحاظ سے شہری لوگوں کو دفاع میں شریک کرنے اور ملک میں فوجی سامان کے سلسلہ میں بھرپور کوششیں جاری ہیں، باہر کے ملکوں سے سامان بھی حاصل کیا جا رہا ہے وغیرہ۔ ہم البتہ دفاع کے اسلامی پہلوؤں کی مزید وضاحت کر کے چند حقیقتیں بیان کر رہے ہیں اور ساتھ ہی کچھ سفارشات بھی دے رہے ہیں کہ ہماری موجودہ دفاعی پالیسی کو مکمل طور پر اسلامی فلسفہ دفاع کی شکل وصورت دے دی جائے۔

جنگ کے مقاصد

اسلامی فلسفہ دفاع کے تحت سب سے پہلی چیز جنگی مقاصد ہیں۔ دفاع کے معاملات کو نہ مدافعانہ کہہ سکتے ہیں اور نہ مصالحانہ۔ آج کل کے زمانے میں دفاع کا لفظ البتہ مصلحت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور غیروں کے ملک پر قبضہ بھی اپنے دفاع کے تحت کر لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک اور اسلام کے لحاظ سے جنگ کے مقاصد البتہ تمہید میں واضح کر دیئے گئے ہیں اور اصولوں کی وضاحت آگے آئے گی۔

پورا ملک ایک قلعہ

اسلام کے لحاظ سے پورے ملک کو ایک دفاعی قلعہ کی طرح ہونا چاہیے تا کہ اس کے عوام بنیان المرصوص کے طور پر اس قلعہ کا دفاع کریں۔ حضور پاک ﷺ نے مدینہ شریف میں یہی طریقہ رائج کیا۔ جنگ بدر کے بعد ہزار کوشش کے باوجود ابوسفیان اس قلعہ کے اندر جھانک بھی نہ سکا۔

بیسویں صدی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کے مدینہ منورہ کے آخری گورنر جناب فخری پاشا[1] نے یہی طریقہ اپنایا اور جنگ عظیم کے ختم ہونے کے دو سال بعد تک شریف حسین اور اس کے انگریز حواری مدینہ شریف میں نہ جھانک سکے۔ پوری کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک ایک مجاہد نے اپنی ذمہ داری کیسے نبھائی کہ تمام مجاہدین کے دل جڑے ہوئے تھے۔

یہ ہے اسلامی فلسفہ دفاع کی بنیادی بات کہ پوری قوم کو حربی سکھلائی دے کر ربط وضبط کے ساتھ اس طرح باندھ دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی فوج بن جاتی ہے کہ روحانی طور پر دل بھی جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کو اسی طرح سے اسلام کا ایک مستقر بنانا ہوگا، کہ کوئی دشمن اس کے اندر جھانک بھی نہ سکے۔ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مغرب کا فوجی ڈھانچہ ایک فرسودہ نظام عسکریت ہے جو غلام ملکوں اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے ملکوں میں اپنی چمک دمک کے بدولت کچھ عرصہ رائج رہ سکتا ہے مگر عوامی جذبہ کے حامل اور بیدار قوموں میں اس قسم کے فوجی ڈھانچوں میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ یہ دور بلاشبہ ایک عوامی دور ہے اور تیسری جنگ عظیم[2] میں وہی قومیں زندہ رہیں گی جن میں ربط وضبط ہوگا اور وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہوں گی۔

اعجاز قرآن

مسلمانوں نے یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا؟ اس کی ہدایات قرآن پاک میں ہیں اور حضور پاک ﷺ نے اپنی سنت سے ان ہدایات کی پیروی کی۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو حضور پاک ﷺ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس حکمت عملی کو آگے بڑھایا، لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں واضح طور پر فرمایا۔ ''کیا گمان کیا تو نے، یہ کہ داخل ہوگے بہشت میں، حالانکہ ابھی نہ ظاہر کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کہ جہاد کرتے ہیں تم میں سے اور ابھی نہ ظاہر کیا کہ صبر کرانے والوں کو۔''

اس آیت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنت صرف جہاد کے راستہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے

۱۔ ''جلال مصطفیٰ'' صفحہ ۱۴، ۳۷۵ اور ۳۷۶ سے استفادہ کریں۔

۲۔ فلسفہ جنگ کلاسوز کی تیسری جلد (اردو) سے استفادہ کریں۔

فرمایا کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔ حضور پاک ﷺ اور آپ کے صحابہ کبار اللہ کے سپاہی بن کر اس دنیا میں تشریف لائے اور حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد اگر کوئی کتاب لکھی گئی یا لوگوں کو پڑھائی گئی تو وہ ''علم مغازی''* یعنی جنگ کے علم پر تھی۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جب تک مسلمان ''علم مغازی'' کو اولیت اور فوقیت دیتے رہے اور اس علم کے ماہر رہے تو وہ دنیا پر غالب رہے۔ جب علم مغازی کو ثانوی یا ذیلی حیثیت دیے دی گئی اور دیگر علوم کو آگے بڑھایا گیا تو مسلمانوں کو ذلت وخواری دیکھنا پڑ گئی۔ اب کئی صدیوں سے علم مغازی، اسلامی درس گاہوں سے مفقود ہو چکا ہے اور لوگ ''سویلین'' بن گئے ہیں کہ حکومت کرنا ''سویلین'' کا حق ہے کہ حضور پاک ﷺ اور صحابہ کرام سویلین تھے؟ نعوذ باللہ۔ قرآن پاک تو واضح اعلان کر رہا ہے۔

''بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں مومنوں سے جانیں ان کی، اور مال ان کے جنت کے بدلے، وہ لڑائی کرتے ہیں اللہ کی راہ میں پس مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔''

بدقسمتی سے ایک سازش کے تحت جنگ کو اس طرح بھیانک بتایا جا رہا ہے کہ ہمارے لوگ جنگ کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں اور اہل یورپ خود ہر وقت جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ تب ہی علامہ اقبال چیخ اٹھے۔

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

قرآن پاک کا حربی نظام

قرآن پاک ہمیں ایک عسکری یا حربی نظام عطا کرتا ہے جو موجودہ زمانے کے لیے بھی ہر لحاظ سے موزوں ہیں۔ اول تو ہم واضح کر چکے ہیں کہ مسلمان جنگیں کسی نظریہ ضرورت کے تحت یا ذاتی مفادات کے لیے نہیں لڑتے بلکہ اپنے عقیدہ اور ایمان کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے نفاذ یعنی حق کے لیے لڑتے ہیں۔ اور اسلام میں جنگ کا مقصد مخلوق خداوندی کو طاغوتی طاقتوں سے آزاد کرانا ہوتا ہے اور دنیا سے فتنہ وفساد کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی جنگ انسانوں پر رحمت خداوندی بن کر نازل ہوئی اور جہاں جہاں قرون اولیٰ میں مسلمان گئے وہاں اسلام آج بھی قائم ودائم ہے۔ ہم دوسری کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ حمص ایک دفعہ مسلمانوں کو وقتی طور پر چھوڑنا پڑا۔ لیکن جب وہاں مسلمان دوسری دفعہ پہنچے تو لوگوں نے مسلمانوں کی آمد کو رحمت خداوندی سمجھا۔

* ''جلال مصطفیٰ'' صفحہ ۲۹۸ سے استفادہ کریں۔

دوم اسلام کچھ ٹھوس قسم کی حربی بنیادیں بھی قائم کرتا ہے جن کے مطابق تیار ہونے والی اللہ کی فوج، ایک دو دھاری تلوار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے ٹکر لینے والی ہر چیز ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ سلطنت روم اور سلطنت ایران کا یہی حشر ہوا۔ مومن دنیاوی سازوسامان سے زیادہ اللہ پر یقین کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور یہ ایمان اس میں خیبر شکن قوتیں پیدا کر دیتا ہے۔ بے شک سازوسامان کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے لیکن اسلام کے لحاظ سے فیصلہ کن حیثیت اس سپاہی کو دی گئی ہے جو ہتھیار کو استعمال کرتا ہے۔ بہر حال کلاسوٹز اور ماؤزے تنگ جیسے آدمی بھی انسان کو اولین حیثیت دیتے ہیں اور ہمارا تو ایمان ہے۔

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

(اقبالؔ)

قرآن پاک نے مسلمانوں کو حزب اللہ کا پیارا نام دیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہم اللہ کی فوج یا اللہ کے سپاہی کر رہے ہیں۔ کتاب اللہ کی چیدہ چیدہ آیات میں جنگ کی بنیادی قدریں بیان کی گئی ہیں کہ مومن پر جہاد فرض ہے۔ اب اس فرض کو تب ہی پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہر مسلمان حرب وضرب کے تقاضوں سے آگاہ ہو۔ زبانی جہاد کرنے والوں، قلمی جہاد کرنے والوں اور تالی بجانے والوں کا اللہ تعالیٰ یہ عذر کبھی قبول نہ کرے گا کہ وہ لڑائی کے طور طریقوں سے ناواقف تھے یا ہتھیار وغیرہ چلانا نہ جانتے تھے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

''کہا جاتا ہے ان کو آؤ جنگ کرو اللہ کی راہ میں یا دفاع کرو، کہا انہوں نے کہ اگر ہم جنگ کرنا جانتے تو تمہارے ساتھ ضرور آتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے بہت قریب تھے۔''

کوئی عذر قبول نہیں

ایسا عذر پیش کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ''منافقین'' کے نام سے یاد کیا ہے اور انہیں دردناک عذاب سے ڈرایا ہے۔ اب ہمارے ملک میں کئی صاحبان اسلام کے مایہ ناز فرزند بنے پھرتے ہیں۔ اور جہاد یا جنگ میں شمولیت تو دور کی بات ہے وہ جنگ کے تقاضوں سے بھی واقف ہونے کو تیار نہیں اور جنگ کی بات نہ کریں گے تو ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو یوں فرمایا۔

''تو ان کے لیے بخشش مانگے یا ان کے لیے بخشش نہ مانگے، اور اگر تو ان کے لیے بخشش مانگے ستر مرتبہ، نہیں، ہرگز اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔''

لہٰذا اسلام ایک ایسے نظام عسکریت کا دعوے دار ہے۔ جس کے مطابق ہر مومن اللہ کا سپاہی ہونے کا فرض بخیر د

خوبی پورا کر سکے اور اسے یہ عذر نہ پیش کرنا پڑے کہ وہ ہتھیار چلانا نہیں جانتا۔

جو لوگ مومنوں کی جماعت یعنی اللہ کی فوج میں شامل ہوتے ہیں وہ اس فرض سے بھی آگاہ ہوتے ہیں کہ انہیں فی سبیل اللہ لڑنا پڑے گا اس لیے وہ لڑائی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن جو لوگ حرب وضرب کے فن سے بھی بیگانہ ہیں، ان کے متعلق قرآن پاک میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور اگر ارادہ کرتے نکلنے کا، البتہ تیار کرتے واسطے اس کے سامان، لیکن ناخوش رکھا اللہ نے اٹھنا ان کا، پس کاہلی سے بند کیا اور کہا گیا بیٹھ رہو، بیٹھنے والوں کے ساتھ۔''

جہاد سے گریز کرنے والوں یا بہانہ تراشنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے تو اس کو سن کر انسان کانپ اٹھتا ہے۔ کیا ہم مسلمان ہیں کہ جہاد سے اس طرح گریز کرر ہے ہیں؟ کوئی دنیاوی فوج اس لیے کھڑی کی جاتی ہے کہ اس کے سپاہی ضرورت پڑنے پر جنگ لڑیں، اپنی جانیں قربان کریں، کوئی سپاہی اگر جنگ سے گریز کرتا ہے تو اس کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ اب ہم اللہ کی فوج ہیں اور جنگ کی تیاری کے لیے فن حرب سے ہی بیگانہ رہیں، تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟

صف بندی اور بنیان المرصوص

ہر مومن پر لڑائی کی تیاری فرض ہے لیکن کچھ اور اجتماعی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

''بے شک اللہ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں صف باندھے جیسے وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔''

اب اس حکم یا بیان پر دھیان دیں۔ اینٹوں کے ڈھیر کو تو دیوار نہیں کہہ سکتے۔ وہ دیوار کی صورت اس وقت اختیار کرے گی جب اینٹوں کو کسی ترتیب کے ساتھ کسی مسالے کے ذریعے سے جوڑ دیں اور اس ترتیب اور رابطہ کے بعد ہی ان اینٹوں میں یگانگت و یکجہتی کا ظہور ہوتا ہے مگر جو کیفیت سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں پیدا ہوتی ہے وہ اینٹوں کی عام دیوار میں نہیں ہو سکتی۔ ایرانی فوجیں اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھ کر لڑتی تھیں۔ جنگ کاظمہ کا دوسرا نام جنگ سلاسل بھی ہے۔ جنگ یرموک میں رومیوں کے ایک دستہ نے بھی اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھا ہوا تھا لیکن دونوں جگہوں پر مسلمانوں کی سیسہ پلائی دیوار کے سامنے ان کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔

ہماری قوم کو اس فلسفہ کے سمجھنے کی از حد ضرورت ہے کہ پوری قوم صرف فوجی رابطوں اور ضابطوں سے ہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکتی ہے۔ یہ ذکر پوری قوم کے لیے ہے کہ پوری قوم کو کم از کم یہ حالت اختیار کرنا ہوگی۔ لیکن سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانے کے بعد مومنوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو للکار سکیں۔

قوت کا استعمال

اب قرآن پاک کی روشنی میں ہم پیشہ ور فوج کی طرف مڑتے ہیں۔اس سے پہلے ہم اپنی کتابوں میں پیشہ ورانہ افواج کا ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چھاؤنیاں بنانے کا حکم دیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں کوفہ، بصرہ، جابیہ، فسطاط اور قیروان وغیرہ کی چھاؤنیاں بنانے کا حکم دیا گیا۔ یہ تو بڑی چھاؤنیاں تھیں۔ان کے علاوہ لاتعداد چھوٹی چھوٹی فوجی چھاؤنیاں اور سرحدی چوکیاں تھیں۔فوج کی تنخواہ کا بندوبست کیا گیا۔وظائف مقرر کیے گئے۔پنشن کا بندوبست کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس سلسلہ میں واضح احکام موجود تھے۔

''تیاری کرو ان کے لیے جس طرح تمام استطاعت رکھتے ہو قوت سے اور فوجی چھاؤنیوں سے، ڈراؤ ان سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو۔''

یعنی قرآن پاک کے مطابق فوجی تیاری حسب استطاعت اتنی مکمل ہو کہ اس کی وجہ سے دشمنوں پر رعب بیٹھ جائے اور وہ خوف کھانے لگیں۔

لیکن برا ہو دو سو سال کی غلامی کا کہ ہمارے دانشوران باتوں کو نہیں سمجھتے اور ہمیں امن پسندی کی میٹھی لوری دے رہے ہیں۔

فوجی تیاری دنیا میں آج بھی جنگ کا ایک بنیادی اصول مانا جاتا ہے اور اس سے گریز کرنے والے لڑائی سے بہت پہلے ہی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہمارے سب فوجی جانتے ہیں کہ لڑائی کا مقصد صرف دشمن کی فوج کو تباہ کرنا یا شکست دینا ہی نہیں ہے بلکہ دشمن کے عزم اور قوت مدافعت کو بھی توڑا جاتا ہے اور حضور پاک ﷺ سے یہ سبق سیکھ کر حضور پاک ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام نے بھی یہی کچھ کیا تو تب ہی دنیا پر چھا گئے۔

وہ قوم جو لڑائی کے لیے تیاری نہیں کرتی اس کا عزم مدافعت پہلے سے ہی مفقود ہو چکا ہوتا ہے۔لہٰذا اسے زیر کرنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔تاریخ انسانی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔جن میں اس اصول پر کاربند قوموں نے صحیح فوجی تیاریوں کے بل بوتے پر اپنے حریفوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

آیئے اس کی مثال ہم جرمنی سے لیں۔پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد، اتحادیوں کے کنٹرول کے باوجود انہوں نے کس طرح جنگ کی تیاری کی پھر ان کے حملہ کرنے پر کسی نے ان کے سامنے چوں بھی نہ کی۔جنگ عظیم دوم سے پہلے ہی انہوں نے فرانس کے مقبوضہ علاقہ سار پر قبضہ کیا۔پھر آسٹریا پر اور آخر میں چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے فرانس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور سارے یورپ پر چھا گئے۔ہاں، روس کیسے بچ گیا اور آخر میں جرمنی شکست کیوں کھا گیا۔ہم اس بحث میں نہ پڑیں گے لیکن لڑنے والے کبھی نہیں مرتے۔جرمن قوم آج بھی

زندہ ہے۔

لیکن ہم مسلمانوں نے کسی سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ ہمارے پاس اپنی مثالیں موجود ہیں۔ یہ دنیاوی مثال صرف موازنہ کے طور پر لکھ دی گئی ہے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ اگر اپنے آٹھ کروڑ عوام کو اللہ کی فوج بنا دیں اور موجودہ پیشہ ور فوج بھی ہمارے پاس ہو تو کیا دنیا کی کوئی طاقت ہماری طرف دیکھنے کی بھی ہمت کر سکے گی، بلکہ ہماری یہ قوت عالم اسلام میں ایسی قوت پیدا کر دے گی جس کو کوئی قلم بیان نہیں کر سکتا۔

حربی نظام کا خلاصہ

ہم نے قرآن پاک کے اس حربی نظام کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ گو یہ بڑا وسیع مضمون ہے اور اس نظام کو جاری کرنے کے لیے تین سطحوں کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے۔ اب اسلامی طرز جنگ کی حکمت عملی اور تدبیرات پر سرسری تبصرہ سے پہلے قرآن پاک اور سنت کی مدد سے جنگ کے کچھ اصولوں کی نشان دہی کر لی جائے، تو پھر حکمت عملی اور تدبیرات کا بیان آسان ہو جائے گا کہ ان اصولوں میں حکمت عملی اور تدبیرات کی طرف بھی سرسری اشارے موجود ہیں۔

قرآن پاک کے لحاظ سے جنگ کے اصول

ا۔ اصول استقامت فی المقصد

اسلام کے لحاظ سے جنگ کے مقاصد بیان کر دیئے گئے ہیں، وہ بہت بڑے مقاصد ہیں جنہیں ہمیشہ ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ کچھ فوری مقاصد بھی ہوتے ہیں جو ان بڑے مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ فوجی تدبیرات یا حکمت عملی کے تحت فوری مقاصد بھی دے دیئے جاتے ہیں اور ترجیحات بھی مقرر کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک کی کئی آیات ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور قرآن پاک میں اکثر جگہ احکام ہیں کہ جب تم وعدہ کر لو تو اس اس پر قائم رہو۔ بہر حال ہم صرف ایک آیت کا ترجمہ لکھیں گے۔

''پس جب تو نے پکا ارادہ کر لیا تو پھر اللہ پر بھروسہ کر، بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''

اس ایک آیت مبارکہ میں مقصد پر قائم رہنے کے مضمون کو بیان کرتے وقت گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایک فوجی ذہن جس کو فوجی زندگی میں اکثر احکام ملتے رہتے ہیں کہ وہ مقصد حاصل کرو یا یہ کرو، وہ ان الفاظ کے

جذبہ کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ دراصل انسان کا ارادہ ہی ہر معاملہ میں روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے اور جب اللہ پر بھروسہ کر کے پکا ارادہ کر لیا جائے تو سبحان اللہ کیا ہی کہنے ہیں کہ مقصد حاصل ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کے لیے مقصد حاصل کرنے کے لیے بنیادی تربیت کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ ہر مقصد حاصل کرنے سے پہلے نیت باندھی جاتی ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے نیت باندھنا، روزہ سے پہلے نیت کرنا، قربانی، زکوٰۃ، حج حتیٰ کہ سفر پر روانہ ہونے کی نیت کرنا بلکہ گھوڑے یا کشتی پر سوار ہونے کی نیت وغیرہ بھی ہے۔ تو دین فطرت کی شان نرالی ہے کہ مقصد کے لیے نیت باندھو اور پھر توکل کرو۔ حضور پاک ﷺ نے اس سلسلہ میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عملی طور پر جو تربیت کی اس کا بیان ہو چکا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے استقامت فی المقصد کو جس طرح نبھایا اس کے نتائج کا ذکر ان کتابوں میں موجود ہے۔

۲۔ اصول ایمان و یقین

اسلام کے لحاظ سے جنگ کا دوسرا بڑا اصول یہ ہے کہ ہر کارروائی ایمان و یقین سے کی جاتی ہے اور انفرادی و اجتماعی طور پر اپنا فلسفہ حیات اور مومن کے مقاصد زندگی پیش نظر ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیم کا مرکز ثقل قلب انسانی ہے، جس کی تربیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اور اب بھی دی جانی چاہیے۔ یہ روحانی تربیت اللہ کے ذکر، حضور پاک ﷺ پر درود وسلام بھیجنے اور بزرگوں کے ادب کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

جب اس طرح صحیح معنوں میں ایک مومن تیار کر لیا جائے تو وہ ایمان کی قوت سے مسلح ہو کر زندگی کی آزمائشوں سے گزرتا ہے۔ ہتھیار یا مشین ثانوی یا ذیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی ایک آدمی اگر چاند ماری میں بڑا ماہر ہے، لیکن کم دل ہے اور میدان جنگ میں اس کو ہمت نہیں ہوتی کہ شست لے کر فائر کر سکے تو بھلا اس کے ماہر ہونے کا کیا فائدہ؟ اور یقین جانیں کہ ہم نے میدان جنگ میں ایسے آدمی دیکھے ہیں اور ایسے بھی دیکھے ہیں کہ امن کے زمانے میں اتنے اچھے سپاہی نظر نہ آتے تھے۔ لیکن میدانِ جنگ میں ان کی قوتِ ایمانی عود کر آئی اور انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے۔

''مت ڈرو (یا بزدلی مت دکھاؤ) اور مت غم کھاؤ (یعنی گھبراؤ نہیں) تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہو۔''

تو بات ساری ایمان والی ہے اور ہم نے حضور پاک ﷺ کی تربیت یافتہ فوج کے کارہائے نمایاں بیان کر دیئے کہ ایمان والوں نے ہمیشہ کس طرح سے اپنے سے تین گنا زیادہ دشمن کو پاش پاش کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے یہ تجزیہ کیا کہ سب سے آگے والے مورچوں میں ایک پلٹن کی ایک کمپنی میں کتنے جوان دشمن پر شست باندھ کر فائر کرتے تھے، تو آگے سے پتہ چلا کہ صرف دس فیصد جوان دشمن کو دیکھ کر فائر کرتے تھے، باقی صرف ٹریگر دبا

دیتے تھے۔ مشہور جرمن جنگی ماہر کلاسوٹز کہتا ہے کہ جنگ کے معاملات ان سے معلوم کئے جائیں جو جنگ میں شرکت کر چکے ہیں۔ اب راقم ذاتی رائے دے رہا ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رات کے وقت تو ایک فیصد فائر تو سوچ سمجھ سے ہوتا تھا اور دن کے وقت چند لوگ ذاتی بچاؤ کے لیے دشمن کو دیکھ کر فائر کرتے تھے۔ ورنہ اکثر ٹریگر دباتے رہتے تھے۔ لیکن ستمبر 1965ء کی جنگ میں میرے عظیم ساتھیوں نے شاید ہی کوئی گولی ضائع کی ہو۔ اور پوری جنگ کے دوران رائفل اور لائٹ مشین گن کا فالتو بارود آگے نہ منگوایا گیا۔ صرف گرنیڈ یا بکتر بند توڑ بارود زیادہ آگے منگوایا گیا کہ ضرورت ایسی پڑی۔ اصول یہ تھا کہ ایک گولی ایک دشمن اور اس پر عمل اس طرح کیا گیا کہ فائر بندی کے وقت ڈوگری کا میدان جنگ دشمن کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور اپنے تقریباً ستر شہدأ کے مقابلے میں تقریباً سات سو بھارتی واصل جہنم ہوئے کہ دوسال بعد بھارتی لوگ سہا اس سلسلے میں چیخ وپکار کا مظاہرہ کررہا تھا۔

لڑائی کی یہ مثال صرف دفاع سے دی گئی ہے۔ لیکن جارحانہ کارروائی کے دوران اکثر ایسے ہوتا ہے کہ گشتی دستے دشمن کے علاقے میں جاتے بھی نہیں اور جھوٹی خبریں دے دیتے ہیں۔ حملہ میں کئی آدمی راستے میں لیٹ جاتے ہیں اور مقصود پر چند ہی جوان پہنچتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی یہ شان نہیں، وہ سارے کے سارے لڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارشاد ربانی ہے۔

''اگر ہوں تم میں سے سو تو غالب آئیں گے ایک ہزار پر۔''

اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں بڑی حکمت پنہاں ہوتی ہے۔ وہ کئی باتوں کو ایک فقرہ میں بیان کر دیتا ہے۔ اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ کافروں میں دس فیصدی لوگ لڑتے ہیں، یعنی سو میں سے دس لڑیں گے تو ان پر دس مسلمان غالب آجائیں گے کہ وہ قوت ایمانی کے ساتھ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ جناب حضور پاک ﷺ کی جنگوں میں ہر جگہ کم نفری نے زیادہ نفری کو شکست دی اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اس اصول کو قائم رکھا گیا۔ ہم پہلی کتاب میں بیان کر چکے ہیں کہ جناب مثنیٰ رضی اللہ عنہ بن حارث فرمایا کرتے تھے کہ اسلام سے پہلے دس ایرانی سو عربوں پر حاوی تھے۔ عرب جب مسلمان ہو گئے تو اب دس عرب، سو ایرانیوں پر حاوی ہیں۔ اور بعد میں جنگ قادسیہ اور جنگ نہاوند میں مسلمانوں نے اس کا عملی ثبوت دیا اور شام کے محاذ پر جنگ یرموک سے بہتر کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ چالیس ہزار مجاہدین نے ایک لاکھ بیس ہزار رومیوں کو نہ صرف شکست دی بلکہ ان کے ستر ہزار جوان کھیت رہے۔ اور مرتا وہی ہے جو لڑتا ہے۔ بے شک اہل روم بھی بڑی بہادری سے لڑے۔ لیکن ارشاد ربانی کے آگے سب ہیچ ہے۔ اور راقم یہ سب کچھ ستمبر ۱۹۶۵ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔

یہاں پر ایک واقعہ کا بیان ضروری ہے۔ قیصر روم ہرقل کا ذکر ہماری دوسری اور تیسری کتاب میں بہت جگہوں پر

ہو چکا ہے کہ وہ کافی مدبر اور جہاندیدہ آدمی تھا اور فوجی حکم عملی کا ماہر تھا۔ جنگ یرموک میں رومیوں کی شکست نے اس کو حیران کر دیا تو اس نے بھگوڑوں کو اکٹھا کیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ تم لوگ ساز و سامان اور نفری کی برتری کے باوجود مسلمانوں سے کیوں شکست کھا گئے؟ ایک تجربہ کار اور سن رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔

''مسلمانوں کے اخلاق ہماری نسبت بہت بلند ہیں۔ وہ لوگ رات بھر عبادت کرتے ہیں اور دن میں روزہ رکھتے ہیں۔ وہ کسی شخص کے جذبات کو مجروح نہیں کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مساویانہ سلوک کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم شراب کے عادی ہیں، عہد شکنی کرتے ہیں اور کمزوروں کو دباتے رہتے ہیں۔''

قوت ایمانی کے نتائج

اپنی کتابوں کے سلسلے میں ہم قوت ایمانی کے نتائج ہر باب میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس کی تربیت ہمارے آقا ﷺ نے مجاہدین کو قرآن پاک کے ذریعہ سے دی تھی۔ ارشاد ربانی ہے۔

''کتنی بار چھوٹی فوج، بڑی فوج پر غالب آئی ہے، اللہ کے حکم سے۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ کفار کو اس طرح تنبیہ کرتا ہے۔

''اور تم کو تمہاری فوج ہرگز کام نہیں آئے گی۔ اگر چہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔''

چنانچہ یہ بڑا ہی وسیع مضمون ہے۔ کلاسوٹز مادی وسائل کے ساتھ اخلاقی وسائل یا اخلاقی قوتوں کے فوائد کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کی کتابوں کے ترجمہ کے وقت اس چیز پر تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ کلاسوٹز کے مطابق جب طاقت یا وسائل میں کمی ہو تو بہتر تدبر اور اخلاقی قوتوں کی مدد سے دشمن کے ساتھ توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے آقا ﷺ اور آپ کے تربیت یافتہ اس اصول سے آگے نکل گئے کہ گو ہر جنگ میں وہ دشمن سے کم تعداد میں تھے لیکن انہوں نے پہلے مرحلہ میں دشمن کے ساتھ اخلاقی قوتوں سے توازن پیدا کیا اور دوسرے مرحلہ میں دشمن کو پاش پاش کر دیا۔ جنگ بدر ہو یا جنگ یمامہ، جنگ قادسیہ ہو یا جنگ اجنادین، ہر جگہ یہی کچھ کیا۔ اول حکمت عملی کے ذریعہ توازن پیدا کیا اور کوئی فرق رہ گیا تو تدبیرات کے تحت اس کو پورا کیا۔ پھر قوت ایمانی سے دشمن کو تہس نہس کر دیا۔

ایسی قوت ایمانی پیدا کرنے کے لیے خاص تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جو از خود ایک وسیع مضمون ہے کہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے جمہوریت نواز اور مادر پدر آزاد لوگ ایسا نہ کر سکیں گے۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ امن کے زمانے میں ان کی بخیلت اور تیز زبان پہچانی جا سکتی ہے اور حضور پاک ﷺ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح نشاندہی کرتا ہے۔

''پس جب قریب آوے خوف، دیکھتا ہے تو ان کو کہ تیری طرف دیکھتے ہیں اور پھرتی ہیں آنکھیں ان کی مانند موت کی غشی کے اور جب جاتا رہتا ہے خوف (یعنی امن مل جاتا ہے) تو پھر بیٹھتے ہیں بیچ تمہارے ساتھ تیز زبانوں کے بخیلی کرتے ہیں اوپر بھلائی کے۔''

ایسے لوگ جب تک راہ راست پر نہ آئیں ان سے کوئی فائدہ نہیں ملتا۔ ایسے آدمیوں نے حضور پاک ﷺ کے زمانے میں کوئی کام نہ کیا اور نہ بعد میں کوئی کام کیا۔ انہی سے پہلے آزاد فکر پیدا ہوئے اور پھر یہ معتزلہ بنے۔ آج بھی ایسے لوگ ہمارے درمیان موجود ہیں اور عقلی گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

''اگر نکلتے ساتھ تمہارے ساتھ نہ زیادتی کرتے تم کو، مگر فساد میں اور البتہ گھوڑے دوڑاتے درمیان تمہارے، چاہتے تمہارے واسطے فتنہ، اور تم میں بعض لوگ ان کی باتیں سنتے ہیں یا ان کو مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ظالموں کو۔''

ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعداد میں دلچسپی نہیں کہ زیادہ تعداد ہو تو کیا فائدہ، اس سے وہ تھوڑے بہتر ہیں جو قوت ایمانی سے سرشار ہوں۔

دیکھ لیں آج دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب ہے اور یہ تعداد ہمیں کچھ فائدہ نہیں دے رہی کہ ہم میں قوت ایمانی کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اسلام کا فلسفہ دفاع (جہاد بالسیف) سیاسی فلسفہ (کلی جہاد) کے تابع ہے اور نظام حکومت کو اسلامی فلسفہ حیات کے تابع ہونا چاہیے کہ پوری قوم کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اور یہ تربیت کیسے ہو، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۳۔ اصول مصابرت

ایمان و یقین کے اصول کا ایک مددگار اصول بھی ہے جو اخلاقی قوتوں کو بڑھاتا ہے۔ گو یہ عنصر بھی ایمان و یقین کا حصہ ہے، لیکن اس کو الگ اور تیسرا اصول بنا کر پیش کرنے میں ایک خاص مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پہلو پر کافی زور دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر جلد باز ہے۔ وہ جلد نتائج حاصل کرنے کے لیے جلد بازی کر جاتا ہے۔ اور جب جلدی نتائج نہ نکلیں تو کہنا شروع کر دیتا ہے کہ ''اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔'' یعنی امید پر گزارہ کرتا ہے، امید بے شک اچھی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لا تقنطوا من رحمة الله۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ دیر ہے اور نہ اندھیر۔ اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کس کام کو کب

ہونا چاہیے۔ اس لیے ہم اس اصول مصابرت کو الگ کر کے بیان کر رہے ہیں کہ دیر ہو جانے کی صورت میں صبر سے کام لیا جائے کہ ہم لوگ ''دیر'' یا ''زماں'' کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے۔

جو لوگ فوج سے وابستہ ہیں ان کو معلوم ہے کہ جنگ کی تیاری اور تربیت میں ہر سطح پر بڑے کتابی اور عملی امتحان آتے ہیں۔ اور ان کا اکثر بڑی صبر آزما گھڑیوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ علاوہ از خود جنگ کے دوران ہر سطح پر امتحان اور انتظار کے پرچے بڑے سخت ہوتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جنگ میں بڑا چوکنا رہنا پڑتا ہے اور جلدی یا بروقت کارروائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تو جو لوگ فوجی ذہن نہیں رکھتے ان کو یہاں تضاد نظر آئے گا کہ ایک طرف جلدی، دوسری طرف صبر تو گزارش ہے کہ جلدی اور صبر میں توازن پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا۔

''اے ایمان والو! صبر کرو اور باہم مصابرہ کرو اور فوجی رابطہ رکھو اور ڈرو اللہ سے کہ تم فلاح پاؤ۔''

سبحان اللہ! کیا شان ہے کہ ایک فوجی ذہن ان الفاظ کی تہہ میں غوطہ پہ غوطہ لگاتا رہے گا اور اس کو یہ معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے میری ہی یونٹ یا ادارہ کے لیے یہ احکام جاری کئے ہیں کہ میں اس ادارہ یا یونٹ میں ہر کام ان اصولوں کے تحت کروں اور کراؤں۔ پہلے انفرادی صبر کی تلقین، پھر اجتماعی صبر کی کہ ایک دوسرے کی صبر کے پہلو سے مدد کرو۔ یا صبر کی اجتماعیت پیدا کرو۔ اور یہ ملا جلا صبر اس فوجی رابطہ کی بنیاد ہے جو فوج یا بنیان المرصوص کی عمارت کا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی موجودگی اور اپنے ڈر کا بھی ذکر کر دیا کہ ایسا کر کے سب کام مجھ پر چھوڑ دو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ یعنی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے کی بات نہیں۔ پہلے کارروائی کرو اور پھر اللہ پر نتیجہ کو چھوڑ دو، یعنی توکل والا پہلو بھی آ گیا۔

صبر کا ذکر قرآن پاک میں اکثر مقامات پر ہے۔ لیکن ہم صرف ایک جگہ کا ذکر کرتے ہیں، جہاں ارشاد ربانی ہے۔

''اور صبر کرو، تحقیق اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

تو سارے مسئلے اس ایک بات سے حل ہو جاتے ہیں کہ صبر سے اللہ کو ساتھی بنا لیا۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ہمارے دلوں کو مضبوط کرنے کے لیے دعا بھی سکھا دی اور حکم ہے کہ اس طرح دعا مانگا کریں۔

''اے ہمارے رب! ڈال ہمارے اوپر صبر اور ثابت رکھ قدم ہمارے (یعنی ہمیں ثابت قدمی عطا فرما) اور مدد دے ہم کو اوپر کافروں کے۔''

یہ دین فطرت ہے، صبر کا اصول یا قوت ایمانی کا اصول، جنگ کے اصول (Principles of War) کے طور پر مغربی دنیا نے نہیں اپنایا۔ ہاں، دوسری جنگ عظیم کے بعد (Moral) یا اخلاقی قوت کو ایک اصول تسلیم کر لیا گیا کہ نفسیاتی طور پر دشمن کے حملے بھی شروع ہو گئے ہیں۔ اس لیے اخلاقی قوتوں کو بڑھایا جائے۔ بہر حال وہ لوگ اخلاقی

قوتوں کو دنیاوی جنگ کے مقاصد کے طور پر بڑھا سکتے ہیں اور دین فطرت کے اصولوں کی یہ بھونڈی نقل بھی نہیں کہ دین فطرت نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ اصول پیش کئے۔ گو صبر کے سلسلہ میں دوسری جنگ عظیم کا مشہور انگریز فیلڈ مارشل منٹگمری اپنی ایک کتاب میں تسلیم کرتا ہے کہ ٹامی (انگریزی سپاہی) جنگوں میں اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ وہ میدان جنگ میں سخت حالات میں دوسرے یورپین سپاہیوں کے مقابلے میں چند لمحے زیادہ ٹھہر جاتا ہے۔ یعنی وہ ذرا زیادہ صابر ہے۔ بہر حال انگریز سپاہی کو یہ مزاج یورپ کی سرد ہواؤں اور گلف سٹریم کی گرم رووں کی ملاوٹ کے توازن نے دیا، اور مسلمان سپاہی کو اللہ تعالیٰ نے یہ دس گنا بہتر شرف اس کی قوت ایمانی کی وجہ سے عطا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ مسلمان سپاہی کو ثابت قدم رہنے کی بار بار تلقین کرتا ہے اور ثابت قدمی صبر سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! جب دشمن کے دستے کے ساتھ ٹکراؤ ہو تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو، اللہ کا کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اب ذکر کے بارے میں اور جگہ بھی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ہرقل کے سامنے ایک تجربہ کار رومی بھگوڑے کا ذکر ہو چکا ہے جس نے ہرقل کو بتایا کہ مسلمان رات کو ذکر کرتے تھے۔ اور اوپر والی آیت میں فلاح کا بھی ذکر ہے تو یہ بات ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ صبر، مصابرہ*، ذکر، اطمینان، ثابت قدمی ان سب چیزوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ سب فلاح کا ذریعہ ہے۔ سورۃ الانفال میں جہاں تعداد کے موازنہ کا ذکر ہے، تو وہاں الفاظ یہ ہیں۔

''اگر ہوں تم میں سے بیس صبر کرنے والے، غالب آئیں گے دو سو پر۔''

یعنی صبر مجاہدوں کا ایک خاص اوصاف ہے، اور یہ اسلامی طرز جنگ کا اصول مصابرہ، جس کے تحت فوج کو تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام بنیادی طور پر گھروں اور مسجدوں سے شروع ہوتا ہے، ایسے اصولوں کی لوری مسلمان بچوں کی مائیں ان کو اپنی آغوش میں دیتی ہیں۔ اور مکتبوں میں ان پر عمل ہوتا ہے۔ اسلام ایسی تعلیم کے حق میں نہیں جہاں کالجوں میں بیٹھ کر ڈینگیں ماری جائیں اور آزاد فکری کا یہ حال ہو کہ بچے مادر پدر آزاد ہو جائیں۔ اور ہر گزرنے والے کو ڈر لگ جاتا ہے کہ شاید یہ بچے کس وقت پھبر کر اس کی عزت کو خراب کر دیں۔

چنانچہ اس اصول مصابرہ میں جو ربط و ضبط کا ذکر ہے، اس کو ہم ایک الگ اصول کے طور بیان کریں گے کہ ربط و

* سید سلیمان ندوی اور ہمارے مطالعے میں فرق یہ ہے کہ ہمارے لحاظ سے صبر، مصابرہ، ذکر، اطمینان، ثابت قدمی وغیرہ سب پہلو جہاد کی تیاری کا حصہ ہیں اور سید صاحب کے لحاظ سے یہ صرف اوصاف ہیں اور انہوں نے سیرت کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔

ضبط کے معاملات اور زیادہ وسیع ہیں۔

۴۔اصول ربط وضبط

اسلام اور قرآن پاک کے لحاظ سے یہ جنگ کا چوتھا بڑا اصول ہے۔عام طور پر اسے غیروں نے بھی ایک جنگی اصول تسلیم کیا ہے۔شاید اس اصول کی شکل وصورت کچھ مختلف ہو اور وقت اس میں تبدیلی لاتا رہا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ میں جنگ بھی ڈرل کے طور پر اصول ربط وضبط کے تحت لڑی جاتی تھی۔اٹھارہویں صدی سے پہلے کی یورپ کی عسکری تاریخ میں جنگ کا کوئی مفید سبق نہیں ملتا۔پس لکیر کے فقیر والا معاملہ تھا اور جنگ،بعض جگہ کھیل کے بھی مشابہ رہی۔اسی وجہ سے اہل یورپ ان جنگوں کو''جنٹلمین وارز''بھی کہتے ہیں۔بہر حال اٹھارہویں صدی میں فریڈرک اعظم نے ڈرل کے طور پر جنگ لڑنے کی راہ نکالی اور ربط وضبط کو ایک اصول مانا گیا۔

دین فطرت کی شان نرالی ہے۔اس میں پہلے روز ہی سے ربط وضبط پر بہت زور دیا گیا بلکہ یہ بھی خیال پایا جاتا ہے کہ ہمارا لفظ''رابطہ''یا''ربط''سپین میں رجمنٹ بن گیا۔اور اب انگریزی لفظ رجمنٹیشن (Regimentation) کے اندر جو بے پناہ رابطے سموئے ہوئے ہیں اور یورپ کے مادر پدر آزاد معاشرے کی فوجی زندگی میں یہ لفظ جو آج تک قائم ہے تو یہ لفظ اہل یورپ کا نہیں ہوسکتا،کہ اس لفظ کا یورپ کی زبان میں کوئی ماخوذ بھی نہیں ملتا۔ہم اس لفظ یا اسلام کے رابطے کا ذکر اسلام کے قلعہ کے عنوان کے تحت اور حربی نظام کے تحت سیسہ پلائی دیوار کے طور پر بیان کر چکے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ سیسہ پلائی دیوار ربط وضبط کے اشتراک سے بنتی ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

''تحقیق اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے جولڑتے ہیں اس کی راہ میں گویا وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں۔''

سبحان اللہ!اس آیت کی کیا فوجی شان ہے۔حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مومنین نے سیسہ پلائی دیوار بن کر جنگیں لڑیں،ایسا صرف دفاع میں نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی''ساکن''دیوار بن جاتے تھے۔ایسی ساکن یا ٹھوس دیوار بننے کی کوشش،تو ایرانی اور رومیوں نے کی جس کا ذکر پہلی دو کتابوں میں کیا گیا ہے۔مسلمانوں کی یہ سیسہ پلائی دیوار متحرک بھی ہوسکتی تھی۔

جناب سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کی سرداری میں،مسلمانوں نے مدائن پر قبضہ کرنے کے لیے دریائے دجلہ کو سیسہ پلائی دیوار بن کر پار کیا۔پوری کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہے لیکن صرف ایک کہاوت کافی رہے گی کہ شہر میں مشہور ہو گیا۔''دیواں آمدند،دیواں آمدند''یعنی دیوؤں کی فوج آ گئی اور چند لمحے بعد یزدجرد،کسریٰ ایران شہر کو چھوڑ کر فرار ہو گیا اور دارالحکومت پر مسلمانوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔یہ سب ذکر پہلی کتاب میں موجود ہے۔مسلمان غازی،سیسہ

پلائی دیوار کیسے بنتے تھے۔اس کی وضاحت خود رب العالمین اس طرح کرتا ہے۔

''ان کے دلوں کو باہم الفت سے جوڑ دیا، اگر تو خرچ کرے جو کچھ زمین میں ہے پورا،نہیں الفت پیدا کرسکتا ان کے دلوں میں،لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا الفت سے، تحقیق وغالب حکمت والا ہے۔''

اب اس بیان کے فلسفہ میں جائیں کہ دولت یا مادی ذرائع سے دل نہیں جوڑے جاسکتے۔ دل الفت اور محبت سے جوڑے جاسکتے ہیں اور ایسی محبت، وحدت فکر سے پیدا ہوتی ہے۔اور اسلام کے لحاظ سے یہ ''فکر'' اللہ اور رسول کی غلامی ہے۔ یہ غلامی کا ملا جلا جذبہ ''کل مومن اخوۃ'' کی بنیاد پر ہے اور یہ قلبی وحدت، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔میدانِ جنگ میں یہ میسر ہو جائے تو سرور سے دل بھر جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں راقم نے جس محبت کو محسوس کیا اور میرے شہید رفقاء جو کچھ میرے پاس چھوڑ گئے۔ یہ اسی کے نتائج ہیں کہ میرے جیسا کم علم اور بے مائع گنہ گار آج اس قسم کے نظروں پر قلم اٹھا رہا ہے کہ یہ محبت اور یہ قلبی وحدت پورے قافلہ اسلام کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بنیان الرصوص، زمان و مکان کو بھی اپنے محیط میں لیے ہوئے ہے اور ایسی وحدت آپ کو ہمیشہ ''زندہ'' رکھے گی۔

قرآن پاک میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے ایک مرتبہ عرض کی کہ ''اے میرے اللہ! تو مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔''

کچھ وضاحت کے بعد، اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

''پس لو چار پرندوں میں سے اور ان کو مانوس کر دو اپنی طرف، پھر کرو ان کے ٹکڑے ٹکڑے پہاڑ پر (یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہاڑ پر پھیلا دو۔'' پھر بلاؤ ان کو، چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لو یہ کہ اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔''

عربی لفظ ''فصرھن'' کے معنیٰ ''مانوس'' کے لفظ کے طور پر کئے گئے ہیں، لیکن اس عربی لفظ کے صحیح معنی مانوس سے بہت زیادہ بڑھ کر ہیں۔اس میں گہرے قلبی لگاؤ والا پہلو بھی آتا ہے اور دین فطرت کا رابطہ وضابطہ قلب کی ایک کیفیت ہے، جس کی مثال نہیں ملتی اور جس کے بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ موجود نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ربط وضبط کا اصول وسیع تر ہے۔اس کے لیے تربیت گھروں اور مسجدوں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے اپنے رفقاء کی یہ تربیت مدینہ شریف میں کی، گو اس کی بنیاد مکہ شریف میں باندھی گئی تھی۔

اس اصول کو اپنانے کے لیے ہمیں اپنی پیشہ ور افواج اور قوم میں ربط وضبط پیدا کرنے اور اندرونی وحدت کے لیے مفصل ہدایات جاری کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی تربیت گھروں، مسجدوں اور سکولوں میں کس طرح ہو۔

اس کام کے لیے فلسفہ اطاعت امیر اور اسلام کی امامت کے طریقوں کو بیچ لانا پڑے گا کہ ہمیں ہر سطح پر ایسے

اماموں کی ضرورت ہوگی جو۔

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کر دے

(اقبالؔ)

پیشہ ور افواج میں ربط وضبط موجود ہے۔ لیکن اس کے طریقے ہم نے غیروں سے سیکھے ہیں۔ پیشہ ور فوج کی بھی تنظیم نو کرنا ہوگی اور اس رابطے وضابطے کی بنیاد اللہ کے طریقے یعنی الفت اور محبت سے کرنا ہوگی، جہاں دلوں کو جوڑنا ہوگا۔ اس کے لیے کردار کی ضرورت ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا وحدتِ کردار

(اقبالؔ)

۵۔اصولِ حفاظت یا تحفظ

اسلام کے لحاظ سے پانچواں اصول حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اصول دوسرے لوگوں کے جنگ کے فلسفہ میں موجود ہے جس کو Security کہہ لیں یا Protection وغیرہ۔ اس کو ہر سطح پر جاری کرنا پڑتا ہے۔ غیروں نے مختلف سطحوں پر اس ضرورت کے مختلف نام رکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خذوا حذرکم کے دو الفاظ میں تمام پہلو واضح کر دیئے اور ارشاد ربانی ہے۔

''اے ایمان والو! لو بچاؤ اپنا پھر نکلو متفرق یا اکٹھے۔''

یعنی اپنی حفاظت کے اصول کو ہر وقت مدنظر رکھ کر طریق کار وضع کرو۔ خواہ گروہ، گروہ کے طور پر کام کر رہے ہو یا اجتماعی طور پر کسی ایک جگہ پر کام کر رہے ہو۔

اس اصول کے تحت اول حکم حضور پاک ﷺ نے یہ دیا کہ جب دو ہوتو ایک کو اپنا امیر بنالو۔ یعنی اسلام کے ہر فلسفہ کے لیے امیر کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور پاک ﷺ اگر مدینہ شریف سے باہر ایک دن یا چند میل کے فاصلے پر بھی جاتے تھے، تو مدینہ شریف میں اپنا ایک نائب مقرر کر کے جاتے تھے۔ جنگ اُحد کے بعد جب آپ ﷺ کفار کے تعاقب میں صرف حمرالاسد تک نکلے تو بھی جناب ابن ام امکتوم کو نائب بنا گئے بلکہ جنگ خندق کے بعد مدینہ شریف کے ساتھ بنی بنو قریظہ کا محاصرہ کیا تو پھر بھی جناب ابن ام مکتوم کو مدینہ شریف میں نائب بنایا۔

لیکن جب ذمہ داری زیادہ ہوتی تھی تو نائب کوئی چیدہ شخصیت ہوتی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جناب سباع رضی اللہ عنہ بن عرفطہ، جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ وغیرہ کو بھی بعض حالتوں میں مدینہ شریف میں نائب چھوڑا بلکہ مہم تبوک کے وقت جناب علی رضی اللہ عنہ کو نائب چھوڑ گئے۔ حفاظت کا یہ اصول ہوتا ہے کہ ہر سطح پر عملی طور پر امیر ہو۔ اس کے علاوہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت کے طریقوں کو راز میں رکھنے کی ہدایات کیں اور عملی طور پر بھی ایسا کیا۔ جنگ خندق کے وقت کفار، خندق کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خندق، چند دن پہلے کھودی گئی تھی بلکہ مدینہ شریف کے گرد خندق، حکمت عملی کے تحت ضروری بھی تھی کہ خندق کے کھودے جانے کے بعد مدینہ شریف کا دفاع آسان ہو گیا تھا اور مدینہ شریف میں چند مجاہدین کو چھوڑ کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم دور دور تک مہمات پر جا سکتے تھے۔ نزدیک قبائل کی بغاوت کے باوجود، اس خندق کی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلیفہ اول جناب صدیق اکبر جناب اسامہ کی مہم کو اتنا دور بھیج سکے، جس کا ذکر پہلی کتاب میں ہے۔ تو حفاظت کے اصول کی پابندی، جتنی اسلام نے سکھائی ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ صلح حدیبیہ کی شرط کے تحت اس سے اگلے سال جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف عمرہ کے لیے گئے تو ہتھیار ساتھ نہ لے جانے کا معاہدہ تھا۔ اس لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر اپنا اسلحہ ایک دستہ کی حفاظت کے تحت رکھا کہ ضرورت پڑنے پر اسلحہ کا استعمال کیا جا سکے۔ اور عمرہ کے دوران اس دستے کے ساتھ باقاعدہ رابطہ تھا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رات کا پہرہ، پاس ورڈ، امرا کارات کو سنتریوں کا ملاحظہ کرنا، غرضیکہ حفاظت کا ہر پہلو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ اور ہم ایسی باتوں کی تفصیل میں جا چکے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

''پسند کرتے ہیں کافر، کاش کہ غافل ہو تم ہتھیاروں اپنے سے اور اسباب اپنے سے پس جھک آویں اوپر تمہارے جھک آنا یکبارگی۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ بھی کر دی ہے۔

۶۔ اصول حرکت اور بھرپور کارروائی

اسلام کے لحاظ سے چھٹا جنگی اصول حرکت اور بھرپور کارروائی ہے۔ انگریز بھی دوسری جنگِ عظیم تک حرکت (Mobility) کو ایک جنگی اصول مانتے رہے لیکن جنگ کے بعد اس اصول کی بجائے لچکداری کے اصول (Flexability) کو اپنا لیا گیا۔ جس کے بیچ حرکت کا پہلو کچھ قائم ہی رہتا ہے اس لئے زیادہ اعتراض کی گنجائش نہیں۔ لیکن اسلام کے لحاظ سے چونکہ اصول پکے ہیں تو ہمارے لحاظ سے حرکت میں برکت ہے اور حرکتی چال یا (Manevoure) حالاتِ جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ ویسے بھی حرکت ایسی ہو کہ دشمن کچھ نہ سمجھے کہ کیا

ہونے والا ہے۔ یہ سب اسلام کے طریق کار ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں اپنی مثال دیتا ہے اور ارشادِ ربانی ہے۔ ''ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔'' یعنی اپنی ذات وصفات کے مقامات بھی حرکت پذیر یا نئی شان میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضور پاک ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ مومن کے مقامات میں بھی معراج ہوتی ہے۔ اور بے شک جو کل والے مقام پر ہے وہ گھاٹے میں رہا۔ پھر قرآن پاک میں زمین' چاند سورج سمیت سیاروں کا ذکر کیا کہ وہ فضا میں تیرتے ہیں۔ یعنی وہ بھی حرکت میں ہیں۔ زمین کا اپنے محور کے گرد گھومنے کا ذکر کیا کہ ہر چیز کتنی تیزی سے حرکت کر رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔

ہم اس پہلو کی وضاحت تو پہلے کر چکے ہیں کہ دین اسلام ایک متحرک دین ہے۔ نماز میں حرکت، زکوٰۃ اور قربانی میں مال یا صدقے والی چیزوں کی حرکت اور حج میں حرکت۔ حضور پاک ﷺ نے متحرک طرزِ جنگ اختیار کیا۔ جنگِ بدر میں اپنی چنی ہوئی زمین پر متحرک دفاع یا وقتی دفاع اپنایا۔ جس کو جارحانہ حرکت دے کر دشمن کو پاش پاش کر دیا۔ مدینہ کے مستقر کی حفاظت متحرک دفاع اور گشتی دستوں سے کی۔ جنگِ اُحد میں دفاع کرنے کی بجائے آپ ﷺ اچانک دشمن کے ایک بازو پر نمودار ہو گئے۔ جنگِ خندق بھی ایک مجہول دفاع نہ تھا بلکہ وقتی دفاع تھا کہ دفاعی لائن تھی اور حرکت کی گنجائش تھی۔ ہمارے ایک عالم دین نے اپنی جہاد کی کتاب میں' جو ''مصلحانہ دفاع'' اور ''مدافعانہ دفاع'' وغیرہ کی باتیں کی ہیں' ان کا اسلام کے یا کسی فنِ جنگ کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہر دفاع مدافعانہ بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔ مصلحت کے طور پر نہ کنارہ کشی کی جاتی ہے' نہ کوئی ساکن شکل وصورت اختیار کی جاتی ہے۔ مشہور جرمن جنگی ماہر کلاسوِٹز نے بھی ایسی بے معنی باتوں کا مذاق اڑایا ہے اور علامہ اقبال نے بھی کئی جگہ ایسے لوگوں پر پھبتی کسی ہے۔ کہیں کرگسوں کا ذکر کیا ہے اور کہیں بڑے پر قاعدہ شیر کے اظہار کی بات کی ہے۔ اگر کوئی صاحب لاعلمی یا کم مطالعہ کی وجہ سے یہ سب کچھ لکھتے رہے ہیں تو الگ بات ہے ورنہ یہ سازش بھی ہو سکتی ہے کہ اس ساری کتاب میں اس جہاد کے بارے تو کوئی بات نظر نہیں آتی جو حضور پاک ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء نے کیا۔

بہر حال متحرک طرزِ دین والوں کو اللہ تعالیٰ نے ''سیروا فی الارض '' یعنی دنیا کو چل پھر کر دیکھنے کی تاکید کی ہے۔ اور یہاں مدافعانہ اور مصلحانہ باتوں کی بجائے متحرک اور بھرپور کاروائی کی باتیں زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب قسم اٹھاتا ہے تو بھی ایسی چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو متحرک اور بھرپور کاروائی والی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: ''قسم ہے ان دوڑنے والوں کی شور کرتے ہوئے، پھر آگ اگلتے ہیں، شگاف کرنے کو۔ پھر تاخت وتاراج کرتے ہیں دشمن کو صبح کے وقت۔ پس غبار اُڑاتے ہیں غبار اڑانا، پس گھس جاتے ہیں دشمن کی جماعت میں۔''

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اول بھی ہے اور آخر بھی اور اس کو سب زمانے، زمانہ حال کی طرح نظر آتے

ہیں۔اُس نے اِس زمانے کی جنگ کا ایک نظارا پیش کیا ہے کہ جیسے غبار اڑاتے ہوئے شور کرتے ہوئے بکتر بند دستے پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔توپ خانہ کی توپیں فائر اگل رہی ہوتی ہیں اور پیدل دستے صبح سویرے یا پو پھٹتے دشمن پہ حملہ آور ہوتے ہیں وغیرہ۔ پورا زمانہ حاضرہ کی جنگ اور بھرپور حرکت والی جنگ کا نظارہ پیش کرتا ہے تو اسی وجہ سے ہم نے حرکت اور بھر کاروائی کو اصول جنگ مانا ہے۔

اب قرآن پاک کا ایک اور بیان سنیں:

''قسم ہے ان کی جو زور سے آگے بڑھتے ہیں۔غوطہ لگاتے ہیں اور جھپٹنے والوں کا جھپٹنا۔اور ہوا میں تیرنے والوں کا تیرنا۔ پس آگے نکل جاتے ہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا۔پس تدبیر کرتے ہیں کام کی۔''

اب قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ موجودہ زمانے کے ہوائی جہازوں کے حملوں اور آپس میں لڑائی (Dog Fight) کا نظارہ نظر آتا ہے۔

تو ظاہر ہوا کہ دنیا کے سپہ سالار اعظم ﷺ اور ہمارے آقا ﷺ اور دو جہانوں کے سردار ﷺ نے قرآن پاک کے ان اصولوں کے تحت متحرک اور بھرپور طرزِ جنگ کو اپنایا۔اور دشمن کو اپنی مرضی کے وقت اور مرضی کی زمین پر لڑائی کے لئے مجبور کیا۔لیکن حکمتِ عملی اور تدبیرات کے تحت متحرک طرزِ جنگ کو اپنانا کوئی آسان کام نہیں۔دشمن کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہوتا۔اس لئے متحرک طرزِ جنگ کے لئے بہت زیادہ ہدایات کی ضرورت ہے اور ہر سطح پر ہدایت کا رنگ شاید مختلف بھی ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر حکمت عملی کے تحت پوری قوم کو مسجدوں کے ذریعہ سے اور ہر سطح پر امرأ کے احکام کے تحت ''متحرک'' کرنا ہوگا۔یعنی ہاتھ پر ہاتھ دھرنے والی یا تالیاں بجانے والی قوم نہیں بلکہ ایک بھرپور کارروائی والی متحرک قوم جو صراطِ مستقیم پر رواں دواں ہے۔پھر اسی حکمتِ عملی کے تحت پیشہ ور افواج یا ان کے بڑے گروہوں کو لچکدار قسم کا متحرک طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔کہ خاص اور اہم مقامات پر کچھ ''وقتی ساکن'' دستے چھوڑنے ہوں گے یا اصول حفاظت یا اصول ضرورت کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا۔تدبیرات کے طور پر تو یہ بڑا وسیع مضمون ہے اور جنگ کے مرحلہ در مرحلہ حالتوں کے لئے بڑی تفصیلی ہدایات جاری کرنا ہوگی۔

۷۔اصولِ غیرت

اسلام کے لحاظ سے زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اللہ تعالیٰ غیرت مند زندگی کاٹنے کا احکام دیتا ہے۔اس لئے اسلامی طرزِ جنگ کا ساتواں بڑا اصول غیرت ہے کہ بے غیرت آدمی اپنے دین یا عقیدہ کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ جنگِ احد کے وقت ابوسفیان نے بڑماری کہ وہ جنگ جیت کر جا رہے ہیں اور کافی باتوں کے بارے بڑمارتا رہا۔لیکن

حضور پاک ﷺ نے اپنے رفقاء کو جواب سے منع فرمایا لیکن جب ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اگلے سال اسی وقت بدر کے مقام پر فیصلہ کن جنگ کی دعوت دی تو حضور پاک ﷺ حکم دیا کہ جواب دیا جائے اور جواب یہ تھا: ''بے شک اگر ہمارے اللہ کو منظور ہوا۔''

اب حضور پاک ﷺ تو چوتھی ہجری میں اپنے مجاہدین کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے نہ آنا تھا اور نہ آیا۔ قحط سالی کا بہانا بنا کر راستے سے واپس چلا گیا۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے دوران حضور پاک ﷺ پرامن طور پر مکہ شریف کے عمرہ شریف کے لئے گئے تھے۔ نہ آپ کا جنگ کا ارادہ تھا' اور نہ تیاری ونفری تھی کہ سولہ سو مجاہدین تھے لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی' گو خبر غلط تھی۔ تو خبر سنتے ہی سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رضوان کا شرف حاصل ہوا جس کو قرآن پاک میں فتح مبین کا نام دیا گیا ہے کہ یہ شہادت پر بیعت تھی۔ جنگِ احد میں بھی شہادت پر بیعت ہوئی۔ اور جنگِ یرموک میں جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل اور آپ کے رفقاء کی شہادت پر بیعت۔ جنگِ جسر میں ابوعبید ثقفی کے قبیلہ کی شہادت پر بیعت۔ امام حسین رضی اللہ عنہ راہِ حق پر پورے کنبہ کے ساتھ باطل کے ساتھ ٹکر۔ غرضیکہ اسلامی غیرت کی ایسی کئی مثالیں کتابوں کے اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

ہم بھی ذرا گریبان میں منہ ڈالیں کہ آج ہماری تعداد نوے کروڑ ہے لیکن ہم مغلوب قوم ہیں۔ باقیوں کو تو چھوڑیں کہ ہنود اور یہود جن کو ہم غلامی کے زمانے میں خاطر نہ لاتے تھے، آج وہ ہمیں خاطر میں لانا تو درکنار، مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اس مقصد میں ہمارے دشمنوں کو کافی کامیابی حاصل ہو چکی ہے کہ اتنی تعداد کا کیا فائدہ جس میں جان نہ ہو۔ بدقسمتی سے امن پسندی کی لوری دینے والوں نے ہمیں اس طرح بنا دیا ہے کہ ہماری غیرت ختم ہوتی جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں واضح احکام ہیں اور ارشاد خداوندی ہے:

''اے ایمان والو! جب میدانِ جنگ میں کفار سے مقابلہ ہو جائے تو پیٹھ نہ پھیرنا۔''

بے شک اس آیت مبارکہ کا تدبیراتی پہلو بھی ہے۔ لیکن حکمت عملی کے تحت میدان جنگ یا محاذ جنگ سے پسپائی کی اجازت ضرور ہے۔ اور قرآن پاک کے مطابق ایسی پسپائی تب ہو سکتی ہے کہ کسی بہتر زمین یا بہتر تعداد کے ساتھ دشمن کو اپنی مرضی کے مطابق، مرضی کے وقت شکست دی جائے۔ ہم دوسری کتاب میں بیان کر چکے ہیں کہ جنگ اجنادین کے وقت یرموک کی وادی کو چھوڑ کر اور جنوب کی طرف کوچ کر کے ایک قسم کی پسپائی کے بعد رومیوں کی طاقت کو اجنادین کے میدان میں پاش پاش کیا گیا۔ جنگ یرموک کے وقت بھی حمص اور قساریہ تک کے علاقوں سے پسپا ہو کر مسلمان لشکر وادئ یرموک میں اکٹھے ہوئے اور وہاں پر اہل روم کو ایسی شکست دی کہ ہرقل ایشیا کو آخری سلام دے کر قسطنطنیہ پہنچ گیا۔

پہلی کتاب میں ذکر ہو چکا ہے کہ ایران کے محاذ پر بھی جنگ جسر کے بعد گو تدبیراتی طور پر پسپائی اختیار کی گئی کہ

اس کے بغیر چارہ نہ تھا لیکن اس کے جلدی بعد جنگ بویب کے بعد حکمت عملی کے تحت پسپائی اختیار کر کے شرف کے مقام پر اجتماع ہوا۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ کر قادسیہ کے مقام پر ایرانی سلطنت پر پہلا بھرپور وار کیا۔ جنگ نہاوند جس کے بعد ایرانی سلطنت ہمیشہ کے لیے مٹ گئی اور ایران، اسلام کا ایک مستقر بن گیا، اس میں تدبیراتی طور پر ایسی پسپائی اختیار کی گئی کہ دشمن کو اپنی طرف ''کھینچا'' اور جب دشمن ''کھچاؤ'' کی وجہ سے توازن کھو بیٹھا تو اس کو نہاوند کے مقام پر تہس نہس کر دیا گیا لیکن دشمن کو اپنی طرف کھینچنا بڑا مشکل تدبیراتی عمل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جو ہم نے ۱۹۷۱ء میں سیالکوٹ کے محاذ پر کر دیا۔

اب قرآن پاک کے الفاظ کی گہرائی میں جایا جائے تو وہ یہ ہیں کہ میدانِ جنگ میں مقابلہ کے وقت پیٹھ نہ پھیری جائے۔ ان الفاظ میں راز ہے اور فلسفہ بھی ہے کہ اس طرح انسان میدان جنگ میں ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ راقم نے یہ طریقہ جنگ عظیم دوم کے دوران، جاپانیوں کو اپناتے دیکھا، جس کے اتنے زیادہ تدبیراتی فوائد حاصل ہوتے تھے کہ انسان حیران ہو جاتا تھا۔ اور اتنے زیادہ ''فوائد'' کا حکمت عملی پر بھی اثر ہوتا ہے۔ راقم کے ساتھیوں اور ماتحتوں نے کچھ ایسا ہی نمونہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لاہور محاذ پر ڈوگری کے مقام پر دیا۔ بے شک ان میں سے اکثر اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر قربان ہو گئے۔ لیکن لاہور بچ گیا اور وہ ایک بنیان المرصوص کا نظارہ ضرور دکھا گئے اور بہت کچھ وہ اس گنہگار کے پاس بھی چھوڑ گئے۔

اصول غیرت کے سلسلہ میں قرآن پاک کے ایک اور بیان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''تو تم ہمت نہ ہارو اور خود صلح کی طرف دعوت نہ دو اور تم تو غالب ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم نہ کرے گا۔''

اس بیان میں اللہ تعالیٰ ڈٹ جانے کی تاکید کرتا ہے اور صلح کے سلسلہ میں بھی پہل کاری سے منع ہے کہ صلح میں کچھ کمزوری کے پہلو کا اظہار ہوتا ہے۔ تب ہی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے، وغیرہ۔ ہم پچھلے باب میں موت کا ذکر تفصیل سے کر آئے ہیں کہ زندگی ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور مسلمان کو موت تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ قرون اولی کے مسلمان جہاں گئے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ تم کون لوگ ہو تو انہوں نے بڑا ہی پیارا جواب دیا۔ ''ہم لوگ ایسی قوم ہیں جو موت کے ساتھ اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی تم لوگ زندگی کے ساتھ محبت کرتے ہو۔''

یعنی کافر اور مسلمان یا مسلمان کا غیروں سے فرق واضح کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مجاہد کا دس کافروں کے برابر ہونے کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ تو یہ تمام باتیں غیرت، یعنی اسلامی غیرت یا ملی غیرت سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ مضمون بے شک وسیع ہے کہ تکبر کو غیرت نہ سمجھا جائے اور ہماری غیرت اللہ اور رسول ﷺ کے لیے ہے اور جس میں یہ غیرت نہیں وہ مسلمان نہیں۔ اور جانوروں میں بے غیرت خنزیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا گوشت اور خون تک ہمارے اوپر حرام ہے

کہ اس کا استعمال ہمیں بے غیرت بنا دے گا۔ لیکن آج ہم دنیا میں ان لوگوں سے بھی بدتر ہیں جو سور کو کھاتے ہیں۔ تو اپنے گریبان میں منہ ڈالیں کہ ایسا کیوں ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری حالت کو ٹھیک کیوں نہیں کرتا تو اپنا دل جواب دے گا کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟

وضع میں تم نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں، جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

(اقبالؔ)

۸۔ اصول، جستجو اور متفرق باتیں

قرآن پاک ایک سمندر ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں جس کا جواب قرآن پاک میں نہ مل سکے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اس سلسلہ میں ہمارے لیے راہ نکالی اور آپ ہر بات کا جواب قرآن پاک میں تلاش کرتے تھے، ان کو جواب کسی ایک آیت یا لفظ میں مل جاتا تھا اور اس لفظ کی برکت سے ان کو حضور پاک ﷺ کی سنت سے پوری تفصیل مل جاتی تھی۔ حضور پاک ﷺ کی سنت کی بزرگوں نے یہی وضاحت کی ہے۔

مودودی صاحب ایک لفظ اکثر لکھتے تھے کہ فلاں مزاج شناس رسول ﷺ تھا اور مودودی صاحب کے مداح خود مودودی صاحب کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں اور خدا کرے ایسا ہی ہو کہ ہم تو ہر مسلمان کے لیے دعا کرتے ہیں کہ وہ مزاج شناس رسول ﷺ ہو، البتہ اس سلسلہ میں حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارکہ بھی ہے کہ جو کچھ میرے ساتھ منسوب کیا جائے اس کے بارے میرا تصور کر کے تجسس کیا جائے کہ واقعی ایسا ہے لیکن یہ بڑا مشکل عمل ہے۔

ایسا کرنے کے لیے اول تو یارِ غار رضی اللہ عنہ کی طرح عاجزی کی ضرورت ہے کہ ان کو حضور پاک کی شان بیان کرنے سے ڈر لگتا تھا کہ بے ادبی یا کوتاہی نہ ہو جائے۔ اور ہم عقلی گھوڑے دوڑا کر حضور پاک ﷺ کی باتوں کا عام آدمیوں کے ساتھ موازنہ شروع کر دیں تو پھر معاملہ ادھر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ تو ظاہر ہوا کہ حضور پاک ﷺ کا مزاج شناس بننے کی کوشش سے پہلے حضور پاک ﷺ کو حاضر و ناظر ماننا پڑتا ہے۔ اگر ہماری بسم اللہ ہی غلط ہو کہ ہم حضور پاک ﷺ کو ایسا نہ مانیں تو مزاج شناسی کس کی کریں؟

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں راقم کو یہ خیال وارد ہوا کہ ہر مسئلہ کا حل حضور پاک ﷺ اور بزرگوں کی وساطت سے تلاش کیا جائے۔ چنانچہ جنگ کے ہر مسئلے کا ایک ایسا حل سامنے آ جاتا تھا جو اس سے پہلے نہ کبھی سنا تھا اور نہ سیکھا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ جنگ کے تین چار ماہ بعد کوئٹہ سے واپس آ کر میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جب شہداء کو نذرانہ

عقیدت پیش کرنے کے لیے گیا تو وہ جگہ نہ پہچان سکا، جہاں پر ہم سولہ دن جنگ لڑتے رہے۔صوبیدار میجر چنار گل نے روکا اور بتایا کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی جو فوجی تھے، وہ یہ یقین نہ کر سکے کہ کوئی فوج اتنے دن ایسی تنگی یا غیر اہم جگہ پر لڑائی لڑ سکے گی۔

مجھے ان کو بتانا پڑا کہ یہ جگہ اس وقت مجھے درۂ دانیال کی طرح نظر آتی تھی اور پھر اپنی ساری باتیں اور کارروائیاں یاد آئیں تو خود حیران ہوا کہ ہم وہاں سے یہ سب کچھ کیسے کر سکے؟

بہرحال عاجزی کے ساتھ تجسس کے ذریعے قرآن پاک اور حدیث مبارکہ میں جواب مل جاتے ہیں۔ اور یہ گنہگار آج تک ''اجتہاد'' کے چکر میں نہیں پڑا کہ اجتہاد وہ کرائے جس کو ضرورت ہو اور اس کا نفاذ بھی کر سکے۔ اور پچھلے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ بحث برائے بحث تو تفرقہ کا باعث بنتی ہے۔

بہرحال اگر اس اصول جستجو کا صحیح استعمال کریں تو قرآن پاک اور سنت میں متعدد ایسے اصول اور احکام ملتے ہیں کہ جن کی مدد سے ہم اپنی حکمت عملی اور تدبیرات کے تمام تانے بانے اسلامی فلسفہ حیات کے تابع کر سکتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا اپنا مزاج ہے اور مسلمانوں کو ان اصولوں کے تحت جنگ لڑنا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں یا ہمارے آقا نے ان کی نشاندہی کی ہے اور یہ اصول لکھنے میں مقصد یہ تھا کہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں اور غوطے لگائے جائیں۔

مثلاً تدبیراتی طور پر قرآن پاک کے کئی احکام سے مدد لی جا سکتی ہے، جس میں خاص کر عقب سے حملہ، دشمن کا تعاقب، جنگ سے قبل تیاری، دفاعی تجاویز، سامان جنگ، جنگی قیدیوں سے سلوک، عہد کی پابندی، دشمن کی چالوں سے باخبر رہنا، سازش اور کانا پھوسیوں کی ممانعت، خفیہ سرگرمیوں کا قلع قمع، باہمی مشورہ، متعدد فوجی ضرورتوں کے لیے واضح احکام قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جن پر تفصیلی مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے انتصار کے طور پر ان ضرورتوں کی نشاندہی کر دی ہے کہ فوجی تربیت کے دوران اگر ایسی فوجی ضرورتوں کے لیے قرآن پاک کے ذکر یا حوالے سے کام شروع کیا جائے اور لڑائی میں ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو فتح ہماری ہوگی۔

حضور پاک ﷺ کی سنت سے مدد

اسی طرح حضور پاک ﷺ کے اقوال یا سنت میں بے حساب فوجی ہدایات اور اصول ہیں جن میں سے ایک دو کا بیان یہاں ضروری ہے کہ اول حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''الحرب خدعۃ'' کہ جنگ میں دھوکا ہوتا ہے، تو اصول ہے کہ جنگ میں دشمن کو دھوکا دو اور اس کو حیران کر دو اور خود دشمن سے دھوکا نہ کھاؤ۔ اب جنگ کی ہر سطح پر Surprise & Discipline کا استعمال افواج میں عام ہوتا جاتا ہے اور ہمارے آقا ﷺ آج سے چودہ سو سال پہلے اس ضرورت کے بارے میں حکم دے گئے تھے اور اپنی ہر جنگ میں انہوں نے دشمن کو حیران کر دیا۔ جنگ بدر میں اچانک متحرک دفاع

اپنایا اور دشمن اس کی مضبوطی کو نہ سمجھ سکا۔ اس کے ساتھ ٹکرایا اور پاش پاش ہوگیا۔ جنگ اُحد میں حضور پاک ﷺ اچانک دشمن کے بازو پر نمودار ہو گئے اور اس کو جنگ کے لیے مجبور کر دیا اور جنگ خندق کا بھی ذکر ہو چکا ہے اور خلفائے راشدین کی چاروں کتابوں میں بے شمار اسباق کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سے ایک اور فوجی سبق بھی نکلتا ہے کہ ہر کارروائی میں طریق کار میں کچھ تبدیلی کی جائے۔

علاوہ ازیں قرآن پاک میں پو پھٹتے دشمن کی صفوں میں گھس جانے والی بات اہم ہے اور Dawn Attack اب دنیاوی فوجوں میں عام ہو گیا ہے لیکن حضور پاک ﷺ نے ایک اور سبق سکھایا کہ سورج اگر موافق ہو تو جوابی کارروائی سورج ڈھلنے کے بعد کی جائے۔ حضور پاک ﷺ نے اس سلسلہ میں زبانی احکام دیئے اور صحابہ کرام ؓ نے اس طریق کار کو اپنایا۔ انہوں نے کسی صورت میں اس اصول سے روگردانی نہ کی۔ جنگ نہاوند میں جب ایرانیوں کو اپنی طرف کھینچا گیا اور جوابی کارروائی مقصود تھی، تو دو پہر سے پہلے اس وقت کے ایک فوجی ماہر جناب مغیرہ ؓ بن شعبہ نے سالار لشکر کو جوابی کارروائی کا مشورہ دیا۔ لیکن سالار لشکر جناب نعمان ؓ بن مقرن نے کہا کہ ''ایسا نہیں ہوگا، آقا ﷺ کا حکم ہے کہ یہ کارروائی بعد دو پہر ہی ہو۔'' تفصیل پہلی کتاب میں موجود ہے۔

جنگ نہاوند کا مکمل مطالعہ اس سلسلہ میں آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اور بعد دو پہر جوابی کارروائی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے پاس ردعمل کا وقت نہیں رہتا۔ اور یہی چیز بھرپور کارروائی کو لاگو ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور فلسفہ جنگ میں ہم نے غیروں سے کچھ بھی نہیں سیکھنا۔ ہماری چاروں کتابیں ان اسباق سے بھری پڑی ہیں اور جو کام اپنوں کی نقل میں کیا جائے اس میں سرور ہے اور لطف ہے۔ سکندر، چنگیز، نپولین، مارلبرو، گڈیرین، رومیل، منٹگمری، ویول اور براڈے کی کارروائیوں میں ہمارے لیے کیا لطف ہے۔ اور لڈل ہارٹ یا فلر کی کتابوں میں کیا ملے گا ''تعصب'' یا ہم خواہ مخواہ مرعوب ہوں گے۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

(اقبالؔ)

دفاعی ٹیکنالوجی

بدقسمتی یہ ہے کہ جو آدمی اپنوں کی نقل کے بارے میں کہتا ہے اس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ آدمی چاہتا ہے کہ نیزوں اور بھالوں سے لڑائی ہو، خیر، نیزوں اور بھالوں کا وقت بھی شاید دوبارہ آ جائے اور پاکستان میں آزادی کے وقت یہ موقع آیا تھا۔ اس وقت اگر ہم نیزے اور بھالے بھی اٹھا لیتے تو عزت رہ جاتی اور کشمیر بھی مل جاتا۔ لیکن جب

لڑنے کا جذبہ ہی مفقود تھا اور سب بھروسہ غیروں کے دیئے ہوئے ہتھیاروں اور بارود پر تھا تو جنگ کی تجویز ہی نہ بنی، لڑائی کی تجویز بنتی رہیں اور فائر بندی کا انتظار تھا۔ درحقیقت ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء کے واقعات کو مکمل جنگ (War) نہیں کہہ سکتے کہ یہ جھڑپیں تھیں۔ بہرحال اب اگر جنگ کی تیاری کرنا ہے تو ساتھ دفاعی ٹیکنالوجی کی بھی ضرورت ہوگی اور اس کا انحصار ملک کی ٹیکنالوجی پر کرنا ہوگا یعنی اس سلسلہ میں بھی اپنے آپ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

قرآن پاک کی سورۃ حدید میں ہماری توجہ اللہ تعالیٰ اس طرف مبذول کراتا ہے کہ دھاتوں کے استعمال میں بڑے فائدے ہیں اور جن تیز رفتار چیزوں کی اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے اور ہم ذکر کر چکے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہمیں آگاہ کر رہا تھا کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جنگ میں ایسے ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی۔ حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مجاہدین یمن بھی گئے تھے کہ وہاں پر نئے ہتھیاروں کا استعمال سیکھیں اور ایسے ہنر کے سیکھنے سے حضور پاک ﷺ نے یہ نہیں منع فرمایا کہ غیروں سے نہ سیکھے جائیں اس لیے غیر اگر ہمیں ٹیکنالوجی یا دفاعی ٹیکنالوجی سکھلائیں تو ضرور ان سے یہ سب کچھ سیکھا جائے اور اپنی افواج کو سامانِ حرب کے سلسلہ میں خود کفیل کیا جائے تاکہ ان کی ضرورتیں ملک ہی میں پوری ہو سکیں۔

بہرحال یہ وسیع مضمون ہے اور اس کے لیے علم، ہنر اور ذرائع کی ضرورت ہے اور غیر یہ نہ چاہیں گے کہ ان سب علوم پر ہمیں دسترس حاصل ہو جائے۔ نیوکلیئر یا اٹامک طاقت کے سلسلہ میں قوم آگاہ ہے کہ غیر کس طرح ہماری مخالفت کر رہے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہوگا اور ایمان کی ایک ایسی سطح ہے کہ تمام علوم آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر قوم کا ایمان و یقین درست ہو گیا تو ٹیکنالوجی بھی حاصل ہو جائے گی لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ وہ خدا ہمارے ہاتھوں میں تب دے گا جب اس سلسلہ میں محنت کریں گے۔ بہرحال یہاں پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں فوجی تدبیرات اور حکمت عملی کی بنیاد بناتے وقت زیادہ انحصار اس ساز و سامان پر کرنا ہوگا جو اپنے ملک میں سے حاصل ہو سکے۔ اور باقی جو کچھ باہر سے مل جائے اس کو بھی انعام خداوندی سمجھ کر قبول کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم مزید وضاحت نہ کریں گے کہ مضمون بہت لمبا ہو جاتا ہے۔

حضور پاک ﷺ کا اسلام

ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ حضور پاک ﷺ کے اسلام پر باطل والوں نے پردے ڈال دیئے ہیں اور سازش جاری ہے۔ کتابوں کے اس سلسلہ میں راقم نے تمام تر واقعات تاریخوں سے لیے ہیں۔ جائزوں میں قرآن پاک اور حدیث مبارکہ کے حوالوں کے علاوہ حضور پاک ﷺ کے رفقاء عملوں سے مثالیں دی ہیں۔ لیکن قارئین کو ان میں سے کئی باتیں نئی معلوم ہوں گی۔ لیکن اگر اسلام کی تاریخ کا با مقصد اور تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو عجیب و غریب راز افشا ہوتے ہیں۔ مختلف عقائدی گروہ بحث برائے بحث کو پر لطف جانے کے لیے خواہ مخواہ کوئی حدیث گھڑ لیتے تھے۔ تفرقہ پیدا

کرنے والوں نے کیا کچھ نہ کیا۔ یہ بڑے وسیع مضامین ہیں۔لیکن ہم نے چند ضروری باتوں سے پردے ہٹائے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی بنیادی بات وحدت فکر اور وحدت عمل ہے۔ایک خبر پڑھی تھی کہ مکہ مکرمہ میں ایک اجتماع ہونے والا ہے، جہاں تمام گروہی اختلافات مٹانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمارے لحاظ سے حضور پاک ﷺ کے اسلام کا نفاذ فقہ وحدت یا فقہ عسکریت کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ یہی نصیحت مرحوم آغا خان نے ہمیں ۱۹۵۰ء میں کی کہ ہم پہلے سو سال کے اسلام کا مطالعہ کریں۔ جہاں ہمیں وحدت فکر و وحدت عمل والا اسلام تلاش کرنا ہو گا۔ پھر اس کا نفاذ کرنا ہے اور آگے اولی الامر اور مشاورت کے معاملات تو آسان ہیں، مشکل یہ ہے۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

اسلام کا نفاذ

ہمارے لحاظ سے اسلام وہ ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہ فقہ وحدت ہے یا فقہ عسکریت ہے۔نظام مصطفیٰ ہے اور نظام جہاد ہے۔ پوری قوم اللہ کی فوج ہے۔ان کو بنیان المرصوص بنانا ہے تو ترجیحات کے طور پر۔اس کو مندرجہ ذیل سات مرحلوں کے تحت نافذ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلا مرحلہ...... تنظیم

پوری قوم کو منظم کرنا ہوگا۔البتہ اس کے لیے قومی تنظیم کی ضرورت ہے۔جس کے لیے اصول میثاق مدینہ سے لینے ہوں گے۔لیکن ان چند فقروں سے نہیں جو مولانا شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی کتابوں میں لکھ دیئے ہیں بلکہ ان پچاس کے قریب اصولوں سے جو ابن اسحٰق اور ابن سعد کی کتابوں میں موجود ہیں۔

۲۔ دوسرا مرحلہ...... تنظیمی تربیت

پوری قوم کو نظام میں باندھنے کے لیے کچھ اصول بنانے ہوں گے اور جس کا مختصر ذکر آگے آتا ہے۔

۳۔ تیسرا مرحلہ...... فن سپہ گری کی تربیت

کہ پوری قوم کو عسکری تربیت کس طرح دی جائے۔

۴۔ چوتھا مرحلہ...... عسکری تنظیم

قوم کی عسکری تنظیم کرنا کہ وہ ملک کے دفاع میں شریک ہو سکے۔

۵۔ پانچواں مرحلہ...... رابطہ

یعنی پیشہ ور افواج اور قوم کی عسکری تنظیموں میں رابطہ پیدا کرنا۔

۶۔ چھٹا مرحلہ...... پیشہ ور افواج کی تنظیم نو

ان افواج کو اس طرح منظم کرنا کہ ان کا زیادا انحصار ملکی وسائل پر ہو۔

۷۔ ساتواں مرحلہ...... ملک کی دفاعی حکمت عملی اور تدبیرات

ملک کی دفاعی حکمت عملی اور تدبیرات کو اسلامی خطوط اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنا۔

کہہ دینے میں تو یہ باتیں بڑی آسان معلوم ہوتی ہیں لیکن ان باتوں پر عمل کرنے کے لیے وسائل کی ضرورت ہے اور حکومت کے باقی شعبوں کو بھی اسی طرح چلانا ہوگا کہ دوغلا پن نہ ہو یا معاملات آدھا تیتر اور آدھا بٹیر نہ بن جائیں۔ ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس میں ذرائع ابلاغ، تعلیم، قانون اور انصاف کو تو پہلے ہی دفاع کے ساتھ برابری دے دی گئی ہے کہ یہ بھی بنیادی مدیں ہیں۔ اس لیے ان سب مدوں کے لیے کم سے کم اتنے اصول تو بنانے ہوں گے جتنے دفاعی فلسفہ کے بنائے گئے ہیں۔ یہ کام ماہرین کو کرنا ہوگا۔

البتہ مادی ذرائع کے لیے وحدت والی پالیسی بنانا ذرا مشکل کام ہے اور اس سلسلہ میں ہم کوئی خاکہ نہ پیش کر سکے۔ ہاں، چند اصول لکھ دیئے گئے ہیں کہ ان ذرائع کو ایسے اصولوں کے تحت چلانا ہوگا جو اسلامی فلسفہ حیات کے تابع ہوں، پھر ان باتوں پر عمل پیرا ہونے کے طریق کار اور مرحلے مقرر کرنا ہوں گے اور قومی وحدت یا دینی امور کے لیے ایک وزارت بنانا ہوگی جو قوم میں وحدت فکر اور وحدت عمل پیدا کرے چنانچہ اس نئی دینی وزارت کو "فقہ وحدت" کے تحت بنانا ہوگا۔

☆☆☆

اس کے بعد اب ہم پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج بنانے کے سلسلہ میں بنیادی باتوں اور مرحلوں کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

ا۔ پہلا مرحلہ...... تنظیم

اول ضرورت یہ ہے کہ پوری قوم کو منظم کیا جائے۔ اسلام میں شرکت منظم ہو کر کی جاتی ہے اور ہر فرد کسی منظم ادارے کے تحت اور کسی امیر کے تحت بڑی تنظیم یا فوجی تنظیم کا حصہ ہوتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح، جس طرح ایک سپاہی اپنے سیکشن کے ذریعے سے اپنی پلٹون، کمپنی، بٹالین، بریگیڈ، ڈویژن، کور اور آرمی کا ایک ممبر یا حصہ بن جاتا ہے، ہمارے خیال کے مطابق یہ کام صوبائی حکومتوں کے سپرد ہونا چاہیے اور ملک میں کتنے صوبے ہوں یہ بات اتنی اہم نہیں۔ البتہ موجودہ لسانی یا ثقافتی نظام تبدیل کر کے اسلامی نام رکھے جائیں جو ان صوبوں میں پہلے مسلمان فاتحین یا فقراءؒ کے نام ہو سکتے ہیں۔ مثلاً عاصم بن عمرو بلوچستان کے لیے، قاسم سندھ کے لیے، غزنی پنجاب کے لیے، عبداللہ بن عامر یا عبدالرحمٰن بن سمرہ وغیرہ سرحد کے لیے۔ یا داتا گنج بخش، سخی سرور، بھٹ شاہ، ہو باہو (کلر کہار) یا اس قسم کے نام ہو سکتے ہیں جو وحدت پیدا کریں۔ بہر حال ہر فرد کو کسی نہ کسی مسجد یا مسجد کے امام کے ذریعے سے قوم کی اس تنظیم میں شامل ہونا پڑے گا لیکن ان مسجدوں کو ایسا بنانا پڑے گا کہ ان کا امام واقعی امیر ہو اور یہ مسجدیں مجاہد پیدا کریں اور ان مسجدوں میں مومن کی اذان شروع ہو۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

ہر فرد کو اپنی مرضی کے مطابق مسجد کے چناؤ کی اجازت ہو، لیکن ایک دفعہ ایک جگہ چن لی جائے تو ہر روز بلاوجہ تبدیلی کی اجازت نہ ہوگی۔ ہاں، اگر کوئی آدمی پیشہ کی وجہ سے یا نقل مکانی کے سبب رہائش گاہ میں تبدیلی کر دے تو اس کو نئی مسجد کا رکن بننا ہوگا۔ یہ ایک خاکہ ہے لیکن اس میں رنگ بھرنا ہوگا۔ اور تفصیلی ہدایات بعد میں جاری کرنا ہوں گی۔

۲۔ دوسرا مرحلہ...... تنظیمی تربیت

حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے، بخدا اگر ان کو بچوں اور عورتوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ ان تمام گھروں کو جلا دیتے جہاں سے مرد مسجدوں میں نہیں آتے۔ اول تو اس حکم میں اسلام کی آمریت کا پہلو ہے کہ اسلام جمہوریت نہیں۔ دوم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجدوں میں ہمیں تنظیمی اور روحانی تربیت دی جاتی ہے۔ مسجد اور مسجد میں تربیت کا ذکر بڑا تفصیلی ہے۔ بہر حال اسلام میں بامقصد نماز کا حکم ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؔ)

ہماری موجودہ نمازوں اوراذانوں کے بارے میں علامہ یوں فرما گئے۔

تیری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

(اقبالؔ)

چنانچہ ان نمازوں کو بامقصد بنانے کے لیے ان کی ادائیگی اس طرح ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے اندر قلبی اور جسمانی وحدت پیدا کریں۔ اور ہم ربط وضبط اور اطاعت امیر کے اصول سیکھیں کیونکہ ان مسجدوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں جب مل کر سجدہ کرتے تھے تو یہ سماں بندھ جاتا تھا۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

(اقبالؔ)

تو ہمیں اپنی موجودہ نمازوں کی بجائے بہت کچھ کرنا ہوگا اور موجودہ حالت کو چھوڑنا ہوگا کہ

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

(اقبالؔ)

پہلے بھی گزارش ہو چکی ہے کہ نماز کا پہلو بہت وسیع ہے کہ اسلام باجماعت نماز کا دعوے دار ہے۔ دراصل لفظ صلوٰۃ کے وسیع ترمعانی ہیں اور اس کے ترجمہ ''نماز'' میں وہ بات نہیں آتی۔ صلوٰۃ کے مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ حالات سے آگاہی کے لیے اکٹھے ہوں اور اپنے لیے راہ عمل کو سوچیں اور امیر کے حکم کے مطابق اپنی ذمہ داری کو سنبھالیں۔ قرون اولیٰ میں جب کوئی اجتماع مقصود ہوتا تھا تو ''صلوٰۃ...... صلوٰۃ'' پکارا جاتا تھا اور لوگ مسجد میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ہم مسجد میں اس لیے بھی اکٹھے ہوں گے کہ اپنی ذمہ داریاں سن لیں۔ وہاں ہی محلے یا گاؤں کے معاملات کو حل کریں گے، ہمسایوں کے حقوق پورے کریں گے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کی راہ نکالیں گے۔ اطاعت امیر کے فلسفہ کو اپنائیں گے۔ آپس میں تفرقے مٹائیں گے۔ اسلامی ایمان ویقین جس کا ذکر ہو چکا ہے، وہ سیکھیں گے اور نماز کے سلسلہ میں فضول اختلافات کہ ہاتھ کہاں باندھیں یا قرأت کیسے پڑھیں وغیرہ ان کو سب کو مٹانا ہوگا۔ بلکہ نماز کے فلسفہ میں جا کر روحانی، قلبی اور جسمانی وحدت کے ذریعے اسلام کے وحدت فکر اور وحدت عمل کے نظریہ پر عمل کرنا ہوگا۔

نماز سے ہمارے اندر وحدت پیدا ہوتی ہے۔ ہم صف بندی یا جنگ میں مورچہ بندی کے اصول سے آگاہ ہوتے

ہیں، حکم ماننے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے، محبت اور الفت پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو جوڑ دیتا ہے کہ روحانی و جسمانی وحدت ہوتی ہے۔ علاوہ صفائی کا خیال ہوتا ہے کہ وضو نماز کی تیاری ہے تو نماز جنگ یا جہاد کی تیاری ہے۔

نماز کے علاوہ روزہ بھی جنگ کی تیاری کی تربیت دیتا ہے اور صبر سکھلاتا ہے کہ ہم جو اصول مصابرہ کا ذکر کر چکے ہیں، تو صبر ہی سے اس اصول پر عمل پیرا ہونے کی تربیت ہوتی ہے۔ علاوہ روزہ، ایمان و یقین کی ایک ارفع مثال ہے کہ فرد کا تعلق اپنے خدا سے ہوتا ہے کہ روزہ میں سوائے فرد اور خدا کے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ روزہ ہے یا نہیں، روزے کا اخلاقی پہلو بھی ہے کہ ہاتھ کا روزہ، کان کا روزہ، آنکھ کا روزہ وغیرہ۔ یعنی تمام شر والی باتوں سے دوری اختیار کی جائے تو تب روزہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قربانی اور زکوٰۃ میں خیرات بانٹنے سے بھی تعلقات بڑھتے ہیں۔ اور امیر و غریب ایک ہوتے ہیں، اس لیے اسلام کے لحاظ سے امیر مسجد یا امیر محلّہ ہی اسلام پر عمل پیرا کر کے اپنے لوگوں کو بنیادی تربیت دے گا۔ اور اوپر یونین کونسل اور تھانہ کی تنظیمیں اس تربیت کو بہتر طور پر منظم کرنے میں مدد دیں گی۔ البتہ ہماری مسجدوں میں درس نظامیہ کے زمانے کے جو خطبات موجود ہیں، ان سے ضرور مدد لی جائے گی۔ لیکن تعلیم و تدریس اور محلّہ کے کاموں کے لیے اس زمانے کی ضرورت کے مطابق تربیت کے لیے ہدایات لکھنا پڑیں گی۔ یعنی لوگوں کو اپنی ذمہ داری پوری کرانے کے لیے مرکزی حکومت خطبات کا بندوبست کرے گی جو مسجدوں میں دیئے جائیں گے۔ بے شک یہ بھی بڑا وسیع مضمون ہے۔ لیکن موجودہ تفرقات والے خطبے ختم کرنے ہوں گے اور تقریر برائے تقریر کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ یعنی خطبات ایسے نہ ہوں۔

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب

(اقبالؒ)

اس سلسلہ میں محلّہ کے لوگوں کو کئی حصوں میں بانٹنا ہوگا۔ اول بچوں کی تربیت اور ان کے لیے کم از کم دینی تعلیم کا معیار اور نصاب مقرر کرنا ہوگا جس میں لڑکوں کے لیے الگ اور لڑکیوں کے لیے الگ درس بنانے ہوں گے۔ پھر محلّہ کی عورتوں کی تربیت کے لیے طریق کار وضع کرنا ہوں گے۔ اور مردوں کو بھی دو حصوں میں بانٹنا ہوگا کہ جوان مرد اور زیادہ عمر والے مردوں کے الگ الگ گروہ بنانے ہوں گے۔ اب کچھ خطبات عام قسم کے ہوں گے جو جمعہ والے دن یا کسی خاص دن دیئے جائیں گے اور ان میں پوری قوم یعنی چھوٹے بڑے کی تربیت پر چند باتیں ہوں گی۔ اور ہر جمعہ کا خطبہ الگ ہو گا۔ لیکن عام تربیت کے لیے نصاب اور اوقات مقرر کرنے ہوں گے کہ جوان یا بوڑھوں کو مسجدوں میں کس وقت کتنی کتنی تربیت دی جائے۔ یہ سب ضرورتیں اور خاکے ہیں۔ اس سلسلہ میں مکمل ہدایات مرکزی حکومت کو جاری کرنا ہوں گی۔

۳۔ تیسرا مرحلہ......سپہ گری کی تربیت

بے شک تنظیمی تربیت ایک جاری وساری معاملہ ہے اور اس کو قائم رکھا جائے گا لیکن ساتھ ہی سپہ گری کی تربیت بھی دینا ہوگا اور ہم مرحلہ کے غور پر اس کو اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ تنظیمی تربیت کے بعد ہی سپہ گری کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے۔ اور جہاد میں تب ہی شرکت ہو سکتی ہے کہ انسان کو فن سپہ گری کی شدھ بدھ ہو۔ اس لیے پوری قوم کو فن سپہ گری سیکھنا ہوگی۔ یہ تربیت بھی مسجدوں اور محلوں کے تحت ہوگی۔ اور اس کی بھی کم از کم دو قسمیں ہوں گی۔ ایک بنیادی سپہ گری جس میں ایک آدھ ہتھیار اور بچاؤ کے طریقے یا اپنے علاقے اور محدود قسم کے دفاعی مسئلے سکھلائے جائیں گے۔ یہ سب لوگوں کے لیے لازم ہوگی۔ اور عورتوں کی کافی تعداد کو اس میں شریک کرنا ہوگا۔ اس سے بڑھ کر کچھ عسکری ضروریات کی سپہ گری ہوگی کہ قوم کے وہ افراد جو گھر کو چھوڑ سکتے ہوں ان کو اس عسکری تنظیم کا حصہ بھی بنانا ہوگا جس کا ذکر ہم چوتھے مرحلہ میں کریں گے۔ اس لیے ان لوگوں کو کچھ اضافی تربیت بھی دینا ہوگی کہ اپنے گھروں سے دور ہو کر وہ قوم کی دوسری عسکری ضرورتوں کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ فن سپہ گری سے نابلد قومیں مٹ جاتی ہیں یا ذلت کا شکار ہو جاتی ہیں اور دین فطرت نے تو پہلے ہی دن سے پوری قوم کو جہاد میں شرکت کا حکم دیا، ورنہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

(اقبالؔ)

۴۔ چوتھا مرحلہ یا ضرورت......قوم کی عسکری تنظیم

عام اور بنیادی سپہ گری سے بڑھ کر کچھ خاص قسم کی سپہ گری میں بھی عام سویلین کام کر سکتے ہیں اور سرکاری ملازمین جن کی تعداد بارہ لاکھ کے قریب ہے، ان کو اس قسم کی سپہ گری کی تربیت دینے کی سفارش پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ یہ کام آج کل جانباز فوج کے ذریعہ سے محدود طریقوں پر کیا جا رہا ہے کہ ان کو کچھ ذمہ داریاں دی گئی ہیں، یعنی دشمن کے ہوائی جہازوں کے خلاف کارروائی کرنا یا ملک کے حفاظتی کاموں اور اندرونی دفاع میں حصہ لینا یعنی دشمن کی چھاتہ بردار یا فضائی فوج کے خلاف کارروائی کرنا، ذرائع آمدورفت اور اہم مقامات کی حفاظت وغیرہ، جانباز افواج البتہ وزارت دفاع اور جنرل ہیڈکوارٹر کے تحت مرکزی حکومت کا حصہ ہیں۔ لیکن یہ کام صوبائی حکومتوں کو کرنا چاہیے۔ اور اب ایسی سویلین عسکری تنظیمیں بہت زیادہ ہو جائیں گی کہ ہر تھانہ میں کم از کم ایک یا دو بٹالین رضا کار عسکری فوج ہوگی۔ بعض جگہ

یہ نفری زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

تو ظاہر ہے کہ ہر تھانہ میں ایسی عسکری تنظیمیں رکھنا ہوں گی، جو گاؤں گاؤں اور محلّہ محلّہ میں لوگوں کو دونوں قسم کی سپہ گری کی تربیت دیں اور خاص کر لوگوں کو عسکری تنظیموں میں جوڑ کر ایسی کئی بٹالین بنائیں جو اپنے علاقہ کا دفاع اور ضروریات بھی پوری کر سکیں اور کچھ بٹالینز دور دراز علاقوں یا محاذ جنگ پر جا کر وہاں کی عسکری تنظیموں یا پیشہ ور افواج کی مدد کر سکیں۔

ان عسکری تنظیموں کی تربیت تو صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری میں ہونا چاہیے کہ لوگوں کا زیادہ واسطہ صوبائی حکومت کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن ان فوجوں کا استعمال وزارت دفاع اور پیشہ ور افواج کے دفاعی فلسفہ کے تحت ضرورت کے مطابق اس طرح سے ہو، جس طرح آج کل ملکی دفاع میں جانباز فوج یا سکاؤٹس یا رینجرز وغیرہ کو ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔ امید واثق ہے کہ یہ تنظیمیں پیشہ ور افواج سے کافی ذمہ داریاں لے لیں گی اور ملکی دفاع اور زیادہ مضبوط ہوگا۔ اور اس طرح جب ملک کے چپہ چپہ میں مردان خدا اللہ تعالیٰ کے راستے پر لڑنے کو تیار کھڑے ہوں گے تو یہ سماں ہوگا۔

صف جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

(اقبالؔ)

۵۔ پانچواں مرحلہ...... پیشہ ور افواج اور سویلین عسکری تنظیموں کا رابطہ

یہ سویلین عسکری تنظیمیں ملک کے دفاع میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیں گی۔ اور پیشہ ور فوج کے لیے سیکھے ہوئے جوان جلدی میسر ہو جائیں گے جن کو صرف پیشہ ور فوج کی تربیت میں باندھنا ہوگا۔ یعنی وہ بنیادی سپہ گری تو جانتے ہی ہوں گے اور خاص خاص پیشہ ور کاموں کی تربیت بھی جلد حاصل کر لیں گے۔ یہ عسکری تنظیمیں ویسے تو سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہوں گی اور وزارت دفاع ان میں سے کچھ تنظیموں کو فضائی و بحری افواج کے ساتھ بھی منسلک کر دے گی۔ جانباز فوج کے استعمال کے سلسلہ میں کچھ Standing Order for War لکھے جا چکے ہیں۔ اول تو وہ مل جائیں گے، ورنہ اسی قسم کے اصولوں پر قوم کی عسکری تنظیموں کو لڑاکا یا بند دستی ہیڈ کوارٹروں کے ساتھ ضرورت کے تحت اس طرح وابستہ کیا جائے گا کہ وہ ملکی دفاع میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ بے شک یہ تفصیلی ہدایات ہوں گی، جس میں اول سوال نفری، تنظیم اور معیار کا ہوگا۔ اور پھر ضرورت کے مطابق پیشہ ور افواج کی متعدد ذمہ داریاں ان لوگوں کو دینا ہوں گی اور پیشہ ور فوج کو خاص اور مشکل دفاعی کاموں کی ذمہ داری دی جائے گی۔

۶۔ چھٹا مرحلہ...... پیشہ وارانہ افواج کی تنظیم نو

تینوں پیشہ ور افواج کی تنظیم تو کرنا ہوگی۔ ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تاریخ اور روایات کو دفن کرنا ہوگا۔ ہمارے رجمنٹل جھنڈوں پر قط العمارہ، سرنگا پٹم، دہلی، کابل اور قندھار کے نام ونشان ہیں، ان باتوں کو بھول جانا ہوگا۔ یہ فخر کی باتیں نہیں، یہ غلامی کے زمانے کی یادگاریں ہیں۔ ہمیں تو حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین ؓ کے زمانے کے کارناموں پر فخر کرنا سیکھنا ہوگا۔ بہر حال بری افواج کی تنظیم نو کے سلسلہ میں تو کچھ خاکہ یا اصول وضع کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بحری اور فضائی فوج کے سلسلہ میں ہماری سمجھ محدود ہے۔ یہ کام ہم ان کے ذہن پر چھوڑیں گے کہ وہ صاحبان بنیادی باتوں کو یاد رکھیں۔

البتہ بری فوج کی بنیاد ان ہتھیاروں پر ہونا ہوگی جو ملک میں موجود ہیں اور حاصل ہو سکیں۔ وہ بھاری ہتھیار اور گولہ بارود جو ہمارے پاس باہر کے ملکوں سے آیا ہوا ہے یا آتا ہے۔ اس کو انعام خداوندی ضرور سمجھا جائے کہ شاید اور بھی ملتا رہے گا لیکن ایسے سامان کو استعمال کرنے میں سخت کفایت کی ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ سویلین عسکری تنظیموں سے ہمیں کافی پیدل فوج مل جائے گی۔ اس لیے موجودہ پیدل فوج میں سے کافی تعداد کو کمانڈو یا شبخونی مجاہد یا کفن پوش مجاہدین میں تبدیل کرنا ہوگا۔ خاص کاموں کو جاننے والے سویلین کو ڈرائیور، گاڑیاں ٹھیک کرنے کے کام اور فائرلیس کے کاموں میں پہلے سے ہی ریزرو بنا دیا جائے گا تاکہ بوقت ضرورت فوج کے خاص محکمہ یعنی رسالہ، توپ خانہ، سگنل یا ایم ٹی وغیرہ کے لیے بھی ریزرو لوگ موجود ہوں۔ اس طرح کچھ رجمنٹ وقتی ہو سکتی ہیں جن کو محدود سٹاف امن کے زمانے میں قائم رکھے گا۔ اور جنگ میں ریزرو کی مدد سے ان کی نفری پوری ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں امن کے زمانے میں بہت زیادہ افسروں کی تربیت دی جائے تاکہ جنگ میں جب افواج میں وسعت یا پھیلاؤ ہو تو افسر موجود ہوں کہ چند دن یا چند ماہ کی تربیت سے افسر نہیں بن سکتے اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ افواج کو مکمل مذہبی تربیت دینا ہوگی کہ فی الحال یا پچھلے کئی سالوں سے یہ حالت رہی ہے۔

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

(اقبالؒ)

۷۔ ساتواں مرحلہ یا ضرورت...... حکمت عملی اور تدبیرات میں تبدیلی

افواج کی تنظیم نو، سامان جنگ کا جائزہ، دفاعی ٹیکنالوجی کے معیار اور سویلین کو عسکری تنظیموں کی پیشہ ور افواج

سے رابطے کے بعد، ہمیں اپنی حکمت عملی اور تدبیرات دنوں میں کافی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ ہماری افواج کو صرف لڑائی (Battle) لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ہم فائر بندی تک چند دن لڑائی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہماری آنے والی جنگیں بڑی بھیانک ہوں گی اور چند دن کی بات نہ ہوگی۔ اس لیے ہمیں اپنی سرحدوں کے دفاعی علاقے ان ترجیحات پر بنانے ہوں گے کہ کہاں پر زیادہ پیشہ ور افواج کی ضرورت ہوگی اور کن مقامات پر تھوڑی پیشہ ور فوج اور سویلین عسکری تنظیمیں دفاع کریں گی۔ جارحانہ اقدام کی بھی کئی سطحیں یا مرحلے بنانا پڑیں گے۔ محدود جارحانہ اقدام اور ان کو کون کہاں تک کرے گا۔ بھرپور جارحانہ اقدام جو صرف پیشہ ور افواج ہی کر سکتی ہیں۔ اور یہ کام تب ہوگا کہ فتح نزدیک آ چکی ہے۔ شروع شروع میں جارحانہ اور متحرک دفاع سے دشمن کو روکا جائے گا اور جوابی طور پر محدود جارحانہ اقدام کیے جائیں گے۔

جارحانہ اقدام کے طریق کار میں بھی تبدیلی لانا ہوگی کہ شروع کے مرحلوں میں شبخونی مجاہدوں کو دشمن کے اندر گھس جانے کی کارروائی ہوگی اور جو کامیابیاں وہ حاصل کریں گے، ان کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے پورے دفاعی ''ادارے'' کو آگے رینگنا ہوگا۔ (i.e. The Defence Posture will have to roll forward)

بہر حال اس سلسلہ میں تفصیلی باتیں اس مسودے میں نہیں لکھی جا سکتیں کہ فائر پاور یا متحرک طاقتوں کو کس طرح شیر و شکر کر کے ایک رولر کی طرح آگے رینگنا ہوگا۔

اسی طرح تدبیرات میں بہت تبدیلیاں لانا ہوں گی اور اتنے زیادہ چھوٹے چھوٹے دستوں کو دشمن کے اندر گھس کر کارروائی کرنا ہوگی، جس کا بیان وسیع تر ہے۔ اصول یہ ہوگا کہ ان میں زیادہ تر کفن پوش ہوں گے، کم از کم ذہنی طور پر۔ اور دور دور کے علاقوں میں چھوٹے دستے یہ کام کریں گے اور اپنی نزدیک والی فوجوں سے رابطہ کے بغیر کام کریں گے۔ لیکن نزدیکی دشمن کے لیے بڑے دستوں کو ایسا کام اپنے نزدیک والے دفاعی دستوں کے ساتھ رابطہ باندھ کر ایسا کرنا ہوگا تا کہ اپنے دفاعی دستے آگے رینگ سکیں۔ ظاہر ہے کہ بکتر بند گاڑیوں، توپ خانہ اور ہوائی جہازوں کا کم سے کم استعمال ہوگا اور شروع شروع میں وہ صرف محدود جوابی کارروائیوں میں کام کریں گے۔ بہر حال یہ اشارے ہیں اور حضور پاک ﷺ اور ان کے رفقاء کی جنگوں کے مطالعہ سے اس گنہ گار پر یہ طریق کار ''وارد'' ہوئے ہیں جن کے عملی ہونے کی بات زیر بحث آ سکتی ہے کہ یہ حرف آخر نہیں اور ان کی تفصیل بعد میں دی جائے گی۔

لیکن اول ضرورت فلسفہ حیات پر عمل کی ہے۔ جب تک ہم خود اپنے علاقہ میں اسلامی فلسفہ حیات کو نہیں اپناتے تو آگے فتح کیے ہوئے علاقے لوگوں کو دینے کے لیے ہمارے پاس کون سی چیز ہے؟

مغربی جمہوریت اور آزادی! (نعوذ باللہ) یہ تو پہلے ہی ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔ مسلمان تو ملک فتح نہیں

کرتے، وہ تو لوگوں کے دل فتح کرتے ہیں اور ایسا تب ہو سکتا ہے کہ وہ خود مسلمان ہوں اور وہاں سے باطل کو مٹانا ہوگا۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوف باطل کیا، کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

(اقبالؒ)

خلاصہ:

یہ نظام جہاد کی چیدہ چیدہ باتیں ہیں۔ اعلان کرنے سے یا فتوے دینے سے جہاد کی ضرورتیں اور تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ یہ ایک طرز زندگی اور اس کو ربط وضبط سے جاری وساری کرنا ہوگا۔ یہ ایک کٹھن کام ہے۔ یہاں مادیت سے مکمل طور پر توبہ کرنا ہوگی اور پچھلے اڑتالیس سالوں (بلکہ 67 سالوں) میں ہم نے جو کچھ کیا ہے اس پر اپنے آپ کو ملامت کرنا ہوگی اور دین شاہبازی اختیار کرنا ہوگا۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

(اقبالؒ)

❖❖❖

سے رابطے کے بعد، ہمیں اپنی حکمت عملی اور تدبیرات دنوں میں کافی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ ہماری افواج کو صرف لڑائی (Battle) لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ہم فائر بندی تک چند دن لڑائی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہماری آنے والی جنگیں بڑی بھیانک ہوں گی اور چند دن کی بات نہ ہوگی۔ اس لیے ہمیں اپنی سرحدوں کے دفاعی علاقے ان ترجیحات پر بنانے ہوں گے کہ کہاں پر زیادہ پیشہ ور افواج کی ضرورت ہوگی اور کن مقامات پر تھوڑی پیشہ ور فوج اور سویلین عسکری تنظیمیں دفاع کریں گی۔ جارحانہ اقدام کی بھی کئی سطحیں یا مرحلے بنانا پڑیں گے۔ محدود جارحانہ اقدام اور ان کو کون کہاں تک کرے گا۔ بھر پور جارحانہ اقدام جو صرف پیشہ ور افواج ہی کر سکتی ہیں۔ اور یہ کام تب ہوگا کہ فتح نزدیک آ چکی ہے۔ شروع شروع میں جارحانہ اور متحرک دفاع سے دشمن کو روکا جائے گا اور جوابی طور پر محدود جارحانہ اقدام کیے جائیں گے۔

جارحانہ اقدام کے طریق کار میں بھی تبدیلی لانا ہوگی کہ شروع کے مرحلوں میں شبخونی مجاہدوں کو دشمن کے اندر گھس جانے کی کارروائی ہوگی اور جو کامیابیاں وہ حاصل کریں گے، ان کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے پورے دفاعی ''ادارے'' کو آگے رینگنا ہوگا۔ (i.e. The Defence Posture will have to roll forward)

بہر حال اس سلسلہ میں تفصیلی باتیں اس مسودے میں نہیں لکھی جاسکتیں کہ فائر پاور یا متحرک طاقتوں کو کس طرح شیر وشکر کر کے ایک رولر کی طرح آگے رینگنا ہوگا۔

اسی طرح تدبیرات میں بہت تبدیلیاں لانا ہوں گی اور اتنے زیادہ چھوٹے چھوٹے دستوں کو دشمن کے اندر گھس کر کارروائی کرنا ہوگی، جس کا بیان وسیع تر ہے۔ اصول یہ ہوگا کہ ان میں زیادہ تر کفن پوش ہوں گے، کم از کم ذہنی طور پر۔ اور دور دور کے علاقوں میں چھوٹے دستے یہ کام کریں گے اور اپنی نزدیک والی فوجوں سے رابطہ کے بغیر کام کریں گے۔ لیکن نزدیکی دشمن کے لیے بڑے دستوں کو ایسا کام اپنے نزدیک والے دفاعی دستوں کے ساتھ رابطہ باندھ کر ایسا کرنا ہو گا تا کہ اپنے دفاعی دستے آگے رینگ سکیں۔ ظاہر ہے کہ بکتر بند گاڑیوں، توپ خانہ اور ہوائی جہازوں کا کم سے کم استعمال ہوگا اور شروع شروع میں وہ صرف محدود جوابی کارروائیوں میں کام کریں گے۔ بہر حال یہ اشارے ہیں اور حضور پاک ﷺ اور ان کے رفقاء کی جنگوں کے مطالعہ سے اس گنہ گار پر یہ طریق کار ''وارد'' ہوئے ہیں جن کے عملی ہونے کی بات زیر بحث آ سکتی ہے کہ یہ حرف آخر نہیں اور ان کی تفصیل بعد میں دی جائے گی۔

لیکن اول ضرورت فلسفہ حیات پر عمل کی ہے۔ جب تک ہم خود اپنے علاقہ میں اسلامی فلسفہ حیات کو نہیں اپناتے تو آگے فتح کیے ہوئے علاقے لوگوں کو دینے کے لیے ہمارے پاس کون سی چیز ہے؟

مغربی جمہوریت اور آزادی! (نعوذ باللہ) یہ تو پہلے ہی ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔ مسلمان تو ملک فتح نہیں

کرتے، وہ تو لوگوں کے دل فتح کرتے ہیں اور ایسا تب ہوسکتا ہے کہ وہ خود مسلمان ہوں اور وہاں سے باطل کو مٹانا ہوگا۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوف باطل کیا، کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

(اقبالؔ)

خلاصہ:

یہ نظام جہاد کی چیدہ چیدہ باتیں ہیں۔ اعلان کرنے سے یا فتوے دینے سے جہاد کی ضرورتیں اور تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ یہ ایک طرزِ زندگی اور اس کو ربط وضبط سے جاری وساری کرنا ہوگا۔ یہ ایک کٹھن کام ہے۔ یہاں مادیت سے مکمل طور پر توبہ کرنا ہوگی اور پچھلے اڑتالیس سالوں (بلکہ 67 سالوں) میں ہم نے جو کچھ کیا ہے اس پر اپنے آپ کو ملامت کرنا ہوگی اور دین شاہبازی اختیار کرنا ہوگا۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

(اقبالؔ)

❖❖❖

گیارہواں باب

تیسری اور چوتھی کتاب کے

مشہور واقعات کا خلاصہ

اس سلسلہ کی کتابوں کی دوسری کتاب میں، پہلی اور دوسری کتاب میں بیان شدہ واقعات کا خلاصہ پیش کیا گیا تھا کہ وہاں پر کچھ واقعات ایسے تھے جن کی تاریخوں میں کسی قدر اختلافات تھے اور ہم نے جائزہ لے کر جس تاریخ کا تعین کیا اس وجہ سے ضروری تھا کہ ایک خلاصہ پیش بھی پیش کیا جاتا۔ تیسری اور چوتھی کتاب کے واقعات کی تاریخوں میں زیادہ اختلافات نہیں کہ اس وقت سن ہجری کا تعین ہو چکا تھا اور اختلافات طرز بیان اور سوچ کے سطحی ہونے کی وجہ سے بہت معمولی قسم کے ہیں۔ بہر حال کتابوں کے سلسلہ میں مشابہت پیدا کرنے کے لیے ہم چند اہم واقعات کا تاریخ وار خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

واقعات	سن ہجری	سن عیسوی
۱۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کا مصر کی سرحد میں داخلہ	ذوالحجہ، ۱۸ ہجری	دسمبر ۶۳۹ عیسوی
۲۔ مصر کے شہر فرما پر مسلمانوں کا قبضہ	محرم، ۱۹ ہجری	جنوری ۶۴۰ عیسوی
۳۔ جناب زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام کا کمک کے ساتھ مصر پہنچنا	جمادی الاول، ۱۹ ہجری	مئی ۶۴۰ عیسوی
۴۔ باب الیون کا محاصرہ	آخر ۱۹ ہجری	آخر ۶۴۰ عیسوی
۵۔ شہنشاہِ روم ہرقل کی وفات	صفر ۲۰ ہجری	۱۱، فروری ۶۴۱ عیسوی
۶۔ باب الیون اور مرکزی مصری علاقوں پر قبضہ	ربیع الاول، ۲۰ ہجری	مارچ ۶۴۱ عیسوی
۷۔ مسلمانوں کی سکندریہ کی طرف پیش قدمی اور رومیوں کی پسپائی	رجب ۲۰ ہجری	جون ۶۴۱ عیسوی

۸۔مسلمانوں کا سکندریہ کا محاصرہ اور قبضہ	۲۰۔۲۱ ہجری	۶۴۱۔۶۴۲ عیسوی
۹۔جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی طرابلس کی طرف پیش قدمی اور قبضہ	۲۲۔۲۳ ہجری	۶۴۳۔۶۴۴ عیسوی
۱۰۔حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت	محرم ۲۴ ہجری	نومبر ۶۴۴ عیسوی
۱۱۔رومیوں کا سکندریہ پر دوبارہ قبضہ	موسم خزاں ۲۴ ہجری	۶۴۵ عیسوی
۱۲۔جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی سکندریہ کی طرف پیش قدمی، نکیوس کی جنگ، سکندریہ پر دوبارہ قبضہ	۲۵ ہجری	۶۴۶ عیسوی
۱۳۔جناب ولید بن عقبہ کا آذربائیجان میں جہاد، شامی اور عراقی فوجوں کا ملاپ، آرمینیا کی طرف پیش قدمی وغیرہ	۲۵۔۲۶ ہجری	۶۴۶۔۶۴۷ عیسوی
۱۴۔جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی انطاکیہ سے آگے ساحلی علاقوں طرطوس وغیرہ کی طرف پیش قدمی	۲۶۔۲۷ ہجری	۶۴۷۔۶۴۸ عیسوی
۱۵۔جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کی شمالی افریقہ کی طرف پیش قدمی اور جنگی کارروائیاں	۲۷ ہجری	۶۴۸ عیسوی
۱۶۔سبطیلہ کی فتح	۲۸ ہجری	۶۴۹ عیسوی
۱۷۔جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا سمندر کے راستے قبرص پر حملہ	۲۸۔۲۹ ہجری	۶۴۹۔۶۵۰ عیسوی
۱۸۔جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کا بصرہ میں تقرر اور جہاد کے لیے روانگی	۲۸۔۲۹ ہجری	۶۴۹۔۶۵۰ عیسوی
۱۹۔جناب سعید رضی اللہ عنہ بن عاص گورنر کوفہ کا طبرستان اور جرجان کی طرف جہاد کے لیے کوچ	۲۹۔۳۰ ہجری	۶۵۰۔۶۵۱ عیسوی
۲۰۔جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عامر کا فارس میں بغاوت کا قلع قمع کرنا اور خراسان کی طرف جہاد کے لیے روانگی	۳۰۔۳۱ ہجری	۶۵۱ عیسوی

۲۱۔ مسلمانوں کی مصر کے ساحل کے نزدیک پہلی بحری جنگ، عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی سرح کی قیادت میں	۳۱ ہجری	۶۵۱ عیسوی
۲۲۔ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبرص پر دوسرا حملہ	۳۱۔۳۲ ہجری	۶۵۱ عیسوی
۲۳۔ ایران کے محاذ پر مزید فتوحات، نیشاپور، رے، بلخ پر دوبارہ قبضہ اور کابل و غزنی کی فتوحات	۳۰۔۳۲ ہجری	۶۵۱۔۶۵۲ عیسوی
۲۴۔ قرآن پاک کی اشاعت	۳۱۔۳۲ ہجری	۶۵۲۔۶۵۳ عیسوی
۲۵۔ مسلمانوں کی دوسری بحری جنگ فناکس کے علاقہ میں، جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں	۳۴ ہجری	۶۵۴۔۶۵۵ عیسوی
۲۶۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت	ذوالحجہ ۳۵ ہجری	جون ۶۵۶ عیسوی
۲۷۔ جنگ جمل	۳۶ ہجری	دسمبر ۶۵۶ عیسوی
۲۸۔ جنگ صفین	۳۶۔۳۷ ہجری	مئی۔ جولائی ۶۵۷ء
۲۹۔ جنگ نہروان	۳۷۔۳۸ ہجری	۶۵۸ عیسوی
۳۰۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت	رمضان ۴۰ ہجری	جنوری ۶۶۱ عیسوی
۳۱۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت	صفر ۴۱ ہجری	جولائی ۶۶۱ عیسوی
۳۲۔ جناب عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص کی وفات	۴۳ ہجری	۶۶۳ عیسوی
۳۳۔ جناب مغیرہ بن شعبہ کی وفات	۴۹۔۵۰ ہجری	۶۷۰ عیسوی
۳۴۔ قسطنطنیہ پر حملہ	۴۷ یا ۴۹ ہجری سے ۵۴ یا ۵۷ ہجری تک	۶۶۹۔۶۷۶ عیسوی
۳۵۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات	۵۱ ہجری	۶۷۲ عیسوی
۳۶۔ جزیرہ روڈس پر مکمل قبضہ	۴۹ ہجری	۶۷۰ عیسوی
۳۷۔ جناب عقبہ بن نافع اور دینار کی بحیرہ اوقیانوس تک مہمات	۴۹ سے ۵۹ ہجری	۶۷۰۔۶۸۰ عیسوی

۳۸۔ بخارا اور وسط ایشیا پر قبضہ	۵۳ ہجری	۶۷۴ عیسوی
۳۹۔ غزنی اور کابل پر دوبارہ قبضہ بنوں، قندھار اور مکران کے مزید علاقوں کی فتوحات	۵۶۔۵۷ ہجری	۶۷۷۔۶۷۸ عیسوی
۴۰۔ امیر معاویہ کی وفات	۶۰ ہجری	۶۸۰ ہجری
۴۱۔ سانحہ کربلا	محرم ۶۱ ہجری	۶۸۱ عیسوی

❖❖❖

خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی اور تدابیرات کا تجزیہ

فتوحات عراق وایران

اشاریہ

(ب)

ج

خ

د

ڈ

ذ

ز

س

ص

ض

ط

ظ

ع

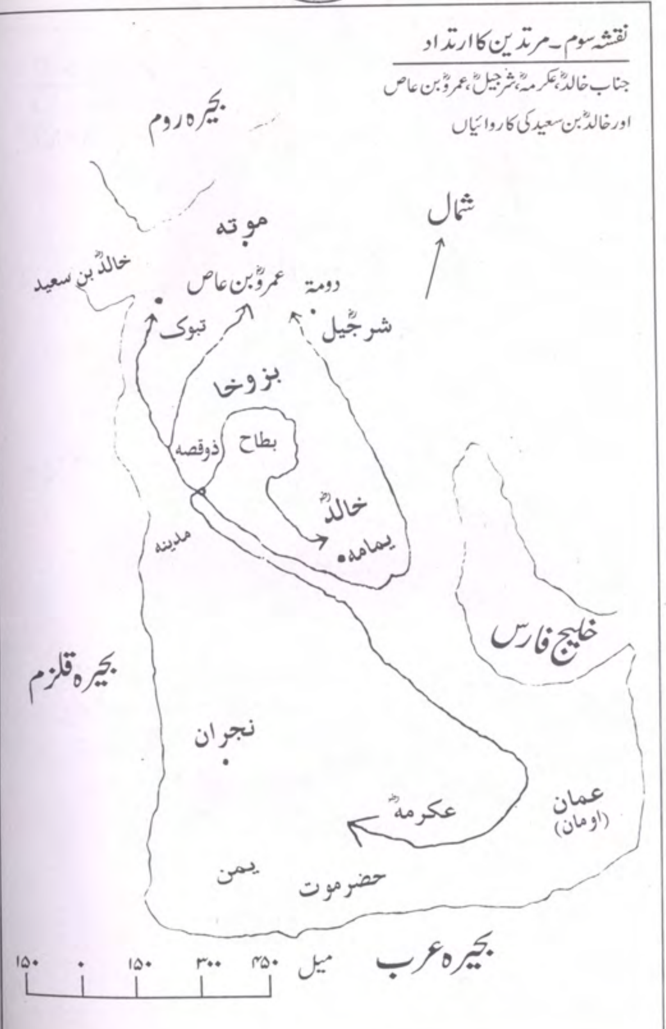
غ

غ

ف

ل

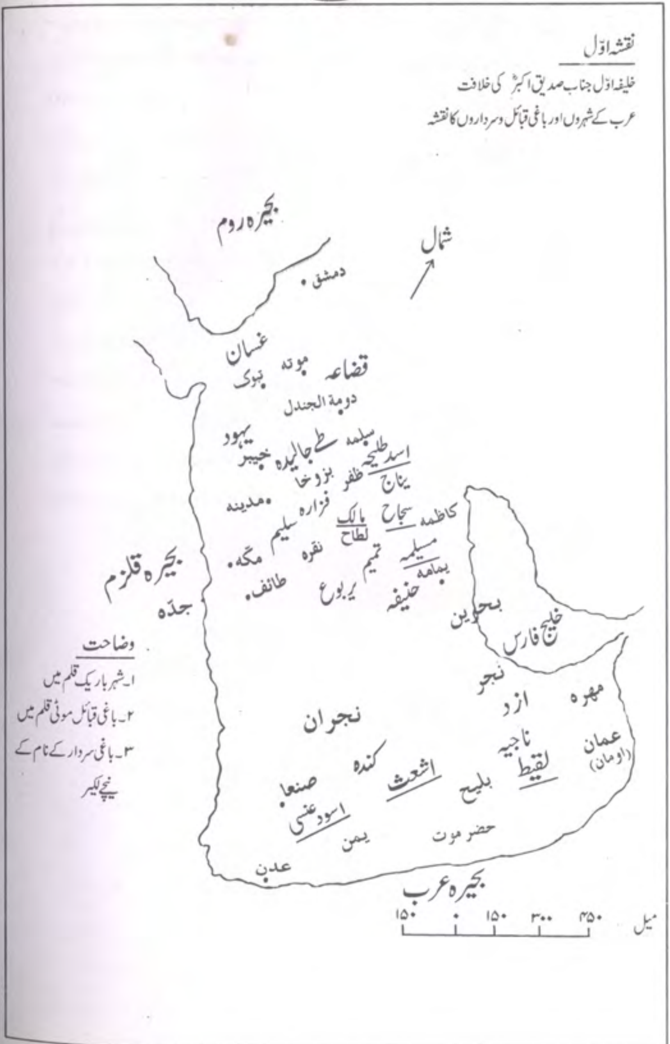
ی


نقشہ سوم۔ مرتدین کا ارتداد
جناب خالدؓ، عکرمہؓ، شرجیلؓ، عمروؓ بن عاص
اور خالدؓ بن سعید کی کاروائیاں
بحیرہ روم
شمال
موتہ
خالدؓ بن سعید
عمروؓ بن عاص
دومۃ
تبوک
شرجیلؓ
بزوخا
بطاح
ذوقصہ
خالدؓ
یمامہ
مدینہ
خلیج فارس
بحیرہ قلزم
نجران
عمان
(اومان)
عکرمہؓ
یمن
حضرموت
بحیرہ عرب
میل
۱۵۰ ۰ ۱۵۰ ۳۰۰ ۴۵۰

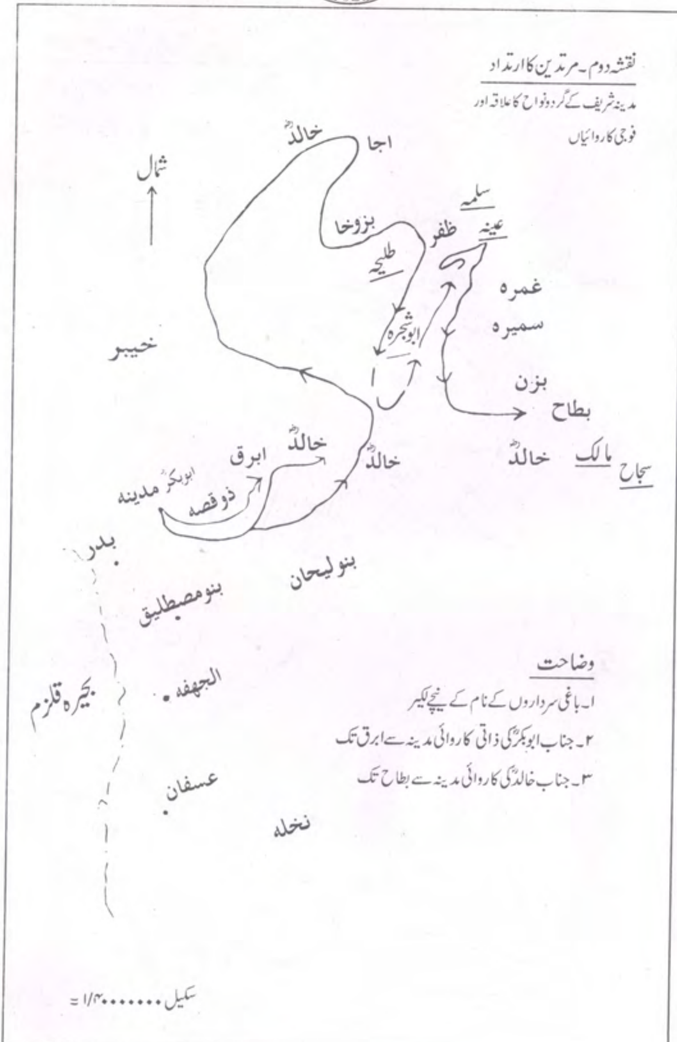
نقشہ چہارم۔ مرتدین کا ارتداد

جناب طریفہؓ، علاؓ، حذیفہؓ، عرفجہؓ، مہاجرؓ، اور سویدؓ کی جنگی کاروائیاں





نقشہ اوّل
خلیفہ اوّل جناب صدیق اکبرؓ کی خلافت
عرب کے شہروں اور باغی قبائل وسرداروں کا نقشہ
بحیرہ روم
شمال
دمشق
غسان
قضاعہ
موتہ
تبوک
دومۃ الجندل
یہود
خیبر
اسد طلیحہ
سلمہ
طے
جالیدہ
بزوخا
ظفر
یناج
فزارہ
مدینہ
کاظمہ
سجاح
مالک
لطاح
سلیم
نقرہ
مکہ
مسیلمہ
یمامہ
تمیم
طائف
یربوع
حنیفہ
بحیرہ قلزم
جدّہ
بحرین
خلیج فارس
وضاحت
۱۔ شہر باریک قلم میں
۲۔ باغی قبائل موٹی قلم میں
۳۔ باغی سردار کے نام کے نیچے لکیر
نجو
مہرہ
ازد
نجران
ناجیہ
لقیط
عمان
(اومان)
کندہ
اشعث
بلیح
صنعا
اسود عنسی
حضر موت
یمن
عدن
بحیرہ عرب
۱۵۰
۰
۱۵۰
۳۰۰
۴۵۰
میل


نقشہ دوم۔ مرتدین کا ارتداد
مدینہ شریف کے گردونواح کا علاقہ اور
فوجی کاروائیاں
شمال
خالدؓ
اجا
سلمہ
عینہ
ظفر
بزوخا
طلیحہ
غمرہ
سمیرہ
ابوشجرہ
خیبر
بزن
بطاح
سجاح
مالک
خالدؓ
خالدؓ
خالدؓ
ابرق
ابوبکرؓ
مدینہ
ذوقصہ
بدر
بنولیحان
بنومصطلیق
الجحفہ
بحیرہ قلزم
عسفان
نخلہ
وضاحت
ا۔ باغی سرداروں کے نام کے نیچے لکیر
۲۔ جناب ابوبکرؓ کی ذاتی کاروائی مدینہ سے ابرق تک
۳۔ جناب خالدؓ کی کاروائی مدینہ سے بطاح تک
سکیل ....۱/۴ =

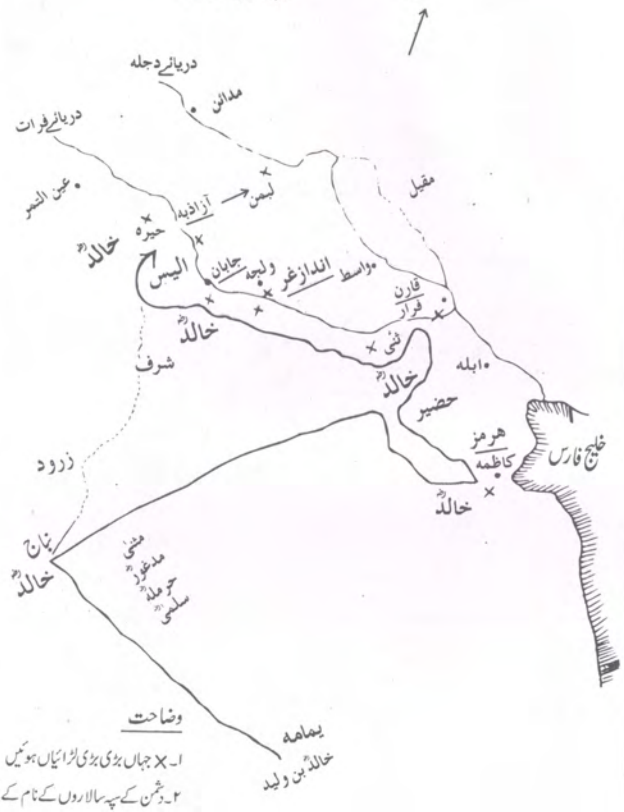
نقشہ پنجم۔ جناب صدیق اکبرؓ کی عراق فتوحات کی حکمت عملی

جناب عمروؓ بن عاص اور جناب سعیدؓ کی ذمہ داری کا علاقہ بھی دکھایا گیا ہے



نقشہ ششم۔ خالدؓ کی کاظمہ کی جنگ سے

حیرہ تک کی فتوحات



وضاحت

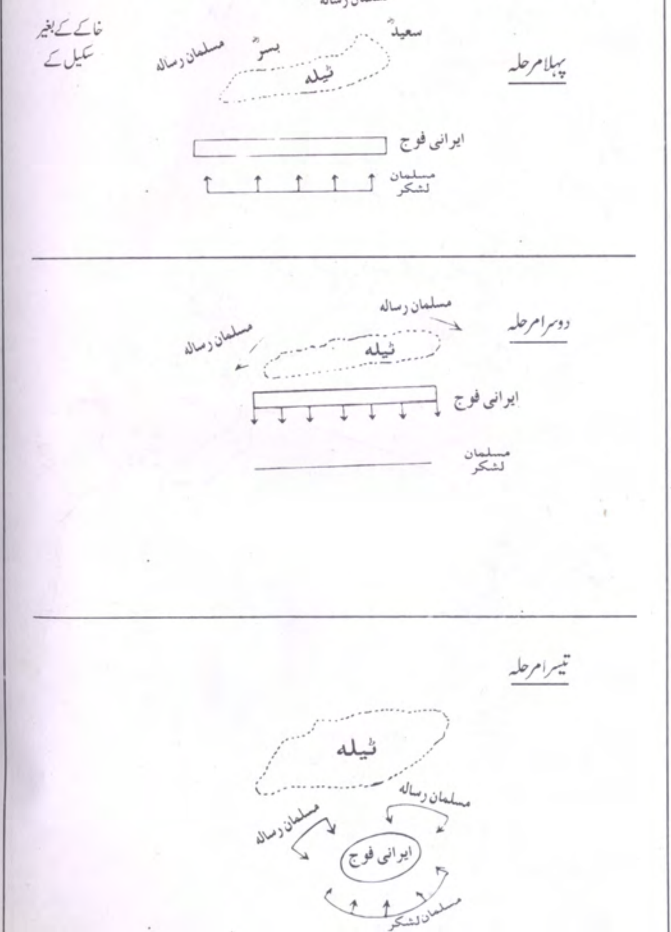
۱۔ × جہاں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں

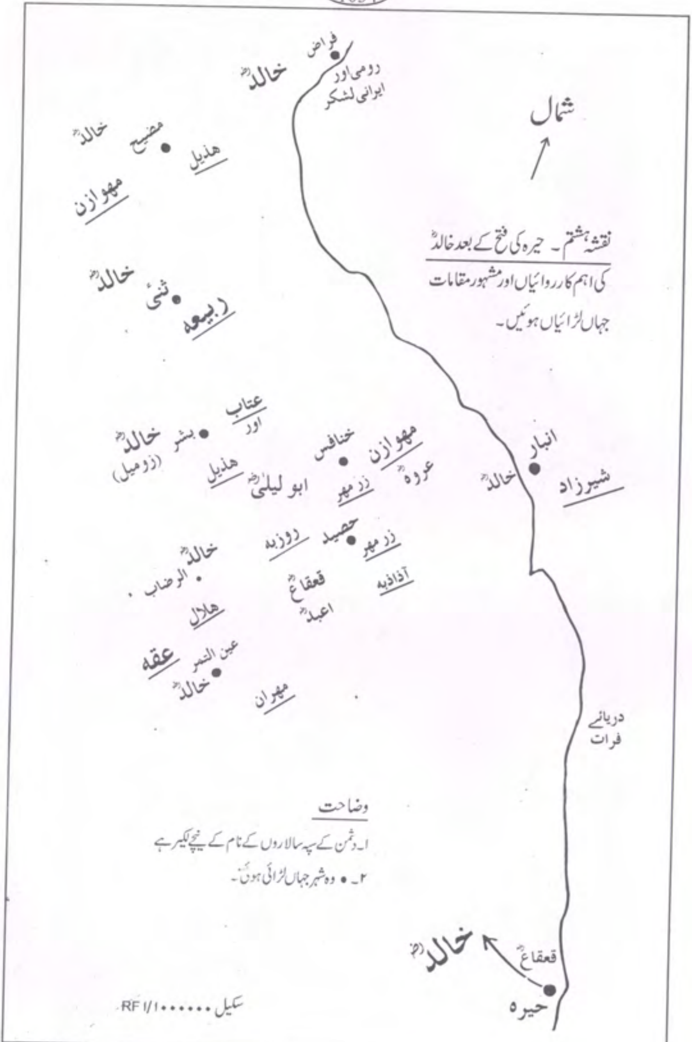
۲۔ دشمن کے سپہ سالاروں کے نام کے نیچے لکیر ہے۔

سکیل RF ۱/۴۰۰۰۰۰۰

نقشہ ہفتم

ولجہ کی جنگ کے تین مرحلے





شمال
نقشہ ہشتم۔ حیرہ کی فتح کے بعد خالدؓ
کی اہم کارروائیاں اور مشہور مقامات
جہاں لڑائیاں ہوئیں۔
فراض
خالدؓ
رومی اور
ایرانی لشکر
مصیخ
خالدؓ
ھذیل
مھوازن
ثنیٰ
خالدؓ
ربیعہ
عتاب
اور
بشر
خالدؓ
(زومیل)
ھذیل
خنافس
مھوازن
عروہؓ
ابو لیلیٰؓ
زر مہر
انبار
خالدؓ
شیرزاد
حصید
روزبہ
زر مہر
خالدؓ
الرضاب
قعقاعؓ
آذاذبہ
اعبدؓ
ھلال
عین التمر
عقہ
خالدؓ
مہران
دریائے
فرات
وضاحت
ا۔ دشمن کے سپہ سالاروں کے نام کے نیچے لکیر ہے
۲۔ • وہ شہر جہاں لڑائی ہوئی۔
خالدؓ
قعقاعؓ
حیرہ
سکیل RF 1/1000000

نقشہ نہم۔ بابل، کسکر، جسر اور بویب

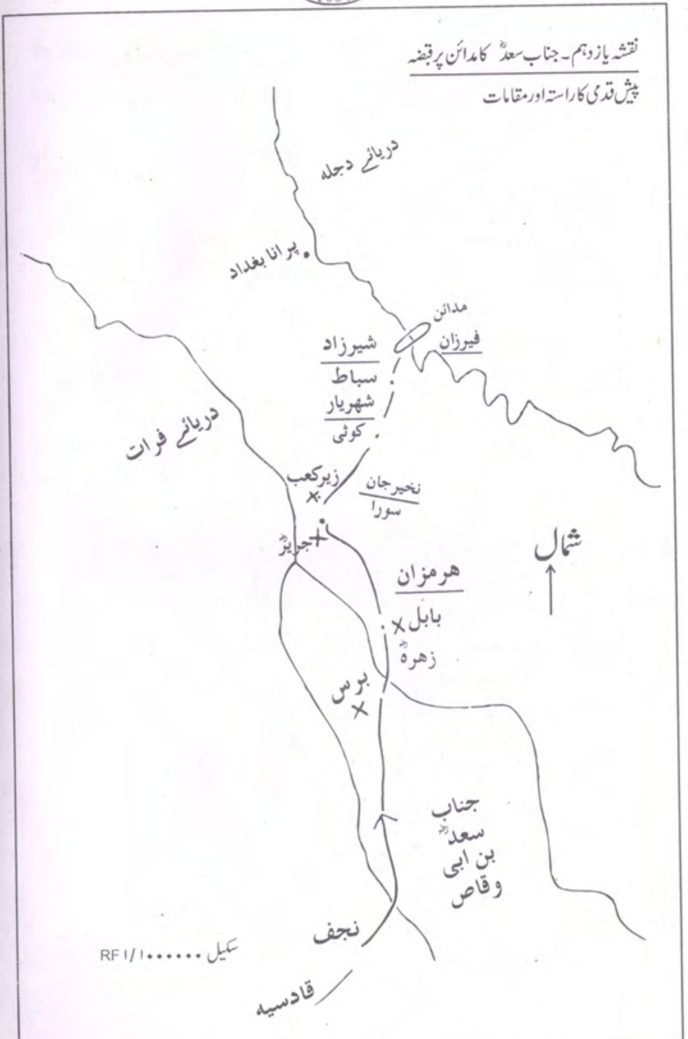
کی جنگوں کا علاقہ

(جناب مثنیٰؓ اور جناب ابوعبیدؓ کی جنگیں)



نقشہ دہم۔ قادسیہ کا محل وقوع اور
اسلامی لشکر کی صف بندی




نقشہ یازدہم۔ جناب سعدؓ کا مدائن پر قبضہ
پیش قدمی کا راستہ اور مقامات
دریائے دجلہ
پرانا بغداد
مدائن
فیروزان
شیرزاد
سباط
شہریار
کوثی
دریائے فرات
زہرکعب
نخیرجان
سورا
جاہرؓ
شمال
ہرمزان
بابل
زہرہؓ
برس
جناب
سعدؓ
بن ابی
وقاص
نجف
سکیل RF 1/1000000
قادسیہ

نقشہ دوازدہم۔

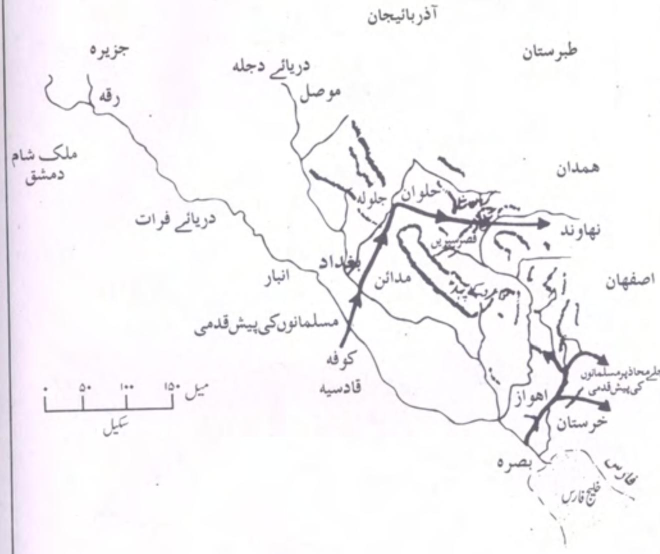
جنوبی علاقے۔فارس اور خزستان کے صوبے



سکیل RF ١/٤٠٠٠٠٠٠

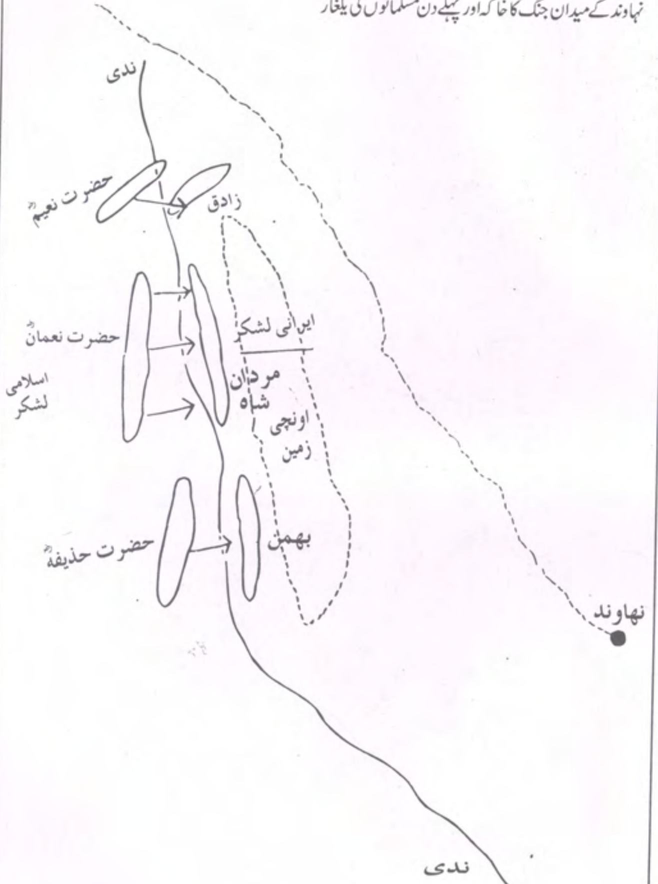
نقشہ سہ از دہم۔

نہاوند کا محل وقوع اور اس طرف پیش قدمی



نقشہ چہاردہم۔ (بغیر سکیل کے)

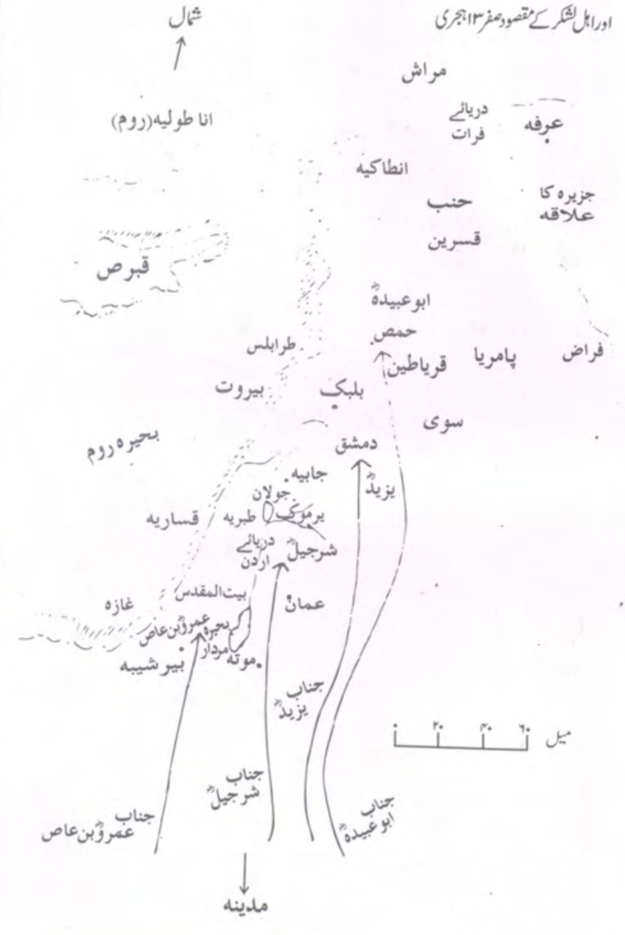
نہاوند کے میدان جنگ کا خاکہ اور پہلے دن مسلمانوں کی یلغار



نقشہ پانزدہم۔عراق اور ایران کی اسلامی فتوحات کی وسعت



نقشہ اوّل۔ جناب صدّیق اکبرؓ کی فتوحات، شام کے لئے حکمت عملی
اور اہل لشکر کے مقصود صفر ۱۳ ہجری





سکیل RFP1/۸۰۰۰۰۰۰

جناب خالدؓ نے عراق سے یرموک کی طرف کوچ میں درمیان والا راستہ اختیار کیا
باقی دو ممکن راستے بھی دکھائے گئے ہیں۔ ربیع الاول ۱۳ ہجری

نقشہ سوم۔

اجنادین کی جنگ۔کوچ کا راستہ

۲۸ جمادی الاول ۱۳ ہجری



اجنادین کی جنگ کے لئے جو راستہ اسلامی
لشکروں نے اختیار کیا اور اجنادین کا محل وقوع۔

نقشہ چہارم۔شام اور اردن کی فتوحات

یرموک کی پہلی جنگ، فحل کی پہلی جنگ

مرج الصفر کی جنگ اور دمشق کا محاصرہ



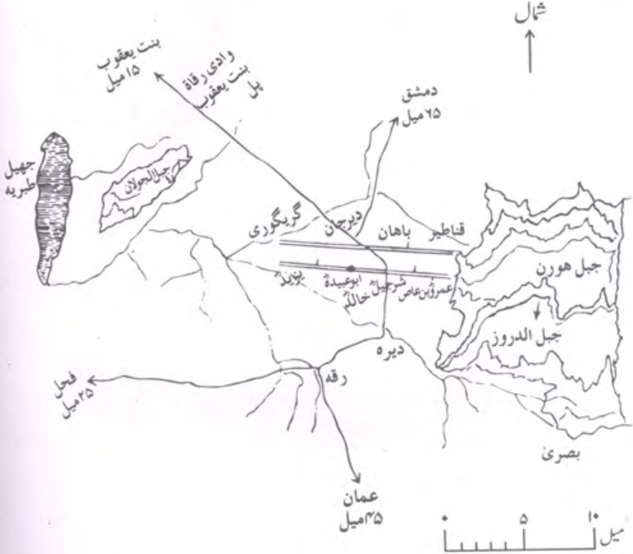
پہاڑی علاقے اور قافلوں کے راستے بھی دکھائے گئے ہیں

نقشہ پنجم۔ ہرقل کی شام سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے
بھرپور کاروائی اور
جنگ یرموک کی تیاری



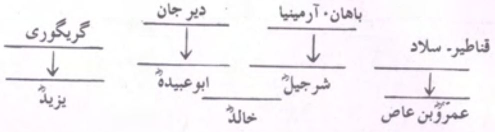
نقشہ ششم۔ یرموک کا میدان جنگ

طرفین کی صف بندی

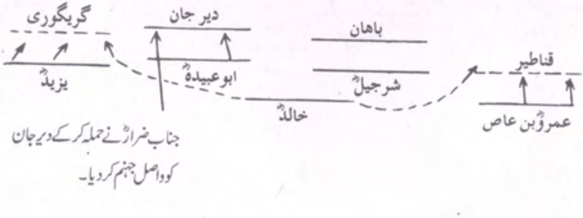


نقشہ ہفتم۔ یرموک کی جنگ، خاکہ بغیر سکیل کے

دوسرے دن کی جنگ دوپہر سے پہلے



دوسرے دن کی جنگ دوپہر کے بعد

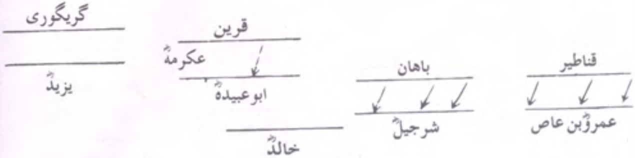


نقشہ ہشتم۔ یرموک کی جنگ، خاکہ بغیر سکیل کے

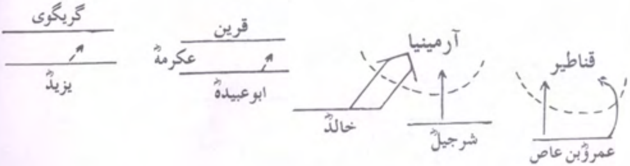
تیسرے دن کی جنگ دوپہر سے پہلے (پہلا مرحلہ)

(دیرجان مارا گیا تھا اس کی جگہ قرین نے لے لی)

شمال

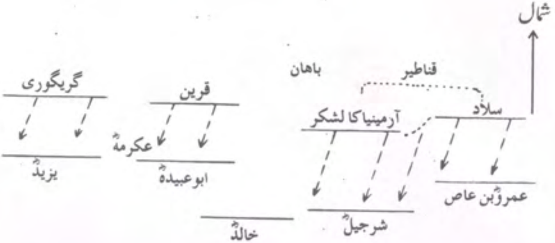


تیسرے دن کی جنگ بعد دوپہر (دوسرا مرحلہ)

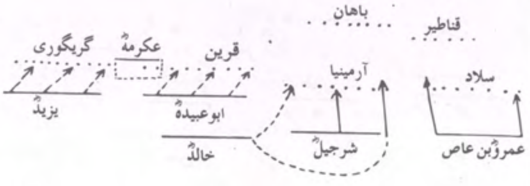


نقشہ نہم۔ یرموک کی جنگ، خاکہ بغیر سکیل کے

چوتھے دن کی جنگ دوپہر سے پہلے (پہلا مرحلہ)



چوتھے دن کی جنگ۔ دوپہر کے بعد (دوسرا مرحلہ)



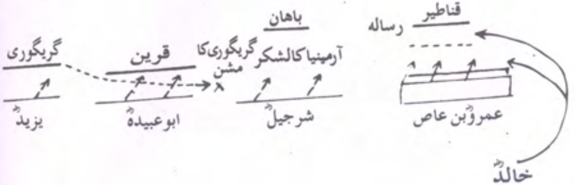
نوٹ

جناب ابوعبیدہؓ اور یزیدؓ نے حملہ کی کاروائی دوپہر سے پہلے شروع کر دی تھی،

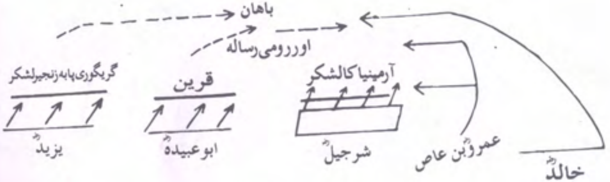
خاکے سے ظاہر ہے کہ پورے محاذ پر بھرپور حملہ کے بعد رومی لشکر میں لڑنے کی سکت ختم ہوگئی

نقشہ دہم الف۔ یرموک کی جنگ، خاکہ بغیر سکیل کے

چھٹے دن کی جنگ مسلمانوں کی پہلے مرحلہ کی کاروائی

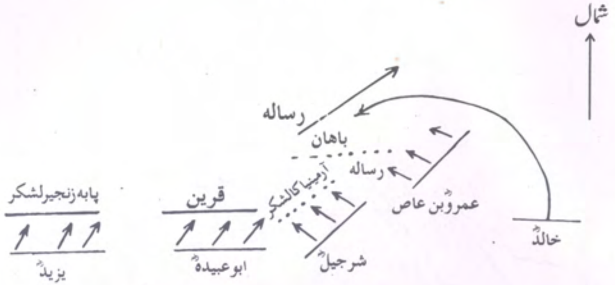


مسلمانوں کے دوسرے مرحلہ کی کاروائی

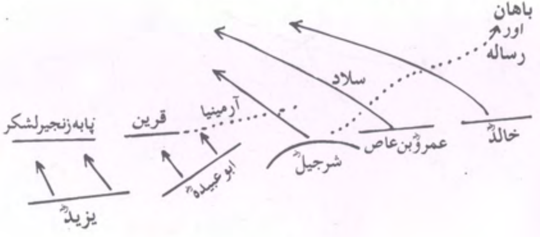


نقشہ دہم ب۔ یرموک کی جنگ، خاکہ بغیر سکیل کے

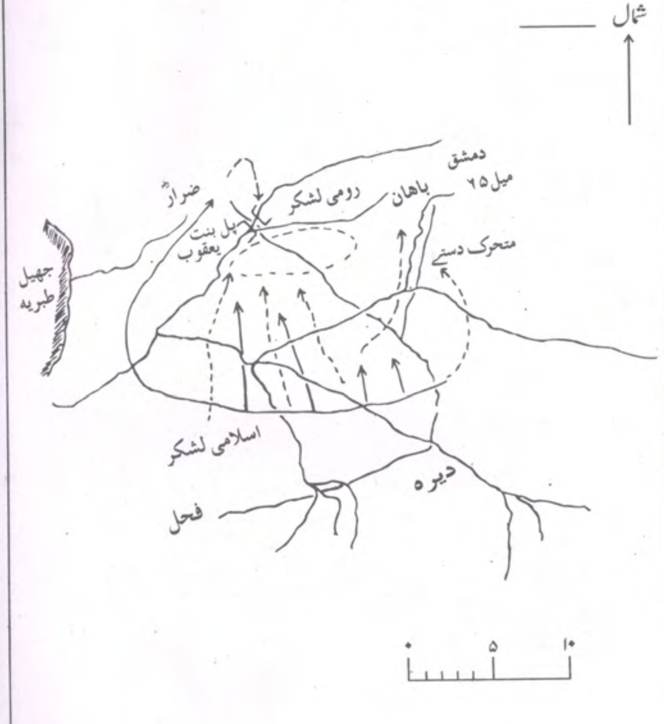
چھٹا دن (تیسرا مرحلہ)



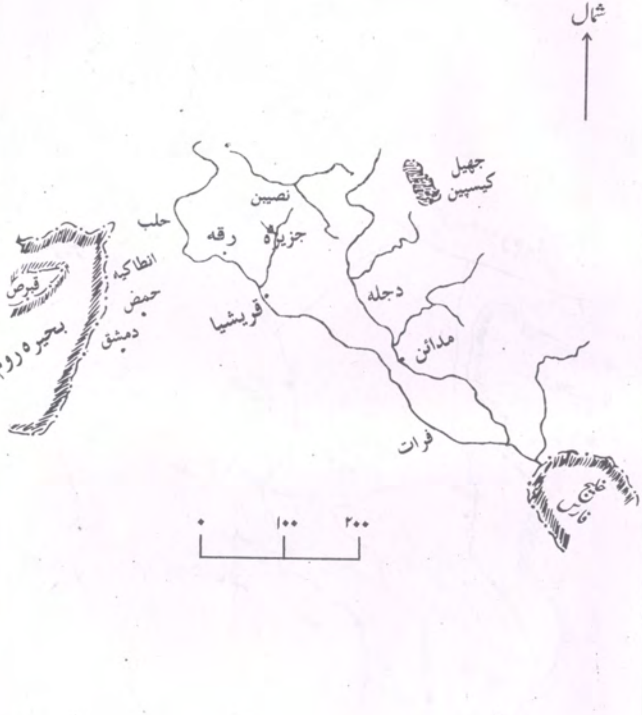
چھٹا دن (چوتھا مرحلہ)



نقشہ یازدہم۔ یرموک کے میدان جنگ کے آخری لمحات، جہاں اہل روم کا
لشکر تہس نہس ہوگیا



نقشہ دوازدہم۔ شمالی شام اور جزیرہ کا علاقہ
(محل وقوع)



نقشہ سیازدہم۔ شمالی شام کا نقشہ

مشہور شہر اور پرانے قافلوں کے راستے

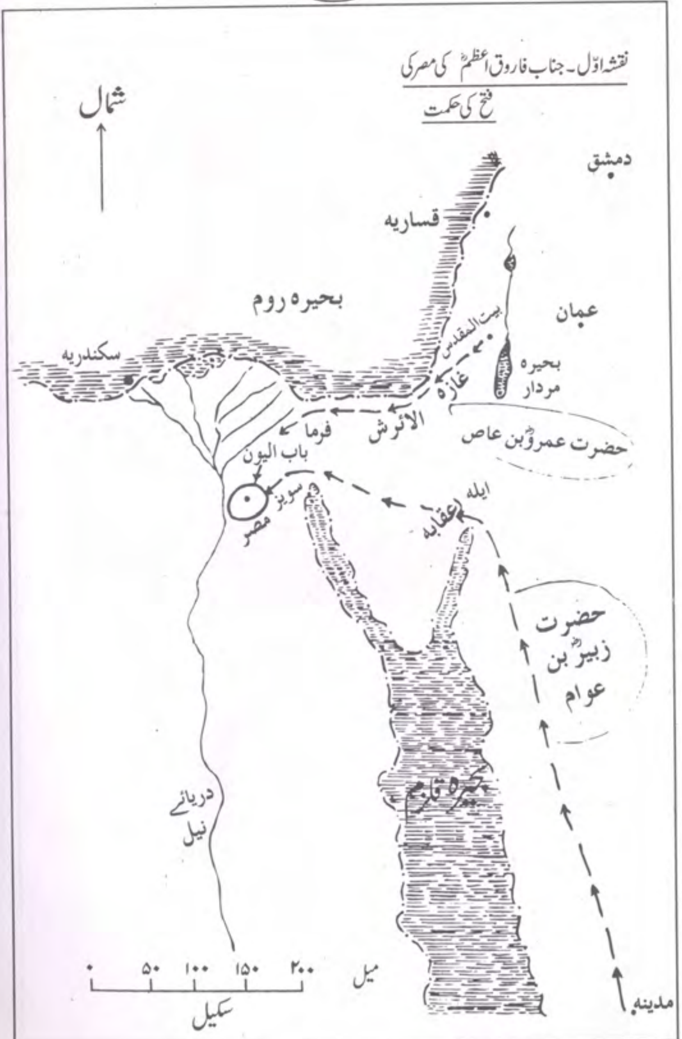


نقشہ چہاردہم۔ جزیرہ کے علاقے کی تفصیلات

مشہور شہر اور دریا

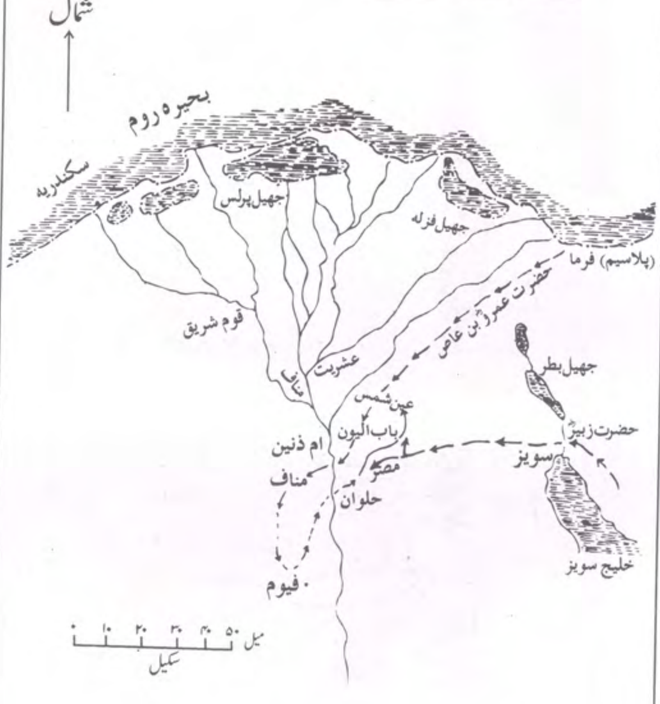


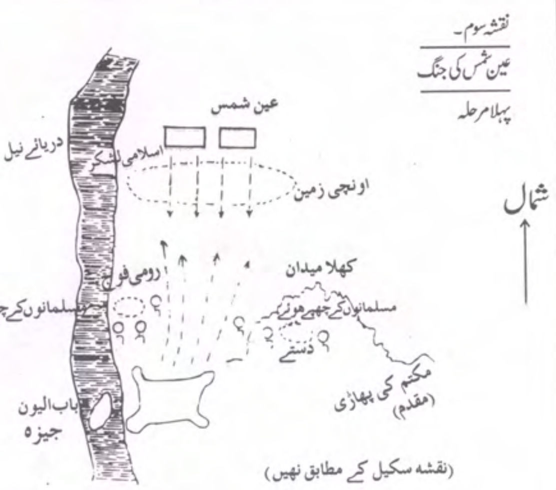
RF 1/4,000,000 سکیل


نقشہ اوّل۔ جناب فاروق اعظمؓ کی مصر کی
فتح کی حکمت
شمال
دمشق
قساریه
بحیره روم
عمان
بیت المقدس
غازه
بحیره
مردار
سکندریه
الائرش
فرما
حضرت عمروؓ بن عاص
باب الیون
سویز
مصر
ایله
عقابه
حضرت
زبیرؓ بن
عوام
بحیرہ قلزم
دریائے
نیل
۰ ۵۰ ۱۰۰ ۱۵۰ ۲۰۰
میل
سکیل
مدینه

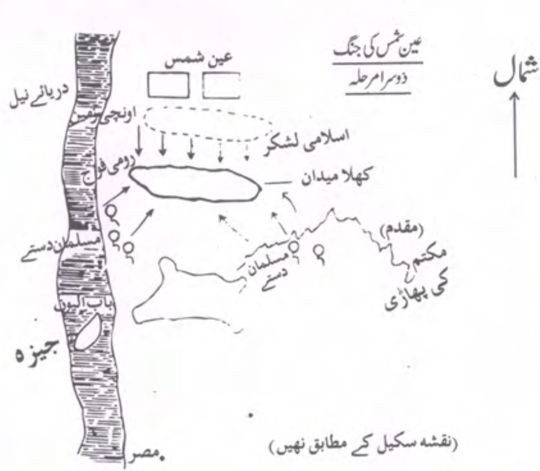
نقشہ دوم ۔ جناب عمروؓ بن عاص کی حضرت زبیرؓ کی کمک پہنچنے سے

پہلے کی کاروائی اور دریائے نیل کو عبور کرنا



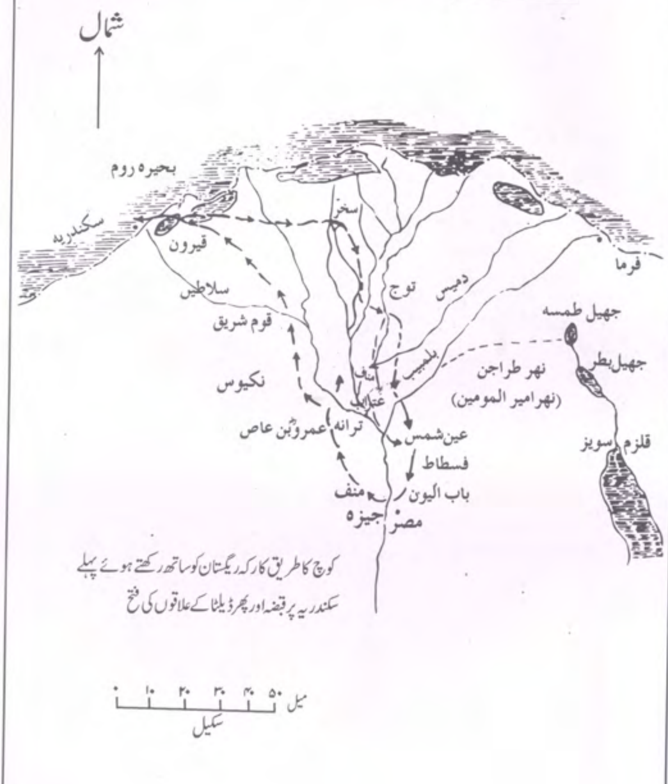


نقشہ سوم۔
عین شمس کی جنگ
پہلا مرحلہ
عین شمس
دریائے نیل
اسلامی لشکر
اونچی زمین
شمال
رومی فوج
کھلا میدان
مسلمانون کے چھپے ہوئے دستے
مسلمانون کے چھپے ہوئے دستے
مکتم کی پہاڑی
(مقدم)
باب الیون
جیزہ
(نقشہ سکیل کے مطابق نہیں)

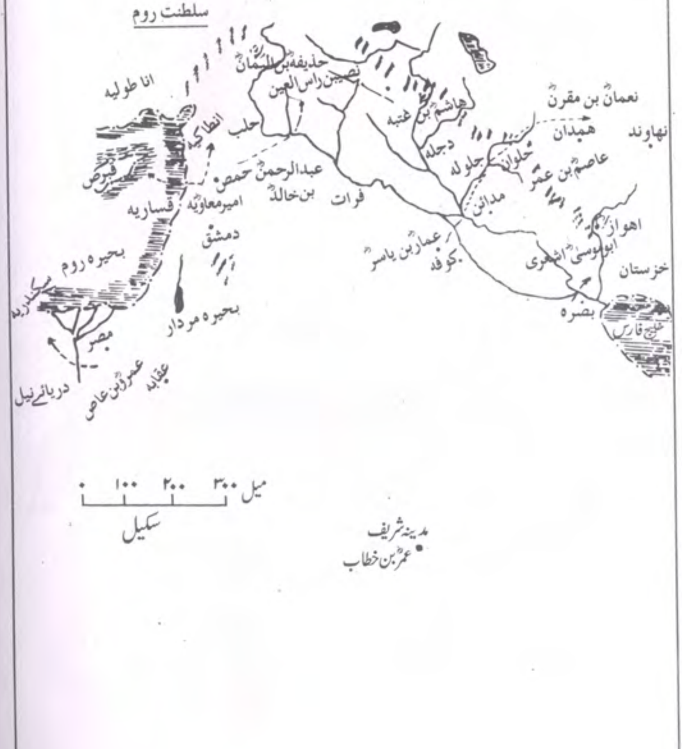


عین شمس کی جنگ
دوسرا مرحلہ
عین شمس
شمال
دریائے نیل
اونچی زمین
اسلامی لشکر
رومی فوج
کھلا میدان
(مقدم)
مکتم کی پہاڑی
مسلمان دستے
مسلمان دستے
باب الیون
جیزہ
مصر
(نقشہ سکیل کے مطابق نہیں)

نقشہ چہارم۔اسلامی لشکر کی سکندریہ کی فتح اور ڈیلٹا پر
قبضہ کا رخ اور نہر طراجن



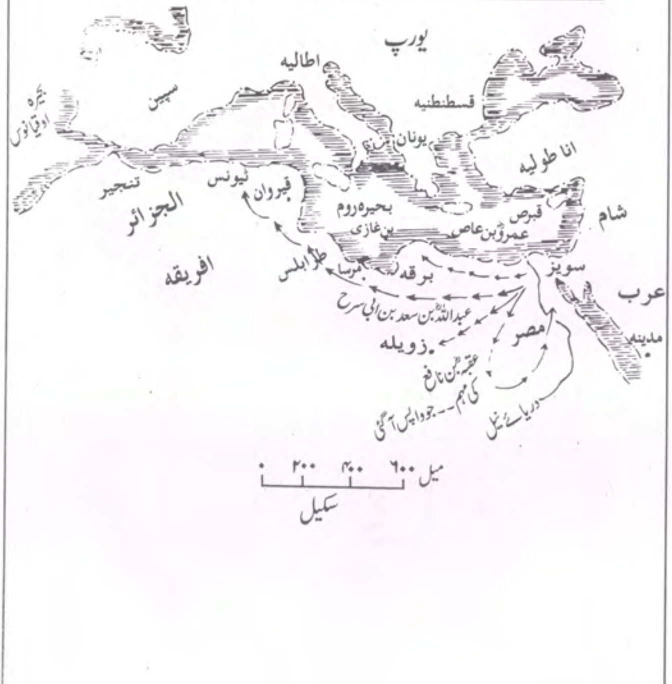
نقشہ پنجم ۔ اکیس ہجری میں خلیفہ دوم کی فتوحات کی حکمت عملی
اور اسلامی لشکروں کے محاذ اور تیاری

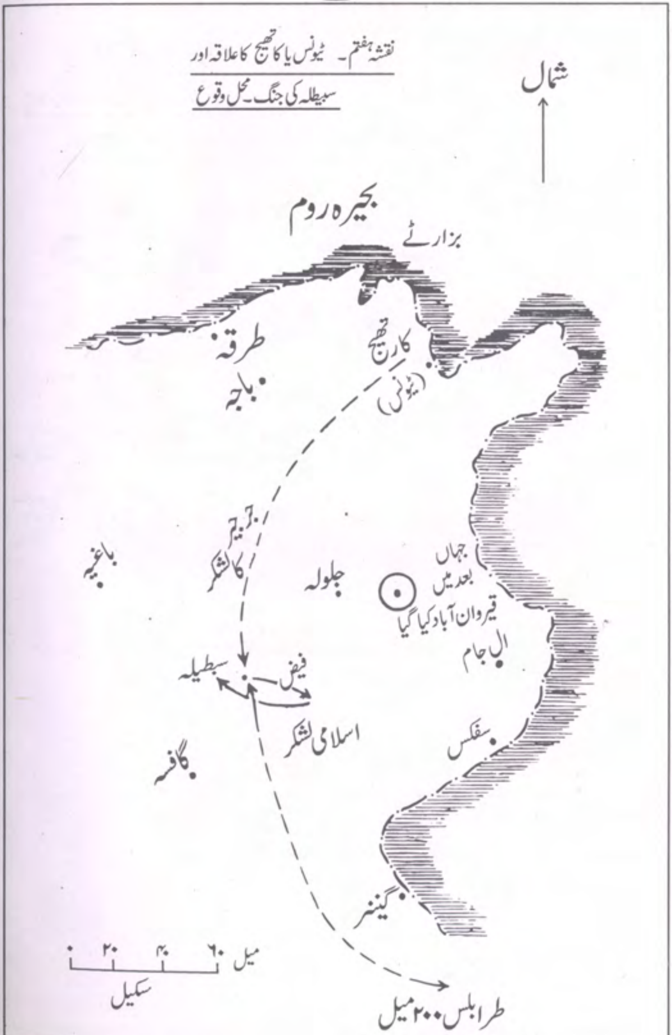


نقشہ ششم۔ مسلمانوں کی شمالی افریقہ کو فتوحات

پہلا مرحلہ: عمروؓ بن عاص کا برقہ تک حربی مظاہرہ

دوسرا مرحلہ: عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کی طرابلس اور ٹیونس کی فتوحات

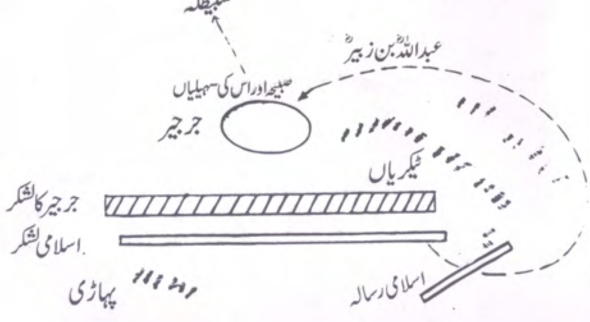




نقشہ ہفتم۔ ٹیونس یا کارتھیج کا علاقہ اور
سبیطلہ کی جنگ۔ محل وقوع

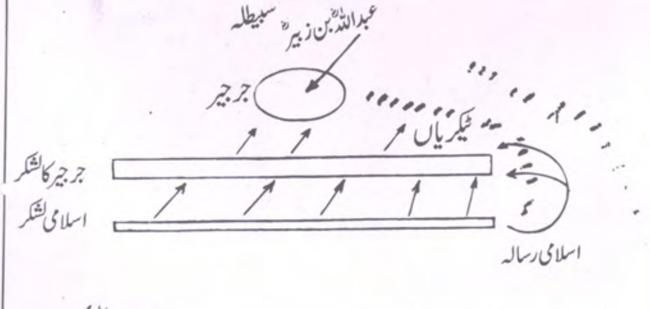
نقشہ ہشتم۔ سبیطلہ کی جنگ

جنگ کا پہلا مرحلہ



(نقشہ سکیل کے مطابق نہیں)

جنگ کا دوسرا مرحلہ



(نقشہ سکیل کے مطابق نہیں)



مسلمانوں کی قبرص پر ۲۸ ہجری اور ۳۲ ہجری میں یلغار

اسلامی تاریخ کے پہلے ملے جلے بری اور بحری حملے


نقشہ دہم۔
مسلمانوں اور رومیوں کی پہلی
دو بحری جنگیں
بحیرہ اسود
قسطنطنیہ
اناطولیہ
سلطنت روم
قسطنطین
شاہ روم
اناطولیہ
طرطوس
روڈس
انطاکیہ
لطاکیہ
طرابلس
قبرص
کریٹ
مسلمانوں اور رومیوں کی دوسری
بحری جنگ ۳۴ ہجری
بحیرہ روم
بیروت
دمشق
حیفہ
شام
اردن
بیت المقدس
غازی
مسلمانوں اور رومیوں کی پہلی
بحری جنگ ۳۱ ہجری
الاثرش
فرما
سکندریہ
میل ۱۵۰ ۱۰۰ ۵۰ ۰
سکیل

نقشہ یازدہم۔ کوفہ کے محاذ کی ذمہ داری کا علاقہ

اور طبرستان و آذربائیجان



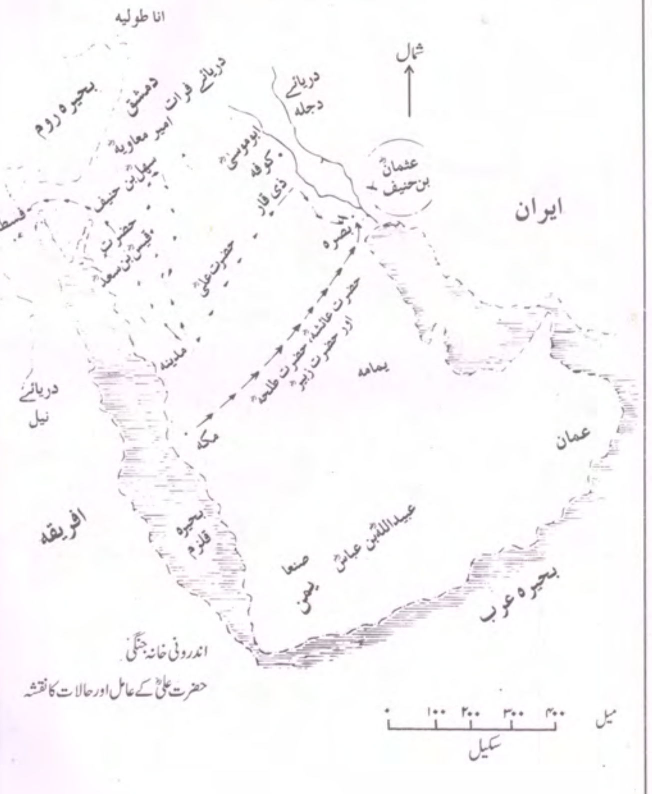
نقشہ دوازدہم۔ بصرہ کے محاذ کی ذمہ داری کا علاقہ اور
مکران، سیستان، خراسان، جرجان کی مہمات و
کابل وزیرستان کی فتوحات



نقشہ اوّل۔ جنگ جمل۔ میدان جنگ × ۳۵ ہجری

حضرت علیؓ کے کوچ کا راستہ

حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے کوچ کا راستہ

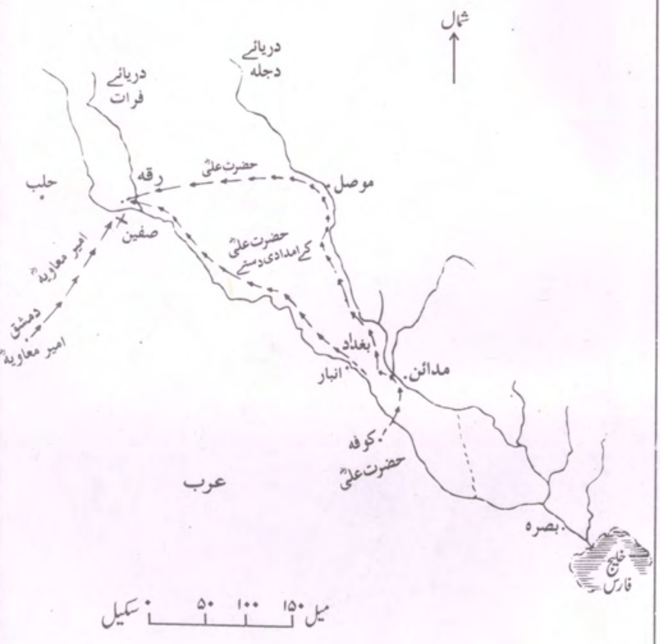


اندرونی خانہ جنگی

حضرت علیؓ کے عامل اور حالات کا نقشہ

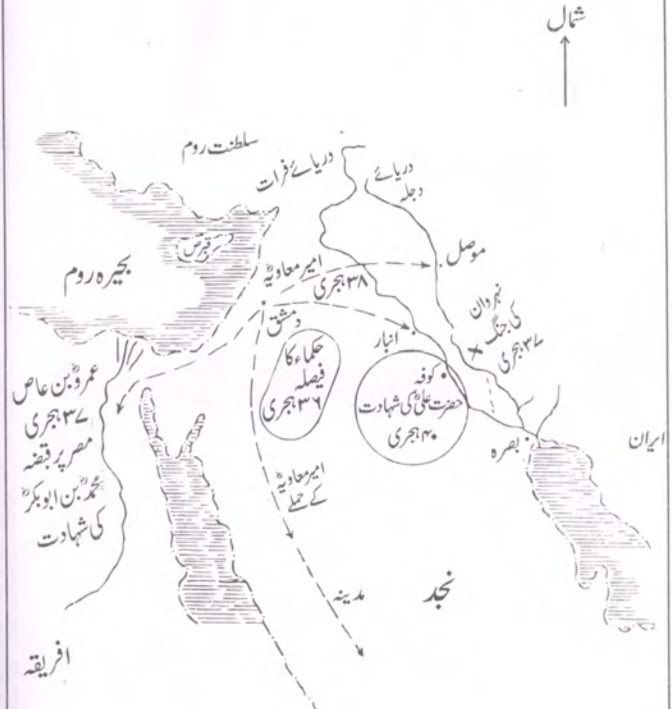
نقشہ دوم۔ جنگ صفین ۳۶/۳۷ ہجری

طرفین کے کوچ



نقشہ سوم۔

جنگ صفین سے حضرت علیؓ کی شہادت تک ملک
میں افراتفری اور خانہ جنگی کا نقشہ




نقشہ چہارم۔
امیر معاویہؓ کے زمانے میں ۴۸ ہجری سے ۵۵ ہجری تک
قسطنطنیہ پر لگاتار حملے
شمال
بحیرہ اسود
درہ دانیال
ابوایوب انصاریؓ کی شہادت
قسطنطنیہ
آبنائے باسفورس
اناطولیہ
سلطنت روم
اسلامی سلطنت
۵۳ ہجری میں مکمل قبضہ
روڈس
انطاکیہ
قبرص
بحیرہ روم
دمشق
امیر معاویہؓ
سکیل ۰ ۵۰ ۱۰۰ ۱۵۰ میل

مغربی محاذ

نقشہ پنجم۔امیر معاویہؓ کے زمانے اور چند سال بعد ۴۱ ہجری سے ۶۳ ہجری تک

افریقہ اور یورپ میں مسلمانوں کی کاروائیاں اور مہمات



نقشہ ششم۔

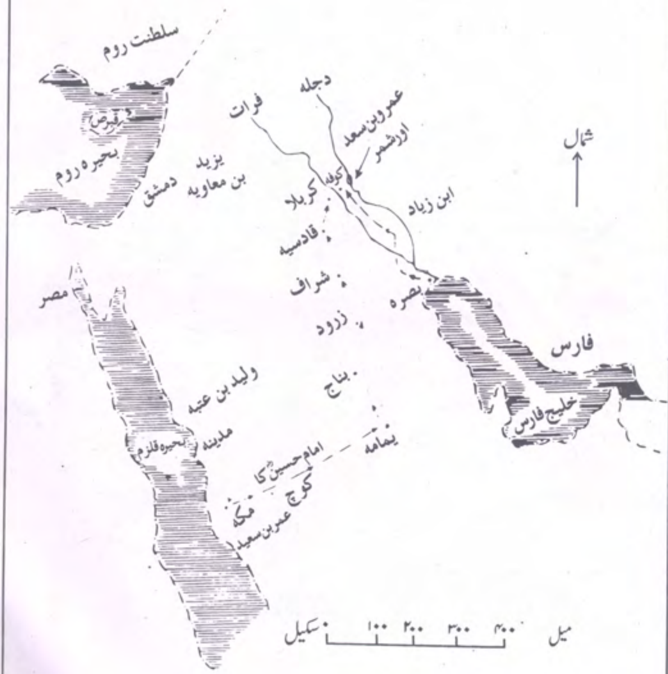
مشرقی محاذ

امیر معاویہؓ کے زمانے میں مشرقی محاذ پر اسلامی سلطنت کا پھیلاؤ

بخارا، سمرقند، کابل، بنوں اور مکران تک



نقشہ ہفتم۔
سانحہ کربلا: امام حسینؓ کا کربلا کی طرف کوچ اور ابن زیاد
کی بصرہ سے کوفہ میں آمد، عمرو بن سعد اور شمر

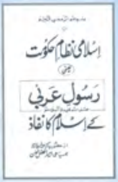


مصنف کی دیگر کتب میں سے
کچھ کے ٹائٹل کا عکس



















۱۹۔ذیشان کالونی، قاب لائنز، راولپنڈی۔ فون: 051-5583778